افلا یتدبرون القرآن

تدبرِ قرآن

مولانا امین احسن اصلاحی رحمۃ اللہ علیہ

یونس ۱۰ — مریم ۱۹

تدبرِ قرآن

جلد چہارم

كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ مُبٰرَكٌ لِّيَدَّبَّرُوْٓا اٰيٰتِهٖ وَلِيَتَذَكَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ

تدبرِ قرآن

جلد چہارم

تفسیر

سورۂ یونس (۱۰) ـــــ تا ـــــ سورۂ مریم (۱۹)

امین احسن اصلاحی

فاران

فاران فاؤنڈیشن

لاہور ـــــ پاکستان

اہتمام — حسن خاور

مطبع — کیو۔ وائی پرنٹرز، میکلوڈ روڈ، لاہور

تاریخ اشاعت — نومبر 2009ء — ذیقعد 1430ھ

ادارہ — فاران فاؤنڈیشن

سیکنڈ فلور، علق پریس بلڈنگ، 19-اے،
ایبٹ روڈ، لاہور، پاکستان۔ فون: 042-6303244
ای میل: faran@wol.net.pk

فہرس

تدبّرِ قرآن

١٠

یونس

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

۱۔ سورتوں کے تیسرے گروپ پر ایک اجمالی نظر

سورۂ توبہ پر سورتوں کا دوسرا گروپ، جیسا کہ ہم نے مقدمہ میں واضح کیا ہے، تمام ہوا۔ اب سورۂ یونس سے تیسرا گروپ شروع ہو رہا ہے جو سورہ نور پر ختم ہوا ہے۔ اس میں ۱۴ سورتیں ـــــ یونس، ہود، یوسف، رعد، ابراہیم، حجر، نحل، بنی اسرائیل، کہف، مریم، طٰہٰ، انبیاء، حج اور مومنون مکی ہیں، آخر میں صرف سورہ نور مدنی ہے۔ سورتوں کے جوڑے جوڑے ہونے کا اصول، جس طرح پچھلے دونوں گروپوں میں آپ نے ملاحظہ فرمایا اسی طرح اس گروپ میں بھی ملحوظ ہے۔ گروپ کی پندرھویں سورہ ـــــ سورۂ نور ـــــ بظاہر الگ نظر آتی ہے لیکن اس کی حیثیت، جیسا کہ ہم سورہ کی تفسیر میں واضح کریں گے، سورۂ مومنون کے تکملہ اور تتمہ کی ہے۔ سورۂ مومنون میں اہل ایمان کو دنیا اور آخرت دونوں کی فلاح کی جو بشارت دی گئی ہے وہ اس خاص اخلاق و کردار کے ساتھ مشروط ہے جو ایمان کا لازمی مقتضی ہے۔ سورۂ نور میں اخلاق و کردار کو مزید واضح فرمایا گیا ہے جس سے 'خبیثون' اور 'خبیثات' کے کافرانہ معاشرہ کے مقابل میں 'طیبون' اور 'طیبات' کا مومنانہ معاشرہ پوری آب و تاب کے ساتھ نگاہوں کے سامنے آگیا ہے اور اس معاشرہ کے لیے اللہ تعالیٰ کا جو وعدہ ہے وہ بھی اس میں نہایت واضح اور قطعی الفاظ میں بیان ہوا ہے۔ چنانچہ فرمایا ہے۔

سورۂ نور کی حیثیت

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ	تم میں سے جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے عمل
وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ	صالح کیا ان سے اللہ کا وعدہ ہے کہ وہ ان کو
فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ	زمین میں خلافت بخشے گا جس طرح اس نے ان
مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ	لوگوں کو خلافت بخشی جو ان سے پہلے گزرے اور
دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَ	ان کے اس دین کو ان کے لیے مستحکم کرے گا جس کو اس
لَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ	نے پسند فرمایا اور ان کی اس خوف کی حالت کو امن
اَمْنًا (نور - ۵۵)	سے بدل دے گا۔

اس گروپ کی سورتوں میں سے سورۂ حج کو بعض لوگوں نے مدنی قرار دیا ہے لیکن یہ رائے صحیح نہیں ہے۔ سورۂ حج گروپ کی آخری سورتیں چونکہ ہجرت کے بالکل قریب زمانے کی ہیں اس وجہ سے ان میں کہیں کہیں مدنی دور کی ملی ہے

جھلک آگئی ہے۔ لیکن یہ سورتیں اپنے مزاج اور مطالب کے اعتبار سے سب مکی ہیں۔ سورہ حج کی بعض آیتیں مدنی دور سے تعلق رکھنے والی ضرور ہیں لیکن سورہ بحیثیت مجموعی، جیسا کہ ہم اس کی تفسیر میں واضح کریں گے، مکی ہے۔ کسی مکی سورہ میں مدنی دور کی بعض آیتیں بطور توضیح یا تکمیل آجانے سے پوری سورہ پر مدنی ہونے کا حکم نہیں لگایا جا سکتا۔ ایسی سورتیں قرآن میں بہت ہیں جن میں مدنی دور کی آیات شامل ہیں لیکن یہ سورتیں اپنے بنیادی مطالب اور اپنے مزاج کے اعتبار سے مکی ہی قرار دی گئی ہیں۔

ان تمام سورتوں میں قدر مشترک

اس پورے گروپ کی تلاوت بار بار تدبر کے ساتھ کیجیے تو آپ نہایت واضح طور پر محسوس کریں گے کہ گروپ کی تمام سورتوں میں مشترک حقیقت، جو مختلف اسلوبوں اور پہلوؤں سے واضح فرمائی گئی ہے، یہ ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت سے حق و باطل کے درمیان جو کشمکش برپا ہو چکی ہے وہ بالآخر پیغمبرؐ اور اہل ایمان کی کامیابی و فتحمندی اور قریش کی ذلت و ہزیمت پر منتہی ہوگی۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہیے کہ اس میں قریش کے لیے انذار اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہؓ کے لیے بشارت ہے۔ قریش پر عقل و فطرت اور آفاق و انفس کے دلائل اور تاریخ و نظام کائنات کے شواہد سے یہ بات واضح کی گئی ہے کہ جو حق تمہارے پاس آچکا ہے۔ اگر اس کی مخالفت میں تمہاری یہی روش قائم رہی تو بہت جلد وہ وقت آرہا ہے جب تم اس کا انجام بد اپنی آنکھوں سے دیکھ لوگے۔ دنیا میں تم سے پہلے جن قوموں نے اپنے رسولوں کی تکذیب کی ہے جو حشر ان کا ہوا ہے اور جن کے عبرت انگیز آثار تمہارے اپنے ملک میں موجود ہیں، وہی حشر تمہارا بھی ہونا ہے۔

اسی طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہؓ کو صبر و استقامت اور تقویٰ کی تلقین فرمائی گئی ہے کہ جس حق کو لے کر تم اٹھے ہو انجام کار کی کامیابی اور فیروزمندی اسی کا حصہ ہے۔ آفاق و انفس اور تاریخ اقوام و ملل کے دلائل و شواہد سب تمہارے ہی حق میں ہیں۔ البتہ سنت الٰہی یہ ہے کہ حق کو غلبہ اور کامیابی کی منزل تک پہنچنے کے لیے آزمائش کے مختلف مرحلوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ ان مرحلوں سے لازماً تمہیں بھی گزرنا ہے۔ اگر یہ مرحلے تم نے عزیمت و استقامت کے ساتھ طے کر لیے تو دنیا اور آخرت دونوں میں کامیابی تمہارا ہی حصہ ہے۔ يُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ وَيُضِلُّ اللّٰهُ الظّٰلِمِيْنَ۔ (ابراہیم - ۲۷)

سورہ کا عمود اور گروپ کی دوسری سورتوں میں اس کے مؤیدات

یہ پورے گروپ پر ایک اجمالی نظر ہوئی۔ اب ہم گروپ کی ایک ایک سورہ کو الگ الگ لے کر اس کی تفسیر کریں گے۔ گروپ کی پہلی سورہ، سورہ یونس ہے۔ ہم اپنے طریقہ کے مطابق پہلے اس کا عمود متعین کر کے اس کے مطالب کا تجزیہ کریں گے، اس کے بعد ایک ایک آیت کی تفسیر کریں گے۔ وَمَا تَوْفِيْقِيْٓ اِلَّا بِاللّٰهِ۔

ب - سورہ کا عمود

اس سورہ کا عمود نہایت جامع الفاظ میں اس کی دوسری ہی آیت سے واضح ہو رہا ہے۔ فرمایا ہے۔

أَنْ أَنذِرِ النَّاسَ وَبَشِّرِ الَّذِينَ آمَنُوا أَنَّ لَهُمْ قَدَمَ صِدْقٍ عِندَ رَبِّهِمْ ۗ قَالَ الْكَافِرُونَ إِنَّ هَٰذَا لَسَاحِرٌ مُّبِينٌ ۝ (۲-یونس)

کہ لوگوں کو آگاہ کر دو اور اہل ایمان کو بشارت پہنچا دو کہ ان کے رب کے پاس ان کے لیے بڑی پایگاہ ہے کافروں نے کہا یہ تو کھلا ہوا جادوگر ہے۔

سورۂ ہود میں اسی حقیقت کو یوں واضح فرمایا ہے۔

فَاصْبِرْ ۖ إِنَّ الْعَاقِبَةَ لِلْمُتَّقِينَ ۝ (۴۹-ھود)

پس ثابت قدم رہو۔ انجام کار کی کامیابی متقین ہی کے لیے ہے۔

سورۂ یوسف میں ارشاد ہے۔

إِنَّهُ مَن يَتَّقِ وَيَصْبِرْ فَإِنَّ اللَّهَ لَا يُضِيعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِينَ ۝ (۹۰-یوسف)

بے شک جو تقویٰ اختیار کریں گے اور ثابت قدم رہیں گے تو اللہ ایسے خوب کاروں کے اجر کو ضائع نہیں کرے گا۔

سورۂ رعد میں اس صبر و تقویٰ کی کسی قدر تفصیل بھی آگئی ہے۔

وَالَّذِينَ صَبَرُوا ابْتِغَاءَ وَجْهِ رَبِّهِمْ وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ وَأَنفَقُوا مِمَّا رَزَقْنَاهُمْ سِرًّا وَعَلَانِيَةً وَيَدْرَءُونَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ أُولَٰئِكَ لَهُمْ عُقْبَى الدَّارِ ۝ (۲۲-رعد)

اور جو لوگ اپنے رب کی رضا جوئی میں جمے رہے اور نماز کا اہتمام کیا اور جو کچھ ہم نے ان کو رزق بخشا اس میں سے چھپے اور کھلے خرچ کیا اور برائی کو بھلائی سے دفع کرتے رہے وہی لوگ ہیں جن کے لیے دار آخرت کی کامیابی ہے۔

سورۂ ابراہیم میں اس کلمۂ توحید کی طرف بھی اشارہ ہے جو دنیا اور آخرت دونوں میں اہل ایمان کے ثبات قدم کا ضامن ہے۔

يُثَبِّتُ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَفِي الْآخِرَةِ ۖ وَيُضِلُّ اللَّهُ الظَّالِمِينَ ۚ (۲۷-ابراھیم)

اللہ اہل ایمان کو دنیا اور آخرت میں قول محکم کی بدولت ثبات قدم بخشے گا اور ظالموں کو نامراد کر دے گا۔

سورۂ نحل میں ہے۔

لِّلَّذِينَ أَحْسَنُوا فِي هَٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةٌ ۚ وَلَدَارُ الْآخِرَةِ خَيْرٌ ۚ وَلَنِعْمَ دَارُ الْمُتَّقِينَ (۳۰-نحل)

جن لوگوں نے خوب کاری اختیار کی ان کے لیے اس دنیا میں بھی اچھا صلہ ہے اور آخرت کا گھر اس سے کہیں بہتر ہے اور کیا ہی اچھا ہے متقین کا گھر۔

سورۂ بنی اسرائیل میں ہے کہ سیدھی راہ قرآن کی بتائی ہوئی راہ ہے اور جن لوگوں نے یہ راہ اختیار کر لی ہے بس دنیا اور آخرت کی فلاح کی بشارت انہی کے لیے ہے۔

إِنَّ هَٰذَا الْقُرْآنَ يَهْدِي لِلَّتِي هِيَ أَقْوَمُ وَيُبَشِّرُ الْمُؤْمِنِينَ الَّذِينَ يَعْمَلُونَ الصَّالِحَاتِ أَنَّ لَهُمْ أَجْرًا كَبِيرًا وَأَنَّ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ أَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابًا أَلِيمًا (۹-۱۰ بنی اسرائیل)

بے شک یہ قرآن اس رستہ کی طرف رہنمائی کر رہا ہے جو بالکل سیدھا ہے اور ان مومنین کو جو نیک عمل کر رہے ہیں ایک اجر عظیم کی بشارت دے رہا ہے اور جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے ان کے لیے ہم نے ایک دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔

سورۂ انبیاء میں ہے:۔

وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُورِ مِن بَعْدِ الذِّكْرِ أَنَّ الْأَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصَّالِحُونَ (۱۰۵-انبیاء)

اور ہم نے زبور میں یاددہانی کے بعد یہ لکھ دیا ہے کہ زمین کے وارث میرے صالح بندے ہوں گے۔

گروپ کی آخری سورہ — سورۂ نور — میں یہ بشارت واضح سے واضح تر ہو گئی ہے۔

وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِينَهُمُ الَّذِي ارْتَضَىٰ لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُم مِّن بَعْدِ خَوْفِهِمْ أَمْنًا (۵۵-نور)

تم میں سے جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے عمل صالح کیے ان سے اللہ کا وعدہ ہے کہ وہ ان کو زمین میں خلافت عطا فرمائے گا جس طرح ان لوگوں کو خلافت عطا فرمائی جو ان سے پہلے گزرے اور ان کے اس دین کو مستحکم کرے گا جس کو ان کے لیے پسند فرمایا اور ان کی اس خوف کی حالت کو امن سے بدل دے گا۔

ان آیات کو نقل کرنے سے مقصود سورۂ یونس اور اس گروپ کی دوسری سورتوں کے عام مزاج سے فی الجملہ قارئین کو آشنا کر دینا ہے۔ ہر سورہ کا عمود اور بحث و استدلال میں اس کا صحیح رُخ مطالب کے تجزیہ سے سامنے آئے گا۔ اب ہم سورۂ یونس کے مطالب کا تجزیہ پیش کرتے ہیں تاکہ پوری سورہ بیک نظر سامنے آجائے۔

ج۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

(۱-۲) قریش کے حال پر اظہارِ افسوس کہ یہ پرحکمت کتاب کی آیات ہیں جو اللہ تعالیٰ نے انہی میں سے ایک شخص پر اتاری ہیں، حق تھا کہ وہ اس کتاب کی قدر کرتے، یہ منکرین کو ان کے انجام بد سے آگاہ کرنے والی اور مومنین کو اللہ کے ہاں مرتبہ بلند کی بشارت دینے والی ہے لیکن ان متکبرین پر یہ بات شاق گزر رہی ہے کہ انہی میں کا ایک آدمی ان کے پاس بشیر و نذیر بن کر آئے چنانچہ وہ اس کو جادوگر قرار دیتے ہیں۔

(۳-۴) اللہ ہی سب کا رب ہے۔ اسی نے آسمان و زمین بنائے۔ وہی تمام آسمان و زمین کا انتظام فرما رہا ہے۔ اس کے ہاں اس کے اذن کے بغیر کسی کے لیے سفارش کی گنجائش نہیں۔ سب اسی کی طرف لوٹیں گے

اور وہ ایمان لانے والوں اور عمل صالح کرنے والوں کو عدل کے ساتھ بھرپور صلہ دے گا اور کفار کے لیے دوزخ کا عذاب ہے۔

(۵-۱۰) آفاق کی شہادت کہ یہ کائنات کسی کھلنڈرے کا کھیل تماشہ نہیں ہے جو غور کرنے والے ہیں وہ اس حقیقت پر ایمان رکھتے ہیں کہ اس کے بعد ایک روز عدل ظہور میں آنے والا ہے۔ صرف وہی لوگ اس حقیقت سے غافل ہیں جو اللہ کی نشانیوں پر غور نہیں کرتے اور اسی دنیا کی دلچسپیوں میں مگن ہیں۔ ایسے لوگوں کا ٹھکانا جہنم ہے۔ اللہ ایمان اور عمل صالح والوں کو ان کے ایمان کی بدولت نعمت کے باغوں میں داخل کرے گا جہاں وہ اپنی کامیابی پر شاداں ایک دوسرے کو مبارک سلامت کا پیغام دیں گے اور اللہ کی نعمتوں کی تکمیل پر ان کی زبانوں پر حمد و شکر کے ترانے ہوں گے۔

(۱۱-۱۲) اللہ تعالیٰ سرکش لوگوں کو اس دنیا میں جو ڈھیل دیتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ رحمت کرنے میں تو جلدی کرتا ہے لیکن قہر کرنے میں جلدی نہیں کرتا۔ اگر وہ رحمت کی طرح قہر کرنے میں بھی جلدی کرنے والا ہوتا تو ان سرکشوں کا قصہ کب کا تمام ہو چکا ہوتا۔ لیکن ایسا نہیں ہے اس وجہ سے وہ ایسے لوگوں کو موقع دیتا ہے کہ وہ اپنی سرکشی میں اچھی طرح بھٹک لیں اور اپنے اوپر اللہ کی حجت تمام کرالیں۔ ان لوگوں کی یہ سرکشی اور ان کی یہ اکڑ ان کے تھڑدلے پن کا ثبوت ہے۔ انسان کا حال یہ ہے کہ ذرا ہم پکڑیں تو لیٹے، بیٹھے، کھڑے ہمارا وظیفہ پڑھنا شروع کر دیتا ہے لیکن ذرا ڈھیل دے دیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نہ یہ کبھی ہماری پکڑ میں آیا تھا اور نہ کبھی اس نے ہمارے آگے کوئی فریاد کی تھی۔

(۱۳-۱۴) پچھلے رسولوں اور ان کی امتوں کا حوالہ کہ آخر یہ لوگ ان کے حالات سے سبق کیوں نہیں لیتے؟ اللہ تعالیٰ نے انھی کی جگہ ان کو دی اور اس لیے دی کہ دیکھے یہ کیسا عمل کرتے ہیں تو آخر ان کے ساتھ اس سے مختلف معاملہ کیوں ہو گا جو ان کے ساتھ ہوا۔

(۱۵-۱۹) توحید بیزاری کے سبب سے قریش کا یہ مطالبہ کہ اگر ہم کو ماننا ہے تو اس قرآن کے سوا کوئی اور قرآن لاؤ یا کم از کم اس میں کوئی ایسی ترمیم کرو کہ یہ ہمارے لیے گوارا ہو سکے۔ پیغمبر کی طرف سے اس کا جواب کہ میں تو تمھارے سامنے اللہ کی وحی پیش کرتا ہوں۔ مجھے اس میں کسی تبدیلی یا ترمیم کا کوئی اختیار نہیں ہے تم جانتے ہو کہ میں تمھارے اندر اپنی زندگی کا ایک طویل حصہ گزار چکا ہوں اور اس دوران میں کوئی دعویٰ یا دعوت لے کر نہیں اٹھا۔ اب جو میں تمھارے سامنے آیا ہوں تو اپنی خواہش سے نہیں آیا ہوں بلکہ خدا کے حکم کی تعمیل میں آیا ہوں۔ اگر خدا کا حکم نہ ہوتا تو میں ہرگز تمھارے سامنے یہ چیز پیش نہ کرتا ــــ ساتھ ہی ان کی توحید بیزاری پر یہ تنبیہ کہ یہ جن چیزوں کی پرستش کر رہے ہیں اور سمجھ بیٹھے ہیں کہ یہ خدا سے ان کے لیے سفارش کرتی ہیں ان کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ یہ سب ان کے ذہن کے مفروضات ہیں، خدا کے علم میں ان کا کوئی وجود نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ اس قسم کی شرکتوں سے پاک اور ارفع ہے۔ اس نے لوگوں کو اپنی طرف سے ایک ہی دین توحید دیا

لیکن لوگوں نے اس میں اختلاف پیدا کیا اور اگر اللہ نے اپنے فیصلہ کا ایک دن نہ مقرر کیا ہوتا تو آج ہی اس جھگڑے کا فیصلہ ہو جاتا۔

(۲۰-۲۳) کفارِ قریش کی طرف سے نشانیٔ عذاب کا مطالبہ اور اس کا جواب کہ نشانیٔ عذاب دکھانا پیغمبر کا کام نہیں ہے۔ اس کا تعلق اللہ تعالیٰ سے ہے۔ صرف وہی جانتا ہے کہ کوئی نشانی ظاہر ہوگی یا نہیں اور ظاہر ہوگی تو کب ہوگی۔ یہ محض انسان کی رعونت ہے کہ وہ کسی عذاب کا مطالبہ کرتا ہے حالانکہ تھڑدلے پن کا حال یہ ہے کہ جب ذرا خدا کی گرفت میں آجاتا ہے تو اللہ اللہ پکارنے لگتا ہے اور عہد کرتا ہے کہ اس آفت سے جان چھوٹ جائے تو زندگی اپنے رب کا شکرگزار بن کر گزاروں گا لیکن جب اللہ تعالیٰ اس کو نجات دے دیتا ہے تو پھر وہ بغاوت اور نافرمانی کی وہی زندگی اختیار کر لیتا ہے۔

(۲۴-۲۷) اس دنیا کی زندگی کی بے ثباتی کی تمثیل کہ کفار کو اس وقت جو زور اور اقتدار حاصل ہے وہ سمجھتے ہیں کہ اس میں کوئی رخنہ کہاں سے پیدا ہو جائے گا۔ حالانکہ آئے دن اس دنیا میں یہ شاہدہ ہوتا رہتا ہے کہ بارش ہوتی ہے، زمین لہلہا اٹھتی ہے۔ باغ اور کھیت سب مالامال ہو جاتے ہیں، زمینوں اور باغوں کے مالک یہ سمجھتے ہیں کہ بھلا اب ہمیں ان سے کون محروم کر سکتا ہے کہ دفعتہً رات میں یا دن میں کسی وقت عذاب الٰہی کا کوئی جھونکا آتا ہے اور وہ سب کو آناً فاناً بے نشان کر کے رکھ دیتا ہے۔ سلامتی کا گھر صرف اللہ کے پاس ہے اور وہ لوگوں کو اسی کی طرف دعوت دیتا ہے لیکن اس کی راہ صرف صاحب توفیق ہی اختیار کرتے ہیں اور یہی لوگ ہیں جن کے چہرے آخرت میں روشن ہوں گے۔ رہے یہ لوگ جو اسی دنیا کی زندگی میں مگن ہیں خدا سے ان کو کوئی بچانے والا نہ ہوگا اور ان کے چہروں کا یہ حال ہوگا کہ گویا ان پر شب دیجور کا کوئی ٹکڑا اڑھا دیا گیا ہے۔

(۲۸-۳۶) کفار اپنے جن معبودوں پر تکیہ کیے بیٹھے ہیں آخرت میں ان کے اور ان کے معبودوں کے درمیان جدائی ہو جائے گی۔ ان کے معبود ان سے اظہارِ بیزاری کریں گے کہ ہمیں کچھ خبر نہیں کہ تم ہماری عبادت کر رہے تھے۔ اس دن ہر شخص کو صرف اپنے اعمال سے سابقہ پیش آئے گا اور ہر ایک کی پیشی معبود حقیقی کے سامنے ہوگی۔ کفار سے یہ مطالبہ کہ جب تم خالق، رازق، مالک اور زندگی اور موت پر اختیار رکھنے والا خدا ہی کو مانتے ہو تو اسی کو رب بھی مانو، اس واضح حق کے بعد اگر تم خدا کے سوا کسی اور کو بھی رب مانتے ہو تو یہ صریح ضلالت ہوئی آخر اس دنیا کی خلق و تدبیر اور تمہاری ہدایت و رہنمائی میں تمہارے ان فرضی معبودوں کا کیا حصہ ہے جس کی بنا پر تم ان کو خدا کے حقوق میں شریک بنا بیٹھے ہو؟ یہ تو محض تمہاری اٹکل پچو باتیں ہیں جو حق کے مقابل میں تمہارے کچھ کام آنے والی نہیں ہیں۔

(۳۷-۴۴) یہ قرآن کوئی من گھڑت چیز نہیں ہے۔ اس کی پیشین گوئیاں پچھلے صحیفوں میں موجود ہیں اور یہ انہی پیشین گوئیوں کا مصداق اور انہی اشارات کی تفصیل ہے۔ اس کے خدائی کتاب ہونے میں کسی شک کی

گنجائش نہیں ہے۔ اگر کفار کہتے ہیں کہ یہ تمھاری گھڑی ہوئی چیز ہے جس کو تم جھوٹ موٹ خدا کی طرف منسوب کر رہے ہو تو ان سے کہو کہ یہ اس کی مانند کوئی ایک ہی سورہ لا کر دکھائیں اور اس کام میں اپنے معبودوں کی مدد بھی اگر حاصل کر سکیں تو وہ بھی حاصل کرنے کی کوشش کریں۔ اصل یہ ہے کہ یہ ایک ایسی چیز کا انکار کر رہے ہیں جس کی حقیقت ان کے سامنے ابھی نہیں آئی ہے اور اس معاملے میں یہ پچھلے مکذبین کی روش کی تقلید کر رہے ہیں تو صبر کرو اور دیکھو کہ ان کا انجام کیا ہوتا ہے ـــ پیغمبرؐ کو تسلی کہ جن کے اندر صلاحیت ہے وہ اس کتاب پر ایمان لا رہے ہیں، رہے وہ لوگ جو اندھے بہرے بن چکے ہیں تو نہ وہ تمھاری بات سنیں گے نہ تمھارے اوپر ان کی کوئی ذمہ داری ہے۔ تم ان سے اپنی برأت کا اعلان کر دو۔ یہ خود اپنے اعمال کی بدولت اس حالت کو پہنچے ہیں۔ خدا نے ان کے ساتھ کوئی ناانصافی نہیں کی ہے۔

(۴۵-۵۸) جس عذاب اور روزِ آخرت کی ان کو دھمکی دی جا رہی ہے اس کے لیے یہ جلدی مچائے ہوئے ہیں حالانکہ جب وہ آئے گا تو یہ محسوس کریں گے کہ زندگی کی مہلت ایک ساعت سے زیادہ نہیں تھی۔ یہ اللہ ہی کے علم میں ہے کہ یہ عذاب کب آئے گا۔ ہو سکتا ہے کہ یہ تمھاری موجودگی ہی میں ان کو دکھا دیا جائے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تمھاری وفات کے بعد یہ اس کا مزا چکھیں۔ لیکن یہ ایک اٹل حقیقت ہے کہ جب کسی قوم کے پاس اس کا رسول آ جاتا ہے تو اس قوم کا فیصلہ لازماً ہو جایا کرتا ہے۔ اگر یہ تم سے اس دھمکی کے ظہور کا وقت پوچھتے ہیں تو تم کہہ دو کہ میرے پاس نہ غیب کا علم ہے اور نہ میں کسی نفع و ضرر پر اختیار رکھتا ہوں۔ بس یہ حقیقت جانتا ہوں کہ ہر امت کے لیے ایک پیمانہ مقرر ہے، جب وہ پیمانہ بھر جائے گا تو پھر اس کو ایک منٹ کی بھی مہلت نہیں ملے گی۔ یہ اگر اتنی جلدی مچاتے ہوئے ہیں تو ان سے پوچھو کہ خدا کے عذاب کا مقابلہ کرنے کے لیے انھوں نے کیا سامان کر رکھا ہے؟ اس وقت تو ان کا ایمان لانا بھی بالکل بے سود ہو گا؟ اس وقت تو حال یہ ہو گا کہ ہر جان اس سے چھوٹنے کے لیے ساری دنیا بھی اس کے ہاتھ آ جائے تو اس کو فدیہ میں دینے کے لیے تیار ہو جائے گی تو آخر یہ اپنی شامت بلانے کے درپے کیوں ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی اس عظیم نعمت و رحمت کو اختیار کیوں نہیں کرتے جو ان پر قرآن کی شکل میں نازل ہوئی ہے اور جس کے آگے اس دنیا کے تمام زخارف بالکل ہیچ ہیں!

(۵۹-۷۰) جن لوگوں نے بے دلیل خدا کے شریک اور سفارشی بنا رکھے ہیں کیا ان کو خدا سے ناانصافی کا اندیشہ ہے؟ خدا تو اپنے بندوں پر بڑا فضل کرنے والا ہے۔ البتہ لوگ ناشکری کرتے اور اس کی دی ہوئی نعمتوں کو دوسروں کی نسبت سے حلال و حرام ٹھہراتے ہیں۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہؓ کو تسلی کہ خدا ہر قدم پر تمھارے ساتھ ہے۔ جو اللہ کے اولیا ہیں ان کے لیے کوئی خوف اور غم نہیں ہے۔ دنیا کی زندگی میں بھی ان کے لیے بشارت ہے اور آخرت میں بھی ان کے لیے بشارت ہے اور خدا کے وعدے اٹل ہیں۔ عزت صرف اللہ کے لیے ہے، جو لوگ اللہ کے سوا دوسروں کی پوجا کرتے ہیں وہ صرف گمان کی پوجا

کر رہے ہیں۔ شب و روز سب اللہ ہی کے بنائے ہوئے ہیں اور زمین و آسمان میں جو کچھ ہے سب اللہ ہی کا ہے۔ اللہ سب سے مستغنی ہے۔ اس کا کوئی ساجھی اور شریک نہیں۔ جو لوگ اپنے جی سے خدا کے شریک ٹھہراتے ہیں ان کے پاس کوئی دلیل نہیں۔ اور وہ آخرت میں عذاب شدید سے دوچار ہوں گے۔

(۷۱-۹۳) اوپر کے بیان کردہ حقائق کی تائید میں تاریخ کی شہادت۔ حضرت نوحؑ سے لے کر حضرت موسیٰؑ تک کے انبیاء اور ان کی قوموں کی سرگزشت کا اجمالی حوالہ، پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہؓ کو یہ تلقین کہ جس طرح کے حالات تم سے پہلے انبیاء اور ان کے ساتھیوں کو پیش آچکے ہیں اسی طرح کے حالات تمہاری قوم کی طرف سے تم کو پیش آرہے ہیں۔ پس اگر تم نے صبر اور توکل کی وہی روش اختیار کی جو تمہارے پیش رو انبیاء اور ان کے صحابہؓ نے اختیار کی اور اس پر جمے رہے تو تمہیں اللہ تعالیٰ دنیا اور آخرت دونوں جہان میں سرخرو کرے گا اور تمہارے مخالفوں کا وہی حشر ہوگا جو نوحؑ اور موسیٰؑ کے مخالفوں کا ہو چکا ہے۔

(۹۴-۱۰۳) پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے مسلمانوں کو یہ تلقین کہ مخالفوں کا غوغا تمہیں اس کتاب کے باب میں کسی شک میں نہ ڈالے جو تم پر اللہ نے اتاری ہے۔ یہ بالکل حق ہے اور جو اچھے اہل کتاب ہیں وہ بھی اس کے حق ہونے کے گواہ ہیں۔ جو لوگ اس کو جھٹلا رہے ہیں وہ اپنے اعمال کے سبب سے خدا کے قانون کی زد میں آچکے ہیں، ان کو خواہ کتنی ہی نشانیاں دکھا دی جائیں وہ اس وقت تک ایمان لانے والے نہیں ہیں جب تک فیصلہ کن عذاب نہ دیکھ لیں۔ کوئی قوم جب قانونِ الٰہی کی زد میں آجاتی ہے تو اس کو ایمان نصیب نہیں ہوا کرتا۔ صرف قوم یونس ایک ایسی قوم ہے جو عذابِ الٰہی کی زد میں آتے آتے بچ گئی۔ عذاب بس آنے ہی کو تھا کہ وہ ایمان لائی اور اللہ نے اس کو بچا لیا۔ اہلِ ایمان کو یہ بات پیشِ نظر رکھنی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ یہ چاہتا ہے کہ لوگ عقل اور سمجھ سے کام لے کر ایمان کی راہ اختیار کریں نہ کہ عذاب کی نشانیوں سے مجبور ہو کر۔ اگر اللہ کو مجبورانہ ایمان مطلوب ہوتا تو اس کے لیے کیا مشکل تھا کہ وہ سب کو ایمان کی ڈگر پر ہانک دیتا؛ لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔ ایمان کی توفیق صرف ان لوگوں کو نصیب ہوتی ہے جو عقل و بصیرت سے کام لیتے ہیں۔ جو لوگ اپنے دلوں پر نجاست کے انبار جمع کر لیتے ہیں ان کے لیے ایمان کی راہ نہیں کھلتی۔ ایسے لوگوں کو بڑی سے بڑی نشانی بھی کچھ نفع نہیں پہنچاتی۔ یہ لوگ تو بس اس طرح کے فیصلہ کن دن کے انتظار میں ہیں جس طرح کے فیصلہ کن دن پچھلی قوموں کو پیش آچکے ہیں۔ ان سے کہو کہ اگر تم اسی کے انتظار میں ہو تو انتظار کرو میں بھی اب تمہارے لیے اسی کے انتظار میں ہوں۔

(۱۰۴-۱۰۹) پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے مخالفین کے سامنے ایک فیصلہ کن اعلان کہ اگر کسی کو میرے دین کے بارے میں شک ہو تو وہ اچھی طرح کان کھول کر سن لے کہ جن چیزوں کو تم پوجتے ہو میں ان کو نہیں پوجتا، میں صرف اللہ واحد کی عبادت کرتا ہوں۔ اسی توحید پر آپ کو جمے رہنے کی تاکید، اس لیے کہ نفع و ضرر صرف اللہ ہی کے اختیار میں ہے، دوسرا نہ کچھ بنا سکتا، نہ بگاڑ سکتا — پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی

زبان سے اعلان کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے حق آچکا ہے اور وہ میں نے لوگوں کو پہنچا دیا ہے۔ اب جو ہدایت اختیار کرے گا تو اس کا نفع اس کو پہنچے گا اور جو گمراہی کی راہ اختیار کرے گا تو اس کا انجام خود بھگتے گا، میں کسی کے ایمان کا ذمہ دار نہیں ہوں ـــــ آخر میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ہدایت کہ وحی الٰہی کی پیروی کرو، اسی پر جمے رہو، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اپنا فیصلہ صادر فرما دے اور وہ بہترین فیصلہ کرنے والا ہے۔

سُوْرَةُ يُوْنُس (١٠)

مَكِّيَّةٌ ——— اٰيَاتُهَا ١٠٩

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

الٓرٰ ۚ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْحَكِيْمِ (١) اَكَانَ لِلنَّاسِ عَجَبًا اَنْ المنزل ٣ آیات
اَوْحَيْنَآ اِلٰى رَجُلٍ مِّنْهُمْ اَنْ اَنْذِرِ النَّاسَ وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا ١-١٠
اَنَّ لَهُمْ قَدَمَ صِدْقٍ عِنْدَ رَبِّهِمْ ؔ قَالَ الْكٰفِرُوْنَ اِنَّ هٰذَا لَسٰحِرٌ وقف النبی صلی اللہ علیہ وسلم
مُّبِيْنٌ (٢) اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِيْ
سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ يُدَبِّرُ الْاَمْرَ ؕ مَا مِنْ شَفِيْعٍ
اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ اِذْنِهٖ ؕ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ ؕ اَفَلَا
تَذَكَّرُوْنَ (٣) اِلَيْهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيْعًا ؕ وَعْدَ اللّٰهِ حَقًّا ؕ اِنَّهٗ يَبْدَؤُا
الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ لِيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ بِالْقِسْطِ ؕ
وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَهُمْ شَرَابٌ مِّنْ حَمِيْمٍ وَّعَذَابٌ اَلِيْمٌۢ بِمَا كَانُوْا
يَكْفُرُوْنَ (٤) هُوَ الَّذِيْ جَعَلَ الشَّمْسَ ضِيَآءً وَّالْقَمَرَ نُوْرًا وَّقَدَّرَهٗ
مَنَازِلَ لِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِيْنَ وَالْحِسَابَ ؕ مَا خَلَقَ اللّٰهُ ذٰلِكَ
اِلَّا بِالْحَقِّ ۚ يُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ (٥) اِنَّ فِي اخْتِلَافِ
الَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَمَا خَلَقَ اللّٰهُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ

يَتَّقُوْنَ ۝٦ اِنَّ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا وَرَضُوْا بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا
وَاطْمَاَنُّوْا بِهَا وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنْ اٰيٰتِنَا غٰفِلُوْنَ ۝٧ اُولٰٓئِكَ مَاْوٰىهُمُ
النَّارُ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ۝٨ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ
يَهْدِيْهِمْ رَبُّهُمْ بِاِيْمَانِهِمْ ۚ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهِمُ الْاَنْهٰرُ فِيْ جَنّٰتِ
النَّعِيْمِ ۝٩ دَعْوٰىهُمْ فِيْهَا سُبْحٰنَكَ اللّٰهُمَّ وَتَحِيَّتُهُمْ فِيْهَا سَلٰمٌ ۚ
ع ۱ وَاٰخِرُ دَعْوٰىهُمْ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝١٠

ترجمۂ آیات ۱-۱۰

یہ الف، لام، را ہے۔ یہ پرحکمت کتاب کی آیات ہیں۔ کیا لوگوں کو اس بات پر حیرانی ہے کہ ہم نے انہی میں سے ایک شخص پر وحی کی کہ لوگوں کو ہوشیار کر دو اور اہل ایمان کو بشارت پہنچا دو کہ ان کے لیے ان کے رب کے پاس بڑا مرتبہ ہے۔ کافروں نے کہا، بے شک یہ ایک کھلا ہوا جادوگر ہے۔ ۱-۲

بے شک تمہارا رب وہی اللہ ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ ادوار میں پیدا کیا، پھر وہ معاملات کا انتظام سنبھالے عرش پر متمکن ہوا۔ اس کے ہاں اس کی اجازت کے بغیر کوئی سفارشی نہیں۔ یہی اللہ تمہارا رب ہے تو اسی کی بندگی کرو، کیا تم سوچتے نہیں! اسی کی طرف تم سب کا لوٹنا ہے۔ یہ اللہ کا پکا وعدہ ہے۔ بے شک وہی خلق کا آغاز کرتا ہے پھر وہی اس کا اعادہ کرے گا تاکہ جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے نیک کام کیے ان کو عدل کے ساتھ بدلہ دے اور جنھوں نے کفر کیا ان کے لیے ان کے کفر کی پاداش میں کھولتا پانی اور دردناک عذاب ہے۔ وہی ہے جس نے سورج کو تاباں اور چاند کو نور بنایا اور اس کے لیے منزلیں ٹھہرا دیں تاکہ تم سالوں کا شمار اور حساب معلوم کر سکو۔ اللہ نے یہ کارخانہ

بے مقصد نہیں بنایا ہے۔ وہ اپنی نشانیوں کی وضاحت کرتا ہے ان لوگوں کے لیے جو جاننا چاہیں۔ بے شک رات اور دن کی آمد و شد اور آسمانوں اور زمین کی مخلوقات میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو ڈریں۔ جو لوگ ہماری ملاقات کے متوقع نہیں ہیں اور اسی دنیا کی زندگی پر قانع اور مطمئن ہیں اور جو ہماری نشانیوں سے غافل ہیں، انہی لوگوں کا ٹھکانا دوزخ ہے ان کے اعمال کی پاداش میں۔ جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے نیک عمل کیے اللہ ان کے ایمان کی بدولت ان کو ان کی منزل پر پہنچائے گا، ان کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی، نعمت کے باغوں میں۔ اس میں ان کا ترانہ ہوگا اے اللہ تو پاک ہے۔ اور اس میں ان کی آپس کی تحیت سلام ہوگی اور ان کا آخری کلمہ الحمد للہ رب العالمین (شکر ہے اللہ رب العالمین کے لیے) ہوگا۔ ۳-۱۰

۱۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

الٓرٰ قف تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْحَكِيْمِ ○ اَكَانَ لِلنَّاسِ عَجَبًا اَنْ اَوْحَيْنَآ اِلٰى رَجُلٍ مِّنْهُمْ اَنْ اَنْذِرِ النَّاسَ وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنَّ لَهُمْ قَدَمَ صِدْقٍ عِنْدَ رَبِّهِمْ قَالَ الْكٰفِرُوْنَ اِنَّ هٰذَا لَسٰحِرٌ مُّبِيْنٌ (۱-۲)

کتاب حکیم کا مفہوم

'الٓرٰ' اس سورہ کا قرآنی نام 'الٓرٰ' ہے اور 'تلک' کا اشارہ اسی کی طرف ہے۔ یہ حروف مقطعات ہیں جن پر ایک جامع بحث ہم بقرہ کی تفسیر کے شروع میں کر آئے ہیں کتاب کی صفت 'حکیم' اس بات کی طرف اشارہ کر رہی ہے کہ یہ کتاب اپنے ہر دعوے پر دلیل و حجت سے اس طرح آراستہ ہے کہ اپنی صداقت کی کسوٹی خود اپنے ہی اندر رکھتی ہے، کسی خارجی شہادت کی محتاج نہیں ہے۔ جو لوگ اس کی صداقت کے ثبوت کے لیے کسی شہادت کے طلب گار ہیں وہ خارج کی بجائے خود اس کے اندر اتریں، اگر ان کی عقل سلیم اور فطرت مستقیم ہوگی تو اس کی حکمت خود ان کے ہر شبہے کو صاف کر دے گی۔

اللہ تعالیٰ کا عظیم احسان

'اَكَانَ لِلنَّاسِ عَجَبًا ...... الاٰیۃ' 'الناس' سے مراد قرینہ دلیل ہے کہ یہاں قریش ہیں۔ یعنی جب یہ کتاب بجائے خود حجت و برہان ہے تو مجرد یہ بات اس کے انکار کی کیا دلیل ہوئی کہ اس کی وحی انہی میں سے ایک شخص پر آئی؟ اپنے اندر کے کسی شخص پر اس وحی کا آنا کوئی انکار و استعجاب کی چیز نہیں بلکہ یہ سوچیں تو یہ

اللہ کا ان پر احسان عظیم ہے کہ اس نے ان پر انہی کے اندر کے ایک ایسے شخص کے ذریعہ سے یہ کتاب اتاری جس کے ماضی و حاضر اور جس کے کردار و اخلاق سے وہ اچھی طرح آگاہ بھی ہیں اور جس کے امین و راستباز ہونے کے وہ معترف بھی رہے ہیں؟ کیا یہ بات بہتر ہوتی کہ کوئی غیر ان پر اس حق کی گواہی دیتا یا یہ بہتر ہے کہ اللہ نے انہی کے ایک بہترین فرد کو اس حق کا گواہ بنایا اور اس طرح گویا انہی کی زبان اور انہی کے ضمیر نے ان پر حق کی حجت تمام کی۔ یہ بات بھی کسی پہلو سے معقول نہ ہوتی کہ اس کام کے لیے کوئی فرشتہ یا جن منتخب کیا جاتا۔ انسانوں کے لیے معلم و مرشد اور نمونہ و مثال انسان ہو سکتا ہے نہ کہ فرشتے اور جن۔

کتاب یا حاملِ کتاب کا اصل پیغام

اَنْ اَنْذِرِ النَّاسَ وَبَشِّرِ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا۔ یہ اس کتاب یا حامل کتاب کا اصل پیغام نقل ہوا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ پیغام بھی کوئی استعجاب یا انکار کی چیز نہیں ہے بلکہ ایک حقیقت ہے۔ یہ دنیا کی زندگی یوں ہی ختم ہو جانے والی نہیں ہے بلکہ اس کے بعد ایک ایسا دن آنے والا ہے جس میں سب کو خدا کی طرف لوٹنا ہے اور اس دن وہ لوگ خدا کے ہاں عزت و سرفرازی کا مقام پائیں گے جو اس کتاب پر ایمان لائیں گے اور جو لوگ اس کو جھٹلائیں گے وہ ذلیل و خوار ہو کر جہنم میں پڑیں گے۔ اس حقیقت کے اظہار سے اگر قریش کے متکبرین کے دل کو چوٹ لگتی ہے تو لگے اور وہ حیران ہوتے ہیں تو حیران ہوں لیکن جو حقیقت ہے وہ اس وجہ سے غلط نہیں ہو جائے گی کہ اس سے کسی گروہ کے پندار پر ضرب پڑتی ہے۔

قَدَمَ صِدْقٍ کا مفہوم

'قَدَمَ صِدْقٍ' میں 'صِدْق' کا لفظ، جیسا کہ دوسرے مقام میں ہم واضح کر چکے ہیں، رسوخ و استحکام اور تمکن پر دلیل ہے اس وجہ سے 'قَدَمَ صِدْقٍ' کا مفہوم عزت کا مقام، مرتبۂ بلند، اونچی پائگاہ اور لازوال سرفرازی ہوگا۔ اس آیت میں ایمان لانے والوں کے لیے جو بشارت ہے وہ تو واضح الفاظ میں مذکور ہے لیکن انذار کا پہلو مبہم چھوڑ دیا گیا ہے اس کی وجہ ہمارے نزدیک یہ ہے کہ اس گروپ کی تمام سورتوں میں نمایاں پہلو اہل ایمان کے لیے بشارت ہی کا ہے۔ کفار کے انجام کا پہلو ان میں اصلاً نہیں بلکہ ضمناً اور تبعاً بیان ہوا ہے۔

کفار کے استعجاب و انکار کی تعبیر

قَالَ الْکٰفِرُوْنَ اِنَّ ھٰذَا لَسٰحِرٌ مُّبِیْنٌ۔ یہ کفار کے استعجاب و انکار کی تعبیر ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جب اس پر حکمت کتاب کی آیتیں ان کو سنائی جاتی ہیں تو بجائے اس کے کہ اس کی قدر کریں اور اس پر ایمان لائیں اس کے لانے والے کو یہ کھلا ہوا جادوگر قرار دیتے ہیں۔ یعنی اس کتاب کے زور، اس کے اثر اور اس کی فصاحت و بلاغت کا لوہا تو مانتے ہیں لیکن ان سب چیزوں کو محض الفاظ اور سجع و قافیہ کی صناعی اور پیغمبر کی فصاحت و بلاغت کی شعبدہ بازی کا نتیجہ قرار دیتے ہیں اور اپنے عوام کو یہ باور کراتے ہیں کہ اس کتاب اور اس کے لانے والے کے کلام میں جو تاثیر اور کشش محسوس کرتے ہو یہ نہ سمجھو کہ یہ اس وجہ سے ہے کہ یہ خدا کی طرف سے آئی ہے اور اس میں حکمت کا خزانہ ہے بلکہ جس طرح ایک شعبدہ باز اپنی شعبدہ بازی سے ایک شے کو کچھ سے کچھ بنا کر دکھاتا ہے اسی طرح یہ شخص (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) الفاظ کی شعبدہ گری کا ماہر ہے اور اپنی بات اس طرح پیش کرتا ہے کہ سادہ لوگ اس کے کلام سے مسحور ہو جاتے ہیں۔

انبیاء کو ساحر و کاہن کہنے کا ایک خاص پہلو

یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ حضرات انبیاء علیہم السلام کو کفار جو ساحر قرار دیتے رہے ہیں تو صرف ان کے معجزات کی اہمیت گھٹانے کے لیے نہیں بلکہ یہی حربہ وہ ان کے کلام کو بے وقعت ٹھہرانے کے لیے بھی استعمال کرتے۔ جب دیکھتے کہ ان کے اندر کے سلیم الفطرت لوگ نبی کے پیش کیے ہوئے کلام سے متاثر ہو رہے ہیں تو یہ شگوفہ چھوڑتے کہ یہ تو محض الفاظ کی شعبدہ بازی اور زبان کی جادوگری ہے، اپنے آپ کو اس فریب سے بچاؤ۔ خود قرآن کو سحر کہنے میں بھی یہی مقصد ان کے پیش نظر ہوتا۔ اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو کفار کاہن بھی کہتے تھے اس سے بھی ان کا مقصد یہی ہوتا کہ اپنے عوام کی توجہ قرآن اور پیغمبر سے ہٹائیں کہ یہ کلام کوئی مافوق چیز اور اس کا پیش کرنے والا کوئی مافوق ہستی نہیں ہے۔ جس طرح ہمارے کاہن سجع اور قافیہ کے ساتھ مرصع اسلوب میں اپنا کلام پیش کرتے ہیں اور جس طرح کاہنوں کے کلام میں مستقبل سے متعلق کچھ پیشین گوئیوں کی جھلک ہوتی ہے اسی طرح کی جھلک ان کے کلام میں بھی ہوتی ہے۔ مطلب یہ کہ یہ ہماری جانی پہچانی ہوئی چیزیں ہیں۔ ان کو آسمانی اور خدائی مرتبہ دینے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔

اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ يُدَبِّرُ
الْاَمْرَ ؕ مَا مِنْ شَفِيْعٍ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ اِذْنِهٖ ؕ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ ؕ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ○
اِلَيْهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيْعًا ؕ وَعْدَ اللّٰهِ حَقًّا ؕ اِنَّهٗ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ لِيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا
وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ بِالْقِسْطِ ؕ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَهُمْ شَرَابٌ مِّنْ حَمِيْمٍ وَّعَذَابٌ اَلِيْمٌۢ بِمَا كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ (۳-۴)

مذکورہ بالا انذار و بشارت کی دلیل

اوپر والے ٹکڑے میں جو انذار و بشارت ہے یہ اسی کی دلیل بیان ہو رہی ہے اور مقدمات کی ترتیب اس طرح ہے کہ جس اللہ نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے اور جس کا خالق ہونا تمھیں خود بھی تسلیم ہے، وہی تمھارا رب اور آقا و مولیٰ ہے۔ یہ کس طرح ممکن ہے کہ خالق تو کوئی اور ہو، آقا و مولیٰ کوئی اور بن جائے، اگر تم نے کچھ اور رب بنا کر ان سے کچھ امیدیں باندھ رکھی ہیں تو یہ محض تمھاری حماقت ہے جو عقل و فطرت اور خود تمھارے اپنے مسلّمہ کے خلاف ہے۔ پھر یہ کائنات کسی اتفاقی حادثے کے طور پر ظہور میں نہیں آگئی ہے بلکہ یہ خدائی دنوں کے حساب سے چھ دنوں یا بالفاظ دیگر چھ ادوار میں درجہ بدرجہ ارتقا پذیر ہوئی ہے۔ یہ تدریج و ترتیب اور یہ ارتقا خود شاہد ہے کہ نہ اس کا ظہور کوئی اتفاقی حادثہ ہے نہ یہ کسی کھلنڈرے کا کھیل تماشہ ہے بلکہ یہ نہایت اہتمام سے پیدا کیا ہوا ایک باغایت و بامقصد کارخانہ ہے اور اس کی مقصدیت کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ انسان جو اس کائنات میں خلیفہ کی حیثیت رکھتا ہے یوں ہی شتر بے مہار نہ چھوڑ دیا جائے بلکہ اس کے سامنے ایک ایسا دن آئے جس میں وہ لوگ پورے انصاف کے ساتھ اپنے اعمال کا صلہ پائیں جنھوں نے خالق کائنات کی پسند کے مطابق زندگی بسر کی اور وہ لوگ اپنے جرائم کی سزا بھگتیں جنھوں نے اس دنیا کو کھیل تماشہ سمجھا اور ساری زندگی بطالت میں گزاری۔

خدا عرش حکومت پر متمکن ہے

ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ يُدَبِّرُ الْاَمْرَ۔ یعنی یہ نہ سمجھو کہ خدا دنیا کو پیدا کر کے کسی گوشے میں ایک

خاص شکل علۃ العلل بن کر بیٹھ رہا ہے اور اس دنیا کا سارا انتظام و انصرام اس نے دوسروں کے حوالے کر دیا ہے بلکہ وہ خود عرش حکومت پر متمکن اور صرف متمکن ہی نہیں بلکہ بالفعل تمام معاملات کا انتظام فرما رہا ہے۔ زبور میں یہی حقیقت ان الفاظ میں بیان ہوئی ہے :-

"تو نے تخت پر بیٹھ کر صداقت سے انصاف کیا۔" ۹: ۴

خدا کے ہاں کوئی سفارش اس کے اذن کے بغیر نہیں ہوگی

مَا مِنْ شَفِيعٍ إِلَّا مِنْ بَعْدِ إِذْنِهِ، یعنی کوئی اس غلط فہمی میں نہ رہے کہ خدا کے اس انصاف سے کسی کی سعی و سفارش کے ذریعے سے وہ اپنے آپ کو بچا لے جائے گا۔ خدا کے ہاں کوئی بھی نہ اس کے اذن کے بغیر سفارش کے لیے زبان کھول سکے گا اور نہ کوئی سفارش باطل کو حق یا حق کو باطل بنا سکے گی۔ اللہ کا علم ہر چیز کو محیط ہے۔

ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوهُ أَفَلَا تَذَكَّرُونَ۔ یعنی یہی اللہ جو آسمانوں اور زمین کا خالق ہے، جو عرش حکومت پر متمکن ہو کر عدل و انصاف کے ساتھ فرمانروائی کر رہا ہے، جس کے ہاں کوئی بڑے سے بڑا سفارشی بھی، اس کے اذن کے بغیر، کسی کی سفارش کی جرأت نہ کر سکے گا، وہی اللہ تمہارا رب ہے تو اپنے اسی رب کی بندگی کرو۔ اس کے سوا تم نے اور رب کہاں سے گھڑ لیے، تم اپنے مانے ہوئے مقدمات و مسلمات کو کس طرح نظر انداز کر جاتے ہو۔

سب کی پیشی خدا ہی کے آگے ہوگی

إِلَيْهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيعًا وَعْدَ اللّٰهِ حَقًّا۔ اسی کی طرف تم سب کا لوٹنا ہے۔ اس کے سوا کوئی اور مولیٰ و مرجع نہیں ہے۔ یہ اللہ کا شدنی وعدہ ہے۔ 'جَمِيعًا' کی تاکید اس امر کے اظہار کے لیے ہے کہ تمہاری اور جن کو تم نے اپنے گمان کے مطابق خدا کا شریک و شفیع بنا رکھا ہے سب کی پیشی خدا ہی کے آگے ہونی ہے اس سے کوئی بھی نہ بچ سکے گا۔

آغاز و اعادہ خدا کے اختیار میں ہے

إِنَّهُ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيدُهُ، یہ اس وعدے کے حق ہونے کی دلیل ہے کہ خدا خلق کا آغاز فرماتا ہے وہی دوبارہ اس کا اعادہ فرمائے گا جس نے پہلی مرتبہ اس کا آغاز کیا، آخر دوبارہ اس کا اعادہ کرنے میں اس کو کیوں دشواری پیش آئے گی؟ اس میں یہ اشارہ بھی ہے کہ جن کا نہ اس کائنات کے آغاز میں کوئی حصہ نہ اس کے اعادہ میں کوئی دخل آخر ان کو کس بنیاد پر تم نے مرجع و مولیٰ بنا رکھا ہے؟

قیامت کا اصل مقصد

لِيَجْزِيَ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ بِالْقِسْطِ۔ یہی اصل مقصد ہے قیامت کے آنے کا۔ اس سے معلوم ہوا کہ قیامت کا اصل مقصود درحقیقت اہل ایمان کو جزا دینا ہے، اہل کفر کو سزا اس کے لوازم اور توابع میں سے ہے۔ یہی وہ بشارت ہے جس کا آغاز میں ذکر ہوا ہے اس کی دلیل بیان کرنے کے بعد پھر اس کی طرف اشارہ فرما دیا۔

کفار کے لیے اولین سامانِ ضیافت

وَالَّذِينَ كَفَرُوا لَهُمْ شَرَابٌ مِنْ حَمِيمٍ وَعَذَابٌ أَلِيمٌ بِمَا كَانُوا يَكْفُرُونَ۔ کفار کو جو عذاب ہوگا یہ اس کا بیان ہے۔ 'شَرَابٌ مِنْ حَمِيمٍ' کا ذکر جیسا کہ ہم دوسرے مقام میں اشارہ کر چکے ہیں، اولین سامانِ ضیافت کی حیثیت

سے ہے یعنی ان کی اول تواضع توان کے اترتے ہی کھولتے پانی سے ہوگی۔ پھر ان کے لیے دردناک عذاب کے دروازے کھول دیے جائیں گے۔

هُوَ الَّذِيْ جَعَلَ الشَّمْسَ ضِيَآءً وَّ الْقَمَرَ نُوْرًا وَّ قَدَّرَهٗ مَنَازِلَ لِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِيْنَ وَ الْحِسَابَ ؕ مَا خَلَقَ اللّٰهُ ذٰلِكَ اِلَّا بِالْحَقِّ ۚ يُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ۝ اِنَّ فِي اخْتِلَافِ الَّيْلِ وَ النَّهَارِ وَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَّقُوْنَ ۝ اِنَّ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا وَ رَضُوْا بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ اطْمَاَنُّوْا بِهَا وَ الَّذِيْنَ هُمْ عَنْ اٰيٰتِنَا غٰفِلُوْنَ ۝ اُولٰٓىِٕكَ مَاْوٰىهُمُ النَّارُ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ۝ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ يَهْدِيْهِمْ رَبُّهُمْ بِاِيْمَانِهِمْ ۚ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهِمُ الْاَنْهٰرُ فِيْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ ۝ دَعْوٰىهُمْ فِيْهَا سُبْحٰنَكَ اللّٰهُمَّ وَ تَحِيَّتُهُمْ فِيْهَا سَلٰمٌ ۚ وَ اٰخِرُ دَعْوٰىهُمْ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ (۵ - ۱۰)

جزا اور سزا کے قطعی ہونے کی دلیل

توحید کے بعد اب یہ جزا اور سزا کے قطعی ہونے کی دلیل بیان ہو رہی ہے کہ اس کارخانۂ کائنات پر جو شخص بھی غور کرے گا اس کو یہ حقیقت نہایت نمایاں طور پر نظر آئے گی کہ یہ کسی کباڑیے کا مال گودام نہیں بلکہ اس کے ہر گوشے میں اس کے خالق کی عظیم قدرت اور اس کی بے پایاں رحمت و ربوبیت نمایاں ہے۔ اس کے اندر نہایت اعلیٰ اہتمام ہے۔ بے نظیر ترتیب و انتظام ہے، بے مثال اقلیدس و ریاضی ہے۔ سورج معین نظام اوقات کے ساتھ نکلتا اور اپنی تابانیوں سے سارے جہان کو روشن کرتا ہے۔ اس کے فیض سے گرمی، سردی، خزاں اور بہار کے مختلف موسم پیدا ہو جاتے ہیں جن میں سے ہر ایک ہماری دنیا کی زندگی اور اس کی بقا کے لیے ضروری ہے۔ چاند اس سے کسب نور کر کے اپنی معین منزلیں طے کرتا اور ہماری تاریک راتوں میں مختلف زاویوں سے ہمارے لیے شمع برداری بھی کرتا ہے اور ہمارے مہینوں اور سالوں کی تقویم بھی بناتا ہے ـــــ کون کہہ سکتا ہے کہ یہ دنیا خیر و شر اور نیکی و بدی کے درمیان امتیاز کے بغیر یوں ہی چلتی رہے گی یا یوں ہی ختم ہو جائے گی؟ اگر یہ مان لیا جائے تو یہ ساری قدرت و حکمت بے مقصد و بے غایت ہو جاتی ہے جو اس کائنات کے ہر گوشہ میں جلوہ گر ہے۔ پھر تو یہ دنیا بالکل باطل اور ایک کھیل تماشا بن کے رہ جاتی ہے اور یہ ایک ایسی خلاف عقل، ایسی خلاف عدل اور ایسی خلاف فطرت بات ہے کہ کوئی سلیم العقل اور کوئی مستقیم الفطرت انسان ایک لمحہ کے لیے بھی اس کو باور نہیں کر سکتا۔ کچھ اینٹیں ایک جگہ بکھری ہوئی پڑی ہوں تو ان کو تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ یوں ہی پڑی ہوئی ہیں لیکن کیا یہی گمان تاج محل، لال قلعہ اور لاہور و دلی کی جامع مسجدوں کے متعلق بھی کر سکتے ہیں؟

---

۱ آیت میں سورج کے لیے ضیا (چمک اور تابانی) اور چاند کے لیے نور (خنک روشنی) کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ بعض لوگوں نے اس فرق کی یہ توجیہہ کی ہے کہ سورج کی روشنی اپنی ذاتی ہے اور چاند کی روشنی سورج سے حاصل کی ہوئی ہے۔ اگرچہ یہ بات بجائے خود صحیح ہے لیکن میرے نزدیک 'ضیا' میں روشنی کے ساتھ تپش کا مفہوم بھی پایا جاتا ہے اور 'نور' خنک روشنی کو کہتے ہیں۔ اور یہ ایک امر واقعہ ہے کہ سورج کی روشنی میں تپش ہوتی ہے اور چاند کی روشنی ٹھنڈی ہوتی ہے۔

صحیح انسانی فطرت کا اعتراف

مَا خَلَقَ اللّٰهُ ذٰلِكَ اِلَّا بِالْحَقِّ۔ یہ صحیح انسانی فطرت کا اعتراف بیان ہوا ہے کہ جو عاقل اس نظامِ کائنات پر غور کرتا ہے وہ پکار اٹھتا ہے کہ یہ کارخانہ باطل اور بے مقصد نہیں بلکہ ایک عظیم غایت کے ساتھ وجود میں آیا ہے اور یہ غایت مقتضی ہے کہ یہ ایک ایسے انجام پر منتہی ہو جو حق اور باطل کے درمیان پورے انصاف کے ساتھ فیصلہ کر دے اور ہر ایک کو اس کے اعمال کے مطابق جزا یا سزا دے۔

يُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ۔ فرمایا کہ اس جزا و سزا کی دلیلیں اور نشانیاں اس نظام کائنات کے اندر پھیلی ہوئی ہیں جو دیکھنے والی آنکھوں سے مخفی نہیں ہو سکتیں لیکن اگر کسی کے لیے یہ مخفی تھیں تو اب ہم نے ان لوگوں کے لیے جو جاننا اور سمجھنا چاہیں ان کی تفصیل بھی کر دی ہے۔ بعینہٖ یہی مضمون آل عمران کی آیت ۱۹۱۔ وَيَتَفَكَّرُوْنَ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ میں بیان ہوا ہے۔ مزید تفصیل کے طالب اس آیت کی تفسیر پر بھی ایک نظر ڈال لیں۔

گردشِ لیل و نہار کا درس

اِنَّ فِي اخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ ۔۔۔۔ الآیۃ اختلاف لیل و نہار سے اس تعاقب کی طرف بھی اشارہ ہو رہا ہے جو وہ ایک دوسرے کا پوری سرگرمی سے کر رہے ہیں جس سے یہ رہنمائی ملتی ہے کہ یہ گردش بے غایت و بے مقصد نہیں ہے بلکہ ایک عظیم نتیجہ پر منتہی ہونے والی ہے، دوسرے اس عظیم نظام ربوبیت کی طرف بھی اس میں اشارہ ہے جو رات اور دن کے اختلاف مزاج کے اندر مضمر ہے کہ دن انسان کے لیے معاش و معیشت کی سرگرمیوں کا میدان گرم کرتا ہے اور رات اس کے لیے راحت و سکون کا بستر بچھاتی ہے۔ اس نظام پر جو شخص بھی غور کرتا ہے وہ لازماً اس نتیجہ تک پہنچتا ہے کہ اضداد کے اندر ایک مشترک مقصد کے لیے یہ حیرت انگیز توافق اسی شکل میں وجود میں آ سکتا ہے جب یہ مانا جائے کہ یہ سارا کارخانہ صرف ایک قادر و قیوم کے ارادے کے تحت کام کر رہا ہے اور پھر اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ جس نے ربوبیت و پرورش کا یہ سارا نظام کھڑا کیا ہے اور اس کو اس اہتمام سے چلا رہا ہے وہ انسان کو مطلق العنان اور غیر مسئول نہیں چھوڑے گا بلکہ اس کے بعد ایک ایسا دن لازماً آتا ہے جس میں وہ اس ربوبیت کا حق پہچاننے والوں کو ان کی حق شناسی کا انعام دے گا اور اس سے بے پروا رہنے والوں کو جہنم میں جھونک دے گا۔ یہی نتیجہ اس کائنات کے تمام اجزا اور اس کے تمام اضداد پر غور کرنے سے حاصل ہوتا ہے اور یہی حاصل ہے جو انسان کی رہنمائی آخرت اور اس جزا و سزا کی طرف کرتا ہے جس سے انسان کے اندر وہ حقیقی تقویٰ پیدا ہوتا ہے جس کی طرف آلِ عمران کی مذکورہ بالا آیت میں سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ کے الفاظ سے اشارہ ہوا ہے۔

ان لوگوں کا انجام جو نشانیوں سے آنکھیں بند کیے ہوئے ہیں

اِنَّ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ ۔۔۔۔۔ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ۔ یہ ان لوگوں کا انجام بیان ہوا ہے جو اس کائنات کی ان تمام نشانیوں کے باوجود اندھے بہرے بنے ہوئے ہیں اور اسی دنیا کی زندگی پر مطمئن ہیں، نہ انھیں خدا کی ملاقات کا اندیشہ ہے، نہ آخرت کا ڈر ہے۔ فرمایا کہ ان سب کا ٹھکانا جہنم ہوگا۔ لفظ رجا یہاں توقع اور اندیشہ کے معنی میں ہے اور یہی اس کا اصل لغوی مفہوم ہے۔

اہل ایمان کا انجام

اِنَّ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا یَہۡدِیۡہِمۡ رَبُّہُمۡ بِاِیۡمَانِہِمۡ ...... اَنِ الۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ - ھدایت
یہاں منزلِ مقصود کی ہدایت کے مفہوم میں ہے جو تمام کائنات کی تخلیق کی غایت ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ ان کے ایمان کی بدولت جنت میں ان کے حسب مراتب منازل و مقامات کی طرف ان کی رہنمائی فرمائے گا۔ دَعۡوٰىہُمۡ فِیۡہَا سُبۡحٰنَکَ، یعنی جب وہ اپنی آنکھوں سے دیکھیں گے کہ حق، حق ہو کے رہا اور باطل، باطل تو بے تحاشا ان کی زبان سے سُبۡحٰنَکَ اللّٰہُمَّ کے الفاظ نکلیں گے کہ آیاتِ الٰہی کے مشاہدے سے ہمارا جو یہ گمان تھا کہ یہ کارخانۂ کائنات کھلنڈرے کا کھیل نہیں ہو سکتا، اس عظیم خالق کی شان سے بعید ہے کہ وہ کوئی کارِ عبث کرے، تو ہمارا یہ گمان سچا ثابت ہوا۔ تَحِیَّتُہُمۡ فِیۡہَا سَلٰمٌ، یعنی ایک کامیاب اور فتح مند ٹیم کی طرح ان کے آپس میں مبارک سلامت کے تبادلے ہوں گے اور دوسری طرف کفار کے اندر جوتیوں میں دال بٹ رہی ہوگی اور ہر ایک دوسرے پر لعنت کر رہا ہوگا۔ وَاٰخِرُ دَعۡوٰىہُمۡ اَنِ الۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ۔ یہ تکمیلِ نعمت پر اظہارِ شکر ہے کہ اہلِ جنت جب دیکھیں گے کہ ہر طرف نعمت ہی نعمت ہے تو بے تحاشا ان کی زبان سے یہ شکر کا کلمہ نکلے گا۔

۲۔ آگے کا مضمون ____ آیات ۱۱-۱۹

آگے پہلے منکرین و مکذبین کے اس مطالبہ کا جواب دیا ہے جو وہ عذاب کے لیے کر رہے تھے کہ اگر جزا اور سزا ایسی ہی اٹل چیز ہے اور ہم اپنے اعمال کے باعث اس کے مستحق ہو ہی چکے ہیں تو اس عذاب کا کوئی نمونہ دکھا کیوں نہیں دیتے جس کی دھمکی سنا رہے ہو سو اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے اپنی اس سنت کا حوالہ دیا کہ خدا رحمت میں سبقت کرتا ہے، قہر کرنے میں وہ بڑا دھیما ہے۔ اگر قہر کرنے میں بھی وہ ویسی ہی جلدی کرنے والا ہوتا، جیسا کہ فضل و رحمت کے معاملے میں ہے تو کب کا فیصلہ ہو چکا ہوتا۔ پھر انسان کی اس جلدبازی کی حقیقت واضح کی ہے کہ وہ مطالبہ تو عذاب کا بڑی ڈھٹائی کے ساتھ کرتا ہے لیکن جب ذرا خدا کی پکڑ میں آجاتا ہے تو واویلا شروع کر دیتا ہے، پھر جوں ہی ذرا ڈھیل ملتی ہے اسی طرح اکڑنے لگتا ہے۔ ایسے لوگ ہدایت کسی صورت میں بھی قبول نہیں کرتے۔ پھر ان کو تاریخ کی طرف توجہ دلائی ہے کہ پچھلی قوموں کی سرگزشت میں، جن کے تم جانشین ہوئے ہو، کافی سامان عبرت موجود ہے، آخر ان کے حالات سے کیوں سبق نہیں لیتے، یہ کیوں ضروری سمجھتے ہو کہ وہی انجام تمہارا بھی ہو جو ان قوموں کا ہوا۔

اس کے بعد ان کے اس مطالبہ کا جواب دیا ہے جو وہ قرآن کو یکسر بدل دینے یا کم از کم اس میں ایسی ترمیم کے لیے کر رہے تھے جس کے بعد وہ ان کے لیے گوارا ہو سکے۔ وہ توحید کی تعلیم اور جزا و سزا اور قہر و عذاب کی دھمکی سننے کے لیے تیار نہیں تھے اس وجہ سے کہتے تھے کہ اگر ہم سے منوانا ہے تو اس کتاب کی جگہ دوسری کتاب لاؤ یا اس میں تبدیلی کرو، بغیر اس کے ہم اس کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ ان کے جواب میں

پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے کہلوایا کہ یہ میری بات نہیں ہے کہ میں اس میں کوئی ترمیم کروں۔ یہ تو خدا کی طرف سے ڈالی ہوئی ایک ذمہ داری ہے جو مجھے اٹھانی پڑی ہے۔ اگر اس کا کوئی امکان ہوتا کہ میں اس ذمہ داری سے بچ سکوں تو میں کسی کو اس کی کانوں کان خبر نہ ہونے دیتا۔ میں نے تمھارے اندر ایک طویل زندگی گزاری ہے اور تم جانتے ہو کہ میں سیادت و امارت کا طالب کبھی نہیں رہا تو اس عمر میں آکر آخر خدا پر ایک افترا کی ذمہ داری میں کس طرح لے سکتا ہوں۔

آخر میں عقیدۂ شرک کی لغویت واضح کی ہے اور مقصد یہ ہے کہ جس چیز کی حمیت و حمایت میں قرآن سے بیزاری ہے وہ محض ایک خیال باطل ہے جس کا وجود نہ کہیں آسمان میں ہے، نہ زمین میں ـــــ اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۱۱-۱۹

وَلَوْ يُعَجِّلُ اللّٰهُ لِلنَّاسِ الشَّرَّ اسْتِعْجَالَهُمْ بِالْخَيْرِ لَقُضِيَ اِلَيْهِمْ اَجَلُهُمْ
فَنَذَرُ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ﴿۱۱﴾ وَاِذَا
مَسَّ الْاِنْسَانَ الضُّرُّ دَعَانَا لِجَنْۢبِهٖۤ اَوْ قَاعِدًا اَوْ قَآئِمًا فَلَمَّا
كَشَفْنَا عَنْهُ ضُرَّهٗ مَرَّ كَاَنْ لَّمْ يَدْعُنَآ اِلٰى ضُرٍّ مَّسَّهٗ كَذٰلِكَ زُيِّنَ
لِلْمُسْرِفِيْنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۲﴾ وَلَقَدْ اَهْلَكْنَا الْقُرُوْنَ مِنْ
قَبْلِكُمْ لَمَّا ظَلَمُوْا وَجَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ وَمَا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْا
كَذٰلِكَ نَجْزِي الْقَوْمَ الْمُجْرِمِيْنَ ﴿۱۳﴾ ثُمَّ جَعَلْنٰكُمْ خَلٰٓئِفَ فِي
الْاَرْضِ مِنْۢ بَعْدِهِمْ لِنَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴﴾ وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ
اٰيَاتُنَا بَيِّنٰتٍ قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا ائْتِ بِقُرْاٰنٍ غَيْرِ هٰذَآ اَوْ
بَدِّلْهُ قُلْ مَا يَكُوْنُ لِيْۤ اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَآئِ نَفْسِيْ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا
مَا يُوْحٰۤى اِلَيَّ اِنِّيْۤ اَخَافُ اِنْ عَصَيْتُ رَبِّيْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ﴿۱۵﴾ قُلْ
لَّوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا تَلَوْتُهٗ عَلَيْكُمْ وَلَآ اَدْرٰىكُمْ بِهٖ فَقَدْ لَبِثْتُ فِيْكُمْ
عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۱۶﴾ فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ

كَذِبًا اَوْ كَذَّبَ بِاٰيٰتِهٖ ۭ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الْمُجْرِمُوْنَ ﴿۱۷﴾ وَيَعْبُدُوْنَ مِنْ
دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ وَيَقُوْلُوْنَ هٰٓؤُلَاۗءِ شُفَعَاۗؤُنَا عِنْدَ
اللّٰهِ ۭ قُلْ اَتُنَبِّـــُٔوْنَ اللّٰهَ بِمَا لَا يَعْلَمُ فِي السَّمٰوٰتِ وَلَا فِي الْاَرْضِ ۭ
سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿۱۸﴾ وَمَا كَانَ النَّاسُ اِلَّآ اُمَّةً وَّاحِدَةً
فَاخْتَلَفُوْا ۭ وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ فِيْمَا فِيْهِ
يَخْتَلِفُوْنَ ﴿۱۹﴾

ترجمۂ آیات ۱۱ - ۱۶

اگر اللہ لوگوں کے لیے عذاب کے معاملے میں ویسی ہی سبقت کرنے والا ہوتا جس طرح وہ ان کے ساتھ رحمت میں سبقت کرتا ہے تو ان کی مدت تمام کر دی گئی ہوتی۔ تو ہم ان لوگوں کو جو ہماری ملاقات کے متوقع نہیں ہیں ان کی سرکشی میں بھٹکتے رہنے کے لیے ڈھیل دے دیتے ہیں۔ اور انسان کا حال یہ ہے کہ جب اس کو کوئی تکلیف پہنچتی ہے تب تو لیٹے، بیٹھے یا کھڑے ہم کو پکارتا ہے۔ پھر جب ہم اس کی تکلیف دور کر دیتے ہیں تو اس طرح چل دیتا ہے گویا کسی تکلیف کے لیے، جو اس کو پہنچی، اس نے ہم کو پکارا ہی نہیں تھا۔ اسی طرح حدود سے تجاوز کرنے والوں کی نگاہوں میں ان کے اعمال کھبا دیے گئے ہیں۔ ۱۱-۱۲

اور ہم نے تم سے پہلے قوموں کو ہلاک کیا جب کہ وہ ظلم کی مرتکب ہوئیں۔ اور ان کے رسول ان کے پاس کھلی کھلی نشانیاں لے کر آئے اور وہ ایمان لانے والے نہ بنے۔ ہم ایسا ہی بدلہ دیتے ہیں مجرم قوم کو۔ پھر ہم نے ان کے بعد تم کو ملک میں ان کا جانشین بنایا کہ دیکھیں تم کیسا عمل کرتے ہو۔ ۱۳-۱۴

اور جب ہماری کھلی ہوئی آیتیں ان کو پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو وہ لوگ جو ہماری ملاقات

کے متوقع نہیں ہیں، کہتے ہیں اس قرآن کے سوا کوئی اور قرآن لاؤ یا اس میں ترمیم کرو۔ کہہ دو مجھے کیا حق ہے کہ میں اس میں اپنے جی سے ترمیم کر دوں۔ میں تو صرف اس وحی کی پیروی کرتا ہوں جو مجھ پر آتی ہے۔ اگر میں نے اپنے رب کی نافرمانی کی تو ایک ہولناک دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں۔ کہہ دو اگر اللہ کی مشیت ہوتی تو نہ میں اس کو تمھیں سناتا اور نہ وہ اس سے تمھیں باخبر کرتا۔ میں اس سے پہلے تم میں ایک عمر بسر کر چکا ہوں تو کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے۔ اس سے بڑھ کر ظالم اور کون ہوگا جو اللہ پر جھوٹ بہتان باندھے یا اس کی آیات کو جھٹلائے۔ بے شک مجرم فلاح پانے والے نہیں بنیں گے۔ ۱۵-۱۷

اور وہ اللہ کے سوا ایسی چیزوں کی پرستش کرتے ہیں جو ان کو نقصان پہنچا سکیں نہ نفع اور کہتے ہیں کہ یہ اللہ کے ہاں ہمارے سفارشی ہیں، کہہ دو، کیا تم اللہ کو ایسی چیز کی خبر دیتے ہو جس کا اس کو خود پتہ نہیں، نہ آسمانوں میں نہ زمین میں۔ وہ پاک اور ارفع ہے ان چیزوں سے جن کو وہ اس کا شریک ٹھہراتے ہیں۔ اور لوگ تو ایک ہی امت تھے۔ پھر انھوں نے اختلاف کیا۔ اور اگر تمھارے رب کی جانب سے ایک بات پہلے سے طے نہ پا چکی ہوتی تو ان کے درمیان اس امر میں فیصلہ کر دیا جاتا جس میں وہ اختلاف کر رہے ہیں۔ ۱۸-۱۹

۳۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَلَوْ يُعَجِّلُ اللّٰهُ لِلنَّاسِ الشَّرَّ اسْتِعْجَالَهُمْ بِالْخَيْرِ لَقُضِيَ إِلَيْهِمْ أَجَلُهُمْ ۖ فَنَذَرُ الَّذِينَ لَا يَرْجُونَ لِقَاءَنَا فِي طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُونَ (۱۱)

عذاب کے لیے جلدبازی کا جواب — یہ، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، جواب ہے عذاب کے لیے کفار کی جلد بازی کا۔ جب ان کو آیاتِ تکذیب کے انجام سے ڈرایا جاتا تو وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو زچ کرنے کے لیے فوراً یہ مطالبہ کرتے اگر تم سچے رسول ہو اور تمھارے خیال کے مطابق تمھاری تکذیب متوجب عذاب ہے تو اس عذاب کے

میں تاخیر نہ کرو، ہم اس کے دیکھنے کے لیے بیقرار ہیں۔ جواب میں ارشاد ہوا کہ سنت الٰہی یوں ہے کہ اللہ رحمت کرنے میں تو جلدی کرتا ہے لیکن عذاب بھیجنے میں جلدی نہیں کرتا۔ اِسْتِعْجَالَهُمْ بِالْخَيْرِ، میں استعمال ہمارے نزدیک اپنے مفعول کی طرف مضاف ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے یہ دنیا چونکہ اصلاً اپنی رحمت ہی کے لیے خلق فرمائی ہے اس لیے وہ لوگوں پر رحمت نازل بھی فرماتا ہے اور لوگوں سے یہ چاہتا بھی ہے کہ وہ فرصت ختم ہونے سے پہلے پہلے اس کی رحمت کے قدردان بنیں اور نیکی اور سعادت کی وہ راہ اختیار کریں جو دنیا اور آخرت دونوں میں ان کو خدا کے فضل و رحمت کا مستحق بنائے۔ اس سنت الٰہی کا تقاضا یہ ہے کہ وہ ان لوگوں پر عذاب بھیجنے میں جلدی نہ کرے جو اس کے آگے اکڑتے اور اس کے رسول کی تکذیب کرتے ہیں۔

'فَنَذَرُ الَّذِينَ لَا يَرْجُونَ لِقَاءَنَا ..... الآية' یہ مذکورہ سنت الٰہی کا تقاضا بیان ہوا ہے کہ اس کا تقاضا یہ ہے کہ نافرمانی اور طغیان کے باوجود لوگوں کو زیادہ سے زیادہ مہلت اور ڈھیل دی جائے تاکہ کسی درجے میں بھی اصلاح حال کا کوئی امکان ہو تو لوگ اپنی اصلاح کر لیں اور اگر اصلاح نہ کریں تو ان پر اللہ کی حجت اس طرح تمام ہو جائے کہ روز آخرت کی پیشی کے وقت، جس سے وہ بالکل نچنت ہیں ان کے پاس پیش کرنے کے لیے کوئی عذر باقی نہ رہ جائے۔

وَإِذَا مَسَّ الْإِنسَانَ الضُّرُّ دَعَانَا لِجَنبِهِ أَوْ قَاعِدًا أَوْ قَائِمًا فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُ ضُرَّهُ مَرَّ كَأَن لَّمْ يَدْعُنَا إِلَىٰ ضُرٍّ مَّسَّهُ ۚ كَذَٰلِكَ زُيِّنَ لِلْمُسْرِفِينَ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ (۱۲)

سرکشوں کی فطرت

'اِنْسَان' کا لفظ ہر چند عام ہے لیکن اس سے مراد وہی متمردین قریش ہیں جو عذاب کا مطالبہ کر رہے تھے۔ ان کو لائق خطاب نہیں سمجھا اس وجہ سے بات عام الفاظ میں فرما دی۔ یہ ان کی اس اکڑ پر ایک ضرب بھی ہے اور اس میں اشارہ اس حقیقت کی طرف بھی ہے کہ کوئی یہ نہ سمجھے کہ اس قسم کے لوگوں کا مطالبۂ عذاب پورا کر دیا جائے تو وہ ایمان لائیں گے۔ اس قسم کے لوگ ایمان نہیں لاتے بلکہ ان کا حال یہ ہوتا ہے کہ جب یہ کسی پکڑ میں آتے ہیں تب تو یہ خدا خدا پکارتے ہیں اور سو سو طرح سے توبہ کا عہد و پیمان باندھتے ہیں لیکن ذرا ڈھیل مل جاتی ہے تو وہی سرمستی ان پر پھر عود کر آتی ہے اور انھیں یاد بھی نہیں رہتا کہ کبھی پکڑ میں آئے تھے اور انھوں نے اس سے چھوٹنے کے لیے خدا کو پکارا بھی تھا۔ 'كَذَٰلِكَ زُيِّنَ لِلْمُسْرِفِينَ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ' یعنی یہ جو کلیہ بیان ہوا ہے یہی ٹھیک ٹھیک ان سرکشوں اور حدود الٰہی سے ان تجاوز کرنے والوں پر منطبق ہوتا ہے۔ یہ جو بداعمالیاں کرتے رہے ہیں، سنت الٰہی کے تحت وہ ان کی نگاہوں میں اس طرح کھبا دی گئی ہیں کہ اگر ان کی طلب کے مطابق کوئی نشانیٔ عذاب ان کو دکھا بھی دی جائے تو اس کی گرفت سے چھوٹتے ہی پھر یہ اسی کیچڑ میں لوٹیں گے جس میں لوٹ رہے ہیں۔

وَلَقَدْ أَهْلَكْنَا الْقُرُونَ مِن قَبْلِكُمْ لَمَّا ظَلَمُوا ۙ وَجَاءَتْهُمْ رُسُلُهُم بِالْبَيِّنَاتِ وَمَا كَانُوا لِيُؤْمِنُوا ۚ كَذَٰلِكَ نَجْزِي الْقَوْمَ الْمُجْرِمِينَ ۝ ثُمَّ جَعَلْنَاكُمْ خَلَائِفَ فِي الْأَرْضِ مِن بَعْدِهِمْ لِنَنظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُونَ (۱۳-۱۴)

تاریخ کی شہادت

یہ جواب قریش کو مخاطب کر کے، تاریخ کی روشنی میں دیا گیا ہے کہ آخر دوسروں کو جو کچھ اسی ملک کی تاریخ کے مختلف ادوار میں پیش آچکا ہے اس سے سبق کیوں نہیں لیتے۔ یہ کیا ضروری ہے کہ وہی کچھ تم پر گزر جائے تب تمھاری سمجھ میں بات آئے کہ جو کچھ تم سے کہا گیا وہ ٹھیک ہے۔ یہاں حوالہ اجمالی ہے۔ اسی سورہ میں آگے بعض اہم تاریخی واقعات کی تفصیل بھی آرہی ہے۔ 'لَمَّا ظَلَمُوْا' سے مراد یہاں ان قوموں کا وہ ظلم ہے جو انھوں نے اپنے رسولوں کی تکذیب کر کے خود اپنے اوپر ڈھایا۔ 'وَجَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ وَمَا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْا' اسی ظلم کی تفصیل ہے۔ 'كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُجْرِمِيْنَ' یعنی جو قومیں اپنے رسولوں کی تکذیب کرتی ہیں ہم ان کو اسی طرح سزا دیا کرتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جب وہی جرم تم کرو گے تو آخر اس کی سزا سے کیسے بچ جاؤ گے۔

'ثُمَّ جَعَلْنٰكُمْ خَلٰٓئِفَ ...... الاية' یعنی جب تم انہی کے جانشین ہوئے ہو تو آخر تمھارے ساتھ اس سے مختلف معاملہ کیوں ہو گا جو ان کے ساتھ ہوا؟ ان کو ہٹا کر خدا نے تم کو ان کی جگہ تو اس لیے دی تھی کہ دیکھے تم کیا بناتے ہو؟

وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيَاتُنَا بَيِّنٰتٍ ۙ قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا ائْتِ بِقُرْاٰنٍ غَيْرِ هٰذَآ اَوْ بَدِّلْهُ ۭ قُلْ مَا يَكُوْنُ لِيْٓ اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَآئِ نَفْسِيْ ۚ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ ۚ اِنِّىْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَيْتُ رَبِّيْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ (۱۵)

مخالفین کی شکست خوردگی

یعنی توحید اور آخرت کی یہ باتیں، جو مذکور ہوئیں، نہایت واضح دلائل کے ساتھ ان کو سنائی جاتی ہیں تو یہ ان سے چڑتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یا تو اس قرآن کی جگہ کوئی اور قرآن لاؤ یا کم از کم اس میں ایسی ترمیم کرو کہ ہمارے لیے گوارا ہو سکے۔ گویا قرآن ان کے نزدیک خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تصنیف ہے کہ آپ اس میں ان کے مطالبے کے مطابق ترمیم و تنسیخ کر سکتے ہیں۔ یہ مطالبہ مخالفین کی شکست خوردگی کی دلیل تھا۔ وہ یہ تو مان چکے تھے کہ قرآن سے اب پیچھا چھڑانا ممکن نہیں رہا۔ اب اگر کوئی شکل باقی ہے تو یہ ہے کہ اس کا مقام تسلیم کرتے ہوئے اس میں ایسی ترمیم کرانے کی کوشش کی جائے جس کے بعد ان کے لیے بھی وہ قابل قبول ہو سکے۔ جواب میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے یہ کہلایا گیا کہ یہ میری کوئی اپنی تصنیف تھوڑے ہی ہے کہ میں اس میں اپنی جانب سے کوئی ترمیم و تنسیخ کر دوں۔ یہ کلام تو مجھ پر خدا کی طرف سے وحی ہوتا ہے اور میں بے چون و چرا اسی وحی کی پیروی کرتا ہوں۔ اگر میں اس میں اپنی طرف سے کوئی ردوبدل کر دوں تو کل کو خدا کے آگے کیا جواب دوں گا۔

قُلْ لَّوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا تَلَوْتُهٗ عَلَيْكُمْ وَلَآ اَدْرٰىكُمْ بِهٖ ڮ فَقَدْ لَبِثْتُ فِيْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝ فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَي اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ كَذَّبَ بِاٰيٰتِهٖ ۭ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الْمُجْرِمُوْنَ (۱۶-۱۷)

'اَدْرٰىكُمْ'، 'دَرٰى يَدْرِيْ' سے باب افعال اور غائب کا صیغہ ہے۔ فاعل اس کا اللہ ہے۔ بعض لوگوں نے اس کو 'مَا تَلَوْتُهٗ' سے ہم آہنگ کرنے کے لیے اس کا ترجمہ متکلم کا کیا ہے لیکن یہ عربیت کے بالکل خلاف ہے۔

مسکت جواب

اب یہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے کفار کے مطالبے کے پہلے ٹکڑے کا جواب دلوایا ہے۔

یعنی اس بات کا کہ اس قرآن کے بجائے کوئی اور قرآن لاؤ۔ فرمایا کہ تم گمان کرتے ہو کہ میں نے یہ قرآن تمھارے سامنے اپنے شوق سے پیش کیا ہے اور اس رنگ میں میں نے تم پر اپنی سیادت اور نبوت جمانی چاہی ہے۔ تمھارا یہ خیال بالکل غلط ہے۔ میں نے اس بارگراں کا نہ کبھی ارمان کیا اور نہ اپنے شوق سے اس کو اٹھایا ہے۔ میں اس ذمہ داری کی گراں باریوں سے سب سے زیادہ بھاگنے والا رہا ہوں۔ لیکن مشیت الٰہی یہی ہوئی کہ میں یہ بوجھ اٹھاؤں۔ اگر خدا کی مشیت نہ ہوتی تو نہ میں اس چیز کو تمھارے سامنے پیش کرتا اور نہ اللہ تعالیٰ اس کے ذریعہ سے تم کو اعلام و انذار کرتا۔

پیغمبر کی زندگی سے استدلال

فَقَدْ لَبِثْتُ فِيكُمْ عُمُرًا مِّن قَبْلِهِ أَفَلَا تَعْقِلُونَ۔ یہ اوپر والی بات کی ایسی سادہ اور مسکت دلیل ہے کہ کوئی ایماندار آدمی اس کو جھٹلا نہیں سکتا۔ ارشاد ہوا کہ میں تم میں کوئی نووارد آدمی نہیں ہوں جس کے ماضی سے تم بے خبر ہو۔ میں تمھارے اندر زندگی کے چالیس سال گزار چکا ہوں۔ اس طویل مدت میں کب تم نے میری طرف سے کسی جھوٹ یا فریب کا تجربہ کیا ہے۔ کب تم نے میرے اندر سیادت و امارت کی لو محسوس کی ہے، کب تم نے پایا ہے کہ میں اونچے اونچے خواب دیکھتا ہوں اور اپنی بڑائی کی دھونس جمانے کا شوق رکھتا ہوں؟ آدمی کا مزاج راتوں رات نہیں بنتا اور نہ کردار ایسی چیز ہے جو اتنی طویل باہمی معاشرت کے باوجود لوگوں سے مخفی رہے۔ جس شخص نے خلق میں سے کسی سے جھوٹ نہ بولا ہو آخر وہ خالق پر اتنا بڑا جھوٹ باندھنے کی جسارت کیسے کر سکتا ہے؟ آج تک تم مجھے صادق اور امین سمجھتے رہے تو اب میں راتوں رات بر خود غلط، خود نما، لپاٹیا اور مفتری کیسے بن گیا؟ خدا کے بندو عقل سے کام لو۔ انصاف سے غور کرو اور ضد و عناد میں اندھے نہ بن جاؤ ـــــ اس سے معلوم ہوا کہ حضرات انبیاء کی زندگی شرف رسالت سے ممتاز ہونے سے پہلے بھی ایسی بے داغ ہوتی ہے کہ ان کے مخالفین ان پر انگلی رکھنے کی کوئی گنجائش نہیں پاتے اور یہ چیز ان کے دعوے کی صداقت کی ایک بہت بڑی دلیل ہوتی ہے۔

رسول کے لیے غلبہ لازم ہے

فَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرَىٰ ...... الآیہ۔ یعنی اگر میں خدا پر افترا کر رہا ہوں اور جھوٹا دعوائے نبوت لے کر اٹھا ہوں تو مجھ سے بڑا کوئی ظالم نہیں اور اگر میں سچا ہوں اور تم اللہ کی آیات کو جھٹلا رہے ہو تو تم سے بڑا کوئی ظالم نہیں۔ اب مستقبل فیصلہ کرے گا کہ ظالم تم ہو یا میں۔ یہ یاد رکھو کہ جو مجرم ہوں گے وہ فلاح نہیں پائیں گے ـــ یہاں وہ بات یاد رکھنے کی ہے جس کی طرف ہم پیچھے اشارہ کر آئے ہیں کہ اللہ کے رسولوں اور ان کے مخالفین کے مابین حق و باطل کی جو کشمکش برپا ہوتی ہے وہ لازماً حق کے غلبہ پر منتہی ہوتی ہے اس لیے کہ رسول خدا کی عدالت ہوتا ہے اور اس کے لیے بفحوائے لَأَغْلِبَنَّ أَنَا وَرُسُلِي آخرت سے پہلے اس دنیا میں بھی غلبہ لازمی ہے۔

وَيَعْبُدُونَ مِن دُونِ اللَّهِ مَا لَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنفَعُهُمْ وَيَقُولُونَ هَٰؤُلَاءِ شُفَعَاؤُنَا عِندَ اللَّهِ ۚ قُلْ أَتُنَبِّئُونَ اللَّهَ بِمَا لَا يَعْلَمُ فِي السَّمَاوَاتِ وَلَا فِي الْأَرْضِ ۚ سُبْحَانَهُ وَتَعَالَىٰ عَمَّا يُشْرِكُونَ ۝ وَمَا

كَانَ النَّاسُ إِلَّا أُمَّةً وَاحِدَةً فَاخْتَلَفُوا ۚ وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِن رَّبِّكَ لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ فِيمَا فِيهِ يَخْتَلِفُونَ (۱۸-۱۹)

مشرکین مکہ کی اصل چڑ

'وَيَعْبُدُونَ مِن دُونِ اللَّهِ ...... الآیۃ' یہ اس خاص چیز کا حوالہ بھی ہے جس کے سبب سے مشرکین مکہ قرآن سے چڑتے اور اس میں ترمیم کا مطالبہ کرتے تھے اور اللہ پر افترا کی ایک مثال بھی ہے جو دلیل ہے اس بات کی کہ عنداللہ سب سے بڑے ظالم یہی ہیں اس لیے کہ یہ ایسی چیزوں کی بندگی کرتے ہیں جو ان کو ضرر پہنچا سکیں نہ نفع اور ان کی نسبت یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ یہ اللہ کے ہاں ہماری سفارشی ہیں، دنیا میں ہمیں آل و اولاد اور رزق و مال جو کچھ ملتا ہے انہی کی سفارش سے ملتا ہے اور اگر آخرت ہوئی تو وہاں بھی یہ ہمیں بخشوائیں گی۔ یہ بات یہاں یاد رکھنے کی ہے کہ اہل عرب اپنے معبودوں کو نہ خدا کی ذات میں شریک مانتے تھے نہ کسی کو خالق و مالک کا درجہ دیتے تھے بلکہ صرف ان کو خدا کے چہیتوں کا درجہ دیتے اور ان کی سفارش کی امید پر ان کی پرستش کرتے تھے۔

عربیت کا ایک خاص اسلوب

'قُلْ أَتُنَبِّئُونَ اللَّهَ بِمَا لَا يَعْلَمُ فِي السَّمَاوَاتِ وَلَا فِي الْأَرْضِ' ۔ یہ نفی الشئی بنفی لازمہ کے اسلوب پر ان فرضی سفارشیوں کی تردید ہے۔ یعنی ان کے ان فرضی سفارشیوں کا آسمان و زمین میں کوئی وجود ہوتا تو سب سے زیادہ ان سے باخبر تو خود اللہ تعالیٰ ہوتا جس کے وہ مقرب اور چہیتے ٹھہرائے جاتے ہیں۔ لیکن خدا کو تو ان کا کوئی پتا نہیں ہے، بس یہی لوگ ان کا سراغ بھی دے رہے ہیں اور یہی ان کو آسمان پر بھی چڑھا رہے ہیں۔ بعینہٖ یہی مضمون رعد آیت ۳۳ میں بھی ہے۔ وَجَعَلُوا لِلَّهِ شُرَكَاءَ قُلْ سَمُّوهُمْ ۚ أَمْ تُنَبِّئُونَهُ بِمَا لَا يَعْلَمُ فِي الْأَرْضِ أَم بِظَاهِرٍ مِّنَ الْقَوْلِ (اور انھوں نے اللہ کے شریک ٹھہرائے ہیں، ان سے کہو کہ ذرا ان کے نام تو لو، کیا تم اس کو ایسی چیز کا پتہ دے رہے ہو جس کے زمین میں وجود کا اس کو خود علم نہیں یا یوں ہی ہوائی بات کر رہے ہو) عربیت کے اس اسلوب کی مثالیں کلام عرب میں موجود ہیں۔ امرء القیس نے ایک صحرائی راستہ کی تعریف کی ہے کہ 'لا یھتدی بمنارہ' اس کی برجیوں سے رہنمائی نہیں حاصل کی جاتی۔ جس کا صریح مفہوم یہ ہے کہ اس میں برجیاں اور مینارے سرے سے موجود ہی نہیں ہیں۔ اگر ہوتے تو لازماً ان سے رہنمائی حاصل کی جاتی۔

ردِ شرک کی ایک دلیل

سُبْحَانَهُ وَتَعَالَىٰ عَمَّا يُشْرِكُونَ ۔ ہم دوسرے مقام میں واضح کر چکے ہیں کہ یہ صرف تنزیہہ کا کلمہ نہیں ہے بلکہ ردِ شرک کی ایک بہت بڑی دلیل بھی ہے۔ وہ یوں کہ کسی شے کی بنیادی صفات کے ساتھ کسی ایسی صفت کا جوڑ ملانا خلاف عقل ہے جس سے بنیادی صفات میں سے کسی صفت کی نفی ہوتی ہو یا اس سے کوئی تضاد لازم آتا ہو۔ شرک ہر شکل میں یا تو خدا کی بنیادی مسلّم صفات میں سے کسی صفت کی نفی کرتا ہے یا اس سے تضاد لازم آتا ہے۔

توحید کے حق میں تاریخ کی شہادت

وَمَا كَانَ النَّاسُ إِلَّا أُمَّةً وَاحِدَةً فَاخْتَلَفُوا ۔ یہ توحید کے حق میں تاریخی دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ نے

ہمیشہ اپنے نبیوں اور رسولوں کے ذریعہ سے لوگوں کو ایک ہی دین توحید کی تعلیم دی اور ایک ہی امت بنایا۔ لیکن لوگوں نے بعد میں اس میں اختلاف پیدا کر کے کج پیچ کی بہت سی راہیں نکال لیں اور مختلف امتوں اور گروہوں میں بٹ گئے۔ مطلب یہ ہے کہ آج شرک و ضلالت کے مختلف طریقوں کی موجودگی سے کوئی یہ دلیل نہ پکڑے کہ یہ راستے بھی خدا اور رسول کے بتائے ہوئے ہیں۔ ان کو خدا سے کوئی تعلق نہیں بلکہ یہ گمراہوں کی اپنی ایجاد سے ظہور میں آئے ہیں ـــــ ضمناً اس سے جدید فلسفیوں کے اس نظریہ کی بھی تردید ہوگئی کہ انسان نے دین کا آغاز شرک سے کیا پھر درجہ بدرجہ ارتقاء کرتے ہوئے توحید تک پہنچا۔ قرآن اس کے بالکل برعکس یہ کہتا ہے کہ خدا نے شروع ہی سے انسان کو توحید کی تعلیم دی لیکن گمراہوں نے اس میں اختلاف پیدا کر کے فتنے کھڑے کر دیے۔ ہم نے فلسفۂ جدید کے اس باطل نظریہ کی تردید اپنی کتاب "حقیقت توحید" میں تفصیل سے کی ہے۔

وَلَوْلَا کَلِمَۃٌ ...... الایۃ۔ یعنی اس اختلاف کے فیصلہ کے لیے آخرت کا دن خدا کی طرف سے مقرر ہو چکا ہے۔ اگر یہ دن مقرر نہ ہو چکا ہوتا تو آج ہی ان کے درمیان فیصلہ کر دیا جاتا۔

۴۔ آگے کا مضمون ـــــ آیات ۲۰-۲۷

آگے کفار کے مطالبۂ عذاب کا حوالہ دے کر اس کا جواب دیا ہے کہ یہ لوگ عذاب کی کوئی نشانی مانگتے ہیں اور وعدہ کرتے ہیں کہ اس طرح کی کوئی نشانی ان کو دکھا دی گئی تو وہ ضرور ہی ایمان لائیں گے لیکن حالت یہ ہے کہ اس طرح کی کوئی نشانی ظاہر ہوتی ہے تو جب تک اس کی گرفت میں ہوتے ہیں اس وقت تک تو انھیں خدا یاد آتا ہے۔ لیکن جوں ہی ذرا ڈھیل ملی تو پھر اپنی سرمستیوں میں اس طرح کھو جاتے ہیں گویا کوئی بات سرے سے پیش ہی نہیں آئی۔ ایسے لوگوں کو کوئی مزید نشانی دکھلانے سے کیا حاصل؟

پھر کفار کا یہ مغالطہ دور فرمایا ہے کہ آج تمھارے حالات سازگار ہیں اور ہر طرف فراغت و رفاہیت کے سروسامان کی فراوانی ہے تو اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ اب تم خدا کی گرفت سے باہر ہو اور تمھیں کوئی گزند پہنچ ہی نہیں سکتا۔ خدا کے قہر کی بجلی تو اس وقت گرتی ہے جب مستحقِ عذاب قوم اپنے حالات میں اتنی مگن ہوتی ہے کہ وہ یہ سمجھنے لگتی ہے کہ اب آسمان یا زمین سے کوئی خطرہ اسے پیش آ ہی نہیں سکتا۔ اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمائیے۔

وَيَقُولُونَ لَوْلَا أُنزِلَ عَلَيْهِ آيَةٌ مِّن رَّبِّهِ ۖ فَقُلْ إِنَّمَا الْغَيْبُ لِلَّهِ　آیات ۲۰-۲۷
فَانتَظِرُوا إِنِّي مَعَكُم مِّنَ الْمُنتَظِرِينَ ﴿٢٠﴾ وَإِذَا أَذَقْنَا النَّاسَ　ع ۲ / ۷
رَحْمَةً مِّن بَعْدِ ضَرَّاءَ مَسَّتْهُمْ إِذَا لَهُم مَّكْرٌ فِي آيَاتِنَا ۚ قُلِ

اللّٰهُ اَسْرَعُ مَكْرًا ۭ اِنَّ رُسُلَنَا يَكْتُبُوْنَ مَا تَمْكُرُوْنَ ﴿۲۱﴾ هُوَ الَّذِيْ
يُسَيِّرُكُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ ۭ حَتّٰٓي اِذَا كُنْتُمْ فِي الْفُلْكِ ۚ وَجَرَيْنَ بِهِمْ
بِرِيْحٍ طَيِّبَةٍ وَّفَرِحُوْا بِهَا جَاۗءَتْهَا رِيْحٌ عَاصِفٌ وَّجَاۗءَهُمُ الْمَوْجُ
مِنْ كُلِّ مَكَانٍ وَّظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ اُحِيْطَ بِهِمْ ۙ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ
لَهُ الدِّيْنَ ۚ لَىِٕنْ اَنْجَيْتَنَا مِنْ هٰذِهٖ لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الشّٰكِرِيْنَ ﴿۲۲﴾ فَلَمَّآ
اَنْجٰىهُمْ اِذَا هُمْ يَبْغُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ ۭ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّمَا
بَغْيُكُمْ عَلٰٓي اَنْفُسِكُمْ ۙ مَّتَاعَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۡ ثُمَّ اِلَيْنَا مَرْجِعُكُمْ
فَنُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۲۳﴾ اِنَّمَا مَثَلُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا كَمَاۗءٍ
اَنْزَلْنٰهُ مِنَ السَّمَاۗءِ فَاخْتَلَطَ بِهٖ نَبَاتُ الْاَرْضِ مِمَّا يَاْكُلُ النَّاسُ
وَالْاَنْعَامُ ۭ حَتّٰٓي اِذَآ اَخَذَتِ الْاَرْضُ زُخْرُفَهَا وَازَّيَّنَتْ وَظَنَّ اَهْلُهَآ
اَنَّهُمْ قٰدِرُوْنَ عَلَيْهَآ ۙ اَتٰىهَآ اَمْرُنَا لَيْلًا اَوْ نَهَارًا فَجَعَلْنٰهَا حَصِيْدًا
كَاَنْ لَّمْ تَغْنَ بِالْاَمْسِ ۭ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ﴿۲۴﴾
وَاللّٰهُ يَدْعُوْٓا اِلٰى دَارِ السَّلٰمِ ۭ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَاۗءُ اِلٰى صِرَاطٍ
مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۲۵﴾ لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوا الْحُسْنٰى وَزِيَادَةٌ ۭ وَلَا يَرْهَقُ وُجُوْهَهُمْ
قَتَرٌ وَّلَا ذِلَّةٌ ۭ اُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۲۶﴾ وَ
الَّذِيْنَ كَسَبُوا السَّيِّاٰتِ جَزَاۗءُ سَيِّئَةٍۢ بِمِثْلِهَا ۙ وَتَرْهَقُهُمْ ذِلَّةٌ ۭ مَا
لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ عَاصِمٍ ۚ كَاَنَّمَآ اُغْشِيَتْ وُجُوْهُهُمْ قِطَعًا مِّنَ الَّيْلِ
مُظْلِمًا ۭ اُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۲۷﴾

ترجمۂ آیات ۲۰-۲۷

اور وہ کہتے ہیں ان پر ان کے رب کی جانب سے کوئی نشانی کیوں نہیں اتاری جاتی؟ تو تم جواب دے دو کہ غیب کا علم تو بس اللہ ہی کو ہے تو تم لوگ انتظار کرو، میں بھی تمھارے ساتھ انتظار کرنے والوں میں سے ہوں اور انسان کا حال یہ ہے کہ جب کسی تکلیف کے بعد جو اس کو پہنچی ہو ہم اسے اپنے فضل سے نوازتے ہیں تو وہ ہماری نشانیوں کے باب میں چالیں چلنے لگتا ہے۔ کہہ دو، خدا اپنی تدبیروں میں کہیں زیادہ تیز ہے۔ جو چالیں تم چل رہے ہو ہمارے فرستادے ان کو نوٹ کر رہے ہیں۔ ۲۰-۲۱

وہی ہے جو تمھیں خشکی اور تری میں سفر کراتا ہے۔ یہاں تک کہ جب تم کشتی میں ہوتے ہو اور کشتیاں ہوائے موافق سے چل رہی ہوتی ہیں اور وہ اس میں مگن ہوتے ہیں کہ دفعتہً ایک باد تند آتی ہے اور ان پر ہر جانب سے موجیں اٹھنے لگتی ہیں اور وہ گمان کرنے لگتے ہیں کہ ہم ہلاک ہوئے تو وہ اللہ کو پکارتے ہیں خالص اسی کی اطاعت کا عہد کرتے ہوئے کہ اگر تو نے ہمیں اس آفت سے نجات دی تو ہم تیرے شکر گزار بندوں میں سے ہو کر رہیں گے تو جب وہ ان کو نجات دے دیتا ہے وہ نجات پاتے ہی زمین میں، بلا کسی حق کے، سرکشی کرنے لگتے ہیں۔ لوگو، تمھاری سرکشی کا وبال تمھارے ہی اوپر آنے والا ہے۔ چند دن دنیا کی زندگی کا نفع اٹھا لو، پھر تمھاری واپسی ہماری ہی طرف ہے، پھر ہم تمھیں تمھاری کرتوتوں سے آگاہ کریں گے۔ اس دنیا کی زندگی کی تمثیل یوں ہے جیسے بارش کہ ہم نے اسے آسمان سے برسایا پس اس سے زمین کی نباتات خوب اگیں، وہ بھی جن کو لوگ کھاتے ہیں اور وہ بھی جن کو چوپائے کھاتے ہیں۔ یہاں تک کہ جب زمین نے اپنا پورا بناؤ سنگھار کر لیا اور زمین والوں نے گمان کیا کہ اب معاملہ ہمارے قابو میں ہے تو دفعتہً اس پر ہمارا قہر رات کو یا دن کو آدھمکا اور ہم نے اس طرح

اس کا ستھراؤ کر دیا کہ گویا کل کچھ تھا ہی نہیں۔ اسی طرح ہم اپنی نشانیوں کی تفصیل کرتے ہیں ان لوگوں کے لیے جو غور کریں۔ ۲۲-۲۴

اور اللہ امن و سلامتی کے گھر کی طرف بلاتا ہے اور وہ جس کو چاہتا ہے سیدھی راہ کی طرف ہدایت دیتا ہے۔ جن لوگوں نے اچھے کام کیے ان کے لیے اچھا بدلہ ہے اور اس پر مزید بھی اور ان کے چہروں پر نہ سیاہی چھائے گی اور نہ ذلت۔ یہی جنت والے لوگ ہیں وہ اسی میں ہمیشہ رہیں گے اور جنھوں نے بدیاں کمائی ہوں گی تو برائی کا بدلہ اس کے مثل ہے اور ان پر ذلت چھائی ہوئی ہوگی، اللہ سے ان کو کوئی بچانے والا نہ ہو گا۔ گویا ان کے چہرے شب دیجور کے ٹکڑوں سے ڈھانک دیے گئے ہیں۔ یہی لوگ اہل دوزخ ہیں، یہ اسی میں ہمیشہ رہیں گے۔ ۲۵-۲۷

۵- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَيَقُولُونَ لَوْلَا أُنزِلَ عَلَيْهِ آيَةٌ مِّن رَّبِّهِ فَقُلْ إِنَّمَا الْغَيْبُ لِلَّهِ فَانتَظِرُوا إِنِّي مَعَكُم مِّنَ الْمُنتَظِرِينَ (۲۰)

مطالبۂ عذاب کا جواب

'آیت' سے یہاں قرینہ دلیل ہے کہ نشانیٔ عذاب مراد ہے۔ قرآن ان کو دو عذابوں کی خبر دے رہا تھا۔ ایک رسول کی تکذیب کی صورت میں اس دنیا میں۔ دوسرا عدم ایمان کی صورت میں آخرت میں۔ سادات قریش کے پندار پر اس سے بڑی چوٹ پڑتی تھی اور یہ چیز بھی منجملہ ان چیزوں کے تھی جن کی وجہ سے وہ قرآن کے بدلنے یا اس میں ترمیم کا مطالبہ کرتے تھے۔ اس باب میں وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو زچ کرنے کے لیے یہ کہتے کہ اگر یہ اپنی اس دھمکی میں سچے ہیں تو آخر یہ اس عذاب کا نمونہ دکھاتے کیوں نہیں جس کی اس شد و مد سے منادی کرتے پھر رہے ہیں؟ جواب میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے کہلوایا گیا کہ عذاب لانا میرا کام نہیں ہے۔ عذاب کی خبر خدا نے دی ہے۔ میں تم کو اس سے خبردار کر رہا ہوں۔ رہی یہ بات کہ عذاب کب اور کس شکل میں آئے گا تو یہ امور غیب ہیں ان کا علم صرف اللہ ہی کو ہے۔ فَانتَظِرُوا إِنِّي مَعَكُم مِّنَ الْمُنتَظِرِينَ۔ اگر تم اس کے طلبگار ہو تو انتظار کرو میں بھی خدا کی دی ہوئی خبر کی بنا پر اس کے انتظار میں ہوں۔ 'انتظار میں ہوں' سے یہ مقصد نہیں ہے کہ آپ کو اپنی قوم کو مبتلائے عذاب الٰہی دیکھنے کا ارمان تھا۔ حضرات انبیاؑ اپنی قوم کو عذاب سے بچانے کے لیے اپنا ایڑی چوٹی کا زور صرف کر دیتے ہیں لیکن جب قوم اپنی ضد کے سبب سے اپنے اندر وہ تمام

اسباب و علامات جمع کر لیتی ہیں جن کے بعد عذاب آیا کرتا ہے تو قدرتی طور پر نبی کے دل کو بھی ہر وقت کھٹکا لگا رہتا ہے کہ اب مریض کا دم واپسیں ہے اور خدا کا حکم آیا ہی چاہتا ہے۔ اس انتظار میں تمنا کا کوئی دخل نہیں ہوتا ہے بلکہ یہ حسرت و اندوہ کے ساتھ ایک امر شدنی کا انتظار ہوتا ہے۔

وَاِذَآ اَذَقْنَا النَّاسَ رَحْمَةً مِّنْۢ بَعْدِ ضَرَّآءَ مَسَّتْهُمْ اِذَا لَهُمْ مَّكْرٌ فِيْٓ اٰيَاتِنَا ۭ قُلِ اللّٰهُ اَسْرَعُ مَكْرًا ۭ اِنَّ رُسُلَنَا يَكْتُبُوْنَ مَا تَمْكُرُوْنَ (۲۱)

کفار کی پالیسی

وَاِذَآ اَذَقْنَا النَّاسَ۔ یہ حال تو قریش ہی کا بیان ہو رہا ہے لیکن بات عام خطاب کے اسلوب میں کہہ دی گئی ہے تاکہ ان سے بے التفاتی کا اظہار بھی ہو جائے اور یہ حقیقت بھی سامنے آ جائے کہ اس باب خاص میں جو حال ان کا ہے وہی حال سب کا ہے۔ صرف صاحب توفیق ہی ہوتے ہیں جو اس سے الگ روش اختیار کرتے ہیں۔ فرمایا کہ اس قسم کی تنبیہی نشانیاں جو لوگوں کو دکھائی جاتی ہیں ان کا کچھ اثر بس اسی وقت تک رہتا ہے جب تک لوگ اس کی زد میں رہتے ہیں۔ جوں ہی حالات بدلے، محسوس ہوا کہ کشتی گرداب سے باہر نکل آئی، فوراً لیڈر اپنے عوام کے دلوں پر سے اس ابتلا کے تمام اثرات مٹانے کے لیے طرح طرح کے فلسفے بیان کرنا شروع کر دیتے ہیں اور مختلف قسم کی چالوں سے خود بھی اپنی پچھلی سرمستیوں میں کھو جاتے ہیں اور اپنی قوم کو بھی اپنے ساتھ ہانک لے جاتے ہیں۔

اِذَا لَهُمْ مَّكْرٌ فِيْٓ اٰيَاتِنَا۔ لفظ مَكْر کی تحقیق آل عمران کی آیت مَكَرُوْا وَمَكَرَ اللّٰهُ کے تحت بیان ہو چکی ہے۔ مکر کے معنی خفیہ تدبیر اور چال بازی کے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی ان نشانیوں کے باب میں کفار نے جو چال بازی کی اس کی ایک مثال تو یہیں آگے والی آیت میں بیان ہو گئی ہے۔ لَئِنْ اَنْجَيْتَنَا مِنْ هٰذِهٖ لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الشّٰكِرِيْنَ ۔ فَلَمَّآ اَنْجٰىهُمْ اِذَا هُمْ يَبْغُوْنَ فِي الْاَرْضِ (اگر تو نے ہم کو اس ہلاکت سے نجات دے دی تو ہم تیرے شکرگزار بندے بن کر رہیں گے لیکن جب ان کو نجات دے دی تو پھر وہ زمین میں سرکشی کرنے لگے) دوسری مثال اس کی قَدْ مَسَّ اٰبَآءَنَا الضَّرَّآءُ وَالسَّرَّآءُ، والی آیت میں بیان ہوئی ہے یعنی ان کے لیڈر اپنے کو تسلی دیتے اور اپنے عوام کو مطمئن کرنے کے لیے اپنے ضمیر کے بالکل خلاف تاریخ کا یہ فلسفہ بیان کرنا شروع کر دیتے ہیں کہ اس قسم کے نرم گرم حالات تو قوموں کی زندگی میں پیش آیا ہی کرتے ہیں، ہمارے بزرگوں کو بھی پیش آئے ہمیں بھی پیش آ رہے ہیں۔ ان کو خواہ مخواہ یہ اہمیت کیوں دی جائے کہ یہ خدا کی طرف سے بطور تنبیہ پیش آئے ہیں یا ان کا کوئی تعلق ہمارے اعمال و عقائد سے ہے۔

قُلِ اللّٰهُ اَسْرَعُ مَكْرًا۔ مکر کی نسبت جب اللہ کی طرف ہوتی ہے تو اس کا مفہوم خفیہ تدبیر ہو جاتا ہے۔ ہم آل عمران کی مذکورہ بالا آیت کے تحت اس کے مختلف پہلوؤں کی وضاحت کر آئے ہیں۔ آیت کا مفہوم یہ ہے کہ تم چالیں چلنی چاہتے ہو تو خوب چل لو، خدا نے تم کو جو یہ ڈھیل دے رکھی ہے تو اس وجہ سے دے رکھی ہے کہ اس کو اپنی تدبیر کے بروئے کار لانے میں کوئی دقت صرف نہیں کرنا پڑتا ہے۔ اس کی تدبیر

... ہر شئے کا رد آتی ہے اور اتنی محکم ہوتی ہے کہ کوئی اس سے بچ کے نکل نہیں سکتا۔ اِنَّ رُسُلَنَا یَکْتُبُوْنَ مَا تَمْکُرُوْنَ، سے یہاں مراد فرشتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ تمہاری ایک ایک چال ہمارے فرشتے نوٹ کر رہے ہیں۔ کوئی چیز ہم سے مخفی نہیں۔ وقت آنے پر ہم اس کا نوٹس لیں گے پھر تمہاری ساری چالیں دھری کی دھری رہ جائیں گی۔

هُوَ الَّذِیْ یُسَیِّرُکُمْ فِی الْبَرِّ وَالْبَحْرِ ؕ حَتّٰۤی اِذَا کُنْتُمْ فِی الْفُلْکِ ۚ وَجَرَیْنَ بِهِمْ بِرِیْحٍ طَیِّبَةٍ وَّفَرِحُوْا بِهَا جَآءَتْهَا رِیْحٌ عَاصِفٌ وَّجَآءَهُمُ الْمَوْجُ مِنْ کُلِّ مَکَانٍ وَّظَنُّوْۤا اَنَّهُمْ اُحِیْطَ بِهِمْ ۙ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِیْنَ لَهُ الدِّیْنَ ۚ لَئِنْ اَنْجَیْتَنَا مِنْ هٰذِهٖ لَنَکُوْنَنَّ مِنَ الشّٰکِرِیْنَ ۝ فَلَمَّاۤ اَنْجٰهُمْ اِذَا هُمْ یَبْغُوْنَ فِی الْاَرْضِ بِغَیْرِ الْحَقِّ ؕ یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اِنَّمَا بَغْیُکُمْ عَلٰۤی اَنْفُسِکُمْ ۙ مَّتَاعَ الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا ۫ ثُمَّ اِلَیْنَا مَرْجِعُکُمْ فَنُنَبِّئُکُمْ بِمَا کُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (۲۲-۲۳)

یُسَیِّرُکُمْ، تسییر، کے معنی چلانے کے ہیں۔ یہاں یہ سفر کرانے کے معنی میں آیا ہے۔ چونکہ تمام وسائل سفر الخ خدا ہی کے پیدا کردہ ہیں اور وہ تدبیر و حکمت بھی خدا ہی کی عطا کردہ ہے جس سے کام لے کر انسان خشکی و تری کے سفر کے وسائل ایجاد کرتا اور ان سے فائدہ اٹھاتا ہے اس وجہ سے فرمایا کہ وہی تمہیں خشکی و تری میں سفر کراتا ہے تاکہ انسان کی نگاہ اسباب و وسائل ہی میں اٹک کر نہ رہ جائے بلکہ اسباب و وسائل پیدا کرنے والے تک پہنچے۔

فِی الْفُلْکِ ۔ 'فُلْک' کے معنی کشتی کے ہیں۔ ہم دوسرے مقام میں واضح کر چکے ہیں کہ یہ مذکر، مونث، واحد جمع، سب کے لیے آتا ہے۔ چنانچہ یہاں اس کے لیے فعل 'جَرَیْنَ' جمع استعمال ہوا ہے۔

وَجَرَیْنَ بِهِمْ بِرِیْحٍ طَیِّبَةٍ ۔ 'رِیْحٌ طَیِّبَةٌ' سے سازگار ہوا مراد ہے۔ اس کا متقابل لفظ 'رِیْحٌ عَاصِفٌ' استعمال ہوا ہے جو طوفانی ہوا کے لیے آتا ہے۔ اوپر سے بات صیغۂ خطاب میں آرہی ہے۔ یہاں سے اسلوب غائب کا ہوگیا۔ اس لیے کہ یہ تمثیل ہے اور تمثیل کے لیے اسلوب بیان عمومی ہی موزوں اور مؤثر ہوتا ہے۔

وَیَبْغُوْنَ فِی الْاَرْضِ بِغَیْرِ الْحَقِّ ۔ 'بغی' استکبار کا نتیجہ ہوتی ہے اور استکبار صرف اس کے لیے روا ہے جس کا خلق و تدبیر میں کوئی حصہ ہو۔ جو خود مخلوق اور ہر چیز میں خالق کے رحم و کرم کا محتاج ہو اس کے اکڑنے اور وہ بھی اپنے خالق کے سامنے کے کیا معنی! اس وجہ سے یہ بغی بغیر حق ہے۔

'یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ' میں خطاب پھر قریش سے ہوگیا اور 'مَتَاعَ الْحَیٰوةِ' میں لفظ 'متاع' فعل محذوف سے منصوب ہے۔

ایک حقیقت افروز تمثیل

اجزا کی تشریح کے بعد اب نفس آیت کے مفہوم پر غور فرمائیے۔ یہ اوپر والی آیت میں بیان کردہ حقیقت کی تمثیل ہے۔ اوپر فرمایا تھا کہ انسان کا حال یہ ہے کہ جب ہم اس کو کسی دکھ کے بعد سکھ پہنچاتے ہیں تو وہ ہماری نشانیوں سے صحیح فائدہ اٹھانے کے بجائے ہم سے چال بازیاں کرتا ہے۔ اسی حقیقت کو انسانی زندگی کے ایک عام الورود واقعہ سے مثال دے کر سمجھایا ہے کہ جس طرح ایک کشتی کے مسافر سفر پر روانہ ہوتے ہیں تو جب

ہوا موافق ہوتی ہے اور کشتی نہایت سکون سے اپنی منزل کی طرف رواں دواں ہوتی ہے تو سب مگن ہوتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اب ان کی اس خوشی میں کوئی خلل انداز ہو ہی نہیں سکتا۔ لیکن زیادہ وقت نہیں گزرتا کہ کسی گوشے سے طوفانی ہوا اٹھتی ہے اور موجوں کے تھپیڑوں سے کشتی اس طرح ہچکولے کھانے لگتی ہے کہ ہر شخص یہ گمان کرنے لگتا ہے کہ اب ڈوبی کہ تب۔ اس نازک وقت میں سب خدا سے دعا و فریاد اور یہ عہد کرتے ہیں کہ اب اگر اس ورطۂ ہلاکت سے خدا نے نجات دے دی تو ہم آیندہ اس کے شکرگزار اور فرمانبردار بندے بن کر زندگی بسر کریں گے۔ لیکن جب خدا ان کو اس گردش سے نجات دے دیتا ہے تو اپنا یہ عہد بھول کر پھر اپنی پچھلی سرمستیوں اور شرارتوں میں کھو جاتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ یہی حال اس وقت ان لوگوں کا ہے جو عذاب کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ اس وقت زندگی کا سفینہ نہایت سکون سے رواں ہے۔ حالات سازگار ہیں۔ اس وجہ سے اپنی شرارتوں میں مگن ہیں۔ پیغمبر ان کو خدا کی پکڑ سے ڈراتا ہے تو ان کی سمجھ میں یہ بات نہیں آ رہی ہے کہ عذاب کیوں آ جائے گا اور کدھر سے آ جائے گا۔ چنانچہ بڑی ڈھٹائی سے پیغمبر کو چیلنج کر رہے ہیں لیکن جب کسی گرفت میں آ جائیں گے تو توبہ توبہ پکاریں گے لیکن وہ اپنی اس توبہ پر صرف اس وقت تک قائم رہیں گے جب تک گرفت میں رہیں گے۔ گرفت سے باہر ہوتے ہی پھر اسی طرح اکڑنے لگیں گے گویا خدا کی خدائی سے باہر ہو گئے۔ مدعا یہ کہ کوئی یہ نہ خیال کرے کہ اس طرح کے لوگوں کو کسی تنبیہ سے کوئی فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ ان کے دلوں کا زنگ کسی رگڑے سے بھی دور نہیں ہوتا۔ اس طرح کے اشقیا صرف خدا کے فیصلہ کن عذاب ہی کے حوالہ ہوتے ہیں۔

قریش کو تہدید

'یَاَیُّھَا النَّاسُ' تمثیل کے بعد یہ قریش کو پھر خطاب کیا ہے اور یہ خطاب اپنے اندر نہایت سخت تہدید و وعید رکھتا ہے۔ 'اِنَّمَا بَغْیُکُمْ عَلٰٓی اَنْفُسِکُمْ' یعنی تمہاری اس شرارت و سرکشی سے نہ خدا کا کچھ بگڑے گا نہ رسولؐ کا۔ بگڑے گا تمہارا ہی۔ تمہاری ہر سرکشی تم پر خدا کی حجت پوری کرے گی اور تم جتنے قدم اس راہ میں بڑھو گے اتنے ہی خدا کے فیصلہ کن عذاب سے قریب تر ہو گے۔ 'مَّتَاعَ الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا' یعنی اس دنیا کے جس سر و سامان پر ریجھے ہوئے ہو اس سے کچھ دن فائدہ اٹھا لو لیکن یاد رکھو کہ واپسی ہماری ہی طرف ہے، کسی اور کی طرف نہیں ہے۔ اس وقت ہم تمہارا سارا کچا چٹھا تمہارے سامنے رکھ دیں گے اور تمہارا کوئی سفارشی تمہارے کچھ کام نہ آئے گا۔

اِنَّمَا مَثَلُ الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا کَمَآءٍ اَنْزَلْنٰہُ مِنَ السَّمَآءِ فَاخْتَلَطَ بِہٖ نَبَاتُ الْاَرْضِ مِمَّا یَاْکُلُ
النَّاسُ وَالْاَنْعَامُ ؕ حَتّٰٓی اِذَآ اَخَذَتِ الْاَرْضُ زُخْرُفَھَا وَازَّیَّنَتْ وَظَنَّ اَھْلُھَآ اَنَّھُمْ قٰدِرُوْنَ عَلَیْھَآ ۙ اَتٰھَآ
اَمْرُنَا لَیْلًا اَوْ نَھَارًا فَجَعَلْنٰھَا حَصِیْدًا کَاَنْ لَّمْ تَغْنَ بِالْاَمْسِ ؕ کَذٰلِکَ نُفَصِّلُ الْاٰیٰتِ لِقَوْمٍ یَّتَفَکَّرُوْنَ (۲۴)

حیاتِ دنیا کی تمثیل

'اِنَّمَا مَثَلُ الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا' یہ اس حیاتِ دنیا کی تمثیل ہے جس کا ذکر اوپر والی آیت میں 'مَتَاعَ الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا' کے الفاظ سے ہوا ہے جس پر کفار ریجھے ہوئے ہیں اور اس کو اس قدر مامون سمجھے ہوئے تھے کہ اس میں کسی رخنے کا ان کو امکان ہی نظر نہیں آتا تھا۔

فَاخْتَلَطَ بِهٖ نَبَاتُ الْاَرْضِ مِمَّا يَاْكُلُ النَّاسُ وَالْاَنْعَامُ۔ 'اختلاط' کے معنی کسی شے کے باہم گڈمڈ ہو جانے اور گتھم گتھا ہو جانے کے ہیں۔ یہ فصلوں اور نباتات کے خوب اپجنے کی تعبیر ہے اس لیے کہ سازگار بارش سے جب فصل نشوونما پاتی ہے تو وہ باہم گڈمڈ ہو کر خوب گھنی ہو جاتی ہے۔ مِمَّا يَاْكُلُ النَّاسُ وَالْاَنْعَامُ یعنی ہر نوع کی نباتات خوب اپجیں، وہ بھی جو انسانوں کے کام آتی ہیں اور وہ بھی جو مویشیوں کے مصرف کی ہوتی ہیں۔

اَخَذَتِ الْاَرْضُ زُخْرُفَهَا وَازَّيَّنَتْ۔ 'زخرف'، حسن، زینت اور ملمع کو کہتے ہیں۔ یہیں سے یہ لفظ زمین کی گوناگوں و بوقلموں نباتات کے لیے بھی آتا ہے۔ 'ازّین' اور 'تزیّن' ایک ہی مفہوم کے لیے آتے ہیں۔

وَظَنَّ اَهْلُهَآ اَنَّهُمْ قٰدِرُوْنَ عَلَيْهَآ، یعنی جب فصل اپنے جوبن پر ہوتی ہے، ان کے مالکوں کے دل حوصلہ اور امنگ سے لبریز ہو جاتے ہیں کہ اب کیا اندیشہ ہے، اب تو بازی ہماری ہے۔

اَتٰهَآ اَمْرُنَا لَيْلًا اَوْ نَهَارًا فَجَعَلْنٰهَا حَصِيْدًا كَاَنْ لَّمْ تَغْنَ بِالْاَمْسِ۔ 'امر' یہاں عذاب کے مفہوم میں ہے۔ 'لَيْلًا اَوْ نَهَارًا' یعنی رات یا دن میں جس وقت بھی ہم نے چاہا اپنا عذاب بھیج دیا، کوئی ہمارا ہاتھ پکڑنے والا نہیں تھا۔ 'حصید' کاٹی ہوئی فصل کو کہتے ہیں 'كَاَنْ لَّمْ تَغْنَ بِالْاَمْسِ' یعنی اس طرح ستھراؤ کر دیا کہ ع گویا کہ ان تلوں میں کبھی تیل ہی نہ تھا۔

خدا کی پکڑ دورِ عروج میں ہوتی ہے

آیت کا مفہوم یہ ہے کہ دنیا کی زندگی جس کو تم بہت کامیاب اور مامون سمجھ رہے ہو، اس کے غرّے میں خدا کو چیلنج نہ کرو۔ جس طرح دیکھتے ہو کہ بارش ہوتی ہے۔ فصل اپجتی ہے۔ باغ پھلتے ہیں۔ ان کے مالک ان کو دیکھ کر پھولے نہیں سماتے کہ دفعتہً قہرِ الٰہی کا کوئی جھونکا آتا ہے اور سب کو خس و خاشاک کی طرح اڑا دیتا ہے اسی طرح جب ہمارا فیصلہ صادر ہو جائے گا ہم تمھیں، عین اسی حالت میں جس کو تم اپنی ترقی اور عروج کا دور خیال کیے بیٹھے ہو، دھر لیں گے اور تم ہمارے مقابلے میں کچھ نہ کر سکو گے۔ تم عذاب کی نشانی دیکھنا چاہتے ہو تو اس دنیا میں جو نشانیاں ہماری آئے دن ظاہر ہوتی رہتی ہیں ہم ان کی تفصیل تمھیں سنا رہے ہیں۔ جن کے اندر غور کرنے کی صلاحیت ہے وہ ان پر غور کریں۔ عاقل وہ ہے جو دوسروں کے حالات سے سبق لے، نہ کہ اس وقت آنکھ کھولے جب خود اپنے سر پر گزر جائے۔ سورۂ قلم کی آیات ۱۷-۲۶ میں باغ والوں کی جو تمثیل بیان ہوئی ہے اس میں بھی یہی حقیقت واضح کی گئی ہے۔ اس سے یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ جن قوموں پر اللہ کی حجت تمام ہو جاتی ہے ان کو وہ عین دورِ عروج میں پکڑ لیتا ہے۔ اس لیے کہ خدا کے ہاں اصلی اہمیت عقائد و اعمال کی ہے نہ کہ مادی اسباب و وسائل کی۔ اگر ایک قوم اخلاقی اعتبار سے گر چکی ہے تو اسباب و وسائل کی فراوانی اس کو سہارا دینے کے بجائے اس کے زوال کی رفتار کو اور تیز کر دیتی ہے۔

وَاللّٰهُ يَدْعُوْٓا اِلٰى دَارِ السَّلٰمِ ۭ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَاۗءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۔ لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوا الْحُسْنٰى وَزِيَادَةٌ ۭ وَلَا يَرْهَقُ وُجُوْهَهُمْ قَتَرٌ وَّلَا ذِلَّةٌ ۭ اُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۔

وَالَّذِیۡنَ کَسَبُوا السَّیِّاٰتِ جَزَآءُ سَیِّئَۃٍۭ بِمِثۡلِہَا ۙ وَ تَرۡہَقُہُمۡ ذِلَّۃٌ ؕ مَا لَہُمۡ مِّنَ اللّٰہِ مِنۡ عَاصِمٍ ۚ کَاَنَّمَاۤ اُغۡشِیَتۡ وُجُوۡہُہُمۡ قِطَعًا مِّنَ الَّیۡلِ مُظۡلِمًا ؕ اُولٰٓئِکَ اَصۡحٰبُ النَّارِ ۚ ہُمۡ فِیۡہَا خٰلِدُوۡنَ (۲۵-۲۷)

'وَاللّٰہُ یَدۡعُوۡۤا اِلٰی دَارِ السَّلٰمِ' سلام کے معنی سکھ اور چین کے ہیں۔ اس سے مراد جنت ہے اس لیے کہ وہی ایسی جگہ ہے جہاں پہنچ جانے کے بعد آدمی کے لیے نہ ماضی کا غم ہوگا، نہ مستقبل کا کوئی اندیشہ بلکہ دائمی سکھ اور ابدی چین کی زندگی ہوگی۔ اس لفظ کے استعمال میں یہاں ایک تلمیح ہے اس دنیا کی طرف سے جس پر کفار ریجھے ہوئے تھے۔ مطلب یہ ہے کہ تم تو جس زندگی پر فریفتہ ہو وہ ہر وقت خدا کی برق غضب کی زد میں ہے، البتہ خدا تمھیں جس گھر کی دعوت دے رہا ہے وہ ابدی امن و سلامتی کا گھر ہے۔

'وَیَہۡدِیۡ مَنۡ یَّشَآءُ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسۡتَقِیۡمٍ' لیکن اس گھر کی راہ اختیار کرنا ہر ایک کا نصیبہ نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ اس گھر کو جانے والی سیدھی راہ کی توفیق انہی کو دیتا ہے جن کو چاہتا ہے۔ 'جن کو چاہتا ہے' یعنی جو سنت الٰہی کے مطابق اس کے اہل ٹھہرتے ہیں۔ یہ سنت تمام تر عدل و حکمت پر مبنی ہے۔ اس کی وضاحت ایک سے زیادہ مقامات میں گزر چکی ہے۔

'لِلَّذِیۡنَ اَحۡسَنُوا الۡحُسۡنٰی وَزِیَادَۃٌ' یہ اس سکھ کے گھر میں لوگوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے معاملے کی تفصیل ہے کہ جن لوگوں نے دنیا میں نیکی کمائی اور احسان کی روش اختیار کی ہوگی ان کے لیے ان کی نیکی کا بدلہ اچھا بھی ہوگا اور ان پر مزید فضل بھی ہوگا۔ یہاں اس مزید فضل کی وضاحت نہیں ہوئی ہے۔ دوسرے مقام میں اس کی تفصیل یوں آئی ہے۔ 'مَنۡ جَآءَ بِالۡحَسَنَۃِ فَلَہٗ عَشۡرُ اَمۡثَالِہَا' ۱۶۰ - انعام (جو بھلائی لے کر حاضر ہوگا تو اس کے لیے اس کا دس گنا اجر ہے)

'وَلَا یَرۡہَقُ وُجُوۡہَہُمۡ قَتَرٌ وَّلَا ذِلَّۃٌ' 'رہق' کے معنی چھا جانے اور غالب آجانے کے ہیں اور 'قتر' غبار، کدورت اور سیاہی کو کہتے ہیں۔ یہاں قرینہ دلیل ہے کہ وہ سیاہی مراد ہے جو شدتِ یاس کے نتیجہ میں چہرے پر چھا جاتی ہے۔ یہاں جن چیزوں کی نفی کی ہے، ان کی نفی سے مقصود ان کے ضد پہلو کا اثبات ہے یعنی ان کے چہرے اپنی کامیابیوں پر ہشاش بشاش ہوں گے اور ہر قدم پر ان کے ساتھ اعزاز و تکریم کا معاملہ ہو رہا ہوگا۔

'جَزَآءُ سَیِّئَۃٍۭ بِمِثۡلِہَا وَ تَرۡہَقُہُمۡ ذِلَّۃٌ مَا لَہُمۡ مِّنَ اللّٰہِ مِنۡ عَاصِمٍ' یہ بروں کا انجام بیان ہوا ہے کہ برائی کا بدلہ پورے انصاف کے ساتھ بالکل ہموزن ہوگا۔ ان کے ساتھ کوئی زیادتی نہیں ہوگی۔ 'وَتَرۡہَقُہُمۡ ذِلَّۃٌ' میں 'ذلت' کے ساتھ 'قتر' کا ذکر نہیں کیا۔ اس کی تفصیل 'کَاَنَّمَاۤ اُغۡشِیَتۡ وُجُوۡہُہُمۡ قِطَعًا مِّنَ الَّیۡلِ مُظۡلِمًا' کی تشبیہ میں آگئی اور اس سے یہ بات بھی واضح ہوگئی کہ 'قتر' سے مراد مایوسی کی سیاہی ہے اور چونکہ یہ ابدی مایوسی کی سیاہی ہوگی اس وجہ سے ایسا معلوم ہوگا کہ گویا ان کے چہروں پر شب تاریک کے ٹکڑے کاٹ کاٹ کر ڈال دیے گئے ہیں۔ 'مَا لَہُمۡ مِّنَ اللّٰہِ مِنۡ عَاصِمٍ' سلسلۂ کلام کے بیچ میں جملہ معترضہ کے محل میں ہے۔ یعنی اس ابدی

مایوسی اور ذلت سے ان کو وہاں چھڑانے والا کوئی نہیں ہوگا۔ دنیا میں جن معبودوں سے سفارش اور مدد کی امیدیں باندھ کر ان کی پرستش کی ہوگی وہ سب ہوا ہو جائیں گے۔ ان میں سے کوئی کام آنے والا نہ بنے گا۔

۶-آگے کا مضمون ــــــ آیات ۲۸-۳۶

اوپر (وَمَا لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ عَاصِمٍ) میں یہ اشارہ جو فرمایا تھا کہ ابدی مایوسی اور ذلت سے چھڑانے میں ان کے مزعومہ شرکاء اور شفعاء کچھ کام آنے والے نہیں، آگے اس اشارے کی تفصیل فرما دی کہ آخرت میں ان کا کیا حال ہوگا اور ساتھ ہی اس بات کی بھی وضاحت فرما دی کہ مجرد ظن کی بنیاد پر آرزوؤں کے جو ہوائی قلعے تعمیر کیے جاتے ہیں وہ اسی طرح مسمار ہوتے ہیں۔ آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۲۸-۳۶ وَيَوْمَ نَحْشُرُهُمْ جَمِيعًا ثُمَّ نَقُولُ لِلَّذِينَ أَشْرَكُوا مَكَانَكُمْ أَنْتُمْ وَ
شُرَكَاؤُكُمْ ۚ فَزَيَّلْنَا بَيْنَهُمْ ۖ وَقَالَ شُرَكَاؤُهُمْ مَا كُنْتُمْ إِيَّانَا تَعْبُدُونَ ﴿۲۸﴾
فَكَفَىٰ بِاللَّهِ شَهِيدًا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ إِنْ كُنَّا عَنْ عِبَادَتِكُمْ لَغَافِلِينَ ﴿۲۹﴾
هُنَالِكَ تَبْلُو كُلُّ نَفْسٍ مَا أَسْلَفَتْ ۚ وَرُدُّوا إِلَى اللَّهِ مَوْلَاهُمُ
ع ۳ ۸ النصف الْحَقِّ ۖ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَا كَانُوا يَفْتَرُونَ ﴿۳۰﴾ قُلْ مَنْ يَرْزُقُكُمْ مِنَ
السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ أَمَّنْ يَمْلِكُ السَّمْعَ وَالْأَبْصَارَ وَمَنْ يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ
الْمَيِّتِ وَيُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَمَنْ يُدَبِّرُ الْأَمْرَ ۚ فَسَيَقُولُونَ اللَّهُ ۚ
فَقُلْ أَفَلَا تَتَّقُونَ ﴿۳۱﴾ فَذَٰلِكُمُ اللَّهُ رَبُّكُمُ الْحَقُّ ۖ فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ
إِلَّا الضَّلَالُ ۖ فَأَنَّىٰ تُصْرَفُونَ ﴿۳۲﴾ كَذَٰلِكَ حَقَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ عَلَى الَّذِينَ
فَسَقُوا أَنَّهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ ﴿۳۳﴾ قُلْ هَلْ مِنْ شُرَكَائِكُمْ مَنْ يَبْدَأُ الْخَلْقَ
ثُمَّ يُعِيدُهُ ۚ قُلِ اللَّهُ يَبْدَأُ الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيدُهُ ۖ فَأَنَّىٰ تُؤْفَكُونَ ﴿۳۴﴾
قُلْ هَلْ مِنْ شُرَكَائِكُمْ مَنْ يَهْدِي إِلَى الْحَقِّ ۚ قُلِ اللَّهُ يَهْدِي لِلْحَقِّ ۗ
أَفَمَنْ يَهْدِي إِلَى الْحَقِّ أَحَقُّ أَنْ يُتَّبَعَ أَمَّنْ لَا يَهِدِّي إِلَّا أَنْ يُهْدَىٰ ۖ

فَمَا لَكُمْ كَيْفَ تَحْكُمُونَ ﴿٣٥﴾ وَمَا يَتَّبِعُ أَكْثَرُهُمْ إِلَّا ظَنًّا إِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِي
مِنَ الْحَقِّ شَيْئًا إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ بِمَا يَفْعَلُونَ ﴿٣٦﴾

ترجمۂ آیات ۲۸-۳۶

اور یاد کرو اس دن کو جس دن ہم سب کو اکٹھا کریں گے پھر ہم شرک کرنے والوں کو حکم دیں گے کہ تم اور تمہارے شرکا، اپنی جگہ ٹھہرو۔ پھر ہم ان کے درمیان تفریق کریں گے اور ان کے شریک کہیں گے، تم ہم کو تو نہیں پوجتے تھے، اللہ ہمارے اور تمہارے درمیان گواہی کے لیے کافی ہے۔ ہم تمہاری عبادت سے بالکل ہی بے خبر رہے۔ اس وقت ہر شخص اپنے اس عمل سے دوچار ہوگا جو اس نے کیا ہوگا اور لوگ اپنے مولائے حقیقی کے حضور پیش ہوں گے اور افترا کر کے انھوں نے جو معبود بنائے تھے وہ سب ہوا ہو جائیں گے۔ ۲۸-۳۰

ان سے پوچھو، کون تم کو آسمان اور زمین سے روزی دیتا ہے؟ یا کون ہے جو سمع اور بصر پر اختیار رکھتا ہے اور کون ہے جو زندہ کو مردہ سے اور مردہ کو زندہ سے نکالتا ہے اور کون ہے جو ساری کائنات کا انتظام فرماتا ہے، تو جواب دیں گے اللہ، تو ان سے کہو کہ کیا تم اس اللہ سے ڈرتے نہیں؟ پس وہی اللہ تمہارا رب حقیقی ہے تو حق کے بعد گمراہی کے سوا اور کیا ہے تو کہاں تمہاری عقل الٹ جاتی ہے؟ اسی طرح تیرے رب کی بات ان لوگوں پر پوری ہو چکی ہے جنھوں نے نافرمانی کی ہے کہ وہ ایمان نہیں لائیں گے۔ ۳۱-۳۳

پوچھو تمہارے شرکا میں کوئی ہے جو خلق کا آغاز کرتا ہو پھر وہ اس کا اعادہ کرے گا؟ کہہ دو اللہ ہی ہے جو خلق کا آغاز کرتا ہے۔ پھر وہ اس کا اعادہ فرمائے گا تو تم کہاں اوندھے ہوئے جاتے ہو؟ پوچھو، کیا تمہارے شرکا میں کوئی ہے جو حق کی طرف رہنمائی کرتا ہو، کہہ دو اللہ ہی ہے جو حق کی توفیق بخشتا ہے۔ تو کیا جو حق کی طرف رہنمائی کرتا ہے وہ پیروی کیے جانے کا مستحق

ہے یا وہ جو بغیر رہنمائی کے خود راہ نہیں پاتے؟ تو تمھیں کیا ہو گیا ہے تم کیسا فیصلہ کرتے ہو! اور ان میں سے اکثر محض گمان کے پیچھے چل رہے ہیں اور گمان حق کا بدل ذرا بھی نہیں ہو سکتا اور جو کچھ یہ کر رہے ہیں اللہ اس سے خوب باخبر ہے۔ ۲۸-۳۶

۷- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَيَوْمَ نَحْشُرُهُمْ جَمِيعًا ثُمَّ نَقُولُ لِلَّذِينَ أَشْرَكُوا مَكَانَكُمْ أَنتُمْ وَشُرَكَاؤُكُمْ فَزَيَّلْنَا بَيْنَهُمْ وَقَالَ شُرَكَاؤُهُم مَّا كُنتُمْ إِيَّانَا تَعْبُدُونَ فَكَفَىٰ بِاللَّهِ شَهِيدًا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ إِن كُنَّا عَنْ عِبَادَتِكُمْ لَغَافِلِينَ (۲۸-۲۹)

مشرکین اور ان کے شرکا ساتھ ہیں۔

'وَيَوْمَ نَحْشُرُهُمْ جَمِيعًا' میں 'جَمِيعًا' کی تاکید اس حقیقت کو ظاہر کرتی ہے کہ مشرکین کے ساتھ اللہ تعالیٰ ان کے ان شریکوں اور شفیعوں کو بھی جمع کرے گا جن کو انھوں نے خدا کی خدائی میں شریک ٹھہرا کر ان کی عبادت کی اور ان کو اپنا سفارشی سمجھا۔

'ثُمَّ نَقُولُ لِلَّذِينَ أَشْرَكُوا مَكَانَكُمْ أَنتُمْ وَشُرَكَاؤُكُمْ فَزَيَّلْنَا بَيْنَهُمْ'۔ 'مَكَانَكُمْ' سے پہلے 'اُمْكُثُوا' یا 'قِفُوا' یا ان کے ہم معنی کوئی فعل محذوف ہے۔ یعنی بس اپنی جگہ پہ ٹھہر جاؤ۔ عربی میں جب کسی فوری اور واجب التعمیل حکم کا موقع ہو تو ظرف یا مفعول سے پہلے اس طرح فعل کو حذف کر دیتے ہیں تاکہ مخاطب کی ساری توجہ اصل بات پر مرتکز ہو جائے 'فَزَيَّلْنَا'، یہ اس روکنے کے مقصد کی تفصیل ہے۔ 'تَزْيِيل' کے معنی تفریق اور جدائی ڈال دینے کے ہیں۔ قرآن مجید میں ایک سے زیادہ مقامات میں اس بات کی تصریح ہے کہ قیامت کے دن مشرکین اور ان کے معبودوں میں جدائی ڈال دی جائے گی اور معبود اپنے عابدوں سے اس دن اظہار برأت بھی کریں گے اور خدا کی قسم کھا کر یہ بھی ان کو بتائیں گے کہ ہمیں اصلاً خبر نہیں کہ دنیا میں تم ہماری عبادت کرتے رہے۔ بقرہ آیت ۱۶۶ اور ۱۶۷ اور انعام آیت ۹۴ میں یہ مضمون گزر چکا ہے۔

شرکا کا اعلان برأت

'وَقَالَ شُرَكَاؤُهُم ...... الاية' یہ مزعومہ شریکوں کا اعلان برأت ہے جو ساری خدائی کے آگے ان کے پرستاروں کو رسوا کرے گا۔ انھیں تو یہ امید ہو گی کہ ساری زندگی جن کی عبادت کی ہے اور جن کو نذریں اور قربانیاں پیش کی ہیں آج وہ ان کے کام آئیں گے اور خدا نے ان پہ ہاتھ ڈالا تو یہ ان کو چھڑائیں گے لیکن قبل اس کے کہ یہ زبانیں کھولیں وہ خدا کی قسم کھا کر کہیں گے کہ ہمیں خبر بھی نہیں کہ کچھ احمق لوگ ہماری عبادت کرتے رہے ہیں۔ 'فَكَفَىٰ بِاللَّهِ شَهِيدًا' قسم کے معنی میں ہے اور 'إِن كُنَّا' میں 'إِن' مخففہ ہے جو 'إِنَّ' کے معنی میں ہوتا ہے اور اس کے بعد 'لَغَافِلِينَ' پر جو لام ہے وہ اس کا قرینہ ہے۔

هُنَالِكَ تَبْلُوا كُلُّ نَفْسٍ مَّآ أَسْلَفَتْ وَرُدُّوٓا إِلَى ٱللَّهِ مَوْلَىٰهُمُ ٱلْحَقِّ وَضَلَّ عَنْهُم مَّا كَانُوا۟ يَفْتَرُونَ (۳۰)

ہر شخص کی پیشی خدا کے آگے ہوگی

'بَلَا یَبْلُو' کے معنی تجربہ کرنے، جانچنے، آزمانے اور چکھنے کے ہیں۔ یعنی مشرکین تو اس امید میں ہیں کہ اگر قیامت ہوئی تو، خواہ ان کے اعمال کچھ ہی ہوں، ان کے دیوی دیوتا ان کو چھڑا ہی لیں گے لیکن وہاں سابقہ ہر شخص کو اپنے ان اعمال سے پیش آئے گا جو اس نے کیے ہوں گے اور وہ انھیں کو بھگتے گا۔ وَرُدُّوٓا إِلَى ٱللَّهِ مَوْلَىٰهُمُ ٱلْحَقِّ وَضَلَّ عَنْهُم مَّا كَانُوا۟ يَفْتَرُونَ یعنی یہ تو توقع لیے بیٹھے ہیں کہ قیامت ہوئی تو ان کے دیوی دیوتا وہاں ان کا خیر مقدم کریں گے لیکن وہاں ہوگا یہ کہ ان کے یہ سارے دیوی دیوتا جو انھوں نے خدا پر افترا کر کے گھڑے ہیں، سب غائب ہو جائیں گے اور سب کی روبکاری اللہ واحد کے حضور میں ہوگی جو ان کا اور سب کا مولائے حقیقی ہے۔ مولیٰ کا صحیح مفہوم مرجع ہے اور مولائے حق کا لفظ یہاں ان کے ان فرضی معبودوں کے مقابل میں استعمال ہوا ہے جو اللہ پر افترا کر کے گھڑے گئے تھے یعنی ان کے متعلق بالکل جھوٹ دعویٰ کیا گیا کہ خدا نے ان کو اپنا شریک بنایا ہے اور یہ ان کے سفارشی ہوں گے۔

قُلْ مَن يَرْزُقُكُم مِّنَ ٱلسَّمَآءِ وَٱلْأَرْضِ أَمَّن يَمْلِكُ ٱلسَّمْعَ وَٱلْأَبْصَٰرَ وَمَن يُخْرِجُ ٱلْحَىَّ مِنَ ٱلْمَيِّتِ وَيُخْرِجُ ٱلْمَيِّتَ مِنَ ٱلْحَىِّ وَمَن يُدَبِّرُ ٱلْأَمْرَ ۚ فَسَيَقُولُونَ ٱللَّهُ ۚ فَقُلْ أَفَلَا تَتَّقُونَ ۝ فَذَٰلِكُمُ ٱللَّهُ رَبُّكُمُ ٱلْحَقُّ ۖ فَمَاذَا بَعْدَ ٱلْحَقِّ إِلَّا ٱلضَّلَٰلُ ۖ فَأَنَّىٰ تُصْرَفُونَ (۳۱-۳۲)

مشرکین کا تضاد فکر

اس آیت کے تمام الفاظ اور فقروں کی تشریح دوسرے مقامات میں ہو چکی ہے۔ اس کے مختلف ٹکڑوں میں جو ترتیب و تدریج ہے وہ بھی واضح ہے۔ اہل عرب کے متعلق یہ بات بھی ہم تفصیل سے بیان کر چکے ہیں کہ وہ کائنات کا خالق و مالک اور مدبر اصلاً اللہ تعالیٰ ہی کو مانتے تھے لیکن ساتھ ہی شرک میں بھی مبتلا تھے۔ وہ جن دیویوں دیوتاؤں کو پوجتے تھے ان کے متعلق ان کا عقیدہ یہ نہیں تھا کہ یہ آسمان و زمین کے خالق ہیں یا ابر و ہوا اور سورج اور چاند کے موجد ہیں یا زندگی اور موت پر متصرف ہیں یا نظام کائنات کا سررشتہ ان کے ہاتھ میں ہے بلکہ صرف یہ مانتے تھے کہ یہ خدا کے محبوب اور چہیتے ہیں۔ خدا ان کی سنتا ہے، جو کام خدا سے کرانا چاہیں کرا سکتے ہیں، ان کو اگر راضی رکھا جائے تو یہ خدا سے سفارش کر کے دنیا کی نعمتیں بھی دلواتے ہیں اور اگر بالفرض مرنے کے بعد اٹھنا ہی ہوا اور حساب کتاب کی نوبت آئی تو اس وقت بھی یہ دستگیری کریں گے اور اپنی بندگی کرنے والوں کو نہ صرف بخشوا لیں گے بلکہ اونچے اونچے درجے دلوائیں گے ـــ قرآن نے یہاں خدا سے متعلق ان کے انہی اصولی مسلمات کو بنیاد قرار دے کر ان کو متنبہ کیا ہے کہ جب تم ان ساری باتوں کو مانتے ہو تو نہ تمھارے لیے آخرت کے انکار کی گنجائش ہے اور نہ خدا کے شریک ٹھہرانے کا کوئی جواز ہے۔ جب خدا ہی مردہ سے زندہ کو اور زندہ سے مردہ کو برآمد کرتا ہے اور تمام خلق و تدبیر اسی کے ہاتھ میں ہے تو وہ کسی کا محتاج کب ہے کہ اپنی خدائی میں کسی کو شریک بنائے اور اس کے لیے اس امر میں دشواری کیا ہے کہ وہ سب کو مرنے کے بعد دوبارہ اٹھا کھڑا کرے؟ مطلب یہ کہ تمھاری یہ باتیں تمھارے اپنے مسلمات کے خلاف ہیں۔ اس طرح تم اپنے ہی منہ سے اپنے کو جھٹلاتے ہو۔

'اَفَلَا تَتَّقُوْنَ'، یعنی جب تم یہ ساری باتیں مانتے ہو تو اس خدا کے قہر و جلال سے ڈرتے نہیں کہ اس کی طرف بے جوڑ باتیں منسوب کر کے اس کی تمام اعلیٰ صفات کی نفی کر دیتے ہو!!

'فَذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمُ الْحَقُّ' ۔ 'ذٰلِكُمْ' کا اشارہ اللہ تعالیٰ کی مذکورہ بالا صفات کی طرف ہے جن کا اہلِ عرب کو اعتراف بھی تھا اور جو صحیح بھی تھیں۔ ان کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ وہی اللہ جس کے لیے یہ صفتیں مانتے ہو وہی تمہارا رب حقیقی بھی ہے، پھر اس کے علاوہ تم نے دوسرے ارباب کس دلیل سے بنا لیے؟ 'فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ اِلَّا الضَّلٰلُ'، یعنی تمہارے مذکورہ بالا اعتراف کا منطقی نتیجہ تو یہ نکلتا ہے کہ جس اللہ کے لیے یہ صفتیں مانتے ہو اسی کو تنہا اپنا رب بھی تسلیم کرو، لیکن تم نے کیا یہ ہے کہ ان سب باتوں کو ماننے کے باوجود رب اور بھی بنا لیے ہیں تو حق کے معین ہو چکنے کے بعد اس کے خلاف کوئی بات ماننا صریح ضلالت ہوئی تو تم صحیح قدم اٹھا کر پھر غلط پگڈنڈیوں پر کس طرح مڑ جاتے ہو۔ 'تُصْرَفُوْنَ' مجہول کا صیغہ ہے جو اس حقیقت کی طرف اشارہ کر رہا ہے کہ جہاں تک عقل اور منطق کا تعلق ہے وہ تو تمہارا ساتھ نہیں دے رہی ہے۔ اب تم خود سوچو کہ تم نے اپنی نکیل کس کے ہاتھ میں دے رکھی ہے جو تم سے یہ ہرزہ گردی کرا رہا ہے۔

اہلِ عرب کے شرک کی نوعیت

اگرچہ آیات کی یہ تاویل واضح ہے لیکن چونکہ اہلِ عرب کے عقائد اور ان کے اصنام سے متعلق عام طور پر لوگوں کی معلومات بہت سرسری ہیں اس وجہ سے ممکن ہے بعض لوگوں کو ایک بات کھٹکے، ہم یہاں بالاختصار اس کی طرف اشارہ کر کے اس کی وضاحت کیے دیتے ہیں۔

اوپر اہلِ عرب کے جو اعترافات نقل ہوئے ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کو نہ صرف خالق و رازق، سمع و بصر کا مالک، زندگی اور موت کا منبع مانتے تھے بلکہ کائنات کا مدبر و منتظم بھی اسی کو تسلیم کرتے تھے۔ ہمارے نزدیک اہلِ عرب کے عقائد سے متعلق یہی اصل حقیقت ہے۔ اہلِ عرب اپنے معبودوں کو کائنات کے نظم و انصرام کا اصل سرچشمہ نہیں سمجھتے تھے بلکہ یہ سمجھتے تھے کہ جس طرح ایک بادشاہ اپنے مقربین کو کچھ اختیارات و فرائض سونپ دیتا ہے جو ہوتے تو ہیں تفویض کردہ لیکن غایت تقرب و اعتماد کے سبب سے وہ عملاً مقربین ہی کے حقوق و اختیارات بن جاتے ہیں۔ اسی طرح کے کچھ اختیارات خاص طور پر، رزق اور اولاد وغیرہ سے متعلق، ان کے مزعومہ شرکاء کو بھی حاصل ہیں۔ قرآن نے جگہ جگہ ان کے اس تصور کی غلطیوں پر تنقید کی ہے جن کی تفصیل ہم نے اپنی کتابوں، حقیقتِ شرک اور حقیقتِ توحید، میں کی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ہمارے زمانے کے مشرکین اور اہلِ عرب کے مشرکین میں کچھ زیادہ فاصلہ نہیں ہے۔ ہم لوگوں نے محض اپنے شرک کو توحید ثابت کرنے کے لیے اہلِ عرب کے شرک کو ہوّا بنا رکھا ہے ورنہ حقیقت یہ ہے کہ ع

این گناہیست کہ در شہر شما نیز کنند

ہدایت و ضلالت کے باب میں سنتِ الٰہی

كَذٰلِكَ حَقَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ عَلَى الَّذِيْنَ فَسَقُوْٓا اَنَّهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ (۳۳)

'كَذٰلِكَ' کا اشارہ مشرکین کی اس متضاد و متناقض روش کی طرف ہے جو اوپر مذکور ہوئی اور 'کلمۂ رب'

سے مراد وہ سنت الٰہی ہے جو اللہ تعالیٰ نے ہدایت و ضلالت کے باب میں مقرر فرمائی ہے اور جس کی وضاحت ایک سے زیادہ مقامات میں ہو چکی ہے۔ اللہ تعالیٰ ایمان و ہدایت کی راہ انہی لوگوں پر کھولتا ہے جو اپنے عقل و دل کی صلاحیتوں سے فائدہ اٹھاتے ہیں، جو لوگ عقل و فطرت کو ٹھکرا کر اپنی خواہشوں کے پیچھے لگ جاتے ہیں اللہ تعالیٰ ایسے فاسقوں کے اوپر ان کی اختیار کردہ ضلالت ہی کو مسلط کر دیتا ہے۔ چنانچہ ان لوگوں پر بھی ان کی پسندیدہ ضلالت مسلط ہو چکی ہے اور اب یہ ایمان کی طرف آنے والے نہیں ہیں۔ دوسرے مقام میں 'وَمَا يُضِلُّ بِهٖٓ اِلَّا الْفٰسِقِيْنَ' کے الفاظ میں بھی یہی سنت الٰہی بیان ہوئی ہے ـــــ یہ آیت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف بطور التفات کے ہے۔ آپ کو تسلی دی گئی ہے کہ ان لوگوں کی روش سے پریشان نہ ہو۔ یہ سنت الٰہی کی زد میں آئے ہوئے لوگ ہیں۔ ایسے لوگوں سے متعلق اتمام حجت کے بعد تمھاری ذمہ داری ختم ہو جاتی ہے۔

قُلْ هَلْ مِنْ شُرَكَآئِكُمْ مَّنْ يَّبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ ؕ قُلِ اللّٰهُ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ فَاَنّٰى تُؤْفَكُوْنَ (۳۴)

مشرکین کے عقیدۂ شفاعت کی تردید

یہ مشرکین کے اس خیال کی تردید ہے کہ اگر قیامت ہوئی تو ان کے شرکاء و شفعاء ان کو اللہ کی پکڑ سے بچا لیں گے۔ ہم مشرکین عرب سے متعلق دوسرے مقامات میں یہ واضح کر چکے ہیں کہ آخرت کے معاملے میں ان کا موقف صریح اور حتمی انکار کا نہیں تھا بلکہ تذبذب اور تردد کا تھا۔ وہ مرنے کے بعد دوبارہ اٹھائے جانے کے معاملے کو بہت مستبعد سمجھتے تھے۔ اس وجہ سے ان کا گمان یہ تھا کہ اول تو قیامت اور حشر نشر ہے ہی نہیں اور اگر ہے تو ہمارا لوٹنا تو ہمارے شرکاء اور شفعاء کی طرف ہوگا، وہ ہمارے مددگار اور ہمارے سفارشی ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے اسی واہمہ کی بنا پر ان سے سوال کرایا ہے کہ کیا تمھارے مزعومہ شریکوں میں سے کوئی ایسا بھی ہے جس کی نسبت تمھارا دعویٰ ہو کہ اس نے خلق کا آغاز کیا ہے اور وہ اس کا اعادہ بھی کرے گا؟ ایسی ذات تو صرف اللہ کی ہے جس نے خلق کا آغاز کیا اور وہ اس کا اعادہ بھی فرمائے گا تو جب خلق کا اعادہ وہ فرمائے گا تو تمھارا لوٹنا اللہ ہی کی طرف ہوگا یا تمھارے ان فرضی معبودوں کی طرف جن کی نسبت تم خود بھی مانتے ہو کہ ان کا کوئی حصہ نہ ابدائے خلق میں ہے اور نہ اس کے اعادے میں۔ 'فَاَنّٰى تُؤْفَكُوْنَ' یعنی تم اپنے مسلمہ کے بموجب کہ جب تم خلق کا ابداء اور اعادہ صرف خدا ہی کی شان سمجھتے ہو تو لازم تھا کہ یہ بھی مانتے کہ جو اٹھائے گا وہی جزا اور سزا بھی دے گا لیکن تم ایک بات صحیح مان کر دوسری بات اس سے بالکل متناقض مان لیتے ہو۔ آخر تمھاری عقل کس طرح اوندھی ہو جاتی ہے!!

قُلْ هَلْ مِنْ شُرَكَآئِكُمْ مَّنْ يَّهْدِيْٓ اِلَى الْحَقِّ ؕ قُلِ اللّٰهُ يَهْدِيْ لِلْحَقِّ ؕ اَفَمَنْ يَّهْدِيْٓ اِلَى الْحَقِّ اَحَقُّ اَنْ يُّتَّبَعَ اَمَّنْ لَّا يَهِدِّيْٓ اِلَّآ اَنْ يُّهْدٰى ۚ فَمَا لَكُمْ ۫ كَيْفَ تَحْكُمُوْنَ (۳۵)

شرکاء کا وجود [illegible]

یعنی آخرت کے معاملے میں تو تمھارے ان مزعومہ شرکاء کا وجود یوں بے کار ثابت ہوا کہ نہ ان کا کوئی دخل

خلق کے ابدا میں ہے نہ اعادے میں۔ اب سوچو کہ اس دنیا میں تمھیں ان سے کیا فیض پہنچتا ہے؟ مخلوق کی ایک بہت بڑی ضرورت خالق سے یہ وابستہ ہوتی ہے کہ وہ زندگی کے معاملات میں رہنمائی فرماتا ہے کہ کیا حق ہے اور کیا باطل، کیا تم کہہ سکتے ہو کہ تمھارے ان معبودوں سے تمھیں اس طرح کی کوئی رہنمائی حاصل ہوتی ہے؟ کیا عقل جو تمھارے اندر رہنمائی کا چراغ ہے، یہ ان کی بخشی ہوئی تمھیں ملی ہے؟ کیا یہ تمھاری ہدایت کے لیے کوئی وحی بھیجتے ہیں۔ کیا انھوں نے تمھاری تربیت و تزکیہ کے لیے کوئی کتاب اتاری، کوئی رسول بھیجا، کوئی شریعت نازل کی، کوئی قانون اتارا؟ اگر ان کاموں میں کوئی کام بھی انھوں نے نہیں کیا، نہ کرتے ہیں نہ کریں گے تو آخر کس غرض کے لیے ان کے پیچھے لگے ہو؟ پیروی کا سزاوار وہ ہے جو حق کی طرف رہنمائی کرتا ہے اور اس کی توفیق بخشتا ہے یا وہ جو خود رہنمائی اور دستگیری کے محتاج ہیں؟ تمھاری عقل کو کیا ہو گیا ہے، تم کیسے الٹے فیصلے کرتے ہو۔

'ہدایت' کا صلہ آیت میں 'الیٰ' کے ساتھ بھی آیا ہے اور 'لِ' کے ساتھ بھی۔ ہمارے نزدیک دونوں میں تھوڑا سا فرق ہے۔ جب 'الیٰ' آتا ہے تو اس سے مقصود صرف کسی چیز کی طرف رہنمائی کر دینا ہوتا ہے لیکن جب 'لِ' آتا ہے تو اس کے اندر رہنمائی کے ساتھ توفیق ہدایت کا مفہوم بھی پیدا ہو جاتا ہے۔ 'یَہِدِّیْ' دراصل 'یَھْتَدِیْ' ہے جو بقاعدۂ ادغام 'یَھِدِّیْ' ہو گیا ہے۔

وَمَا یَتَّبِعُ اَکْثَرُهُمْ اِلَّا ظَنًّا ۭ اِنَّ الظَّنَّ لَا یُغْنِیْ مِنَ الْحَقِّ شَیْـًٔا ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلِیْمٌۢ بِمَا یَفْعَلُوْنَ (۳۶)

محض گمان کی پیروی

لفظ 'ظن' 'علم' 'یقین' اور 'حق' تینوں کے ضد کی حیثیت سے استعمال ہوتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ علم ثابت و صحیح اور حق واضح و معروف کے بجائے محض اپنے گمان کے پیچھے چل رہے ہیں اور ظاہر ہے محض اٹکل کے تیر تکے حقیقت سے بے نیاز نہیں کر سکتے۔ حقیقت جب سامنے آئے گی تو انھیں معلوم ہو جائے گا کہ انھوں نے اپنی عمارت بالکل ریت پر بنائی۔ 'اِنَّ اللّٰهَ عَلِیْمٌۢ بِمَا یَفْعَلُوْنَ' ہیں ان کے لیے دھمکی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تسلی ہے کہ حقیقت سے آنکھیں بند کر کے جو کر رہے ہیں کریں۔ وقت آ رہا ہے جب اللہ تعالیٰ سب کچھ ان کے سامنے رکھ دے گا۔ یہ ملحوظ رہے کہ قرآن نے یہ حال ان کی اکثریت کا بیان کیا ہے، سب کا حال یہی نہیں تھا بلکہ ان میں کچھ سوچنے سمجھنے والے بھی تھے جن کا ذکر آگے آیات ۴۲-۴۳ میں آ رہا ہے۔

۸- آگے کا مضمون ــــــ آیات ۳۷-۷۰

یاد ہو گا، بات کفار کے اس مطالبہ سے چلی تھی کہ یا تو اس قرآن کی جگہ کوئی اور قرآن لاؤ یا اس میں ایسی ترمیم کر دو کہ ہمارے لیے وہ قابل قبول ہو سکے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کا یہ مطالبہ تسلیم کرنے کے بجائے قرآن کی ان باتوں کو مزید واضح اور مدلل کر دیا جن سے وہ چڑتے تھے۔ اب آگے اسی مضمون کو ایک نئے پہلو سے لیا اور قرآن کا کتاب الٰہی ہونا بھی ثابت کیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھیوں کو تسلی بھی دی اور

قرآن کے دعاوی کو مزید مبرہن کر دیا۔ اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۳۷-۵۰

وَمَا كَانَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ اَنْ يُّفْتَرٰى مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ تَصْدِيْقَ
الَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ وَتَفْصِيْلَ الْكِتٰبِ لَا رَيْبَ فِيْهِ مِنْ رَّبِّ
الْعٰلَمِيْنَ ﴿۳۷﴾ اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ۭ قُلْ فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّثْلِهٖ وَادْعُوْا
مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۳۸﴾ بَلْ كَذَّبُوْا
بِمَا لَمْ يُحِيْطُوْا بِعِلْمِهٖ وَلَمَّا يَاْتِهِمْ تَاْوِيْلُهٗ ۭ كَذٰلِكَ كَذَّبَ الَّذِيْنَ
مِنْ قَبْلِهِمْ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۳۹﴾ وَمِنْهُمْ مَّنْ يُّؤْمِنُ
ع ۴ ۱۰ ۹ بِهٖ وَمِنْهُمْ مَّنْ لَّا يُؤْمِنُ بِهٖ ۭ وَرَبُّكَ اَعْلَمُ بِالْمُفْسِدِيْنَ ﴿۴۰﴾ وَاِنْ
كَذَّبُوْكَ فَقُلْ لِّيْ عَمَلِيْ وَلَكُمْ عَمَلُكُمْ ۚ اَنْتُمْ بَرِيْۗـــُٔوْنَ مِمَّآ اَعْمَلُ وَ
اَنَا بَرِيْۗءٌ مِّمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۴۱﴾ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّسْتَمِعُوْنَ اِلَيْكَ ۭ اَفَاَنْتَ
تُسْمِعُ الصُّمَّ وَلَوْ كَانُوْا لَا يَعْقِلُوْنَ ﴿۴۲﴾ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْظُرُ اِلَيْكَ ۭ اَفَاَنْتَ
تَهْدِي الْعُمْيَ وَلَوْ كَانُوْا لَا يُبْصِرُوْنَ ﴿۴۳﴾ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ النَّاسَ
شَيْــــًٔا وَّلٰكِنَّ النَّاسَ اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ﴿۴۴﴾ وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ كَاَنْ
لَّمْ يَلْبَثُوْٓا اِلَّا سَاعَةً مِّنَ النَّهَارِ يَتَعَارَفُوْنَ بَيْنَهُمْ ۭ قَدْ خَسِرَ الَّذِيْنَ
كَذَّبُوْا بِلِقَاۗءِ اللّٰهِ وَمَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ ﴿۴۵﴾ وَاِمَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ
الَّذِيْ نَعِدُهُمْ اَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ فَاِلَيْنَا مَرْجِعُهُمْ ثُمَّ اللّٰهُ شَهِيْدٌ عَلٰي
مَا يَفْعَلُوْنَ ﴿۴۶﴾ وَلِكُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلٌ ۚ فَاِذَا جَاۗءَ رَسُوْلُهُمْ قُضِيَ
بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿۴۷﴾ وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ
اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۴۸﴾ قُلْ لَّآ اَمْلِكُ لِنَفْسِيْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا اِلَّا مَا

شَآءَ اللّٰهُ ۭ لِكُلِّ اُمَّةٍ اَجَلٌ ۭ اِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ فَلَا يَسْتَاْخِرُوْنَ
سَاعَةً وَّلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ ﴿٤٩﴾ قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ اَتٰىكُمْ عَذَابُهٗ بَيَاتًا
اَوْ نَهَارًا مَّاذَا يَسْتَعْجِلُ مِنْهُ الْمُجْرِمُوْنَ ﴿٥٠﴾ اَثُمَّ اِذَا مَا وَقَعَ اٰمَنْتُمْ
بِهٖ ۭ اٰۗلْئٰنَ وَقَدْ كُنْتُمْ بِهٖ تَسْتَعْجِلُوْنَ ﴿٥١﴾ ثُمَّ قِيْلَ لِلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ذُوْقُوْا
عَذَابَ الْخُلْدِ ۚ هَلْ تُجْزَوْنَ اِلَّا بِمَا كُنْتُمْ تَكْسِبُوْنَ ﴿٥٢﴾ وَيَسْتَنْۢبِـُٔوْنَكَ
اَحَقٌّ هُوَ ۭ قُلْ اِيْ وَرَبِّيْٓ اِنَّهٗ لَحَقٌّ ڤ وَمَآ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِيْنَ ﴿٥٣﴾ وَلَوْ ع ۵ ۱۲
اَنَّ لِكُلِّ نَفْسٍ ظَلَمَتْ مَا فِي الْاَرْضِ لَافْتَدَتْ بِهٖ ۭ وَاَسَرُّوا النَّدَامَةَ
لَمَّا رَاَوُا الْعَذَابَ ۚ وَقُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿٥٤﴾
اَلَآ اِنَّ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ اَلَآ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّلٰكِنَّ
اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿٥٥﴾ هُوَ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿٥٦﴾
يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاۗءَتْكُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَشِفَاۗءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ ڏ
وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿٥٧﴾ قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَبِرَحْمَتِهٖ فَبِذٰلِكَ
فَلْيَفْرَحُوْا ۭ هُوَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ ﴿٥٨﴾ قُلْ اَرَءَيْتُمْ مَّآ اَنْزَلَ
اللّٰهُ لَكُمْ مِّنْ رِّزْقٍ فَجَعَلْتُمْ مِّنْهُ حَرَامًا وَّحَلٰلًا ۭ قُلْ اٰۗللّٰهُ اَذِنَ لَكُمْ
اَمْ عَلَي اللّٰهِ تَفْتَرُوْنَ ﴿٥٩﴾ وَمَا ظَنُّ الَّذِيْنَ يَفْتَرُوْنَ عَلَي اللّٰهِ الْكَذِبَ
يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَي النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا
يَشْكُرُوْنَ ﴿٦٠﴾ وَمَا تَكُوْنُ فِيْ شَاْنٍ وَّمَا تَتْلُوْا مِنْهُ مِنْ قُرْاٰنٍ وَّلَا ع ۶ ۱۱
تَعْمَلُوْنَ مِنْ عَمَلٍ اِلَّا كُنَّا عَلَيْكُمْ شُهُوْدًا اِذْ تُفِيْضُوْنَ فِيْهِ ۭ وَمَا

يَعْزُبُ عَنْ رَّبِّكَ مِنْ مِّثْقَالِ ذَرَّةٍ فِي الْأَرْضِ وَلَا فِي السَّمَاءِ وَلَا أَصْغَرَ
مِنْ ذٰلِكَ وَلَا أَكْبَرَ إِلَّا فِي كِتٰبٍ مُّبِينٍ ﴿٦١﴾ أَلَا إِنَّ أَوْلِيَاءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ
عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ﴿٦٢﴾ الَّذِينَ اٰمَنُوا وَكَانُوا يَتَّقُونَ ﴿٦٣﴾ لَهُمُ الْبُشْرٰى
فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ ۚ لَا تَبْدِيلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ ۚ ذٰلِكَ هُوَ
وقف لازم الْفَوْزُ الْعَظِيمُ ﴿٦٤﴾ وَلَا يَحْزُنْكَ قَوْلُهُمْ ۘ إِنَّ الْعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِيعًا ۚ هُوَ
السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ﴿٦٥﴾ أَلَا إِنَّ لِلّٰهِ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْأَرْضِ ۗ
وَمَا يَتَّبِعُ الَّذِينَ يَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللّٰهِ شُرَكَاءَ ۚ إِنْ يَتَّبِعُونَ إِلَّا
الظَّنَّ وَإِنْ هُمْ إِلَّا يَخْرُصُونَ ﴿٦٦﴾ هُوَ الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ الَّيْلَ
لِتَسْكُنُوا فِيهِ وَالنَّهَارَ مُبْصِرًا ۚ إِنَّ فِي ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّسْمَعُونَ ﴿٦٧﴾
قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا سُبْحٰنَهٗ ۖ هُوَ الْغَنِيُّ ۖ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ
وَمَا فِي الْأَرْضِ ۚ إِنْ عِنْدَكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ بِهٰذَا ۚ أَتَقُولُونَ عَلَى اللّٰهِ
مَا لَا تَعْلَمُونَ ﴿٦٨﴾ قُلْ إِنَّ الَّذِينَ يَفْتَرُونَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ لَا
يُفْلِحُونَ ﴿٦٩﴾ مَتَاعٌ فِي الدُّنْيَا ثُمَّ إِلَيْنَا مَرْجِعُهُمْ ثُمَّ نُذِيقُهُمُ
ع ۱۰ ۱۲ الثلثة الْعَذَابَ الشَّدِيدَ بِمَا كَانُوا يَكْفُرُونَ ﴿٧٠﴾

ترجمۂ آیات ۳۷-۷۰

اور یہ قرآن ایسی چیز نہیں ہے جو اللہ سے پرے پرے ہی گھڑ لیا گیا ہو بلکہ یہ تصدیق ہے ان پیشین گوئیوں کی جو اس کے پہلے سے موجود ہیں اور کتاب کی تفصیل ہے۔ اس کے خداوند عالم کی طرف سے ہونے میں کسی شک کی گنجائش نہیں ہے کیا وہ کہتے ہیں کہ (۱) کو اس نے گھڑ لیا ہے؟ ان سے کہو تو تم لاؤ اس کے مانند کوئی سورہ اور بلا لو اللہ کے سوا جن کو تم بلا سکو،

اگر تم سچے ہو۔ بلکہ یہ لوگ اس چیز کو جھٹلا رہے ہیں جو ان کے علم کے احاطے میں نہیں آئی اور جس کی حقیقت ابھی ان کے سامنے ظاہر نہیں ہوئی۔ اسی طرح ان لوگوں نے بھی جھٹلایا جو ان سے پہلے گزرے تو دیکھو ظالموں کا انجام کیا ہوا! ۳۸-۳۹

اور ان میں ایسے بھی ہیں جو اس پر ایمان لاتے ہیں اور وہ بھی ہیں جو ایمان نہیں لاتے اور تیرا رب مفسدوں سے خوب واقف ہے اور اگر وہ تمھیں جھٹلاتے ہیں تو کہہ دو میرے لیے میرا عمل ہے اور تمھارے لیے تمھارا عمل، تم بری ہو میرے عمل کی ذمہ داری سے اور میں بری ہوں تمھارے عمل کی ذمہ داریوں سے۔ اور ان میں وہ بھی ہیں جو تمھاری بات پر کان دھرتے ہیں تو کیا تم بہروں کو سناؤ گے اگر وہ کچھ سمجھتے بوجھتے نہ ہوں؟ اور ان میں ایسے بھی ہیں جو تمھاری طرف نظر کرتے ہیں تو اب کیا تم اندھوں کو راہ دکھاؤ گے اگرچہ وہ دیکھ نہ رہے ہوں؟ اللہ لوگوں پر ذرا بھی ظلم نہیں کرتا بلکہ لوگ خود ہی اپنی جانوں پر ظلم ڈھاتے ہیں۔ ۳۹-۴۴

اور جس دن اللہ ان کو اکٹھا کرے گا اس دن وہ محسوس کریں گے کہ گویا بس وہ دن کی ایک گھڑی رہے۔ وہ آپس میں ایک دوسرے کو پہچانتے ہوں گے۔ نامراد ہوئے وہ لوگ جنھوں نے اللہ کی ملاقات کو جھٹلایا اور ہدایت حاصل کرنے والے نہ بنے۔ یا ہم تم کو اس کا کوئی حصہ دکھا دیں گے جس کا ان سے وعدہ کر رہے ہیں یا تمھیں وفات دیں گے پس ان کی واپسی ہماری طرف ہوگی، پھر اللہ گواہ ہے اس چیز پر جو وہ کر رہے ہیں اور ہر امت کے لیے ایک رسول ہے تو جب ان کا رسول آجاتا ہے ان کے درمیان انصاف کے ساتھ فیصلہ کر دیا جاتا ہے اور ان پر کوئی ظلم نہیں کیا جاتا۔ اور وہ کہتے ہیں کہ وعدہ کب پورا ہوگا اگر تم سچے ہو۔ کہہ دو کہ میں اپنی ذات کے معاملے میں بھی کسی نقصان اور نفع پر کوئی اختیار نہیں رکھتا مگر جو اللہ چاہے۔ ہر امت کے لیے ایک وقت

مقرر ہے۔ جب ان کا وقت آجاتا ہے تو پھر نہ ایک گھڑی پیچھے ہوتے نہ آگے۔ ان سے کہو کہ بتاؤ کہ اگر اللہ کا عذاب تم پر رات میں آ دھمکے یا دن میں تو کیا چیز ہے جس کے بل پر مجرمین جلدی مچائے ہوئے ہیں! پھر کیا جب آہی دھمکے گا تب اس کو مانو گے! اب مانتے، اسی کی تم جلدی مچائے ہوئے تھے!! پھر ان ظالموں سے کہا جائے گا کہ اب ہمیشہ کا عذاب چکھو۔ یہ تمھاری اپنی کمائی کا تمھیں بدلہ مل رہا ہے۔ ۴۵-۵۲

اور وہ تم سے پوچھتے ہیں کہ کیا یہ بات واقعی ہے؟ کہہ دو کہ ہاں میرے رب کی قسم یہ شدنی ہے اور تم قابو سے باہر نہیں نکل سکو گے۔ اور ہر جان، جس نے ظلم کا ارتکاب کیا، اگر اس کو مل جائے وہ سب کچھ جو زمین میں ہے تو وہ اس کو فدیہ میں دے دینا چاہے گی اور وہ پشیمان ہوں گے جب عذاب کو دیکھیں گے اور ان کے درمیان انصاف سے فیصلہ کر دیا جائے گا اور ان پر کوئی ظلم نہ ہوگا۔ سن رکھو کہ آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے اللہ ہی کا ہے۔ سن رکھو کہ اللہ کا وعدہ شدنی ہے، لیکن ان کے اکثر اس بات کو نہیں جانتے۔ وہی زندہ کرتا ہے اور وہی مارتا ہے اور اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے۔ ۵۳-۵۶

اے لوگو! تمھارے پاس تمھارے رب کی جانب سے نصیحت، سینوں کے امراض کی شفا اور اہل ایمان کے لیے ہدایت و رحمت آگئی ہے۔ کہہ دو کہ یہ اللہ کے فضل و رحمت کا کرشمہ ہے تو چاہیے کہ اس پر شادماں ہوں، یہ اس سے بہتر ہے جو وہ جمع کر رہے ہیں۔ ۵۷-۵۸

ان سے کہو، بتاؤ اللہ نے تمھارے لیے جو رزق اتارا تو تم نے اس میں سے کچھ کو حرام ٹھہرایا اور کچھ کو حلال۔ پوچھو، کیا اللہ نے تم کو اس کا حکم دیا یا تم اللہ پر جھوٹ لگا رہے ہو؟ جو لوگ اللہ پر جھوٹ لگا رہے ہیں ان کا قیامت کے دن کیا گمان ہے؟ اللہ لوگوں پر بڑا فضل فرمانے والا ہے

لیکن اکثر لوگ شکر گزار نہیں ہوتے۔ ۵۹-۶۰

اور تم جس حال میں بھی ہوتے ہو اور کتاب میں سے جو حصہ بھی سنا رہے ہوتے ہو اور تم لوگ جو کام بھی کرتے ہو تو ہم جس وقت تم اس میں مشغول ہوتے ہو، تمہارے پاس موجود ہوتے ہیں اور تیرے رب سے ذرہ برابر بھی کوئی چیز مخفی نہیں، نہ زمین میں نہ آسمان میں اور نہ اس سے چھوٹی اور نہ بڑی، مگر وہ ایک واضح کتاب میں درج ہے۔ سن لو کہ اللہ کے دوستوں کے لیے نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے یعنی وہ لوگ جو ایمان لائے اور ڈرتے رہے۔ ان کے لیے خوشخبری ہے دنیا کی زندگی میں بھی اور آخرت میں بھی۔ اللہ کی باتوں میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ یہی بڑی کامیابی ہے۔ اور تم کو ان کی بات غم میں نہ ڈالے۔ عزت تمام اللہ ہی کے لیے ہے۔ وہ سمیع و علیم ہے۔ ۶۱-۶۵

سن رکھو کہ جو آسمانوں میں ہیں اور جو زمین میں ہیں سب اللہ ہی کے ہیں اور جو لوگ اللہ کے ماسوا کو پکارتے ہیں یہ شریکوں کی پیروی نہیں کر رہے بلکہ محض گمان کی پیروی کر رہے ہیں اور اٹکل کے تیر تکے چلاتے ہیں۔ وہی ہے جس نے رات کو تمہارے لیے پرسکون بنایا تاکہ تم اس میں آرام کرو۔ اور دن کو روشن بنایا تاکہ تم اس میں معاش کے لیے جدوجہد کرو بے شک اس میں ان لوگوں کے لیے نشانیاں ہیں جو بات کو سنتے ہیں۔ یہ کہتے ہیں کہ خدا کے اولاد ہے۔ وہ ایسی باتوں سے پاک ہے۔ وہ بے نیاز ہے۔ جو کچھ آسمانوں اور جو کچھ زمین میں ہے سب اسی کا ہے۔ تمہارے پاس اس بات کی کوئی دلیل نہیں ہے۔ کیا تم اللہ پر وہ بات لگاتے ہو جس کا تم علم نہیں رکھتے؟ کہہ دو، جو لوگ اللہ پر جھوٹ لگاتے ہیں وہ فلاح نہیں پائیں گے۔ ان کے لیے بس دنیا میں چند روزہ فائدہ اٹھا لینا ہے۔ پھر ہماری ہی طرف ان کی واپسی ہوگی، پھر ہم ان کے کفر کی پاداش میں ان کو سخت عذاب چکھائیں گے۔ ۶۶-۷۰

۹۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَمَا كَانَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ اَنْ يُّفْتَرٰى مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ تَصْدِيْقَ الَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ وَتَفْصِيْلَ الْكِتٰبِ لَا رَيْبَ فِيْهِ مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ؕ قُلْ فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّثْلِهٖ وَادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝ بَلْ كَذَّبُوْا بِمَا لَمْ يُحِيْطُوْا بِعِلْمِهٖ وَلَمَّا يَاْتِهِمْ تَاْوِيْلُهٗ ؕ كَذٰلِكَ كَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الظّٰلِمِيْنَ (۳۷-۳۹)

قرآن سابق پیشین گوئیوں کی تصدیق ہے

وَمَا كَانَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ ...... الاٰیۃ' آیت ۱۵ میں قرآن کی صداقت کی دلیل حامل قرآن کے کردار کے پہلو سے پیش کی گئی تھی، اس کے بعد کلام کا رخ قرآن کے ان دعاوی کے اثبات کی طرف مڑ گیا تھا جو خاص طور پر مخالفین کی وحشت کا باعث تھے اور جن کی ترمیم یا تنسیخ کا وہ مطالبہ کر رہے تھے۔ اب پھر وہی بات ایک نئے پہلو سے سامنے آگئی۔ فرمایا کہ قرآن کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو خدا سے پرے ہی پرے گھڑ کر خدا کی طرف منسوب کر دی گئی ہو بلکہ یہ ان پیشین گوئیوں کی تصدیق ہے جو اس کے باب میں پہلے سے آسمانی صحیفوں میں موجود ہیں۔ ان پیشین گوئیوں کا حوالہ ہم بقرہ اور آل عمران کی تفسیر میں نقل کر چکے ہیں۔

'تَفْصِيْلَ الْكِتٰبِ' میں 'کتاب' سے مراد ہمارے نزدیک تورات ہے۔ قرآن نے تورات کی ان پیشین گوئیوں کی بھی جو مجمل و مبہم صورت میں اپنے محمل و مصداق کی منتظر تھیں اور اس دین کی بھی توضیح و تکمیل کی جس کی توضیح و تکمیل کا کام آخری بعثت پر اٹھا رکھا گیا تھا۔ یہ بات بھی ہم دوسرے مقام میں واضح کر چکے ہیں کہ 'الکتاب' کا لفظ تمام صحائف تورات کے لیے قرآن میں استعمال ہوا ہے یہاں تک کہ انجیل بھی اس میں شامل ہے۔ بعض مرتبہ اجزا کے اعتبار سے لفظ 'کتب' استعمال ہوتا ہے بعض مرتبہ مجموعہ کو پیش نظر رکھ کر 'الکتاب'۔ نزول قرآن سے پہلے الکتب کی حیثیت تورات ہی کو حاصل رہی ہے۔ بقیہ تمام صحائف کی حیثیت اس کے اجزا اور ابواب و فصول کی تھی۔

'لَا رَيْبَ فِيْهِ مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ' کا مفہوم، جیسا کہ ہم بقرہ کی دوسری ہی آیت کی تفسیر میں واضح کر چکے ہیں یہ ہے کہ اس کے خداوند عالم کی طرف سے ہونے میں کسی شک کی گنجائش نہیں ہے۔

قرآن کی عام تحدی

'اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ...... الاٰیۃ' یعنی اگر منکرین یہ کہتے ہیں کہ پیغمبر نے یہ کتاب خود تصنیف کر کے جھوٹ موٹ اس کو خدا کی طرف نسبت دے دی ہے تو ان سے کہو کہ پھر تو تمہارے لیے اس کا توڑ بہت آسان ہے، تم اس کی مانند ایک ہی سورہ بنا کر پیش کر دو اور اس کام میں ان سب کا تعاون بھی حاصل کر لو جن کا تعاون تم اپنے شاعروں، ادیبوں، ساحروں، کاہنوں، جنوں، شیطانوں اور اپنے ان معبودوں میں سے حاصل کر سکتے ہو جن کو تم خدا کا شریک سمجھتے ہو۔ اگر تم اپنے اس گمان میں سچے ہو تو ان سب کو اس کام کے لیے بلاؤ۔ آخر اس سے زیادہ نازک موقع ان کی مدد حاصل کرنے اور ان کی مدد کے لیے اٹھنے کا اب کب آئے گا جب کہ تمہارے دین آبائی کے ساتھ ساتھ ان کی خدائی بھی معرض خطر میں ہے۔

تکذیب قرآن کی اصل وجہ

بَلْ كَذَّبُوا بِمَا لَمْ يُحِيطُوا بِعِلْمِهِ ...... الآیۃ' یہ اصل وجہ تکذیب کی طرف اشارہ ہے کہ قرآن کی مخالفت میں یہ جو کچھ کہتے ہیں یہ سب تو اوپر کی باتیں ہیں۔ اصل وجہ تکذیب یہ ہے کہ قرآن ان کو رسول کی تکذیب کی صورت میں جس عذاب کی اس دنیا میں اور پھر اس کے بعد آخرت میں خبر دے رہا ہے وہ ان کے علم کی گرفت میں نہیں آرہی ہے اس لیے کہ اس کی حقیقت ان کے سامنے ابھی ظاہر نہیں ہوئی۔ یہ اس کو ماننے سے پہلے سر کی آنکھوں سے اس کی حقیقت دیکھنا چاہتے ہیں کہ اس عذاب کا کوئی نمونہ یا اصل عذاب ہی آجائے تب وہ مان جائیں گے کہ قرآن سچی خبر دے رہا ہے اور یہ خدائی کتاب ہے۔ فرمایا کہ یہ بعینہٖ وہی روش ہے جو ان سے پہلے رسولوں کی تکذیب کرنے والی قوموں نے اختیار کی تو جو انجام ان کا ہوا وہی انجام ان کا بھی ہونے والا ہے۔ لفظ 'تاویل' پر آل عمران کی تفسیر میں ہم بحث کر چکے ہیں۔ یہاں یہ کسی خبر کے واقعاتی مصداق کے مفہوم میں ہے۔

وَمِنْهُم مَّن يُؤْمِنُ بِهِ وَمِنْهُم مَّن لَّا يُؤْمِنُ بِهِ ۚ وَرَبُّكَ أَعْلَمُ بِالْمُفْسِدِينَ ۝ وَإِن كَذَّبُوكَ فَقُل لِّي عَمَلِي وَلَكُمْ عَمَلُكُمْ ۖ أَنتُم بَرِيئُونَ مِمَّا أَعْمَلُ وَأَنَا بَرِيءٌ مِّمَّا تَعْمَلُونَ ۝ وَمِنْهُم مَّن يَسْتَمِعُونَ إِلَيْكَ ۚ أَفَأَنتَ تُسْمِعُ الصُّمَّ وَلَوْ كَانُوا لَا يَعْقِلُونَ ۝ وَمِنْهُم مَّن يَنظُرُ إِلَيْكَ ۚ أَفَأَنتَ تَهْدِي الْعُمْيَ وَلَوْ كَانُوا لَا يُبْصِرُونَ ۝ إِنَّ اللَّهَ لَا يَظْلِمُ النَّاسَ شَيْئًا وَلَٰكِنَّ النَّاسَ أَنفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ (۴۰-۴۴)

مکذبین کو مہلت دینے کی وجہ

وَمِنْهُم مَّن يُؤْمِنُ بِهِ ...... الآیۃ' یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تسلی بھی ہے اور مکذبین قرآن کے لیے دھمکی بھی۔ مطلب یہ ہے کہ جب ان کے اندر سے ایسے لوگ نکل رہے ہیں جو قرآن پر ایمان لا رہے ہیں تو معلوم ہوا کہ ان کے اندر کچھ ذی صلاحیت بھی ہیں۔ اس کا تقاضا یہ ہے کہ ان کو اس حد تک بلو لیا جائے کہ ان کے اندر جتنا مکھن ہے وہ نکل آئے، صرف چھاچھ بچ رہے۔ اسی حکمت کے تحت ان کے مطالبۂ عذاب کے باوجود ان کو مہلت دی جا رہی ہے کہ جو مفسدین ہیں وہ چھٹ کر بالکل سامنے آجائیں۔ تیرا رب ان سے خوب واقف ہے، ان کو وہ ان کی شرارتوں کا مزہ چکھائے گا۔

مکذبین سے اعلانِ برات

وَإِن كَذَّبُوكَ ...... الآیۃ' یہ ان مکذبین سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اعلانِ برات کی ہدایت ہے کہ جو کسی طرح کوئی بات سننے سمجھنے کے لیے تیار ہی نہیں ہوتے تھے۔ فرمایا کہ ان سے کہہ دو کہ میں اپنے عمل کا ذمہ دار ہوں، تم اپنے عمل کے ذمہ دار ہو، تم میرے عمل کی ذمہ داری سے بری ہو اور میں تمہارے اعمال کی ذمہ داریوں سے بری ہوں۔ رسول کی طرف سے یہ اعلان برات، ہم دوسرے مقام میں واضح کر چکے ہیں کہ اس کے جھٹلانے والوں کے لیے عذاب کا پیش خیمہ ہوتا ہے۔ رسول جب تک اپنی قوم کے اندر رہتا ہے وہ اس کے لیے امان اور سپر ہوتا ہے، جب وہ ان سے اعلان برات کر دیتا ہے تو یہ امان جو اس کی بدولت قوم کو حاصل ہوتی ہے اٹھ جاتی ہے اور جب امان اٹھ گئی تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس کے بعد عذاب ہر

وقت متوقع ہے۔ اسی وجہ سے رسول کی زبان سے برات کا کلمہ کوئی معمولی بات نہیں ہے بلکہ اس کی قوم کی زندگی میں یہی وقت سب سے زیادہ نازک وقت ہوتا ہے۔

آنحضرت صلعم کے لیے تسکین و تسلی

وَمِنْهُم مَّن يَسْتَمِعُونَ ..... الآیۃ۔ یہ بھی آیت ۴۲ کی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تسکین و تسلی ہے کہ تمہارے اطمینان کے لیے یہ چیز کافی ہونی چاہیے کہ ان کے اندر جو سننے سمجھنے اور فہم و بصیرت رکھنے والے لوگ ہیں وہ تمہاری بات پر کان دھرتے اور تمہاری طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ رہے وہ لوگ جو اپنی شامت اعمال سے گونگے بہرے اور اندھے بن چکے ہیں، وہ تو سننے سمجھنے سے رہے۔ اگر تمہارے دل کے اندر یہ ارمان ہے کہ یہ بھی تمہاری باتیں سنیں اور مانیں تو یہ ہونے سے رہا۔ ایمان و ہدایت کے باب میں اللہ کی جو سنت ہے وہ تبدیل نہیں ہو سکتی۔ اللہ تعالیٰ ہدایت انہی کو بخشتا ہے جو اس کی عطا کی ہوئی صلاحیتوں کو زندہ رکھتے اور ان سے کام لیتے ہیں۔

وَمِنْهُم مَّن يَنظُرُ إِلَيْكَ ...... الآیۃ۔ یہ بعینہٖ اوپر والی آیت کا مضمون ذرا مختلف اسلوب میں بیان ہوا ہے۔

ایک استدراک

إِنَّ اللَّهَ لَا يَظْلِمُ النَّاسَ ...... الآیۃ یہ اوپر والی بات پر ایک قسم کا استدراک ہے۔ بادی النظر میں یہ بات کھٹکتی ہے کہ آخر بہت سے لوگوں کا حال یہ کیوں ہو جاتا ہے کہ وہ ایسے اندھے بہرے ہو جاتے ہیں کہ بالآخر وہ خدا کے ابدی عذاب کے مستحق ٹھہرتے ہیں۔ فرمایا کہ یہ اس وجہ سے نہیں ہے کہ اللہ نے ان پر کوئی ظلم کیا ہے، اللہ ذرا بھی اپنے بندوں پر ظلم نہیں کرتا بلکہ لوگ خود ہی اپنی جانوں پر ظلم ڈھاتے ہیں۔ اللہ نے انسان کو بہترین صلاحیتوں سے مسلح کیا ہے۔ اگر وہ ان سے کام لے تو نبیوں اور رسولوں کی بات اس کو اپنے دل کی آواز معلوم ہو گی لیکن لوگ اپنی خواہشات کی پیروی میں اندھے بہرے بن جاتے ہیں جس کے سبب سے ان کو ہر صدائے حق اجنبی معلوم ہونے لگتی ہے اور وہ اس کو قبول کرنے کی بجائے اس سے بدکنے لگتے ہیں۔

وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ كَأَن لَّمْ يَلْبَثُوا إِلَّا سَاعَةً مِّنَ النَّهَارِ يَتَعَارَفُونَ بَيْنَهُمْ ۚ قَدْ خَسِرَ الَّذِينَ كَذَّبُوا بِلِقَاءِ اللَّهِ وَمَا كَانُوا مُهْتَدِينَ ۝ وَإِمَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِي نَعِدُهُمْ أَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ فَإِلَيْنَا مَرْجِعُهُمْ ثُمَّ اللَّهُ شَهِيدٌ عَلَىٰ مَا يَفْعَلُونَ (۴۵-۴۶)

مکذبین کی جلد بازی کا جواب

یہ آخرت اور عذاب کے جھٹلانے والوں کی جلد بازی کا جواب ہے۔ فرمایا کہ آج تو ان کو آخرت بہت بعید معلوم ہوتی ہے لیکن جس دن وہ اکٹھا کیے جائیں گے اس دن ان کا احساس اس دنیا کی زندگی کے متعلق یہ ہو گا کہ گویا وہ اس میں ایک گھڑی سے زیادہ نہیں رہے۔ يَتَعَارَفُونَ بَيْنَهُمْ وہ ایک دوسرے کو اس طرح پہچانتے ہوں گے گویا ان کی ملاقات صبح و شام کا قصہ ہے۔ ہر بات ذہن میں اس طرح تازہ ہو گی گویا اس پر کوئی زمانہ گزرا ہی نہیں۔ مطلب یہ کہ اصل شے تو وہ احساس ہے جو اس دنیا کی زندگی سے متعلق روز آخرت میں طاری

ہوگا تو انسان کی محرومی و نامرادی ہی ہے کہ وہ اس دنیا کی زندگی کو بہت طویل سمجھ کر آخرت سے بے پروا ہو بیٹھے اور جب اسے اس سے ڈرایا جائے تو یہ مطالبہ شروع کر دے کہ اگر وہ آنی ہے تو آ کیوں نہیں جاتی۔

وَاِمَّا نُرِیَنَّكَ بَعْضَ الَّذِیْ نَعِدُهُمْ ..... الآیۃ خطاب پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جس عذاب سے ان کو ڈرایا جا رہا ہے اور یہ اس کے مؤخر ہونے کے سبب سے اس کو خالی خولی دھمکی سمجھ رہے ہیں اور تمھیں زچ کرنے کے لیے اس کی جلدی مچائے ہوئے ہیں، اگر حکمتِ الٰہی مقتضی ہوئی تو تمھاری زندگی ہی میں ان کو اس کا کچھ حصہ دکھا دیا جائے گا، ورنہ اللہ تعالیٰ تمھیں وفات دے گا اور ان کی واپسی ہماری طرف ہوگی پھر اللہ ان کا سارا کچا چٹھا ان کے سامنے رکھ دے گا۔

قریش پر فیصلہ کن عذاب نہ آنے کی وجہ

یہاں اللہ تعالیٰ کی وہ سنت پیش نظر ہے جس کا حوالہ ہم دوسرے مقام میں دے چکے ہیں کہ اگر کسی رسول کی قوم نے بحیثیت مجموعی اس کی تکذیب کر کے اس کے قتل کا ارادہ کر لیا ہے تب تو اللہ تعالیٰ نے رسول اور اس کے ساتھیوں کو الگ کر کے قوم کو اپنے کسی عذاب کے ذریعہ سے تباہ کر دیا ہے اور اگر قوم کے اندر معتد بہ تعداد ایمان والوں کی بھی نکلی ہے تو اس قوم پر اس دنیا میں کوئی فیصلہ کن عذاب بھیجنے کے بجائے اللہ تعالیٰ نے اس کے مکذبین کا معاملہ آخرت کے عذاب پر اٹھا رکھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قوم کا بڑا حصہ چونکہ ایمان لایا اس وجہ سے اس پر اس طرح کا کوئی فیصلہ کن عذاب نہیں آیا جیسا کہ عاد و ثمود وغیرہ قوموں پر آیا بلکہ آپ کے مکذبین اہل ایمان کے ساتھ تصادم میں ختم ہو گئے اور آخرت میں ان کو اپنی جواب دہی خدا کی عدالت میں کرنی ہے۔ آیت میں اسی سنت الٰہی کی طرف اشارہ ہے۔

وَلِكُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلٌ ۚ فَاِذَا جَآءَ رَسُوْلُهُمْ قُضِیَ بَیْنَهُمْ بِالْقِسْطِ وَهُمْ لَا یُظْلَمُوْنَ (۴۷)

رسول کی تکذیب کے باب میں سنتِ الٰہی

یہ قریش کو انذار ہے اس سنت الٰہی کی روشنی میں جس کی وضاحت ایک سے زیادہ مقامات میں ہو چکی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی حجت تمام کرنے کے لیے ہر قوم میں اپنے رسول بھیجے، یہ رسول خدا کی عدالت بن کر آئے اور ان کے ذریعے سے اس قوم کے درمیان حق و باطل کا فیصلہ کر دیا گیا، جو لوگ رسول پر ایمان لائے ان کو نجات و فلاح حاصل ہوئی اور جو لوگ اس کی تکذیب پر اڑے رہ گئے ان کی جڑ کاٹ دی گئی۔ مطلب یہ ہے کہ اب یہی مرحلہ قریش کے لیے بھی درپیش ہے۔ ان کے لیے بھی خدا کی میزانِ عدل نصب ہو چکی ہے اور اتمام حجت کے لیے خدا کا رسول آ چکا ہے۔ اگر انھوں نے تکذیب کر دی تو وہ بھی لازماً اسی انجام سے دوچار ہوں گے جس سے رسولوں کی تکذیب کرنے والی ان کی پیشرو قومیں دوچار ہو چکی ہیں وَهُمْ لَا یُظْلَمُوْنَ میں اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ اس معاملے میں خدا کی طرف سے کوئی بات عدل و انصاف کے خلاف نہیں ہوتی۔ خدا کا رسول ہر پہلو سے لوگوں پر اتمام حجت کر دیتا ہے اور لوگوں کو سوچنے سمجھنے، جانچنے اور دیکھنے کے لیے جتنا موقع ملنا چاہیے اتنا موقع بھی دیا جاتا ہے۔ یہ سارے جتن کر لینے کے بعد بھی جو لوگ اپنی ضد پر اڑے ہی رہ جاتے ہیں بالآخر ان کا فیصلہ کر دیا جاتا ہے ــــ یہاں وہ فرق ملحوظ رہے جو نبی اور رسول کے

درمیان ہم متعدد مقامات میں واضح کر چکے ہیں۔ یہ سنت الٰہی رسولوں کے ساتھ مخصوص ہے۔ انبیاء کے لیے اس کا ظہور ضروری نہیں ہے۔

وَيَقُولُونَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ إِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝ قُلْ لَّآ أَمْلِكُ لِنَفْسِيْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا إِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ۭ لِكُلِّ أُمَّةٍ أَجَلٌ ۭ إِذَا جَآءَ أَجَلُهُمْ فَلَا يَسْتَأْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ (۴۸-۴۹)

جلدبازوں کو جواب

یعنی جب ان کو اس حقیقت نفس الامری سے آگاہ کیا جاتا ہے تو بجائے اس کے کہ متنبہ ہوں اور خطرے سے بچنے کی راہ اختیار کریں اس کا مذاق اڑاتے ہیں، پیغمبر اور اس کے ساتھیوں سے کہتے ہیں کہ اگر تم اپنی اس بات میں سچے ہو تو آخر تمہاری یہ دھمکی واقعہ کی صورت میں کیوں نہیں ظاہر ہوتی؟ تم کب سے یہی رٹ لگائے ہوئے ہو، آخر یہ چیز کب واقع ہوگی؟ فرمایا کہ ان کو جواب دے دو کہ یہ خدا کی بات تھی جو میں نے تمہیں سنا دی۔ رہا یہ امر کہ یہ بات کب واقع ہوگی تو نہ میں غیب جانتا اور نہ خود اپنے معاملے میں کسی نقصان یا نفع پر اختیار رکھتا ہوں۔ یہ چیز تمام تر اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے جب اس کی حکمت کا تقاضا ہوگا یہ ظاہر ہوگی اور جب ظاہر ہوگی تو کوئی اس کو دفع نہ کر سکے گا۔

ہر امت کے لیے وقت مقرر ہے

'لِكُلِّ أُمَّةٍ أَجَلٌ ..... الآیۃ' یہ اسی سوال کا اصولی جواب ہے کہ ہر امت کے لیے ایک وقت مقرر ہے، جب وہ وقت آ جائے گا تو نہ ایک گھڑی پیچھے ہوں گے نہ آگے۔ ہم دوسرے مقام میں واضح کر چکے ہیں کہ قوموں کی ہلاکت کی 'اجل' اخلاقی پیمانہ سے ناپ کر اللہ تعالیٰ نے مقرر فرمائی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہر قوم کو ڈھیل دیتا ہے یہاں تک کہ جب اس کا طغیان اس حد کو پہنچ جاتا ہے جو ہلاکت کے لیے مقرر ہے تو اللہ تعالیٰ اس قوم کا بیڑا غرق کر دیتا ہے اور یہ بات اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو معلوم نہیں ہوتی کہ کب سوئی اپنے آخری نشان پر پہنچی۔

قُلْ أَرَءَيْتُمْ إِنْ أَتٰىكُمْ عَذَابُهٗ بَيَاتًا أَوْ نَهَارًا مَّاذَا يَسْتَعْجِلُ مِنْهُ الْمُجْرِمُوْنَ ۝ أَثُمَّ إِذَا مَا وَقَعَ اٰمَنْتُمْ بِهٖ ۭ آٰلْـٰٔنَ وَقَدْ كُنْتُمْ بِهٖ تَسْتَعْجِلُوْنَ ۝ ثُمَّ قِيْلَ لِلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ذُوْقُوْا عَذَابَ الْخُلْدِ ۚ هَلْ تُجْزَوْنَ إِلَّا بِمَا كُنْتُمْ تَكْسِبُوْنَ (۵۰-۵۲)

جلدبازوں سے ایک سوال

ان کے سوال 'مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ' کا جواب تو اوپر کی آیات میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے دلوا دیا لیکن ساتھ ہی ان کے سوال کے مقابل میں ایک سوال ان سے بھی کر دیا کہ ان سے پوچھو کہ اس طنطنہ سے جو خدا کے عذاب سے متعلق سوال کر رہے ہو تو آخر کس بل بوتے پر کود رہے ہو؟ اس کا عذاب چاہے رات کی تاریکی میں چپ چپاتے آ جائے یا پورے دن کی روشنی میں ڈنکے کی چوٹ آ دھمکے آخر ان مجرمین نے اس کے مقابلے کے لیے کیا سامان دفاع تیار کر رکھا ہے؟ یہاں 'مجرموں' کے لفظ میں ایک لطیف اشارہ اس بات کی طرف بھی ہے کہ جو لوگ جرم سے بری ہیں اگر وہ اس طرح کا سوال کرتے تو اس کے لیے تو ایک جواز ہو سکتا تھا لیکن جو لوگ مجرم ہیں اور جن کے جرم ہی کی پاداش میں یہ برق خاطف گرنے والی ہے ان کی یہ ڈھٹائی

ان کی بدبختی اور شامت کے سوا اور کس چیز کی دلیل ہے!

'اَثُمَّ اِذَا مَا وَقَعَ اٰمَنْتُمْ بِهٖ' یعنی کیا اس بے جلدی مچائے ہوئے ہو کہ جب وہ آجائے گا تب اس پر ایمان لاؤ گے کہ پیغمبر نے سچی خبر دی تھی اور وہ سچے تھے، لیکن اس وقت کا ایمان کیا نفع دے گا؟ اس وقت ایمان لائے تو تم سے کہا جائے گا۔ 'آٰلْـٰٔنَ وَقَدْ كُنْتُمْ بِهٖ تَسْتَعْجِلُوْنَ' کہ اب مانتے حالانکہ یہی چیز ہے جس کے لیے تم اپنی رعونت کے سبب سے جلدی مچائے ہوئے تھے اور سمجھتے تھے کہ یہ محض بھبکی ہے۔

'ثُمَّ قِيْلَ لِلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا' یعنی مذکورہ عذاب عاجل کے بعد جب عذاب آخرت کا مرحلہ آئے گا تو ان ظالموں سے کہا جائے گا کہ اب دائمی عذاب چکھو، یہ تمہاری اپنی ہی کرتوتوں کا ثمرہ ہے۔ یہاں ان لوگوں کو 'ظالم' اس وجہ سے کہا گیا کہ انھوں نے اپنے لیے یہ پس بھری فصل خود کاشت کی۔ خدا ان کے اوپر، جیسا کہ اوپر آیت ۴۴ میں ہے، کوئی ظلم نہیں کرے گا۔

وَيَسْتَنْۢبِـُٔوْنَكَ اَحَقٌّ هُوَ ؕ قُلْ اِيْ وَرَبِّيْۤ اِنَّهٗ لَحَقٌّ ؕۚ وَمَاۤ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِيْنَ ۰ وَلَوْ اَنَّ لِكُلِّ نَفْسٍ ظَلَمَتْ مَا فِي الْاَرْضِ لَافْتَدَتْ بِهٖ ؕ وَاَسَرُّوا النَّدَامَةَ لَمَّا رَاَوُا الْعَذَابَ ۚ وَقُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ (۵۳-۵۴)

عذاب کا مذاق اڑانے والوں کو جواب

'وَيَسْتَنْۢبِـُٔوْنَكَ اَحَقٌّ هُوَ' اوپر آیت ۴۸ میں کفار کا سوال 'مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ' نقل ہوا ہے یہ سوال بھی اسی نوعیت کا ہے۔ بس یہ فرق ہے کہ اس میں انکار و استہزا کا پہلو ذرا مخفی ہے، اس میں وہ کھل کر سامنے آگیا ہے۔ سوال کرنے والوں کے مزاج مختلف قسم کے ہوتے ہیں۔ بعض ذرا رکھ رکھاؤ کے انداز میں اپنے دل کی بات کہتے ہیں۔ بعض منہ پھٹ ہوتے ہیں جو اپنی بات پھینک مارتے ہیں۔ اسی قسم کے لاابالیوں کی زبان سے یہ سوال نقل ہوا ہے کہ یہ پیغمبر سے پوچھتے ہیں کہ یہ جو عذاب اور جزا و سزا کی باتیں سنا رہے ہو یہ حقیقت ہے یا یوں ہی محض دھونس جمانے کے لیے ڈینگیں مار رہے ہو؟

'قُلْ اِيْ وَرَبِّيْۤ اِنَّهٗ لَحَقٌّ وَمَاۤ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِيْنَ'۔ 'اِیْ' حرف جواب ہے 'نَعَمْ' کے معنی میں اور یہ صرف قسم سے پہلے آتا ہے۔ سوال کرنے والوں کی ذہنیت کو پیش نظر رکھ کر صرف سادہ جواب ہی پر اکتفا نہیں فرمایا بلکہ قسم کے ساتھ جواب دیا کہ یہ چیز شدنی ہے اور ساتھ ہی 'وَمَاۤ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِيْنَ' کے الفاظ سے ان کی رعونت پر بھی ضرب کاری لگا دی کہ جب یہ چیز ظاہر ہوگی تو تم میرے رب کی گرفت سے بچ کے نکل نہ سکو گے۔

'وَلَوْ اَنَّ لِكُلِّ نَفْسٍ ظَلَمَتْ ...... الاية' یعنی آج تو بڑی رعونت سے تم اس کا مذاق اڑا رہے ہو۔ لیکن جب یہ چیز سامنے آئے گی تو ہر جان، جس نے اس دن سے غفلت برت کر اپنے اوپر ظلم ڈھایا ہوگا، اس کا حال یہ ہوگا کہ اگر زمین کی ساری دولت بھی اس کے ہاتھ آجائے اور اس کو فدیہ میں دے کر اس دن کی ہولناکی سے نجات پانا ممکن ہو تو وہ اس کو فدیہ میں دے کر اپنی جان چھڑانے کی کوشش کرے گی۔ 'وَاَسَرُّوا النَّدَامَةَ لَمَّا رَاَوُا الْعَذَابَ' میں وہی حقیقت ظاہر کی گئی ہے جو سورۂ انعام آیت ۲۱ میں بیان ہوئی ہے حَتّٰۤى اِذَا

جَآءَتْهُمُ السَّاعَةُ بَغْتَةً قَالُوْا يٰحَسْرَتَنَا عَلٰى مَا فَرَّطْنَا فِيْهَا (یہاں تک کہ جب وہ گھڑی ان پر آدھمکے گی وہ کہیں گے ہائے افسوس اس کوتاہی پر جو اس معاملے میں ہم نے کی) چونکہ ندامت اور افسوس کا منبع انسان کا باطن ہوتا ہے اس وجہ سے اس کے لیے لفظ 'اسرّ' استعمال ہوا ہے جس طرح 'ابطن العداوۃ' کا محاورہ عربی میں معروف ہے۔ مقصود یہی بتانا ہے کہ آج تو یہ مذاق اڑا رہے ہیں لیکن کل وہ اپنی اس نالائقی پر نادم اور پشیمان ہوں گے 'وَقُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ' یعنی ان کے درمیان پورے انصاف کے ساتھ فیصلہ کر دیا جائے گا، جو کچھ انھوں نے کمایا ہوگا وہی ان کے سامنے آئے گا۔ ان کے اوپر کوئی زیادتی نہیں ہوگی۔ اس میں ایک اشارہ اس بات کی طرف بھی ہو گیا کہ انھوں نے اپنے مزعومہ شرکاء اور شفعاء سے جو امیدیں باندھ رکھی ہیں وہ سب بے حقیقت ثابت ہوں گی۔ کوئی چیز خدا کے انصاف پر اثر انداز نہ ہو سکے گی۔

اَلَآ اِنَّ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ اَلَآ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ هُوَ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ (۵۵-۵۶)

یہ توحید کے مضمون سے اوپر کے مضمون کو مزید مؤکد کیا ہے اور 'اَلَآ' کے لفظ سے پوری طرح متنبہ بھی فرما دیا ہے کہ کان کھول کر اچھی طرح سن لو کہ آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے سب خدا ہی کا ہے، کسی کی بھی اس میں شرکت اور حصہ داری نہیں ہے۔ اس کا ہر وعدہ اور اس کی ہر وعید ایک امر واقعی اور شدنی ہے۔ وہی زندہ کرتا ہے اور وہی مارتا ہے اور اسی کی طرف سب کو لوٹنا ہے۔ اگر کسی نے یہ گمان کر رکھا ہے کہ اس کا معاملہ اس کے مزعومہ شرکاء اور شفعاء سے متعلق ہوگا تو وہ اس خیال خام کی اصلاح کر لے، جن کو زندہ کرنے میں کوئی دخل نہیں، جن کو موت کے معاملے میں کوئی اختیار نہیں آخر وہ آخرت میں مولیٰ و مرجع کس طرح بن جائیں گے 'وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ' مجرد خبر کا جملہ نہیں ہے بلکہ اس کے اندر افسوس اور حسرت کا مضمون مضمر ہے یعنی اصل حقیقت تو یہ ہے کہ اللہ کا ہر وعدہ اور اس کی ہر وعید شدنی ہے اور اس وقت خدا کے آگے کسی کی بھی کچھ پیش نہیں جائے گی لیکن افسوس ہے کہ اکثر لوگ اس عظیم حقیقت سے اپنے کان بند کیے ہوئے ہیں۔

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاۗءَتْكُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَشِفَاۗءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ ڏ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ۝ قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَبِرَحْمَتِهٖ فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا ۭ هُوَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ (۵۷-۵۸)

قرآن کی چار صفتیں

'يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ ...... الآیۃ' اوپر ایک نظر ڈال کر دیکھ لیجیے یہ سلسلۂ کلام آیت ۳۷ میں کفار کے اس خیال کی تردید سے چلا تھا کہ یہ قرآن کوئی من گھڑت چیز ہے۔ اس کے بعد کلام کا رخ ان باتوں کو ثابت کرنے کی طرف مڑ گیا تھا جو مخالفین کے ذہنوں میں الجھن پیدا کیے ہوئے تھیں اور جن کو نہ ماننے کی خواہش کے تحت وہ قرآن اور پیغمبر کی تکذیب کر رہے تھے۔ اب پھر بطور التفات قرآن کی قدر و قیمت واضح کر دی گئی کہ کتنی بڑی نعمت ہے جو لوگوں کو محض اللہ کے فضل سے حاصل ہوئی ہے۔ لیکن بدقسمت لوگ اس کی قدر نہیں کر رہے ہیں۔ یہاں قرآن کی چار صفتیں بیان ہوئی ہیں۔ ایک یہ کہ یہ تمھارے رب کی جانب سے موعظت ہے۔

یعنی جن خطرات و مہالک سے لوگوں کو بچنا چاہیے ان سے آگاہی اور جو لوگ آنکھ بند کیے ان کی طرف بڑھے چلے جا رہے ہیں ان کو زجر و تنبیہ۔ دوسری یہ کہ 'شِفَآءٌ لِّمَا فِی الصُّدُوْرِ' ہے یعنی دلوں کو جو روگ لگتے ہیں اور جن کے سبب سے انسان تمام انسانی اوصاف کھو کر مختوم القلب اور حیوانات سے بدترین بن جاتا ہے، ان سب کا اس میں علاج ہے۔ یہ بات یہاں یاد رکھنی چاہیے کہ قرآن میں دل ہی کو تمام حکمت و بصیرت اور تمام عزائم و اعمال کا مرکز اور حقیقی زندگی کا منبع قرار دیا گیا ہے۔ قرآن کے نزدیک زندہ صرف وہی لوگ ہیں جن کے دل زندہ ہیں، جن کے دل زندہ نہیں ہیں وہ مردہ ہیں۔ تیسری اور چوتھی یہ کہ یہ ہدایت و رحمت ہے۔ ہم دوسرے مقام میں یہ واضح کر چکے ہیں کہ یہ دونوں صفتیں آغاز و انجام دونوں پہلوؤں پر حاوی ہیں۔ اس دنیا میں قرآن ہدایت ہے اور جو لوگ اس ہدایت کو قبول کر لیں گے ان کے لیے آخرت میں ابدی رحمت کی ضمانت ہے۔

'قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ ...... الاٰیۃ' میرے نزدیک آیت میں فعل محذوف ہے یعنی قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَبِرَحْمَتِهٖ جَآءَ، یہ قرآن اللہ کے فضل اور اس کی رحمت کو لے کر نازل ہوا ہے 'فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا' تو جن کو خوش ہونا ہے وہ اس فضل و رحمت کو اختیار کریں اور اس پر خوش ہوں 'هُوَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ' یہ ان خزف ریزوں سے کہیں بڑھ کر ہے جن کو دنیا کے پرستار جمع کر رہے ہیں اور جن کے عشق میں ایسے اندھے ہوئے ہیں کہ ابدی قدر و قیمت کے یہ جواہرات ان کو نظر نہیں آ رہے ہیں۔

قُلْ اَرَءَيْتُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰهُ لَكُمْ مِّنْ رِّزْقٍ فَجَعَلْتُمْ مِّنْهُ حَرَامًا وَّحَلٰلًا ۭ قُلْ آٰللّٰهُ اَذِنَ لَكُمْ اَمْ عَلَى اللّٰهِ تَفْتَرُوْنَ ۝ وَمَا ظَنُّ الَّذِيْنَ يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَشْكُرُوْنَ (۵۹-۶۰)

اپنے جی کے تحریم و تحلیل اللہ پر افترا ہے

'قُلْ اَرَءَيْتُمْ ...... الاٰیۃ' اوپر والی آیت میں قرآن کا ذکر، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، بطور التفات آ گیا تھا۔ اس کے بعد توحید اور قیامت کا وہی سلسلۂ بیان پھر لوٹ آیا جو قرآن اور پیغمبر کی صداقت ثابت کرنے کے لیے شروع سے چلا آ رہا ہے۔ فرمایا کہ ذرا تم اپنی اس عجیب و غریب حرکت پر غور کرو کہ رزق اتارا تو اللہ نے لیکن اس میں سے حرام اور حلال تم نے اپنے جی سے ٹھہرا لیے۔ شرک اور تحریم و تحلیل کے تعلق پر ایک سے زیادہ مقامات میں تفصیل سے بحث گزر چکی ہے۔ اول تو تحریم و تحلیل خدا کے حقوق میں مداخلت ہے جو بجائے خود شرک ہے۔ دوسرے مشرکین نے یہ تحریم و تحلیل، جیسا کہ سورۂ انعام میں تفصیل سے بحث گزر چکی ہے، اپنے مشرکانہ عقائد و تصورات کے تحت کی تھی۔ لیکن دعویٰ یہ کرتے تھے کہ یہی خدا کا حکم ہے۔ ظاہر ہے کہ اپنی من گھڑت شریعت کو بے دلیل خدا کی طرف منسوب کرنا خدا پر افترا ہے جو شدید ترین جرائم میں سے ہے۔

'وَمَا ظَنُّ الَّذِيْنَ يَفْتَرُوْنَ' یہ افتراء علی اللہ کے جرم کی انتہائی شناعت کا اظہار ہے۔ سوال کیا ہے کہ جو لوگ اللہ پر جھوٹ لگا رہے ہیں قیامت کے دن ان کا کیا گمان ہے؟ سوال کر کے جواب دیے بغیر بات

ختم کر دی ہے جو متکلم کے انتہائی غضب کی دلیل ہے مطلب یہ ہے کہ کیا یہ شامت زدہ لوگ اس جرم عظیم کو کوئی معمولی بات سمجھے بیٹھے ہیں قیامت آئے گی تو انھیں پتہ چلے گا کہ اس جسارت کی ان کو کیا سزا ملتی ہے۔

'اِنَّ اللّٰهَ لَذُوْ فَضْلٍ ..... الآیۃ' مطلب یہ ہے کہ ان کا یہ جرم تو ایسا گھنونا ہے کہ ابھی ان کا قصہ پاک کر دیا جاتا لیکن اللہ لوگوں پر بڑے فضل والا ہے کہ لوگوں کے بڑے بڑے جرائم کے باوجود ان کو مہلت بھی دیتا ہے اور ان کو اپنے رزق و فضل سے بھی محروم نہیں کرتا کہ اگر وہ اپنے جرم کی تلافی اور توبہ و اصلاح کرنا چاہیں تو کر لیں لیکن لوگوں کی اکثریت کا حال یہی ہے کہ وہ شکر گزار نہیں ہوتے بلکہ اس ڈھیل اور درگزر سے ان کی حماقت اور شرارت میں اضافہ ہی ہوتا جاتا ہے۔

وَمَا تَكُوْنُ فِيْ شَاْنٍ وَّمَا تَتْلُوْا مِنْهُ مِنْ قُرْاٰنٍ وَّلَا تَعْمَلُوْنَ مِنْ عَمَلٍ اِلَّا كُنَّا عَلَيْكُمْ شُهُوْدًا اِذْ تُفِيْضُوْنَ فِيْهِ ؕ وَمَا يَعْزُبُ عَنْ رَّبِّكَ مِنْ مِّثْقَالِ ذَرَّةٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِي السَّمَآءِ وَلَاۤ اَصْغَرَ مِنْ ذٰلِكَ وَلَاۤ اَكْبَرَ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ۝ اَلَاۤ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ ۝ لَهُمُ الْبُشْرٰى فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ ؕ لَا تَبْدِيْلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝ وَلَا يَحْزُنْكَ قَوْلُهُمْ ۘ اِنَّ الْعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا ؕ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ (۶۱-۶۵)

پیغمبر صلعم اور صحابہؓ کو تسلی

'وَمَا تَكُوْنُ فِيْ شَاْنٍ .... الآیۃ' - یہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھیوں کے لیے بطور التفات تسلی اور بشارت ہے کہ مخالفوں کی ان غوغا آرائیوں کی ذرا پروا نہ کرو، تم جہاں کہیں اور جس حال میں بھی ہو عبادت و طاعت اور تذکیر و دعوت کی جس مہم میں بھی مصروف ہو، پورے انہماک اور پوری یکسوئی و دل جمعی کے ساتھ اس میں لگے رہو۔ ہم ہر جگہ تمھارے ساتھ ہیں، تمھارے ایک ایک عمل کو دیکھ رہے ہیں اور تمھاری حفاظت و نگرانی کر رہے ہیں۔ آسمان اور زمین کی کوئی چیز چھوٹی ہو یا بڑی خدا سے اوجھل نہیں ہے۔ ہر چیز ایک کھلی کتاب میں درج اور ہر وقت خدا کی نگاہوں کے سامنے ہے۔ 'وَمَا تَتْلُوْا مِنْهُ مِنْ قُرْاٰنٍ' میں ضمیر مجرور کا مرجع کتاب الٰہی ہے جس کا ذکر اوپر آیت ۵۷-۵۸ میں گزر چکا ہے اور 'قرآن' سے یہاں مراد کتاب الٰہی کا کوئی جزو اور حصہ ہے۔ اس معنی کے لیے نظائر قرآن میں موجود ہیں۔ 'وَلَا تَعْمَلُوْنَ مِنْ عَمَلٍ' میں خطاب جمع آپ کے جان نثار ساتھیوں سے ہے تاکہ یہ واضح ہو جائے کہ یہ پیام تسلی و بشارت پیغمبرؐ ہی کے لیے مخصوص نہیں ہے بلکہ آپ کے ساتھیوں کے لیے بھی ہے جو اس وقت اللہ کے دین کی راہ میں جان کی بازی لگائے ہوئے ہیں۔ 'اِذْ تُفِيْضُوْنَ فِيْهِ'، 'افاض' کا صلہ جب 'فی' کے ساتھ آتا ہے تو اس کے معنی کسی شے میں غایت درجہ انہماک کے ہوتے ہیں۔ یہاں اس قید سے ایک تو اس غیر معمولی انہماک پر بھی روشنی پڑی جو اقامت دین کی اس جدوجہد میں صحابہؓ کو تھا۔ دوسرے اس سے تسلی کے مضمون کی بلاغت بھی دو چند ہو گئی ہے اس لیے کہ اس کا مطلب یہ ہوا کہ جب تم اپنے تن، من، دھن ہر چیز سے بے پروا ہو کر خدا کے کلمہ کی سربلندی کی جدوجہد میں لگے ہوئے ہوتے ہو تو اس وقت ہم تمھارے پیچھے تمھاری حفاظت و نگرانی میں مصروف ہوتے ہیں۔

کیا غم ہے جو ہو ساری خدائی بھی مخالف
کافی ہے اگر ایک خدا میرے لیے ہے

اَلَآ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ ...... الاٰیۃ ۔ اسلوب کلام سے بن کہے یہ بات واضح ہو گئی کہ یہی گروہ اللہ کے دوستوں کا گروہ ہے اور ان کے لیے آخرت میں ایک ایسی زندگی کی بشارت ہے جس میں نہ ماضی کا کوئی پچھتاوا ہو گا نہ مستقبل کا کوئی اندیشہ۔

خدا کی دوستی ایمان و تقویٰ کی بنا پر

'اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ'، اس صفت کے یہاں لانے سے مقصود اس حقیقت کو ظاہر کرنا ہے کہ اللہ کی دوستی اور محبت کا یہ مقام اور اس کا مذکورہ ثمرہ ان لوگوں کے لیے ہے جو ایمان کے ساتھ تقویٰ اور حدودِ الٰہی کی حفاظت پر قائم و دائم رہیں گے۔ یعنی یہ کسی گروہ کا اجارہ نہیں بلکہ صفات کے ساتھ مشروط ہے۔

'لَهُمُ الْبُشْرٰى فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ ...... الاٰیۃ' ان کے لیے دنیا کی زندگی میں غلبہ و تمکن اور آخرت میں جنت نعیم کی بشارت ہے۔ یہاں وہ بات ذہن میں رہے جو ہم رسولوں کے متعلق ایک سے زیادہ مقامات میں واضح کر چکے ہیں کہ ان کو اور ان کے ساتھیوں کو اس دنیا میں بھی لازماً غلبہ حاصل ہوتا ہے۔ اس غلبہ کے باب میں جو سنت الٰہی ہے اس کی وضاحت بھی اس کے محل میں ہو چکی ہے۔ ان انبیا کا معاملہ جو صرف نبی تھے، رسول نہیں تھے، اس سے الگ ہے۔

'لَا تَبْدِيْلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ' یہاں 'كَلِمٰتِ اللّٰهِ' سے مراد خدا کے وعدے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ کے وعدے اٹل ہیں۔ یہ پورے ہو کے رہیں گے اور اصلی اور بڑی کامیابی یہی ہے جس کا وعدہ اہل ایمان کے لیے کیا جا رہا ہے۔

'وَلَا يَحْزُنْكَ قَوْلُهُمْ اِنَّ الْعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا' یہاں 'قَوْلُهُمْ' سے مراد کفار کے اس طرح کے طعن آمیز اقوال ہیں جن کی ایک مثال سورۂ ہود آیت ١٢ میں یوں نقل ہوئی ہے فَلَعَلَّكَ تَارِكٌۢ بَعْضَ مَا يُوْحٰٓى اِلَيْكَ وَضَآئِقٌۢ بِهٖ صَدْرُكَ اَنْ يَّقُوْلُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ كَنْزٌ اَوْ جَآءَ مَعَهٗ مَلَكٌ ۭ اِنَّمَآ اَنْتَ نَذِيْرٌ ۭ وَاللّٰهُ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ وَّكِيْلٌ (تو شاید تم اس وحی کا جو تم پر کی جا رہی ہے، کچھ حصہ چھوڑ دینے والے ہو اور اس سے تمہارا سینہ بھنچ رہا ہے کہ وہ طعنہ دیں گے کہ اس کے اوپر کوئی خزانہ کیوں نہیں اتارا جاتا یا اس کے ساتھ کوئی فرشتہ کیوں نہیں آیا، تم تو بس ایک ہوشیار کر دینے والے ہو، اللہ ہر چیز پر وکیل ہے) ان آیات کے نزول کے دور میں مسلمانوں کا جو حال تھا اس کے لحاظ سے تمکن اور غلبہ کی وہ بشارت جو اوپر والی آیت میں مذکور ہوئی کفار کے لیے طنز و استہزا کا موضوع بن سکتی تھی۔ وہ کہہ سکتے تھے اور انھوں نے کہا بھی ہو گا کہ ذرا اس نئے دین کے سرپھروں کا حوصلہ دیکھو کہ کسی کو دو وقت کی قرینہ کی روٹی اور تن ڈھانکنے کو سلیقہ کا لباس نصیب نہیں لیکن حکومت و سلطنت کے خواب دیکھ رہے ہیں۔ اسی کو پیش نظر رکھ کر فرمایا کہ تمھیں مخالفین کی اس طرح کی باتیں غم میں نہ ڈالیں۔ تمھارے لیے جو بشارت ہے وہ حتمی اور قطعی ہے۔ عزت

کا مالک اللہ ہے، یہ چیز جس کو بھی ملتی ہے اللہ ہی کے دیے ملتی ہے۔ اب اللہ نے اگر یہ عزت تمھیں اور تمھارے ساتھیوں کو دینے کا فیصلہ فرما لیا ہے تو اس کا ہاتھ کون پکڑ سکتا ہے۔ هُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ کی صفات کے حوالہ سے مقصود یہاں پیغمبرؐ اور آپ کے ساتھیوں کو صبر اور توکل کی تعلیم دینا ہے کہ خدا ساری باتیں سنتا اور جانتا ہے۔ ان کی ہر بات کا جواب اپنے وقت پر ظاہر ہو گا۔ تم صبر کے ساتھ اپنے کام کیے جاؤ۔

أَلَا إِنَّ لِلَّهِ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْأَرْضِ ط وَمَا يَتَّبِعُ الَّذِينَ يَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ شُرَكَاءَ ط إِنْ يَتَّبِعُونَ إِلَّا الظَّنَّ وَإِنْ هُمْ إِلَّا يَخْرُصُونَ ○ هُوَ الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ اللَّيْلَ لِتَسْكُنُوا فِيهِ وَالنَّهَارَ مُبْصِرًا ط إِنَّ فِي ذٰلِكَ لَآيٰتٍ لِقَوْمٍ يَسْمَعُونَ ○ قَالُوا اتَّخَذَ اللَّهُ وَلَدًا سُبْحٰنَهُ ط هُوَ الْغَنِيُّ ط لَهُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ ط إِنْ عِنْدَكُمْ مِنْ سُلْطٰنٍ بِهٰذَا ط أَتَقُولُونَ عَلَى اللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ ○ قُلْ إِنَّ الَّذِينَ يَفْتَرُونَ عَلَى اللَّهِ الْكَذِبَ لَا يُفْلِحُونَ ○ مَتَاعٌ فِي الدُّنْيَا ثُمَّ إِلَيْنَا مَرْجِعُهُمْ ثُمَّ نُذِيقُهُمُ الْعَذَابَ الشَّدِيدَ بِمَا كَانُوا يَكْفُرُونَ (۶۶-۷۰)

شرک کی بنا محض گمان پر ہے

'أَلَا إِنَّ لِلَّهِ ...... الایۃ' اوپر والی آیت، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، بطور التفات تھی۔ اب توحید کے مضمون کو پھر لے لیا جو پیچھے سے چلا آ رہا تھا۔ فرمایا کہ اچھی طرح کان کھول کر سن لو کہ آسمانوں اور زمین میں جو بھی ہے، خواہ فرشتے یا جنات یا انسان، سب خدا ہی کی مخلوق اور اسی کے مملوک ہیں، ان میں سے کسی کا یہ درجہ نہیں کہ وہ خدا کی خدائی میں شریک و سہیم ہو تو جو لوگ اللہ کے سوا دوسروں کو پکارتے ہیں وہ فی الحقیقت خدا کے شریکوں کی پیروی نہیں کر رہے ہیں اس لیے کہ خدا کا تو کوئی شریک ہے ہی نہیں۔ بلکہ یہ لوگ محض اپنے گمان کی پیروی کر رہے ہیں اور اٹکل کے تیر تکے چلا رہے ہیں۔ 'ظن' کے لفظ پر ہم دوسرے مقام میں بحث کر چکے ہیں۔ یہاں اس سے مراد وہ بات ہے جس کی بنیاد نہ علم صحیح پر ہے نہ عقل و فطرت پر بلکہ مجرد وہم و خیال اور اٹکل پچو اندازوں پر ہے۔

مقابل الفاظ کے حذف کا اسلوب

'هُوَ الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ اللَّيْلَ .... الایۃ' اس آیت میں عربی زبان کا وہ اسلوب استعمال ہوا ہے جس میں مقابل الفاظ حذف کر دیے جاتے ہیں اور جس کی متعدد مثالیں پچھلی سورتوں میں گزر چکی ہیں۔ اس حذف کو کھول دیا جائے تو پوری بات گویا یوں ہو گی۔ جَعَلَ لَكُمُ اللَّيْلَ (مظلما) لِتَسْكُنُوا فِيهِ وَالنَّهَارَ مُبْصِرًا (لتعملوا فیہ)۔

فرمایا وہی خدا ہے جس نے تمھارے لیے شب کو تاریک اور خنک بنایا کہ تم اس میں آرام کرو اور دن کو روشن بنایا تاکہ تم اس میں کام کرو۔ 'إِنَّ فِي ذٰلِكَ لَآيٰتٍ لِقَوْمٍ يَسْمَعُونَ' یعنی رات اور دن اس نوعیت کے سننے اور سمجھنے والوں کے لیے نشانیاں ہیں۔ یہاں نشانیوں کی وضاحت نہیں کی ہے لیکن قرآن کے دوسرے مقامات میں ان کی وضاحت موجود ہے۔ ہم ان میں سے بعض کی طرف اشارہ کریں گے۔

رات اور دن کی نشانیاں ردِ شرک کے لیے

سب سے پہلے تو اس پہلو پر نگاہ کیجیے جو رات اور دن کے اندر باوجودیکہ وہ دونوں ضدین کی نسبت رکھتے ہیں، پایا جاتا ہے کہ دونوں مل کر انسان کی خدمت کر رہے ہیں۔ رات اس کے لیے راحت کا بستر بچھاتی ہے اور دن اس کے لیے سرگرمیوں کا میدان کھولتا ہے۔ یہی حال اس کائنات کے تمام اضداد کا ہے کہ وہ پوری دمسازی اور سازگاری کے ساتھ اپنے سے بالاتر مقصد کی خدمت میں سرگرم ہیں اور اس سے ذرا انحراف اختیار نہیں کرتے۔ ظاہر ہے کہ یہ اس کے بغیر ممکن نہیں ہے کہ ایک بالاتر اور حکیم ارادہ اس کائنات کے پورے نظام پر حاوی اور قاہر ہو اور وہ اس کے اجزائے مختلفہ میں ربط و تعلق پیدا کر کے اس کو اپنی حکمت کے تحت چلا رہا ہو ـــــ یہ اس توحید کی دلیل ہوئی جس کا ذکر اوپر والی آیت میں ہے۔

دوسری چیز جو ظاہر ہو رہی ہے وہ یہ ہے کہ یہ کارخانۂ کائنات نہ کوئی اتفاقی حادثہ کے طور پر ظہور میں آجانے والی شے ہے اور نہ یہ کسی کھلنڈرے کا کھیل تماشہ ہے بلکہ اس کے ہر گوشے میں عظیم قدرت، حیرت انگیز حکمت اور نہایت گہری غایت و مصلحت پائی جاتی ہے۔ یہ چیز مقتضی ہے کہ یہ دنیا نہ یوں ہی چلتی رہے، نہ یوں ہی تمام ہو جائے بلکہ ضروری ہے کہ یہ کسی عظیم غایت پر منتہی ہو اور یہ غایت بغیر اس کے پوری نہیں ہو سکتی کہ اس کے بعد آخرت کو تسلیم کیا جائے۔

تیسری چیز وہ ربوبیت کا نظام ہے جو اس کے ہر گوشے میں جلوہ گر ہے۔ ربوبیت مسئولیت کو مقتضی ہے جس نے ہمارے لیے زندگی اور پرورش کا یہ سارا نظام قائم کیا ہے اس کا ہم پر فطری طور پر حق قائم ہوتا ہے اور لازم ہے کہ ایک دن اس حق کی بابت ہم سے پرسش ہو جنھوں نے اس حق کو پہچانا ہو وہ اس کا انعام پائیں اور جنھوں نے اس کی ناقدری کی ہو وہ اس کی سزا بھگتیں۔ اس اعتبار سے یہ جزا اور سزا کی دلیل ہوئی۔

یہاں جس طرح قرآن نے اشارے پر اکتفا کیا ہے اسی طرح ہم بھی اشارات پر اکتفا کرتے ہیں۔ دوسرے مقامات میں یہ سارے پہلو نہایت تفصیل سے زیر بحث آئے ہیں۔

... کی کا تردید

'قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا سُبۡحٰنَهٗ ...... الاٰیۃ' لفظ 'ولد'، مذکر، مونث، جمع، مثنیٰ سب کے لیے آتا ہے۔ جن لوگوں نے اس کو بیٹے کے معنی میں لیا ہے ان کی بات زبان اور عرب کے عقائد دونوں کے خلاف ہے۔ یہاں عقائد مشرکین عرب کے زیر بحث ہیں اور مشرکین عرب کسی کو خدا کا بیٹا نہیں مانتے تھے۔ وہ فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں کہتے تھے۔

'سُبۡحٰنَهٗ' یعنی یہ بات خدا کی صفات الوہیت کے منافی ہے کہ اس کے لیے اولاد مانی جائے اس لیے کہ جو اولاد ہوگی وہ خدا کی ذات کا ایک جزو اور اس کی مثیل و نظیر ہوگی اور یہ شرک فی الذات اور اس کی بےہمگی اور بےہمتائی کی نفی ہے۔

'هُوَ الۡغَنِیُّ' یعنی خدا اس بات سے مستغنی ہے کہ اس کے اولاد ہو۔ آدمی کو اولاد کی ضرورت اس لیے ہوتی ہے کہ وہ اس کی نسل کی بقا کا ذریعہ بنتی ہے۔ اس کے کاروبار میں اس کی مددگار ہوتی ہے جب وہ

بوڑھا ہوتا ہے تو اس کو سہارا دیتی ہے۔ خدا ان تمام ضروریات و حالات سے بالا و برتر، مستغنی اور بے نیاز ہے۔ لَهُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے سب اسی کا ہے تو اس کو اولاد کی کیا ضرورت ہے؟ اِنْ عِنْدَكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍۢ بِهٰذَا، سلطان کے معنی دلیل کے ہیں۔ یعنی تمہارے پاس اس بات کی کوئی دلیل نہیں ہے بس یونہی خدا پر ایک تہمت جوڑ رہے ہو۔

قُلْ اِنَّ الَّذِيْنَ يَفْتَرُوْنَ ...... الاٰیۃ 'فلاح' کا لفظ قرآن میں عاقبت کار کی کامیابی و سرخروئی کے لیے آتا ہے۔ فرمایا کہ جو لوگ اللہ پر شرک کی تہمت جوڑ رہے ہیں وہ عاقبت کار کی کامیابی سے محروم ہیں۔

مَتَاعٌ فِي الدُّنْيَا ثُمَّ اِلَيْنَا مَرْجِعُهُمْ ...... الاٰیۃ یعنی ان کے لیے بس اس دنیا کی زندگی میں چند روزہ نفع اٹھا لینے کی مہلت ہے۔ پھر سب کی واپسی ہماری طرف ہوگی اور ہم ان کے کفر کی پاداش میں ان کو اپنے عذاب سخت کا مزہ چکھائیں گے۔

١٠۔ آگے کا مضمون ـــــ آیات ٧١-٩٣

آگے حضرت نوحؑ اور حضرت موسیٰؑ کی سرگزشت کسی قدر تفصیل کے ساتھ اور درمیان کے رسولوں کی اجمالاً مذکور ہوئی ہے۔ مقصود ان سرگزشتوں کے حوالہ سے انہی حقائق کو تاریخ کی روشنی میں واضح کرنا ہے جو اوپر عقل و فطرت کے دلائل سے مبرہن کیے گئے ہیں۔ ان میں پیغمبرؐ اور آپؐ کے ساتھیوں کے لیے سرمایۂ تسکین اور آپؐ کے معاندین و مخالفین کے لیے پورا پورا درس عبرت موجود ہے۔ فرق اگر ہے تو نام و مقام اور زمانے کا ہے۔ اصل داستان اس قدر باہمدگر مشابہ ہے کہ نام و مقام کے فرق کو نظر انداز کر دیجیے تو سرے سے کوئی فرق ہی نہیں رہ جاتا ـــــ آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ٧١-٩٣ وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ نُوْحٍ ۘ اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اِنْ كَانَ كَبُرَ عَلَيْكُمْ
مَّقَامِيْ وَتَذْكِيْرِيْ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَعَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْتُ
فَاَجْمِعُوْٓا اَمْرَكُمْ وَشُرَكَاۗءَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُنْ اَمْرُكُمْ عَلَيْكُمْ غُمَّةً
ثُمَّ اقْضُوْٓا اِلَيَّ وَلَا تُنْظِرُوْنِ (٧١) فَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَمَا سَاَلْتُكُمْ مِّنْ
اَجْرٍ ۭ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلَي اللّٰهِ ۙ وَاُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ (٧٢)
فَكَذَّبُوْهُ فَنَجَّيْنٰهُ وَمَنْ مَّعَهٗ فِي الْفُلْكِ وَجَعَلْنٰهُمْ خَلٰۗىِٕفَ وَاَغْرَقْنَا
الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ۚ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُنْذَرِيْنَ (٧٣)

ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْ بَعْدِهٖ رُسُلًا اِلٰى قَوْمِهِمْ فَجَآءُوْهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَمَا
كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْا بِمَا كَذَّبُوْا بِهٖ مِنْ قَبْلُ ۭ كَذٰلِكَ نَطْبَعُ عَلٰى قُلُوْبِ
الْمُعْتَدِيْنَ ﴿٧٤﴾ ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ مُّوْسٰى وَهٰرُوْنَ اِلٰى فِرْعَوْنَ
وَمَلَا۟ىِٕهٖ بِاٰيٰتِنَا فَاسْتَكْبَرُوْا وَكَانُوْا قَوْمًا مُّجْرِمِيْنَ ﴿٧٥﴾ فَلَمَّا
جَآءَهُمُ الْحَقُّ مِنْ عِنْدِنَا قَالُوْٓا اِنَّ هٰذَا لَسِحْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿٧٦﴾ قَالَ
مُوْسٰٓى اَتَقُوْلُوْنَ لِلْحَقِّ لَمَّا جَآءَكُمْ ۭ اَسِحْرٌ هٰذَا ۭ وَلَا يُفْلِحُ السّٰحِرُوْنَ ﴿٧٧﴾
قَالُوْٓا اَجِئْتَنَا لِتَلْفِتَنَا عَمَّا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا وَتَكُوْنَ لَكُمَا
الْكِبْرِيَاۗءُ فِي الْاَرْضِ ۭ وَمَا نَحْنُ لَكُمَا بِمُؤْمِنِيْنَ ﴿٧٨﴾ وَقَالَ فِرْعَوْنُ
ائْتُوْنِيْ بِكُلِّ سٰحِرٍ عَلِيْمٍ ﴿٧٩﴾ فَلَمَّا جَآءَ السَّحَرَةُ قَالَ لَهُمْ مُّوْسٰٓى
اَلْقُوْا مَآ اَنْتُمْ مُّلْقُوْنَ ﴿٨٠﴾ فَلَمَّآ اَلْقَوْا قَالَ مُوْسٰى مَا جِئْتُمْ بِهِ ۙ
السِّحْرُ ۭ اِنَّ اللّٰهَ سَيُبْطِلُهٗ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُصْلِحُ عَمَلَ الْمُفْسِدِيْنَ ﴿٨١﴾
وَيُحِقُّ اللّٰهُ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُجْرِمُوْنَ ﴿٨٢﴾ فَمَآ اٰمَنَ لِمُوْسٰٓى ع ١٢
اِلَّا ذُرِّيَّةٌ مِّنْ قَوْمِهٖ عَلٰي خَوْفٍ مِّنْ فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ىِٕهِمْ اَنْ يَّفْتِنَهُمْ ۭ ١٣
وَاِنَّ فِرْعَوْنَ لَعَالٍ فِي الْاَرْضِ ۚ وَاِنَّهٗ لَمِنَ الْمُسْرِفِيْنَ ﴿٨٣﴾ وَقَالَ
مُوْسٰى يٰقَوْمِ اِنْ كُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰهِ فَعَلَيْهِ تَوَكَّلُوْٓا اِنْ كُنْتُمْ
مُّسْلِمِيْنَ ﴿٨٤﴾ فَقَالُوْا عَلَي اللّٰهِ تَوَكَّلْنَا ۚ رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا فِتْنَةً لِّلْقَوْمِ
الظّٰلِمِيْنَ ﴿٨٥﴾ وَنَجِّنَا بِرَحْمَتِكَ مِنَ الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿٨٦﴾ وَاَوْحَيْنَآ اِلٰى
مُوْسٰى وَاَخِيْهِ اَنْ تَبَوَّاٰ لِقَوْمِكُمَا بِمِصْرَ بُيُوْتًا وَّاجْعَلُوْا بُيُوْتَكُمْ

قِبْلَةً وَّ اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ ؕ وَ بَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۸۷﴾ وَ قَالَ مُوْسٰى رَبَّنَآ
اِنَّكَ اٰتَيْتَ فِرْعَوْنَ وَ مَلَاَهٗ زِيْنَةً وَّ اَمْوَالًا فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۙ
رَبَّنَا لِيُضِلُّوْا عَنْ سَبِيْلِكَ ۚ رَبَّنَا اطْمِسْ عَلٰٓى اَمْوَالِهِمْ وَ اشْدُدْ عَلٰى
قُلُوْبِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْا حَتّٰى يَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ ﴿۸۸﴾ قَالَ قَدْ اُجِيْبَتْ
دَّعْوَتُكُمَا فَاسْتَقِيْمَا وَ لَا تَتَّبِعٰٓنِّ سَبِيْلَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۸۹﴾ وَ
جٰوَزْنَا بِبَنِىْٓ اِسْرَآءِيْلَ الْبَحْرَ فَاَتْبَعَهُمْ فِرْعَوْنُ وَ جُنُوْدُهٗ بَغْيًا وَّ
عَدْوًا ؕ حَتّٰىٓ اِذَآ اَدْرَكَهُ الْغَرَقُ ۙ قَالَ اٰمَنْتُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا الَّذِىْٓ
اٰمَنَتْ بِهٖ بَنُوْٓا اِسْرَآءِيْلَ وَ اَنَا مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ﴿۹۰﴾ آٰلْئٰنَ وَ قَدْ عَصَيْتَ
قَبْلُ وَ كُنْتَ مِنَ الْمُفْسِدِيْنَ ﴿۹۱﴾ فَالْيَوْمَ نُنَجِّيْكَ بِبَدَنِكَ لِتَكُوْنَ
ع ۹ ۱۰ ۱۴ لِمَنْ خَلْفَكَ اٰيَةً ؕ وَ اِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ عَنْ اٰيٰتِنَا لَغٰفِلُوْنَ ﴿۹۲﴾ وَ
لَقَدْ بَوَّاْنَا بَنِىْٓ اِسْرَآءِيْلَ مُبَوَّاَ صِدْقٍ وَّ رَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ ۚ
فَمَا اخْتَلَفُوْا حَتّٰى جَآءَهُمُ الْعِلْمُ ؕ اِنَّ رَبَّكَ يَقْضِىْ بَيْنَهُمْ يَوْمَ
الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ﴿۹۳﴾

ترجمۂ آیات ۷۱ - ۹۳

اور ان کو نوحؑ کی سرگزشت پڑھ کر سناؤ جب کہ اس نے اپنی قوم سے کہا کہ اے میری قوم کے لوگو، اگر تم پر تمھارے اندر میرا ٹکنا اور اللہ کی آیات کی یاد دہانی کرنا گراں ہو گیا ہے تو میں نے بس اللہ پر بھروسہ کیا۔ تم اپنی رائے مجتمع کر لو اور اپنے شرکاء کو بھی ملا لو پھر تمھارے فیصلہ میں کوئی تذبذب باقی نہ رہے اور میرے ساتھ جو کرنا چاہتے ہو کر گزرو اور مجھے مہلت نہ دو۔ پس اگر تم اعراض کرو گے تو میں نے تم سے کوئی اجر نہیں مانگا ہے۔ میرا اجر تو بس

اللہ ہی پر ہے اور مجھے یہ حکم ملا ہے کہ میں فرمانبرداروں میں سے بنوں۔ تو انھوں نے اس کو جھٹلا دیا تو ہم نے اس کو اور جو لوگ اس کے ساتھ کشتی میں تھے نجات دی اور ان کو جانشین بنایا اور ان لوگوں کو غرق کر دیا جنھوں نے ہماری آیات کی تکذیب کی تو دیکھو کیا انجام ہوا ان لوگوں کا جن کو ہوشیار کیا جا چکا تھا!! ۷۱-۷۳

پھر ہم نے اس کے بعد رسول بھیجے ان کی اپنی قوموں کی طرف تو وہ ان کے پاس کھلی کھلی نشانیاں لے کر آئے لیکن وہ اس چیز پر ایمان لانے والے نہ بنے جس کو پہلے جھٹلا چکے تھے۔ اسی طرح ہم حدود سے تجاوز کرنے والوں کے دلوں پر مہر کر دیا کرتے ہیں۔ ۷۴

پھر ان کے بعد ہم نے موسیٰؑ اور ہارونؑ کو فرعون اور اس کے درباریوں کے پاس اپنی نشانیوں کے ساتھ بھیجا تو انھوں نے گھمنڈ کیا اور وہ مجرم لوگ تھے پس جب ان کے پاس ہماری طرف سے حق آیا تو انھوں نے کہا یہ تو کھلا ہوا جادو ہے۔ موسیٰؑ نے کہا کہ کیا تم حق کو سحر کہتے ہو جب کہ وہ تمھارے پاس آ چکا ہے۔ بھلا، یہ سحر ہے؟ اور ساحر کبھی فلاح نہیں پاتے۔ وہ بولے کیا تم ہمارے پاس اس لیے آئے ہو کہ ہمیں اس طریقہ سے ہٹا دو جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا اور ملک میں سیادت تم دونوں کو حاصل ہو جائے؟ اور ہم تو تم دونوں کی بات کبھی ماننے والے نہیں اور فرعون نے حکم دیا کہ میرے پاس سارے ماہر جادوگروں کو حاضر کرو۔ تو جب جادوگر آئے موسیٰؑ نے ان سے کہا جو کچھ تمھیں پیش کرنا ہے اس کو پیش کرو تو جب انھوں نے پیش کیا موسیٰ نے کہا یہ جو کچھ تم لائے ہو، یہ جادو ہے بے شک اللہ اس کو نیست کر دے گا، اللہ فساد برپا کرنے والوں کے عمل کو نتیجہ خیز نہیں ہونے دیتا اور اللہ مجرموں کے علی الرغم اپنے کلمات سے حق کا بول بالا کرتا ہے۔ تو موسیٰ کی بات نہ مانی مگر اس کی قوم کے

تھوڑے سے نوجوانوں نے ڈرتے ہوئے فرعون اور اپنے بڑوں سے کہ مبادا وہ ان کو کسی فتنہ میں ڈال دے۔ بے شک فرعون ملک میں نہایت سرکش اور حد سے بڑھ جانے والوں میں سے تھا اور موسیٰ نے کہا اے میری قوم کے لوگو! اگر تم اللہ پر ایمان لائے ہو تو اسی پر بھروسہ کرو اگر تم اپنے آپ کو اس کے حوالہ کر چکے ہو۔ وہ بولے کہ ہم نے اللہ پر بھروسہ کیا۔ اے ہمارے رب ہمیں ظالموں کے ظلم کا آماجگاہ نہ بنا اور ہمیں اپنے فضل سے کافروں کے پنجۂ ستم سے چھڑا۔ ۷۵-۸۶

اور ہم نے موسیٰ اور اس کے بھائی کی طرف وحی کی کہ اپنی قوم کے لیے مصر میں کچھ گھر ٹھہرا لو اور اپنے گھروں کو قبلہ بناؤ اور نماز کا اہتمام کرو اور ایمان لانے والوں کو خوش خبری دے دو۔ اور موسیٰ نے دعا کی، اے ہمارے رب! تو نے فرعون اور اس کے اعیان کو دنیا کی زندگی میں شان و شوکت اور مال و اسباب سے بہرہ مند کیا، اے ہمارے رب کہ وہ تیری راہ سے لوگوں کو بے راہ کریں، اے ہمارے رب ان کے مالوں کو مٹا دے اور ان کے دلوں کو بند کر دے کہ وہ ایمان نہ لائیں یہاں تک کہ دیکھ لیں دردناک عذاب کو۔ فرمایا تمھاری دعا قبول ہوئی تو تم دونوں جمے رہو اور ان لوگوں کی راہ کی پیروی نہ کیجیو جو علم نہیں رکھتے۔ ۸۷-۸۹

اور ہم نے بنی اسرائیل کو سمندر پار کرا دیا تو ان کا پیچھا کیا فرعون اور اس کے فوجیوں نے سرکشی اور زیادتی سے۔ یہاں تک کہ جب وہ ڈوبنے کے لپیٹ میں آگیا بولا کہ میں ایمان لایا کہ نہیں ہے کوئی معبود مگر وہی جس پر بنی اسرائیل ایمان لائے اور میں اس کے فرمانبرداروں میں بنتا ہوں۔ کیا اب! حالانکہ تم نے اس سے پہلے نافرمانی کی اور تم فساد برپا کرنے والوں میں سے تھے۔ پس آج ہم تیرے جسم کو بچائیں گے تاکہ تو اپنے بعد والوں کے لیے نشانی بنے اور بے شک بہت سارے لوگ ہماری نشانیوں سے غافل ہی رہتے ہیں۔ اور ہم نے بنی اسرائیل کو عزت

کا ٹھکانا دیا اور ان کو اچھا رزق بخشا اور انھوں نے نہیں اختلاف برپا کیا مگر اس وقت جبکہ ان کے پاس علم آگیا، تیرا رب ان چیزوں کے باب میں جن میں وہ اختلاف کرتے رہے ہیں قیامت کے دن ان کے درمیان فیصلہ کرے گا۔ ۹۰-۹۳

۱۱- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَأَ نُوحٍ إِذْ قَالَ لِقَوْمِهِ يَا قَوْمِ إِن كَانَ كَبُرَ عَلَيْكُم مَّقَامِي وَتَذْكِيرِي بِآيَاتِ اللَّهِ فَعَلَى اللَّهِ تَوَكَّلْتُ فَأَجْمِعُوا أَمْرَكُمْ وَشُرَكَاءَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُنْ أَمْرُكُمْ عَلَيْكُمْ غُمَّةً ثُمَّ اقْضُوا إِلَيَّ وَلَا تُنظِرُونِ (۷۱)

حضرت نوح کی سرگزشت سب سے قدیم سرگزشت ہے

پچھلی قوموں میں سے سب سے قدیم قوم، جس کی بربادی کی روایات عربوں میں مشہور تھیں، وہ نوح کی قوم تھی۔ اس وجہ سے قرآن میں جب تاریخی ترتیب سے قوموں کی سرگزشت بیان ہوتی ہے تو سب سے پہلے اسی قوم کا ذکر آتا ہے۔ اعراف آیات ۶۰-۶۴ میں بھی اس کا ذکر گزر چکا ہے۔ وہاں ہم اس کے محل وقوع اور اس کے تخمینی زمانہ کی طرف اشارہ کر چکے ہیں۔ 'نَبَأ' کے لفظ پر ہم دوسرے مقام میں بحث کر کے بتا چکے ہیں کہ اس سے مراد کوئی اہم واقعہ ہوتا ہے۔ اس لفظ کے استعمال سے یہاں پتہ چلتا ہے کہ مقصود نوحؑ اور قوم نوحؑ کی زندگی کے کسی اہم مؤثر اور کسی فیصلہ کن واقعہ کی سرگزشت سنانا ہے، مؤرخوں کی طرز کی مجرد داستان سرائی پیش نظر نہیں ہے۔

إِن كَانَ كَبُرَ عَلَيْكُم مَّقَامِي وَتَذْكِيرِي بِآيَاتِ اللَّهِ۔ مقام سے مراد اپنی قوم کے اندر وہ طویل قیام ہے جو حضرت نوحؑ کو حاصل ہوا۔ عنکبوت آیت ۱۴ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی قوم کے اندر ایک مدت دراز تک تبلیغ و دعوت میں سرگرم رہے یہاں تک کہ ان کے معاندین و مخالفین ان کی دعوت سے، جیسا کہ ہود آیت ۳۲ سے واضح ہو رہا ہے، بالکل تنگ آگئے۔ اسی مرحلہ میں حضرت نوحؑ نے یہ بات فرمائی ہے اور یہ درحقیقت تمہید ہے اس چیلنج کی جو آگے آرہا ہے۔

حضرت نوحؑ کا چیلنج

فَأَجْمِعُوا أَمْرَكُمْ ..... الآیۃ 'امر' سے مراد رائے اور فیصلہ ہے۔ یعنی تم میرے باب میں اجتماعی طور پر ایک قطعی فیصلہ کر لو اور اپنے ان معبودوں کو بھی اس فیصلہ میں شریک کر لو جن کو تم خدا کی خدائی میں شریک گردانتے ہو۔ ثُمَّ لَا يَكُنْ أَمْرُكُمْ عَلَيْكُمْ غُمَّةً 'غُمَّة' کسی ڈھانک لینے والی چیز کو کہتے ہیں۔ لیکن محاورہ کلام میں جب کہیں گے 'هُوَ فِي غُمَّةٍ' تو اس کے معنی ہوں گے، وہ حیرانی اور تردد میں ہے۔ مطلب یہ ہے

کہ ایسا قطعی فیصلہ کر لو کہ اس میں کوئی تردد و تذبذب باقی نہ رہے۔ ثُمَّ اقْضُوْٓا اِلَیَّ وَلَا تُنْظِرُوْنِ، اُقْضُوْا کے بعد اِلٰی اقدام پر دلیل ہے۔ مطلب یہ ہے کہ قطعی فیصلہ کر کے مجھ پر اقدام کرو اور پھر مجھے ذرا مہلت نہ دو۔ میرا بھروسہ اللہ پر ہے وہ میری حفاظت فرمائے گا۔

فَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَمَا سَاَلْتُكُمْ مِّنْ اَجْرٍ ۭ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلَي اللّٰهِ ۙ وَاُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ (۷۲)

یعنی اگر تم غور و فکر کے بعد اسی نتیجہ پر پہنچے کہ اسی روش اعراض پر جمے رہنا ہے تو مجھے اب تمھاری کوئی پروا نہیں ہے۔ میں تمھیں جو تبلیغ و تذکیر کر رہا تھا اس کا میں تم سے کوئی معاوضہ نہیں لے رہا تھا کہ اس سے محروم ہو جانے کا غم ہو۔ میری محنت کا اجر تو اللہ کے ذمے ہے۔ وہ مجھے محروم نہیں فرمائے گا۔ مجھ پر یہ ذمہ داری بھی نہیں ڈالی گئی تھی کہ لازماً تم کو مومن و مسلم ہی بنا لوں۔ مجھے تو یہ حکم ملا تھا کہ میں اپنے رب کے فرماں برداروں میں بنوں۔ سو میں اسی کا فرماں بردار ہوں۔

فَكَذَّبُوْهُ فَنَجَّيْنٰهُ وَمَنْ مَّعَهٗ فِي الْفُلْكِ وَجَعَلْنٰھُمْ خَلٰۗىِٕفَ وَاَغْرَقْنَا الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ۚ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُنْذَرِيْنَ (۷۳)

قریش کو انذار

یہاں یہ بات قابلِ غور ہے کہ پہلے مکذبین کے غرق کا ذکر نہیں فرمایا بلکہ حضرت نوحؑ اور ان کے باایمان ساتھیوں کی نجات کا ذکر فرمایا۔ اس لیے کہ سنت الٰہی یہی ہے کہ رسولوں کی تکذیب کرنے والوں پر جب عذاب آیا ہے تو اللہ تعالیٰ نے اس سے پہلے اہل ایمان کی حفاظت کا اہتمام فرمایا ہے۔ وَجَعَلْنٰهُمْ خَلٰٓئِفَ یعنی مکذبین کو غرق کر کے ان کی جگہ زمین کی وراثت حضرت نوحؑ اور ان کے ساتھیوں کو بخشی۔ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُنْذَرِيْنَ، یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس حقیقت کی طرف توجہ دلائی ہے جو اس سرگزشت کے سنانے سے پیش نظر ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اتمام حجت ہو چکنے کے بعد جس طرح قوم نوح کا بیڑا غرق ہو گیا اسی طرح قریش کا بھی قصہ پاک ہو جائے گا اگر انھوں نے تمھارے انذار سے آنکھیں نہ کھولیں۔

ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ رُسُلًا اِلٰى قَوْمِهِمْ فَجَاۗءُوْھُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَمَا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْا بِمَا كَذَّبُوْا بِهٖ مِنْ قَبْلُ ۭ كَذٰلِكَ نَطْبَعُ عَلٰي قُلُوْبِ الْمُعْتَدِيْنَ (۷۴)

بعد کے رسولوں کی طرف ایک اجمالی اشارہ

یہ ان رسولوں کی طرف ایک اجمالی اشارہ ہے جو حضرت نوحؑ کے بعد آئے۔ یہاں ان کی تفصیل نہیں کی ہے بلکہ سرسری اشارہ کر کے بعد والی آیت میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی سرگزشت لے لی ہے۔ اس اجمال کی تفصیل بعد والی سورہ ــــ سورۂ ہود ــــ میں آئی ہے جو اس سورہ کے مثنیٰ کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس میں ہود، صالح، لوط اور شعیب علیہم السلام کا ذکر بھی مفصل ہوا ہے اور قوم نوح اور قوم موسیٰ کے حالات کے بھی بعض وہ گوشے روشنی میں آئے ہیں جو یہاں مخفی رہ گئے تھے۔ اجمال کے بعد تفصیل کا یہ اسلوب قرآن مجید میں بہت استعمال ہوا ہے۔

توفیق ایمان کے باب میں سنت الٰہی

فَمَا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْا ۔۔۔۔ الآیۃ۔ میں اس سنت الٰہی کی طرف اشارہ ہے جو توفیق ایمان کے باب میں

بار بار بیان ہوتی ہے اور جس کی وضاحت ہم ایک سے زیادہ مقامات میں کر چکے ہیں کہ جو لوگ عقل و فطرت کے بدیہیات اور یقینیات کو جھٹلا دیتے ہیں ان کو رسول کے انذار سے بھی کوئی نفع نہیں پہنچتا ہے۔ ایسے لوگوں پر رسول کے ذریعہ سے اتمام حجت ہوتا ہے اور اس اتمام حجت کے نتیجہ میں ان کے دلوں پر مہر لگ جاتی ہے۔
'اعتداء' کے معنی حدود الٰہی سے تجاوز کرنے کے ہیں۔ جو لوگ خدا کے مقرر کیے ہوئے تمام حدود توڑ تاڑ کے رکھ دیتے ہیں ان کے اندر حدود کے احترام کا احساس ہی مردہ ہو جاتا ہے اور اس احساس کے مردہ ہو جانے کے بعد ان سے کسی خیر کی امید عبث ہے۔ ایسے مردے کسی کے جھنجھوڑنے سے بھی نہیں جاگتے۔

ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْ بَعْدِهِمْ مُوسَىٰ وَهَارُونَ إِلَىٰ فِرْعَوْنَ وَمَلَئِهِ بِآيَاتِنَا فَاسْتَكْبَرُوا وَكَانُوا قَوْمًا مُجْرِمِينَ (۷۵)

حضرت موسیٰؑ کا اتمام حجت

لفظ 'ملاء' پر ہم دوسرے مقام میں بحث کر چکے ہیں۔ 'آیات' سے مراد وہ آیاتِ الٰہی بھی ہیں جو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون اور اس کے درباریوں کو سنائیں اور وہ نشانیاں بھی ہیں جو انھوں نے ان کو دکھائیں 'وَكَانُوا قَوْمًا مُجْرِمِينَ' سے اسی فساد قلب و عقل کی طرف اشارہ ہے جس کا ذکر اوپر والی آیت میں ہوا ہے کہ چونکہ پہلے سے یہ اپنے دل اور عقل کی آنکھیں پھوڑ چکے تھے اس وجہ سے کسی چیز سے بھی انھوں نے فائدہ نہیں اٹھایا۔ یہاں یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارونؑ فرعون اور اس کے اعیان کے پاس رسول کی حیثیت سے گئے تھے اس وجہ سے انھوں نے لازماً ان کے اوپر اللہ کی حجت تمام کی۔ اس کے بغیر رسول کا مشن پورا نہیں ہوتا اس وجہ سے ان لوگوں کا خیال صحیح نہیں ہے جو سمجھتے ہیں کہ حضرت موسیٰؑ نے ایک قوم پرست لیڈر کی طرح فرعون سے صرف بنی اسرائیل کی آزادی کا مطالبہ کیا، اس کے آگے ایمان و اسلام کی کوئی دعوت نہیں پیش کی۔

فَلَمَّا جَاءَهُمُ الْحَقُّ مِنْ عِنْدِنَا قَالُوا إِنَّ هَٰذَا لَسِحْرٌ مُبِينٌ ۝ قَالَ مُوسَىٰ أَتَقُولُونَ لِلْحَقِّ لَمَّا جَاءَكُمْ ۖ أَسِحْرٌ هَٰذَا وَلَا يُفْلِحُ السَّاحِرُونَ (۷۶-۷۷)

حق اور سحر کا فرق

'حق' کے معنی ہیں ایک واضح، مبرہن اور مدلل حقیقت۔ یہاں اس سے مراد حضرت موسیٰؑ اور ان کے بھائی کا فرعون اور اس کے اعیان کے سامنے نہایت کھلے ہوئے معجزات کے ساتھ یہ دعویٰ ہے کہ ہم تیرے رب کے رسول ہیں۔ اس دعوے کی تردید میں انھوں نے کہا کہ تمہارا یہ دعویٰ باطل ہے۔ جو نشانی تم دکھا رہے ہو یہ کوئی خدائی نشانی نہیں ہے بلکہ یہ صریح جادو ہے اور یہ چیز تم سے کہیں زیادہ ہمارے اپنے جادوگروں کے پاس ہے۔

'أَتَقُولُونَ لِلْحَقِّ لَمَّا جَاءَكُمْ' میں 'تَقُولُونَ' کا مفعول بتقاضائے بلاغت حذف ہے اور 'لِلْحَقِّ' میں 'ل' 'فی' کے معنی میں ہے یعنی تم ایک واضح حق کے باب میں کہتے ہو کہ یہ سحر ہے۔ لفظ سحر کو یہاں حذف کر دینے سے یہ بات نکلتی ہے کہ متکلم کو حق کے باب میں یہ نقل کفر بھی اس درجہ ناگوار ہے کہ وہ اپنی زبان کو اس سے آلودہ کرنا

پسند نہیں کرتا۔ 'لَمَّا جَآءَکُمْ' کی بلاغت بھی بیان قابلِ لحاظ ہے۔ 'حق' جب تک نگاہوں سے اوجھل ہو اس وقت تک تو اس کی نسبت کوئی شخص اگر کوئی نظریاتی بحث اٹھائے تو اس کو کسی حد تک معذور قرار دیا جا سکتا ہے۔ لیکن جب حق سامنے موجود ہو تو اس کے باب میں کٹ حجتی کرنا ویسا ہی ہے جس طرح کوئی نصف النہار کے سورج کے بارے میں تردد کا اظہار کرے۔ ہم سورۂ اعراف میں واضح کر چکے ہیں کہ سحر اور معجزہ کے درمیان جو فرق ہے وہ اصلاً منطق سے نمایاں نہیں ہوتا بلکہ دونوں کے ظہور کی نوعیت، اذہان و قلوب پر دونوں کے اثرات اور دونوں کے پیش کرنے والوں کے کردار سے نمایاں ہوتا ہے۔ 'وَلَا یُفْلِحُ السّٰحِرُوْنَ' یعنی ساحر کبھی کسی پائدار کامیابی سے ہمکنار نہیں ہوتے۔ ان کے کرشموں اور شعبدوں کی چمک دمک عارضی ہوتی ہے۔ بالخصوص جب وہ حق کے مقابل میں آتے ہیں تب تو وہ ایک لمحے کے لیے بھی ٹک نہیں سکتے۔ معجزے کے آفتاب تاباں کے آگے ان کے دیے بالکل ماند پڑ جاتے ہیں۔ یہ جملہ حضرت موسیٰؑ کی طرف سے فرعونیوں کو ایک چیلنج بھی ہے کہ اگر اس کو سحر کہتے ہو تو جب تم اس کے مقابلے کے لیے اپنے ساحروں کو لاؤ گے تو ساری حقیقت تم پر کھل جائے گی کہ رسول کے معجزے اور ساحر کے سحر میں کیا فرق ہوتا ہے۔

قَالُوْٓا اَجِئْتَنَا لِتَلْفِتَنَا عَمَّا وَجَدْنَا عَلَیْهِ اٰبَآءَنَا وَتَكُوْنَ لَكُمَا الْكِبْرِیَآءُ فِی الْاَرْضِ ؕ وَمَا نَحْنُ لَكُمَا بِمُؤْمِنِیْنَ (۷۸)

حضرت موسیٰؑ پر ایک سیاسی الزام

فرعونیوں کا یہ فقرہ نہایت زہر آلود ہے۔ انھوں نے اپنی قوم کو حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارونؑ کے خلاف بھڑکانے کے لیے ان پر آبائی دین اور ملک کی حکومت، دونوں کے خلاف بغاوت برپا کرنے کا الزام تھوپ دیا کہ تم ہمارے آبائی دین سے بھی ہم کو برگشتہ کرنا چاہتے ہو اور تمھاری یہ آرزو بھی ہے کہ اس ملک کا اقتدار تم دونوں کے ہاتھ آجائے۔ ہم سورۂ اعراف کی تفسیر میں تورات کے حوالوں کی روشنی میں واضح کر چکے ہیں کہ مصر میں اس وقت جو ارسٹوکریسی برسرِ اقتدار تھی وہ اسرائیلیوں کی روز افزوں ترقی پذیر تعداد سے بہت خائف تھی کہ مبادا ان کی تعداد اتنی زیادہ ہو جائے کہ یہ قبطیوں کو ہٹا کر خود اقتدار پر قابض ہو جائیں چنانچہ اسرائیلی بچوں کو قتل کر دینے کی جو سنگدلانہ اسکیم چلائی گئی تھی اس کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ اس طرح بنی اسرائیل کی تعداد کو کنٹرول میں رکھا جا سکے۔ چونکہ یہ خطرہ ذہنوں میں موجود تھا اس وجہ سے جب حضرت موسیٰؑ کی دعوت بلند ہوئی تو اس کے خلاف یہ اشتعال بھی چھوڑ دیا گیا کہ یہ ملک میں اقتدار حاصل کرنے کے خواہاں ہیں تاکہ قبطی عصبیت پوری طرح ان سے نبرد آزما ہونے کے لیے تیار ہو جائے۔

وَقَالَ فِرْعَوْنُ ائْتُوْنِیْ بِكُلِّ سٰحِرٍ عَلِیْمٍ ۝ فَلَمَّا جَآءَ السَّحَرَةُ قَالَ لَهُمْ مُّوْسٰٓی اَلْقُوْا مَآ اَنْتُمْ مُّلْقُوْنَ ۝ فَلَمَّآ اَلْقَوْا قَالَ مُوْسٰی مَا جِئْتُمْ بِهِ ۙ السِّحْرُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَیُبْطِلُهٗ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا یُصْلِحُ عَمَلَ الْمُفْسِدِیْنَ ۝ وَیُحِقُّ اللّٰهُ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُجْرِمُوْنَ (۷۹-۸۲)

حضرت موسیٰؑ اور جادوگروں کا مقابلہ

'وَقَالَ فِرْعَوْنُ ..... الاٰیۃ' فرعون اور اس کے درباریوں سے یہ حقیقت تو مخفی نہیں ہو سکتی تھی کہ نہ حضرت

موسیٰ ساحر ہیں اور نہ جو کچھ وہ پیش کر رہے ہیں، وہ سحر ہے لیکن چونکہ ان کی بات مان لینے کی صورت میں اس کو اپنی اور اپنی مزعومہ خدائی کی موت نظر آتی تھی۔ اس وجہ سے اس کو مفر کی شکل یہی نظر آئی کہ ملک کے تمام ماہر جادوگروں کو بلا کر ان سے حضرت موسیٰؑ کا مقابلہ کرایا جائے کہ شاید اس طرح بات بن جائے۔ اگرچہ یہ ایک صریح حماقت تھی لیکن کسی حقیقت کو نہ ماننے کی خواہش ایک ایسی خواہش ہے جس کی خاطر انسان بہت سی حماقتیں کر گزرتا ہے۔

حضرت موسیٰؑ کا اعتماد علی اللہ

فَلَمَّا جَآءَ السَّحَرَةُ ..... الآیۃ: ساحروں سے حضرت موسیٰ کا یہ فرمانا کہ "جو کچھ تم پیش کرنا چاہتے ہو وہ پیش کرو" اپنے مشن پر غایت درجہ اعتماد کی دلیل ہے۔ ان کو اللہ تعالیٰ کے وعدۂ نصرت پر پورا بھروسہ تھا کہ خواہ جادوگر جتنا بڑا جادو بھی دکھائیں ان کے پاس اس کا توڑ موجود ہے۔ اس وجہ سے انھوں نے کسی پیش بندی سے بے نیاز ہو کر انہی کو پہل کرنے کا موقع دیا اور یہ گویا میدان مقابلہ میں ان کی پہلی جیت تھی۔ اس لیے کہ اس کے بعد حریف کو جو شکست ہوئی وہ خود اس کے اپنے منتخب کیے ہوئے میدان میں ہوئی۔

باطل کی چمک دمک عارضی ہوتی ہے

فَلَمَّآ اَلْقَوْا ..... الآیۃ: جب حضرت موسیٰ نے ان کا جادو دیکھا تو فرمایا مَا جِئْتُمْ بِهِ السِّحْرُ کہ یہ جو کچھ تم نے دکھایا ہے، یہ جادو ہے۔ یہ فرعونیوں کے اس قول کا جواب ہے جو اوپر آیت ۷۶ میں گزرا، قَالُوْٓا اِنَّ هٰذَا لَسِحْرٌ مُّبِيْنٌ (کہ انھوں نے حضرت موسیٰؑ کے معجزے کو دیکھ کر کہا کہ یہ تو کھلا ہوا جادو ہے۔ حضرت موسیٰ نے ان کے اسی قول کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ تم میرے معجزے کو جادو کہتے تھے، جادو وہ نہیں تھا۔ جادو یہ ہے جو تم نے پیش کیا ہے اور تم اب حق کے مقابلہ میں اس کی بے حقیقتی اپنی آنکھوں سے دیکھ لو گے۔ اِنَّ اللّٰهَ سَيُبْطِلُهٗ (اللہ اس کو نابود کر دے گا) اس لیے کہ باطل اپنی چمک دمک اسی وقت دکھاتا ہے جب تک حق سے اس کا مقابلہ نہیں ہوتا، جب حق ظاہر ہو جاتا ہے تو باطل جھاگ کی طرح بیٹھ جایا کرتا ہے۔ یہی حقیقت دوسرے مقام میں یوں واضح فرمائی گئی ہے۔ جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا (حق ظاہر ہو گیا اور باطل نابود ہوا، اس لیے کہ باطل نابود ہی ہونے والی چیز ہے)۔

حق غالب ہو کر رہتا ہے

اِنَّ اللّٰهَ لَا يُصْلِحُ عَمَلَ الْمُفْسِدِيْنَ، لفظ اصلاح، یہاں بار آور اور نتیجہ خیز کرنے کے معنی میں ہے۔ اسی معنی میں یہ لفظ سورۂ محمدؐ آیات ۲-۵ میں بھی استعمال ہوا ہے یعنی مصلحین جو حق لے کر اٹھتے ہیں ان کے مقابل میں مفسدین کی مفسدانہ کوششیں کبھی بار آور نہیں ہوتیں۔ امتحان و آزمائش کا مرحلہ گزرنے کے بعد غلبہ بالآخر حق ہی کو حاصل ہوتا ہے۔

وَيُحِقُّ اللّٰهُ الْحَقَّ ..... الآیۃ: یعنی مجرمین و مفسدین خواہ حق کو دبانے کی کتنی ہی کوششیں کریں لیکن جو لوگ اللہ کا کلمہ لے کر اٹھتے ہیں، اللہ اپنے کلمات کے ذریعہ سے حق کا بول بالا کرتا ہے۔[1]

---

[1] یہ امر ملحوظ رہے کہ یہاں حق و باطل کی وہ کشمکش زیر بحث ہے جو ایک رسول کی بعثت سے ظہور میں آتی ہے۔ رسول کے لیے، جیسا کہ ہم ایک سے زیادہ مقامات میں واضح کر چکے ہیں، بالآخر غلبہ لازمی ہے۔

فَمَآ اٰمَنَ لِمُوْسٰۤی اِلَّا ذُرِّیَّۃٌ مِّنْ قَوْمِہٖ عَلٰی خَوْفٍ مِّنْ فِرْعَوْنَ وَمَلَا۠ئِہِمْ اَنْ یَّفْتِنَہُمْ ؕ وَ اِنَّ فِرْعَوْنَ لَعَالٍ فِی الْاَرْضِ ۚ وَاِنَّہٗ لَمِنَ الْمُسْرِفِیْنَ (۸۳)

حضرت موسیٰ کے ابتدائی ساتھی

ذُرِّیَّۃٌ، کا لفظ صرف قلت تعداد کو ظاہر نہیں کرتا، جیسا کہ عام طور پر لوگوں نے سمجھا ہے، بلکہ اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ حضرت موسیٰ پر ابتدائی ایمان لانے والے ان کی قوم کے اندر سے صرف تھوڑے سے نوجوان تھے۔ حضرات انبیاء کے معاملے میں سنت الٰہی یہی رہی ہے کہ شروع شروع میں ان کا ساتھ بالعموم نوجوانوں نے ہی دیا ہے۔ اسلام کی ابتدائی تاریخ بھی اسی حقیقت کی شہادت دیتی ہے اور دوسرے انبیاء کی تاریخ بھی اگر تفصیل سے معلوم ہو سکے تو اس سے بھی یہی بات ثابت ہوگی۔ اس کی واضح نفسیاتی وجہ یہ ہے کہ حضرات انبیاء جس ہمہ گیر دعوتِ اسلام کو لے کر اٹھتے ہیں اس کو ابتدائی مراحل میں آگے بڑھ کر قبول کرنا بڑی بلند حوصلگی بلکہ بڑے جان جوکھم کا کام ہوتا ہے۔ اس کی ہمت وہ لوگ آسانی سے نہیں کر سکتے جو روایات و رسوم سے مرعوب اور حالات و مصالح کی رعایت کے خوگر ہوں۔ ایسے لوگوں کا حجاب آہستہ آہستہ ہی ٹوٹتا ہے۔ نوجوانوں میں اس قسم کی مرعوبیت و مغلوبیت کم ہوتی ہے اس وجہ سے ان کو جب دعوت حق اپیل کر لیتی ہے تو وہ اس کے لیے دنیوی عواقب سے بے پروا ہو کر اٹھ کھڑے ہوتے ہیں، نہ وہ اپنے بڑوں اور بزرگوں کی سرزنش کی کچھ زیادہ پروا کرتے نہ وقت کے ارباب اقتدار کی برہمی کو خاطر میں لاتے ہیں۔ حضرت موسیٰ کے معاملے میں حالات کا یہ خاص پہلو بھی قابل لحاظ ہے کہ ملک میں جو ارسٹو کریسی برسر اقتدار تھی وہ نسلاً بھی حضرت موسیٰ کی قوم سے بالکل الگ تھی اور اس دور میں جو شخص تختِ حکومت پر تھا، وہ بھی، جیسا کہ آیت کے الفاظ سے واضح ہے، طبعاً نہایت جبار اور سرکش تھا۔ ایسے حالات میں ظاہر ہے کہ وہی لوگ ان کا ساتھ دینے کے لیے آگے بڑھ سکتے تھے جو اپنی حمیت حق کے جوش و جذبہ کو دبا سکنے پر قادر نہ ہوں۔

'اٰمَنَ لَہٗ' اور 'اٰمَنَ بِہٖ' کا فرق

ان نوجوانوں کے ایمان کو قرآن نے 'اٰمَنَ لَہٗ' سے تعبیر کیا ہے۔ عربی زبان کا علم رکھنے والے جانتے ہیں کہ 'اٰمَنَ لَہٗ' اور 'اٰمَنَ بِہٖ' میں بڑا فرق ہے۔ 'اٰمَنَ لَہٗ'، تو یہ ہے کہ آپ کسی شخص کے دعوے یا اس کی خبر کو سچ مان لیں۔ اس کے لیے حوالگی، تفویض، تسلیم اور انقیاد و اطاعت شرط نہیں ہے لیکن 'اٰمَنَ بِہٖ' کا تقاضا پورا کرنے کے لیے یہ ساری چیزیں شرط ہیں۔ نبی اور رسول کے معاملے میں صرف 'اٰمَنَ لَہٗ' کافی نہیں ہے بلکہ اس کے لیے 'اٰمَنَ بِہٖ' کے تقاضے پورے کرنے ہوتے ہیں۔ اس مرحلے تک کچھ اسرائیلی نوجوانوں نے حضرت موسیٰ کے دعوے کی صداقت تو تسلیم کر لی تھی لیکن ابھی 'اٰمَنَ بِہٖ' کے مقام تک وہ نہیں پہنچے تھے اس وجہ سے ان کے اعتراف و قبولیت کو قرآن نے 'اٰمَنَ لَہٗ' سے تعبیر کیا ہے۔ یہ حقیقت چونکہ حضرت موسیٰ پر واضح تھی اس وجہ سے انھوں نے ان نوجوانوں کو ایمان کی اصل حقیقت سمجھائی جس کا ذکر آگے والی آیت میں آ رہا ہے۔

بنی اسرائیل کے اکابر کا حال

'مَلَا۟ئِہِمۡ' میں ضمیر کا مرجع ذریت ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ان نوجوانوں کو فرعون کی طرف سے بھی خطرہ تھا کہ وہ حمایت موسیٰؑ کے جرم میں ان کو کسی مصیبت میں نہ پھنسا دے اور اپنی قوم اور ملک کے اعیان و اکابر سے بھی اندیشہ تھا کہ اگر ان کو پتہ چل گیا کہ ہم حضرت موسیٰؑ کے ساتھ ہیں تو جھاڑ کے کانٹوں کی طرح پیچھے پڑ جائیں گے۔ یہ امر ملحوظ رہے کہ اس مرحلہ تک خود بنی اسرائیل کے بڑے بوڑھوں کا رویہ بھی، حضرت موسیٰؑ کے ساتھ ہمدردی کے باوجود یہی تھا کہ وہ اپنے یا اپنی اولاد کے لیے کوئی خطرہ مول لینا نہیں چاہتے تھے۔

'وَاِنَّ فِرۡعَوۡنَ لَعَالٍ فِی الۡاَرۡضِ وَاِنَّهٗ لَمِنَ الۡمُسۡرِفِیۡنَ' یعنی اول تو فرعون نہایت متکبر اور جبّار تھا کہ اپنے آگے کسی کو سر اٹھاتے دیکھ ہی نہیں سکتا تھا۔ دوسرے یہ کہ جب ظلم کرنے پر آتا تو اس کے ظلم کی کوئی حد نہ رہتی، بلکہ تمام حدود کو لانگ جاتا۔

وَقَالَ مُوۡسٰی یٰقَوۡمِ اِنۡ کُنۡتُمۡ اٰمَنۡتُمۡ بِاللّٰهِ فَعَلَیۡهِ تَوَکَّلُوۡۤا اِنۡ کُنۡتُمۡ مُّسۡلِمِیۡنَ ○ فَقَالُوۡا عَلَی اللّٰهِ تَوَکَّلۡنَا ۚ رَبَّنَا لَا تَجۡعَلۡنَا فِتۡنَةً لِّلۡقَوۡمِ الظّٰلِمِیۡنَ ○ وَنَجِّنَا بِرَحۡمَتِکَ مِنَ الۡقَوۡمِ الۡکٰفِرِیۡنَ (۸۴-۸۶)

ایمان کی اصل حقیقت

'وَقَالَ مُوۡسٰی ..... الآیۃ' یہ حضرت موسیٰؑ نے اپنی قوم کے لوگوں کو ایمان باللہ کی حقیقت سمجھائی ہے کہ اگر ایمان کا اظہار کیا ہے تو اس ایمان کے تقاضے پورے کرنے کی راہ میں کسی کا ڈر اور کسی کا لحاظ حائل نہیں ہونا چاہیے بلکہ سب سے بے نیاز و بے پروا ہو کر اللہ کی راہ میں بڑھنا چاہیے اور اللہ پر پورا بھروسہ رکھنا چاہیے کہ جس نے یہ راہ کھولی ہے وہی اس میں پیش آنے والی مشکلات میں یار و ناصر ہو گا۔ گویا ایمان کا لازمی تقاضا خدا پر توکل ہے اور اس توکل کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ آدمی اپنے آپ کو بالکلیہ اپنے رب کے حوالے کر دے یہی حوالگی اصل اسلام ہے۔

توکل کی حقیقت

'فَقَالُوۡا عَلَی اللّٰهِ تَوَکَّلۡنَا ...... الآیۃ' حضرت موسیٰؑ کے ساتھیوں نے ان کی یہ تعلیم قبول کی اور چونکہ وہ اچھی طرح سمجھ گئے تھے کہ اس توکل کے معنی گوشہ نشینی کے نہیں بلکہ اللہ کی راہ میں سرفروشی اور جان بازی کے ہیں اس وجہ سے عزم بالجزم کے اظہار کے ساتھ ہی انھوں نے دعا کی کہ اے رب ہمیں ظالموں کے لیے فتنہ نہ بنانا۔ 'فتنہ' کے معنی یہاں ہدف اور نشانہ کے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ان کو اتنی ڈھیل نہ دینا کہ وہ ہمیں ہمارے دین سے پھیرنے کے لیے ہم کو بالکل ہی مظالم کا آماجگاہ بنا لیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ اللہ پر توکل کے تقاضے پورے کرنے کے لیے جس طرح بندے کا عزم راسخ ضروری ہے اسی طرح ہر قدم پر خدا سے دعا و استعانت بھی ضروری ہے کہ وہ راہ کے فتنوں سے امان میں رکھے اور جو فتنے پیش آئیں ان سے عہدہ برآ ہونے کی توفیق دے۔

'وَنَجِّنَا بِرَحۡمَتِکَ ..... الآیۃ' چونکہ یہ بات ابتدائی مرحلے ہی میں واضح ہو چکی تھی کہ حضرت موسیٰؑ بنی اسرائیل کو فرعونیوں کی غلامی سے چھڑانا چاہتے ہیں۔ اس وجہ سے اس مقصد عزیز کے لیے بھی انھوں نے دعا کی۔ یہ دعا گویا ہجرت کی کامیابی کے لیے تھی۔

وَاَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰى وَاَخِيْهِ اَنْ تَبَوَّاٰ لِقَوْمِكُمَا بِمِصْرَ بُيُوْتًا وَّاجْعَلُوْا بُيُوْتَكُمْ قِبْلَةً وَّاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ ۭ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ (۸۷)

صبر اور توکل کے حصول کی تدبیر نماز

یہ تدبیر ارشاد ہوئی اس صبر اور توکل کے حصول کی جس کی تعلیم اوپر کی آیات میں دی گئی ہے۔ حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارونؑ کو حکم ہوا کہ مصر کے مختلف حصوں میں کچھ مقام نماز باجماعت کے لیے مخصوص کر لو جن میں بنی اسرائیل معین اوقات پر نماز کے لیے جمع ہوا کریں اور تم اپنے گھروں کو قبلہ قرار دے کر نماز باجماعت کا اہتمام کرو۔ یہ بعینہٖ اسی طرح کی ہدایت ہے جس طرح کی ہدایت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو مکہ کی پر مصائب زندگی میں دی گئی تھی۔ صبر و توکل اور نماز کے باہمی تعلق پر ہم ایک سے زیادہ مقامات میں بحث کر چکے ہیں۔

دینی تنظیم کا ابتدائی نقطہ

مصر کی غلامانہ زندگی میں بنی اسرائیل اپنی مذہبی تنظیم کی خصوصیات سے محروم ہو گئے تھے۔ از اں جملہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کے ہاں اجتماعی نماز و دعا کی بھی کوئی شکل باقی نہیں رہ گئی تھی۔ اب جب کہ حضرت موسیٰؑ نے ان کے اندر تجدید کا کام شروع کیا تو ظاہر ہے کہ اس کا آغاز اسی نقطہ سے ہونا تھا جو دینی تنظیم کا ابتدائی نقطہ ہے۔ چنانچہ ان کو نماز کے قیام و اہتمام کا حکم ہوا اور اس کے لیے یہ ہدایت ہوئی کہ مصر کے مختلف حصوں میں کچھ مکانات مسجد کی حیثیت سے مخصوص کر لیے جائیں جن میں بنی اسرائیل اوقات نماز میں مجتمع ہو جایا کریں۔ یہ طریقہ اختیار کرنے کی ہدایت اس وجہ سے ہوئی کہ تمام بنی اسرائیل کا مصر کے مختلف حصوں سے ایک جگہ جمع ہونا ناممکن ہوتا۔

جب متعدد مسجدیں ہوئیں تو ان میں وحدت پیدا کرنے کے لیے یہ بھی ضروری ہوا کہ کوئی مسجد سب کے قبلہ کی حیثیت سے معین ہو۔ اس لیے حکم ہوا۔ وَّاجْعَلُوْا بُيُوْتَكُمْ قِبْلَةً، اپنے گھروں کو قبلہ بناؤ۔ میرا ذہن ان الفاظ سے اس طرف جاتا ہے کہ اس سے مراد وہ گھر ہیں جو حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارونؑ نے اپنے اور اپنے متعلقین اور اپنے آس پاس کے بنی اسرائیل کی نماز کے لیے مخصوص فرمائے ہوں گے۔ چونکہ دعوت و ہدایت کے مرکز کی حیثیت انہی گھروں کو حاصل تھی اس وجہ سے اس عبوری دور میں انہی گھروں کو عارضی طور پر قبلہ کی حیثیت دے دی گئی۔ بعد میں جب بنی اسرائیل نے ہجرت کی تو اس کے بعد سے بیت المقدس کی تعمیر تک ان کے ہاں قبلہ کی حیثیت اس تابوت کو حاصل رہی جس کا ذکر سورۂ بقرہ میں گزر چکا ہے۔

اہل ایمان کے لیے بشارت

وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ۔ یہ اہل ایمان کو بشارت ہے کہ جو لوگ اللہ کی راہ میں ثابت قدم رہیں گے، نماز کا اہتمام رکھیں گے، اللہ ان کو تمام آزمائشوں میں ثابت قدم رکھے گا اور ان کو دنیا اور آخرت دونوں میں فوز و فلاح عطا فرمائے گا۔ اس بشارت کا ذکر آیت ۲ میں گزر چکا ہے، وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنَّ لَهُمْ قَدَمَ صِدْقٍ عِنْدَ رَبِّهِمْ (اور ایمان لانے والوں کو بشارت دو کہ ان کے لیے ان کے رب کے پاس عزت کی پائگاہ ہے) اور خاص بنی اسرائیل کے لیے یہ بشارت جس شکل میں ظاہر ہوئی اس کا ذکر آگے آیت ۹۳ میں ہوا ہے۔

وَقَالَ مُوْسٰى رَبَّنَآ اِنَّكَ اٰتَيْتَ فِرْعَوْنَ وَمَلَاَهٗ زِيْنَةً وَّاَمْوَالًا فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۙ رَبَّنَا لِيُضِلُّوْا عَنْ سَبِيْلِكَ ۚ رَبَّنَا اطْمِسْ عَلٰٓى اَمْوَالِهِمْ وَاشْدُدْ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْا حَتّٰى يَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ (۸۸)

رسولوں کے مکذبین کے باب میں سنت الٰہی

یہ دعا حضرت موسیٰؑ نے اس وقت فرمائی ہے جب سارے جتن کر چکنے کے بعد وہ فرعون اور اس کی قوم کے ایمان سے مایوس ہو چکے ہیں۔ یہی مرحلہ ہے جس میں حضرت نوحؑ نے اپنی قوم کے معاندین کے لیے ان الفاظ میں دعا کی:-

قَالَ نُوْحٌ رَّبِّ اِنَّهُمْ عَصَوْنِيْ وَاتَّبَعُوْا مَنْ لَّمْ يَزِدْهُ مَالُهٗ وَوَلَدُهٗٓ اِلَّا خَسَارًا ۚ وَمَكَرُوْا مَكْرًا كُبَّارًا ۚ ...... وَقَدْ اَضَلُّوْا كَثِيْرًا ۚ وَلَا تَزِدِ الظّٰلِمِيْنَ اِلَّا ضَلٰلًا ...... وَقَالَ نُوْحٌ رَّبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْاَرْضِ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ دَيَّارًا ۚ اِنَّكَ اِنْ تَذَرْهُمْ يُضِلُّوْا عِبَادَكَ وَلَا يَلِدُوْٓا اِلَّا فَاجِرًا كَفَّارًا (۲۱-۲۷ - نوح)

نوحؑ نے دعا کی، اے میرے رب انھوں نے میری بات رد کر دی اور اس کی پیروی کی جس کے مال اور اولاد نے اس کے خسارے ہی میں اضافہ کیا اور انھوں نے بڑی بڑی چال چلی...... اور انھوں نے بہتوں کو گمراہ کر ڈالا اور تو ان ظالموں کی ضلالت ہی میں اضافہ کر...... اور نوحؑ نے دعا کی اے میرے رب، تو زمین پر کافروں میں سے کسی کو چلتا پھرتا نہ چھوڑ۔ اگر تو ان کو چھوڑے گا یہ تیرے بندوں کو گمراہ کریں گے اور صرف نابکاروں اور ناشکروں کو جنم دیں گے۔

یہ بات ہم ایک سے زیادہ مقامات میں واضح کر چکے ہیں کہ رسول اتمام حجت کا آخری ذریعہ ہوتا ہے۔ اس کے اتمام حجت کے بعد اگر کوئی قوم ایمان نہیں لاتی تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس کے اندر قبول حق کی ادنیٰ صلاحیت بھی باقی نہیں رہی ہے۔ اب اگر وہ خدا کی زمین پر باقی رہے تو دوسروں کی گمراہی کا ذریعہ تو ہو سکتی ہے لیکن اس کے اندر سے کسی خیر کے پیدا ہونے کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ اس وجہ سے سنت الٰہی یہ رہی ہے کہ جن قوموں پر کسی رسول کے ذریعہ سے حجت تمام ہوتی اس کے مکذبین ایک خاص حد تک مہلت دیے جانے کے بعد لازماً تباہ کر دیے گئے ہیں۔ اس دنیا کے اندر زندگی کی جو مہلت قوموں کو ملتی ہے وہ اپنی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے کے لیے ملتی ہے، شر محض کی پرورش اس کائنات کے مزاج کے خلاف ہے۔ چنانچہ حضرت موسیٰؑ نے یہ دعا اس وقت کی ہے جب ان پر یہ حقیقت واضح ہو گئی ہے کہ ان سرکشوں کی آنکھوں کی پٹی عذاب الٰہی کے سوا اب کوئی دوسری چیز نہیں کھول سکتی۔

رَبَّنَا لِيُضِلُّوْا عَنْ سَبِيْلِكَ عربی میں 'ل' بسا اوقات کسی چیز کے اس انجام اور نتیجہ کو ظاہر کرتا ہے جو اس سے ظہور میں آتا ہے۔ یعنی تو نے ان کو جو مال و اسباب عطا فرمائے وہ ان کے لیے شکر گزاری کے بجائے طغیان و فساد کا سبب بنے اس وجہ سے، اے ہمارے رب، اب تو ان کو مزید مہلت نہ دے کہ یہ تیری مخلوق کو گمراہ کریں۔ رَبَّنَا اطْمِسْ عَلٰٓى اَمْوَالِهِمْ وَاشْدُدْ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ اور ان کے دلوں پر وہ پٹی باندھ

جس کو تیز اعذاب ہی کھرلے۔ یہاں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ اللہ کے رسولوں کو جھٹلانے والوں نے رسول کے تمام دلائل اور تمام نشانیوں سے آنکھیں بند کر کے ہمیشہ اس بات پر اصرار کیا ہے کہ جب تک ان کو وہ عذاب نہ دکھا دیا جائے جس سے ان کو ڈرایا جا رہا ہے اس وقت تک وہ ایمان نہیں لانے کے۔ یہی مطالبہ فرعون اور اس کی قوم کا بھی تھا۔ ان کی اسی ذہنیت کو سامنے رکھ کر، ان کے ایمان سے کلیتہً مایوس ہو جانے کے بعد، حضرت موسیٰؑ نے ان کے لیے اللہ تعالیٰ سے اسی چیز کی درخواست کی جس کے لیے وہ بضد تھے۔

قَالَ قَدْ اُجِیْبَتْ دَّعْوَتُكُمَا فَاسْتَقِیْمَا وَلَا تَتَّبِعٰٓنِّ سَبِیْلَ الَّذِیْنَ لَا یَعْلَمُوْنَ (۸۹)

مکذبین پر ہلاکت کی بددعا

جو دعا صحیح طریقہ اور ٹھیک وقت پر کی جاتی ہے اس کی قبولیت میں دیر نہیں ہوتی۔ حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارونؑ پر دعوت و اصلاح اور انذار و تبلیغ کی ذمہ داری عائد ہوتی تھی چونکہ وہ کما حقہٗ ادا ہو چکی تھی اس وجہ سے ان کی دعا قبول ہو گئی اور ان کو یہ ہدایت ہوئی کہ اب آگے کے مرحلہ میں ان سرکشوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ جو معاملہ کرنے والا ہے اس کو جی کڑا کر کے دیکھنا۔ ان کی درگت دیکھ کر ان کے لیے دل میں نہ کوئی نرمی و رأفت پیدا ہو، نہ ان کے حق میں کوئی کلمہ سفارش کہنا اور نہ کسی پہلو سے اب ان کی چھوٹ تم کو یا تمھارے ساتھیوں کو لگنے پائے۔ یہ بعینہٖ اسی طرح کی ہدایت ہے جس طرح کی ہدایت حضرت نوحؑ کو، ان کی قوم کے باب میں فیصلۂ عذاب ہو جانے کے بعد کی گئی تھی جس کا ذکر سورۂ ہود میں یوں ہوا ہے۔

وَاصْنَعِ الْفُلْكَ بِاَعْیُنِنَا وَوَحْیِنَا وَلَا تُخَاطِبْنِیْ فِی الَّذِیْنَ ظَلَمُوْاۚ اِنَّهُمْ مُّغْرَقُوْنَ (۳۷- ھود)

اور کشتی بناؤ ہماری نگرانی میں اور ہماری ہدایت کے مطابق اور ان ظالموں کے باب میں اب ہم سے کچھ نہ کہیو۔ یہ لازماً غرق کیے جائیں گے۔

بعینہٖ اسی قسم کے سیاق و سباق میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہؓ کو یہ ہدایت کی گئی۔

فَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ وَمَنْ تَابَ مَعَكَ وَلَا تَطْغَوْاؕ اِنَّهٗ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ وَلَا تَرْكَنُوْٓا اِلَى الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُۙ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ اَوْلِیَآءَ ثُمَّ لَا تُنْصَرُوْنَ (۱۱۲-۱۱۳ ھود)

پس جس طرح تمھیں حکم ملا ہے تم اور جن لوگوں نے تمھارے ساتھ توبہ کی ہے، جمے رہو اور سرکشی نہ کیجیو۔ بے شک وہ جو کچھ تم کر رہے ہو اس کو دیکھ رہا ہے اور ان لوگوں کی طرف مائل نہ ہوجیو جنھوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا کہ تم کو بھی دوزخ کا عذاب پکڑ لے اور تمھارے لیے اللہ کے مقابل میں کوئی مددگار نہ ہوگا، پھر تمھاری کوئی مدد نہ کی جائے گی۔

اس قسم کی تنبیہ کا مقصد درحقیقت اپنے گلّے کے راعیوں کو ہوشیار و آگاہ کرنا ہوتا ہے کہ چوکنے رہو کہ تمھارے گلّے کی کوئی بھیڑ اس گلّے سے نہ جا ملے جس کی ہلاکت اب مقدر ہو چکی ہے اور جس پر اللہ کا عذاب بس آنے ہی والا ہے۔ اس قسم کے مواقع میں خطاب بظاہر پیغمبر سے ہوتا ہے لیکن کلام کا رخ، جیسا کہ دوسرے

مواقع میں ہم واضح کر چکے ہیں، دوسروں کی طرف ہوتا ہے چنانچہ ہود کی محولہ بالا آیات میں اس کی وضاحت بھی ہو گئی ہے کہ خطاب پہلے واحد سے ہوا، پھر صیغۂ جمع کا آ گیا۔

وَجٰوَزْنَا بِبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ الْبَحْرَ فَاَتْبَعَهُمْ فِرْعَوْنُ وَجُنُوْدُهٗ بَغْیًا وَّعَدْوًا ؕ حَتّٰۤی اِذَآ اَدْرَكَهُ الْغَرَقُ ۙ قَالَ اٰمَنْتُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا الَّذِیْۤ اٰمَنَتْ بِهٖ بَنُوْۤا اِسْرَآءِیْلَ وَاَنَا مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ ۝ آٰلْـٰٔنَ وَقَدْ عَصَیْتَ قَبْلُ وَكُنْتَ مِنَ الْمُفْسِدِیْنَ ۝ فَالْیَوْمَ نُنَجِّیْكَ بِبَدَنِكَ لِتَكُوْنَ لِمَنْ خَلْفَكَ اٰیَةً ؕ وَاِنَّ كَثِیْرًا مِّنَ النَّاسِ عَنْ اٰیٰتِنَا لَغٰفِلُوْنَ (۹۰-۹۲)

بنی اسرائیل کی نجات کا خدائی اہتمام

'وَجٰوَزْنَا بِبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ الْبَحْرَ …… الآیۃ' یہ خاص خدائی اہتمام میں بنی اسرائیل کو سمندر پار کرا دینے کی تعبیر ہے گویا کوئی کسی کو اپنے کندھے پر سوار کرا کے دریا پار کرا دے۔ اس کی شکل کیا ہوئی، یہ وال بحث طلب ہے۔ ہم اس سوال پر اس مقام میں بحث کریں گے جہاں قرآن نے اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔ یہ قدرت کے عجائب تصرفات میں سے ہے کہ جس مقام سے سمندر نے بنی اسرائیل کو خشک راستہ دیا اسی مقام سے گزرتے ہوئے فرعون اپنی فوجوں کے ساتھ غرق ہو گیا۔ فرعون کے اس تعاقب کو قرآن نے 'بغی' اور 'عدو' یعنی سرکشی اور تعدی سے تعبیر کیا ہے۔ اس کا یہ فعل یوں تو ہر پہلو سے سرکشی اور تعدی تھا لیکن اس کا یہ پہلو خاص طور پر یہاں قابل لحاظ ہے کہ ایک مدت کی کشمکش کے بعد فرعون نے خود بنی اسرائیل کو جانے کی اجازت دی تھی۔ اس اجازت کے بعد پیچھے سے ان پر فوجیں لے کر چڑھ دوڑنا ایک ایسی زیادتی تھی جو اس کی تمام زیادتیوں پر بازی لے گئی۔ ڈوبتے وقت فرعون کا اقرار توحید اس تصریح کے ساتھ کہ لَآ اِلٰهَ اِلَّا الَّذِیْۤ اٰمَنَتْ بِهٖ بَنُوْۤا اِسْرَآءِیْلَ اس کی بے بسی کی کامل تصویر ہے جو فراعنہ اور متمردین پر اس وقت طاری ہوا کرتی ہے جب وہ خدا کی پکڑ میں آ جاتے ہیں۔ اس وقت وہ ناک رگڑ رگڑ کے اس حقیقت کا اظہار و اعلان کرتے ہیں جس کا نام سننا بھی ان کو اس سے پہلے گوارا نہیں ہوتا۔

'آٰلْـٰٔنَ وَقَدْ عَصَیْتَ …… الآیۃ' یعنی اب ماننے جب ماننے کا وقت گزر گیا۔ اب مسلم بننے کا اقرار کرتے ہو درآنحالیکہ ساری زندگی فساد میں گزری! یہ ضروری نہیں کہ بات قولاً کہی گئی ہو بلکہ غالب یہ ہے کہ یہ صورت حال کی تصویر ہو۔

قدرت کے انتقام کی ایک نشانی

'فَالْیَوْمَ نُنَجِّیْكَ بِبَدَنِكَ لِتَكُوْنَ لِمَنْ خَلْفَكَ … الآیۃ' قدرت کے انتقام کی اس عظیم نشانی کے اندر ایک دوسری عظیم نشانی یہ ظاہر ہوئی کہ فرعون کی لاش کو سمندر نے قبول نہیں کیا بلکہ اس کو ایک نشانِ عبرت بنانے کے لیے باہر پھینک دیا اور یہ لاش بعد میں لوگوں کو ملی بھی اور لوگوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ جو خدائی کا مدعی تھا اس کا انجام کیا ہوا ــــ مصر میں لاشوں کو ممی کر کے محفوظ کرنے کا رواج تھا اور ایک فرعون کی ممی کی ہوئی لاش قاہرہ کے عجائب خانے میں محفوظ ہے۔ اس لاش کے بارے میں اثریات کے ماہرین چاہے اختلاف کریں کہ یہ اسی فرعون کی لاش ہے یا کسی اور کی۔ لیکن ان کے اٹکل پچو اندازوں کے

مقابل میں قرآن کا یہ چودہ سو سال پہلے کا بیان زیادہ قابلِ اعتماد ہے۔ اس طرح قدرت نے اس کی لاش کو عبرت کی ایک ایسی نشانی بنا دیا جو آج کے فرعونوں کے لیے بھی محفوظ ہے لیکن دیکھنے کے لیے آنکھوں کی ضرورت ہے اور اس دنیا میں عبرت پذیر آنکھوں سے زیادہ کمیاب کوئی شے بھی نہیں 'وَاِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ عَنْ اٰيٰتِنَا لَغٰفِلُوْنَ' میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہے۔

وَلَقَدْ بَوَّاْنَا بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ مُبَوَّاَ صِدْقٍ وَّرَزَقْنٰھُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ ۚ فَمَا اخْتَلَفُوْا حَتّٰى جَاۗءَھُمُ الْعِلْمُ ۭ اِنَّ رَبَّكَ يَقْضِيْ بَيْنَھُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ (۹۳)

بنی اسرائیل پر اللہ کا انعام اور ان کی ناشکری

'تبویۃ' کے معنی متمکن کرنے کے ہیں اور 'صدق' کی طرف اس کی اضافت اس کے اندر مزید قوت و استحکام کے اظہار کے لیے ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس طرح اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کے دشمن کو پامال کیا اور بنی اسرائیل کو اپنے منتخب کردہ علاقے میں اقتدار و استحکام بخشا۔ یہ منتخب علاقہ، جیسا کہ سورۂ بقرہ میں وضاحت ہو چکی ہے، اردن اور شام کا علاقہ ہے۔ 'وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ' سے علاقے کی زرخیزی و شادابی کی طرف اشارہ ہے جس کی تفصیلات تورات میں موجود ہیں اور قرآن نے بھی جگہ جگہ اس کا حوالہ دیا ہے۔

'فَمَا اخْتَلَفُوْا حَتّٰى جَاۗءَھُمُ الْعِلْمُ' اب یہ اس ناشکری اور ناسپاسی کی طرف اشارہ ہے جو اللہ تعالیٰ کے اتنے عظیم احسانات کے مورد ہونے کے بعد اللہ کے دین اور اس کی کتاب و شریعت کے معاملے میں یہود نے کی۔ انھوں نے اس کے اندر طرح طرح کے اختلافات پیدا کر کے پائی ہوئی حقیقت گم کر دی اور اسی سرگشتگی اور حیرانی میں پھر مبتلا ہو گئے جس سے اللہ تعالیٰ نے اس اہتمام سے ان کو نکالا تھا۔ 'حَتّٰى جَاۗءَھُمُ الْعِلْمُ' سے اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہ وہ بدقسمت قوم ہے جس نے رات کی تاریکی میں نہیں بلکہ پورے دن کی روشنی میں ٹھوکر کھائی اس وجہ سے سارا بارِ الزام اس کے اپنے ہی کندھوں پر ہے۔ 'اِنَّ رَبَّكَ يَقْضِيْ بَيْنَهُمْ ..... الآیۃ' یہ دھمکی ہے یہود کو کہ آج انھوں نے اللہ کے دین کے معاملے میں جو دھاندلی مچائی ہے اور کتابِ الٰہی کی جن حقیقتوں پر پردہ ڈالا ہے سب کے فیصلے کے لیے اللہ نے ایک دن مقرر کر رکھا ہے۔ اس دن ان کا سارا کچا چٹھا ان کے سامنے آ جائے گا اور ہر شخص اپنے جرم کی نوعیت کے لحاظ سے اپنے کیفرِ کردار کو پہنچے گا۔

۱۲- آگے کا مضمون ___ آیات ۹۴-۱۰۹

خاتمۂ سورہ

آگے کا مضمون خاتمۂ سورہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ پہلے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے مکذبین پر عتاب ہے کہ ان کی روش تمھیں کسی تردد میں نہ ڈالے۔ جو چیز تم پر اتاری گئی ہے اگر یہ لاخیرے قسم کے لوگ اس کی تکذیب کر رہے ہیں تو اس کا غم نہ کرو، ایسے لوگ بھی موجود ہیں جو پہلے سے کتاب کے حامل رہے ہیں، ان سے پوچھو تو وہ اس حق کی تائید کریں گے۔

پیغمبر صلعم کو تسلی

اس کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی کہ یہ نہ خیال کرو کہ جو لوگ تمھاری تکذیب کر رہے ہیں اگر ان کو ان کے حسب منشا کوئی نشانی دکھا دی جائے تو یہ مومن بن جائیں گے۔ جو لوگ خدا کے قانون کی زد میں آئے ہوئے ہوں ان کو دنیا جہان کی نشانیاں دکھا دو پھر بھی وہ ماننے والے نہیں ہیں۔ تاریخ میں صرف ایک مثال قوم یونس کی موجود ہے کہ وہ عذاب کے کنارے پہنچتے پہنچتے سنبھل گئی اور اس کے ایمان سے اس کو نفع پہنچا۔ اللہ تعالیٰ کو لوگوں کا ایمان لانا بہت محبوب ہے لیکن وہ چاہتا ہے کہ لوگ اپنے ضمیر اور ارادے کی آزادی اور آفاق و انفس کی نشانیاں دیکھ کر ایمان لائیں۔ اس معاملے میں نہ وہ جبر کو پسند کرتا ہے اور نہ لوگوں کے مطالبۂ معجزات کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ جن کو نشانیاں مطلوب ہوں وہ آسمان و زمین کی نشانیوں پر غور کریں اور جن کو اس طرح کا کوئی عذاب مطلوب ہو جس طرح کے عذاب پچھلی قوموں پر آئے ان سے کہہ دو کہ اس کے لیے انتظار کرو میں بھی اس کا انتظار کر رہا ہوں۔

عقیدۂ توحید کا اعلان

آخر میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے دو ٹوک الفاظ میں عقیدۂ توحید کا اعلان کرایا ہے اور یہ اعلان گویا دین کفر و شرک سے آخری برأت و بیزاری کا اعلان ہے تاکہ مشرکین آخری درجے میں سمجھوتے کی توقع سے مایوس ہو جائیں اور جو کچھ کرنا چاہتے ہیں کر گزریں ـــ اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۹۴-۱۰۹

فَاِنْ كُنْتَ فِيْ شَكٍّ مِّمَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ فَسْــَٔلِ الَّذِيْنَ يَقْرَءُوْنَ الْكِتٰبَ
مِنْ قَبْلِكَ ۚ لَقَدْ جَآءَكَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ ﴿۹۴﴾
وَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَتَكُوْنَ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿۹۵﴾
اِنَّ الَّذِيْنَ حَقَّتْ عَلَيْهِمْ كَلِمَتُ رَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۹۶﴾ وَلَوْ جَآءَتْهُمْ
كُلُّ اٰيَةٍ حَتّٰى يَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ ﴿۹۷﴾ فَلَوْلَا كَانَتْ قَرْيَةٌ اٰمَنَتْ
فَنَفَعَهَآ اِيْمَانُهَآ اِلَّا قَوْمَ يُوْنُسَ ۗ لَمَّآ اٰمَنُوْا كَشَفْنَا عَنْهُمْ عَذَابَ
الْخِزْيِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَمَتَّعْنٰهُمْ اِلٰى حِيْنٍ ﴿۹۸﴾ وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ
لَاٰمَنَ مَنْ فِي الْاَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِيْعًا ۭ اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰى يَكُوْنُوْا
مُؤْمِنِيْنَ ﴿۹۹﴾ وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تُؤْمِنَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ۭ وَيَجْعَلُ
الرِّجْسَ عَلَي الَّذِيْنَ لَا يَعْقِلُوْنَ ﴿۱۰۰﴾ قُلِ انْظُرُوْا مَاذَا فِي السَّمٰوٰتِ

وَالْاَرْضِ ۭ وَمَا تُغْنِي الْاٰيٰتُ وَالنُّذُرُ عَنْ قَوْمٍ لَّا يُؤْمِنُوْنَ ﴿١٠١﴾ فَهَلْ
يَنْتَظِرُوْنَ اِلَّا مِثْلَ اَيَّامِ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِهِمْ ۭ قُلْ فَانْتَظِرُوْٓا
اِنِّىْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُنْتَظِرِيْنَ ﴿١٠٢﴾ ثُمَّ نُنَجِّيْ رُسُلَنَا وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كَذٰلِكَ ۚ
ع ١٠ ١١ ١٥ حَقًّا عَلَيْنَا نُنْجِ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿١٠٣﴾ قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنْ كُنْتُمْ فِيْ شَكٍّ مِّنْ
دِيْنِيْ فَلَآ اَعْبُدُ الَّذِيْنَ تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ اَعْبُدُ
اللّٰهَ الَّذِيْ يَتَوَفّٰىكُمْ ښ وَاُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿١٠٤﴾ وَاَنْ اَقِمْ
وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا ۚ وَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿١٠٥﴾ وَلَا تَدْعُ
مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُكَ وَلَا يَضُرُّكَ ۚ فَاِنْ فَعَلْتَ فَاِنَّكَ اِذًا مِّنَ
الظّٰلِمِيْنَ ﴿١٠٦﴾ وَاِنْ يَّمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهٗٓ اِلَّا هُوَ ۚ وَ
اِنْ يُّرِدْكَ بِخَيْرٍ فَلَا رَاۗدَّ لِفَضْلِهٖ ۭ يُصِيْبُ بِهٖ مَنْ يَّشَاۗءُ مِنْ
عِبَادِهٖ ۭ وَهُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ﴿١٠٧﴾ قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاۗءَكُمُ الْحَقُّ
مِنْ رَّبِّكُمْ ۚ فَمَنِ اهْتَدٰى فَاِنَّمَا يَهْتَدِيْ لِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ ضَلَّ فَاِنَّمَا
يَضِلُّ عَلَيْهَا ۚ وَمَآ اَنَا عَلَيْكُمْ بِوَكِيْلٍ ﴿١٠٨﴾ وَاتَّبِعْ مَا يُوْحٰٓى اِلَيْكَ وَاصْبِرْ
ع ١١ ٦ ١٦ حَتّٰى يَحْكُمَ اللّٰهُ ښ وَهُوَ خَيْرُ الْحٰكِمِيْنَ ﴿١٠٩﴾

ترجمۂ آیات ۹۲-۱۰۹

پس اگر تم شک میں ہو اس چیز کے باب میں جو ہم نے تمہاری طرف اتاری ہے تو ان لوگوں سے پوچھو جو تم سے پہلے سے کتاب پڑھتے آ رہے ہیں۔ بے شک تم پر تمہارے رب کی طرف سے حق نازل ہوا ہے تو تم شک کرنے والوں میں سے نہ بنو اور تم ان لوگوں میں سے نہ ہو جیو جنھوں نے اللہ کی آیات کی تکذیب کی کہ تم بھی نامرادوں میں سے ہو جاؤ۔ بے شک جن لوگوں پر

تیرے رب کی بات پوری ہو چکی ہے وہ ایمان نہیں لانے کے خواہ ان کے پاس ساری ہی نشانیاں آجائیں جب تک وہ دردناک عذاب نہ دیکھ لیں۔ پس کیوں نہ ہوا کہ کوئی بستی ایمان لاتی کہ اس کا ایمان اس کو نفع دیتا بجز یونس کی قوم کے۔ جب وہ ایمان لائے تو ہم نے ان سے دنیا کی زندگی میں رسوائی کے عذاب کو دور کر دیا اور ایک وقت تک ان کو کھانے پلنے کا موقع دیا۔ ۹۸-۹۶

اور اگر تیرا رب چاہتا تو روئے زمین پر جتنے لوگ بھی ہیں سب ایمان قبول کر لیتے تو کیا تم لوگوں کو مجبور کرو گے کہ وہ مومن بن جائیں؟ اور کسی شخص کے لیے ممکن نہیں کہ وہ ایمان لا سکے مگر اللہ کے اذن سے۔ اور وہ گندگی لاد دیا کرتا ہے ان لوگوں پر جو عقل سے کام نہیں لیتے۔ ۹۹-۱۰۰

ان سے کہو، آسمانوں اور زمین میں کیا کچھ ہے اس کو دیکھو۔ اور نشانیاں اور ڈراوے ان لوگوں کو کچھ نفع نہیں پہنچاتے جو ایمان نہیں لانا چاہتے۔ یہ تو بس اس طرح کے دن کا انتظار کر رہے ہیں جس طرح کے دن لوگوں کو پیش آئے جو ان سے پہلے گزرے۔ کہہ دو، انتظار کرو میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرنے والوں میں ہوں۔ پھر ہم نجات دے دیتے رہے ہیں اپنے رسولوں کو اور ایمان لانے والوں کو۔ ایسے ہی ہم پر حق ہے، ہم مومنوں کو نجات دیں گے۔ ۱۰۱-۱۰۳

کہہ دو، اے لوگو، اگر تم میرے دین کے باب میں شک میں ہو تو سن لو کہ میں ان کو نہیں پوجتا جن کو تم اللہ کے سوا پوجتے ہو بلکہ میں اس اللہ کو پوجتا ہوں جو تم کو وفات دیتا ہے اور مجھے حکم ملا ہے کہ میں ایمان والوں میں سے بنوں۔ اور یہ کہ اپنا رخ یکسو ہو کر اطاعت کی طرف کرو اور مشرکوں میں سے نہ بنو۔ اور اللہ کے سوا ان چیزوں کو نہ پکارو جو نہ تم کو نفع پہنچائیں نہ نقصان، اگر تم ایسا کرو گے تو بیشک تم ظالموں میں سے بن جاؤ گے۔ اور اگر اللہ تمہیں کسی تکلیف میں پکڑ لے تو اس

کے سوا کوئی نہیں جو اس کو دور کر سکے اور اگر وہ تمھارے لیے کوئی بھلائی چاہے تو کوئی اس کے فضل کو روکنے والا نہیں، وہ اس سے نوازتا ہے اپنے بندوں میں سے جس کو چاہے۔ اور وہ بخشنے والا مہربان ہے۔ ۱۰۴-۱۰۷

کہہ دو، اے لوگو، تمھارے رب کی طرف سے تمھارے پاس حق آگیا ہے تو جو ہدایت قبول کرے گا وہ اپنے ہی لیے کرے گا اور جو بھٹکے گا تو اس کا وبال اسی پر آئے گا۔ اور میں تمھارے اوپر کا ذمہ دار نہیں ہوں۔ اور تم پیروی کرو اس چیز کی جو تم پر وحی کی جاتی ہے اور ثابت قدم رہو یہاں تک کہ اللہ فیصلہ کر دے اور وہ بہترین فیصلہ کرنے والا ہے۔ ۱۰۸-۱۰۹

۱۳- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

فَإِن كُنتَ فِي شَكٍّ مِّمَّآ أَنزَلْنَآ إِلَيْكَ فَسْـَٔلِ ٱلَّذِينَ يَقْرَءُونَ ٱلْكِتَٰبَ مِن قَبْلِكَ ۚ لَقَدْ جَآءَكَ ٱلْحَقُّ مِن رَّبِّكَ فَلَا تَكُونَنَّ مِنَ ٱلْمُمْتَرِينَ ۝ وَلَا تَكُونَنَّ مِنَ ٱلَّذِينَ كَذَّبُوا۟ بِـَٔايَٰتِ ٱللَّهِ فَتَكُونَ مِنَ ٱلْخَٰسِرِينَ (۹۴-۹۵)

خطاب پیغمبر سے عتاب مکذبین پر

'فَإِن كُنتَ فِي شَكٍّ ...... الایۃ' ہم دوسرے مقام میں ذکر کر چکے ہیں کہ بعض مرتبہ خطاب بظاہر الفاظ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے ہوتا ہے لیکن اس میں جو عتاب مضمر ہوتا ہے اس کا رخ منکرین و مکذبین کی طرف ہوتا ہے، وہ اپنی ضد کے سبب سے چونکہ لائق خطاب نہیں رہ جاتے اس وجہ سے بات پیغمبر کو خطاب کر کے کہہ دی جاتی ہے۔ ایک سورج کی طرح واضح حق کی مخالفت پر بھی اگر یمین و یسار کے سارے ہی لوگ ایکا کر لیں تو اس بات کا اندیشہ پیدا ہو جاتا ہے کہ ایک نیک نیت اور راستباز آدمی کے دل میں بھی وہ کچھ تردد پیدا کرنے میں کامیاب ہو جائیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اس قسم کے تردد سے محفوظ رکھنے کے لیے یہ تنبیہ فرما دی گئی کہ ان مکذبین کا رویہ اس حق کے باب میں تمھیں کسی تردد میں نہ ڈالے جو اللہ نے تم پر اتارا ہے 'فَسْـَٔلِ ٱلَّذِينَ يَقْرَءُونَ ٱلْكِتَٰبَ مِن قَبْلِكَ' اگر یہ قرآن و کتاب سے ناآشنا لوگ اس نعمت کی ناقدری کر رہے ہیں تو اس کی پروا نہ کرو، جو لوگ پہلے سے کتاب کے حامل ہیں اور اس کو پڑھتے پڑھاتے ہیں ان سے پوچھو تو وہ اس کی تائید کریں گے۔ 'يَقْرَءُونَ' فعل یہاں اپنے حقیقی مفہوم میں استعمال ہوا ہے اور اس سے اشارہ یہاں صالحین اہل کتاب کی طرف ہے جن کی تائید و تصدیق کا حوالہ قرآن نے جگہ جگہ دیا ہے۔ اس میں ان صالحین کی حوصلہ افزائی بھی ہے کہ اب وقت آگیا ہے کہ وہ اس حق کا لوگوں سے تعارف کرائیں۔

جس سے وہ پہلے سے تعارف کی سعادت رکھتے ہیں۔

وَلَا تَكُوْنَنَّ .... الاٰیۃ اس میں بھی خطاب پیغمبرؐ سے ہے لیکن عتاب کا رخ جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا، آیاتِ الٰہی کی تکذیب کرنے والوں کی طرف ہے۔

یہاں جس انداز میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی ہے اسی انداز میں سورۂ ہود میں بھی تسلی دی گئی ہے۔ فرمایا ہے۔

اَفَمَنْ كَانَ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّهٖ وَيَتْلُوْهُ	کیا وہ جو اپنے رب کی بخشی ہوئی ایک واضح دلیل پر ہے،
شَاهِدٌ مِّنْهُ وَمِنْ قَبْلِهٖ كِتٰبُ مُوْسٰٓى	اس کے بعد مزید برآں اس کی طرف سے ایک شاہد آتا ہے
اِمَامًا وَّرَحْمَةً ؕ اُولٰٓئِكَ يُؤْمِنُوْنَ	اور اس کے پہلے سے موسیٰ کی کتاب رہنما اور رحمت کی حیثیت
بِهٖ ؕ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِهٖ مِنَ الْاَحْزَابِ	سے موجود ہے۔ یہی لوگ اس قرآن پر ایمان لائیں گے اور
فَالنَّارُ مَوْعِدُهٗ ۚ فَلَا تَكُ فِيْ مِرْيَةٍ مِّنْهُ ۚ	جماعتوں میں سے جو بھی اس کا انکار کریں گے ان کا ٹھکانا جہنم
اِنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ	ہے تو تم اس کی طرف سے شک میں نہ پڑو۔ یہ تمھارے رب
لَا يُؤْمِنُوْنَ (۱۷ - ہود)	کی جانب سے حق ہے لیکن اکثر لوگ ایمان نہیں لاتے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ حَقَّتْ عَلَيْهِمْ كَلِمَتُ رَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۙ وَلَوْ جَآءَتْهُمْ كُلُّ اٰيَةٍ حَتّٰى يَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ (۹۶-۹۷)

ایک سنتِ الٰہی

اِنَّ الَّذِيْنَ حَقَّتْ عَلَيْهِمْ ..... الاٰیۃ یہ اس سنتِ الٰہی کی طرف اشارہ ہے جس کا اشارہ پیچھے آیت ۳۳ میں گزر چکا ہے كَذٰلِكَ حَقَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ عَلَى الَّذِيْنَ فَسَقُوْٓا اَنَّهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ (اسی طرح تیرے رب کی بات ان لوگوں پر پوری ہو چکی ہے جن لوگوں نے نافرمانی کی ہے، وہ ایمان نہیں لانے کے) یعنی جو لوگ حق واضح ہونے کے باوجود اندھے بہرے بنے رہتے ہیں اللہ تعالیٰ ان کے دلوں پر مہر کر دیا کرتا ہے جس کے بعد ان کو ایمان کی توفیق نصیب نہیں ہوتی۔

وَلَوْ جَآءَتْهُمْ كُلُّ اٰيَةٍ .... الاٰیۃ یعنی ایسے لوگوں کی آنکھیں کسی معجزے سے بھی نہیں کھلتیں خواہ انھیں کتنے ہی معجزے دکھا دیے جائیں۔ ایسے لوگ صرف اس عذاب کو دیکھ کر ایمان لاتے ہیں جو ان کا فیصلہ کر دینے کے لیے اللہ تعالیٰ ان پر نازل فرماتا ہے۔ لیکن عذاب کو دیکھ کر جو ایمان لایا جاتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کے ہاں معتبر نہیں۔

فَلَوْلَا كَانَتْ قَرْيَةٌ اٰمَنَتْ فَنَفَعَهَآ اِيْمَانُهَآ اِلَّا قَوْمَ يُوْنُسَ ؕ لَمَّآ اٰمَنُوْا كَشَفْنَا عَنْهُمْ عَذَابَ الْخِزْيِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَمَتَّعْنٰهُمْ اِلٰى حِيْنٍ (۹۸)

تاریخ کی روشنی میں پیغمبرِ صلعم کو تسلی

یہ تاریخ کی روشنی میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی ہے کہ تم سے پہلے جتنے بھی رسول آئے ان میں سے کسی رسول کی قوم کے لوگ بھی رسول پر اس وقت ایمان نہیں لائے جس وقت ایمان لانا نافع ہوا کرتا

ہے بلکہ اللہ کا عذاب دیکھ کر ایمان لائے جب ایمان لانا بے سود ہو جاتا ہے۔ صرف ایک مثال قوم یونس کی اس سے مستثنیٰ ہے۔ اس قوم کے لوگ بے شک عذاب کی گھڑی کے ظہور سے پہلے پہلے چوکنے ہو گئے۔ اللہ نے ان کو ایمان لانے کی توفیق بخشی، یہ ایمان لائے اور ان کے ایمان سے ان کو نفع پہنچا کہ اس عذاب سے یہ محفوظ رہے جس کے ظہور میں اب زیادہ دیر نہیں باقی رہ گئی تھی[1]۔

قریش کو ترہیب و ترغیب

پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تسلی کے ساتھ اس میں قریش کے لیے بھی ترہیب و ترغیب ہے کہ اب تمہارا پیمانہ بھی لبریز ہوا چاہتا ہے۔ اگر تم جلد متنبہ نہ ہوئے تو وہی انجام دیکھو گے جو دنیا کی بہت سی قومیں دیکھ چکی ہیں۔ اب بھی توقع باقی ہے کہ تم ہلاکت کی اس عام راہ پر جانے کے بجائے قوم یونس کی روش اختیار کرو کہ تمہارا ایمان تمہارے لیے نافع ہو اور تم اس عذاب سے بچا لیے جاؤ جو تم پر منڈلا رہا ہے ــــــ

یہ بات یہاں یاد رکھنے کی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی قوم پر کوئی اس طرح کا فیصلہ کن عذاب نہیں آیا جس قسم کا عذاب عاد و ثمود وغیرہ قوموں پر آیا بلکہ آپ کی قوم کے وہ سارے لوگ آہستہ آہستہ داخلِ ایمان ہو گئے جن کے اندر کچھ صلاحیت تھی، صرف شریر قسم کے لوگ اس سے محروم رہے اور وہ مختلف قسم کے غزوات میں اہلِ حق کی تلواروں سے ختم ہو گئے۔

وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَاٰمَنَ مَنْ فِی الْاَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِیْعًا ؕ اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰی یَكُوْنُوْا مُؤْمِنِیْنَ ۝ وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تُؤْمِنَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَیَجْعَلُ الرِّجْسَ عَلَی الَّذِیْنَ لَا یَعْقِلُوْنَ (۹۹-۱۰۰)

پیغمبر صلعم کو مزید تسلی

'وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ ...... الایۃ' یہ بھی پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی ہے کہ لوگوں کے ایمان نہ لانے سے تم پریشان نہ ہو، اللہ تعالیٰ کو لوگوں کا ایمان لانا بہت پسند ہے بشرطیکہ لوگ اپنی عقل اور اپنے ضمیر کی رہنمائی میں ایمان لائیں۔ اس معاملے میں اس نے جبر کو پسند نہیں فرمایا ہے۔ اگر وہ جبر کو پسند فرماتا تو سارے ہی لوگوں کو مومن بنا دیتا لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔ تمہارا فرض صرف حق تبلیغ ادا کر دینا ہے۔ یہ کام تم نے کر دیا۔ اس کے بعد لوگ ایمان نہیں لاتے تو ذمہ داری تمہاری نہیں ہے، لوگوں کی اپنی ہے۔ اب خدا کے ہاں پرسش ان سے ہونی ہے نہ کہ تم سے۔ تمہارا کام یہ نہیں ہے کہ تم لوگوں کو لازماً ایمان کے راستہ پر چلا ہی دو۔

ایمان کے باب میں سنت الٰہی

'وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ ...... الایۃ' ایمان لانے اور نہ لانے کے باب میں جو سنت الٰہی ہے یہ اس کی طرف اشارہ ہے کہ جو بھی ایمان لاتا ہے وہ اللہ کے حکم اور اس کی توفیق سے ایمان لاتا ہے اور یہ توفیق ان کو حاصل ہوتی ہے جو اللہ کی بخشی ہوئی عقل اور سمجھ سے کام لیتے ہیں۔ جو لوگ عقل اور سمجھ سے کام نہیں لیتے ان کی بصیرت پر اللہ تعالیٰ ان کے اعمال کی نجاست مسلط کر دیتا ہے جو ان کو بالکل اندھا بنا کر چھوڑ دیتی ہے اور وہ اپنی خواہشاتِ نفس کے پیچھے ہی بھٹکتے پھرتے ہیں۔

---

[1] حضرت یونس علیہ السلام کے اپنی قوم کو چھوڑ کر چلے جانے کے واقعہ کی طرف یہاں کوئی اشارہ نہیں ہے۔ اس وجہ سے ہم بھی اس سے یہاں بحث نہیں کرتے۔ اس کے محل میں ان شاء اللہ ہم اس کی نوعیت واضح کریں گے۔

قُلِ انْظُرُوْا مَاذَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ وَمَا تُغْنِی الْاٰیٰتُ وَالنُّذُرُ عَنْ قَوْمٍ لَّا یُؤْمِنُوْنَ ۝
فَهَلْ یَنْتَظِرُوْنَ اِلَّا مِثْلَ اَیَّامِ الَّذِیْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِهِمْ ۭ قُلْ فَانْتَظِرُوْٓا اِنِّیْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُنْتَظِرِیْنَ ۝
ثُمَّ نُنَجِّیْ رُسُلَنَا وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كَذٰلِكَ ۚ حَقًّا عَلَیْنَا نُنْجِ الْمُؤْمِنِیْنَ (۱۰۱-۱۰۳)

مطالبۂ معجزات کا جواب

'قُلِ انْظُرُوْا ...... الایۃ' یہ کفار کے مطالبۂ معجزات کا جواب دلوایا ہے کہ آسمان و زمین معجزات اور نشانیوں سے بھرے پڑے ہیں ان سے کہو کہ معجزات کی طلب ہے تو ان نشانیوں اور معجزات کو دیکھو، یہ آنکھیں کھول دینے کے لیے کافی ہیں۔ اس کے بعد وضاحت فرما دی کہ نشانیاں اور ڈراوے انہی لوگوں کو نفع دیتے ہیں جن کے اندر ان سے نفع اٹھانے کا ارادہ پایا جاتا ہے۔ جو لوگ ایمان نہیں لانا چاہتے ان کو کوئی نشانی اور کوئی ڈراوا بھی نفع نہیں پہنچاتا۔ 'یُؤْمِنُوْنَ' فعل یہاں ارادۂ فعل کے معنی میں استعمال ہوا ہے اور 'نُذُر' سے مراد خاص طور پر وہ نشانیاں ہیں جو اللہ تعالیٰ لوگوں کے اندر اپنا خوف پیدا کرنے کے لیے ظاہر فرماتا ہے۔

'فَهَلْ یَنْتَظِرُوْنَ ...... الایۃ' یعنی آفاق و انفس کے اندر پھیلی ہوئی نشانیوں کے اندر انھیں کچھ نظر نہیں آتا۔ یہ تو اس قسم کے کسی فیصلہ کن عذاب کے منتظر ہیں جس قسم کے فیصلہ کن عذاب عاد و ثمود وغیرہ قوموں پر آ چکے ہیں۔ فرمایا کہ ان سے کہہ دو کہ اگر اس قسم کے کسی عذاب کا انتظار ہے تو انتظار کرو۔ میں بھی تمھارے ساتھ انتظار کرنے والوں میں ہوں۔ یعنی اس قسم کے کسی عذاب کا لانا میرے اختیار کی بات نہیں ہے۔ یہ اللہ ہی کے اختیار کی بات ہے۔ البتہ اس کے قرائن و آثار تمھارے اندر جمع ہوتے دیکھ رہا ہوں اس وجہ سے تم بھی اس کا انتظار کرو، میں بھی اس کا انتظار کرتا ہوں۔

قریش کو تنبیہ

'ثُمَّ نُنَجِّیْ رُسُلَنَا وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ...... الایۃ' اب یہ اس عذاب کا نتیجہ بتا دیا کہ کوئی اس کو بچوں کا کھیل نہ سمجھے، جب ہم اس قسم کا فیصلہ کن عذاب بھیجتے ہیں تو پھر اس سے نجات ہمارے رسول اور ان پر ایمان لانے والے ہی پاتے ہیں باقی سب اس کی لپیٹ میں آ کر فنا ہو جاتے ہیں 'كَذٰلِكَ حَقًّا عَلَیْنَا نُنْجِ الْمُؤْمِنِیْنَ' یہ قریش کو تنبیہ ہے کہ یہ جو سنتِ الٰہی بیان ہوئی ہے اب اس کی زد میں تم بھی ہو۔ اسی طرح ہم پر حق ہے کہ ہم تمھارے معاملے میں بھی کریں اور ان لوگوں کو نجات دیں جو ایمان لائے ہیں۔

ہم دوسرے مقام میں یہ ذکر کر چکے ہیں کہ رسولوں کے مکذبین پر جب آخری فیصلہ کن عذاب آتا ہے تو اللہ کے رسول اور ان پر ایمان لانے والے لازماً اس سے بچا لیے جاتے ہیں، صرف وہ لوگ اس کی زد میں آتے ہیں جو رسول کی تکذیب کرنے والے ہوتے ہیں۔ البتہ یہ یاد رہے کہ یہ ضابطہ صرف فیصلہ کن عذاب سے متعلق ہے۔ عام آزمائشیں جو محض تذکیر کے لیے ظاہر ہوتی ہیں وہ مومن و کافر سب کے لیے یکساں ہوتی ہیں البتہ مومن اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں اور کافر ان سے اپنے اوپر صرف اللہ کی حجت تمام کراتے ہیں۔

قُلْ یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ اِنْ كُنْتُمْ فِیْ شَكٍّ مِّنْ دِیْنِیْ فَلَآ اَعْبُدُ الَّذِیْنَ تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ
وَلٰكِنْ اَعْبُدُ اللّٰهَ الَّذِیْ یَتَوَفّٰىكُمْ ښ وَاُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ ۝ وَاَنْ اَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّیْنِ

حَنِيفًا ۚ وَلَا تَكُونَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِينَ ۝ وَلَا تَدْعُ مِن دُونِ اللَّهِ مَا لَا يَنفَعُكَ وَلَا يَضُرُّكَ ۖ فَإِن
فَعَلْتَ فَإِنَّكَ إِذًا مِّنَ الظَّالِمِينَ ۝ وَإِن يَمْسَسْكَ اللَّهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهُ إِلَّا هُوَ ۖ وَإِن يُرِدْكَ
بِخَيْرٍ فَلَا رَادَّ لِفَضْلِهِ ۚ يُصِيبُ بِهِ مَن يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ ۚ وَهُوَ الْغَفُورُ الرَّحِيمُ (۱۰۴-۱۰۷)

آخری فیصلہ کن اعلان

قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ .... یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے آخری فیصلہ کن اعلان کرایا جا رہا ہے تاکہ کفار کے ذہن کے کسی گوشے میں اگر کوئی طمع خام اس قسم کا ہو کہ دباؤ ڈال کر آپ کو کچھ نرم کیا جا سکتا ہے تو وہ اس کو اپنے ذہن سے نکال دیں اور جو کچھ وہ کرنا چاہتے ہیں وہ کر گزریں۔ اس قسم کا اعلان آخری مرحلے میں تمام انبیاء سے ماثور ہے اور یہ درحقیقت قوم سے رسول کا اعلان براءت ہوتا ہے جس کے بعد ہجرت کا مرحلہ آجاتا ہے۔ 'الَّذِي يَتَوَفَّاكُمْ' کی صفت کا حوالہ یہاں بطور تنبیہ و تذکیر ہے یعنی وہی خدا جو تمہیں وفات دیتا ہے اور جس کے آگے جواب دہی کے لیے لازماً تمہیں حاضر ہونا ہے۔ وَأُمِرْتُ أَنْ أَكُونَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ یعنی مجھے جو حکم ملا ہے وہ یہی ہے کہ میں مومن و موحد بنوں اس سے قطع نظر کہ تم کیا روش اختیار کرتے ہو۔

وَأَنْ أَقِمْ وَجْهَكَ ..... الآیۃ یہ اوپر والی بات ہی کی مزید وضاحت ہے۔ ایمان کی اصل خصوصیت اللہ واحد کی طرف یکسوئی اور شرک کے تمام شوائب سے پورا پورا اجتناب ہے۔

وَلَا تَدْعُ مِن دُونِ اللَّهِ .... الآیۃ۔ یہ شرک کے باطل ہونے کی دلیل ہے کہ جب اذنِ الٰہی کے بغیر نہ کوئی چیز نفع پہنچا سکتی ہے نہ ضرر تو اللہ کے سوا دوسری چیزوں کو پکارنا اپنے نفس پر بھی بہت بڑا ظلم ہے اور یہ خدا کے بھی سب سے بڑے حق کو تلف کرنا ہے۔

وَإِن يَمْسَسْكَ اللَّهُ بِضُرٍّ .... الآیۃ۔ اوپر والی بات ہی کی وضاحت ایک دوسرے اسلوب سے جس سے ان تمام تصورات کی نفی ہو جاتی ہے جن کی بنا پر مشرکین شرکاء و شفعاء کو پوجتے تھے۔ آخر میں 'غَفُورٌ رَّحِيمٌ' کی صفات کے حوالہ سے مقصود اس حقیقت کی طرف توجہ دلانا ہے کہ جب خدا خود مغفرت فرمانے والا اور رحم فرمانے والا ہے تو بندے اسی کے دامنِ رحمت میں پناہ لیں، دوسروں کا سہارا کیوں ڈھونڈیں!

قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَكُمُ الْحَقُّ مِن رَّبِّكُمْ ۖ فَمَنِ اهْتَدَىٰ فَإِنَّمَا يَهْتَدِي لِنَفْسِهِ ۖ وَمَن
ضَلَّ فَإِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا ۖ وَمَا أَنَا عَلَيْكُم بِوَكِيلٍ (۱۰۸)

آخری تنبیہ

خطاب ہر چند باعتبار الفاظ عام ہے لیکن روئے سخن قریش ہی کی طرف ہے جن سے اوپر سے خطاب چلا آ رہا ہے۔ یہ گویا اس سلسلہ کی آخری تنبیہ ہے کہ یہ جو کچھ تمہارے سامنے پیش کیا جا رہا ہے یہ تمہارے رب کی طرف سے ہے اور بالکل حق ہے۔ جو تعلیم تمہیں دی جا رہی ہے یہ بھی حق ہے اور دنیا اور آخرت میں اس کی تکذیب کی صورت میں جس عذاب کی خبر دی جا رہی ہے وہ بھی شدنی ہے تو اچھی طرح کان کھول کے سن لو کہ جو اس حق کو قبول کرے گا وہ اپنا ہی بھلا کرے گا، اور جو اس کے بعد بھی بھٹکتا رہے گا تو اس بھٹکنے کا وبال اسی کے سر پر آئے گا۔ کسی دوسرے کے سر پر نہیں جائے گا۔ اور یہ بھی سن لو کہ میرے اوپر جو ذمہ داری ہے وہ بس اس حق

کو پہنچا دینے کی ہے۔ اس کو تم سے منوا لینے کی ذمہ داری مجھ پر نہیں ہے۔

وَاتَّبِعْ مَا يُوحَىٰ إِلَيْكَ وَاصْبِرْ حَتَّىٰ يَحْكُمَ اللَّهُ ۚ وَهُوَ خَيْرُ الْحَاكِمِينَ (۱۰۹)

پیغمبرؐ کو آخری ہدایت

یہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو اس سلسلہ کی آخری ہدایت ہے کہ مخالفین کے رویہ سے قطع نظر کر کے اس وحی کی تم پیروی کرو جو تم پر کی جا رہی ہے اور یہ مخالفین خواہ کتنا ہی زور لگائیں لیکن تم اپنے موقف حق پر ڈٹے رہو یہاں تک کہ اللہ کا فیصلہ ظاہر ہو جائے۔ اس فیصلہ کی طرف اشارہ اوپر آیت ۱۰۳ میں گزر چکا ہے کہ بالآخر اللہ تعالیٰ اپنے رسولوں اور اہل ایمان کو کامیابی عطا فرماتا ہے اور ان کے مخالفین رسوا و نامراد ہوتے ہیں۔

اس سورہ کی تفسیر میں یہ آخری سطریں ہیں جو اس بے بضاعت کے قلم سے سپرد قرطاس ہوئیں۔ جو باتیں قلم سے صحیح نکلی ہیں وہ اللہ تعالیٰ کی توفیق سے نکلی ہیں اور جو باتیں کمزور یا غلط ہیں وہ میری کم علمی کا نتیجہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ لغزشوں کو معاف فرمائے اور صحیح باتوں کے لیے دلوں میں جگہ پیدا کرے۔ وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ۔

لاہور

۱۴ر نومبر ۱۹۶۹ء

۴ر رمضان المبارک ۱۳۸۹ھ

تدبّرِ قرآن

11

ھود

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ا۔ سورہ کا عمود اور سابق سورہ سے تعلق

اس پورے گروپ کے عمود اور اس کے مطالب پر ایک جامع تبصرہ ہم سورہ یونس کی تمہید میں پیش کر چکے ہیں۔ یہ سورہ چونکہ ہمارے اصول سے سورۂ یونس ہی کا مثنیٰ ہے اس وجہ سے نفس عمود میں دونوں کے درمیان کچھ ایسا فرق نہیں ہے، البتہ اجمال و تفصیل اور بحث و استدلال کے اعتبار سے دونوں کا نہج الگ الگ ہے۔ سورۂ یونس میں جو باتیں بالاجمال بیان ہوئی تھیں، مثلاً پچھلی قوموں کی سرگزشتیں ——— وہ اس سورہ میں تفصیل سے بیان ہوئی ہیں اور اس حقیقت کی طرف اس کی پہلی ہی آیت نے اشارہ بھی کر دیا ہے "کِتٰبٌ اُحْکِمَتْ اٰیٰتُهٗ ثُمَّ فُصِّلَتْ مِنْ لَّدُنْ حَکِیْمٍ خَبِیْرٍ" (یہ ایک ایسی کتاب ہے جس کی آیتیں پہلے محکم کی گئیں، پھر خدائے حکیم و خبیر کی طرف سے ان کی تفصیل کی گئی)۔ ان دونوں کا قرآنی نام بھی ایک ہی یعنی 'الٓرٰ' ہے اور یہ بات ہم اس کے محل میں واضح کر چکے ہیں کہ سورتوں کے نام میں اشتراک ان کے مطالب کے اشتراک پر دلیل ہے۔

عمود کے متعلق یہ اشارہ کافی ہے۔ اب ہم سورہ کے مطالب کا تجزیہ پیش کرتے ہیں جس سے پوری سورہ بحیثیت مجموعی نگاہ کے سامنے آ جائے گی۔

ب۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

(۱-۴) پہلے بطورِ تمہید قرآن کی یہ خصوصیت واضح کی گئی ہے کہ لوگوں کی تربیت و تعلیم کے مقصد کو پیش نظر رکھ کر اللہ تعالیٰ نے اس کو اس شکل میں اتارا ہے کہ پہلے صرف اصولی اور بنیادی باتیں، گٹھے ہوئے الفاظ میں اجمال و اختصار کے ساتھ، بیان ہوئیں، پھر بتدریج وہ تفصیل کے قالب میں آئیں۔ اس کے بعد پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے اس کتاب کے پیغام کی وضاحت فرمائی کہ یہ اللہ واحد کی بندگی اور استغفار و توبہ کی دعوت ہے اور میں اللہ کی طرف سے بشیر و نذیر ہو کر آیا ہوں کہ جو لوگ استغفار کر کے اللہ واحد کی طرف رجوع کر لیں گے اللہ ایک مقررہ مدت تک ان کو زندگی کی نعمتوں سے بہرہ مند اور اپنے فضل سے متمتع کرے گا اور جو لوگ اس سے اعراض کریں گے ان کے لیے ایک بڑے عذاب کا دن سامنے ہے۔ دنیا میں بھی اور

آخرت میں بھی۔

(۵-۶) ان لوگوں کی حالت پر اظہارِ افسوس جن کے دل تو یہ گواہی دے رہے ہیں کہ پیغمبر کا ڈراوا بالکل حق ہے لیکن اس کے باوجود وہ حقیقت کا مواجہہ کرنے سے اس طرح گریز کر رہے ہیں گویا وہ اپنے آپ کو خدا سے چھپا رہے ہیں حالانکہ خدا سے کوئی چیز ڈھکی چھپی نہیں رہتی، وہ پوشیدہ و علانیہ ہر چیز سے باخبر اور سینوں کے بھیدوں سے بھی آگاہ ہے۔ وہی سب کو رزق پہنچاتا ہے۔ اس کو ہر ایک کے مستقر و مدفن کا پتہ ہے۔ ہر چیز اس کے رجسٹر میں درج ہے۔

(۷-۱۱) جزا و سزا کے منکرین اور عذاب کے مذاق اڑانے والوں کو تنبیہ کہ یہ دنیا بازیچۂ اطفال نہیں ہے۔ اللہ نے اس کو اس لیے بنایا ہے کہ وہ دیکھے کہ لوگ کیسا عمل کرتے ہیں۔ مجرموں کو جو مہلت وہ دیتا ہے اس سے دلیر ہو کر شریر لوگ پیغمبر کا مذاق اڑانا شروع کر دیتے ہیں کہ اس نے محض دھونس جمانے کے لیے عذاب کی دھمکی دی تھی۔ انسان کا حال عجیب ہے کہ جب خدا کی پکڑ میں آ جاتا ہے تب تو بالکل مایوس اور دل شکستہ ہو جاتا ہے لیکن جب خدا اس کو ڈھیل دے دیتا ہے تو اکڑنے اور شیخی بگھارنے لگتا ہے۔ تھوڑے لوگ ایسے نکلتے ہیں جو مصیبت میں صبر کی اور نعمت میں شکر کی روش اختیار کرتے ہیں۔ انہی کے لیے خدا کے ہاں مغفرت اور اجر عظیم ہے۔

(۱۲-۱۶) پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی حوصلہ افزائی کہ تم مخالفین کے استہزا اور مطالبۂ معجزات سے دل شکستہ نہ ہو۔ تم ایک منذر ہو۔ اپنا فرض انذار ادا کرو، خدا سب کچھ دیکھ اور سن رہا ہے۔ اگر یہ کہتے ہیں کہ یہ قرآن تمہارا گھڑا ہوا ہے تو ان سے کہو کہ وہ دس سورتیں ایسی ہی گھڑی ہوئی لا کر دکھا دیں اور اس کام میں وہ اپنے شریکوں کی مدد بھی حاصل کر لیں جن کو یہ خدا کے سوا پوجتے ہیں۔ اگر ان کے شرکا اس کام میں ان کی مدد نہ کر سکیں تو پھر یہ مانیں کہ یہ خدا کی اتاری ہوئی چیز ہے اور اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔ ان لوگوں کو اگر یہ گھمنڈ ہے کہ دنیاوی اعتبار سے تمہارے اور تمہارے ساتھیوں کے مقابل میں ان کا حال بہتر ہے تو انھیں معلوم ہونا چاہیے کہ دنیا کے طالبین کو اللہ سب کچھ اسی دنیا میں پورا کر دیتا ہے، آخرت میں ان کے لیے دوزخ کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔

(۱۷-۲۴) قرآن کی دعوت کو قبول کرنے والوں اور اس سے اعراض کرنے والوں کے ذہنی فرق و اختلاف کی وضاحت۔ ایمان صرف وہ لوگ لائیں گے جن کی فطرت مسخ ہونے سے محفوظ ہو۔ وہ قرآن کی آواز کو اپنے دل کی آواز سمجھیں گے۔ اس سے پہلے موسیٰ کو جو کتاب دی گئی وہ بھی ان کے لیے ایک تائید مزید فراہم کرے گی۔ رہے وہ لوگ جن کی اپنی فطرت کا نور بجھ چکا ہو وہ دوزخ کی آگ ہی دیکھ کر قائل ہوں گے تو ان کی مخالفت تمہیں اپنے موقف کے بارے میں کسی تردد میں نہ ڈالے۔ ان لوگوں سے بڑھ کر ظالم کون ہو سکتا ہے جنھوں نے خدا پر جھوٹ باندھا ہے اور اس جھوٹ کے ذریعہ سے لوگوں کو اللہ کے راستے

سے روک رہے ہیں، یہ خدا کے قابو سے باہر نہیں ہیں۔ لیکن خدا اس لیے انھیں ڈھیل دے رہا ہے کہ آخرت میں ساری کسر پوری ہو جائے گی۔ فلاح صرف ان لوگوں کو حاصل ہوگی جنھوں نے اپنے آپ کو بالکلیہ اپنے رب کے حوالے کر دیا اور ایمان و عمل صالح کی زندگی اختیار کی۔ ان دونوں گروہوں کی تمثیل ایسی ہے کہ ایک گروہ اندھوں بہروں کا ہوا اور دوسرا چشم و گوش رکھنے والوں کا۔ کیا یہ دونوں یکساں ہوں گے؟

(۲۵-۴۹) حضرت نوحؑ اور ان کی قوم کی سرگزشت جس میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو دکھایا گیا ہے کہ جس بشارت و انذار کے ساتھ تم اپنی قوم کے پاس آئے ہو بعینہٖ اسی انذار و بشارت کے ساتھ اللہ نے نوحؑ کو ان کی قوم کے پاس بھیجا تھا۔ ان کی قوم کے سرغنوں نے بھی بعینہٖ اسی طرح کی باتیں بنائیں جس طرح کی باتیں تمھاری قوم کے لوگ بنا رہے ہیں۔ بالآخر ان پر اللہ کا عذاب آیا اور وہ غرق کر دیے گئے۔ آخر میں اس کا خلاصہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ان لفظوں میں رکھا گیا ہے۔ 'فَاصۡبِرۡ اِنَّ الۡعَاقِبَۃَ لِلۡمُتَّقِیۡنَ' (پس جمے رہو، انجام کار کی کامیابی خدا سے ڈرنے والوں ہی کے لیے ہے) یعنی اگر تمھاری قوم کے لوگ بھی سرکشی سے باز نہ آئے تو اسی طرح کا روز بد یہ بھی دیکھیں گے۔ خدا تم کو اور تمھارے ساتھیوں کو بہر حال سرخرو کرے گا، اگر تم تمام مخالفتوں کے علی الرغم اپنی دعوت میں ثابت قدم رہے۔

(۵۰-۶۰) قوم عاد کی سرگزشت۔ انھوں نے بھی اپنے پیغمبر ہودؑ کے ساتھ اسی قسم کی روش اختیار کی جس قسم کی روش قوم نوحؑ نے نوحؑ کے ساتھ اور قریش نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اختیار کی۔ بالآخر یہ بھی اپنے کیفر کردار کو پہنچے اور ہود علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے سرخرو کیا۔ اس سرگزشت کے سنانے سے بھی مقصود قریش کو تاریخ کے آئینہ میں ان کا انجام دکھا دینا اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دینا ہے۔

(۶۱-۶۸) قوم ثمود اور حضرت صالحؑ کی سرگزشت جس سے بعینہٖ وہی حقیقت واضح ہوتی ہے جو اوپر کی سرگزشتوں سے واضح ہوتی ہے۔

(۶۹-۸۳) قوم لوطؑ کی سرگزشت اسی مضمون کی تائید کے لیے جو اوپر سے چلا آ رہا ہے۔ اس سے ضمناً یہ بات بھی واضح ہو گئی کہ قریش جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے فرشتے اتارنے کا مطالبہ کر رہے ہیں یہ اپنی شامت بلانے کا سامان کر رہے ہیں۔ فرشتوں کا آنا کوئی معمولی واقعہ نہیں ہوتا، یہ جب آتے ہیں تو کسی عظیم خدائی مہم پر آتے ہیں۔ ان کی اہمیت کا یہ حال ہے کہ حضرت ابراہیم خلیل اللہ جیسے عظیم پیغمبر نے جب یہ محسوس کیا کہ ان کے پاس فرشتے آئے ہیں تو ان کا دم خشک ہو گیا اور اس وقت تک انھوں نے اطمینان کا سانس نہیں لیا جب تک ان کی پیش نظر مہم کی نوعیت ان کے سامنے واضح نہیں ہو گئی۔

(۸۴-۹۵) اہل مدین اور حضرت شعیبؑ کی سرگزشت۔

(۹۶-۹۹) حضرت موسیٰؑ اور فرعون کی سرگزشت کی طرف سرسری اشارہ۔ چونکہ حضرت موسیٰ کی سرگزشت پچھلی سورہ میں تفصیل سے گزر چکی تھی اس وجہ سے اس سورہ میں اس کی طرف صرف اشارہ فرما دیا۔

(۱۰۰-۱۲۳) خاتمۂ سورہ جس میں ان سرگزشتوں کو سنانے سے جو مقصد ہے اس کو واضح فرمایا ہے۔ پھر ان سے جو نتائج و حقائق نکلتے ہیں ان کی روشنی میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھیوں کو ضروری ہدایات دی ہیں۔ قریش کو اپنے ملک کی تاریخ سے سبق لینے ورنہ نتائج بھگتنے کے لیے تیار رہنے کے لیے تنبیہ فرمائی ہے۔

مضامین سورہ کے اس تجزیہ پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے بھی اندازہ ہو جائے گا کہ پوری سورہ ایک معین مقصد پر نہایت جامع اور مربوط خطبہ ہے۔ اب ہم اللہ کا نام لے کر، اپنے طریقہ کے مطابق، سورہ کی تفسیر شروع کرتے ہیں۔ وما توفیقی الا باللہ۔

سُوْرَةُ هُوْدٍ (١١)

مَكِّيَّةٌ ——————— اٰيَاتُهَا ١٢٣

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

الٓرٰ كِتٰبٌ اُحْكِمَتْ اٰيٰتُهٗ ثُمَّ فُصِّلَتْ مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ خَبِيْرٍ ۝١ آيات
اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّا اللّٰهَ ؕ اِنَّنِيْ لَكُمْ مِّنْهُ نَذِيْرٌ وَّبَشِيْرٌ ۝٢ وَّاَنِ ١ - ٢٤
اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ يُمَتِّعْكُمْ مَّتَاعًا حَسَنًا
اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى وَّيُؤْتِ كُلَّ ذِيْ فَضْلٍ فَضْلَهٗ ؕ وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنِّيْٓ
اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ كَبِيْرٍ ۝٣ اِلَى اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ ۚ وَهُوَ عَلٰى
كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝٤ اَلَآ اِنَّهُمْ يَثْنُوْنَ صُدُوْرَهُمْ لِيَسْتَخْفُوْا مِنْهُ ؕ
اَلَا حِيْنَ يَسْتَغْشُوْنَ ثِيَابَهُمْ ۙ يَعْلَمُ مَا يُسِرُّوْنَ وَمَا يُعْلِنُوْنَ ۚ
اِنَّهٗ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ۝٥ وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا
عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا وَيَعْلَمُ مُسْتَقَرَّهَا وَمُسْتَوْدَعَهَا ؕ كُلٌّ فِيْ كِتٰبٍ
مُّبِيْنٍ ۝٦ وَهُوَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ
وَّكَانَ عَرْشُهٗ عَلَى الْمَآءِ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ؕ وَلَئِنْ قُلْتَ
اِنَّكُمْ مَّبْعُوْثُوْنَ مِنْۢ بَعْدِ الْمَوْتِ لَيَقُوْلَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ هٰذَآ

إِلَّا سِحْرٌ مُّبِينٌ ۞ ۷ وَلَئِنْ أَخَّرْنَا عَنْهُمُ الْعَذَابَ إِلَىٰ أُمَّةٍ مَّعْدُودَةٍ
لَّيَقُولُنَّ مَا يَحْبِسُهُ ۗ أَلَا يَوْمَ يَأْتِيهِمْ لَيْسَ مَصْرُوفًا عَنْهُمْ
وَحَاقَ بِهِم مَّا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِئُونَ ۞ ۸ وَلَئِنْ أَذَقْنَا ع
الْإِنسَانَ مِنَّا رَحْمَةً ثُمَّ نَزَعْنَاهَا مِنْهُ إِنَّهُ لَيَئُوسٌ كَفُورٌ ۞ ۹
وَلَئِنْ أَذَقْنَاهُ نَعْمَاءَ بَعْدَ ضَرَّاءَ مَسَّتْهُ لَيَقُولَنَّ ذَهَبَ السَّيِّئَاتُ
عَنِّي ۚ إِنَّهُ لَفَرِحٌ فَخُورٌ ۞ ۱۰ إِلَّا الَّذِينَ صَبَرُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ ۖ
أُولَٰئِكَ لَهُم مَّغْفِرَةٌ وَأَجْرٌ كَبِيرٌ ۞ ۱۱ فَلَعَلَّكَ تَارِكٌ بَعْضَ مَا يُوحَىٰ
إِلَيْكَ وَضَائِقٌ بِهِ صَدْرُكَ أَن يَقُولُوا لَوْلَا أُنزِلَ عَلَيْهِ كَنزٌ
أَوْ جَاءَ مَعَهُ مَلَكٌ ۚ إِنَّمَا أَنتَ نَذِيرٌ ۚ وَاللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ وَكِيلٌ ۞ ۱۲
أَمْ يَقُولُونَ افْتَرَاهُ ۖ قُلْ فَأْتُوا بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِهِ مُفْتَرَيَاتٍ وَادْعُوا
مَنِ اسْتَطَعْتُم مِّن دُونِ اللَّهِ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ ۞ ۱۳ فَإِلَّمْ
يَسْتَجِيبُوا لَكُمْ فَاعْلَمُوا أَنَّمَا أُنزِلَ بِعِلْمِ اللَّهِ وَأَن لَّا إِلَٰهَ إِلَّا
هُوَ ۖ فَهَلْ أَنتُم مُّسْلِمُونَ ۞ ۱۴ مَن كَانَ يُرِيدُ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا وَزِينَتَهَا
نُوَفِّ إِلَيْهِمْ أَعْمَالَهُمْ فِيهَا وَهُمْ فِيهَا لَا يُبْخَسُونَ ۞ ۱۵ أُولَٰئِكَ
الَّذِينَ لَيْسَ لَهُمْ فِي الْآخِرَةِ إِلَّا النَّارُ ۖ وَحَبِطَ مَا صَنَعُوا فِيهَا وَ
بَاطِلٌ مَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ ۞ ۱۶ أَفَمَن كَانَ عَلَىٰ بَيِّنَةٍ مِّن رَّبِّهِ وَيَتْلُوهُ
شَاهِدٌ مِّنْهُ وَمِن قَبْلِهِ كِتَابُ مُوسَىٰ إِمَامًا وَرَحْمَةً ۚ أُولَٰئِكَ
يُؤْمِنُونَ بِهِ ۚ وَمَن يَكْفُرْ بِهِ مِنَ الْأَحْزَابِ فَالنَّارُ مَوْعِدُهُ ۚ فَلَا تَكُ

فِيْ مِرْيَةٍ مِّنْهُ ۚ اِنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا
يُؤْمِنُوْنَ ﴿١٧﴾ وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا ۭ اُولٰۗىِٕكَ
يُعْرَضُوْنَ عَلٰي رَبِّهِمْ وَيَقُوْلُ الْاَشْهَادُ هٰٓؤُلَاۗءِ الَّذِيْنَ كَذَبُوْا عَلٰي
رَبِّهِمْ ۚ اَلَا لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَي الظّٰلِمِيْنَ ﴿١٨﴾ الَّذِيْنَ يَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ
اللّٰهِ وَيَبْغُوْنَهَا عِوَجًا ۭ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ كٰفِرُوْنَ ﴿١٩﴾ اُولٰۗىِٕكَ لَمْ
يَكُوْنُوْا مُعْجِزِيْنَ فِي الْاَرْضِ وَمَا كَانَ لَهُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ اَوْلِيَاۗءَ ۘ وقف لازم
يُضٰعَفُ لَهُمُ الْعَذَابُ ۭ مَا كَانُوْا يَسْتَطِيْعُوْنَ السَّمْعَ وَمَا كَانُوْا
يُبْصِرُوْنَ ﴿٢٠﴾ اُولٰۗىِٕكَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَّا
كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ﴿٢١﴾ لَا جَرَمَ اَنَّهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ هُمُ الْاَخْسَرُوْنَ ﴿٢٢﴾
اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَاَخْبَتُوْٓا اِلٰى رَبِّهِمْ ۙ اُولٰۗىِٕكَ
اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿٢٣﴾ مَثَلُ الْفَرِيْقَيْنِ كَالْاَعْمٰى
وَالْاَصَمِّ وَالْبَصِيْرِ وَالسَّمِيْعِ ۭ هَلْ يَسْتَوِيٰنِ مَثَلًا ۭ اَفَلَا
تَذَكَّرُوْنَ ﴿٢٤﴾ ع ٢ ١٦ ٢

ترجمۂ آیات ۱ - ۲۴

یہ الٓرٰ ہے۔ یہ ایک ایسی کتاب ہے جس کی آیتیں پہلے محکم کی گئیں پھر خدائے حکیم و خبیر کی طرف سے ان کی تفصیل کی گئی کہ تم اللہ کے سوا کسی اور کی بندگی نہ کرو۔ میں تمہارے لیے اس کی طرف سے ہوشیار کرنے والا اور خوش خبری دینے والا ہوں، اور یہ کہ تم اپنے رب سے مغفرت چاہو، پھر اس کی طرف رجوع کرو وہ تم کو ایک وقت معین تک اچھی طرح بہرہ مند کرے گا اور ہر مستحق فضل کو اپنے فضل سے نوازے گا۔ اور اگر تم منہ موڑو گے تو میں تم پر ایک

ہولناک دن کے عذاب کا اندیشہ رکھتا ہوں۔ اللہ ہی کی طرف تم سب کا پلٹنا ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ ۱-۴

ذرا دیکھو، یہ اپنے سینے موڑتے ہیں کہ اس سے چھپ جائیں۔ آگاہ ہو، یہ اس وقت بھی اس کی نظر میں ہوتے ہیں جب اپنے اوپر کپڑے لپیٹتے ہیں۔ وہ جانتا ہے جو وہ چھپاتے ہیں اور جو ظاہر کرتے ہیں۔ وہ تو سینوں کے بھیدوں سے بھی اچھی طرح باخبر ہے۔ اور زمین کے ہر جاندار کا رزق اللہ ہی کے ذمہ ہے۔ اور وہ جانتا ہے اس کے مستقر اور مدفن کو۔ ہر چیز ایک واضح رجسٹر میں درج ہے۔ ۵-۶

اور وہی ہے جس نے پیدا کیا آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں اور اس کا عرش پانی پر تھا تاکہ تمھیں جانچے کہ کون اچھے عمل والا ہے اور اگر تم کہتے ہو کہ مرنے کے بعد تم لوگ اٹھائے جاؤ گے تو یہ کافر کہتے ہیں کہ یہ تو بس کھلا ہوا جادو ہے اور اگر ہم ان سے عذاب کو کچھ مدت کے لیے ٹالے دیتے ہیں تو پوچھتے ہیں کہ اس کو کیا چیز روکے ہوئے ہے! آگاہ کہ جس دن وہ ان پر آ دھمکے گا تو ان سے ٹالا نہ جا سکے گا اور جس چیز کا وہ مذاق اڑا رہے ہیں وہ ان کو آ گھیرے گی۔ اور اگر ہم انسان کو اپنے کسی فضل سے نوازتے ہیں پھر اس سے اس کو محروم کر دیتے ہیں تو وہ مایوس اور ناشکرا بن جاتا ہے اور اگر کسی تکلیف کے بعد، جو اس کو پہنچی اس کو نعمت سے نوازتے ہیں تو کہتا ہے میری مصیبتیں دفع ہوئیں اور وہ اکڑنے والا اور شیخی بگھارنے والا بن جاتا ہے۔ صرف وہ اس سے مستثنیٰ ہیں جو صبر کرنے والے اور نیک عمل کرنے والے ہیں۔ انہی کے لیے مغفرت اور بڑا اجر ہے۔ ۷-۱۱

شاید اس چیز کا کچھ حصہ تم چھوڑ دینے والے ہو جو تم پر وحی کی جا رہی ہے اور اس سے تمھارا

سینہ بھنچ رہا ہے کہ وہ کہیں گے کہ اس پر کوئی خزانہ کیوں نہیں اتارا گیا یا اس کے ساتھ کوئی فرشتہ کیوں نہیں آیا۔ تو تم بس ایک ہوشیار کر دینے والے ہو اور ہر چیز اللہ کے حوالے ہے۔ کیا یہ کہتے ہیں کہ اس نے اس کو گھڑ لیا ہے؟ ان سے کہو کہ پھر تم ایسی ہی دس سورتیں گھڑی ہوئی لاؤ اور اللہ کے سوا جن کو تم بلا سکو ان کو بھی بلا لو اگر تم سچے ہو۔ پس اگر وہ تمہاری مدد کو نہ پہنچیں تم سمجھ لو کہ یہ اللہ ہی کے علم سے اترا ہے اور یہ کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے تو کیا اب تم مانتے ہو؟ ۱۲-۱۴

جو دنیا کی زندگی اور اس کے سروسامان کے طالب ہوتے ہیں ہم ان کے اعمال کا بدلہ یہیں چکا دیتے ہیں اور اس میں ان کے ساتھ کوئی کمی نہیں کی جاتی۔ یہی لوگ ہیں جن کے لیے آخرت میں آگ کے سوا کچھ بھی نہیں ہے اور جو کچھ انھوں نے کیا کرایا ہے سب حبط ہو جائے گا اور باطل ہے جو کچھ وہ کرتے رہے ہیں۔ ۱۵-۱۶

کیا وہ جو اپنے رب کی طرف سے ایک برہان پر ہے، پھر اس کے بعد اس کی طرف سے ایک گواہ بھی آجاتا ہے اور اس کے پہلے سے موسیٰ کی کتاب رہنما اور رحمت کی حیثیت سے موجود ہے اور وہ جو نورِ بصیرت سے محروم ہیں، دونوں یکساں ہو جائیں گے؟ اس پر ایمان تو وہی لوگ لائیں گے اور جماعتوں میں سے جو اس کا انکار کریں گے ان کا موعود ٹھکانا بس دوزخ ہے پس تم اس کے باب میں کسی شک میں نہ پڑو، یہی تمہارے رب کی طرف سے حق ہے لیکن اکثر لوگ اس کو نہیں مانتے اور ان سے بڑھ کر ظالم کون ہے جو اللہ پر جھوٹ گھڑیں۔ ان لوگوں کی پیشی ان کے رب کے سامنے ہوگی اور گواہ گواہی دیں گے کہ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے رب پر جھوٹ بولے ہیں۔ آگاہ کہ اللہ کی لعنت ہے ان ظالموں پر جو اللہ کی راہ سے روکتے اور اس میں کجی پیدا کرنا چاہتے

ہیں اور آخرت کے یہی لوگ منکر ہیں۔ یہ زمین میں خدا کے قابو سے باہر نہیں اور نہ اللہ کے سوا ان کا کوئی مددگار ہے، ان پر دونا عذاب ہوگا۔ یہ نہ سن سکتے تھے اور نہ دیکھتے ہی تھے۔ یہی لوگ ہیں جنھوں نے اپنے آپ کو گھاٹے میں ڈالا اور جو انھوں نے گھڑ رکھے تھے سب ہوا ہو جائیں گے۔ لازماً یہی لوگ ہیں جو آخرت میں خسارے میں ہوں گے۔ باقی رہے وہ لوگ جو ایمان لائے اور جنھوں نے نیک عمل کیے اور جو اپنے رب کی طرف جھک پڑے تو وہی لوگ جنت والے ہیں، وہ اسی میں ہمیشہ رہیں گے۔ دونوں فریقوں کی تمثیل ایسی ہے کہ ایک اندھا اور بہرا ہو اور ایک دیکھنے والا اور سننے والا۔ کیا دونوں کا حال ایک جیسا ہو جائے گا؟ کیا تم لوگ دھیان نہیں کرتے۔ ۱۷-۲۴

۱- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

الٓرٰ قف كِتٰبٌ اُحْكِمَتْ اٰيٰتُهٗ ثُمَّ فُصِّلَتْ مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ خَبِيْرٍ ۙ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّا اللّٰهَ ؕ اِنَّنِيْ لَكُمْ مِّنْهُ نَذِيْرٌ وَّبَشِيْرٌ ۙ وَّاَنِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ يُمَتِّعْكُمْ مَّتَاعًا حَسَنًا اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى وَّيُؤْتِ كُلَّ ذِيْ فَضْلٍ فَضْلَهٗ ؕ وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنِّيْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ كَبِيْرٍ ؕ اِلَى اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ ۚ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (۱-۴)

آیاتِ قرآن میں اجمال اور تفصیل

'الٓرٰ كِتٰبٌ اُحْكِمَتْ اٰيٰتُهٗ ...... الاية' 'الٓرٰ' اس سورہ کا قرآنی نام ہے۔ یہی نام پچھلی سورہ کا بھی ہے اور یہ اس بات کا قرینہ ہے کہ عمود و مضمون کے اعتبار سے دونوں سورتیں باہم ملتی جلتی ہیں چنانچہ آگے آپ دیکھیں گے کہ ان دونوں میں فرق صرف اجمال و تفصیل کا ہے۔ پچھلی سورہ میں جو پہلو مجمل رہ گئے تھے وہ اس میں وضاحت سے سامنے آگئے ہیں۔ یہ فرق یوں تو ہر پہلو میں نمایاں ہے لیکن خاص طور پر واقعات کے بیان میں یہ فرق بہت زیادہ نظر آئے گا۔ اجمال کے بعد تفصیل کا یہ طریقہ، جو قرآن نے اختیار کیا ہے، یہ صرف تنوع کی خاطر نہیں اختیار کیا ہے بلکہ تعلیم و تربیت اور تبلیغ و دعوت کے نقطۂ نظر سے یہی طریقہ مفید اور بابرکت ہے۔

'احکام' کا مفہوم

'احکام' کے معنی کسی چیز کو اچھی طرح گانٹھنے اور مضبوط کرنے کے ہیں۔ کپڑا خوب ٹھونک کر گف بنا جائے تو یہ لفظ اس کے لیے بھی آئے گا۔ قرآنی آیات کے لیے اس لفظ کے استعمال سے مقصود اس حقیقت کو ظاہر کرنا ہے کہ قرآن کی تعلیمات پہلے گٹھے ہوئے، مختصر اور جامع جملوں کی شکل میں نازل ہوئیں، پھر بتدریج وہ

واضح اور مفصل ہوتی گئیں۔ چنانچہ مکہ کے ابتدائی دور میں جو سورتیں نازل ہوئیں وہ اختصار، جامعیت اور اعجاز بیان کا کامل نمونہ ہیں۔ دین کی بنیادی باتیں مختصر گٹھے ہوئے جملوں میں دریا بکوزہ کی مثال ہیں۔ بعد میں آہستہ آہستہ ان پر تفصیل کا رنگ آیا یہاں تک کہ مدنی دور میں آ کر دین کی وہی بنیادی باتیں ایک جامع اور ہمہ گیر نظام زندگی کی شکل میں نمایاں ہوگئیں۔ اس چیز کا حوالہ دینے سے مقصود اس اہتمام خاص کی طرف لوگوں کو متوجہ کرنا ہے جو ان کی تعلیم و تربیت کے لیے اللہ تعالیٰ نے اس کتاب میں ملحوظ رکھا ہے۔ یہ بات یہاں یاد رکھنے کی ہے کہ تورات کے معاملے میں ترتیب و تدریج اور احکام و تفصیل کا یہ اہتمام نہیں ہوا بلکہ اس کا بیشتر حصہ یک دفعہ نازل ہوگیا۔ آخر میں حکیم و خبیر کی صفات کا حوالہ ہے اس لیے کہ خدائے حکیم ہی جان سکتا تھا کہ وہ حکمت کے خزانوں کو کس طرح مختصر لفظوں میں بند کرے اور پھر خدائے خبیر ہی کی یہ شان تھی کہ وہ کھول کر دکھائے کہ ایک کوزے میں کتنے دریا اور کتنے سمندر بند ہیں۔

قرآن کا بنیادی پیغام

أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا اللَّهَ ...... الآیۃ یہ اس کتاب کا بنیادی پیغام ہے کہ اللہ کے سوا کسی اور کی بندگی نہ کرو۔ یہی پیغام تمام دین و شریعت کی اصل ہے۔ اللہ کے رسول ہمیشہ اسی پیغام کے ساتھ بشیر و نذیر بن کر آئے۔ انھوں نے اس پیغام کے قبول کر لینے والوں کو اللہ تعالیٰ کے فضل و رحمت کی بشارت دی اور جو لوگ اس سے اعراض کریں ان کو ایک ہولناک عذاب سے ڈرایا۔ چنانچہ انذار و بشارت کا یہی فریضہ اب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سپرد ہوا تھا۔

بشارت

وَأَنِ اسْتَغْفِرُوا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوبُوا إِلَيْهِ یہ بشارت کا پہلو مذکور ہوا ہے کہ اپنے رب سے مغفرت مانگو اور اس کی طرف رجوع کرو تو اللہ تعالیٰ ایک مدت معینہ تک اس دنیا میں تم کو اپنی نعمتوں سے بہرہ مند کرے گا اور ہر مستحق فضل کو خاص اپنے فضل سے نوازے گا۔

انذار

وَإِنْ تَوَلَّوْا ...... الآیۃ یہ انذار کا پہلو بیان ہوا ہے کہ اگر اس دعوت سے منہ موڑو گے تو ایک ہولناک دن کے عذاب سے دوچار ہونے کے لیے تیار رہو۔ اس عذاب سے وہ عذاب مراد ہے جو رسول کی تکذیب کرنے والوں پر لازماً آتا ہے۔ رسول کے مان لینے والوں کو زندگی کی مہلت ملتی ہے اور کامیابی نصیب ہوتی ہے جو اس وقت تک باقی رہتی ہے جب تک لوگ صحیح راستہ پر استوار رہتے ہیں لیکن رسول کے مکذبین اتمام حجت کی مہلت گزر جانے پر کسی ہولناک عذاب کے ذریعے سے یک قلم ختم کر دیے جاتے ہیں۔

توبہ کے دو رکن

اس آیت سے توبہ کے متعلق بھی یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ اس کے دو اہم رکن ہیں۔ ایک استغفار دوسرا توبہ۔ استغفار تو یہ ہے کہ آدمی اپنے جرم کی اللہ تعالیٰ سے معافی مانگے اور اس سے آئندہ باز رہنے کا عہد کرے اور توبہ یہ ہے کہ اللہ کی طرف رجوع کرے اور اس صحیح راہ کو اختیار کرے جس کی طرف اللہ نے رہنمائی فرمائی ہے۔ اگر آدمی جرم سے باز نہ آئے اور صحیح روش اختیار نہ کرے تو زبان سے لاکھ توبہ توبہ کرے اس کی توبہ محض مذاق ہے۔

إِلَى اللَّهِ مَرْجِعُكُمْ ... الایۃ۔ اوپر مکذبین رسول کے لیے جس عذاب کا ذکر ہے اس کا تعلق اس دنیا سے ہے۔ اب یہ آخرت کے عذاب سے ڈرایا گیا ہے کہ اس کے بعد تمہاری واپسی خدا کی طرف ہونی ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ 'وہ ہر چیز پر قادر ہے' کے ابہام کے اندر جو تخویف ہے وہ کسی تصریح کے اندر نہیں سما سکتی۔

أَلَا إِنَّهُمْ يَثْنُونَ صُدُورَهُمْ لِيَسْتَخْفُوا مِنْهُ ۚ أَلَا حِينَ يَسْتَغْشُونَ ثِيَابَهُمْ يَعْلَمُ مَا يُسِرُّونَ وَمَا يُعْلِنُونَ ۚ إِنَّهُ عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ (۵)

متکبرین کے تکبر کی تصویر

'ثنی' کے معنی پھیرنے، موڑنے اور لپیٹنے کے ہیں۔ قاعدہ ہے کہ آدمی جب کسی بات کو غرور اور نفرت کے سبب سے سننا نہیں چاہتا تو مونڈھے جھٹک کر اور سینہ موڑ کر وہاں سے چل دیتا ہے۔ اسی حالت کو سورہ حج آیت ۹ میں 'ثانی عطفه' سے تعبیر فرمایا ہے اور یہاں 'يَثْنُونَ صُدُورَهُمْ' سے۔ اسی چیز کی ایک شکل یہ بھی ہوتی ہے کہ آدمی اپنی چادر سنبھالتا اور اپنے اوپر لپیٹتا اور چل دیتا ہے اس کو 'استغشاء ثیاب' سے تعبیر فرمایا ہے۔ مثلاً سورہ نوح آیت ۷ میں ہے۔ 'وَإِنِّي كُلَّمَا دَعَوْتُهُمْ لِتَغْفِرَ لَهُمْ جَعَلُوا أَصَابِعَهُمْ فِي آذَانِهِمْ وَاسْتَغْشَوْا ثِيَابَهُمْ وَأَصَرُّوا وَاسْتَكْبَرُوا اسْتِكْبَارًا' (اور میں نے جب جب ان کو دعوت دی کہ تو ان کی مغفرت فرمائے انھوں نے اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں اور اپنی چادریں لپیٹ لیں اور ضد کی اور نہایت گھمنڈ کیا)۔

اب اس آیت میں تصویر ہے اس رویے کی جو پیغمبر کے انذار کے جواب میں متکبرین قریش اختیار کرتے تھے کہ غرور سے سینہ موڑ کے وہاں سے چل دیتے اور اس طرح اپنے زعم میں گویا خدا اور اس کے انذار سے اپنے آپ کو محفوظ کر لیتے۔ انسان کی حماقتوں میں سے ایک حماقت یہ بھی ہے کہ وہ ایک حقیقت کا مواجہہ کرنے سے گریز کرتا ہے اور سمجھ بیٹھتا ہے کہ اب وہ حقیقت حقیقت نہیں رہی۔ حالانکہ کسی کے گریز کرنے سے حقیقت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ شتر مرغ طوفان کا احساس کر کے اپنا سر ریت میں چھپا لیا کرتا ہے تو اس سے طوفان کا رخ تبدیل نہیں ہو جاتا۔ اسی طرح اگر خدا انذار فرما رہا ہے تو اس سے چھپنے کی یہ تدبیر بالکل ہی احمقانہ ہے کہ اس کو سننے سے گریز کیا جائے۔ آخر خدا سے آدمی کہاں چھپ سکتا ہے، وہ تو اس وقت بھی لوگوں کو دیکھتا ہے جب لوگ اپنے اوپر اپنی چادریں لپیٹتے ہیں۔ وہ تو ظاہر سے بھی واقف ہوتا ہے اور پوشیدہ سے بھی اور سینوں کے تمام اسرار سے بھی۔

وَمَا مِنْ دَابَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللَّهِ رِزْقُهَا وَيَعْلَمُ مُسْتَقَرَّهَا وَمُسْتَوْدَعَهَا ۚ كُلٌّ فِي كِتَابٍ مُبِينٍ (۶)

خدا کا علم ہر چیز کو محیط ہے

'مُسْتَقَرّ' اور 'مُسْتَوْدَع' پر انعام آیت ۹۸ کے تحت بحث گزر چکی ہے۔ 'مُسْتَقَرّ' سے مراد وہ ٹھکانا ہے جہاں انسان زندگی کے دن گزارتا ہے اور 'مُسْتَوْدَع' سے مراد وہ جگہ ہے جہاں وہ مرنے کے بعد زمین کے سپرد کیا جاتا ہے۔ اس آیت میں اسی مضمون کی مزید وضاحت ہے جو اوپر والی آیت میں گزرا کہ

خدا کا علم ہر چیز کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ کوئی اس سے بھاگ یا چھپ نہیں سکتا۔ فرمایا کہ وہ خدا ہی ہے جس کے ہاتھوں ہر جاندار کو روزی مل رہی ہے۔ مطلب یہ کہ جو ہر جاندار کو، وہ جہاں بھی ہو، پہاڑوں کی چوٹیوں پر یا سمندروں کی تہوں میں، گھنے جنگلوں میں یا آباد شہروں میں، اس کا مقدر رزق پہنچا رہا ہے کیا اس سے کوئی چیز مخفی ہو سکتی ہے؟ پھر اس میں خدا سے چھپنے کی کوشش کرنے والوں کے لیے ایک مخفی ملامت بھی ہے کہ حیف ہے ان لوگوں پر جو اس کی بات سننے سے گریز کر رہے ہیں جس کے بخشے ہوئے رزق پر پل رہے ہیں۔

یَعْلَمُ مُسْتَقَرَّهَا وَمُسْتَوْدَعَهَا وہ ہر ایک کے مستقر کو بھی جانتا ہے اور اس کے مدفن کو بھی جانتا ہے جہاں وہ مرنے کے بعد زمین کی امانت میں دیا جاتا ہے۔ مدفن کے لیے 'مُسْتَوْدَع' کا لفظ استعمال کرنے میں یہ بلیغ تذکیر ہے کہ کوئی یہ نہ سمجھے کہ جب وہ مر گیا تو بس فنا ہو گیا۔ وہ فنا نہیں ہو جاتا بلکہ وہ زمین کی امانت میں دے دیا جاتا ہے اور ایک دن آئے گا جب زمین یہ امانت اپنے رب کے حوالے کرے گی۔ کُلٌّ فِیْ کِتٰبٍ مُّبِیْنٍ ہر چیز ایک واضح رجسٹر میں درج ہے، نہ کوئی چیز درج ہونے سے رہ گئی اور نہ کسی چیز کی تلاش کے لیے کوئی زحمت اٹھانی ہے۔

وَهُوَ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ وَّكَانَ عَرْشُهٗ عَلَی الْمَآءِ لِیَبْلُوَكُمْ اَیُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ؕ وَلَىِٕنْ قُلْتَ اِنَّكُمْ مَّبْعُوْثُوْنَ مِنْۢ بَعْدِ الْمَوْتِ لَیَقُوْلَنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْۤا اِنْ هٰذَاۤ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِیْنٌ (۷)

جزا اور سزا کی دلیل

یہ اس جزا و سزا کا بیان ہے جس سے ان کو ڈرایا جاتا تھا لیکن وہ اس کو تسلیم کر کے اس کے لیے تیاری کرنے کی بجائے اس کا مذاق اڑاتے تھے۔ فرمایا کہ وہی خدا جس کے رزق پر سب پل رہے ہیں وہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں پیدا کیا اور اس سے پہلے اس کی حکومت پانی پر تھی۔ ہم دوسرے مقام میں واضح کر چکے ہیں کہ چھ دنوں سے یہ ہمارے دن مراد نہیں ہیں بلکہ خدائی دن مراد ہیں جن میں سے ہر دن ہمارے ہزاروں سال کے برابر ہوتا ہے۔ ہم ان کو ادوار سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ یہ دنیا کا چھ ادوار میں درجہ بدرجہ ظہور میں آنا اور اپنے نقطۂ کمال کو پہنچنا اس حقیقت کو ظاہر کرتا ہے کہ اس کا ظہور کوئی اتفاقی حادثہ نہیں ہے بلکہ اس کے خالق نے ارادہ، اسکیم، ترتیب اور حکمت کے ساتھ اس کو وجود بخشا ہے۔ یہ ارادہ، اسکیم اور ترتیب و حکمت اس بات کی شہادت ہے کہ یہ کوئی بے غایت و بے مقصد کارخانہ نہیں ہے بلکہ اس کے پیچھے ایک عظیم غایت ہے جس کا ظہور میں آنا لازمی ہے۔

وَكَانَ عَرْشُهٗ عَلَی الْمَآءِ 'عرش' خدا کی حکومت کی تعبیر ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس کرۂ ارض کی خشکی نمودار ہونے سے پہلے پہلے یہ سارا کرہ مائی تھا اور اللہ کی حکومت اس پر تھی۔ پھر پانی سے خشکی نمودار ہوئی اور زندگی کی مختلف النوع انواع ظہور میں آئیں اور درجہ بدرجہ یہ پورا عالم ہستی آباد ہوا۔ یہی بات تورات میں بھی بیان ہوئی ہے اگرچہ اس کے مترجموں نے مطلب خبط کر دیا ہے۔ کتاب پیدائش کی پہلی ہی آیت میں یہ الفاظ ہیں "اور گہراؤ کے اوپر اندھیرا اور خدا کی روح پانی کی سطح پر جنبش کرتی تھی"۔

لِیَبْلُوَکُمْ اَیُّکُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ۔ یعنی یہ سارا اہتمام و انتظام صاف اس بات کی شہادت دے رہا ہے کہ یہ دنیا کوئی بازیچۂ اطفال یا کسی کھلنڈرے کا کھیل تماشا نہیں ہے کہ یوں ہی پیدا ہوئی، یوں ہی تمام ہو جائے۔ انسان جو اس میں گل سرسبد کی حیثیت رکھتا ہے اور جس کے لیے ہی معلوم ہوتا ہے کہ ساری چیزیں پیدا کی گئی ہیں کوئی شتر بے مہار نہیں چھوڑا گیا کہ کھائے پیے، عیش کرے اور ایک دن ختم ہو جائے۔ اگر ایسا ہو تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس دنیا کے خالق نے ایک عبث کام کیا درآنحالیکہ اس دنیا کے ایک ایک ذرہ سے اس کی قدرت، حکمت اور رحمت کی ایسی شہادتیں مل رہی ہیں کہ ان کی موجودگی میں اس کی طرف کسی لہو و عبث کی نسبت بالکل خلاف عقل ہے۔ اگر اس کی طرف اس طرح کی کوئی نسبت خلاف عقل ہے تو یہ ماننا پڑے گا کہ اس دنیا میں اللہ تعالیٰ انسان کو ارادے کی آزادی اور خیر و شر کا امتیاز دے کر یہ امتحان کر رہا ہے کہ وہ اپنے اختیار سے خیر کی راہ اختیار کرتا ہے یا شر کی اور لازماً وہ اس کے لیے ایک دن اپنے رب کے آگے مسئول اور جواب دہ ہوگا اور اپنے عمل کے مطابق جزا یا سزا بھگتے گا۔ یاد ہوگا، عالم کے چھ دن میں پیدا کیے جانے کا ذکر سورۂ یونس میں بھی ہوا ہے۔ یہاں اس پر لِیَبْلُوَکُمْ اَیُّکُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا کا اضافہ ہے جس سے وہ حقیقت واضح ہوتی ہے جو اس اہتمام سے اس عالم کے پیدا کیے جانے میں مضمر ہے۔

وَلَئِنْ قُلْتَ اِنَّکُمْ مَّبْعُوْثُوْنَ ...... الآیۃ۔ یعنی یہ بات تو بالکل بدیہی اور نہایت واضح معلوم ہوتی ہے لیکن اگر یہی بات تم ان لوگوں کو سمجھاتے ہو کہ مرنے کے بعد تم حساب کتاب اور جزا و سزا کے لیے اٹھائے جاؤ گے تو یہ تمہاری تقریر کے زور اور تمہارے حسن بیان کو صداقت کی دل نشینی قرار دینے کے بجائے الفاظ و بیان کی جادوگری قرار دیتے ہیں تاکہ یہ اپنے عوام کو دھوکا دے سکیں کہ وہ قرآن اور پیغمبر کی باتوں سے متاثر نہ ہوں۔

وَلَئِنْ اَخَّرْنَا عَنْهُمُ الْعَذَابَ اِلٰٓى اُمَّةٍ مَّعْدُوْدَةٍ لَّيَقُوْلُنَّ مَا يَحْبِسُهٗ ۭ اَلَا يَوْمَ يَاْتِيْهِمْ لَيْسَ مَصْرُوْفًا عَنْهُمْ وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ۝ وَلَئِنْ اَذَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنَّا رَحْمَةً ثُمَّ نَزَعْنٰهَا مِنْهُ ۚ اِنَّهٗ لَيَـــُٔوْسٌ كَفُوْرٌ ۝ وَلَئِنْ اَذَقْنٰهُ نَعْمَاۗءَ بَعْدَ ضَرَّاۗءَ مَسَّتْهُ لَيَقُوْلَنَّ ذَهَبَ السَّيِّاٰتُ عَنِّيْ ۭ اِنَّهٗ لَفَرِحٌ فَخُوْرٌ ۝ اِلَّا الَّذِيْنَ صَبَرُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۭ اُولٰۗىِٕكَ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ كَبِيْرٌ ۝ (۸-۱۱)

لفظ امۃ کا مفہوم

وَلَئِنْ اَخَّرْنَا عَنْهُمُ الْعَذَابَ اِلٰٓى اُمَّةٍ ...... الآیۃ۔ لفظ امت یہاں ٹھیک اپنے لغوی مفہوم یعنی مدت کے معنی میں ہے جس طرح سورۂ یوسف میں ہے وَقَالَ الَّذِیْ نَجَا مِنْهُمَا وَادَّكَرَ بَعْدَ اُمَّةٍ ۔ ۴۵ (اور کہا اس نے جس نے ان دونوں میں سے رہائی پائی تھی اور ایک مدت کے بعد اس نے یاد کیا)۔

کفار کے استہزاء کا جواب

اوپر کی آیت میں ان کے اس مذاق کا ذکر ہے جو مرنے کے بعد اٹھائے جانے کی خبر کا وہ اڑا رہے تھے۔ اس آیت میں یہ بتایا جا رہا ہے کہ یہی مذاق کی روش ان کی اس عذاب کے بارے میں بھی ہے جس سے اس دنیا میں ان کو لازماً دوچار ہونا ہے اگر انھوں نے رسول کی تکذیب کر دی۔ فرمایا کہ جس عذاب کی ان کو خبر

دی جا رہی ہے اگر کچھ مدت کے لیے ہم اس کو ٹال رہے ہیں تو یہ ہماری عنایت ہے کہ ہم ان کو توبہ و اصلاح کی مہلت دے رہے ہیں لیکن یہ اپنی بدبختی سے اس مہلت سے فائدہ اٹھانے کے بجائے یہ سمجھتے ہیں کہ یہ محض ایک دھونس ہے اور پیغمبر کا مذاق اڑاتے ہیں کہ عذاب آنے والا ہے تو آ کیوں نہیں جاتا، کس چیز نے اس کو باندھ رکھا ہے۔ فرمایا کہ ان کی اس جسارت اور بدبختی پر افسوس ہے۔ جس دن وہ عذاب ظاہر ہوگا، کسی کی یہ طاقت نہ ہوگی کہ وہ اس کو ان سے ہٹا سکے، نہ یہ خود اس کے رخ کو موڑ سکیں گے اور نہ ان کے شرکا و شفعاء اس وقت ان کی کچھ مدد کر سکیں گے، وہ عذاب ان کو اپنے گرداب میں لے لے گا جس کو یہ دل لگی سمجھتے اور جس کا مذاق اڑا رہے ہیں۔

ایک خاص اسلوبِ کلام

وَلَئِنْ اَذَقْنَا الْاِنْسَانَ ...... اِنَّهٗ لَفَرِحٌ فَخُوْرٌ۔ یہاں لفظ انسان اگرچہ عام ہے لیکن اس سے مراد وہی لوگ ہیں جن کا ذکر اوپر سے آ رہا ہے۔ ضدی اور جھگڑالو مخاطب سے جب منہ پھیر لینا مقصود ہوتا ہے تو بسا اوقات یہ طریقہ اختیار کیا جاتا ہے کہ اس کو خطاب کر کے یا اس کی طرف اشارہ کر کے بات کہنے کے بجائے ایک کلیہ کے اسلوب میں بات کہہ دی جاتی ہے جس سے اعراض کا مقصد بھی پورا ہو جاتا ہے اور بات بھی ایک کلیہ کا جامہ اختیار کر لینے کی وجہ سے زیادہ مؤثر اور جاندار ہو جاتی ہے۔ یہی اسلوب تقریر یہاں اختیار کیا گیا ہے اور اس کی نہایت بلیغ مثالیں آگے آئیں گی۔ اس اسلوب کے فوائد پر ان شاء اللہ ہم کسی موزوں مقام پر بحث کریں گے۔

پیغمبر کو صبر کی تلقین

مطلب یہ ہے کہ اس وقت اللہ نے ان کو جو اپنے رزق و فضل سے نواز رکھا ہے تو یہ اس کے شکرگزار ہونے کے بجائے بدمستی میں اس کی تذکیر و تنبیہ کا مذاق اڑا رہے ہیں۔ ان کو عذاب سے ڈرایا جاتا ہے تو ڈرنے کے بجائے ڈھیٹ ہو کر عذاب کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ ان کی اس حالت پر صبر کرو اور ان کو نظر انداز کرو، عام طور پر لوگوں کا حال یہی ہوتا ہے کہ جب اللہ ان کو اپنے فضل سے نوازتا ہے تو وہ اس کے شکرگزار ہونے کے بجائے اکڑتے اور رونتا نے ہیں اور جب ذرا خدا کی گرفت میں آ جاتے ہیں تو فوراً دل شکستہ اور مایوس ہو جاتے ہیں۔ آج ان کے طنطنہ اور غرہ کا یہ حال ہے کہ اپنے آگے کسی کو خاطر ہی میں نہیں لا رہے ہیں لیکن اس طنطنہ کی کوئی بنیاد نہیں ہے، قدرت ذرا سا جھنجھوڑ دے تو دیکھو کیسے بلبلا اٹھتے ہیں۔

خدا کے پسندیدہ بندوں کی روش

اِلَّا الَّذِيْنَ صَبَرُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ..... الاٰیۃ یہ ان لوگوں کا بیان ہے جو مذکورہ عام کلیہ سے مستثنیٰ ہیں، یہ وہ لوگ ہیں جو کسی آزمائش اور مصیبت میں گرفتار ہوتے ہیں تو اللہ سے مایوس و دل شکستہ ہونے کے بجائے اس کی رحمت کی امید پر صابر و مطمئن رہتے ہیں اور جب اس کے فضل و نعمت سے نوازے جاتے ہیں تو اکڑنے اور مغرور ہونے کے بجائے اس کے شکرگزار رہتے اور نیک عمل کرتے ہیں، مصیبت ان کی صبر کی صفت کو مستحکم کرتی ہے اور نعمت ان کے لیے شکر اور اعمال صالحہ کی راہیں کھولتی ہے۔ یہی لوگ انسانیت کے گل سرسبد ہیں اور ان کے لیے اللہ کے ہاں مغفرت اور اجر عظیم ہے۔ رہے وہ لوگ جنھوں نے مصائب سے مایوسی کا

اور نعمتوں سے غرور و تکبر کا اندوختہ فراہم کیا ہے تو یہ اپنے اس اندوختہ سمیت جہنم کا ایندھن بنیں گے۔

فَلَعَلَّكَ تَارِكٌۢ بَعْضَ مَا يُوْحٰٓى اِلَيْكَ وَضَآئِقٌۢ بِهٖ صَدْرُكَ اَنْ يَّقُوْلُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ كَنْزٌ اَوْ جَآءَ مَعَهٗ مَلَكٌ ۭ اِنَّمَآ اَنْتَ نَذِيْرٌ ۭ وَاللّٰهُ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ وَّكِيْلٌ (۱۲)

پیغمبرؐ کو تسلی

یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تسلی ہے کہ تم ان لوگوں کے رویے سے برداشتہ خاطر ہو کر اپنے فرض کی ادائیگی میں ذرا ڈھیلے نہ پڑنا۔ اگر یہ تمہیں خدا کا رسول ماننے کے لیے یہ شرط ٹھہراتے ہیں کہ تمہارے پاس بہت بڑا خزانہ ہو یا تمہارے ساتھ کوئی فرشتہ تمہاری رسالت کی گواہی دیتا پھرے تو اس قسم کے احمقانہ مطالبات تمہارے لیے وجہ پریشانی نہ ہوں۔ تم صرف ان کے لیے نذیر بنا کر بھیجے گئے ہو، ان پر داروغہ مقرر کر کے نہیں بھیجے گئے ہو کہ لازماً ان کو تم ہدایت کے راستہ پر کر ہی دو۔ انذار کا فرض ادا کر دینے کے بعد تمہاری ذمہ داری ختم ہو جاتی ہے۔ اگر لاطائل مطالبات کو بہانہ بنا کر یہ لوگ حقیقت سے گریز کرنا چاہتے ہیں تو معاملہ اللہ کے حوالے کرو۔ وہ ہر چیز کو دیکھ رہا ہے۔ تمہاری جانفشانیاں بھی اس کے سامنے ہیں اور ان کی شرارتیں بھی۔ وہ ان کو جس چیز کا مستحق پائے گا وہی ان کے ساتھ کرے گا اور جب کرے گا تو کوئی اس کا ہاتھ پکڑنے والا نہ بن سکے گا ـــــ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ اس قسم کی ہدایات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دینے کی وجہ یہ نہیں تھی کہ آپ وحی الٰہی کے کسی حصہ کی تبلیغ سے ہچکچا رہے تھے یا اس کو چھوڑ دینا چاہتے تھے بلکہ یہ حالات کی شدت اور ان کے سبب سے آپ کی پریشانی کے پیش نظر آپ کو اپنے موقف پر استقامت کی تلقین اور اپنی ذمہ داری کو اس کے حدود ہی تک محدود رکھنے کی ہدایت ہے۔ اس قسم کے مواقع میں خطاب میں جو ذرا تیزی ہوتی ہے اس کا رخ، جیسا کہ ہم بارہا ظاہر کر چکے ہیں، اصلاً پیغمبرؐ کی طرف نہیں ہوتا بلکہ ان معاندین کی طرف ہوتا ہے جن کا عناد اس ہدایت کا موجب ہوتا ہے۔

اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ۭ قُلْ فَاْتُوْا بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِهٖ مُفْتَرَيٰتٍ وَّادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (۱۳)

مخالفین قرآن کو متبادل کلام پیش کرنے کا چیلنج

یہ استفہام اظہار تعجب کی نوعیت کا ہے۔ اوپر کے اعتراضات تو سادہ اسلوب میں نقل کر دیے ہیں لیکن قرآن کو پیغمبر کی گھڑی ہوئی کتاب قرار دینا ایک نہایت عجیب بات تھی، بالخصوص ان لوگوں کی زبان سے جو کلام کے حسن و قبح کے نقاد اور اس کے اعجاز کے قدر دان بھی تھے اور موازنہ اور مقابلہ کے لیے ان کے پاس اپنے چوٹی کے شاعروں اور خطیبوں کے کلام کا ایک دفتر بھی موجود تھا۔ اس وجہ سے اس کا ذکر تعجب کے اسلوب میں فرمایا کہ اگر یہ بے شرم ہو کر یہ بات کہتے ہیں تو اس کا فیصلہ نہایت آسانی سے یوں ہو سکتا ہے کہ وہ بھی ایسی ہی دس سورتیں گھڑی ہوئی پیش کر دیں اور اگر یہ کام تنہا ان کے بس کا نہ ہو تو اپنے ان شرکاء اور شفعاء کو بھی اپنی مدد کے لیے بلا لیں جن کو یہ اللہ کے سوا پوجتے ہیں۔

'اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ' میں ایک مفہوم تو یہ ہے کہ اگر تم اپنے اس دعوے میں سچے ہو کہ جن کو تم پوجتے ہو یہ خدا کے شریک ہیں۔ اگر یہ خدا کے شریک ہیں تو یہ سب سے زیادہ اہم موقع ہے کہ وہ قرآن کی نظیر پیش کرنے میں تمہاری مدد کریں۔ اس لیے کہ اس قرآن کی بدولت سب سے زیادہ خطرے میں خود ان کی خدائی ہے۔

دوسرا مفہوم اس کے اندر یہ ہے کہ اگر تم اپنے اس گمان میں سچے ہو کہ یہ قرآن محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی اپنی تصنیف ہے جس کو وہ لوگوں کو مرعوب کرنے کے لیے جھوٹ موٹ خدا کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ سورۂ طور میں ہے:

أَمْ يَقُولُونَ تَقَوَّلَهُ بَلْ لَا يُؤْمِنُونَ ۝ فَلْيَأْتُوا بِحَدِيثٍ مِثْلِهِ إِنْ كَانُوا صَادِقِينَ ۳۳-۳۴ (کیا وہ کہتے ہیں کہ اس کو گھڑ لیا ہے بلکہ وہ ایمان نہیں لانا چاہتے۔ اگر وہ اپنے اس گمان میں سچے ہیں تو اس کے مانند کوئی کلام خود پیش کر دیں) اس آیت سے یہ بات بھی نکلتی ہے کہ جو لوگ اس کو گھڑی ہوئی چیز قرار دیتے تھے یہ ان کے دل کی آواز نہیں تھی بلکہ یہ محض ایمان نہ لانے کا ایک بہانہ تراشا گیا تھا۔

تحدی کی نوعیت

اس سورہ میں ان سے دس سورتوں کا مطالبہ کیا گیا ہے۔ سورۂ یونس آیت ۳۸ میں ایک ہی سورہ کا مطالبہ کیا گیا ہے۔ بقرہ آیت ۲۳ میں بھی ایک ہی سورہ کا مطالبہ ہے۔ بنی اسرائیل آیت ۸۸ میں 'مثلِ قرآن' کا مطالبہ ہے اور سورۂ طور کی مذکورہ بالا آیت میں 'بِحَدِيثٍ مِثْلِهِ' کے الفاظ ہیں جس کا واضح مفہوم یہی معلوم ہوتا ہے کہ مراد قرآن کی مانند کلام ہے۔ عام اس سے کہ وہ ایک سورہ کی شکل میں ہو یا دس سورتوں کی شکل میں، یا قرآن و کتاب کی شکل میں۔ عام طور پر لوگوں نے ان مختلف آیتوں کو سامنے رکھ کر اس تحدی کی ایک تدریج و ترتیب قائم کی ہے کہ پہلے ان سے مانند قرآن کتاب پیش کرنے کا مطالبہ کیا گیا، جب وہ اس سے عاجز رہے تو دس سورتوں کا مطالبہ کیا گیا، جب وہ اس سے بھی قاصر رہے تو ادنیٰ درجہ میں ان سے ایک ہی سورہ پیش کرنے کا مطالبہ کیا گیا، لیکن وہ اس کا بھی حوصلہ نہ کر سکے۔ اگرچہ یہ بات بظاہر اچھی معلوم ہوتی ہے لیکن اس کی صحت کا انحصار اس امر پر ہے کہ جن سورتوں میں یہ تحدی مذکور ہوئی ہے ان کا زمانۂ نزول تعین کے ساتھ معلوم ہو۔ چونکہ یہ معاملہ مشکل ہے اس وجہ سے ہمارے نزدیک صائب رائے یہ ہے کہ قرآن نے شروع ہی میں، جیسا کہ سورۂ طور کی مذکورہ بالا آیت سے واضح ہوتا ہے، قرآن کے مانند کلام پیش کرنے کا مطالبہ کیا، خواہ وہ دس سورتوں کی شکل میں ہو یا ایک ہی سورہ کی شکل میں، بعد میں اسی اجمال کو حسب موقع مختلف الفاظ میں واضح فرمایا گیا۔ ہمارے نزدیک اس کو عام معنی میں تحدی سمجھنا بھی کچھ صحیح نہیں ہے۔ تحدی اور چیلنج کا سوال وہاں پیدا ہوتا ہے جہاں گمان ہو کہ حریف میدان مقابلہ میں اترنے اور قسمت آزمائی کا حوصلہ رکھتا ہے۔ جب یہ واضح ہو کہ حریف کی ساری مشیخت محض حقیقت سے گریز و فرار کے لیے ایک بہانہ ہے تو اس کو ایک خاص اہتمام کے ساتھ چیلنج کرنے کے بجائے یہ بہتر ہوتا ہے کہ پہلا ہی وار اس کے لیے بھرپور ہو۔

فَإِلَّمْ يَسْتَجِيبُوا لَكُمْ فَاعْلَمُوا أَنَّمَا أُنْزِلَ بِعِلْمِ اللَّهِ وَأَنْ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ ۚ فَهَلْ أَنْتُمْ مُسْلِمُونَ (۱۴)

'اِسْتَجَابَ لَهٗ' کے معنی ہیں: اس کے سوال کا جواب دیا یا اس کی حاجت پوری کی۔ خدا کے تعلق سے یہ لفظ آئے تو اس کے معنی ہوں گے: اس کی دعا قبول کی۔

مخالفینِ قرآن پر اتمامِ حجت

اوپر والی آیت میں بات بالواسطہ کہی گئی تھی اس میں ان کو براہ راست خطاب کر کے فرمایا کہ اگر تمہارے یہ شفعاء و شرکاء قرآن کا جواب پیش کرنے کی مہم میں تمہاری حاجت روائی کے لیے نہ اٹھیں تو پھر یہ مانو کہ یہ

کتاب علم الٰہی کا فیضان ہے جیسا کہ پیغمبر کہتے ہیں، نہ کہ ان کی گھڑی ہوئی، جیسا کہ تم الزام لگاتے ہو۔ اَنَّمَآ اُنْزِلَ بِعِلْمِ اللّٰہِ سے یہ بات واضح ہوتی کہ قرآن کے اعجاز کا اصل پہلو یہ ہے کہ وہ جس علم و معرفت کا خزانہ ہے وہ خزانہ خدا کے سوا کوئی اور بخش ہی نہیں سکتا۔ وَاَنْ لَّآ اِلٰـہَ اِلَّا ھُوَ، یہ دوسرا بدیہی نتیجہ ہے جو اس کا جواب پیش کرنے سے قاصر رہنے کی صورت میں نکلتا ہے۔ وہ یہ کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے اور تم جن کو معبود بنائے بیٹھے ہو، یہ محض خیالی چیزیں ہیں جن کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ اگر ان کی کوئی حقیقت ہے تو یہ وقت ہے کہ وہ تمھاری اور خود اپنی عزت بچانے کے لیے کچھ جوہر دکھائیں۔ اگر اس نازک موقع پر بھی ان کی غیرت جوش میں نہیں آتی تو پھر آخر وہ کس مرض کی دوا ہیں۔ فَھَلْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ کے اسلوب بیان میں تشویق و ترغیب کا پہلو بھی ہے اور زجر و ملامت کا بھی۔ مطلب یہ ہے کہ تمھیں اپنی بات ثابت کرنے کے لیے پورا موقع حاصل ہے، تم اس کے لیے اپنے معبودوں کو بھی مدد کے لیے بلا سکتے ہو لیکن اس سب کے بعد بھی اگر تم کچھ نہ کر سکے تو بتاؤ اسلام لانے والے بنتے ہو؟

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَزِيْنَتَهَا نُوَفِّ اِلَيْهِمْ اَعْمَالَهُمْ فِيْهَا وَهُمْ فِيْهَا لَا يُبْخَسُوْنَ ۝ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَيْسَ لَهُمْ فِى الْاٰخِرَةِ اِلَّا النَّارُ ۖ وَحَبِطَ مَا صَنَعُوْا فِيْهَا وَبٰطِلٌ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (۱۵-۱۶)

وسعت رزق کے مغالطہ کی تردید

اوپر آیت ۱۲ میں کفار کے اس طعنہ کا حوالہ گزر چکا ہے کہ وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھیوں کی بے سروسامانی کو آپؐ کی رسالت کے خلاف بطور دلیل پیش کرتے تھے۔ ان کا گمان یہ تھا کہ جب ہم دنیوی اسباب و وسائل کے اعتبار سے ان سے نہایت بہتر حالت میں ہیں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ خدا کی نگاہوں میں بھی ہم ان سے بہتر ہیں، پھر ہم کو خدا کے غضب اور اس کے عذاب سے ڈرانے کے کیا معنی؟ اگر ہم خدا کے مبغوض و معتوب ہوتے تو کیا اس کا نتیجہ یہی نکلنا تھا کہ یہ جوتیاں چٹخاتے پھرتے اور ہم عیش کرتے؟ پھر تو یہ ہونا تھا کہ یہ خزانے لٹاتے اور ہم ان کی جوتیاں سیدھی کرتے۔ ان دونوں آیتوں میں ان کے اسی مغالطے کا جواب دیا ہے۔ فرمایا کہ یہ دنیا اور اس کی زینتیں نیک اعمال کے صلہ کے طور پر نہیں ملتیں کہ جو نیک اعمال نہ کریں وہ ان سے محروم رہیں۔ یہ دنیا تو نیک اور بد دونوں کو ملتی ہے البتہ جو دنیا ہی کے طالب ہوتے ہیں، آخرت کی جن کو کوئی پروا نہیں ہوتی ان کا سارا کھاتا یہیں بے باق کر دیا جاتا ہے، آخرت میں ان کے لیے دوزخ کے سوا کچھ نہیں بچ رہتا۔ چونکہ وہ کوئی کام آخرت کو مقصود بنا کر نہیں کرتے اس وجہ سے آخرت میں ان کے سارے اعمال حبط ہو جائیں گے۔ دنیا آخرت کے بغیر مجرد باطل رہ جاتی ہے اور اس باطل کو مقصود قرار دے کر جو کچھ بھی کیا جاتا ہے سب باطل ہوتا ہے اگرچہ وہ بظاہر نیکی ہی کے کام کیوں نہ ہوں۔ یہ مضمون قرآن میں جگہ جگہ بیان ہوا ہے۔ سورۂ بنی اسرائیل میں یہی مضمون اس طرح بیان ہوا ہے۔ مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعَاجِلَةَ عَجَّلْنَا لَهٗ فِيْهَا مَا نَشَآءُ لِمَنْ نُّرِيْدُ ثُمَّ جَعَلْنَا لَهٗ جَهَنَّمَ ۚ يَصْلٰىهَا مَذْمُوْمًا

مَّدْحُوْرًا ۝ وَمَنْ اَرَادَ الْاٰخِرَةَ وَسَعٰى لَهَا سَعْيَهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ كَانَ سَعْيُهُمْ مَّشْكُوْرًا ۝ كُلًّا نُّمِدُّ هٰٓؤُلَآءِ وَهٰٓؤُلَآءِ مِنْ عَطَآءِ رَبِّكَ وَمَا كَانَ عَطَآءُ رَبِّكَ مَحْظُوْرًا (۱۸-۲۰) (جو دنیا ہی کے طالب ہوتے ہیں ہم ان کو یہیں دے دیتے ہیں جو دنیا چاہتے ہیں، پھر ہم نے ان کے لیے جہنم تیار کر رکھی ہے جس میں وہ ذلیل اور راندہ ہو کر پڑیں گے اور جو آخرت کے طالب بنتے ہیں اور ایمان و اخلاص کے ساتھ اس کے لیے اس کے شایانِ شان کوشش بھی کرتے ہیں، وہی لوگ ہیں جن کی کوشش مقبول ہوگی، ہم تیرے رب کی بخشش سے دونوں کو فیض یاب کرتے ہیں، اُن کو بھی اور ان کو بھی اور تیرے رب کی بخشش کسی پر بھی بند نہیں ہے) ان آیات میں 'مَا نَشَآءُ لِمَنْ نُّرِيْدُ' کے الفاظ سے یہ حقیقت واضح ہوتی کہ دنیا کے طالبوں کو بھی اتنا ہی ملتا ہے جتنا خدا چاہتا ہے اور انہی کو ملتا ہے جن کو خدا دینا چاہتا ہے، یہ نہیں کہ جو دنیا کا طالب بن جائے وہ جتنا چاہے سمیٹ لے۔ ان کے معاملے میں بھی جو کچھ ہوتا ہے خدا ہی کے اختیار اور اسی کی حکمت کے تحت ہوتا ہے۔ اسی طرح 'وَسَعٰى لَهَا سَعْيَهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ' کے الفاظ یہ حقیقت واضح کرتے ہیں کہ طلب آخرت بھی اللہ کے ہاں وہ معتبر ہے جو ایمان و اخلاص کے ساتھ ہو اور جس کے ساتھ آخرت کے شایانِ شان عملی جدوجہد بھی پائی جاتی ہو۔ اگر اس میں ریا اور شرک کی کوئی آلودگی شامل ہو، یا محض زبان کے بھاگ کے بل پر جنت کو جیتنے کے خواب دیکھے جا رہے ہوں تو ان لذیذ خوابوں کی خدا کے ہاں کوئی قدر و قیمت نہیں ہے۔

اَفَمَنْ كَانَ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّهٖ وَيَتْلُوْهُ شَاهِدٌ مِّنْهُ وَمِنْ قَبْلِهٖ كِتٰبُ مُوْسٰٓى اِمَامًا وَّرَحْمَةً ؕ اُولٰٓئِكَ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ ؕ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِهٖ مِنَ الْاَحْزَابِ فَالنَّارُ مَوْعِدُهٗ ۚ فَلَا تَكُ فِيْ مِرْيَةٍ مِّنْهُ ۚ اِنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يُؤْمِنُوْنَ (۱۷)

مخالفین قرآن کی اصل بیماری

اب یہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی جا رہی ہے کہ جو لوگ قرآن سے گریز و فرار کے لیے یہ بہانے تراش رہے ہیں ان کی اصل بیماری یہ ہے کہ ان کی فطرت کا نور بجھ چکا ہے اور جن کی فطرت کا نور بجھ چکا ہو وہ قرآن پر ایمان لانے والے نہیں بن سکتے۔ اس پر ایمان لانے والے وہی بنیں گے جن کی فطرت مسخ ہونے سے محفوظ ہو۔ وہ بے شک پہلے سے بنیادی حقائق کے باب میں اپنے اندر ایک دلیل و برہان رکھتے ہیں، پھر جب اس کے بعد اوپر سے بھی قرآن کی شکل میں ان کے سامنے ایک شہادت آ جاتی ہے تو وہ انھیں بعینہٖ اپنے دل کی آواز معلوم ہوتی ہے۔ وہ محسوس کرتے ہیں کہ جو کچھ وہ اپنے دل میں پا رہے ہیں اس کی تائید و تصدیق اس آسمانی شاہد کی زبان سے بھی ہو رہی ہے۔

اس طرح کے استفہامیہ جملوں میں بعض اوقات مقابل جملہ حذف کر دیا جاتا ہے جو قرینہ سے سمجھا جاتا ہے۔ گویا پوری بات یوں ہوگی کہ کیا وہ لوگ جن کے سامنے یہ یہ روشنیاں ہیں اور وہ لوگ جو ان تمام روشنیوں سے محروم ہیں، قرآن پر ایمان لانے کے معاملے میں یکساں ہوں گے؟ یہ نہیں ہو سکتا۔ اس پر

ایمان وہی لوگ لائیں گے جو نورِ فطرت سے بہرہ مند ہیں اور اس امر سے بھی آشنا ہیں کہ اس سے پہلے اسی طرح کی کتاب ہدایت و رحمت بن کر موسیٰؑ پر بھی اتر چکی ہے۔ اس طرح کے لوگوں کے لیے قرآن بے شک ایک مانوس چیز ہے۔ وہ جب اس کو سنتے ہیں تو محسوس کرتے ہیں کہ جو کچھ وہ اپنے صحیفۂ فطرت میں پا رہے تھے اسی کی تصدیق و تائید خدا کی طرف سے ایک شاہد کے ذریعہ سے بھی سامنے آگئی۔ چنانچہ ایسے ہی لوگ ہیں جو اس پر ایمان لائیں گے۔ مطلب یہ ہے کہ جو لوگ اس کی مخالفت میں طرح طرح کی باتیں بنا رہے ہیں ان کی محرومی کے اسباب خود ان کے اندر موجود ہیں۔ ان کی دل کی آنکھیں اندھی ہو چکی ہیں۔ ان سے کسی خیر کی امید نہ رکھو۔

'بیّنۃ' سے مراد نورِ فطرت ہے

'بَیِّنَۃ' کے معنی روشن دلیل اور واضح حجت کے ہیں۔ یہاں اس سے مراد، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، وہ نورِ فطرت ہے جو حق و باطل اور خیر و شر کے مبادی کے امتیاز کے لیے خدا نے خود ہمارے اندر ودیعت فرمایا ہے۔ جن کی فطرت خارج کے برے اثرات سے جتنی ہی محفوظ ہوتی ہے ان کے اندر یہ نور اتنا ہی قوی ہوتا ہے۔ چنانچہ حضرات انبیاءؑ اس سے کامل طور پر بہرہ مند ہوتے ہیں۔ ان کا باطن وحی کے نور سے منور ہونے سے پہلے بھی اس نور سے نورانی ہوتا ہے۔ ان کے لیے وحی کی حیثیت تاریکی پر روشنی کی نہیں بلکہ، جیسا کہ سورۂ نور میں ارشاد ہوا ہے، 'نُوْرٌ عَلٰی نُوْرٍ' یعنی روشنی پر روشنی کی ہوتی ہے۔ آگے اسی سورہ کی آیات ۲۸ - ۶۳ - ۸۸ میں بھی یہ لفظ اسی مفہوم میں آیا ہے۔ عام لوگوں میں سے جو لوگ انبیاءؑ کی دعوت قبول کرنے میں سبقت کرتے ہیں وہ بھی علیٰ فرق مراتب اس نور سے بہرہ مند ہوتے ہیں اور جس کے اندر یہ نور جتنا ہی قوی ہوتا ہے وہ اسی اعتبار سے ان کی طرف سبقت بھی کرتا ہے اور اسی نسبت سے ان کا دست و بازو بھی بنتا ہے۔ اس کے بالکل برعکس حال ان لوگوں کا ہوتا ہے جو اپنی شامت اعمال سے اس نور کو بجھا کر 'ظُلُمٰتٌ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ' کے گرداب میں پھنس جاتے ہیں۔

ضمیروں کے باب میں ایک خاص اسلوب

یہاں یہ بات بھی یاد رکھیے کہ اس طرح کے الفاظ کے معاملہ میں جن کی تانیث غیر حقیقی ہوتی ہے، یہ ضروری نہیں ہوا کرتا کہ ان کے لیے ضمیر لانے میں لفظ کے ظاہر کا لحاظ کیا جائے بلکہ ضمیر مذکر بھی لا سکتے ہیں اگر لفظ کا اصل مصداق مذکر ہو۔ چنانچہ یہاں 'یَتْلُوْهُ' میں اس کے لیے ضمیر مذکر ہی آئی ہے اس لیے کہ اس سے مراد درحقیقت وہی چیز ہے جس کے لیے قرآن کے دوسرے مقامات میں 'نور'، 'برھان'، اور 'سلطان'، وغیرہ کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔

'وَیَتْلُوْهُ شَاهِدٌ مِّنْهُ' 'تلا یتلو' کے معنی یہاں کسی چیز کے بعد اور پیچھے آنے کے ہیں اور 'مِنْهُ' میں ضمیر کا مرجع اللہ تعالیٰ ہے۔ اس نے اپنے فضل سے پہلے تو ہماری فطرت کے اندر وہ سب کچھ ودیعت فرما دیا جس کی قرآن دعوت دیتا ہے پھر اپنے مزید فضل سے اس نے لسان غیب کے ذریعے سے اس سارے ریکارڈ کو ہمیں سنا بھی دیا تاکہ کسی کے لیے کوئی عذر باقی نہ رہ جائے۔ 'شاھد' سے مراد یہاں وہ وحی الٰہی

ہے جس کا مظہر قرآن ہے، جس کے لانے والے جبرائیل امین اور جس کے حامل پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ حضرت ابن عباسؓ نے 'شَاهِدٌ' سے جبرائیل امین کو مراد لیا ہے۔ ہمارے نزدیک یہ بات صحیح ہے۔ وحی قرآن، جبرائیل اور پیغمبر میں فرق صرف تعبیر کا ہے۔ خدا کے شاہد ہونے کے اعتبار سے ان میں کوئی خاص فرق نہیں ہے۔ چنانچہ قرآن میں یہ لفظ ان سب کے لیے استعمال ہوا ہے۔

قرآن کے حق میں پہلے کی شہادت

'وَمِنْ قَبْلِهٖ كِتٰبُ مُوْسٰٓى اِمَامًا وَّرَحْمَةً'، یعنی پہلے کی شہادتوں میں سے یہ شہادت بھی قرآن کی تصدیق وتائید کے لیے ان کے سامنے موجود ہے کہ اسی طرح کی ایک کتاب، اسی طرح کی تعلیمات و ہدایات بلکہ اس کی اور اس کے حامل کی پیشین گوئیوں کے ساتھ اس سے پہلے امام اور رحمت بن کر موسیٰؑ پر بھی اتر چکی ہے۔ 'امام' اور 'رحمت' کے الفاظ یہاں اسی طرح آئے ہیں جس طرح بعض دوسرے مقامات میں 'ھدی' اور 'رحمت' کے الفاظ آئے ہیں۔ یہاں 'ھدی' کے مفہوم کو 'امام' کے لفظ سے تعبیر فرمایا ہے اس لیے کہ رہنمائی کا مضمون دونوں لفظوں کے اندر یکساں موجود ہے۔ ہم نے دوسرے مقام میں ان دونوں لفظوں کی تشریح کی ہے کہ یہ آغاز و انجام کے اعتبار سے استعمال ہوئے ہیں۔ یعنی یہ کتاب اس دنیا میں صراط مستقیم کی ہدایت و رہنمائی ہے اور جو لوگ اس ہدایت و رہنمائی کو قبول کرلیں ان کے لیے آخرت میں ابدی فضل و رحمت کا پیش خیمہ ہے۔

یہود کی بدبختی کی طرف اشارہ

یہاں ایک لطیف اشارہ بھی قابل توجہ ہے۔ اس سورہ میں مخاطب چونکہ اصلاً قریش ہیں اس وجہ سے یہ گمان ہوتا ہے کہ ان کے لیے کتاب موسیٰ کی نظیر کچھ زیادہ مؤثر نہیں ہوسکتی تھی۔ لیکن یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ قریش اول تو مذہبی علم و فضل کے اعتبار سے اہل کتاب کے معترف تھے ثانیاً یہاں قرآن ایک ہلکا سا اشارہ ان یہود کی طرف بھی کر دینا چاہتا ہے جن کو ایک 'امام و رحمت' کتاب کے حامل ہونے کے سبب سے قرآن کی طرف سب سے پہلے سبقت کرنے والا بننا تھا لیکن وہ سبقت کرنے کے بجائے اندر اندر اس کی مخالفت کے لیے سازشوں کی تیاریاں کر رہے تھے۔ قرآن نے ایک نہایت لطیف اشارے کی شکل میں ان کو توجہ دلادی کہ ان کے مرتبہ و مقام کا تقاضا کیا ہے اور اگر انھوں نے اس کے خلاف کیا تو وہ اپنے آپ کو کس گڑھے میں گرائیں گے۔

'اُولٰٓئِكَ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ' میں حصر کا مضمون پایا جاتا ہے۔ یعنی یہی لوگ جن کی خصوصیات اوپر بیان ہوئیں قرآن پر ایمان لائیں گے۔ اس سے یہ بات آپ سے آپ نکلی کہ جو لوگ قرآن کی مخالفت کر رہے ہیں ان خصوصیات سے محروم ہیں۔ چونکہ یہ بات کلام کے سیاق سے واضح تھی اس وجہ سے حذف کر دی گئی۔

خطاب پیغمبر سے عتاب دوسروں پر

'وَمَنْ يَّكْفُرْ بِهٖ مِنَ الْاَحْزَابِ فَالنَّارُ مَوْعِدُهٗ'۔ 'احزاب' کے لفظ میں ذرا وسعت ہے۔ قرآن نے اپنے سامنے کے مخالفین کے ساتھ ساتھ ان مخالفین کی طرف بھی ہلکا سا اشارہ کر دیا ہے جو ابھی اس مرحلے تک تو اگرچہ پردے کے پیچھے تھے لیکن بعد کے مراحل میں نہایت خطرناک دشمن بن کر سامنے آئے۔ یعنی اہل کتاب۔

فَلَا تَكُ فِيْ مِرْيَةٍ مِّنْهُ اِنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يُؤْمِنُوْنَ۔ یہ خطاب اگرچہ عام بھی

ہو سکتا ہے لیکن ہمارے نزدیک خطاب پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم ہی سے ہے۔ البتہ اس طرح کے جملوں میں جو حتہ ہوتا ہے اس کا رخ، جیسا کہ ہم دوسرے مقامات میں واضح کر چکے ہیں، مخالفین کی طرف ہوتا ہے لیکن وہ لائق التفات نہیں رہ جاتے اس وجہ سے ان کو خطاب کر کے بات براہ راست کہنے کی بجائے پیغمبر کو خطاب کر کے کہہ دی جاتی ہے۔ زجر و ملامت کا یہ اسلوب بسا اوقات براہ راست زجر و تنبیہ سے زیادہ مؤثر ثابت ہوتا ہے۔ قرآن میں اس کی نہایت دلآویز مثالیں موجود ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اگر یہ شامت زدہ لوگ اس واضح حقیقت کو جھٹلا رہے ہیں تو جھٹلائیں، ان کی اس روش سے تم کسی الجھن میں نہ پڑو۔ یہی حقیقت ہے اور یہ تمہارے رب کی طرف سے ہے لیکن اکثر لوگ اپنی بدبختی کے سبب سے ایمان نہیں لائیں گے۔

یہ مضمون سورۂ رعد کی آیت ۱۹ میں بیان ہوا ہے۔ وہاں ان شاء اللہ ہم اس کی مزید وضاحت کریں گے۔ سورۂ یونس کی آیات ۹۴ - ۹۵ کے تحت ہم جو کچھ لکھ آئے ہیں ایک نظر اس پر بھی ڈال لیجیے۔

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا ۭ اُولٰۗىِٕكَ يُعْرَضُوْنَ عَلٰي رَبِّهِمْ وَيَقُوْلُ الْاَشْهَادُ هٰٓؤُلَاۗءِ الَّذِيْنَ كَذَبُوْا عَلٰي رَبِّهِمْ ۚ اَلَا لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَي الظّٰلِمِيْنَ ۙ الَّذِيْنَ يَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَيَبْغُوْنَهَا عِوَجًا ۭ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ كٰفِرُوْنَ (۱۸ - ۱۹)

مشرکین کی بدبختی پر اظہار افسوس

یہی مضمون بعینہٖ اسی سیاق و سباق کے ساتھ سورۂ یونس کی آیات ۱۷-۱۸ میں گزر چکا ہے۔ وہاں تصریح ہے کہ قریش کو قرآن سے سب سے زیادہ چڑ اس کی دعوت توحید سے ہے۔ وہ اپنے دیوتاؤں کی مذمت سن کر آگ بگولا ہو جاتے اور پھر اس کے خلاف جو کچھ منہ میں آجاتا وہ بک ڈالتے۔ قرآن نے یہاں ان کے اسی اصل محرک مخالفت کو سامنے رکھ کر ان کی بدبختی اور محرومی پر افسوس کیا ہے کہ ان سے بڑھ کر بدقسمت اور اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والا کون ہو سکتا ہے جنھوں نے اللہ پر جھوٹ باندھا، یعنی اللہ کے سوا دوسری چیزوں کی پرستش کی اور ان کے متعلق بالکل جھوٹ موٹ، بلا کسی سند اور دلیل کے، یہ دعویٰ کیا ہے کہ خدا نے ان کو اپنا شریک بنایا ہے اور ان کی عبادت کا حکم دیا ہے۔ یہ سب سے بڑی بدقسمتی اس وجہ سے ہے کہ یہی چیز ان کی ابدی محرومی کا باعث ہوگی جب کہ قیامت کے دن ان کے سامنے یہ راز کھلے گا کہ جن کی انھوں نے زندگی بھر عبادت کی اور جن کی حمیت و حمایت میں اللہ کی کتاب کو جھٹلایا وہ سب ہوا ہو گئے اور معاملہ تنہا خدائے واحد و قہار سے پڑا۔

وَيَقُوْلُ الْاَشْهَادُ هٰٓؤُلَاۗءِ الَّذِيْنَ كَذَبُوْا عَلٰي رَبِّهِمْ۔ یہ شہادت انبیاؑ کی بھی ہو سکتی ہے، اس لیے کہ قرآن میں تصریح ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر نبی سے اس کی امت پر قیامت کے دن گواہی دلوائے گا کہ اس نے ان کو کیا تعلیم دی تھی اور انھوں نے اس میں کیا بگاڑ پیدا کیا، ان ہستیوں کی بھی ہو سکتی ہے جن کو معبود بنا کر پوجا گیا حالانکہ نہ انھوں نے اس کا حکم دیا اور نہ انھیں اس کی خبر ہوئی اور ان فرشتوں کی بھی ہو سکتی ہے جو ہر شخص کے سارے اعمال کا ریکارڈ رکھتے ہیں اور قیامت کے دن یہ سارا ریکارڈ سامنے آئے گا۔

اَلَا لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَي الظّٰلِمِيْنَ۔ یہ وہ منادی ہے جو گواہوں کی گواہی کے بعد ان مشرکین پر لعنت

کے لیے کی جائے گی۔ اور یہ لعنت ان کے لیے تمام مصیبتوں کا فتح باب ہو گی۔

مشرکین کے جرائم

الَّذِیْنَ یَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰہِ وَیَبْغُوْنَہَا عِوَجًا ط وَہُمْ بِالْاٰخِرَۃِ ہُمْ کٰفِرُوْنَ ۔ یہ ان ظالمین کی مزید صفات بیان کر دی گئیں تاکہ کلام مطابق حال بھی ہو جائے اور ان کے وہ جرائم بھی سامنے آ جائیں جو اس لعنت کے موجب ہوں گے۔ ان کا ایک جرم تو یہ ہے کہ انھوں نے دیدہ و دانستہ، حقیقت کے واضح ہونے کے باوجود، لوگوں کو اللہ کے راستے سے روکا اور دوسرا جرم یہ ہے کہ اس راستہ کو کج کرنے کی کوشش کی۔ بندوں کے لیے خدا تک پہنچنے کی راہ بالکل ہموار و مستقیم ہے، اس میں کج پیچ اور پگڈنڈیاں نہیں ہیں۔ بندہ اس راہ پر چلے تو براہ راست اپنے رب سے تعلق پیدا کر لیتا ہے لیکن ان ظالموں نے اس راہ میں بہت سے اڑنگے ڈال دیے۔ قدم قدم پر انھوں نے اس کا رخ مختلف تھانوں، استھانوں، دیویوں اور دیوتاؤں کی طرف موڑ دیا اور اس طرح لوگوں کو اصل شاہراہ توحید سے ہٹا کر گلیوں اور کوچوں میں ڈال دیا۔

'وَہُمْ بِالْاٰخِرَۃِ ہُمْ کٰفِرُوْنَ' میں مبتدا کے اعادے سے مقصود اس پر زور دینا ہے۔ یعنی آخرت کے اصلی منکر یہی ہیں۔ اول تو انھوں نے خلق کو اللہ کے راستہ سے روکنے کی کوشش کی اور یہ جسارت آخرت سے بالکل بے پروا ہوئے بغیر ممکن نہیں۔ دوسرے شرک بجائے خود آخرت کی نفی ہے اس لیے کہ شرکاء و شفعاء جب اپنے پجاریوں کو بہر حال بخشوا ہی لیں گے خواہ ان کے عقائد و اعمال کچھ ہی ہوں تو آخرت کا ہونا، نہ ہونا دونوں یکساں ہوا۔ آخرت کو صرف مان لینا مطلوب نہیں ہے بلکہ یہ ماننا ضروری ہے کہ وہ ہر ایک کے لیے بے لاگ انصاف کا دن ہو گا اور خدا کے آگے اس دن کسی کا زور نہیں چلے گا۔

اُولٰٓئِکَ لَمْ یَکُوْنُوْا مُعْجِزِیْنَ فِی الْاَرْضِ وَمَا کَانَ لَہُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰہِ مِنْ اَوْلِیَآءَ م یُضٰعَفُ لَہُمُ الْعَذَابُ ط مَا کَانُوْا یَسْتَطِیْعُوْنَ السَّمْعَ وَمَا کَانُوْا یُبْصِرُوْنَ (۲۰)

یعنی دنیا میں اللہ نے ان کو جو مہلت دی تو اس وجہ سے نہیں کہ وہ خدا کے قابو سے باہر تھے بلکہ یہ اس کی ڈھیل تھی کہ وہ توبہ اور اصلاح کرنا چاہیں تو توبہ اور اصلاح کر لیں ورنہ اپنا پیمانہ اچھی طرح بھر لیں۔ ان کا یہ زعم بھی بالکل بے حقیقت تھا کہ ان کے کچھ اولیاء اور مددگار ہیں جو خدا کی پکڑ سے ان کو بچا سکتے ہیں۔ اب سارے حقائق ان کے سامنے آ گئے۔ اب یہ اپنے کیے کی سزا بھگتیں گے اور چونکہ یہ خدا کی راہ سے صرف خود ہی نہیں رکے بلکہ دوسروں کو بھی روکنے والے بنے اس وجہ سے یہ دوہرے عذاب کے مستحق ٹھہریں گے۔ مَا کَانُوْا یَسْتَطِیْعُوْنَ السَّمْعَ وَمَا کَانُوْا یُبْصِرُوْنَ ۔ یعنی نفرت اور بیزاری کی شدت کے سبب سے نہ تو یہ اللہ اور رسول کی باتیں سننے ہی کے لیے تیار ہوتے تھے اور نہ محبت دنیا کا پردہ اللہ کی نشانیاں دیکھنے کے لیے ان کی آنکھیں ہی کھلنے دیتا تھا۔

اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَہُمْ وَضَلَّ عَنْہُمْ مَّا کَانُوْا یَفْتَرُوْنَ ۔ لَا جَرَمَ اَنَّہُمْ فِی الْاٰخِرَۃِ ہُمُ الْاَخْسَرُوْنَ (۲۱-۲۲)

ظاہر ہے کہ جن لوگوں نے اس طرح اپنی صلاحیتیں برباد کیں انھوں نے اپنے آپ

کو خود اپنے ہی ہاتھوں برباد کیا اور جن کی مدد اور شفاعت کے اعتماد پر یہ خطرناک کھیل کھیلے ان میں سے کوئی ان کے کام آنے والا نہ بنے گا اس لیے کہ خدا پر افترا کر کے محض اپنے ذہن سے جو خیالی معبود انھوں نے گھڑے وہ سب بے حقیقت ثابت ہوں گے ظاہر ہے کہ آخرت کی نامرادی ایسے ہی عقل و بصیرت سے محروم لوگوں کے حصے میں آئے گی۔

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَأَخْبَتُوا إِلَىٰ رَبِّهِمْ أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ الْجَنَّةِ ۖ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ (۲۳)

اہل ایمان کے فضائل

اب یہ کفار و مشرکین کے مقابل گروہ یعنی اہل ایمان کے انجام کا ذکر ہے۔ 'وَأَخْبَتُوا إِلَىٰ رَبِّهِمْ' کے معنی 'اطْمَأَنُّوا إِلَى اللهِ وَتَخَشَّعُوا أَمَامَهُ' کے ہیں۔ یعنی ہر ایک سے کٹ کر اپنے رب کی طرف پوری دل جمعی اور کامل یک سوئی کے ساتھ وہ جھک پڑے۔ اوپر مشرکین کا حال تو یہ بیان ہوا ہے کہ وہ اپنے کبر و غرور کے سبب سے نہ اپنے کان ہی کھولنے کے لیے تیار ہوئے نہ اپنی آنکھیں ہی لیکن ان لوگوں نے ایمان و عمل صالح کی روش اختیار کی اور خلق خدا کو اللہ کی صراط مستقیم سے ہٹانے اور اس کو مختلف وادیوں میں ہرزہ گردی کرانے کے بجائے پوری یکسوئی و فروتنی کے ساتھ اپنے آپ کو اپنے خالق و پروردگار کے آگے ڈال دیا۔ فرمایا کہ یہی لوگ جنت کے وارث ہوں گے اور اس میں ہمیشہ رہیں گے ایک مرتبہ اس میں داخل ہو جانے کے بعد پھر اس سے کبھی محروم نہیں ہوں گے۔

مَثَلُ الْفَرِيقَيْنِ كَالْأَعْمَىٰ وَالْأَصَمِّ وَالْبَصِيرِ وَالسَّمِيعِ ۚ هَلْ يَسْتَوِيَانِ مَثَلًا ۚ أَفَلَا تَذَكَّرُونَ (۲۴)

اوپر کفار کی حالت بیان ہو چکی ہے کہ 'مَا كَانُوا يَسْتَطِيعُونَ السَّمْعَ وَمَا كَانُوا يُبْصِرُونَ'، کہ ان کے ہوش کے کان اور ان کی بصیرت کی آنکھیں بند ہو چکی تھیں اس وجہ سے وہ قرآن کو سننے اور اللہ کی نشانیوں کے مشاہدہ سے محروم رہے۔ اس کے برعکس اہل ایمان نے اپنی آنکھیں بھی کھلی رکھیں اور اپنے کان بھی۔ فرمایا کہ ان دونوں گروہوں کی تمثیل یہ ہے کہ ایک اندھا اور بہرا ہو اور دوسرا بینا اور شنوا تو دونوں کا رویہ قرآن کے باب میں ایک سا کس طرح ہو سکتا ہے؟ قرآن کی دعوت سرتاسر عقل و بصیرت پر مبنی ہے، اس پر ایمان وہی لوگ لائیں گے جن کے کان اور دل کھلے ہوں اور جنھوں نے بخشی ہوئی فطری صلاحیتیں اپنی محفوظ رکھی ہوں۔

۲۔ آگے کا مضمون ــــــ آیات ۲۵-۹۹

آگے آیت ۹۹ تک ایک تاریخی ترتیب کے ساتھ پچھلے رسولوں اور ان کی قوموں کی سرگزشتیں سنائی گئی ہیں۔ ان کے سنانے سے مقصود ایک طرف تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ دکھانا ہے کہ آج جو کچھ تمھیں پیش آ رہا ہے بعینہٖ وہی کچھ تم سے پہلے آنے والے رسولوں کو بھی پیش آ چکا ہے، تو تم ان کی زندگیوں سے رہنمائی حاصل کرو اور جس طرح انھوں نے صبر و عزیمت کے ساتھ حالات کا مقابلہ کیا اسی طرح تم بھی حالات کا مقابلہ کرو۔ دوسری طرف قریش کو یہ دکھانا ہے کہ تم نے جو روش اپنے رسول کے ساتھ اختیار کی ہے وہی

روش تمہاری پیش رو قوموں نے بھی اختیار کی تھی جس کے نتیجہ میں ایک خاص حد تک مہلت دیے جانے کے بعد وہ ہلاک کر دی گئیں تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ جس طرح کا معاملہ اللہ تعالیٰ نے ان کے ساتھ کیا اسی طرح کا معاملہ وہ تمہارے ساتھ نہ کرے۔ اس روشنی میں آگے کی آیات تلاوت فرمائیے۔

آیات ۲۵-۹۹

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖٓ ۡاِنِّىْ لَـكُمْ نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿۲۵﴾ اَنْ لَّا
تَعْبُدُوْٓا اِلَّا اللّٰهَ ؕ اِنِّىْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ اَلِيْمٍ ﴿۲۶﴾ فَقَالَ
الْمَلَاُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ مَا نَرٰىكَ اِلَّا بَشَرًا مِّثْلَنَا وَمَا
نَرٰىكَ اتَّبَعَكَ اِلَّا الَّذِيْنَ هُمْ اَرَاذِلُنَا بَادِىَ الرَّاْىِ ۚ وَمَا نَرٰى
لَـكُمْ عَلَيْنَا مِنْ فَضْلٍۢ بَلْ نَظُنُّكُمْ كٰذِبِيْنَ ﴿۲۷﴾ قَالَ يٰقَوْمِ اَرَءَيْتُمْ
اِنْ كُنْتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّىْ وَاٰتٰٮنِىْ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِهٖ فَعُمِّيَتْ
عَلَيْكُمْ ؕ اَنُلْزِمُكُمُوْهَا وَاَنْتُمْ لَهَا كٰرِهُوْنَ ﴿۲۸﴾ وَيٰقَوْمِ لَاۤ اَسْـئَلُكُمْ
عَلَيْهِ مَالًا ؕ اِنْ اَجْرِىَ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ وَمَاۤ اَنَا بِطَارِدِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ؕ اِنَّهُمْ
مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ وَلٰـكِنِّىْۤ اَرٰٮكُمْ قَوْمًا تَجْهَلُوْنَ ﴿۲۹﴾ وَيٰقَوْمِ مَنْ يَّنْصُرُنِىْ
مِنَ اللّٰهِ اِنْ طَرَدْتُّهُمْ ؕ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ﴿۳۰﴾ وَلَاۤ اَقُوْلُ لَـكُمْ عِنْدِىْ
خَزَاۤئِنُ اللّٰهِ وَلَاۤ اَعْلَمُ الْغَيْبَ وَلَاۤ اَقُوْلُ اِنِّىْ مَلَكٌ وَّلَاۤ اَقُوْلُ لِلَّذِيْنَ
تَزْدَرِىْۤ اَعْيُنُكُمْ لَنْ يُّؤْتِيَهُمُ اللّٰهُ خَيْرًا ؕ اَللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا فِىْۤ اَنْفُسِهِمْ ۖۚ
اِنِّىْۤ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۳۱﴾ قَالُوْا يٰنُوْحُ قَدْ جَادَلْتَنَا فَاَكْثَرْتَ
جِدَالَنَا فَاْتِنَا بِمَا تَعِدُنَاۤ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿۳۲﴾ قَالَ اِنَّمَا
يَاْتِيْكُمْ بِهِ اللّٰهُ اِنْ شَاۤءَ وَمَاۤ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِيْنَ ﴿۳۳﴾ وَلَا يَنْفَعُكُمْ
نُصْحِىْۤ اِنْ اَرَدْتُّ اَنْ اَنْصَحَ لَـكُمْ اِنْ كَانَ اللّٰهُ يُرِيْدُ اَنْ يُّغْوِيَكُمْ ؕ هُوَ

رَبُّكُمْ وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ ﴿٣٤﴾ أَمْ يَقُولُونَ افْتَرَاهُ ۖ قُلْ إِنِ افْتَرَيْتُهُ
ع ۳ ۱۱ فَعَلَيَّ إِجْرَامِي وَأَنَا بَرِيءٌ مِّمَّا تُجْرِمُونَ ﴿٣٥﴾ وَأُوحِيَ إِلَىٰ نُوحٍ أَنَّهُ
لَن يُؤْمِنَ مِن قَوْمِكَ إِلَّا مَن قَدْ آمَنَ فَلَا تَبْتَئِسْ بِمَا كَانُوا
يَفْعَلُونَ ﴿٣٦﴾ وَاصْنَعِ الْفُلْكَ بِأَعْيُنِنَا وَوَحْيِنَا وَلَا تُخَاطِبْنِي فِي
الَّذِينَ ظَلَمُوا ۚ إِنَّهُم مُّغْرَقُونَ ﴿٣٧﴾ وَيَصْنَعُ الْفُلْكَ وَكُلَّمَا مَرَّ عَلَيْهِ
مَلَأٌ مِّن قَوْمِهِ سَخِرُوا مِنْهُ ۚ قَالَ إِن تَسْخَرُوا مِنَّا فَإِنَّا نَسْخَرُ
مِنكُمْ كَمَا تَسْخَرُونَ ﴿٣٨﴾ فَسَوْفَ تَعْلَمُونَ مَن يَأْتِيهِ عَذَابٌ يُخْزِيهِ
وَيَحِلُّ عَلَيْهِ عَذَابٌ مُّقِيمٌ ﴿٣٩﴾ حَتَّىٰ إِذَا جَاءَ أَمْرُنَا وَفَارَ التَّنُّورُ
قُلْنَا احْمِلْ فِيهَا مِن كُلٍّ زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ وَأَهْلَكَ إِلَّا مَن سَبَقَ عَلَيْهِ
الْقَوْلُ وَمَنْ آمَنَ ۚ وَمَا آمَنَ مَعَهُ إِلَّا قَلِيلٌ ﴿٤٠﴾ وَقَالَ ارْكَبُوا فِيهَا
قرأ حفص بفتح الميم وإمالة الراء ۱۲ بِسْمِ اللَّهِ مَجْرَاهَا وَمُرْسَاهَا ۚ إِنَّ رَبِّي لَغَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿٤١﴾ وَهِيَ تَجْرِي
بِهِمْ فِي مَوْجٍ كَالْجِبَالِ وَنَادَىٰ نُوحٌ ابْنَهُ وَكَانَ فِي مَعْزِلٍ يَا بُنَيَّ
ارْكَب مَّعَنَا وَلَا تَكُن مَّعَ الْكَافِرِينَ ﴿٤٢﴾ قَالَ سَآوِي إِلَىٰ جَبَلٍ يَعْصِمُنِي
مِنَ الْمَاءِ ۚ قَالَ لَا عَاصِمَ الْيَوْمَ مِنْ أَمْرِ اللَّهِ إِلَّا مَن رَّحِمَ ۚ وَحَالَ
بَيْنَهُمَا الْمَوْجُ فَكَانَ مِنَ الْمُغْرَقِينَ ﴿٤٣﴾ وَقِيلَ يَا أَرْضُ ابْلَعِي مَاءَكِ
وَيَا سَمَاءُ أَقْلِعِي وَغِيضَ الْمَاءُ وَقُضِيَ الْأَمْرُ وَاسْتَوَتْ عَلَى الْجُودِيِّ ۖ
الربع وَقِيلَ بُعْدًا لِّلْقَوْمِ الظَّالِمِينَ ﴿٤٤﴾ وَنَادَىٰ نُوحٌ رَّبَّهُ فَقَالَ رَبِّ إِنَّ
ابْنِي مِنْ أَهْلِي وَإِنَّ وَعْدَكَ الْحَقُّ وَأَنتَ أَحْكَمُ الْحَاكِمِينَ ﴿٤٥﴾ قَالَ

يٰنُوْحُ اِنَّهٗ لَيْسَ مِنْ اَهْلِكَ ۚ اِنَّهٗ عَمَلٌ غَيْرُ صَالِحٍ ۖ فَلَا تَسْـَٔلْنِ مَا
لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ۭ اِنِّىْٓ اَعِظُكَ اَنْ تَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ ۝۴۶ قَالَ
رَبِّ اِنِّىْٓ اَعُوْذُ بِكَ اَنْ اَسْـَٔلَكَ مَا لَيْسَ لِيْ بِهٖ عِلْمٌ ۭ وَاِلَّا تَغْفِرْ لِيْ وَ
تَرْحَمْنِيْٓ اَكُنْ مِّنَ الْخٰسِرِيْنَ ۝۴۷ قِيْلَ يٰنُوْحُ اهْبِطْ بِسَلٰمٍ مِّنَّا وَ
بَرَكٰتٍ عَلَيْكَ وَعَلٰٓي اُمَمٍ مِّمَّنْ مَّعَكَ ۭ وَاُمَمٌ سَنُمَتِّعُهُمْ ثُمَّ يَمَسُّهُمْ
مِّنَّا عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝۴۸ تِلْكَ مِنْ اَنْۢبَاۗءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهَآ اِلَيْكَ ۚ مَا كُنْتَ
تَعْلَمُهَآ اَنْتَ وَلَا قَوْمُكَ مِنْ قَبْلِ هٰذَا ۚ فَاصْبِرْ ۚ اِنَّ الْعَاقِبَةَ
لِلْمُتَّقِيْنَ ۝۴۹ وَاِلٰى عَادٍ اَخَاهُمْ هُوْدًا ۭ قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا ع ۴
لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ۭ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا مُفْتَرُوْنَ ۝۵۰ يٰقَوْمِ لَآ اَسْـَٔــلُكُمْ عَلَيْهِ
اَجْرًا ۭ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلَي الَّذِيْ فَطَرَنِيْ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝۵۱ وَيٰقَوْمِ
اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ يُرْسِلِ السَّمَاۗءَ عَلَيْكُمْ مِّدْرَارًا وَّيَزِدْكُمْ
قُوَّةً اِلٰى قُوَّتِكُمْ وَلَا تَتَوَلَّوْا مُجْرِمِيْنَ ۝۵۲ قَالُوْا يٰهُوْدُ مَا جِئْتَنَا بِبَيِّنَةٍ
وَّمَا نَحْنُ بِتَارِكِيْٓ اٰلِهَتِنَا عَنْ قَوْلِكَ وَمَا نَحْنُ لَكَ بِمُؤْمِنِيْنَ ۝۵۳ اِنْ
نَّقُوْلُ اِلَّا اعْتَرٰىكَ بَعْضُ اٰلِهَتِنَا بِسُوْۗءٍ ۭ قَالَ اِنِّىْٓ اُشْهِدُ اللّٰهَ وَاشْهَدُوْٓا
اَنِّىْ بَرِيْۗءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ ۝۵۴ مِنْ دُوْنِهٖ فَكِيْدُوْنِيْ جَمِيْعًا ثُمَّ لَا
تُنْظِرُوْنِ ۝۵۵ اِنِّىْ تَوَكَّلْتُ عَلَي اللّٰهِ رَبِّيْ وَرَبِّكُمْ ۭ مَا مِنْ دَاۗبَّةٍ اِلَّا
هُوَ اٰخِذٌۢ بِنَاصِيَتِهَا ۭ اِنَّ رَبِّيْ عَلٰي صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝۵۶ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقَدْ
اَبْلَغْتُكُمْ مَّآ اُرْسِلْتُ بِهٖٓ اِلَيْكُمْ ۭ وَيَسْتَخْلِفُ رَبِّيْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ۚ وَلَا

تَضُرُّوْنَهٗ شَيْـًٔا ۭ اِنَّ رَبِّيْ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ حَفِيْظٌ ۵۷ وَلَمَّا جَاۗءَ اَمْرُنَا
نَجَّيْنَا هُوْدًا وَّالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا ۚ وَنَجَّيْنٰهُمْ مِّنْ
عَذَابٍ غَلِيْظٍ ۵۸ وَتِلْكَ عَادٌ ڐ جَحَدُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ وَعَصَوْا
رُسُلَهٗ وَاتَّبَعُوْٓا اَمْرَ كُلِّ جَبَّارٍ عَنِيْدٍ ۵۹ وَاُتْبِعُوْا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا
لَعْنَةً وَّيَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ اَلَآ اِنَّ عَادًا كَفَرُوْا رَبَّهُمْ ۭ اَلَا بُعْدًا لِّعَادٍ
قَوْمِ هُوْدٍ ۶۰ وَاِلٰي ثَمُوْدَ اَخَاهُمْ صٰلِحًا ۘ قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ ع ۵
مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ۭ هُوَ اَنْشَاَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ وَاسْتَعْمَرَكُمْ فِيْهَا
فَاسْتَغْفِرُوْهُ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ ۭ اِنَّ رَبِّيْ قَرِيْبٌ مُّجِيْبٌ ۶۱ قَالُوْا
يٰصٰلِحُ قَدْ كُنْتَ فِيْنَا مَرْجُوًّا قَبْلَ هٰذَآ اَتَنْهٰىنَآ اَنْ نَّعْبُدَ مَا
يَعْبُدُ اٰبَاۗؤُنَا وَاِنَّنَا لَفِيْ شَكٍّ مِّمَّا تَدْعُوْنَآ اِلَيْهِ مُرِيْبٍ ۶۲ قَالَ
يٰقَوْمِ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰي بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ وَاٰتٰىنِيْ مِنْهُ رَحْمَةً
فَمَنْ يَّنْصُرُنِيْ مِنَ اللّٰهِ اِنْ عَصَيْتُهٗ ۣ فَمَا تَزِيْدُوْنَنِيْ غَيْرَ تَخْسِيْرٍ ۶۳
وَيٰقَوْمِ هٰذِهٖ نَاقَةُ اللّٰهِ لَكُمْ اٰيَةً فَذَرُوْهَا تَاْكُلْ فِيْٓ اَرْضِ اللّٰهِ
وَلَا تَمَسُّوْهَا بِسُوْۗءٍ فَيَاْخُذَكُمْ عَذَابٌ قَرِيْبٌ ۶۴ فَعَقَرُوْهَا فَقَالَ
تَمَتَّعُوْا فِيْ دَارِكُمْ ثَلٰثَةَ اَيَّامٍ ۭ ذٰلِكَ وَعْدٌ غَيْرُ مَكْذُوْبٍ ۶۵ فَلَمَّا
جَاۗءَ اَمْرُنَا نَجَّيْنَا صٰلِحًا وَّالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا وَمِنْ
خِزْيِ يَوْمِىِٕذٍ ۭ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ الْقَوِيُّ الْعَزِيْزُ ۶۶ وَاَخَذَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوا
الصَّيْحَةُ فَاَصْبَحُوْا فِيْ دِيَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ ۶۷ ۙ كَاَنْ لَّمْ يَغْنَوْا فِيْهَا ۭ

ع ۶ أَلَآ إِنَّ ثَمُودَا۟ كَفَرُوا۟ رَبَّهُمْ ۗ أَلَا بُعْدًا لِّثَمُودَ ﴿٦٨﴾ وَلَقَدْ جَآءَتْ رُسُلُنَآ
إِبْرَٰهِيمَ بِٱلْبُشْرَىٰ قَالُوا۟ سَلَـٰمًا ۖ قَالَ سَلَـٰمٌ ۖ فَمَا لَبِثَ أَن جَآءَ بِعِجْلٍ
حَنِيذٍ ﴿٦٩﴾ فَلَمَّا رَءَآ أَيْدِيَهُمْ لَا تَصِلُ إِلَيْهِ نَكِرَهُمْ وَأَوْجَسَ مِنْهُمْ خِيفَةً ۚ
قَالُوا۟ لَا تَخَفْ إِنَّآ أُرْسِلْنَآ إِلَىٰ قَوْمِ لُوطٍ ﴿٧٠﴾ وَٱمْرَأَتُهُۥ قَآئِمَةٌ
فَضَحِكَتْ فَبَشَّرْنَـٰهَا بِإِسْحَـٰقَ وَمِن وَرَآءِ إِسْحَـٰقَ يَعْقُوبَ ﴿٧١﴾ قَالَتْ
يَـٰوَيْلَتَىٰٓ ءَأَلِدُ وَأَنَا۠ عَجُوزٌ وَهَـٰذَا بَعْلِى شَيْخًا ۖ إِنَّ هَـٰذَا لَشَىْءٌ عَجِيبٌ ﴿٧٢﴾
قَالُوٓا۟ أَتَعْجَبِينَ مِنْ أَمْرِ ٱللَّهِ ۖ رَحْمَتُ ٱللَّهِ وَبَرَكَـٰتُهُۥ عَلَيْكُمْ أَهْلَ ٱلْبَيْتِ ۚ
إِنَّهُۥ حَمِيدٌ مَّجِيدٌ ﴿٧٣﴾ فَلَمَّا ذَهَبَ عَنْ إِبْرَٰهِيمَ ٱلرَّوْعُ وَجَآءَتْهُ
ٱلْبُشْرَىٰ يُجَـٰدِلُنَا فِى قَوْمِ لُوطٍ ﴿٧٤﴾ إِنَّ إِبْرَٰهِيمَ لَحَلِيمٌ أَوَّٰهٌ مُّنِيبٌ ﴿٧٥﴾
يَـٰٓإِبْرَٰهِيمُ أَعْرِضْ عَنْ هَـٰذَآ ۖ إِنَّهُۥ قَدْ جَآءَ أَمْرُ رَبِّكَ ۖ وَإِنَّهُمْ ءَاتِيهِمْ عَذَابٌ
غَيْرُ مَرْدُودٍ ﴿٧٦﴾ وَلَمَّا جَآءَتْ رُسُلُنَا لُوطًا سِىٓءَ بِهِمْ وَضَاقَ بِهِمْ
ذَرْعًا وَقَالَ هَـٰذَا يَوْمٌ عَصِيبٌ ﴿٧٧﴾ وَجَآءَهُۥ قَوْمُهُۥ يُهْرَعُونَ إِلَيْهِ
وَمِن قَبْلُ كَانُوا۟ يَعْمَلُونَ ٱلسَّيِّـَٔاتِ ۚ قَالَ يَـٰقَوْمِ هَـٰٓؤُلَآءِ بَنَاتِى هُنَّ
أَطْهَرُ لَكُمْ ۖ فَٱتَّقُوا۟ ٱللَّهَ وَلَا تُخْزُونِ فِى ضَيْفِىٓ ۖ أَلَيْسَ مِنكُمْ رَجُلٌ
رَّشِيدٌ ﴿٧٨﴾ قَالُوا۟ لَقَدْ عَلِمْتَ مَا لَنَا فِى بَنَاتِكَ مِنْ حَقٍّ وَإِنَّكَ لَتَعْلَمُ
مَا نُرِيدُ ﴿٧٩﴾ قَالَ لَوْ أَنَّ لِى بِكُمْ قُوَّةً أَوْ ءَاوِىٓ إِلَىٰ رُكْنٍ شَدِيدٍ ﴿٨٠﴾
قَالُوا۟ يَـٰلُوطُ إِنَّا رُسُلُ رَبِّكَ لَن يَصِلُوٓا۟ إِلَيْكَ ۖ فَأَسْرِ بِأَهْلِكَ بِقِطْعٍ
مِّنَ ٱلَّيْلِ وَلَا يَلْتَفِتْ مِنكُمْ أَحَدٌ إِلَّا ٱمْرَأَتَكَ ۖ إِنَّهُۥ مُصِيبُهَا

مَآ اَصَابَهُمْ ؕ اِنَّ مَوْعِدَهُمُ الصُّبْحُ ؕ اَلَيْسَ الصُّبْحُ بِقَرِيْبٍ ﴿۸۱﴾ فَلَمَّا
جَآءَ اَمْرُنَا جَعَلْنَا عَالِيَهَا سَافِلَهَا وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهَا حِجَارَةً مِّنْ
سِجِّيْلٍ ۙ۬ مَّنْضُوْدٍ ﴿۸۲﴾ مُّسَوَّمَةً عِنْدَ رَبِّكَ ؕ وَمَا هِيَ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ع النصف
بِبَعِيْدٍ ﴿۸۳﴾ وَاِلٰى مَدْيَنَ اَخَاهُمْ شُعَيْبًا ؕ قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا
لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ وَلَا تَنْقُصُوا الْمِكْيَالَ وَالْمِيْزَانَ اِنِّيْٓ اَرٰىكُمْ بِخَيْرٍ
وَّاِنِّيْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ مُّحِيْطٍ ﴿۸۴﴾ وَيٰقَوْمِ اَوْفُوا الْمِكْيَالَ
وَالْمِيْزَانَ بِالْقِسْطِ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْيَآءَهُمْ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ
مُفْسِدِيْنَ ﴿۸۵﴾ بَقِيَّتُ اللّٰهِ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۚ۬ وَمَآ اَنَا
عَلَيْكُمْ بِحَفِيْظٍ ﴿۸۶﴾ قَالُوْا يٰشُعَيْبُ اَصَلٰوتُكَ تَاْمُرُكَ اَنْ نَّتْرُكَ مَا
يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَآ اَوْ اَنْ نَّفْعَلَ فِيْٓ اَمْوَالِنَا مَا نَشٰٓؤُا ؕ اِنَّكَ لَاَنْتَ الْحَلِيْمُ
الرَّشِيْدُ ﴿۸۷﴾ قَالَ يٰقَوْمِ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ وَ
رَزَقَنِيْ مِنْهُ رِزْقًا حَسَنًا ؕ وَمَآ اُرِيْدُ اَنْ اُخَالِفَكُمْ اِلٰى مَآ اَنْهٰىكُمْ
عَنْهُ ؕ اِنْ اُرِيْدُ اِلَّا الْاِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ ؕ وَمَا تَوْفِيْقِيْٓ اِلَّا بِاللّٰهِ ؕ
عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَاِلَيْهِ اُنِيْبُ ﴿۸۸﴾ وَيٰقَوْمِ لَا يَجْرِمَنَّكُمْ شِقَاقِيْٓ اَنْ
يُّصِيْبَكُمْ مِّثْلُ مَآ اَصَابَ قَوْمَ نُوْحٍ اَوْ قَوْمَ هُوْدٍ اَوْ قَوْمَ صٰلِحٍ ؕ
وَمَا قَوْمُ لُوْطٍ مِّنْكُمْ بِبَعِيْدٍ ﴿۸۹﴾ وَاسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ ؕ
اِنَّ رَبِّيْ رَحِيْمٌ وَّدُوْدٌ ﴿۹۰﴾ قَالُوْا يٰشُعَيْبُ مَا نَفْقَهُ كَثِيْرًا مِّمَّا
تَقُوْلُ وَاِنَّا لَنَرٰىكَ فِيْنَا ضَعِيْفًا ۚ وَلَوْلَا رَهْطُكَ لَرَجَمْنٰكَ ؗ وَمَآ

أَنْتَ عَلَيْنَا بِعَزِيزٍ ﴿٩١﴾ قَالَ يَا قَوْمِ أَرَهْطِي أَعَزُّ عَلَيْكُمْ مِنَ اللَّهِ وَ
اتَّخَذْتُمُوهُ وَرَاءَكُمْ ظِهْرِيًّا ۖ إِنَّ رَبِّي بِمَا تَعْمَلُونَ مُحِيطٌ ﴿٩٢﴾ وَ
يَا قَوْمِ اعْمَلُوا عَلَىٰ مَكَانَتِكُمْ إِنِّي عَامِلٌ ۖ سَوْفَ تَعْلَمُونَ مَنْ
يَأْتِيهِ عَذَابٌ يُخْزِيهِ وَمَنْ هُوَ كَاذِبٌ ۖ وَارْتَقِبُوا إِنِّي مَعَكُمْ
رَقِيبٌ ﴿٩٣﴾ وَلَمَّا جَاءَ أَمْرُنَا نَجَّيْنَا شُعَيْبًا وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ
بِرَحْمَةٍ مِنَّا وَأَخَذَتِ الَّذِينَ ظَلَمُوا الصَّيْحَةُ فَأَصْبَحُوا فِي
دِيَارِهِمْ جَاثِمِينَ ﴿٩٤﴾ كَأَنْ لَمْ يَغْنَوْا فِيهَا ۗ أَلَا بُعْدًا لِمَدْيَنَ كَمَا بَعِدَتْ
ثَمُودُ ﴿٩٥﴾ وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا مُوسَىٰ بِآيَاتِنَا وَسُلْطَانٍ مُبِينٍ ﴿٩٦﴾ إِلَىٰ فِرْعَوْنَ ع ۱۲ ۸
وَمَلَئِهِ فَاتَّبَعُوا أَمْرَ فِرْعَوْنَ ۖ وَمَا أَمْرُ فِرْعَوْنَ بِرَشِيدٍ ﴿٩٧﴾ يَقْدُمُ
قَوْمَهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فَأَوْرَدَهُمُ النَّارَ ۖ وَبِئْسَ الْوِرْدُ الْمَوْرُودُ ﴿٩٨﴾
وَأُتْبِعُوا فِي هَٰذِهِ لَعْنَةً وَيَوْمَ الْقِيَامَةِ ۚ بِئْسَ الرِّفْدُ الْمَرْفُودُ ﴿٩٩﴾

ترجمۂ آیات ۲۵-۹۹

اور ہم نے نوحؑ کو اس کی قوم کی طرف رسول بنا کر بھیجا۔ اس نے ان کو آگاہ کیا کہ میں تمھارے لیے ایک نذیر مبین ہو کر آیا ہوں کہ اللہ کے سوا کسی اور کی بندگی نہ کرو۔ میں تم پر ایک دردناک عذاب کے دن کا اندیشہ رکھتا ہوں۔ اس کی قوم کے ان سربراہوں نے جنھوں نے کفر کیا، جواب دیا کہ ہم تو تم کو بس اپنا ہی جیسا ایک آدمی دیکھتے ہیں اور ہم تمھاری پیروی کرنے والوں میں انھی کو پاتے ہیں جو ہمارے اندر کے ذلیل لوگ ہیں، بے سمجھے بوجھے تمھارے پیچھے لگ گئے ہیں اور ہم تم لوگوں کے لیے اپنے مقابل میں کوئی خاص امتیاز بھی نہیں دیکھ رہے ہیں بلکہ ہم تو تم کو بالکل جھوٹا خیال کر رہے ہیں۔ ۲۵-۲۷

اس نے کہا، اے میرے ہم قومو! بتاؤ اگر میں اپنے رب کی جانب سے ایک روشن دلیل پر ہوں اور پھر اس نے خاص اپنی رحمت سے بھی مجھے نوازا اور وہ تم سے پوشیدہ رہی تو کیا ہم اس کو تم پر چپکا دیں جب کہ تم اس سے بیزار بھی ہو! اور اے میرے ہم قومو، میں اس خدمت پر تم سے کسی مال کا طالب نہیں۔ میرا اجر تو بس اللہ ہی کے ذمہ ہے اور میں ان لوگوں کو ہرگز دھتکارنے والا نہیں جو ایمان لائے ہیں۔ یہ اپنے رب سے ملاقات کرنے والے ہیں بلکہ میں تو تم کو دیکھ رہا ہوں کہ تم جہالت میں مبتلا ہو۔ اور اے میرے ہم قومو، اگر میں ان کو دھتکار دوں تو خدا کے مقابل میں کون میری مدد کرے گا؟ کیا تم لوگ اس پہلو پر دھیان نہیں کرتے؟ اور میں تمہارے سامنے یہ دعویٰ نہیں کرتا کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں اور نہ میں غیب جانتا اور نہ یہ دعویٰ کرتا کہ میں کوئی فرشتہ ہوں اور نہ میں ان لوگوں کے بارے میں، جن کو تمہاری نگاہیں حقیر دیکھتی ہیں، یہ کہہ سکتا کہ خدا ان کو کوئی خیر دے ہی نہیں سکتا۔ جو کچھ ان کے دلوں میں ہے اس کو خدا ہی خوب جانتا ہے۔ اگر میں ایسا کروں تو میں ہی ظالم ٹھہروں گا۔ وہ بولے کہ اے نوحؑ تم نے ہم سے بحث کر لی اور بہت بحث کر لی، اگر تم سچے ہو تو وہ چیز ہم پر لاؤ جس کی تم ہم کو برابر دھمکی سنا رہے ہو۔ اس نے جواب دیا کہ اس کو تو تم پر اللہ ہی لائے گا اگر وہ چاہے گا اور تم اس کے قابو سے باہر نہ نکل سکو گے اور میری خیر خواہی تم پر کچھ کارگر نہیں ہو سکتی اگر میں تمہاری خیر خواہی کرنا چاہوں اگر اللہ تم کو گمراہ کرنا چاہتا ہو۔ وہی تمہارا رب ہے اور اسی کی طرف تم کو لوٹنا ہے۔ ۲۸-۳۴

کیا یہ کہتے ہیں کہ اس نے اس کو گھڑ لیا ہے، کہہ دو، کہ اگر میں نے اس کو گھڑا ہے تو میرے جرم کا وبال میرے ہی اوپر ہے اور جو جرم تم کر رہے ہو میں اس سے بری ہوں۔ ۳۵

اور نوحؑ کو وحی کی گئی کہ تمہاری قوم میں سے جو ایمان لا چکے ان کے سوا اب کوئی اور ایمان

لانے والا نہیں تو جو کچھ یہ کرتے رہے ہیں اس سے آزردہ خاطر نہ ہو اور تم کشتی بناؤ ہماری نگرانی میں اور ہماری ہدایت کے مطابق اور ان ظالموں کے باب میں اب ہم سے کچھ نہ کہیو، یہ تو غرق ہو کر رہیں گے۔ اور وہ کشتی بنانے لگا۔ اور جب جب اس کی قوم کے بڑوں کی کوئی جماعت اس کے پاس سے گزرتی تو اس کا مذاق اڑاتی۔ وہ ان کو جواب دیتا کہ اگر تم ہمارا مذاق اڑا رہے ہو تو جس طرح تم مذاق اڑا رہے ہو اسی طرح ہم بھی تمہارا مذاق اڑائیں گے۔ تم جلد جان لوگے کہ وہ کون ہیں جن پر وہ عذاب آتا ہے جو ان کو رسوا کر کے رکھ دیتا ہے اور وہ قہر نازل ہوتا ہے جو ٹک کے رہ جاتا ہے۔ یہاں تک کہ جب ہمارا حکم آ پہنچا اور طوفان اُبل پڑا، ہم نے اس کو کہا کہ ہر چیز میں سے نر و مادہ دونوں کو اور اپنے اہل و عیال کو، بجز ان کے جن پر حکم نافذ ہو چکا ہے، اور ان لوگوں کو جو ایمان لائے ہیں، اس کشتی میں سوار کرا لو، اور اس کے ساتھ ایمان لانے والوں کی تعداد تو بس تھوڑی ہی تھی۔ اور اس نے کہا کہ اس میں سوار ہو جاؤ، اللہ ہی کے نام سے ہے اس کا چلنا اور اس کا لنگر انداز ہونا۔ میرا رب بڑا ہی بخشنے والا مہربان ہے۔ ۳۶-۴۱

اور وہ کشتی پہاڑوں کی طرح اٹھتی موجوں کے درمیان ان کو لے کر چلنے لگی اور نوح نے اپنے بیٹے کو، جو اس سے الگ تھا، آواز دی کہ اے میرے بیٹے ہمارے ساتھ سوار ہو جا اور ان کافروں کا ساتھ نہ دے۔ وہ بولا کہ میں ابھی کسی پہاڑ کی پناہ لے لوں گا جو مجھے پانی سے بچا لے گا۔ نوحؑ نے کہا، آج اللہ کے قہر سے کوئی بچانے والا نہیں ہے مگر وہی جس پر رحم فرمائے۔ اور ان دونوں کے درمیان موج حائل ہو گئی اور وہ بھی غرق ہونے والوں میں سے ہو کے رہا۔ اور حکم ہوا کہ اے زمین اپنا پانی نگل لے اور اے آسمان تھم جا اور پانی اتار دیا گیا اور معاملے کا

فیصلہ ہوگیا اور کشتی کوہ جودی پر جا لگی اور اعلان کر دیا گیا کہ ظالموں پر خدا کی پھٹکار ہے۔

اور نوح نے اپنے رب کو پکارا اور کہا کہ اے میرے خداوند میرا بیٹا تو میرے اہل میں سے ہے اور تیرا وعدہ پکا ہے اور تو تمام فیصلہ کرنے والوں سے بڑھ کر فیصلہ کرنے والا ہے۔ فرمایا، اے نوح وہ تمہارے اہل میں سے نہیں ہے، وہ نہایت نابکار ہے۔ مجھ سے اس چیز کے لیے درخواست نہ کرو جس کے باب میں تمہیں کچھ علم نہیں اور میں تمہیں نصیحت کرتا ہوں کہ تم جاہلوں میں سے نہ بنو۔ اس نے کہا کہ اے میرے رب میں تیری پناہ مانگتا ہوں کہ تجھ سے کسی ایسی چیز کی درخواست کروں جس کے باب میں مجھے کوئی علم نہیں اور اگر تو میری مغفرت نہ کرے گا اور مجھ پر رحم نہ فرمائے گا تو میں نامرادوں میں سے ہو جاؤں گا۔ ارشاد ہوا اے نوح اترو، ہماری طرف سے سلامتی اور برکتوں کے ساتھ اپنے اوپر بھی اور ان امتوں پر بھی جو ان سے ظہور میں آئیں جو تمہارے ساتھ ہیں۔ اور ایسی امتیں بھی اٹھیں گی جن کو ہم بہرہ مند کریں گے پھر ان کو ہماری طرف سے ایک عذاب دردناک پکڑے گا۔ ۴۲-۴۸

یہ ماجرا غیب کی باتوں میں سے ہے جو ہم تم کو وحی کے ذریعہ سے سنا رہے ہیں، اس سے پہلے نہ تم ہی اس کو جانتے تھے اور نہ تمہاری قوم کے لوگ ہی، تو ثابت قدم رہو، انجام کار کی کامیابی خدا سے ڈرنے والوں ہی کا حصہ ہے۔ ۴۹

اور عاد کی طرف ہم نے ان کے بھائی ہود کو رسول بنا کر بھیجا۔ اس نے ان کو دعوت دی کہ اے میری قوم کے لوگو، اللہ ہی کی بندگی کرو، اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں۔ یہ تم محض افترا کر رہے ہو۔ اے میری قوم کے لوگو، میں اس پر تم سے کسی معاوضے کا طالب نہیں ہوں۔ میرا اجر تو بس اسی کے ذمے ہے جس نے مجھے پیدا کیا تو کیا تم سمجھتے نہیں؟ اور اے میری قوم کے لوگو،

اپنے رب سے اپنے گناہوں کی معافی چاہو پھر اس کی طرف رجوع کرو وہ تم پر خوب اپنا ابر کرم برسائے گا اور تمہاری قوت میں اضافہ پر اضافہ فرمائے گا اور مجرمانہ روگردانی کی روش اختیار نہ کرو۔ وہ بولے کہ اے ہود تم ہمارے پاس کوئی کھلی نشانی لے کر تو آئے نہیں اور ہم مجرد تمہارے کہنے سے تو اپنے معبودوں کو چھوڑنے والے نہیں اور ہم ہرگز تمھیں ماننے والے نہیں۔ ہم تو یہی کہیں گے کہ تم پر ہمارے معبودوں میں سے کسی کی مار پڑی ہے۔ اس نے کہا میں اللہ کو گواہ ٹھہراتا ہوں اور تم بھی گواہ رہو کہ اس کے سوا جن کو تم شریک ٹھہراتے ہو میں ان سے بالکل بری ہوں تو تم سب مل کر میرے خلاف چالیں چل دیکھو، پھر مجھے ذرا مہلت نہ دو۔ میں نے اللہ، اپنے اور تمہارے رب پر بھروسہ کیا، جتنے بھی جاندار ہیں ان کی پیشانی اسی کی گرفت میں ہے بے شک میرا رب نہایت سیدھی راہ پر ہے۔ پس اگر تم اعراض کر رہے ہو تو میں نے تمھیں وہ پیغام پہنچا دیا جو دے کر مجھے تمہاری طرف بھیجا گیا ہے۔ اور میرا رب تمہاری جگہ اب تمہارے سوا کسی اور قوم کو لائے گا اور تم اس کا کچھ بھی بگاڑ نہ سکو گے۔ میرا رب ہر چیز پر نگہبان ہے۔ اور جب ہمارا عذاب آ دھمکا ہم نے ہود کو اور ان لوگوں کو جو اس کے ساتھ ایمان لائے، اپنے فضل خاص سے نجات بخشی۔ اور ہم نے ان کو ایک نہایت ہی سخت عذاب سے بچایا۔ ۵۰-۵۸

اور یہ قوم عاد ہے۔ انھوں نے اپنے رب کی آیتوں کا انکار کیا اور اس کے رسولوں کی نافرمانی کی اور ہر جبار و سرکش کی بات کے پیچھے لگے اور اس دنیا میں بھی ان کے پیچھے لعنت لگا دی گئی اور قیامت کے روز بھی۔ سن لو کہ عاد نے اپنے رب کا انکار کیا، سن لو کہ ہلاکی ہو ہود کی قوم عاد کے لیے!! ۵۹-۶۰

اور قوم ثمود کی طرف ہم نے ان کے بھائی صالح کو رسول بنا کر بھیجا۔ اس نے دعوت دی

اے میری قوم کے لوگو اللہ کی بندگی کرو، اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں۔ اسی نے تم کو زمین سے پیدا کیا اور اس میں آباد کیا تو اس سے مغفرت مانگو، پھر اس کی طرف رجوع کرو۔ میرا رب قریب بھی ہے، قبول کرنے والا بھی۔ وہ بولے کہ صالح، اس سے پہلے تو ہمارے اندر تم بڑی امیدوں کے مرکز تھے۔ کیا تم ہمیں ان کی عبادت سے روکتے ہو جن کو ہمارے باپ دادا پوجتے آئے! اور ہم تو اس چیز کے سبب سے جس کی تم ہمیں دعوت دے رہے ہو بڑی ہی سخت الجھن میں پڑ گئے ہیں۔ اس نے کہا، اے میری قوم کے لوگو، بتاؤ، اگر میں اپنے رب کی طرف سے ایک واضح دلیل پر ہوں اور اس نے اپنی جانب سے رحمت خاص سے بھی مجھے نوازا تو اگر میں اس کی نافرمانی کروں تو اللہ کی پکڑ کے وقت کون میرا مددگار ہوگا۔ سو تم میری بربادی ہی میں اضافہ کروگے۔ ۶۱-۶۳

اور اے میری قوم کے لوگو، یہ اللہ کی اونٹنی ہے تمہارے لیے ایک نشانی تو اس کو چھوڑ دو کہ یہ اللہ کی زمین میں چرے چگے اور اس کو کوئی گزند نہ پہنچائیو ورنہ ایک قریبی عذاب تمہیں آ پکڑے گا تو انھوں نے اس کی کوچیں کاٹ دیں۔ تب اس نے کہا کہ اب تین دن اور اپنی بستی میں رس بس لو۔ یہ دھمکی جھوٹی نہیں ہونے کی۔ پس جب ہمارا حکم صادر ہوا تو ہم نے صالح کو اور ان لوگوں کو جو اس کے ساتھ ایمان لائے اپنے خاص فضل سے اس عذاب اور اس دن کی رسوائی سے نجات بخشی۔ بے شک تمہارا رب ہی قوی اور غالب ہے اور ان لوگوں کو جنھوں نے ظلم کیا خدا کی ڈانٹ نے آ پکڑا اور وہ اپنے گھروں میں زمین سے چمٹے پڑے رہ گئے۔ گویا کبھی ان میں بسے ہی نہیں۔ سن لو ثمود نے اپنے رب کی ناشکری کی۔ سن لو کہ بلا کی ہو ثمود کے لیے!! ۶۴-۶۸

اور ابراہیم کے پاس ہمارے فرستادے خوش خبری لے کر آئے۔ کہا سلامتی ہو۔ اس نے

بھی کہا سلامتی ہو۔ دیر نہیں گزری کہ اس نے ان کے آگے بھنا ہوا بچھڑا پیش کیا۔ پھر جب دیکھا کہ ان کے ہاتھ اس کی طرف نہیں بڑھ رہے ہیں تو اس نے ان میں اجنبیت پائی اور ان کی طرف سے ایک خدشہ محسوس کیا۔ وہ بولے کہ تم کوئی اندیشہ نہ کرو، ہم تو قوم لوط کی طرف بھیجے گئے ہیں۔ اور اس کی بیوی پاس کھڑی تھی وہ ہنسی پس ہم نے اس کو اسحاق کی خوش خبری دی اور اسحاق کے آگے یعقوب کی۔ وہ بولی کہ ہائے شامت! کیا اب میں بچہ جنوں گی جب میں خود بھی ایک بڑھیا ہوں اور یہ میرے شوہر بھی بوڑھے ہیں! یہ تو ایک نہایت ہی عجیب بات ہوگی! وہ بولے، کیا خدا کی بات پر تعجب! اللہ کی رحمت اور برکتیں نازل ہوں آپ پر اے اہل بیت نبی بے شک وہ سزاوار حمد و بزرگ ہے!! ۶۹-۷۳

تو جب ابراہیم کا خوف دور ہوا اور اس کو بشارت ملی تو وہ ہم سے قوم لوط کے بارے میں بحث کرنے لگا۔ بے شک ابراہیم نہایت ہی بردبار، دردمند اور اپنے رب کی طرف دھیان رکھنے والا تھا اے ابراہیم یہ بحث چھوڑو، اب تمہارے رب کا حکم ہو چکا ہے اور ان پر ایک ایسا عذاب آنے والا ہے جو ٹالے نہ ٹالا جا سکے اور جب ہمارے فرستادے لوط کے پاس پہنچے وہ ان کے سبب سے غمگین ہوا اور اس کا دل بھنچا اور بولا کہ یہ تو بہت ہی کٹھن دن ہے۔ ۷۴-۷۷

اور اس کی قوم کے لوگ جھپٹتے ہوئے اس کے پاس پہنچے اور یہ پہلے سے بدکاریوں میں مبتلا تھے۔ اس نے کہا اے میری قوم کے لوگو، یہ میری بیٹیاں ہیں، وہ تمہارے لیے زیادہ پاکیزہ ہیں تو اللہ سے ڈرو اور میرے مہمانوں کے باب میں مجھے رسوا نہ کرو، کیا تم میں کوئی مرد معقول نہیں! وہ بولے کہ تمہیں تو معلوم ہی ہے کہ تمہاری بیٹیوں پر ہمارا کوئی حق نہیں اور تم خوب جانتے ہو جو کچھ ہم چاہتے ہیں۔ اس نے کہا کاش میرے پاس تم سے مقابلہ کی قوت ہوتی یا میں کسی طاقت ور

سہارے کی پناہ لے سکتا!! فرستادوں نے کہا اے لوط ہم تو تمہارے رب کے فرستادے ہیں، یہ ہرگز تم تک، پہنچ نہیں سکتے تو تم اپنے اہل و عیال کو لے کر کچھ رات رہے نکل جاؤ اور تم میں سے کوئی مڑ کے بھی نہ دیکھے۔ مگر تمہاری بیوی اس سے مستثنیٰ ہے، اس پر بھی وہی آفت آنی ہے جو ان پر مقدر ہو چکی ہے۔ ان کے عذاب کا وقت مقررہ صبح ہے، کیا صبح قریب نہیں! ۸۰-۸۱

پس جب آیا ہمارا عذاب تو ہم نے اس بستی کو یک قلم تلپٹ کر کے رکھ دیا اور اس سنگِ گل کی بارش کی، تہ بہ تہ، تمہارے رب کے پاس نشان لگائے ہوئے، اور وہ ان ظالموں سے کچھ دور نہیں۔ ۸۲-۸۳

اور مدین کی طرف ہم نے ان کے بھائی شعیب کو بھیجا۔ اس نے دعوت دی کہ اے میری قوم کے لوگو! اللہ ہی کی بندگی کرو، اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں اور ناپ اور تول میں کمی نہ کرو۔ میں تمھیں فارغ البالی کی حالت میں دیکھ رہا ہوں اور تم پر ایک گھیرنے والے دن کے عذاب کا اندیشہ رکھتا ہوں۔ اور اے میری قوم کے لوگو! ناپ اور تول کو پورا رکھو پورے عدل کے ساتھ اور لوگوں کی چیزوں میں ان کی حق تلفی نہ کرو اور زمین میں فساد پھیلانے والے بن کر نہ ابھرو۔ اللہ کا بخشا ہوا منافع ہی تمہارے لیے بہتر ہے اگر تم سچے ایمان والے ہو۔ اور میں تم پر نگران نہیں ہوں۔ وہ بولے کہ اے شعیب، کیا تمہاری نماز تمھیں یہ سکھاتی ہے کہ ہم ان چیزوں کو چھوڑ بیٹھیں جن کی ہمارے باپ دادا پرستش کرتے آئے یا یہ کہ ہم اپنے مال میں اپنی مرضی کے مطابق تصرف نہ کریں؟ بس تمھیں تو ایک دانشمند اور راست رو رہ گئے ہو! اس نے کہا اے میری قوم کے لوگو، بتاؤ اگر میں اپنے رب کی جانب سے ایک واضح دلیل پر ہوں (اور اس نے مزید اپنی جانب سے مجھے رزق حسن سے بھی نوازا ہو (تو اس کے سوا میں تمھیں اور کس چیز کی دعوت دوں) اور میں یہ نہیں چاہتا کہ تمہاری مخالفت

کر کے وہی چیز خود اختیار کر دوں جس سے تمہیں روک رہا ہوں۔ میں تو صرف اصلاح چاہتا ہوں، جس حد تک کر سکوں۔ اور مجھے توفیق تو اللہ ہی کی مدد سے حاصل ہو گی۔ اسی پر میں نے بھروسہ کیا اور اسی کی طرف میں رجوع کرتا ہوں۔ اور اے میری قوم کہیں میری ضد تمہارے لیے اس امر کا باعث نہ بن جائے کہ تم پر بھی اسی طرح کی آفت نازل ہو جس طرح کی آفت قوم نوح یا قوم ہود یا قوم صالح پر نازل ہوئی اور قوم لوط تو تم سے کچھ دور بھی نہیں۔ اور اپنے رب سے مغفرت مانگو پھر اس کی طرف رجوع کرو۔ بے شک میرا رب نہایت مہربان اور بڑی محبت کرنے والا ہے۔ وہ بولے کہ اے شعیب، جو باتیں تم کہتے ہو اس کا بہت سا حصہ ہماری سمجھ میں نہیں آتا اور ہم تو تم کو اپنے اندر ایک کمزور وجود خیال کرتے ہیں اور اگر تمہارا خاندان نہ ہوتا تو ہم تو تم کو سنگسار کر دیتے اور تم ہم پر کچھ بھاری نہیں۔ اس نے کہا اے میری قوم، کیا میرا خاندان تم پر اللہ سے زیادہ بھاری ہے اور اس کو تو تم نے پس پشت ڈال رکھا ہے۔ میرا رب جو کچھ تم کر رہے ہو سب کا احاطہ کیے ہوئے ہے اور اے میری قوم کے لوگو تم اپنے طور پر کام کر رہے ہو، میں بھی اپنے طور پر کر رہا ہوں، تم عنقریب جان لو گے کہ کس پر وہ عذاب آتا ہے جو اس کو رسوا کر کے رکھ دیتا ہے اور کون ہے جو جھوٹا ہے اور انتظار کرو میں بھی تمہارے ساتھ منتظر ہوں۔ اور جب ہمارا عذاب آیا ہم نے شعیب کو اور ان لوگوں کو جو اس کے ساتھ ایمان لائے اپنی رحمت سے نجات دی اور جن لوگوں نے اپنی جانوں پر ظلم ڈھائے ان کو ڈانٹ نے آ پکڑا پس وہ اپنے گھروں میں اوندھے پڑے رہ گئے۔ گویا کبھی ان میں بسے ہی نہ تھے۔ ہاں، ہلاک ہوئے مدین جس طرح دفع ہوئے ثمود! ۸۸-۹۵

اور ہم نے موسیٰ کو فرعون اور اس کے اعیان کے پاس اپنی آیات اور ایک روشن نشانی کے ساتھ رسول بنا کر بھیجا تو انہوں نے فرعون ہی کی بات مانی حالانکہ فرعون کی بات راست نہ تھی۔

وہ قیامت کے روز اپنی قوم کے آگے آگے ہوگا اور ان کو دوزخ میں لے جا اتارے گا اور کیا ہی برا گھاٹ ہوگا جس پر یہ اتریں گے! اور اس دنیا میں ان کے پیچھے لعنت لگا دی گئی اور قیامت کے دن بھی۔ کیا ہی برا انعام ہے جو دیا گیا! ۹۶-۹۹

۳- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖٓ ۡ اِنِّىْ لَكُمْ نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ (۲۵)

'نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ' کا مفہوم

حضرت نوحؑ کی سرگزشت کی طرف اجمالی اشارہ پچھلی سورہ میں بھی ——— آیات ۷۱ - ۷۳ ——— گزر چکا ہے۔ اس سورہ میں اس اجمال کی تفصیل آ رہی ہے۔ 'نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ' (کھلا ڈرانے والا) میں اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ رسول جس قہر و عذاب سے ڈراتا ہے اس کی نوعیت قیاسات اور اندازوں پر مبنی اشارات و کنایات کی نہیں ہوتی بلکہ ایک واضح اور قطعی خبر اور اعلان کی ہوتی ہے اس لیے کہ اس کی بنیاد اول تو وحی الٰہی پر ہوتی ہے ثانیاً یہ اس سنت الٰہی کا تقاضا بھی ہے جو رسول کی تکذیب کی صورت میں لازماً ظاہر ہوتی ہے۔ اس قطعیت کا اثر قدرتی طور پر اس کے الفاظ اور لب و لہجہ میں بھی نمایاں ہوتا ہے۔ وہ آنے والے خطرے کا اس طرح اعلان کرتا ہے گویا اپنی دونوں آنکھوں سے اس کو دیکھ رہا ہے۔ یہاں لفظ 'مُبِیْن' میں ایک لطیف تلمیح بھی ہے اس کو بھی نگاہ میں رکھیے۔ عرب میں دستور رہا ہے کہ ہر قوم کے لوگ کسی بلند ٹیلہ یا پہاڑی پر دیدبان بناتے جہاں ہر وقت ایک نگران مقرر رہتا جس کا کام یہ ہوتا کہ جب وہ دیکھتا کہ کسی طرف سے حملہ آوروں کی کوئی جماعت اس کی قوم پر حملہ کیا چاہتی ہے تو وہ اپنے کپڑے پھاڑ کر ننگا ہو جاتا اور 'واصباحا!' کا نعرہ لگاتا۔ یہ پوری قوم کے لیے الارم ہوتا اور سب تلواریں سونت سونت کر مدافعت کے لیے باہر نکل آتے۔ اس کو 'نذیر عریاں' کہتے تھے۔ خدا کے رسول بھی اپنی قوم کو آنے والے عذاب سے آگاہ کرنے کے لیے آئے اور انھوں نے بالکل اس طرح لوگوں کو اس سے آگاہ کیا گویا وہ عقب سے نمودار ہی ہونے والا ہے اس وجہ سے قرآن میں ان کے لیے 'نَذِیْرٌ مُّبِیْنٌ' کے الفاظ استعمال ہوئے۔

اَنْ لَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّا اللّٰهَ ؕ اِنِّىْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ اَلِيْمٍ (۲۶)

حضرت نوحؑ کی دعوت

یہ حضرت نوحؑ کی دعوت کا نقطۂ آغاز ہے۔ پیچھے مڑ کر اس سورہ کی آیت ۲ پر نظر ڈالیے تو معلوم ہوگا کہ بعینہٖ اسی نقطہ سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اپنی دعوت کا آغاز فرمایا۔ پھر مزید آگے بڑھیے تو معلوم ہوگا کہ جس قسم کا معارضہ قوم نوح نے حضرت نوحؑ کے ساتھ کیا اسی قسم کا معارضہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی قوم نے آپ کے ساتھ کیا۔ حالات و واقعات کی یہ مطابقت ہی ہے جس

کر دکھانے کے لیے یہ سرگزشتیں سنائی جا رہی ہیں کہ نبی اور اس کی قوم دونوں کے سامنے ماضی کے آئینے میں ان حاضر اور مستقبل کا پورا نقشہ آجائے۔ تاریخ کی جو قدر و قیمت ہے وہ اسی پہلو سے ہے۔ اگر یہ پہلو نگاہوں سے اوجھل ہو جائے تو تاریخ کی حیثیت مجرد داستان سرائی کی رہ جاتی ہے۔

فَقَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ مَا نَرٰىكَ اِلَّا بَشَرًا مِّثْلَنَا وَمَا نَرٰىكَ اتَّبَعَكَ اِلَّا الَّذِيْنَ هُمْ اَرَاذِلُنَا بَادِيَ الرَّاْيِ ۚ وَمَا نَرٰى لَكُمْ عَلَيْنَا مِنْ فَضْلٍۢ بَلْ نَظُنُّكُمْ كٰذِبِيْنَ (۲۷)

قوم نوح کے تین معارضے

لفظ 'ملا' کی تحقیق ہم دوسرے مقام میں بیان کر چکے ہیں کہ اس سے مراد کسی قوم کے لیڈر، سرپنچ، زعماء اور اکابر ہوتے ہیں۔ چونکہ بگڑی ہوئی قوم کے سارے فساد کی جڑ یہی ہوتے ہیں اس وجہ سے انبیاء کی دعوتِ اصلاح سے سب سے زیادہ پرخاش انہی کو ہوتی ہے۔ قومِ نوح کے ان لیڈروں نے حضرت نوح کی دعوت کے جواب میں بیک وقت تین معارضے پیش کیے۔

ایک یہ کہ 'مَا نَرٰىكَ اِلَّا بَشَرًا مِّثْلَنَا' یعنی تم تو ہمارے ہی جیسے انسان ہو۔ اگر خدا کو کوئی رسول بھیجنا ہی تھا تو وہ کسی فرشتے کو یا کسی اور برتر مخلوق کو رسول بنا کر بھیجتا، یا کم از کم یہ کہ کسی فرشتے کو تمہارے ساتھ گواہ بنا کر بھیجتا۔ ہمارے ہی جیسے ایک انسان کو ہماری طرف رسول بنا کر بھیجنے کے کیا معنی؟ پیچھے مرکر آیت ۱۲ پر ایک نظر ڈال کر دیکھ لیجیے۔ بعینہٖ یہی بات قریش کے لیڈروں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کے جواب میں کہی۔

دوسرا یہ کہ 'وَمَا نَرٰىكَ اتَّبَعَكَ اِلَّا الَّذِيْنَ هُمْ اَرَاذِلُنَا بَادِيَ الرَّاْيِ' یعنی تمہارے پیرو ہمارے اندر کے صرف وہ لوگ بنے ہیں جو رذالے اور ادنیٰ درجہ کے لوگ ہیں، جن کی سوسائٹی میں کوئی عزت و وقعت نہیں، جو معاملات پر غور کرنے اور ان کے نتائج و عواقب کا تجزیہ کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ بس تمہاری بات انھوں نے سنی اور بے سوچے سمجھے تمہارے پیچھے لگ گئے۔ 'بَادِيَ الرَّاْيِ' کو کشاف نے ظرف کے مفہوم میں لیا ہے اور اس کی وضاحت یوں کی ہے "وقت حدوث اول رأیہم" یعنی جو بات دل میں باول وہلہ آگئی وہ کر گزرے، اس پر غور کرنے کی زحمت انھوں نے نہیں اٹھائی۔

تیسرا یہ کہ 'وَمَا نَرٰى لَكُمْ عَلَيْنَا مِنْ فَضْلٍ' یعنی اگر تم خدا کے ایسے ہی چہیتے ہو کہ اس نے تم کو رسول بنا کر بھیجا تو چاہیے تو یہ تھا کہ تم پر اور تمہارے ساتھیوں پر دھن برستا، تم خزانوں کے مالک ہوتے اور خدم و حشم تمہارے ہم رکاب چلتے لیکن ہم تو اپنے مقابل میں تمہارے اور تمہارے ساتھیوں کو کسی پہلو سے مرجح نہیں دیکھتے بلکہ اس کے برعکس یہ دیکھتے ہیں کہ ہمارا حال تمہارے اور تمہارے ساتھیوں کے مقابل میں بدرجہا بہتر ہے۔ اس وجہ سے ہم تو یہی سمجھتے ہیں کہ تم جھوٹ موٹ کی ہم پر دھونس جما رہے ہو۔

قَالَ يٰقَوْمِ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ وَاٰتٰىنِيْ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِهٖ فَعُمِّيَتْ عَلَيْكُمْ ۭ اَنُلْزِمُكُمُوْهَا وَاَنْتُمْ لَهَا كٰرِهُوْنَ (۲۸)

معارضات کا جواب

اب اس آیت میں اور آگے کی آیات میں مذکورہ بالا معارضات میں سے ایک ایک کا جواب آرہا ہے۔

حضرت نوح نے پہلی بات تو یہ فرمائی کہ میں جو کچھ تمہارے سامنے پیش کر رہا ہوں اس کی بنیاد دو چیزوں پر

ہے۔ ایک تو اس نور فطرت (بیّنہ) پر جو میرے اندر پہلے سے موجود تھا اور دوسرے اس وحی الٰہی (رحمت) پر جس سے میرے رب نے مجھے نوازا۔ اگر تمھارے اندر بھی فطرت کی وہ روشنی موجود ہوتی جو میرے اندر ہے تب تو میری یہ دعوت تمھیں خود اپنے دل کی آواز معلوم ہوتی اور تم اس کو اللہ کی رحمت سمجھ کر قبول کرتے لیکن مشکل یہ ہے کہ تم نے اپنی ناشکریوں اور بداعمالیوں سے اپنی فطرت کے نور کو گل کر دیا ہے جس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ قدرت کے قانون کے تحت تمھارے دل تاریک کر دیے گئے ہیں اور ان کے اندر کسی ہدایت کو قبول کرنے کی صلاحیت سرے سے باقی ہی نہیں رہ گئی ہے۔ اب یہ کس طرح ممکن ہے کہ میں تمھارے اوپر ایک ایسی چیز چپکا دوں جس کے چپکنے کے لیے تمھارے اندر سرے سے کوئی لوٹ باقی ہی نہیں رہ گیا ہے اور وہ بھی اس حال میں کہ تم اس کے نام سے بھی بیزار ہو۔ پیچھے آیت ۱۷ کے تحت ہم جو کچھ لکھ آئے ہیں ایک نظر اس پر بھی ڈال لیجیے۔

وَيٰقَوْمِ لَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مَالًا ۭ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلَي اللّٰهِ وَمَآ اَنَا بِطَارِدِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۭ اِنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ وَلٰكِنِّيْٓ اَرٰىكُمْ قَوْمًا تَجْـهَلُوْنَ (۲۹)

یہ حضرت نوحؑ کی طرف سے اپنی قوم کے سرداروں کی رعونت کا جواب ہے کہ اگر تم میری بات سننے اور سمجھنے کے لیے تیار نہیں ہو تو اچھی طرح سمجھ لو کہ اس میں میرا نقصان کوئی نہیں ہے، سرتاسر تمھارا اپنا ہی نقصان ہے۔ میں جو کچھ تمھارے آگے پیش کر رہا ہوں اگر میں اس کے عوض میں تم سے کسی اجرت کا طالب ہوتا تب تو تمھاری اس بیزاری کی مجھے پروا ہوتی کہ تم نے میرے مال کی قدر نہیں کی اور میری دکان بیٹھ جائے گی۔ لیکن جب میں کوئی تجارت نہیں کر رہا ہوں بلکہ جس طرح مفت پایا ہے اسی طرح مفت بانٹ رہا ہوں تو تم اگر اس کو قبول نہ کرو گے تو خود ہی خسارہ میں رہو گے۔ مجھے تو اس کا جو اجر ملنا ہے وہ اللہ تعالیٰ کے ذمہ ہے اور وہ مجھے مل کے رہے گا۔ تمھارے رد و قبول سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ رہی یہ بات کہ میری دعوت جن لوگوں نے قبول کی ہے وہ تمھاری نگاہوں میں حقیر و رذیل لوگ ہیں اس وجہ سے تمھیں میرے قرب سے عار ہے تو میں تمھاری دلداری کے لیے ان کو اپنے پاس سے دھتکارنے کے لیے تیار نہیں ہوں۔ وہ اپنے رب پر ایمان لائے ہیں اور کل کو اپنے اسی ایمان کے ساتھ اپنے رب کے ساتھ ملنے والے ہیں۔ اگر میں آج انھیں تمھاری خاطر داری میں اپنے پاس سے دھتکاروں تو کل کو میں خدا کو کیا منہ دکھاؤں گا؟ شرافت اور رذالت کا اصلی فیصلہ تو خدا کے ہاں ہونا ہے۔ وہی بتلائے گا کہ اس کی نگاہوں میں کون شریف ہے اور کون رذیل۔ میری نگاہوں میں تو تمھی لوگ جہالت میں مبتلا ہو۔

وَيٰقَوْمِ مَنْ يَّنْصُرُنِيْ مِنَ اللّٰهِ اِنْ طَرَدْتُّهُمْ ۭ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ (۳۰)

یہ اوپر والی آیت کی مزید وضاحت ہے کہ اگر میں تمھاری نازبرداری میں اللہ پر ایمان لانے والے ان غریبوں کو دھتکار دوں تو کل کو خدا کی پکڑ سے مجھے کون بچانے والا بنے گا! اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ یعنی مال و جاہ کے غرور میں تم ایسے پاگل ہو گئے ہو کہ تم میں سے کسی کو معاملے کے اس پہلو پر غور کرنے کی توفیق ہی نہیں ہوتی۔

وَلَآ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِيْ خَزَآئِنُ اللّٰهِ وَلَآ اَعْلَمُ الْغَيْبَ وَلَآ اَقُوْلُ اِنِّيْ مَلَكٌ وَّلَآ اَقُوْلُ لِلَّذِيْنَ تَزْدَرِيْٓ اَعْيُنُكُمْ لَنْ يُّؤْتِيَهُمُ اللّٰهُ خَيْرًا ۭ اَللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ ښ اِنِّىْٓ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِيْنَ (۳۱)

یہ مخالفین کے سارے معارضات کا اکٹھا جواب ہے کہ اگر تم مجھ میں کوئی بات مافوق بشریت نہیں پاتے تو میں نے بشریت سے بالاتر ہونے کا دعویٰ کب کیا ہے! میں نے کب کہا ہے کہ میرے پاس خدا کے خزانوں کی کنجیاں ہیں یا میں غیب دان ہوں یا کوئی فرشتہ ہوں میں ان باتوں میں سے کسی بات کا بھی مدعی نہیں ہوں۔ میں تو صرف خدا کا رسول ہوں اور جس پیغام کے ساتھ اس نے مجھے تمہاری طرف بھیجا ہے وہ میں تمہیں سنا رہا ہوں۔ میرے ساتھی غریب و نادار لوگ ہیں اس وجہ سے تم ان کو حقیر سمجھتے ہو اور چونکہ تمہاری نگاہوں میں ساری قدر و قیمت دنیا اور اسباب دنیا ہی کی ہے جو تمہیں حاصل ہے، اس وجہ سے تم یہ سمجھتے ہو کہ اگر اس دعوت میں، جو میں دے رہا ہوں، کوئی پہلو خیر کا ہوتا تو بھلا یہ کس طرح ممکن تھا کہ یہ سدا کے بھوکے ننگے لوگ، تو اس سے فیض یاب ہو جاتے اور تم جو اپنے زعم میں سارے خیر و فضل کے وارث و مورث ہو اس سے محروم رہ جاتے! اگر تمہارا گھمنڈ یہ ہے کہ جب انھیں دنیا نہیں ملی تو خدا ان کو کوئی اور خیر و فضل کس طرح دے سکتا ہے تو میں تمہارے اس گھمنڈ کی تائید کرنے کے لیے تیار نہیں۔ دنیا تو ہر اہل و نااہل کو مل جاتی ہے لیکن دین کی نعمت ہمیشہ انہی کو نصیب ہوتی ہے جن کے دلوں میں اس کے لیے صلاحیت ہوتی ہے اور جن کی فطرت مسخ ہونے سے محفوظ ہوتی ہے۔ یہ دل اور فطرت کا حال اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ اس وجہ سے اگر میں ان کے باب میں تمہارے گمان کی تائید کروں تو میں بھی اپنے آپ کو ظالموں کا ساتھی بنا لوں۔

قَالُوْا يٰنُوْحُ قَدْ جٰدَلْتَنَا فَاَكْثَرْتَ جِدَالَنَا فَاْتِنَا بِمَا تَعِدُنَآ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۝ قَالَ اِنَّمَا يَاْتِيْكُمْ بِهِ اللّٰهُ اِنْ شَاۗءَ وَمَآ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِيْنَ (۳۲-۳۳)

قومِ نوح کا مطالبہ عذاب

جب قومِ نوح کے اعیان بحث و مناظرہ کے میدان میں بالکل پسپا ہو گئے، حضرت نوحؑ نے ہر پہلو سے ان پر حجت تمام کر دی اور ان کے لیے کوئی راہِ فرار باقی نہیں چھوڑی تو آخری دامن انھوں نے اپنے لیے یہ خیال کیا کہ ان سے اس عذاب کے لانے کا مطالبہ کریں جس کی وہ خبر دے رہے تھے۔ چنانچہ انھوں نے کہا کہ بحث و مناظرہ تو اے نوح! بہت ہو چکا، اب تو بس اگر تم سچے ہو تو وہ عذاب لاؤ جس کی دھمکی پر دھمکی سنا رہے ہو۔ حضرت نوحؑ نے جواب میں فرمایا کہ عذاب کا لانا تو اللہ کے اختیار میں ہے، وہی جب چاہے گا لائے گا لیکن یہ یاد رکھو کہ اس غطنہ کے ساتھ جو عذاب کا مطالبہ کر رہے ہو تو جب عذاب آدھمکے گا اس وقت کوئی خدا کے قابو سے باہر نہ نکل سکے گا۔

وَلَا يَنْفَعُكُمْ نُصْحِيْٓ اِنْ اَرَدْتُّ اَنْ اَنْصَحَ لَكُمْ اِنْ كَانَ اللّٰهُ يُرِيْدُ اَنْ يُّغْوِيَكُمْ ۭ هُوَ رَبُّكُمْ ۣ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ (۳۴)

حضرت نوحؑ کا

دعوت و نصیحت اور تذکیر و موعظت کا آخری مرحلہ یہ ہوتا ہے کہ رسول اپنا فرض ادا کر کے اپنی سبکدوشی کا اعلان کرتا ہے اور اپنے

جھٹلانے والوں کو ان کے اس انجام کے حوالے کرتا ہے جو ان کے لیے خدا کی طرف سے مقدر ہو چکا ہوتا ہے۔ یہ بات حضرت نوحؑ نے اسی مرحلہ میں فرمائی ہے کہ اب تم خدا کے قانون کی زد میں آ چکے ہو اور اپنے اعمال کے سبب سے سزاوار ہو کہ خدا تمہیں گمراہی کی راہ پر جانے کے لیے چھوڑ دے تو میں لاکھ تمہیں نصیحت و موعظت سناؤں میری نصیحت و موعظت کچھ کارگر نہیں ہو سکتی۔ اب تمہارا معاملہ اللہ کے حوالہ ہے، وہی تمہارا رب ہے اور اسی کے آگے تمہاری پیشی ہونی ہے۔

اَمۡ یَقُوۡلُوۡنَ افۡتَرٰىہُ ؕ قُلۡ اِنِ افۡتَرَیۡتُہٗ فَعَلَیَّ اِجۡرَامِیۡ وَ اَنَا بَرِیۡٓءٌ مِّمَّا تُجۡرِمُوۡنَ (۳۵)

حضرت نوحؑ کا اعلان برائت

اس آیت میں بعض لوگوں نے مخاطب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو سمجھا ہے اور اس کو حضرت نوحؑ کی سرگزشت کے درمیان ایک التفات کی حیثیت دی ہے۔ اگرچہ اس کے التفات ہونے کا بھی ایک محل ہے لیکن ہمارے نزدیک، جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا، یہ دعوت و موعظت کے آخری مرحلہ میں اعلان برائت کی آیت ہے۔ اس آیت میں حضرت نوحؑ کو ہدایت ہوئی کہ اگر تمہاری قوم کے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ جو کچھ تم انہیں بتا رہے ہو یہ سب تمہاری اپنی ہی گھڑی ہوئی باتیں ہیں جن کو تم جھوٹ موٹ خدا کی طرف منسوب کر رہے ہو تو اب یہ بحث بند کر دو اور ان سے کہہ دو کہ اگر یہ سب کچھ میرا افترا ہے تو اس جرم کی ذمہ داری مجھ پر ہے اور اگر یہ حق ہے اور تم جان بوجھ کر اس سے بغاوت کر رہے ہو تو میں تمہارے اس جرم کی ذمہ داری سے اپنی برائت کا اعلان کرتا ہوں ـــــ ہم دوسرے مقام میں واضح کر چکے ہیں کہ پیغمبر کے اعلان برائت کے بعد قوم کے لیے فیصلہ کن گھڑی آ جاتی ہے۔

وَاُوۡحِیَ اِلٰی نُوۡحٍ اَنَّہٗ لَنۡ یُّؤۡمِنَ مِنۡ قَوۡمِکَ اِلَّا مَنۡ قَدۡ اٰمَنَ فَلَا تَبۡتَئِسۡ بِمَا کَانُوۡا یَفۡعَلُوۡنَ ۚ وَاصۡنَعِ الۡفُلۡکَ بِاَعۡیُنِنَا وَوَحۡیِنَا وَلَا تُخَاطِبۡنِیۡ فِی الَّذِیۡنَ ظَلَمُوۡا ۚ اِنَّہُمۡ مُّغۡرَقُوۡنَ (۳۶-۳۷)

عدالتِ الٰہی کا ظہور

مذکورہ بالا اعلان برائت کے بعد حضرت نوحؑ کو وحی کے ذریعہ سے اطلاع دے دی گئی کہ تمہاری قوم میں جن لوگوں کے اندر تمہاری دعوتِ ایمان قبول کرنے کی صلاحیت تھی وہ ایمان لا چکے، اب کوئی اور ایمان لانے والا باقی نہیں رہا ہے۔ دودھ میں جتنا مکھن تھا وہ سب نکالا جا چکا ہے، اب جو بچ رہا ہے وہ صرف چھاچھ ہے، تو تم خاطر جمع رکھو، یہ جو کچھ اب تک کرتے رہے ہیں اس سے دل شکستہ اور ملول نہ ہو، اب سنتِ الٰہی کے مطابق ان کے لیے خدا کی عدالت کے ظہور کا وقت آ گیا ہے اور فیصلۂ الٰہی یہ ہے کہ یہ سب غرق کر دیے جائیں گے تو تم اپنے اور اپنے اہل ایمان ساتھیوں کے بچاؤ کے لیے ہماری نگرانی میں اور ہماری ہدایات کے تحت ایک کشتی بناؤ اور خبردار ان ظالموں کے باب میں اب ہم سے کچھ نہ کہیو، اب یہ لازماً غرق ہو کے رہیں گے۔

وَیَصۡنَعُ الۡفُلۡکَ ۟ وَکُلَّمَا مَرَّ عَلَیۡہِ مَلَاٌ مِّنۡ قَوۡمِہٖ سَخِرُوۡا مِنۡہُ ؕ قَالَ اِنۡ تَسۡخَرُوۡا مِنَّا فَاِنَّا نَسۡخَرُ مِنۡکُمۡ کَمَا تَسۡخَرُوۡنَ (۳۸)

کشتی پر قوم نوحؑ کی پھبتیاں

'وَیَصۡنَعُ الۡفُلۡکَ'، جَعَلَ یَصۡنَعُ الۡفُلۡکَ' عربی زبان کے معروف اسلوب کے مطابق مضارع سے پہلے فعل ناقص حذف ہو گیا ہے۔

حضرت نوح علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے مطابق کشتی بنانی شروع کر دی۔ ان کی قوم کے متکبرین

جو عذاب کی دھمکی ہی کو سرے سے نعوذ باللہ لاف زنی سمجھتے تھے، انھوں نے جب دیکھا کہ عذاب سے بچاؤ کے لیے کشتی بھی بننی شروع ہو گئی ہے تو ظاہر ہے کہ انھوں نے اس کو خلل دماغ ہی پر محمول کیا ہو گا اور جب جب پاس سے گزرتے ہوں گے خوب خوب پھبتیاں چست کرتے رہے ہوں گے اور کون اندازہ کر سکتا ہے کہ ان پھبتیوں کا حضرت نوحؑ اور ان کے ساتھیوں کے دلوں پر کیا اثر پڑتا رہا ہو گا۔ لیکن انبیاء اور ان کے ساتھیوں کو اس طرح کے امتحانات سے گزرنا ہی پڑتا ہے۔ اسی سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ جس غیب سے وہ لوگوں کو ڈراتے ہیں اس پر ان کو کس درجے کا یقین ہوتا ہے۔ گویا وہ اس کو اپنے سر کی آنکھوں سے دیکھ رہے ہوتے ہیں، اگرچہ اپنے مخالفوں کو اس کو دکھا نہیں سکتے۔

ایک خاص اسلوب بیان

'فَاِنَّا نَسْخَرُ مِنْكُمْ كَمَا تَسْخَرُوْنَ' سے یہ مراد نہیں ہے کہ ہم بھی اسی طرح کی مبتذل پھبتیاں تم پر چست کریں گے جس طرح کی پھبتیاں تم چست کر رہے ہو۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ آج جس طرح ہمارا یہ فعل تمہاری نگاہوں میں سامان مضحکہ ہے اسی طرح کل تمہارا انجام ہمارے لیے موجب ازدیاد ایمان و اطمینان ہو گا۔ آج تم ہنس رہے ہو کل کو تم روؤ گے اور ہم نصرت الٰہی کے ظہور پر مسرور و بہتہج اور اپنے رب کے شکر گزار ہوں گے۔ بعض مرتبہ جملہ میں صوتی ہم آہنگی کے اقتضا سے لفظ ایک ہی استعمال ہوتا ہے لیکن اس کا مفہوم الگ الگ ہوتا ہے۔ جیسے کہ 'دِنَّاهُمْ كَمَا دَانُوْا' میں ہے۔ کسی کی مصیبت پر خوش ہونا عام حالات میں تو اچھی بات نہیں ہے لیکن جن لوگوں پر اس طرح حجت تمام ہو چکی ہو جس طرح حضرت نوحؑ اور ان کے ساتھیوں نے اپنی قوم پر تمام کی ان پر عذاب الٰہی کا نزول حق کی فتح مندی اور باطل کی ہزیمت کا ایک یادگار واقعہ ہوتا ہے جس پر اہل ایمان کا خوش ہونا عین مقتضائے ایمان ہوتا ہے۔

فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ مَنْ يَّاْتِيْهِ عَذَابٌ يُّخْزِيْهِ وَيَحِلُّ عَلَيْهِ عَذَابٌ مُّقِيْمٌ (۳۹)

'عذاب مقیم' کا مفہوم

یعنی ابھی تو تم ہمارا مذاق اڑا رہے ہو اور ہماری اس تیاری کو خلل دماغ پر محمول کر رہے ہو لیکن عنقریب وہ وقت آنے والا ہے جب تم دیکھ لوگے کہ رسوا کر دینے والا اور ٹک جانے والا عذاب کن پر نازل ہوتا ہے۔ یہاں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ عذاب دو قسموں کا ہوتا ہے۔ ایک تو وہ عذاب ہوتا ہے جس کا مقصد غافلین و منکرین کو جگانا اور جھنجھوڑنا ہوتا ہے تاکہ وہ داعی کی بات پر کان دھریں اور جس خطرے سے وہ ان کو آگاہ کر رہا ہے اس کے آثار دیکھ کر اگر متنبہ ہونا چاہیں تو متنبہ ہو جائیں۔ دوسرا وہ عذاب ہوتا ہے جو کامل اتمام حجت کے بعد رسول کے جھٹلانے والوں کی جڑ کاٹ دینے کے لیے نازل ہوتا ہے۔ یہ فیصلہ کن عذاب ہوتا ہے جو ان لوگوں کو ہمیشہ کے لیے رسوا کر کے رکھ دیتا ہے جو رسول کے انذار کا مذاق اڑاتے اور اس کی تنبیہات کو خلل دماغ پر محمول کرتے ہیں۔ یہ محض ایک جھونکا نہیں ہوتا جو آیا اور گزر گیا بلکہ جس قوم اور جس بستی پر نازل ہوتا ہے وہیں ڈیرے ڈال دیتا ہے اور اس کی عبرت انگیز سرگزشت آثار و کھنڈروں کی شکل میں بھی اور تاریخ کے صفحات میں بھی محفوظ ہو جاتی ہے تاکہ آنے والی نسلیں بھی ان کے انجام سے سبق حاصل کریں۔ نیز یہی عذاب دیباچہ بن جاتا ہے اس ابدی عذاب کا جس سے ان کو آخرت میں سابقہ پیش آئے گا۔

حَتّٰۤی اِذَا جَآءَ اَمۡرُنَا وَ فَارَ التَّنُّوۡرُ ۙ قُلۡنَا احۡمِلۡ فِیۡهَا مِنۡ کُلٍّ زَوۡجَیۡنِ اثۡنَیۡنِ وَ اَهۡلَكَ اِلَّا مَنۡ سَبَقَ عَلَیۡهِ الۡقَوۡلُ وَ مَنۡ اٰمَنَ ؕ وَ مَاۤ اٰمَنَ مَعَهٗۤ اِلَّا قَلِیۡلٌ ﴿۴۰﴾

قوم نوح کے عذاب کی نوعیت

'فار یفور' کے معنی جوش مارنے کے ہیں۔ یہ لفظ پکتی ہوئی ہانڈی کے جوش مارنے اور ابلنے کے لیے بھی آتا ہے اور بھڑکتے ہوئے تنور کے جوش مارنے کے لیے بھی۔ یہاں 'فَارَ التَّنُّوۡرُ' کا محاورہ بطریق استعارہ اس سائیکلونی طوفان کی تعبیر کے لیے استعمال ہوا ہے جو قوم نوح پر آیا، جس سے سخت بارش بھی ہوئی اور آس پاس کے سمندروں کا پانی بھی ابل پڑا۔ حضرت استاذ رحمۃ اللہ علیہ، سورۂ ذاریات کی تفسیر میں، قوم نوح کے عذاب کی نوعیت واضح کرتے ہوئے آخر میں خلاصۂ بحث یوں تحریر فرماتے ہیں۔

> "اس تفصیل سے یہ حقیقت واضح ہوئی کہ قوم نوح پر تند اور چکر مار ہوا کا طوفان آیا جس سے سخت بارش ہوئی، پاس کے سمندر کا پانی ابل پڑا اور ہر طرف سے موجیں اچھلنے لگیں۔ اس طوفان کے اندر نوح علیہ السلام کا سفینہ کوہ جودی پر جا ٹکا۔" (تفسیر سورہ ذاریات از فراہی)

'امر' سے مراد اس آیت میں بھی اور آگے آیت ۴۴ میں بھی وہ عذاب ہے جو حکم الٰہی سے ظہور میں آیا۔ فرمایا کہ جب عذاب آیا اور طوفان ابل پڑا، ہم نے نوح کو حکم دیا کہ ہر چیز میں سے نر و مادہ دو دو کو اپنے اہل و عیال کو اور جو لوگ ایمان لائے ہیں ان کو اس کشتی میں سوار کرا لو۔

من کل کا مفہوم

'مِنۡ کُلٍّ' کی تعمیم سے یہ بات لازم نہیں آتی کہ ہوام و حشرات اور کیڑے مکوڑے سب اس میں شامل ہوں بلکہ یہ لفظ معہود ذہنی کو پیش نظر رکھ کر بھی استعمال ہوتا ہے۔ اس کی متعدد مثالوں کی طرف ہم پیچھے اشارہ کرتے آئے ہیں اس وجہ سے اس سے مراد وہ جانور ہیں جو اس وقت تک انسان کے تصرف میں آ چکے تھے اور اس کی مختلف ضروریات میں کام آ رہے تھے۔

'اِلَّا مَنۡ سَبَقَ' کے استثناء کی نوعیت

'اِلَّا مَنۡ سَبَقَ عَلَیۡهِ الۡقَوۡلُ' یعنی تمہارے اہل میں سے وہ لوگ اس میں شامل نہیں ہیں جن کے باب میں خدا کا فیصلہ پہلے ہی صادر ہو چکا ہے۔ اس فیصلہ سے مراد وہ فیصلہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے شیطان کو روز اول ہی اس کے الٹی میٹم کے جواب میں سنا دیا تھا کہ جنوں اور انسانوں میں سے جو تیری پیروی کریں گے میں ان سب کو جہنم میں بھر دوں گا۔ مطلب یہ ہے کہ جو اس حکم ازلی کی زد میں آ چکے ہیں وہ تو اس میں سوار ہونے سے محروم رہیں گے باقی کو اس میں سوار کرا لو۔

ایمان سے محروم اکثریت گندگی کا ڈھیر ہے

'وَ مَاۤ اٰمَنَ مَعَهٗۤ اِلَّا قَلِیۡلٌ' سے اس حقیقت کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے کہ یہ ہولناک طوفان تمام موجود انسانوں کی عظیم اکثریت کو بہا لے گیا صرف تھوڑے سے لوگ، جو حضرت نوح پر ایمان لائے تھے، اس سے محفوظ رہے۔ اس سے اللہ جل شانہٗ کی بے نیازی کا بھی اظہار ہوتا ہے کہ اس کی نگاہوں میں وہ اکثریت گندگی کا ایک ڈھیر ہے جو ایمان سے محروم ہے، وہ اس گندگی سے اپنی زمین کو پاک ہی دیکھنا پسند کرتا ہے اور محض اس بنیاد پر کہ اس کی تعداد زیادہ ہے اپنی زمین کی پشت پر اس کو لادے رکھنا پسند نہیں کرتا۔ ساتھ ہی اہل ایمان

کے لیے اس کی بے پایاں رحمت کا بھی اظہار ہوتا ہے کہ ہر چند ان کی تعداد کتنی ہی کم ہو، لیکن خدائے رؤف رحیم ان جواہر ریزوں کی ہر حال میں اپنے دامن رحمت میں حفاظت فرماتا ہے یہاں تک کہ طوفان نوحؑ بھی ان کو کوئی گزند نہیں پہنچا سکتا۔ اس پہلو سے اس ٹکڑے میں قریش کی مغرور اکثریت کے لیے وعید بھی ہے اور ان کے اندر کے ان قلیل التعداد اور مظلوم مسلمانوں کے لیے عظیم پیغام تسلی بھی جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے تھے اور اس دور میں قریش کے ظلم و ستم کے ہدف بنے ہوئے تھے۔

وَقَالَ ارْكَبُوْا فِيْهَا بِسْمِ اللّٰهِ مَجْرٖىهَا وَمُرْسٰىهَا ۭ اِنَّ رَبِّيْ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (۴۱)

مومن کا مرکز نگاہ

اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق حضرت نوحؑ نے اپنے ساتھیوں کو کشتی میں سوار ہو جانے کی دعوت دی اور پہلا کلمہ جو اس موقع پر ان کی زبان سے نکلا وہ 'بِسْمِ اللّٰهِ مَجْرٖىهَا وَمُرْسٰىهَا... الاٰیۃ' ہے۔ یہ کلمہ اس حقیقت کی تعبیر ہے کہ اسباب و وسائل بجائے خود کتنی ہی اہمیت کیوں نہ رکھتے ہوں لیکن مومن کا اصلی اعتماد اسباب و وسائل پر نہیں بلکہ خدائے رحمان و رحیم کی رحمت و عنایت پر ہوتا ہے۔ اس کی عنایت شامل حال ہو تو متلاطم سمندر کے اندر لکڑی کا ایک ٹوٹا ہوا تختہ بھی آدمی کے لیے سہارا بن جاتا ہے۔ اور اگر یہ عنایت شامل حال نہ ہو تو عظیم الشان ٹیٹینک (TITANIC) بھی چشم زدن میں موجوں کا لقمہ بن جاتا ہے، اور سائنس کی ساری کارفرمائیاں بے حقیقت ثابت ہوتی ہیں۔ ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر کام کا آغاز بسم اللہ سے جو کرنے کی ہدایت فرمائی ہے اس میں اصلی رمز یہی ہے کہ ہماری نگاہ صرف اسباب پر ٹک کے نہ رہ جائے بلکہ اسباب کے پس پردہ جو مسبب الاسباب ہے وہ بھی نگاہ میں رہے اس لیے کہ اسباب اسی کے اذن سے کام کرتے ہیں۔ آخر میں 'غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ' کی صفات کا حوالہ اس حقیقت کو ظاہر کرتا ہے کہ جس طرح مجرد اسباب پر بھروسہ جائز نہیں ہے اسی طرح اپنے اعمال پر بھی، خواہ وہ کتنے ہی نیک کیوں نہ ہوں، غرہ نہیں ہونا چاہیے بلکہ اصل بھروسہ خدا کی مغفرت و رحمت ہی پر ہونا چاہیے۔ کون جانتا ہے کہ خدا کی میزان میں کس کے عمل کا کیا وزن ٹھہرتا ہے۔

وَهِيَ تَجْرِيْ بِهِمْ فِيْ مَوْجٍ كَالْجِبَالِ ۣ وَنَادٰي نُوْحُۨ ابْنَهٗ وَكَانَ فِيْ مَعْزِلٍ يّٰبُنَيَّ ارْكَبْ مَّعَنَا وَلَا تَكُنْ مَّعَ الْكٰفِرِيْنَ (۴۲)

حضرت نوحؑ کی وفاداری کا آخری امتحان

کشتی متلاطم موجوں کے اندر چل رہی تھی۔ موجیں اس طرح اٹھ رہی تھیں گویا کالے پہاڑ اٹھ رہے ہوں (یہ صحیح تصویر ہے طوفانی سمندر کے اندر موجوں کے اٹھنے کی) اتنے میں حضرت نوحؑ نے دیکھا کہ کچھ فاصلے پر ان کا بیٹا (تورات میں اس بیٹے کا نام کنعان آیا ہے) کھڑا ہے۔ اس کو دیکھ کر شفقت پدری جوش میں آگئی۔ اس کو آواز دے کر پکارا 'يّٰبُنَيَّ ارْكَبْ مَّعَنَا وَلَا تَكُنْ مَّعَ الْكٰفِرِيْنَ'۔ اس پکار میں بیک وقت شفقت اور دعوت دونوں کی روح سموئی ہوئی ہے۔ 'يّٰبُنَيَّ' باپ کی طرف سے بیٹے کے لیے نہایت پیار کا خطاب ہے اور 'وَلَا تَكُنْ مَّعَ الْكٰفِرِيْنَ' میں گویا آخری دعوت ہے کہ لخت جگر اب بھی موقع ہے کہ ان کافروں کا ساتھ چھوڑ کر ہم میں شامل ہو جا۔

وَهِيَ تَجْرِيْ' حال کا صیغہ تصویر حال کے لیے ہے۔ اسی طرح 'وَكَانَ فِيْ مَعْزِلٍ' کے الفاظ بھی اسی لیے وارد ہوئے ہیں کہ یہ منظر قاری کی نگاہوں کے سامنے آجائے۔ طوفانی ہوائیں چل رہی ہیں، موسلادھار بارش ہو رہی ہے، پہاڑوں کی طرح موجیں اٹھ رہی ہیں، ان موجوں کے تھپیڑوں سے حضرت نوحؑ کی کشتی نبرد آزما ہے کہ اتنے میں نگاہ جو اٹھتی ہے تو دیکھتے ہیں کہ کچھ فاصلے پر جوان سال بیٹا حالات سے ششدر و سراسیمہ کھڑا ہے۔ آخر یہ بھی تو ممکن تھا کہ یہ منظر ان کو نہ دکھایا جاتا، جس طرح دوسرے بہت سارے کفار ان کی نگاہوں سے اوجھل رہ کر ڈوبے اسی طرح یہ بھی نگاہوں سے دور کہیں کسی موج کا لقمہ بن جاتا۔ لیکن نہیں، اللہ تعالیٰ نے چاہا کہ حضرت نوحؑ بیٹے کے ڈوبنے کا عبرت انگیز تماشا اپنی آنکھوں سے دیکھیں۔ یہ حضرت نوحؑ کی وفاداری کا آخری امتحان تھا جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضرات انبیاءؑ کیسے کیسے امتحانوں سے گزارے جاتے ہیں لیکن اللہ کی توفیق سے وہ ہر امتحان میں ثابت قدم رہتے ہیں۔ نیز اس سے یہ حقیقت بھی واضح ہوتی ہے کہ خدا کا قانون جب آتا ہے لاگ ہے کہ نوحؑ کا بیٹا بھی نافرمان ہو تو وہ اس کی گردن بھی عین باپ کے سامنے دبا دیتا ہے تو تا بہ دیگراں چہ رسد۔

قَالَ سَاٰوِيْٓ اِلٰى جَبَلٍ يَّعْصِمُنِيْ مِنَ الْمَآءِ ۭ قَالَ لَا عَاصِمَ الْيَوْمَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ ۚ وَحَالَ بَيْنَهُمَا الْمَوْجُ فَكَانَ مِنَ الْمُغْرَقِيْنَ (۴۳)

ہولناک ٹریجڈی کا آخری منظر

بیٹا بھی بڑا ہی ہٹی تھا۔ یہ ہولناک منظر دیکھ کر بھی اس کی ہٹ دھرمی میں کوئی فرق نہیں آیا۔ باپ کی اس شفقت بھری دعوت کے جواب میں بولا کہ کچھ پروا نہیں، میں کسی پہاڑ کی پناہ لے لوں گا، وہ مجھے اس پانی سے بچا لے گا۔ حضرت نوحؑ نے فرمایا کہ یہ پانی نہیں بلکہ قہر الٰہی ہے جس سے آج کوئی بچانے والا نہیں بن سکتا۔ صرف وہی اس سے بچ سکے گا جس پر اللہ ہی رحم فرمائے۔ اتنے میں ایک موج باپ اور بیٹے کے درمیان حائل ہو گئی اور وہ بھی غرق ہو کے رہا۔ یہ اس ہولناک ٹریجڈی کا آخری منظر تھا۔ اس کے سامنے آجانے کے بعد فوراً آسمان و زمین سب کو احکام صادر ہو گئے کہ بس اب کام پورا ہو چکا!

وَقِيْلَ يٰٓاَرْضُ ابْلَعِيْ مَآءَكِ وَيٰسَمَآءُ اَقْلِعِيْ وَغِيْضَ الْمَآءُ وَقُضِيَ الْاَمْرُ وَاسْتَوَتْ عَلَى الْجُوْدِيِّ وَقِيْلَ بُعْدًا لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ (۴۴)

زمین کو حکم ہوا کہ اپنا پانی نگل لے۔ آسمان کو حکم ہوا کہ بس اب تھم جا۔

'اقلاع' کا مفہوم

'اقلاع' کے معنی کسی کام سے رک جانے کے بھی ہیں۔ 'یا سماء اقلعی'، ای امسکی من المطر'

'غیض الماء' کا مفہوم

'وَغِيْضَ الْمَآءُ' یعنی چڑھا ہوا پانی اتر گیا۔ 'غَاضَ يَغِيْضُ' لازم اور متعدی دونوں آتا ہے۔ 'غَاضَ الْمَآءُ' پانی اتر گیا، 'غَاضَ الْمَآءَ' پانی کو اتار دیا۔ یہاں متعدی استعمال ہوا ہے

'جودی' سے مراد

الجودی کوہستان اراراط کی ایک چوٹی کا نام ہے۔ تورات میں صرف اراراط کا ذکر ہے۔ قرآن نے خاص اس چوٹی کا ذکر کیا ہے جہاں کشتی جا کر ٹکی۔ اس سے طوفان کی ہولناکی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ چند دنوں میں پانی کہاں سے کہاں تک پہنچ گیا۔ اگر کسی محدود علاقہ میں بارش اتنی زیادہ ہو کہ نکاس کے تمام راستے اس کے پانی کو باہر نکالنے سے قاصر رہ جائیں تو وہاں پانی کا چڑھ جانا امر لازمی ہے۔

معذبین پر لعنت

'بُعۡدًا لِّلۡقَوۡمِ الظّٰلِمِيۡنَ' اظہارِ نفرت ولعنت کا جملہ ہے۔ یعنی خس کم جہاں پاک! ان ظالموں پر لعنت ہو! 'ظلم' سے یہاں اپنی جان پر ظلم مراد ہے یعنی اللہ نے توان کو نہایت اعلیٰ صلاحیتوں کے ساتھ پیدا کیا لیکن انھوں نے اپنی بداعمالیوں سے اپنے آپ کو خدا کی زمین پر غلاظت کا ایک ڈھیر بنا لیا جس کو صاف کرنے کے لیے خدا کو ایک طوفان بھیجنا پڑا۔

وَنَادٰى نُوۡحٌ رَّبَّهٗ فَقَالَ رَبِّ اِنَّ ابۡنِىۡ مِنۡ اَهۡلِىۡ وَاِنَّ وَعۡدَكَ الۡحَـقُّ وَاَنۡتَ اَحۡكَمُ الۡحٰكِمِيۡنَ (۴۵)

بلاغتِ کلام کا ایک خاص پہلو

یہ دعا حضرت نوحؑ نے اس وقت فرمائی ہے جب بیٹے کو ڈوبتے دیکھا اس وجہ سے بظاہر اس کا حوالہ آیت ۴۳ کے ساتھ آنا تھا لیکن بلاغت کلام کے اقتضا سے اس کا ذکر مؤخر ہوگیا۔ گویا خدا کی نگاہوں میں یہ شخص، حضرت نوحؑ کا بیٹا ہونے کے باوجود، ایسا نابکار تھا کہ جب تک خدا نے اس کو غرق نہیں کر لیا، اس کے باب میں حضرت نوحؑ کی دعا کو زیر بحث لانا بھی پسند نہیں فرمایا۔ اس غضب کی وجہ ظاہر ہے کہ اس دنیا میں اگر کسی انسان کو سب سے بڑی سعادت اور خوش بختی حاصل ہو سکتی ہے تو وہ یہی ہو سکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو کسی پیغمبر کے گھر میں جنم دے لیکن یہی خوش بختی سب سے بڑی بدبختی بھی ہو سکتی ہے اگر وہ اس کی قدر نہ کرے اور رسول کے گھر میں شیطان بن کر اٹھے۔ چنانچہ کلام کی ترتیب ہی سے یہ بات صاف عیاں ہے کہ اس شخص کو خدا نے سب سے زیادہ مبغوض قرار دیا۔ گویا سارے طوفان کا اصلی ہدف تھا ہی یہی کہ جب یہ ڈوب گیا تو معاً طوفان کے خاتمہ کا اعلان ہوگیا۔

حضرت نوحؑ کی شفقت پدری

حضرت نوحؑ نے یہ دعا شفقت پدری سے مغلوب ہو کر محض 'اہل' کے اس لفظ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے فرمائی جو اوپر آیت ۴۰ میں گزرا ہے کہ حضرت نوحؑ کو حکم ہوا کہ "اس کشتی میں ہر چیز کے نر و مادہ اور اپنے اہل و عیال کو بجز ان کے جن کے باب میں خدا کا فیصلہ پہلے ہی ہو چکا ہے، سوار کرا لو"۔ چونکہ 'اہل' کے لفظ میں ان کا بیٹا کنعان بھی بظاہر شامل تھا اور یہ بات تعین کے ساتھ ان کے علم میں نہیں تھی کہ یہ خدا کے اس فیصلہ کی زد میں آچکا ہے جس کا حوالہ ہم نے اوپر 'اِلَّا مَنۡ سَبَقَ عَلَيۡهِ الۡقَوۡلُ' کی وضاحت کرتے ہوئے دیا ہے۔ اس وجہ سے انھوں نے فریاد کی کہ اے رب، میرا یہ بیٹا بھی میرے اہل میں شامل ہے اور تیرا یہ وعدہ کہ تو میرے اہل کو اس کشتی کے ذریعہ سے نجات دے گا سچا وعدہ ہے اور تو سب سے بہتر فیصلہ فرمانے والا ہے۔ مطلب یہ کہ جب یہ تیرا سچا وعدہ موجود ہے تو میرا یہ بیٹا غرق کیوں ہوا؟

قَالَ يٰنُوۡحُ اِنَّهٗ لَيۡسَ مِنۡ اَهۡلِكَ‌ۚ اِنَّهٗ عَمَلٌ غَيۡرُ صَالِحٍ ‌‌ۖ فَلَا تَسۡـئَلۡنِ مَا لَـيۡسَ لَـكَ بِهٖ عِلۡمٌ‌ؕ اِنِّىۡۤ اَعِظُكَ اَنۡ تَكُوۡنَ مِنَ الۡجٰهِلِيۡنَ (۴۶)

نبی کا گھرانہ ایمان وعمل صالح سے بنتا ہے

اللہ تعالیٰ نے جواب میں فرمایا کہ یہ بیٹا تمہارے ان اہل میں شامل نہیں جن کے لیے نجات کا وعدہ تھا۔ نجات کا وعدہ صرف اہل ایمان کے لیے تھا اور تمہارے اہل میں سے اس میں وہی شامل تھے جو ایمان کے رشتہ سے تمہارے ساتھ وابستہ تھے۔ 'اِنَّهٗ عَمَلٌ

'غَيْرُ صَالِحٍ' یہ اسی طرح کا اسلوب بیان ہے جیسے کہیں 'زَيْدٌ عَدْلٌ' (زید سراپا عدل ہے) یعنی یہ شخص تمہارے اہل میں کیسے شمار ہو سکتا ہے، یہ تو بالکل نابکار و ناہنجار تھا۔ نبی کا گھرانا صرف نسب سے نہیں بنتا بلکہ ایمان و عمل صالح سے بنتا ہے۔ یہ تو ان لوگوں میں شامل تھا جن کے باب میں ہمارا فیصلہ صادر ہو چکا ہے کہ ہم ایسے تمام لوگوں کو جہنم میں بھر دیں گے تو تم ہم سے کسی ایسی بات کے لیے درخواست نہ کرو جس کے باب میں تمہیں کوئی علم نہیں۔ میں تمہیں نصیحت کرتا ہوں کہ تم جذبات سے مغلوب ہو جانے والوں میں سے نہ بنو۔ ہم دوسرے مقام میں لفظ 'جہل' کی تحقیق بیان کر چکے ہیں کہ عربی میں اس کا اصلی مفہوم جذبات سے مغلوب ہو جانا ہے۔

قَالَ رَبِّ إِنِّي أَعُوذُ بِكَ أَنْ أَسْأَلَكَ مَا لَيْسَ لِي بِهِ عِلْمٌ ۖ وَإِلَّا تَغْفِرْ لِي وَتَرْحَمْنِي أَكُن مِّنَ الْخَاسِرِينَ (۴۷)

حضرت نوح علیہ السلام نے اس تنبیہ کے بعد فوراً توبہ کی اور اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ قبول فرمائی۔

قِيلَ يَا نُوحُ اهْبِطْ بِسَلَامٍ مِّنَّا وَبَرَكَاتٍ عَلَيْكَ وَعَلَىٰ أُمَمٍ مِّمَّن مَّعَكَ ۚ وَأُمَمٌ سَنُمَتِّعُهُمْ ثُمَّ يَمَسُّهُم مِّنَّا عَذَابٌ أَلِيمٌ (۴۸)

حضرت نوحؑ کو برکات کی بشارت

طوفان گزر جانے کے بعد حضرت نوحؑ کو ہدایت ہوئی کہ اب خدا کی طرف سے سلامتی اور برکتوں کے سایہ میں زمین پر اترو۔ یہاں یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ کسی معذب قوم کے اندر سے جو لوگ اپنے ایمان اور اپنی عزیمت کی بدولت نجات پاتے ہیں چونکہ وہ آزمائش کی بھٹیوں سے گزر کر ہر قسم کے غل و غش سے بالکل پاک ہو جاتے ہیں اس وجہ سے رحمت الٰہی ان کی طرف خاص طور سے متوجہ ہوتی ہے اور ان کو اپنی مخصوص برکات و افضال کے سایہ میں پروان چڑھاتی ہے۔ ان کی مثال نہایت صالح بیجوں کی ہوتی ہے جو صالح زمین اور سازگار آب و ہوا میں پروان چڑھتے ہیں۔ اس وجہ سے ہر چند ان کی تعداد تھوڑی ہو لیکن وہ بہت جلد تمام اکناف کو گھیر لیتے ہیں۔ 'وَعَلَىٰ أُمَمٍ مِّمَّن مَّعَكَ' یعنی آج اگر بظاہر تمہارے ساتھ صرف چند نفوس ہیں لیکن چونکہ ان پر خدا کی رحمت و برکت ہے اس وجہ سے ان کے اندر بڑی بڑی قومیں اور ملتیں مضمر ہیں جو بالآخر ظہور میں آئیں گی اور تمام روئے زمین پر چھا جائیں گی۔ چنانچہ تاریخ شاہد ہے کہ طوفان نوح کے بعد یہی نفوس از سر نو آبادی کا ذریعہ بنے۔

ایک تنبیہ

'وَأُمَمٌ سَنُمَتِّعُهُمْ ثُمَّ يَمَسُّهُم مِّنَّا عَذَابٌ أَلِيمٌ' ساتھ ہی اس امر واقعہ سے آگاہ فرمایا کہ آئندہ ان کی نسل سے جو قومیں اٹھیں گی ان میں سب مبارک ہی نہیں ہوں گی بلکہ ان میں ایسی قومیں بھی ہوں گی جو عروج پکڑیں گی اور ہم ان کو ایک خاص حد تک مہلت بھی دیں گے بالآخر ان کے اعمال کی پاداش میں ہم ان کو ایک دردناک عذاب میں پکڑیں گے۔

آنحضرت صلعم کی طرف التفات

تِلْكَ مِنْ أَنبَاءِ الْغَيْبِ نُوحِيهَا إِلَيْكَ ۖ مَا كُنتَ تَعْلَمُهَا أَنتَ وَلَا قَوْمُكَ مِن قَبْلِ هَٰذَا ۖ فَاصْبِرْ ۖ إِنَّ الْعَاقِبَةَ لِلْمُتَّقِينَ (۴۹)

یہ خاتمۂ سرگزشت پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف التفات ہے کہ یہ سرگزشت نہ تمہارے علم میں تھی اور نہ تمہاری قوم ہی کے۔

یہ محض اللہ کا فضل ہے کہ اس نے اپنی وحی کے ذریعہ سے اس سے تم کو بھی آگاہ کیا اور تمہارے واسطہ سے تمہاری قوم کو بھی اس سے آگاہ ہونے کا سامان بہم پہنچایا۔ یہ امر یہاں واضح رہے کہ یہ سرگزشت اس واضح صورت میں، اپنے فوائد و نتائج کے ساتھ، پہلی مرتبہ قرآن ہی میں بیان ہوئی ہے۔ اس سے پہلے تورات میں اس کے بعض حصے بیان تو ضرور ہوئے تھے لیکن نہایت ہی پراگندہ اور مسخ شدہ شکل میں۔ پھر پچھلے صحیفوں سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی ناواقف تھے اور آپ کی قوم کے لوگ بھی۔ یہ تو قرآن کا فیض ہے کہ اس نے تاریخ کے ان حقائق سے آگاہ کیا اور یہ حقائق جس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھیوں کے لیے سبق آموز تھے اسی طرح آپ کی قوم اور آپ کے لیے بھی۔ فَاصْبِرْ اِنَّ الْعَاقِبَةَ لِلْمُتَّقِيْنَ۔ یہ خلاصہ ہے اس سرگزشت کا۔ مطلب یہ ہے کہ اپنی دعوت پر جمے رہو۔ انجام کار کی کامیابی خدا سے ڈرنے والوں ہی کو حاصل ہوتی ہے۔ تمہارے مخالف ناکام و نامراد ہوں گے۔

وَاِلٰى عَادٍ اَخَاهُمْ هُوْدًا ۚ قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ۭ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا مُفْتَرُوْنَ (۵۰)

قوم عاد و حضرت ہود

رسولوں کے باب میں یہ سنتِ الٰہی رہی ہے کہ ہر قوم کی طرف اللہ تعالیٰ نے انہی میں سے رسول بھیجا تاکہ انہی کے اندر کا ایک بہترین آدمی، انہی کی زبان میں ان پر حجت تمام کرے اور قومی و لسانی اجنبیت بیچ میں حائل نہ ہونے پائے۔ اس طرح گویا اپنی ہی زبان اور اپنا ہی دل اپنے اوپر گواہی دیتا ہے اور خود اپنا ہی بھائی حق نصیحت ادا کرتا ہے جس کی ہر اس شخص کو قدر کرنی چاہیے جس کے اندر حق کی عزت ہے۔ 'اَخَاهُمْ' کے لفظ سے اسی حقیقت کی طرف اشارہ مقصود ہے کہ ہم نے عاد کی طرف کسی غیر کو نہیں بلکہ انہی کے ایک بھائی کو رسول بنا کر بھیجا لیکن حق دشمنی کے جوش میں اس چیز کو بھی، جیسا کہ آگے تفصیل آئے گی، انھوں نے اس کی مخالفت کا بہانہ بنا لیا۔ اُعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ۔ یہی توحید کی دعوت شروع سے تمام انبیاء کی مشترک دعوت رہی ہے اور اسی کی دعوت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی بلند کی تھی۔ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا مُفْتَرُوْنَ یعنی اگر تم یہ دعوے کرتے ہو کہ کچھ اور معبود بھی ہیں جن کو خدا نے اپنا شریک ٹھہرایا ہے تو تم یہ خدا پر تہمت اور بہتان لگاتے ہو۔ خدا نے کہیں بھی یہ نہیں کہا ہے کہ اس نے کسی کو شریک بنایا ہے۔

يٰقَوْمِ لَآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا ۭ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلَى الَّذِيْ فَطَرَنِيْ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ (۵۱)

حضرت ہود کی بے قراری

یعنی میں اس طرح ٹوٹ ٹوٹ کر جو تمہیں سمجھا رہا ہوں تو اس لیے نہیں کہ اس کے عوض میں تم سے اپنا کوئی مفاد وابستہ رکھتا ہوں۔ یہ میں کوئی مالِ تجارت لے کر تمہارے پیچھے پیچھے نہیں پھر رہا ہوں اگر تم نے نہ خریدا تو میرا کاروبار بیٹھ جائے گا۔ یہ تو محض تمہاری صلاح و فلاح کی آرزو ہے جو تمہاری تمام ناقدریوں کے باوجود مجھے چین سے بیٹھنے نہیں دیتی تو خدارا میری بات توجہ سے سنو تو سہی۔ آخر میں اس کا کوئی معاوضہ تو نہیں مانگ رہا ہوں کہ تم میری بات سننے کے بھی روادار نہیں۔ جہاں تک میرے اجر کا تعلق ہے وہ میرے اس رب کے ذمہ ہے جس نے مجھ کو پیدا کیا ہے۔ میں تو تم کو کچھ دینا چاہتا ہوں، کچھ لینے کا خواہشمند نہیں ہوں۔ کیا اتنی واضح بات تمہاری سمجھ میں نہیں آ رہی ہے۔

وَيٰقَوْمِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ يُرْسِلِ السَّمَاۗءَ عَلَيْكُمْ مِّدْرَارًا وَّيَزِدْكُمْ قُوَّةً اِلٰى

قُوَّتِكُمْ وَلَا تَتَوَلَّوْا مُجْرِمِيْنَ (۵۲)

توبہ کی دعوت اور اس کی برکات

یہ قوم کو توبہ کی دعوت ہے کہ شرک اور نافرمانی سے تائب ہو کر خالص اپنے رب سے اپنے تعلق کو استوار کرو۔ ہم دوسرے مقام میں واضح کر چکے ہیں کہ توبہ کے دو رکن ہیں۔ ایک منفی دوسرا مثبت۔ منفی تو یہ ہے کہ آدمی نے جو غلط عقائد و اعمال اختیار کر رکھے ہیں ان سے دست بردار ہو، مثبت یہ ہے کہ ان کی جگہ صحیح عقائد و اعمال اختیار کرے۔ پہلے کے لیے استغفار کا لفظ ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ بندہ اپنے رب سے ملتجی ہو کہ وہ اس کے گناہوں سے درگزر فرمائے اور ان پر اپنے عفو و کرم کا پردہ ڈالے۔ دوسرے کے لیے توبہ کا لفظ ہے جس کے معنی رجوع کرنے کے ہیں۔ یعنی بندہ زندگی کی اس صراطِ مستقیم کی طرف رجوع کرے جو خدا نے اس کو بتائی ہے اور جو اس کو خدا تک پہنچانے والی ہے۔ ان میں سے پہلے کی بنیاد خشیت پر ہے اور دوسرے کی محبت پر۔ پھر شعور اور احساس ان کا لازمی جزو ہے۔ جب تک یہ تمام عناصر جمع نہ ہوں، مجرد 'توبہ توبہ' یا 'استغفر اللہ' کے ورد سے وہ توبہ وجود میں نہیں آتی جو خدا کے ہاں قبولیت کا درجہ پائے ـــــ يُرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَيْكُمْ مِّدْرَارًا وَّيَزِدْكُمْ قُوَّةً اِلٰى قُوَّتِكُمْ۔ خوب خوب بارش برسانا رزق و فضل میں زیادتی کی تعبیر ہے اور يَزِدْكُمْ قُوَّةً اِلٰى قُوَّتِكُمْ سے سیاسی قوت و شوکت میں اضافہ کی طرف اشارہ ہے۔ یہ اجتماعی توبہ کی برکتیں بیان ہوئی ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ یہ نہ خیال کرو کہ آسمان سے بارش تمہارے دیوتا برساتے ہیں اور میدانِ جنگ میں فتح تمہیں وہ دلاتے ہیں اس وجہ سے اگر تم نے ان کو چھوڑ دیا تو رزق سے بھی محروم ہو جاؤ گے اور تمہاری سیاسی جمعیت بھی پارہ پارہ ہو جائے گی۔ تمہارے یہ خیالات بالکل وہم پر مبنی ہیں۔ آسمان و زمین سب پر صرف خدا ہی کی بادشاہی ہے۔ اس وجہ سے اگر کوئی قوم اللہ کی طرف رجوع کرتی اور اس کی رسی مضبوطی سے پکڑ لیتی ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے لیے آسمان و زمین سب کی برکتوں کے دروازے کھول دیتا ہے اور چہار دانگ عالم پر اس کی حکومت قائم ہو جاتی ہے۔ استغفار و توبہ کی جو دعوت تمہیں ہمارا رسول دے رہا ہے اس کو فرمانبردارانہ قبول کرو، اس سے مجرمانہ منہ نہ موڑو ـــــ اگرچہ یہاں، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، اجتماعی توبہ کی برکتیں بیان ہوئی ہیں لیکن اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ انفرادی توبہ ان برکتوں سے خالی ہوتی ہے۔ جو بندہ گناہ کی زندگی سے منہ موڑ کر اللہ کی طرف رجوع کرتا ہے اللہ تعالیٰ رزقِ طیب سے اس کی کفالت فرماتا اور اس کو سکینت و طمانیت کی لازوال بادشاہت بخشتا ہے۔

قَالُوْا يٰهُوْدُ مَا جِئْتَنَا بِبَيِّنَةٍ وَّمَا نَحْنُ بِتَارِكِيْٓ اٰلِهَتِنَا عَنْ قَوْلِكَ وَمَا نَحْنُ لَكَ بِمُؤْمِنِيْنَ (۵۳)

قوم کی طرف سے معجزہ کا مطالبہ

بینۃ سے مراد یہاں کوئی کھلا ہوا حسی معجزہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہم تمہارا اتنا بڑا دعویٰ کہ تم خدا کے رسول ہو کر ہمارے پاس آئے ہو اور اتنا بڑا مطالبہ کہ ہم اپنے معبودوں کو چھوڑ دیں، مجرد تمہارے کہہ دینے سے کس طرح قبول کر لیں؟ ہم یہ دعویٰ اور مطالبہ تو صرف اس صورت میں مان سکتے تھے جب تم کوئی کھلا ہوا معجزہ دکھاتے۔ لیکن جب تم اس طرح کا کوئی معجزہ لے کر نہیں آئے تو ہم مجرد تمہارے کہے پر نہ اپنے معبودوں ہی کو چھوڑنے کے لیے تیار

ہیں اور نہ تمھارے اس دعوے ہی کی تصدیق کے لیے تیار ہیں کہ تم خدا کے رسول ہو۔

اِنْ نَّقُوْلُ اِلَّا اعْتَرٰىكَ بَعْضُ اٰلِهَتِنَا بِسُوْٓءٍ ۭ قَالَ اِنِّىْٓ اُشْهِدُ اللّٰهَ وَاشْهَدُوْٓا اَنِّىْ بَرِيْۗءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ ۙ مِنْ دُوْنِهٖ فَكِيْدُوْنِيْ جَمِيْعًا ثُمَّ لَا تُنْظِرُوْنِ (۵۴-۵۵)

حضرت ہودؑ کی غیرتِ حق

'اِعْتِرَاء' کے معنی پہنچنے اور لاحق ہونے کے ہیں. یعنی تمہارا یہ دعویٰ اور یہ مطالبہ تسلیم کرنا تو الگ رہا، ہمارا کہنا تو یہ ہے کہ تم پر ہمارے معبودوں ہی میں سے کسی کی مار پڑی ہے جس کے اثر سے تم باؤلے ہو کر اس قسم کی بہکی بہکی باتیں کرنے لگے ہو۔ ان کی یہ بات سنتے ہی حضرت ہودؑ کی غیرتِ توحید بھڑک اٹھی۔ انداز کلام سے مترشح ہوتا ہے کہ انھوں نے ان کی بات کاٹ کر فوراً پورے جوش کے ساتھ جواب دیا کہ "میں اللہ کو گواہ کر کے کہتا ہوں اور تم بھی گواہ رہو کہ اللہ کے سوا تم جن چیزوں کو شریک مانتے ہو، میں ان سے بری ہوں"۔ 'فَكِيْدُوْنِيْ جَمِيْعًا ثُمَّ لَا تُنْظِرُوْنِ' اعلان برأت کے ساتھ یہ چیلنج ہے کہ اگر تمہارا گمان یہ ہے کہ تمہارے یہ معبود مجھے کوئی ضرر پہنچا سکتے ہیں تو تم اور تمہارے یہ سارے معبود مل کر میرے ساتھ جو داؤ گھات کرنا چاہتے ہو کر ڈالو اور پھر مجھے ذرا مہلت نہ دو۔ یعنی اپنے ترکش کے آخری تیر بھی آزما دیکھو کہ دل میں کوئی ارمان باقی نہ رہ جائے۔

اِنِّىْ تَوَكَّلْتُ عَلَى اللّٰهِ رَبِّيْ وَرَبِّكُمْ ۭ مَا مِنْ دَاۗبَّةٍ اِلَّا هُوَ اٰخِذٌۢ بِنَاصِيَتِهَا ۭ اِنَّ رَبِّيْ عَلٰي صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ (۵۶)

مومن کی ڈھال: توکل

یہ ہے مومن موحد کی وہ ڈھال جس کے بل پر حضرت ہودؑ نے مذکورہ بالا چیلنج دیا۔ فرمایا کہ میرا بھروسہ اللہ پر ہے جو میرا رب بھی ہے اور تمہارا بھی۔ مجال نہیں ہے کہ اس کے اذن کے بغیر کسی کو کوئی گزند پہنچا سکے۔ 'مَا مِنْ دَاۗبَّةٍ اِلَّا هُوَ اٰخِذٌۢ بِنَاصِيَتِهَا' کوئی جاندار ایسا نہیں ہے جو اس کے قبضۂ قدرت سے باہر ہو۔ سب کی پیشانی اس کی مٹھی میں ہے۔ وہ جس کو جدھر چاہے اس کی چوٹی پکڑ کر موڑ دے اور جہاں چاہے روک لے۔ 'اِنَّ رَبِّيْ عَلٰي صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ' اور یہ نہ سمجھو کہ مجھے اپنے رب تک پہنچنے کے لیے بہت سی کج پیچ کی راہوں سے گزرنے اور تمہارے عقیدے کے مطابق بہت سے واسطوں اور وسیلوں کی ضرورت ہو۔ بلکہ میری عقل اور میری فطرت کو اس سے براہ راست ربط ہے۔ اس تک پہنچنے کے لیے یہ کافی ہے کہ میں صدق دل سے اس کی طرف متوجہ ہو جاؤں، اگر میں متوجہ ہو جاؤں تو وہ بالکل سیدھی راہ پر میرے سامنے ہے۔ یہاں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ مشرکین کا عقیدہ یہ تھا کہ خدا تک پہنچنے کا واسطہ ان کے اصنام ہی ہیں اس وجہ سے بغیر ان کی عبادت کے کوئی خدا کو نہیں پا سکتا۔ اپنے اسی عقیدے کو وہ یوں پیش کرتے تھے کہ 'مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَآ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى' (ہم ان کی عبادت صرف اس لیے کرتے ہیں کہ یہ ہم کو خدا سے قریب کر دیں) ان کے اسی عقیدے کی بنا پر قرآن نے ان کا جرم یہ بتایا ہے کہ وہ خدا تک پہنچنے کی سیدھی راہ سے لوگوں کو روکتے ہیں اور اس سیدھی راہ کو کج کرنا چاہتے ہیں 'وَالَّذِيْنَ يَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَيَبْغُوْنَهَا عِوَجًا' (۴۵ الاعراف) حضرت ہودؑ نے اسی عقیدۂ باطل کی تردید فرمائی ہے اور غور کیجیے تو یہ حقیقت سامنے آئے گی کہ جب تک آدمی کے اندر خدا کے قرب و اتصال کا وہ تصور موجود نہ ہو جو ایک

سچے موحد کے اندر رہتا ہے اس وقت تک اس کو خدا پر وہ توکل نہیں ہو سکتا کہ حضرت ہودؑ کی طرح ساری خدائی کو چیلنج کر سکے۔

فَإِنْ تَوَلَّوْا فَقَدْ أَبْلَغْتُكُمْ مَا أُرْسِلْتُ بِهِ إِلَيْكُمْ ۚ وَيَسْتَخْلِفُ رَبِّي قَوْمًا غَيْرَكُمْ وَلَا تَضُرُّونَهُ شَيْئًا ۚ إِنَّ رَبِّي عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ حَفِيظٌ (۵۷)

حضرت ہودؑ کی آخری تنبیہ

یہ حضرت ہودؑ کی طرف سے آخری تنبیہ ہے کہ اگر تم اسی اعراض کی روش پر اڑے رہنے کا فیصلہ کر چکے ہو تو اب نتائج کی تمام ذمہ داری تمہارے ہی سر ہے، اس لیے کہ مجھے اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو پیغام دے کر بھیجا گیا تھا وہ میں تمہیں واضح طور پر پہنچا چکا ہوں۔ اب آگے کا مرحلہ یہ ہے کہ میرا رب تمہاری جڑ کاٹ دے گا۔ وَيَسْتَخْلِفُ رَبِّي قَوْمًا غَيْرَكُمْ اور تمہاری جگہ تمہارے سوا کسی اور قوم کو متمکن کر دے گا۔ وَلَا تَضُرُّونَهُ شَيْئًا: اور یہ نہ سمجھو کہ تمہارے اجڑ جانے سے خدا کی دنیا اجڑ جائے گی۔ تمہارا فنا ہو جانا اس کے یا اس کی دنیا کے لیے ذرا بھی ضرر رساں نہیں۔ وہ ہر چیز کا نگران اور محافظ ہے۔ جو چیز بگڑ جاتی ہے اس کو مٹا کر اس کی جگہ دوسری نئی چیز لا دیتا ہے۔ یہ نہیں ہے کہ وہ ایک مرتبہ اس دنیا کو بنا کر پھر اس سے بے تعلق ہو کر بیٹھ رہا ہو بلکہ وہ برابر اس کی نگرانی بھی کر رہا ہے۔ اگر کوئی قوم اپنے حدود سے گزر جاتی ہے تو ایک خاص حد تک مہلت دینے کے بعد اس کو درست بھی کر دیتا ہے۔

وَلَمَّا جَاءَ أَمْرُنَا نَجَّيْنَا هُودًا وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ بِرَحْمَةٍ مِنَّا وَنَجَّيْنَاهُمْ مِنْ عَذَابٍ غَلِيظٍ (۵۸)

قومِ عاد کے عذاب کی نوعیت

'امر' سے مراد یہاں وہ عذاب ہے جو امرِ الٰہی کے تحت ظہور میں آیا۔ اس عذاب کی نوعیت کیا تھی؟ اس کی کوئی تفصیل یہاں نہیں ہے۔ ہمارے استاذ مولانا فراہیؒ نے سورۂ ذاریات کی تفسیر میں اس کی نوعیت پر تفصیل سے بحث کی ہے۔ اس بحث کی تمہید مولانا نے یوں اٹھائی ہے۔

"قرآن مجید میں قومِ عاد کی ہلاکت کی جو تفصیلات بیان ہوئی ہیں ان پر جو شخص غور کرے گا اس سے یہ حقیقت مخفی نہیں رہ سکتی کہ وہ تند ہوا کے ذریعے سے ہلاک کیے گئے جس کے ساتھ سرما کے وہ بادل بھی تھے جو ہمیشہ رعد و برق کے ساتھ نمودار ہوتے ہیں۔ قرآن میں جہاں ان کی تباہی کا ذکر ہوا ہے ہوا کے ساتھ بادل، پانی سے خالی، اور صاعقہ کا بھی ذکر ہوا ہے۔ سورۂ احقاف میں ہے۔ فَلَمَّا رَأَوْهُ عَارِضًا مُسْتَقْبِلَ أَوْدِيَتِهِمْ قَالُوا هَٰذَا عَارِضٌ مُمْطِرُنَا ۚ بَلْ هُوَ مَا اسْتَعْجَلْتُمْ بِهِ ۖ رِيحٌ فِيهَا عَذَابٌ أَلِيمٌ ۝ تُدَمِّرُ كُلَّ شَيْءٍ بِأَمْرِ رَبِّهَا (پس جب انھوں نے اس کو عذاب کی دیکھا ابر کی صورت میں اپنی وادیوں کی طرف بڑھتے ہوئے، بولے یہ تو بادل ہے جو ہم پر برسنے والا ہے بلکہ یہ وہ چیز ہے جس کے لیے تم جلدی مچائے ہوئے تھے۔ بادِ تند جس کے اندر ایک دردناک عذاب ہے۔ یہ اکھاڑ پھینکے گی ہر چیز کو اپنے رب کے حکم سے)

ظاہر ہے یہ تمام خصوصیات موسمِ سرما کی بادِ تند کی ہیں۔ اس زمانے میں، عرب میں بادِ شمال صرصر کی شکل میں نمودار ہوتی ہے اور قحط و خشکی کی ایک عام نحوست اور تباہی ہر طرف پھیل جاتی ہے۔ سورۂ قمر میں اسی چیز کی

طرف اشارہ فرمایا ہے۔ اِنَّآ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيْحًا صَرْصَرًا ... مُّسْتَمِرٍّ (اور ہم نے ان پر باد صرصر چلادی قائم رہنے والی نحوست کے زمانے میں) اسی طرح ... میں ہے فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيْحًا صَرْصَرًا فِيْٓ اَيَّامٍ نَّحِسَاتٍ (پس ہم نے ان پر باد صرصر چلادی نحوست کے زمانے میں) باد صرصر کے یہ طوفان، جیسا کہ ہم نے عرض کیا، عرب میں جاڑوں میں ظاہر ہوتے ہیں اور یہی زمانہ ان کے ہاں نحوست اور فاقہ کا سمجھا جاتا ہے۔ (تفسیر سورۂ ذاریات فراہیؒ۔ فصل ۱۷)

اہل ایمان پر اللہ کا فضل

جب یہ عذاب نازل ہوا تو اللہ تعالیٰ نے اپنی سنت کے مطابق اپنے رسول حضرت ہودؑ اور ان کے باایمان ساتھیوں کو اپنے فضل خاص سے اس عذاب سے بچا لیا اور باقی سب کو فنا کر دیا۔ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا سے اس رحمت کی عظمت و شان ظاہر ہو رہی ہے اس لیے کہ جو عذاب پورے علاقہ پر آیا، اس سے تھوڑے سے مخصوص لوگوں کو اس طرح اپنی رحمت کے پروں کے نیچے چھپا کر بچا لینا عنایت الٰہی کا ایک عظیم کرشمہ ہے۔ وَنَجَّيْنٰهُمْ مِّنْ عَذَابٍ غَلِيْظٍ یعنی یہ نہ سمجھو کہ ہم نے انھیں کسی معمولی آفت سے چھڑایا بلکہ نہایت ہی سخت و شدید عذاب سے چھڑایا۔ اس سے عذاب کی ہولناکی کا بھی اظہار ہو رہا ہے اور اس عظیم رحمت کا بھی جو حضرت ہودؑ اور ان کے ساتھیوں کے لیے ظاہر ہوئی۔ مفسرین نے عام طور پر اس سے عذاب آخرت مراد لیا ہے لیکن ہم نے جو اس کا خاص پہلو واضح کیا ہے وہ موقع و محل سے نہایت واضح مناسبت رکھتا ہے۔

وَتِلْكَ عَادٌ جَحَدُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ وَعَصَوْا رُسُلَهٗ وَاتَّبَعُوْٓا اَمْرَ كُلِّ جَبَّارٍ عَنِيْدٍ
وَاُتْبِعُوْا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا لَعْنَةً وَّيَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ اَلَآ اِنَّ عَادًا كَفَرُوْا رَبَّهُمْ ۭ اَلَا بُعْدًا
لِّعَادٍ قَوْمِ هُوْدٍ (۵۹ - ۶۰)

قریش کو تنبیہ

وَتِلْكَ کا اشارہ مخاطب یعنی قریش کو اس سرگزشت کی طرف توجہ دلانے کے لیے ہے کہ ان کے انجام سے سبق لو اور عبرت پکڑو۔ یہ کسی دوسرے کی سرگزشت نہیں، تمہاری اپنی ہی سرزمین کا ماجرا ہے۔ جَحَدُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ انھوں نے بھی تمہاری ہی طرح اپنے رب کی نشانیوں کا دیدہ و دانستہ، جیسا کہ دوسری جگہ تصریح ہے، انکار کیا۔ وَعَصَوْا رُسُلَهٗ اور اس کے رسولوں کی نافرمانی کی۔ یہاں یہ امر ملحوظ رہے کہ اگرچہ بظاہر انھوں نے نافرمانی ایک ہی رسول — حضرت ہودؑ — کی کی تھی لیکن لفظ جمع کا 'رُسُل' استعمال ہوا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اعتبار اصل علت فعل کا ہوتا ہے نہ کہ مخصوص فعل کا۔ جس علت کی بنا پر انھوں نے حضرت ہودؑ کو جھٹلایا اس کی موجودگی کی صورت میں کسی رسول کے ساتھ بھی ان کا معاملہ اس سے مختلف نہیں ہو سکتا تھا۔ وَاتَّبَعُوْٓا اَمْرَ كُلِّ جَبَّارٍ عَنِيْدٍ یعنی رسولوں کی تو انھوں نے نافرمانی کی اور سرکشوں اور ضدیوں کی بات مانی۔ انجام اس بدبختانہ روش کا یہ ہوا کہ وَاُتْبِعُوْا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا لَعْنَةً وَّيَوْمَ الْقِيٰمَةِ اس دنیا میں بھی ان کے پیچھے لعنت لگا دی گئی اور آخرت میں بھی ان کے پیچھے یہ لعنت لگی رہے گی۔ یہ حقیقت بھی یہاں پیش نظر رہے کہ اس دنیا میں انسان کے لیے دو ہی راستے ہیں۔ ایک رحمان کا، دوسرا شیطان کا اور انہی میں سے کسی ایک کی پیروی اس کے لیے ناگزیر ہے۔ اگر وہ رحمان کے راستہ کو نہیں اختیار کرے گا تو لازماً شیطان

کی پیروی کرے گا۔ بیچ کی کوئی اور راہ نہیں ہے۔ آخر میں فرمایا کہ پھر متنبہ کیا کہ کان کھول کر سن لو کہ عاد نے اپنے رب کا انکار کیا اَلَا بُعْدًا لِّعَادٍ قَوْمِ هُوْدٍ سن لو کہ ہود کی قوم عاد پر خدا کی مار!

وَاِلٰی ثَمُوْدَ اَخَاهُمْ صٰلِحًا ۘ قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ هُوَ اَنْشَاَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ وَاسْتَعْمَرَكُمْ فِيْهَا فَاسْتَغْفِرُوْهُ ثُمَّ تُوْبُوْا اِلَيْهِ ؕ اِنَّ رَبِّيْ قَرِيْبٌ مُّجِيْبٌ (۶۱)

اور قوم ثمود کی سرگزشت

عاد کے بعد عرب کی قدیم اقوام میں ثمود نے اپنی تمدنی و تعمیری ترقیوں کے اعتبار سے بڑی شہرت حاصل کی۔ اعراف ۷۴، کے تحت ان کی تعمیری ترقیوں کا ذکر گزر چکا ہے۔ ان کی طرف اللہ تعالیٰ نے حضرت صالحؑ کو رسول بنا کر بھیجا جو ان کے اپنے ہی بھائی بند تھے تاکہ قومی اجنبیت کسی وحشت و بیگانگی کا باعث نہ بنے۔ انھوں نے توحید کی دعوت کے ساتھ اپنی قوم کو اس حقیقت کی طرف بھی توجہ دلائی کہ یہ خدا ہی ہے جس نے تمھیں زمین سے پیدا کیا اور تمھیں اس کی تعمیر و ترقی میں لگا دیا۔ هُوَ اَنْشَاَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ وَاسْتَعْمَرَكُمْ فِيْهَا، اِسْتَعْمَرَهٗ فِی الْمَكَانِ کے معنی ہیں اس کو اس کی اصلاح و تعمیر میں لگا دیا۔ مطلب یہ ہے کہ تم کو تعمیر و تمدن میں جو ترقی نصیب ہوئی ہے تو یہ بھی خدا ہی کا عطیہ ہے، اسی کی بخشی ہوئی صلاحیتوں کی بدولت تم یہ کارنامے انجام دینے کے قابل ہوئے تو ان کارناموں پر مغرور ہو کر زمین میں فساد برپا کرنے والے نہ بنو بلکہ اپنے گناہوں کی معافی چاہو اور صدق دل سے اس کی طرف رجوع کرو۔ اِنَّ رَبِّيْ قَرِيْبٌ مُّجِيْبٌ، میرا رب قریب بھی ہے اور دعاؤں اور التجاؤں کو قبول کرنے والا بھی۔ یعنی اس کو پانے کے لیے یہ کافی ہے کہ تم اخلاص کے ساتھ اس کی طرف توجہ کرو، تمھارے ان شفعاء و شرکاء کی مطلق ضرورت نہیں ہے جن کو تم اس کا قرب حاصل کرنے کے لیے شرط لازم ٹھہراتے ہو۔

قَالُوْا يٰصٰلِحُ قَدْ كُنْتَ فِيْنَا مَرْجُوًّا قَبْلَ هٰذَآ اَتَنْهٰىنَآ اَنْ نَّعْبُدَ مَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا وَاِنَّنَا لَفِيْ شَكٍّ مِّمَّا تَدْعُوْنَآ اِلَيْهِ مُرِيْبٍ (۶۲)

انبیاءؑ [illegible] [illegible] سے ہے

"مَرْجُوًّا" سے مراد وہ شخص ہے جس کی اٹھان ایسی اچھی رہی ہو کہ وہ قوم و قبیلہ کی امیدوں اور آرزوؤں کا مرکز بن جائے اور لوگ مستقبل میں اس سے بڑی بڑی امیدیں وابستہ کرنے لگیں۔ حضرات انبیاء علیہم السلام چونکہ نخل فطرت کے بہترین ثمر تھے اس وجہ سے منصب نبوت پر سرفراز ہونے سے پہلے بھی وہ اپنی پوری قوم میں اپنی اعلیٰ صلاحیتوں اور اپنے پاکیزہ اخلاق و اوصاف کے اعتبار سے نہایت ممتاز ہوتے ہیں۔ ان کے اس وصف کا تقاضا تو یہ تھا کہ جب وہ نبوت کے دعوے کے ساتھ سامنے آتے تو لوگ سنجیدگی کے ساتھ ان کی بات پر غور کرتے لیکن یہ عجیب بات ہے کہ انبیاء کی قوموں کا معاملہ بالعموم اس کے برعکس رہا ہے۔ جس شخص کو وہ زندگی بھر صادق اور امین مانتے رہے جونہی اس نے اپنی نبوت کا اظہار کیا اس کو کذاب اور مفتری کہنے لگے اور اس کی جان کے درپے ہو گئے۔ صرف تھوڑے سے لوگ ایسے نکلے جنھوں نے معاملے پر سنجیدگی کے ساتھ غور کرنے کی توفیق پائی۔

حضرت صالحؑ پر قوم کے اعتراضات

حضرت صالحؑ کی قوم کو بھی پہلے ان سے بڑا حسن ظن تھا لیکن جب وہ نبی کی حیثیت سے سامنے آئے، توحید کی دعوت دی اور شرک سے روکا تو ان کا سارا حسن ظن غائب ہو گیا۔ وہ بولے کہ ہم تو تم سے بڑی بڑی امیدیں

وابستہ کیے ہوئے تھے کہ تم سے باپ دادا کا نام روشن اور دینِ آبائی کی عزت و عظمت میں اضافہ ہوگا لیکن تم اچھے نکلے کہ ہمیں ہمارے ان معبودوں کی عبادت سے روکنے اٹھ کھڑے ہوئے جن کو ہمارے باپ دادا پوجتے آئے۔ بھائی سچی بات تو یہ ہے کہ اس دعوت کے سبب جو تم ہمیں دے رہے ہو ہم سخت شک اور الجھن میں پڑ گئے ہیں۔ 'أَتَنْهَانَا أَنْ نَعْبُدَ' میں 'عن' محذوف ہو گیا ہے۔ اصل میں 'عَنْ أَنْ نَعْبُدَ' ہے۔ 'مِمَّا تَدْعُونَا إِلَيْهِ' سے حضرت صالحؑ کی دعوتِ توحید مراد ہے۔ 'شک' کے ساتھ 'مُرِيبٍ' کی صفت سے مضمون میں یہ اضافہ ہو گیا ہے کہ تمہاری اس دعوت سے ہماری امیدوں کو بڑا دھکا لگا ہے۔ ہم کیا توقعات لیے بیٹھے تھے اور تم کیا فتنہ لے کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ 'ارابہ' کے معنی لغت میں 'ازعجہ و اقلقہ' کے ہیں۔ یعنی اس نے اس کو اضطراب اور الجھن میں ڈال دیا۔

قَالَ يَٰقَوْمِ أَرَءَيْتُمْ إِن كُنتُ عَلَىٰ بَيِّنَةٍ مِّن رَّبِّي وَءَاتَىٰنِي مِنْهُ رَحْمَةً فَمَن يَنصُرُنِي مِنَ ٱللَّهِ إِنْ عَصَيْتُهُۥ ۖ فَمَا تَزِيدُونَنِي غَيْرَ تَخْسِيرٍ (۶۳)

حضرت صالحؑ کا جواب

'بینۃ' اور 'رحمۃ' پر آیت ۱۷ اور آیت ۲۸ کے تحت بحث گزر چکی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ میں تو جو دعوت دے رہا ہوں وہ میری فطرت کی آواز بھی ہے اور مزید برآں وحیِ الٰہی کی تعلیم بھی جو مجھے براہِ راست حاصل ہوئی تو اب اگر میں اس راہ سے ہٹ کر کوئی اور راہ اختیار کروں تو مجھے خدا کی پکڑ سے بچانے والا کون بنے گا؟ 'فَمَا تَزِيدُونَنِي غَيْرَ تَخْسِيرٍ' یعنی اگر میں یہ راہ چھوڑ کر تمہاری وہ توقعات پوری کرنے میں لگ جاؤں تو تم میری بدبختی اور نامرادی ہی میں اضافہ کرو گے، خدا کے مقابل میں میری کوئی مدد نہیں کر سکو گے۔

وَيَٰقَوْمِ هَٰذِهِۦ نَاقَةُ ٱللَّهِ لَكُمْ ءَايَةً فَذَرُوهَا تَأْكُلْ فِيٓ أَرْضِ ٱللَّهِ ۖ وَلَا تَمَسُّوهَا بِسُوٓءٍ فَيَأْخُذَكُمْ عَذَابٌ قَرِيبٌ ۝ فَعَقَرُوهَا فَقَالَ تَمَتَّعُوا۟ فِي دَارِكُمْ ثَلَٰثَةَ أَيَّامٍ ۖ ذَٰلِكَ وَعْدٌ غَيْرُ مَكْذُوبٍ (۶۴-۶۵)

ناقہ کا معجزہ

بعینہٖ یہی مضمون کم و بیش انہی الفاظ میں اعراف آیت ۷۳ میں گزر چکا ہے۔ وہاں ہم نے اس کے تمام اہم اجزا کی بھی تشریح کی ہے اور ناقہ کی نشانی کے ظہور کا موقع و محل اور اس کا مقصد بھی واضح کیا ہے۔

فَلَمَّا جَآءَ أَمْرُنَا نَجَّيْنَا صَٰلِحًا وَٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ مَعَهُۥ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا وَمِنْ خِزْىِ يَوْمِئِذٍ ۗ إِنَّ رَبَّكَ هُوَ ٱلْقَوِىُّ ٱلْعَزِيزُ (۶۶)

'امر' سے مراد وہ عذاب ہے جو ثمود پر اللہ تعالیٰ کے حکم سے آیا۔ اس عذاب کو لفظ 'امر' سے تعبیر کرنے میں یہ بلاغت ہے کہ جونہی حکم صادر ہوا معاً عذاب آ دھمکا۔ گویا امر ہی کے اندر عذاب مضمر تھا۔ 'نَجَّيْنَا صَٰلِحًا وَٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ مَعَهُۥ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا'، یعنی ہم نے اپنے خاص فضل سے صالحؑ اور اس کے ساتھ ایمان لانے والوں کو نجات دی۔ ورنہ یہ آفت ایسی بے پناہ اور ہمہ گیر تھی کہ اللہ کی رحمت کے سوا اور کوئی چیز اس سے نجات دلانے والی نہیں بن سکتی تھی۔ 'وَمِنْ خِزْىِ يَوْمِئِذٍ' یعنی 'وَنَجَّيْنَاهُم مِّنْ خِزْىِ يَوْمِئِذٍ' جس طرح اوپر آیت ۵۸ میں ہے۔ 'وَنَجَّيْنَٰهُم مِّنْ عَذَابٍ غَلِيظٍ' وہاں فعل کو ظاہر کر دیا ہے۔ یہاں قرینہ کی موجودگی کے سبب سے حذف کر دیا۔ مطلب یہ ہے کہ یہ نہ سمجھو کہ ان کو کسی معمولی آفت

قریش کو تنبیہ
آنحضرت صلعم
کو ...

سے نجات بخشی بلکہ اس دن کی رسوائی سے نجات بخشی جس کی رسوائی معروف خواص و عوام ہے۔ یہ امر بھی یہاں ملحوظ رہے کہ رسول کی تکذیب کے نتیجہ میں جب کسی قوم پر عذاب آیا ہے تو وہ کامل تذکیر و تبلیغ اور کامل اتمام حجت کے بعد ان لوگوں پر آیا ہے جو اپنے غرور کے سبب سے کسی بات کو سننے اور سمجھنے کے لیے تیار ہی نہیں ہوتے تھے اس وجہ سے اس کا نمایاں پہلو یہ بھی رہا ہے کہ اس نے ان کو صرف پامال ہی نہیں کیا بلکہ آخری درجہ میں ذلیل اور رسوا کر کے بھی رکھ دیا۔ اِنَّ رَبَّکَ ھُوَ الْقَوِیُّ الْعَزِیْزُ یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے پیام تسکین و تسلی ہے کہ قوت اور عزت کا اصل مالک تو تیرا رب ہی ہے۔ اگر اس میں سے کسی کو کوئی حصہ نصیب ہوتا ہے تو اسی کی عنایت سے نصیب ہوتا ہے تو تم مطمئن رہو جس طرح اس نے صالحؑ کے دشمنوں کو ذلیل و پامال کر کے رکھ دیا اسی طرح تمہارے دشمنوں کو بھی ایک دن رسوا کر دے گا اور کوئی اس کا ہاتھ پکڑنے والا نہیں بن سکے گا۔

وَاَخَذَ الَّذِیْنَ ظَلَمُوا الصَّیْحَۃُ فَاَصْبَحُوْا فِیْ دِیَارِھِمْ جٰثِمِیْنَ ۝ کَاَنْ لَّمْ یَغْنَوْا فِیْھَا ؕ اَلَآ اِنَّ ثَمُوْدَا۟ کَفَرُوْا رَبَّھُمْ ؕ اَلَا بُعْدًا لِّثَمُوْدَ ﴿۶۷ - ۶۸﴾

قوم ثمود پر عذاب کی نوعیت

صَیْحَۃ کے معنی ڈانٹ کے ہیں۔ اس سے مراد وہ عذاب ہے جو قوم ثمود پر آیا چونکہ لحاظ لفظ کا نہیں بلکہ مفہوم کا ہوا اس وجہ سے فعل اس کے لیے مذکر استعمال ہوا۔ اس قوم پر اللہ تعالیٰ نے سرا کی بادِ صرصر اور کڑک دمک والے اور زلزلے کا عذاب بھیجا۔ فَاَصْبَحُوْا فِیْ دِیَارِھِمْ جٰثِمِیْنَ کَاَنْ لَّمْ یَغْنَوْا فِیْھَا، نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اپنے گھروں میں اوندھے منہ پڑے کے پڑے رہ گئے اور اس طرح بے نام و نشان ہوئے گویا کبھی ان میں بسے ہی نہیں۔ 'اَلَا بُعْدًا لِّثَمُوْدَ' یہ اظہار نفرت و لعنت کا جملہ ہے۔ اس کی وضاحت اوپر ہو چکی ہے۔

وَلَقَدْ جَآءَتْ رُسُلُنَآ اِبْرٰھِیْمَ بِالْبُشْرٰی قَالُوْا سَلٰمًا ؕ قَالَ سَلٰمٌ فَمَا لَبِثَ اَنْ جَآءَ بِعِجْلٍ حَنِیْذٍ ﴿۶۹﴾

حضرت لوطؑ اور قوم لوط کی سرگزشت

اب آگے حضرت لوطؑ اور ان کی قوم کی سرگزشت آرہی ہے۔ یہ آیت اس سرگزشت کی تمہید کے طور پر یہاں وارد ہوئی ہے اس لیے کہ جو فرشتے قوم لوط کے لیے عذاب لے کے آئے تھے وہی حضرت ابراہیمؑ کے لیے بیٹے اور پوتے کی بشارت بھی لے کے آئے تھے۔ 'رُسُل' سے مراد یہاں وہی فرشتے ہیں۔ 'بُشْرٰی' سے مراد جیسا کہ آگے آیت ۷۱ میں تصریح ہے، حضرت اسحٰقؑ اور پھر ان سے حضرت یعقوبؑ کی ولادت کی خوش خبری ہے۔

حضرت ابراہیمؑ کی میزبانی فرشتوں کے لیے

'قَالُوْا سَلٰمًا قَالَ سَلٰمٌ' یعنی انھوں نے صالح اور شائستہ لوگوں کی طرح حضرت ابراہیمؑ کو سلام کیا۔ اور حضرت ابراہیمؑ نے بھی ان کے سلام کا جواب دیا، اور چونکہ وہ انسانی بھیس میں تھے اس وجہ سے حضرت ابراہیمؑ فوراً ان کی میزبانی کی فکر میں لگ گئے: 'فَمَا لَبِثَ اَنْ جَآءَ بِعِجْلٍ حَنِیْذٍ' اور زیادہ دیر نہیں گزری کہ انھوں نے ان کے آگے بھنا ہوا بچھڑا پیش کر دیا۔ اس سے حضرت ابراہیمؑ کی فیاضی اور مسافر نوازی کا اندازہ ہوتا ہے کہ چند آدمی دروازے پر آتے ہیں، جن سے دید و شنید کچھ بھی نہیں لیکن وہ بلا تاخیر ان کے لیے گلے سے بچھڑا ذبح کرا دیتے ہیں اور اس کا بھنا ہوا گوشت ان کے آگے پیش کر دیتے ہیں۔ 'عِجْل' کے لفظ سے یہ لازم نہیں آتا کہ

مسلم بھنا ہوا بچھڑا پیش کیا گیا ہو بلکہ زبان کا یہ معروف اسلوب ہے کہ کبھی کُل بول کر اس سے مراد جزو لیتے ہیں اس وجہ اس کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ان کے آگے انھوں نے بچھڑے کا بھنا ہوا گوشت پیش کیا ہو۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ بدویانہ دورِ زندگی میں یہ ضیافت نہایت فیاضانہ تھی کہ تین آدمیوں کی میزبانی کے لیے حضرت ابراہیمؑ نے گلے کا ایک بچھڑا ذبح کرا دیا۔ ان کی اس فیاضی کو نمایاں کرنے کے لیے گوشت کے بجائے بچھڑے کا ذکر فرمایا۔

فَلَمَّا رَاٰۤ اَیۡدِیَہُمۡ لَا تَصِلُ اِلَیۡہِ نَکِرَہُمۡ وَ اَوۡجَسَ مِنۡہُمۡ خِیۡفَۃً ؕ قَالُوۡا لَا تَخَفۡ اِنَّاۤ اُرۡسِلۡنَاۤ اِلٰی قَوۡمِ لُوۡطٍ (۷۰)

حضرت ابراہیمؑ کی تشویش اور فرشتوں کی طمانیت دہانی

اب تک حضرت ابراہیمؑ کو یہ گمان تھا کہ قرب و جوار کے کسی علاقے کے چند شریف اور صالح آدمی ہیں لیکن ان کی اتنی محنت اور اتنے ذوق و شوق سے تیار کی ہوئی ضیافت کی طرف جب انھوں نے ہاتھ نہیں بڑھایا تو قدرتاً انھوں نے کچھ بیگانگی محسوس کی اور دل ہی دل میں کچھ ڈرے کہ یہ کیا بات ہے۔ انھوں نے ان کی ضیافت قبول نہیں کی۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ میں نے ان کو آدمی سمجھا اور وہ فرشتے ہوں۔ اور اگر یہ فرشتے ہیں تو لازماً یہ کسی بڑی مہم پر نکلے ہوں گے اس لیے کہ فرشتوں کا ظہور کسی بڑی مہم ہی کے لیے ہوا کرتا ہے۔ اس موقع پر ان کے ذہن میں قدرتی طور پر قوم لوط کا بھی خیال آیا ہوگا جو پاس ہی حضرت لوطؑ کی جد و جہد کے علی الرغم اپنے طغیان کے اس مرحلے میں داخل ہو چکی تھی جس کے بعد لازماً خدا کا عذاب آ جایا کرتا ہے۔ فرشتوں نے یہ محسوس کر کے کہ حضرت ابراہیمؑ تشویش میں پڑ گئے ہیں ان کو تسلی دی کہ آپ کسی تشویش میں مبتلا نہ ہوں، ہم قوم لوط کی طرف بھیجے گئے ہیں اور قرینہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اسی موقع پر انھوں نے ان کو بیٹے کی بشارت سنائی۔

وَامۡرَاَتُہٗ قَآئِمَۃٌ فَضَحِکَتۡ فَبَشَّرۡنٰہَا بِاِسۡحٰقَ ۙ وَ مِنۡ وَّرَآءِ اِسۡحٰقَ یَعۡقُوۡبَ ﴿﴾ قَالَتۡ یٰوَیۡلَتٰۤی ءَاَلِدُ وَ اَنَا عَجُوۡزٌ وَّ ہٰذَا بَعۡلِیۡ شَیۡخًا ؕ اِنَّ ہٰذَا لَشَیۡءٌ عَجِیۡبٌ (۷۱-۷۲)

حضرت سارہ کی حیرت اور مسرت

سرگزشت کا آغاز جَآءَتۡ رُسُلُنَاۤ اِبۡرٰہِیۡمَ بِالۡبُشۡرٰی سے ہوا تھا لیکن مہمانوں کو دیکھتے ہی معاً حضرت ابراہیمؑ ان کی خاطر و مدارات کے اہتمام میں لگ گئے۔ اس وجہ سے بشارت کے سننے کی نوبت اب آئی اور اس وقت ان پر یہ انکشاف ہوا کہ جن کو وہ آدمی سمجھتے تھے وہ آدمی نہیں بلکہ فرشتے ہیں۔ جس وقت فرشتوں نے بشارت سنائی حضرت ابراہیمؑ کی بیوی سارہ بھی دروازے سے لگی کھڑی تھیں۔ 'فَضَحِکَتۡ' یعنی یہ بشارت سن کر وہ ہنسیں۔ یہ ہنسی حیرت، تعجب اور مسرت کے گوناگوں جذبات کا مظہر تھی۔ اس تعجب کا اظہار انھوں نے جن لفظوں میں فرمایا اس کا حوالہ آگے آ رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت ان کے اس مسرت آمیز اظہارِ حیرت پر مزید جوش میں آ گئی۔ چنانچہ ان کو براہِ راست مخاطب کر کے صرف بیٹے ہی کی نہیں بلکہ تعین نام کے ساتھ بیٹے اور اس سے آگے پوتے کی بھی بشارت دے دی گئی 'فَبَشَّرۡنٰہَا بِاِسۡحٰقَ وَمِنۡ وَّرَآءِ اِسۡحٰقَ یَعۡقُوۡبَ'۔ 'فَبَشَّرۡنٰہَا' میں عنایتِ خاص اور تکمیلِ مسرت کے جو گوناگوں پہلو ملحوظ ہیں وہ محتاجِ بیان نہیں اور بیٹے کے ساتھ پوتے کی بشارت نے گویا یہ اطمینان بھی دلا دیا کہ بیٹا زندہ

رہے گا، اچھی عمر پائے گا اور اس کی صلب سے نامور پوتا بھی پیدا ہوگا۔ 'قَالَتْ يٰوَيْلَتٰى ... الاية' یہ حضرت سارہ کے اظہار تعجب کی تفصیل ہے جس کی طرف اوپر 'فَضَحِكَتْ' کے لفظ سے اشارہ فرمایا تھا۔ وہ خاص نسوانی انداز میں بولیں، ہائے شامت! کیا اب میں بچہ جنوں گی جب کہ بڑھیا بانجھ ہو چکی ہوں اور یہ میرے میاں بھی بوڑھے ہو چکے ہیں، یہ تو نہایت ہی عجیب بات ہوگی!! بظاہر یہ فقرہ اظہار تعجب کا ہے لیکن اس کے لفظ لفظ کے اندر سے جو باطنی خوشی جھلک رہی ہے وہ محتاج وضاحت نہیں ہے۔ حضرت سارہ کے اظہار تعجب کا ایک خاص پہلو یہ ہے کہ اس بشارت کے ظہور کی راہ میں جو ظاہری رکاوٹیں ہیں ان کا ذکر کر کے یہ اطمینان حاصل کر لیں کہ ان کے باوجود یہ پوری ہو کے رہے گی۔

قَالُوْٓا اَتَعْجَبِيْنَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ رَحْمَتُ اللّٰهِ وَبَرَكٰتُهٗ عَلَيْكُمْ اَهْلَ الْبَيْتِ ۭ اِنَّهٗ حَمِيْدٌ مَّجِيْدٌ (۷۳)

فرشتوں کی اطمینان دہانی

'اَتَعْجَبِيْنَ' کے لفظ سے صاف واضح ہے کہ فرشتوں نے حضرت سارہ کی ہنسی اور ان کے فقرے کو اس کے بالکل صحیح یعنی اظہار تعجب کے مفہوم میں لیا اور نہایت ادب و احترام کے انداز میں انہوں نے حضرت سارہ کو توجہ دلائی کہ اے اہل بیت نبی! خدا کے کسی کام اور اس کے کسی ارادہ پر تعجب کی کہاں گنجائش ہے، پھر آپ پر تو اس کے خاص افضال اور اس کی خاص رحمتیں اور برکتیں ہیں، وہ بڑا ہی سزاوار حمد اور بڑا ہی بزرگ و برتر ہے ـــــ 'رَحْمَتُ اللّٰهِ وَبَرَكٰتُهٗ عَلَيْكُمْ اَهْلَ الْبَيْتِ' میں 'عَلَيْكُمْ' ضمیر مذکر جمع کا استعمال عربی زبان کے شائستہ انداز خطاب کی مثال ہے۔ عورتوں کے اس انداز خطاب میں پردہ داری اور احترام کی جو شان ہے وہ محتاج اظہار نہیں۔ قرآن مجید اور کلام عرب میں اس کی نہایت واضح اور لطیف مثالیں موجود ہیں۔ سورہ احزاب میں ہے۔

يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ	اللہ چاہتا ہے کہ تم سے دور کرے ناپاکی کو اے اہل بیت نبی
اَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيْرًا۔	اور تم کو پاک کرے اچھی طرح۔

امراء القیس کا ایک شعر بھی قابل ذکر ہے:۔

فلو كان اهل الدار فيها كعهدنا　　وجدت مقيلا عندهم ومعرسا

فَلَمَّا ذَهَبَ عَنْ اِبْرٰهِيْمَ الرَّوْعُ وَجَاۗءَتْهُ الْبُشْرٰى يُجَادِلُنَا فِيْ قَوْمِ لُوْطٍ (۷۴)

قوم لوط کے لیے حضرت ابراہیم کی سفارش

'يُجَادِلُنَا' یعنی 'صار يجادلنا' مضارع سے پہلے فعل ناقص کے حذف کر دینے کی متعدد مثالیں پیچھے گزر چکی ہیں۔ آیت ۳۸ میں 'وَيَصْنَعُ الْفُلْكَ' بھی اسی اسلوب پر ہے۔ لفظ 'مجادلہ' یہاں مجادلہ حسن کے مفہوم میں ہے۔ یعنی حسن ادب اور محبت و اعتماد کے ساتھ کسی سے اپنی بات باصرار و الحاح منوانے کی کوشش کرنا۔ حضرت ابراہیمؑ پر جب تک فرشتوں کا اصل منصوبہ واضح نہیں ہوا تھا اس وقت تک تو وہ متردد اور فکرمند رہے لیکن جب ان کو بیٹے کی بشارت مل گئی اور خود اپنے باب میں اطمینان ہو گیا تو انھیں قوم لوط کی فکر ہوئی اور وہ ان کے باب میں اللہ تعالیٰ سے سفارش میں لگ گئے اور اپنی بات منوانے کے لیے سارے جتن کر ڈالے۔ ہم تورات سے اس مجادلہ کی تفصیل نقل کرتے ہیں تاکہ کچھ اندازہ ہو سکے کہ کس نوعیت کا مجادلہ اللہ تعالیٰ کی نگاہوں میں پسندیدہ ہے۔

پر ابرہام خداوند کے حضور کھڑا ہی رہا۔ تب ابرہام نے نزدیک جا کر کہا کیا تو نیک کو بد کے ساتھ ہلاک کرے گا؟ شاید اس شہر میں پچاس راست باز ہوں۔ کیا تو اسے ہلاک کرے گا اور ان پچاس راستبازوں کی خاطر جو اس میں ہوں اس مقام کو نہ چھوڑے گا؟ ایسا کرنا تجھ سے بعید ہے کہ نیک کو بد کے ساتھ مار ڈالے اور نیک بد کے برابر ہو جائیں۔ یہ تجھ سے بعید ہے۔ کیا تمام دنیا کا انصاف کرنے والا انصاف نہ کرے گا اور خداوند نے فرمایا کہ اگر مجھے سدوم میں شہر کے اندر پچاس راست باز ملیں تو میں ان کی خاطر اس مقام کو چھوڑ دوں گا۔

تب ابرہام نے جواب دیا، کہا کہ دیکھئے! میں نے خداوند سے بات کرنے کی جرأت کی اگرچہ میں راکھ اور خاک ہوں۔ شاید پچاس راست بازوں میں پانچ کم ہوں۔ کیا ان پانچ کی کمی کے سبب سے تو تمام شہر کو نیست کر دے گا؟ اس نے کہا اگر مجھے وہاں پینتالیس ملیں تو میں اسے نیست نہیں کروں گا۔ پھر اس نے کہا کہ شاید وہاں چالیس ملیں۔ تب اس نے کہا کہ میں ان چالیس کی خاطر بھی یہ نہیں کروں گا۔ پھر اس نے کہا کہ خداوند ناراض نہ ہو تو میں کچھ اور عرض کروں۔ شاید وہاں تیس ملیں۔ اس نے کہا اگر مجھے وہاں تیس بھی ملیں تو بھی میں ایسا نہیں کروں گا۔ پھر اس نے کہا دیکھیے! میں نے خداوند سے بات کرنے کی جرأت کی۔ شاید وہاں بیس ملیں۔ اس نے کہا میں بیس کی خاطر بھی اسے نیست نہیں کروں گا۔ تب اس نے کہا۔ خداوند ناراض نہ ہو تو میں ایک بار اور کچھ عرض کروں۔ شاید وہاں دس ملیں۔ اس نے کہا میں دس کی خاطر بھی اسے نیست نہیں کروں گا۔

(پیدائش باب ۱۸: ۲۳-۳۲)

حضرت ابراہیمؑ کا اپنے رب کے ساتھ یہ مجادلہ اپنے اندر محبت، اعتماد، ناز اور دردمندی و ہمدردی کے جو پہلو سمیٹے ہوئے ہے زبان قلم ان کی تعبیر و تشریح سے قاصر ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس پر حضرت ابراہیمؑ کی تحسین فرمائی۔

إِنَّ إِبْرَاهِيمَ لَحَلِيمٌ أَوَّاهٌ مُّنِيبٌ (۷۵)

حضرت ابراہیمؑ کی دردمندی

'أَوَّاهٌ' آہ سے مبالغہ کا صیغہ ہے جس کا لغوی مفہوم ہے کثرت سے آہ آہ کرنے والا یعنی نہایت دردمند، نہایت غم خوار اور صاحبِ سوزِ دل۔ جب حضرت ابراہیمؑ قوم لوط جیسی ناہنجار قوم کی سفارش میں اس طرح اپنے دل کو نچوڑ کر رکھ دیتے ہیں تو ان کے حلم اور ان کی دردمندی میں کیا شک کی گنجائش رہی اور کمال انابت کی اس سے بڑھ کر اور کیا مثال ہو سکتی ہے کہ بظاہر معلوم ہے کہ اب قوم لوط کا پیمانہ لبریز ہے لیکن وہ برابر دعا اور التجا میں سرگرم ہیں۔

يَا إِبْرَاهِيمُ أَعْرِضْ عَنْ هَٰذَا ۖ إِنَّهُ قَدْ جَاءَ أَمْرُ رَبِّكَ ۖ وَإِنَّهُمْ آتِيهِمْ عَذَابٌ غَيْرُ مَرْدُودٍ (۷۶)

حضرت ابراہیمؑ کو جواب

اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ کی اس ہمدردی و دردمندی اور اس دعا و التجا کی تو تعریف فرمائی لیکن ساتھ ہی آگاہ بھی فرما دیا کہ اب دعا و سفارش کا وقت گزر چکا ہے۔ 'إِنَّهُ قَدْ جَاءَ أَمْرُ رَبِّكَ' اب تیرے رب کا حکم یعنی حکمِ عذاب آچکا ہے اور ان پر نہ ٹلنے والا عذاب اب آکے رہے گا۔ 'عَذَابٌ غَيْرُ مَرْدُودٍ' سے ایک تو اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ یہ عذاب

کوئی تنبیہی نوعیت کا نہیں ہے کہ محض تنبیہ کر کے گزر جائے بلکہ فیصلہ کن عذاب ہے جو ان کی کمر توڑ کر رکھ دے گا۔ دوسرے اس بات کی طرف بھی اس میں اشارہ ہے کہ یہ عذاب کسی کے ٹالے ٹل نہیں سکے گا اس لیے کہ حکم الٰہی کے مقابلے کی طاقت کسی میں بھی نہیں ہے۔

وَلَمَّا جَآءَتْ رُسُلُنَا لُوْطًا سِیْٓءَ بِهِمْ وَضَاقَ بِهِمْ ذَرْعًا وَّقَالَ هٰذَا یَوْمٌ عَصِیْبٌ (۷۷)

فرشتوں کی آمد پر حضرت لوطؑ کی تشویش

حضرت ابراہیمؑ کو بشارت پہنچانے اور قوم لوطؑ کے انجام سے باخبر کرنے کے بعد یہ فرشتے حضرت لوطؑ کے پاس پہنچے۔ حضرت لوطؑ نے جب دیکھا کہ چند خوبرو نوجوان دروازے پر ہیں تو وہ سخت منقبض اور دل تنگ ہوئے۔ دل میں کہا کہ آج کا دن تو بڑا کٹھن دن ہوگا۔ اس انقباض و پریشانی کی وجہ ظاہر ہے کہ جب قوم کی قوم اس فساد اخلاق میں مبتلا ہو جس میں حضرت لوطؑ کی قوم مبتلا تھی تو ایسے خوش شکل نو واردوں کا دروازے پر آنا گویا شہر کے سارے غنڈوں کو دعوت دینے کے ہم معنی تھا۔

وَجَآءَهٗ قَوْمُهٗ یُهْرَعُوْنَ اِلَیْهِ ؕ وَمِنْ قَبْلُ كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ السَّیِّاٰتِ ؕ قَالَ یٰقَوْمِ هٰٓؤُلَآءِ بَنَاتِیْ هُنَّ اَطْهَرُ لَكُمْ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَلَا تُخْزُوْنِ فِیْ ضَیْفِیْ ؕ اَلَیْسَ مِنْكُمْ رَجُلٌ رَّشِیْدٌ (۷۸)

حضرت لوطؑ کی فریاد

چنانچہ ان کا اندیشہ بالکل صحیح ثابت ہوا۔ جب اوباشوں نے دیکھا کہ حضرت لوطؑ کے دروازے پر چند خوبرو لڑکے آئے ہوئے ہیں تو جھپٹے ہوئے پہنچے۔ حضرت لوطؑ نے ان کے تیور دیکھے تو فرمایا: یٰقَوْمِ هٰٓؤُلَآءِ بَنَاتِیْ هُنَّ اَطْهَرُ لَكُمْ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَلَا تُخْزُوْنِ فِیْ ضَیْفِیْ۔ یہ پیشکش نہیں بلکہ اپنی قوم کے ضمیر کو جگانے اور جھنجھوڑنے کے لیے گویا حضرت لوطؑ کی آخری فریاد تھی کہ وہ سوچیں کہ ایک اللہ کا بندہ یہ ہے جو اپنے مہمانوں کی عزت کے معاملے میں اتنا حساس ہے کہ اس کے لیے اپنی عزیز سے عزیز شے کو قربان کرنے پر تیار ہے اور ایک ہم ہیں کہ اندھے ہو کر اس کے مہمانوں پر ٹوٹ پڑے ہیں۔ اسی طرح انھوں نے اللہ کا خوف بھی یاد دلایا اور آخر میں اَلَیْسَ مِنْكُمْ رَجُلٌ رَّشِیْدٌ کہہ کر گویا پوری طرح ان پر حجت تمام کر دی۔ اس لیے کہ کسی کے اندر اگر رائی برابر بھی حق کی حمیت و حمایت کا احساس ہوتا تو اس فقرے کے بعد تو اس کو ضرور حرکت میں آجانا تھا لیکن جب اس کے بعد بھی کوئی ضمیر بیدار نہیں ہوا تو اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ کسی کے اندر حسِ انسانیت و شرافت سرے سے باقی ہی نہیں رہ گئی تھی۔

قَالُوْا لَقَدْ عَلِمْتَ مَا لَنَا فِیْ بَنٰتِكَ مِنْ حَقٍّ ۚ وَاِنَّكَ لَتَعْلَمُ مَا نُرِیْدُ (۷۹)

قوم لوطؑ کی ضد

وہ جواب میں بولے کہ زیادہ بات کو بڑھانے اور الجھانے سے کیا فائدہ۔ تمہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ ہمیں کوئی حق حاصل نہیں ہے کہ ہم تمہاری لڑکیوں پر ہاتھ ڈالیں۔ ہم جو کچھ چاہتے ہیں وہ تم سے مخفی نہیں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ خواہ مخواہ ہماری اس خواہش میں مزاحم کیوں ہوتے ہو؟ ہم جو کچھ چاہتے ہیں کر لینے دو۔

قَالَ لَوْ اَنَّ لِیْ بِكُمْ قُوَّةً اَوْ اٰوِیْٓ اِلٰی رُكْنٍ شَدِیْدٍ (۸۰)

حضرت لوطؑ کی طرف سے قوم کے ضمیر کو جھنجھوڑنے کی آخری کوشش

حضرت لوطؑ کی زبان سے یہ فقرہ انتہائی اضطراب اور غنڈوں کے رویے سے آخری درجے میں مایوس ہو جانے کے بعد نکلا ہے۔ فرمایا کہ کاش میرے پاس یا تو خود اپنی اتنی قوت و جمعیت ہوتی کہ تم سے نبٹ سکتا یا کوئی ایسا صاحبِ جمعیت اور بااثر شخص ہی ہوتا کہ میں اس کی پناہ لے

لے سکتا اور وہ مجھے تمہاری چیرہ دستیوں سے بچا سکتا۔ یہ آخری فقرہ بھی حضرت لوطؑ نے قوم کے ضمیر کو جھنجوڑنے کے لیے فرمایا۔ یہاں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ عرب میں کسی مصیبت زدہ اور مظلوم کو پناہ دینا، جب کہ وہ طالب پناہ ہو، بڑے شرف کی بات سمجھی جاتی تھی اور اسی طرح کسی طالب پناہ کو پناہ نہ دینا انتہائی ذلالت کی دلیل تھی۔ حضرت لوطؑ نے یہ فقرہ فرما کر گویا آخری حجت بھی تمام کر دی۔ اس حجت کے تمام ہو جانے کے بعد فرشتوں نے حقیقت سے پردہ اٹھا دیا اور بولے۔

قَالُوْا يٰلُوْطُ اِنَّا رُسُلُ رَبِّكَ لَنْ يَّصِلُوْٓا اِلَيْكَ فَاَسْرِ بِاَهْلِكَ بِقِطْعٍ مِّنَ الَّيْلِ وَلَا يَلْتَفِتْ مِنْكُمْ اَحَدٌ اِلَّا امْرَاَتَكَ ۭ اِنَّهٗ مُصِيْبُهَا مَآ اَصَابَهُمْ ۭ اِنَّ مَوْعِدَهُمُ الصُّبْحُ ۭ اَلَيْسَ الصُّبْحُ بِقَرِيْبٍ (۸۱)

فرشتوں نے پردہ اٹھا دیا

بولے اے لوطؑ! تم پریشان نہ ہو، ہم چھوکرے نہیں ہیں جیسا کہ یہ شیاطین سمجھے ہوئے ہیں، بلکہ ہم تیرے رب کے فرستادے ہیں۔ یہ ہرگز تم تک نہیں پہنچ سکتے تو یوں کرو کہ راتوں رات اس بستی سے اپنے اہل و عیال سمیت نکل جاؤ اور تم میں سے کوئی پیچھے مڑ کے بھی نہ دیکھے۔ ہاں، تمہاری بیوی تمہارے اہل سے مستثنیٰ ہے۔ اس پر بھی وہی آفت آنی ہے جو پوری قوم کے لیے مقدر ہو چکی ہے۔ ان کے لیے وقت موعود صبح کا وقت ہے۔ کیا صبح کا وقت قریب نہیں ہے؟

فَلَمَّا جَاۗءَ اَمْرُنَا جَعَلْنَا عَالِيَهَا سَافِلَهَا وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهَا حِجَارَةً مِّنْ سِجِّيْلٍ ڏ مَّنْضُوْدٍ مُّسَوَّمَةً عِنْدَ رَبِّكَ ۭ وَمَا هِيَ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ بِبَعِيْدٍ (۸۲-۸۳)

عذاب الٰہی

یعنی جب ہمارا حکم آپہنچا تو ہم نے ان پر ایسی تندگی بھیجی کہ اس نے ان کے مکانوں کو بالکل تلپٹ کر کے رکھ دیا۔ وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهَا حِجَارَةً مِّنْ سِجِّيْلٍ، 'سِجِّيْل' سنگ گل کا معرب ہے۔ یعنی ہم نے ان کی بستی پر خوب سنگ گل کی تہ بہ تہ بارش کر دی۔ مُسَوَّمَةً عِنْدَ رَبِّكَ۔ وہ تیرے رب کے پاس نشان لگائے ہوئے یعنی خدا کے علم اور اس کی قدرت میں پہلے سے متعدد اور مقرر تھے۔ گویا ان کے چھٹے لگا کر پہلے سے ان پر نشان لگا دیا گیا تھا کہ یہ چھٹے قوم لوطؑ کی بستی پر برسانے کے لیے ہیں۔ وَمَا هِيَ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ بِبَعِيْدٍ۔ اور یہ سنگ گل کے چھٹے ان ظالموں سے کچھ دور بھی نہ تھے کہ ان کو وہاں سے اٹھا کر لانے میں کچھ وقت لگتا بلکہ وہ ان کے پاؤں کے نیچے ہی سے ہماری بھیجی ہوئی باد تند (حاصب) نے اٹھایا اور ان کے سروں پر برسا دیا۔

ظالمین سے مراد قریش ہیں

اس ٹکڑے کی تاویل میں اس کی بھی گنجائش ہے کہ 'ھی' کا مرجع لوطؑ کی بستی کو سمجھا جائے اور 'ظالمین' سے قریش مراد لیے جائیں۔ مطلب یہ کہ لوطؑ کی بستی قریش سے کچھ دور بھی نہیں، وہ اپنے سفر شام میں اسی بستی پر سے گزرتے ہیں۔ اگر دیدۂ عبرت نگاہ رکھتے ہیں تو اس سے عبرت حاصل کریں۔ آگے آیت ۸۹ میں حضرت شعیبؑ نے اپنی قوم کو مخاطب کر کے فرمایا ہے۔ وَمَا قَوْمُ لُوْطٍ مِّنْكُمْ بِبَعِيْدٍ۔

قوم لوطؑ کے عذاب کی نوعیت

قوم لوطؑ کے عذاب کے بارے میں مولانا فراہیؒ کی تحقیق کا خلاصہ یہ ہے۔

"قوم لوطؑ پر اللہ تعالیٰ نے غبار انگیز ہوا بھیجی جو سخت ہو کر باد حاصب (کنکر پتھر برسانے والی تند آندھی) بن گئی۔ اس سے اول تو ان کے اوپر کنکروں پتھروں کی بارش ہوئی۔ پھر اس نے اس قدر شدت اختیار کر لی کہ

اس کے زور سے ان کے مکانات بھی اٹ گئے۔ چنانچہ انہی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ فَمِنۡهُمۡ مَّنۡ اَرۡسَلۡنَا عَلَيۡهِ حَاصِبًا (ان میں سے بعض قوموں پر ہم نے کنکر برسانے والی آندھی بھیجی) نیز فرمایا ہے فَجَعَلۡنَا عَالِيَهَا سَافِلَهَا وَاَمۡطَرۡنَا عَلَيۡهِمۡ حِجَارَةً مِّنۡ سِجِّيۡلٍ مَّنۡضُوۡدٍ (پس ہم نے اس بستی کو تلپٹ کر دیا اور ان کے اوپر تہ بر تہ سنگ گل کے پتھروں کی بارش کی) یعنی ایسی تند ہوائیں چلیں کہ ان کے مکانات اور چھتیں سب زمین کے برابر ہو گئیں اور اوپر سے کنکریوں اور ریت نے ان کو ڈھانک لیا۔

(تفسیر سورۂ ذاریات فراہیؒ ـ فصل ۱۵)

وَاِلٰى مَدۡيَنَ اَخَاهُمۡ شُعَيۡبًا ؕ قَالَ يٰقَوۡمِ اعۡبُدُوا اللّٰهَ مَا لَـكُمۡ مِّنۡ اِلٰهٍ غَيۡرُهٗ ؕ وَلَا تَـنۡقُصُوا الۡمِكۡيَالَ وَالۡمِيۡزَانَ اِنِّىۡۤ اَرٰٮكُمۡ بِخَيۡرٍ وَّاِنِّىۡۤ اَخَافُ عَلَيۡكُمۡ عَذَابَ يَوۡمٍ مُّحِيۡطٍ (۸۴)

قومِ شعیب کے فساد کی نوعیت

اس امر کی وضاحت اوپر ہو چکی ہے کہ ہر قوم کے اندر انہی میں سے انہی کے ایک بھائی کو رسول بنا کر مبعوث کرنے میں اتمامِ حجت کے نقطۂ نظر سے کیا مصلحت ہے؟ اور یہ حقیقت بھی اچھی طرح واضح ہو چکی ہے کہ توحید کو تمام انبیاء کی دعوت میں مرکزِ ثقل اور محوری نقطہ کی حیثیت حاصل ہے۔ اس سے انحراف تمام انحرافات کے دروازے کھولتا ہے اور اسی کی طرف بازگشت سے صراطِ مستقیم کی ہدایت نصیب ہوتی ہے۔ چنانچہ اسی نقطہ سے حضرت شعیبؑ نے بھی اپنی دعوت کا آغاز فرمایا اور پھر اپنی قوم کی اس برائی کی اصلاح کی طرف توجہ فرمائی جو پوری قوم میں نہ صرف یہ کہ عام ہو چکی تھی بلکہ وہ برائی کے بجائے ہنر اور قابلیت اور حق و صواب سمجھی جانے لگی تھی۔ ان کی قوم۔ اہلِ مدین ـــــ تجارت پیشہ قوم تھی۔ اس وجہ سے ان کا فسادِ مزاج سب سے زیادہ اسی میدان میں ابھرا اور ناپ تول میں کمی کرنے کو اپنا پیشہ ورانہ ہنر بنا لیا۔ اس فن کے ایک سے ایک بڑھ کر ماہر ان میں پیدا ہونے لگے اور کسی کے اندر اس امر کا احساس بھی باقی نہیں رہا کہ یہ ترقی و کامرانی کی راہ نہیں بلکہ فساد فی الارض کی راہ ہے۔ حضرت شعیبؑ نے ان کو اس کی اصلاح کی دعوت دی فرمایا، وَلَا تَـنۡقُصُوا الۡمِكۡيَالَ وَالۡمِيۡزَانَ اِنِّىۡۤ اَرٰٮكُمۡ بِخَيۡرٍ وَّاِنِّىۡۤ اَخَافُ عَلَيۡكُمۡ عَذَابَ يَوۡمٍ مُّحِيۡطٍ، لوگو، ناپ تول میں کمی نہ کرو، میں اس وقت تمھیں رفاہیت اور خوش حالی میں دیکھ رہا ہوں اور میں تم پر ایک ایسے دن کے عذاب کا اندیشہ رکھتا ہوں جو تمھیں بالکل اپنے گھیرے میں لے گا۔ مطلب یہ ہے کہ اس وقت تمھیں جو رفاہیت و خوش حالی حاصل ہے اس کا فطری تقاضا یہ ہے کہ تم زیادہ سے زیادہ اپنے رب کے شکرگزار اور اس کے قانونِ عدل و قسط کے فرمانبردار بنو۔ اللہ تعالیٰ رفاہیت و خوش حالی بخشتا ہی کسی قوم کو اس لیے ہے کہ دیکھے کہ وہ قوم خدا کی شکرگزار بنتی ہے یا ناشکری اور نافرمانی کی راہ اختیار کرتی ہے۔ اگر وہ یہ دوسری راہ اختیار کر لیتی ہے تو یہی خوش حالی و رفاہیت اس کے لیے ایک عذاب کا دیباچہ بن جاتی ہے جو اس طرح گھیر لیتا ہے کہ پھر کوئی بھی اس کے گھیرے سے باہر نہیں نکل سکتا۔ میں تمھارے موجودہ موٹاپے کے اندر اسی مرگِ ناگہانی کے آثار دیکھ رہا ہوں تو تم جلد سے جلد اپنی خبر لو۔

وَيٰقَوۡمِ اَوۡفُوا الۡمِكۡيَالَ وَالۡمِيۡزَانَ بِالۡقِسۡطِ وَلَا تَبۡخَسُوا النَّاسَ اَشۡيَآءَهُمۡ وَلَا تَعۡثَوۡا فِى الۡاَرۡضِ مُفۡسِدِيۡنَ (۸۵)

حضرت شعیب کی دعوتِ اصلاح

"قسط" کے معنی عدل و انصاف کے ہیں۔ یعنی ناپ ہو یا تول دونوں میں پورے پورے عدل و انصاف کو مدنظر رکھو۔ "وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْيَآءَهُمْ" اور لوگوں کے ساتھ ان کی چیزوں کی ناپ تول میں کوئی ناانصافی اور کمی نہ کرو۔ "وَلَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ" یعنی زمین میں بڑھو تو خیر و صلاح اور عدل و قسط کے حامل اور علم بردار بن کر بڑھو، اس کے عدل و قسط کو درہم برہم کرنے والے اور اس میں فساد برپا کرنے والے بن کر نہ بڑھو۔ اس طرح کے بڑھنے کو اس زمین کا خالق و مالک بس ایک خاص حد ہی تک مہلت دیتا ہے۔ اس مہلت کے گزرتے ہی وہ ایسے مفسدین سے اپنی زمین کو پاک کر دیتا ہے۔

بَقِيَّتُ اللّٰهِ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۚ وَمَآ اَنَا عَلَيْكُمْ بِحَفِيْظٍ (۸۶)

"بقیۃ اللہ" سے مراد جائز نفع ہے اگر ایک تاجر ناپ تول میں ٹھیک ٹھیک عدل کو ملحوظ رکھے، جھوٹ، فریب، ملاوٹ اور اس قسم کے دوسرے ہتھکنڈوں سے بچے، دوسروں کی ریس میں غلط راستے نہ اختیار کرے تو گو وہ اتنا زیادہ منافع نہ لوٹ سکے جتنا دوسروں نے، جنھوں نے حرام و حلال کی تمیز اٹھا دی، لوٹا ہو لیکن اس کا حاصل کیا ہوا نفع "بقیۃ اللہ" کی حیثیت رکھتا ہے اور وہ قلیل بھی ہو تو دوسروں کے کثیر سے ہزار درجہ افضل ہے اس لیے کہ اس میں دنیا اور آخرت دونوں میں برکت ہوگی۔ اس کے برعکس بے ایمانی کا حاصل کیا ہوا نفع دنیا میں بے برکت اور آخرت میں دہکتی ہوئی آگ بنے گا۔
"وَمَآ اَنَا عَلَيْكُمْ بِحَفِيْظٍ" یعنی میں نے نیک و بد تمھیں اچھی طرح سمجھا دیا اور یہی میری ذمہ داری تھی۔ مانو گے تو اس میں تمھارا ہی فائدہ ہے۔ نہ مانو گے تو تم ہی اس کا انجام بد دیکھو گے، مجھے اس سے کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ میں تو صرف ایک منذر و مبشر ہوں، تم پر کوئی نگران اور داروغہ نہیں مقرر ہوا ہوں کہ تمھارے ایمان نہ لانے کی پرسش مجھ سے ہو۔

قَالُوْا يٰشُعَيْبُ اَصَلٰوتُكَ تَاْمُرُكَ اَنْ نَّتْرُكَ مَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَآ اَوْ اَنْ نَّفْعَلَ فِيْٓ اَمْوَالِنَا
مَا نَشٰٓؤُا ۭ اِنَّكَ لَاَنْتَ الْحَلِيْمُ الرَّشِيْدُ (۸۷)

حضرت شعیب پر قوم کا طنز

یہ پورا فقرہ طنزیہ انداز میں ہے۔ وہ بولے کہ کیا تمھاری نماز تمھیں یہی سکھاتی ہے کہ جن معبودوں کو ہمارے باپ دادا پوجتے آئے ہم ان کی عبادت ترک کر دیں اور اپنے مال میں اپنے صواب دید کے مطابق تصرف نہ کریں۔ تمھاری ان باتوں سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ تمھاری نگاہ میں سب اگلے پچھلے بے وقوف اور گمراہ تھے، بس تم ہی ایک دانا و بینا اور راہ یاب رہ گئے ہو۔ مطلب یہ کہ تم نماز وغیرہ پڑھتے تھے تو اس سے خیال تو یہ ہوتا تھا کہ تم سے باپ دادا کا نام بھی روشن ہوگا اور قوم کے لیے بھی کچھ کامیابی کی راہیں کھلیں گی مگر خوب نکلی تمھاری یہ نماز کہ وہ ماضی و حاضر سب کی بساط لپیٹ کر رکھ دینا چاہتی ہے۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ حضرت شعیبؑ کی نیک اور پاکیزہ زندگی سے چونکہ مفسدین کو اندیشہ تھا کہ وہ لوگ متاثر ہوں گے جو بالطبع نیک ہیں اس وجہ سے انھوں نے ان کی نیکیوں ہی کو اپنے طنز کا ہدف بنا لیا گویا سارے فساد کی جڑ وہی ہیں۔

قَالَ يٰقَوْمِ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ وَرَزَقَنِيْ مِنْهُ رِزْقًا حَسَنًا ۭ وَمَآ اُرِيْدُ اَنْ

أُخَالِفَكُمْ إِلَىٰ مَا أَنْهَاكُمْ عَنْهُ ۚ إِنْ أُرِيدُ إِلَّا الْإِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ ۚ وَمَا تَوْفِيقِي إِلَّا بِاللَّهِ ۚ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَإِلَيْهِ أُنِيبُ (۸۸)

'بینة' اور 'رزقِ حسن' سے مراد

لفظ 'بَیِّنَۃٌ' کی تحقیق اور آیت ۶۳ کے تحت گزر چکی ہے۔ اس سے مراد وہ ایمان واعتقاد ہے جو ہر فطرتِ سلیم کے اندر اللہ تعالیٰ نے ودیعت فرمایا ہے اور جو انسان کی رہنمائی صراطِ مستقیم کی طرف کرتا ہے بشرطیکہ انسان نے غلط ماحول کے اثرات سے متاثر ہو کر اپنی فطرت مسخ نہ کر لی ہو۔ 'وَرَزَقَنِیْ مِنْهُ رِزْقًا حَسَنًا'، 'رزقِ حسن' سے یہاں اسی چیز کو تعبیر فرمایا ہے جس کو مذکورہ بالا آیت ۶۳ میں 'رَحْمَۃ' سے تعبیر فرمایا ہے یعنی وحی الٰہی۔ وحی الٰہی کو 'رزقِ حسن' سے تعبیر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ جس طرح مادی رزق انسان کی مادی زندگی کے باقی رہنے کے لیے ضروری ہے اسی طرح 'وحی الٰہی' کا رزقِ حسن انسان کی روحانی زندگی کے لیے ضروری ہے۔ سیدنا مسیحؑ نے اسی حقیقت کو یوں تعبیر فرمایا ہے کہ 'انسان صرف روٹی سے نہیں جیتا بلکہ اس کلمہ سے جیتا ہے جو خداوند کی طرف سے آتا ہے۔'

پہلے جملہ میں جوابِ شرط محذوف ہے۔ اگر اس محذوف کو آیت ۶۳ کی روشنی میں، جو بعینہٖ اسی مضمون کی آیت ہے، کھول دیا جائے تو پوری بات گویا یوں ہوگی 'بتاؤ، اگر میں اپنے رب کی جانب سے ایک روشن دلیل پر ہوں، پھر اس نے مجھے اپنی جانب سے رزقِ حسن سے بھی نوازا تو اس کے بعد بھی اگر میں اس کی راہ سے ہٹ کر چلوں تو مجھے خدا کے غضب سے بچانے والا کون بنے گا؟' مطلب یہ کہ میں یہ جو کچھ تمھیں بتا رہا ہوں تم اس کو تصنع اور بناوٹ پر محمول کر کے مجھے طنز و تحقیر کا ہدف بنا رہے ہو، لیکن میں کیا کروں؟ یہی میری فطرت کی آواز پہلے سے تھی اور پھر اسی کو مدلل اور مبرہن کرتی ہوئی مجھ پر میرے رب نے وحی بھی اتاری تو اگر میں تمھارے سامنے یہ نہ پیش کروں تو اور کیا پیش کروں؟ 'وَمَآ اُرِيْدُ اَنْ اُخَالِفَكُمْ اِلٰى مَآ اَنْهٰىكُمْ عَنْهُ' یعنی یہ بدگمانی نہ کرو کہ میں جو تمھیں ناپ تول میں بے ایمانی سے روک رہا ہوں تو یہ چاہتا ہوں کہ تمھیں اس سے روک کر یہی کام خود کروں اور اس طرح تمھیں بازار سے بے دخل کر کے خود بازار پر قابض بن بیٹھوں۔ ممکن ہے حضرت شعیبؑ اپنی معاش کے لیے کوئی چھوٹی موٹی تجارت خود بھی کرتے رہے ہوں۔ اس چیز سے شریروں نے فائدہ اٹھا کر یہ اشتعلا چھوڑا ہو کہ یہ شخص جو اس شد و مد سے ناپ تول میں ایمانداری کا وعظ سنا رہا ہے اس سے اس کی غرض صرف یہ ہے کہ ہم تو ایمان داری کے ہو کے رہ جائیں اور یہ اپنی من مانی کر کے پورے بازار پر قبضہ کر لے۔ حضرت شعیبؑ نے ان کی یہ بدگمانی دور کرنے کی کوشش کی کہ میں جس بات سے تمھیں روک رہا ہوں اس لیے نہیں روک رہا ہوں کہ اس پر تنہا خود قابض ہونا چاہتا ہوں۔ 'اِنْ اُرِيْدُ اِلَّا الْاِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ' میں صرف اصلاح چاہتا ہوں جہاں تک میرا بس چلے۔ 'وَمَا تَوْفِيْقِيْٓ اِلَّا بِاللّٰهِ' اور اس جد و جہد میں توفیق و رہنمائی جس حد تک بھی حاصل ہوگی اللہ ہی کی عنایت سے حاصل ہوگی۔ میں نے اسی پر بھروسہ کیا اور اسی کی طرف رجوع کرتا ہوں۔

وَيٰقَوْمِ لَا يَجْرِمَنَّكُمْ شِقَاقِيْٓ اَنْ يُّصِيْبَكُمْ مِّثْلُ مَآ اَصَابَ قَوْمَ نُوْحٍ اَوْ قَوْمَ هُوْدٍ اَوْ قَوْمَ صٰلِحٍ ؕ
وَمَا قَوْمُ لُوْطٍ مِّنْكُمْ بِبَعِيْدٍ (۸۹)

حضرت شعیبؑ کی تنبیہ

'شقاق' کے معنی ضد اور مخالفت کے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ پرائے شگون پر اپنی ناک نہ کٹوا بیٹھو۔ میری ضد میں تم نے جو روش اختیار کی ہے کہیں وہ تمہارے لیے اس بات کا سبب نہ بن جائے کہ تم پر کوئی اس طرح کا عذاب آ دھمکے جس طرح کے عذاب قوم نوحؑ یا قوم ہودؑ یا قوم صالحؑ پر اس سے پہلے آ چکے ہیں اور قوم لوطؑ تو تم سے کچھ دور بھی نہیں ہے۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ قوم لوطؑ زمانہ اور اپنے مسکن دونوں ہی اعتبار سے قوم شعیبؑ سے بہت قریب تھی۔ حضرت شعیبؑ کے ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ یہ نہ سمجھو کہ میں تمہیں صرف ماضی بعید کے افسانے سنا رہا ہوں بلکہ تمہارے ماضی قریب اور تمہارے قرب و جوار کی شہادت بھی یہی ہے کہ تمہاری روش خدا کے عذاب کو دعوت دے رہی ہے۔

وَاسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ ؕ اِنَّ رَبِّيْ رَحِيْمٌ وَّدُوْدٌ (۹۰)

یعنی خیریت چاہتے ہو تو میری بات سنو اور اپنے گناہوں کی اپنے رب سے معافی مانگو اور اس کی طرف رجوع کرو۔ 'رجوع' سے یہ مراد ہے کہ اپنی موجودہ روش سے باز آ کر وہ راہ اختیار کرو جو خدا کی پسندیدہ راہ ہے اور جس کی طرف میں تمہیں بلا رہا ہوں۔

یہ حقیقت پیش نظر رہے کہ توبہ کے دو بنیادی رکن ہیں: ایک استغفار، دوسرا اصلاح۔ یعنی آدمی اپنے رب سے اپنے جرائم کی معافی بھی مانگے اور صحیح راہ اختیار کر کے عملاً اپنے رویہ کی اصلاح کا ثبوت بھی دے۔ اس کے بغیر کوئی توبہ اللہ تعالیٰ کے ہاں درخورِ قبول نہیں ٹھہرتی۔

'اِنَّ رَبِّيْ رَحِيْمٌ وَّدُوْدٌ'۔ یہ اللہ تعالیٰ کی صفاتِ رحمت اور محبت کا حوالہ ہے۔ مقصود اس سے استغفار اور توبہ کی تشویق و ترغیب بھی ہے اور نہایت لطیف انداز میں قبولیتِ توبہ کی بشارت بھی۔ مدعا یہ ہے کہ تمہارے جرائم کتنے ہی سنگین ہوں، لیکن جب تم صدقِ دل سے اس کی طرف رجوع کرو گے تو وہ تمہیں ٹھکرائے گا نہیں بلکہ معاف کر کے اپنی رحمتوں سے نوازے گا۔ وہ نہایت مہربان اور محبت کرنے والا ہے۔

قَالُوْا يٰشُعَيْبُ مَا نَفْقَهُ كَثِيْرًا مِّمَّا تَقُوْلُ وَاِنَّا لَنَرٰىكَ فِيْنَا ضَعِيْفًا ۚ وَلَوْلَا رَهْطُكَ لَرَجَمْنٰكَ ۫
وَمَآ اَنْتَ عَلَيْنَا بِعَزِيْزٍ (۹۱)

حضرت شعیبؑ کو سنگسار کر دینے کی دھمکی

قوم نے حضرت شعیبؑ کی اس ساری موعظت کا جواب نہایت رعونت سے یہ دیا کہ 'اے شعیب! تمہاری بہت ساری باتیں کسی طرح ہماری سمجھ میں نہیں آتیں'۔ مطلب یہ کہ تمہاری یہ باتیں ہیں ہی نہایت مہمل اور دور از کار، ورنہ معقول باتیں سمجھنے میں ہم سے بڑھ کر کون ہو سکتا ہے! اس کے بعد دھمکی بھی دے دی کہ تمہاری کوئی جمعیت و جماعت تو ہے نہیں جس کا ہمیں اندیشہ ہو، ہم تو تمہیں اپنے اندر نہایت کمزور اور بے بس دیکھ رہے ہیں۔ اگر تمہارے خاندان کا لحاظ نہ ہوتا تو ہم تو تمہیں سنگسار کر دیتے۔ 'وَمَآ اَنْتَ عَلَيْنَا بِعَزِيْزٍ'۔ یعنی بجائے خود تم ہم پر ایسے گراں نہیں ہو کہ تم کو ٹھکانے لگا دینا ہمارے لیے کچھ مشکل ہو۔ البتہ تمہارے کنبہ اور قبیلہ کا خیال دامن گیر ہوتا ہے کہ اس سے کیوں

جھگڑا مول لیں۔ سنگسار کردینے کی دھمکی خاص طور پر اس لیے دی گئی کہ حضرت شعیبؑ قوم کے بتوں کی تحقیر کرتے تھے، یاد ہوگا بتوں کی تحقیر پر یہی دھمکی سیدنا ابراہیمؑ اور دوسرے انبیاؑ کو بھی دی گئی تھی۔

قَالَ يٰقَوْمِ اَرَهْطِيْٓ اَعَزُّ عَلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ ۭ وَاتَّخَذْتُمُوْهُ وَرَاۗءَكُمْ ظِهْرِيًّا ۭ اِنَّ رَبِّيْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ مُحِيْطٌ (۹۲)

حضرت شعیبؑ کا توکل علی اللہ

حضرت شعیبؑ نے اس دھمکی کے جواب میں فرمایا کہ اے میرے ہم قومو! کیا میرے کنبہ و قبیلہ کا خوف و لحاظ تمہیں اللہ سے زیادہ ہے کہ تم کنبہ و قبیلہ کو تو اہمیت دیتے ہو جب کہ خدا کو تم نے پس پشت ڈال رکھا ہے۔ اِنَّ رَبِّيْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ مُحِيْطٌ یاد رکھو میرا رب جو کچھ تم کر رہے ہو یا کرنے والے ہو سب کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ مجال نہیں ہے کہ تم کوئی قدم اس کے اذن کے بغیر اٹھا سکو۔ مطلب یہ کہ میرا بھروسہ میرے رب پر ہے، تم جو کرنا چاہتے ہو کرو۔

'ظِهْرِيّ' کے معنی ہیں وہ چیز جو پیچھے ڈال کر فراموش کر دی جائے۔

وَيٰقَوْمِ اعْمَلُوْا عَلٰي مَكَانَتِكُمْ اِنِّىْ عَامِلٌ ۭ سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۙ مَنْ يَّاْتِيْهِ عَذَابٌ يُّخْزِيْهِ وَمَنْ هُوَ كَاذِبٌ ۭ وَارْتَقِبُوْٓا اِنِّىْ مَعَكُمْ رَقِيْبٌ (۹۳)

'اِنِّىْ عَامِلٌ' یعنی اِنِّىْ عَامِلٌ عَلٰي مَكَانَتِيْ۔ 'مَكَانَةٌ' کے معنی جگہ اور منزلت کے ہیں یعنی تم اپنی جگہ پر کام کرو، میں اپنی جگہ پر کام کرتا ہوں۔ تم میری ضد اور مخالفت میں جو کچھ کرنا چاہتے ہو کر گزرو اور میں اپنے رب کی جانب سے انذار و تبشیر کے جس مشن پر مامور ہوں گا وہ کرتا رہوں گا۔ سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ مَنْ يَّاْتِيْهِ عَذَابٌ يُّخْزِيْهِ وَمَنْ هُوَ كَاذِبٌ جلد تم جان لوگے کہ کس پر رسوا کرنے والا عذاب آتا ہے اور کون جھوٹا ہے۔ وَارْتَقِبُوْٓا اِنِّىْ مَعَكُمْ رَقِيْبٌ تم بھی انتظار کرو میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرتا ہوں۔ یعنی غیب کا علم تو مجھے بھی نہیں ہے کہ تعین کے ساتھ بتا سکوں کہ عذاب کس وقت آئے گا لیکن یہ واضح ہے کہ تم میں مستحق عذاب ہونے کی ساری علامتیں نمودار ہو چکی ہیں اس وجہ سے میں بھی اب اس کے ظہور ناگہانی کا منتظر ہوں۔

وَلَمَّا جَاۗءَ اَمْرُنَا نَجَّيْنَا شُعَيْبًا وَّالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا وَاَخَذَتِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوا
الصَّيْحَةُ فَاَصْبَحُوْا فِيْ دِيَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ ۙ كَاَنْ لَّمْ يَغْنَوْا فِيْهَا ۭ اَلَا بُعْدًا لِّمَدْيَنَ كَمَا بَعِدَتْ ثَمُوْدُ (۹۴-۹۵)

کم و بیش انہی الفاظ میں یہی مضمون آیات ۶۶-۶۸ میں گزر چکا ہے۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى بِاٰيٰتِنَا وَسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ (۹۶)

حضرت موسیٰؑ اور فرعون کی سرگزشت

اب آگے کی چند آیات میں حضرت موسیٰؑ اور فرعون کی سرگزشت کی طرف اجمالاً اشارہ فرمایا ہے۔ یاد ہوگا، سورۂ یونس میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی سرگزشت تو تفصیل کے ساتھ بیان ہوئی ہے لیکن دوسرے انبیاؑ کا صرف اجمالی حوالہ ہے اس کے برعکس اس سورہ میں حضرت موسیٰؑ کی سرگزشت کی طرف تو اجمالی اشارہ کر دیا ہے البتہ دوسرے انبیاؑ کی سرگزشتیں، جیسا کہ آپ نے دیکھا، تفصیل سے بیان ہوئی ہیں۔ اس طرح دونوں سورتیں مل کر ایک دوسرے کی تکمیل کرتی ہیں اور یہی حقیقت ہے سورتوں کے زوج زوج ہونے کی۔ متعدد کتاب

میں ہم اس مسئلہ پر گفتگو کر چکے ہیں۔

بِاٰيٰتِنَا وَسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ۔ آیات سے مراد تو وہ عام نشانیاں ہیں جو حضرت موسیٰ کے ہاتھوں قدم قدم پر ظاہر ہوئیں اور سُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ سے مراد خاص طور پر وہ نشانی ہے جس سے حضرت موسیٰ کو فرعون، اس کے درباریوں اور اس کے ساحروں پر کھلا ہوا غلبہ حاصل ہوا یعنی معجزۂ عصا۔ گویا یہاں عام کے بعد خاص کا ذکر ہے اور اس کو سُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ کے لفظ سے تعبیر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ اس کی حیثیت درحقیقت ایک حجت قاہرہ کی تھی جس کے بعد فرعون اور اس کے درباریوں کی ساری ساکھ خود اپنے آدمیوں کی نگاہ میں اکھڑ گئی۔

اِلٰى فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهٖ فَاتَّبَعُوْٓا اَمْرَ فِرْعَوْنَ ۚ وَمَآ اَمْرُ فِرْعَوْنَ بِرَشِيْدٍ (۹۷)

یعنی ہم نے تو ان کی ہدایت و رہنمائی کے لیے اپنا پیغمبر بھیجا لیکن ان شامت کے ماروں نے پیروی فرعون کی رائے اور اس کے حکم کی کی۔ فرعون کی رہنمائی صائب نہ تھی۔ اس وجہ سے یہ اس کھڈ میں گرے جس میں اس طرح کے لیڈروں کی پیروی کرنے والے گرا کرتے ہیں۔

يَقْدُمُ قَوْمَهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فَاَوْرَدَهُمُ النَّارَ ؕ وَبِئْسَ الْوِرْدُ الْمَوْرُوْدُ (۹۸)

'ورد' کے معنی کسی گھاٹ پر پانی پینے پلانے کے لیے اترنے کے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ قیامت کے دن یہ فرعون ان تمام لوگوں کا لیڈر ہوگا جنھوں نے اس جہان میں اس کی پیروی کی اور وہ ان کو دوزخ کے گھاٹ پر اتارے گا جس سے زیادہ برا کوئی گھاٹ نہیں۔

وَاُتْبِعُوْا فِيْ هٰذِهٖ لَعْنَةً وَّيَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ بِئْسَ الرِّفْدُ الْمَرْفُوْدُ (۹۹)

'رفد' کے معنی عطیہ اور انعام کے ہیں۔ یعنی اس دنیا میں بھی ان کے پیچھے لعنت لگا دی گئی ہے اور آخرت میں بھی یہ لعنت ان کے پیچھے لگی رہے گی اور کیا ہی برا ہے یہ انعام جو ان کو عطا ہوا!!

۴۔ آگے کا مضمون ـــــ آیات ۱۰۰-۱۲۳

خاتمۂ سورہ

اب آگے خاتمۂ سورہ کی آیات ہیں۔ اس میں ان حقائق کی طرف توجہ دلائی ہے جو ماضی کی سرگزشتوں کے اندر مضمر ہیں اور جن کو مخاطب کے سامنے لانے ہی کے لیے یہ سنائی گئی ہیں۔ ان کے اندر قریش کے لیے جو سبق ہیں ان کی طرف بھی توجہ دلائی ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہؓ کو ان سے جو تعلیم ملتی ہے اس کی طرف بھی اشارہ فرمایا ہے ـــــ اس روشنی میں آگے کی آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۱۰۰-۱۲۳

ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْقُرٰى نَقُصُّهٗ عَلَيْكَ مِنْهَا قَآئِمٌ وَّحَصِيْدٌ ﴿۱۰۰﴾ وَمَا ظَلَمْنٰهُمْ وَلٰكِنْ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ فَمَآ اَغْنَتْ عَنْهُمْ اٰلِهَتُهُمُ الَّتِيْ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ لَّمَّا جَآءَ اَمْرُ رَبِّكَ ؕ وَمَا زَادُوْهُمْ غَيْرَ تَتْبِيْبٍ ﴿۱۰۱﴾ وَكَذٰلِكَ اَخْذُ رَبِّكَ اِذَآ اَخَذَ الْقُرٰى وَهِيَ ظَالِمَةٌ ؕ

إِنَّ أَخْذَهُ أَلِيمٌ شَدِيدٌ ﴿١٠٢﴾ إِنَّ فِي ذٰلِكَ لَآيَةً لِمَنْ خَافَ عَذَابَ
الْآخِرَةِ ۚ ذٰلِكَ يَوْمٌ مَجْمُوعٌ لَهُ النَّاسُ وَذٰلِكَ يَوْمٌ مَشْهُودٌ ﴿١٠٣﴾
وَمَا نُؤَخِّرُهُ إِلَّا لِأَجَلٍ مَعْدُودٍ ﴿١٠٤﴾ يَوْمَ يَأْتِ لَا تَكَلَّمُ نَفْسٌ إِلَّا
بِإِذْنِهِ ۚ فَمِنْهُمْ شَقِيٌّ وَسَعِيدٌ ﴿١٠٥﴾ فَأَمَّا الَّذِينَ شَقُوا فَفِي النَّارِ لَهُمْ
فِيهَا زَفِيرٌ وَشَهِيقٌ ﴿١٠٦﴾ خَالِدِينَ فِيهَا مَا دَامَتِ السَّمَاوَاتُ وَالْأَرْضُ
إِلَّا مَا شَاءَ رَبُّكَ ۚ إِنَّ رَبَّكَ فَعَّالٌ لِمَا يُرِيدُ ﴿١٠٧﴾ وَأَمَّا الَّذِينَ
سُعِدُوا فَفِي الْجَنَّةِ خَالِدِينَ فِيهَا مَا دَامَتِ السَّمَاوَاتُ وَالْأَرْضُ
إِلَّا مَا شَاءَ رَبُّكَ ۖ عَطَاءً غَيْرَ مَجْذُوذٍ ﴿١٠٨﴾ فَلَا تَكُ فِي مِرْيَةٍ مِمَّا
يَعْبُدُ هٰؤُلَاءِ ۚ مَا يَعْبُدُونَ إِلَّا كَمَا يَعْبُدُ آبَاؤُهُمْ مِنْ قَبْلُ ۚ وَإِنَّا
لَمُوَفُّوهُمْ نَصِيبَهُمْ غَيْرَ مَنْقُوصٍ ﴿١٠٩﴾ وَلَقَدْ آتَيْنَا مُوسَى الْكِتَابَ فَاخْتُلِفَ ع ١٤
فِيهِ ۚ وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَبِّكَ لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ ۚ وَإِنَّهُمْ لَفِي شَكٍّ
مِنْهُ مُرِيبٍ ﴿١١٠﴾ وَإِنَّ كُلًّا لَمَّا لَيُوَفِّيَنَّهُمْ رَبُّكَ أَعْمَالَهُمْ ۚ إِنَّهُ بِمَا
يَعْمَلُونَ خَبِيرٌ ﴿١١١﴾ فَاسْتَقِمْ كَمَا أُمِرْتَ وَمَنْ تَابَ مَعَكَ وَلَا تَطْغَوْا ۚ
إِنَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ﴿١١٢﴾ وَلَا تَرْكَنُوا إِلَى الَّذِينَ ظَلَمُوا فَتَمَسَّكُمُ
النَّارُ وَمَا لَكُمْ مِنْ دُونِ اللَّهِ مِنْ أَوْلِيَاءَ ثُمَّ لَا تُنْصَرُونَ ﴿١١٣﴾ وَأَقِمِ
الصَّلَاةَ طَرَفَيِ النَّهَارِ وَزُلَفًا مِنَ اللَّيْلِ ۚ إِنَّ الْحَسَنَاتِ يُذْهِبْنَ
السَّيِّئَاتِ ۚ ذٰلِكَ ذِكْرَىٰ لِلذَّاكِرِينَ ﴿١١٤﴾ وَاصْبِرْ فَإِنَّ اللَّهَ لَا يُضِيعُ أَجْرَ
الْمُحْسِنِينَ ﴿١١٥﴾ فَلَوْلَا كَانَ مِنَ الْقُرُونِ مِنْ قَبْلِكُمْ أُولُو بَقِيَّةٍ يَنْهَوْنَ

عَنِ الْفَسَادِ فِي الْأَرْضِ إِلَّا قَلِيلًا مِّمَّنْ أَنجَيْنَا مِنْهُمْ ۚ وَاتَّبَعَ الَّذِينَ
ظَلَمُوا مَا أُتْرِفُوا فِيهِ وَكَانُوا مُجْرِمِينَ ﴿۱۱۶﴾ وَمَا كَانَ رَبُّكَ لِيُهْلِكَ
الْقُرَىٰ بِظُلْمٍ وَأَهْلُهَا مُصْلِحُونَ ﴿۱۱۷﴾ وَلَوْ شَاءَ رَبُّكَ لَجَعَلَ النَّاسَ
أُمَّةً وَاحِدَةً ۖ وَلَا يَزَالُونَ مُخْتَلِفِينَ ﴿۱۱۸﴾ إِلَّا مَن رَّحِمَ رَبُّكَ ۚ
وَلِذَٰلِكَ خَلَقَهُمْ ۗ وَتَمَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ لَأَمْلَأَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَ
النَّاسِ أَجْمَعِينَ ﴿۱۱۹﴾ وَكُلًّا نَّقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ أَنبَاءِ الرُّسُلِ مَا نُثَبِّتُ
بِهِ فُؤَادَكَ ۚ وَجَاءَكَ فِي هَٰذِهِ الْحَقُّ وَمَوْعِظَةٌ وَذِكْرَىٰ لِلْمُؤْمِنِينَ ﴿۱۲۰﴾
وَقُل لِّلَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ اعْمَلُوا عَلَىٰ مَكَانَتِكُمْ إِنَّا عَامِلُونَ ﴿۱۲۱﴾ وَانتَظِرُوا
إِنَّا مُنتَظِرُونَ ﴿۱۲۲﴾ وَلِلَّهِ غَيْبُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَإِلَيْهِ يُرْجَعُ ۱۰ ع ۳ ۱۰
الْأَمْرُ كُلُّهُ فَاعْبُدْهُ وَتَوَكَّلْ عَلَيْهِ ۚ وَمَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ ﴿۱۲۳﴾

ترجمۂ آیات ۱۰-۱۲۳

یہ بستیوں کی کچھ سرگزشتیں ہیں جو ہم تمھیں سنا رہے ہیں، ان میں سے کچھ تو قائم ہیں اور کچھ مٹ مٹا گئیں۔ اور ہم نے ان پر کوئی ظلم نہیں کیا بلکہ انھوں نے خود اپنے اوپر ظلم کیا۔ تو ان کے وہ دیوتا جن کو وہ اللہ کے سوا پکارتے تھے، جب تیرے رب کا عذاب آیا، ان کے کچھ بھی کام نہ آئے اور انھوں نے ان کی بربادی کے سوا اور کسی چیز میں اضافہ نہیں کیا۔ اور تیرے رب کی پکڑ، جب کہ وہ بستیوں کو ان کے ظلم میں پکڑتا ہے، اسی طرح ہوتی ہے۔ بے شک اس کی پکڑ بڑی ہی دردناک اور سخت ہے۔ اس میں ان لوگوں کے لیے بڑی نشانی ہے جو عذاب آخرت سے ڈریں۔ وہ ایک ایسا دن ہوگا جس کے لیے سارے ہی لوگ اکٹھے کیے جائیں گے اور وہ حاضری کا دن ہوگا اور ہم تو اس کو بس ایک گنتی کی مدت کے لیے ٹال رہے ہیں۔ جب وہ دن آئے گا کوئی جان اس کے

اذن کے بغیر کلام نہ کر سکے گی۔ پس ان میں کچھ بدبخت ہوں گے، کچھ نیک بخت۔ تو جو بدبخت ہوں گے وہ دوزخ میں پڑیں گے، اس میں ان کے لیے چلانا اور گھگیانا ہوگا، اسی میں پڑے رہیں گے جب تک آسمان و زمین قائم ہیں، مگر جو تیرا رب چاہے۔ بے شک تیرا رب جو چاہے کر گزرنے والا ہے۔ اور رہے وہ جو نیک بخت ہیں تو وہ جنت میں رہیں گے جب تک آسمان و زمین قائم ہیں، مگر جو تیرا رب چاہے۔ غیر منقطع عطیۂ الٰہی۔ تو تم ان کے باب میں کسی تردد میں نہ پڑو جن کی یہ لوگ پوجا کر رہے ہیں۔ یہ اسی طرح پوج رہے ہیں جس طرح ان سے پہلے ان کے باپ دادا پوجتے رہے اور ہم ان کا حصہ ان کو پورا پورا بغیر کسی کمی کے دے کے رہیں گے۔ ۱۰۰-۱۰۹

اور ہم نے موسیٰ کو کتاب دی تو اس میں اختلاف کیا گیا، اور اگر تیرے رب کی طرف سے ایک بات پہلے ہی نہ طے ہو چکی ہوتی تو ان کے درمیان فیصلہ کر دیا جاتا اور یہ لوگ اس کی طرف سے الجھا دینے والے شک میں پڑے ہوئے ہیں۔ اور یقیناً تیرا رب ہر ایک کو اس کے اعمال کا بدلہ پورا کر کے رہے گا۔ وہ جو کچھ یہ کر رہے ہیں اس سے باخبر ہے۔ تو تم جمے رہو جیسا کہ تمھیں حکم ملا ہے اور وہ بھی جنھوں نے تمھارے ساتھ توبہ کی ہے اور کج نہ ہونا، بے شک وہ جو کچھ تم کر رہے ہو اس کو دیکھ رہا ہے۔ اور ان لوگوں کی طرف مائل نہ ہوجیو جنھوں نے ظلم کیا کہ تمھیں بھی دوزخ کی آگ پکڑ لے اور تمھارے لیے اللہ کے سوا کوئی حامی نہیں، پھر تمھاری مدد نہیں کی جائے گی۔ اور نماز کا اہتمام کرو دن کے دونوں حصوں میں اور شب کے کچھ حصہ میں۔ بے شک نیکیاں دور کرتی ہیں بدیوں کو۔ یہ یاددہانی ہے یاددہانی حاصل کرنے والوں کے لیے اور ثابت قدم رہو، اللہ خوب کاروں کا اجر ضائع نہیں کرے گا۔ ۱۱۰-۱۱۵

پس کیوں نہ ایسا ہوا کہ تم سے پہلے کی امتوں میں سے ایسے حاملین حق ہوتے جو زمین میں فساد

برپا کرنے سے روکتے مگر تھوڑے ان میں سے جن کو ہم نے ان میں سے نجات بخشی اور جن لوگوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا وہ اسی عیش میں پڑے رہے جس میں تھے اور وہ مجرم تھے۔ اور تیرا رب ایسا نہیں کہ وہ بستیوں کو ہلاک کر دے کسی ظلم کی پاداش میں جب کہ ان کے باشندے اصلاح میں سرگرم ہوں۔ ۱۱۶-۱۱۷

اور اگر تیرا رب چاہتا تو لوگوں کو ایک ہی امت بنا چھوڑتا اور وہ برابر اختلاف میں رہیں گے بجز ان کے جن پر تیرا رب رحم فرمائے اور اسی لیے ان کو اس نے پیدا کیا ہے اور تیرے رب کی بات پوری ہوئی کہ میں جہنم کو جنوں اور انسانوں سب سے بھر دوں گا۔ ۱۱۸-۱۱۹

اور ہم رسولوں کی سرگزشتوں میں سے ہر ایک تمہیں سنا رہے ہیں جن سے تمہارے دل کو تقویت دیں، اور ان میں تمہارے پاس حق آیا ہے اور مومنوں کے لیے ان میں نصیحت اور یاد دہانی ہے۔ اور جو لوگ ایمان نہیں لا رہے ہیں ان سے کہہ دو کہ تم اپنے ڈھرے پر چلو ہم اپنی روش پر چلتے رہیں گے اور تم بھی انتظار کرو، ہم بھی منتظر ہیں۔ اور آسمانوں اور زمین کا غیب اللہ ہی کے علم میں ہے اور وہی تمام امور کا مرجع ہے تو اسی کی بندگی کرو اور اسی پر بھروسہ کرو اور تیرا رب جو کچھ تم کر رہے ہو اس سے بے خبر نہیں ہے۔ ۱۲۰-۱۲۳

۵- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْقُرٰى نَقُصُّهٗ عَلَيْكَ مِنْهَا قَآىِٕمٌ وَّحَصِيْدٌ (۱۰۰)

پچھلی سرگزشتوں کی طرف اشارہ

پیچھے جن قوموں کی سرگزشتیں سنائی گئی ہیں ان کی طرف اشارہ فرماتے ہوئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اور آپ کے واسطہ سے آپ کی قوم کو توجہ دلائی کہ یہ سرگزشتیں ہم سنا رہے ہیں کہ ان سے تمہیں بھی قوت و حوصلہ حاصل ہو اور تمہاری قوم کے لوگ بھی ان سے سبق حاصل کریں۔ اس مضمون کو آگے آیت ۱۲۰ میں اچھی طرح واضح فرما دیا ہے۔

بستیوں میں نشانِ عبرت

'مِنْهَا قَآىِٕمٌ وَّحَصِيْدٌ' یعنی ان بستیوں میں سے بعض قائم ہیں جن کو دیکھ سکتے ہو اور بعض ان میں سے بالکل ملیا میٹ ہو گئیں۔ 'حَصِيْدٌ' کٹی ہوئی فصل کو کہتے ہیں۔ یہاں یہ ان بستیوں کے لیے استعمال ہوا ہے جو عذابِ الٰہی

سے یک قلم نیست و نابود ہوگئیں۔ 'قَآئِمٌ' کی ایک مثال مصر ہے جس کے اندر سے فرعون اور اس کی قوم کو خدا نے نکالا اور لے جا کر سمندر میں غرق کر دیا۔ مکان قائم رہ گئے، مکین ناپید ہو گئے۔ 'حَصِیْدٌ' سے مراد قوم ہود اور قوم لوط وغیرہ کی بستیاں ہیں جن کے مکان و مکین سب ناپید ہو گئے۔ صرف کسی کسی کے کچھ آثار اپنے مکینوں کی بدبختی کی داستان عبرت سنانے کے لیے رہ گئے۔ یہ بات قریش کو سنا کر اس لیے کہی گئی ہے کہ اگر وہ اپنی اس ضد و ضلالت کی روش پر قائم ہیں تو لازماً انھیں بھی ان دو فہرستوں میں سے کسی ایک میں اپنا نام لکھانا پڑے گا۔ ان کے اندر رسول کی بعثت کے بعد اب ان کا فیصلہ بھی لازماً ہونا ہے۔

وَمَا ظَلَمْنٰهُمْ وَلٰكِنْ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ فَمَآ اَغْنَتْ عَنْهُمْ اٰلِهَتُهُمُ الَّتِيْ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ لَّمَّا جَآءَ اَمْرُ رَبِّكَ ۭ وَمَا زَادُوْهُمْ غَيْرَ تَتْبِيْبٍ (۱۰۱)

یعنی یہ نہ سمجھو کہ ہم نے ان کو تباہ جو کر دیا تو یہ ان کے اوپر ہم نے کوئی ظلم کیا۔ ہم نے ان کے اوپر کوئی ظلم نہیں کیا بلکہ انھوں نے خود اپنے اوپر ظلم کیا۔ اللہ نے ان کو جن اعلیٰ صلاحیتوں کے ساتھ پیدا کیا تھا وہ سب انھوں نے برباد کیں اور خدا اور اپنے رسول کے احکام کی نافرمانی کر کے خود اپنی تباہی کے اسباب فراہم کیے۔ فَمَآ اَغْنَتْ عَنْهُمْ اٰلِهَتُهُمُ الَّتِيْ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ لَّمَّا جَآءَ اَمْرُ رَبِّكَ۔ اور جب خدا کا حکم عذاب آیا تو ان کے وہ سارے دیوی دیوتا جن کو وہ خدا کے سوا پوجتے تھے ان کے کچھ کام نہ آئے۔ اس لیے کہ وہ سب ان کے وہم کی ایجاد تھے اور وہم حقیقت کے مقابلے میں کچھ کام نہیں آتا۔ وَمَا زَادُوْهُمْ غَيْرَ تَتْبِيْبٍ۔ یعنی انھوں نے اضافہ کیا تو ان کی تباہی و بربادی ہی میں اضافہ کیا اس لیے کہ جھوٹے سہارے ضرورت کے وقت مصیبت اور محرومی ہی میں اضافہ کرتے ہیں۔ اگر پیاسا سراب کو پانی سمجھ کر اس کی طرف بھاگے تو جس وقت اس کے سامنے اصل حقیقت واضح ہوگی اس وقت موت اس کے سامنے ہر طرف سے منہ کھولے ہوئے کھڑی ہوگی اور زندگی کی تمام راہیں مسدود ہو چکی ہوں گی حالانکہ اگر وہ اس مغالطے میں نہ مبتلا ہوا ہوتا تو ممکن تھا کہ زندگی بچا لینے کی کوئی نہ کوئی راہ اس کے لیے کھل ہی جاتی۔

وَكَذٰلِكَ اَخْذُ رَبِّكَ اِذَآ اَخَذَ الْقُرٰى وَهِيَ ظَالِمَةٌ ۭ اِنَّ اَخْذَهٗٓ اَلِيْمٌ شَدِيْدٌ (۱۰۲)

قریش کو تنبیہ

یعنی جب خدا قوموں اور بستیوں کو ان کے ظلم، ان کی سرکشی اور ان کے طغیان کی سزا دیتا ہے تو اسی طرح دیتا ہے جس طرح ان قوموں کو دی جن کی سرگزشتیں اوپر بیان ہوئیں۔ اس وقت خدا کی پکڑ بڑی دردناک اور سخت ہوتی ہے۔ یہ بات نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے قریش کو سنائی گئی ہے کہ وہ متنبہ ہوں کہ اب ان کی قوم بھی اسی میزان میں ہے جس میں دوسری قومیں تولی جا چکی ہیں۔ خدا نے جو معاملہ ان قوموں کے ساتھ کیا ہے کوئی وجہ نہیں ہے کہ ان کے ساتھ اس سے کوئی مختلف معاملہ کرے۔

اس دنیا کی شہادت آخرت کے حق میں

اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّمَنْ خَافَ عَذَابَ الْاٰخِرَةِ ۭ ذٰلِكَ يَوْمٌ مَّجْمُوْعٌ ۙ لَّهُ النَّاسُ وَذٰلِكَ يَوْمٌ مَّشْهُوْدٌ (۱۰۳)

یعنی قوموں کی یہ سرگزشتیں جس طرح نبیوں اور رسولوں کی تکذیب کا انجام ظاہر کرتی ہیں اسی طرح ان کے اندر عذاب آخرت سے ڈرنے والوں کے لیے بھی بہت بڑی نشانی ہے۔ ان واقعات سے اس دنیا کے خالق و

مالک کی صفات سامنے آتی ہیں اور اس کی پسند و ناپسند کا معیار معین ہوتا ہے کہ جب وہ اس دنیا میں سرکشوں اور باغیوں کو عبرتناک سزائیں دیتا ہے تو یہ کس طرح ممکن ہے کہ اس نے اس مجموعی دنیا کے لیے کوئی روز جزا، سزا نہ رکھا ہو۔ پس ضرور ہے کہ ایک روز جزا و سزا آئے جس میں نیکوکار اپنی نیکیوں کا صلہ پائیں اور بدکار اپنی بدیوں کی سزا بھگتیں۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ تاریخ کے یہ واقعات شہادت دے رہے ہیں کہ یہ دنیا کسی کھلنڈرے کا کھیل نہیں ہے۔ بلکہ یہ ایک عادل و حکیم خدا کی بنائی ہوئی دنیا ہے اس وجہ سے ضرور ہے کہ اس کے بعد ایک ایسا دن آئے جس میں اس کا عدل کامل ظاہر ہو اور ہر نیک و بد اپنی نیکی و بدی کو اپنی آنکھوں دیکھ لے۔

سب کی حاضری کا دن

ذٰلِكَ يَوْمٌ مَّجْمُوْعٌ لَّهُ النَّاسُ - یعنی یہ ایسا دن ہوگا کہ جس میں سب اکٹھے کیے جائیں گے، آگے جو گزرے وہ بھی اور پیچھے جو آئے وہ بھی، انبیاء بھی اور ان کی امتیں بھی، نیکی کی دعوت دینے والے بھی اور برائی کی راہیں دکھانے والے بھی، حاکم بھی اور محکوم بھی، شاہد بھی اور مشہود بھی تاکہ ہر متنفس اپنی نیکی کا صلہ پائے اگر اس نے نیکی کمائی ہے اور اپنی بدی کی سزا بھگتے اگر اس نے بدی کمائی ہے۔ وَذٰلِكَ يَوْمٌ مَّشْهُوْدٌ۔ یعنی یہ دن سب کی حاضری اور پیشی کا ہوگا تاکہ ہر معاملے کے سارے فریق سامنے موجود ہوں اور پورے انصاف کے ساتھ ان کا فیصلہ ہو سکے۔ یہ حقیقت قرآن میں دوسرے مقامات میں بھی ظاہر کی گئی ہے۔ ہم بعض آیات کا حوالہ دیتے ہیں تاکہ ذہن میں اس کا صحیح تصور قائم ہو سکے۔

وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الْبُرُوْجِ ۝ وَالْيَوْمِ الْمَوْعُوْدِ ۝ وَشَاهِدٍ وَّمَشْهُوْدٍ ۝ (البروج ۸۵: ۱-۳)	برجوں والے آسمان کی قسم، وعدہ کیے ہوئے دن کی قسم اور شاہد و مشہود کی قسم۔
اِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ يَقُوْمُ الْاَشْهَادُ (۵۱ - غافر)	اور ہم اپنے رسولوں کی اور جو لوگ ان پر ایمان لائے ان کی، دنیا کی زندگی میں بھی مدد کرتے ہیں اور اس دن بھی مدد کریں گے جس دن گواہ کھڑے ہوں گے۔
وَيَوْمَ نَبْعَثُ فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ شَهِيْدًا عَلَيْهِمْ مِّنْ اَنْفُسِهِمْ (نحل - ۸۹)	اور جس دن ہم ہر امت میں ایک گواہ اٹھائیں گے انھیں میں سے۔
يَوْمَ تَشْهَدُ عَلَيْهِمْ اَلْسِنَتُهُمْ وَاَيْدِيْهِمْ وَاَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ۔ (نور - ۲۴)	اور جس دن کہ ان پر گواہی دیں گی ان کی زبانیں اور ان کے ہاتھ اور ان کے پاؤں ان چیزوں کے باب میں جو وہ کرتے رہے ہیں۔

وَمَا نُؤَخِّرُهٗٓ اِلَّا لِاَجَلٍ مَّعْدُوْدٍ (۱۰۴)

ایک حقیقت نفس الامری

یعنی یہ نہ سمجھو کہ اس دن کے آنے میں اتنی غیر محدود مدت باقی ہے کہ اس کے اندیشہ میں ابھی سے اپنا عیش مکدر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ مدت غیر محدود نہیں، بلکہ شمار کی

ہوئی مدت ہے، نہ شمار کی ہوئی مدت، نہ کوئی مبالغہ کا اسلوب بیان ہے اور نہ یہ بات علم الٰہی کے اعتبار سے ارشاد ہوئی ہے بلکہ یہ ایک حقیقت نفس الامری کا اظہار ہے اس لیے کہ جو شخص مرا تو، جیسا کہ حدیث میں ارشاد ہے، 'مَنْ مَاتَ فَقَدْ قَامَتْ قِيَامَتُهُ' اس کی قیامت آگئی۔ برزخ میں جو مدت گزرے گی نفخ صور کے وقت اس کا کوئی احساس باقی نہیں رہے گا۔ ہر شخص یہ محسوس کرے گا کہ ابھی سوئے تھے ابھی اٹھ بیٹھے ہیں۔ جب اصل حقیقت یہ ہے تو اس میں کیا شبہ ہے کہ قیامت کے آنے میں بس اتنے ہی دن باقی ہیں جتنے دن زندگی کے باقی ہیں۔ زندگی ختم ہوئی، قیامت آن کھڑی ہوئی۔ رہی زندگی کی مدت تو اس کا 'اَجَلٍ مَّعْدُوْدٍ' ہونا ایک امر بدیہی ہے۔

يَوْمَ يَاْتِ لَا تَكَلَّمُ نَفْسٌ اِلَّا بِاِذْنِهٖ فَمِنْهُمْ شَقِيٌّ وَّسَعِيْدٌ ۱۰۵

جھوٹی شفاعت کی تردید

جب وہ گھڑی آئے گی تو کسی کی مجال نہ ہوگی کہ خدا کے اذن کے بغیر کوئی اس سے بات کرنے کے لیے زبان ہلا سکے۔ یہ مشرکین کے اس گمان کی تردید ہے کہ ان کے معبودوں کو خدا کے ہاں عزت و اعتماد کا وہ مقام حاصل ہے کہ خواہ ان کے اعمال کچھ ہی کیوں نہ ہوں لیکن وہ اپنے پجاریوں کو بہر حال چھڑا ہی لیں گے اور خدا ان کی دلداری میں مجبور ہوگا کہ ان کی سفارش سنے اور ان کی بات مانے۔ فرشتوں کی نسبت ان کا گمان تھا کہ یہ خدا کی چہیتی بیٹیاں ہیں اور جس طرح چہیتی بیٹیاں ناز و تدلل سے اپنی ہر بات اپنے باپ سے منوا لیتی ہیں اسی طرح یہ اپنے باپ یعنی خدا سے ان سارے لوگوں کو بخشوا لیں گی جو دنیا میں ان کی عبادت کرتے رہے۔ اس آیت نے ان تمام بے بنیاد اور خیالی توقعات کا خاتمہ کر دیا۔ خدا کا کسی کی ناز برداری کرنا تو درکنار اس کے آگے کوئی زبان ہی نہیں کھولے گا جب تک وہ اس کو اجازت نہ دے۔ دوسرے مقام میں اس بات کی بھی تصریح ہے کہ جو خدا کی اجازت کے بعد زبان کھولے گا بھی وہ وہی بات کہے گا جو حق ہوگی۔ سرمو حق سے تجاوز نہ کر سکے گا۔ 'فَمِنْهُمْ شَقِيٌّ وَّسَعِيْدٌ' یعنی جو لوگ محشر میں جمع ہوں گے ان میں سے کچھ بدبخت اور محروم القسمت ہوں گے اور کچھ خوش بخت اور فائز المرام۔ پہلا گروہ دوزخ میں جائے گا اور دوسرا گروہ جنت سے نوازا جائے گا اور ان میں سے ہر ایک کی بدبختی یا خوش بختی اس کے اعمال پر مبنی ہوگی۔

فَاَمَّا الَّذِيْنَ شَقُوْا فَفِي النَّارِ لَهُمْ فِيْهَا زَفِيْرٌ وَّشَهِيْقٌ ۙ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ ۭ اِنَّ رَبَّكَ فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ (۱۰۶-۱۰۷)

دوزخیوں کے چیخنے چلانے کی تعبیر

جو بدبخت ہوں گے وہ دوزخ میں پڑیں گے اور اس میں ان کا حال یہ ہوگا کہ 'لَهُمْ فِيْهَا زَفِيْرٌ وَّشَهِيْقٌ'۔ 'زَفِيْرٌ' اور 'شَهِيْقٌ' دونوں لفظ گدھے کی چیخ کے لیے آتے ہیں۔ جب وہ چیختا ہے تو جو سانس وہ باہر کی طرف نکالتا ہے اس کو 'زفیر' کہتے ہیں اور جو سانس اندر کی طرف لے جاتا ہے اس کو 'شہیق' کہتے ہیں۔ یہ دوزخیوں کے چیخنے چلانے اور رونے گھگھیانے کی تعبیر ہے اور ان لفظوں میں جو حقارت کا پہلو ہے وہ بالکل واضح ہے۔

نیا آسمان نئی زمین

خٰلِدِيْنَ فِيْهَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ۔ وہ اسی دوزخ میں رہیں گے جب تک آسمان و زمین قائم رہیں گے۔ ظاہر ہے کہ اس آسمان و زمین سے یہ موجودہ آسمان و زمین مراد نہیں ہیں، یہ آسمان و زمین تو ظہور قیامت کے وقت ختم ہو چکے ہوں گے۔ بلکہ وہ آسمان و زمین مراد ہیں جو نئے نوامیس و قوانین کے ساتھ

قیامِ قیامت کے وقت ظہور میں آئیں گے اور جن کی طرف آیت یَوْمَ تُبَدَّلُ الْاَرْضُ غَیْرَ الْاَرْضِ وَالسَّمٰوٰتُ میں اشارہ ہے۔

سب اختیار خدا کا ہے

'اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ' مگر جو تیرا رب چاہے۔ یعنی اس دائمی عذاب سے کوئی اور تو چھڑانے والا بن نہیں سکتا ہاں اگر تیرا رب ہی چاہے تو کسی کے عذاب میں تخفیف کر سکتا ہے یا کسی کو خاک اور راکھ بنا دے سکتا ہے۔ اِنَّ رَبَّكَ فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ۔ تیرا رب جو چاہے کر سکتا ہے، کوئی اس کا ہاتھ پکڑنے والا نہیں۔

وَاَمَّا الَّذِيْنَ سُعِدُوْا فَفِى الْجَنَّةِ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ ؕ عَطَآءً غَيْرَ مَجْذُوْذٍ (۱۰۸)

خوب سے خوب تر کی طرف ترقی

جو نیک بخت ہوں گے جنت میں داخل ہوں گے اور اسی میں رہیں گے جب تک آسمان و زمین قائم ہیں مگر جو تیرا رب چاہے۔ 'مگر تیرا رب جو چاہے' کے استثناء سے یہ اشارہ نکلتا ہے کہ ان کے احوال و مراتب میں بھی تبدیلیاں ہوں گی لیکن یہ تبدیلیاں خیر سے شر کی طرف کی نوعیت کی نہیں، بلکہ خوب سے خوب تر کی طرف کی نوعیت کی ہوں گی اس لیے کہ ان کے واسطے خدا کی بخشش میں کبھی انقطاع نہیں ہوگا۔ عَطَآءً غَيْرَ مَجْذُوْذٍ۔ ان کو جنت کبھی نہ منقطع ہونے والے عطیہ کی حیثیت سے ملے گی۔

فَلَا تَكُ فِىْ مِرْيَةٍ مِّمَّا يَعْبُدُ هٰٓؤُلَآءِ ؕ مَا يَعْبُدُوْنَ اِلَّا كَمَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُهُمْ مِّنْ قَبْلُ ؕ وَاِنَّا لَمُوَفُّوْهُمْ نَصِيْبَهُمْ غَيْرَ مَنْقُوْصٍ (۱۰۹)

خطاب نبیؐ سے عتاب مخالفین پر

ہم یہ اسلوب متعدد مقامات میں واضح کر چکے ہیں کہ بعض مرتبہ خطاب بظاہر الفاظ تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ہوتا ہے لیکن اس کے اندر جو عتاب مضمر ہوتا ہے اس کا رخ مخالفین کی طرف ہوتا ہے۔ وہ چونکہ اپنی ضد کے سبب سے لائق خطاب نہیں رہ جاتے اس وجہ سے بات ان کو خطاب کر کے کہنے کے بجائے پیغمبر کو خطاب کر کے کہہ دی جاتی ہے۔ سورۂ یونس کی آیات ۹۴-۹۵ میں اس کی مثال گزر چکی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ان لوگوں کے شرک پر جمے رہنے سے تمہیں کہیں یہ غلط فہمی نہ لاحق ہو کہ ان کے پاس اس کے لیے کوئی دلیل موجود ہے بس جس طرح ان کے باپ دادا بے سمجھے بوجھے ان پتھروں اور خیالی دیویوں اور دیوتاؤں کو پوجتے آئے اسی طرح اپنی عقلوں پر پٹی باندھ کر یہ ان کو پوج رہے ہیں۔ عقل اور دلیل سے کام لینے کی زحمت نہ انھوں نے اٹھائی نہ یہ اٹھانا چاہتے ہیں۔ وَاِنَّا لَمُوَفُّوْهُمْ یعنی یہ جس جنت الحمقاء میں زندگی گزارنا چاہتے ہیں گزاریں ہم تو ان کا حصہ پورا کر کے رہیں گے۔ اس میں ذرا کمی نہیں کریں گے۔

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ فَاخْتُلِفَ فِيْهِ ؕ وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ لَقُضِىَ بَيْنَهُمْ ؕ وَاِنَّهُمْ لَفِىْ شَكٍّ مِّنْهُ مُرِيْبٍ (۱۱۰)

پیغمبر صلعم کو تسلی

یہ آیت جس سیاق و سباق میں یہاں ہے بعینہٖ اسی سیاق و سباق میں سورۂ حٰم السجدۃ میں بھی ہے، ملاحظہ ہو آیت ۴۳-۴۵ مَا يُقَالُ لَكَ اِلَّا مَا قَدْ قِيْلَ لِلرُّسُلِ مِنْ قَبْلِكَ ؕ اِنَّ رَبَّكَ لَذُوْ مَغْفِرَةٍ وَّذُوْ عِقَابٍ اَلِيْمٍ ○ وَلَوْ جَعَلْنٰهُ قُرْاٰنًا اَعْجَمِيًّا لَّقَالُوْا لَوْلَا فُصِّلَتْ اٰيٰتُهٗ ؕ ءَاَعْجَمِىٌّ وَّعَرَبِىٌّ ؕ قُلْ هُوَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا

هُدًى وَّشِفَآءٌ ۭ وَالَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ فِيْٓ اٰذَانِهِمْ وَقْرٌ وَّهُوَ عَلَيْهِمْ عَمًى ۭ اُولٰۗىِٕكَ يُنَادَوْنَ مِنْ مَّكَانٍۢ بَعِيْدٍ ۝ وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ فَاخْتُلِفَ فِيْهِ ۭ وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ ۭ وَاِنَّهُمْ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ مُرِيْبٍ ۔ (تم کو نہیں کہی جا رہی ہیں مگر وہی باتیں جو تم سے پہلے رسولوں کو کہی گئیں بیشک تمہارا رب مغفرت فرمانے والا بھی ہے اور سخت پاداش دینے والا بھی۔ اور اگر ہم اس قرآن کو عجمی قرآن بناتے تو یہ کہتے کہ اس کی آیات کھولی کیوں نہیں گئیں، کتاب عجمی اور مخاطب عربی! کہہ دو یہ ایمان لانے والوں کے لیے ہدایت اور شفا ہے اور جو لوگ ایمان نہیں لا رہے ہیں ان کے کانوں میں بہرا پن اور یہ ان کی آنکھوں پر پٹی ہے۔ یہ لوگ اب بہت دور کی جگہ سے پکارے جائیں گے۔ اور ہم نے موسیٰ کو بھی کتاب دی تو اس کے باب میں بھی اختلاف کیا گیا ۔۔۔۔) یہاں آیت زیر بحث تسلی کے مقام میں ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اطمینان دلایا گیا ہے کہ جس طرح تمہاری قوم کے لوگ تمہارے اس کتاب کے پیش کرنے پر تمہارے پیچھے پڑ گئے ہیں اسی طرح موسیٰ کی قوم کے لوگوں نے بھی تورات کے معاملے میں ان سے قدم قدم پر جھگڑا اور اختلاف کیا۔ مطلب یہ ہے کہ جس صورت حال سے تمہیں سابقہ درپیش ہے اسی صورت حال سے تمہارے پیش رو نبیوں کو بھی سابقہ رہا ہے تو جس طرح انھوں نے صبر و استقامت کے ساتھ حالات کا مقابلہ کیا یہاں تک کہ اللہ نے ان کو کامیابی بخشی اسی طرح تم بھی صبر و استقامت کے ساتھ حالات کا مقابلہ کرو، اللہ تمہیں بھی تمہارے مخالفو پر فتحمند کرے گا۔ وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ، یعنی اللہ نے ہر چیز کے لیے پہلے سے ایک وقت مقرر فرما لیا ہے۔ اس وجہ سے ہر بات اس کے مقررہ پروگرام کے مطابق ہوگی، تمہاری قوم کے لیے بھی مہلت کی ایک مدت مقرر ہے، جب وہ مدت پوری ہو جائے گی ان کا پیمانہ بھی لبریز ہو جائے گا اور ان کے درمیان بھی فیصلہ کر دیا جائے گا۔ وَاِنَّهُمْ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ مُرِيْبٍ، یعنی یہ لوگ اس چیز کے باب میں جو تم پیش کر رہے ہو ایک الجھن میں ڈال دینے والے شک میں پڑے ہوئے ہیں۔ 'مُرِيْبٍ' کے معنی الجھن میں ڈال دینے والے کے ہیں۔ اس صفت کے لانے سے مقصود یہ دکھانا ہے کہ انکار کی یہ روش جو انھوں نے اختیار کر رکھی ہے یہ صرف نہ ماننے کی خواہش پر مبنی ہے اس کی کوئی بنیاد نہیں ہے۔ جو کچھ تم پیش کر رہے ہو اس کی حجت واضح ہے لیکن وہ اس کو ماننا نہیں چاہتے۔ اس وجہ سے وہ ایک سخت الجھن میں گرفتار ہو کر رہ گئے ہیں۔ نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن!

وَاِنَّ كُلًّا لَّمَّا لَيُوَفِّيَنَّهُمْ رَبُّكَ اَعْمَالَهُمْ ۭ اِنَّهٗ بِمَا يَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ (۱۱۱)

پیغمبر صلعم کو تسلی مخالفین کو تنبیہ

'لَمَّا' میں 'ل' تاکید اور قسم کا ہے اور 'مَا' زائد۔ کبھی کبھی محض جملہ کے آہنگ اور صوت کو ٹھیک رکھنے کے لیے آتا ہے۔ مثلاً اِنْ كُلُّ ذٰلِكَ لَمَّا مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۔ زخرف ۳۵ (بے شک یہ ساری چیزیں دنیوی زندگی کی متاع ہیں) اسی طرح سورۂ طارق میں ہے اِنْ كُلُّ نَفْسٍ لَّمَّا عَلَيْهَا حَافِظٌ (بے شک ہر جان پر ایک نگران مقرر ہے)۔

لفظ 'کل' اگرچہ عام ہے لیکن یہاں اس سے مراد وہی گروہ ہیں جو اوپر مذکور ہوئے یعنی مشرکین قریش اور یہود فرمایا کہ یہ لوگ دعوت حق کی مخالفت میں جو ایڑی چوٹی کا زور لگانا چاہتے ہیں لگا لیں، وہ وقت بھی آئے گا جب

تیرا رب ان کے سارے اعمال کا بھرپور بدلہ ان کو دے گا۔ جو کچھ یہ کر رہے ہیں اس سے وہ پوری طرح باخبر ہے۔ یہ امر ملحوظ رہے کہ دعوت کا جو مرحلہ یہاں زیر بحث ہے اس میں یہود نے بھی قریش کی پیٹھ ٹھونکنی شروع کر دی تھی۔

فَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ وَمَنْ تَابَ مَعَكَ وَلَا تَطْغَوْا ۭ اِنَّهٗ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ (۱۱۲)

یہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ پر ایمان لانے والوں کو جادۂ حق پر استوار رہنے کی تلقین ہے کہ مخالفتوں کے اس طوفان کے اندر اسی راہ پر پوری مضبوطی سے قائم رہو جو تمہارے رب نے تمہارے لیے کھولی ہے۔ 'وَلَا تَطْغَوْا' یعنی حالات سے مرعوب ہو کر یا ترغیبات سے متاثر ہو کر ذرا اس راہ سے کج نہ ہونا۔ 'اِنَّهٗ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ' جو کچھ تم کر رہے ہو یا کرو گے وہ سب کچھ دیکھ رہا ہے۔ وہ مشکلات میں تمہاری رہنمائی فرمائے گا اور جب تم اس کی مدد کے محتاج ہو گے وہ تم کو سہارا دے گا۔

وَلَا تَرْكَنُوْٓا اِلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ ۙ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ اَوْلِيَاۗءَ ثُمَّ لَا تُنْصَرُوْنَ (۱۱۳)

ایمان لانے والوں کو جادۂ حق پر استقامت کی تلقین

یہ آپ پر ایمان لانے والوں کو تنبیہ ہے کہ خوف یا طمع کسی چیز سے متاثر ہو کر ان لوگوں کی طرف مائل نہ ہونا جنھوں نے ظلم یعنی شرک و کفر کا ارتکاب کیا ہے ورنہ یہی دوزخ کی آگ تمہیں بھی اپنی گرفت میں لے لے گی جو ان کے لیے مقدر ہے اور اس وقت خدا کے مقابل میں تمہارا کوئی مددگار نہ ہوگا۔ 'ثُمَّ لَا تُنْصَرُوْنَ' یعنی اگر تم ان کفار و مشرکین کی طرف ذرا بھی مائل ہوئے تو جس نصرت کا اس دنیا میں تم سے وعدہ کیا جا رہا ہے اس سے محروم ہی رہو گے۔ یہ وعدہ استقامت کی شرط کے ساتھ مشروط ہے۔ اس کے بغیر تم خدا کی نصرت کے سزاوار نہیں ہو سکتے۔

وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ طَرَفَيِ النَّهَارِ وَزُلَفًا مِّنَ الَّيْلِ ۭ اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّـيِّاٰتِ ۭ ذٰلِكَ ذِكْرٰى لِلذّٰكِرِيْنَ ؀ وَاصْبِرْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ (۱۱۴ - ۱۱۵)

نماز ذریعۂ استقامت ہے

یہ اس صبر و استقامت کے حصول کی تدبیر بیان ہوئی ہے جس کی اوپر والی آیات میں ہدایت فرمائی گئی ہے۔ قرآن میں یہ بات جگہ جگہ واضح کی گئی ہے کہ خدا کی راہ میں شیطان اور ان کے اعوان کی طرف سے جو مزاحمتیں پیش آتی ہیں ان کے مقابلہ کے لیے روحانی طاقت نماز ہی سے ہوتی ہے۔ یہی چیز بندے کو خدا سے جوڑتی ہے اور جب بندہ اپنے رب سے جڑ جاتا ہے تو اس پر انوار و برکات رحمانی کا فیضان ہوتا ہے، دل وسوسوں اور کمزوریوں سے پاک اور وہ پورے عزم و حوصلے سے حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ سورۂ طٰہٰ میں صبر اور نماز کا یہ باہمی تعلق اس طرح واضح فرمایا گیا ہے۔

فَاصْبِرْ عَلٰي مَا يَقُوْلُوْنَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ	پس صبر کرو ان باتوں پر جو وہ کہتے ہیں اور اپنے
رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ غُرُوْبِهَا	رب کی حمد کے ساتھ تسبیح کرو سورج کے طلوع اور
وَمِنْ اٰنَاۗئِ الَّيْلِ فَسَبِّحْ وَاَطْرَافَ	اس کے غروب سے پہلے اور رات کے وقتوں میں بھی
النَّهَارِ لَعَلَّكَ تَرْضٰى ؀	اس کی تسبیح کرو اور دن کے اطراف میں بھی تاکہ تم
(طٰہٰ - ۱۳۰)	نہال ہو جاؤ۔

آیت زیر بحث میں اوقات نماز کی تفصیل نہیں ہے لیکن طٰہٰ کی مذکورہ بالا آیت پر غور کیجیے تو اس میں نہ صرف پانچ فرض نمازوں کے اوقات کی طرف اشارہ ہے بلکہ چاشت اور تہجد کے اوقات بھی اس میں مضمر ہیں لیکن یہاں ہم صرف صبر اور نماز کے باہمی تعلق کو واضح کرنا چاہتے ہیں۔ اوقات نماز کے مسئلہ پر انشاء اللہ اس کے محل میں بحث کریں گے۔

ایک جامع کلیہ

إِنَّ الْحَسَنَاتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّئَاتِ ایک جامع کلیہ ہے۔ لفظ 'حسنات' نے نماز اور اس کے خاندان کی دوسری تمام نیکیوں کو اپنے اندر سمیٹ لیا۔ مطلب یہ ہے کہ ان بھلائیوں ہی میں زیادہ سے زیادہ سرگرم رہو اس لیے کہ یہی ان برائیوں کو مٹائیں گی جو اندر سے یا باہر سے سر اٹھا سکتی ہیں۔

ذٰلِكَ ذِكْرَىٰ لِلذَّاكِرِينَ ۔ یہ اس ہدایت کی قدر و قیمت کی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ اس کو معمولی بات نہ سمجھنا۔ یہ سننے اور سمجھنے والوں کے لیے بڑی گراں مایہ موعظت ہے۔ یہ تنبیہ اس لیے ضروری تھی کہ ہر شخص کے لیے یہ سمجھنا آسان نہیں تھا کہ نماز راہ حق میں جہاد کا سب سے بڑا ہتھیار بھی ہے۔

خوب کاروں کا صبر

وَاصْبِرْ فَإِنَّ اللَّهَ لَا يُضِيعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِينَ ۔ اسی صبر کو مستحکم اور غیر متزلزل بنانے کے لیے اوپر والی آیت میں جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، نماز کا حکم ہے۔ نماز سے پہلے استقامت اور نماز کے بعد صبر کے ذکر میں ایک اشارہ اس حقیقت کی طرف بھی ہے کہ پامردی اور استقلال محمود اسی صورت میں ہے جب آدمی کا رخ صحیح سمت میں ہو۔ علاوہ ازیں ایک اور نکتہ بھی اس آیت میں ہے۔ وہ یہ کہ یوں نہیں فرمایا کہ 'صبر کرو اس لیے کہ اللہ صبر کرنے والوں کے اجر کو ضائع نہیں کرے گا' بلکہ یوں فرمایا کہ 'صبر کرو اس لیے کہ اللہ خوب کاروں کے اجر کو ضائع نہیں کرے گا' اس سے اس حقیقت کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے کہ صبر بھی خدا کے ہاں عزیز و محبوب اور سزاوار اجر انہی لوگوں کا ہے جو اس طرح صبر کریں جس طرح صبر کرنے کا حق ہے۔ رو دھو کر اور گلے شکوے کر کے تو سب ہی صبر کر لیتے ہیں۔ خوب کاروں کا صبر یہ ہے کہ سروں پر آرے چل جائیں لیکن نہ دل گلہ مند ہو نہ پیشانی پر بل آنے پائے۔ جو لوگ اس شان و وقار سے صبر کرتے ہیں ان کا اجر کبھی ضائع نہیں جاتا۔ لفظ 'احسان' پر دوسرے مقام میں بحث کر کے ہم یہ بتا چکے ہیں کہ اس کے معنی کسی کام کو نہایت خوبی کے ساتھ کرنے کے بھی آتے ہیں۔

فَلَوْلَا كَانَ مِنَ الْقُرُونِ مِن قَبْلِكُمْ أُولُوا بَقِيَّةٍ يَنْهَوْنَ عَنِ الْفَسَادِ فِي الْأَرْضِ إِلَّا قَلِيلًا مِّمَّنْ
أَنجَيْنَا مِنْهُمْ ۗ وَاتَّبَعَ الَّذِينَ ظَلَمُوا مَا أُتْرِفُوا فِيهِ وَكَانُوا مُجْرِمِينَ (۱۱۶)

'اولوا بقیۃ' کا مفہوم

یعنی اخیار و صالحین اور حامیان حق۔ عربی میں جب کہیں کہ فلان بقیۃ قومہ تو اس کے معنی ہوں گے کہ وہ اپنی قوم کے اخیار و صالحین میں سے ہے۔

مَا أُتْرِفُوا فِيهِ ۔ 'اترفہ المال' کے معنی ہوں گے کہ مال و اسباب نے اس کو طغیان و فساد میں مبتلا کر دیا یعنی اسباب عیش و تنعم کی فراوانی نے ان کو جس سرمستی میں مبتلا کر دیا تھا اسی میں پڑے رہے۔

قریش کو تنبیہ

اب یہ ان معذب قوموں کی طرف، جن کا ذکر اوپر گزرا ہے، اشارہ کرتے ہوئے بتایا ہے کہ کیا چیز ان کی

تباہی کا باعث ہوئی اور مقصود اس سے قریش کو متنبہ کرنا ہے کہ اگر وہی روش تم نے اختیار کرلی تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ تمہارا انجام ان کے انجام سے مختلف ہو۔ فرمایا کہ ان میں ایسے لوگ باقی نہیں رہ گئے تھے جو لوگوں کو خدا کی زمین میں فساد برپا کرنے سے روکتے۔ ان کی اکثریت ایسے ہی لوگوں پر مشتمل تھی جو اسی سرمستی میں گمن پڑے رہے جس میں مبتلا تھے۔ بس تھوڑے ہی لوگ ان میں ایسے نکلے جو خدا سے ڈرنے والے تھے۔ سو ان کو ہم نے نجات دی۔ باقی جنھوں نے اپنی جانوں پر ظلم ڈھائے وہ اپنی مرغوبات کے پیچھے پڑے رہے اور ہلاک ہوئے اس لیے کہ وہ مجرم تھے۔

وَمَا كَانَ رَبُّكَ لِيُهْلِكَ الْقُرٰى بِظُلْمٍ وَّاَهْلُهَا مُصْلِحُوْنَ (۱۱۷)

قوموں کی ہلاکت کے باب میں سنّتِ الٰہی

اب یہ قوموں کی ہلاکت کے باب میں سنّتِ الٰہی واضح فرمائی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ کا طریقہ یہ نہیں ہے کہ وہ کسی قریہ کو ان کے کسی ظلم کی پاداش میں ہلاک کرے جب کہ اس کے باشندے بحیثیتِ مجموعی اصلاح کرنے والے ہوں۔ مطلب یہ کہ خدا کا عذاب کسی قوم پر اس وقت آتا ہے جب قوم کا مزاج بحیثیتِ مجموعی بگڑ جاتا ہے۔ اصلاح کرنے والے یا تو اس میں باقی رہ ہی نہیں جاتے یا رہتے ہیں تو خال خال نہایت قلیل تعداد میں۔ لفظ 'قُرٰی' یہاں قوموں کے مفہوم میں ہے اور 'بِظُلْمٍ' کی تنکیر سے مقصود اس حقیقت کو واضح کرنا ہے کہ انفرادی خرابیاں عذابِ الٰہی کا باعث نہیں ہوتیں۔ عذابِ الٰہی اسی وقت نازل ہوتا ہے جب مجموعہ کا مزاج فاسد ہو جاتا ہے۔

وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَجَعَلَ النَّاسَ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلَا يَزَالُوْنَ مُخْتَلِفِيْنَ ۙ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ رَبُّكَ ۭ وَلِذٰلِكَ خَلَقَهُمْ ۭ وَتَمَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ (۱۱۸-۱۱۹)

ہدایت وضلالت کے معاملہ میں قانونِ الٰہی

یعنی اللہ اگر سب کو ایک ہی امت بنا دینا چاہتا تو وہ ایسا کر سکتا تھا، کوئی اس کا ہاتھ پکڑنے والا نہیں تھا لیکن اس نے ہدایت وضلالت کے معاملے میں اس جبر کو پسند نہیں فرمایا بلکہ اس نے نیکی اور بدی دونوں کو ان کے انجام کی تفصیل کے ساتھ لوگوں کے سامنے رکھ دیا ہے اور انہیں اختیار دیا ہے کہ وہ ان میں سے جس کو چاہیں اختیار کر لیں۔ اگر وہ نیکی کی راہ اختیار کریں گے تو اس کا صلہ آخرت کی ابدی زندگی کی کامرانیاں ہیں اور اگر بدی کی راہ اختیار کریں گے تو آخرت میں اس کی سزا بھگتیں گے۔ 'وَلَا يَزَالُوْنَ مُخْتَلِفِيْنَ' یعنی جب اللہ نے اس معاملے میں جبر کو پسند نہیں فرمایا بلکہ لوگوں کو اختیار دیا ہے تو یہ توقع نہیں کرنی چاہیے کہ ہر شخص نیکی ہی کی راہ اختیار کرے گا بلکہ بہتیرے ان میں سے ایسے بھی نکلتے رہیں گے جو تمام تعلیم و تذکیر کے باوجود اپنے نفس اور شیطان کی پیروی میں بدی ہی کی راہ اختیار کریں گے اور اسی پر جئیں گے، اسی پر مریں گے۔ 'اِلَّا مَنْ رَّحِمَ رَبُّكَ' یعنی بدی کی راہ اختیار کرنے سے وہی لوگ محفوظ رہیں گے جن پر تیرے رب کی رحمت ہو۔ یہ بات یہاں سیاق کلام کے اندر مضمر ہے کہ رحمتِ خداوندی کے سزاوار وہی ہو سکتے ہیں جو اپنے سمع و بصر اور عقل و دل کی صلاحیتوں سے فائدہ اٹھائیں اور آنکھیں رکھتے ہوئے ٹھوکریں کھائیں۔ 'وَلِذٰلِكَ خَلَقَهُمْ' یعنی اللہ نے تو لوگوں کو اسی لیے پیدا کیا ہے کہ وہ اپنے انتخاب و اختیار سے اپنے آپ کو اپنے رب کے فضل و رحمت کا سزاوار بنائیں۔ یہ امتحان

انسان کی خلقت کا ایک لازمی جزو ہے۔ اس سے گزرے بغیر کوئی شخص رحمتِ خداوندی کا حقدار نہیں ہو سکتا۔ وَتَمَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ لَأَمْلَأَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ: یعنی جو لوگ اس امتحان میں فیل ہو جائیں گے ان کے حق میں تیرے رب کی یہ بات پوری ہو کے رہے گی کہ میں جہنم کو جنوں اور انسانوں سے بھر دوں گا۔ یہ اللہ تعالیٰ کے اس قول کا حوالہ ہے جو ابلیس کے جواب میں ارشاد ہوا تھا اور جس کی تفصیل دوسرے مقام میں ہے کہ ابلیس نے آدمؑ کو سجدہ سے انکار کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ سے کہا کہ میں ذریتِ آدم پر ایسے گھیرے ڈالوں گا کہ تو ان میں سے اکثر کو اپنا شکر گزار نہیں پائے گا، اللہ تعالیٰ نے اس کی اس دھمکی کے جواب میں فرمایا کہ میں ایسے تمام جنوں اور تمام انسانوں سے جہنم کو بھر دوں گا۔

وَكُلًّا نَّقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ أَنبَاءِ الرُّسُلِ مَا نُثَبِّتُ بِهِ فُؤَادَكَ ۚ وَجَاءَكَ فِي هَٰذِهِ الْحَقُّ وَمَوْعِظَةٌ وَذِكْرَىٰ لِلْمُؤْمِنِينَ (۱۲۰)

سرگزشتیں سنانے سے مقصود

اوپر حضرات انبیاء علیہم السلام اور ان کی قوموں کی جو سرگزشتیں بیان ہوئی ہیں ان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ سرگزشتیں ہم اس لیے سناتے ہیں کہ ان کے وہ پہلو تمہارے سامنے لائیں جو تمہارے دل کو مضبوط کریں تاکہ تم ان حالات کا پامردی اور استقلال کے ساتھ مقابلہ کر سکو جو تمہیں پیش آ رہے ہیں یا آئندہ پیش آ سکتے ہیں۔

اور یہ اطمینان رکھو کہ ان واقعات سے حق کے غلبہ اور باطل کی شکست کی جو تاریخ تمہارے سامنے آئی ہے یہ تمام تر حقائق پر مبنی ہے۔ ایسا ہی ہوا ہے اور ایسا ہی ہوگا۔ یہ سنتِ الٰہی پر مبنی ہے اور سنتِ الٰہی میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ وَمَوْعِظَةٌ وَذِكْرَىٰ لِلْمُؤْمِنِينَ اور ان سرگزشتوں میں ان لوگوں کے لیے بھی موعظت اور یاد دہانی ہے جو تم پر ایمان لائے ہیں۔ مخالفتوں کے اس طوفان میں جن چیزوں سے انھیں بچنا ہے وہ بھی ان سے واضح ہوتی ہیں اور جو روش انھیں اختیار کرنی چاہیے وہ بھی سامنے آتی ہے۔

وَقُل لِّلَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ اعْمَلُوا عَلَىٰ مَكَانَتِكُمْ إِنَّا عَامِلُونَ ۝ وَانتَظِرُوا إِنَّا مُنتَظِرُونَ (۱۲۱-۱۲۲)

مخالفین کو فیصلہ کن جواب

اب یہ آخر میں ایک فیصلہ کن جواب ہے مخالفین کو کہ تم جو کچھ ہماری مخالفت میں کر رہے ہو یا کرنا چاہتے ہو کرو اور ہم بھی دعوتِ حق کے جس کام کو کر رہے ہیں تمہاری تمام مخالفتوں اور تمام تر ژاژخائیوں کے علی الرغم کرتے رہیں گے۔ اگر تم عذاب کا مطالبہ کر رہے ہو تو اس کا انتظار کرو، ہم بھی اس کے منتظر ہی ہیں۔ اس لیے کہ وہ تمام علامتیں جو کسی قوم کو مستحق عذاب بناتی ہیں وہ تم میں ایک ایک کر کے نمایاں ہو رہی ہیں لیکن عذاب بھیجنا خدائے علام الغیوب کا کام ہے۔ وہی جانتا ہے کہ کب تمہارا فیصلہ ہونا چاہیے۔

وَلِلَّهِ غَيْبُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَإِلَيْهِ يُرْجَعُ الْأَمْرُ كُلُّهُ فَاعْبُدْهُ وَتَوَكَّلْ عَلَيْهِ ۚ وَمَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ (۱۲۳)

اللہ پر بھروسہ کرنے کی ہدایت

یہ آخر میں سارا معاملہ اللہ کے حوالہ کرنے، ہمہ تن اس کی عبادت میں سرگرم رہنے اور اس پر پورا پورا بھروسہ کرنے کی ہدایت فرمائی گئی کہ آسمانوں اور زمین کا سارا بھید اللہ ہی کے علم و اختیار میں ہے اور سارے معاملات فیصلہ کے لیے

اسی کے حضور میں پیش ہوتے ہیں تو تم اسی کی بندگی کرو اور اسی پر بھروسہ رکھو۔ تمہارا رب جو کچھ تم کر رہے ہو اس سے بے خبر نہیں ہے۔ وہ ہر منزل اور ہر گام پر تمہارے ساتھ ہے۔ وہ تمہاری رہنمائی فرمائے گا اور ہر مشکل میں تمہاری مدد کرے گا۔

یہ آخری سطریں ہیں جو اس سورہ کی تفسیر میں اس بیچمدان کو حوالۂ قرطاس کرنے کی توفیق حاصل ہوئی۔ وَاٰخِرُ دَعْوٰنَآ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۔

لاہور

۲ مئی ۱۹۷۰ء

۲۵، صفر ۱۳۹۰ھ

تدبرِ قرآن

۱۲

یوسف

۱۔ سورہ کا عمود

سورتوں کا یہ گروپ سورۂ یونس سے شروع ہوا ہے۔ ہم اس پورے گروپ کے عمود پر، سورۂ یونس کی تفسیر کی تمہید میں ایک جامع تبصرہ کر چکے ہیں۔ یہاں ہم اس کا ضروری حصہ نقل کیے دیتے ہیں تاکہ ذہن میں بات تازہ ہو جائے ہم نے لکھا ہے۔

"اس پورے گروپ کی تلاوت، تدبر کے ساتھ، بار بار کیجیے تو آپ نہایت واضح طور پر محسوس کریں گے کہ گروپ کی تمام سورتوں میں مشترک حقیقت جو مختلف پہلوؤں اور اسلوبوں سے واضح فرمائی گئی ہے، یہ ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت سے حق و باطل کے درمیان جو کشمکش برپا ہو چکی ہے وہ بالآخر پیغمبرؐ اور اس پر ایمان لانے والوں کی کامیابی و فتح مندی اور قریش کی ذلت و ہزیمت پر منتہی ہوگی۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہیے کہ اس میں قریش کے لیے انذار اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہؓ کے لیے بشارت ہے۔ قریش پر عقل و فطرت، آفاق و انفس کے دلائل اور تاریخ و نظام کائنات کے شواہد سے یہ بات واضح کی گئی ہے کہ جو حق تمہارے پاس آچکا ہے اس کی مخالفت میں اگر تمہاری یہی روش قائم رہی تو بہت جلد وہ وقت آ رہا ہے جب تم اس کا انجام بد اپنی آنکھوں سے دیکھ لوگے:

"اسی طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہؓ کو صبر، استقامت اور تقویٰ کی تلقین فرمائی گئی ہے کہ جس حق کو لے کر تم اٹھے ہو انجام کار کی کامیابی و فیروزمندی اسی کا حصہ ہے۔ البتہ سنت الٰہی یہ ہے کہ حق کو غلبہ اور کامیابی کی منزل تک پہنچنے کے لیے آزمائش کے مختلف مرحلوں سے گزرنا پڑتا ہے، ان مرحلوں سے لازماً تمہیں بھی گزرنا ہے۔ اگر یہ مرحلے تم نے عزیمت و استقامت کے ساتھ طے کر لیے تو دنیا اور آخرت دونوں میں کامیابی تمہارا ہی حصہ ہے۔ يُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ ۚ وَيُضِلُّ اللّٰهُ الظّٰلِمِيْنَ

(ابراھیم - ۲۷)

اسی حقیقت کو واضح کرنے کے لیے سورۂ یونس اور سورۂ ہود دونوں میں، جیسا کہ آپ نے دیکھا حضرات انبیاء علیہم السلام اور ان کی قوموں کی سرگزشتیں تفصیل سے سنائی گئی ہیں اور سورۂ ہود کے آخر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے ان سرگزشتوں کے سنانے کا یہ مقصد بیان فرمایا گیا ہے۔

وَكُلًّا نَّقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الرُّسُلِ مَا نُثَبِّتُ بِهٖ فُؤَادَكَ ۚ وَجَآءَكَ فِيْ هٰذِهِ الْحَقُّ وَ

اور ہم رسولوں کی سرگزشتوں میں سے یہ جو سب سنا رہے ہیں جس سے تمہارے دل کو مضبوط کریں اور ان میں

مَوْعِظَةٌ وَّذِكْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ ۝ وَقُلْ لِّلَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ اعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ ۭ اِنَّا عٰمِلُوْنَ ۝ وَانْتَظِرُوْا ۚ اِنَّا مُنْتَظِرُوْنَ ۝ (ھود - ۱۲۰ - ۱۲۲)

تمھارے لیے بھی حق واضح ہوا ہے اور ایمان لانے والوں کے لیے بھی ان میں موعظت اور یاد دہانی ہے اور جو ایمان نہیں لا رہے ہیں ان سے کہہ دو کہ تم اپنی جگہ پر کام کرو، ہم اپنی جگہ پر کام کر رہے ہیں اور تم بھی انتظار کرو، ہم بھی منتظر ہی ہیں۔

ب۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

بعینہٖ یہی مقصد اس سرگزشت کا بھی ہے جو سورۂ یوسف میں مذکور ہوئی ہے۔ بس یہ فرق ہے کہ پچھلی سورتوں میں متعدد انبیاء کی سرگزشتیں سنائی گئی ہیں، اس میں ایک ہی سرگزشت نے پوری سورہ کو گھیر لیا ہے اور اس کو احسن القصص (بہترین سرگزشت) سے تعبیر فرمایا گیا ہے اور آخر میں خلاصۂ سرگزشت ان الفاظ میں سامنے آیا ہے۔

اِنَّهٗ مَنْ يَّتَّقِ وَيَصْبِرْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ (یوسف - ۹۰)

بے شک جو تقویٰ اختیار کریں گے اور ثابت قدم رہیں گے تو اللہ ایسے خوب کاروں کے اجر کو ضائع نہیں کرے گا۔

گویا سورہ ہود کے بعد سورۂ یوسف اسی حقیقت کو مبرہن کرنے کے لیے ایک تاریخی شہادت ہے جو سورۂ ہود کی مندرجہ بالا آیت میں مذکور ہوئی ہے اور یہ شہادت ایک بہترین شہادت ہے جو ایک بہترین سرگزشت میں نمایاں ہوئی ہے۔

ج۔ قصۂ یوسف (علیہ السلام) کے احسن القصص ہونے کے بعض وجوہ

قصۂ یوسف کا احسن القصص ہونا اس پہلو سے تو نہایت واضح ہے کہ ہر پڑھنے والا اس کے اندر اپنے ایمان کے لیے غذا اور اپنی روح کے لیے لذت و حلاوت محسوس کرتا ہے لیکن اس کے بعض پہلوؤں کی طرف ہم بھی یہاں اشارہ کیے دیتے ہیں تاکہ جو لوگ اس کے محاسن کو گرفت میں لینے کا شوق رکھتے ہوں ان کی کچھ رہنمائی ہو سکے۔

ہمارے نزدیک اس کے احسن القصص ہونے کے مندرجہ ذیل پہلو خاص اہمیت رکھتے ہیں۔

۱۔ یوں تو قرآن میں حضرات انبیاء علیہم السلام اور ان کی قوموں کے درمیان کشمکش کے جتنے واقعات بھی بیان ہوئے ہیں سب ہی عبرت و رہنمائی کے لیے بیان ہوئے ہیں کہ ماضی کی ان سرگزشتوں سے حاضر اور مستقبل کے حالات سے عہدہ برآ ہونے کے لیے سبق حاصل کیے جائیں لیکن خاص طور پر حضرت یوسف علیہ السلام اور ان کے بھائیوں کی یہ سرگزشت تو گویا ایک آئینہ ہے جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو پہلے سے وہ تمام حالات دکھا دیے گئے جو آپ کی قوم کے ہاتھوں آپ کو پیش آنے تھے۔

تفصیلات میں جانے کا یہاں موقع نہیں ہے۔ چند نمایاں واقعات کی طرف اشارہ کر دینا کافی ہوگا۔

دار الندوہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کے مشورے اور اس شر سے حضورؐ کا محفوظ رہنا۔ غارِ ثور میں حضورؐ کا چھپنا اور پھر مدینہ کو ہجرت فرمانا۔ مدینہ پہنچ کر آہستہ آہستہ آپؐ کو وہ وقار و اقتدار حاصل ہونا کہ چشمِ فلک نے اس کی نظیر نہیں دیکھی۔ آپ کی قوم کے باایمان لوگوں کا مدینہ کو ہجرت کرنا اور وہاں ایک طاقتور حکومت کا قیام۔ اس حکومت کا عروج اور اہل مکہ کا اس کی اطاعت میں داخل ہونا۔ فتح مکہ کے موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنی قوم کے لوگوں سے یہ سوال کہ لوگو، بتاؤ، میں تمہارے ساتھ کیا معاملہ کرنے والا ہوں؟ وہ بولے کہ آپ شریف بھائی اور شریف بھائی کے بیٹے ہیں۔' ان کے اس جواب کے بعد آپ نے فرمایا 'میں تم سے وہی بات کہتا ہوں جو میرے بھائی یوسفؑ نے اپنے بھائیوں سے کہی تھی، جاؤ تم آزاد ہو، تم پر کوئی الزام نہیں'۔........... ان تمام واقعات کو ذہن کے سامنے رکھتے ہوئے سورۂ یوسف کا تدبر کے ساتھ مطالعہ کیجیے تو یہ ساری سرگزشت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی پر یوں منطبق ہوتی ہے کہ گویا

جامہ بود کہ بر قامت او دوختہ بود

۲۔ جس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا حاضر و مستقبل اس آئینہ میں بالکل مصور و ممثل دیکھ لیا اسی طرح آپؐ کے دشمنوں نے بھی، کم از کم جو ذہین رہے ہوں گے، اس قصہ کے پیرایہ میں اپنی عاقبت دیکھلی ہوگی اور اس کا بھی امکان ہے کہ جن کے اندر صلاحیت رہی ہوگی وہ اس سے متاثر بھی ہوئے ہوں گے۔ حالانکہ اگر یہی باتیں صریح الفاظ میں کہی جاتیں تو اس سے فائدہ پہنچنے کی بجائے الٹا نقصان پہنچتا۔ ایک لطیف قصہ کے پردے میں لوگ جو کچھ ہضم کر جاتے ہیں وہ کھلے ہوئے وعظ کی شکل میں کبھی قبول نہیں کرتے۔

۳۔ عام طور پر لوگ ان قصوں سے بہت دلچسپی لیتے ہیں جن میں کچھ چاشنی حسن و عشق کی ہو لیکن ایسے قصے بالعموم اخلاق کو بگاڑنے والے ہوتے ہیں۔ اس قصہ کی یہ خصوصیت ہے کہ اس میں حسن و عشق کی چاشنی بھی ہے اور پھر پوری سرگزشت ہر پہلو سے حضرت یوسفؑ کے اعلیٰ کردار و صفات کا ایک مرقع ہے۔ جو مواقع خاص آزمائش کے آئے ہیں ان میں حضرت یوسفؑ نے اپنی اعلیٰ فطرت کے جو جوہر نمایاں کیے ہیں وہ ایسے شاندار ہیں کہ ہر پڑھنے والے کے اندر ان کی تقلید کا جذبہ ابھرتا ہے اور خاص بات یہ ہے کہ یہ تقلید ناممکن نہیں بلکہ ممکن محسوس ہوتی ہے۔

۴۔ یہ پہلو بھی اس سرگزشت کا نہایت دلکش ہے کہ باوجودیکہ جو واقعات و حالات پیش آئے وہ نہایت حیرت انگیز ہیں لیکن کوئی بات بے ربط اور رفتارِ حالات سے بے جوڑ نہیں معلوم ہوتی۔ ذہن بے تکلف اس کو قبول کر لیتا ہے اور ان کی فطری صداقت سے ہر سننے والا اپنی صلاحیت کے مطابق متاثر ہوتا ہے۔

۵۔ حضرت یوسفؑ حسن ظاہر اور حسن باطن دونوں کے جامع تھے لیکن ان کا اصلی حسن ان آزمائشوں میں نمایاں ہوا ہے جو ان کی زندگی کے مختلف مراحل میں پیش آئی ہیں۔ وہ بیک وقت ذہانت، پاکیزگی، نبوت، بادشاہی، نیکنامی اور قدرت کے ساتھ عفو و درگزر کی ایک زندہ جاوید مثال ہیں۔

یہ چند نمایاں پہلوؤں کی طرف یہاں ہم نے اشارہ کر دیا ہے۔ اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ اس قصہ کی حکمت بس

انھیں چند باتوں تک محدود ہے۔ آگے اثنائے قصہ میں کتنے نوادرِ حکمت آئیں گے جن کی وضاحت ان کے محل ہی میں مناسب رہے گی۔ اس تمہیدی بحث کے بعد اب ہم اللہ کا نام لے کر سورہ کی تفسیر شروع کرتے ہیں۔

سُوْرَةُ يُوْسُفَ (۱۲)

مَكِّيَّةٌ ——— اٰيَاتُهَا ۱۱۱

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

آیات ۱-۶

الٓرٰ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ ۝١ اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ قُرْءٰنًا عَرَبِيًّا
لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ۝٢ نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ اَحْسَنَ الْقَصَصِ بِمَآ
اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ هٰذَا الْقُرْاٰنَ ۖ وَاِنْ كُنْتَ مِنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الْغٰفِلِيْنَ ۝٣
اِذْ قَالَ يُوْسُفُ لِاَبِيْهِ يٰٓاَبَتِ اِنِّىْ رَاَيْتُ اَحَدَ عَشَرَ كَوْكَبًا وَّ
الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ رَاَيْتُهُمْ لِىْ سٰجِدِيْنَ ۝٤ قَالَ يٰبُنَىَّ لَا تَقْصُصْ
رُءْيَاكَ عَلٰٓى اِخْوَتِكَ فَيَكِيْدُوْا لَكَ كَيْدًا ۭ اِنَّ الشَّيْطٰنَ لِلْاِنْسَانِ
عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ۝٥ وَكَذٰلِكَ يَجْتَبِيْكَ رَبُّكَ وَيُعَلِّمُكَ مِنْ تَاْوِيْلِ
الْاَحَادِيْثِ وَيُتِمُّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكَ وَعَلٰٓى اٰلِ يَعْقُوْبَ كَمَآ اَتَمَّهَا
عَلٰٓى اَبَوَيْكَ مِنْ قَبْلُ اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْحٰقَ ۭ اِنَّ رَبَّكَ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۝٦ ع ۱

ترجمۂ آیات ۱-۶

یہ الف، لام، را ہے۔ یہ واضح کتاب کی آیات ہیں۔ ہم نے اس کو عربی قرآن بنا کر اتارا تاکہ تم سمجھو۔ ۱-۲

ہم تمھیں ایک بہترین سرگزشت سناتے ہیں اس قرآن کی بدولت جو ہم نے تمھاری طرف وحی کیا۔ اس سے پہلے بے شک تم اس سے ناآشنا تھے۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب یوسفؑ نے اپنے باپ سے کہا کہ ابا جان! میں نے خواب میں گیارہ تارے اور سورج اور چاند دیکھے، میں

نے ان کو دیکھا کہ وہ میرے آگے سربسجود ہیں۔ اس نے جواب دیا کہ اے میرے بیٹے تم اپنے اس خواب کو اپنے بھائیوں کو نہ سنانا کہ وہ تمھارے خلاف کسی سازش میں لگ جائیں۔ شیطان انسان کا کھلا ہوا دشمن ہے اور اسی طرح تمھارا رب تمھیں برگزیدہ کرے گا اور تمھیں باتوں کی حقیقتوں تک پہنچنا سکھائے گا اور تم پر اور آلِ یعقوب پر اپنی نعمت تمام کرے گا جس طرح اس نے اس سے پہلے تمھارے اجداد ابراہیمؑ اور اسحاقؑ پر اپنی نعمت تمام کی۔ بے شک تمھارا رب بڑا ہی علیم و حکیم ہے۔ ۶-۴

۱- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

الٓرٰ تِلْكَ اٰیٰتُ الْكِتٰبِ الْمُبِیْنِ ﴿۱﴾ اِنَّاۤ اَنْزَلْنٰهُ قُرْءٰنًا عَرَبِیًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ (۱-۲)

سورہ کا قرآنی نام 'الٓرٰ' یہ اس سورہ کا قرآنی نام ہے۔ یہی نام سورہ یونس اور سورہ ہود کا بھی ہے۔ نام میں اصل مقصود تسمیہ ہوتا ہے۔ اس وجہ سے ان کے معانی کی کھود کرید کی ضرورت نہیں ہے۔ بس اتنی بات یاد رکھنی چاہیے کہ ناموں کا اشتراک معانی و مطالب کے اشتراک کی دلیل ہوتا ہے۔ سو یہ چیز، جیسا کہ ہم پچھلی دونوں سورتوں کی تفسیر میں اشارہ کر آئے ہیں، ان سب سورتوں میں موجود ہے۔ ان میں اصل موضوع بحث ایک ہی ہے البتہ انداز بحث اور موادِ استدلال ہر ایک میں الگ الگ ہے۔

'کتاب مبین' کا مفہوم تِلْكَ اٰیٰتُ الْكِتٰبِ الْمُبِیْنِ۔ 'کتاب مبین' وہ کتاب جو اپنے بیان و استدلال میں بالکل واضح ہو، جس کی ہر بات ناقابلِ انکار دلائل سے مبرہن ہو، جس کا اندازِ بحث و نظر دل نشین، طمانیت بخش اور تمام الجھنوں کو دور کر دینے والا ہو۔ مطلب یہ ہے کہ اس کتاب کی صداقت کی گواہی کے لیے کسی خارجی معجزے یا نشانی کی ضرورت نہیں ہے، جیسا کہ منکرین مطالبہ کر رہے ہیں، بلکہ اس کی حقانیت و صداقت کے سورج کی طرح روشن دلائل خود اس کے اندر ہی موجود ہیں بشرطیکہ لوگ کان کھول کر اس کو سنیں اور اس کے دلائل پر غور کریں۔

اہلِ عرب پر عظیم احسان اِنَّاۤ اَنْزَلْنٰهُ قُرْءٰنًا عَرَبِیًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ۔ خطاب اہلِ عرب سے عموماً اور قریش سے خاص طور پر ہے کہ اللہ کا تم پر عظیم احسان ہوا ہے کہ اللہ کی یہ سب سے بڑی نعمت تمھاری عربی زبان میں نازل ہوئی ہے تاکہ تم اس کو سمجھو، اس کی قدر کرو اور اس کو دوسروں تک پہنچاؤ اور ان کو سمجھاؤ۔ یہ اس کتاب کے کتاب مبین ہونے کا ایک پہلو ہے اور اس میں قریش کے لیے ایک دھمکی بھی ہے کہ اگر تم نے اس نعمت کی قدر نہ کی تو تم سے بڑا بدقسمت بھی کوئی اور نہ ہوگا، یہ جتنی بڑی نعمت ہے اتنی ہی بڑی نعمت کے سزاوار ٹھہروگے اگر تم نے اس کی قدر نہ کی۔

نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ أَحْسَنَ الْقَصَصِ بِمَا أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ هَٰذَا الْقُرْآنَ ۖ وَإِن كُنتَ مِن قَبْلِهِ لَمِنَ الْغَافِلِينَ (۳)

'احسن القصص' کا مفہوم

'اَحْسَنَ الْقَصَصِ' میں قصص، قصہ اور سرگزشت کے معنی میں ہے۔ مصدر یعنی قصہ بیان کرنے کے معنی میں نہیں ہے۔ اگر مصدر کے معنی میں ہوتا تو زبان کے معروف استعمال کے مطابق اس پر الف لام نہ آتا بلکہ 'احسن قصص' ہوتا۔ اس وجہ سے ہمارے نزدیک اس کے معنی یہ ہیں کہ ہم تمھیں بہترین قصہ سناتے ہیں۔ یہ معنی اس کے صحیح نہیں ہیں کہ ہم تمھیں بہترین پیرایہ میں سناتے ہیں۔ قرآن کے نظائر سے اسی کی تائید ہوتی ہے۔ مثلاً سورۂ اعراف میں ہے فَاقْصُصِ الْقَصَصَ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُونَ (پس ان کو سرگزشت سناؤ تاکہ وہ غور کریں) سورۂ قصص میں ہے فَلَمَّا جَاءَهُ وَقَصَّ عَلَيْهِ الْقَصَصَ (پس جب وہ اس کے پاس آیا اور اس کو سرگزشت سنائی) ہمارے نزدیک 'احسن القصص' اسی طرح کی تالیف کلام ہے جس کی نظیر قرآن میں 'اللّٰهُ نَزَّلَ أَحْسَنَ الْحَدِيثِ۔ ۲۳ زمر' (اللہ نے بہترین کلام اتارا ہے) ہے۔ یہ امر بھی یہاں قابل توجہ ہے کہ 'احسن القصص' کو مصدر کے معنی میں لینے کی صورت میں مفعول غائب ہو جاتا ہے درآنحالیکہ فعل اپنے مفعول کا مقتضی ہے اور قرآن میں ہر جگہ یہ اپنے مفعول کے ساتھ ہی آیا ہے۔

یہ چند اشارات تالیف کلام سے متعلق ہیں۔ رہا یہ سوال کہ حضرت یوسفؑ کی اس سرگزشت کو 'احسن القصص' سے کیوں تعبیر فرمایا گیا ہے تو اس کے بعض پہلو ہم اپنے تمہیدی مباحث میں واضح کر چکے ہیں اور بعض کی طرف ہم آگے ان کے محل میں انشاء اللہ اشارہ کریں گے۔

ایک سرگزشت آنحضرت صلعم کے لیے بمنزلۂ آئینہ

اوپر کی آیات میں خطاب عام ہے اور اس کی نوعیت، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، قریش کو تنبیہ کی تھی۔ اب اس آیت سے روئے سخن نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف براہ راست ہو گیا ہے۔ آپؐ کو خطاب کر کے فرمایا جا رہا ہے کہ ہم تمھیں ایک بہترین سرگزشت سنا رہے ہیں اور یہ سرگزشت اس قرآن کی بے شمار برکتوں میں سے ایک برکت ہے جو ہم تمھاری طرف وحی کر رہے ہیں، اس سے پہلے تم اس سے بالکل ناآشنا تھے۔

یہاں غور کیجیے تو معلوم ہو گا کہ اس سرگزشت کے دو نہایت اہم پہلو آپؐ کے سامنے واضح کیے گئے ہیں۔ ایک یہ کہ یہ احسن القصص ہے، دوسرا یہ کہ یہ آپؐ کی رسالت کی ایک نہایت واضح دلیل ہے۔ جہاں تک اس کے احسن القصص ہونے کا تعلق ہے اس کی وضاحت ہم پیچھے کر چکے ہیں۔ ایک سرگزشت اگر بجائے خود سچی بھی ہو اور جس کو سنائی جا رہی ہو اس کے لیے وہ بمنزلہ ایک آئینہ کے بھی بن جائے جس میں وہ اپنی زندگی کے تمام نشیب و فراز کامیابی کی آخری منزلوں تک، دیکھ لے تو اس سرگزشت سے زیادہ سبق آموز، بابرکت اور قیمتی سرگزشت کوئی اور نہیں ہو سکتی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے حضرت یوسفؑ کی سرگزشت کی نوعیت یہی تھی۔ اس میں آپؐ کو آپؐ کے حاضر اور مستقبل کا پورا نقشہ دکھا دیا گیا جس میں چند مقامات بہت سخت بھی تھے لیکن آخری منزل نہایت شان دار تھی۔ اس راہ میں اگرچہ غار ثور بھی آتا تھا لیکن غار ثور کی ظلمتوں سے مدینہ کی حکومت بھی نظر آ رہی تھی اور مکہ کی پرامن زندگی کے اندر اس دن کی جھلک بھی نمایاں تھی جب کہ مکہ کے متمردین گھٹنے ٹیک کر آپ سے عفو و کرم کی التجائیں کریں گے۔

سرگزشت کے دلیلِ رسالت ہونے کی نوعیت

رسالت کی دلیل یہ یوں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم امی تھے۔ آپ نہ تو اس سرگزشت سے واقف ہی تھے نہ آپؐ کے پاس اس سے واقف ہونے کا ذریعہ ہی تھا۔ یہ قرآن کا فیض تھا کہ آپؐ اس سے واقف ہوئے اور اس صحت، وصداقت اور ایسی وسعت وتفصیل کے ساتھ واقف ہوئے کہ اہلِ کتاب بھی اس سے واقف نہ تھے۔ اس پہلو سے یہ آپؐ کی قوم کے لیے بھی آپؐ کی رسالت کی ایک دلیل تھی اور اہلِ کتاب کے لیے بھی، کہ اگر آپؐ وحی الٰہی سے مشرف نہیں ہیں تو یہ باتیں اس استقصا اور صحت وصداقت کے ساتھ آپؐ کو کیسے معلوم ہوئیں! مِنْ قَبْلِهٖ کے لفظ سے اس امرواقعی کی طرف توجہ دلانا مقصود ہے کہ اگر اس قرآن سے پہلے تمھیں اس سرگزشت کی کچھ بھی واقفیت ہوتی تو چالیس سال کی وسیع مدت میں کبھی تو بات زبان پر آتی۔ پھر تمھارے مخالفین کیوں نہیں سوچتے کہ اگر یہ وحی الٰہی کا فیضان نہیں ہے تو یہ چشمہ یکایک کہاں سے پھوٹ پڑا۔ یہ امر بھی یہاں ملحوظ رہے کہ تورات اور تالمود میں یہ سرگزشت ہے ضرور لیکن اول تو، جیسا کہ ہم نے عرض کیا آپؐ کے پاس ان سے واقف ہونے کا کوئی ذریعہ نہیں تھا، پھر ان کے بیان اور قرآن کے بیان میں قدم قدم پر اختلاف ہے اور اس اختلاف پر جو شخص بھی انصاف سے غور کرے گا وہ اسی نتیجہ پر پہنچے گا کہ قرآن کا بیان بالکل نیچرل ہے اور تورات کا بیان بالکل خلافِ عقل وفطرت اور شانِ نبوت کے منافی۔

إِذْ قَالَ يُوسُفُ لِأَبِيهِ يَا أَبَتِ إِنِّي رَأَيْتُ أَحَدَ عَشَرَ كَوْكَبًا وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ رَأَيْتُهُمْ لِي سَاجِدِينَ (۴)

حضرت یوسفؑ کا خواب

اب یہ اصل سرگزشت کی تمہید شروع ہوتی ہے۔ حضرت یوسفؑ نے ایک دن اپنے والد حضرت یعقوبؑ سے اپنا ایک خواب بیان کیا کہ گیارہ ستارے اور سورج اور چاند میرے آگے سربسجود ہیں۔ حضرت یوسفؑ کا اس خواب کو سب سے پہلے اپنے والد کے علم میں لانا ان کی غیرمعمولی سلیم الطبعی، نیک نیتی اور سعادت مندی کی دلیل ہے۔ اس طرح کا خواب اگر کوئی اوچھی طبیعت کا آدمی دیکھتا تو سب سے پہلے اپنی بڑائی کا ڈھول دوسروں میں پیٹتا لیکن حضرت یوسفؑ بچپن ہی سے نہایت رزین، متین اور سنجیدہ تھے۔ انھوں نے یہ خواب دیکھا تو انھیں یہ محسوس ہوا کہ یہ خواب خوابِ پریشاں کی نوعیت کا نہیں ہے بلکہ اہمیت رکھنے والا خواب ہے اس وجہ سے انھوں نے اس کو سب سے پہلے اپنے والد ماجد کے سامنے پیش کیا جن پر ہر پہلو سے ان کو سب سے زیادہ اعتماد تھا۔ آیت کے الفاظ پر غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ ان کی طبیعت کے اندر جو تواضع تھی وہ خواب کو پیش کرنے کے انداز میں بھی نمایاں ہے۔ حضرت یعقوبؑ کے سامنے جاتے ہی بے دھڑک یوں نہیں کہہ دیا کہ میں نے گیارہ ستاروں اور سورج چاند کو اپنے آگے سربسجود دیکھا بلکہ خواب کا ابتدائی حصہ کہ میں نے گیارہ ستاروں اور سورج چاند کو دیکھا، کہہ کر ٹھٹک گئے اس لیے کہ آگے کی بات میں ان کی بڑائی نمایاں تھی جس کے اظہار سے ان کی متواضع طبیعت جھجکتی تھی لیکن چونکہ اظہار ضروری تھا اس وجہ سے ذرا توقف کے بعد فرمایا کہ رَأَيْتُهُمْ لِي سٰجِدِيْنَ میں نے ان کو دیکھا کہ وہ میرے لیے سجدے میں پڑے ہوئے ہیں۔ عربیت کا ذوق رکھنے والے اندازہ کر سکتے ہیں کہ فعل رَأَيْتُ کے اعادہ میں یہ بلاغت ہے کہ اس میں رویا کے بیان کرتے وقت خاص کر واقعۂ سجدہ کے بیان کرتے وقت، حضرت یوسفؑ پر جو

جھجک طاری رہی ہے وہ واضح ہے۔

قَالَ يٰبُنَيَّ لَا تَقْصُصْ رُءْيَاكَ عَلٰٓى اِخْوَتِكَ فَيَكِيْدُوْا لَكَ كَيْدًا ۭ اِنَّ الشَّيْطٰنَ لِلْاِنْسَانِ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ (۵)

حضرت یعقوبؑ کی تعبیر اور حضرت یوسفؑ کو ہدایت

حضرت یعقوبؑ نے خواب سنتے ہی یہ اندازہ فرما لیا کہ یہ منصب نبوت پر سرفرازی کا اشارہ ہے لیکن اس بشارت سے پہلے انھوں نے حضرت یوسفؑ کو تاکید کے ساتھ منع فرمایا کہ یہ خواب اپنے بھائیوں کے آگے نہ بیان کرو تاکہ کہیں وہ حسد سے جل بھن کر تمہارے خلاف کسی سازش میں سرگرم ہو جائیں۔ یہ امر یہاں واضح رہے کہ حضرت یوسفؑ کے کل گیارہ بھائی تھے جن میں سے دس ان کی سوتیلی ماؤں سے تھے۔ صرف سب سے چھوٹے بھائی بن یامین ان کی اپنی ماں سے تھے۔ یہاں اشارہ انھیں دس سوتیلے بھائیوں کی طرف ہے۔ چونکہ ان بھائیوں کی پرخاش حضرت یوسفؑ کے ساتھ واضح تھی اس وجہ سے حضرت یعقوبؑ کو اندیشہ ہوا کہ اگر کہیں انھوں نے یوسفؑ کا خواب سن لیا تو ان کی حسد کی آگ اور بھڑک اٹھے گی اور عجب نہیں کہ وہ حسد سے اندھے ہو کر ان کو نقصان پہنچانے کی کوئی خطرناک سازش کر ڈالیں۔ اِنَّ الشَّيْطٰنَ لِلْاِنْسَانِ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ، یعنی کھلا ہوا دشمن شیطان تو موجود ہی ہے، وہ کہیں ان کو کسی فتنہ کی راہ پر نہ ڈال دے۔

وَكَذٰلِكَ يَجْتَبِيْكَ رَبُّكَ وَيُعَلِّمُكَ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ وَيُتِمُّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكَ وَعَلٰٓى اٰلِ يَعْقُوْبَ كَمَآ اَتَمَّهَا عَلٰٓى اَبَوَيْكَ مِنْ قَبْلُ اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْحٰقَ ۭ اِنَّ رَبَّكَ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ (۶)

حضرت یعقوبؑ نے جب خواب سنا تو چونکہ یہ بات ان کے علم ہی تھی کہ نبوت کا آغاز رویائے صادقہ ہی سے ہوتا ہے اور اس خواب کا ظاہر ہی بتا رہا تھا کہ یہ سچا خواب ہے اور خواب دیکھنے والے کے لیے ایک شاندار مستقبل کی پیشین گوئی کر رہا ہے اس وجہ سے انھوں نے فرمایا کہ یہ جو کچھ تم نے دیکھا ہے ٹھیک ہے۔ جلد وہ وقت آنے والا ہے جب تمہارا رب تمھیں منصب نبوت کے لیے منتخب فرمائے گا۔

وَيُعَلِّمُكَ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ، میں دو باتوں کی طرف اشارہ ہے ایک تو اس بات کی طرف کہ اس رویا کی حقیقت اللہ تعالیٰ خود تم پر واضح فرما دے گا۔ چنانچہ جب اس کی حقیقت حضرت یوسفؑ نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لی تو فرمایا يٰٓاَبَتِ هٰذَا تَاْوِيْلُ رُءْيَايَ مِنْ قَبْلُ ۡ قَدْ جَعَلَهَا رَبِّيْ حَقًّا ۭ وَقَدْ اَحْسَنَ بِيْٓ اِذْ اَخْرَجَنِيْ مِنَ السِّجْنِ وَجَاۗءَ بِكُمْ مِّنَ الْبَدْوِ مِنْۢ بَعْدِ اَنْ نَّزَغَ الشَّيْطٰنُ بَيْنِيْ وَبَيْنَ اِخْوَتِيْ ۭ اِنَّ رَبِّيْ لَطِيْفٌ لِّمَا يَشَاۗءُ ۭ اِنَّهٗ هُوَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ ۔ رَبِّ قَدْ اٰتَيْتَنِيْ مِنَ الْمُلْكِ وَعَلَّمْتَنِيْ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ۔ (اے میرے باپ یہ میرے اس خواب کی تعبیر ہے جو میں نے پہلے دیکھا تھا میرے رب نے اس کو حقیقت کر دکھایا اور اس نے مجھ پر بڑا ہی کرم فرمایا جب کہ مجھے قید خانہ سے باہر نکالا اور آپ لوگوں کو بعد اس کے کہ شیطان نے میرے اور میرے بھائیوں کے درمیان فساد ڈال دیا تھا، دیہات سے یہاں لایا، میرا رب جو کچھ چاہتا ہے اس کو نہایت خوبی سے کر دکھاتا ہے، وہ بڑا ہی علیم و حکیم ہے۔ اے میرے رب تو نے مجھے حکومت بھی عطا فرمائی اور رویا کی تعبیر بھی بتائی)۔

تعبیر رؤیا کا علم

دوسری یہ کہ رویا چونکہ علوم نبوت کے ذرائع میں سے ایک ذریعہ ہے اور رویا میں حقائق مجازی شکل میں ظاہر ہوتے ہیں جن کو سمجھنا ایک خاص ذہنی مناسبت کا مقتضی ہے اس وجہ سے اللہ تعالیٰ حضرات انبیاء علیہم السلام کو تعبیر رویا کا ایک خاص ذوق اور ایک خاص علم بھی عطا فرماتا ہے۔ حضرت یعقوبؑ نے جب محسوس فرما لیا کہ اس رویا میں حضرت یوسفؑ کے لیے نبوت کی بشارت ہے تو ساتھ ہی ان پر یہ بات بھی واضح ہو گئی کہ اب حضرت یوسفؑ کو تعبیر رویا کا علم بھی عطا ہو گا تاکہ رویا کی شکل میں جو حقائق ان پر وارد ہوں ان کو ٹھیک ٹھیک سمجھ کر وہ منشائے خداوندی کی تعمیل کر سکیں۔ چنانچہ آگے اسی سورہ میں آئے گا کہ اللہ تعالیٰ نے اس علم میں ان کا درجہ اتنا بلند کیا کہ بالآخر یہی علم ان کے لیے مصر کی بادشاہی کے حصول کا ذریعہ بن گیا۔

اصل نعمت دین و شریعت ہے

وَيُتِمُّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكَ ...... الآیہ، نعمت سے مراد دین و شریعت کی نعمت ہے۔ دنیا کی دوسری چیزوں کا نعمت ہونا ایک امر اضافی ہے۔ جب بندے کو دین و شریعت کی نعمت ملتی ہے تب ہی نعمت کامل ہوتی ہے۔ حضرت یعقوبؑ نے فرمایا کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے تمہارے اجداد ابراہیمؑ اور اسحٰقؑ کو اپنی نعمت سے نوازا اسی طرح وہ تم کو اور آل یعقوب کو بھی اس نعمت سے نوازے گا اور تم نے جو رویا دیکھی ہے وہ اسی اتمام نعمت کی بشارت ہے۔ اللہ بڑا ہی علیم و حکیم ہے۔ وہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے اور جو کچھ کرتا ہے وہ حکمت پر مبنی ہوتا ہے۔

۲ آگے کا مضمون ـــــ آیات ۷-۲۲

حضرت یوسفؑ کی سرگزشت

اوپر کی تمہید کے بعد اب آگے حضرت یوسفؑ اور ان کے بھائیوں کی اصل سرگزشت شروع ہوتی ہے چونکہ اس سرگزشت کے سنانے سے اصل مقصود داستان سرائی نہیں بلکہ ان بہت سے سوالوں کا جواب دینا تھا جو اس دور میں اپنوں اور بیگانوں دونوں ہی کے ذہنوں کے اندر نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کی دعوت سے متعلق پیدا ہو رہے تھے اس وجہ سے ابتدا ہی میں متنبہ کر دیا کہ لَقَدْ كَانَ فِيْ يُوْسُفَ وَاِخْوَتِهٖٓ اٰيٰتٌ لِّلسَّآئِلِيْنَ (یوسفؑ اور اس کے بھائیوں کی سرگزشت میں سوال کرنے والوں کے لیے بہت سی نشانیاں ہیں) یعنی جو لوگ اس الجھن میں ہیں کہ آگے کیا ہو گا اور کس طرح ہو گا وہ اپنے اس طرح کے سوالوں کے جواب اس سرگزشت میں پا لیں گے۔ پھر پیرے کے آخر میں فرمایا کہ وَاللّٰهُ غَالِبٌ عَلٰٓى اَمْرِهٖ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ۔ اللہ اپنی اسکیم کو بروئے کار لانے پر پوری طرح حاوی ہے لیکن اکثر لوگ اس بات کو نہیں جانتے ـــــ اس روشنی میں آگے کی آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۷-۲۲

لَقَدْ كَانَ فِيْ يُوْسُفَ وَاِخْوَتِهٖٓ اٰيٰتٌ لِّلسَّآئِلِيْنَ ۝۷ اِذْ قَالُوْا لَيُوْسُفُ
وَاَخُوْهُ اَحَبُّ اِلٰٓى اَبِيْنَا مِنَّا وَنَحْنُ عُصْبَةٌ ۭ اِنَّ اَبَانَا لَفِيْ ضَلٰلٍ
مُّبِيْنِۨ ۝۸ اقْتُلُوْا يُوْسُفَ اَوِ اطْرَحُوْهُ اَرْضًا يَّخْلُ لَكُمْ وَجْهُ

أَبِيكُمْ وَتَكُونُوا مِنْ بَعْدِهِ قَوْمًا صٰلِحِينَ ۞ ۹ قَالَ قَآئِلٌ مِّنْهُمْ
لَا تَقْتُلُوا يُوسُفَ وَأَلْقُوهُ فِي غَيٰبَتِ الْجُبِّ يَلْتَقِطْهُ بَعْضُ
السَّيَّارَةِ إِنْ كُنْتُمْ فٰعِلِينَ ۞ ۱۰ قَالُوا يٰٓأَبَانَا مَا لَكَ لَا تَأْمَنَّا عَلٰى
يُوسُفَ وَإِنَّا لَهُ لَنٰصِحُونَ ۞ ۱۱ أَرْسِلْهُ مَعَنَا غَدًا يَّرْتَعْ وَيَلْعَبْ
وَإِنَّا لَهُ لَحٰفِظُونَ ۞ ۱۲ قَالَ إِنِّي لَيَحْزُنُنِيٓ أَنْ تَذْهَبُوا بِهِ وَ
أَخَافُ أَنْ يَّأْكُلَهُ الذِّئْبُ وَأَنْتُمْ عَنْهُ غٰفِلُونَ ۞ ۱۳ قَالُوا لَئِنْ
أَكَلَهُ الذِّئْبُ وَنَحْنُ عُصْبَةٌ إِنَّآ إِذًا لَّخٰسِرُونَ ۞ ۱۴ فَلَمَّا ذَهَبُوا
بِهِ وَأَجْمَعُوٓا أَنْ يَّجْعَلُوهُ فِي غَيٰبَتِ الْجُبِّ ۚ وَأَوْحَيْنَآ إِلَيْهِ
لَتُنَبِّئَنَّهُمْ بِأَمْرِهِمْ هٰذَا وَهُمْ لَا يَشْعُرُونَ ۞ ۱۵ وَجَآءُوٓ أَبَاهُمْ
عِشَآءً يَّبْكُونَ ۞ ۱۶ قَالُوا يٰٓأَبَانَآ إِنَّا ذَهَبْنَا نَسْتَبِقُ وَتَرَكْنَا
يُوسُفَ عِنْدَ مَتَاعِنَا فَأَكَلَهُ الذِّئْبُ ۚ وَمَآ أَنْتَ بِمُؤْمِنٍ لَّنَا
وَلَوْ كُنَّا صٰدِقِينَ ۞ ۱۷ وَجَآءُوْ عَلٰى قَمِيصِهِ بِدَمٍ كَذِبٍ ۭ قَالَ الثلثة
بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ أَنْفُسُكُمْ أَمْرًا ۭ فَصَبْرٌ جَمِيلٌ ۭ وَاللّٰهُ الْمُسْتَعَانُ
عَلٰى مَا تَصِفُونَ ۞ ۱۸ وَجَآءَتْ سَيَّارَةٌ فَأَرْسَلُوا وَارِدَهُمْ فَأَدْلٰى
دَلْوَهُ ۭ قَالَ يٰبُشْرٰى هٰذَا غُلٰمٌ ۭ وَأَسَرُّوهُ بِضٰعَةً ۭ وَاللّٰهُ عَلِيمٌ
بِمَا يَعْمَلُونَ ۞ ۱۹ وَشَرَوْهُ بِثَمَنٍ بَخْسٍ دَرٰهِمَ مَعْدُودَةٍ ۚ وَ
كَانُوا فِيهِ مِنَ الزّٰهِدِينَ ۞ ۲۰ وَقَالَ الَّذِي اشْتَرٰىهُ مِنْ مِّصْرَ ع ۲ ۱۴ ۱۲
لِامْرَأَتِهِ أَكْرِمِي مَثْوٰىهُ عَسٰىٓ أَنْ يَّنْفَعَنَآ أَوْ نَتَّخِذَهُ وَلَدًا ۭ وَ

كَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوسُفَ فِى الْاَرْضِ ۡ وَلِنُعَلِّمَهٗ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ ؕ
وَاللّٰهُ غَالِبٌ عَلٰٓى اَمْرِهٖ وَلٰـكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۲۱﴾ وَلَمَّا
بَلَغَ اَشُدَّهٗۤ اٰتَيْنٰهُ حُكْمًا وَّعِلْمًا ؕ وَكَذٰلِكَ نَجْزِى الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۲۲﴾

ترجمۂ آیات ۷ - ۲۲

بے شک یوسف اور اس کے بھائیوں کی سرگزشت میں پوچھنے والوں کے لیے بہت سی نشانیاں ہیں۔ خیال کرو جب انھوں نے کہا کہ یوسف اور اس کا بھائی ہمارے باپ کو ہم سے زیادہ پیارے ہیں حالانکہ ہم ایک پورا جتھا ہیں۔ بے شک ہمارا باپ ایک کھلی ہوئی غلطی میں مبتلا ہے۔ یوسف کو قتل کر دو یا اس کو کہیں پھینک دو تو تمھارے باپ کی ساری توجہ تمھاری ہی طرف ہو جائے گی اور اس کے بعد تم بالکل ٹھیک ہو جاؤ گے۔ ان میں سے ایک کہنے والے نے کہا کہ یوسف کو قتل تو نہ کرو، اگر تم کچھ کرنے ہی والے ہو تو اس کو کسی کنوئیں کی تہ میں پھینک دو، کوئی راہ چلتا قافلہ اس کو نکال لے جائے گا۔ ۷ - ۱۰

انھوں نے اپنے باپ سے کہا، اے ہمارے باپ، کیا بات ہے کہ یوسف کے معاملے میں آپ ہم پر اعتماد نہیں کرتے حالانکہ ہم اس کے بڑے ہی خیر خواہ ہیں۔ کل اس کو ہمارے ساتھ جانے دیجیے ذرا چرے چگے اور کھیلے کودے اور ہم اس کی پوری حفاظت کے ذمہ دار ہوں گے۔ اس نے کہا مجھے غم میں یہ چیز ڈالتی ہے کہ تم اسے لے جاؤ اور ڈرتا ہوں کہ جب تم اس سے غافل ہو تو اس کو بھیڑیا کھا جائے۔ وہ بولے کہ اگر اس کو بھیڑیا کھا گیا جب کہ ہم ایک پوری جماعت ہیں تو ہم تو اس صورت میں نہایت ہی نامراد ثابت ہوں گے۔ ۱۱ - ۱۴

پس جب وہ اس کو لے گئے اور یہ طے کر لیا کہ اس کو کنوئیں کی تہ میں پھینک دیں اور ہم نے اس کو وحی بھی کر دی کہ تم ان کو ان کی اس کارستانی سے آگاہ کرو گے جب کہ ان کو کچھ خیال بھی نہ ہوگا اور

وہ اپنے باپ کے پاس کچھ رات گئے روتے ہوئے آئے تو بولے کہ اے ہمارے باپ ہم ایک دوسرے سے دوڑ میں مقابلہ کرتے ہوئے دور نکل گئے اور یوسف کو ہم نے اپنے سامان کے پاس چھوڑا تو اس کو بھیڑیا کھا گیا ـــــــ اور آپ تو ہماری بات باور کرنے والے ہیں نہیں اگرچہ ہم سچے ہی ہوں اور وہ اس کے کرتے پر جھوٹ موٹ کا خون بھی لگا لائے۔ اس نے کہا کہ بلکہ یہ تو تمہارے جی کی ایک گھڑی ہوئی بات ہے تو صبر جمیل کی توفیق ملے اور جو کچھ تم بیان کرتے ہو اس میں خدا ہی سہارا ہے۔ ۱۵-۱۸

اور ایک قافلہ آیا تو انھوں نے اپنے سقہ کو بھیجا۔ اس نے ڈول ڈالا تو پکار اٹھا، خوشخبری ہو! یہ تو ایک لڑکا ہے! اور اس کو ایک پونجی سمجھ کر محفوظ کر لیا اور اللہ خوب باخبر تھا اس چیز سے جو وہ کر رہے تھے اور انھوں نے اس کو ایک حقیر قیمت، چند درم کے عوض، بیچ دیا اور وہ اس کے معاملے میں بالکل بے پروا تھے۔ ۱۹-۲۰

اور اہل مصر میں سے جس نے اس کو خریدا اس نے اپنی بیوی سے کہا کہ ذرا اس کو خاطر سے رکھیو۔ امید ہے کہ ہمیں نفع پہنچائے یا ہم اس کو بیٹا ہی بنا لیں اور اس طرح ہم نے یوسف کے لیے ملک میں زمین ہموار کی تاکہ ہم اس کو منتخب کریں اور اس کو باتوں کی تعبیر بتائیں اور اللہ اپنے ارادے کی تنفید پر غالب ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔ اور جب وہ اپنی پختگی کو پہنچا ہم نے اس کو حکومت اور علم عطا کیا اور ہم خوب کاروں کو اسی طرح بدلہ دیا کرتے ہیں۔ ۲۱-۲۲

۳- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

لَقَدْ كَانَ فِيْ يُوْسُفَ وَاِخْوَتِهٖٓ اٰيٰتٌ لِّلسَّآئِلِيْنَ (۷)

سرگزشت سے پہلے ایک تنبیہ

یہ آیت، جیسا کہ ہم نے تمہید میں اشارہ کیا، اصل سرگزشت کے شروع کرنے سے پہلے ایک تنبیہ ہے کہ مخاطب اس کو محض ایک کہانی کی طرح نہ سنیں بلکہ اس میں ان بہت سے سوالوں کے جواب مضمر ہیں جو دعوت اسلامی کے اس دور میں مخالفین و موافقین دونوں ہی کے

غلبۂ حق اور ہزیمت باطل کی بشارت

ذہنوں میں ابھر رہے ہیں۔ اس گروپ کی پچھلی دونوں سورتوں میں حق کے غلبہ اور باطل کی ہزیمت کا مضمون مختلف اسلوبوں سے بیان ہوا ہے لیکن جس وقت یہ مضمون بیان ہوا ہے پورے ملک پر اس طرح کفر کی تاریکی چھائی ہوئی تھی کہ یہ تصور کرنا کچھ آسان نہ تھا کہ یہ تاریکی ایک دن بالکل کافور ہو جائے گی اور جو شخص آج اپنے چند نہایت مظلوم ساتھیوں کے ساتھ وقت کے متمردین کے ہاتھوں ہر قسم کے مصائب و مظالم کا ہدف ہے ایک دن آئے گا کہ یہ تمام متمردین اس کے آگے گھٹنے ٹیک کر اس سے رحم و کرم کی التجائیں کریں گے۔ قرآن نے اس تصور کو ذہنوں کے قریب لانے کے لیے یہ سرگزشت سنائی تاکہ اس امر سے متعلق ذہنوں میں جتنے بھی سوالات و شبہات موجود ہوں یا آئندہ پیدا ہو سکتے ہوں وہ دور ہو جائیں اور لوگوں کو اندازہ ہو جائے کہ خدا کی شانیں یوں ظاہر ہوتی ہیں اور اس کے ارادے اور منصوبے یوں بروئے کار آتے ہیں۔

إِذْ قَالُوا لَيُوسُفُ وَأَخُوهُ أَحَبُّ إِلَىٰ أَبِينَا مِنَّا وَنَحْنُ عُصْبَةٌ إِنَّ أَبَانَا لَفِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ (۸)

برادرانِ یوسف کا غصہ

'عُصْبَةٌ' کے معنی گروہ، جتھہ اور جماعت کے ہیں، خاص طور پر وہ گروہ جس کے اندر خون کی عصبیت بھی موجود ہو۔ بدویانہ دور زندگی میں، جب منظم حکومتوں کا وجود نہیں تھا، حمایت و مدافعت کا تمام تر انحصار خاندان اور قبیلہ کی عصبیت ہی پر ہوتا تھا۔ سب سے زیادہ باعزت اور با اثر وہ خاندان سمجھا جاتا جس کے اندر حمایت اور مدافعت کے لیے اٹھنے والے نوجوان سب سے زیادہ ہوں۔ اسی خاندان کو قوم و قبیلہ کی سربراہی حاصل ہوتی اور وہی حکومت کرتا۔ حضرت یوسفؑ کے بھائیوں نے اسی امر کو مدنظر رکھ کر نعوذ باللہ اپنے باپ کی بے خردی اور ناعاقبت اندیشی پر آپس میں غصہ کا اظہار کیا کہ جتھہ اور گروہ کی حیثیت تو ہماری ہے، حمایت و مدافعت کا ذریعہ تو ہم بنیں گے، دوسروں پر دھاک تو ہمارے بل بوتے پر بیٹھے گی لیکن ہمارے باپ کا حال یہ ہے کہ اس کو محبت یوسف اور اس کے بھائی بنیامین سے ہے، اس سے بڑی غلطی اور گمراہی اور کیا ہو سکتی ہے۔

اقْتُلُوا يُوسُفَ أَوِ اطْرَحُوهُ أَرْضًا يَخْلُ لَكُمْ وَجْهُ أَبِيكُمْ وَتَكُونُوا مِن بَعْدِهِ قَوْمًا صَالِحِينَ (۹)

لفظ 'صالح' کا لغوی مفہوم

لفظ 'صالح' یہاں ٹھیک اپنے لغوی مفہوم میں ہے۔ عربی میں اگر کہیں 'صَلَحَتْ حَالُ فُلَانٍ' تو اس کے معنی ہوں گے، اس کا حال بالکل ٹھیک ہو گیا، اس کی پریشانی دور ہو گئی، جو کانٹا اسے چبھ رہا تھا اس سے وہ نجات پا گیا۔

برادرانِ یوسف کی مشورت

یہ وہ علاج ہے جو حضرت یوسف کے بھائیوں نے اپنی پریشانی دور کرنے کے لیے سوچا۔ انھوں نے اسکیم یہ بنائی کہ یوسفؑ کو یا تو قتل کر دیں یا کہیں دور دراز مقام میں لے جا کر پھینک دیں تاکہ ان کے باپ کی ساری توجہ انہی کی طرف ہو جائے اور یہ کانٹا جو انھیں چبھ رہا ہے نکل جائے۔

بعض لوگوں نے 'وَتَكُونُوا مِن بَعْدِهِ قَوْمًا صَالِحِينَ' کا یہ مطلب لیا ہے کہ اس جرم کے کر لینے کے بعد پھر نیک بن جانا لیکن یہ معنی اس جملہ کے کسی طرح نہیں ہو سکتے۔ دوسرے پہلوؤں سے قطع نظر جملہ کی نحوی ترکیب ہی اس سے ابا کر رہی ہے ظاہر ہے کہ اس کا عطف سابق جواب امر پر ہے اس وجہ سے جو حکم اس کا ہو گا وہی حکم اس کا بھی ہو گا۔

حضرت یوسفؑ کے بھائیوں کی اس مشورت سے یہ بات بالکل صاف ہو جاتی ہے کہ ان کو اصلی کد حضرت یوسفؑ ہی سے تھی اور اس کد میں اصلی دخل صرف ان کے سوتیلے ہونے کو نہیں تھا بلکہ ان کی ان اعلیٰ صلاحیتوں کو تھا جو اسی عمر سے ان میں ابھرنے لگی تھیں اور جن کو دیکھ کر حضرت یعقوبؑ ان سے غیر معمولی طور پر محبت کرنے لگے تھے۔ اگر مجرد سوتیلے ہونے کے سبب سے کد ہوتی تو سوتیلے تو بنیامین بھی تھے آخر ان کو ٹھکانے لگانے کی انھوں نے کوئی اسکیم کیوں نہیں بنائی!

قَالَ قَآئِلٌ مِّنْهُمْ لَا تَقْتُلُوْا يُوْسُفَ وَاَلْقُوْهُ فِيْ غَيٰبَتِ الْجُبِّ يَلْتَقِطْهُ بَعْضُ السَّيَّارَةِ اِنْ كُنْتُمْ فٰعِلِيْنَ (۱۰)

'غَیَابَۃ' کنوئیں کی تہ کو اور 'جُبّ' کچے کنوئیں کو کہتے ہیں۔ صحرائی راستوں میں جن پر سے قافلے گزرتے ہیں اس طرح کے کنوئیں ہوتے تھے جو عام حالات میں تو یوں ہی پڑے رہتے لیکن کوئی قافلہ گزرتا تو ان پر رونق ہو جاتی۔ دس بھائیوں میں سے ایک کے دل میں معلوم ہوتا ہے حضرت یوسفؑ کے لیے کوئی نرم گوشہ تھا۔ اس نے مشورہ دیا کہ قتل تو نہ کرو، اگر کچھ کرنا ہی ہے تو یہ کرو کہ قافلوں کے راستے کے کسی کنوئیں میں اس کو ڈال دو۔ کوئی قافلہ گزرے گا اس کو نکال لے گا۔ چونکہ اس زمانہ میں بردہ فروشی کا عام رواج تھا اس وجہ سے ممکن ہے یہ خیال بھی ہوا ہو کہ قافلے والے یا تو اس کو غلام بنا لیں گے یا کسی شہر میں لے جا کر اس کو بیچ دیں گے۔ اس طرح اس کی جان بھی بچ جائے گی اور تمھارے پہلو کا کانٹا بھی نکل جائے گا۔ بالآخر اسی مشورے پر سب کا اتفاق رائے ہو گیا۔

قَالُوْا يٰٓاَبَانَا مَا لَكَ لَا تَاْمَنَّا عَلٰى يُوْسُفَ وَاِنَّا لَهٗ لَنٰصِحُوْنَ ۝ اَرْسِلْهُ مَعَنَا غَدًا يَّرْتَعْ وَيَلْعَبْ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ (۱۱-۱۲)

حضرت یعقوبؑ کو فریب

'یَرْتَعْ وَیَلْعَبْ' کا لغوی مفہوم تو یہ ہے کہ ذرا چرے چگے اور کھیلے کودے لیکن یہ نہایت خوب صورت تعبیر ہے پکنک منانے کی۔ بدویانہ دور زندگی میں جی بہلانے کے جو طریقے بہت مقبول و محبوب رہے ہیں ان میں پکنک کو خاص اہمیت حاصل رہی ہے۔ شعرائے جاہلیت اپنے قصائد میں بڑی دل چسپی سے اس کا ذکر کرتے ہیں۔ حضرت یوسفؑ کے بھائیوں نے بھی مذکورہ بالا رائے پر اتفاق کر لینے کے بعد حضرت یعقوبؑ کو شیشہ میں اتارنے کے لیے ان کو یہی سبز باغ دکھلانے کی کوشش کی۔ سب مل کر ان کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ پہلے تو اپنا اعتماد جمانے کے لیے یہ کہا کہ کیا بات ہے کہ یوسفؑ کے معاملے میں آپ ہم پر اعتماد نہیں کرتے حالانکہ ہم تو اس کے بڑے ہی خیر خواہ اور محبت کرنے والے ہیں پھر ان کے سامنے اپنا پکنک کا پروگرام پیش کیا کہ کل ہم نے تفریح کا پروگرام بنایا ہے اور ہماری دلی آرزو ہے کہ یوسفؑ بھی اس پروگرام میں شریک رہے، ذرا پھل پھلاری کھائے گا، ہمارے ساتھ کھیلے کودے گا اور آپ پوری طرح مطمئن رہیں کہ کسی بات کا اندیشہ نہیں ہے، اگر کوئی خطرہ ہوا تو ہم سب اس کی حفاظت کے لیے موجود ہیں۔

قَالَ اِنِّيْ لَيَحْزُنُنِيْٓ اَنْ تَذْهَبُوْا بِهٖ وَاَخَافُ اَنْ يَّاْكُلَهُ الذِّئْبُ وَاَنْتُمْ عَنْهُ غٰفِلُوْنَ ۝ قَالُوْا لَئِنْ اَكَلَهُ الذِّئْبُ وَنَحْنُ عُصْبَةٌ اِنَّآ اِذًا لَّخٰسِرُوْنَ (۱۳-۱۴)

حضرت یعقوبؑ نے فرمایا کہ مجھے غم اور اندیشہ اگر ہے تو اس بات کا ہے کہ تم اس کو لے جاؤ اور تم تو اپنے کھیل کود، اپنی دلچسپیوں میں معروف ہو جاؤ اور تمھاری غفلت میں اس کو کوئی بھیڑیا کھا جائے معلوم ہوتا ہے اس علاقہ میں بھیڑیوں کی کثرت تھی اور آدمیوں پر ان کے حملوں کی وارداتیں ہوتی رہتی تھیں۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کے اس اندیشے کو سن کر بڑے تاؤ سے انھوں نے جواب دیا کہ ہماری پوری پارٹی کی موجودگی میں اگر اس کو بھیڑیا کھا گیا تو ہم سے بڑھ کر بدقسمت اور نامراد کون ہوگا ـــــ معلوم ہوتا ہے حضرت یعقوبؑ نے ان کی اس یقین دہانی کے بعد طوعاً وکرہاً ہی سہی، حضرت یوسفؑ کو ان کے ساتھ جانے کی اجازت دے دی اور ان کی سازش کا پہلا مرحلہ کامیابی سے طے ہو گیا۔

فَلَمَّا ذَهَبُوا بِهٖ وَاَجْمَعُوْٓا اَنْ يَّجْعَلُوْهُ فِيْ غَيٰبَتِ الْجُبِّ ۚ وَاَوْحَيْنَآ اِلَيْهِ لَتُنَبِّئَنَّهُمْ بِاَمْرِهِمْ هٰذَا وَهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۱۵﴾ وَجَآءُوْٓ اَبَاهُمْ عِشَآءً يَّبْكُوْنَ ﴿۱۶﴾ قَالُوْا يٰٓاَبَانَآ اِنَّا ذَهَبْنَا نَسْتَبِقُ وَتَرَكْنَا يُوْسُفَ عِنْدَ مَتَاعِنَا فَاَكَلَهُ الذِّئْبُ ۚ وَمَآ اَنْتَ بِمُؤْمِنٍ لَّنَا وَلَوْ كُنَّا صٰدِقِيْنَ (۱۵-۱۷)

تجویز جس پر عمل ہوا

ان آیات میں یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ لَمَّا کا جواب 'قَالُوْا يٰٓاَبَانَآ ..... الآیۃ' ہے۔ بات کو سمیٹنے کے لیے بیچ کی کئی باتوں کو لَمَّا ہی کے تحت کر دیا ہے۔ یعنی جب انھوں نے اس کو کنوئیں میں ڈالنے کا فیصلہ کر لیا اور یوسفؑ کو یہ خوش خبری بھی الہام کر دی گئی کہ تم اس آفت سے نجات پاؤ گے اور ایک دن آئے گا کہ تم ان کو ان کی اس کارستانی سے آگاہ کرو گے، اور وہ روتے ہوئے اپنے باپ کے پاس رات میں آئے، تب انھوں نے یہ کہا کہ ہم تو یوسفؑ کو سامان کے پاس چھوڑ کر دوڑ لگاتے ہوئے دور نکل گئے اور یوسف کو بھیڑیا کھا گیا۔ اس ایجاز کا فائدہ یہ ہوا کہ سرگزشت کے تمام اجزا کی طرف اشارہ بھی ہو گیا اور اصل نقطہ سے مخاطب کی توجہ ہٹنے بھی نہ پائی۔

اب اس کے اجزا پر ایک نظر ڈال لیجیے۔

فَلَمَّا ذَهَبُوا بِهٖ وَاَجْمَعُوْٓا اَنْ يَّجْعَلُوْهُ فِيْ غَيٰبَتِ الْجُبِّ ۚ یعنی حضرت یعقوبؑ کو کسی نہ کسی طرح راضی کر ہی لیا اور یوسفؑ کو ساتھ لے گئے اور اس بات پر اتفاق کر لیا کہ اس کو کنوئیں میں ڈال دیں۔ اس سے یہ بات نکلتی ہے کہ اس امر میں اختلاف اگرچہ آخر تک موجود رہا کہ یوسفؑ کو قتل کریں یا کنوئیں میں ڈالیں لیکن بالآخر کنوئیں والی تجویز ہی پر سب کا اتفاق اور اسی پر عمل ہوا۔

حضرت یوسفؑ کو بشارت

وَاَوْحَيْنَآ اِلَيْهِ لَتُنَبِّئَنَّهُمْ بِاَمْرِهِمْ هٰذَا وَهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ۔ یہاں 'وحی' سے مراد اصطلاحی وحی نہیں ہے بلکہ مراد دل میں بات ڈال دینا ہے۔ صالحین کو ظالموں اور شریروں کے ہاتھوں جب کوئی آزمائش پیش آتی ہے تو اللہ تعالیٰ جس وقت ظالموں کو ڈھیل دیتا ہے اسی وقت مظلوم کے دل پر بھی غیب سے سکینت وطمانیت، تسلی اور بشارت نازل فرماتا ہے۔ اس کا تجربہ کم و بیش ہر اس شخص کو ہوتا ہے جس کو اللہ تعالیٰ کی راہ میں کوئی تکلیف اٹھانے کی سعادت حاصل ہوتی ہے۔ یہ چیز آپ سے آپ دل پر نازل ہوتی ہے اور پھر دل کو اس طرح اپنے رنگ میں رنگ لیتی ہے کہ بڑی سے بڑی مصیبت کی اہمیت بھی پرکاہ کے برابر نہیں رہ جاتی۔ حضرت یوسف علیہ السلام کے دل پر بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ بات ڈال دی گئی کہ یہ آزمائش وقتی اور عارضی ہے۔ وہ وقت آئے گا کہ تم

ان لوگوں کو ان کی کارستانی سے آگاہ کرو گے اور تم اس وقت ایسے منصب بلند پر ہو گے کہ یہ گمان بھی نہ کر سکیں گے کہ یہ ان کا وہی بھائی ان سے بات کر رہا ہے جس کو انھوں نے اندھے کنوئیں میں پھینکا تھا۔ اس کی تفصیل آیت ۹۰ کے تحت آئے گی۔

بھائیوں کی سخن سازی

وَجَآءُوْٓ اَبَاهُمْ عِشَآءً یَّبْكُوْنَ۔ یعنی یہ کارستانی انجام دے کر کچھ رات گئے منہ لبورتے اور ٹسوے بہاتے باپ کے پاس آئے۔ کچھ رات گئے آنے میں ممکن ہے یہ مصلحت مدِنظر رہی ہو کہ اگر باپ کے دل میں تلاش و تحقیق کا کوئی خیال پیدا ہو تو اس کا بھی کوئی امکان باقی نہ رہے۔

'وَقَالُوْا یٰٓاَبَانَآ اِنَّا ذَهَبْنَا نَسْتَبِقُ وَتَرَكْنَا یُوْسُفَ عِنْدَ مَتَاعِنَا فَاَكَلَهُ الذِّئْبُ' یہ وہ اصل بات ہے جو انھوں نے اپنی صفائی میں پیش کی۔ 'اِسْتِبَاق' کے معنی دوڑنے، جھپٹنے اور ایک دوسرے سے آگے نکل جانے کے ہیں۔ اسی سورہ میں آگے 'اِسْتَبَقَا الْبَابَ' آیا ہے یعنی وہ دونوں دروازے کی طرف جھپٹے۔ ان لوگوں نے اپنے لیے عذر تلاش کرنے میں کچھ زیادہ ذہانت کا ثبوت نہیں دیا۔ حضرت یعقوبؑ نے ان کے سامنے بھیڑیے کا جو اندیشہ ظاہر کیا تھا اسی سے انھوں نے بات بنالی کہ باپ کے ذہن میں بھیڑیے کا اندیشہ تو موجود ہی ہے تو کیوں نہ اس کی آڑ میں پناہ لی جائے۔ چنانچہ انھوں نے حضرت یعقوبؑ ہی کی بات دہرا دی کہ ہم تو یوسفؑ کو سامان کے پاس چھوڑ کر دوڑ لگاتے ہوئے دور نکل گئے اور پھر بھیڑیا آیا اور یوسفؑ کو کھا گیا۔ یہ بات کہنے کو تو انھوں نے کہہ دی لیکن وہ خود بھی مطمئن نہیں تھے کہ حضرت یعقوبؑ ان کی بات باور کر لیں گے۔ چنانچہ ان کے دل کا چور ان کی زبان پر بھی آگیا اور ساتھ ہی وہ یہ بھی کہہ گزرے کہ 'وَمَآ اَنْتَ بِمُؤْمِنٍ لَّنَا وَلَوْ كُنَّا صٰدِقِیْنَ'۔ آپ ہماری بات ماننے والے تو ہیں نہیں اگرچہ ہم سچے ہی کیوں نہ ہوں۔

وَجَآءُوْ عَلٰى قَمِیْصِهٖ بِدَمٍ كَذِبٍ ؕ قَالَ بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ اَنْفُسُكُمْ اَمْرًا ؕ فَصَبْرٌ جَمِیْلٌ ؕ وَاللّٰهُ الْمُسْتَعَانُ عَلٰى مَا تَصِفُوْنَ (۱۸)

'سولت لہ نفسہ کذا، زینتہ لہ وسھلتہ لہ وھونتہ'۔ شیطان نے اس کی نگاہ میں فلاں بات کھبا دی اور آسان کر دی۔

'صبرِ جمیل' کا مفہوم

'فَصَبْرٌ جَمِیْلٌ' مبتدا بھی ہو سکتا ہے اس لیے کہ نکرہ موصوف میں مبتدا ہونے کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے اور مبتدائے محذوف کی خبر بھی ہو سکتا ہے۔ ہم نے مبتدا مان کر ترجمہ کیا ہے اور خبر محذوف کو ترجمہ میں کھول دیا ہے۔ ایسے مواقع میں خبر کے محذوف ہونے کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ وہ بالکل واضح ہوتی ہے اور اس کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ ساری توجہ اصل نقطہ پر مرکوز ہو جاتی ہے۔ 'صَبْرٌ جَمِیْلٌ' سے مراد وہ صبر ہے جو ہر قسم کے جزع فزع، گلے شکوے اور نوحہ و ماتم سے پاک ہو۔ اگر قرآن اور تورات کا فرق دیکھنا ہو تو صرف یہی ایک مقام تورات میں دیکھ لیجیے۔ قرآن تو ان کے صبرِ جمیل کی تعریف کرتا ہے اور تورات میں ہے کہ "تب یعقوب نے اپنے کپڑے پھاڑے اور ٹاٹ اپنے کولھے پر ڈالا اور بہت دن تک اپنے بیٹے کا غم کیا" پیدائش ۳۷: ۳۴

حضرت یعقوبؑ کو اپنی بات باور کرانے کے لیے ان لوگوں نے تدبیر یہ کی کہ حضرت یوسفؑ کے قمیص پر کسی چیز

کے خون کے دھبے بھی ڈال لائے لیکن حضرت یعقوبؑ نے ایک لمحہ کے لیے بھی ان کی بات باور نہیں کی۔ سنتے ہی فرمایا کہ یہ سب تمہارا من گھڑت قصہ ہے تو صبر جمیل کی توفیق ملے اور جو کچھ تم بیان کرتے ہو اللہ ہی مدد فرمائے تو اس کا عقدہ کھلے۔

وَجَآءَتْ سَيَّارَةٌ فَأَرْسَلُوا وَارِدَهُمْ فَأَدْلَىٰ دَلْوَهُ ۖ قَالَ يَٰبُشْرَىٰ هَٰذَا غُلَٰمٌ ۚ وَأَسَرُّوهُ بِضَٰعَةً ۚ وَٱللَّهُ عَلِيمٌۢ بِمَا يَعْمَلُونَ (۱۹)

'وارد' کا مفہوم — خدائے کارساز کی کارسازی

'وارد' کے اصل معنی تو کسی گھاٹ یا چشمہ پر اترنے والے کے ہیں۔ عرب میں قافلے والے یوں کرتے کہ جس کنوئیں میں اترنا ہوتا ذرا پہلے اپنا ایک آدمی اس پر بھیج دیتے کہ وہ پانی وغیرہ کا انتظام کر رکھے۔ یہاں وارد سے وہی مراد ہے برادرانِ یوسفؑ تو ان کو کنوئیں میں ڈال کر گھر کو سدھارے۔ ادھر ربِ کریم و کارساز نے یہ انتظام فرمایا کہ ایک قافلہ آنکلا اور اس نے اپنے پانی کے منتظم کو کنوئیں پر بھیجا۔ اس نے ڈول ڈالا تو دیکھتا ہے کہ کنوئیں میں ایک لڑکا ہے۔ وہ خوشی سے چلایا کہ خوش خبری ہو، اس میں تو ایک لڑکا ہے! اس دور میں بردہ فروشی کا رواج عام تھا، انھوں نے سوچا کہ چلو ایک نفع کی چیز مل گئی، کہیں بیچ لیں گے اور اس خیال سے کہ کہیں داہنے بائیں کوئی مدعی نہ اٹھ کھڑا ہو اس واقعہ کو انھوں نے راز میں رکھنے کی کوشش کی، اس کی تشہیر نہیں ہونے دی۔ 'وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ بِمَا يَعْمَلُوْنَ' اور اللہ کو خوب پتہ تھا کہ وہ کیا کر رہے تھے۔ وہ تو اپنی اسکیم پوری کر رہے تھے اور اللہ اپنی اسکیم پوری کر رہا تھا۔ انھیں تو ایک غلام ملا تھا، خوش تھے کہ اس کو بیچ کر کچھ پیسے حاصل کر لیں گے اور اللہ نے یہ چاہا کہ یوسفؑ کی یہ غلامی مصر کی بادشاہی کی تمہید ثابت ہو۔

وَشَرَوْهُ بِثَمَنٍۭ بَخْسٍ دَرَٰهِمَ مَعْدُودَةٍ ۚ وَكَانُوا۟ فِيهِ مِنَ ٱلزَّٰهِدِينَ (۲۰)

'بخس' اور 'زھد' کا مفہوم

'شَرٰى يَشْرِيْ' خریدنے اور بیچنے دونوں معنی میں آتا ہے۔ یہاں یہ اپنے دوسرے معنی میں آیا ہے 'بَخْس' کے معنی ناقص اور حقیر کے ہیں۔ 'زَهِدَ فِى الشَّئِ، رَغِبَ عَنْهُ وَتَرَكَهٗ' یعنی وہ فلاں چیز سے بے رغبت ہو گیا، اس کو چھوڑ بیٹھا۔ تارکِ دنیا کو 'زاہد' اس لیے کہتے ہیں کہ وہ دنیا اور اسبابِ دنیا سے بے رغبت و بے نیاز ہو جاتا ہے۔

حضرت یوسفؑ کی فروخت

مطلب یہ ہے کہ ان لوگوں نے مصر پہنچتے ہی اس کو نہایت حقیر قیمت گنتی کے چند درہم کے عوض بیچ دیا۔ انھوں نے حضرت یوسفؑ کے حاصل کرنے پر کچھ دام تو خرچ نہیں کیے تھے کہ اپنے دام وصول کرنے اور اس پر کچھ مزید نفع حاصل کرنے کی فکر ہوتی۔ ایک چیز مفت ہاتھ آئی تھی وہ جس قیمت پر بھی بک گئی ان کے لیے نفع ہی نفع تھی۔ چنانچہ انھوں نے غالباً خریدارِ اول ہی کے ہاتھ، جو قیمت بھی اس کی زبان سے نکل گئی، اسی قیمت پر ان کو فروخت کر دیا۔ انھیں کیا پتہ تھا کہ وہ جس لڑکے کو بیچ رہے ہیں وہ خانوادۂ یعقوبی کا چشم و چراغ اور خدا کا پیغمبر ہے اور بہت جلد مصر کی پوری مملکت اس کے انگوٹھے کے نیچے آنے والی ہے۔ جب وہ ان باتوں میں سے کسی بات سے واقف ہی نہیں تھے تو ان کو بے پروا تو ہونا ہی تھا۔

وَقَالَ الَّذِي اشْتَرٰىهُ مِنْ مِّصْرَ لِامْرَاَتِهٖٓ اَكْرِمِيْ مَثْوٰىهُ عَسٰٓى اَنْ يَّنْفَعَنَآ اَوْ نَتَّخِذَهٗ وَلَدًا ؕ وَكَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوْسُفَ فِي الْاَرْضِ ۡ وَلِنُعَلِّمَهٗ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ ؕ وَاللّٰهُ غَالِبٌ عَلٰٓى اَمْرِهٖ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ (۲۱)

ایک نحوی اشکال کی وضاحت

اس آیت میں ایک نحوی اشکال ہے وہ یہ کہ 'وَلِنُعَلِّمَهٗ' کا معطوف علیہ موجود نہیں ہے۔ اس اسلوب کی مثالیں پیچھے بھی گزر چکی ہیں اور ہم اس کی وضاحت کر چکے ہیں کہ کبھی معطوف علیہ کو غایت وضاحت کی وجہ سے حذف کر دیتے ہیں، اس کو قرینہ سے سمجھ لیتے ہیں اور اگر مرتبع مقتضی ہو تو وہ پوری بات وہاں محذوف مانی جا سکتی ہے جس سے موجود خلا بھر سکے۔ یہاں ہمارے نزدیک 'وَلِنُعَلِّمَهٗ' سے پہلے 'لِنُجْتَبِيَهٗ' محذوف ہے اور حرف عطف 'و' اس کی طرف اشارہ کر رہا ہے یعنی پوری بات یوں ہے کہ اس طرح ہم نے یوسف کے لیے ملک میں زمین ہموار کی تاکہ ہم اس کو اپنے کام کے لیے برگزیدہ کریں اور تاکہ ہم اس کو باتوں کی تاویل و تعبیر سکھائیں۔

حضرت یوسف کی زندگی کا ایک نیا موڑ

اب یہاں سے حضرت یوسفؑ کی زندگی ایک نیا موڑ مڑتی ہے۔ اہلِ مصر میں سے جس نے ان کو خریدا اور آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ حکومت کا ایک معزز عہدہ دار غالباً شاہی باڈی گارڈ کا اعلیٰ افسر اور طبیعت کا نہایت شریف آدمی تھا۔ تورات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس نے حضرت یوسف کو دیکھتے ہی تاڑ لیا تھا کہ یہ کسی نہایت اعلیٰ خاندان کا چشم و چراغ ہے جس کو یہ بیچنے والے کہیں سے پکڑ لائے ہیں۔ چنانچہ اس نے اپنی بیوی کو ہدایت کی کہ اس کو غلام کی طرح نہیں بلکہ خاطر و مدارات سے رکھنا۔ بہت ممکن ہے کہ یہ ہمیں نفع پہنچائے یا ہم اس کو اپنا بیٹیا ہی بنا لیں۔ معلوم ہوتا ہے اس وقت تک اس کے ہاں کوئی اولاد نہیں تھی اس وجہ سے اس نے سوچا ہو کہ اگر ہمارے ہاں کوئی اولاد نہ ہوئی تو ہم اس کو متبنّیٰ کر لیں گے۔ اس طرح اس نے حضرت یوسف کو اپنے پورے گھر کا، جیسا کہ تورات سے واضح ہوتا ہے، مالک و مختار بنا دیا۔

حضرت یوسف کا نبوت کے لیے انتخاب

'وَكَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوْسُفَ' یعنی اس طرح ہم نے یوسف کے لیے مصر میں زمین ہموار کی تاکہ جس کار نبوت کے لیے ہم اس کو منتخب کرنا چاہتے تھے اس کو منتخب کریں اور اس کو باتوں اور خوابوں کی وہ تاویل و تعبیر سکھائیں جو اس کے لیے بالآخر، جیسا کہ آگے تفصیل آئے گی، عملاً مصر کی بادشاہی کے لیے زمین ہموار کر دے۔

قریش کو تنبیہ

'وَاللّٰهُ غَالِبٌ عَلٰٓى اَمْرِهٖ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ'۔ اوپر جتنی سرگزشت بیان ہوئی ہے یہ اس کا خلاصہ ہے کہ خدا کے ارادے اور اس کی اسکیمیں اسی طرح بروئے کار آتی ہیں لیکن جن لوگوں کی نظر صرف ظاہر پر ہوتی ہے وہ اس کو نہیں جانتے۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ یہ ساری سرگزشت قریش کو سنائی جا رہی ہے اور اس آخری فقرے میں انہی کی آنکھوں سے پردہ اٹھایا گیا ہے کہ وہ چاہیں تو اس سرگزشت میں اپنا مستقبل بھی دیکھ لیں اور اس پیغمبر کا مستقبل بھی دیکھ لیں جس کے خلاف وہ رات دن طرح طرح کی سازشوں میں مصروف ہیں۔

وَلَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗٓ اٰتَيْنٰهُ حُكْمًا وَّعِلْمًا ؕ وَكَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ (۲۲)

حضرت یوسفؑ پر انعام الٰہی

یہ وہ انعام ہے جو اللہ تعالیٰ نے بعد میں حضرت یوسفؑ پر فرمایا اور جس کی طرف، اوپر والی آیت میں اشارہ

ہے۔ فرمایا کہ جب وہ عمر کی پختگی کو پہنچا ہم نے اس کو حکم اور علم سے نوازا اور ہم خوب کاروں کو اسی طرح بدلہ دیا کرتے ہیں۔ لفظ 'اشُدّ' جوانی کے لیے بھی آتا ہے اور پختہ سن و سال کے لیے بھی آتا ہے مثلاً حَتّٰیٓ اِذَا بَلَغَ اَشُدَّهٗ وَبَلَغَ اَرْبَعِيْنَ سَنَةً (یہاں تک کہ جب وہ اپنی پختگی کو پہنچا اور چالیس سال کا ہوا) حکم اور علم یہاں نبوت کی تعبیر ہے۔ 'حکم' سے مراد قوتِ فیصلہ بھی ہے اور حکومت بھی اور یہ دونوں ہی چیزیں حضرت یوسفؑ کو عطا ہوئیں۔ 'علم' سے مراد وہ علم ہے جو حضرات انبیاء کو وحی کے ذریعہ سے عطا ہوتا ہے۔ آخر میں یہ واضح فرمادیا کہ یہ انعام جو یوسفؑ پر ہوا تو اس لیے ہوا کہ وہ خوب کار تھے۔ انھوں نے خدا کے حقوق و فرائض کو پہچانا اور ہر امتحان میں پورے اترے تو خدا نے ان کو اپنی نبوت کے لیے انتخاب فرمایا۔

۴۔ آگے کا مضمون ——— آیات ۲۳-۳۴

حضرت یوسفؑ کی آزمائش کا دوسرا مرحلہ

آزمائش کا پہلا مرحلہ ختم ہوا تو ساتھ ہی دوسرا مرحلہ شروع ہوگیا۔ پہلا مرحلہ بھائیوں کے حسد اور ان کی نفرت اور عداوت کا تھا جس کے نتیجہ میں انھیں ایک اندھے کنوئیں میں پھینکا گیا۔ یہ دوسرا مرحلہ عزیزِ مصر کی بیوی کی طرف سے عشق و محبت کی شکل میں نمودار ہوا جس کے نتیجہ میں حضرت یوسفؑ کو بے قصور جیل میں ڈالا گیا۔ لیکن جس طرح وہ پہلے امتحان میں کامیاب رہے اسی طرح اللہ تعالیٰ نے اس دوسرے امتحان میں بھی ان کو نہایت شاندار کامیابی بخشی ——— آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۲۳-۳۴

وَرَاوَدَتْهُ الَّتِيْ هُوَ فِيْ بَيْتِهَا عَنْ نَّفْسِهٖ وَغَلَّقَتِ الْاَبْوَابَ وَقَالَتْ
هَيْتَ لَكَ ۭ قَالَ مَعَاذَ اللّٰهِ اِنَّهٗ رَبِّيْٓ اَحْسَنَ مَثْوَايَ ۭ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ
الظّٰلِمُوْنَ ﴿٢٣﴾ وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ ۚ وَهَمَّ بِهَا لَوْلَآ اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ ۭ
كَذٰلِكَ لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوْۗءَ وَالْفَحْشَاۗءَ ۭ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا
الْمُخْلَصِيْنَ ﴿٢٤﴾ وَاسْتَبَقَا الْبَابَ وَقَدَّتْ قَمِيْصَهٗ مِنْ دُبُرٍ وَّاَلْفَيَا
سَيِّدَهَا لَدَا الْبَابِ ۭ قَالَتْ مَا جَزَاۗءُ مَنْ اَرَادَ بِاَهْلِكَ سُوْۗءًا
اِلَّآ اَنْ يُّسْجَنَ اَوْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿٢٥﴾ قَالَ هِيَ رَاوَدَتْنِيْ عَنْ نَّفْسِيْ وَ
شَهِدَ شَاهِدٌ مِّنْ اَهْلِهَا ۚ اِنْ كَانَ قَمِيْصُهٗ قُدَّ مِنْ قُبُلٍ
فَصَدَقَتْ وَهُوَ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ ﴿٢٦﴾ وَاِنْ كَانَ قَمِيْصُهٗ قُدَّ مِنْ

دُبُرٍ فَكَذَبَتْ وَهُوَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿٢٧﴾ فَلَمَّا رَاٰ قَمِيْصَهٗ قُدَّ
مِنْ دُبُرٍ قَالَ اِنَّهٗ مِنْ كَيْدِكُنَّ ۭ اِنَّ كَيْدَكُنَّ عَظِيْمٌ ﴿٢٨﴾ يُوْسُفُ
اَعْرِضْ عَنْ هٰذَا ٚ وَاسْتَغْفِرِيْ لِذَنْۢبِكِ ښ اِنَّكِ كُنْتِ مِنَ
الْخٰطِـِٕيْنَ ﴿٢٩﴾ وَقَالَ نِسْوَةٌ فِي الْمَدِيْنَةِ امْرَاَتُ الْعَزِيْزِ تُرَاوِدُ ع ۳ ۹ ۱۳
فَتٰىهَا عَنْ نَّفْسِهٖ ۚ قَدْ شَغَفَهَا حُبًّا ۭ اِنَّا لَنَرٰىهَا فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿٣٠﴾
فَلَمَّا سَمِعَتْ بِمَكْرِهِنَّ اَرْسَلَتْ اِلَيْهِنَّ وَاَعْتَدَتْ لَهُنَّ مُتَّكَاً وَّاٰتَتْ
كُلَّ وَاحِدَةٍ مِّنْهُنَّ سِكِّيْنًا وَّقَالَتِ اخْرُجْ عَلَيْهِنَّ ۚ فَلَمَّا رَاَيْنَهٗٓ
اَكْبَرْنَهٗ وَقَطَّعْنَ اَيْدِيَهُنَّ وَقُلْنَ حَاشَ لِلّٰهِ مَا هٰذَا بَشَرًا ۭ
اِنْ هٰذَآ اِلَّا مَلَكٌ كَرِيْمٌ ﴿٣١﴾ قَالَتْ فَذٰلِكُنَّ الَّذِيْ لُمْتُنَّنِيْ فِيْهِ ۭ
وَلَقَدْ رَاوَدْتُّهٗ عَنْ نَّفْسِهٖ فَاسْتَعْصَمَ ۭ وَلَىِٕنْ لَّمْ يَفْعَلْ مَآ اٰمُرُهٗ
لَيُسْجَنَنَّ وَلَيَكُوْنًا مِّنَ الصّٰغِرِيْنَ ﴿٣٢﴾ قَالَ رَبِّ السِّجْنُ اَحَبُّ
اِلَيَّ مِمَّا يَدْعُوْنَنِيْٓ اِلَيْهِ ۚ وَاِلَّا تَصْرِفْ عَنِّيْ كَيْدَهُنَّ اَصْبُ
اِلَيْهِنَّ وَاَكُنْ مِّنَ الْجٰهِلِيْنَ ﴿٣٣﴾ فَاسْتَجَابَ لَهٗ رَبُّهٗ فَصَرَفَ عَنْهُ
كَيْدَهُنَّ ۭ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿٣٤﴾

ترجمۂ آیات ۲۳-۳۴

اور جس عورت کے گھر میں وہ تھا وہ اس پر ڈورے ڈالنے لگی اور اس نے دروازے بند کر لیے اور بولی کہ بس آجاؤ۔ اس نے کہا معاذ اللہ! وہ میرا آقا ہے اس نے مجھے خاطر سے رکھا ہے حق تلفی کرنے والے ہرگز فلاح نہیں پاتے۔ اور عورت نے تو اس کا قصد کر ہی لیا تھا وہ بھی اس کا قصد کر لیتا اگر اس نے اپنے رب کی واضح نشانی نہ دیکھ لی ہوتی۔ ہم نے ایسا ہی کیا تاکہ ہم اس سے برائی

اور بے حیائی کو دور رکھیں بے شک وہ ہمارے برگزیدہ بندوں میں سے تھا (۲۲-۲۴)

اور وہ دونوں دروازے کی طرف جھپٹے اور اس نے یوسف کا کرتا پیچھے سے پھاڑ دیا اور دونوں نے اس کے شوہر کو دروازے پر پایا۔ وہ بولی کہ جو تیری بیوی کے ساتھ کسی برائی کا ارادہ کرے اس کی سزا اس کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے کہ وہ قید خانہ میں ڈالا جائے یا وہ کوئی دردناک تکلیف بھگتے۔ اس نے کہا اسی نے مجھے پھسلانے کی کوشش کی اور عورت کے خاندان والوں میں سے ایک گواہ نے گواہی دی کہ اگر اس کا کرتا آگے سے پھٹا ہوا ہو تو وہ سچی ہے اور وہ جھوٹا ہے اور اگر اس کا کرتا پیچھے سے پھٹا ہو تو وہ جھوٹی اور یہ سچا ہے۔ تو جب اس نے اس کا کرتا پیچھے سے پھٹا ہوا دیکھا تو بول اٹھا کہ بے شک یہ تمہارا ہی چرتر ہے اور تمہارے چرتر بڑے ہی فتنہ ہوتے ہیں۔ یوسف اس کو چھوڑو اور تو اپنے گناہ کی معافی مانگ، بے شک تو ہی خطاوار ہے۔ ۲۵-۲۹

اور شہر میں کچھ عورتوں نے کہا کہ عزیز کی بیوی اپنے غلام پر ڈورے ڈال رہی ہے۔ اس کے عشق میں دیوانی ہو گئی ہے۔ ہم تو اس کو کھلی حماقت میں مبتلا دیکھ رہے ہیں۔ تو جب اس نے ان کے چرتر کا حال سنا تو اس نے انھیں بلا بھیجا اور ان کے لیے نشست گاہ آراستہ کی اور ان میں سے ہر ایک کو ایک ایک چھری دی اور یوسف سے کہا کہ تم ان کے سامنے آؤ تو جب انھوں نے اس کو دیکھا اس کی عظمت سے مبہوت رہ گئیں اور انھوں نے اپنے ہاتھ زخمی کر لیے اور بولیں کہ حاشا للہ یہ آدمی نہیں۔ یہ تو کوئی فرشتہ یزدانی ہے۔ وہ بولی کہ یہی ہے وہ جس کے بارے میں تم مجھے ملامت کر رہی تھیں بیشک میں نے اس پر ڈورے ڈالے لیکن یہ بچ رہا، اگر اس نے وہ نہ کیا جو میں اسے کہہ رہی ہوں تو وہ ضرور قید کیا جائے گا اور ذلیل ہوگا۔ اس نے دعا کی اے میرے رب! قید خانہ مجھے اس چیز کے مقابل میں زیادہ محبوب ہے جس کی یہ مجھے دعوت دے رہی ہیں اور اگر تو نے ان کے چرتر کو مجھ سے دفع نہ کیا تو میں ان کی طرف

مائل اور جذبات سے مغلوب ہو جانے والوں میں سے ہو جاؤں گا۔ تو اس کے رب نے اس کی دعا قبول فرمائی اور ان کے چرتر کو اس سے دفع کر دیا۔ بے شک وہ سننے والا جاننے والا ہے۔ ۲۰-۳۴

۵- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَرَاوَدَتْهُ الَّتِي هُوَ فِي بَيْتِهَا عَن نَّفْسِهِ وَغَلَّقَتِ الْأَبْوَابَ وَقَالَتْ هَيْتَ لَكَ ۚ قَالَ مَعَاذَ اللَّهِ
إِنَّهُ رَبِّي أَحْسَنَ مَثْوَايَ ۖ إِنَّهُ لَا يُفْلِحُ الظَّالِمُونَ (۲۳)

'مراودۃ' کا مفہوم — 'رَاوَدَتْهُ عَن نَّفْسِهِ' کے معنی ہیں چھل فریب کے ذریعہ سے اس نے اس کو بدکاری کی طرف مائل کرنے کی کوشش کی۔

'ھیت لک' کا مفہوم — 'هَيْتَ لَكَ' کے معنی ہیں 'هَلُمَّ لَكَ وَتَعَالَ' یعنی آ جاؤ۔

لفظ 'رب' کا مفہوم — 'إِنَّهُ رَبِّي' لفظ 'رب' یہاں اپنے عام لغوی مفہوم یعنی آقا اور مالک کے معنی میں ہے۔ آگے آیات ۴۱-۴۲ میں بھی اسی مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔ مثلاً أَمَّا أَحَدُكُمَا فَيَسْقِي رَبَّهُ خَمْرًا (رہا تم میں سے ایک تو وہ اپنے آقا کو شراب پلائے گا) اُذْكُرْنِي عِندَ رَبِّكَ (اپنے آقا کے پاس میرا ذکر کیجیو)۔

حضرت یوسفؑ کے لیے دام ہوس — ہم نے اوپر ذکر کیا ہے کہ یہاں سے حضرت یوسفؑ کی زندگی کا نیا دور شروع ہوتا ہے۔ اب تک وہ نفرت اور حسد کے شکار رہے، اس سے جان چھوٹی تو عشق و ہوس نے ان پر اپنے دام پھینکنے کی کوشش شروع کی اور یہ امتحان پہلے امتحان سے بھی کہیں زیادہ سخت ثابت ہوا۔ مصریوں میں سے جس نے ان کو خریدا تھا اس کی بیوی ان پر مرنے لگی اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ ایک دن اس نے اپنے دروازے بند کر لیے اور بولی کہ بس آ جاؤ۔ حضرت یوسفؑ نے ان کے شوہر کا حوالہ دیتے ہوئے فرمایا کہ وہ میرا آقا ہے اور اس نے مجھے نہایت اچھی طرح رکھا ہے، یہ بڑی بے وفائی اور نمک حرامی ہوگی اگر میں اس کی بیوی کے ساتھ اس طرح کی کوئی حرکت کروں۔ اس صورت میں میں ظالم ٹھہروں گا اور ظالم کبھی فلاح نہیں پائیں گے۔ حضرت یوسفؑ کے اس فقرے پر غور فرمائیے تو معلوم ہوگا کہ اس میں بڑی نفسیاتی بلاغت ہے۔ جذبات سے اندھی اور خدا اور آخرت سے ایک بے خبر عورت کے سامنے خدا اور آخرت کا وعظ ظاہر ہے کہ بھینس کے آگے بین بجانے کے مترادف تھا۔ اس کے ہیجان کو اگر کچھ ٹھنڈا کیا جا سکتا تھا تو اسی فقرے سے کیا جا سکتا تھا جو حضرت یوسفؑ نے فرمایا۔ اس میں اگر شرافت کی رمق بھی ہوتی تو وہ ضرور سوچتی کہ ایک یہ نوجوان ہے جو اپنے آقا کی معمولی سی مہربانی سے اتنا متاثر ہے اور اس کی آقائی کا اس کو اتنا اہتمام لحاظ ہے کہ میری بے محابا دعوت کے باوجود اس کے ساتھ کوئی بے وفائی کرنا اپنی دنیا اور عاقبت دونوں کی بربادی تصور کرتا ہے اور ایک میں ہوں کہ اس کی بیوی ہوں، میں نے اپنے آپ کو اس کی زوجیت میں دیا ہے، اپنی حمت

کا اس کو مالک بنایا ہے، اس کے گھر کی ملکہ بنی بیٹھی ہوں، اس کے مال پر مالکانہ متصرف ہوں لیکن اس کے ساتھ وفاداری کا یہ حال ہے کہ اس کے زرخرید غلام کو اس طرح ہوس سے اندھی ہو کر دعوت عشق دے رہی ہوں۔

'اِنَّهٗ رَبِّیْٓ' میں ضمیر منصوب کا مرجع

بعض لوگوں نے 'اِنَّهٗ رَبِّیْٓ' میں ضمیر منصوب کا مرجع خدا کو مانا ہے لیکن یہ محض تکلف ہے۔ سیاق و سباق اس سے اِبا کر رہا ہے۔ عربی میں رب المال، رب البیت اور رب الدار وغیرہ کی ترکیبیں موجود ہیں اور اوپر آپ نے دیکھا کہ خود حضرت یوسفؑ نے آقا کے لیے لفظ 'رب' کا استعمال فرمایا ہے۔ کتنے الفاظ زبان میں ایسے ہیں جو خدا کے لیے بھی استعمال ہوتے ہیں اور بندوں کے لیے بھی لیکن دونوں شکلوں میں ان کے مفہوم بالکل الگ الگ ہوتے ہیں۔

وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ ۚ وَهَمَّ بِهَا لَوْلَآ اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ ۭ كَذٰلِكَ لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوْۗءَ وَالْفَحْشَاۗءَ ۭ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِيْنَ (۲۴)

'برہانِ رب' کا مفہوم

'برہانِ رب' سے مراد وہ نورِ یزدانی ہے جو اللہ تعالیٰ ہر انسان کی فطرت کے اندر ودیعت فرماتا ہے۔ جو خیر و شر میں امتیاز کا ذریعہ بھی ہے اور جو خیر پر ابھارتا بھی ہے اور برائی سے روکتا بھی ہے۔ یہ نور اللہ تعالیٰ بخشتا تو ہر ایک کو ہے لیکن سنت الٰہی یہ ہے کہ جو اس کی قدر کرتے اور اس کی رہنمائی قبول کرتے ہیں ان کے اندر تو یہ برابر قوی سے قوی تر ہوتا جاتا ہے یہاں تک کہ اتنا قوی ہو جاتا ہے کہ نہایت سخت آزمائش کے مواقع پر بھی وہ انسان کو نفس اور شیطان کے فتنوں میں مبتلا ہونے سے بچا لیتا ہے۔ برعکس اس کے جو لوگ اس کی قدر نہیں کرتے بلکہ برابر اس کی رہنمائی کو ٹھکراتے ہی رہتے ہیں ان کے اندر یہ آہستہ آہستہ ضعیف ہوتے ہوتے بالکل بجھ جاتا ہے اور ان پر وہ سیاہی چھا جاتی ہے جو ان کو بصیرت سے بالکل ہی محروم اور اخلاقی اعتبار سے بالکل ہی اندھا بہرا بنا کر چھوڑ دیتی ہے۔ قرآن میں ایسے ہی لوگوں کے بارے میں ارشاد ہوا ہے۔ كَلَّا بَلْ ۜ رَانَ عَلٰي قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ (ہرگز نہیں ان کے دلوں پر ان کے اعمال کی سیاہی چھا گئی ہے)

باطن کا نورِ یزدانی

حضرت یوسفؑ ان لوگوں میں سے تھے جنھوں نے اس نور کی قدر کی۔ اس کا صلہ ان کو یہ ملا کہ اس نازک موقع پر، جس کی طرف اس آیت میں اشارہ ہے، اس نور نے ان کو نفس اور شیطان کی تاریکی میں گھر جانے سے بچا لیا۔ آیت کے الفاظ صاف بتا رہے ہیں کہ جہاں تک عورت کا تعلق ہے وہ تو بالکل اندھی بہری ہو کر پیچھے پڑ گئی تھی۔ حضرت یوسفؑ بھی اس وقت آخر جوان تھے۔ غالباً ۱۸، ۲۰ سال کی عمر ہوگی، کیا عجب تھا کہ ان کے قدم بھی لڑکھڑا جاتے۔ لیکن نہیں۔ ان کے اندر وہ نورِ یزدانی موجود تھا جس کی رہنمائی کو انھوں نے کبھی ٹھکرایا نہیں تھا۔ وہ اس موقع پر ان کے باطن میں چمکا اور دفعتہً آنکھوں کے سامنے سے ساری ظلمت کافور ہو گئی۔ فرمایا كَذٰلِكَ لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوْۗءَ وَالْفَحْشَاۗءَ ۭ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِيْنَ۔ یعنی چونکہ وہ ہمارے منتخب اور برگزیدہ بندوں میں سے تھا جس کو ہم نے اپنے کارِ خاص کے لیے منتخب کیا تھا اس وجہ سے ہم نے اس نازک موقع پر اپنی برہان سے اس کی رہنمائی فرمائی تاکہ اس کو برائی اور بے حیائی سے محفوظ رکھیں۔ 'برہان' واضح دلیل اور

مسکت حجت کو کہتے ہیں۔ اس دلیل سے زیادہ واضح اور مسکت دلیل اور کون ہو سکتی ہے جو خود اپنے باطن سے اذان دے!

عصمت انبیاء کے بعض پہلو

اس آیت سے عصمت انبیاء کے بعض پہلو بھی روشن ہوتے ہیں۔ مثلاً ایک تو یہ کہ اللہ تعالیٰ ان کو بعثت سے قبل بھی گناہوں کی آلودگی سے محفوظ رکھتا ہے۔ دوسرا یہ کہ نبی کے معصوم ہونے کے معنی یہ نہیں ہیں کہ اس سے گناہ کرنے کی قوت و صلاحیت سلب کر لی جاتی ہو بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ برابر اپنے نور فطرت کی نگرانی کرتے ہیں اس وجہ سے بالتدریج وہ اتنا قوی ہو جاتا ہے کہ سخت سے سخت آزمائش کے مواقع میں بھی وہ ان کو راہ سے بے راہ نہیں ہونے دیتا۔

وَاسْتَبَقَا الْبَابَ وَقَدَّتْ قَمِيصَهُ مِنْ دُبُرٍ وَأَلْفَيَا سَيِّدَهَا لَدَا الْبَابِ ط قَالَتْ مَا جَزَاءُ مَنْ
أَرَادَ بِأَهْلِكَ سُوْٓءًا إِلَّآ أَنْ يُّسْجَنَ أَوْ عَذَابٌ أَلِيْمٌ (۲۵)

عورت کا فریب۔

'استباق' کے معنی ہیں دوڑ میں ایک دوسرے سے آگے نکل جانے کی کوشش کرنا۔

حضرت یوسفؑ نے جب دیکھا کہ اس فتنہ سے جان بچانے کی کوئی شکل باقی نہیں رہی ہے تو وہ دروازے کی طرف جھپٹے کہ کھول کر باہر نکل جائیں پیچھے سے عورت نے تعاقب۔ ان کو تو پکڑ نہ سکی البتہ ان کا کرتہ اس کے ہاتھ میں آگیا۔ اس کو جو زور سے اس نے کھینچا تو وہ پھٹ گیا اور ساتھ ہی یہ سانحہ پیش آیا کہ دروازہ جو کھلا تو دیکھا کہ شوہر دروازے سے لگا کھڑا ہے۔ اس کو دیکھتے ہی سارا نشۂ عشق ہرن ہو گیا۔ جھٹ بولی کہ تمہاری بیوی کے ساتھ جو برائی کا ارادہ کرے یا تو وہ جیل بھیجے جانے کا مستحق ہے یا یہ کہ اس کو کوئی دردناک سزا دی جائے۔ اس طرح اس نے شوہر کی نظروں میں اپنے کو بری اور حضرت یوسفؑ کو مجرم ثابت کرنے کی کوشش کی۔

قَالَ هِيَ رَاوَدَتْنِيْ عَنْ نَّفْسِيْ وَشَهِدَ شَاهِدٌ مِّنْ أَهْلِهَا ج إِنْ كَانَ قَمِيْصُهُ قُدَّ مِنْ قُبُلٍ فَصَدَقَتْ
وَهُوَ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ ۝ وَإِنْ كَانَ قَمِيْصُهُ قُدَّ مِنْ دُبُرٍ فَكَذَبَتْ وَهُوَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۝ فَلَمَّا رَاٰ قَمِيْصَهُ
قُدَّ مِنْ دُبُرٍ قَالَ إِنَّهُ مِنْ كَيْدِكُنَّ ط إِنَّ كَيْدَكُنَّ عَظِيْمٌ (۲۶ - ۲۸)

قرآن کی شہادت

جب اس نے حضرت یوسفؑ کو متہم کرنے کی کوشش کی تو انھوں نے مختصر الفاظ میں اصل حقیقت ظاہر کر دی کہ اس میں میرا قصور نہیں ہے بلکہ یہی میرے پیچھے پڑی ہوئی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس واقعہ کی خبر خاندان میں بھی پھیل گئی اور یہ بھی لوگوں کو علم ہو گیا کہ اس کشمکش میں یوسفؑ کا کرتا پھٹ گیا ہے۔ گویا ایک مقدمہ بن گیا۔ عورت کا بیان کچھ، یوسفؑ کا بیان کچھ۔ اب جھوٹا کون ہے اور سچا کون؟ اس کا فیصلہ کرنے میں اگر حالات و قرائن میں سے کوئی چیز مددگار ہو سکتی تھی تو کرتا پھٹنے کا واقعہ تھا۔ عورت کے خاندان کے لوگوں میں سے ایک شخص نے، جو غالباً خاندان کے بڑوں بوڑھوں میں سے رہا ہوگا، یہ رائے دی کہ اگر کرتا آگے سے پھٹا ہو تب تو عورت سچی ہے یوسف جھوٹے ہیں اور اگر کرتا پیچھے سے پھٹا ہو تو یوسفؑ سچے ہیں، عورت جھوٹ بولتی ہے۔ یہ بات نہایت معقول تھی اس سے شوہر کو اس پر اطمینان ہو گیا۔ جب اس نے دیکھا کہ یوسفؑ کا کرتا پیچھے سے پھٹا ہے تو اس نے عورت کو ڈانٹا کہ یہ سب تمہارا فریب ہے اور تمہارا فریب بڑا ہی خطرناک ہوتا ہے۔ 'مِنْ كَيْدِكُنَّ' میں جمع کی ضمیر مرد کے غصہ کی

تیزی اور شدت کو ظاہر کرتی ہے۔ گویا اس کے اس فعل نے تنہا اس کو نہیں بلکہ اس کی پوری جنس کو اس کی نگاہوں میں کیاد اور مبغوض بنا دیا۔

یُوۡسُفُ اَعۡرِضۡ عَنۡ هٰذَا وَاسۡتَغۡفِرِىۡ لِذَنۡۢبِكِ ۖۚ اِنَّكِ كُنۡتِ مِنَ الۡخٰطِـئِيۡنَ (۲۹)

بیوی کو شوہر کی ڈانٹ

صحیح صورت حال سامنے آجانے کے بعد اس نے حضرت یوسفؑ کو مخاطب کرکے تو اطمینان دلایا کہ تم اس کی بکواس کی کوئی پروا نہ کرو، اس سے اعراض کرو۔ اور خود بیوی کو خطاب کرکے ڈانٹا کہ تو ہی خطاوار ہے اس وجہ سے اپنے گناہ کی معافی چاہ۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ توبہ اور استغفار کو مشرکانہ ادیان میں بھی ہمیشہ بڑی اہمیت حاصل رہی ہے یہ الگ بات ہے کہ ان کا استغفار اپنے دیوتاؤں کے سامنے ہوتا ہے جن کی کوئی حقیقت نہیں۔

وَقَالَ نِسۡوَةٌ فِى الۡمَدِيۡنَةِ امۡرَاَتُ الۡعَزِيۡزِ تُرَاوِدُ فَتٰٮهَا عَنۡ نَّـفۡسِهٖ‌ۚ قَدۡ شَغَفَهَا حُبًّا ؕ اِنَّا لَـنَرٰٮهَا فِىۡ ضَلٰلٍ مُّبِيۡنٍ (۳۰)

عزیز کا مفہوم

'عزیز' کے معنی غالب اور مقتدر کے ہیں۔ یہ لفظ بادشاہ کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے اور اونچے درجہ کے بااختیار و باقتدار افسروں اور عہدہ داروں کے لیے بھی۔ چونکہ یہ شخص شاہی باڈی گارڈ کا افسر اعلیٰ تھا اس وجہ سے عورتوں نے اس کے لیے 'عزیز' کا لفظ استعمال کیا۔

شہر کی عورتوں میں چرچا

حضرت یوسفؑ کے ساتھ عزیز کی بیوی کے اس عشق کا چرچا آہستہ آہستہ افسانۂ بزم و انجمن بن گیا۔ شہر کی کچھ عورتوں نے، جو ہو سکتا ہے اسی طبقہ کی رہی ہوں جس طبقہ کی عزیز کی بیوی تھی، یہ کہنا شروع کیا کہ عزیز کی بیوی اپنے غلام کے عشق میں دیوانی ہو رہی ہے، اس پر ڈورے ڈال رہی ہے لیکن کچھ نہیں کر پا رہی ہے، ہم تو اس کو ایک صریح غلطی میں مبتلا دیکھ رہے ہیں۔ ان کے اس آخری فقرے میں ملامت، شماتت اور ادعا کے بہت سے پہلو مضمر ہیں۔ ان کا مطلب یہ تھا کہ اول تو یہی بات بڑی عجیب ہے کہ ایک اعلیٰ عہدہ دار کی بیگم ہو کر اپنے غلام کے پیچھے اپنے کو خوار کرے پھر اس سے بھی عجیب تر ماجرا یہ کہ اس کو بھی رام نہ کر سکے۔ یہیں سے اس ملامت کے اندر یہ مضمون بھی پیدا ہو جاتا ہے کہ یہ عورت احمق ہے کہ بدنام بھی ہوئی اور نامراد بھی رہی، اگر کہیں ہم ہوتے تو ایک ہی غمزے میں یوسف کو ایسی پٹخنی دیتے کہ ان کی پارسائی کی ساری دھوم ختم ہو جاتی۔

فَلَمَّا سَمِعَتۡ بِمَكۡرِهِنَّ اَرۡسَلَتۡ اِلَيۡهِنَّ وَاَعۡتَدَتۡ لَهُنَّ مُتَّكَاً وَّاٰتَتۡ كُلَّ وَاحِدَةٍ مِّنۡهُنَّ سِكِّيۡنًا وَّقَالَتِ اخۡرُجۡ عَلَيۡهِنَّ‌ ۚ فَلَمَّا رَاَيۡنَهٗۤ اَكۡبَرۡنَهٗ وَقَطَّعۡنَ اَيۡدِيَهُنَّ وَقُلۡنَ حَاشَ لِلّٰهِ مَا هٰذَا بَشَرًا ؕ اِنۡ هٰذَاۤ اِلَّا مَلَكٌ كَرِيۡمٌ (۳۱)

'فَلَمَّا سَمِعَتۡ بِمَكۡرِهِنَّ' یعنی جب عزیز کی بیوی نے سنا کہ ان عورتوں کو اپنی عشوہ طرازیوں، دلربائیوں اور کار فرمائیوں پر یہ ناز اور یہ غرہ ہے تو اس کے دل کو بڑی چوٹ لگی اور اس نے یہ چاہا کہ یہ بھی ذرا یوسفؑ پر اپنے ہنر آزما دیکھیں تاکہ انھیں بھی اپنی قدر و قیمت کا اندازہ ہو جائے۔ چنانچہ اس نے ان کی دعوت کا انتظام کیا، ان کے لیے مصر کی اس وقت کی تہذیب کے مطابق گاؤ تکیوں سے نشست گاہ آراستہ کی، اور جب وہ آئیں

تو پھل وغیرہ کھانے کے لیے ان کے ہاتھوں میں چھریاں بھی پکڑا دیں۔ یہ اہتمام کرنے کے بعد اس نے حضرت یوسفؑ سے کہا کہ ذرا ان کے سامنے آ جاؤ۔

عورتوں کا فریب اور ان کی ناکامی

فَلَمَّا رَاَيْنَهٗٓ اَكْبَرْنَهٗ وَقَطَّعْنَ اَيْدِيَهُنَّ وَقُلْنَ حَاشَ لِلّٰهِ مَا هٰذَا بَشَرًا ۭ اِنْ هٰذَآ اِلَّا مَلَكٌ كَرِيْمٌ۔ 'اکبار' کے معنی ہیں کسی کو بہت بڑا سمجھنا اور دل میں اس کی عظمت اور بڑائی کا قائل ہو جانا یعنی جب حضرت یوسفؑ سامنے آئے تو ان کی نورانی صورت، ان کی تابناک پیشانی اور ان کا پاکیزہ چہرہ دیکھ کر عورتیں مبہوت رہ گئیں۔ سیرت و اخلاق کی پاکیزگی بجائے خود بڑی ہی دلربا چیز ہے اور جب ایک جوان رعنا کے اندر ہو جو شکلاً بھی خوب صورت ہو تو اس کی دلربائی دوچند ہو جاتی ہے۔ یہی واردات ان عورتوں پر گزری۔ وہ ایک نوجوان غلام کا تصور کر کے اس پر اپنے چلتر آزمانے آئی تھیں۔ یہاں انھوں نے دیکھا کہ ان کے سامنے پاکیزگی اور تقدس کا ایک پیکر قدسی کھڑا ہے۔ یہ دیکھ کر انھیں یہ اندازہ ہو گیا کہ اس ملائک صفت پر ان کے سارے تیرونشتر بیکار رہیں لیکن چونکہ وہ بڑے دعوے اور طنطنے کے ساتھ آئی تھیں اس وجہ سے کچھ نہ کچھ کرنا بھی ضرور تھا۔ چنانچہ قرینہ بتاتا ہے اور شواہد قرآن سے اس کی تائید ہوتی ہے کہ انھوں نے حضرت یوسفؑ کو اپنی باتوں سے رام کرنے کی کوشش کی لیکن جب انھوں نے دیکھا کہ ان کی باتیں ان پر ذرا کارگر نہیں ہو رہی ہیں تو ان کے دل کے اندر اپنے حق میں ہمدردی پیدا کرنے کے لیے خودکشی کی دھمکی بھی دے دی اور ان میں سے بعض نے اس دھمکی کو سچ ثابت کرنے کے لیے ابتدائی اقدام کے طور پر پھل کھانے کی چھریوں سے اپنے ہاتھ زخمی بھی کر لیے تاکہ حضرت یوسفؑ اس کو نری دھمکی ہی نہ سمجھیں بلکہ ڈر جائیں کہ اگر انھوں نے ان کی بات نہ مانی تو ان میں سے بعض ضرور اپنے آپ کو ہلاک کر کے رہیں گی۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ خودکشی کی دھمکی عورت کے نہایت کارگر ہتھیاروں میں سے ہے۔ جب وہ مرد پر اپنے عشوہ و غمزہ کے ہتھیار کارگر ہوتے نہیں دیکھتی تو آخری حربہ وہ یہی آزماتی ہے۔ ان عورتوں نے بھی یہی کیا۔

یہ جو کچھ ہم نے عرض کیا ہے، محض ہمارا قیاس نہیں ہے۔ خود اسی سورہ میں آگے اس امر کی تصریح موجود ہے کہ ان عورتوں نے اس موقع پر حضرت یوسفؑ کو بہلانے پھسلانے کی کوشش کی اور اس امر کی بھی تصریح ہے کہ یہ ہاتھوں کو زخمی کر لینے کا معاملہ ان عورتوں کا ایک کید (چال) تھا۔ ملاحظہ ہو۔

فَلَمَّا جَآءَهُ الرَّسُوْلُ قَالَ ارْجِعْ اِلٰى رَبِّكَ فَسْـَٔــلْهُ مَا بَالُ النِّسْوَةِ الّٰتِيْ قَطَّعْنَ اَيْدِيَهُنَّ ۭ اِنَّ رَبِّيْ بِكَيْدِهِنَّ عَلِيْمٌ ۔ قَالَ مَا خَطْبُكُنَّ اِذْ رَاوَدْتُّنَّ يُوْسُفَ عَنْ نَّفْسِهٖ ۭ

(یوسف - ۵۱)

پس جب اس کے پاس قاصد آیا اس نے اس کو جواب دیا کہ تم اپنے آقا کے پاس واپس جاؤ اور اس سے پوچھو کہ ان عورتوں کا کیا حال ہے جنھوں نے اپنے ہاتھ زخمی کر لیے تھے، بے شک میرا رب ان کی چال سے خوب واقف ہے۔ اس نے ان سے پوچھا کہ تمہارا کیا ماجرا ہوا جب کہ یوسف کو تم نے پھسلانے کی کوشش کی۔

خودکشی کی دھمکی بطور حربہ

غور کیجیے اگر واقعہ کی نوعیت یہ ہوتی کہ عورتیں حضرت یوسفؑ کے حسن و جمال سے بے خود ہو کر اپنے ہاتھ کاٹ بیٹھیں تو اس میں چال کا کیا پہلو تھا کہ حضرت یوسفؑ اس کو کید سے تعبیر فرماتے؟ اور اگر انھوں نے حضرت یوسفؑ کو اپنے دام میں پھنسانے کی کوئی کوشش نہ کی ہوتی تو ان سے یہ سوال کیوں ہوتا کہ مَا خَطْبُكُنَّ إِذْ رَاوَدْتُّنَّ يُوسُفَ عَنْ نَّفْسِهٖ (تمھارا کیا ماجرا ہوا جب کہ تم نے یوسف کو پھسلانے کی کوشش کی) ممکن ہے کسی کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہو کہ اگر عورتوں نے حضرت یوسفؑ کا دل جیتنے کے لیے کچھ باتیں کی تھیں تو قرآن نے ان کا ذکر کیوں نہیں کیا۔ اس سوال کا جواب ہماری طرف سے یہ ہے کہ اس قسم کی خرافات سے تعرض قرآن کے شایان شان نہیں ہے اس وجہ سے اس نے دو لفظوں میں یہ سارا دفتر سمیٹ دیا کہ انھوں نے حضرت یوسفؑ پر اپنے چلتر آزمائے تو انھیں اندازہ ہو گیا کہ باتوں سے ان کو شیشہ میں اتارنا مشکل ہے بالآخر انھوں نے خودکشی کی دھمکی کی نمائش کی لیکن یہ دھمکی بھی بے اثر ہی رہی۔

کمزوروں کا آخری حربہ

خودکشی کی دھمکی کمزوروں کا آخری حربہ ہے۔ ایک مرتبہ میں بمبئی میں ایک کرم فرما کی دکان پر بیٹھا ہوا تھا۔ اسی اثنا میں ایک سائل آیا اور دکان کے سامنے سڑک کی پٹڑی پر بیٹھ گیا۔ صاحب دکان نے اس کے سامنے ایک دونی یا چونی پھینک دی۔ اس نے کہا "سیٹھ پانچ روپے سے کم نہیں لوں گا۔" سیٹھ صاحب نے اس کی بات کا خیال نہیں کیا۔ وہ بالکل بے پروا مجھ سے باتوں میں مشغول رہے۔ تھوڑی دیر اپنے فضل و کمال کی لاف زنیاں کرنے کے بعد اس نے پھر پانچ روپے کا مطالبہ کیا اور ساتھ ہی یہ دھمکی بھی سنا دی کہ اگر پانچ روپے نہ دیے گئے تو وہ یہیں جل مرے گا۔ سیٹھ اس کی یہ دھمکی سن کر بھی ٹس سے مس نہ ہوئے۔ بدستور مجھ سے باتوں میں لگے رہے بالآخر میں نے دیکھا کہ اس نے دیا سلائی سے اپنے ایک پائنچے میں آگ لگائی اور وہ جلنے لگا۔ یہ منظر دیکھ کر مجھے تو پسینہ آنے لگا۔ میں نے چاہا کہ میں اپنے پاس سے اس کا مطالبہ پورا کر کے کسی طرح اس قصہ کو ختم کروں لیکن سیٹھ صاحب اس بات پر بھی راضی نہ ہوئے۔ جب اس کا پائنچہ گھٹنے کے قریب تک جل گیا اور اس نے سیٹھ کو پسیجتے نہیں دیکھا تو جلدی جلدی اپنے ہی ہاتھوں سے آگ بجھائی اور وہاں سے چلتا ہوا۔ سیٹھ صاحب نے کہا ہمیں ایسے مکاروں سے روز سابقہ رہتا ہے۔ میں نے کہا یہ سب زنان مصر کے بھائی معلوم ہوتے ہیں۔

حَاشَ لِلّٰهِ کا مفہوم

حَاشَ لِلّٰهِ مَا هٰذَا بَشَرًا ۚ إِنْ هٰذَآ إِلَّا مَلَكٌ كَرِيْمٌ۔ حَاشَ لِلّٰهِ۔ استثنا اور تنزیہ کا کلمہ ہے۔ یہ اس موقع پر بولا جاتا ہے جب اپنے آپ کو یا کسی اور کو کسی الزام سے بری ثابت کرنا ہو۔ مَا هٰذَا بَشَرًا میں 'ما' 'لیس' کے مفہوم میں ہے اس وجہ سے 'بشرا' منصوب ہے۔ قرآن میں اس کی نظیر موجود ہے۔

بیگمات کا اعتراف

ان بیگمات کا یہ اعتراف حضرت یوسفؑ کی کمال درجہ تعریف بھی ہے اور اپنی شکست کے لیے ایک عذر بھی۔ اس کے اندر یہ مضمون بھی مضمر ہے کہ اگر ہم ان کو جیت نہ سکے تو اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ ہمارے فن یا ہمارے حسن و جمال میں کوئی نقص تھا بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمیں مقابلہ ایک معزز فرشتہ سے کرنا پڑا جب کہ ہمارے سارے اسلحہ صرف انسانوں ہی پر کارگر ہونے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

قَالَتْ فَذٰلِكُنَّ الَّذِيْ لُمْتُنَّنِيْ فِيْهِ ۭ وَلَقَدْ رَاوَدْتُّهٗ عَنْ نَّفْسِهٖ فَاسْتَعْصَمَ ۭ وَلَىِٕنْ لَّمْ
يَفْعَلْ مَآ اٰمُرُهٗ لَيُسْجَنَنَّ وَلَيَكُوْنًا مِّنَ الصّٰغِرِيْنَ (۳۲)

زلیخا کی دھمکی

ان عورتوں کی شکست سے زلیخا کے دل سے اپنی شکست کا غم جاتا رہا۔ اس نے بڑے تیکھے انداز میں ان عورتوں سے کہا کہ یہی ہے وہ جس کے بارے میں تم نے مجھے طعن وطنز کا نشانہ بنا لیا تھا۔ اب تو تمھیں اندازہ ہوا کہ اس کو جیتنا کوئی آسان کام نہیں تھا! اس میں شبہ نہیں کہ میں نے اس کا دل مٹھی میں لینے کی پوری کوشش کی لیکن یہ اپنے کو بچا لے گیا۔ لیکن صاف کہے دیتی ہوں کہ اگر اس نے میرا کہا نہ کیا تو لازماً جیل جائے گا اور ذلیل ہوگا۔ مطلب یہ کہ اگر میں محبت سے اسے رام نہ کر سکی تو یہ نہ سمجھے کہ اس کی جان چھوٹ گئی۔ اب جیل کی ہوا کھائے گا اور ذلیل ہوگا۔ یہاں سے حضرت یوسفؑ کی آزمائش ایک نئی شکل اختیار کرتی ہے۔ ہوس کی محبت اپنی ناکامی کا انتقام لینے پر آمادہ ہوتی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ مصر میں غلاموں پر ان کے آقاؤں کو غیر محدود اختیار حاصل تھے۔ وہ ان سے ناراض ہونے کی صورت میں بے تکلف ان کو جیل بھجوا سکتے تھے، پھر یہاں تو معاملہ ایک اعلیٰ سرکاری عہدہ دار کی بیگم صاحبہ کا تھا، کس کی مجال تھی کہ ان کے ارادے میں مزاحم ہو سکے۔

قَالَ رَبِّ السِّجْنُ اَحَبُّ اِلَيَّ مِمَّا يَدْعُوْنَنِيْٓ اِلَيْهِ ۚ وَاِلَّا تَصْرِفْ عَنِّيْ كَيْدَهُنَّ اَصْبُ اِلَيْهِنَّ
وَاَكُنْ مِّنَ الْجٰهِلِيْنَ (۳۳)

حضرت یوسفؑ کی دعا

یہ دھمکی تو زلیخا نے حضرت یوسفؑ کو مرعوب کرنے کے لیے دی تھی کہ اس سے ڈر کر وہ اس کی خواہش پوری کرنے پر آمادہ ہو ہی جائیں گے لیکن حضرت یوسفؑ نے ہوس کے ان پھندوں کے مقابل میں جیل کی بیڑیوں کو غنیمت جانا۔ انھوں نے فوراً دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیے کہ پروردگار! ان کی دعوتِ ہوس کے مقابلے میں یہ جیل مجھے کہیں زیادہ عزیز و محبوب ہے اور ساتھ ہی ناز اور اعتماد کا یہ فقرہ بھی فرما گئے کہ "اگر تو نے ان کے ان فتنوں سے اب مجھے نہ بچایا تو میں ان کی طرف مائل اور جذبات سے مغلوب ہو جاؤں گا۔"

فَاسْتَجَابَ لَهٗ رَبُّهٗ فَصَرَفَ عَنْهُ كَيْدَهُنَّ ۭ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ (۳۴)

دعا کی قبولیت

حضرت یوسفؑ کی زبان سے یہ دعا اس وقت نکلی ہے جب وہ اپنی پوری طاقت اپنے ایمان و اخلاق کی حفاظت کے لیے نچوڑ چکے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ ان بگیات کی پیدا کی ہوئی پرفتن زندگی کے مقابل میں جیل کی پرمحن زندگی کو قبول کرنے پر راضی ہیں۔ جب بندہ اس حد تک اپنی استقامت دکھا دینے کے بعد اپنے آپ کو اپنے رب کے آگے ڈال دیتا ہے اور اس سے مدد مانگتا ہے تو اس کی دعا ضرور قبول ہوتی ہے اور فوراً قبول ہوتی ہے۔ چنانچہ حضرت یوسفؑ کی دعا بھی قبول ہوئی اور شیطان کے ان نسوانی پھندوں سے انھوں نے نجات پائی۔ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ۔ خدا سمیع و علیم ہے۔ وہ بندے کی دعائیں اور فریادیں سنتا اور دلوں کے احوال اور اسرار سے اچھی طرح واقف ہوتا ہے۔

۶- آگے کا مضمون ـــــ آیات ۳۵-۵۳

حضرت یوسفؑ کی آزمائش کا نیا دور

یہاں سے حضرت یوسفؑ کی آزمائش کا نیا دور شروع ہوتا ہے۔ اگرچہ عزیز پر بھی اور زلیخا کے عزیزوں اور رشتہ داروں پر بھی اصل حقیقت پوری طرح واضح تھی لیکن انھوں نے مصلحت اسی میں سمجھی کہ کچھ دنوں کے لیے حضرت یوسفؑ کو جیل بھجوا دیں۔ انھوں نے خیال کیا ہوگا کہ اس طرح لوگوں کی زبانیں بھی کچھ عرصہ کے بعد بند ہو جائیں گی اور نگاہوں سے دور ہو جانے کے سبب سے زلیخا کا خبط بھی جاتا رہے گا۔ جیل میں حضرت یوسفؑ کے دو ساتھی خواب دیکھتے ہیں، وہ خواب کی تعبیر حضرت یوسفؑ سے پوچھتے ہیں۔ حضرت یوسفؑ اس خواب کی تعبیر بتاتے ہیں جو بالکل صحیح ثابت ہوتی ہے۔ بالآخر یہیں سے ان کے لیے بادشاہ وقت کے ایک خواب کی تعبیر بتانے کی راہ کھلتی ہے جس کے بعد بادشاہ ان کا ایسا گرویدہ ہو جاتا ہے کہ ملک کے تمام سفید و سیاہ کا ان کو مالک بنا دیتا ہے ـــــ آیات کی تلاوت فرمائیے۔

ع ۶ ۱۴ ترجمۂ آیات ۳۵-۵۳

ثُمَّ بَدَا لَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا رَاَوُا الْاٰيٰتِ لَيَسْجُنُنَّهٗ حَتّٰى حِيْنٍ ﴿۳۵﴾
وَدَخَلَ مَعَهُ السِّجْنَ فَتَيٰنِ ؕ قَالَ اَحَدُهُمَاۤ اِنِّيْۤ اَرٰىنِيْۤ اَعْصِرُ
خَمْرًا ۚ وَقَالَ الْاٰخَرُ اِنِّيْۤ اَرٰىنِيْۤ اَحْمِلُ فَوْقَ رَاْسِيْ خُبْزًا تَاْكُلُ
الطَّيْرُ مِنْهُ ؕ نَبِّئْنَا بِتَاْوِيْلِهٖ ۚ اِنَّا نَرٰىكَ مِنَ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۳۶﴾
قَالَ لَا يَاْتِيْكُمَا طَعَامٌ تُرْزَقٰنِهٖۤ اِلَّا نَبَّاْتُكُمَا بِتَاْوِيْلِهٖ قَبْلَ
اَنْ يَّاْتِيَكُمَا ؕ ذٰلِكُمَا مِمَّا عَلَّمَنِيْ رَبِّيْ ؕ اِنِّيْ تَرَكْتُ مِلَّةَ قَوْمٍ لَّا
يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ كٰفِرُوْنَ ﴿۳۷﴾ وَاتَّبَعْتُ مِلَّةَ اٰبَآءِيْۤ
اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ ؕ مَا كَانَ لَنَاۤ اَنْ نُّشْرِكَ بِاللّٰهِ مِنْ
شَيْءٍ ؕ ذٰلِكَ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ عَلَيْنَا وَعَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ
لَا يَشْكُرُوْنَ ﴿۳۸﴾ يٰصَاحِبَيِ السِّجْنِ ءَاَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَيْرٌ اَمِ
اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ﴿۳۹﴾ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖۤ اِلَّاۤ اَسْمَآءً سَمَّيْتُمُوْهَاۤ

أَنْتُمْ وَآبَاؤُكُمْ مَا أَنْزَلَ اللَّهُ بِهَا مِنْ سُلْطَانٍ ۚ إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا
لِلَّهِ ۚ أَمَرَ أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا إِيَّاهُ ۚ ذَٰلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ
النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ ﴿٤٠﴾ يَا صَاحِبَيِ السِّجْنِ أَمَّا أَحَدُكُمَا فَيَسْقِي
رَبَّهُ خَمْرًا ۖ وَأَمَّا الْآخَرُ فَيُصْلَبُ فَتَأْكُلُ الطَّيْرُ مِنْ رَأْسِهِ ۚ قُضِيَ
الْأَمْرُ الَّذِي فِيهِ تَسْتَفْتِيَانِ ﴿٤١﴾ وَقَالَ لِلَّذِي ظَنَّ أَنَّهُ نَاجٍ مِنْهُمَا
اذْكُرْنِي عِنْدَ رَبِّكَ فَأَنْسَاهُ الشَّيْطَانُ ذِكْرَ رَبِّهِ فَلَبِثَ فِي السِّجْنِ
بِضْعَ سِنِينَ ﴿٤٢﴾ وَقَالَ الْمَلِكُ إِنِّي أَرَىٰ سَبْعَ بَقَرَاتٍ سِمَانٍ يَأْكُلُهُنَّ ع ٥ ١٥
سَبْعٌ عِجَافٌ وَسَبْعَ سُنْبُلَاتٍ خُضْرٍ وَأُخَرَ يَابِسَاتٍ ۖ يَا أَيُّهَا الْمَلَأُ
أَفْتُونِي فِي رُؤْيَايَ إِنْ كُنْتُمْ لِلرُّؤْيَا تَعْبُرُونَ ﴿٤٣﴾ قَالُوا أَضْغَاثُ
أَحْلَامٍ ۖ وَمَا نَحْنُ بِتَأْوِيلِ الْأَحْلَامِ بِعَالِمِينَ ﴿٤٤﴾ وَقَالَ الَّذِي
نَجَا مِنْهُمَا وَادَّكَرَ بَعْدَ أُمَّةٍ أَنَا أُنَبِّئُكُمْ بِتَأْوِيلِهِ فَأَرْسِلُونِ ﴿٤٥﴾
يُوسُفُ أَيُّهَا الصِّدِّيقُ أَفْتِنَا فِي سَبْعِ بَقَرَاتٍ سِمَانٍ يَأْكُلُهُنَّ
سَبْعٌ عِجَافٌ وَسَبْعِ سُنْبُلَاتٍ خُضْرٍ وَأُخَرَ يَابِسَاتٍ لَعَلِّي أَرْجِعُ إِلَى
النَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَعْلَمُونَ ﴿٤٦﴾ قَالَ تَزْرَعُونَ سَبْعَ سِنِينَ دَأَبًا فَمَا
حَصَدْتُمْ فَذَرُوهُ فِي سُنْبُلِهِ إِلَّا قَلِيلًا مِمَّا تَأْكُلُونَ ﴿٤٧﴾
ثُمَّ يَأْتِي مِنْ بَعْدِ ذَٰلِكَ سَبْعٌ شِدَادٌ يَأْكُلْنَ مَا قَدَّمْتُمْ لَهُنَّ
إِلَّا قَلِيلًا مِمَّا تُحْصِنُونَ ﴿٤٨﴾ ثُمَّ يَأْتِي مِنْ بَعْدِ ذَٰلِكَ عَامٌ فِيهِ
يُغَاثُ النَّاسُ وَفِيهِ يَعْصِرُونَ ﴿٤٩﴾ وَقَالَ الْمَلِكُ ائْتُونِي بِهِ ۖ ع ٦ ١٦

فَلَمَّا جَآءَهُ الرَّسُوْلُ قَالَ ارْجِعْ اِلٰى رَبِّكَ فَسْـَٔلْهُ مَا بَالُ النِّسْوَةِ
الّٰتِیْ قَطَّعْنَ اَیْدِیَهُنَّ ؕ اِنَّ رَبِّیْ بِكَیْدِهِنَّ عَلِیْمٌ ﴿۵۰﴾ قَالَ مَا
خَطْبُكُنَّ اِذْ رَاوَدْتُّنَّ یُوْسُفَ عَنْ نَّفْسِهٖ ؕ قُلْنَ حَاشَ لِلّٰهِ مَا
عَلِمْنَا عَلَیْهِ مِنْ سُوْٓءٍ ؕ قَالَتِ امْرَاَتُ الْعَزِیْزِ الْـٰٔنَ حَصْحَصَ الْحَقُّ٘
اَنَا رَاوَدْتُّهٗ عَنْ نَّفْسِهٖ وَاِنَّهٗ لَمِنَ الصّٰدِقِیْنَ ﴿۵۱﴾ ذٰلِكَ لِیَعْلَمَ
اَنِّیْ لَمْ اَخُنْهُ بِالْغَیْبِ وَاَنَّ اللّٰهَ لَا یَهْدِیْ كَیْدَ الْخَآئِنِیْنَ ﴿۵۲﴾
وَمَآ اُبَرِّئُ نَفْسِیْ ۚ اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌۢ بِالسُّوْٓءِ اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّیْ ؕ
اِنَّ رَبِّیْ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ﴿۵۳﴾

ترجمۂ آیات ۳۵-۵۳

پھر نشانیاں دیکھ چکنے کے بعد انھیں مصلحت یہی معلوم ہوئی کہ اس کو کچھ مدت کے لیے قید کر دیں۔ اور اس کے ساتھ دو اور جوان بھی جیل خانہ میں داخل ہوئے۔ ان میں سے ایک نے کہا کہ میں اپنے آپ کو خواب میں دیکھتا ہوں کہ میں شراب نچوڑ رہا ہوں اور دوسرے نے کہا کہ میں اپنے کو دیکھتا ہوں کہ میں اپنے سر پر روٹی اٹھائے ہوئے ہوں جس میں سے چڑیاں کھا رہی ہیں۔ آپ ہمیں اس کی تعبیر بتائیے۔ ہم آپ کو خوب کاروں میں سے سمجھتے ہیں۔ اس نے کہا جو کھانا تمھیں ملتا ہے وہ آئے گا نہیں کہ میں اس کے آنے سے پہلے پہلے تمھیں اس کی تعبیر بتا دوں گا۔ یہ اس علم میں سے ہے جو میرے رب نے مجھے سکھایا ہے۔ میں نے ان لوگوں کے مذہب کو چھوڑا ہے جو اللہ پر ایمان نہیں رکھتے اور آخرت کے یہی لوگ منکر ہیں۔ اور میں نے اپنے بزرگوں، ابراہیم اور اسحٰق اور یعقوب کے مذہب کی پیروی کی۔ ہمیں حق نہیں کہ ہم کسی چیز کو اللہ کا شریک ٹھہرائیں۔ یہ اللہ کا ہم پر اور لوگوں پر فضل ہے لیکن اکثر لوگ شکر گزار نہیں ہوتے۔ اے میرے جیل کے

دونوں ساتھیو! کیا الگ الگ بہت سے رب بہتر ہیں، یا اکیلا اللہ ہی سب پر حاوی و غالب؟
تم اس کے سوا نہیں پوجتے ہو مگر چند ناموں کو جو تم نے اور تمھارے باپ دادوں نے رکھ
چھوڑے ہیں۔ اللہ نے ان کی کوئی دلیل نہیں اتاری۔ اختیار و اقتدار صرف اللہ ہی کا ہے۔
اس نے حکم دیا ہے کہ اس کے سوا کسی کی پرستش نہ کرو۔ یہی دین قیم ہے لیکن اکثر لوگ
نہیں جانتے۔ ۳۵-۴۰

اے میرے زندان کے دونوں ساتھیو، تم میں سے ایک تو اپنے آقا کو شراب پلانے کی خدمت
انجام دے گا۔ رہا دوسرا تو اس کو سولی دی جائے گی پھر پرندے اس کے سر کو نوچ نوچ کر کھائیں گے۔
اس امر کا فیصلہ ہوا جس کے بارے میں تم پوچھ رہے تھے۔ ۴۱

اور جس کے بارے میں اس نے خیال کیا کہ وہ چھوٹ جانے والا ہے اس سے اس نے کہا کہ
اپنے آقا کے پاس میرا ذکر کیجیو۔ تو شیطان نے اس کو اپنے آقا سے ذکر کرنا بھلا دیا پس وہ جیل خانہ
میں کئی سال پڑا رہا۔ ۴۲

اور بادشاہ نے کہا کہ میں خواب میں دیکھتا ہوں کہ سات موٹی گائیں ہیں جنھیں سات دبلی
گائیں کھا رہی ہیں اور سات سبز بالیاں ہیں اور دوسری سات خشک۔ اے دربار یو، میرے رویا
کی مجھے تعبیر بتاؤ اگر تم خواب کی تعبیر دیتے ہو۔ وہ بولے یہ خواب پریشان ہیں اور ہم پریشان خوابوں
کی تعبیر کے عالم نہیں۔ اور ان دونوں میں سے جو چھوٹ گیا تھا اور ایک مدت کے بعد اسے یاد
پڑا، وہ بولا کہ میں آپ لوگوں کو اس کی تعبیر بتاؤں گا، پس مجھے جانے دیجیے۔ ۴۳-۴۵

یوسف! اے راست باز! ہمیں سات فربہ گایوں کے بارے میں جنھیں سات دبلی گائیں
کھا رہی ہیں اور سات سبز بالیوں اور دوسری سات خشک بالیوں کے بارے میں تعبیر بتا تاکہ میں

لوگوں کے پاس جاؤں تاکہ وہ بھی جانیں۔ اس نے کہا تم سات سال برابر کاشت کروگے پس جو فصل کاٹو، اس قلیل مقدار کے سوا جو تم کھاؤ، اس کی بالیوں میں چھوڑ دیا کرو۔ پھر اس کے بعد سات سخت سال آئیں گے جو، بجز اس قلیل مقدار کے جو تم محفوظ کر لوگے اس کو چٹ کر جائیں گے جو تم نے ان کے لیے فراہم کیا ہوگا۔ پھر اس کے بعد ایک ایسا سال آئے گا جس میں لوگوں کی فریاد رسی ہوگی اور لوگ اس میں انگور نچوڑیں گے۔ ۴۶-۴۹

اور بادشاہ نے کہا کہ اس کو میرے پاس لاؤ۔ پس جب قاصد اس کے پاس آیا اس نے کہا کہ تم اپنے آقا کے پاس واپس جاؤ اور اس سے دریافت کرو کہ ان عورتوں کا کیا حال ہے جنھوں نے اپنے ہاتھ زخمی کر لیے تھے؟ بے شک میرا رب ان کے کید سے خوب واقف ہے۔ اس نے پوچھا، تمھارا کیا ماجرا ہے جب تم نے یوسف کو پھسلانے کی کوشش کی؟ وہ بولیں کہ حاشا للہ ہم نے اس پر برائی کا کوئی بھی نقش نہیں پایا۔ عزیز کی بیوی بولی اب حق آشکارا ہوگیا۔ میں نے اس کو پھسلانے کی کوشش کی۔ اور بے شک وہ راست بازوں میں سے ہے۔ ۵۰-۵۱

یہ اس لیے کہ وہ جان لے کہ میں نے پیٹھ پیچھے اس سے بے وفائی نہیں کی اور بے شک اللہ خائنوں کی چال کو چلنے نہیں دیتا۔ اور میں اپنے نفس کو بری نہیں قرار دیتا۔ نفس تو برائیوں ہی کی راہ سجھانے والا ہے مگر جب میرا رب رحم فرمائے۔ بے شک میرا رب بخشنے والا، رحم فرمانے والا ہے (۵۲-۵۳)

۷- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

ثُمَّ بَدَا لَهُمْ مِّنْ بَعْدِ مَا رَاَوُا الْاٰيٰتِ لَيَسْجُنُنَّهٗ حَتّٰى حِيْنٍ (۳۵)

قیدوبند کی آزمائش کا دور

'آیات' سے مراد یہاں حضرت یوسفؑ کی براءت و بے گناہی کے دلائل و شواہد ہیں۔ یعنی عزیز اور اس کے رشتہ داروں پر اگرچہ یہ حقیقت پوری طرح واضح ہو چکی تھی کہ یوسفؑ بالکل بے گناہ ہیں، سارا قصور زلیخا ہی کا ہے لیکن

اپنی ناک بچانے کے لیے انھیں مصلحت اسی میں نظر آئی کہ کچھ عرصہ کے لیے حضرت یوسفؑ کو جیل بھجوا دیں۔ انھوں نے خیال کیا ہو گا کہ اس طرح کچھ مدت کے بعد زلیخا کے دماغ سے یوسفؑ کا خبط بھی نکل جائے گا اور جو لوگ اس قصہ سے دلچسپی لے رہے ہیں ان کی توجہ بھی ہٹ جائے گی۔ لوگ خیال کریں گے قصور زلیخا کا نہیں بلکہ یوسفؑ ہی کا تھا چنانچہ اسی کو سزا ملی۔ اس زمانے میں مالکوں کو اپنے غلاموں پر جو غیر محدود اختیارات حاصل تھے ان کی موجودگی میں عزیز کے لیے حضرت یوسفؑ کو جیل بھجوا دینے میں اول تو کوئی زحمت رہی نہیں ہو گی اور اگر کچھ رہی بھی ہو گی تو ایک سرکاری عہدہ دار کے لیے، جو شاہی باڈی گارڈ کا افسر تھا، اس قسم کی کسی زحمت کو دور کر لینا کیا مشکل تھا۔ الغرض یہاں سے حضرت یوسفؑ کی آزمائش کا نیا دور شروع ہو گیا۔ یوں عام نگاہ میں تو آزمائش کا اصلی دور یہی ہے لیکن حضرت یوسفؑ کی نگاہ میں چونکہ اصلی اہمیت اپنے ایمان و اخلاق کی تھی اس وجہ سے انھوں نے پچھلے دور کے مقابل میں، جیسا کہ آپ نے دیکھا، نہ صرف یہ کہ اس کی تمنا کی بلکہ اس کے لیے دعا بھی کی۔

وَدَخَلَ مَعَهُ السِّجْنَ فَتَيٰنِ ۭ قَالَ اَحَدُهُمَآ اِنِّىْٓ اَرٰىنِىْٓ اَعْصِرُ خَمْرًا ۚ وَقَالَ الْاٰخَرُ اِنِّىْٓ اَرٰىنِىْٓ اَحْمِلُ فَوْقَ رَاْسِىْ خُبْزًا تَاْكُلُ الطَّيْرُ مِنْهُ ۭ نَبِّئْنَا بِتَاْوِيْلِهٖ ۚ اِنَّا نَرٰىكَ مِنَ الْمُحْسِنِيْنَ (۳۶)

'فَتَيَان'، یعنی دو نوجوان، قرآن میں یہ تصریح نہیں ہے کہ دو نوجوان کون تھے۔ تورات کی روایت باور کیجیے تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں سے ایک بادشاہ کا ساقی تھا دوسرا نان پز۔

'اِنِّىْٓ اَرٰىنِىْٓ اَعْصِرُ خَمْرًا' عربی زبان میں یہ اسلوب موجود ہے کہ بعض اوقات کسی شے کو اس کی نہایت کے اعتبار سے تعبیر کرتے ہیں۔ انگور نچوڑنے کا مقصد اگر اس سے شراب بنانا ہے تو اس کو یوں کہہ سکتے ہیں کہ میں شراب نچوڑ رہا ہوں۔

۱۔ قیدی نوجوانوں کے خواب

حضرت یوسفؑ کے ساتھ دو اور نوجوان بھی، جو خاص بادشاہ کے خدمت گار تھے، جیل خانے میں داخل ہوئے۔ ان دونوں نے خواب دیکھے۔ ایک نے یہ دیکھا کہ میں انگور نچوڑ رہا ہوں۔ دوسرے نے یہ دیکھا کہ میں سر پر روٹیوں کا ٹوکرا لیے ہوئے ہوں اور چڑیاں اس میں سے نوچ نوچ کر کھا رہی ہیں۔ یہ خواب چونکہ عام خوابوں سے بہت مختلف تھے، ان کو ان کی تعبیر معلوم کرنے کی فکر ہوئی۔ اس دوران میں ان کو حضرت یوسفؑ کو بہت قریب سے دیکھنے کا موقع مل چکا تھا اور وہ ان کے علم و تقویٰ سے متاثر تھے۔ قدرتی طور پر اس کام کے لیے انھوں نے انھیں سے رجوع کیا اور نہایت ادب سے عرض کی کہ آپ چونکہ ہمیں نہایت خوب کار اور نیک آدمی معلوم ہوتے ہیں اس وجہ سے آپ ہی سے گزارش ہے کہ ہمیں ان خوابوں کی تعبیر بتائیے۔ لفظ 'محسن' یہاں خوب کار کے معنی میں ہے یعنی جس کام کو بھی کرتے ہیں اپنے رب کو حاضر ناظر جانتے ہوئے کرتے ہیں۔

قَالَ لَا يَاْتِيْكُمَا طَعَامٌ تُرْزَقٰنِهٖٓ اِلَّا نَبَّاْتُكُمَا بِتَاْوِيْلِهٖ قَبْلَ اَنْ يَّاْتِيَكُمَا ۭ ذٰلِكُمَا مِمَّا عَلَّمَنِيْ رَبِّيْ ۭ اِنِّىْ تَرَكْتُ مِلَّةَ قَوْمٍ لَّا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ كٰفِرُوْنَ (۳۷)

خواب کی تعبیر اور دین کی دعوت

حضرت یوسفؑ نے فرمایا کہ کھانا تقسیم ہونے سے پہلے پہلے میں تم کو ان خوابوں کی تعبیر بتا دوں گا۔ جیل بالخصوص

اس زمانے کے جیل کی افسردہ اور یک رنگ زندگی میں کھانے کی تقسیم وغیرہ جیسے ایک آدھ واقعے ہی ایسے ہو سکتے ہیں جو زندگی میں ذرا تغیر کی علامت سمجھے جاتے ہوں گے اس وجہ سے حضرت یوسفؑ نے اسی کا حوالہ دے کر خوابوں کی تعبیر کے معاملے کو کچھ وقت کے لیے ٹال دیا۔ اس کا اثر تعبیر پوچھنے والوں پر تو یہ پڑا ہو گا کہ حضرت یوسفؑ نے ان کے خوابوں کو اہمیت دی ہے، وہ سرسری طور پر الٹی سیدھی کوئی بات بتا کر ان کو ٹالنا نہیں چاہتے بلکہ سوچ کر یا اپنے رب سے رجوع کرنے کے بعد ان کی تعبیر بتائیں گے اور ادھر خود حضرت یوسفؑ نے اس التوا سے اس حق کی تبلیغ کے لیے ایک نہایت اچھا موقع پیدا کر لیا جو ان کی زندگی کا سب سے زیادہ محبوب مقصد بن چکا تھا۔ انھوں نے جب دو دلوں کو اپنی طرف مائل دیکھا تو صرف ان کی اندھی بہری عقیدت ہی پر قانع نہیں ہو گئے بلکہ چاہا کہ ان کو اللہ کی بندگی کی وہ دعوت پہنچا دیں جو اگر وہ قبول کر لیں تو ان کی دنیا اور آخرت دونوں سنور جائیں۔ چنانچہ انھوں نے پہلی بات تو یہ فرمائی کہ ذٰلِكُمَا مِمَّا عَلَّمَنِي رَبِّي یہ خوابوں کی تعبیر کا علم ان علموں میں سے ہے جو میرے رب نے مجھے سکھائے ہیں۔ مقصد یہ کہ اگر اس علم کو تم قدر و قیمت کی چیز سمجھتے ہو تو یہ یاد رکھو کہ اس کا منبع اور سرچشمہ میں نہیں ہوں بلکہ میرا رب ہے۔ اس نے مجھے جو علم بخشے ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے۔ دوسری بات یہ فرمائی کہ اِنِّي تَرَكْتُ مِلَّةَ قَوْمٍ لَّا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ یعنی مجھ پر میرے رب کا یہ فضل جو ہوا تو اس وجہ سے ہوا کہ میں نے ان لوگوں کے مذہب کو چھوڑا ہے جو اللہ پر ایمان نہیں رکھتے۔ تیسری بات یہ فرمائی کہ هُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ كٰفِرُوْنَ یعنی یہی لوگ ہیں جو آخرت کے منکر ہیں اس لیے کہ جو لوگ سرے سے خدا ہی پر ایمان نہیں رکھتے ان کے آخرت کو ماننے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ غور کیجیے تو معلوم ہو گا کہ جوں ہی حضرت یوسفؑ نے محسوس فرمایا کہ ان نوجوانوں کے دلوں میں کچھ صلاحیت ہے انھوں نے دین کی تمام بنیادی باتوں کی ان کے اندر تخم ریزی کر دی اور ساتھ ہی یہ تاثر بھی ان کو دے دیا کہ اگر یہ راہ اختیار کرنے کا حوصلہ ہے تو اس کے لیے ان لوگوں کی ملت چھوڑنی پڑے گی جو خدا اور آخرت پر ایمان نہیں رکھتے۔

حضرت یوسفؑ کا یہ ارشاد کہ میں نے ان لوگوں کی ملت کو چھوڑا ہے جو اللہ پر ایمان نہیں رکھتے، اس حقیقت کا اظہار ہے کہ انھوں نے اپنے باطن میں اچھی طرح تجزیہ اور تنقید کر کے حق کا حق ہونا اور باطل کا باطل ہونا معین کر لیا ہے اور حق کو جو اختیار کیا ہے تو مجرد اس لیے نہیں کہ میراث آبا ہے بلکہ اس لیے کیا ہے کہ وہی اختیار کرنے کی چیز ہے، اسی طرح اگر باطل کو چھوڑا ہے تو اس وجہ سے چھوڑا ہے کہ اس کا باطل ہونا پوری طرح واضح ہو چکا ہے۔

وَاتَّبَعْتُ مِلَّةَ اٰبَآءِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ ؕ مَا كَانَ لَنَآ اَنْ نُّشْرِكَ بِاللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ ؕ ذٰلِكَ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ عَلَيْنَا وَعَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُوْنَ (۳۸)

اللہ پر ایمان نہ رکھنے والوں کی ملت کو چھوڑ کر جس ملت کو انھوں نے اختیار فرمایا، یہ اس کا بیان ہے۔ اس پورے سلسلۃ الذہب کی وضاحت اس وجہ سے ضروری تھی کہ مخاطب کہیں اس غلط فہمی میں مبتلا نہ ہوں کہ حضرت یوسفؑ جس ملت کی ان کو دعوت دے رہے ہیں یہ ان کی کوئی نو ایجاد ملت ہے بلکہ ان پر یہ حقیقت اچھی طرح واضح ہو جائے کہ یہ وہی ملت ہے جس کو حضرت ابراہیم، حضرت اسحٰق اور حضرت یعقوب علیہم السلام جیسے اکابر و مشاہیر

نے اختیار فرمایا۔ ان اکابر کے نام تمام اطراف دیار میں پھیلے ہوئے تھے اور عجب نہیں کہ حضرت یوسفؑ کے یہ زندان کے ساتھی بھی ان ناموں سے آشنا رہے ہوں۔

ملتِ توحید کی تاریخی و فطری عظمت

مَا كَانَ لَنَآ اَنْ نُّشْرِكَ بِاللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ: ملت توحید کی تاریخی عظمت و اہمیت واضح کرنے کے بعد یہ حضرت یوسفؑ نے اس کی فطری اور عقلی عظمت واضح فرمائی ہے کہ یہ حقیقت تو روزِ روشن کی طرح واضح ہے کہ ایک خالق ہے جس نے یہ دنیا بنائی ہے، جس نے ہم کو زندگی بخشی ہے، جو رزق دیتا ہے اور جس کے اختیار میں ہماری زندگی اور موت ہے لیکن اس بات کی ہمارے سامنے کوئی ادنیٰ شہادت بھی موجود نہیں ہے کہ کوئی اور بھی ان کاموں میں اس کا شریک و سہیم ہے۔ تو جب اس چیز کی کوئی ادنیٰ شہادت ہمارے پاس موجود نہیں ہے، نہ ہماری عقل میں، نہ ہماری فطرت میں، نہ آفاق میں، نہ انفس میں تو ہمیں یہ کس طرح حق پہنچتا ہے کہ ہم خواہ مخواہ کسی چیز کو اس کی خدائی میں شریک اور حصہ دار بنا کے رکھ دیں۔

يٰصَاحِبَيِ السِّجْنِ ءَاَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَيْرٌ اَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ۝ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖٓ اِلَّآ اَسْمَآءً سَمَّيْتُمُوْهَآ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ ۭ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ۭ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ ۭ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ (۳۹-۴۰)

دعوتِ توحید

يٰصَاحِبَيِ السِّجْنِ کے خطاب میں جو بلاغت اور دل نوازی ہے وہ بالکل واضح ہے۔ بسا اوقات مصیبت کا اشتراک بھی شرکائے مصیبت کے دلوں میں ہمدردی، محبت، اخلاص اور باہمی خیر خواہی و خیر سگالی کے جذبات نہایت زور و قوت سے ابھار دیتا ہے۔ حضرت یوسفؑ نے اس خطاب سے اپنے ان ساتھیوں کے انہی جذبات کو ابھارا ہے تاکہ وہ ان کی طرف متوجہ ہوں اور ان کی وہ بات جو سرتا سر انہی کے نفع کے لیے ہے گوشِ دل سے سنیں۔

ءَاَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَيْرٌ اَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ، لفظ قہار پر ہم دوسرے مقام میں بحث کر کے بتا چکے ہیں کہ اس کا صحیح مفہوم وہ ہے جو لفظ کنٹرولر (CONTROLLER) کا ہے یعنی سب پر حاوی اور غالب جس کے حیطۂ اقتدار سے نہ کوئی باہر ہو، نہ باہر نکل سکے۔ مطلب یہ کہ جہاں تک ایک خدا کا تعلق ہے وہ تو ایک بدیہی حقیقت بلکہ ابدہ البدیہیات ہے۔ مشرک اور موحد سب اس کو مانتے ہیں۔ اب رہا یہ سوال کہ اس کے سوا اور بھی کچھ اس کے شریک ہیں تو یہ چیز نہایت مضبوط دلیل کی محتاج ہے۔ اگر اس کی کوئی دلیل موجود نہیں ہے تو مجرد خواہش کی بنا پر کسی کو اپنے اوپر خدا بنا کر مسلط کر لینا کہاں کی دانشمندی ہے؟ ایک غلام کے سامنے اگر یہ سوال رکھا جائے کہ اسے بیک وقت ایک آقا کی غلامی پسند ہے یا کئی آقاؤں کی تو وہ متعدد آقاؤں کے تقابل میں ایک ہی آقا کی غلامی کو ترجیح دے گا۔ یہی انسان کی فطرت ہے۔ اسے اپنے اوپر کسی کو خدا بنا کر مسلط کرنے کا شوق نہیں ہے۔ وہ ایک خدا کو تو اس لیے مانتا ہے کہ اس کے ماننے پر اس کی عقل اور فطرت اس کو مجبور کرتی ہے۔ اس کے سوا دوسروں کو ماننے کے لیے کیا مجبوری ہے کہ وہ خواہ مخواہ ان کی غلامی کا پٹا بھی اپنی گردن میں ڈال لے۔ انسانی فطرت کی اسی حقیقت کی طرف قرآن نے سورہ زمر کی اسی تمثیل میں اشارہ فرمایا ہے۔ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا رَّجُلًا فِيْهِ

شُرَكَآءُ مُتَشٰكِسُوْنَ وَرَجُلًا سَلَمًا لِّرَجُلٍ ؕ هَلْ يَسْتَوِيٰنِ مَثَلًا ؕ ۲۹- زمر (اور اللہ تمثیل بیان کرتا ہے ایک ایسے غلام کی جس میں متعدد مختلف الاغراض شرکاء شریک ہیں اور ایک ایسے غلام کی جو پورا کا پورا ایک ہی آقا کی ملکیت ہے۔ کیا دونوں کی حیثیت ایک جیسی ہو گی) یہاں قہار کی صفت سے اس حقیقت کی طرف اشارہ مقصود ہے کہ جب خدا قہار بھی ہے یعنی سب پر حاوی و غالب اور یہ اس کی صفات کا لازمی تقاضا بھی ہے تو آخر وہ ضرورت کیا ہے جس کے لیے دوسروں کو اس کی خدائی میں شریک کیا جائے۔

مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖٓ اِلَّآ اَسْمَآءً، الایۃ۔ یعنی یہ جن کو تم پوج رہے ہو یہ محض تمہارے وہم کے ایجاد کیے ہوئے نام ہیں، ان ناموں کا کوئی مسمّٰی موجود نہیں ہے۔ تمہارے باپ دادا جس لکیر کو پیٹتے آئے اسی لکیر کو بے سمجھے تم بھی پیٹ رہے ہو۔ خدا نے تمہارے ان فرضی دیویوں اور دیوتاؤں کے حق میں کوئی دلیل نہیں اتاری۔ حکم اور فیصلہ، امر اور قضا سب اللہ ہی کے اختیار میں ہے اور اس نے صرف اپنی عبادت کا حکم دیا ہے اور یہی سیدھا، مستقیم اور فطری دین ہے۔ اس کے علاوہ جتنے بھی طریقے ہیں سب فطرتِ انسانی سے ہٹے ہوئے اور انسان کو پیچ کی راہوں میں گم کرنے والے ہیں لیکن لوگوں کی اکثریت اپنی شامتِ اعمال سے اس حقیقت سے بے خبر ہے۔

يٰصَاحِبَيِ السِّجْنِ اَمَّآ اَحَدُكُمَا فَيَسْقِيْ رَبَّهٗ خَمْرًا ۚ وَاَمَّا الْاٰخَرُ فَيُصْلَبُ فَتَاْكُلُ الطَّيْرُ مِنْ رَّاْسِهٖ ؕ قُضِيَ الْاَمْرُ الَّذِيْ فِيْهِ تَسْتَفْتِيٰنِ (۴۱)

خوابوں کی تعبیر

حضرات انبیاء علیہم السلام کے دل و دماغ پر سب سے زیادہ حاوی اور غالب چونکہ اللہ کے دین کی دعوت ہی ہوتی ہے اس وجہ سے جب کبھی اور جہاں کہیں بھی اس کا موقع ان کو ہاتھ آ جاتا ہے وہ اس سے فائدہ اٹھا لیتے ہیں۔ حضرت یوسفؑ نے جب دیکھا کہ ان کے زندان کے ساتھی حسن ظن اور اعتماد کے ساتھ ان کی طرف متوجہ ہوئے ہیں تو پہلے تو انھوں نے ان کو خدا کی توحید کی دعوت پہنچائی اس کے بعد انھیں ان کے خوابوں کی تعبیر بھی بتا دی فرمایا کہ تم میں سے ایک، جس نے شراب نچوڑنے کا خواب دیکھا ہے، وہ تو قید سے رہائی پائے گا اور اپنے آقا کی ساقی گری کی خدمت انجام دے گا۔ رہا دوسرا، جس نے اپنے سر پر روٹیوں کے ٹوکرے سے چڑیوں کو نوچ نوچ کر کھاتے دیکھا، اس کو پھانسی ہو گی اور چڑیاں اس کے سر کو نوچ نوچ کر کھائیں گی۔ فرمایا کہ یہ ہے تمہارے ان خوابوں کی تعبیر جن کے باب میں تم نے مجھ سے سوال کیا تھا۔ میں نے اپنا وعدہ پورا کر دیا۔

وَقَالَ لِلَّذِيْ ظَنَّ اَنَّهٗ نَاجٍ مِّنْهُمَا اذْكُرْنِيْ عِنْدَ رَبِّكَ ۫ فَاَنْسٰىهُ الشَّيْطٰنُ ذِكْرَ رَبِّهٖ فَلَبِثَ فِي السِّجْنِ بِضْعَ سِنِيْنَ (۴۲)

جائز مقصد کے لیے جائز تدبیر

وَقَالَ لِلَّذِيْ ظَنَّ اَنَّهٗ نَاجٍ مِّنْهُمَا اذْكُرْنِيْ عِنْدَ رَبِّكَ ۔ ان دونوں میں سے ایک سے، جس کی نسبت حضرت یوسفؑ کو اس کے خواب کی بنا پر گمان تھا کہ وہ جیل سے چھوٹ جائے گا، حضرت نے یہ خواہش کی کہ اگر کوئی مناسب موقع پیدا ہو تو اپنے آقا سے میرا ذکر کرنا۔ آقا سے مراد یہاں بادشاہ ہے اس لیے کہ وہ، جیسا کہ اوپر گزرا، بادشاہ کا ساقی تھا۔ ذکر سے مراد ظاہر ہے کہ ان ہی باتوں کا ذکر ہے جو جیل کی اس معیت کے دوران میں اس کے اپنے علم و مشاہدہ

میں آئی تھیں۔ خاص طور پر خواب کی تعبیر کے معاملے کا ذکر جو ایک اہم واقعہ بھی تھا اور بادشاہوں کے دربار میں اس طرح کے معاملات آئے دن پیش آتے بھی رہتے ہیں۔ حضرت یوسفؑ نے اس خواہش کا اظہار اس توقع کی بنا پر کیا ہو گا کہ جہاں دادفریاد اور عدل وانصاف کے سارے دروازے بند ہیں، شاید اسی راہ سے اس مظلومانہ قید سے چھوٹنے کی کوئی شکل پیدا ہو۔ کسی جائز مقصد کے لیے جائز تدابیر و وسائل کا اختیار کرنا توکل اور اعتماد علی اللہ کے منافی نہیں ہے۔ توکل کے منافی یہ ہے کہ آدمی حالات سے دل شکستہ ہو کر ناجائز تدابیر کے اختیار کرنے پر اتر آئے۔ اللہ تعالیٰ کے نزدیک مقبول بندہ وہ نہیں ہے جو توکل کے نام پر ہاتھ پاؤں توڑ کر بیٹھ رہے بلکہ وہ ہے جو کارزارِ حیات میں اترے، وسائل و تدابیر سے کام لے، اسباب و ذرائع کو استعمال کرے لیکن ہر گام پر خدا کے حدود و قیود کا احترام پورا پورا ملحوظ رکھے۔ یہی وہ اصلی امتحان ہے جس کے لیے خدا نے خلق کو پیدا کیا ہے اور جو اس دنیا کے وجود کی غایت ہے۔

تقدیر الٰہی کا فیصلہ

’فَاَنْسٰىهُ الشَّيْطٰنُ ذِكْرَ رَبِّهٖ فَلَبِثَ فِي السِّجْنِ بِضْعَ سِنِيْنَ‘۔ ’ذِكْرَ رَبِّهٖ‘ میں اضافت کی نوعیت وہی ہے جو ’مَكْرُ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ‘ وغیرہ میں ہے۔ یعنی جیل سے چھوٹنے والا غلام اپنے آقا یعنی بادشاہ کے سامنے حضرت یوسفؑ کا ذکر کرنا بھول گیا۔ اس بھول جانے کو شیطان کی طرف منسوب فرمایا ہے اس لیے کہ کسی نیکی کے کام سے غافل کرنا شیطان ہی کا کام ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ تدابیر و وسائل کو اختیار کرنا تو انسان کے فرائض میں سے ہے لیکن ان تدابیر و وسائل کا بروئے کار آنا اللہ تعالیٰ کی تقدیر اور اس کی حکمت پر منحصر ہے۔ اللہ تعالیٰ کی حکمت و مصلحت کا تقاضا یہ تھا کہ ابھی حضرت یوسفؑ کچھ سال اور جیل ہی میں گزاریں۔ چنانچہ یہ بات یوں پوری ہو گئی کہ حضرت یوسفؑ کا جیل سے چھوٹنے والا ساتھی جیل سے باہر آ کر بالکل یاد نہ رکھ سکا کہ زندان کے ساتھی نے اس سے کیا بات کہی۔

وَقَالَ الْمَلِكُ اِنِّيْٓ اَرٰى سَبْعَ بَقَرٰتٍ سِمَانٍ يَّاْكُلُهُنَّ سَبْعٌ عِجَافٌ وَّسَبْعَ سُنْۢبُلٰتٍ خُضْرٍ وَّاُخَرَ يٰبِسٰتٍ ۭ

يٰٓاَيُّهَا الْمَلَاُ اَفْتُوْنِيْ فِيْ رُءْيَايَ اِنْ كُنْتُمْ لِلرُّءْيَا تَعْبُرُوْنَ (۴۳)

بادشاہ کا خواب

جب اللہ تعالیٰ کسی بات کو چاہتا ہے تو خواہ وہ کتنی بعید از قیاس ہو اس کے اسباب خود بخود پیدا ہونے شروع ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ اس دوران میں خود بادشاہ نے ایک خواب دیکھا کہ سات فربہ گائیں ہیں، سات دبلی، اور یہ دبلی گائیں فربہ گایوں کو نگلے جا رہی ہیں۔ اسی طرح سات سبز بالیاں ہیں اور دوسری سات خشک اور یہ سات خشک بالیاں ساتوں سبز بالیوں کو کھا رہی ہیں۔ بادشاہ کو یہ خواب بڑی اہمیت رکھنے والا محسوس ہوا چنانچہ اس نے اپنے درباریوں کو یہ خواب سنایا اور ان سے کہا کہ اگر آپ لوگ خوابوں کی تعبیر کرتے ہیں تو ذرا میرے اس خواب کی تعبیر بتلائیے۔ بادشاہ کے اس آخری فقرے سے یہ بات مترشح ہوتی ہے کہ اس کی نظر میں اس خواب کی بڑی اہمیت تھی اور وہ یہ بھی محسوس کر رہا تھا کہ اس کی تعبیر بتانا ان لال بجھکڑوں کے لیے کچھ آسان نہیں ہے۔

آیت میں ’وَاُخَرَ يٰبِسٰتٍ‘ کے بعد ’یاکلن‘ کا لفظ محذوف ہے۔ قرینہ کی موجودگی کے سبب سے اس کو حذف کر دیا گیا ہے۔ آگے آیت ۴۸ میں اس کی وضاحت ہو گئی ہے۔ ہم نے ترجمہ میں اس کو کھول دیا ہے۔

قَالُوْٓا اَضْغَاثُ اَحْلَامٍ ۚ وَمَا نَحْنُ بِتَاْوِيْلِ الْاَحْلَامِ بِعٰلِمِيْنَ (۴۴)

درباریوں کا جواب

'ضغث' خس و خاشاک کے گٹھے کو کہتے ہیں۔ اسی کی جمع 'اضغاث' ہے جو بے حقیقت باتوں اور خبروں کے مجموعہ کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔ پھر اسی سے 'اَضْغَاثُ اَحْلَامٍ' کی ترکیب پیدا ہو گئی جس سے مراد وہ خواب پریشان ہوتے ہیں، جو بدہضمی یا تبخیر معدی یا کسی اور باعث سے نظر آجاتے ہیں، ان کے اندر کوئی تعبیر نہیں ہوتی۔

دربار کے معبّروں نے یہ فقرہ کہہ کر اول تو بادشاہ کی پریشانی دور کرنے کی کوشش کی کہ جہاں پناہ اس خواب کی زیادہ فکر نہ کریں، یہ خواب پریشان کی نوعیت کی چیز ہے، اس طرح کے خوابوں کے اندر کوئی تعبیر نہیں ہوتی اور ساتھ ہی اپنا بھرم بھی قائم رکھنے کی کوشش کی کہ ہمارا کام بامعنی خوابوں کی تعبیر بتانا ہے نہ کہ خواب ہائے پریشان کی۔

وَقَالَ الَّذِيْ نَجَا مِنْهُمَا وَادَّكَرَ بَعْدَ اُمَّةٍ اَنَا اُنَبِّئُكُمْ بِتَاْوِيْلِهٖ فَاَرْسِلُوْنِ (۴۵)

'اِذَّكَر' 'اِدَّكَر' اور 'اِذْدَكَر' تینوں ایک ہی معنی میں استعمال ہوتے ہیں اور 'اُمَّۃ' یہاں زمانہ اور مدت کے معنی میں ہے۔

شاہی ساقی کی پیشکش

اس خواب کی تعبیر سے درباری معبّروں کی بے بسی نے شاہی ساقی کو، جو جیل سے چھوٹا تھا، ایک مدت کے بعد، اپنے خواب کا قصہ یاد دلایا جس کی تعبیر حضرت یوسفؑ نے بتائی تھی اور جو بالکل صحیح نکلی تھی۔ اس نے فوراً آگے بڑھ کر عرض کی کہ اس خواب کی تعبیر آپ لوگوں کو میں بتاؤں گا، تو مجھے اس سے ملنے کے لیے جانے دیں جس سے اس مقصد کے لیے میں ملنا چاہتا ہوں۔

يُوْسُفُ اَيُّهَا الصِّدِّيْقُ اَفْتِنَا فِيْ سَبْعِ بَقَرٰتٍ سِمَانٍ يَّاْكُلُهُنَّ سَبْعٌ عِجَافٌ وَّسَبْعِ سُنْۢبُلٰتٍ خُضْرٍ وَّاُخَرَ يٰبِسٰتٍ ۙ لَّعَلِّيْٓ اَرْجِعُ اِلَى النَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَعْلَمُوْنَ (۴۶)

حضرت یوسفؑ سے ساقی کی درخواست

یہاں اتنی بات قرینہ کی موجودگی کے سبب سے حذف کر دی گئی کہ بالآخر درباریوں نے ساقی کو حضرت یوسفؑ کے پاس جانے کی اجازت دے دی اور وہ جیل خانہ میں ان کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔ اس نے جاتے ہی حضرت یوسفؑ کو 'اَيُّهَا الصِّدِّيْقُ' سے خطاب کیا جس کے معنی ہیں اے راست باز، اے پیکر صداقت، اے صدق مجسم، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ مجرد اپنے خواب کی تعبیر کی بنا پر حضرت یوسفؑ کا معتقد نہیں ہو گیا تھا بلکہ ایک مدت تک جیل میں ان کی زندگی کی پاکبازی اور صداقت کا اس کو جو تجربہ ہوا تھا اس نے ان کا گرویدہ بنا دیا تھا۔ چنانچہ اس نے ان کو، اے خوابوں کی تعبیر بتانے والا، سے خطاب کرنے کی بجائے 'اے مرد راست باز' سے خطاب کیا جو تمام اوصاف حسنہ سے متصف ہونے کی ایک جامع اور کامل تعبیر ہے۔

اس خطاب کے بعد اس نے خواب کا ذکر کیا کہ سات دبلی گائیں ہیں جو سات فربہ گایوں کو نگل رہی ہیں اور سات خشک بالیاں ہیں جو سات سرسبز بالیوں کو کھا رہی ہیں۔ خواب کی تعبیر پوچھنے کے ساتھ ساتھ اس نے اشارۃً اس بات کا بھی ذکر کر دیا کہ باہر لوگ اس خواب کی تعبیر کے باب میں پریشان ہیں اس وجہ سے آپ مجھے جتنی جلدی ممکن ہو اس خواب کی تعبیر بتائیے تاکہ میں باہر جا کر لوگوں کو بتا سکوں اور انھیں اطمینان ہو۔ 'لَعَلَّهُمْ يَعْلَمُوْنَ' میں ایک نہایت لطیف اشارہ اس بات کی طرف بھی ہے کہ لوگ تو یوں ہی اٹکل کے تیر تکے چلا رہے ہیں البتہ آپ جو

بات بتائیں گے وہ صحیح علم پر مبنی ہوگی اور اس سے لوگوں کو رہنمائی حاصل ہوگی۔

قَالَ تَزْرَعُوْنَ سَبْعَ سِنِيْنَ دَاَبًا ۚ فَمَا حَصَدْتُّمْ فَذَرُوْهُ فِيْ سُنْۢبُلِهٖٓ اِلَّا قَلِيْلًا مِّمَّا تَاْكُلُوْنَ ۝ ثُمَّ يَاْتِيْ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ سَبْعٌ شِدَادٌ يَّاْكُلْنَ مَا قَدَّمْتُمْ لَهُنَّ اِلَّا قَلِيْلًا مِّمَّا تُحْصِنُوْنَ ۝ ثُمَّ يَاْتِيْ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ عَامٌ فِيْهِ يُغَاثُ النَّاسُ وَفِيْهِ يَعْصِرُوْنَ (۴۷-۴۹)

'تَزْرَعُوْنَ' ہے تو خبر کے اسلوب میں لیکن ہے یہ امر کے مفہوم میں۔ ہم دوسرے مقام میں یہ بتا چکے ہیں کہ جب موقع دمحل رہنمائی، مشورہ اور ہدایت دینے کا ہو تو ایسے مواقع میں امر کی بجائے خبر کا اسلوب ہی موزوں رہتا ہے۔ قرآن میں اس کی نظیریں بہت ہیں۔

خواب کی تعبیر

یہ حضرت یوسفؑ نے خواب کی تعبیر بھی بتا دی اور ساتھ ہی اس سات سالہ ہولناک قحط کے مقابلہ کی تدبیر کی طرف بھی رہنمائی فرما دی جس کی اس خواب نے خبر دی تھی۔ آپ نے فرمایا کہ سات سال مسلسل کاشت کرتے جاؤ تو جو فصل کاٹو اس میں سے غذائی ضرورت کے بقدر الگ کر کے صاف کر لو بقیہ سارا غلہ اس کی بالیوں میں چھوڑتے جاؤ تاکہ وہ محفوظ رہے۔ یہ بات یہاں ذہن میں رکھنے کی ہے کہ دانے جب تک بھس اور بالیوں کے اندر رہتے ہیں دیمک، سرسری اور کیڑوں مکوڑوں کی آفت سے بچے رہتے ہیں۔

اس کے بعد خواب کے دوسرے حصے کی تعبیر یہ بتائی کہ سات سال متواتر نہایت سخت قحط کے آئیں گے جو اس سارے ذخیرے کو چٹ کر جائیں گے جو تم قحط کے مقابلے کے لیے جمع کرو گے۔ اس محفوظ ذخیرے میں سے بہت تھوڑا حصہ تم بچا پاؤ گے۔ ساتھ ہی یہ خوشخبری بھی سنا دی کہ اس کے بعد ایک ایسا سال آئے گا جس میں لوگوں کی فریاد رسی ہوگی یعنی لوگوں کی چیخ و پکار اور دعا و فریاد کی خدا کے ہاں شنوائی ہوگی، اس کا ابر کرم برسے گا، انگوروں کی فصل خوب بارآور ہوگی اور لوگ خوب انگور نچوڑیں گے۔

'یُغَاثُ' کا مطلب بعض لوگوں نے بارش بھی لیا ہے لیکن میرے نزدیک بارش اس کا لغوی مفہوم نہیں ہے البتہ اس کے لازم معنی کی حیثیت سے اس کو اس کے مفہوم میں شامل کیا جا سکتا ہے۔ لفظ کو اس کے لغوی مفہوم میں لینے کا ایک کھلا ہوا فائدہ یہ ہے کہ اس کے ہمہ گیر اثر کی پوری تصویر سامنے آجاتی ہے کہ سارے ہی لوگ اس کے اثر سے چیخ اٹھیں گے اور ہر شخص اپنے رب کے آگے روئے اور گڑگڑائے گا۔ یہ بات یہاں یاد رکھنے کی ہے کہ جب حقیقی معنوں میں کوئی سخت وقت آپڑتا تو، جیسا کہ قرآن میں تصریح ہے، کٹر سے کٹر کافر و مشرک بھی اکیلے خدا ہی کو پکارتے ہیں، اپنے دوسرے فرضی دیویوں اور دیوتاؤں کو بھول جاتے ہیں۔ پھر یہ زمانہ قحط تو، جیسا کہ آگے تفصیل آئے گی، پورا کا پورا اہل مصر نے حضرت یوسفؑ کی رہنمائی میں گزارا ہے جس میں بادشاہ سے لے کر عوام تک سب ان کے گرویدہ، تابع فرمان اور معتقد رہے ہیں۔

'یَعْصِرُوْنَ' کے لفظ سے بھی مقصود اس کے لازم کی طرف اشارہ کرنا ہے۔ یعنی خوب بارش ہوگی۔ انگور کی بیلیں خوب پھلیں پھولیں گی، لوگ خوب انگور نچوڑیں گے۔ ساتھ ہی اس میں ایک لطیف تلمیح بھی پیدا ہو گئی ہے۔ وہ یہ کہ پوچھنے والا، جیسا کہ اوپر گزرا ہے، بادشاہ کا خاص ساقی تھا۔ اس مناسبت سے 'یَعْصِرُوْنَ' کے لفظ نے کلام میں

ایک خاص لطف پیدا کر دیا ہے جو اہل ذوق سے مخفی نہیں ہے۔

وَقَالَ الْمَلِكُ ائْتُونِي بِهِ ۚ فَلَمَّا جَاءَهُ الرَّسُولُ قَالَ ارْجِعْ إِلَىٰ رَبِّكَ فَاسْأَلْهُ مَا بَالُ النِّسْوَةِ اللَّاتِي قَطَّعْنَ أَيْدِيَهُنَّ ۚ إِنَّ رَبِّي بِكَيْدِهِنَّ عَلِيمٌ (۵۰)

حضرت یوسفؑ کو بادشاہ کی دعوت اور ان کا جواب

یہاں بھی سرگزشت کا اتنا حصہ محذوف ہے جتنا سیاقِ کلام سے خود واضح تھا یعنی بادشاہ کے قاصد نے حضرت یوسفؑ کی بیان کردہ تعبیر بادشاہ کو جا کر سنائی۔ بادشاہ اپنے خواب کی تعبیر سن کر اتنا متاثر ہوا کہ اس نے فوراً حکم دیا کہ اس قیدی کو میرے پاس لاؤ۔ قاصد پھر حضرت یوسفؑ کے پاس گیا اور خوش خوش ان کو مژدہ سنایا کہ بادشاہ نے آپ کو یاد فرمایا ہے۔ قاصد کو تو یہ توقع رہی ہوگی کہ ایک قیدی، جو برسوں سے، جیل کی شقتیں جھیل رہا ہے، اپنی رہائی کا یہ مژدہ سن کر پھولا نہ سمائے گا اور فوراً اس کے ساتھ ہو لے گا لیکن حضرت یوسفؑ نے اس کی توقع کے بالکل خلاف اس کو یہ جواب دیا کہ تم اپنے آقا (بادشاہ) کے پاس جاؤ اور ان سے کہو کہ ان عورتوں کا کیا قصہ ہے جنھوں نے اپنے ہاتھ زخمی کر لیے تھے، مطلب یہ ہے کہ اس واقعہ کی تحقیق ہونی چاہیے، جس کو بہانہ بنا کر مجھے جیل بھیجا گیا تھا۔ یوں میرا رب تو ان کی سازش سے اچھی طرح واقف ہی ہے اور میرے اعتماد کے لیے اس کا واقف ہونا ہی کافی ہے لیکن میں چاہتا ہوں کہ میری رہائی سے پہلے اس واقعہ کی تحقیق ہو جائے تاکہ بعد میں اس کے سبب سے کسی کو میرے خلاف لب کشائی کی جرأت نہ ہو سکے۔ حضرت یوسفؑ کے اس ارشاد کی تہ میں اتر کر غور کیجیے تو یہ حقیقت واضح ہوگی کہ انھوں نے مجرد بادشاہ کے وقتی حسنِ ظن سے فائدہ اٹھا کر اپنی رہائی اور بادشاہ کے تقرب کو پسند نہیں فرمایا بلکہ سب سے زیادہ اہمیت الزام سے برأت کو دی اور اپنی سچائی اور اپنے رب پر انھیں اس درجہ اعتماد تھا کہ اس بات کی ذرا پروا نہ ہوئی کہ فریقِ ثانی انھیں ملزم بنانے کے لیے کیا دروغ بافیاں کر سکتا ہے۔

قَالَ مَا خَطْبُكُنَّ إِذْ رَاوَدتُّنَّ يُوسُفَ عَن نَّفْسِهِ ۚ قُلْنَ حَاشَ لِلَّهِ مَا عَلِمْنَا عَلَيْهِ مِن سُوءٍ ۚ قَالَتِ امْرَأَتُ الْعَزِيزِ الْآنَ حَصْحَصَ الْحَقُّ أَنَا رَاوَدتُّهُ عَن نَّفْسِهِ وَإِنَّهُ لَمِنَ الصَّادِقِينَ (۵۱)

عورتوں کے واقعہ کی تحقیق

یہاں بھی قرینہ کی وضاحت کی بنا پر اتنا حصہ محذوف ہے کہ قاصد نے حضرت یوسفؑ کی بات بادشاہ کو پہنچا دی۔ چنانچہ بادشاہ نے ان عورتوں کو بلوایا اور ان سے پوچھا کہ تمہارا کیا ماجرا ہے جب کہ تم نے یوسفؑ کو پھسلانے کی کوشش کی؟ بادشاہ کے سوال کے الفاظ سے یہ بات بالکل واضح ہے کہ کم از کم اس مرحلے میں اس پر یہ حقیقت بالکل واضح ہو چکی تھی کہ یہ سارا جال فریب ان عورتوں ہی کا تھا، یوسفؑ اس معاملے میں بالکل بے قصور تھے۔ اگر بادشاہ پر یہ حقیقت واضح نہ ہوتی تو سوال کا انداز اس سے مختلف ہوتا۔ یعنی وہ یوں پوچھتا کہ یہ کیا واقعہ ہے جو یوسفؑ کے ساتھ تمہیں پیش آیا؟ اصل یہ ہے کہ سچائی اپنے ظہور کے لیے صبر کا مطالبہ کرتی ہے۔ اگر کوئی اللہ کا بندہ اس کو اختیار کر لے اور جو صبر اس کے لیے مطلوب ہے اس کا حق ادا کر دے تو وہ وقت لازماً آتا ہے جب اس کی صداقت کی صدائے بازگشت در و دیوار سے سنائی دیتی ہے۔ یہاں تک کہ دشمن بھی جیسا کہ آپ دیکھیں گے، اس کی گواہی دیتے ہیں۔

قُلْنَ حَاشَ لِلّٰهِ مَا عَلِمْنَا عَلَيْهِ مِن سُوٓءٍ۔ حاشا' اور 'حاش' استثنا اور تنزیہ کے کلمے ہیں جو اس وقت بولے جاتے ہیں جب کسی کو کسی الزام یا تہمت سے بری ثابت کرنا ہو۔

عورتوں کا اعتراف حق

ہم اوپر اشارہ کر چکے ہیں کہ حضرت یوسفؑ کے عظیم صبر نے حالات کا رخ اس طرح بدل دیا تھا کہ کسی کے لیے بھی یہ ممکن نہیں رہ گیا تھا کہ وہ ان کے خلاف کچھ کہہ سکے۔ چنانچہ ان عورتوں نے بھی نہایت کھلے دل سے اعتراف کیا کہ ہم نے اچھی طرح ٹٹول کر دیکھا لیکن ان پر برائی کا کوئی نقش نہیں پایا اور خود عزیز کی بیوی، جس نے یہ سارا فتنہ اٹھایا تھا، اعتراف حق میں ان عورتوں سے بھی آگے نکل گئی۔ اس نے کہا، اب تو حق پوری طرح آشکارا ہو ہی گیا، اب چھپانے سے کیا حاصل، اصل یہ ہے کہ میں نے ہی ان پر ڈورے ڈالنے کی کوشش کی لیکن یہ بالکل محفوظ رہے اور بلاشبہ یہ راست بازوں میں سے ہیں۔

ذٰلِكَ لِيَعْلَمَ اَنِّيْ لَمْ اَخُنْهُ بِالْغَيْبِ وَاَنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ كَيْدَ الْخَآئِنِيْنَ ۝ وَمَآ اُبَرِّئُ نَفْسِيْ ۚ اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌۢ بِالسُّوْٓءِ اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّيْ ۚ اِنَّ رَبِّيْ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (۵۲-۵۳)

تحقیقات کے مطالبہ کی وجہ

اپنا دامن بے داغ ثابت ہو جانے کے بعد یہ حضرت یوسفؑ نے اس بات کی وجہ بھی بتا دی کہ انھوں نے اس قضیہ کو از سر نو چھیڑنا کیوں ضروری سمجھا جب کہ بادشاہ اس معاملے کو زیر بحث لائے بغیر ان کو رہا کر رہا تھا۔ فرمایا کہ ایسا میں نے اس لیے کیا کہ بادشاہ پر یہ حقیقت اچھی طرح واضح ہو جائے کہ مجھے بالکل بے گناہ جیل میں ڈالا گیا تھا۔ میں نے عزیز کے ساتھ اس کی پیٹھ پیچھے کوئی بے وفائی نہیں کی تھی اور یہ حقیقت بھی اچھی طرح واضح ہو جائے کہ اللہ تعالیٰ خائنوں اور بے وفاؤں کی چال کو کامیاب و بامراد نہیں کرتا بلکہ بالآخر وہ نامراد ہوتے ہیں اور جو لوگ سچائی اور وفاداری پر استوار رہتے ہیں وہی سرخرو اور بامراد ہوتے ہیں۔

ہمارے نزدیک 'لِيَعْلَمَ' کی ضمیر کا مرجع بادشاہ ہے جس کا ذکر اوپر کی آیات میں نہایت واضح الفاظ میں ہوا ہے اور 'اَخُنْهُ' کی ضمیر کا مرجع عزیز ہے جس کے لیے واضح قرینہ موجود ہے۔ اگر قرائن موجود ہوں تو ضمیروں میں اس قسم کا انتشار کوئی عیب نہیں ہے۔

اس کے بعد حضرت یوسفؑ نے یہ حقیقت بھی واضح فرما دی کہ کوئی میرے اس رویہ سے اس غلط فہمی میں مبتلا نہ ہو کہ اپنے نفس کو میں گناہوں سے بالاتر سمجھتا ہوں۔ نفس میرے ساتھ بھی ہے اور وہ برائی کے لیے وسوسہ اندازیاں بھی کرتا رہتا ہے۔ اس کے فتنوں سے محفوظ تو آدمی اسی وقت تک رہتا ہے جب تک خدا کی رحمت اور اس کا فضل شامل حال رہے۔ سو میں اگر فتنوں سے محفوظ رہا تو اس وجہ سے نہیں کہ میں اپنے اندر نفس نہیں رکھتا تھا بلکہ صرف اس وجہ سے محفوظ رہا کہ میرے رب کی رحمت و عنایت نے میری دستگیری فرمائی۔ میرا رب بخشنے والا اور مہربان ہے۔ 'اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّيْ' میں 'ما'، ہمارے نزدیک ظرفیہ ہے۔

ایک سنت الٰہی

یہاں یہ سنت الٰہی یاد رکھیے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو نیکی اور بدی الہام فرما کر اس کو اختیار دیا ہے کہ وہ بدی کی راہ اختیار کرے یا نیکی کی۔ اگر وہ نیکی کی راہ اختیار کرتا ہے اور اس راہ میں پیش آنے والی آزمائشوں کا پامردی

سے مقابلہ کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی طرف رحمت و عنایت سے متوجہ ہوتا ہے اور اس کی راہ کو آسان کر دیتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ منزلِ مقصود پر پہنچ جاتا ہے اور اگر کوئی شخص نیکی کی راہ چھوڑ کر بدی کی راہ اختیار کر لیتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو اسی راہ میں بڑھنے کے لیے ڈھیل دے دیتا ہے۔ حضرت یوسفؑ نے نفس کے اعلیٰ داعیات کو اختیار فرمایا اور اس راہ کی تمام مزاحمتوں کا پوری پامردی کے ساتھ مقابلہ کیا۔ یہاں تک کہ نفس کے سفلی داعیات ان کے آگے سپر انداز ہو گئے اور اللہ تعالیٰ نے ان کو اس مرتبۂ بلند کی سرفرازی بخشی جو ان کے لیے مقدر تھا۔

۸۔ آگے کا مضمون ___ آیات ۵۴-۱۰۱

حضرت یوسفؑ کی زندگی کا نیا دور

اب آگے حضرت یوسفؑ کی زندگی کا نیا دور شروع ہوتا ہے۔ وہ نہ صرف جیل سے چھوٹتے ہیں بلکہ عملاً پورے مصر کی حکومت ان کے انگوٹھے کے نیچے آجاتی ہے۔ سات سالہ قحط کے مقابلہ کے لیے وہ حالات کو اس خوبی سے سنبھالتے ہیں کہ نہ صرف ملک کی غذائی ضروریات پوری کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں بلکہ پاس پڑوس کے ملکوں کی مشکلات حل کرنے میں بھی ان کی مدد کرتے ہیں۔ اپنے جن بھائیوں کی عنایت سے وہ عزیزِ مصر کی غلامی اور بالآخر جیل تک پہنچے تھے، اس دورِ اقتدار میں وہ بھی ان کی خدمت میں غلہ لینے کے لیے حاضر ہوتے ہیں اگرچہ انھیں یہ پتہ نہیں ہوتا کہ یہ ان کا وہی بھائی ہے جس کو انھوں نے ایک اندھے کنوئیں میں پھینکا تھا۔ ان کی اس بے خبری میں حضرت یوسفؑ بعض لطیف طریقوں سے ان کا امتحان بھی کرتے ہیں کہ اندازہ ہو سکے کہ وہ سب کچھ کر گزرنے کے بعد، جو انھوں نے ان کے ساتھ کیا، ان کے باطن میں تبدیلی ہوئی یا نہیں۔ بالآخر وہ وقت آتا ہے کہ ان پر یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ جس کے سامنے وہ سائلانہ حاضر ہیں یہ ان کا وہی بھائی ہے جس کو انھوں نے کنوئیں میں پھینکا تھا۔ اس کے بعد حضرت یوسفؑ اپنے تمام بھائیوں اور ماں باپ کو اپنے پاس بلواتے ہیں۔ وہ آتے ہیں تو حضرت یوسفؑ کے دربار میں ان کو سر جھکا کر تعظیم بجا لاتے ہیں اور اس طرح حضرت یوسفؑ کا وہ خواب سچا ثابت ہو جاتا ہے جو انھوں نے دیکھا تھا کہ گیارہ ستارے اور سورج اور چاند مجھے سجدہ کر رہے ہیں ___ آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۵۴-۱۰۱

وَقَالَ الْمَلِكُ ائْتُوْنِيْ بِهٖٓ اَسْتَخْلِصْهُ لِنَفْسِيْ ۚ فَلَمَّا كَلَّمَهٗ قَالَ
اِنَّكَ الْيَوْمَ لَدَيْنَا مَكِيْنٌ اَمِيْنٌ ﴿۵۴﴾ قَالَ اجْعَلْنِيْ عَلٰي خَزَاۗىِٕنِ
الْاَرْضِ ۚ اِنِّىْ حَفِيْظٌ عَلِيْمٌ ﴿۵۵﴾ وَكَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوْسُفَ فِي الْاَرْضِ ۚ
يَتَبَوَّاُ مِنْهَا حَيْثُ يَشَاۗءُ ۭ نُصِيْبُ بِرَحْمَتِنَا مَنْ نَّشَاۗءُ وَلَا نُضِيْعُ
اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۵۶﴾ وَلَاَجْرُ الْاٰخِرَةِ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا

يَتَّقُوْنَ ﴿٥٧﴾ ع وَجَآءَ اِخْوَةُ يُوْسُفَ فَدَخَلُوْا عَلَيْهِ فَعَرَفَهُمْ وَهُمْ ع ۸ ۱
لَهٗ مُنْكِرُوْنَ ﴿٥٨﴾ وَلَمَّا جَهَّزَهُمْ بِجَهَازِهِمْ قَالَ ائْتُوْنِيْ بِاَخٍ لَّكُمْ
مِّنْ اَبِيْكُمْ ۚ اَلَا تَرَوْنَ اَنِّيْٓ اُوْفِي الْكَيْلَ وَاَنَا خَيْرُ الْمُنْزِلِيْنَ ﴿٥٩﴾
فَاِنْ لَّمْ تَاْتُوْنِيْ بِهٖ فَلَا كَيْلَ لَكُمْ عِنْدِيْ وَلَا تَقْرَبُوْنِ ﴿٦٠﴾ قَالُوْا
سَنُرَاوِدُ عَنْهُ اَبَاهُ وَاِنَّا لَفٰعِلُوْنَ ﴿٦١﴾ وَقَالَ لِفِتْيٰنِهِ اجْعَلُوْا
بِضَاعَتَهُمْ فِيْ رِحَالِهِمْ لَعَلَّهُمْ يَعْرِفُوْنَهَآ اِذَا انْقَلَبُوْٓا اِلٰٓى اَهْلِهِمْ
لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ﴿٦٢﴾ فَلَمَّا رَجَعُوْٓا اِلٰٓى اَبِيْهِمْ قَالُوْا يٰٓاَبَانَا مُنِعَ
مِنَّا الْكَيْلُ فَاَرْسِلْ مَعَنَآ اَخَانَا نَكْتَلْ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ﴿٦٣﴾
قَالَ هَلْ اٰمَنُكُمْ عَلَيْهِ اِلَّا كَمَآ اَمِنْتُكُمْ عَلٰٓى اَخِيْهِ مِنْ قَبْلُ ۗ
فَاللّٰهُ خَيْرٌ حٰفِظًا ۪ وَّهُوَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ ﴿٦٤﴾ وَلَمَّا فَتَحُوْا مَتَاعَهُمْ
وَجَدُوْا بِضَاعَتَهُمْ رُدَّتْ اِلَيْهِمْ ۗ قَالُوْا يٰٓاَبَانَا مَا نَبْغِيْ ۗ هٰذِهٖ
بِضَاعَتُنَا رُدَّتْ اِلَيْنَا ۚ وَنَمِيْرُ اَهْلَنَا وَنَحْفَظُ اَخَانَا وَنَزْدَادُ كَيْلَ
بَعِيْرٍ ۗ ذٰلِكَ كَيْلٌ يَّسِيْرٌ ﴿٦٥﴾ قَالَ لَنْ اُرْسِلَهٗ مَعَكُمْ حَتّٰى تُؤْتُوْنِ
مَوْثِقًا مِّنَ اللّٰهِ لَتَاْتُنَّنِيْ بِهٖٓ اِلَّآ اَنْ يُّحَاطَ بِكُمْ ۚ فَلَمَّآ اٰتَوْهُ
مَوْثِقَهُمْ قَالَ اللّٰهُ عَلٰى مَا نَقُوْلُ وَكِيْلٌ ﴿٦٦﴾ وَقَالَ يٰبَنِيَّ لَا تَدْخُلُوْا
مِنْۢ بَابٍ وَّاحِدٍ وَّادْخُلُوْا مِنْ اَبْوَابٍ مُّتَفَرِّقَةٍ ۗ وَمَآ اُغْنِيْ عَنْكُمْ
مِّنَ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ ۗ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ۗ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ ۚ وَعَلَيْهِ
فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُوْنَ ﴿٦٧﴾ وَلَمَّا دَخَلُوْا مِنْ حَيْثُ اَمَرَهُمْ اَبُوْهُمْ ۭ مَا

كَانَ يُغْنِي عَنْهُم مِّنَ اللَّهِ مِن شَيْءٍ إِلَّا حَاجَةً فِي نَفْسِ يَعْقُوبَ
ع ۸ ۱۱ ۲ قَضَاهَا ۚ وَإِنَّهُ لَذُو عِلْمٍ لِّمَا عَلَّمْنَاهُ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ ﴿۶۸﴾
وَلَمَّا دَخَلُوا عَلَىٰ يُوسُفَ آوَىٰ إِلَيْهِ أَخَاهُ ۖ قَالَ إِنِّي أَنَا أَخُوكَ فَلَا
تَبْتَئِسْ بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿۶۹﴾ فَلَمَّا جَهَّزَهُم بِجَهَازِهِمْ جَعَلَ السِّقَايَةَ
فِي رَحْلِ أَخِيهِ ثُمَّ أَذَّنَ مُؤَذِّنٌ أَيَّتُهَا الْعِيرُ إِنَّكُمْ لَسَارِقُونَ ﴿۷۰﴾ قَالُوا
وَأَقْبَلُوا عَلَيْهِم مَّاذَا تَفْقِدُونَ ﴿۷۱﴾ قَالُوا نَفْقِدُ صُوَاعَ الْمَلِكِ وَلِمَن
جَاءَ بِهِ حِمْلُ بَعِيرٍ وَأَنَا بِهِ زَعِيمٌ ﴿۷۲﴾ قَالُوا تَاللَّهِ لَقَدْ عَلِمْتُم
مَّا جِئْنَا لِنُفْسِدَ فِي الْأَرْضِ وَمَا كُنَّا سَارِقِينَ ﴿۷۳﴾ قَالُوا فَمَا جَزَاؤُهُ
إِن كُنتُمْ كَاذِبِينَ ﴿۷۴﴾ قَالُوا جَزَاؤُهُ مَن وُجِدَ فِي رَحْلِهِ فَهُوَ جَزَاؤُهُ ۚ
كَذَٰلِكَ نَجْزِي الظَّالِمِينَ ﴿۷۵﴾ فَبَدَأَ بِأَوْعِيَتِهِمْ قَبْلَ وِعَاءِ أَخِيهِ
ثُمَّ اسْتَخْرَجَهَا مِن وِعَاءِ أَخِيهِ ۚ كَذَٰلِكَ كِدْنَا لِيُوسُفَ ۖ مَا كَانَ
لِيَأْخُذَ أَخَاهُ فِي دِينِ الْمَلِكِ إِلَّا أَن يَشَاءَ اللَّهُ ۚ نَرْفَعُ دَرَجَاتٍ مَّن نَّشَاءُ ۗ
وَفَوْقَ كُلِّ ذِي عِلْمٍ عَلِيمٌ ﴿۷۶﴾ قَالُوا إِن يَسْرِقْ فَقَدْ سَرَقَ أَخٌ لَّهُ
مِن قَبْلُ ۚ فَأَسَرَّهَا يُوسُفُ فِي نَفْسِهِ وَلَمْ يُبْدِهَا لَهُمْ ۚ قَالَ أَنتُمْ
شَرٌّ مَّكَانًا ۖ وَاللَّهُ أَعْلَمُ بِمَا تَصِفُونَ ﴿۷۷﴾ قَالُوا يَا أَيُّهَا الْعَزِيزُ إِنَّ لَهُ
أَبًا شَيْخًا كَبِيرًا فَخُذْ أَحَدَنَا مَكَانَهُ ۖ إِنَّا نَرَاكَ مِنَ الْمُحْسِنِينَ ﴿۷۸﴾
قَالَ مَعَاذَ اللَّهِ أَن نَّأْخُذَ إِلَّا مَن وَجَدْنَا مَتَاعَنَا عِندَهُ إِنَّا
ع ۹ ۱۱ ۳ إِذًا لَّظَالِمُونَ ﴿۷۹﴾ فَلَمَّا اسْتَيْأَسُوا مِنْهُ خَلَصُوا نَجِيًّا ۖ قَالَ كَبِيرُهُمْ أَلَمْ

تَعْلَمُوْٓا اَنَّ اَبَاكُمْ قَدْ اَخَذَ عَلَيْكُمْ مَّوْثِقًا مِّنَ اللّٰهِ وَمِنْ قَبْلُ مَا
فَرَّطْتُّمْ فِيْ يُوْسُفَ ۚ فَلَنْ اَبْرَحَ الْاَرْضَ حَتّٰى يَاْذَنَ لِيْٓ اَبِيْٓ اَوْ يَحْكُمَ
اللّٰهُ لِيْ ۚ وَهُوَ خَيْرُ الْحٰكِمِيْنَ ﴿۸۰﴾ اِرْجِعُوْٓا اِلٰٓى اَبِيْكُمْ فَقُوْلُوْا يٰٓاَبَانَآ اِنَّ
ابْنَكَ سَرَقَ ۚ وَمَا شَهِدْنَآ اِلَّا بِمَا عَلِمْنَا وَمَا كُنَّا لِلْغَيْبِ حٰفِظِيْنَ ﴿۸۱﴾
وَسْـَٔلِ الْقَرْيَةَ الَّتِيْ كُنَّا فِيْهَا وَالْعِيْرَ الَّتِيْٓ اَقْبَلْنَا فِيْهَا ۭ وَاِنَّا لَصٰدِقُوْنَ ﴿۸۲﴾
قَالَ بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ اَنْفُسُكُمْ اَمْرًا ۭ فَصَبْرٌ جَمِيْلٌ ۭ عَسَى اللّٰهُ اَنْ
يَّاْتِيَنِيْ بِهِمْ جَمِيْعًا ۭ اِنَّهٗ هُوَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ ﴿۸۳﴾ وَتَوَلّٰى عَنْهُمْ وَ
قَالَ يٰٓاَسَفٰى عَلٰي يُوْسُفَ وَابْيَضَّتْ عَيْنٰهُ مِنَ الْحُزْنِ فَهُوَ كَظِيْمٌ ﴿۸۴﴾
قَالُوْا تَاللّٰهِ تَفْتَؤُا تَذْكُرُ يُوْسُفَ حَتّٰى تَكُوْنَ حَرَضًا اَوْ تَكُوْنَ
مِنَ الْهٰلِكِيْنَ ﴿۸۵﴾ قَالَ اِنَّمَآ اَشْكُوْا بَثِّيْ وَحُزْنِيْٓ اِلَى اللّٰهِ وَاَعْلَمُ
مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۸۶﴾ يٰبَنِيَّ اذْهَبُوْا فَتَحَسَّسُوْا مِنْ يُّوْسُفَ وَ
اَخِيْهِ وَلَا تَايْـَٔسُوْا مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ ۭ اِنَّهٗ لَا يَايْـَٔسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِلَّا
الْقَوْمُ الْكٰفِرُوْنَ ﴿۸۷﴾ فَلَمَّا دَخَلُوْا عَلَيْهِ قَالُوْا يٰٓاَيُّهَا الْعَزِيْزُ مَسَّنَا
وَاَهْلَنَا الضُّرُّ وَجِئْنَا بِبِضَاعَةٍ مُّزْجٰىةٍ فَاَوْفِ لَنَا الْكَيْلَ وَتَصَدَّقْ
عَلَيْنَا ۭ اِنَّ اللّٰهَ يَجْزِي الْمُتَصَدِّقِيْنَ ﴿۸۸﴾ قَالَ هَلْ عَلِمْتُمْ مَّا فَعَلْتُمْ
بِيُوْسُفَ وَاَخِيْهِ اِذْ اَنْتُمْ جٰهِلُوْنَ ﴿۸۹﴾ قَالُوْٓا ءَاِنَّكَ لَاَنْتَ يُوْسُفُ ۭ
قَالَ اَنَا يُوْسُفُ وَهٰذَآ اَخِيْ ۡ قَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْنَا ۭ اِنَّهٗ مَنْ يَّتَّقِ وَ
يَصْبِرْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۹۰﴾ قَالُوْا تَاللّٰهِ لَقَدْ

اٰثَرَكَ اللّٰهُ عَلَيْنَا وَاِنْ كُنَّا لَخٰطِـِٕيْنَ ﴿۹۱﴾ قَالَ لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ ؕ
يَغْفِرُ اللّٰهُ لَكُمْ ۫ وَهُوَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ ﴿۹۲﴾ اِذْهَبُوْا بِقَمِيْصِيْ هٰذَا
ع ۱۰/۱۴/۴ فَاَلْقُوْهُ عَلٰى وَجْهِ اَبِيْ يَاْتِ بَصِيْرًا ۚ وَاْتُوْنِيْ بِاَهْلِكُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۹۳﴾
وَلَمَّا فَصَلَتِ الْعِيْرُ قَالَ اَبُوْهُمْ اِنِّيْ لَاَجِدُ رِيْحَ يُوْسُفَ لَوْلَاۤ اَنْ
الربع تُفَنِّدُوْنِ ﴿۹۴﴾ قَالُوْا تَاللّٰهِ اِنَّكَ لَفِيْ ضَلٰلِكَ الْقَدِيْمِ ﴿۹۵﴾ فَلَمَّاۤ اَنْ
جَآءَ الْبَشِيْرُ اَلْقٰىهُ عَلٰى وَجْهِهٖ فَارْتَدَّ بَصِيْرًا ۚ قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ ۚۙ
اِنِّيْۤ اَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۹۶﴾ قَالُوْا يٰۤاَبَانَا اسْتَغْفِرْ لَنَا
ذُنُوْبَنَاۤ اِنَّا كُنَّا خٰطِـِٕيْنَ ﴿۹۷﴾ قَالَ سَوْفَ اَسْتَغْفِرُ لَكُمْ رَبِّيْ ؕ اِنَّهٗ هُوَ
الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ﴿۹۸﴾ فَلَمَّا دَخَلُوْا عَلٰى يُوْسُفَ اٰوٰۤى اِلَيْهِ اَبَوَيْهِ
وَقَالَ ادْخُلُوْا مِصْرَ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ اٰمِنِيْنَ ؕ ﴿۹۹﴾ وَرَفَعَ اَبَوَيْهِ عَلَى
الْعَرْشِ وَخَرُّوْا لَهٗ سُجَّدًا ۚ وَقَالَ يٰۤاَبَتِ هٰذَا تَاْوِيْلُ رُءْيَايَ مِنْ
قَبْلُ ۫ قَدْ جَعَلَهَا رَبِّيْ حَقًّا ؕ وَقَدْ اَحْسَنَ بِيْۤ اِذْ اَخْرَجَنِيْ مِنَ السِّجْنِ
وَجَآءَ بِكُمْ مِّنَ الْبَدْوِ مِنْ بَعْدِ اَنْ نَّزَغَ الشَّيْطٰنُ بَيْنِيْ وَبَيْنَ اِخْوَتِيْ ؕ
اِنَّ رَبِّيْ لَطِيْفٌ لِّمَا يَشَآءُ ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ ﴿۱۰۰﴾ رَبِّ قَدْ اٰتَيْتَنِيْ
مِنَ الْمُلْكِ وَعَلَّمْتَنِيْ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ ۚ فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَ
الْاَرْضِ ۫ اَنْتَ وَلِيّٖ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۚ تَوَفَّنِيْ مُسْلِمًا وَّاَلْحِقْنِيْ
بِالصّٰلِحِيْنَ ﴿۱۰۱﴾

ترجمۂ آیات ۵۴-۱۰۱ اور بادشاہ نے کہا، اس کو میرے پاس لاؤ، میں اس کو اپنا معتمد خاص بناؤں گا۔ پھر جب

اس سے بات چیت کی تو کہا اب تم ہمارے ہاں با اقتدار اور معتمد ہوئے۔ اس نے کہا مجھے ملک کے ذرائع آمدنی پر مامور کیجیے، میں متدین بھی ہوں اور باخبر بھی۔ ۵۴-۵۵

اور اس طرح ہم نے یوسف کو ملک میں اقتدار بخشا وہ اس میں جہاں چاہے متمکن ہو۔ ہم اپنے فضل سے جس کو چاہتے ہیں نوازتے ہیں اور ہم خوب کاروں کے اجر کو ضائع نہیں کرتے اور آخرت کا اجر اس سے کہیں بڑھ کر ہے ان لوگوں کے لیے جو ایمان لائے اور تقویٰ پر قائم رہے۔ ۵۶-۵۷

اور یوسف کے بھائی آئے اور اس سے ملے۔ اس نے تو ان کو پہچان لیا پر وہ اس سے ناآشنا ہی رہے۔ اور جب اس نے ان کا سامان تیار کر دیا کہا کہ اب کے اپنے سوتیلے بھائی کو بھی میرے پاس لائیو۔ دیکھتے ہو نا کہ میں غلہ بھی پورے پیمانہ سے دیتا ہوں اور بہترین میزبانی کرنے والا بھی ہوں۔ اور اگر تم اس کو میرے پاس نہیں لاؤ گے تو نہ تمھارے لیے میرے پاس غلہ ہے اور نہ تم میرے پاس پھٹکنا۔ انھوں نے کہا ہم اس کے بارے میں اس کے باپ کو راضی کرنے کی کوشش کریں گے اور ہم یہ ضرور کریں گے۔ ۵۸-۶۱

اور اس نے اپنے نوجوانوں کو حکم دیا کہ ان کا دیا ہوا مال ان کے کجاووں ہی میں ڈال دو کہ جب وہ اپنے اہل و عیال میں پہنچیں اس کو پہچانیں تاکہ وہ پھر آئیں۔ تو جب وہ اپنے باپ کے پاس لوٹے انھوں نے کہا کہ ابا جان! ہم آگے کو غلہ سے محروم کر دیے گئے ہیں تو ہمارے ساتھ ہمارے بھائی کو بھی جانے دیجیے کہ ہم غلہ لائیں اور ہم اس کی حفاظت کا عہد کرتے ہیں۔ اس نے کہا کہ اس کے معاملے میں تم پر میرا اعتماد نہیں ہوگا مگر ویسا ہی جیسا کہ میں نے اس سے پہلے اس کے بھائی کے معاملے میں تم پر کیا۔ تو اللہ بہترین محافظ اور وہ سب سے بڑھ کر رحم فرمانے والا ہے۔ ۶۲-۶۴

اور جب انھوں نے اپنا سامان کھولا تو دیکھا کہ ان کی پونجی بھی ان کو لوٹا دی گئی ہے۔ بولے ابا جان! اب ہمیں کیا چاہیے، یہ ہماری پونجی بھی ہمیں لوٹا دی گئی ہے، اب ہم جائیں گے، اپنے اہل و عیال کے لیے رسد لائیں گے، اپنے بھائی کی حفاظت کریں گے، ایک بارِ شتر غلہ زیادہ حاصل کریں گے! یہ غلہ تو تھوڑا ہے۔ اس نے جواب دیا کہ میں اس کو تمھارے ساتھ ہرگز نہ بھیجوں گا جب تک تم مجھ سے خدا کے نام پر یہ عہد نہ کرو کہ تم اس کو میرے پاس ضرور واپس لاؤ گے الا آنکہ تم کہیں گھر ہی جاؤ۔ تو جب انھوں نے اس کو اپنا پکا قول دے دیا اس نے کہا جو قول و قرار ہم کر رہے ہیں اللہ اس پر نگہبان ہے۔ ۶۵-۶۶

اور اس نے ہدایت کی کہ اے میرے بیٹو، تم سب ایک ہی دروازے سے نہ داخل ہونا، الگ الگ مختلف دروازوں سے داخل ہونا۔ اور میں اللہ کے مقابل میں تمھارے کچھ کام نہیں آسکتا اختیار تو بس اللہ ہی کا ہے۔ میرا بھروسا اسی پر ہے اور بھروسہ کرنے والوں کو اسی پر بھروسہ کرنا چاہیے۔ اور جب وہ داخل ہوئے جہاں سے ان کے باپ نے ان کو ہدایت کی تھی تو وہ اللہ کے مقابل میں ان کے کچھ کام آنے والا نہ تھا۔ بس یعقوب کے دل میں ایک خیال تھا جو اس نے پورا کر لیا اور وہ بے شک اس علم سے بہرہ ور تھا جو ہم نے اس کو سکھایا تھا لیکن اکثر لوگ علم نہیں رکھتے۔ ۶۷-۶۸

اور جب یہ لوگ یوسف کے پاس پہنچے اس نے اپنے بھائی کو خاص اپنے پاس جگہ دی۔ بتایا کہ میں تو تمھارا بھائی ہوں تو جو کچھ یہ کرتے رہے ہیں اس سے آزردہ خاطر نہ ہوجیو۔ پس جب ان کا سامان تیار کرا دیا کٹورا اپنے بھائی کے کجاوے میں رکھوا دیا۔ پھر ایک منادی نے آواز دی کہ اے قافلہ والو تم لوگ چور ہو۔ انھوں نے ان کی طرف مڑ کر پوچھا، تمھاری کیا چیز کھوئی گئی ہے؟ انھوں نے کہا ہم

شاہی پیمانہ نہیں پا رہے ہیں۔ اور جو اس کو لائے گا اس کے لیے ایک بار شتر غلہ ہے اور میں اس کا ضامن ہوں انھوں نے کہا: خدا کی قسم! آپ لوگ جانتے ہیں کہ ہم اس ملک میں اس لیے نہیں آئے کہ فساد برپا کریں اور ہم چوری کرنے والے لوگوں میں سے نہیں ہیں۔ انھوں نے کہا کہ اگر تم جھوٹے ثابت ہوئے تو اس چوری کرنے والے کی کیا سزا ہے؟ وہ بولے اس کی سزا؛ جس کے کجاوے میں چیز ملے وہ اس کی سزا میں دھر لیا جائے۔ ہم ایسے ظالموں کو اسی طرح سزا دیا کرتے ہیں۔ پس اپنے بھائی کے تھیلے سے پہلے ان کے تھیلوں سے تفتیش کا آغاز کیا، پھر اس کو اپنے بھائی کے تھیلے سے برآمد کر لیا۔ اس طرح ہم نے یوسف کے لیے تدبیر کی۔ وہ بادشاہ کے قانون کی رُو سے اپنے بھائی کو پکڑنے کا مجاز نہ تھا مگر یہ کہ اللہ چاہے۔ ہم جس کو چاہتے ہیں درجے پر درجے بلند کرتے ہیں اور ہر علم والے سے بالاتر ایک علم والا ہے۔ ۶۹-۷۶

انھوں نے کہا اگر یہ چوری کرے تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔ اس سے پہلے اس کا ایک بھائی بھی چوری کر چکا ہے۔ یوسف نے اس بات کو اپنے دل ہی میں رکھا، اس کو ان پر ظاہر نہیں ہونے دیا۔ دل میں کہا تم خود ہی بدقماش لوگ ہو۔ اور جو کچھ تم بیان کر رہے ہو اللہ اس کو خوب جانتا ہے۔ انھوں نے کہا، اے عزیز! اس کا ایک باپ ہے جو بہت بوڑھا ہے تو آپ اس کی جگہ ہم میں سے کسی کو روک لیجیے۔ ہم آپ کو نہایت ہی محسن سمجھتے ہیں۔ اس نے کہا، اللہ پناہ میں رکھے اس بات سے کہ ہم اس کے سوا کسی کو پکڑیں جس کے پاس ہم نے اپنی چیز پائی ہے۔ اس صورت میں ہم نہایت ظالم ٹھہریں گے۔ جب وہ اس سے مایوس ہو گئے تو آپس میں مشورہ کرنے الگ ہوئے۔ ان کے بڑے نے کہا کیا تم کو علم نہیں کہ تمھارے باپ نے اللہ کے نام پر تم سے مضبوط قول و قرار لیا ہے اور اس سے پہلے یوسف کے معاملے میں جو تقصیر تم سے سرزد ہو چکی ہے وہ بھی تمھارے علم میں ہے تو میں تو اس

سرزمین سے ٹلنے کا نہیں جب تک میرے باپ مجھے اجازت نہ دیں یا اللہ میرے لیے کوئی فیصلہ نہ فرمائے۔ اور وہی بہترین فیصلہ فرمانے والا ہے۔ تم لوگ اپنے باپ کے پاس جاؤ اور ان سے کہو کہ اے ہمارے باپ! آپ کے بیٹے نے چوری کی اور ہم نے وہی بات کہی ہے جو ہمارے علم میں آئی؛ ہم غیب کے نگہبان نہیں ہیں۔ اور آپ اس بستی کے لوگوں سے بھی پوچھ لیجیے جس میں ہم رہے ہیں اور اس قافلے سے بھی پوچھ لیجیے جس میں ہم آئے ہیں اور ہم بالکل سچے ہیں۔ اس نے کہا بلکہ تمہارے دل نے یہ بات گھڑلی ہے تو صبر جمیل ہی اولیٰ ہے۔ امید ہے اللہ ان سب کو میرے پاس لائے گا، بے شک وہی علیم و حکیم ہے۔ ۸۰-۸۳

اور اس نے ان سے منہ پھیرا اور کہا ہائے یوسف! اور غم سے اس کی آنکھیں سفید پڑ گئیں اور وہ گھٹا گھٹا رہنے لگا۔ وہ بولے کہ بخدا آپ یوسف ہی کی یاد میں رہیں گے یہاں تک کہ از کار رفتہ ہو کے رہ جائیں گے یا ہلاک ہی ہو جائیں گے۔ اس نے کہا میں اپنی پریشانی اور اپنے غم کا شکوہ اللہ ہی سے کرتا ہوں اور میں اللہ کی جانب سے وہ باتیں جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔ اے میرے بیٹو! جاؤ یوسف اور اس کے بھائی کی ٹوہ لگاؤ اور اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو۔ اللہ کی رحمت سے مایوس تو بس کافر ہی ہوتے ہیں۔ ۸۴-۸۷

تو جب وہ اس کے پاس پہنچے، انھوں نے اس سے کہا کہ اے عزیز! ہم اور ہمارے اہل و عیال بڑی تکلیف میں مبتلا ہیں اور ہم تھوڑی سی پونجی لے کر حاضر ہوئے ہیں تو آپ ہمیں غلہ بھی پورا دیجیے اور ہم کو صدقہ بھی عنایت فرمائیے۔ اللہ تعالیٰ صدقہ کرنے والوں کو بدلہ عنایت فرماتا ہے۔ اس نے کہا، تمہیں کچھ پتہ ہے کہ تم جہالت میں مبتلا ہو کر یوسف اور اس کے بھائی کے ساتھ کیا کچھ کر گزرے ہو! وہ بولے کہ کیا آپ واقعۃً یوسف ہی ہیں!! اس نے کہا میں یوسف ہوں اور یہ میرا بھائی ہے۔ اللہ

نے ہم پر اپنا فضل فرمایا۔ بے شک جو تقویٰ اختیار کرتے ہیں اور ثابت قدم رہتے ہیں تو اللہ خوب کاروں کے اجر کو ضائع نہیں کرتا۔ وہ بولے کہ خدا کی قسم اللہ نے آپ کو ہم پر برتری بخشی اور بے شک ہم ہی غلطی پر تھے۔ اس نے کہا اب تم پر کچھ الزام نہیں۔ اللہ تم کو معاف کرے۔ وہ ارحم الراحمین ہے۔ تم میرا یہ کرتا لے جاؤ، میرے باپ کے چہرے پر ڈال دیجیو وہ دیکھنے لگیں گے۔ اور تم لوگ اپنے تمام اہل و عیال کے ساتھ میرے پاس آجاؤ۔ ۸۸-۸۹

اور جب قافلہ چلا ان کے باپ نے کہا کہ اگر تم لوگ مجھے خبطی نہ قرار دو تو میں یوسف کی خوشبو محسوس کر رہا ہوں۔ لوگ بولے کہ خدا کی قسم آپ ابھی تک اپنے پرانے خبط ہی میں مبتلا ہیں۔ پس جب یوں ہوا کہ خوش خبری دینے والا آیا اس نے کرتا اس کے چہرے پر ڈال دیا، اس کی بصارت عود کر آئی تو اس نے کہا، کیا میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ میں اللہ کی جانب سے وہ باتیں جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔ انھوں نے درخواست کی کہ ہمارے باپ ہمارے گناہوں کی مغفرت کے لیے دعا کیجیے۔ بے شک ہم ہی قصوروار ہوئے۔ اس نے کہا میں جلد اپنے رب سے تمہارے لیے مغفرت کی دعا کروں گا، بے شک وہی بخشنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔ ۹۴-۹۸

پس جب وہ یوسف کے پاس پہنچے اس نے اپنے والدین کو خاص اپنے پاس جگہ دی اور کہا مصر میں انشاءاللہ امن وچین سے رہیے اور اس نے اپنے والدین کو تخت پر بٹھایا اور سب اس کے لیے سجدہ میں گر پڑے۔ اور اس نے کہا، اے میرے باپ! یہ ہے میرے پہلے کے خواب کی تعبیر۔ میرے رب نے اس کو سچ کر دکھایا۔ اور اس نے بڑے ہی کرم کے ساتھ میری خبر گیری فرمائی جب کہ مجھے قید خانے سے نکالا اور آپ لوگوں کو دیہات سے لایا بعد اس کے کہ شیطان نے میرے اور میرے بھائیوں کے درمیان فساد ڈلوا دیا تھا۔ بے شک میرا رب جو کچھ چاہتا ہے اس کے لیے نہایت باریک بین اور

دقیقہ رس ہے، بے شک وہی علیم و حکیم ہے۔ اے میرے رب تو نے مجھے اقتدار میں سے بھی حصہ بخشا اور باتوں کی تعبیر کے علم میں سے بھی سکھایا۔ اے آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے والے تو ہی دنیا اور آخرت دونوں میں میرا کارساز ہے، مجھے اسلام پر وفات دے اور نیکوکاروں کے زمرہ میں شامل کر۔ ۹۹-۱۰۱

۹۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَقَالَ الْمَلِكُ ائْتُونِي بِهٖٓ أَسْتَخْلِصْهُ لِنَفْسِي ۚ فَلَمَّا كَلَّمَهٗ قَالَ إِنَّكَ الْيَوْمَ لَدَيْنَا مَكِينٌ أَمِينٌ (۵۴)

حضرت یوسفؑ کے ساتھ بادشاہ کی گرویدگی

بادشاہ اول تو حضرت یوسفؑ کا اسی بات سے گرویدہ ہو گیا کہ جس خواب کی تعبیر سے اس کے دربار کے تمام عقلاء و فضلاء قاصر رہے اس کی انھوں نے ایسی تعبیر بتا دی جو ہر شخص کے دل میں اتر گئی۔ پھر اس سے بڑھ کر اس کو متاثر کرنے والی بات یہ ہوئی کہ حضرت یوسفؑ نے خواب کی تعبیر کے ساتھ اس ہولناک قحط کے مقابلے کی تدبیر بھی بتا دی جس کے ظہور کی خواب نے خبر دی تھی۔

پھر ان دونوں باتوں سے بڑھ کر تیسری بات یہ ہوئی کہ جب بادشاہ نے ان کو جیل سے رہا کر کے اپنے پاس بلانا چاہا تو انھوں نے اس پیشکش کو قبول کرنے سے اس وقت تک کے لیے انکار کر دیا جب تک ان الزامات کی تحقیق نہ ہو جائے جن کو بہانہ بنا کر انھیں جیل میں ڈالا گیا تھا۔ اس تحقیق کا نتیجہ بھی، جیسا کہ اوپر کی آیات سے معلوم ہو چکا، حضرت یوسفؑ کے حق میں نہایت شاندار نکلا۔

ان تینوں میں سے کوئی ایک بات بھی بادشاہ کو حضرت یوسفؑ کا گرویدہ بنا دینے کے لیے کافی ہو سکتی تھی لیکن جس شخص کے باب میں یہ تینوں باتیں اکٹھی بادشاہ کے علم میں آئیں آخر وہ اس کا نادیدہ عاشق نہ ہو جاتا تو اور کیا کرتا چنانچہ اس نے فوراً حکم دیا کہ ان کو فوراً میرے پاس لایا جائے، میں ان کو اپنا معتمد خاص بناؤں گا۔ شخصی حکومتوں میں سارے اختیارات کا مرکز بادشاہ کی ذات ہوتی ہے اس وجہ سے اگر وہ کسی کو اپنا معتمد خاص بنا لے اور وہ بھی اس عقیدت اور گرویدگی کے ساتھ جو بادشاہ کے دل میں حضرت یوسفؑ کے لیے پیدا ہو گئی تھی، تو اس کے معنی یہ ہیں کہ گویا بادشاہ نے زمام اختیار و اقتدار حضرت یوسفؑ کے حوالے کر دینے کے ارادے کا اعلان ان کی رہائی کے اعلان کے ساتھ ہی کر دیا۔

حضرت یوسفؑ کو بڑے منصب کی پیشکش

'فَلَمَّا كَلَّمَهٗ قَالَ إِنَّكَ الْيَوْمَ لَدَيْنَا مَكِينٌ أَمِينٌ'۔ اب تک بادشاہ اور حضرت یوسفؑ کے

درمیان دوسرے لوگ واسطہ تھے۔ اس کو براہ راست حضرت سے ملنے اور گفتگو کرنے کا کوئی موقع نہیں ملا تھا۔ اب ملاقات ہوئی تو اس نے ان سے گفتگو بھی کی۔ قرآن نے اگرچہ اس گفتگو کا حوالہ اجمالاً ہی دیا ہے لیکن ظاہر ہے کہ یہ گفتگو تفصیل سے ہوئی ہوگی۔ دینی اور اخلاقی مسائل بھی زیر بحث آئے ہوں گے اور ملک کے انتظامی اور معاشی مسائل پر بھی حضرت یوسفؑ نے اپنی رائے پیش کی ہوگی۔ آدمی کی شخصیت کا صحیح اندازہ ملاقات اور گفتگو ہی سے ہوتا ہے۔ چنانچہ معلوم ہوتا ہے کہ اس ملاقات اور گفتگو نے بادشاہ کو حضرت یوسفؑ کا مزید گرویدہ بنا دیا اور اس نے ان سے کہہ دیا کہ اب آپ ہماری حکومت میں ایک با اقتدار معتمد ہیں۔ گویا بادشاہ نے ان کے سامنے اپنی حکومت میں بڑے سے بڑے منصب کی پیشکش کر دی اور اس امر کو حضرت یوسفؑ کی صواب دید پر چھوڑا کہ وہ اس پیشکش کو کس صورت میں قبول فرماتے ہیں۔

قَالَ اجْعَلْنِيْ عَلٰى خَزَآئِنِ الْاَرْضِ ۚ اِنِّيْ حَفِيْظٌ عَلِيْمٌ (۵۵)

حضرت یوسفؑ کی تجویز

'الْاَرْض' سے مراد یہاں سرزمین مصر اور 'خزائن' سے مراد ملک کے ذرائع پیداوار ہیں۔ چونکہ اس وقت سب سے بڑی مہم ملک کو پیش آنے والے قحط میں سنبھالنے کی تھی اس وجہ سے حضرت یوسفؑ نے فرمایا کہ ملک کے تمام ذرائع پیداوار کا اہتمام و انصرام میرے سپرد کر دیجیے، میں پوری احتیاط سے ہر چیز کی حفاظت کرنے والا بھی ہوں اور اس ذمہ داری کو سنبھالنے کے لیے علم بھی رکھتا ہوں۔ یہ واضح رہے کہ حضرت یوسفؑ کی طرف سے کوئی درخواست نہیں تھی بلکہ خود بادشاہ کی پیشکش قبول کرنے اور اس کو بروئے کار لانے کے لیے ان کو جو شکل مناسب معلوم ہوئی وہ انھوں نے اس کے سامنے رکھ دی اور ساتھ ہی یہ بات بھی ظاہر فرما دی کہ اس ذمہ داری کو سنبھالنے کے لیے جس دیانت اور علم کی ضرورت ہے وہ میں اپنے اندر پاتا ہوں۔ مطلب یہ ہے کہ اس وجہ سے توقع رکھتا ہوں کہ اس کام کو بحسن و خوبی انجام دے سکوں گا۔ حضرت یوسفؑ کی یہ تجویز عین بادشاہ کی آرزو کے مطابق تھی اس وجہ سے وہ مطمئن ہو گیا اور اس طرح مصر کی سلطنت گویا حضرت یوسفؑ کے انگوٹھے کے نیچے آگئی۔ تورات میں ہے کہ "پھر فرعون نے یوسفؑ سے کہا کہ دیکھ میں نے تجھے ساری زمین مصر پر حکومت بخشی اور فرعون نے اپنی انگشتری اپنے ہاتھ سے نکال کر یوسفؑ کے ہاتھ میں پہنا دی۔ تب اس کے آگے منادی کی گئی، سب ادب سے رہو اور اس نے اسے مصر کی ساری مملکت پر حاکم کیا اور یوسفؑ کو کہا، میں فرعون ہوں اور تیرے حکم کے بغیر مصر کی ساری زمین میں کوئی انسان اپنا ہاتھ یا پاؤں نہ اٹھائے گا۔" (پیدائش ۴۱-۴۴)

وَكَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوْسُفَ فِي الْاَرْضِ ۚ يَتَبَوَّاُ مِنْهَا حَيْثُ يَشَآءُ ۚ نُصِيْبُ بِرَحْمَتِنَا مَنْ نَّشَآءُ وَلَا نُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ ۝ وَلَاَجْرُ الْاٰخِرَةِ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ (۵۶-۵۷)

حضرت یوسفؑ کا کامل اقتدار

اس طرح حضرت یوسفؑ کو پورے ملک مصر میں عملاً وہ تمام اختیار و اقتدار حاصل ہو گیا جو بادشاہ کو حاصل تھا۔ نام تو بادشاہ کا ضرور باقی رہا لیکن اپنے اختیارات اس نے سارے حضرت یوسفؑ کو تفویض کر دیے۔ 'يَتَبَوَّاُ مِنْهَا حَيْثُ يَشَآءُ' یعنی وہ جہاں چاہیں فروکش ہوں، جس حصۂ ملک کا چاہیں دورہ کریں، جہاں جو نظم و نسق ضروری سمجھیں

اس کے لیے احکام صادر فرمائیں۔ حکومت کے عمال کا فرض تھا کہ بے چون وچرا ان کے احکام کی تعمیل کریں۔

اللہ کا معاملہ خوب کاروں کے ساتھ

نُصِيبُ بِرَحْمَتِنَا مَنْ نَّشَآءُ وَلَا نُضِيعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِينَ میں دو حقیقتیں واضح فرمائی گئی ہیں۔ ایک تو یہ کہ تمام اختیار و اقتدار خدا ہی کو حاصل ہے۔ وہ اگر کسی کو اپنے فضل و رحمت سے نوازنا چاہے تو کوئی اس کا ہاتھ نہیں پکڑ سکتا۔ وہ جب چاہے ایک قیدی کو زنداں سے نکالے اور اس کو ملک کے تختِ حکومت پر لا بٹھائے۔ یہ اس کی قدرت و مشیت کا ایک ادنیٰ کرشمہ ہے۔ دوسری یہ کہ وہ محسنین، یعنی خوب کاروں کے اجر کو ضائع نہیں کرتا۔ ان کو آزمائشیں ضرور پیش آتی ہیں، اگر وہ ان آزمائشوں میں خدا کی راہ پر استوار اور ثابت قدم رہتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ان کو اس دنیا میں بھی اس کا صلہ دیتا ہے اور آخرت میں بھی وہ اس کا صلہ پائیں گے وَلَأَجْرُ الْآخِرَةِ خَيْرٌ لِّلَّذِينَ آمَنُوا وَكَانُوا يَتَّقُونَ۔ یعنی آخرت کا اجر اس دنیا کے اجر سے کہیں بڑھ کر ہے جو اللہ نے ان لوگوں کے لیے مخصوص کر رکھا ہے جو ایمان پر ثابت قدم اور خدا کے حدود و قیود کی خلاف ورزی سے بچتے رہیں۔

وَجَآءَ إِخْوَةُ يُوسُفَ فَدَخَلُوا عَلَيْهِ فَعَرَفَهُمْ وَهُمْ لَهُ مُنْكِرُونَ (۵۸)

برادرانِ یوسف کی حاضری

حضرت یوسفؑ کے بھائیوں کا یہ آنا، جیسا کہ آگے کی آیت میں وضاحت ہے، غلہ لینے کی غرض سے تھا۔ یعنی یہ سات سال بعد اس زمانے کی بات ہے جب مصر اور اس سے ملحقہ ممالک فلسطین و شام وغیرہ سب قحط کے لپیٹ میں آچکے ہیں۔ یہ قحط تو مصر میں بھی تھا لیکن حضرت یوسفؑ کی پیش بندی اور ان کے حسنِ انتظام کی بدولت مصر نہ صرف اپنی ضروریات پوری کرنے میں کامیاب رہا بلکہ وہاں پاس پڑوس کے ملکوں سے آنے والے ضرورت مندوں کو بھی ایک معین مقدار میں سرکاری ڈپو سے غلہ خریدنے کی اجازت تھی۔ چنانچہ غلہ ہی حاصل کرنے کی غرض سے حضرت یوسفؑ کے بھائی مصر آئے اور معلوم ہوتا ہے کہ بیرونی ہونے کی وجہ سے انھیں خاص اجازت نامہ حاصل کرنے کے لیے حضرت یوسفؑ کے سامنے بھی حاضر ہونا پڑا۔ اس حاضری کے وقت حضرت یوسفؑ نے تو ان کو پہچان لیا لیکن یہ لوگ ان کو نہ پہچان سکے۔ نہ پہچان سکنے کی وجہ ظاہر ہے کہ اول تو انھوں نے جس وقت انھیں کنوئیں میں پھینکا تھا اس پر کم و بیش بیس اکیس سال کا زمانہ گزر چکا تھا، اتنے طویل عرصے میں آدمی کی شکل و صورت بہت کچھ تبدیل ہو جاتی ہے۔ پھر بالفرض چہرے بشرے میں انھوں نے کچھ جھلک محسوس بھی کی ہو، جیسا کہ آگے آیت ۹۰ سے اشارہ نکلتا ہے تو آخر وہ یہ گمان کس طرح کر سکتے تھے کہ جس بھائی کو انھوں نے اندھے کنوئیں میں ڈالا تھا وہ آج مصر کے تختِ حکومت پر متمکن ہے۔

وَلَمَّا جَهَّزَهُمْ بِجَهَازِهِمْ قَالَ ائْتُونِي بِأَخٍ لَّكُمْ مِّنْ أَبِيكُمْ أَلَا تَرَوْنَ أَنِّي أُوفِي الْكَيْلَ وَأَنَا خَيْرُ الْمُنْزِلِينَ ۝ فَإِن لَّمْ تَأْتُونِي بِهِ فَلَا كَيْلَ لَكُمْ عِندِي وَلَا تَقْرَبُونِ (۵۹-۶۰)

بھائیوں کو حضرت یوسفؑ کی ہدایت

ان کا سامان ٹھیک ٹھاک کرا دینے کے بعد حضرت یوسفؑ نے ان کو ہدایت فرمائی اب کے غلہ لینے آئیو تو اپنے سوتیلے بھائی کو بھی ساتھ لائیو۔ معلوم ہوتا ہے کہ راشننگ سسٹم نافذ ہونے کے سبب سے ہر ضرورت مند کو

غلہ بحساب افرادِ خاندان ملتا تھا اس وجہ سے انھیں یہ بتانا پڑا ہوگا کہ ہمارا ایک سوتیلا بھائی بھی گھر پر ہے۔ حضرت یوسفؑ نے فرمایا کہ اب کے آنا تو اس کو بھی ساتھ لانا۔ اس کے لیے انھیں ترغیب بھی دی اور ساتھ ہی دھمکی بھی۔ ترغیب یہ کہ دیکھو میں ہر فرد کے حصہ کا غلہ پورا پورا دیتا ہوں۔ 'کیل' کے معنی تو پیمانہ کے ہیں لیکن جس طرح ظرف بول کر کبھی مظروف مراد لیتے ہیں اسی طرح اس سے یہاں مراد غلہ ہے۔ مطلب یہ کہ اپنے بھائی کو لاؤ گے تو اس کے حصہ کا غلہ بھی پورا پورا پاؤ گے اور یہ تجربہ تو تم کر ہی چکے ہو کہ میں آنے والوں کی نہایت بہتر طریقہ پر میزبانی کرتا ہوں۔ دھمکی یہ دی کہ اگر تم اپنے بھائی کو نہ لائے تو نہ تمھارے لیے میرے پاس غلہ ہے اور نہ تم میرے پاس پھٹکنا۔

قَالُوا سَنُرَاوِدُ عَنْهُ أَبَاهُ وَإِنَّا لَفَاعِلُونَ (۶۱)

بھائیوں کا جواب

'مُراودت' کے معنی بہلانے پھسلانے کے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ اس کے بارے میں ہم اس کے باپ کو راضی کرنے کی کوشش کریں گے اور جہاں تک اپنی کوشش کا تعلق ہے اس میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھیں گے ـــــ ان کے اس جملے کے اندر یہ بات مضمر ہے کہ اگر ہم اس کو لانے میں کامیاب نہ ہو سکے تو اس میں ہمارا قصور نہ ہوگا، بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ اس کے باپ نے اس کو اجازت نہ دی اور یہ چیز ایسی ہے جس میں ہماری مجبوری واضح ہے۔ حضرت یوسفؑ کے ساتھ جو کچھ وہ کر چکے تھے اس کے سبب سے ان کے دل میں ایک چور تھا جو ان کے اس فقرے میں نمایاں ہے۔

وَقَالَ لِفِتْيَانِهِ اجْعَلُوا بِضَاعَتَهُمْ فِي رِحَالِهِمْ لَعَلَّهُمْ يَعْرِفُونَهَا إِذَا انقَلَبُوا إِلَىٰ أَهْلِهِمْ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ (۶۲)

مزید احسان

حضرت یوسفؑ نے اس خیال سے کہ مالی مشکلات ان کے دوبارہ آنے میں مانع نہ ہوں یہ کیا کہ اپنے آدمیوں کو حکم دیا کہ جو نقدی انھوں نے غلہ کی قیمت کے طور پر ادا کی ہے وہ ان کے سامان میں ڈال دی جائے تاکہ جب وہ گھر پر جا کر اپنا سامان کھولیں تو وہ یہ محسوس کریں کہ یہ ان پر احسان کیا گیا ہے اور خوشی خوشی، حوصلہ کے ساتھ، دوبارہ غلہ لینے آئیں۔

فَلَمَّا رَجَعُوا إِلَىٰ أَبِيهِمْ قَالُوا يَا أَبَانَا مُنِعَ مِنَّا الْكَيْلُ فَأَرْسِلْ مَعَنَا أَخَانَا نَكْتَلْ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ ۝ قَالَ هَلْ آمَنُكُمْ عَلَيْهِ إِلَّا كَمَا أَمِنتُكُمْ عَلَىٰ أَخِيهِ مِن قَبْلُ ۖ فَاللَّهُ خَيْرٌ حَافِظًا ۖ وَهُوَ أَرْحَمُ الرَّاحِمِينَ (۶۳-۶۴)

بیٹوں کی گزارش باپ سے اور باپ کا جواب

جب یہ لوگ گھر پہنچے تو باپ کو ساری روداد سنائی کہ آگے کو ہم غلہ سے محروم کر دیے گئے ہیں۔ اب غلہ حاصل کرنے کی ایک ہی راہ ہے کہ ہم اپنے ساتھ اپنے بھائی بن یامین کو بھی لے جائیں اور اپنے آپ کو سچا ثابت کریں کہ ہمارا ایک گیارہواں بھائی بھی ہے تو آپ اس مرتبہ بن یامین کو ہمارے ساتھ جانے دیجیے تاکہ ہم سب کے حصہ کا غلہ لے سکیں اور ہم آپ کو یہ اطمینان دلاتے ہیں کہ ہم اس کی پوری حفاظت کریں گے۔ حضرت یعقوبؑ نے فرمایا کہ بن یامین کے معاملے میں اگر میں تم پر اعتماد کروں تو یہ اعتماد ویسا ہی ہوگا جیسا کہ میں اس سے پہلے یوسفؑ کے بارے میں تم پر کر چکا ہوں۔ تو اللہ ہی بہترین محافظ اور ارحم الراحمین ہے۔ حضرت یعقوبؑ کے آخری الفاظ سے یہ بات نکلتی ہے کہ جہاں تک تمھارے

اعتماد کا تعلق ہے اس کا تجربہ تو مجھے ہو چکا ہے البتہ اگر بن یامین کو تمہارے ساتھ بھیجنا ہی پڑا تو میں یہ کام اللہ کی حفاظت و رحمت کے بھروسہ پر کروں گا، تمہارے اعتماد پر نہیں کروں گا۔

وَلَمَّا فَتَحُوا مَتَاعَهُمْ وَجَدُوا بِضَاعَتَهُمْ رُدَّتْ إِلَيْهِمْ ۖ قَالُوا يَا أَبَانَا مَا نَبْغِي ۖ هَٰذِهِ

بِضَاعَتُنَا رُدَّتْ إِلَيْنَا ۖ وَنَمِيرُ أَهْلَنَا وَنَحْفَظُ أَخَانَا وَنَزْدَادُ كَيْلَ بَعِيرٍ ۖ ذَٰلِكَ كَيْلٌ يَسِيرٌ (۶۵)

بیٹوں کی مسرت

جب ان لوگوں نے اپنا سامان کھولا اور یہ دیکھا کہ جو رقم انھوں نے غلہ کی قیمت کے طور پر ادا کی تھی وہ پوری کی پوری ان کی غلہ کی بوریوں میں موجود ہے تو وہ خوشی سے اچھل پڑے۔ بولے کہ ابا جان! اب کیا چاہیے، یہ دیکھیے کہ ہماری رقم بھی ہم کو لوٹا دی گئی ہے۔ اب ہم جائیں گے، اپنے اہل و عیال کے لیے غلہ لائیں گے، اپنے بھائی کی حفاظت کریں گے، ایک بار شتر غلہ ہم مزید حاصل کریں گے، یہ غلہ جو ہم لائے یہ تو تھوڑا ہے۔

قرآن کی بلاغت کے قربان جائیے کہ اس نے ان کی بات اس طرح نقل کی ہے کہ ان کی خوشی ان کے فقرے فقرے سے ابلی پڑتی ہے۔

'وَنَمِيرُ أَهْلَنَا' کا معطوف علیہ یہاں قرینہ کی وضاحت کے سبب سے محذوف ہے ہم نے ترجمہ میں اس کو کھول دیا ہے۔ 'مَادَ، يَمِيدُ، مَيْدًا' کے معنی اپنے اہل و عیال کے لیے غلہ اور ضرورت کی چیزیں فراہم کرنا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اب رقم واپس مل جانے کے بعد ہماری راہ میں کیا رکاوٹ باقی رہی، اب تو ہم ضرور ہی جائیں گے اور اپنے اہل و عیال کے لیے غلہ لائیں گے۔

'كَيْلَ بَعِيرٍ' سے یہ بات معلوم ہوئی کہ حضرت یوسفؑ نے جو راشننگ سسٹم جاری کیا تھا اس میں بیرونی ضرورت مندوں کو ایک بار شتر غلہ حاصل کرنے کی اجازت تھی۔

قَالَ لَنْ أُرْسِلَهُ مَعَكُمْ حَتَّىٰ تُؤْتُونِ مَوْثِقًا مِنَ اللَّهِ لَتَأْتُنَّنِي بِهِ إِلَّا أَنْ يُحَاطَ بِكُمْ ۖ

فَلَمَّا آتَوْهُ مَوْثِقَهُمْ قَالَ اللَّهُ عَلَىٰ مَا نَقُولُ وَكِيلٌ (۶۶)

حضرت یعقوبؑ کی شرط اجازت

حضرت یعقوبؑ نے فرمایا کہ میں بن یامین کو صرف اس صورت میں تمہارے ساتھ جانے کی اجازت دوں گا جب تم اللہ کے نام پر مجھ سے یہ مضبوط عہد کرو کہ اس کو تم ضرور واپس لاؤ گے الا آنکہ تم خود ہی کسی آفت میں گھر جاؤ۔ تو جب انھوں نے قسم کھا کے ان سے عہد کیا تو حضرت یعقوبؑ نے فرمایا کہ ہم جو قول و قرار کر رہے ہیں اس پر اللہ ضامن اور گواہ ہے۔

وَقَالَ يَا بَنِيَّ لَا تَدْخُلُوا مِنْ بَابٍ وَاحِدٍ وَادْخُلُوا مِنْ أَبْوَابٍ مُتَفَرِّقَةٍ ۖ وَمَا أُغْنِي عَنْكُمْ

مِنَ اللَّهِ مِنْ شَيْءٍ ۖ إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلَّهِ ۖ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ ۖ وَعَلَيْهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُونَ (۶۷)

'مَا أُغْنِي عَنْكُمْ' یعنی میں تمہارے کچھ کام نہیں آسکتا، تمھیں کچھ نفع نہیں پہنچا سکتا۔

ایک مصلحت آمیز ہدایت

چونکہ قحط کا زمانہ تھا جس میں چوری، ڈکیتی اور اس نوع کے دوسرے جرائم کے امکانات بہت بڑھ جاتے ہیں اس وجہ سے حضرت یعقوبؑ نے ان کو رخصت کرتے وقت یہ ہدایت فرمائی کہ شہر میں جب داخل ہونا تو ایک ہی

دروازے سے نہ داخل ہونا بلکہ مختلف دروازوں سے داخل ہونا۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ قدیم زمانے میں بیرونی حملوں سے حفاظت کے لیے ہر قابل ذکر شہر کے گرداگرد فصیل اور ہر سمت سے داخل ہونے کے لیے معین دروازے ہوتے تھے۔ حضرت یعقوبؑ نے یہ ہدایت ممکن ہے اس اندیشہ سے فرمائی ہو کہ کہیں یہ لوگ شہر کے شریروں اور گنڈوں کی توجہ کا ہدف نہ بن جائیں۔ ایک ہی وقت میں ایک ہی دروازے سے گیارہ ذی وجاہت، خوش شکل اور باوقار بھائیوں کا اپنے قافلہ سمیت شہر میں داخل ہونا ایک جالب توجہ چیز ہو سکتی تھی اور اس کا بھی امکان تھا کہ کچھ شریر لوگ ان کے پیچھے لگ جائیں کہ ان کے پاس مال زیادہ ہوگا اور اسی طمع میں وہ ان کو نقصان پہنچانے کے درپے ہو جائیں۔

اس ہدایت کے ساتھ ساتھ انھوں نے یہ تنبیہ فرما دی کہ یہ ایک تدبیر ہے جس کو اپنی دانست میں بہتر سمجھ کر میں تمھیں اختیار کرنے کی نصیحت کرتا ہوں۔ اس تدبیر کو ہرگز ہرگز اس معنی میں نہ لینا کہ یہ تمھیں اس تقدیر سے بچا سکے گی جو خدا نے تمھارے لیے لکھ رکھی ہے۔ وہ اپنی جگہ پر اٹل ہے۔ اصلی اختیار خدا ہی کا ہے۔ میں نے اسی پر بھروسہ کیا ہے اور بھروسہ کرنے والوں کو اسی پر بھروسہ کرنا چاہیے۔

وَلَمَّا دَخَلُوْا مِنْ حَيْثُ اَمَرَهُمْ اَبُوْهُمْ ۭ مَا كَانَ يُغْنِيْ عَنْهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ اِلَّا حَاجَةً فِيْ نَفْسِ
يَعْقُوْبَ قَضٰىهَا ۭ وَاِنَّهٗ لَذُوْ عِلْمٍ لِّمَا عَلَّمْنٰهُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ (۶۸)

تقدیر اور تدبیر کا باہمی تعلق

اب یہ تدبیر اور تقدیر کے باہمی تعلق کو واضح فرما دیا گیا کہ بیٹوں نے شہر میں داخل ہونے کے باب میں باپ کے مشورے پر جو عمل کیا تو یہ محض حالات وقت کے پیش نظر ایک تدبیر تھی جس کی ضرورت کا احساس باپ کے دل میں پیدا ہوا اور اس نے انھیں اس کے اختیار کرنے کی ہدایت کردی جو ان کے لیے مفید و بابرکت ثابت ہوئی۔ اس کے یہ معنی ہرگز نہیں ہیں کہ اگر ان کی تقدیر میں کوئی آفت آنی لکھی ہوئی ہوتی تو اس تدبیر سے وہ اس سے بھی بچ جاتے۔ تقدیر بہرحال اٹل ہے جس کو کسی کی تدبیر نہیں بدل سکتی لیکن اس کے باوجود انسان کا فرض ہے کہ وہ حالات و مصالح کے مطابق تدابیر اختیار کرے۔ اسی میں اس کے ارادے اور سعی و عمل کا امتحان ہے اور اسی پر آخرت میں اس کے درجے اور مرتبے کا انحصار۔ اس وجہ سے کسی کے لیے یہ بات جائز نہیں ہے کہ وہ تقدیر کے نام پر اپنے ہاتھ پاؤں توڑ کے بیٹھ رہے۔ بلکہ ضروری ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے مقرر کیے ہوئے حدود کے اندر تدابیر اختیار کرے، ان کو بروئے کار لانے کے لیے اپنے امکان بھر جدوجہد کرے اور ساتھ ہی یہ یقین رکھے کہ ہوگا وہی جو اللہ کی مشیت میں ہے۔ اللہ کے فیصلہ کو کوئی بدل نہیں سکتا۔

وَاِنَّهٗ لَذُوْ عِلْمٍ ..... الاٰیۃ، یہ حضرت یعقوبؑ کی تعریف و تحسین ہے کہ وہ تدبیر و تقدیر کے معاملے میں اس علم سے بہرہ مند تھے جو اللہ نے ان کو سکھایا تھا لیکن اکثر لوگ ان کی حقیقت سے بے خبر ہوتے ہیں۔ وہ یا تو تدبیر ہی کو سب کچھ سمجھ لیتے ہیں، تقدیر ان کے ہاں ایک واہمہ ہے، یا پھر تقدیر و توکل کے نام پر وہ بالکل اپاہج بن کر بیٹھ جاتے ہیں۔

وَلَمَّا دَخَلُوْا عَلٰي يُوْسُفَ اٰوٰٓى اِلَيْهِ اَخَاهُ قَالَ اِنِّىْٓ اَنَا اَخُوْكَ فَلَا تَبْتَىِٕسْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (۶۹)

بھائی پر افشائے راز

جب یہ لوگ حضرت یوسفؑ کے پاس پہنچے انھوں نے اپنے بھائی بنیامین کو تنہائی میں اپنے پاس بلا کر ان کو آگاہ کر دیا کہ میں تمھارا بھائی یوسف ہوں تو اب تک انھوں نے جو کچھ کیا ہے اس سے دل شکستہ اور آزردہ خاطر نہ ہونا۔ اب یہ دور گزر چکا۔ قرینہ دلیل ہے کہ اس موقع پر حضرت یوسفؑ نے بھائی کو اپنی اس تدبیر سے بھی آگاہ فرما دیا ہوگا جو وہ ان کو اپنے پاس روکنے کے لیے اختیار فرمانے والے ہیں تاکہ آگے جو حالات پیش آنے والے ہیں ان میں وہ مطمئن رہیں۔

فَلَمَّا جَهَّزَهُم بِجَهَازِهِمْ جَعَلَ السِّقَايَةَ فِي رَحْلِ أَخِيهِ ثُمَّ أَذَّنَ مُؤَذِّنٌ أَيَّتُهَا الْعِيرُ إِنَّكُمْ لَسَارِقُونَ ۝ قَالُوا وَأَقْبَلُوا عَلَيْهِم مَّاذَا تَفْقِدُونَ ۝ قَالُوا نَفْقِدُ صُوَاعَ الْمَلِكِ وَلِمَن جَاءَ بِهِ حِمْلُ بَعِيرٍ وَأَنَا بِهِ زَعِيمٌ ۝ قَالُوا تَاللَّهِ لَقَدْ عَلِمْتُم مَّا جِئْنَا لِنُفْسِدَ فِي الْأَرْضِ وَمَا كُنَّا سَارِقِينَ ۝ قَالُوا فَمَا جَزَاؤُهُ إِن كُنتُمْ كَاذِبِينَ ۝ قَالُوا جَزَاؤُهُ مَن وُجِدَ فِي رَحْلِهِ فَهُوَ جَزَاؤُهُ ۚ كَذَٰلِكَ نَجْزِي الظَّالِمِينَ ۝ فَبَدَأَ بِأَوْعِيَتِهِمْ قَبْلَ وِعَاءِ أَخِيهِ ثُمَّ اسْتَخْرَجَهَا مِن وِعَاءِ أَخِيهِ ۚ كَذَٰلِكَ كِدْنَا لِيُوسُفَ ۖ مَا كَانَ لِيَأْخُذَ أَخَاهُ فِي دِينِ الْمَلِكِ إِلَّا أَن يَشَاءَ اللَّهُ ۚ نَرْفَعُ دَرَجَاتٍ مَّن نَّشَاءُ ۗ وَفَوْقَ كُلِّ ذِي عِلْمٍ عَلِيمٌ ۝ (۷۰-۷۶)

بھائی کو روکنے کے لیے حضرت یوسفؑ کی تدبیر

جب ان کا سارا سامان ٹھیک ٹھاک کرا دیا تو پانی پینے کا کٹورا، جو غلہ ناپنے کے لیے، شاہی پیمانے کے طور پر استعمال ہوتا تھا، وہ حضرت یوسفؑ نے اپنے بھائی کے کجاوے میں رکھوا دیا۔ پھر ایک منادی نے پکارا کہ اے قافلے والو، تم چور ہو۔ وہ جھپٹ کے ان کی طرف مڑے اور پوچھا کہ آپ لوگوں کی کیا چیز کھوئی گئی ہے؟ انھوں نے بتایا کہ شاہی پیمانہ کھویا گیا ہے تو جو اس کو لائے گا اس کو ایک بارِ شتر غلہ انعام ملے گا اور میں اس کا ضامن ہوں۔ انھوں نے قسم کھا کر جواب دیا کہ آپ لوگوں کو اچھی طرح علم ہے کہ ہم اس ملک میں فساد برپا کرنے نہیں آئے اور ہم چوری کرنے والے لوگ نہیں ہیں۔ انھوں نے پوچھا کہ اگر تم لوگ جھوٹے ثابت ہوئے تو اس کی کیا سزا ہے؟ انھوں نے کہا کہ جس کے سامان میں کٹورا ملے وہی اس کے بدلے میں روک لیا جائے۔ ہم ایسے ظالموں کو یہی سزا دیا کرتے ہیں۔ اس کے بعد حضرت یوسفؑ نے ان کے سامان کی تلاشی لی اور تلاشی کا آغاز اپنے بھائی کے تھیلے سے پہلے ان کے تھیلوں سے کیا اور آخر میں اپنے بھائی کے تھیلے سے پیمانہ کو برآمد کر لیا۔ حضرت یوسفؑ کی اس تدبیر کی بابت اللہ تعالیٰ کا ارشاد یہ ہے کہ یہ تدبیر یوسفؑ کے لیے ہم نے کی۔ بادشاہ کے قانون کی رو سے وہ اپنے بھائی کو روکنے کے مجاز نہ تھے الا آنکہ اللہ چاہے۔ فرمایا کہ ہم ہی جس کے چاہیں درجے پر درجے بلند کرتے ہیں اور ہر صاحبِ علم سے بڑھ کر ایک علم والا ہے۔

حضرت یوسفؑ کے طرزِ عمل پر شبہات کا ازالہ

مذکورہ بالا آیات کا یہ خلاصۂ مطلب ہے جو ہم نے اپنے الفاظ میں بیان کر دیا ہے، اب ہم ایک ترتیب کے ساتھ چند اصولی باتیں عرض کریں گے تاکہ حضرت یوسفؑ کے اس طرزِ عمل سے متعلق جو شبہات ذہن میں پیدا ہوتے ہیں وہ صاف ہو جائیں۔

۱۔ پہلی بات یہ ہے کہ حضرت یوسفؑ ابھی اس مرحلے میں اپنے آپ کو اپنے بھائیوں پر ظاہر نہیں کرنا چاہتے تھے بلکہ ان کو اچھی طرح ٹٹول کر یہ دیکھنا چاہتے تھے کہ اتنا بڑا ظلم کر گزرنے کے بعد، جو انھوں نے ان کے ساتھ کیا، ان کے باطن میں کوئی تبدیلی ہوئی ہے یا ابھی ان کے سوچنے کا انداز وہی ہے جو پہلے تھا۔

۲۔ دوسری بات یہ ہے کہ حضرت یوسفؑ اپنے بھائی بنیامین کو پا جانے کے بعد اب کسی قیمت پر یہ خطرہ مول لینے کے لیے تیار نہ تھے کہ اس کو ان ظالم لوگوں کے حوالہ کریں۔ انھوں نے خیال فرمایا ہو گا کہ لانے کو تو وہ اس طمع میں اس کو لائے کہ ان کو معلوم تھا کہ اس کے بغیر ان کو غلہ ملنے کا کوئی امکان نہیں ہے لیکن اب واپسی میں ایسے لوگوں سے کیا بعید ہے کہ اس طرح کا کوئی اقدام اس کے ساتھ بھی کر گزریں جس طرح کا اقدام وہ خود ان کے ساتھ کر چکے ہیں۔ آخر حسد کا وہ جذبہ جو ان کے پہلے اقدام کا محرک ہوا وہ تو اس بھائی کے معاملے میں بھی موجود ہے۔

۳۔ تیسری بات یہ ہے کہ ان کو بہر حال ملک کے قانون کا رکھ رکھاؤ بھی مد نظر تھا۔ اس میں شبہ نہیں کہ بادشاہ کی غیر معمولی عقیدت کی وجہ سے حضرت یوسفؑ کو، جیسا کہ پیچھے گزر چکا ہے، ہر قسم کے اختیارات حاصل تھے، لیکن ان کے شایان شان بات یہی تھی کہ وہ جو قدم بھی اٹھائیں وہ قانون ملک کے مطابق ہو۔ بالخصوص جب کہ وہ قانون مبنی بر عدل بھی ہو۔

۴۔ چوتھی بات یہ کہ ان گوناگوں حالات سے عہدہ برآ ہونے کے لیے اگر کوئی طریقہ کارگر ہو سکتا تھا تو توریہ کا طریقہ ہی ہو سکتا تھا۔ توریہ اگر کسی باطل مقصد کے لیے ہو اور اس میں جھوٹ کی بھی ملاوٹ ہو تو وہ توریہ بلا شبہ حرام ہے لیکن اگر یہ کسی مقصد حق کے لیے ہو اور اس میں جھوٹ اور فریب کی آمیزش نہ ہو تو اس توریہ میں نہ صرف یہ کہ کوئی خرابی نہیں ہے بلکہ بسا اوقات اس کا اختیار کرنا، بالخصوص دشمن کے مقابل میں، مصلحت حق کی خاطر ضروری ہو جاتا ہے۔ اس کی بعض نہایت لطیف اور پاکیزہ مثالیں ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں بھی ملتی ہیں۔ اس قسم کے توریہ میں جو بات کہی یا کی جاتی ہے وہ بجائے خود سچی اور صحیح ہوتی ہے لیکن اس کے کہنے یا کرنے کا انداز ایسا ہوتا ہے کہ مخاطب اس سے مغالطہ میں پڑ جاتا ہے۔

۵۔ حضرت یوسفؑ نے بھائی کے تھیلے میں پیمانہ رکھ کر یا رکھوا کر ایک منادی سے یہ اعلان جو کرایا کہ اے قافلہ والو تم چور ہو، تو منادی نے یہ اعلان حضرت یوسفؑ کے حکم کی تعمیل میں کیا اور حضرت یوسف نے یہ اعلان کراتے ہوئے جو بات پیش نظر رکھی وہ یہ نہیں تھی کہ اہل قافلہ نے شاہی پیمانہ چرایا ہے بلکہ انھوں نے خود اپنے واقعہ کو مد نظر رکھا کہ ان کو سیر و تفریح کے بہانے گھر سے لائے اور ایک کنوئیں میں پھینک کر شام کو جب گھر واپس ہوئے تو بوڑھے باپ کو یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ یوسف کو بھیڑیا کھا گیا۔ چنانچہ دیکھیے کہ منادی کے الفاظ یہ نہیں ہیں کہ اے قافلہ والو تم نے شاہی پیمانہ چرایا

ہے، بلکہ اس کے الفاظ یہ ہیں کہ 'اے قافلہ والو تم چور ہو'۔ ظاہر ہے کہ یہ بات بجائے خود بالکل صحیح تھی البتہ اس سے اس موقع پر یہ مغالطہ ضرور پیدا ہو سکتا تھا کہ کسی خاص چیز کی چوری کو اس اعلان کی وجہ قرار دے لیں۔

۶۔ اس اعلان کے ساتھ ہی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت یوسفؑ کے سارے عملہ میں یہ بات پھیل گئی کہ شاہی پیمانہ گم ہے۔ یہ شاہی پیمانہ چونکہ پہلے پانی پینے کا شاہی کٹورا تھا اس وجہ سے لازماً قیمتی رہا ہوگا اس وجہ سے اس کا چرایا جانا بعید از قیاس نہیں سمجھا جا سکتا تھا۔ ہو سکتا ہے کسی پہلو سے خود حضرت یوسفؑ نے اس موقع پر شاہی پیمانے کا ذکر چھیڑا ہو اور ان کے عملہ نے از خود رائے قائم کر لی ہو کہ قافلہ والوں پر جس چوری کا الزام ہے وہ شاہی پیمانہ ہی کی چوری ہے۔

۷۔ جب اہل قافلہ نے مڑ کر حضرت یوسفؑ کے آدمیوں سے پوچھا کہ آپ لوگوں کی کیا چیز کھوئی گئی ہے تو انھوں نے اپنے علم کے مطابق یہ جواب دیا کہ ہمارا شاہی پیمانہ کھویا گیا ہے اور ساتھ ہی ان میں سے ایک نے یہ بھی کہا کہ جو شخص پیمانہ لائے گا اس کو ایک بارِ شتر غلہ انعام ملے گا اور میں اس کا ضامن بنتا ہوں۔ یہ آخری بات ظاہر ہے کہ حضرت یوسفؑ کے ایما پر کہی گئی ہوگی اور اغلب ہے یہ بات اسی آدمی نے کہی ہو جس نے یہ منادی کی تھی کہ اے قافلہ والو تم چور ہو۔

۸۔ قافلہ والوں نے پہلے تو قسم کھا کے اپنی صفائی پیش کی کہ ہم اس ملک میں فساد برپا کرنے نہیں آئے تھے اور نہ ہم چوری کرنے والے لوگ ہیں، پھر جب ان سے یہ سوال ہوا کہ اگر تم جھوٹے ثابت ہوئے تو چور کی کیا سزا؟ انھوں نے تھوڑے سے تردد کے ساتھ یہ جواب دیا کہ جس کے کجاوے سے چیز نکلے وہی اس کے بدلہ میں پکڑا جائے۔ ہم ایسے ظالموں کے ساتھ یہی معاملہ کرتے ہیں۔

۹۔ اس کے بعد حضرت یوسفؑ نے خود تلاشی لی اور تلاشی کا آغاز بن یامین کے بجائے دوسروں سے کیا تاکہ ان کو کوئی شبہ نہ ہو اور آخر میں بنیامین کے تھیلے سے شاہی پیمانہ برآمد کر لیا۔ اس طرح گویا اپنے بھائی کو روک لینے کے وہ ملک کے قانون کی رو سے بھی مجاز ہو گئے اور اپنے بھائیوں کے اقرار کی رو سے بھی۔

۱۰۔ اس تدبیر کو اللہ تعالیٰ نے 'کید' سے تعبیر اور اس 'کید' کو خود اپنی طرف منسوب فرمایا ہے۔ 'کید' مخفی تدبیر کو کہتے ہیں۔ یہ مخفی تدبیر اللہ تعالیٰ نے حضرت یوسفؑ کو سجھائی جس کی بدولت وہ اس قابل ہوئے کہ اپنے بھائی کو بھی خطرے سے بچا سکیں اور ملک کے قانون کا احترام بھی باقی رہے۔

اس پوری تفصیل پر غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ اس ساری کارروائی میں نہ حضرت یوسفؑ کسی جھوٹ میں ملوث ہوئے ہیں نہ ان کے آدمی۔ البتہ وقتی طور پر بن یامین پر ایک الزام کا دھبہ لگا لیکن اول تو وہ اس سے، جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے، پہلے سے آگاہ کر دیے گئے تھے ثانیاً یہ جو کچھ کیا گیا انہی کو سوتیلے بھائیوں کے ظلم و ستم سے بچانے کے لیے کیا گیا۔

آخر میں نَرْفَعُ دَرَجٰتٍ مَّنْ نَّشَآءُ ۭ وَفَوْقَ كُلِّ ذِيْ عِلْمٍ عَلِيْمٌ ۔ میں حضرت یوسفؑ کے مراتب بلند کی طرف اشارہ بھی ہے اور ان لوگوں پر ایک تعریض بھی جو اپنے علم کو آخری چیز سمجھ بیٹھتے ہیں۔ ان کو دنیا جتنی نظر آتی ہے وہ سمجھتے ہیں کہ بس یہ کائنات کل اتنی ہی ہے اور اپنے اس نشہ میں ان بہت سی حقیقتوں کا مذاق اڑاتے ہیں جو ان کے محدود علم سے باہر ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے یہاں بتایا کہ کسی کو بھی اپنے اندازوں اور قیاسوں پر مغرور نہیں ہونا چاہیے۔ سب علم والوں سے بڑھ کر بھی ایک علم والا ہے اور اسی کا علم حقیقی ہے۔ اس میں قریش کو، جن کو یہ سرگزشت سنائی گئی ہے، ایک لطیف تنبیہ بھی ہے کہ آج وہ خدا کے رسول کو جن حالات میں دیکھ رہے ہیں ان سے کسی غلط فہمی میں مبتلا نہ ہوں۔ حالات کا حقیقی علم صرف اللہ ہی کو ہے۔ وہ جانتا ہے کہ مستقبل کے پردوں میں کیا چھپا ہوا ہے۔ موجودہ تاریکیوں کے اندر سے کس طرح روشنی برآمد ہوگی اور اسلام اور پیغمبر اسلام کے لیے کس طرح راہیں ہموار ہوں گی۔

قَالُوْٓا اِنْ يَّسْرِقْ فَقَدْ سَرَقَ اَخٌ لَّهٗ مِنْ قَبْلُ ۚ فَاَسَرَّهَا يُوْسُفُ فِيْ نَفْسِهٖ وَلَمْ يُبْدِهَا لَهُمْ ۚ قَالَ اَنْتُمْ شَرٌّ مَّكَانًا ۚ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا تَصِفُوْنَ (۷۷)

بھائیوں کی ایک اور شرارت

جب برادران یوسفؑ نے دیکھا کہ وہ پکڑے گئے تو جھٹ اپنی شرمندگی مٹانے کے لیے حضرت یوسفؑ پر ایک تہمت جڑ دی۔ بولے کہ اگر اس نے چوری کی تو یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہوئی۔ اس سے پہلے اس کا ایک بھائی بھی چوری کر چکا ہے۔ اس طرح انھوں نے گویا یہ تاثر دینے کی کوشش کی کہ یہ ہمارا حقیقی بھائی نہیں بلکہ سوتیلا بھائی ہے اور چوری کی یہ خصلت یہ اپنی ماں کی طرف سے لایا ہے۔ حضرت یوسفؑ نے جب ان کی یہ بات سنی تو ان پر اس کا جو قدرتی اثر پڑنا تھا وہ تو پڑا لیکن وہ اس کو پی گئے اس لیے کہ اس مرحلہ میں ابھی وہ اس کا اظہار نہیں کرنا چاہتے تھے۔ بس دل میں یہ کہہ کے رہ گئے کہ تم بہت ہی برے لوگ ہو اور جو کچھ تم بیان کر رہے ہو اللہ اس کو خوب جانتا ہے۔

قَالُوْا يٰٓاَيُّهَا الْعَزِيْزُ اِنَّ لَهٗٓ اَبًا شَيْخًا كَبِيْرًا فَخُذْ اَحَدَنَا مَكَانَهٗ ۚ اِنَّا نَرٰىكَ مِنَ الْمُحْسِنِيْنَ (۷۸)

حضرت یوسفؑ کی خوشامد

جب انھوں نے دیکھا کہ بازی ہاری گئی تو فوراً خوشامد پر اتر آئے اور حضرت یوسفؑ کو خاص سرکاری خطاب 'عزیز' سے، جو مصر کے اعلیٰ سرکاری عہدہ داروں کے لیے مخصوص تھا، مخاطب کر کے نہایت لجاجت سے عرض کی کہ حضور! اس کا باپ بہت بوڑھا ہو چکا ہے تو آپ اس کی جگہ ہم میں سے کسی کو روک لیجیے اور اس کو رہا کر دیجیے۔ ہم آپ کو ایک نہایت محسن آدمی سمجھتے ہیں، امید ہے کہ آپ ہمیں اپنے احسان سے محروم نہ فرمائیں گے۔

قَالَ مَعَاذَ اللّٰهِ اَنْ نَّاْخُذَ اِلَّا مَنْ وَّجَدْنَا مَتَاعَنَا عِنْدَهٗٓ ۙ اِنَّآ اِذًا لَّظٰلِمُوْنَ (۷۹)

حضرت یوسفؑ کا جواب

حضرت یوسفؑ نے جواب دیا کہ اس بات سے اللہ کی پناہ کہ ہم اس کے سوا کسی کو پکڑیں جس کے پاس اپنی چیز پائی ہے۔ اگر ہم ایسا کریں تو ہم نہایت ظالم ٹھہریں گے۔ یہاں حضرت یوسفؑ کی یہ احتیاط ملحوظ رہے کہ وہ یہ نہیں فرماتے کہ ہم اس کے سوا کسی کو پکڑیں جس نے ہماری چیز چرائی ہے، بلکہ محتاط الفاظ میں یوں فرماتے ہیں کہ اس کے سوا کسی کو پکڑیں جس کے پاس اپنی چیز پائی ہے۔

فَلَمَّا اسْتَيْـَٔسُوْا مِنْهُ خَلَصُوْا نَجِيًّا ۭ قَالَ كَبِيْرُهُمْ اَلَمْ تَعْلَمُوْٓا اَنَّ اَبَاكُمْ قَدْ اَخَذَ عَلَيْكُمْ

مَّوْثِقًا مِّنَ اللّٰهِ وَمِنْ قَبْلُ مَا فَرَّطْتُّمْ فِیْ یُوْسُفَ ج فَلَنْ اَبْرَحَ الْاَرْضَ حَتّٰی یَاْذَنَ لِیْٓ اَبِیْٓ اَوْ یَحْکُمَ اللّٰهُ لِیْ ج وَھُوَ خَیْرُ الْحٰکِمِیْنَ (۸۰)

بھائیوں کی مشورت

حضرت یوسفؑ کے مذکورہ بالا جواب کے بعد وہ ان کی طرف سے تو مایوس ہو گئے کہ وہ چھوڑنے والے نہیں ہیں۔ اب کیا کیا جائے؟ اس سوال پر غور کرنے کے لیے سب بھائی لوگوں سے الگ تھلگ ہو کر مشورہ کے لیے بیٹھے۔ بڑے نے کہا کہ یاد رکھو کہ تمہارے باپ نے اللہ کا واسطہ دلا کر تم سے عہد لیا ہے اور اس سے پہلے یوسف کے معاملے میں جو تقصیر تم سے ہو چکی ہے وہ معلوم ہی ہے تو میں تو یہاں سے ٹلنے کا نہیں جب تک میرے والد مجھے اجازت نہ دیں یا اللہ میرے لیے کوئی فیصلہ نہ فرمائے۔ اور وہی بہترین فیصلہ فرمانے والا ہے۔

اس امر میں اختلاف ہوا ہے کہ 'کَبِیْرُ' سے کون بھائی مراد ہے۔ عمر میں بڑا روبیل یا عقل و رائے میں بڑا یہوذا۔ ہمارے نزدیک لفظ 'کَبِیْرُ' جس طرح 'بَلْ فَعَلَهٗ کَبِیْرُھُمْ ھٰذَا' میں درجہ اور مرتبہ کی بڑائی کے لیے ہے اسی طرح یہاں بھی درجہ اور مرتبہ کی بڑائی ظاہر کرنے کے لیے ہے۔ اگر مجرد عمر کی بڑائی کا اظہار مقصود ہوتا تو اس کے لیے 'اَکْبَرُھُمْ' کا لفظ موزوں ہوتا۔ اس وجہ سے اگر اس سے 'یہوذا' کو مراد لیا جائے تو یہ زیادہ اقرب ہے۔ تورات میں اسی کا نام آیا بھی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس کے دل میں حضرت یوسفؑ کے لیے کوئی نرم گوشہ تھا۔ غالباً اسی نے اس وقت جب حضرت یوسفؑ کے قتل کے مشورے ہو رہے تھے ان کو قتل کرنے کے بجائے کسی سر راہ کنوئیں میں ڈال دینے کا مشورہ دیا کہ کوئی راہ چلتا قافلہ اس کو نکال لے جائے گا، اس طرح ہم اس کے قتل کے گناہ سے بچ جائیں گے اور اس کو ٹھکانے لگانے میں بھی کامیاب ہو جائیں گے۔

اِرْجِعُوْٓا اِلٰٓی اَبِیْکُمْ فَقُوْلُوْا یٰٓاَبَانَآ اِنَّ ابْنَکَ سَرَقَ ج وَمَا شَهِدْنَآ اِلَّا بِمَا عَلِمْنَا وَمَا کُنَّا لِلْغَیْبِ حٰفِظِیْنَ ○ وَسْئَلِ الْقَرْیَةَ الَّتِیْ کُنَّا فِیْهَا وَالْعِیْرَ الَّتِیْٓ اَقْبَلْنَا فِیْهَا ط وَاِنَّا لَصٰدِقُوْنَ (۸۱-۸۲)

'وَسْئَلِ الْقَرْیَةَ' میں مضاف محذوف ہے۔ یعنی وَسْئَلْ اَھْلَ الْقَرْیَةِ۔

یہوذا نے بھائیوں کو یہ مشورہ دیا کہ میں تو یہاں سے کھسکتا نہیں البتہ تم لوگ اپنے باپ کے پاس جاؤ اور ان سے عرض کرو کہ آپ کے صاحبزادے نے چوری کی۔ جو کچھ ہمارے علم میں آیا ہے، ہم وہی کہہ رہے ہیں، ہم غیب کے عالم نہیں ہیں۔ ہم جس بستی میں ٹھہرے تھے اس کے لوگوں سے بھی پوچھ لیجیے اور جس قافلہ کے ساتھ ہم آئے ہیں اس سے بھی دریافت کر لیجیے، ہم اپنے بیان میں بالکل سچے ہیں۔

بھائیوں نے اسی مشورے پر عمل کیا اور آکر باپ کو واقعہ کی رپورٹ دے دی۔ اب آگے حضرت یعقوبؑ کے تاثرات کا ذکر ہے۔

قَالَ بَلْ سَوَّلَتْ لَکُمْ اَنْفُسُکُمْ اَمْرًا ط فَصَبْرٌ جَمِیْلٌ ط عَسَی اللّٰهُ اَنْ یَّاْتِیَنِیْ بِهِمْ جَمِیْعًا ط اِنَّهٗ ھُوَ الْعَلِیْمُ الْحَکِیْمُ (۸۳)

'تَسْوِیْل' کے معنی تزیین اور تسہیل کے ہیں۔ سَوَّلَ لَهُ الشَّیْطٰنُ، شیطان نے اس کو گمراہ کیا اور اس

کی نگاہوں میں کھبایا کہ فلاں کام کر گزرے۔ 'سَوَّلَتْ لَہٗ نَفْسُہٗ کَذَا' اس کے نفس نے فلاں کام کو اس کے لیے آسان بنا دیا اور اس کی نگاہوں میں کھبا دیا۔

'فَصَبْرٌ جَمِیْلٌ' نکرہ موصوف یہاں مبتدا کے محل میں ہے اور خبر اس کی محذوف ہے۔ یعنی صبر جمیل ہی اس حالت میں اولیٰ اور اختیار کے لائق ہے۔ 'صَبْرٌ جَمِیْلٌ' اس صبر کو کہتے ہیں جو اظہار غم کے اوچھے طریقوں سے پاک ہو۔ واویلا اور ماتم و سرکوبی کے بعد تو سب ہی صبر کر لیتے ہیں، صبر جمیل ان لوگوں کے صبر کو کہتے ہیں جو غم کو اس طرح برداشت کرتے ہیں کہ نہ ان کی زبان کسی حرف شکایت سے آلودہ ہوتی نہ ان کے ہاتھ پاؤں سے کسی خلاف وقار حرکت کا صدور ہوتا۔

دو بیٹوں سے محرومی پر حضرت یعقوبؑ کے تاثرات

'قَالَ' کا ظاہر مفہوم تو اگرچہ یہی ہے کہ حضرت یعقوبؑ نے یہ بات بیٹوں کو خطاب کر کے فرمائی ہو لیکن یہ لفظ چونکہ دل میں کہنے کے لیے بھی آتا ہے اس وجہ سے میرا ذہن بار بار اس طرف جاتا ہے کہ حضرت یعقوبؑ نے بیٹوں کی زبانی یہ غم انگیز خبر سن کر یہ بات ان کو خطاب کر کے نہیں بلکہ اپنے دل میں کہی کہ سب تمہارے اپنے نفس کا گھڑا ہوا افسانہ ہے تو صبر جمیل ہی اولیٰ اور احق ہے کہ اس کو اختیار کیا جائے۔ ساتھ ہی ان کے قلب روشن میں یہ امید بڑے زوروں سے ابھری کہ اللہ تعالیٰ ان سب کو میرے پاس جمع کر دے گا، علیم و حکیم تو وہی ہے۔ جس طرح اس کی شدت بارش کی امید کو بڑھاتی ہے اسی طرح آزمائش کی شدت اللہ کی رحمت کی امید کو غذا اور قوت بخشتی ہے۔ خاصانِ خدا اس رمز سے آگاہ ہوتے ہیں کہ اللہ اپنے بندوں کو ان کی طاقت سے زیادہ نہیں آزماتا اس وجہ سے جب وہ دیکھتے ہیں کہ اب معاملہ ان کی طاقت سے باہر ہو رہا ہے تو وہ منتظر ہو جاتے ہیں کہ اب فتح باب میں زیادہ دیر نہیں ہے۔ حضرت یعقوبؑ نے جب دیکھا کہ یوسفؑ کے بعد وہ بن یامین اور یہوذا سے بھی محروم ہو گئے تو انھیں دفعۃً یہ روشنی نظر آئی کہ اب انشاء اللہ سب کے جمع ہو جانے کا وقت قریب آگیا ہے۔ رہی یہ بات کہ یہ کیسے ہو گی تو اس کیسے کا جواب صرف اسی کے پاس ہے جو تمام علم و حکمت کا مالک ہے۔ بندے کو چاہیے کہ وہ اسی علیم و حکیم پر بھروسہ رکھے۔

وَتَوَلّٰی عَنْھُمْ وَقَالَ یٰٓاَسَفٰی عَلٰی یُوْسُفَ وَابْیَضَّتْ عَیْنٰہُ مِنَ الْحُزْنِ فَھُوَ کَظِیْمٌ (۸۴)

'وَتَوَلّٰی عَنْھُمْ' یعنی اس حادثہ کے بعد بیٹوں سے آزردہ اور الگ ہو کر وہ گوشہ میں بیٹھ گئے۔ اس تازہ حادثہ نے حضرت یوسفؑ کے غم کو مزید شدت سے تازہ کر دیا اور اس شدت غم میں ان کی زبان سے ہائے یوسفؑ! کے الفاظ بے ساختہ نکل گئے۔ شدتِ غم اور کثرت گریہ سے ان کی آنکھیں سفید پڑ گئیں اور ہر وقت سینہ میں غم دبائے رکھنے کے سبب سے وہ گھٹے گھٹے سے رہنے لگے۔ یہ واضح رہے کہ یہ ساری حالتیں ان کے تنہائی کے غم و الم کی بیان ہو رہی ہیں جس میں معاملہ تمام تر ان کے اور ان کے رب کے درمیان تھا۔ اس حقیقت کا انھوں نے اظہار بھی فرمایا ہے۔ 'اِنَّمَآ اَشْکُوْا بَثِّیْ وَحُزْنِیْٓ اِلَی اللّٰہِ وَاَعْلَمُ مِنَ اللّٰہِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ' (میں اپنی پریشانی اور غم کا شکوہ اپنے اللہ ہی کے آگے کر رہا ہوں اور میں اللہ کی طرف سے ان باتوں کو جانتا ہوں جن کو تم نہیں جانتے) اپنے غم و الم کا اظہار اپنے رب کے آگے کرنا نہ صرف یہ کہ کوئی بری بات نہیں ہے بلکہ نہایت اچھی بات ہے۔ اس غم و الم کا باعث

یاس نہیں بلکہ امید ہوتی ہے۔ بندہ یہ توقع رکھتا ہے کہ وہ جتنا ہی اپنے رب کے آگے روئے گا اتنا ہی اس کا رونا اس کی رحمت کو جوش میں لائے گا۔ رونا دھونا وہ ممنوع ہے جو دوسروں کے آگے ہو، جو امید کے بجائے یاس کا مظہر ہو اور جس میں انسان اپنی بے صبری کا اظہار اس طرح کرے جس سے ایمان اور توکل کا وقار مجروح ہو۔

یہ بات کچھ عجیب نہیں کہ اس تازہ حادثہ نے بھی حضرت یعقوبؑ کے دل میں حضرت یوسفؑ ہی کے غم کو ہرا کیا۔ اول تو بن یامین کے حادثہ کی نوعیت وہ نہیں تھی جو حضرت یوسفؑ کے حادثہ کی تھی، ثانیاً حضرت یعقوبؑ کو حضرت یوسفؑ سے جو دل بستگی تھی وہ صرف بیٹے ہونے کے سبب سے نہیں تھی بلکہ اس میں اصلی دخل ان کی ان اعلیٰ صلاحیتوں کو تھا جن کی بنا پر حضرت یعقوبؑ ان سے اس درجہ محبت کرتے تھے کہ وہ اپنے تمام بھائیوں کے محسود بن گئے اور بالآخر اسی کے نتیجہ میں بھائیوں کے ہاتھوں انھیں نہایت زہرہ گداز آزمائشوں سے گزرنا پڑا۔

غم والم کی شدت اور رونے دھونے سے آنکھوں کا سفید ہو جانا کوئی مبالغہ کا اسلوب بیان نہیں ہے بلکہ بیان حقیقت ہے۔ غم اور گریہ سے پلکوں اور پتلیوں کی سیاہی بھی متاثر ہوتی ہے اور آنکھوں کے سرخ ڈورے بھی آہستہ آہستہ غائب ہو جاتے ہیں۔ لفظ کَظِیْمٌ حضرت یعقوبؑ کے صبر کی تعریف کے لیے ہے کہ ہر وقت غم کو سینہ میں دبائے رکھنے کے سبب سے وہ گھٹے گھٹے سے رہتے۔ یٰاَسَفٰی میں آخر کا الف یائے اضافت کا قائم مقام ہے۔

قَالُوْا تَاللّٰهِ تَفْتَؤُا تَذْكُرُ يُوْسُفَ حَتّٰى تَكُوْنَ حَرَضًا اَوْ تَكُوْنَ مِنَ الْهٰلِكِيْنَ (۸۵)

'تَاللّٰهِ' عربی میں 'وَ' کی طرح 'تَ' بھی قسم کے لیے آتی ہے۔ 'تَفْتَؤُا' لاتزال کے معنی میں ہے۔ 'حَرَضٌ' اس شخص کو کہتے ہیں جو ہلاکت کے قریب پہنچ جائے اور از کار رفتہ ہو کے رہ جائے۔

باپ کو بیٹوں کی ملامت

سعادت مند بیٹوں نے یہ سب کچھ کر گزرنے کے بعد باپ کو نصیحت کرنی شروع کی کہ خدا کی قسم! آپ اسی طرح یوسفؑ کی یاد میں لگے رہیں گے یہاں تک کہ از کار رفتہ ہو کر رہ جائیں گے یا ہلاک ہی ہو جائیں گے۔ یہ ملحوظ رہے کہ اس نصیحت کا انداز اگرچہ بظاہر ہمدردانہ ہے لیکن در پردہ اس کے اندر بھی ان کا وہی جذبۂ حسد کارفرما ہے جو ان کے ان تمام اقدامات کا باعث ہوا جو اوپر مذکور ہوئے۔ انھوں نے تو حضرت یوسفؑ کو اس توقع پر ٹھکانے لگایا تھا کہ اس کے بعد باپ کی ساری توجہ ان پر مرکوز ہو کے رہے گی لیکن اب ان کو نظر آیا کہ ان کی اس سعی نامراد کا نتیجہ بالکل الٹا نکلا۔ اب تک باپ کی توجہ اور نظر التفات کا کوئی گوشہ ان کو حاصل تھا تو اب وہ اس سے بھی محروم ہو گئے۔ انھوں نے دیکھا کہ باپ کا اس کے سوا کوئی کام ہی نہیں رہ گیا ہے کہ گوشۂ تنہائی میں یوسفؑ کو یاد کر کے روئیں اور اپنے رب سے استغاثہ اور فریاد کریں۔

قَالَ اِنَّمَاۤ اَشْكُوْا بَثِّيْ وَحُزْنِيْۤ اِلَى اللّٰهِ وَاَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ (۸۶)

'بث' کا بالکل ٹھیک ترجمہ پریشانی ہے۔

باپ کا جواب

حضرت یعقوبؑ نے جواب میں فرمایا کہ میرے اس غم والم پر مجھے ملامت نہ کرو، میں اپنی پریشانی اور غم کا

شکوہ اپنے اللہ ہی سے کر رہا ہوں۔ کسی اور سے نہیں کر رہا ہوں۔ رونا دھونا وہ برا ہے جو خدا کے سوا کسی اور کے آگے ہو، اگر بندہ اپنے رب ہی کے آگے روتا ہے تو یہ کوئی برائی نہیں بلکہ یہ بھی عبادت ہے۔ اور یہ نہ سمجھو کہ میں یہ کوئی بے سود کام کر رہا ہوں۔ خدا کے معاملے میں تمہارا تجربہ اور ہے، میرا تجربہ کچھ اور ہے۔ میں خدا کی طرف سے وہ باتیں جانتا ہوں جن سے تم آشنا نہیں۔ تو مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔ میں اب رب کی رحمت سے مایوس نہیں ہوں۔

يٰبَنِيَّ اذْهَبُوْا فَتَحَسَّسُوْا مِنْ يُّوْسُفَ وَاَخِيْهِ وَلَا تَايْـَٔسُوْا مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ ۭ اِنَّهٗ لَا يَايْـَٔسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْكٰفِرُوْنَ (۸۷)

جب بات یہاں تک پہنچ گئی کہ حضرت یعقوبؑ نے بیٹوں کے سامنے اپنے دل کا یہ راز کھول دیا کہ وہ یوسفؑ کے باب میں اپنے رب کی رحمت سے مایوس نہیں ہیں تو صاف لفظوں میں ان سے نہایت پیار کے انداز میں یہ بھی کہہ دیا کہ اے میرے بیٹو جاؤ، یوسف اور اس کے بھائی کی ٹوہ لگاؤ اور خدا کی مشکل کشائی اور اس کی تائید و رحمت سے مایوس نہ ہو، اللہ کی تائید و رحمت سے صرف کافر ہی مایوس ہوتے ہیں۔ مطلب یہ کہ جی جان کی بازی لگا کر یہ کام کرو گے تو رحمت الٰہی کا ایک ہی جھونکا تمام مشکلیں آسان کر دے گا۔

فَلَمَّا دَخَلُوْا عَلَيْهِ قَالُوْا يٰٓاَيُّهَا الْعَزِيْزُ مَسَّنَا وَاَهْلَنَا الضُّرُّ وَجِئْنَا بِبِضَاعَةٍ مُّزْجٰىةٍ فَاَوْفِ لَنَا الْكَيْلَ وَتَصَدَّقْ عَلَيْنَا ۭ اِنَّ اللّٰهَ يَجْزِي الْمُتَصَدِّقِيْنَ (۸۸)

'ضر' کا مفہوم

'ضُرّ' اس تکلیف کو کہتے ہیں جو بھوک اور قحط وغیرہ کے سبب سے پہنچتی ہے۔

'بِضَاعَةٍ مُّزْجٰىةٍ' ایسی پونجی جس کو کوئی قبول نہ کرے۔ حقیر، غیر مطلوب۔ اس لفظ کے استعمال سے ذہن اس طرف جاتا ہے کہ وہ قیمت ادا کرنے کے لیے نقد کے بجائے کوئی ایسی جنس لے کر گئے تھے جس کی کوئی خاص مانگ نہیں تھی۔

حضرت یوسفؑ کی خدمت میں دوبارہ حاضری

یہ اندازہ تو یہاں سے نہیں ہوتا کہ باپ کی اپیل کا ان پر کیا اثر پڑا لیکن غلہ کی ضرورت نے انھیں پھر مصر جانے پر مجبور کیا۔ وہاں جب حضرت یوسفؑ کے سامنے ان کی پیشی ہوئی تو انھوں نے بڑے رقت انگیز انداز میں اپنی خستہ حالی اور پریشانی کا ذکر کیا۔ حضرت یوسفؑ کو ان کے سرکاری خطاب 'عزیز' سے مخاطب کیا اور بولے کہ حضور ہم اور ہمارے اہل و عیال قحط کے سبب سے سخت تکلیف میں ہیں، ہم اب کے پونجی بھی نہایت حقیر ہی لے کر آئے ہیں لیکن ہماری درخواست یہ ہے کہ غلہ بھی ہمیں پورا پورا دیجیے اور مزید برآں ہمیں صدقہ بھی عنایت فرمائیے۔ اللہ تعالیٰ صدقہ دینے والوں کو جزا عطا فرماتا ہے۔

قَالَ هَلْ عَلِمْتُمْ مَّا فَعَلْتُمْ بِيُوْسُفَ وَاَخِيْهِ اِذْ اَنْتُمْ جٰهِلُوْنَ (۸۹)

افشائے راز

حضرت یوسفؑ بھائی اور شریف بھائی تھے۔ بھائیوں کی اس بدحالی اور پریشانی اور ان کی اس لجاجت آمیز درخواست بالخصوص درخواست صدقہ نے ان کے دل کو ہلا دیا۔ یہ بڑے طنطنہ کے لوگ تھے لیکن اب حالات نے اس طرح ان کے اعصاب ڈھیلے کر دیے تھے کہ صدقہ کے لیے درخواست کرنے میں بھی انھیں عار نہ تھا۔ حضرت

یوسفؑ اس صورتِ حال سے اس درجہ متاثر ہوئے کہ بیگانگی کا جو پردہ ان کے اور ان کے بھائیوں کے درمیان اب تک حائل تھا اس کو مزید برقرار رکھنا انھوں نے مناسب نہیں خیال فرمایا۔ ارشاد ہوا کہ یوسفؑ اور اس کے بھائی کے ساتھ اپنی جہالت کے زمانے میں جو کچھ کر چکے ہو وہ کچھ تمھیں یاد ہے؟ لفظ 'جھل' یہاں بے جذبات سے مغلوبیت کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ اس کی تشریح ایک سے زائد مقامات میں ہم کر چکے ہیں۔

قَالُوٓا ءَاِنَّكَ لَاَنْتَ يُوْسُفُ ؕ قَالَ اَنَا يُوْسُفُ وَهٰذَآ اَخِيْ ؗ قَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْنَا ؕ اِنَّهٗ مَنْ يَّتَّقِ وَيَصْبِرْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ (۹۰)

حضرت یوسفؑ کی زبان سے لفظ یوسف نکلنا تھا کہ یہ لوگ بول پڑے کہ اچھا! آپ یوسفؑ ہی ہیں؟ ان کے اس فقرے سے یہ بات مترشح ہوتی ہے کہ اس سے پہلے کی ملاقاتوں میں بھی چہرے، بشرے، انداز، اطوار سے انھیں یہ بات کھٹکتی رہی تھی کہ کہیں یہ یوسف تو نہیں ہیں؟ لیکن کنعان کے اس کنوئیں میں، جس میں انھوں نے حضرت یوسفؑ کو ڈالا تھا، اور اس تختِ حکومت میں، جس پر حضرت یوسف اب فروکش تھے، اتنا بُعد تھا کہ وہ یہ گمان نہیں کر سکتے تھے کہ یوسفؑ وہاں سے یہاں تک پہنچ سکتے ہیں۔ جن لوگوں کی نگاہ صرف ظواہر تک محدود رہتی ہے وہ قدرتِ الٰہی اور رحمتِ ربانی کے ان عجائب کا تصور نہیں کر سکتے۔ چنانچہ جب جب ان کا ذہن اس طرف گیا کہ ان میں بہت سی جھلکیاں یوسفؑ کی ہیں تو اس کو وہ محض واہمہ کی کرشمہ سازی سمجھ کر دل سے نکالتے رہے لیکن اب جب کہ حضرت یوسفؑ کا مذکورہ بالا فقرہ کانوں میں پڑا تو وہ پکار اٹھے کہ اچھا آپ یوسف ہی ہیں؟

حضرت یوسفؑ نے فرمایا کہ جی ہاں! میں یوسف ہوں اور یہ میرا بھائی ہے۔ اللہ نے ہم پر اپنا فضل فرمایا۔ جو لوگ تقویٰ اختیار کرتے ہیں اور اس پر خوبی کے ساتھ ثابت قدم رہتے ہیں تو اللہ ایسے خوب کاروں کے اجر کو ضائع نہیں کرتا۔ بلکہ دنیا میں بھی ان کو اپنے فضل سے نوازتا ہے اور آخرت میں بھی اس کا بھرپور صلہ عطا فرمائے گا۔

یہی حقیقت اس ساری سرگزشت کی روح ہے اور ہم شروع میں عرض کر چکے ہیں کہ اسی کو اس سورہ کے عمود کی حیثیت بھی حاصل ہے۔ 'احسان' کا لفظ یہاں تقویٰ اور صبر کی بنیادی شرط کی حیثیت سے مذکور ہوا ہے یعنی عند اللہ مقبول تقویٰ اور صبر وہ ہے جس کے اندر 'احسان' کی روح ہو یعنی بندہ اس طرح تقویٰ اور صبر کا حق ادا کرے گویا وہ خدا کو دیکھ رہا ہے اور یہ یقین رکھے کہ اگر وہ خدا کو نہیں دیکھ رہا ہے تو خدا تو بہرحال اس کو دیکھ رہا ہے۔

قَالُوْا تَاللّٰهِ لَقَدْ اٰثَرَكَ اللّٰهُ عَلَيْنَا وَاِنْ كُنَّا لَخٰطِـِٕيْنَ (۹۱)

'اِیْثَار' کے معنی ترجیح اور فضیلت دینے کے ہیں۔

اعترافِ حق

اس مرحلہ میں آکر انھوں نے خدا کی قسم کھا کر اقرار کیا کہ بے شک خدا نے آپ کو ہم پر فضیلت دی اور ہم غلطی پر تھے۔ یعنی ہم نے اس غم و غصہ میں یہ سارے پاپڑ بیلے کہ ہمارے باپ ہمارے مقابل میں کیوں آپ کو

خاص مہر و محبت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ اب خود اللہ تعالیٰ نے آپ کو ہم پر کھلی ہوئی فضیلت دے کر ہم پر ہماری غلطی واضح فرما دی۔ ہم تسلیم کرتے ہیں کہ آپ کو جو فضیلت حاصل ہوئی آپ اس کے سزاوار تھے اور ہم نے جو کچھ کیا ہم اس میں غلطی پر تھے۔

قَالَ لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ ط يَغْفِرُ اللّٰهُ لَكُمْ ز وَهُوَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ (۹۲)

حضرت یوسفؑ کا عفو و کرم

'تَثْرِيْب' کے معنی کسی کو اس کے کسی قابلِ ملامت فعل پر ملامت کرنے کے ہیں۔ اگر سچے احساسِ ندامت کے ساتھ کوئی شخص اپنی غلطی کا اعتراف کر لیتا ہے تو ایک کریم بن کریم اس کو معاف ہی کر دیتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے ہاں بھی اس کی معافی کی امید ہوتی ہے اس لیے کہ وہ تمام مہربانوں سے بڑھ کر مہربان ہے۔ حضرت یوسفؑ نے جب یہ محسوس فرما لیا کہ یہ لوگ سچے دل سے اپنی غلطی کے معترف ہیں تو انھوں نے نہایت فیاضی سے ان کو معاف فرما دیا کہ اب آپ لوگوں پر کوئی الزام نہیں اور خدا کے ہاں بھی ان کو معافی کی امید دلائی۔

یہاں یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ یہی الفاظ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے دن قریش کے ان سرغنوں کو خطاب کر کے فرمائے جو برابر آپ کی دشمنی میں سرگرم رہے تھے۔ جب یہ لوگ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے حاضر ہوئے تو آپ نے ان سے سوال کیا کہ تم جانتے ہو کہ میں تمھارے ساتھ کیا معاملہ کرنے والا ہوں؟ وہ بولے کہ آپ شریف بھائی اور شریف بھائی کے بیٹے ہیں، آپ نے فرمایا کہ میں تم سے وہی بات کہتا ہوں جو میرے بھائی یوسفؑ نے اپنے بھائیوں سے کہی تھی، اب تم پر کوئی الزام نہیں، جاؤ تم آزاد ہو۔

اِذْهَبُوْا بِقَمِيْصِيْ هٰذَا فَاَلْقُوْهُ عَلٰى وَجْهِ اَبِيْ يَاْتِ بَصِيْرًا ج وَاْتُوْنِيْ بِاَهْلِكُمْ اَجْمَعِيْنَ (۹۳)

پیراہنِ یوسف کی کرامات

جس ضعفِ بصارت کا سبب غم و الم اور گریہ و زاری ہو، جیسا کہ آیت ۸۴ میں گزر چکا ہے، اس کا واحد علاج یہ ہے کہ کوئی ایسی چیز سامنے آئے جو نہ صرف اس سارے غم و الم کو دھو کر صاف کر دے بلکہ اس کی لائی ہوئی خوشی رگ رگ میں ایک حیات تازہ دوڑا دے۔ حضرت یوسفؑ کو بنیامین کے ذریعہ سے باپ کا سارا حال معلوم ہو چکا تھا کہ روتے روتے ان کی آنکھیں سفید پڑ چکی ہیں۔ چنانچہ انھوں نے اپنا کرتا بھائیوں کو دیا کہ اس کو لے جاؤ، میرے باپ کے منہ پر اس کو ڈال دینا، اس سے ان کی آنکھیں روشن ہو جائیں گی۔ یہاں یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ حضرت یعقوبؑ کے سامنے زندگی کا سب سے بڑا غم بھی پیراہنِ یوسف ہی کی شکل میں آیا تھا جب کہ بھائیوں نے اس پر خون لگا کر بوڑھے باپ کے سامنے پیش کیا کہ یوسفؑ کو بھیڑیا کھا گیا اور اب زندگی کی سب سے بڑی خوشی بھی پیراہنِ یوسفؑ ہی کی شکل میں نمودار ہونے والی تھی۔

حضرت یوسفؑ نے اپنے جسم سے مَس کیا ہوا کرتا ہی اپنی نشانی کے طور پر کیوں بھیجا؟ اور کرتے میں یہ اثر کہاں سے آیا کہ اس سے بصارت عود کر آئے؟ یہ سوالات نہ ہر شخص کے حل کرنے کے ہیں اور نہ اس کا حل ہر شخص کی سمجھ میں آ سکتا ہے۔ ان چیزوں کا تعلق جذبات سے ہے اور جذبات بھی ایسے عالی مقام لوگوں کے کہ ایک طرف حضرت یعقوبؑ ہیں، دوسری طرف حضرت یوسفؑ۔ ہم عامی اس طرح کے معاملات میں اس سے

زیادہ کچھ نہیں کہہ سکتے کہ سچے جذبات کی تاثیر و تاثر کے کرشمے ایسی حیرت انگیز صورتوں میں ظاہر ہوتے ہیں کہ عقل ان کی توجیہ سے بالکل قاصر رہ جاتی ہے۔

'وَأْتُونِي بِأَهْلِكُمْ أَجْمَعِينَ' بھائیوں کو حضرت یوسفؑ نے یہ ہدایت بھی فرمائی کہ اپنے اہل و عیال سمیت سب یہاں آ جاؤ۔ والدین کا ذکر غایت وضاحت کی وجہ سے حذف ہے۔ ظاہر ہے کہ اصل مقصود تو انہی کو بلانا تھا۔ بقیہ سارے تو ان کے توابع کی حیثیت رکھتے تھے۔

وَلَمَّا فَصَلَتِ الْعِيرُ قَالَ أَبُوهُمْ إِنِّي لَأَجِدُ رِيحَ يُوسُفَ لَوْلَا أَنْ تُفَنِّدُونِ (۹۴)

'فَصَلَ فُصُولًا' کے معنی کسی جگہ سے چلنے اور نکلنے کے ہیں اور 'تَفْنِيد' کے معنی ہیں کسی کو خرف اور بے وقوف سمجھ کر اس کی رائے اور بات کو بے وزن اور غلط قرار دینا۔

پیراہن یوسف کی خوشبو

ادھر قافلہ مصر سے روانہ ہوا ادھر حضرت یعقوبؑ نے اپنے گرد و پیش والوں سے فرمایا کہ اگر تم لوگ مجھے خبطی نہ قرار دو تو میں یہ کہوں کہ میں یوسفؑ کی خوشبو محسوس کر رہا ہوں۔ شدت توجہ عام حالات میں بھی آدمی کے حواس کی قوت میں بہت اضافہ کر دیتی ہے۔ یہاں تو معاملہ بھی خاص نوعیت کا ہے اور قوت حاسہ بھی حضرت یعقوبؑ جیسے پیغمبر کی ہے۔ اس وجہ سے اس بات پر ذرا تعجب نہیں ہونا چاہیے کہ حضرت یعقوبؑ نے اتنی دور سے پیراہن یوسفؑ کی خوشبو محسوس کر لی۔ انبیا کے قویٰ اور حواس کو اپنے قویٰ اور حواس پر قیاس نہیں کرنا چاہیے۔ ان کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا معاملہ خاص ہوتا ہے۔

فلسفی کو منکر حنانہ است
از حواس انبیاء بیگانہ است

قَالُوا تَاللَّهِ إِنَّكَ لَفِي ضَلَالِكَ الْقَدِيمِ (۹۵)

اس پر سننے والوں نے وہی کہا جس کا حضرت یعقوبؑ نے اندیشہ ظاہر کیا تھا۔ وہ بولے کہ آپ اب تک اپنے اسی خبط میں مبتلا ہیں جس میں پہلے مبتلا تھے۔

فَلَمَّا أَنْ جَاءَ الْبَشِيرُ أَلْقَاهُ عَلَىٰ وَجْهِهِ فَارْتَدَّ بَصِيرًا ۖ قَالَ أَلَمْ أَقُلْ لَكُمْ إِنِّي أَعْلَمُ مِنَ اللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ (۹۶)

'فَلَمَّا أَنْ جَاءَ الْبَشِيرُ' میں 'اَنْ' سے پہلے ایک فعل محذوف ہے۔ یعنی یہ بات واقع ہوئی کہ خوشخبری دینے والا پہنچا تو یوسفؑ کا کرتا اس نے حضرت یعقوبؑ کے چہرے پر ڈال دیا اور ان کی آنکھیں روشن ہو گئیں۔ انھوں نے فرمایا کیا میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ میں خدا کی طرف سے وہ باتیں جانتا ہوں جن کو تم نہیں جانتے۔ یہ اس بات کا حوالہ ہے جو پیچھے آیت ۸۶ میں گزر چکی ہے۔ جو بات انھوں نے فرمائی تھی جب وہ واقعہ کی شکل میں ظہور میں آ گئی تو انھوں نے اس پر اظہار مسرت بھی فرمایا اور بیٹوں کو یہ تعلیم بھی دی کہ وہ صرف ظاہر کے غلام بن کر زندگی نہ گزاریں بلکہ اس ظاہر کے اندر خدا کے مخفی ہاتھوں کی جو کارفرمائیاں ہیں ان پر بھی

ایمان رکھیں۔ اس کے بغیر خدا پر ایمان و توکل کا حق ادا نہیں ہو سکتا۔

قَالُوْا يٰٓاَبَانَا اسْتَغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَآ اِنَّا كُنَّا خٰطِـِٕيْنَ (۹۷)

باپ سے استغفار کی درخواست

یہ سب کچھ دیکھ لینے کے بعد بیٹوں کو اپنی نادانیوں کا احساس ہوا اور انھوں نے جس طرح حضرت یوسفؑ کے سامنے اپنی غلطی کا اعتراف کیا، جس کا ذکر آیت ۹۱ میں گزر چکا ہے، اسی طرح باپ کے سامنے بھی غلطی کا اعتراف کیا اور ان سے درخواست کی کہ آپ ہمارے گناہوں کی معافی کے لیے اللہ تعالیٰ سے دعا کریں۔

قَالَ سَوْفَ اَسْتَغْفِرُ لَكُمْ رَبِّيْ ۭ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ (۹۸)

حضرت یعقوبؑ نے ان کی یہ استدعا قبول فرمائی اور ان سے وعدہ کیا کہ میں عنقریب تمھارے لیے اپنے رب سے گناہوں کی معافی کے لیے دعا کروں گا۔ 'سَوْفَ' کا لفظ یہاں اس بات کی طرف اشارہ کر رہا ہے کہ حضرت یعقوبؑ نے ان کے لیے خاص اہتمام کے ساتھ، خاص وقت میں، دعا کا وعدہ فرمایا۔ یہ کہ کر ان کو ٹالنے کی کوشش نہیں کی کہ جاؤ، اللہ تمھیں معاف فرمائے۔ اس سے ایک بات تو یہ معلوم ہوئی کہ آدمی کا دل اگر خود اپنے گناہوں پر پشیمان ہو تو اس کو صالحین سے دعا کی درخواست بھی کرنی چاہیے اور اس کے حق میں صالحین کی دعا قبول بھی ہوتی ہے۔ دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ یوں تو بندہ ہر وقت اپنے رب سے دعا کر سکتا ہے لیکن خاص اہتمام، خاص وقت اور خاص جگہ بھی اس کی قبولیت کے معاملے میں ایک مؤثر چیز ہے۔

ہر سخن جائے و ہر نکتہ مکانے دارد

فَلَمَّا دَخَلُوْا عَلٰي يُوْسُفَ اٰوٰٓى اِلَيْهِ اَبَوَيْهِ وَقَالَ ادْخُلُوْا مِصْرَ اِنْ شَاۗءَ اللّٰهُ اٰمِنِيْنَ (۹۹)

حضرت یوسفؑ کی خدمت میں حاضری

یہاں قرینہ کی موجودگی کے سبب سے اتنی بات محذوف ہے کہ یہ لوگ حضرت یوسفؑ کے ارشاد کی تعمیل میں اپنے والدین اور اہل و عیال سمیت مصر پہنچے۔ مصر پہنچ کر جب حضرت یوسفؑ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو انھوں نے اپنے والدین کو خاص اپنے پاس جگہ دی اور ان سب لوگوں کا خیر مقدم کیا۔ 'اُدْخُلُوْا مِصْرَ اِنْ شَاۗءَ اللّٰهُ اٰمِنِيْنَ' خیر مقدم کا جملہ ہے یعنی مصر میں داخل ہو جیے، یہ داخلہ انشاء اللہ امن و اطمینان کا موجب ہوگا۔ تورات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت یوسفؑ نے شہر سے باہر نکل کر ان لوگوں کا خیر مقدم کیا اور اس شان سے ان لوگوں کو شہر میں لائے کہ ایک جشن کی صورت پیدا ہو گئی۔

'اَبَوَيْهِ' کا لفظ یہاں علی سبیل التغلیب استعمال ہوا ہے اس لیے کہ تورات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت یوسفؑ کی والدہ کا انتقال ہو چکا تھا۔ ان کی پرورش سوتیلی ماں نے کی تھی جو ان کی حقیقی خالہ بھی تھیں۔

وَرَفَعَ اَبَوَيْهِ عَلَي الْعَرْشِ وَخَرُّوْا لَهٗ سُجَّدًا ۚ وَقَالَ يٰٓاَبَتِ هٰذَا تَاْوِيْلُ رُءْيَايَ مِنْ قَبْلُ ۡ قَدْ جَعَلَهَا رَبِّيْ حَقًّا ۭ وَقَدْ اَحْسَنَ بِيْٓ اِذْ اَخْرَجَنِيْ مِنَ السِّجْنِ وَجَاۗءَ بِكُمْ مِّنَ الْبَدْوِ مِنْۢ بَعْدِ اَنْ نَّزَغَ الشَّيْطٰنُ بَيْنِيْ وَبَيْنَ اِخْوَتِيْ ۭ اِنَّ رَبِّيْ لَطِيْفٌ لِّمَا يَشَاۗءُ ۭ اِنَّهٗ هُوَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ (۱۰۰)

'عَرْش' سے مراد یہاں تختِ شاہی نہیں بلکہ وہ تخت ہے جس پر حضرت یوسفؑ فصلِ مقدمات وغیرہ کے لیے فروکش ہوا کرتے تھے۔ معلوم ہوتا ہے اس دور میں وزراء اور اعلیٰ حکام تخت ہی پر بیٹھتے تھے۔

'خَرُّوْا' کے معنی اوپر سے نیچے کی طرف گرنے اور 'سُجُوْد' کے معنی فرماں بردارانہ جھکنے کے ہیں پیشانی زمین پر ٹیکنا اس کے لیے لازم نہیں بلکہ یہ اس کی تکمیلی صورت ہے جب اس کے ساتھ 'خَرَّ' کا لفظ آئے تو اس کے معنی بے اختیارانہ جھک پڑنے کے ہوں گے۔ عام اس سے کہ یہ جھک پڑنا صرف جھک پڑنے کی حد تک ہو یا پیشانی زمین پر ٹیک دینے کی حد تک۔ جس عہد کا یہ واقعہ ہے تورات وغیرہ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں بڑوں کی تعظیم کے لیے یہ طریقہ معروف رہا ہے لیکن اس کی صورت زمین پر پیشانی ٹیک دینے کی نہیں بلکہ جھک پڑنے کی تھی۔ اور اگر کوئی شخص اس سجود سے اصطلاحی سجدہ ہی مراد لے جب بھی کوئی خاص فرق نہیں پڑتا کیونکہ سجدہ بجائے خود شرک نہیں بلکہ شرک کے اشباہ و قوالب میں سے ہے اور یہ اشباہ و قوالب حتمی طور پر آخری اور کامل دین یعنی اسلام میں حرام ہوئے۔

حضرت یوسفؑ نے اپنے والدین کو تعظیماً تخت پر جگہ دی بقیہ لوگ حسبِ دستورِ عام لوگوں کے بیٹھنے کی جگہ پر بیٹھے ہوں گے۔ اس کے بعد معلوم ہوتا ہے حضرت یوسفؑ نمودار ہوئے اور قاعدے کے مطابق ان کے خدم و حشم ان کی تعظیم کے لیے جھکے تو ماحول سے متاثر ہو کر یہ لوگ بھی بے اختیارانہ ان کی تعظیم کے لیے جھک پڑے۔

خواب کی تعبیر

'وَقَالَ يٰٓاَبَتِ هٰذَا تَاْوِيْلُ رُءْيَايَ مِنْ قَبْلُ قَدْ جَعَلَهَا رَبِّيْ حَقًّا' 'يٰٓاَبَتِ' میں 'ت' 'ی' کی قائم مقام ہے۔ حضرت یوسفؑ نے یہ منظر دیکھا تو انھیں اپنا وہ خواب یاد آگیا جو انھوں نے پہلے دیکھا تھا کہ گیارہ ستارے اور سورج اور چاند مجھے سجدہ کر رہے ہیں۔ انھوں نے والد ماجد کو مخاطب کر کے فرمایا کہ والد ماجد! یہ ہے میرے اس خواب کی تعبیر جو میں نے پہلے دیکھا تھا، میرے رب نے اس کو سچ کر دکھایا۔ اس کے بعد حضرت یوسفؑ نے اپنی جیل سے رہائی اور ایک مدت کی جدائی کے بعد ماں باپ اور بھائیوں کی یکجائی پر اپنے رب کا شکر ادا کیا۔

'اِنَّ رَبِّيْ لَطِيْفٌ لِّمَا يَشَآءُ' یعنی میرا رب جس کام کو کرنا چاہتا ہے اس کے لیے اپنے علم اور اپنی حکمت سے ایسی باریک راہیں نکال لیتا ہے کہ اس کا سان گمان بھی نہیں ہوتا۔ حضرت یوسفؑ کی یہ پوری سرگزشت اس حقیقت کی ایک عظیم شہادت ہے۔

رَبِّ قَدْ اٰتَيْتَنِيْ مِنَ الْمُلْكِ وَعَلَّمْتَنِيْ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ ۚ فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۣ اَنْتَ وَلِيّٖ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۚ تَوَفَّنِيْ مُسْلِمًا وَّاَلْحِقْنِيْ بِالصّٰلِحِيْنَ (۱۰۱)

حضرت یوسفؑ کا دل یہ منظر دیکھ کر خدا کی حمد و سپاس میں ڈوب جاتا ہے۔ وہ اپنے رب کا شکر ادا کرتے ہیں کہ حکومت بھی تو ہی نے مجھے عطا فرمائی اور خوابوں کی تعبیر کا علم بھی تو ہی نے بخشا، اے آسمانوں اور زمین کے خالق دنیا اور آخرت دونوں میں میرا کارساز اور مددگار تو ہی ہے۔ مجھے اسلام پر وفات دینا اور مجھے صالحین کے زمرے میں داخل کرنا۔

۱۰- آگے کا مضمون ـــــ آیات ۱۰۲-۱۱۱

خاتمۂ سورہ

اب یہ خاتمۂ سورہ کی آیات ہیں جن میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کرکے آپ کو تسلی دی گئی ہے اور ساتھ ہی قریش کو دھمکی ہے کہ اگر انھوں نے قوموں کی تاریخ سے سبق نہ لیا تو اس انجام سے دوچار ہونے کے لیے تیار رہیں جس سے پچھلی قومیں دوچار ہو چکی ہیں ـــــ آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۱۰۲-۱۱۱

ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهِ اِلَيْكَ ۚ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ اَجْمَعُوْٓا
اَمْرَهُمْ وَهُمْ يَمْكُرُوْنَ ﴿۱۰۲﴾ وَمَآ اَكْثَرُ النَّاسِ وَلَوْ حَرَصْتَ بِمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۰۳﴾
ع ۱۱ / ۵ وَمَا تَسْـَٔلُهُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ ۭ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۰۴﴾ وَكَاَيِّنْ مِّنْ
اٰيَةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ يَمُرُّوْنَ عَلَيْهَا وَهُمْ عَنْهَا مُعْرِضُوْنَ ﴿۱۰۵﴾
وَمَا يُؤْمِنُ اَكْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ اِلَّا وَهُمْ مُّشْرِكُوْنَ ﴿۱۰۶﴾ اَفَاَمِنُوْٓا اَنْ
تَاْتِيَهُمْ غَاشِيَةٌ مِّنْ عَذَابِ اللّٰهِ اَوْ تَاْتِيَهُمُ السَّاعَةُ بَغْتَةً وَّهُمْ
لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۱۰۷﴾ قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ ۚ عَلٰي بَصِيْرَةٍ اَنَا وَ (دعوۃ النبی علیہ السلام)
مَنِ اتَّبَعَنِيْ ۭ وَسُبْحٰنَ اللّٰهِ وَمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۱۰۸﴾ وَمَآ اَرْسَلْنَا
مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْٓ اِلَيْهِمْ مِّنْ اَهْلِ الْقُرٰى ۭ اَفَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي
الْاَرْضِ فَيَنْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۭ وَلَدَارُ الْاٰخِرَةِ
خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ اتَّقَوْا ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۱۰۹﴾ حَتّٰٓي اِذَا اسْتَيْـَٔسَ الرُّسُلُ وَ
ظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ قَدْ كُذِبُوْا جَاۗءَهُمْ نَصْرُنَا ۙ فَنُجِّيَ مَنْ نَّشَاۗءُ ۭ وَلَا يُرَدُّ بَاْسُنَا
عَنِ الْقَوْمِ الْمُجْرِمِيْنَ ﴿۱۱۰﴾ لَقَدْ كَانَ فِيْ قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِّاُولِي الْاَلْبَابِ ۭ
مَا كَانَ حَدِيْثًا يُّفْتَرٰى وَلٰكِنْ تَصْدِيْقَ الَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ وَ
ع ۱۲ / ۶ تَفْصِيْلَ كُلِّ شَيْءٍ وَّهُدًى وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴿۱۱۱﴾

ترجمۂ آیات ۱۰۲ - ۱۱۱

یہ سرگزشت غیب کی خبروں میں سے ہے جس کی ہم تمھاری طرف وحی کر رہے ہیں اور تم تو ان کے پاس اس وقت موجود نہیں تھے جب کہ انھوں نے اپنی رائے پختہ کی اور وہ سازش کر رہے تھے۔ ۱۰۲

اور ان لوگوں میں سے اکثر ایمان لانے والے نہیں ہیں خواہ تم ان کے ایمان کی کتنی ہی حرص کرو۔ اور تم اس پر ان سے کوئی معاوضہ تو نہیں طلب کر رہے ہو۔ یہ تو بس دنیا والوں کے لیے ایک یاددہانی ہے۔ اور آسمانوں اور زمین میں کتنی ہی نشانیاں ہیں جن پر سے یہ گزرتے ہیں تو ان سے منہ موڑے ہوئے اور ان میں سے اکثر اللہ پر ایمان نہیں رکھتے مگر اس طرح کہ ساتھ ہی اس کے شریک بھی ٹھہرائے ہوئے ہیں۔ کیا یہ لوگ اس بات سے نچنت ہیں کہ ان پر عذاب الٰہی کی کوئی آفت یا قیامت ہی اچانک آ دھمکے اور وہ اس سے بالکل بے خبر ہوں۔ ۱۰۳-۱۰۷

کہہ دو، یہ میری راہ ہے۔ میں اللہ کی طرف بلاتا ہوں، پوری بصیرت کے ساتھ، میں بھی اور وہ لوگ بھی جنھوں نے میری پیروی کی ہے اور اللہ پاک ہے اور میں مشرکوں میں سے نہیں ہوں۔ ۱۰۸

اور ہم نے تم سے پہلے بھی نہیں بھیجے مگر آدمی ہی انہی بستیوں والوں میں سے، ہم ان کی طرف وحی کرتے تھے۔ کیا یہ لوگ زمین میں چلے پھرے نہیں کہ دیکھتے کہ کیا انجام ہوا ان لوگوں کا جو ان سے پہلے تھے اور دار آخرت ان لوگوں کے لیے بہتر ہے جنھوں نے تقویٰ اختیار کیا تو کیا تم سمجھتے نہیں۔ یہاں تک کہ جب یہ نوبت آ گئی کہ رسول اپنی قوموں سے مایوس ہو گئے اور لوگوں نے یہ گمان کیا کہ ان کو جھوٹے ڈراوے سنائے گئے تو ان کو ہماری مدد آ پہنچی۔ پس نجات ملی ان کو جن کو ہم نے چاہا اور مجرموں سے ہمارے عذاب کو ٹالا نہیں جا سکتا۔ ان کی سرگزشتوں میں اہل عقل کے لیے بڑا سامانِ عبرت ہے۔ یہ کوئی گھڑی ہوئی چیز نہیں بلکہ تصدیق ہے اس چیز کی جو اس سے پہلے موجود ہے اور تفصیل

ہے ہر چیز کی اور ہدایت و رحمت ہے ایمان لانے والوں کے لیے۔ ۱۰۹-۱۱۱

۱۱۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَیْبِ نُوْحِیْهِ اِلَیْكَ ۚ وَمَا كُنْتَ لَدَیْهِمْ اِذْ اَجْمَعُوْٓا اَمْرَهُمْ وَهُمْ یَمْكُرُوْنَ (۱۰۲)

'ذٰلِكَ' کا اشارہ اسی سرگزشت کی طرف ہے جو سنائی گئی۔ فرمایا کہ یہ غیب کی خبروں میں سے ہے یعنی یہ تمھارے علم و اطلاع سے بالکل باہر کی چیز ہے، نہ تمھیں اس کا کوئی علم تھا اور نہ اس کے معلوم کرنے کا تمھارے پاس کوئی ذریعہ ہی تھا۔ یہ صرف اللہ کا فضل ہے کہ اس نے اپنی وحی کے ذریعہ سے تمھیں آگاہ فرمایا، ورنہ تم کہیں اس وقت یوسفؑ کے بھائیوں کے پاس موجود تو تھے نہیں جب وہ یوسفؑ کے خلاف سازش کر رہے تھے، کسی کی رائے کچھ تھی کسی کی کچھ، بالآخر اس رائے پر سب کا اتفاق ہو گیا کہ ان کو کسی کنوئیں میں ڈال دیا جائے۔

یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ تورات میں حضرت یوسفؑ کا قصہ اگر ہے بھی تو آنحضرت صلعم کے لیے اس سے واقف ہونے کا کوئی ذریعہ نہیں تھا اس لیے کہ آپ اُمّی تھے۔ پھر تورات کے بیان اور قرآن کے بیان میں قدم قدم پر اختلاف ہے اور ان تمام اختلافات پر جو شخص بھی غور کرے گا وہ یہ تسلیم کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ قرآن کا بیان بالکل عقل و فطرت کے مطابق ہے اس لیے کہ یہ براہِ راست وحی الٰہی پر مبنی ہے۔

وَمَآ اَكْثَرُ النَّاسِ وَلَوْ حَرَصْتَ بِمُؤْمِنِیْنَ (۱۰۳)

منکرین کے اعراض کی اصل علت

یعنی طبیعتوں میں اگر حق کو قبول کرنے کی رغبت اور صلاحیت ہو تو قرآن کے وحی الٰہی ثابت کر دینے کے لیے یہی ایک چیز کافی ہے۔ یہود و نصاریٰ کے لیے بھی اس میں حجت ہے اور قریش کے لیے بھی، لیکن ان لوگوں کے دلوں میں حق کو قبول کرنے کی صلاحیت ہی باقی نہیں رہ گئی ہے۔ اس وجہ سے خواہ تم ان کے ایمان و ہدایت کی طمع میں کچھ ہی کر ڈالو ان کی اکثریت ایمان سے محروم ہی رہے گی۔ ان کے ایمان نہ لانے کا سبب یہ نہیں ہے کہ ان کے سامنے قرآن کا کتاب الٰہی ہونا واضح نہیں ہے بلکہ اس کا اصل سبب یہ ہے کہ ان کے اندر حق کو قبول کرنے کی صلاحیت ہی مردہ ہو چکی ہے۔

وَمَا تَسْـَٔلُهُمْ عَلَیْهِ مِنْ اَجْرٍ ۭ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِیْنَ (۱۰۴)

آنحضرت صلعم کو تسلی

یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تسلی ہے کہ اگر یہ لوگ نہیں مانتے تو ان کے پیچھے آخر اپنے آپ کو اتنا پریشان کیوں رکھو۔ تم یہ نعمت مفت بانٹ رہے تھے، اس کا کوئی معاوضہ تو ان سے طلب نہیں کر رہے تھے کہ انھوں نے اس کو قبول نہ کیا تو اس سے تمھارے معاوضے میں کوئی کمی ہو جائے گی۔ محرومی ہے تو ان کی نہ کہ تمھاری۔ یہ قرآن تو بس خلق کے لیے ایک یاددہانی ہے، جو اس کو قبول کرے گا اس کا فائدہ اسی کے لیے ہے، جو نہ قبول کرے گا اس کا خمیازہ وہ خود بھگتے گا۔ تمھاری ذمہ داری بس لوگوں تک اس کو پہنچا دینے کی ہے۔ اس کے بعد تم سبکدوش ہو۔

وَكَاَيِّنْ مِّنْ اٰيَةٍ فِى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ يَمُرُّوْنَ عَلَيْهَا وَهُمْ عَنْهَا مُعْرِضُوْنَ (۱۰۵)

نشانیوں کے مطالبہ کا جواب

یعنی ان کے ایمان نہ لانے میں اس چیز کو بھی کوئی دخل نہیں ہے کہ ان کے طلب کے مطابق ان کو کوئی نشانی نہیں دکھائی جاتی۔ اصل یہ ہے کہ نشانیوں کو دیکھنے اور ان سے عبرت حاصل کرنے والی آنکھیں ہی ان کے پاس موجود نہیں ہیں، ورنہ آسمان و زمین میں کتنی ہی نشانیاں ہیں جن پر سے یہ گزرتے ہیں، اگر ان کے پاس آنکھیں ہوتیں تو یہ ان کو دیکھتے اور ان سے عبرت حاصل کرتے۔ مطلب یہ ہے کہ اس پہلو سے بھی نہ قصور تمھارا ہے اور نہ قرآن کا بلکہ اصل بیماری خود ان کے اپنے اندر ہے کہ وہ آنکھیں کھول کر کسی چیز کو دیکھنے ہی کے لیے تیار نہیں ہیں۔ یہ امر ملحوظ رہے کہ قرآن جب ان کو یہ خبر دیتا تھا کہ اگر وہ رسول پر ایمان نہ لائے تو ان پر اللہ کا عذاب آجائے گا تو اس کا جواب وہ یہ دیتے تھے کہ آخر اس عذاب کی کوئی نشانی ہمیں دکھا کیوں نہیں دی جاتی۔ یہ اسی کا جواب ہے کہ اگر وہ آنکھیں کھول کر دیکھیں تو ان کے گرد و پیش میں اس کی بہت سی نشانیاں ہیں لیکن یہ تو اسی کو نشانی سمجھتے ہیں جو ان پر آدھمکے۔

وَمَا يُؤْمِنُ اَكْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ اِلَّا وَهُمْ مُّشْرِكُوْنَ (۱۰۶)

ایمان نہ لانے کی ایک اور وجہ

یہ ان کے قرآن پر ایمان نہ لانے کی ایک اور بڑی وجہ واضح کی گئی ہے کہ ان میں جو اللہ کو مانتے بھی ہیں وہ اللہ کے ساتھ بہت سے شرکاء اور شفعاء کو بھی مانتے ہیں اور ان کا عقیدہ یہ ہے کہ اگر اللہ ان کی کسی بات پر گرفت کرنا چاہے گا بھی تو یہ شرکاء اور شفعاء ان کو خدا سے بچا لیں گے۔ اس ضلالت کی موجودگی میں قرآن کے ڈراوے ان پر کیا اثر کر سکتے ہیں۔

اَفَاَمِنُوْٓا اَنْ تَاْتِيَهُمْ غَاشِيَةٌ مِّنْ عَذَابِ اللّٰهِ اَوْ تَاْتِيَهُمُ السَّاعَةُ بَغْتَةً وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ (۱۰۷)

یہ سوال انذار و تنبیہ کے لیے ہے کہ کیا وہ اپنے شرکاء اور شفعاء پر اعتماد کر کے اس بات سے نچنت ہو بیٹھے ہیں کہ ان پر عذاب الٰہی کی کوئی ایسی آفت آئے جو ان سب کو اپنے لپیٹ میں لے لے یا قیامت ہی اچانک آدھمکے اور ان کو اس کی کوئی خبر بھی نہ ہو؟ مطلب یہ کہ اگر یہ چیز ہے تو بس ان کی شامت ہی آئی ہوئی ہے۔

قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ وَسُبْحٰنَ اللّٰهِ وَمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ (۱۰۸)

شرک سے اعلانِ براءت

ان کی تمام بیماریوں کی جڑ یہ شرک ہی تھا اس وجہ سے جب اس کا ذکر آگیا تو پیغمبر کی زبان سے پوری وضاحت کے ساتھ اس سے براءت کا اعلان کرا دیا گیا۔ فرمایا ان سے کہہ دو کہ میری راہ یہ ہے، میں اللہ کی طرف بلاتا ہوں، پوری بصیرت کے ساتھ، میں بھی اور وہ لوگ بھی جنھوں نے میری پیروی کی ہے یعنی جس طرح میں اللہ ہی کی طرف بلاتا ہوں اسی طرح میرے پیرو بھی اللہ ہی کی طرف بلاتے ہیں اور ہم سب اس بات میں حجت و بصیرت

اور دلیل و برہان کی پوری روشنی اپنے ساتھ رکھتے ہیں۔ مطلب یہ کہ اس معاملے میں ہم سے کوئی یہ توقع نہ رکھے کہ ہم کسی قسم کی نرمی برتنے کے لیے تیار ہوں گے یا کوئی تذبذب گوارا کریں گے۔ اللہ شرک کی تمام آلائشوں سے پاک اور منزہ ہے۔ اور میں مشرکین میں سے نہیں ہوں۔ یعنی ان سے اپنی برأت کا اعلان کرتا ہوں۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْٓ اِلَيْهِمْ مِّنْ اَهْلِ الْقُرٰى ۭ اَفَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۭ وَلَدَارُ الْاٰخِرَةِ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ اتَّقَوْا ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ (۱۰۹)

اَدْسَلنا میں رسول بنانے پر اعتراض

یہ ان کے ایک اور اعتراض کو، جو وہ ایمان نہ لانے کے بہانے کے طور پر پیش کیا کرتے تھے، رفع فرمایا۔ ان کا اعتراض یہ تھا کہ یہ کس طرح ممکن ہے کہ ہم اپنے ہی اندر کے ایک آدمی کو، جو ہمارے ہی اندر پیدا ہوا، ہمارے ہی اندر رہا سہا اور جوان ہوا، اللہ کا رسول مان لیں۔ اگر اللہ کو کوئی رسول ہی بھیجنا ہوتا تو کسی برتر مخلوق یعنی کسی فرشتہ کو رسول بنا کر بھیجتا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے اس کا جواب دیا کہ تم سے پہلے بھی جو رسول بھیجے بلا استثنا وہ سب آدمیوں ہی میں سے بھیجے، فرشتوں یا جنات میں سے نہیں بھیجے، اور انہی بستیوں والوں میں سے بھیجے جن کو دعوت دینے پر وہ مامور کیے گئے، باہر والوں سے نہیں بھیجے۔ اگر ان کو کوئی امتیاز حاصل تھا تو یہ نہیں تھا کہ وہ کوئی برتر یا انوکھی یا اجنبی مخلوق تھے بلکہ یہ تھا کہ وہ خدا کی وحی سے مشرف تھے۔

اَفَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ ..... الآیۃ یعنی اگر اپنے ہی ملک میں وہ آنکھیں کھول کر چلے پھرے ہوتے تو انھیں مذکورہ بالا حقیقت کا بھی ثبوت مل جاتا اور عاد، ثمود، مدین وغیرہ کے آثار سے یہ بات بھی ان پر واضح ہو جاتی کہ جن لوگوں نے ان رسولوں کی تکذیب کی ان کا انجام کیا ہوا اور جو لوگ ان پر ایمان لائے ان کو اس کا کیا صلہ ملا اور اہل ایمان کے لیے صلہ کی اصلی جگہ تو آخرت ہے جو اس سے کہیں بڑھ کر ہے تو کیا تم لوگ سوچتے نہیں؟

حَتّٰٓي اِذَا اسْتَيْـَٔسَ الرُّسُلُ وَظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ قَدْ كُذِبُوْا جَاۗءَهُمْ نَصْرُنَا ۙ فَنُجِّيَ مَنْ نَّشَاۗءُ ۭ وَلَا يُرَدُّ بَاْسُنَا عَنِ الْقَوْمِ الْمُجْرِمِيْنَ (۱۱۰)

عذاب الٰہی کے بارے میں سنتِ الٰہی

اب یہ کفار کی جلد بازی کے جواب میں کہ اگر پیغمبر ہم کو عذاب سے ڈراتے ہیں تو یہ عذاب آ کیوں نہیں جاتا، اللہ تعالیٰ نے اس باب میں اپنی سنت کی وضاحت فرما دی کہ اللہ عذاب بھیجنے میں جلدی نہیں کرتا بلکہ وہ اپنے رسولوں کے ذریعہ سے لوگوں پر اپنی حجت پوری کرتا ہے۔ عذاب اس وقت آتا ہے جب اللہ کے رسول اپنی قوموں کے ایمان سے مایوس ہو جاتے ہیں اور ان کی قوم کے لوگ عذاب کی تاخیر کے سبب سے یہ گمان کرنے لگتے ہیں کہ ان پر جھوٹ موٹ عذاب کی دھونس جمائی گئی تھی۔ فرمایا کہ اس وقت ہمارے رسولوں کے لیے ہماری مدد ظہور میں آتی ہے تو ہم جس کو چاہتے ہیں اس کو نجات ملتی ہے اور مجرموں سے ہمارے عذاب کو کوئی طاقت ٹال نہیں سکتی۔

لَقَدْ كَانَ فِيْ قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِّاُولِي الْاَلْبَابِ ؕ مَا كَانَ حَدِيْثًا يُّفْتَرٰى وَلٰكِنْ تَصْدِيْقَ الَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ وَتَفْصِيْلَ كُلِّ شَيْءٍ وَّهُدًى وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ (۱۱۱)

قرآن کی اصلی حقیقت

یعنی پچھلے انبیاء اور ان کی قوموں کی سرگزشتوں میں اہلِ عقل کے لیے بڑا سامان عبرت موجود ہے بشرطیکہ یہ عقل سے کام لیں اور ان سرگزشتوں کو صرف دوسروں کی حکایت سمجھ کر نہ سنیں بلکہ ان سے خود اپنی زندگی کو درست کرنے کے لیے سبق حاصل کریں۔ یہ قرآن کوئی من گھڑت کہانی نہیں ہے بلکہ جو پیشینگوئیاں اور جو حقائق آسمانی کتابوں میں پہلے سے موجود ہیں یہ ان کی تصدیق، ہر متعلق چیز کی تفصیل، آغاز کے اعتبار سے رہنمائی اور انجام کے اعتبار سے رحمت ہے ان لوگوں کے لیے جو ایمان لائیں۔

یہ آخری سطریں ہیں جو اس بے مایہ کو اس سورہ کی تفسیر میں لکھنے کی توفیق حاصل ہوئی۔ وَاٰخِرُ دَعْوَانَآ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ۔

لاہور

۱۷ر جون ۱۹۷۰ء

۲۱ر ربیع الثانی ۱۳۹۰ھ

تدبرِ قرآن

۱۳

الرعد

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ا۔ سورہ کا عمود

یہ سورہ سورۂ یوسفؑ کے توام اور اس کے جوڑے کی حیثیت رکھتی ہے۔ دونوں کے عمود میں کوئی بنیادی فرق نہیں ہے۔ قرآن کے نزول نے حق و باطل کے درمیان جو کشمکش برپا کر دی تھی، انجام کار کی کامیابی اس میں جس گروہ کو حاصل ہونے والی تھی اس کو اس میں نمایاں فرمایا ہے۔ یہی حقیقت سورۂ یوسف میں بھی واضح کی گئی ہے، البتہ دونوں سورتوں میں طریق استدلال الگ الگ ہے۔ سورۂ یوسف میں حضرت یوسفؑ کی زندگی کے حالات و واقعات سے اس حقیقت کو اجاگر کیا گیا ہے اور اس سورہ میں عقل و فطرت کے دلائل سے۔ آیات ۷، ۱۰، ۲۲ سے اس سورہ کے عمود پر روشنی پڑتی ہے۔

ب۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

یہ سورہ اپنے مطالب کے اعتبار سے تمام تر مکی ہے۔ بعض مصاحف میں اس پر مدنی لکھا گیا ہے، جس کی وجہ ہماری سمجھ میں نہیں آئی۔ ہمارے نزدیک پوری سورہ کا مدنی ہونا تو الگ رہا اس کی کوئی ایک آیت بھی مدنی نہیں ہے۔

اب ہم اختصار کے ساتھ سورہ کے مطالب کا تجزیہ بھی کیے دیتے ہیں تاکہ پوری سورہ پر ایک اجمالی نظر پڑ جائے۔

(۱) تمہید، جس میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے یہ حقیقت واضح کی گئی ہے کہ یہ کتاب الٰہی کی آیات ہیں، ہوائی باتیں نہیں ہیں، ان کی ہر بات ایک حقیقت ہے اور جن باتوں کی یہ خبر دے رہی ہیں وہ سب پوری ہو کر رہیں گی لیکن اکثر لوگ اپنی ضد پر اڑے ہی رہیں گے، اس پر ایمان نہیں لائیں گے۔

(۲ - ۴) کائنات کی ان نشانیوں کی طرف اشارہ جن سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ یہ پورا کارخانہ ایک ہی مدبر کی تدبیر و حکمت سے چل رہا ہے۔ اس میں ربوبیت کا وسیع نظام ہے جو اس بات کی شہادت دے رہا ہے کہ اس کو بنانے والے نے کوئی کھیل تماشا نہیں بنایا ہے بلکہ اس کے پیچھے ایک عظیم مقصد ہے جو ظہور میں آ کے رہے گا۔ اس کے ہر گوشہ میں کثرت کے اندر وحدت اور اختلاف کے اندر سازگاری کی ایسی نشانیاں موجود ہیں جو صاف شہادت دے رہی ہیں کہ اس پورے کارخانہ پر ایک ہی خالق و مالک کا ارادہ اور تصرف کارفرما ہے۔

(۵ - ۶) منکرین قیامت کے اس تعجب پر تعجب کہ وہ مر جانے اور سڑ گل جانے کے بعد دوبارہ اٹھائے جانے کو نہایت عجیب بات سمجھتے ہیں۔ ان کا یہ تعجب درحقیقت خدا کے انکار کے ہم معنی ہے۔ ان لوگوں کی گردنوں میں

طوق پڑے ہوئے ہیں۔ نہ یہ آسمان کی نشانیاں دیکھنے کے لیے اپنی آنکھیں اٹھا سکتے ہیں اور نہ یہ زمین کی نشانیاں دیکھنے کے لیے ان کو جھکا سکتے ہیں۔ یہ توبہ سے پہلے عذاب کے لیے جلدی مچائے ہوئے ہیں حالانکہ تاریخ کے اندر ان کے لیے کافی سبق موجود ہے۔ یہ اللہ کی مہربانی ہے کہ وہ لوگوں کو ان کی سرکشی کے باوجود مہلت دیتا ہے لیکن وہ سخت پاداش والا بھی ہے، جب وہ پکڑے گا تو کوئی اس کی پکڑ سے نہ بچ سکے گا۔

(۷-۱۱) کفار کی طرف سے کسی نشانیِ عذاب کا مطالبہ اور اس کا جواب۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ تسلی کہ تم پر ذمہ داری صرف لوگوں کو عذاب سے ہوشیار کر دینے کی ہے، عذاب کا لانا یا اس کا وقت مقرر کرنا تمھاری ذمہ داری نہیں ہے۔ سنتِ الٰہی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر قوم کی طرف انذار اور بشارت کے لیے اپنا ایک رسول بھیجتا ہے۔ اگر قوم اس کی تکذیب کر دیتی ہے تو وہ لازماً تباہ کر دی جاتی ہے۔ رہا یہ سوال کہ عذاب کب اور کس شکل میں آئے گا تو اس کا علم صرف اللہ ہی کو ہے۔ ایک حاملہ یہ تو جانتی ہے کہ اس کے پیٹ میں بچہ ہے اور وہ اس کو جنے گی لیکن اس بات کا علم صرف اللہ ہی کو ہے وہ کب جنے گی اور کیا جنے گی۔

لوگوں کو مخاطب کر کے یہ دھمکی کہ تم میں سے ایک ایک کی ہر بات، خواہ ظاہر ہو یا پوشیدہ اور ہر شخص خواہ وہ شب کے پردوں میں چھپا ہوا ہو یا روزِ روشن میں مصروفِ عمل ہو، اللہ کے علم میں ہے۔ اللہ کے مقرر کیے ہوئے فرشتے اس کی نگرانی کر رہے ہیں، وہ ان کو جب چاہے گا اور جہاں سے چاہے گا پکڑ لے گا۔ سنتِ الٰہی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی قوم کو اپنی نظرِ عنایت سے محروم نہیں کرتا جب تک وہ قوم خود اپنی روش بگاڑ نہ لے۔ ہاں جب قوم اپنی روش بگاڑ لیتی ہے تو اللہ کی طرف سے اس پر وہ عذاب آتا ہے جس کو کوئی بھی دفع نہیں کر سکتا۔

(۱۲-۱۳) عذاب کی بعض نشانیوں کی طرف اشارہ جو آئے دن لوگوں کے مشاہدے میں آتی رہتی ہیں۔ مثلاً بجلی اور کڑک دمک کی نشانی۔ اللہ تعالیٰ جب چاہے ایک کڑک سے سب کو فنا کر دے۔ اس کی طاقت بے پناہ ہے۔

(۱۴-۱۶) خدا کے سوا کسی دوسرے کو پکارنا سراب کو پانی سمجھ کر اس کے پیچھے بھاگنا ہے۔ یہ خیالی شرکا و شفعاء کہیں کام آنے والے نہیں ہیں۔ ان کو پکارنا محض صدا بصحرا ہے۔ اس کائنات میں ہر چیز اپنے وجود سے خدا کی توحید کی شہادت دے رہی ہے۔ جن کی گردنیں خدا سے اکڑی ہوتی رہتی ہیں ان کے جسموں کا بھی سایہ خدا ہی کے آگے سجدہ ریز ہوتا ہے۔ ان کو پکارنے سے کچھ حاصل نہیں جو خود اپنے لیے کسی نفع و ضرر پر کوئی اختیار نہیں رکھتے۔ شرک خدا کے عدل و حکمت کی نفی ہے۔ اللہ ہی ہر چیز کا خالق ہے اور وہ ایک یکہ و تنہا سب کو اپنے کنٹرول میں رکھنے والا ہے۔

(۱۷) اس کائنات کی بعض نشانیوں کی طرف اشارہ جن سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ اس کا خالق و صانع ہر گوشہ میں نافع کو باقی رکھتا اور غیر نافع کو چھانٹتا رہتا ہے۔ یہ اس بات کی شہادت ہے کہ وہ حق و باطل کی اس کشمکش میں بھی جو نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کی دعوت اور قرآن کے نزول سے برپا ہوتی ہے باطل کو مٹا دے گا اور حق

کا بول بالا کرے گا۔

(۱۸-۲۵) پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت قبول کر کے اللہ کے راستہ پر چل کھڑے ہونے والوں کے لیے انجام کار کی کامیابی کی بشارت اور اس دعوت کی مخالفت و مزاحمت کرنے والوں پر اللہ کی لعنت۔

(۲۶) اس شبہ کا جواب کہ اگر اللہ کی تمام عنایتوں کے حق دار صرف اہل ایمان ہی ہیں تو وہ لوگ کیوں رزق و فضل کے مالک بنے بیٹھے ہیں جو رات دن اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت و مزاحمت میں سرگرم ہیں۔

(۲۷-۳۲) کفار کی طرف سے کسی معجزہ کا مطالبہ اور اس کا جواب۔ دلوں کو مطمئن کرنے والی چیز اللہ اور اس کی صفات کی یاد داشت اور اس میں غور و فکر ہے نہ کہ کوئی معجزہ۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی کہ تمھیں وہی کچھ پیش آ رہا ہے جو تم سے پہلے نبیوں اور رسولوں کو پیش آ چکا ہے تو تم خدا کی وحی کی ہوئی کتاب ان کو سنا دو اور اللہ پر بھروسہ رکھو۔ مسلمانوں کو یہ تسلی کہ یہ نہ خیال کرو کہ اگر ان کو کوئی معجزہ دکھا دیا گیا تو یہ مان لیں گے۔ اگر کوئی ایسا قرآن بھی ان کے لیے اتار دیا جائے جس سے پہاڑ چلنے لگیں، زمین ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے یا مردے بولنے لگ جائیں جب بھی یہ اپنی ہٹ سے باز آنے والے نہیں ہیں۔ اہل ایمان کو یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ اللہ نے ایمان کے معاملے میں جبر کو پسند نہیں فرمایا ہے۔ اگر وہ جبر کو پسند کرتا تو سب کو ہدایت کے راستہ پر چلا دیتا۔ عذاب کی نشانیاں ان پر یا ان کے قرب و جوار میں ظاہر ہوتی رہیں گی یہاں تک کہ اللہ کا فیصلہ کن عذاب آ جائے۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی کہ جس طرح یہ لوگ تمھارا مذاق اڑا رہے ہیں اسی طرح تم سے پہلے آنے والے رسولوں کا بھی مذاق اڑایا گیا، بالآخر خدا کا عذاب نمودار ہوا اور ان مذاق اڑانے والوں کا فیصلہ کر دیا گیا۔

(۳۳-۳۵) شرک اور شرکاء کی نفی۔ شرکاء و شفعاء کا کوئی وجود نہیں۔ یہ محض من گھڑت باتیں ہیں۔ اس فریب نفس میں مبتلا ہو کر جنھوں نے اللہ کے راستہ سے منہ موڑا وہ اس دنیا میں بھی خدا کے عذاب سے دوچار ہوں گے اور آخرت کا عذاب تو اس سے کہیں سخت ہوگا۔ کوئی شریک و شفیع وہاں ان کو بچانے کے لیے نہیں اٹھے گا۔ جنت کی ابدی نعمتیں صرف ان لوگوں کا حصہ ہوں گی جو خدا سے ڈرنے والے ہیں۔

(۳۶-۳۷) اہل کتاب کے دو گروہوں کا حوالہ جن میں سے ایک حق پر قائم تھا اس وجہ سے اس نے قرآن کا پوری خوش دلی سے خیر مقدم کیا اور دوسرا اپنی ایجاد کردہ بدعات میں مبتلا ہونے کی وجہ سے اس کا مخالف بن گیا۔ ان کے سامنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے اعلان حق اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ تنبیہ کہ حق کے واضح ہو چکنے کے بعد اگر تم نے ان کی بدعات کی پیروی کی تو تمھیں خدا کی پکڑ سے کوئی نہ بچا سکے گا۔

(۳۸-۴۳) پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو مخالفین کے اعتراضات و مطالبات کے مقابل میں تسلی کہ تم سے پہلے جو رسول آئے وہ بھی کوئی فرشتے یا آسمانی مخلوق نہیں تھے بلکہ تمھاری ہی طرح بشر اور بیویاں رکھنے والے لوگ تھے۔ انھوں نے جو معجزے بھی دکھائے وہ اللہ کے حکم سے دکھائے، اپنے اختیار سے نہیں دکھائے۔ تم ان لوگوں کو

جن باتوں سے ڈرا رہے ہو ہو سکتا ہے کہ ہم تمہاری زندگی ہی میں ان میں سے بعض چیزوں کو دکھا دیں اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہم تمہیں وفات دیں اور اس کے بعد ان سے مواخذہ کریں۔ یہ لوگ اگر آنکھیں کھول کر دیکھیں تو انھیں یہ چیز نظر آ سکتی ہے کہ ہم ان کے اطراف سے بالتدریج ان کی طرف بڑھ رہے ہیں اور عنقریب ان کو اپنے گھیرے میں لیا چاہتے ہیں۔ اس وقت انھیں پتہ چل جائے گا کہ انجام کار کی کامیابی کس کا حصہ ہے۔ اگر یہ لوگ تمہیں رسول نہیں مانتے تو تم ان سے کہہ دو کہ میرے اور تمہارے درمیان گواہی کے لیے اللہ اور اللہ کے وہ بندے کافی ہیں جن کے پاس اللہ کی کتاب کا علم ہے۔

سُوْرَةُ الرَّعْدِ (۱۳)

مَكِّيَّةٌ ——— اٰيَاتُهَا ۴۳

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

الٓمّٓرٰ ۫ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ ؕ وَالَّذِیْۤ اُنْزِلَ اِلَیْكَ مِنْ رَّبِّكَ الْحَقُّ آیات ۱ - ۱۳
وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا یُؤْمِنُوْنَ ① اَللّٰهُ الَّذِیْ رَفَعَ السَّمٰوٰتِ بِغَیْرِ
عَمَدٍ تَرَوْنَهَا ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ؕ كُلٌّ
یَّجْرِیْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّی ؕ یُدَبِّرُ الْاَمْرَ یُفَصِّلُ الْاٰیٰتِ لَعَلَّكُمْ بِلِقَآءِ رَبِّكُمْ
تُوْقِنُوْنَ ② وَهُوَ الَّذِیْ مَدَّ الْاَرْضَ وَجَعَلَ فِیْهَا رَوَاسِیَ وَاَنْهٰرًا ؕ وَ
مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ جَعَلَ فِیْهَا زَوْجَیْنِ اثْنَیْنِ یُغْشِی الَّیْلَ النَّهَارَ ؕ اِنَّ فِیْ
ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَفَكَّرُوْنَ ③ وَفِی الْاَرْضِ قِطَعٌ مُّتَجٰوِرٰتٌ وَّجَنّٰتٌ
مِّنْ اَعْنَابٍ وَّزَرْعٌ وَّنَخِیْلٌ صِنْوَانٌ وَّغَیْرُ صِنْوَانٍ یُّسْقٰی بِمَآءٍ وَّاحِدٍ ۫
وَنُفَضِّلُ بَعْضَهَا عَلٰی بَعْضٍ فِی الْاُكُلِ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ
یَّعْقِلُوْنَ ④ وَاِنْ تَعْجَبْ فَعَجَبٌ قَوْلُهُمْ ءَاِذَا كُنَّا تُرٰبًا ءَاِنَّا لَفِیْ
خَلْقٍ جَدِیْدٍ ؕ اُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ ۚ وَاُولٰٓئِكَ الْاَغْلٰلُ فِیْۤ
اَعْنَاقِهِمْ ۚ وَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ ⑤ وَیَسْتَعْجِلُوْنَكَ

بِالسَّيِّئَةِ قَبْلَ الْحَسَنَةِ وَقَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِمُ الْمَثُلٰتُ ۭ وَاِنَّ رَبَّكَ
لَذُوْ مَغْفِرَةٍ لِّلنَّاسِ عَلٰي ظُلْمِهِمْ ۚ وَاِنَّ رَبَّكَ لَشَدِيْدُ الْعِقَابِ (۶) وَ
يَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ۭ اِنَّمَآ اَنْتَ مُنْذِرٌ
وَّلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ (۷) اللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تَحْمِلُ كُلُّ اُنْثٰى وَمَا تَغِيْضُ ع
الْاَرْحَامُ وَمَا تَزْدَادُ ۭ وَكُلُّ شَيْءٍ عِنْدَهٗ بِمِقْدَارٍ (۸) عٰلِمُ الْغَيْبِ وَ
الشَّهَادَةِ الْكَبِيْرُ الْمُتَعَالِ (۹) سَوَاۗءٌ مِّنْكُمْ مَّنْ اَسَرَّ الْقَوْلَ وَمَنْ
جَهَرَ بِهٖ وَمَنْ هُوَ مُسْتَخْفٍۢ بِالَّيْلِ وَسَارِبٌۢ بِالنَّهَارِ (۱۰) لَهٗ مُعَقِّبٰتٌ
مِّنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ يَحْفَظُوْنَهٗ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ
مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ ۭ وَاِذَآ اَرَادَ اللّٰهُ بِقَوْمٍ سُوْۗءًا فَلَا
مَرَدَّ لَهٗ ۚ وَمَا لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّالٍ (۱۱) هُوَ الَّذِيْ يُرِيْكُمُ الْبَرْقَ
خَوْفًا وَّطَمَعًا وَّيُنْشِئُ السَّحَابَ الثِّقَالَ (۱۲) وَيُسَبِّحُ الرَّعْدُ
بِحَمْدِهٖ وَالْمَلٰۗىِٕكَةُ مِنْ خِيْفَتِهٖ ۚ وَيُرْسِلُ الصَّوَاعِقَ فَيُصِيْبُ بِهَا
مَنْ يَّشَاۗءُ وَهُمْ يُجَادِلُوْنَ فِي اللّٰهِ ۚ وَهُوَ شَدِيْدُ الْمِحَالِ (۱۳)

ترجمۂ آیات ۱-۱۳

یہ الف، لام، میم، را ہے۔ یہ کتاب الٰہی کی آیات ہیں اور جو چیز تمہاری طرف تمہارے خداوند کی طرف سے اتاری گئی ہے حق ہے لیکن اکثر لوگ نہیں مان رہے ہیں۔ ۱

اللہ ہی ہے جس نے آسمانوں کو بلند کیا بغیر ایسے ستونوں کے جو تمہیں نظر آئیں۔ پھر وہ اپنے عرش پر متمکن ہوا اور اس نے سورج اور چاند کو مسخر کیا۔ ان میں سے ہر ایک ایک وقت معین کے لیے گردش کرتا ہے۔ وہی کائنات کا انتظام فرماتا ہے اور اپنی نشانیوں کی وضاحت کرتا ہے تاکہ تم اپنے

رب کی ملاقات کا یقین کرو۔ ۲

اور وہی ہے جس نے زمین کو بچھایا اور اس میں پہاڑ اور دریا بنائے اور ہر قسم کے پھلوں کی
دو دو قسمیں اس میں پیدا کیں۔ وہ رات کو دن پر اڑھا دیتا ہے۔ بے شک ان چیزوں کے اندر ان
لوگوں کے لیے نشانیاں ہیں جو غور کریں ۳

اور زمین میں پاس پاس کے قطعے ہیں، انگوروں کے باغ ہیں، کھیتی ہے اور کھجوریں ہیں۔ جڑواں
بھی ہیں اور اکہرے بھی۔ سب ایک ہی پانی سے سیراب ہوتے ہیں لیکن ہم پیداوار میں ایک کو دوسرے
پر ترجیح دے دیتے ہیں۔ بے شک اس کے اندر نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو عقل سے کام لیں۔ ۴

اور اگر تم تعجب کرو تو تعجب کے قابل ان کی یہ بات ہے کہ، کیا جب ہم مٹی ہو جائیں گے تو
ہم از سر نو وجود میں آئیں گے! یہی لوگ ہیں جنھوں نے اپنے رب کا انکار کیا، یہی لوگ ہیں جن کی
گردنوں میں طوق پڑے ہوئے ہیں اور یہی لوگ اہل دوزخ ہیں، یہ اسی میں ہمیشہ رہیں گے۔ ۵

اور یہ لوگ خیر سے پہلے شر کے لیے تم سے جلدی مچائے ہوئے ہیں۔ حالانکہ ان سے پہلے
عقوبت کی مثالیں گزر چکی ہیں۔ تمھارا رب لوگوں کی زیادتیوں کے باوجود ان سے درگزر کرنے والا بھی ہے
اور تیرا رب سخت سزا دینے والا بھی ہے۔ ۶

اور جن لوگوں نے کفر کیا وہ کہتے ہیں کہ اس پر اس کے رب کی جانب سے کوئی نشانی کیوں نہیں
اتاری گئی؛ تم تو بس ایک آگاہ کر دینے والے ہو اور ہر قوم کے لیے ایک ہادی ہے۔ اللہ ہی جانتا
ہے ہر مادہ کے حمل کو اور جو کچھ رحموں میں گھٹتا اور بڑھتا ہے اس کو بھی اور ہر چیز اس کے ہاں ایک
اندازہ کے مطابق ہے۔ وہ غائب و حاضر سب کا جاننے والا، عظیم اور عالی شان ہے۔ اس کے علم میں
یکساں ہیں تم میں سے وہ جو بات کو چپکے سے کہیں اور وہ جو بلند آواز سے کہیں اور جو شب کی تاریکی میں

چھپے ہوئے ہوں اور جو دن کی روشنی میں نقل و حرکت کر رہے ہوں سب ان پر ان کے آگے اور پیچھے سے امر الٰہی کے مؤکل لگے رہتے ہیں جو باری باری سے ان کی نگرانی کرتے ہیں۔ اللہ کسی قوم کے ساتھ اپنا معاملہ اس وقت تک نہیں بدلتا جب تک وہ خود اپنی روش میں تبدیلی نہ کرے اور جب اللہ کسی قوم پر کوئی آفت لانے کا ارادہ کر لیتا ہے تو وہ کسی کے ٹالے ٹل نہیں سکتی اور ان کا اس کے مقابل میں کوئی بھی مددگار نہیں بن سکتا۔ ۷-۱۱

وہی دکھاتا ہے تمہیں بجلی جو خوف بھی پیدا کرتی ہے اور امید بھی اور ابھارتا ہے بوجھل بادلوں کو اور بجلی کی گرج اس کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کرتی ہے اور فرشتے بھی اس کے ڈر سے اس کی تسبیح کرتے ہیں اور وہ بھیجتا ہے بجلی کے کڑکے اور ان کو نازل کر دیتا ہے جن پر چاہتا ہے اور وہ خدا کے باب میں جھگڑتے ہی ہوتے ہیں اور وہ بڑی ہی زبردست قوت والا ہے۔ ۱۱-۱۳

۱- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

الٓمّٓرٰ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ ؕ وَالَّذِيْٓ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ الْحَقُّ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يُؤْمِنُوْنَ (۱)

حروف مقطعات پر تفصیل بحث بقرہ کے شروع میں گزر چکی ہے۔ ہمارے نزدیک یہ سورتوں کے نام ہیں۔ یہاں مبتدا محذوف ہے یعنی هٰذِهٖ الٓمّٓرٰ، یہ الٓمّٓرٰ ہے۔

اظہار احسان اور انذار بیک وقت دونوں

تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ لفظ اَلْكِتٰبُ پر تفصیلی بحث بقرہ کی پہلی آیات کے تحت گزر چکی ہے۔ اس سے مراد وہ موعود و منتظر کتاب الٰہی ہے جس کو آخری صحیفۂ ہدایت کی حیثیت سے اتارنے کا اللہ تعالیٰ نے اپنے نبیوں اور رسولوں کے ذریعہ سے وعدہ فرمایا تھا۔ تِلْكَ کا اشارہ الٓمّٓرٰ کی طرف ہے۔ یعنی یہ سورہ موعود و منتظر کتاب الٰہی کی آیات پر مشتمل ہے۔ اس فقرے میں بیک وقت اظہار احسان بھی ہے اور دھمکی بھی۔ احسان یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے وہ عظیم نعمت، جس کا اس نے اپنے نبیوں اور رسولوں کے ذریعہ سے وعدہ فرمایا تھا، اتار دی ہے۔ اب یہ لوگوں کا فرض ہے کہ اس کی صدق دل سے قدر کریں اور اس کی برکتوں سے متمتع ہوں۔ دھمکی کا پہلو یہ ہے کہ یہ کتاب الٰہی کی آیات ہیں تو جو لوگ ان کی قدر کرنے کے بجائے ان کا مذاق اڑائیں گے اور ان

کی مخالفت میں اپنا زور صرف کریں گے وہ خود سوچ لیں کہ وہ اپنے لیے کس شامت کو دعوت دے رہے ہیں۔

وَالَّذِیْٓ اُنْزِلَ اِلَیْكَ مِنْ رَّبِّكَ الْحَقُّ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا یُؤْمِنُوْنَ۔

پیغمبر صلعم کو تسلی

یہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی ہے کہ یہ کتاب جو تم پر تمھارے رب کی جانب سے آتاری گئی ہے اس کی ایک ایک بات حق ہے۔ اس کا ہر دعویٰ ثابت، مدلل اور مبرہن ہے اور اس کی ہر چیز شدنی ہے۔ اس میں کوئی بات ایسی نہیں ہے جس سے اختلاف کیا جا سکے، یہ لوگوں کی اپنی محرومی و بدقسمتی ہے کہ ان کی اکثریت اس کو قبول نہیں کر رہی ہے۔

اَللّٰهُ الَّذِیْ رَفَعَ السَّمٰوٰتِ بِغَیْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ؕ كُلٌّ یَّجْرِیْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّی ؕ یُدَبِّرُ الْاَمْرَ یُفَصِّلُ الْاٰیٰتِ لَعَلَّكُمْ بِلِقَآءِ رَبِّكُمْ تُوْقِنُوْنَ (۲)

خدا کی عظیم قدرت و حکمت کی طرف ایک اشارہ

'رَفَعَ السَّمٰوٰتِ بِغَیْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا' عَمَد، عمود کی بھی جمع ہے اور عماد کی بھی اور تَرَوْنَهَا اس کی صفت ہے۔ یعنی خدا نے آسمانوں کو ایسے ستونوں کے بغیر کھڑا کیا ہے جو تمھیں نظر آئیں۔ یہ اللہ تعالیٰ نے اپنی عظیم قدرت و حکمت کی طرف توجہ دلائی ہے کہ اس نے یہ عظیم شامیانہ جذب و کشش کے ایسے ستونوں پر کھڑا کیا ہے جن کو دیکھنے سے تمھاری نگاہیں قاصر ہیں۔

ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ۔ یعنی وہ ان کو پیدا کر کے کہیں کسی گوشے میں نہیں جا بیٹھا ہے جیسا کہ مشرکین گمان کرتے ہیں، بلکہ وہ اپنے عرش اقتدار پر متمکن ہے اور اس پوری کائنات پر فرماں روائی کر رہا ہے۔

وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ كُلٌّ یَّجْرِیْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّی۔ یہ دو بڑی نشانیاں۔ سورج اور چاند۔ اپنے وجود سے شہادت دے رہی ہیں کہ ہر چیز ہر وقت، خدا کے قبضۂ قدرت میں ہے۔ مجال نہیں ہے کہ کوئی چیز اپنے معین مدار سے بال برابر ادھر ادھر ہو سکے۔ سورج اور چاند کے طلوع و غروب کے لیے جو اوقات مقرر کر دیے گئے ہیں وہ ٹھیک ٹھیک اسی نظام الاوقات کی پابندی کرتے ہیں، اس میں منٹ اور سکینڈ کا بھی کبھی کوئی فرق واقع نہیں ہوتا۔

یُدَبِّرُ الْاَمْرَ یُفَصِّلُ الْاٰیٰتِ لَعَلَّكُمْ بِلِقَآءِ رَبِّكُمْ تُوْقِنُوْنَ۔ یعنی ان نشانیوں سے یہ بات بھی ثابت ہے کہ خدا ہی تمام کائنات کا انتظام فرما رہا ہے اور ساتھ ہی وہ ان نشانیوں کے تمام مضمرات بھی واضح فرما رہا ہے تاکہ تم اس بات کا یقین کرو کہ جس طرح ہر چیز کے لیے ایک اجل معین ہے اسی طرح تمھارے لیے بھی ایک اجل معین ہے۔ بالآخر تمھیں ایک دن خدا کی طرف لوٹنا اور اس سے ملنا ہے۔

وَهُوَ الَّذِیْ مَدَّ الْاَرْضَ وَجَعَلَ فِیْهَا رَوَاسِیَ وَاَنْهٰرًا ؕ وَمِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ جَعَلَ فِیْهَا زَوْجَیْنِ اثْنَیْنِ یُغْشِی الَّیْلَ النَّهَارَ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَفَكَّرُوْنَ (۳)

آسمان کے بعد زمین کی نشانیوں کی طرف اشارہ

آسمان کی نشانیوں کے بعد یہ زمین کی نشانیوں کی طرف توجہ دلائی کہ جس طرح آسمان کی نشانیوں سے اس کے خلق و تدبیر، اس کی قدرت و حکمت اور اس کی وحدت و یکتائی کی شانیں ظاہر ہوتی ہیں اسی طرح زمین کے چپے چپے

سے بھی اس کی ان صفات کی شہادت مل رہی ہے بشرطیکہ سوچنے والے دل اور غور کرنے والی عقلیں ہوں۔ دریا اور پہاڑ بظاہر اپنے مزاج کے اعتبار سے ایک دوسرے سے کتنے مختلف ہیں لیکن خدا نے اپنی قدرت و حکمت سے ان کے اندر ایسی سازگاری پیدا کر رکھی ہے کہ پتھروں کے اندر سے پانی کے چشمے جاری کر دیے ہیں۔ کیا یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ آپ سے آپ وجود میں آ گئے ہیں اور ان پر الگ الگ دیوتاؤں کی خدائی ہے یا اس بات کا ثبوت ہے کہ ایک ہی قادر و توانا حکیم نے یہ تمام اضداد پیدا کیے اور پھر اپنی بے پایاں حکمت سے ان میں حیرت انگیز سازگاری پیدا کر دی کہ ان میں زوجین کا سا توافق پیدا ہو گیا ہے۔

آسمان و زمین کی نشانیوں کی شہادت

اس کائنات کے ہر گوشہ میں، ہر چیز، آسمان اور زمین، سورج اور چاند، شب اور روز کے اندر جس طرح کا تضاد اور پھر ساتھ ہی جس طرح کا توافق پایا جاتا ہے۔ وہ صاف صاف شہادت دے رہا ہے کہ یہ کائنات مختلف الاغراض دیوتاؤں کی رزم گاہ نہیں ہے بلکہ اس پر ایک ہی قادر و قیوم کا ارادہ کارفرما ہے۔

تضاد اور توافق کے قانون کی ہمہ گیری

'مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ' کے الفاظ سے تضاد اور توافق کے اس قانون کی ہمہ گیری کی طرف اشارہ فرمایا ہے کہ جس طرح شب اور روز کے اندر یہ قانون کارفرما ہے اسی طرح ایک ایک پھل اور ایک ایک دانے کے اندر کارفرما ہے، خواہ انسان کو اس کا علم ہو یا نہ ہو۔ گندم کے ایک دانے کو بھی دیکھیے تو وہ بھی دو حصوں میں تقسیم نظر آتا ہے۔ تاہم دونوں میں پوری وابستگی اور پیوستگی پائی جاتی ہے ــــــ کائنات کے ہر گوشہ کی یہ شہادت اس امر کی طرف اشارہ کر رہی ہے کہ یہ دنیا بھی تنہا نہیں ہے بلکہ اس کا بھی جوڑا ہے اور وہ ہے آخرت۔ اپنے اسی جوڑے کے ساتھ مل کر ہی یہ اپنی غایت کو پہنچتی ہے ورنہ اس کا وجود بالکل بے مقصد اور بے غایت ہو کے رہ جاتا ہے۔

نشانیاں صرف اہل حق کے لیے کارآمد ہیں

'اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَفَكَّرُوْنَ' یعنی ان چیزوں کے اندر خدا کے خلق و تدبیر، اس کی قدرت و حکمت، اس کی توحید اور آخرت کی بہت سی نشانیاں ہیں لیکن ان نشانیوں تک انھی لوگوں کی عقلیں پہنچتی ہیں جو ان پر غور کرتے ہیں اور ان سے جو رہنمائی حاصل ہوتی ہے اس کو حرز جاں بناتے ہیں بے فکرے اور لاابالی لوگ ان چیزوں سے کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔

وَفِی الْاَرْضِ قِطَعٌ مُّتَجٰوِرٰتٌ وَّجَنّٰتٌ مِّنْ اَعْنَابٍ وَّزَرْعٌ وَّنَخِیْلٌ صِنْوَانٌ وَّغَیْرُ صِنْوَانٍ یُّسْقٰی بِمَآءٍ وَّاحِدٍ ۣ وَنُفَضِّلُ بَعْضَهَا عَلٰی بَعْضٍ فِی الْاُكُلِ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ (۴)

زمین کی نشانیوں کے ایک اور پہلو کی طرف اشارہ

یہ زمین کی نشانیوں کے ایک اور پہلو کی طرف توجہ دلائی کہ دیکھتے ہو کہ زمین کے بالکل پاس پاس کے قطعے ہیں، بعض میں انگور کے باغ ہیں، بعض میں کھیتیاں ہیں، بعض میں کھجوریں ہیں، جن میں بعض کے تنے اکہرے ہیں، بعض کے دوہرے۔ ٹکڑے پاس پاس کے ہیں، سیراب سب ایک ہی پانی سے ہوتے ہیں، لیکن پیداوار کی مقدار میں فرق ہو جاتا ہے، کسی کی پیداوار زیادہ ہوتی ہے کسی کی کم، مزے میں بھی اختلاف ہو جاتا ہے، کسی کا مزا معیار پر ہوتا ہے کسی کا معیار سے اترا ہوا، درختوں کی نشوونما میں بھی بڑا فرق ہوتا ہے، کہیں ایک

ہی جڑ سے کئی کئی تنے پھوٹ نکلے ہیں، کہیں ایک ہی تنہ نکلا ہے۔ یہ صورت حال اس بات کی شہادت دے رہی ہے کہ یہ سب کچھ آپ سے آپ ہو رہا ہے اور نیچر کا ایک اندھا بہرہ قانون سب پر مسلط ہے یا اس بات کی شہادت دے رہی ہے کہ ایک ہی خدائے علیم و حکیم اس پورے نظام کائنات کو اپنی نگرانی میں چلا رہا ہے اور سارے عالم اسباب پر تنہا اسی کی حکمرانی ہے اور وہ اپنی حکمت کے تحت اس کے ذرے ذرے پر تصرف فرما رہا ہے۔

وَاِنْ تَعْجَبْ فَعَجَبٌ قَوْلُهُمْ ءَاِذَا كُنَّا تُرٰبًا ءَاِنَّا لَفِيْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ ۗ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ ۚ وَاُولٰٓئِكَ الْاَغْلٰلُ فِيْٓ اَعْنَاقِهِمْ ۚ وَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ (۵)

تعجب کی اصل بات

یعنی خدا کی قدرت و حکمت اور اس کے خلق و تدبیر کی ان نشانیوں کی موجودگی میں جن کا ذکر اوپر ہوا، تعجب کرنے کی بات وہ نہیں ہے جس سے تم (خطاب پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے) لوگوں کو آگاہ کر رہے ہو کہ مرنے کے بعد اٹھنا اور خدا کے حضور حساب کتاب کے لیے حاضر ہونا ہے بلکہ تعجب کے قابل خود ان لوگوں کا یہ تعجب ہے کہ یہ کہتے ہیں کہ جب ہم سڑگل کر خاک ہو جائیں گے تو کیا از سر نو زندہ کیے جائیں گے۔

خدا کو ماننے کا صحیح مفہوم

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ فرمایا کہ اپنے رب کے اصلی منکر درحقیقت یہ لوگ ہیں۔ خدا کو ماننے کے لیے یہ کافی نہیں ہے کہ کوئی شخص یہ مان لے کہ خدا ہے بلکہ اس کو اس کی صفات اور اس کے حقوق کے ساتھ ماننا ضروری ہے، اگر کوئی شخص خدا کا اقرار کرتا ہے لیکن اس کی بدیہی اور لازمی صفات یا ان سے عاید شدہ حقوق و لوازم کا منکر ہے تو وہ اپنے اقرار کے باوجود مومن نہیں بلکہ کافر ہے۔ خدا کی میزان میں اس کے اس اقرار کا کوئی وزن نہیں ہے۔ خدا کسی کے ماننے کا محتاج نہیں ہے بلکہ لوگ اس کے ماننے کے محتاج ہیں اور یہ چیز اس کو صحیح طور پر ماننے سے ہی حاصل ہوتی ہے۔

منکرین کے انکار کی اصل علت

اُولٰٓئِكَ الْاَغْلٰلُ فِيْٓ اَعْنَاقِهِمْ مطلب یہ ہے کہ ان لوگوں کی گردنوں میں کبر و انانیت، خود پرستی، تقلید اعمیٰ اور جمود کے طوق پڑے ہوئے ہیں۔ یہ طوق نہ ان کی گردنیں اوپر کی طرف اٹھنے دیتے ہیں کہ یہ آسمان کی ان نشانیوں پر غور کر سکیں جن کی طرف قرآن نے آیت ۲ میں اشارہ فرمایا ہے اور نہ زمین کی ان نشانیوں کی طرف جھکنے دیتے جن کا حوالہ آیات ۳-۴ میں ہے۔ نتیجہ اس اندھے پن کا یہ ہے کہ یہ دوزخ میں پڑیں گے اور اسی میں ہمیشہ سڑیں گے۔ اس حقیقت کو سورۂ یٰسین میں یوں واضح فرمایا ہے۔ اِنَّا جَعَلْنَا فِيْٓ اَعْنَاقِهِمْ اَغْلٰلًا فَهِيَ اِلَى الْاَذْقَانِ فَهُمْ مُّقْمَحُوْنَ (۸)

وَيَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالسَّيِّئَةِ قَبْلَ الْحَسَنَةِ وَقَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِمُ الْمَثُلٰتُ ۗ وَاِنَّ رَبَّكَ لَذُوْ مَغْفِرَةٍ لِّلنَّاسِ عَلٰي ظُلْمِهِمْ ۚ وَاِنَّ رَبَّكَ لَشَدِيْدُ الْعِقَابِ (۶)

عاقل وہ ہے جو دوسروں سے سبق حاصل کرے

'مثلات'، 'مثلۃ' کی جمع ہے۔ اس کے معنی عقوبت اور عبرت انگیز عذاب کے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ توبہ اور اصلاح سے پہلے کسی آفت اور عذاب کے منتظر ہیں۔ کہتے ہیں کہ جب ہم اس عذاب کی کوئی نشانی دیکھ لیں گے جس سے پیغمبر ڈرا رہے ہیں، تب ہم ان کی بات مانیں گے۔ حالانکہ عاقل وہ ہے جو دوسروں سے سبق

قوموں کی تاریخ میں نشانِ عبرت

حاصل کرے۔ ان سے پہلے کتنی قومیں گزر چکی ہیں جنھوں نے انھیں کی طرح اپنے پیغمبروں کی تکذیب کی اور بالآخر کیفرِ کردار کو پہنچیں۔ ان کی سرگزشتیں ان کو سنائی بھی جا رہی ہیں۔ کیا ان کے اندر ان کے لیے درسِ عبرت موجود نہیں ہے؟ یہ تو اللہ کی عنایت ہے کہ وہ لوگوں کو ان کے کفر و شرک کے باوجود توبہ اور اصلاح کی طویل مہلت دیتا ہے لیکن اس مہلت کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ اس کے گزر جانے کے بعد جب وہ پکڑتا ہے تو اس کی پکڑ بھی بڑی ہی سخت ہوتی ہے۔

وَيَقُولُ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْلَا أُنزِلَ عَلَيْهِ آيَةٌ مِّن رَّبِّهِ ۗ إِنَّمَا أَنتَ مُنذِرٌ ۖ وَلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ (۷)

مطالبۂ عذاب کا جواب

'آیۃ' سے مراد یہاں کوئی نشانیٔ عذاب ہے۔ اوپر والی آیت میں جس عذاب کے لیے عجلت کا ذکر ہے یہ اسی کی طرف اشارہ ہے کہ یہ کہتے ہیں کہ پیغمبر ہمیں جس عذاب کے ڈراوے ہر وقت سنا رہے ہیں آخر اس کی کوئی نشانی یہ کیوں نہیں دکھاتے؟ فرمایا کہ تمھارا کام صرف لوگوں کو اس عذاب سے خبردار کر دینا ہے، اس کی کوئی نشانی دکھانا یا اس عذاب کو لا دینا تمھارا کام نہیں ہے۔ یہ ہمارا کام ہے۔ تم اپنا کام کرو اور ہمارا کام ہم پر چھوڑ دو۔ ان کی بکواسوں کی پروا مت کرو۔ 'وَلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ' میں اس سنتِ الٰہی کی طرف اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی قوم کو سزا دینے سے پہلے اس کو انذار و تنبیہ فرماتا ہے چنانچہ ان کے انذار کے لیے خدا نے تمھیں ہادی بنا کر بھیج دیا ہے جس کے صاف معنی یہ ہیں کہ اگر انھوں نے تمھاری ہدایت قبول نہ کی تو اب اس کے بعد ان کے لیے عذاب ہی کا مرحلہ باقی رہ جاتا ہے۔

اللَّهُ يَعْلَمُ مَا تَحْمِلُ كُلُّ أُنثَىٰ وَمَا تَغِيضُ الْأَرْحَامُ وَمَا تَزْدَادُ ۖ وَكُلُّ شَيْءٍ عِندَهُ بِمِقْدَارٍ (۸)

یعنی ایک بات جو ایک امرِ واقعی اور شدنی ہے اس میں اس بنیاد پر کوئی شبہ قائم کرنا کہ تم اس کا وقت معین طور پر نہیں بتا سکتے یا ان کے مطالبے پر اس کو دکھا نہیں سکتے، کوئی معقول بات نہیں ہے۔ ایک عورت حاملہ ہوتی ہے، اس کے رحم میں لڑکا ہے یا لڑکی، اس کو صرف اللہ ہی جانتا ہے، اس میں در پردہ جو کمی بیشی واقع ہوتی ہے اس کو بھی اللہ ہی جانتا ہے، اس کے وضع کا ٹھیک ٹھیک وقت بھی اللہ ہی کے علم میں ہوتا ہے۔ ان باتوں کے نہ جاننے سے نہ تو نفسِ حمل کی نفی ہوتی اور نہ کوئی عاقل اس بنیاد پر ایک حاملہ کے حاملہ ہونے سے انکار کرتا ہے۔ یہی مثال ان ظالموں کے لیے عذابِ الٰہی کی ہے۔ انھوں نے اپنے عقاید و اعمال کے فساد کے باعث اس کا حمل قبول کر لیا ہے اور یہ حمل لازماً اپنی مدت کو پہنچ کر ظہور میں آئے گا لیکن کب آئے گا اور کس شکل و صورت میں آئے گا اس کا ٹھیک ٹھیک پتہ صرف اللہ ہی کو ہے، کسی دوسرے کو اس کا علم نہیں ہے 'وَكُلُّ شَيْءٍ عِندَهُ بِمِقْدَارٍ' اللہ کے ہاں ہر چیز کے لگے بندھے ضابطے، معین پیمانے اور مقرر اوقات ہیں۔ لوگوں کی جلد بازی سے وہ سنتِ الٰہی متغیر نہیں ہوتی جو اس نے ہر چیز کے لیے مقرر کر رکھی ہے۔

عَالِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ الْكَبِيرُ الْمُتَعَالِ (۹)

یہ اوپر والے مضمون کی مزید توضیح و تاکید ہے۔ مطلب یہ ہے کہ خدا کی باتوں، اس کے علم اور اس کے

منصوبوں کو اپنے محدود علم سے ناپنے کی کوشش نہ کرو۔ اس کا علم تمام غائب و حاضر کا احاطہ کیے ہوئے ہے، وہ بڑی ہی عظیم ہستی اور اس کی بارگاہ بہت بلند ہے۔ وہ اپنے ارادوں اور اپنی سکیموں کے بھیدوں کو خود ہی جانتا ہے، دوسرے اس میں سے اتنا ہی جان سکتے ہیں، جتنا وہ ظاہر کر دے۔

سَوَآءٌ مِّنْكُمْ مَّنْ اَسَرَّ الْقَوْلَ وَمَنْ جَهَرَ بِهٖ وَمَنْ هُوَ مُسْتَخْفٍۢ بِالَّيْلِ وَسَارِبٌۢ بِالنَّهَارِ (۱۰)

مطلب یہ کہ دیر سویر کی فکر تو اس کو ہو جس کو اندیشہ ہو کہ ذرا تاخیر ہوئی تو وقت نکل جائے گا اور پھر حریف قابو میں نہ آسکے گا۔ جس کا علم اور جس کی قدرت ہر چیز اور ہر شخص کا اس طرح احاطہ کیے ہوئے ہو کہ اس کا 'سَوَآءٌ عَلَانِيَةً' سب اس کے علم میں ہو اور اس کی شب اور اس کے روز کی ہر نقل و حرکت پر اس کو پورا اختیار حاصل ہو وہ پکڑنے میں جلد بازی کیوں کرے؟ وہ جب چاہے گا اور جہاں سے چاہے گا ہر ایک کو پکڑے گا۔ کس کی طاقت ہے کہ اس کے قابو سے باہر نکل سکے یا کہیں اس سے چھپ سکے۔

لَهٗ مُعَقِّبٰتٌ مِّنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ يَحْفَظُوْنَهٗ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ ؕ وَاِذَآ اَرَادَ اللّٰهُ بِقَوْمٍ سُوْٓءًا فَلَا مَرَدَّ لَهٗ ۚ وَمَا لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّالٍ (۱۱)

'مُعَقِّبٰتٌ'، یعنی 'اَرْوَاحٌ مُّعَقِّبٰتٌ'، مراد اس سے وہ فرشتے ہیں جو باری باری ہر انسان پر خدا کی طرف سے نگرانی کے لیے مقرر ہوتے ہیں اور اس کے ساتھ 'مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ' بیان کے لیے ہے جس طرح 'قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ' اور بعض دوسری آیات میں ہے۔ یعنی یہ فرشتے یا یہ ارواح اللہ کے امر میں سے ہیں۔

اوپر کے مضمون کی توضیح مزید

یہ آیت اوپر والی آیت کے مضمون کی توضیح مزید ہے۔ یعنی اللہ ہر شخص کے ظاہر و باطن اور اس کے شب و روز سے پوری طرح آگاہ ہے۔ اس نے ہر شخص پر اپنے فرشتے بطور پہرہ دار مقرر کر رکھے ہیں۔ یہ فرشتے اللہ کے امر میں سے ہیں جو ہر وقت ہر شخص کے ہر قول و فعل کی نگرانی کرتے ہیں۔

عذاب کے معاملے میں سنتِ الٰہی

'اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ'۔ اب یہ قوموں کے عذاب کے معاملے میں اصل سنت اللہ کی وضاحت فرما دی کہ اللہ تعالیٰ اپنا معاملہ کسی قوم کے ساتھ اس وقت تک نہیں بدلتا جب تک وہ قوم خود اپنی روش میں تبدیلی نہ کرلے۔ جب قوم خود اپنی روش بدل لیتی ہے اور تنبیہ و انذار کے باوجود متنبہ نہیں ہوتی تو اللہ تعالیٰ اس پر وہ عذاب بھیجتا ہے جس کو کوئی طاقت بھی دفع نہیں کر سکتی۔ مطلب یہ ہے کہ عذاب کی نشانیوں کا مطالبہ کرنے کے بجائے اس سنت الٰہی کی روشنی میں اپنے حالات کا جائزہ لو۔ اگر تم نے خود اپنی روش بدل لی ہے تو بس سمجھ لو کہ خدا کا تمھارے ساتھ جو معاملہ اب تک رہا ہے اب اس کے بدلنے میں بھی دیر نہیں ہے اور یہ بات بھی یاد رکھو کہ جب خدا کسی قوم پر عذاب بھیجنے کا فیصلہ کر لیتا ہے تو اس قضائے مبرم کو ٹالنے کا یارا کسی میں نہیں ہوتا۔ تمھارے سارے اصنام خیالی اور سارے قلعے اور دمدمے ہوا ہو جائیں گے۔

هُوَ الَّذِيْ يُرِيْكُمُ الْبَرْقَ خَوْفًا وَّطَمَعًا وَّيُنْشِئُ السَّحَابَ الثِّقَالَ ۚ وَيُسَبِّحُ الرَّعْدُ بِحَمْدِهٖ

وَالْمَلٰٓئِكَةُ مِنْ خِيْفَتِهٖ ۚ وَيُرْسِلُ الصَّوَاعِقَ فَيُصِيْبُ بِهَا مَنْ يَّشَآءُ وَهُمْ يُجَادِلُوْنَ فِی اللّٰهِ ۚ وَهُوَ شَدِيْدُ الْمِحَالِ (۱۲-۱۳)

آفاق کی بعض نشانیوں کی طرف اشارہ

اب یہ اسی مطالبۂ عذاب کے جواب میں جس کا ذکر اوپر سے چلا آ رہا ہے، آفاق کی بعض نشانیوں کی طرف توجہ دلائی ہے کہ نشانیوں کی طلب ہے تو نشانیاں تو روز ظاہر ہوتی رہتی ہیں۔ بجلی چمکتی ہے جو اپنے اندر امید و بیم دونوں کے پہلو رکھتی ہے، وہی بارش کا پیغام بھی بن کر نمودار ہوتی ہے اور اگر اللہ چاہتا ہے تو اسی کو عذاب کا تازیانہ بھی بنا دیتا ہے۔ بادل اٹھتے ہیں جو رحمت کی گھٹا بن کر بھی برستے ہیں اور اگر اللہ چاہتا ہے تو انہی کے اندر سے طوفانِ نوح بھی ابل پڑتا ہے ـــــ ان نشانیوں کے بعد اب کن نشانیوں کے منتظر ہو؟

وَيُسَبِّحُ الرَّعْدُ بِحَمْدِهٖ وَالْمَلٰٓئِكَةُ مِنْ خِيْفَتِهٖ: میں حذف کا وہ اسلوب مضمر ہے جس کی طرف ہم ایک سے زیادہ مقامات میں اشارہ کر چکے ہیں کہ بعض مرتبہ متقابل الفاظ قرینہ کی وضاحت کی وجہ سے حذف کر دیے جاتے ہیں۔ اس اسلوب کو کھول دیجیے تو پوری بات گویا یوں ہوگی (وَيُسَبِّحُ الرَّعْدُ مِنْ خِيْفَتِهٖ بِحَمْدِهٖ وَالْمَلٰٓئِكَةُ مِنْ خِيْفَتِهٖ بِحَمْدِهٖ) یہ بات بھی ہم دوسرے مقام میں واضح کر چکے ہیں کہ 'تسبیح' میں تنزیہہ کا پہلو غالب ہے اور حمد میں صفاتِ حسنٰی کے اقرار و اعتراف کا۔

یہ اوپر والے مضمون ہی کی توضیح مزید ہے کہ منکرین اور مکذبین کی جسارت کا تو یہ عالم ہے کہ وہ عذاب کا مطالبہ کرتے ہیں اور ادھر رعد و برق اور فرشتوں کا حال یہ ہے کہ وہ ہر وقت خوفِ الٰہی سے اس کی تسبیح اور حمد میں مصروف رہتے ہیں کہ معلوم نہیں کس وقت کیا حکم صادر ہو۔ پھر خدا جن پر چاہتا ہے اپنا صاعقۂ عذاب بھیج دیتا ہے اور لوگ خدا کے بارے میں جھگڑنے ہی میں مصروف ہوتے ہیں۔ خدا 'شَدِيْدُ الْمِحَالِ' یعنی بڑی طاقت والا ہے، کسی میں طاقت نہیں کہ اس کے وار کو روک سکے۔

۲- آگے کا مضمون ـــــ آیات ۱۴-۱۶

آگے چند آیات میں یہ حقیقت واضح فرما دی کہ جو لوگ اپنے خیالی معبودوں کے اعتماد پر خدا کے عذاب کو دعوت دے رہے ہیں وہ محض اپنی شامت کو دے رہے ہیں۔ خدا کا کوئی شریک و سہیم نہیں ہے، وہ وحدہٗ لاشریک ہے۔ نتیجہ خیز پکارنا صرف خدا ہی کو پکارنا ہے۔ اس کے سوا دوسروں کو پکارنا محض صدا بصحرا ہے۔ اس روشنی میں آگے کی آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۱۴-۱۶

لَهٗ دَعْوَةُ الْحَقِّ ۚ وَالَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ لَا يَسْتَجِيْبُوْنَ لَهُمْ بِشَيْءٍ اِلَّا كَبَاسِطِ كَفَّيْهِ اِلَى الْمَآءِ لِيَبْلُغَ فَاهُ وَمَا هُوَ بِبَالِغِهٖ ۚ

وَمَا دُعَآءُ الْكٰفِرِيْنَ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ ﴿١٤﴾ وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَ
الْاَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا وَّظِلٰلُهُمْ بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ ﴿١٥﴾ قُلْ مَنْ رَّبُّ السجدة
السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ قُلِ اللّٰهُ قُلْ اَفَاتَّخَذْتُمْ مِّنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ لَا
يَمْلِكُوْنَ لِاَنْفُسِهِمْ نَفْعًا وَّلَا ضَرًّا قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الْاَعْمٰى وَالْبَصِيْرُ
اَمْ هَلْ تَسْتَوِي الظُّلُمٰتُ وَالنُّوْرُ اَمْ جَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ خَلَقُوْا كَخَلْقِهٖ
فَتَشَابَهَ الْخَلْقُ عَلَيْهِمْ قُلِ اللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ وَّهُوَ
الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ﴿١٦﴾

ترجمۂ آیات ۱۴-۱۶

حقیقی پکارنا تو صرف اس کو پکارنا ہے۔ رہے وہ جن کو یہ اس کے سوا پکارتے ہیں تو وہ ان کی کوئی بھی داد رسی نہیں کر سکتے۔ ان کو پکارنا ایسا ہی ہے کہ کوئی اپنے دونوں ہاتھ پانی کی طرف بڑھائے کہ وہ اس کے منہ تک پہنچ جائے درآنحالیکہ وہ کسی طرح اس کے منہ تک پہنچنے والا نہ ہو۔ ان کافروں کی فریاد محض صدا بصحرا ہو گی۔ ۱۴

اور آسمانوں اور زمین میں جو بھی ہیں سب خدا ہی کو سجدہ کرتے ہیں، خواہ طوعاً خواہ کرہاً۔ اور ان کے سائے بھی صبح اور شام۔ ان سے پوچھو آسمانوں اور زمین کا مالک کون ہے؟ کہہ دو، اللہ! ان سے پوچھو تو کیا اس کے بعد تم نے اس کے سوا ایسے کارساز بنا رکھے ہیں جو خود اپنی ذات کے لیے بھی نہ کسی نفع پر کوئی اختیار رکھتے اور نہ کسی ضرر پر۔ ان سے پوچھو، کیا اندھے اور بینا دونوں یکساں ہو جائیں گے! یا کیا روشنی اور تاریکی دونوں برابر ہو جائے گی! کیا انھوں نے خدا کے ایسے شریک ٹھہرائے ہیں جنھوں نے اسی کی طرح خلق کیا ہے جس کے سبب سے ان کو خلق میں اشتباہ لاحق ہو گیا ہے! بتا دو کہ ہر چیز کا خالق اللہ ہی ہے اور وہ واحد اور سب پر حاوی ہے۔ ۱۵-۱۶

۲- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

لَهٗ دَعْوَةُ الْحَقِّ ؕ وَالَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ لَا یَسْتَجِیْبُوْنَ لَهُمْ بِشَیْءٍ اِلَّا كَبَاسِطِ كَفَّیْهِ اِلَی الْمَآءِ لِیَبْلُغَ فَاهُ وَمَا هُوَ بِبَالِغِهٖ ؕ وَمَا دُعَآءُ الْكٰفِرِیْنَ اِلَّا فِیْ ضَلٰلٍ (۱۴)

نتیجہ خیز پکارنا صرف خدا کو پکارنا ہے

'لَهٗ دَعْوَةُ الْحَقِّ' یعنی نتیجہ خیز، نافع اور موجب خیر و برکت پکارنا تو صرف اللہ ہی کو پکارنا ہے اس لیے کہ تمام اختیار و اقتدار اور تمام زور و اثر تنہا اسی کے اختیار میں ہے۔ جو لوگ خدا کے سوا دوسرے معبودوں سے آس لگائے بیٹھے ہیں، یہاں تک کہ ان کے بل پر خود خدا کو چیلنج کر رہے ہیں ان کو پکارنا محض صدا بصحرا ہے، اول تو ان کا کوئی وجود ہی نہیں اور اگر وجود ہے بھی تو وہ ان کی مدد کے معاملے میں بالکل بے بس ہیں۔

مشرکوں کی محرومی کی تمثیل

ان کی محرومی و نامرادی کی مثال ایک ایسے پیاسے سے دی ہے جو پیاس کی بے قراری میں اپنے دونوں ہاتھ ایسے پانی کی طرف بڑھائے جو اس کی پہنچ سے باہر ہو۔ جس طرح وہ پیاس سے تڑپتا اور پانی سے محروم رہتا ہے اسی طرح یہ اپنی محرومی پر اپنے سر پیٹیں گے۔ 'وَمَا دُعَآءُ الْكٰفِرِیْنَ اِلَّا فِیْ ضَلٰلٍ' کا ٹھیک مفہوم وہی ہے جس کو ہم اپنے الفاظ میں 'صدا بصحرا' کہتے ہیں۔ یہ گویا 'لَهٗ دَعْوَةُ الْحَقِّ' کے مضمون کی تعبیر دوسرے اسلوب سے ہے۔

وَلِلّٰهِ یَسْجُدُ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا وَّظِلٰلُهُمْ بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ (۱۵)

ہر چیز کی تکوینی شہادت

یہ اوپر والے مضمون کی مزید تاکید ہر چیز کی تکوینی شہادت سے فرمائی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہر چیز اپنے اصل وجود میں خدا ہی کی مطیع و منقاد ہے۔ جن کو کچھ اختیار ملا ہوا ہے اگر وہ اپنے اس اختیار سے غلط فائدہ اٹھا کر اکڑتے بھی ہیں تو وہ بھی اپنے تکوینی وجود میں خدا ہی کے آگے جھکنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ یہ شہادت ہے اس بات کی کہ ہمارا وجود اپنی فطرت سے خدا ہی کا مطیع ہے۔ اگر ہم خدا سے اکڑتے ہیں تو یہ حالت درحقیقت ہماری اپنی اصل جبلت سے بغاوت ہے۔ اس حقیقت کو اس مثال سے واضح فرمایا ہے کہ دیکھ لو، ہر چیز کا سایہ صبح و شام خدا کے آگے بچھا رہتا ہے اور رات بھر وہ اپنے اس تکوینی سجدہ سے سر نہیں اٹھاتا۔ صبح کو وہ آہستہ آہستہ سر اٹھاتا ہے اور پھر سورج کے زوال کے ساتھ اس پر رکوع و سجود کی وہی حالت طاری ہونی شروع ہو جاتی ہے۔ یہ مضمون سورۂ نحل کی آیات ۴۸-۴۹ میں بھی بیان ہوا ہے۔ انشاء اللہ وہاں ہم اس کی مزید تفصیل کریں گے۔ یہ دلائل کی ایک خاص قسم ہے جس کو ہم اشارات سے تعبیر کرتے ہیں۔ اگرچہ منطق کی میزان ان دلائل کی صحیح قدر و قیمت کا اندازہ لگانے سے قاصر ہے لیکن انسانی فطرت کی میزان میں ان دلائل کا بڑا وزن ہے۔

قُلْ مَنْ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ قُلِ اللّٰهُ ؕ قُلْ اَفَاتَّخَذْتُمْ مِّنْ دُوْنِهٖۤ اَوْلِیَآءَ لَا یَمْلِكُوْنَ لِاَنْفُسِهِمْ نَفْعًا وَّلَا ضَرًّا ؕ قُلْ هَلْ یَسْتَوِی الْاَعْمٰی وَالْبَصِیْرُ ۙ۬ اَمْ هَلْ تَسْتَوِی الظُّلُمٰتُ وَ

النُّوْرُ ۚ اَمْ جَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ خَلَقُوْا كَخَلْقِهٖ فَتَشَابَهَ الْخَلْقُ عَلَيْهِمْ ۭ قُلِ اللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ وَّ هُوَ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ (۱۶)

'قُلْ مَنْ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ قُلِ اللّٰهُ' لفظ 'قُلْ' کہو، پوچھو، سوال کرو، جواب دو، سب معنوں میں آتا ہے۔ موقع و محل کی مناسبت پیش نظر رکھ کر اس کا صحیح مفہوم متعین کرنا پڑتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ان سے پوچھو کہ آسمانوں اور زمین کا مالک اور کائنات کا رب کون ہے؟ پھر فرمایا کہ ان کو بتا دو کہ ان سب کا مالک اور رب خدا ہی ہے۔ ہم دوسرے مقام میں یہ واضح کر چکے ہیں کہ اہل عرب آسمانوں اور زمین کا خالق و مالک اصلاً اللہ تعالیٰ ہی کو مانتے تھے لیکن اولیاء اور شرکاء انھوں نے اور بھی بنا لیے تھے جن کی نسبت ان کا گمان یہ تھا کہ یہ خدا کے بڑے چہیتے ہیں، ان کی عبادت خدا کی قربت حاصل کرنے کا ذریعہ ہے۔ انہی کی عنایت سے تمام دنیوی نعمتیں حاصل ہوتی ہیں اور اگر آخرت کا کوئی مرحلہ بالفرض پیش آیا تو یہ ان کو بخشوا لیں گے۔

'قُلْ اَفَاتَّخَذْتُمْ مِّنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ لَا يَمْلِكُوْنَ لِاَنْفُسِهِمْ نَفْعًا وَّلَا ضَرًّا' یعنی جب آسمانوں اور زمین کا مالک وہی ہے تو ان سے پوچھو کہ کس منطق سے انھوں نے خدا کے دوسرے ولی اور کارساز بنا لیے ہیں جن کا حال یہ ہے کہ یہ بے چارے دوسروں کو کوئی نفع پہنچانا یا ان سے کسی ضرر کو دفع کرنا تو الگ رہا خود اپنے کو کوئی نفع پہنچانے یا اپنے اوپر کسی آئی ہوئی مصیبت کو دور کرنے پر بھی قادر نہیں ہیں۔

'قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الْاَعْمٰى وَالْبَصِيْرُ ۙ اَمْ هَلْ تَسْتَوِي الظُّلُمٰتُ وَالنُّوْرُ'

'اعمیٰ اور بصیر' کا مفہوم

'اَعْمٰى' اور 'بَصِيْر' کے الفاظ یہاں عقلی و اخلاقی اندھوں اور بیناؤں کے مفہوم میں استعمال ہوئے ہیں۔ اسی طرح 'ظُلُمٰت' سے مراد عقلی اور اخلاقی تاریکیاں ہیں اور 'نُوْر' سے مراد عقلی و ایمانی روشنی۔ 'ظُلُمٰت' کے جمع لانے میں، جب کہ لفظ مقابل 'نُوْر' واحد استعمال ہوا ہے، ایک لطیف نکتہ بھی ہے۔ وہ یہ کہ عقلی یا اخلاقی مفاسد کے ظہور میں آنے کے راستے اور دروازے مختلف ہو سکتے ہیں اور ہوتے ہیں لیکن عقلی و اخلاقی روشنی کا دروازہ ایک ہی ہے اور وہ ہے اللہ تعالیٰ۔

'ظلمت اور نور' سے مراد

شرک کی جڑ پر کلہاڑا

اب یہ شرک کی جڑ پر کلہاڑا مارا گیا ہے کہ تم خدا کے شریک مانتے ہو جن کی نسبت تمہارا گمان یہ ہے کہ وہ اپنے پجاریوں کو، خواہ ان کے اعمال و افعال اور عقائد و نظریات کچھ ہوں، خدا کی پکڑ سے بچا لیں گے دوسرے لفظوں میں اس کے معنی یہ ہوئے کہ خدا کی نگاہ میں اندھے اور بصیر، اور تاریکی اور روشنی دونوں یکساں ہوئے۔ اس طرح تم نے اس حق و عدل کی بنیاد ہی ڈھا دی جس پر یہ آسمان و زمین قائم ہیں اور جس کی نفی کے بعد یہ سارا عالم ایک اندھیر نگری یا کسی کھلنڈرے کا کھیل بن کے رہ جاتا ہے۔

شرک کس دلیل کی بنا پر!

'اَمْ جَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ' یعنی آخر کس دلیل کی بنا پر انھوں نے خدا کے شریک بنائے ہیں۔ کیا مخلوقات میں کچھ ان کے مزعوم شرکاء کی پیدا کی ہوئی مخلوقات بھی ہیں جن کے سبب سے ان کو یہ گھپلا پیش آ گیا ہے کہ یہ متعین نہیں کر پا رہے ہیں کہ کس کو خدا کی مخلوق قرار دیں اور کس کو اپنے شرکاء کی۔ 'قُلِ اللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ

شَیْءٍ وَّهُوَ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ۔ مطلب یہ ہے کہ خالق تو ہر شے کا اللہ ہی ہے اور اس حقیقت سے تمہیں بھی انکار نہیں ہے تو پھر خدا کی خلق میں تم نے دوسروں کو کس دلیل سے شریک بنا کے رکھ دیا۔ لفظ 'قہّار' پر دوسرے مقام میں ہم بحث کر چکے ہیں کہ اس کا صحیح مفہوم ہے سب کو اپنے کنٹرول میں رکھنے والا' مطلب یہ ہے کہ وہ خالق بھی ہے اور سب کو اپنے کنٹرول میں رکھنے پر قادر بھی ہے تو ضرورت کیا ہے جس کی بنا پر دوسرے شریکوں کو اس کی خدائی میں شریک مانا جائے۔

۴۔ آگے کا مضمون ـــــ آیات ۱۷-۲۶

آگے اس حقیقت کی مزید وضاحت فرمائی ہے جس کی طرف اوپر اشارہ گزرا کہ شرک سے اس تمام حق و عدل کی بنیاد ہی ڈھے جاتی ہے جس پر اس عالم کا نظام قائم ہے اور جس کی شہادت خود اس کائنات کی فطرت دے رہی ہے۔ نیز اس حقیقت کی طرف بھی نہایت لطیف اشارہ فرمایا کہ قرآن کے نزول نے اس وقت حق و باطل میں جو کشمکش پیدا کر دی ہے وہ بالآخر حق کی فتح پر منتہی ہوگی اور باطل جھاگ کی مانند اڑ جائے گی اس روشنی میں آگے کی آیات کی تلاوت فرمائیے۔

أَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَسَالَتْ أَوْدِيَةٌ بِقَدَرِهَا فَاحْتَمَلَ السَّيْلُ آیات
زَبَدًا رَابِيًا ۚ وَمِمَّا يُوقِدُونَ عَلَيْهِ فِي النَّارِ ابْتِغَاءَ حِلْيَةٍ أَوْ ۱۷-۲۶
مَتَاعٍ زَبَدٌ مِثْلُهُ ۚ كَذَٰلِكَ يَضْرِبُ اللَّهُ الْحَقَّ وَالْبَاطِلَ ۚ فَأَمَّا الزَّبَدُ
فَيَذْهَبُ جُفَاءً ۖ وَأَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْأَرْضِ ۚ كَذَٰلِكَ
يَضْرِبُ اللَّهُ الْأَمْثَالَ ﴿١٧﴾ لِلَّذِينَ اسْتَجَابُوا لِرَبِّهِمُ الْحُسْنَىٰ ۚ وَالَّذِينَ وقف النبی علیہ السلام
لَمْ يَسْتَجِيبُوا لَهُ لَوْ أَنَّ لَهُمْ مَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا وَمِثْلَهُ مَعَهُ
لَافْتَدَوْا بِهِ ۚ أُولَٰئِكَ لَهُمْ سُوءُ الْحِسَابِ ۖ وَمَأْوَاهُمْ جَهَنَّمُ ۖ وَبِئْسَ
الْمِهَادُ ﴿١٨﴾ أَفَمَنْ يَعْلَمُ أَنَّمَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ الْحَقُّ كَمَنْ هُوَ ع ۲ ۸
أَعْمَىٰ ۚ إِنَّمَا يَتَذَكَّرُ أُولُو الْأَلْبَابِ ﴿١٩﴾ الَّذِينَ يُوفُونَ بِعَهْدِ اللَّهِ
وَلَا يَنْقُضُونَ الْمِيثَاقَ ﴿٢٠﴾ وَالَّذِينَ يَصِلُونَ مَا أَمَرَ اللَّهُ بِهِ أَنْ يُوصَلَ

وَيَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ وَيَخَافُوْنَ سُوْٓءَ الْحِسَابِ ﴿٢١﴾ وَالَّذِيْنَ صَبَرُوا ابْتِغَآءَ
وَجْهِ رَبِّهِمْ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً
وَّيَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عُقْبَى الدَّارِ ﴿٢٢﴾ جَنّٰتُ
عَدْنٍ يَّدْخُلُوْنَهَا وَمَنْ صَلَحَ مِنْ اٰبَآئِهِمْ وَاَزْوَاجِهِمْ وَذُرِّيّٰتِهِمْ
وَالْمَلٰٓئِكَةُ يَدْخُلُوْنَ عَلَيْهِمْ مِّنْ كُلِّ بَابٍ ﴿٢٣﴾ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ بِمَا
صَبَرْتُمْ فَنِعْمَ عُقْبَى الدَّارِ ﴿٢٤﴾ وَالَّذِيْنَ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْ بَعْدِ
مِيْثَاقِهٖ وَيَقْطَعُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ وَيُفْسِدُوْنَ فِى
الْاَرْضِ اُولٰٓئِكَ لَهُمُ اللَّعْنَةُ وَلَهُمْ سُوْٓءُ الدَّارِ ﴿٢٥﴾ اَللّٰهُ يَبْسُطُ الرِّزْقَ
لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَقْدِرُ وَفَرِحُوْا بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا
ع ۳/۹ فِى الْاٰخِرَةِ اِلَّا مَتَاعٌ ﴿٢٦﴾

ترجمۂ آیات ۱۷-۲۶

اس نے آسمان سے پانی برسایا تو وادیاں اپنے اپنے ظرف کے مطابق بہہ نکلیں۔ پھر سیلاب نے ابھرتے جھاگ کو اٹھا لیا اور اسی طرح کا جھاگ ان چیزوں کے اندر سے بھی ابھرتا ہے جن کو یہ زیور یا اسی قسم کی کوئی اور چیز بنانے کے لیے آگ میں تپاتے ہیں۔ اسی طرح اللہ حق اور باطل کو ٹکراتا ہے تو جھاگ تو بے مصرف ہو کر اڑ جاتا ہے لیکن جو چیز لوگوں کو نفع پہنچانے والی ہوتی ہے وہ زمین میں ٹک جاتی ہے۔ اسی طرح اللہ تمثیلیں بیان کرتا ہے۔ جن لوگوں نے اپنے رب کی دعوت کو لبیک کہا ان کے لیے انجام کار کی فیروزمندی ہے اور جن لوگوں نے اس کی دعوت قبول نہیں کی اگر ان کو وہ سب کچھ حاصل ہو جائے جو زمین میں ہے اور اسی کے برابر اور بھی تو وہ فدیہ میں دے ڈالیں۔ یہی لوگ ہیں جن کا حساب برا ہوگا اور ان کا ٹھکانا جہنم ہوگا اور وہ کیا ہی برا

ٹھکانا ہے۔ ۱۷-۱۸

تو کیا ہو جاتا ہے کہ جو کچھ تمہارے رب کی جانب سے اتارا گیا ہے وہ حق ہے وہ اس کے مانند ہو جائے گا جو اندھا ہے۔ یاددہانی تو اہلِ عقل ہی حاصل کرتے ہیں۔ جو اللہ سے کیے ہوئے عہد کو پورا کرتے ہیں اور اپنے پیمان کو توڑتے نہیں! اور جو اس چیز کو جوڑتے ہیں جس کو اللہ نے جوڑے رکھنے کا حکم دیا ہے اور اپنے رب سے ڈرتے اور سخت حساب کا اندیشہ رکھتے ہیں۔ اور جو اپنے رب کی رضا جوئی میں ثابت قدم رہے اور جنھوں نے نماز کا اہتمام رکھا اور جو کچھ ہم نے ان کو بخشا اس میں سے سرّاً اور علانیۃً خرچ کیا اور جو بدی کو بھلائی سے دفع کرتے ہیں! انجام کار کی کامیابی انھی کے لیے ہے۔ ابد کے باغ جن میں وہ داخل ہوں گے اور وہ بھی جو اس کے اہل بنیں گے ان کے آبا و اجداد، ان کی ازواج اور ان کی اولاد میں سے۔ اور فرشتے ہر دروازے سے ان کے پاس جائیں گے اور کہیں گے آپ لوگوں پر سلامتی ہو بوجہ اس کے کہ آپ لوگ ثابت قدم رہے پس کیا ہی خوب ہے انجام کار کی کامیابی۔ ۱۹-۲۴

اور جو لوگ اللہ کے عہد کو اس کے باندھنے کے بعد توڑتے ہیں اور اس چیز کو کاٹتے ہیں جس کو اللہ نے جوڑنے کا حکم دیا ہے اور زمین میں فساد برپا کرتے ہیں وہی لوگ ہیں جن پر لعنت ہے اور ان کے لیے برا انجام آخرت ہے۔ اللہ رزق کو کشادہ کرتا ہے جس کے لیے چاہتا ہے اور تنگ کر دیتا ہے جس کے لیے چاہتا ہے اور یہ دنیا کی زندگی پر مگن ہیں اور یہ دنیا کی زندگی آخرت کی زندگی کے مقابل میں محض ایک متاع حقیر ہے۔ ۲۵-۲۶

۵۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

أَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَسَالَتْ أَوْدِيَةٌۢ بِقَدَرِهَا فَاحْتَمَلَ السَّيْلُ زَبَدًا رَّابِيًا ۭ وَمِمَّا يُوْقِدُوْنَ

عَلَيْهِ فِي النَّارِ ابْتِغَاءَ حِلْيَةٍ أَوْ مَتَاعٍ زَبَدٌ مِّثْلُهُ ۚ كَذَٰلِكَ يَضْرِبُ اللَّهُ الْحَقَّ وَالْبَاطِلَ ۚ فَأَمَّا
الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَاءً ۖ وَأَمَّا مَا يَنفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْأَرْضِ ۚ كَذَٰلِكَ يَضْرِبُ اللَّهُ
الْأَمْثَالَ (۱۷)

اوپر آیت ۱۶ میں اس حقیقت کی طرف اشارہ فرمایا تھا کہ شرک اور شفاعت باطل کا سب سے زیادہ گھنونا پہلو یہ ہے کہ یہ اندھے اور بینا اور نور و ظلمت یا بالفاظ دیگر حق و باطل سب کو ایک ہی درجے میں کر دیتا ہے جو بالبداہت عقل و انصاف کے خلاف ہے۔ اب ایک قدم بڑھ کر یہ واضح کیا جا رہا ہے کہ یہ چیز اس کائنات کی فطرت کے بھی خلاف ہے اور اس سنت الٰہی کے بھی جو اس کائنات میں جاری و نافذ ہے۔

فطرتِ کائنات کی شہادت

اس کائنات کی فطرت کو یوں واضح فرمایا کہ تم دیکھتے ہو کہ آسمان سے بارش ہوتی ہے تو وادیاں اور نالے لبریز ہو کر بہہ نکلتے ہیں، پھر دیکھتے ہو کہ سیلاب جھاگ کو ابھار کر اوپر کر دیتا ہے، پھر جھاگ تو خس و خاشاک ہو کر ہوا میں اڑ جاتا ہے لیکن پانی جو زمین اور اہل زمین کے لیے نافع ہے زمین میں ٹک جاتا ہے۔

پھر اسی حقیقت کو ایک دوسری مثال سے سمجھایا کہ چاندی کو کوئی زیور یا کوئی اور چیز بنانے کے لیے کٹھالی میں پگھلاتے ہو تو اس کا میل کچیل تو اوپر آ کر اڑ جاتا ہے اور چاندی باقی رہ جاتی ہے۔

حق و باطل کی کشمکش میں بقائے نافع

ان دونوں مثالوں سے خدا کی بنائی ہوئی اس کائنات کا مزاج واضح ہو جاتا ہے کہ یہ درحقیقت نافع کو باقی رکھنا چاہتی ہے اور غیر نافع کو برابر چھانٹتی رہتی ہے۔ پھر اسی پر اللہ تعالیٰ نے اپنی اس سنت کو مبنی کیا ہے کہ وہ بھی اسی طرح حق اور باطل کو ٹکراتا ہے تو اس ٹکراؤ سے حق کے اوپر باطل کا جو جھاگ ابھرتا ہے وہ یوں ہی خس و خاشاک کی طرح اڑ جاتا ہے البتہ حق جو لوگوں کو نفع پہنچانے والی چیز ہے وہ باقی رہ جاتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اسی طرح اس وقت قرآن کی صورت میں جو بارش زمین پر ہوئی ہے اس نے بھی کچھ جھاگ ابھار کر اوپر کر دیے ہیں لیکن یہ سارے جھاگ فنا ہو جائیں گے اور قرآن اور اس کے حاملین باقی رہ جائیں گے۔

'کَذٰلِکَ یَضْرِبُ اللّٰہُ الْاَمْثَالَ' اس سے آگے کا ٹکڑا حذف ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ یہ تمثیلیں اس لیے پیش کر رہا ہے کہ ان کے اندر وہ لوگ بھی اپنا مستقبل دیکھ لیں جو باطل کی حمایت میں آستینیں چڑھائے ہوئے ہیں اور اہل ایمان بھی اپنا روشن مستقبل دیکھ لیں۔

لِلَّذِينَ اسْتَجَابُوا لِرَبِّهِمُ الْحُسْنَىٰ ۚ وَالَّذِينَ لَمْ يَسْتَجِيبُوا لَهُ لَوْ أَنَّ لَهُم مَّا فِي الْأَرْضِ
جَمِيعًا وَمِثْلَهُ مَعَهُ لَافْتَدَوْا بِهِ ۚ أُولَٰئِكَ لَهُمْ سُوءُ الْحِسَابِ ۖ وَمَأْوَاهُمْ جَهَنَّمُ ۖ وَبِئْسَ
الْمِهَادُ (۱۸)

اصل حقیقت سادہ لفظوں میں

'اَلْحُسْنٰی' کا موصوف یہاں، بربنائے وضاحت قرینہ، محذوف ہے، یعنی 'اَلْعَاقِبَةُ الْحُسْنٰی'۔ اوپر تمثیلی رنگ میں جو بات فرمائی گئی تھی وہی بات سادہ لفظوں میں کہہ دی گئی ہے کہ جو لوگ آج اس دعوت پر لبیک کہہ رہے ہیں جو اللہ کا رسول قرآن کی شکل میں پیش کر رہا ہے ان کا انجام تو بخیر ہے، رہے وہ لوگ جو اس سے گریز

یا اس کی مخالفت کر رہے ہیں تو وہ یاد رکھیں کہ جب ان کے سامنے ان کا انجام آئے گا تو اس وقت ان کا یہ حال ہو گا کہ اگر ساری دنیا بھی ان کو ہاتھ آجائے اور اسی کے برابر مزید بھی تو وہ سب کچھ اس سے جان چھڑانے کے لیے فدیہ میں دے دینا چاہیں گے۔ فرمایا کہ یہی لوگ ہیں جن کے لیے برا حساب ہے، ان کا ٹھکانا جہنم ہوگا اور وہ نہایت برا ٹھکانا ہے۔ 'سُوْٓءُ الْحِسَابِ' سے اس حقیقت کی طرف اشارہ مقصود ہے کہ ان کی ایک ایک چھوٹی سے چھوٹی بات پر بھی گرفت ہوگی، اور ان کا ہر قول و فعل اپنی اصلی بھیانک شکل میں سامنے آئے گا۔ اہل ایمان کے ساتھ تو ان کی لغزشوں اور کوتاہیوں کے معاملے میں چشم پوشی برتی جائے گی لیکن ان اکڑنے والوں کی رائی بھی ہوگی تو وہ پہاڑ بن کر سامنے آئے گی۔

'لَوْ اَنَّ لَهُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا' سے ان کے اعراض و انکار کے اصل سبب پر روشنی پڑ رہی ہے کہ یہ اس دنیا اور متاع دنیا کی محبت ہے جو قرآن کی دعوت سے انھیں روک رہی ہے لیکن جس دنیا کا عشق آج ان سے یہ حرکت کرا رہا ہے جب اس کا انجام سامنے آئے گا تو یہ سارا عشق ہرن ہو جائے گا۔ اس وقت تو یہ چاہیں گے کہ یہ ساری دنیا اور اس کے برابر ایک اور دنیا بھی انھیں مل جائے تو وہ یہ سب کچھ فدیہ میں دے کر کسی طرح اس سے نجات حاصل کریں۔

اَفَمَنْ یَّعْلَمُ اَنَّمَآ اُنْزِلَ اِلَیْكَ مِنْ رَّبِّكَ الْحَقُّ كَمَنْ هُوَ اَعْمٰى ۭ اِنَّمَا یَتَذَكَّرُ اُولُوا الْاَلْبَابِ (۱۹)

'اَعْمٰی' کا لفظ، جیسا کہ آیت ۱۶ میں عقل و دل کے اندھوں کے لیے آیا ہے اسی طرح اس آیت میں بھی یہ عقل و دل کے اندھوں کے لیے وارد ہوا ہے۔ یہ آیت بطور التفات، پیغمبر صلعم کی تسلی کے لیے بھی ہے اور مکذبین و منکرین کی تہدید و وعید کے لیے بھی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تسلی کا پہلو تو یہ ہے کہ تم قرآن کی شکل میں جو دعوت پیش کر رہے ہو اس کے بارے میں ہر ایک کا رویہ یکساں نہیں ہوگا۔ اس سے یاد دہانی وہی حاصل کریں گے جو 'اُولُوا الْاَلْبَاب' یعنی عقل و دل رکھنے والے ہیں، جن کے دل مردہ اور جن کی عقلیں اندھی ہو چکی ہیں وہ اس سے کوئی فائدہ نہیں اٹھائیں گے۔ مطلب یہ کہ تم ان کے رویہ سے بلاوجہ بددل اور پریشان نہ ہو۔ (پیغمبر صلعم کو تسلی، منکرین کو تہدید)

اس آیت کا اسلوب خود بول رہا ہے کہ لوگ دو قسم کے ہوتے ہیں ایک وہ جن کے لیے پیغمبر اور قرآن کی ہر بات خود اپنے دل کی آواز ہوتی ہے۔ وہ پیغمبر کی بات اور قرآن کی آیات سن کر یوں محسوس کرتے ہیں کہ

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

ان کے لیے قرآن کی حیثیت ایک یاد دہانی کی ہوتی ہے۔ وہ ان پر کوئی چیز اوپر سے لادتا نہیں بلکہ خود ان کی اپنی فطرت کے مدفون خزانوں کو ابھار کر ان کی نگاہوں کے سامنے کر دیتا ہے۔

منکرین و مکذبین کے لیے اس میں وعید یہ ہے کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ اس طرح کے اندھے لوگ ان لوگوں کے

مانند ہو جائیں جن کے دل و دماغ روشن ہیں۔ لازم ہے کہ دونوں کا انجام ان کے اعمال کے اعتبار سے الگ الگ ہو۔

اَلَّذِيْنَ يُوْفُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَلَا يَنْقُضُوْنَ الْمِيْثَاقَ (۲۰)

میثاق کا مفہوم

'میثاق' سے مراد یہاں میثاقِ فطرت ہے جو تمام اولادِ آدم سے لیا گیا ہے اور جس کا سب نے اقرار کیا ہے۔ اس پر مفصل بحث سورۂ اعراف آیت ۱۷۲ 'وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْۢ بَنِيْٓ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَاَشْهَدَهُمْ عَلٰٓي اَنْفُسِهِمْ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ قَالُوْا بَلٰى' کے تحت گزر چکی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جو لوگ اس عہد کو یاد رکھے ہوئے ہیں اور جنھوں نے اس پیمان کو توڑا نہیں ہے وہی لوگ اس قرآن سے یاددہانی حاصل کریں گے رہے وہ لوگ جو اپنی فطرت کو مسخ اور اس میثاق کو توڑ چکے ہیں ان سے کسی خیر کی امید نہ رکھو۔[۱]

وَالَّذِيْنَ يَصِلُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ وَيَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ وَيَخَافُوْنَ سُوْۗءَ الْحِسَابِ (۲۱)

رشتۂ رحم کا پاس احترام

'مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ' سے مراد رشتۂ رحم کا پاس و احترام ہے۔ یعنی جس طرح وہ اللہ کے حقوق کا دل سے احترام کرتے ہیں اسی طرح بندوں کے جو حقوق ان پر بربنائے رشتۂ رحم عاید ہوتے ہیں ان کو بھی پوری فیاضی سے ادا کرتے ہیں، وہ رشتۂ رحم کو کاٹتے نہیں بلکہ اللہ کے حکم کے مطابق اس کو جوڑتے ہیں۔ اور یہ سب کچھ وہ کسی نمود و نمائش یا غرض کے لیے نہیں بلکہ خدا کے ڈر سے اور اس کی رضا جوئی کے لیے کرتے ہیں۔ سورہ دہر میں بھی یہی حقیقت یوں واضح فرمائی گئی ہے 'يُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰي حُبِّهٖ مِسْكِيْنًا وَّيَـتِـيْمًا وَّاَسِيْرًا ۝ اِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَاۗءً وَّلَا شُكُوْرًا ۝ اِنَّا نَخَافُ مِنْ رَّبِّنَا يَوْمًا عَبُوْسًا قَمْطَرِيْرًا' (۸-۱۰)

وَالَّذِيْنَ صَبَرُوا ابْتِغَاۗءَ وَجْهِ رَبِّهِمْ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً وَّيَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ اُولٰۗىِٕكَ لَهُمْ عُقْبَى الدَّارِ (۲۲)

انہی کی مزید صفات بیان ہو رہی ہیں کہ اللہ اور بندوں کے حقوق کی ادائیگی کی راہ میں ان کو جو مشکلات و مصائب پیش آتے ہیں وہ ان کو اللہ کی رضا جوئی کی خاطر برداشت کرتے ہیں۔ 'اَقَامُوا الصَّلٰوةَ' نماز کا اہتمام کرتے ہیں۔ ہم دوسرے مقامات میں واضح کر چکے ہیں کہ نماز پڑھنے اور نماز کے اہتمام میں بڑا فرق ہے۔ اس کی تفصیل اس کے محل میں دیکھیے۔

سری انفاق کی اہمیت

'وَاَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً' کی باقاعدہ شکل زکوٰۃ ہے لیکن اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ زکوٰۃ کے حکم کے بعد انفاق کا حکم باقی نہیں رہا۔ زکوٰۃ تو گویا علانیہ انفاق کے تحت آ گئی۔ سری انفاق جس پر اصل فضیلت کا انحصار ہے، وہ زکوٰۃ کے بعد بھی باقی رہا ہے اور تزکیۂ نفس کے پہلو سے اصلی اہمیت اسی انفاق کی ہے۔ 'وَيَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ' یعنی وہ برائی کو برائی سے نہیں بلکہ اس کو نیکی اور بھلائی سے دفع کرتے ہیں۔ یوں تو یہ ایک جامع کلیہ ہے لیکن اس کا ایک خاص محل بھی ہے، وہ یہ کہ مستحقین کے ساتھ سلوک کرنے

---

[۱] اس عہدِ فطرت پر مفصل بحث ہم نے اپنی کتاب حقیقتِ شرک و توحید میں کی ہے۔ تفصیل کے طالب اسے پڑھیں۔

میں اس چیز کو نہیں دیکھتے کہ کس کا سلوک ان کے ساتھ کیسا ہے بلکہ وہ ان کے ساتھ بھی اچھا سلوک کرتے ہیں جو ان کے ساتھ برا سلوک کرتے ہیں۔ قرآن اور حدیث دونوں سے یہ بات ثابت ہے کہ اس نیکی کا اللہ تعالیٰ کی میزان میں بڑا وزن ہے۔

'اُولٰٓئِکَ لَھُمْ عُقْبَی الدَّارِ' دار سے مراد دارِ آخرت ہے، فرمایا کہ دارِ آخرت کا اصلی صلہ اور اجر درحقیقت انہی لوگوں کے لیے ہے۔ مطلب یہ کہ ان لوگوں کا زعم بالکل باطل ہے جنھوں نے شرک اور شفاعت باطل کا عقیدہ ایجاد کر کے حق اور باطل، عدل اور ظلم دونوں کو یکساں کر دیا ہے۔

جَنّٰتُ عَدْنٍ یَّدْخُلُوْنَهَا وَمَنْ صَلَحَ مِنْ اٰبَآئِهِمْ وَاَزْوَاجِهِمْ وَذُرِّیّٰتِهِمْ وَالْمَلٰٓئِکَةُ یَدْخُلُوْنَ عَلَیْهِمْ مِّنْ کُلِّ بَابٍ ۝ سَلٰمٌ عَلَیْکُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ فَنِعْمَ عُقْبَی الدَّارِ (۲۳-۲۴)

جنت میں جذبات کی رعایت

یہ اس 'عُقْبَی الدَّارِ' یعنی انجام خیر کی تفصیل ہے جس کا ذکر اوپر والی آیت میں گزرا۔ فرمایا کہ ان کے لیے ابد کے باغ ہوں گے جن میں وہ اتریں گے اور ان کی مسرت کی تکمیل کے لیے ان کے ساتھ ان کے باپ دادوں اور ان کی ازواج و اولاد میں سے ان لوگوں کو بھی جمع کر دیا جائے گا جو اپنے اعمال کی بدولت اس کے اہل قرار پائیں گے۔ یہ انسان کی فطرت ہے کہ جب وہ کسی نعمت سے بہرہ مند ہوتا ہے تو اس کی یہ دلی آرزو ہوتی ہے کہ اس میں وہ لوگ بھی شریک ہوں جو اپنے عزیز رہے ہیں یا جنھوں نے اس کو عزیز رکھا ہے۔ اس کی اس فطرت کے تقاضے کا لحاظ کر کے اللہ تعالیٰ اس کے عزیزوں اور قریبوں کو بھی اس کے ساتھ جمع کر دے گا بایں شرط کہ وہ جنت میں جانے کے اہل ہوں۔ یہ شرط ایک بنیادی شرط ہے جو ملحوظ نہ رہے تو وہ نظامِ حق ہی متزلزل ہو جائے جو ان آیات میں زیر بحث ہے لیکن اس شرط سے اللہ تعالیٰ کے اس فضل کی نفی نہیں ہوتی کہ وہ ان صالحین و ابرار کی مسرت کی تکمیل کے لیے ان کے ان اعزا و اقربا کو بھی ان کے ساتھ جمع کر دے جو اگرچہ باعتبار درجہ و مرتبہ ان سے فروتر ہوں لیکن ہوں وہ جنت کے حق داروں میں سے۔

'وَالْمَلٰٓئِکَةُ یَدْخُلُوْنَ عَلَیْهِمْ الایة' اوپر والی بات تکمیلِ مسرت کی خاطر تھی اب یہ ان کے اعزاز و اکرام کا پہلو نمایاں کیا جا رہا ہے کہ اس جنت کے بہت سے دروازے ہوں گے اور ہر دروازے سے فرشتے ان کے پاس سلام و تہنیت کے لیے پہنچیں گے اور ان کو ان کی ثابت قدمی پر مبارک باد دیں گے جس کے صلہ میں وہ اللہ کے اس فضل کے حق دار ٹھہرے۔

اللہ تعالیٰ کی طرف سے تحسین

'فَنِعْمَ عُقْبَی الدَّارِ' کا ٹکڑا ہمارے نزدیک فرشتوں کے قول تہنیت کا جزو نہیں بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس مرتبہ بلند کی تحسین ہے۔ اوپر آیت ۲۲ میں فرمایا تھا کہ 'اُولٰٓئِکَ لَھُمْ عُقْبَی الدَّارِ' اب جب اس 'عُقْبَی الدَّارِ' کی شان و عظمت واضح فرمائی تو بطور تحسین فرمایا کہ 'فَنِعْمَ عُقْبَی الدَّارِ' دیکھو، کیا ہی خوب ہے یہ دارِ آخرت کی کامیابی!!

وَالَّذِیْنَ یَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مِیْثَاقِهٖ وَیَقْطَعُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ یُّوْصَلَ

وَيُفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ ۙ أُولَٰئِكَ لَهُمُ اللَّعْنَةُ وَلَهُمْ سُوءُ الدَّارِ (۲۵)

مکذبین کی صفات — اب یہ بالکل متقابل گروہ کا بیان ہے۔ ان لوگوں کا جو عہد فطرت کو، اس کا اقرار کرنے اور اس کو باندھنے کے بعد توڑ رہے ہیں اور رشتۂ رحم، جس کو اللہ نے جوڑنے کا حکم دیا ہے اور جس کو توڑنا تمام فساد فی الارض کی اصل ہے، اس کو کاٹ رہے ہیں۔ فرمایا کہ یہی لوگ ہیں جن پر اللہ کی لعنت ہے اور انہی لوگوں کے لیے دارِ آخرت کی ذلت و رسوائی ہے۔ یہ حقیقت ہم دوسرے مقام میں واضح کر چکے ہیں کہ اسلام کا نظامِ حق و عدل دو بنیادی ستونوں پر قائم ہے۔ ایک وحدتِ الٰہ، دوسرا وحدتِ آدم۔ اگر یہ دونوں بنیادیں ڈھا دی جائیں تو پھر صالح معاشرہ اور صالح تمدن کا وجود میں آنا ناممکن ہے۔

اَللّٰهُ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَقْدِرُ ۭ وَفَرِحُوْا بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۭ وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا مَتَاعٌ (۲۶)

اصل تقدیرِ کلام یوں ہے يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَقْدِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ۔ قرینہ کی وضاحت کے سبب سے ایک جگہ لِمَنْ يَّشَآءُ کو حذف کر دیا۔ قَدَرَ کے معنی تو اندازہ کرنے کے ہیں لیکن یہاں یہ تنگ کر دینے کے معنی میں ہے۔ لفظ 'مَتَاع' کی تنکیر تقلیل کے مفہوم پر دلیل ہے۔

اصل سبب انکار کی وضاحت — اب یہ ان منکرین کے اصل سبب انکار و تکذیب کو واضح فرمایا جا رہا ہے کہ ان کو جو دنیا کی نعمتیں ملی ہیں ان کے سبب سے یہ غرور اور گھمنڈ میں مبتلا ہو گئے ہیں اور پیغمبر کی طرف سے آخرت کی یاد دہانی ان پر شاق گزر رہی ہے حالانکہ یہ اللہ ہی ہے جو جس کے لیے چاہتا ہے رزق کے دروازے کشادہ کر دیتا ہے اور جس کے لیے چاہتا ہے تنگ کر دیتا ہے۔ جس کے لیے وہ کشادہ کرتا ہے اس سے وہ چاہتا ہے کہ وہ اپنے رب کا شکر گزار بندہ بنے اور جس کے لیے تنگ کرتا ہے اس سے وہ یہ چاہتا ہے کہ وہ صبر کرے۔ اسی صبر و شکر پر تمام دین کی عمارت قائم ہے۔ جو لوگ اس دنیا کے خزف ریزے پا کر اس کے غرور میں آخرت کو بھول بیٹھے ہیں وہ جب روزِ آخرت میں شاکرین و صابرین کے اجر کو دیکھیں گے، تب انھیں اندازہ ہوگا کہ نہایت ہی حقیر چیز کے لیے انھوں نے یہ ابدی بادشاہی کھو دی۔

۶- آگے کا مضمون ——— آیات ۲۷-۳۲

اب آگے یہ حقیقت واضح کی جا رہی ہے کہ آفاق و انفس کی یہ دلیلیں جو ان کو سنائی جا رہی ہیں ان سے ان کا اطمینان نہیں ہو رہا ہے۔ یہ مطالبہ کر رہے ہیں کہ ان کو کوئی حسی معجزہ دکھایا جائے تب وہ مانیں گے کہ یہ اللہ کے رسول ہیں اور جو کچھ یہ کہہ رہے ہیں وہ حق ہے۔ ان کے اس مطالبے کے جواب میں فرمایا گیا ہے کہ ایمان و ہدایت کا راستہ اللہ کے کلام اور اس کے رسول کی باتوں پر غور کرنے سے کھلتا ہے۔ جو لوگ یہ راستہ نہیں اختیار کرتے وہ دنیا جہان کے معجزے دیکھ کر بھی اندھے ہی بنے رہتے ہیں۔ آیات ملاحظہ ہوں۔

آیات ۲۷-۳۲
وَيَقُولُ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْلَا أُنزِلَ عَلَيْهِ آيَةٌ مِّن رَّبِّهِ ۗ قُلْ إِنَّ اللَّهَ
يُضِلُّ مَن يَشَاءُ وَيَهْدِي إِلَيْهِ مَنْ أَنَابَ ﴿٢٧﴾ الَّذِينَ آمَنُوا وَ
تَطْمَئِنُّ قُلُوبُهُم بِذِكْرِ اللَّهِ ۗ أَلَا بِذِكْرِ اللَّهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوبُ ﴿٢٨﴾
الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ طُوبَىٰ لَهُمْ وَحُسْنُ مَآبٍ ﴿٢٩﴾
كَذَٰلِكَ أَرْسَلْنَاكَ فِي أُمَّةٍ قَدْ خَلَتْ مِن قَبْلِهَا أُمَمٌ لِّتَتْلُوَ
عَلَيْهِمُ الَّذِي أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ وَهُمْ يَكْفُرُونَ بِالرَّحْمَٰنِ ۚ قُلْ هُوَ
رَبِّي لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَإِلَيْهِ مَتَابِ ﴿٣٠﴾ وَلَوْ أَنَّ قُرْآنًا
سُيِّرَتْ بِهِ الْجِبَالُ أَوْ قُطِّعَتْ بِهِ الْأَرْضُ أَوْ كُلِّمَ بِهِ الْمَوْتَىٰ ۗ
بَل لِّلَّهِ الْأَمْرُ جَمِيعًا ۗ أَفَلَمْ يَيْأَسِ الَّذِينَ آمَنُوا أَن لَّوْ يَشَاءُ اللَّهُ
لَهَدَى النَّاسَ جَمِيعًا ۗ وَلَا يَزَالُ الَّذِينَ كَفَرُوا تُصِيبُهُم بِمَا صَنَعُوا
قَارِعَةٌ أَوْ تَحُلُّ قَرِيبًا مِّن دَارِهِمْ حَتَّىٰ يَأْتِيَ وَعْدُ اللَّهِ ۚ إِنَّ
ع ۵ ۱۰ اللَّهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيعَادَ ﴿٣١﴾ وَلَقَدِ اسْتُهْزِئَ بِرُسُلٍ مِّن قَبْلِكَ
فَأَمْلَيْتُ لِلَّذِينَ كَفَرُوا ثُمَّ أَخَذْتُهُمْ ۖ فَكَيْفَ كَانَ عِقَابِ ﴿٣٢﴾

ترجمۂ آیات ۲۷-۳۲
اور جنھوں نے کفر کیا وہ کہتے ہیں کہ اس پر اس کے رب کی جانب سے کوئی نشانی کیوں
نہیں اتاری گئی؟ کہہ دو کہ اللہ جس کو چاہتا ہے گمراہ کرتا ہے اور اپنی طرف رہنمائی ان لوگوں کی فرماتا
ہے جو اس کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ جو ایمان لاتے ہیں اور جن کے دل اللہ کے ذکر سے مطمئن ہوتے
ہیں، سن لو کہ اللہ کے ذکر ہی سے دلوں کو طمانیت حاصل ہوتی ہے۔ جو لوگ ایمان لائے اور جنھوں
نے اچھے عمل کیے ان کے لیے خوش خبری ہے اور اچھا ٹھکانا ہے۔ ۲۷-۲۹

اسی طرح ہم نے تم کو بھیجا ہے ایک ایسی امت میں جس سے پہلے بہت سی امتیں گزر چکی ہیں تاکہ تم انھیں وہ چیز سنا دو جو ہم نے تم پر وحی کی ہے۔ ہر چند وہ خدائے رحمان کا انکار کر رہے ہیں۔ کہہ دو کہ وہی میرا رب ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں، اسی پر میں نے بھروسہ کیا اور اسی کی طرف لوٹنا ہے۔ اور اگر کوئی ایسا قرآن بھی اترتا جس سے پہاڑ حرکت میں آجاتے یا زمین پاش پاش ہو جاتی یا مردے بولنے لگ جاتے تب بھی یہ ایمان لانے والے نہیں تھے۔ بلکہ سارا اختیار اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے۔ کیا ایمان لانے والوں کو اس بات سے اطمینان نہیں ہوا کہ اگر اللہ چاہتا تو سب ہی کو ہدایت پر کر دیتا۔ اور ان کافروں کو برابر کوئی نہ کوئی آفت ان کے اعمال کی پاداش میں پہنچتی رہے گی یا ان کی بستی کے قریب نازل ہوتی رہے گی۔ یہاں تک کہ اللہ کے وعدے کے ظہور کا وقت آجائے، اللہ اپنے وعدے کی خلاف ورزی نہیں کرے گا۔ اور تم سے پہلے بھی رسولوں کا مذاق اڑایا گیا تو میں نے کفر کرنے والوں کو ڈھیل دی، پھر میں نے ان کو پکڑا تو دیکھو کیسا ہوا میرا عذاب۔ ۳۰ - ۳۲

۷۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَيَقُولُ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْلَا أُنزِلَ عَلَيْهِ آيَةٌ مِّن رَّبِّهِ ۗ قُلْ إِنَّ اللَّهَ يُضِلُّ مَن يَشَاءُ وَيَهْدِي إِلَيْهِ مَنْ أَنَابَ (۲۷)

ایمان کی رہنما آفاق و انفس کی نشانیاں ہیں

'آیۃ' سے مراد یہاں کوئی حسی معجزہ ہے۔ یعنی یہ لوگ آفاق و انفس کی ان نشانیوں سے تو آنکھیں بند کیے ہوئے ہیں جو ہر طرف سے ان کو گھیرے ہوئے ہیں اور جن کی طرف قرآن ان کو توجہ دلا رہا ہے البتہ یہ مطالبہ کیے جا رہے ہیں کہ ان کو پیغمبر کوئی معجزہ دکھائیں تب وہ مانیں گے کہ یہ اللہ کے رسول ہیں۔ جواب میں اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنی یہ سنت یاد دلائی کہ اللہ تعالیٰ اپنی ہدایت ان لوگوں کو نہیں بخشتا جو معجزوں اور کرشموں کے مطالبے کرتے ہیں بلکہ ان لوگوں کو یہ نعمت بخشتا ہے جو آفاق و انفس کی نشانیوں کو دیکھ کر حقیقت کے طالب بنتے ہیں اور خدا کی طرف شرح صدر اور طمانیت قلب کے لیے متوجہ ہوتے ہیں۔ جن کے اندر یہ طلب پیدا ہو جاتی

ہے ان کے لیے

رو ئے و آواز پیمبر معجزہ است

رہے وہ لوگ جو عجائب اور کرشموں کے درپے رہتے ہیں ان کی زندگی ہمیشہ ٹھوکریں کھانے میں ہی گزرتی ہے۔ اللہ ایسے آنکھیں رکھ کر اندھے بن جانے والوں کے لیے یہی چاہتا ہے کہ وہ اپنی اسی ضلالت میں پڑے رہیں۔ خدا اگر جبر و زور اور معجزوں کے بل پر لوگوں کو مومن بنانا چاہتا تو اس کے پاس ایک سے ایک بڑھ کر معجزے موجود ہیں لیکن وہ چاہتا ہے کہ لوگ اپنی عقل و فکر سے کام لے کر اس کی طرف متوجہ ہوں۔

الَّذِينَ آمَنُوا وَتَطْمَئِنُّ قُلُوبُهُم بِذِكْرِ اللَّهِ ۗ أَلَا بِذِكْرِ اللَّهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوبُ (۲۸)

'مَنْ أَنَابَ' کی تفصیل ہے اور 'ذِكْرِ اللَّهِ' سے مراد اللہ تعالیٰ کی صفات، اور اس کے دلائل و حجج کا وہ بیان ہے جو قرآن میں موجود ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی طرف رہنمائی انہی لوگوں کو فرماتا ہے جن کے دل اللہ کی صفات اور اس کے دلائل و براہین سے طمانیت پاتے ہیں۔ جو لوگ یہ راہ نہیں اختیار کرتے وہ ہمیشہ ایمان سے محروم ہی اور معجزات کے مطالبے ہی کرتے رہتے ہیں۔

ذکر اللہ میں طمانیت قلب

'أَلَا بِذِكْرِ اللَّهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوبُ' اب یہ اصل بات پورا زور دے کر فرمائی کہ کان کھول کر سن لو کہ اگر دلوں کی طمانیت اور ایمان و شرح صدر کی نعمت مطلوب ہے تو وہ معجزوں اور کرشموں سے نہیں حاصل ہوتی بلکہ اللہ اور اس کی صفات جمال و کمال کے تذکر و تفکر سے حاصل ہوتی ہے تو اگر یہ چیز مطلوب ہے تو پیغمبر کی دعوت سنو اور اس پر غور کرو ورنہ جس وادی میں چاہو ٹھوکریں کھاتے پھرو۔

الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ طُوبَىٰ لَهُمْ وَحُسْنُ مَآبٍ (۲۹)

مطلب یہ ہے کہ جن لوگوں نے یہ راہ اختیار کی اور اس کو اختیار کر کے ایمان و عمل صالح کی شاہراہ پر گامزن ہو گئے ان کے لیے تو مبارکباد اور خوش خبری ہے، ان کو اچھی منزل اور اچھا ٹھکانا نصیب ہوگا۔ رہے وہ لوگ جو معجزات کے منتظر ہیں تو وہ اسی انتظار میں ایک دن اپنے اس انجام سے دوچار ہو جائیں گے جو ایسے عقل کے اندھوں کے لیے مقدر ہے۔

كَذَٰلِكَ أَرْسَلْنَاكَ فِي أُمَّةٍ قَدْ خَلَتْ مِن قَبْلِهَا أُمَمٌ لِّتَتْلُوَ عَلَيْهِمُ الَّذِي أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ وَهُمْ يَكْفُرُونَ بِالرَّحْمَٰنِ ۚ قُلْ هُوَ رَبِّي لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَإِلَيْهِ مَتَابِ (۳۰)

مطالبۂ معجزات کا جواب ایک اور پہلو سے

یہ بھی اسی مطالبۂ معجزات کا جواب ہے جس کا ذکر آیت ۲۷ میں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ نہ تم دنیا میں پہلے نبی ہو اور نہ یہ (اہل عرب) دنیا میں پہلی امت ہیں۔ تم سے پہلے نبی اور رسول بھی گزر چکے ہیں اور ان سے پہلے قومیں اور امتیں بھی گزر چکی ہیں۔ تمہارے لیے اپنے پیشرو نبیوں اور رسولوں کی زندگی میں اسوہ اور نمونہ ہے اور ان کے لیے ان کے پیشرو قوموں کی زندگی نظیر اور مثال ہے۔ تو تم ان کے نت نئے مطالبات سے دل تنگ نہ ہو بلکہ ان کو اللہ کی وہ کتاب سناؤ جو تم پر وحی کی جا رہی ہے، ہر چند وہ خدائے رحمان کا انکار ہی کرتے رہیں۔ اور

ان کے مطالبات کے جواب میں ان کو سنا دو کہ اللہ ہی میرا رب ہے، کوئی اس کا شریک نہیں، میرا اسی پر بھروسہ اور وہی میرا مرجع ہے۔ مجھے جو پیام دے کر اس نے بھیجا ہے وہ میں تمھیں سنا رہا ہوں۔ معجزے دکھانا میرا کام نہیں ہے۔ یہ اس کی حکمت و مشیت پر منحصر ہے، وہ چاہے گا، دکھلائے گا، نہیں چاہے گا نہیں دکھائے گا۔

وَلَوْ أَنَّ قُرْآنًا سُيِّرَتْ بِهِ الْجِبَالُ أَوْ قُطِّعَتْ بِهِ الْأَرْضُ أَوْ كُلِّمَ بِهِ الْمَوْتَىٰ ۗ بَل لِّلَّهِ الْأَمْرُ جَمِيعًا ۗ أَفَلَمْ يَيْأَسِ الَّذِينَ آمَنُوا أَن لَّوْ يَشَاءُ اللَّهُ لَهَدَى النَّاسَ جَمِيعًا ۗ وَلَا يَزَالُ الَّذِينَ كَفَرُوا تُصِيبُهُم بِمَا صَنَعُوا قَارِعَةٌ أَوْ تَحُلُّ قَرِيبًا مِّن دَارِهِمْ حَتَّىٰ يَأْتِيَ وَعْدُ اللَّهِ ۚ إِنَّ اللَّهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيعَادَ (۳۱)

وَلَوْ أَنَّ قُرْآنًا .... أَوْ كُلِّمَ بِهِ الْمَوْتَىٰ: میں جوابِ شرط محذوف ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ معجزے کا مطالبہ کرتے تو ہیں اور اس سے ایک نیک نیت آدمی کو یہ گمان بھی ہوتا ہے کہ کیا عجب یہ اپنی طلب کے مطابق معجزے دیکھ کر ایمان ہی لائیں لیکن یہ گمان محض گمان ہے۔ اگر ان کے لیے کوئی ایسا قرآن بھی اتارا جاتا جس سے پہاڑ حرکت میں آجاتے یا زمین شق ہو جاتی یا مردے بولنے لگتے جب بھی یہ ایمان لانے والے نہیں تھے بلکہ اس وقت بھی یہ اپنے کفر پر اڑے رہنے کے لیے کوئی نہ کوئی بہانہ بنا ہی لیتے۔ آخر ان کے پیشروؤں نے کتنے معجزے دیکھے لیکن وہ ان کو سحر اور شعبدہ بازی کہہ کر بدستور اپنے کفر پر اڑے ہی رہ گئے یہاں تک کہ بالآخر عذابِ الٰہی نے ان کا فیصلہ کر دیا۔

بَل لِّلَّهِ الْأَمْرُ جَمِيعًا: مطلب یہ ہے کہ اس معاملے کو تم تمام تر اللہ پر چھوڑ دو۔ وہی جانتا ہے کہ یہ کس چیز کے مستحق ہیں اور ان کے ساتھ کیا معاملہ ہونا چاہیے۔ ہدایت و ضلالت کے باب میں اس کی جو سنت ہے وہ اسی کے مطابق ان کے ساتھ معاملہ کرے گا۔ ہدایت کی راہ وہ انھی لوگوں کے لیے کھولے گا جو اس کے قانون کے مطابق اس کے سزاوار ٹھہریں گے۔

مسلمانوں کو تسلی

أَفَلَمْ يَيْأَسِ الَّذِينَ آمَنُوا أَن لَّوْ يَشَاءُ اللَّهُ لَهَدَى النَّاسَ جَمِيعًا: یہ نیک دل مسلمانوں کو تسلی دی گئی ہے کہ تمھارے اندر خواہش پیدا ہوتی ہے کہ ان کو ان کی طلب کے مطابق معجزہ دکھا ہی دیا جائے لیکن کیا تمھارے اطمینان کے لیے یہ چیز بس نہیں کرتی کہ اللہ اگر اپنے جبر و زور ہی کے ذریعے سے لوگوں کو ہدایت کی راہ پر لانا چاہتا تو آن کی آن میں سب کو مسلم و مومن بنا دیتا لیکن اس نے ایسا نہیں کیا اس لیے کہ وہ چاہتا ہے کہ لوگ اپنی عقل و بصیرت سے کام لیں، آفاق و انفس کے دلائل پر غور کریں، پیغمبر کی باتوں کو سوچیں اور سمجھیں اور پھر اپنے اختیار و ارادہ کی آزادی کے ساتھ اس راہِ حق کو اختیار کریں۔

تنبیہات کی طرف اشارہ

وَلَا يَزَالُ الَّذِينَ كَفَرُوا .... إِنَّ اللَّهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيعَادَ: یعنی یہ بات بھی نہیں ہے کہ نشانیاں ظاہر نہ ہو رہی ہوں، وقتاً فوقتاً ان کی کرتوتوں کی پاداش میں خود ان پر یا ان کے قرب و جوار کے لوگوں پر تنبیہات نازل ہوتی ہی رہتی ہیں۔ ان سے مقصود یہی ہوتا ہے کہ یہ لوگ جاگیں، آنکھیں کھولیں اور پیغمبر کی باتوں

کو سنیں سمجھیں لیکن ان سے یہ کوئی سبق نہیں لیتے بلکہ منتظر ہیں کہ عذاب الٰہی کا ڈنڈا خود ان کی کمر پر پڑے تب یہ مانیں گے۔ تو اس کا وقت بھی آ جائے گا۔ ان کو جس عذاب کی دھمکی دی جا رہی ہے اگر یہ اپنی ضد پر اڑے رہے تو وہ آ کے رہے گا۔ اللہ اپنے وعدے کی خلاف ورزی نہیں کرے گا۔

حَتّٰی یَاْتِیَ وَعْدُ اللّٰہِ میں 'وَعْدُ اللّٰہ' سے مراد وہ عذاب الٰہی ہے جس کی خبر ہر رسول نے اپنی قوم کو دی کہ اگر اس نے رسول کی بات نہ مانی تو بالآخر اس پر عذاب الٰہی آئے گا جو اس کو یک قلم فنا کر دے گا۔ رسول کے دور بعثت سے متعلق ہم یہ بات بھی کہیں لکھ آئے ہیں کہ ان کے زمانے میں ایسی نشانیوں کے ظہور کی خاص طور پر کثرت ہوتی ہے جن سے غافلوں کے اندر بیداری پیدا ہو تاکہ رسول کی باتیں سننے کے لیے ان کے کان کھلیں۔

وَلَقَدِ اسْتُهْزِئَ بِرُسُلٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَاَمْلَيْتُ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا ثُمَّ اَخَذْتُهُمْ فَكَيْفَ كَانَ عِقَابِ (۳۲)

تاخیر عذاب کی حکمت

اب یہ اس بات کی حکمت واضح فرما دی کہ ان کی ضد اور ان کے مطالبۂ عذاب کے باوجود ان پر جو عذاب نہیں آ رہا ہے تو اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ اللہ ان کو اتنی مہلت دے رہا ہے کہ ان پر اس کی حجت پوری ہو جائے۔ فرمایا کہ تم سے پہلے بھی رسولوں کا ان کی قوموں کی طرف سے مذاق اڑایا گیا لیکن ہم نے اس کے باوجود ان کو مہلت دی، پھر پکڑا تو دیکھو کیسا پکڑا اور ہمارا عذاب کیسا درد انگیز ہوا۔ یہی معاملہ ان کے ساتھ بھی ہوگا۔

'عِقَابِ' اصل میں عقابی ہے۔ قافیہ کی رعایت سے 'ی' گر گئی۔ کسرہ اس کی یادگار ہے۔

۸۔ آگے کا مضمون ——— آیات ۳۳-۳۷

آگے یہ حقیقت واضح فرمائی ہے کہ اگر ان کی یہ جسارت اپنے ان فرضی معبودوں کے بل پر ہے جن کو انھوں نے بلا کسی دلیل کے خدا کا شریک اور اپنا حامی و ناصر گمان کر رکھا ہے تو ان کو بتا دو کہ ان معبودوں کا کوئی وجود ہی نہیں ہے۔ یہ محض خیالی باتیں ہیں۔ یہ لوگ دنیا میں بھی خدا کے عذاب سے دوچار ہوں گے اور آخرت میں ان کو جس عذاب سے سابقہ پیش آنے والا ہے وہ تو اس سے بھی کہیں سخت ہوگا۔ جنت کے حق دار صرف اس کے مومن اور موحد بندے ہوں گے۔ اگر یہ لوگ اس بدیہی حقیقت کو جھٹلا رہے ہیں تو تم اس کا غم نہ کرو، اہل کتاب میں سے جو لوگ اچھے اور اپنی کتاب پر قائم ہیں وہ اس کتاب سے بہت خوش ہیں جو تم پر اتاری گئی ہے۔ آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۳۳-۳۷

اَفَمَنْ هُوَ قَآئِمٌ عَلٰى كُلِّ نَفْسٍۭ بِمَا كَسَبَتْ ۚ وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ ؕ
قُلْ سَمُّوْهُمْ ؕ اَمْ تُنَبِّئُوْنَهٗ بِمَا لَا يَعْلَمُ فِى الْاَرْضِ اَمْ بِظَاهِرٍ
مِّنَ الْقَوْلِ ؕ بَلْ زُيِّنَ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا مَكْرُهُمْ وَصُدُّوْا عَنِ السَّبِيْلِ ؕ وَ

مَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ هَادٍ ﴿۳۳﴾ لَهُمْ عَذَابٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا
وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَشَقُّ ۚ وَمَا لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ وَّاقٍ ﴿۳۴﴾ مَثَلُ الْجَنَّةِ
الَّتِيْ وُعِدَ الْمُتَّقُوْنَ ۭ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۭ اُكُلُهَا دَاۗىِٕمٌ وَّظِلُّهَا ۭ
تِلْكَ عُقْبَى الَّذِيْنَ اتَّقَوْا ڰ وَّعُقْبَى الْكٰفِرِيْنَ النَّارُ ﴿۳۵﴾ وَالَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ
الْكِتٰبَ يَفْرَحُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمِنَ الْاَحْزَابِ مَنْ يُّنْكِرُ بَعْضَهٗ ۭ
قُلْ اِنَّمَآ اُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَ اللّٰهَ وَلَآ اُشْرِكَ بِهٖ ۭ اِلَيْهِ اَدْعُوْا وَاِلَيْهِ
مَاٰبِ ﴿۳۶﴾ وَكَذٰلِكَ اَنْزَلْنٰهُ حُكْمًا عَرَبِيًّا ۭ وَلَىِٕنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَاۗءَهُمْ
بَعْدَ مَا جَاۗءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا وَاقٍ ﴿۳۷﴾ ع ۵ ۱۱

ترجمۂ آیات ۳۳-۳۷

کیا وہ ذات جو ہر جان سے اس کے عمل پر محاسبہ کرنے والی ہے (اور وہ جو کسی چیز پر قدرت نہیں رکھتے یکساں ہیں) اور ان لوگوں نے اللہ کے شریک بنا لیے ہیں۔ ان سے کہو ان کے نام تو بتاؤ۔ کیا تم خدا کو ایسی چیزوں کی خبر دے رہے ہو جن کے زمین میں وجود سے وہ بے خبر ہے یا یوں ہی ہوائی بات کر رہے ہو۔ بلکہ ان کافروں کی نگاہ میں ان کی چال کھبا دی گئی ہے اور یہ راہِ حق سے روک دیے گئے ہیں اور جس کو اللہ گمراہ کر دے تو ان کو کوئی دوسرا ہدایت دینے والا نہیں بن سکتا۔ ان کے لیے دنیا کی زندگی میں بھی عذاب ہے اور آخرت کا عذاب تو اس سے کہیں بھاری ہوگا۔ اور ان کو اللہ سے کوئی بچانے والا نہیں ہوگا۔ ۳۳-۳۴

اس جنت کی تمثیل جس کا متقیوں سے وعدہ ہے یہ ہے کہ اس کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی اس کا پھل بھی دائمی اور اس کا سایہ بھی دائمی۔ یہ انجام ہے ان لوگوں کا جنھوں نے تقویٰ اختیار کیا اور کافروں کا انجام دوزخ ہے۔ ۳۵

اور جن کو ہم نے کتاب عطا کی وہ اس چیز پر خوش ہیں جو تم پر اتاری گئی ہے اور ان جماعتوں میں سے ایسے بھی ہیں جو اس کے بعض حصوں کا انکار کرتے ہیں۔ تم کہہ دو کہ مجھے تو حکم ہوا ہے کہ میں اللہ ہی کی بندگی کروں اور اس کا کسی کو ساجھی نہ ٹھہراؤں۔ میں اسی کی طرف دعوت دیتا ہوں اور اسی کی طرف میرا لوٹنا ہے۔ اور اسی طرح ہم نے یہ کتاب ایک فرمان کی حیثیت سے عربی میں اتاری ہے اور اگر تم اس علم صحیح کے آ جانے کے بعد ان کی بدعتوں کی پیروی کرو گے تو نہ خدا کے مقابل میں تمہارا کوئی مددگار ہو گا نہ بچانے والا۔ ۳۶-۳۷

۹- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

أَفَمَنْ هُوَ قَائِمٌ عَلَىٰ كُلِّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ ۗ وَجَعَلُوا لِلَّهِ شُرَكَاءَ قُلْ سَمُّوهُمْ ۚ أَمْ تُنَبِّئُونَهُ بِمَا لَا يَعْلَمُ فِي الْأَرْضِ أَمْ بِظَاهِرٍ مِنَ الْقَوْلِ ۗ بَلْ زُيِّنَ لِلَّذِينَ كَفَرُوا مَكْرُهُمْ وَصُدُّوا عَنِ السَّبِيلِ ۗ وَمَنْ يُضْلِلِ اللَّهُ فَمَا لَهُ مِنْ هَادٍ (۳۳)

أَفَمَنْ هُوَ قَائِمٌ عَلَىٰ كُلِّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ، یعنی جو ہر جان کے ہر قول و فعل کی نگرانی بھی کر رہا ہے اور ہر قول و فعل کا محاسبہ بھی کرنے والا ہے۔

حذف بتقاضائے بلاغت

اس جملہ میں سوال کا آدھا حصہ بتقاضائے بلاغت حذف ہے۔ فرمانا یہ ہے کہ کیا وہ ذات جو ہر جان کے اعمال کی نگرانی بھی کر رہی ہے اور جو ہر ایک کے ہر قول و فعل کا محاسبہ بھی کرنے والی ہے اس کا شریک تم ایسی چیزوں کو بنائے ہوئے ہو جن کی نہ کوئی حقیقت، نہ جن کا کوئی وجود اور نہ جن کے پاس کوئی علم نہ کوئی اختیار۔ اس حذف سے اس بے تکی بات سے متکلم کی نفرت و کراہت کا اظہار ہو رہا ہے۔ گویا اس بھونڈی بات کا ذکر بھی اسے گوارا نہیں۔

وَجَعَلُوا لِلَّهِ شُرَكَاءَ قُلْ سَمُّوهُمْ، یعنی انھوں نے اللہ کے شریک بنائے ہیں ان سے کہو کہ ذرا یہ ان کے نام تو لیں جن کو یہ خدا کا شریک بنائے بیٹھے ہیں۔ قُلْ سَمُّوهُمْ، میں جو غصہ اور تحقیر مضمر ہے وہ محتاج بیان نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ مشرکین اس کے جواب میں انھی بتوں کے نام لے سکتے تھے جن کو وہ پوجتے تھے۔ ہبل، لات، عزّیٰ، نائلہ وغیرہ وغیرہ۔ لیکن ان کے جواب کا انتظار کیے بغیر یک قلم ان کے وجود ہی کی نفی فرما دی گئی کہ أَمْ تُنَبِّئُونَهُ بِمَا لَا يَعْلَمُ فِي الْأَرْضِ أَمْ بِظَاهِرٍ مِنَ الْقَوْلِ، یہ تم خدا کو ایسی چیزوں کا پتہ دے رہے ہو جن کے زمین میں وجود سے وہ بے خبر ہے یا یوں ہی ہوائی

نفی الشیء بنفی لازمہٖ کا اسلوب

باتیں کر رہے ہو۔ اَمْ تُنَبِّئُوْنَهٗ بِمَا لَا يَعْلَمُ فِي الْاَرْضِ میں زبان کا وہ اسلوب ہے جس کو ہم دوسرے مقام میں نفی الشیء و بنفی لازمہٖ کے عنوان سے ذکر کر چکے ہیں کہ بعض مرتبہ کسی شے کی نفی اس کے لوازم کی نفی سے کر دی جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر کوئی شے اس دنیا میں وجود رکھتی ہے تو لازم ہے کہ اس دنیا کے خالق کو اس کا پتہ ہو۔ اگر ایک چیز کا سرے سے خالق ہی کو پتہ نہیں تو اس کے وجود کے کیا معنی؟ اسی اصول پر اللہ تعالیٰ نے مشرکین سے بانداز طنز سوال فرمایا ہے کہ یہ خدا کی معلومات میں اضافہ کرنے اٹھے ہو یا یوں ہی ہوائی باتیں کر رہے ہو جن کا نہ کوئی سر ہے نہ پیر۔

حمایتِ شرک دنیوی مفادات کے لیے

'بَلْ زُيِّنَ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا مَكْرُهُمْ الاٰیۃ' آیت کے آخر میں اصل حقیقت واضح فرما دی کہ شرک کی حمایت میں جو لوگ آستینیں چڑھائے ہوئے ہیں یہ محض اپنے اقتدار اور اپنی پیشوائی کو بچائے رکھنے کی ایک چال ہے جو اس وقت انھیں بہت عزیز ہے۔ قرآن کے دلائل اور پیغمبر کی دعوت نے دین شرک کا پول اس طرح کھول دیا ہے کہ اب اس کے بڑے سے بڑے حامیوں کی نظر میں بھی اس کا کوئی وزن باقی نہیں رہ گیا ہے۔ سوال صرف مفاد کا ہے۔ پیشوائی کی موروثی گدی چھوڑی نہیں جاتی اس وجہ سے یہ جاننے کے باوجود کہ خدا کا راستہ وہی ہے جس کی طرف قرآن بلا رہا ہے یہ اپنی اس ضلالت پر اڑے ہوئے ہیں۔ اس طرح کے لوگ جو جان بوجھ کر حق کو جھٹلاتے اور باطل کی حمایت کرتے ہیں خدا کے قانون کی زد میں آجاتے ہیں اور جو خدا کے قانون کی زد میں آئے ہوئے ہوں کس کی طاقت ہے کہ ان کو ہدایت کی راہ پر لا سکے۔

لَهُمْ عَذَابٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَشَقُّ ۚ وَمَا لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ وَّاقٍ (۳۴)

ایسے لوگوں کے لیے دنیا میں بھی عذاب ہے اور دنیا کے عذاب سے کہیں بڑھ چڑھ کر آخرت کا عذاب ہے اور یہ لوگ اپنے مزعومہ شرکاء و شفعاء پر جو اعتماد کیے بیٹھے ہیں کہ وہ ان کو خدا کی پکڑ سے بچا لیں گے تو ان میں سے کوئی ان کو بچانے والا نہ بن سکے گا۔ یہاں اس سنت الٰہی کو یاد رکھیے جس کا حوالہ ہم بار بار دے چکے ہیں کہ جس قوم پر رسول کے ذریعہ سے حجت تمام کر دی جاتی ہے اگر وہ ایمان نہیں لاتی تو لازماً ہلاک کر دی جاتی ہے۔

مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِيْ وُعِدَ الْمُتَّقُوْنَ ۭ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۭ اُكُلُهَا دَاۗىِٕمٌ وَّظِلُّهَا ۭ تِلْكَ عُقْبَى الَّذِيْنَ اتَّقَوْا ڰ وَّعُقْبَى الْكٰفِرِيْنَ النَّارُ (۳۵)

متقین کے انجام کا بیان

'اُكُلُهَا دَاۗىِٕمٌ وَّظِلُّهَا' میں 'ظِلُّهَا' کی خبر قرینہ کی وضاحت کے سبب سے محذوف ہے یعنی ظِلُّهَا دَاۗىِٕمٌ۔ یہ مقابلہ کے اصول کے مطابق رسول کے مکذبین کا انجام بیان کرنے کے بعد ان لوگوں کا انجام بھی بیان فرما دیا جو اپنی خدا ترسی سے رسول پر ایمان لائے۔ فرمایا کہ وہ ایسے سدا بہار باغوں میں اتارے جائیں گے جن کی پیداوار بھی دائمی اور جن کا سایہ بھی دائمی۔ یعنی وہ کبھی خزاں سے آشنا نہیں ہوں گے۔

وَالَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَفْرَحُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمِنَ الْاَحْزَابِ مَنْ يُّنْكِرُ بَعْضَهٗ

قُلْ إِنَّمَا أُمِرْتُ أَنْ أَعْبُدَ اللَّهَ وَلَا أُشْرِكَ بِهِ ۚ إِلَيْهِ أَدْعُو وَإِلَيْهِ مَآبِ (۳۶)

صالحین اہل کتاب کا رویہ

'وَالَّذِينَ آتَيْنَاهُمُ الْكِتَابَ' سے اچھے اہل کتاب مراد ہیں، اہل کتاب بالخصوص نصاریٰ ہیں، جیسا کہ مائدہ کی آیات ۸۳-۸۴ کے تحت تفصیل گزر چکی ہے، ایسے لوگ بھی موجود تھے جو اپنے صحیفوں کی پیشین گوئیوں کی بنا پر رسول خاتم کے منتظر تھے۔ اس وجہ سے آپ کی دعوت اور آپ کی لائی ہوئی کتاب میں جب انھوں نے ان پیشین گوئیوں کی تصدیق کے آثار دیکھے تو بڑے ذوق و شوق سے انھوں نے اس کا خیر مقدم کیا۔ اہل کتاب کے اس پاکیزہ گروہ کا ذکر قرآن میں جابجا ہوا ہے اور بالعموم ان کا ذکر معروف ہی کے صیغہ سے ہوا ہے جس طرح یہاں ہوا ہے۔ ان لوگوں کے ذکر سے یہاں مقصود پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دینا بھی ہے کہ اگر جاہل ہٹ دھرم لوگ تمھارا مذاق اڑا رہے ہیں تم ان کی پروا کیوں کرو جب کہ حاملین کتاب کا ایک گروہ تمھارا خیر مقدم کر رہا ہے اور منکرین کو ترغیب دینا بھی ہے کہ جس کا اچھے اور پاکیزہ ذی علم لوگ خیر مقدم کر رہے ہیں حیف ہے اگر تم اس کی تکذیب کرو اور اس کی لائی ہوئی برکتوں سے محروم رہو۔

مخالفین کی طرف ایک اشارہ

'وَمِنَ الْأَحْزَابِ مَنْ يُنْكِرُ بَعْضَهُ' احزاب سے یہاں مراد مخالف پارٹیاں ہیں یعنی یہود، نصاریٰ اور مشرکین عرب۔ ان کی مخالفت کی نوعیت بھی بالعموم یہ نہیں تھی کہ قرآن کے ہر حصہ سے ان کو اختلاف ہو۔ آخر ہر حصہ سے اس کے وہ اختلاف کر بھی کس طرح سکتے تھے۔ قرآن کی تعلیمات اور تورات و انجیل کی تعلیمات میں اختلاف اصلاً تو انہی مواقع میں ہے جہاں اہل کتاب نے کوئی تحریف کر ڈالی ہے۔ مشرکین عرب کو بھی اصل اختلاف قرآن کی دعوتِ توحید سے تھا بقیہ چیزوں سے ان کے لیے بھی اختلاف کی کوئی وجہ نہیں تھی۔ نصاریٰ میں سے پال کے معتقدین کا اختلاف بھی ان کے شرک ہی کی بنا پر تھا۔ قرآن نے ان کے اس اختلاف کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت فرمائی کہ جن کے ساتھ بنائے اختلاف توحید ہے ان کو تم صاف لفظوں میں سنا دو کہ میں اللہ واحد ہی کی بندگی کرتا ہوں اور کسی کو اس کا شریک نہیں مانتا، میری دعوت بھی اسی کی طرف اور میرا مرجع بھی اسی کی طرف ہے۔ یعنی میں اس وہم میں مبتلا نہیں ہوں کہ مجھے کسی اور حامی یا شفیع سے کوئی مدد مل سکے گی۔ یہ صاف صاف اعلان اسی لیے کرا دیا گیا کہ اگر ان پارٹیوں میں سے کسی کو یہ توقع ہو کہ وہ اپنا دباؤ ڈال کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو کچھ نرم یا مرعوب کر سکے گی تو وہ اس طمع خام سے باز آ جائے۔

'وَإِلَيْهِ مَآبِ' میں ترکیب کلام بعینہٖ وہی ہے جو اوپر 'كَانَ عِقَابِ' میں گزر چکی ہے۔

وَكَذَٰلِكَ أَنْزَلْنَاهُ حُكْمًا عَرَبِيًّا ۚ وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ أَهْوَاءَهُمْ بَعْدَمَا جَاءَكَ مِنَ الْعِلْمِ مَا لَكَ مِنَ اللَّهِ مِنْ وَلِيٍّ وَلَا وَاقٍ (۳۷)

یہ قرآن فرمان واجب الاذعان ہے

'وَكَذَٰلِكَ' عربی میں ان معنوں میں بھی آتا ہے جن معنوں میں ہم 'چنانچہ' یا 'اسی لیے' کے الفاظ بولتے ہیں۔ یہاں یہ 'اسی لیے' کے مفہوم میں ہے۔ اوپر والی آیت میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ حکم ہوا ہے کہ 'قُلْ إِنَّمَا أُمِرْتُ أَنْ أَعْبُدَ اللَّهَ وَلَا أُشْرِكَ بِهِ ۚ إِلَيْهِ أَدْعُو وَإِلَيْهِ مَآبِ' اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ اسی امر و حکم کی

دعوت واشاعت کے لیے ہم نے تم پر یہ کتاب اتاری ہے۔ 'حُكْمًا عَرَبِيًّا' یہ اس کتاب کی حیثیت واضح فرمائی ہے کہ یہ حکم ہے یعنی ایک فیصلہ ناطق اور فرمان واجب الاذعان، اور عربی میں ہے اس لیے ان تمام لوگوں پر جن کی زبان عربی ہے یہ احسان بھی ہے اور اتمام حجت بھی۔ مطلب یہ ہے کہ یہ کوئی درخواست اور التجا نہیں ہے بلکہ واجب الاطاعت فرمان ہے تمہارے لیے بھی اور اہل عرب کے لیے بھی۔ اگر اس کی تعمیل نہ کی گئی تو مہلت کی ایک مدت گزر جانے کے بعد ان سب لوگوں کو، جو اس کی اطاعت سے انکار کریں گے، اسی انجام سے دوچار ہونا پڑے گا جس سے رسولوں کے مکذبین و مخالفین کو دوچار ہونا پڑا۔ یہ حقیقت ہم اس کے محل میں واضح کر چکے ہیں کہ رسول جس قوم کی طرف بھیجا جاتا ہے اس کے لیے وہ بمنزلۂ عدالت الٰہی ہوتا ہے۔ وہ لوگوں کے پاس کوئی درخواست لے کر نہیں بلکہ خدا کا فرمان لے کر آتا ہے جس کی تعمیل واجب اور جس کی نافرمانی مستوجب سزا ہوتی ہے۔

خطاب پیغمبر سے، عتاب مشرکین پر

'وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ أَهْوَاءَهُمْ بَعْدَ مَا جَاءَكَ مِنَ الْعِلْمِ الآیة' ۔ 'أَهْوَاءَ' سے مراد، جیسا کہ ہم مختلف مقامات میں واضح کر چکے ہیں 'بدعتیں' ہیں اس لیے کہ بدعتوں کی بنیاد علم پر نہیں بلکہ خواہشوں ہی پر ہوتی ہے۔ یہاں خاص طور پر اہل عرب کی مشرکانہ بدعات کی طرف اشارہ ہے۔ 'الْعِلْمِ' سے مراد یہاں وہ صحیح علم ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے قرآن کی شکل میں نازل ہوا۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے فرمایا کہ اس فرمان عربی اور اس علم صحیح کے نازل ہو جانے کے بعد اگر تم نے ان مشرکوں کی مشرکانہ بدعات کی پیروی کی تو تم کو خدا کی پکڑ سے بچانے والا کوئی نہ بن سکے گا۔ اس آیت میں باعتبار الفاظ اگرچہ خطاب پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے لیکن اس میں جو عتاب ہے اس کا رخ تمام مشرکین کی طرف ہے۔ پیغمبر کو مخاطب کر کے یہ بات کہنے میں جو بلاغت ہے وہ یہ ہے کہ سننے والے اچھی طرح متنبہ ہو جائیں کہ اس حکم کی خلاف ورزی کر کے جب پیغمبر بھی خدا کی پکڑ سے نہیں بچ سکتے تو تا بہ دیگراں چہ رسد!

۱۰۔ آگے کا مضمون ــــ آیات ۳۸-۴۳

خاتمۂ سورہ

آگے کی آیات خاتمۂ سورہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی ہے کہ ان مخالفین کے نت نئے اعتراضات اور مطالبۂ معجزات سے تم پریشان نہ ہو۔ تم اپنا کام کیے جاؤ اور مطالبۂ معجزات کے معاملے کو ہمارے اوپر چھوڑ دو۔ ان لوگوں کو نظر نہیں آ رہا ہے لیکن غلبۂ حق کے آثار خود اس سرزمین میں بھی نمایاں ہونے شروع ہو گئے ہیں۔ خدا کی بات شدنی ہے اور کوئی اس کے فیصلہ کو روک نہیں سکتا۔ جس طرح کی چالیں یہ چل رہے ہیں اسی طرح کی چالیں چلنے والے پہلے بھی گزرے ہیں۔ خدا ان کی چالوں کے سارے تار و پود بکھیر دے گا اور عنقریب ان پر واضح ہو جائے گا کہ انجام کار کی کامیابی کس کو حاصل ہوتی ہے۔ اگر یہ تمہیں رسول نہیں مانتے تو کہہ دو کہ میرے اور تمہارے درمیان اللہ اور حاملین علم کتاب کی گواہی کافی ہے ــــ آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۳۸-۴۳

وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّن قَبْلِكَ وَجَعَلْنَا لَهُمْ أَزْوَاجًا وَذُرِّيَّةً
وَمَا كَانَ لِرَسُولٍ أَن يَأْتِيَ بِآيَةٍ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ ۗ لِكُلِّ أَجَلٍ كِتَابٌ ﴿٣٨﴾
يَمْحُو اللَّهُ مَا يَشَاءُ وَيُثْبِتُ ۖ وَعِندَهُ أُمُّ الْكِتَابِ ﴿٣٩﴾ وَإِن مَّا
نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِي نَعِدُهُمْ أَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ فَإِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلَاغُ
وَعَلَيْنَا الْحِسَابُ ﴿٤٠﴾ أَوَلَمْ يَرَوْا أَنَّا نَأْتِي الْأَرْضَ نَنقُصُهَا مِنْ أَطْرَافِهَا ۚ
وَاللَّهُ يَحْكُمُ لَا مُعَقِّبَ لِحُكْمِهِ ۚ وَهُوَ سَرِيعُ الْحِسَابِ ﴿٤١﴾ وَقَدْ
مَكَرَ الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ فَلِلَّهِ الْمَكْرُ جَمِيعًا ۖ يَعْلَمُ مَا تَكْسِبُ كُلُّ
نَفْسٍ ۗ وَسَيَعْلَمُ الْكُفَّارُ لِمَنْ عُقْبَى الدَّارِ ﴿٤٢﴾ وَيَقُولُ الَّذِينَ
كَفَرُوا لَسْتَ مُرْسَلًا ۚ قُلْ كَفَىٰ بِاللَّهِ شَهِيدًا بَيْنِي وَبَيْنَكُمْ وَمَنْ
ع ۶ ۱۲ عِندَهُ عِلْمُ الْكِتَابِ ﴿٤٣﴾

ترجمۂ آیات ۳۸-۴۳

اور ہم نے تم سے پہلے بھی رسول بھیجے اور ان کو بیویاں اور اولاد بھی عطا فرمائیں۔ اور کسی رسول کے اختیار میں یہ نہیں کہ وہ اللہ کے اذن کے بغیر کوئی نشانی لا سکے۔ ہر چیز کے لیے ایک وقت اور ہر وقت کے لیے ایک نوشتہ ہے۔ اللہ جس چیز کو چاہتا ہے مٹا دیتا ہے اور جس چیز کو چاہتا ہے باقی رکھتا ہے اور اصل کتاب اسی کے پاس ہے۔ ۳۸-۳۹

اور جس چیز کی ہم ان کو دھمکی دے رہے ہیں اس کا کچھ حصہ یا تو ہم تم کو دکھا دیں گے یا ہم تم کو وفات دے دیں گے۔ پس تمہارے اوپر صرف پہنچا دینے کی ذمہ داری ہے، حساب کی ذمہ داری ہم پر ہے۔ کیا وہ یہ نہیں دیکھ رہے ہیں کہ ہم سرزمین کی طرف اس کو اس کے اطراف سے کم کرتے ہوئے بڑھ رہے ہیں۔ فیصلہ اللہ کرتا ہے اور کوئی اس کے فیصلہ کو ہٹانے والا نہیں۔ اور وہ بہت جلد

حساب چکا دینے والا ہے۔ جو ان سے پہلے گزرے انھوں نے بھی چالیں چلیں لیکن چالیں سب اللہ کے اختیار میں ہیں۔ ہر جان جو کچھ کرتی ہے اس کو وہ جانتا ہے اور یہ کافر جلد جان لیں گے کہ دار آخرت کی کامیابی کس کے لیے ہے۔ ۴۰-۴۲

اور یہ کافر کہتے ہیں کہ تم خدا کے بھیجے ہوئے نہیں ہو۔ کہہ دو میرے اور تمھارے درمیان اللہ اور وہ لوگ گواہی کے لیے کافی ہیں جن کے پاس کتاب کا علم ہے۔ ۴۳

۱۱۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّنْ قَبْلِكَ وَجَعَلْنَا لَهُمْ اَزْوَاجًا وَّذُرِّيَّةً ۭ وَمَا كَانَ لِرَسُوْلٍ اَنْ يَّاْتِيَ بِاٰيَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ۭ لِكُلِّ اَجَلٍ كِتَابٌ (۳۸)

دو اعتراضوں کے جواب

اس آیت میں مخالفین کے دو اعتراضوں کے بغیر ان کو نقل کیے جواب دیے ہیں۔ ایک یہ کہ یہ اللہ کے رسول ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں، اگر اللہ کو کوئی رسول بھیجنا ہوتا تو کیا وہ ہمارے ہی جیسے ایک بشر کو رسول بنا کر بھیجتا؟ اس کے پاس فرشتوں کی اتنی بڑی فوج ہے آخر ان میں سے کسی کو اس منصب کے لیے اس نے کیوں نہ منتخب کیا؟ دوسرا یہ کہ یہ ہم کو دھمکی سنا رہے ہیں کہ اگر ہم نے ان کی بات نہ مانی تو ہم پر اللہ کا عذاب آجائے گا۔ اگر یہ اپنے اس دعوے میں سچے ہیں تو آخر یہ ہم کو کوئی ایسی نشانی عذاب کیوں نہیں دکھاتے جس سے ہم پر بھی یہ واضح ہو جائے کہ فی الواقع اگر ہم نے ان کی بات نہ مانی تو ہم پر قہر الٰہی ٹوٹ پڑے گا۔

ان میں سے پہلے اعتراض کا جواب یہ دیا کہ تم دنیا میں پہلے رسول نہیں ہو، تم سے پہلے بہت سے رسول آچکے ہیں، وہ سب بشر ہی تھے ان میں کوئی بھی مافوق البشر نہیں تھا۔ سب بیوی بچے رکھتے تھے اور اسی طرح کھاتے پیتے تھے جس طرح تم کھاتے پیتے ہو۔

دوسرے اعتراض کا جواب یہ دیا کہ کوئی نشانی اور معجزہ دکھانا رسول کے اختیار میں نہیں ہوتا بلکہ اس کا انحصار اللہ کے اذن اور اس کی حکمت پر ہے۔ اللہ نے ہر چیز کے لیے اپنی حکمت کے تحت ایک وقت مقرر کر رکھا ہے اور ہر مقررہ ساعت کے لیے ایک نوشتہ ہے۔

يَمْحُوا اللّٰهُ مَا يَشَاۗءُ وَيُثْبِتُ ښ وَعِنْدَهٗٓ اُمُّ الْكِتٰبِ (۳۹)

وَيُثْبِتُ یعنی يُثْبِتُ مَا يَشَاۗءُ۔

اس نوشتہ پر تمام تر اختیار اللہ ہی کا ہے۔ اس میں ہر محو و اثبات اور ہر اخراج و اندراج صرف اسی کی

حکمت و مشیت کے تحت ہوتا ہے کسی دوسرے کو اس میں کوئی دخل نہیں اور اصل کتاب اسی کے پاس ہے کسی دوسرے کی اس تک رسائی نہیں ہے۔

وَإِن مَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِي نَعِدُهُمْ أَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ فَإِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلَاغُ وَعَلَيْنَا الْحِسَابُ (۴۰)

عذاب کا وقت خدا کی مشیت و حکمت کے مطابق

یعنی جس عذاب کی ہم ان کو، تمہاری تکذیب کی صورت میں، دھمکی سنا رہے ہیں، ہو سکتا ہے کہ اس کا کوئی نمونہ تمہاری زندگی ہی میں ہم دکھا دیں یا تم کو توفات دے دیں اور تمہاری وفات کے بعد ان کو اس کا مزہ چکھائیں۔ اس امر کا تمام تر انحصار ہماری مشیت و حکمت پر ہے۔ اس معاملے میں نہ تم کو کوئی دخل ہے اور نہ تمہیں اس کے لیے پریشان ہونا چاہیے۔ تم پر ذمہ داری صرف ان لوگوں کو ہماری بات پہنچا دینے کی ہے، ان سے مواخذہ و محاسبہ کرنا ہمارا کام ہے۔

أَوَلَمْ يَرَوْا أَنَّا نَأْتِي الْأَرْضَ نَنقُصُهَا مِنْ أَطْرَافِهَا ۚ وَاللَّهُ يَحْكُمُ لَا مُعَقِّبَ لِحُكْمِهِ ۚ وَهُوَ سَرِيعُ الْحِسَابِ (۴۱)

'الارض' سے مراد مکہ ہے — دعوتِ اسلام کے تدریجی عروج میں نشانی

'الْأَرْضَ' سے مراد یہاں سرزمین مکہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر ان کو اسلام کے غلبہ اور خود ان کی اپنی ہزیمت کی کوئی نشانی ہی مطلوب ہے تو وہ اس امر واقعی کو کیوں نہیں دیکھتے کہ اسلام کی دعوت بالتدریج مکہ کے اطراف کو فتح کرتی ہوئی سرزمین مکہ کی طرف بڑھ رہی ہے اور وہ دن دور نہیں ہے جب وہ اس سرزمین کو بھی زیر نگین کرے گی۔ اسلام کے تدریجی عروج اور مکہ کے اطراف کے قبائل اور مدینہ میں اس کی اشاعت کو اللہ تعالیٰ نے مکہ کی طرف اپنے اقدام سے تعبیر فرمایا ہے اور یہ تعبیر ایک حقیقت ہے۔ اسلام کی دعوت کا آغاز تو مکہ سے ہوا لیکن قریش پوری قوت اور ہر نوع کے ظلم و ستم سے اس کو دبا دینے پر تل گئے لیکن حق کی آواز دبتی نہیں۔ آہستہ آہستہ اطراف کے قبائل کے بہت سے لوگ اسلام میں داخل ہو گئے اور مدینہ میں تو اس کو وہ فروغ ہوا کہ بالآخر اسی شہر کو اللہ تعالیٰ نے دار الہجرت ہونے کا شرف عطا فرمایا۔ دعوت کے اس دور میں اہل کتاب میں سے بھی، جیسا کہ اوپر گزرا، اسلام کے حق میں کلمۂ خیر کہنے والے پیدا ہو گئے تھے۔ الغرض اسلام خود اپنے گھر میں تو اس دور میں مظلوم رہا لیکن باہر اس کو فروغ حاصل ہو رہا تھا اور قبیلے کے قبیلے قریش کی سیادت اور ان کے دین شرک سے نکل کر اسلام اور پیغمبر اسلام کی اطاعت میں داخل ہو رہے تھے۔ اسی صورت حال کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ اگر کفار کو کوئی نشانی ہی مطلوب ہے تو وہ اس نشانی پر کیوں نہیں غور کرتے۔

'لَا مُعَقِّبَ لِحُكْمِهِ وَهُوَ سَرِيعُ الْحِسَابِ' یعنی اسلام کا یہ غلبہ ایک فیصلۂ الٰہی ہے، یہ ہو کے رہے گا اور کسی کی یہ طاقت نہیں کہ وہ اس قضائے مبرم کو ٹال سکے۔ اور مزید آنکہ اس میں اب زیادہ دیر نہیں ہے۔ جلد وہ وقت آ رہا ہے جب یہ سارا حساب چکا دیا جائے گا۔

بعینہٖ یہی مضمون سورۂ انبیاء میں بھی بیان ہوا ہے۔ اس آیت کو بھی سامنے رکھ لیجیے۔ قریش کی طرف اشارہ

کرتے ہوئے ارشاد ہوا۔

بَلْ مَتَّعْنَا هٰٓؤُلَآءِ وَاٰبَآءَهُمْ حَتّٰى طَالَ عَلَيْهِمُ الْعُمُرُ ۭ اَفَلَا يَرَوْنَ اَنَّا نَاْتِي الْاَرْضَ نَنْقُصُهَا مِنْ اَطْرَافِهَا ۭ اَفَهُمُ الْغٰلِبُوْنَ (الانبیاء - ۴۴)	بلکہ ہوا یہ کہ ہم نے ان کو اور ان کے آباؤ اجداد کو بھی اپنی نعمتوں سے بہرہ مند کیا یہاں تک کہ اسی حال میں ان پر ایک طویل مدت گزر گئی (اس وجہ سے یہ اس گھمنڈ میں مبتلا ہو گئے ہیں کہ یہ اسی طرح ہمیشہ غالب و سربلند رہیں گے) کیا وہ نہیں دیکھ رہے ہیں کہ ہم ان کی سرزمین کی طرف اس کو اس کے اطراف سے کم کرتے ہوئے بڑھ رہے ہیں (تو کیا یہ علامت اس بات کی ہے کہ) وہی غالب رہنے والے ہیں۔

اسلام کی دعوتی فتوحات

غالباً اسی آیت کی بنا پر بعض لوگوں نے اس سورہ کو مدنی قرار دیا ہے۔ ان کا ذہن اس طرف گیا کہ نَنْقُصُهَا مِنْ اَطْرَافِهَا سے اشارہ مسلمانوں کی جہادی فتوحات کی طرف ہے اور جہادی فتوحات کا تعلق چونکہ مدنی دور ہی سے ہے اس وجہ سے یہ سورہ ان کے نزدیک مدنی ہوئی۔ لیکن ہمارے نزدیک اس سے اشارہ اسلام کی دعوتی فتوحات کی طرف ہے۔ پھر اوپر آپ نے دیکھا کہ بعینہٖ یہی آیت، تھوڑے سے تغیر الفاظ کے ساتھ، سورۂ انبیاء میں بھی ہے جو بالاتفاق مکی ہے۔ البتہ ان الفاظ سے یہ بات ضرور نکلتی ہے کہ یہ سورہ مکی زندگی کے اس دور سے تعلق رکھتی ہے جب مکہ کے اطراف کے قبائل اور مدینہ میں اسلام کی دعوت زور پکڑ رہی تھی اور قریش کی سیادت کی چولیں ڈھیلی ہو رہی تھیں بالخصوص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور کمزور مسلمانوں پر ان کے مظالم نے ان کی اخلاقی ساکھ مکہ سے باہر والوں کی نظر میں بالکل ہی گرا دی تھی۔

وَقَدْ مَكَرَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَلِلّٰهِ الْمَكْرُ جَمِيْعًا ۭ يَعْلَمُ مَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ ۭ وَسَيَعْلَمُ الْكُفّٰرُ لِمَنْ عُقْبَى الدَّارِ (۴۲)

اب یہ فرمایا کہ جس قسم کی چالیں اسلام اور پیغمبر کے خلاف یہ چل رہے ہیں اسی قسم کی چالیں ان سے پہلے کی قومیں اپنے اپنے پیغمبروں کے خلاف چل کے اس کا انجام دیکھ چکی ہیں۔ یہ بھی وہی انجام دیکھنے والے ہیں۔ ساری چالیں خدا کے اختیار میں ہیں، ہر جان جو کچھ کرتی ہے اللہ اس سے پوری طرح باخبر رہتا ہے۔ کوئی چیز بھی اس کے اختیار اور علم سے باہر نہیں۔

وَسَيَعْلَمُ الْكُفّٰرُ لِمَنْ عُقْبَى الدَّارِ یعنی دنیا میں تو ان کا جو انجام ہونا ہے وہ اوپر کی آیات میں بتا دیا گیا۔ آخرت میں جو انجام سامنے آنے والا ہے وہ بھی جلد جان لیں گے کہ آخرت کی فیروز مندی کس کو حاصل ہوتی ہے۔

وَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَسْتَ مُرْسَلًا ۭ قُلْ كَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًۢا بَيْنِيْ وَبَيْنَكُمْ ۙ وَمَنْ عِنْدَهٗ عِلْمُ الْكِتٰبِ (۴۳)

یعنی یہ سارے دلائل و شواہد سننے اور دیکھنے کے باوجود اگر یہ کفار یہی کہتے ہیں کہ تم فرستادۂ خدا نہیں ہو تو ان سے مزید بحث کی ضرورت نہیں۔ ان سے کہہ دو کہ میرے اور تمہارے درمیان خدا کی گواہی کافی ہے اور ان لوگوں کی جو کتاب الٰہی کے علم کے سچے حامل ہیں۔ یہ اشارہ اہل کتاب میں سے ان علماء کی طرف ہے جن کا ذکر اوپر آیت ۳۶ میں گزرا۔

اس سورہ کی تفسیر میں یہ آخری سطریں ہیں جو اس بے مایہ کے قلم سے حوالۂ قرطاس ہوئیں۔ وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ۔

تدبّرِ قرآن

۱۴

ابرٰھیم

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ا ۔ سورہ کا عمود

سورہ رعد کی آیات اَوَلَمْ یَرَوْا اَنَّا نَاْتِی الْاَرْضَ نَنْقُصُهَا مِنْ اَطْرَافِهَا الایہ میں قریش کو جو دھمکی اور مسلمانوں کو جو بشارت، اشارہ اور کنایہ کے انداز میں، دی گئی تھی اس سورہ میں وہ کھل کر سامنے آگئی ہے۔ قریش پر یہ واضح کر دیا گیا ہے کہ آج مکہ کی سرزمین پر حق و باطل میں جو کشمکش برپا ہے اس میں تم جس کلمۂ باطل کے علمبردار ہو اس کی کوئی بنیاد نہ زمین میں ہے نہ آسمان میں۔ اس کی مثال گھورے پر اُگے ہوئے ایک شجرۂ خبیثہ کی ہے جو ایک جنبش میں اکھاڑ کر پھینکا جا سکتا ہے۔ اگر یہ اب تک برقرار رہا تو اس وجہ سے نہیں کہ وہ کوئی مضبوط جڑ رکھتا تھا بلکہ اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ اس کو اکھاڑنے والے ہاتھ موجود نہیں تھے۔ اب اللہ نے وہ ہاتھ نمودار کر دیے ہیں تو تم دیکھو گے کہ کتنی جلدی اس کا قصہ پاک ہوا جاتا ہے۔ اس کے بالمقابل اسلام کی دعوت کی تمثیل اس سدا بہار شجرۂ طیبہ سے دی گئی ہے جس کی جڑیں پاتال میں اتری ہوئی اور جس کی شاخیں فضائے آسمانی میں پھیلی ہوئی ہوں۔ اللہ تعالیٰ اہل ایمان کو دنیا میں بھی مضبوط و مستحکم کرے گا اور آخرت میں بھی ان کو سرخروئی بخشے گا بشرطیکہ وہ صبر و استقامت کے ساتھ اپنی دعوت حق پر جمے رہے اور اس راہ میں پیش آنے والی آزمائشوں کا انھوں نے اللہ پر بھروسہ کرتے ہوئے مقابلہ کیا۔

اس حقیقت کو تاریخ کی روشنی میں واضح کرنے کے لیے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور دوسرے انبیاء کی سرگزشتوں کے ان پہلوؤں کی طرف اس میں اشارات ہیں جن سے اصل مدعا کی تائید ہوتی ہے۔ آخر میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی سرگزشت کا حوالہ دے کر یہ واضح فرمایا ہے کہ وہ کس مقصد کے لیے اپنے وطن سے ہجرت کر کے اس وادی غیر ذی زرع میں آئے تھے، اس سرزمین کے لیے انھوں نے کیا دعا کی تھی، اس میں اپنی اولاد کو بساتے ہوئے ان کے دل میں کیا ارمان تھے اور انھوں نے اپنے رب سے ان کے لیے کیا چاہا اور کیا مانگا تھا۔ یہ باتیں سنانے سے مقصود قریش کے سامنے ان کی اپنی تاریخ کا آئینہ رکھ دینا ہے تاکہ وہ اندازہ کر سکیں کہ ان کو کیا بننا تھا اور وہ کیا بن کے رہ گئے ہیں۔

اگرچہ سورہ کا نظام سمجھنے کے لیے یہ تمہید بھی کافی ہے لیکن اپنے طریقہ کے مطابق ہم سورہ کے مطالب کا تجزیہ بھی کیے دیتے ہیں۔

ب ۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

(۱-۳) نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے اس کتاب کو اتارنے کا مقصد واضح فرمایا گیا ہے کہ یہ اس لیے اتاری

گئی ہے کہ اس کے ذریعے سے تم لوگوں کو عقاید و اعمال کی تاریکیوں سے نکال کر ایمان و عمل صالح کی روشنی میں لاؤ۔ پھر ان لوگوں کا انجام بتایا گیا ہے جو اس کا انکار کریں گے۔ قریش کو دھمکی دی گئی ہے کہ اس کتاب کو ان کی زبان میں اتار کر خدا نے ان پر اپنی حجت تمام کر دی ہے۔ پیغمبر صلعم کو یہ تسلی دی گئی ہے کہ لوگوں کا ایمان لانا یا نہ لانا خدا کی توفیق بخشی پر منحصر ہے وہ جس کو جس چیز کا مستحق پائے گا وہی دے گا۔ اس معاملے میں تمھاری ذمہ داری صرف بلاغ کی ہے۔

(۵-۱۷) حضرت موسیٰؑ اور دوسرے انبیاء سابقین کا حوالہ کہ وہ بھی اسی مقصد کو لے کر آئے تھے اور انھیں اس راہ میں بڑے بڑے مصائب سے دوچار ہونا پڑا لیکن انھوں نے استقامت دکھائی جس کا صلہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کو یہ ملا کہ وہ غالب رہے اور ان کے مخالفین کو اللہ نے تباہ کر دیا۔ مقصود ان سرگزشتوں کے حوالہ سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں پر یہ واضح کرنا ہے کہ اس کشمکش میں بھی بالآخر غلبہ انہی کو حاصل ہوگا لیکن ان ابتدائی مراحل میں صبر و استقامت اور آخری مرحلہ میں شکر نعمت لازمی ہے۔

(۱۸-۲۲) کفار و مشرکین کا آخرت میں جو حشر ہوگا اس کا بیان کہ ان کا سارا کیا کرایا خاک اور راکھ ہو کر اڑ جائے گا۔ لیڈر اور ان کے پیرو ایک دوسرے پر لعنت بھیجیں گے۔ یہاں تک کہ شیطان بھی اپنی پیروی کرنے والوں سے اعلان برأت کر دے گا اور ان سے کہے گا کہ تم مجھے ملامت کرنے کے بجائے خود اپنے سر پیٹو، تم اپنی بدبختی کے ذمہ دار خود ہو۔

(۲۳-۲۷) اس کے مقابل میں اہل ایمان کا حال آخرت میں یہ ہوگا کہ آپس میں سلام و تحیت اور مبارک سلامت کے تبادلے ہو رہے ہوں گے۔ اللہ نے اپنے قول محکم کی بدولت جس طرح دنیا میں ان کو سرفرازی بخشی اسی طرح آخرت میں بھی ان کو سرفرازی بخشے گا۔

(۲۸-۳۴) قریش کے لیڈروں کو انذار و تنبیہ کہ انھوں نے اللہ کی بخشی ہوئی نعمتوں کو کفر و شرک کا ذریعہ بنایا اور اس طرح اپنی قوم کو جہنم کے گھاٹ پر اتارا۔ ضمناً مسلمانوں کو نصیحت کہ وہ نماز کا اہتمام رکھیں اور اپنے مال میں سے خدا کی راہ میں سرًّا و علانیۃً خرچ کریں۔ مقصود اس نصیحت سے مسلمانوں کو یہ رہنمائی دینا ہے کہ یہی چیز ان کے حریفوں کے مقابل میں عنداللہ ان کے حق کو مرجح کرنے والی اور حضرت ابراہیمؑ کے اس مقصد کو پورا کرنے والی ہوگی جس کے لیے انھوں نے اس وادی غیر ذی زرع میں، جیسا کہ آگے اس کا ذکر آ رہا ہے، اپنی ذریت کو بسایا تھا۔

(۳۵-۴۱) حضرت ابراہیمؑ کی ان دعاؤں کا حوالہ جو انھوں نے سرزمین مکہ کو اپنا دار الہجرت بنانے کے بعد اس سرزمین کے لیے اور اپنی اولاد کے لیے کیں۔ مقصود ان کے حوالے سے قریش پر یہ واضح کرنا ہے کہ ان کی ساری زندگی حضرت ابراہیمؑ کی دعاؤں اور تمناؤں کے بالکل برعکس ہے۔ حضرت ابراہیمؑ کے مقصد کو اگر پورا کر رہے ہیں تو یہ پیغمبر اور ان کی پیروی کرنے والے مسلمان لیکن قریش ان کے دشمن بن کر اٹھ کھڑے ہوئے ہیں۔

(۴۲-۵۲) خاتمۂ سورہ جس میں تمام تر تنبیہ و انذار ہے۔

سُورَةُ اِبْرٰهِيْمَ (١٤)

مَكِّيَّةٌ ـــــــــــــــ اٰيَاتُهَا ٥٢

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

آیات ١-٤ الٓرٰ ۚ كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۙ
بِاِذْنِ رَبِّهِمْ اِلٰى صِرَاطِ الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ ① اللّٰهِ الَّذِيْ لَهٗ مَا فِي
السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۗ وَوَيْلٌ لِّلْكٰفِرِيْنَ مِنْ عَذَابٍ شَدِيْدِ ۙ②
الَّذِيْنَ يَسْتَحِبُّوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا عَلَى الْاٰخِرَةِ وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ
اللّٰهِ وَيَبْغُوْنَهَا عِوَجًا ۗ اُولٰٓئِكَ فِيْ ضَلٰلٍ بَعِيْدٍ ③ وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ
رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ لِيُبَيِّنَ لَهُمْ ۗ فَيُضِلُّ اللّٰهُ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْ
مَنْ يَّشَآءُ ۗ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ④

ترجمۂ آیات ١-٤ یہ الٓرٰ ہے۔ یہ کتاب ہے جو ہم نے تمھاری طرف اس لیے اتاری ہے کہ تم لوگوں کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی کی طرف لاؤ۔ ان کے رب کے اذن سے۔ خدائے عزیز و حمید کے راستہ کی طرف اس اللہ کے راستہ کی طرف جو آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے سب کا مالک ہے اور کافروں کے لیے ایک عذاب شدید کی تباہی ہے۔ ان کے لیے جو دنیا کی زندگی کو آخرت پر ترجیح دیتے ہیں اور اللہ کی راہ سے روکتے ہیں اور اس میں کجی پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ یہ لوگ بہت دور کی گمراہی میں ہیں۔ اور ہم نے جو رسول بھی بھیجا اس کی قوم کی زبان میں بھیجا تاکہ وہ ان پر اچھی طرح واضح کردے۔ پس اللہ جس کو چاہتا ہے گمراہ کر دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے اور وہ عزیز و حکیم ہے۔ ١-٤

۱- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

الٓرٰ قف كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۙ بِاِذْنِ رَبِّهِمْ اِلٰى صِرَاطِ الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ (۱)

'الٓرٰ' - حروف مقطعات پر جامع بحث سورۂ بقرہ کے شروع میں ملاحظہ فرمائیے۔

'كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ'

ظلمت' اور نور' سے مراد

'ظُلُمٰت' سے مراد عقائد و اعمال کی تاریکیاں اور 'نور' سے مراد ایمان و عمل صالح کی روشنی ہے۔ گمراہی کے ہزاروں راستے ہیں لیکن ہدایت کی راہ ایک ہی ہے اس وجہ سے ظلمات جمع ہے اور نور واحد۔

ہدایت خدا کی توفیق بخشی پر منحصر ہے

'بِاِذْنِ رَبِّهِمْ' یعنی یہ تاریکیوں سے نکل کر روشنی کی طرف آنا جن کو بھی میسر ہوگا خدا کی توفیق بخشی ہی سے میسر ہوگا۔ وہی اپنی سنت کے مطابق جن کو ہدایت کا اہل پائے گا ان کو ہدایت بخشے گا اور جن کو اس کا اہل نہیں پائے گا ان کو ان کی گمراہی میں بھٹکتا چھوڑ دے گا۔ مطلب یہ ہے کہ پیغمبر کی ذمہ داری اس معاملے میں صرف تبلیغ و دعوت کی ہے۔ لوگوں کو ہدایت کی راہ پر لا کھڑے کرنا اس کی ذمہ داری ہی نہیں ہے۔

'عزیز' اور 'حمید' کا مفہوم

'اِلٰى صِرَاطِ الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ' یہ 'نور' کی وضاحت فرما دی گئی ہے کہ اس سے مراد وہ راستہ ہے جو خدائے عزیز و حمید کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ 'عزیز' یعنی سب پر غالب و مقتدر، اس وجہ سے وہی سزاوار ہے کہ اس سے ڈرا جائے۔ 'حمید' یعنی تمام جود و کرم کا منبع، اس وجہ سے وہی حق دار ہے کہ اس کی حمد کی جائے اور اس سے امیدیں باندھی جائیں۔

اللّٰهِ الَّذِيْ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ وَوَيْلٌ لِّلْكٰفِرِيْنَ مِنْ عَذَابٍ شَدِيْدِ ۙ
الَّذِيْنَ يَسْتَحِبُّوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا عَلَى الْاٰخِرَةِ وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَيَبْغُوْنَهَا عِوَجًا ۭ
اُولٰۗىِٕكَ فِيْ ضَلٰلٍۢ بَعِيْدٍ (۲-۳)

دنیوی مفادات ہدایت کے لیے حجاب

یعنی اس خدا کے راستہ کی طرف جو تنہا آسمانوں اور زمین کی ہر چیز کا مالک ہے۔ اس وجہ سے جو لوگ آج اپنے مزعومہ شریکوں کے اعتماد پر اس صحیفہ ہدایت کا انکار کر رہے ہیں وہ اپنے لیے ایک عذاب شدید کی تباہی کو دعوت دے رہے ہیں۔

'اَلَّذِيْنَ يَسْتَحِبُّوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا عَلَى الْاٰخِرَةِ' یہ ان کے اصل سبب انکار سے پردہ اٹھایا گیا ہے کہ باتیں تو وہ جو چاہیں بنا لیں لیکن اصل چیز جو ان کے اور اس صحیفۂ ہدایت کے درمیان حجاب بنی ہوئی ہے وہ یہ ہے کہ وہ آخرت کی خاطر اپنے دنیوی مفادات قربان کرنے کو تیار نہیں ہیں۔ 'وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ' چنانچہ وہ خود بھی اللہ کی راہ سے رو گرداں ہیں اور دوسروں کو بھی، جہاں تک ان کا زور چلتا ہے، اس سے روکنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ 'وَيَبْغُوْنَهَا عِوَجًا' یعنی خدائے عزیز و حمید کی طرف لے جانے والی سیدھی راہ کو کج

کرکے اپنے مزعومہ معبودوں کی طرف موڑ رہے ہیں اور لوگوں کو یہ باور کرانے کی کوشش کر رہے ہیں کہ خدا تک اگر پہنچا جا سکتا ہے تو انہی پر پیچ تنگ ڈنڈیوں سے ہو کر پہنچا جا سکتا ہے۔ اُولٰٓئِكَ فِيْ ضَلٰلٍۢ بَعِيْدٍ یعنی اپنی ان حرکتوں کے سبب سے وہ اصل شاہراہ سے بھٹک کر بہت دور نکل گئے ہیں۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ لِيُبَيِّنَ لَهُمْ ۭ فَيُضِلُّ اللّٰهُ مَنْ يَّشَاۗءُ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ (۴)

ہدایت و ضلالت کے باب میں سنت الٰہی

یہ اللہ تعالیٰ نے اپنے اس احسان کا اظہار فرمایا ہے جو اس صحیفۂ ہدایت کو عربی میں اور رسولؐ کو خود ان کی قوم کے اندر سے مبعوث فرما کر اس نے ان کے اوپر کیا ہے اور مقصود اس سے ان کو اس حقیقت کی طرف متوجہ کرنا ہے کہ انھیں اللہ کی اس نعمت کی قدر کرنی چاہیے کہ اس نے انہی کے اندر کے ایک فرد کے ذریعہ سے انہی کی زبان میں اپنا صحیفہ اتارا تاکہ وہ اللہ کی ہدایت کو لوگوں پر اچھی طرح واضح کر دے۔ فَيُضِلُّ اللّٰهُ مَنْ يَّشَاۗءُ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ۔ یہ ہدایت و ضلالت کے معاملے میں اللہ تعالیٰ نے اپنی سنت واضح فرمائی ہے کہ وہ جس کو چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے گمراہ کرتا ہے۔ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تسلی ہے کہ تمہارا کام اللہ کی باتوں کو اچھی طرح واضح کر دینا ہے وہ تم نے کر دیا ہے اور کر رہے ہو، رہا لوگوں کا ایمان لانا یا نہ لانا تو یہ خدا کی مشیت پر منحصر ہے اور خدا عزیز و حکیم ہے۔ یعنی اس کی ہر مشیت اس کی حکمت کے ساتھ ہے۔ جو لوگ اس کی حکمت کے تحت ہدایت پانے کے مستحق ٹھہریں گے وہ ہدایت پائیں گے اور جو لوگ اس کے مستحق نہیں ٹھہریں گے وہ اس سے محروم رہیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے ہر ایک کے اندر جو صلاحیتیں ودیعت فرمائی ہیں اگر ایک شخص ان سے فائدہ اٹھاتا ہے تو وہ مزید توفیق کا سزاوار قرار پاتا ہے اور اگر کوئی شخص ان کی قدر نہیں کرتا تو مزید پانا تو الگ رہا جو اس کو دی گئی ہوتی ہیں وہ بھی اس سے سلب ہو جاتی ہیں۔ اس سنت الٰہی کی وضاحت ہم ایک سے زیادہ مقامات میں کر چکے ہیں۔

۲۔ آگے کا مضمون ——— آیات ۵-۸

آگے حضرت موسیٰؑ کی سرگزشت کی طرف اشارہ فرمایا ہے کہ ان کو بھی اللہ تعالیٰ نے اسی مقصد سے مبعوث فرمایا تھا کہ اپنی قوم کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی کی طرف لائیں۔ چنانچہ انھوں نے یہ کام کیا اور اللہ کی تائید و نصرت نے ان کو فرعونیوں کے پنجۂ ستم سے نجات دلائی اور ساتھ ہی ان کو خدا کے اس فیصلہ سے بھی آگاہ فرما دیا کہ اگر تم نے اپنے رب کی اس نعمت کی قدر کی اور اس کے شکرگزار رہے تو تم پر مزید فضل ہوگا اور اگر تم نے ناشکری کی تو خدا کے سخت عذاب سے دوچار ہوگے۔ اس یاد دہانی سے مقصود ان یہود کو متنبہ کرنا تھا جو اسلام کی مخالفت کے جوش میں اپنا سارا وزن قریش کے پلڑے میں ڈال رہے تھے اور جس طرح قریش حضرت ابراہیمؑ کی تعلیمات کو پس پشت ڈال چکے تھے اسی طرح یہود حضرت موسیٰؑ کی ان تنبیہات سے اپنے کان

بند کیے ہوئے تھے۔ آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۵-۸
وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى بِاٰيٰتِنَآ اَنْ اَخْرِجْ قَوْمَكَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى
النُّوْرِ ۙ وَذَكِّرْهُمْ بِاَيّٰىمِ اللّٰهِ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ
شَكُوْرٍ ﴿۵﴾ وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهِ اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ
اَنْجٰىكُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ يَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْۗءَ الْعَذَابِ وَيُذَبِّحُوْنَ
اَبْنَاۗءَكُمْ وَيَسْتَحْيُوْنَ نِسَاۗءَكُمْ ۭ وَفِيْ ذٰلِكُمْ بَلَاۗءٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ
ع ۱۲ عَظِيْمٌ ﴿۶﴾ وَاِذْ تَاَذَّنَ رَبُّكُمْ لَىِٕنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ وَلَىِٕنْ كَفَرْتُمْ
اِنَّ عَذَابِيْ لَشَدِيْدٌ ﴿۷﴾ وَقَالَ مُوْسٰٓى اِنْ تَكْفُرُوْٓا اَنْتُمْ وَمَنْ فِي
الْاَرْضِ جَمِيْعًا ۙ فَاِنَّ اللّٰهَ لَغَنِيٌّ حَمِيْدٌ ﴿۸﴾

ترجمۂ آیات ۵-۸

اور ہم نے موسیٰ کو اپنی نشانیوں کے ساتھ بھیجا کہ اپنی قوم کو تاریکیوں سے روشنی کی طرف نکالو اور ان کو خدا کے یادگار ایام یاد دلاؤ، بے شک ان کے اندر ثابت قدم رہنے والوں اور شکر کرنے والوں کے لیے بڑی نشانیاں ہیں۔ ۵

اور یاد کرو جب موسیٰؑ نے اپنی قوم سے کہا کہ اپنے اوپر اللہ کے اس فضل کو یاد رکھو کہ اس نے تمھیں آلِ فرعون کے پنجہ سے نجات دی جو تمھیں نہایت برے عذاب چکھاتے تھے اور تمھارے بیٹوں کو ذبح کر ڈالتے تھے اور تمھاری عورتوں کو زندہ رکھتے تھے اور بے شک اس میں تمھارے رب کی جانب سے بہت بڑی آزمائش تھی۔ اور یاد کرو جب تمھارے رب نے آگاہ کر دیا کہ اگر تم شکرگزار رہے تو میں تمھیں بڑھاؤں گا اور اگر تم نے ناشکری کی تو میرا عذاب بھی بڑا سخت ہوگا۔ اور موسیٰ نے کہا کہ اگر تم اور وہ سارے لوگ جو روئے زمین پر ہیں ناشکری کرو گے تو خدا کا کچھ نہیں

بگاڑ دو گے اور وہ بے نیاز اور ستودہ صفات ہے۔ ۸-۶

۲- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى بِاٰيٰتِنَآ اَنْ اَخْرِجْ قَوْمَكَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۙ وَذَكِّرْهُمْ بِاَيّٰىمِ اللّٰهِ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوْرٍ (۵)

'بِاٰيٰتِنَآ' یعنی عصا اور ید بیضا وغیرہ کی نشانیوں کے ساتھ جن کا دوسرے مختلف مقامات میں نہایت تفصیل سے ذکر ہوا ہے۔

'ایام اللہ' سے مراد

'وَذَكِّرْهُمْ بِاَيّٰىمِ اللّٰهِ' ایام کا لفظ جب اس طرح آتا ہے جس طرح یہاں آیا ہے تو اس سے خاص بڑے بڑے اہم تاریخی اور یادگار دن مراد ہوتے ہیں۔ مثلاً ایام العرب، کہیں تو اس سے عرب کی جنگیں مراد ہوں گی۔ اسی طرح 'اَيّٰمِ اللّٰهِ' سے مراد وہ یادگار تاریخی دن ہیں جن میں اللہ تعالیٰ نے نافرمان قوموں پر عذاب نازل فرمائے اور اپنے باایمان بندوں کو ان کے ظلم و ستم سے نجات بخشی۔

'اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ' یعنی موسیٰ کی اس سرگزشت میں ثابت قدم رہنے والوں اور شکر کرنے والوں کے لیے بڑی نشانیاں ہیں۔ حضرت موسیٰ نے جب دعوت حق بلند کی تو ان کو اور ان کی قوم کو فرعونیوں کے ہاتھوں بڑے بڑے مظالم سہنے پڑے لیکن بالآخر اللہ تعالیٰ نے فرعونیوں کو غرق کر دیا اور بنی اسرائیل کو نجات بخشی۔ مطلب یہ ہے کہ اسی طرح مسلمانوں کے سامنے بھی اس وقت آزمائش کا مرحلہ ہے۔ اس مرحلہ سے اگر وہ ثابت قدمی سے گزر گئے تو کامیابی ان کے قدم چومے گی اور وہ اپنے رب کے افضال و عنایات پر شکر گزار ہوں گے۔

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهِ اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ اَنْجٰىكُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ يَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْۗءَ الْعَذَابِ وَيُذَبِّحُوْنَ اَبْنَاۗءَكُمْ وَيَسْتَحْيُوْنَ نِسَاۗءَكُمْ ۭ وَفِيْ ذٰلِكُمْ بَلَاۗءٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَظِيْمٌ (۶)

'آل' سے مراد اتباع اور پیرو

'اٰلِ فِرْعَوْنَ' ہم دوسرے مقام میں واضح کر چکے ہیں کہ لفظ 'آل' سے مراد اتباع اور پیرو بھی ہوتے ہیں۔

حضرت موسیٰ کی ایک تقریر کا حوالہ

یہ حضرت موسیٰ کی اس تقریر کا حوالہ ہے جو انھوں نے اپنی قوم کے سامنے اس وقت فرمائی ہے جب ان کو اور ان کی قوم کو فرعونیوں کے چنگل سے نجات مل چکی ہے۔ اس تقریر سے حضرت موسیٰ کا مقصود اپنی قوم کو یہ یاد دلانا تھا کہ یہ بہت بڑی آزمائش تھی جس سے خدا نے محض اپنے فضل سے تمھیں نجات بخشی ہے۔ تو اس فضل کو یاد رکھنا، خدا کے برابر شکر گزار رہنا، اس کو بھول کر پھر کہیں انہی سرمستیوں میں نہ کھو جانا جس کی سزا تمھیں فرعونیوں کے عذاب کی شکل میں ملی۔ حضرت موسیٰ کی اس تقریر کی یاددہانی وقت کے بنی اسرائیل کو اس لیے کرائی گئی ہے کہ وہ متنبہ ہوں کہ وہ حضرت موسیٰ کی اس تلقین کو فراموش کر کے پھر شیطان کے راستہ پر چل پڑے ہیں اور اسلام کی مخالفت کر کے از سر نو اپنی شامت کو دعوت دینا چاہتے ہیں۔

وَإِذْ تَأَذَّنَ رَبُّكُمْ لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَأَزِيدَنَّكُمْ ۖ وَلَئِنْ كَفَرْتُمْ إِنَّ عَذَابِي لَشَدِيدٌ (۷)

وقت کے بنی اسرائیل کو یاددہانی

تَأَذَّنَ کے معنی باخبر اور آگاہ کرنے کے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ موسیٰ نے تو وہ بات کہی تھی جو اوپر گزری اور ساتھ ہی تمھارے رب نے بھی تمھیں آگاہ کر دیا تھا کہ اگر تم میرے احکام و ارشادات کی پیروی کر کے میرے شکر گزار رہے تو میں تمھاری تعداد اور اپنے افضال و عنایات میں برابر اضافہ کروں گا اور اگر تم ناشکری اور نافرمانی کی راہ پر چل پڑے تو یاد رکھو کہ میرا عذاب بھی بڑا ہی سخت ہوگا ـــــ یہ بات بھی وقت کے بنی اسرائیل کو یاددہانی کے لیے یہاں لائی گئی ہے اور رَبُّكُمْ کے خطاب سے واضح ہے کہ یہ ان کو براہِ راست مخاطب کر کے فرمائی گئی ہے۔

وَقَالَ مُوسَىٰ إِنْ تَكْفُرُوا أَنْتُمْ وَمَنْ فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا فَإِنَّ اللَّهَ لَغَنِيٌّ حَمِيدٌ (۸)

شکر گزاروں پر عنایت میں اضافہ

یعنی ساتھ ہی موسیٰ نے یہ تنبیہ بھی کر دی تھی کہ خدا کی شکر گزاری کا یہ مطالبہ اس بنا پر نہیں ہے کہ وہ اس کا محتاج ہے یا اس سے اس کی شان اور عظمت میں کوئی اضافہ ہوتا ہے۔ وہ ہر چیز سے بے نیاز اور ہر حال میں ستودہ صفات ہے۔ یہ شکر گزاری خود بندوں ہی کے لیے موجبِ خیر و برکت ہے اس لیے کہ اس سے، جیسا کہ اوپر والی آیت میں مذکور ہے، اللہ تعالیٰ بندوں پر اپنی نعمتوں اور برکتوں میں اضافہ فرماتا ہے۔

۴۔ آگے کا مضمون ــــ آیات ۹-۱۷

آگے خطاب اگرچہ عام ہے لیکن روئے سخن مسلمانوں ہی کی طرف ہے۔ ان کو اطمینان دلایا گیا ہے کہ تمام رسولوں اور ان کی قوموں کی سرگزشت اس بات کی شہادت دیتی ہے کہ ہر چند راہِ حق میں آزمائشیں بہت پیش آتی ہیں، یہاں تک کہ بسا اوقات اس راہ میں گھر در سب کچھ چھوڑنا پڑتا ہے لیکن آخر کار کامیابی اہلِ ایمان ہی کو حاصل ہوتی ہے ـــــ اس روشنی میں آگے کی آیات تلاوت فرمائیے۔

آیات ۹-۱۷

أَلَمْ يَأْتِكُمْ نَبَأُ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ قَوْمِ نُوحٍ وَعَادٍ وَثَمُودَ ۛ وَالَّذِينَ
مِنْ بَعْدِهِمْ ۛ لَا يَعْلَمُهُمْ إِلَّا اللَّهُ ۚ جَاءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنَاتِ فَرَدُّوا
أَيْدِيَهُمْ فِي أَفْوَاهِهِمْ وَقَالُوا إِنَّا كَفَرْنَا بِمَا أُرْسِلْتُمْ بِهِ وَإِنَّا
الثلثة لَفِي شَكٍّ مِمَّا تَدْعُونَنَا إِلَيْهِ مُرِيبٍ ﴿٩﴾ قَالَتْ رُسُلُهُمْ أَفِي اللَّهِ
شَكٌّ فَاطِرِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ ۖ يَدْعُوكُمْ لِيَغْفِرَ لَكُمْ مِنْ ذُنُوبِكُمْ
وَيُؤَخِّرَكُمْ إِلَىٰ أَجَلٍ مُسَمًّى ۚ قَالُوا إِنْ أَنْتُمْ إِلَّا بَشَرٌ مِثْلُنَا تُرِيدُونَ

أَنْ تَصُدُّونَا عَمَّا كَانَ يَعْبُدُ آبَاؤُنَا فَأْتُونَا بِسُلْطَانٍ مُّبِينٍ (۱۰) قَالَتْ
لَهُمْ رُسُلُهُمْ إِنْ نَّحْنُ إِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ يَمُنُّ عَلَىٰ
مَنْ يَّشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ ۖ وَمَا كَانَ لَنَا أَنْ نَّأْتِيَكُمْ بِسُلْطَانٍ إِلَّا بِإِذْنِ
اللَّهِ ۚ وَعَلَى اللَّهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُونَ (۱۱) وَمَا لَنَا أَلَّا نَتَوَكَّلَ عَلَى اللَّهِ وَ
قَدْ هَدَانَا سُبُلَنَا ۚ وَلَنَصْبِرَنَّ عَلَىٰ مَا آذَيْتُمُونَا ۚ وَعَلَى اللَّهِ فَلْيَتَوَكَّلِ
الْمُتَوَكِّلُونَ (۱۲) وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لِرُسُلِهِمْ لَنُخْرِجَنَّكُمْ مِّنْ أَرْضِنَا أَوْ ع ۲ ۶ ۱۴
لَتَعُودُنَّ فِي مِلَّتِنَا ۚ فَأَوْحَىٰ إِلَيْهِمْ رَبُّهُمْ لَنُهْلِكَنَّ الظَّالِمِينَ (۱۳)
وَلَنُسْكِنَنَّكُمُ الْأَرْضَ مِنْ بَعْدِهِمْ ۚ ذَٰلِكَ لِمَنْ خَافَ مَقَامِي وَ
خَافَ وَعِيدِ (۱۴) وَاسْتَفْتَحُوا وَخَابَ كُلُّ جَبَّارٍ عَنِيدٍ (۱۵) مِّنْ
وَّرَائِهِ جَهَنَّمُ وَيُسْقَىٰ مِنْ مَّاءٍ صَدِيدٍ (۱۶) يَّتَجَرَّعُهُ وَلَا يَكَادُ
يُسِيغُهُ وَيَأْتِيهِ الْمَوْتُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ وَّمَا هُوَ بِمَيِّتٍ ۖ وَمِنْ وَّرَائِهِ
عَذَابٌ غَلِيظٌ (۱۷)

ترجمۂ آیات ۹-۱۷

کیا تمھیں ان لوگوں کا حال نہیں پہنچا جو تم سے پہلے گزر چکے ہیں، قوم نوح، عاد اور ثمود کا حال اور ان کا جو ان کے بعد ہوئے ہیں۔ خدا کے سوا جن کو کوئی نہیں جانتا۔ ان کے رسول ان کے پاس کھلی کھلی نشانیاں لے کر آئے تو انھوں نے ان کے منہ پر اپنے ہاتھ رکھ دیے اور بولے کہ جس پیغام کے ساتھ تم بھیجے گئے ہو ہم اس کا انکار کرتے ہیں اور جس چیز کی تم ہمیں دعوت دے رہے ہو ہم اس کے باب میں سخت الجھن میں ڈال دینے والے شک میں ہیں۔ ان کے رسولوں نے کہا کیا تمھیں آسمانوں اور زمین کے وجود میں لانے والے اللہ کے بارے میں شک ہے؛ وہ تمھیں بلاتا ہے تاکہ

تمھارے گناہوں کو بخشے اور تمھیں ایک وقت معین تک مہلت دے۔ وہ بولے کہ تم تو ہمارے ہی جیسے آدمی ہو۔ تم چاہتے ہو کہ ہم کو ان چیزوں کی عبادت سے روک دو جن کو ہمارے باپ دادا پوجتے آئے تو ہمارے پاس کوئی کھلا ہوا معجزہ لاؤ۔ ان کے رسولوں نے جواب دیا کہ ہم ہیں تو تمھارے ہی جیسے آدمی لیکن اللہ اپنے بندوں میں سے جن پر چاہتا ہے اپنا فضل فرماتا ہے۔ اور یہ ہمارے اختیار میں نہیں کہ ہم تمھارے پاس کوئی معجزہ لا دیں مگر اللہ کے حکم سے اور ایمان لانے والوں کو اللہ ہی پر بھروسہ رکھنا چاہیے۔ اور ہم کیوں نہ اللہ پر بھروسہ رکھیں جب کہ اس نے ہمیں ہمارے راستوں کی ہدایت بخشی اور تم ہمیں جو ایذا بھی پہنچاؤ گے ہم اس پر صبر کریں گے اور بھروسہ کرنے والوں کو اللہ ہی پر بھروسہ کرنا چاہیے۔ اور کافروں نے اپنے رسولوں سے کہا کہ یا تو ہم تمھیں اپنی سرزمین سے نکال کر رہیں گے یا تمھیں ہماری ملت میں پھر واپس آنا پڑے گا تو ان کے رب نے ان پر وحی بھیجی کہ ہم ان ظالموں ہی کو ہلاک کر دیں گے اور ان کے بعد تم کو زمین میں بسائیں گے، یہ ان کے لیے ہے جو میرے حضور پیشی سے ڈرے اور میری وعید سے ڈرے۔ ۹-۱۴

اور انھوں نے فیصلہ چاہا اور ہر سرکش ضدی نامراد ہوا۔ اس کے آگے جہنم ہے اور اس کو پیپ لہو پینے کو ملے گا۔ وہ اس کو گھونٹ گھونٹ پینے کی کوشش کرے گا اور اس کو حلق سے نہ اتار سکے گا اور موت اس پر ہر جانب سے پلی پڑ رہی ہوگی اور وہ مرنے والا نہ بنے گا اور آگے ایک اور سخت عذاب اس کے لیے موجود ہوگا۔ ۱۵-۱۷

۵۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

اَلَمْ يَاْتِكُمْ نَبَؤُا الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ قَوْمِ نُوْحٍ وَّعَادٍ وَّثَمُوْدَ ۛ وَالَّذِيْنَ مِنْ بَعْدِهِمْ ۛ لَا يَعْلَمُهُمْ اِلَّا اللّٰهُ ۭ جَاۗءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَرَدُّوْٓا اَيْدِيَهُمْ فِيْٓ اَفْوَاهِهِمْ وَقَالُوْٓا اِنَّا كَفَرْنَا بِمَآ

أُرْسِلْتُم بِهِ وَإِنَّا لَفِي شَكٍّ مِّمَّا تَدْعُونَنَا إِلَيْهِ مُرِيبٍ (۹)

قوم نوح اور عاد کے بعد کی بعض قوموں کا حوالہ

وَالَّذِينَ مِن بَعْدِهِمْ لَا يَعْلَمُهُمْ إِلَّا اللَّهُ ۔ یہ حوالہ ہے ان قوموں کا جو قوم نوح اور عاد اور ثمود کے بعد آئیں اور ان کے اندر اللہ نے اپنے رسول بھی بھیجے لیکن قرآن نے ان کا ذکر نہیں کیا ہے ۔ تاریخوں میں بھی ان کا کوئی قابل اعتماد تذکرہ موجود نہیں ہے ۔ صحیح علم ان کا صرف اللہ ہی کو ہے ۔ دوسرے مقام پر یہی بات یوں ارشاد ہوئی ہے وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّن قَبْلِكَ مِنْهُم مَّن قَصَصْنَا عَلَيْكَ وَمِنْهُم مَّن لَّمْ نَقْصُصْ عَلَيْكَ - ۷۸ المومن (اور ہم نے تم سے پہلے بھی رسول بھیجے، ان میں سے کچھ کی سرگزشتیں ہم نے تم کو سنادیں اور ان میں سے کچھ کی نہیں سنائیں)۔

رسولوں کے منہ بند کرنے کی کوشش

فَرَدُّوا أَيْدِيَهُمْ فِي أَفْوَاهِهِمْ، یعنی انھوں نے اپنے رسولوں کے منہ بند کردینے کی کوشش کی۔ جب کوئی شخص کسی شخص کو بات کرنے سے، غصہ اور نفرت کے ساتھ، روکنا چاہتا ہے تو اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیتا ہے کہ زبان بند کرو، مزید ایک حرف بھی زبان سے نہ نکالو۔ 'رَدُّوا' یہاں 'جَعَلُوا' کے معنی میں ہے اور اس معنی میں یہ لفظ استعمال ہوتا ہے۔

إِنَّا كَفَرْنَا بِمَا أُرْسِلْتُم بِهِ وَإِنَّا لَفِي شَكٍّ مِّمَّا تَدْعُونَنَا إِلَيْهِ مُرِيبٍ ۔ یعنی جس پیغام انذار کے ساتھ تم خدا کی طرف سے بھیجے جانے کے مدعی ہو ہمیں اس سے صاف انکار ہے۔ نہ ہم تمھیں خدا کا رسول مانتے ہیں اور نہ تمھاری یہ دھمکی ماننے کے لیے تیار ہیں کہ اگر ہم نے تمھاری بات نہ مانی تو ہم تباہ کردیے جائیں گے۔ وَإِنَّا لَفِي شَكٍّ الآية اور یہ توحید اور قیامت پر ایمان لانے کی جو دعوت تم ہمیں دے رہے ہو تو اس باب میں بھی ہم سخت شک میں ہیں۔

قَالَتْ رُسُلُهُمْ أَفِي اللَّهِ شَكٌّ فَاطِرِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ ۖ يَدْعُوكُمْ لِيَغْفِرَ لَكُم مِّن ذُنُوبِكُمْ وَيُؤَخِّرَكُمْ إِلَىٰ أَجَلٍ مُّسَمًّى ۚ قَالُوا إِنْ أَنتُمْ إِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا تُرِيدُونَ أَن تَصُدُّونَا عَمَّا كَانَ يَعْبُدُ آبَاؤُنَا فَأْتُونَا بِسُلْطَانٍ مُّبِينٍ (۱۰)

سوال استعجاب کی نوعیت کا

رسولوں کی طرف سے یہ سوال استعجاب کی نوعیت کا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ کیا تمھیں آسمانوں اور زمین کے وجود میں لانے والے خدا کے باب میں شک ہے؟ خدا کو تو تم مانتے ہی ہو اور اسی کو آسمانوں اور زمین کا خالق بھی مانتے ہو، اسی کی دعوت ہم تمھیں دے رہے ہیں تو اس کے بارے میں تو کسی شک کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اب رہے وہ جن کو تم نے خدا کا شریک بنا رکھا ہے تو ان سے ہم تم کو روکتے ہیں اس لیے کہ ان کے حق میں کوئی دلیل موجود نہیں ہے۔

دعوت رحمت کے لیے

يَدْعُوكُمْ لِيَغْفِرَ لَكُم مِّن ذُنُوبِكُمْ وَيُؤَخِّرَكُمْ إِلَىٰ أَجَلٍ مُّسَمًّى یعنی یہ دعوت، جو وہ ہمارے ذریعہ سے تمھیں دے رہا ہے، کوئی چڑنے اور برہم ہونے کی بات نہیں ہے بلکہ یہ تمھارے حق میں ایک عظیم رحمت ہے۔ وہ یہ چاہتا ہے کہ اگر تم یہ دعوت قبول کرلو تو وہ تمھارے گناہوں کو بخشے، تمھیں زندگی کی مہلت عطا فرمائے اور اس عذاب کو تم سے ہٹالے جس کو تم نے اپنی شامت اعمال سے دعوت دے رکھی ہے اور جو ہماری

تکذیب کی صورت میں لازماً تم پر آدھمکے گا۔

بشریت پر اعتراض ۔ معجزہ کا مطالبہ

قَالُوْٓا اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا الاٰیۃ یعنی اپنے رسولوں کے ان ارشادات کو سن کر اگر وہ بولے تو یہ بولے کہ تم تو ہمارے ہی جیسے آدمی ہو اور اپنی ان تقریروں سے تم ہمیں ہمارے ان معبودوں کی عبادت سے روک دینا چاہتے ہو جن کو ہمارے باپ دادا پوجتے آئے تو ایسی سنگین بات ہم اپنے ہی جیسے آدمیوں کی کس طرح مان سکتے ہیں! اگر تم اپنی بات منوانی چاہتے ہو تو کوئی ایسا معجزہ دکھاؤ جس کو دیکھ کر ہر شخص پکار اٹھے کہ بے شک تم خدا کے فرستادے ہو اور جو کچھ کہہ رہے ہو اسی کی طرف سے کہہ رہے ہو۔

قَالَتْ لَهُمْ رُسُلُهُمْ اِنْ نَّحْنُ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَمُنُّ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ؕ وَمَا كَانَ لَنَآ اَنْ نَّاْتِيَكُمْ بِسُلْطٰنٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝ وَمَا لَنَآ اَلَّا نَتَوَكَّلَ عَلَى اللّٰهِ وَقَدْ هَدٰىنَا سُبُلَنَا ؕ وَلَنَصْبِرَنَّ عَلٰى مَآ اٰذَيْتُمُوْنَا ؕ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُوْنَ (۱۱-۱۲)

رسولوں کا جواب

یہ رسولوں کا جواب نقل ہوا ہے کہ اگر تم کو ہماری بشریت پر اعتراض ہے تو ہم کو یہ اعتراف ہے کہ بلاشبہ ہم تمہاری ہی طرح بشر ہیں۔ ہم کو مافوق البشر ہونے کا دعویٰ نہیں ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ اپنے انہی بندوں میں سے جو بشر ہوتے ہیں جن پر چاہتا ہے اپنا فضل فرماتا ہے اور ان کو نبوت و رسالت کے منصب پر سرفراز کر دیتا ہے۔ ہم پر یہی فضل ہوا ہے۔ اس کے سوا ہم اور کسی چیز کا دعویٰ نہیں رکھتے۔

ہم دوسرے مقام پر یہ حقیقت واضح کر چکے ہیں کہ خدا کی ہر مشیت اس کی حکمت کے ساتھ ہے اس وجہ سے 'عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ' کا یہ مفہوم نہیں ہے کہ وہ جس کو چاہے پکڑ کے نبی اور رسول بنا دے بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے بندوں میں سے جن کو اس منصب کے لیے اہل پاتا ہے ان میں سے جس کے لیے اس کی حکمت مقتضی ہوتی ہے اس کو اس کار عظیم کے لیے انتخاب فرماتا ہے۔

وَمَا كَانَ لَنَآ اَنْ نَّاْتِيَكُمْ بِسُلْطٰنٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ یعنی اگر ہماری بشریت کی بنا پر ہمارے ہاتھوں کوئی واضح معجزہ دیکھے بغیر ہمیں رسول ماننے کے لیے تیار نہیں ہو تو یہ چیز ہمارے اختیار میں نہیں ہے۔ کوئی معجزہ تو ہم خدا ہی کے حکم سے دکھا سکتے ہیں۔ 'وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ' سو تمہارے اس مطالبہ کو ہم اللہ کے حوالے کرتے ہیں، اگر وہ چاہے گا تو کوئی معجزہ دکھا دے گا اور اگر نہ چاہے گا تو نہ دکھائے گا۔ اہل ایمان کے شایانِ شان بات یہی ہے کہ وہ اس طرح کے معاملات میں اللہ پر بھروسہ رکھیں۔

توکل کی بنیاد

وَمَا لَنَآ اَلَّا نَتَوَكَّلَ عَلَى اللّٰهِ وَقَدْ هَدٰىنَا سُبُلَنَا الاٰیۃ یہ خدا پر بھروسہ کرنے کی دلیل ارشاد ہوئی ہے کہ جن راستوں پر چلنے کی اس نے ہمیں خود ہدایت فرمائی ہے، ہمارا اعتماد ہے اور ہمیں اعتماد کرنا چاہیے کہ ان میں جو مزاحمتیں اور رکاوٹیں پیش آئیں گی ان کے دور کرنے میں وہ ہماری مدد اور رہنمائی فرمائے گا۔ انہی مزاحمتوں اور رکاوٹوں میں سے تمہارا یہ مطالبہ بھی ہے۔ ہم بھروسہ رکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اس معاملے میں بھی ہماری مدد فرمائے گا۔ ہماری ذمہ داری یہ ہے کہ ہم اس راستہ میں استقامت دکھائیں سو یہ عزم ہم رکھتے ہیں کہ تم جو ایذا بھی ہمیں پہنچاؤ گے

ہم اس پر صبر کریں گے اور اللہ پر بھروسہ کریں گے، اس لیے کہ اللہ ہی کی ذات ایسی ہے جس پر بھروسہ کرنے والوں کو بھروسہ کرنا چاہیے۔

وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لِرُسُلِهِمْ لَنُخْرِجَنَّكُمْ مِنْ أَرْضِنَا أَوْ لَتَعُودُنَّ فِي مِلَّتِنَا ۖ فَأَوْحَىٰ إِلَيْهِمْ رَبُّهُمْ لَنُهْلِكَنَّ الظَّالِمِينَ ۝ وَلَنُسْكِنَنَّكُمُ الْأَرْضَ مِنْ بَعْدِهِمْ ۚ ذَٰلِكَ لِمَنْ خَافَ مَقَامِي وَخَافَ وَعِيدِ (۱۳-۱۴)

رسولوں کو ان کی قوموں کی دھمکی

ہر رسول کی زندگی میں بالآخر یہ مرحلہ بھی پیش آیا ہے کہ اس کی دعوت سے تنگ آ کر اس کی قوم نے اس کو یہ نوٹس دے دیا کہ یا تو تم ہماری ملت میں واپس آ جاؤ ورنہ ہم تمھیں اپنی سرزمین سے جلاوطن کر دیں گے۔ جب نوبت یہاں تک پہنچی ہے تو اللہ تعالیٰ نے بذریعہ وحی اپنے رسولوں کو یہ بشارت دے دی ہے کہ ہم ان ظالموں ہی کو ہلاک کر دیں گے اور ان کے بعد تمھیں زمین میں بسائیں گے۔ ذٰلِكَ لِمَنْ خَافَ مَقَامِي وَخَافَ وَعِيدِ یعنی یہ عظیم بشارت ان کے لیے ہے جو میرے حضور پیشی اور میری وعید سے ایسے خائف رہے کہ ان کے مقابل میں انھوں نے کسی مصیبت اور کسی دھمکی کی بھی پروا نہیں کی۔

أَوْ لَتَعُودُنَّ فِي مِلَّتِنَا سے یہ بات لازم نہیں آتی کہ کوئی رسول اپنی زندگی کے کسی دور میں ملت جاہلیت کا پیرو بھی رہا ہے۔ انبیاء بعثت سے پہلے بھی فطرۃ اللہ پر قائم رہے لیکن چونکہ دعوت سے پہلے کی زندگی میں قوم کے لیے ان کے ساتھ عناد کی کوئی وجہ نہیں تھی اس وجہ سے قوم کے لوگ ان کو اپنی ہی ملت پر گمان کرتے رہے بعد میں جب انھوں نے دعوت شروع کی تب قوم کے اشرار نے ان پر ملت سے انحراف کی بنا پر لعن طعن شروع کر دیا

رسولوں کے پیرؤں کے لیے تنبیہ

ذٰلِكَ لِمَنْ خَافَ مَقَامِي وَخَافَ وَعِيدِ۔ میں رسولوں کے پیرؤں کے لیے تنبیہ اور استقامت کی تلقین ہے۔ آیت زیر بحث میں رسولوں کو جو بشارت دی گئی ہے اس میں چونکہ ان کے پیرو بھی شامل ہیں اس وجہ سے انھیں آگاہ کر دیا گیا کہ یہ بشارت ان کے لیے ہے جو ہر قسم کے مصائب کا مقابلہ کریں گے اور مخالفوں سے ڈر کر خدا کے خوف کو نظر انداز نہ کریں گے۔

ان آیات سے اس سورہ کے زمانۂ نزول پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ باتیں دعوت کے اس دور میں فرمائی گئی ہیں جب قریش نے اپنے ظلم و ستم سے ایسے حالات پیدا کر دیے ہیں کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے ساتھیوں کے لیے ہجرت کے سوا کوئی اور راہ باقی نہیں رہ گئی ہے۔

وَاسْتَفْتَحُوا وَخَابَ كُلُّ جَبَّارٍ عَنِيدٍ (۱۵)

رسولوں کی طرف سے فیصلۂ حق و باطل کی دعا

کفار تکذیب کے جوش میں بار بار اپنے رسولوں سے یہ مطالبہ کرتے رہتے تھے کہ جس عذاب کی تم ہمیں بار بار دھمکی سنا رہے ہو وہ لا دو تاکہ اس قضیہ کا فیصلہ ہو جائے لیکن اللہ کے رسول اپنی رأفت کے سبب سے ان کے لیے یہی دعا کرتے تھے کہ ان کو ایمان لانے کی سعادت نصیب ہو۔ تاہم ہر چیز کی ایک حد ہوتی ہے۔ بالآخر ایک مرحلہ وہ بھی آیا جب رسولوں نے بھی یہ دعا کی ہے کہ

رَبَّنَا افْتَحْ بَيْنَنَا وَبَيْنَ قَوْمِنَا بِالْحَقِّ   اے ہمارے رب ہمارے اور ہماری قوم کے درمیان حق کے ساتھ

فَاَنْتَ خَیْرُ الْفٰتِحِیْنَ (اعراف-۸۹) فیصلہ فرما دے اور تو بہترین فیصلہ فرمانے والا ہے۔

اس مرحلے میں جب رسول نے فیصلہ کے لیے دعا کی ہے تو اللہ کا فیصلہ فوراً ہی صادر ہو گیا ہے اور عذاب الٰہی نے سرکشوں اور شریروں کی کمر توڑ دی ہے۔

مِنْ وَّرَآئِهٖ جَهَنَّمُ وَيُسْقٰى مِنْ مَّآءٍ صَدِيْدٍ ۙ يَّتَجَرَّعُهٗ وَلَا يَكَادُ يُسِيْغُهٗ وَيَاْتِيْهِ الْمَوْتُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ وَّمَا هُوَ بِمَيِّتٍ ۭ وَمِنْ وَّرَآئِهٖ عَذَابٌ غَلِيْظٌ (۱۶-۱۷)

سرکشوں کے لیے آگے کا عذاب — یعنی ایسے سرکشوں اور جباروں کے لیے اسی عذاب دنیا پر بس نہیں ہے بلکہ ان کے لیے آگے جہنم بھی تیار کھڑی ہے جہاں ان کو پیپ لہو پینے کو ملے گا لیکن پیاس کا یہ عالم ہو گا کہ وہ اس کے گھونٹ بھریں گے اور اس کو حلق سے اتارنے کی کوشش کریں گے لیکن اس کو اتار نہ پائیں گے۔ ان پر موت ہر جانب سے پلی پڑ رہی ہو گی لیکن ان کو موت نصیب نہیں ہو گی کہ اس عذاب سے چھٹکارا ملے اور اسی پر بس نہیں، آگے ان کے لیے مزید سخت تر عذاب موجود ہو گا۔

۶- آگے کا مضمون ـــــ آیات ۱۸-۲۳

آگے کے احوال — آگے ان حالات کی تفصیل آرہی ہے جن سے ان کفار و مشرکین کو آخرت میں سابقہ پیش آئے گا۔ پیرو اپنے لیڈروں پر لعنت بھیجیں گے اور لیڈر اپنے پیرووں پر یہاں تک کہ شیطان بھی اپنے پیچھے چلنے والوں کو صاف سنا دے گا کہ کوئی مجھے ملامت نہ کرے بلکہ جس نے میری پیروی کی ہے وہ آج اپنی بدبختی پر خود اپنا سر پیٹے۔ اس کے برعکس اہل ایمان کا حال یہ بیان ہوا ہے کہ وہ جنت میں براجمان ہوں گے اور ان کے درمیان مبارک سلامت کے تبادلے ہو رہے ہوں گے۔ آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۱۸-۲۳

مَثَلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ اَعْمَالُهُمْ كَرَمَادِ ِۨ اشْتَدَّتْ بِهِ الرِّيْحُ
فِيْ يَوْمٍ عَاصِفٍ ۭ لَا يَقْدِرُوْنَ مِمَّا كَسَبُوْا عَلٰي شَيْءٍ ۭ ذٰلِكَ هُوَ
الضَّلٰلُ الْبَعِيْدُ ۱۸ اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ
بِالْحَقِّ ۭ اِنْ يَّشَاْ يُذْهِبْكُمْ وَيَاْتِ بِخَلْقٍ جَدِيْدٍ ۱۹ وَّمَا ذٰلِكَ
عَلَي اللّٰهِ بِعَزِيْزٍ ۲۰ وَبَرَزُوْا لِلّٰهِ جَمِيْعًا فَقَالَ الضُّعَفٰۗؤُا لِلَّذِيْنَ
اسْتَكْبَرُوْٓا اِنَّا كُنَّا لَكُمْ تَبَعًا فَهَلْ اَنْتُمْ مُّغْنُوْنَ عَنَّا مِنْ عَذَابِ

اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ ۭ قَالُوْا لَوْ هَدٰىنَا اللّٰهُ لَهَدَيْنٰكُمْ ۭ سَوَاۗءٌ عَلَيْنَآ
ع ۳ ۹ ۱۵ اَجَزِعْنَآ اَمْ صَبَرْنَا مَا لَنَا مِنْ مَّحِيْصٍ ﴿۲۱﴾ وَقَالَ الشَّيْطٰنُ لَمَّا
قُضِيَ الْاَمْرُ اِنَّ اللّٰهَ وَعَدَكُمْ وَعْدَ الْحَقِّ وَوَعَدْتُّكُمْ فَاَخْلَفْتُكُمْ ۭ
وَمَا كَانَ لِيَ عَلَيْكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ اِلَّآ اَنْ دَعَوْتُكُمْ فَاسْتَجَبْتُمْ لِيْ ۚ
فَلَا تَلُوْمُوْنِيْ وَلُوْمُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ۭ مَآ اَنَا بِمُصْرِخِكُمْ وَمَآ اَنْتُمْ
بِمُصْرِخِيَّ ۭ اِنِّىْ كَفَرْتُ بِمَآ اَشْرَكْتُمُوْنِ مِنْ قَبْلُ ۭ اِنَّ الظّٰلِمِيْنَ لَهُمْ
عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۲۲﴾ وَاُدْخِلَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جَنّٰتٍ
تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا بِاِذْنِ رَبِّهِمْ ۭ تَحِيَّتُهُمْ فِيْهَا
سَلٰمٌ ﴿۲۳﴾

ترجمۂ آیات ۱۸-۲۳

ان لوگوں کے اعمال کی تمثیل جنھوں نے اپنے رب کے ساتھ کفر کیا یہ ہے کہ جیسے راکھ ہو جس پر آندھی کے دن بادِ تند چل جائے۔ جو کچھ انھوں نے کمائی کی ہوگی اس میں سے کچھ بھی ان کے پلے نہیں پڑے گی۔ یہی دور کی گمراہی ہے۔ کیا تم نے غور نہیں کیا کہ اللہ نے آسمانوں اور زمین کو مقصدِ حق کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ اگر وہ چاہے تو تم کو فنا کر دے اور ایک نئی مخلوق کو لا بسائے۔ اور یہ اللہ کو ذرا مشکل نہیں۔ ۱۸-۲۰

اور سب اللہ کے حضور حاضر ہوں گے تو کمزور لوگ ان لوگوں سے جو بڑے بنے رہے کہیں گے کہ ہم تو تمھارے تابع رہے ہیں تو کیا اللہ کے اس عذاب میں سے کچھ تم ہمارا بوجھ ہلکا کرو گے؟ وہ جواب دیں گے کہ اگر اللہ نے ہم کو ہدایت دی ہوتی تو ہم بھی تمھیں ہدایت کی راہ دکھاتے۔ اب ہمارے لیے یکساں ہے چیخیں چلائیں یا صبر کریں، ہمارے لیے کوئی مفر نہیں۔ ۲۱

اور جب معاملے کا فیصلہ ہو چکے گا، شیطان بولے گا کہ بے شک اللہ نے تم سے سچا وعدہ کیا تھا اور میں نے تم سے وعدہ کیا تو اس کی خلاف ورزی کی اور مجھے تم پر کوئی اختیار نہیں تھا بس میں نے تمھیں دعوت دی اور تم نے میری بات مان لی تو مجھے ملامت نہ کرنا، اپنے آپ ہی کو ملامت کرو، نہ میں تمھاری فریاد رسی کر سکتا اور نہ تم میری فریاد رسی کر سکتے۔ تم نے جو مجھے شریک بنا لیا تو میں نے اس کا پہلے سے انکار کر دیا۔ بے شک اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والوں ہی کے لیے دردناک عذاب ہے۔ ۲۲

اور جو لوگ ایمان لائے اور جنھوں نے بھلے کام کیے ہوں گے وہ ایسے باغوں میں اتارے جائیں گے جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی، ان میں وہ اپنے رب کے حکم سے ہمیشہ رہیں گے اور اس میں ان کی تحیت آپس میں ایک دوسرے پر سلام ہو گی۔ ۲۳

۷۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

مَثَلُ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا بِرَبِّھِمْ اَعْمَالُھُمْ کَرَمَادِ اِۨشْتَدَّتْ بِہِ الرِّیْحُ فِیْ یَوْمٍ عَاصِفٍ ط لَا یَقْدِرُوْنَ مِمَّا کَسَبُوْا عَلٰی شَیْءٍ ط ذٰلِکَ ھُوَ الضَّلٰلُ الْبَعِیْدُ ۔ ۱۸

شرک باعتبارِ حقیقت کفر ہے

'الذین کفروا' سے مراد وہ مشرکین ہی ہیں جو یہاں مخاطب ہیں۔ ہم دوسرے مقام میں یہ بات واضح کر چکے ہیں کہ شرک اپنی حقیقت کے اعتبار سے کفر ہی ہے۔ دین میں خدا کا صرف وہی ماننا معتبر ہے جو کامل توحید کے ساتھ ہو۔ اگر اس کی ذات یا صفات یا اس کے حقوق میں کسی اور کو شریک بنا کر اس کو مانا جائے تو یہ ماننا معتبر نہیں ہے۔ یہ اس کے انکار ہی کے ہم معنی ہے۔

مشرکین کے اعمال کی تمثیل

یہ ان مشرکین کے اعمال کی تمثیل ہے کہ قیامت کے دن اعمال کا یہ حال ہو گا۔ ظاہر ہے کہ اعمال سے مراد یہاں ان کے وہ اعمال ہیں جو اپنی دانست میں انھوں نے نیکی کے اعمال سمجھ کر انجام دیے۔ فرمایا کہ قیامت کے روز ان کے اعمال راکھ کے ایک ڈھیر کی مانند ہوں گے جس پر کسی آندھی والے دن میں تند ہوا چل جائے اور وہ سب کو اڑا لے جائے۔ 'لَا یَقْدِرُوْنَ مِمَّا کَسَبُوْا عَلٰی شَیْءٍ' یعنی اس ساری کمائی میں سے، جو شرک کے ساتھ انھوں نے کی ہو گی کچھ بھی ان کے پلے پڑنے والی نہیں، وہ ساری کی ساری خاک اور راکھ ہو کر اڑ جائے گی، صرف

اس کا وبال ان کے حصہ میں آئے گا۔ ذٰلِكَ هُوَ الضَّلٰلُ الْبَعِيْدُ یعنی ایک گم شدگی، گمراہی اور محرومی تو وہ ہوتی ہے جس کے بعد لوٹنے اور راستہ پانے کا بھی امکان باقی رہ جاتا ہے لیکن یہ وہ دور کی گم شدگی اور محرومی ہے جس کے بعد لوٹنے اور پانے کا سرے سے کوئی امکان ہی باقی نہیں رہے گا۔ یہاں اسی سورہ کی آیت ۳ پر ایک نظر پھر ڈال لیجیے۔ اور اسی طرح کے لوگوں کے اعمال کی ایک نہایت اعلیٰ تمثیل سورۂ نور کی آیت ۳۹ میں بھی ہے۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ ۭ اِنْ يَّشَاْ يُذْهِبْكُمْ وَيَاْتِ بِخَلْقٍ جَدِيْدٍ ۙ وَّمَا ذٰلِكَ عَلَي اللّٰهِ بِعَزِيْزٍ (۱۹-۲۰)

قریش کو دھمکی

یہ واضح الفاظ میں قریش کو دھمکی ہے کہ تم نے اس امر پر غور نہیں کیا کہ یہ دنیا کسی کھلنڈرے کا کھیل تماشا نہیں ہے بلکہ اللہ نے اس کو غایت و مقصد کے ساتھ پیدا کیا ہے اور تمہارا وجود اس غایت و مقصد کے بالکل خلاف ہو کر رہ گیا ہے تو آخر وہ تم کو کس کام کے لیے اس زمین کی پشت پر لادے رکھے گا جب کہ اس کی قدرت کا یہ عالم ہے کہ اگر وہ چاہے تو ابھی چشم زدن میں تم سب کو فنا کر دے اور ایک نئی مخلوق لا کھڑی کرے۔ وَمَا ذٰلِكَ عَلَي اللّٰهِ بِعَزِيْزٍ یعنی یہ نہ سمجھو کہ خدا کے لیے یہ کام کچھ مشکل ہے یا یہ اس پر کچھ گراں گزرے گا۔ اس کی قدرت کی بھی کوئی حد نہیں ہے اور رافت و رحمت کے ساتھ ساتھ وہ عدل و قسط کا قائم کرنے والا بھی ہے تو ان لوگوں کو فنا کر دینا اس پر کیوں گراں گزرے گا جنھوں نے ہر شعبۂ زندگی میں عدل و قسط کو بالکل مٹا کر رکھ دیا ہے۔

وَبَرَزُوْا لِلّٰهِ جَمِيْعًا فَقَالَ الضُّعَفٰۗؤُا لِلَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْٓا اِنَّا كُنَّا لَكُمْ تَبَعًا فَهَلْ اَنْتُمْ مُّغْنُوْنَ عَنَّا مِنْ عَذَابِ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ ۭ قَالُوْا لَوْ هَدٰىنَا اللّٰهُ لَهَدَيْنٰكُمْ ۭ سَوَاۗءٌ عَلَيْنَآ اَجَزِعْنَآ اَمْ صَبَرْنَا مَا لَنَا مِنْ مَّحِيْصٍ (۲۱)

آخرت کی حضوری

وَبَرَزُوْا لِلّٰهِ جَمِيْعًا 'بُرُوْز' کے اصل معنی پردہ کی اوٹ سے باہر آنے کے ہیں۔ یہاں اس لفظ کے استعمال میں یہ بلاغت ہے کہ ایک وقت آئے گا جب وہ سارے لوگ جو اس دنیا میں اپنے مزعومہ شرکاء و شفعاء کو اوٹ اور سپر بنائے ہوئے ہیں اور وہ لوگ بھی جو سرپرست اور سپر بنے ہوئے ہیں سب صرف خدائے واحد کے حضور حاضر ہوں گے اور وہاں کوئی کسی کا سرپرست، ساتھی اور مددگار نہ ہوگا۔ اس وقت چھوٹے اپنے بڑوں سے کہیں گے کہ دنیا میں ہم آپ لوگوں کے پیچھے چلنے والے رہے ہیں، جو کچھ آپ لوگوں نے حکم دیا ہم نے اس کی تعمیل کی جس کے نتیجہ میں یہ عذاب ہمارے سامنے کھڑا ہے۔ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّغْنُوْنَ عَنَّا مِنْ عَذَابِ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ تو کیا اس عذاب میں سے بھی آپ لوگ کچھ ہمارا بار ہلکا کریں گے؟ 'اَغْنَاهُ عَنْهُ' کے معنی ہیں 'كَفَاهُ'۔

لیڈروں کا جواب

قَالُوْا لَوْ هَدٰىنَا اللّٰهُ ... الآیۃ بڑے اور لیڈر لوگ یہ جواب دیں گے کہ ہم جو کچھ خود تھے وہی ہم نے تم کو بھی بنایا۔ اگر ہم خود ہدایت پر ہوتے تو تمھیں بھی اس کی راہ دکھاتے۔ اب تو شکوہ شکایت کا وقت گزر چکا،

یہ تو سارا ہی بھگتنے کا وقت ہے اور یہ ایسے اٹل ہیں کہ خواہ ہم چیخیں چلائیں یا صبر کریں نہ یہ ٹلنے والے ہیں اور نہ ہمارے لیے کوئی راہ فرار باقی رہی ہے۔

وَقَالَ الشَّيْطٰنُ لَمَّا قُضِيَ الْاَمْرُ اِنَّ اللّٰهَ وَعَدَكُمْ وَعْدَ الْحَقِّ وَوَعَدْتُّكُمْ فَاَخْلَفْتُكُمْ ۭ وَمَا كَانَ لِيَ عَلَيْكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ اِلَّآ اَنْ دَعَوْتُكُمْ فَاسْتَجَبْتُمْ لِيْ ۚ فَلَا تَلُوْمُوْنِيْ وَلُوْمُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ۭ مَآ اَنَا بِمُصْرِخِكُمْ وَمَآ اَنْتُمْ بِمُصْرِخِيَّ ۭ اِنِّىْ كَفَرْتُ بِمَآ اَشْرَكْتُمُوْنِ مِنْ قَبْلُ ۭ اِنَّ الظّٰلِمِيْنَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ (۲۲)

شیطان کا جواب

'وَقَالَ الشَّيْطٰنُ لَمَّا قُضِيَ الْاَمْرُ اِنَّ اللّٰهَ وَعَدَكُمْ وَعْدَ الْحَقِّ وَوَعَدْتُّكُمْ فَاَخْلَفْتُكُمْ' یعنی جب ائمۂ کفر اور ان کے پیرووں کا قضیہ ختم ہو چکے گا اور شیطان دیکھ لے گا کہ ان کے ہاں کیا جوتیوں میں دال بٹی ہے تو اسے لازماً اندیشہ ہوگا کہ اب یہ دونوں فریق آپس کی جنگ سے فارغ ہو کر اس پر لعنت ملامت کے لیے پل پڑیں گے۔ چنانچہ وہ پیش قدمی کر کے پہلے ہی ان کو چپ کرنے کی کوشش کرے گا۔

پہلی بات وہ یہ کہے گا کہ خدا نے جو وعدہ جزا و سزا کا تم سے کیا تھا وہ سچا وعدہ تھا چنانچہ اس نے اپنے وعدہ کی خلاف ورزی نہیں کی بلکہ اس کو پورا کر دکھایا البتہ میں نے جو سبز باغ تمہیں دکھائے تھے وہ محض جھوٹ اور فریب تھے چنانچہ میں نے ان میں سے کوئی وعدہ بھی پورا نہیں کیا۔

اس کی دوسری بات یہ ہوگی کہ 'وَمَا كَانَ لِيَ عَلَيْكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ اِلَّآ اَنْ دَعَوْتُكُمْ فَاسْتَجَبْتُمْ لِيْ ۚ فَلَا تَلُوْمُوْنِيْ وَلُوْمُوْٓا اَنْفُسَكُمْ' کہ بہر حال مجھے تم کو گمراہی کے راستے پر ڈال دینے کا کوئی اختیار نہیں تھا اگر کوئی اختیار حاصل تھا تو وہ صرف اس قدر تھا کہ میں تمہیں گمراہی کی دعوت اور ترغیب دے سکوں۔ اس گمراہی کو اگر تم نے اختیار کیا تو اپنی پسند اور اپنے اختیار سے کیا تو اس باب میں مجھے کوئی ملامت نہ کرنا بلکہ خود اپنے ہی کو ملامت کرنا۔

تیسری بات وہ یہ کہے گا کہ 'مَآ اَنَا بِمُصْرِخِكُمْ وَمَآ اَنْتُمْ بِمُصْرِخِيَّ ۭ اِنِّىْ كَفَرْتُ بِمَآ اَشْرَكْتُمُوْنِ مِنْ قَبْلُ' اب ایک دوسرے کو لعنت ملامت کرنے سے کچھ حاصل نہیں، اب نہ میں تمہارا کوئی فریادرسی کر سکتا ہوں اور نہ تم میری کوئی فریادرسی کر سکتے ہو تو قبل اس کے کہ تم مجھے کوئی ملامت شروع کرو تم نے جو مجھے شریک خدا بنایا اور اطاعت میں مجھے اس کا شریک ٹھہرایا میں نے اس سے اپنی براءت کا اعلان کر دیا۔

وَاُدْخِلَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا بِاِذْنِ رَبِّهِمْ ۭ تَحِيَّتُهُمْ فِيْهَا سَلٰمٌ (۲۳)

اہل ایمان کا انجام

اہل کفر و شرک کا انجام واضح کر دینے کے بعد یہ اہل ایمان کا انجام بیان ہوا کہ وہ جنت میں ہوں گے اور وہاں وہ ایک دوسرے کو اہلاً و سہلاً، احسنت و مرحبا اور سلام و رحمت کے ساتھ خیر مقدم کریں گے اس لیے کہ انھوں نے ایک دوسرے کو صحیح مشورے دیے جن کا انجام ان کے سامنے بہتر سے بہتر شکل میں موجود

ہوگا۔ اوپر کفار کی باہمی لعن طعن کے مقابل میں رکھ کے اس آیت کو پڑھیے تب اس کا اصل زور سامنے آئے گا۔

۸۔ آگے کا مضمون ــــ آیات ۲۴-۲۷

توحید اور شرک کی تمثیل

اوپر کی آیات میں شرکیہ و کفریہ اعمال کی تمثیل بیان ہوئی۔ اب آگے کی آیات میں شرکیہ عقائد و نظریات اور توحید اور اس پر مبنی عقائد و نظریات کی تمثیل بیان ہو رہی ہے۔ تاکہ واضح ہو سکے کہ شرک کی کوئی بنیاد نہ عقل و فطرت کے اندر ہے اور نہ خدا کے ہاں اس کی کوئی جڑ ہے اس وجہ سے اس پر مبنی اعمال سب ہوا میں اڑ جائیں گے۔ اس کے برعکس توحید کی بنیاد عقل و فطرت میں بھی ہے اور عنداللہ بھی اس کی بنیاد ہے، زمین میں بھی اس کی جڑیں گہری اتری ہوئی ہیں اور فضا میں بھی اس کی شاخیں پھیلی ہوئی ہیں، اس وجہ سے جو لوگ توحید پر قائم ہیں اللہ تعالیٰ ان کو دنیا اور آخرت دونوں میں رسوخ قدم اور تمکن بخشے گا۔ آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۲۴-۲۷

أَلَمْ تَرَ كَيْفَ ضَرَبَ اللَّهُ مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ أَصْلُهَا
ثَابِتٌ وَفَرْعُهَا فِي السَّمَاءِ ﴿٢٤﴾ تُؤْتِي أُكُلَهَا كُلَّ حِينٍ بِإِذْنِ
رَبِّهَا وَيَضْرِبُ اللَّهُ الْأَمْثَالَ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُونَ ﴿٢٥﴾
وَمَثَلُ كَلِمَةٍ خَبِيثَةٍ كَشَجَرَةٍ خَبِيثَةٍ اجْتُثَّتْ مِنْ فَوْقِ الْأَرْضِ
مَا لَهَا مِنْ قَرَارٍ ﴿٢٦﴾ يُثَبِّتُ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِي
الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَفِي الْآخِرَةِ ۖ وَيُضِلُّ اللَّهُ الظَّالِمِينَ ۚ وَيَفْعَلُ
ع ۴/۱۶ اللَّهُ مَا يَشَاءُ ﴿٢٧﴾

ترجمۂ آیات ۲۴-۲۷

کیا تم نے غور نہیں کیا، کس طرح تمثیل بیان فرمائی ہے اللہ نے کلمۂ طیبہ کی۔ وہ ایک شجرہ طیبہ کے مانند ہے جس کی جڑ زمین میں اتری ہوئی ہے اور جس کی شاخیں فضا میں پھیلی ہوئی ہیں۔ وہ اپنا پھل ہر فصل میں اپنے رب کے حکم سے دیتا رہتا ہے اور اللہ لوگوں کے لیے تمثیلیں بیان کرتا ہے تاکہ وہ یاددہانی حاصل کریں۔ ۲۴-۲۵

اور کلمۂ خبیثہ کی تمثیل ایک شجرۂ خبیثہ کی ہے جو زمین کے اوپر ہی سے اکھاڑ لیا جائے،
اسے ذرا ثبات حاصل نہ ہو۔ ۲۶

اللہ اہل ایمان کو قول محکم کی بدولت دنیا کی زندگی میں بھی ثبات عطا فرمائے گا اور آخرت
میں بھی اور اللہ اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والوں کے اعمال رائگاں کر دے گا اور اللہ جو چاہے
کرتا ہے۔ ۲۷

۹۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

اَلَمْ تَرَ کَیْفَ ضَرَبَ اللّٰہُ مَثَلًا کَلِمَۃً طَیِّبَۃً کَشَجَرَۃٍ طَیِّبَۃٍ اَصْلُھَا ثَابِتٌ وَّفَرْعُھَا
فِی السَّمَآءِ ہ تُؤْتِیْٓ اُکُلَھَا کُلَّ حِیْنٍۭ بِاِذْنِ رَبِّھَا ؕ وَیَضْرِبُ اللّٰہُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ لَعَلَّھُمْ یَتَذَکَّرُوْنَ (۲۴-۲۵)

اَلَمْ تَرَ کا خطاب: 'اَلَمْ تَرَ' اگرچہ لفظ واحد ہے لیکن اس کا خطاب عام ہے۔ گویا مخاطب گروہ کے ایک ایک شخص کو فرداً فرداً خطاب کر کے آگے آنے والی تمثیلات پر غور کرنے کی دعوت دی جا رہی ہے۔

کلمۂ طیبہ سے مراد: 'کلمۃ طیبۃ' سے کلمۂ توحید اور اس پر مبنی عقائد و نظریات مراد ہیں۔

شجرۂ طیبہ سے مراد: 'شجرۃ طیبۃ' وہ درخت جو مثمر، سایہ دار، نفع بخش اور بابرکت ہو۔

مقابل الفاظ کا حذف: 'اَصْلُھَا ثَابِتٌ وَّفَرْعُھَا فِی السَّمَآءِ' میں مذکورہ الفاظ کے مقابل الفاظ محذوف ہیں۔ مثلاً پہلے جملہ میں 'ثَابِتٌ' کا لفظ ظاہر فرمایا تو دوسرے ٹکڑے میں 'فَرْعُھَا' کے بعد اس کا مقابل لفظ 'عال' یا اس کے ہم معنی کوئی لفظ حذف کر دیا۔ اسی طرح دوسرے جملے میں 'فِی السَّمَآءِ' کو ظاہر فرمایا تو پہلے ٹکڑے میں 'ثَابِتٌ' کے بعد 'فِی الْاَرْضِ' محذوف کر دیا۔ اس قسم کے حذف کی مثالیں قرآن مجید اور عربی ادب میں بہت ہیں۔ اس کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ الفاظ کم استعمال ہوتے ہیں اور معانی ان کے اندر زیادہ سما جاتے ہیں۔ ان محذوفات کو کھول کر اس کا ترجمہ کیجیے تو ترجمہ یہ ہو گا۔ اس کی جڑ زمین کی تہوں میں اتری ہوئی اور اس کی شاخیں فضائے آسمانی میں پھیلی ہوئی ہیں۔ لفظ 'سماء' جس طرح آسمان کے لیے آتا ہے اسی طرح فضا کے لیے بھی اس کا استعمال معروف ہے۔ درخت چونکہ زمین اور فضا دونوں سے غذا اور قوت حاصل کرتا ہے اس لیے فرمایا کہ 'اَصْلُھَا ثَابِتٌ وَّفَرْعُھَا فِی السَّمَآءِ' یعنی زمین میں اس کی جڑیں اتری ہوئی ہونے کے سبب سے زمین سے بھی اسے پوری غذا مل رہی ہے اور شاخیں فضا میں پھیلی ہوئی ہونے کی وجہ سے فضا بھی اس کی پرورش میں پورا پورا حصہ لے رہی ہے۔

کلمۂ توحید سدا بہار ہے

'تُؤْتِيْٓ اُكُلَهَا كُلَّ حِيْنٍۢ بِاِذْنِ رَبِّهَا' یہ اس درخت کے سدا بہار ہونے کی تعبیر ہے۔ یعنی اس درخت پر کبھی خزاں نہیں آتی بلکہ یہ اپنے رب کے حکم سے ہمیشہ پھل دیتا ہے۔

کلمۂ توحید کی تمثیل

کلمۂ توحید کی تمثیل ایک ایسے درخت سے دے کر قرآن نے ایک حقیقت تو یہ واضح فرمائی کہ اس کی جڑیں انسانی عقل و فطرت کے اندر بھی گہری اتری ہوئی ہیں اور عند اللہ بھی یہ سب سے زیادہ قدر و قیمت رکھنے والی حقیقت ہے۔ گویا زمین و آسمان دونوں میں جو مقام اس کو حاصل ہے وہ کسی اور چیز کو حاصل نہیں۔

دوسری حقیقت یہ واضح فرمائی کہ اس کو انسانی فطرت کے اندر سے بھی برابر غذا اور قوت حاصل ہوتی رہتی ہے اور اوپر سے بھی برابر ترشحات اس پر نازل ہوتے رہتے ہیں جو اس کو ہمیشہ سرسبز و شاداب رکھتے ہیں۔

تیسری حقیقت یہ واضح فرمائی کہ اس کی برکات ابدی اور دوامی ہیں۔ اس کا فیض ہمیشہ جاری رہتا ہے جس کے سینہ میں یہ نور موجود ہے وہ ہمیشہ آسودہ اور شاد کام رہتا ہے۔

مخاطبوں کو تنبیہ اور احسان کی یاد دہانی

'وَيَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ' یہ اللہ تعالیٰ نے مخاطبوں یعنی قریش کو متنبہ بھی فرمایا ہے اور ان کو اپنے احسان کی یاد دہانی بھی فرمائی ہے کہ یہ تمثیلیں ہم ان کو اس لیے سنا رہے ہیں کہ وہ چیتیں اور سوچیں کہ اللہ تعالیٰ ان کو کس مقام بلند کی سرفرازی بخشنا چاہتا ہے لیکن وہ ہیں کہ اسی جوہڑ میں پڑے رہنا چاہتے ہیں جس میں شیطان نے ان کو دھکیل رکھا ہے۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ تمثیلوں میں چونکہ حقائق مجاز کا جامہ اختیار کر لیتے ہیں اس وجہ سے تقریب فہم کے پہلو سے ان کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انبیاء اور داعیانِ حق نے اس سے بڑا کام لیا ہے لیکن افسوس ہے کہ نادانوں نے کبھی اس کی قدر نہیں کی۔

وَمَثَلُ كَلِمَةٍ خَبِيْثَةٍ كَشَجَرَةٍ خَبِيْثَةِ ۨاجْتُثَّتْ مِنْ فَوْقِ الْاَرْضِ مَا لَهَا مِنْ قَرَارٍ (۲۶)

'کلمۂ خبیثہ' سے مراد

کلمۂ خبیثہ سے مراد کلمۂ شرک اور مبنی بر شرک و کفر عقائد و نظریات ہیں۔

'شجرۂ خبیثہ' سے مراد

'شَجَرَةٍ خَبِيْثَةٍ' جھاڑ جھنکاڑ کے قسم کا درخت جس میں نہ پھول نہ پھل، نہ سایہ نہ غذا۔ ہاتھ لگائیے تو اس کے کانٹے ہاتھوں کو زخمی کریں، چکھیے تو اس کی تلخی سے زبان اینٹھ جائے، پاس بیٹھیے تو اس کی بو سے قوت شامہ ماؤف ہو کے رہ جائے۔

'اجْتُثَّتْ مِنْ فَوْقِ الْاَرْضِ مَا لَهَا مِنْ قَرَارٍ' یعنی زمین میں اس کی کوئی جڑ نہیں۔ اکھاڑیے تو زمین کے اوپر ہی سے اس کو اکھاڑ لیجیے۔ اس میں ذرا ثبات نہیں اور جس کے لیے زمین میں ثبات نہیں اس کے لیے فضا میں پھیلنے کا کوئی امکان ہی نہیں۔

کلمۂ شرک کی تمثیل

پھر کلمۂ شرک کی تمثیل بیان ہوئی کہ اس کی مثال خودرو، خاردار، بدبودار، بے فیض و بے ثمر جھاڑیوں کی ہے۔ نہ ان کی کوئی گہری جڑ ہوتی ہے نہ فضا میں ان کا کوئی پھیلاؤ ہوتا۔ کوئی اکھاڑنا چاہے تو اوپر ہی سے

ان کو اکھاڑ کے رکھ دے۔

اس تمثیل سے یہ بات واضح ہوتی کہ شرک کی کوئی بنیاد نہ عقل و فطرت کے اندر ہے نہ خدا کے اتارے ہوئے دین میں، یہ خودرو خبیث جھاڑیوں کی طرح جہاں جگہ پا جاتا ہے وہاں اگ پڑتا ہے۔ اگر اس کو اکھاڑنے والے ہاتھ موجود ہوں تو بڑی آسانی سے اس کو اکھاڑ کے پھینک سکتے ہیں لیکن اکھاڑنے والے ہاتھ موجود نہ ہوں تو پھر یہ بہت سی جگہ گھیر لیتا ہے۔

اہل ایمان کے لیے بشارت — اس میں اہل ایمان کے لیے یہ بشارت بھی ہے کہ ان کے اردگرد شرک و کفر کے جو جھاڑ جھنکار پھیلے ہوئے ہیں ان کی عمر اب زیادہ نہیں ہے۔ خدا نے وہ ہاتھ پیدا کر دیے ہیں جو ان ناپائیدار اور خبیث جھاڑیوں سے بہت جلد اس سرزمین کو پاک کر دیں گے۔

يُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ ۚ وَيُضِلُّ اللّٰهُ الظّٰلِمِيْنَ ۚ وَيَفْعَلُ اللّٰهُ مَا يَشَاۗءُ ۔ ۲۷

قول ثابت سے مراد کلمۂ توحید ہے — 'قَوْلِ ثَابِت' سے مراد وہی کلمۂ توحید ہے جس کی آسمان و زمین اور فطرت و کائنات دونوں میں پائداری و استواری کی تعریف اوپر گزر چکی ہے۔

'وَيُضِلُّ اللّٰهُ الظّٰلِمِيْنَ' میں اضلال سے مراد کوششوں اور محنتوں کو رائیگاں کر دینا ہے جیسا کہ سورۂ محمد کی آیت ۱ میں ہے۔ 'اَلَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَضَلَّ اَعْمَالَهُمْ' (جنھوں نے کفر کیا اور خدا کی راہ سے لوگوں کو روکا خدا نے ان کی کوششیں رائیگاں کر دیں) 'ظّٰلِمِيْنَ' سے مراد مشرکین ہیں اس لیے کہ شرک، جیسا کہ قرآن میں تصریح ہے، سب سے بڑا ظلم ہے۔

مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ توحید کے کلمۂ ثابت و محکم کی بدولت اہل ایمان کو تو دنیا اور آخرت دونوں میں پائیداری و استواری بخشے گا۔ رہے مشرکین تو اللہ ان کے سارے اعمال کو، جیسا کہ اوپر گزرا، راکھ اور خاک کی طرح برباد کر دے گا۔ 'وَيَفْعَلُ اللّٰهُ مَا يَشَاۗءُ' یعنی خدا جو چاہے گا کر ڈالے گا، نہ کوئی اس کا ہاتھ پکڑنے والا بن سکے گا اور نہ کسی کی سعی و سفارش اس کے ہاں کچھ کام آئے گی۔ وہ بات یہاں پیش نظر رہے جس کا ذکر ہم بار بار کر چکے ہیں کہ خدا کی مشیت ہمیشہ اس کے عدل اور اس کی حکمت کے ساتھ ہے۔

۱۰۔ آگے کا مضمون ــــــ آیات ۲۸-۳۴

قریش کو وعید اور اہل ایمان کو بشارت — آگے نہایت صاف الفاظ میں پہلے قریش کو تہدید و وعید ہے کہ چونکہ انھی نے اپنی قوم کو اس ہلاکت کے گڑھے میں گرایا ہے اس وجہ سے ان کا ٹھکانا جہنم ہے۔ اس کے بعد مسلمانوں کو کامیابی کی بشارت ہے اور ساتھ ہی اس کامیابی کے لیے انھیں جو تیاری کرنی چاہیے اس کی طرف اشارہ ہے۔ اس روشنی میں آگے کی آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ٢٨-٣٤

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ بَدَّلُوا نِعْمَتَ اللَّهِ كُفْرًا وَأَحَلُّوا قَوْمَهُمْ
دَارَ الْبَوَارِ ﴿٢٨﴾ جَهَنَّمَ يَصْلَوْنَهَا ۖ وَبِئْسَ الْقَرَارُ ﴿٢٩﴾ وَجَعَلُوا لِلَّهِ
أَنْدَادًا لِيُضِلُّوا عَنْ سَبِيلِهِ ۗ قُلْ تَمَتَّعُوا فَإِنَّ مَصِيرَكُمْ إِلَى
النَّارِ ﴿٣٠﴾ قُلْ لِعِبَادِيَ الَّذِينَ آمَنُوا يُقِيمُوا الصَّلَاةَ وَيُنْفِقُوا مِمَّا
رَزَقْنَاهُمْ سِرًّا وَعَلَانِيَةً مِنْ قَبْلِ أَنْ يَأْتِيَ يَوْمٌ لَا بَيْعٌ فِيهِ وَلَا
خِلَالٌ ﴿٣١﴾ اللَّهُ الَّذِي خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ وَأَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ
مَاءً فَأَخْرَجَ بِهِ مِنَ الثَّمَرَاتِ رِزْقًا لَكُمْ ۖ وَسَخَّرَ لَكُمُ الْفُلْكَ
لِتَجْرِيَ فِي الْبَحْرِ بِأَمْرِهِ ۖ وَسَخَّرَ لَكُمُ الْأَنْهَارَ ﴿٣٢﴾ وَسَخَّرَ لَكُمُ الشَّمْسَ
وَالْقَمَرَ دَائِبَيْنِ ۖ وَسَخَّرَ لَكُمُ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ ﴿٣٣﴾ وَآتَاكُمْ مِنْ كُلِّ مَا
سَأَلْتُمُوهُ ۚ وَإِنْ تَعُدُّوا نِعْمَتَ اللَّهِ لَا تُحْصُوهَا ۗ إِنَّ الْإِنْسَانَ لَظَلُومٌ
٥ ع ١٧ كَفَّارٌ ﴿٣٤﴾

ترجمۂ آیات ٢٨-٣٤

کیا تم نے ان لوگوں کے حال پر غور نہیں کیا جنھوں نے اللہ کی نعمت کے عوض میں کفر کیا اور اپنی قوم کو ہلاکت کے گھر — جہنم — میں لا اتارا۔ جس میں وہ داخل ہوں گے اور وہ کیا ہی برا ٹھکانا ہے۔ اور انھوں نے اللہ کے شریک ٹھہرائے تاکہ اس کے راستہ سے لوگوں کو گمراہ کر کے ہٹائیں۔ کہہ دو چند دن عیش کر لو۔ بالآخر تمھارا ٹھکانا دوزخ ہے۔ ٢٨ - ٣٠

میرے ان بندوں کو جو ایمان لائے ہیں کہہ دو کہ نماز کا اہتمام رکھیں اور جو کچھ ہم نے ان کو عطا کیا ہے اس میں سے پوشیدہ و علانیہ خرچ کریں پیشتر اس کے کہ وہ دن آئے جس میں نہ خرید و فروخت ہوگی اور نہ دوستی کام آئے گی۔ ٣١

اللہ ہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور بادلوں سے پانی اتارا پھر اس سے مختلف قسم کے پھل تمہارے رزق کے لیے پیدا کیے اور کشتی کو تمہاری نفع رسانی میں لگا دیا تاکہ وہ سمندر میں اس کے حکم سے چلے اور اس نے دریاؤں کو بھی تمہاری نفع رسانی میں لگا دیا، اور سورج اور چاند کو بھی تمہاری نفع رسانی میں لگا دیا، دونوں ایک ہی انداز پر گردش میں ہیں اور دن اور رات کو بھی۔ اور تم کو ہر اس چیز میں سے بخشا جس کے تم طالب بنے۔ اور اگر تم اللہ کی نعمتوں کو گننا چاہو گے تو ان کو شمار نہ کر پاؤ گے۔ بے شک انسان بڑا ہی حق تلف ناشکرا ہے۔ ۲۲-۳۴

۱۱۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ بَدَّلُوا نِعْمَتَ اللَّهِ كُفْرًا وَأَحَلُّوا قَوْمَهُمْ دَارَ الْبَوَارِ ۝ جَهَنَّمَ يَصْلَوْنَهَا وَبِئْسَ الْقَرَارُ ۝ وَجَعَلُوا لِلَّهِ أَنْدَادًا لِيُضِلُّوا عَنْ سَبِيلِهِ قُلْ تَمَتَّعُوا فَإِنَّ مَصِيرَكُمْ إِلَى النَّارِ (۲۸-۳۰)

'الم تر' کے استعمال کا ایک خاص محل

'اَلَمْ تَرَ' کے خطاب میں فی الجملہ اظہارِ شان اور اظہارِ تعجب کا پہلو بھی ہوتا ہے۔ یہاں سیاق و سباق دلیل ہے کہ موقع اظہارِ تعجب اور ملامت کا ہے اور اشارہ قریش اور ان کے لیڈروں کی طرف ہے۔ اس لیے کہ عرب میں انہی کا یہ مقام تھا کہ انھوں نے اپنی قوم کو، جیسا کہ اَحَلُّوا قَوْمَهُمْ دَارَ الْبَوَارِ کے الفاظ سے واضح ہے، شرک اور کفر کے گڑھے میں دھکیلا اور اس طرح اپنے لیے بھی اور دوسروں کے لیے بھی جہنم کا سامان کیا۔

قریش کا کفرانِ نعمت

'بَدَّلُوا نِعْمَتَ اللَّهِ كُفْرًا' یعنی ان کو نعمتیں تو تمام اللہ کے فضل و رحمت اور حضرت ابراہیمؑ کی دعا کی برکت سے، جیسا کہ آگے تفصیل آرہی ہے، ملیں۔ خدا نے ان کو حرم کی پاسبانی کی بدولت تمام عرب کی سیادت و قیادت بخشی، ان کو بدویانہ اور گلہ بانی کی غیر مطمئن زندگی کی جگہ شہری زندگی کا سکون بخشا، ایک وادی غیر ذی زرع میں رزق و فضل کے دروازے کھولے لیکن انھوں نے ان سب کی یہ قدر کی کہ کفر و شرک کی زندگی اختیار کر لی اور بہت سے شرکاء و شفعاء ایجاد کر کے خلق کو خدا سے موڑ کر ان کی طرف جھونک دیا۔

'قُلْ تَمَتَّعُوا الآیۃ' یعنی ان کو سنا دو کہ چند دن عیش کر لو اس لیے کہ بالآخر تمہارا ٹھکانا دوزخ ہے۔ خدا کے خوانِ کرم کی نعمتوں سے متمتع ہونا اور سرِ نیاز و عقیدت دوسروں کے آگے جھکانا زیادہ دیر چلنے والی بات نہیں۔ یہ چند روزہ مہلت ہے جو بہت جلد ختم ہونے والی ہے۔

قُلْ لِعِبَادِيَ الَّذِينَ آمَنُوا يُقِيمُوا الصَّلَاةَ وَيُنْفِقُوا مِمَّا رَزَقْنَاهُمْ سِرًّا وَعَلَانِيَةً مِنْ قَبْلِ

اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ لَّا بَيْعٌ فِيْهِ وَلَا خِلٰلٌ (۳۱)

'خِلٰل' کے معنی دوستی اور مواخات کے ہیں اور لفظ 'بَيْع' بعض مواقع میں خرید و فروخت دونوں معنوں میں آتا ہے، جب تبادلہ چیز کا چیز سے ہو تو معاملت کے دونوں فریق بائع بھی ہوتے ہیں اور مشتری بھی۔

مسلمانوں کو پیغام

قریش کو انذار کے بعد اب یہ پیغام مسلمانوں کے لیے ہے کہ ان سے کہہ دو کہ وہ نماز کا اہتمام کریں اور خدا کی راہ میں سرًّا و علانیۃً دونوں طرح خرچ کریں۔ سرًّا اس لیے کہ انفاق فی سبیل اللہ کی اصل روح اخلاص ہے اور یہ اسی انفاق میں پایا جاتا ہے جو درپردہ ہو اور علانیۃً اس لیے کہ ایک پہلو اس کا بھی باعث خیر و برکت ہے۔ وہ یہ کہ اس سے دوسروں کو انفاق کی ترغیب و تشویق ہوتی ہے۔ سرًّا کی تقدیم سے یہ بات نکلتی ہے کہ اس طرح کا انفاق اولیٰ و افضل ہے۔

انفاق کی اصل ضرورت

'لَا بَيْعٌ فِيْهِ وَلَا خِلٰلٌ' میں اس انفاق کی اصل ضرورت کا اظہار ہے کہ اصلاً یہ دوسروں کے لیے مطلوب نہیں ہے بلکہ خود خرچ کرنے والے کی اپنی نجات و فلاح کے لیے یہ مطلوب ہے اس لیے کہ آگے ایک ایسا دور آنے والا ہے جس میں نہ خرید و فروخت ہو گی نہ دوستی اور رشتہ داری کام آئے گی۔ اگر کام آئے گا تو یہی انفاق جو کسی نے اللہ کی راہ میں کیا ہو گا۔

مسلمانوں کو مستقبل کی کامیابی کی بشارت

آیت کے الفاظ، اس کے اسلوب اور موقع و محل پر اچھی طرح غور کیجیے تو اس کے اندر مسلمانوں کے لیے مستقبل کی کامیابی کی بشارت بھی مضمر ہے۔ اس کے اندر یہ بات پوشیدہ ہے کہ قریش نے تو امانت حضرت ابراہیمؑ سے وراثت میں پائی تھی اس کے تمام مقاصد برباد کر کے رکھ دیے۔ اب اہل ایمان کے لیے یہ موقع ہے کہ وہ ان مقاصد کے لیے اپنے آپ کو تیار کریں اور اس امانت کے امین بنیں۔

اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ ۚ وَسَخَّرَ لَكُمُ الْفُلْكَ لِتَجْرِيَ فِي الْبَحْرِ بِاَمْرِهٖ ۚ وَسَخَّرَ لَكُمُ الْاَنْهٰرَ ۚ وَسَخَّرَ لَكُمُ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ دَآىِٕبَيْنِ ۚ وَسَخَّرَ لَكُمُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ ۚ وَاٰتٰىكُمْ مِّنْ كُلِّ مَا سَاَلْتُمُوْهُ ۭ وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا ۭ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَظَلُوْمٌ كَفَّارٌ (۳۲-۳۴)

یہ اسی مضمون کی مزید وضاحت ہے جو اوپر گزر چکا ہے کہ نعمتیں تو ساری کی ساری اللہ نے بخشیں لیکن ظالم مشرکوں نے ان میں سے ایک ایک کو اپنے مزعومہ دیوتاؤں کی طرف منسوب کر کے ان کی عبادت شروع کر دی۔ بارش، کشتی، دریا، سورج، چاند، شب اور روز سب کو انسان کی نفع رسانی میں اللہ نے سرگرم کیا ہے لیکن ان میں سے بعض چیزوں کو تو نادانوں نے خود دیوتا بنا دیا اور جن کو دیوتا نہیں بنایا ان پر دوسرے دیوتا حاکم و متصرف بنا دیے اور ان کی جے پکارنے لگے۔

انسان کی نفع رسانی کے لیے اشیاء کی تسخیر

'سَخَّرَ لَكُمْ' کا مفہوم ہم دوسرے مقام میں واضح کر چکے ہیں کہ کسی شے کو کسی کی نفع رسانی میں لگا دینے کا ہے۔ آسمان و زمین، سورج اور چاند سب مسخر خدا ہی کے ہاتھ میں ہیں، البتہ خدا نے ان کو انسان کی نفع رسانی میں لگا رکھا ہے اور یہ اس کا فضل و کرم ہے۔

'وَسَخَّرَ لَكُمُ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ دَآئِبَيْنِ' دَآئِب کے معنی مستمر کے ہیں۔ یعنی ایک ہی انداز، ایک ہی راہ اور ایک ہی مدار و مستقر پر سیکنڈ اور منٹ کی پابندی کے ساتھ، اپنی مفوضہ خدمت کی انجام دہی میں مصروف ہیں، مجال نہیں کہ اس میں سرمو فرق آنے پائے۔ غور کرو کہ یہ ان کے معبود ہونے کی علامت ہے یا اصل حاکم کائنات خدائے عزیز و علیم کے محکوم و مقہور ہونے کی؟

'وَآتَاكُمْ مِنْ كُلِّ مَا سَأَلْتُمُوهُ' یہ خطاب انسان سے بحیثیت انسان ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تم اپنی فطرت و خلقت کی رو سے جن چیزوں کے محتاج بنائے گئے ان ساری چیزوں میں سے اللہ نے تمہیں اپنی حکمت و مصلحت کے مطابق بخشیں۔ طلب اور اس کے جواب میں یہ کامل مطابقت خود سب سے بڑی شہادت اس بات کی ہے کہ جس نے تم کو پیدا کیا اسی نے تمہاری ساری ضرورتوں کا اہتمام فرمایا ہے۔

'إِنَّ الْإِنْسَانَ لَظَلُومٌ كَفَّارٌ' لفظ انسان اگرچہ عام ہے لیکن روئے سخن انہی مشرکین کی طرف ہے جن کا ذکر اوپر کی آیات میں گزرا۔ چونکہ وہ اپنی نالائقی کے سبب سے لائق التفات نہیں اس وجہ سے بات عام صیغہ سے کہہ دی گئی۔ 'ظَلُومٌ' کے معنی حق کو تلف کرنے والا۔ ہم دوسرے مقام میں یہ واضح کر چکے ہیں کہ شرک کا ارتکاب کر کے انسان خدا کے حق کو بھی تلف کرتا ہے اور خود اپنے نفس کے حق کو بھی۔ 'كَفَّارٌ' کے معنی ناشکرے کے ہیں، جو نعمت تو کسی اور سے پاتا ہے اور گن کسی اور کے گاتا ہے۔

۱۲- آگے کا مضمون ـــــ آیات ۳۵-۴۱

ملتِ ابراہیمی کی وضاحت

قریش اپنے مذہب شرک کی حمایت میں سب سے بڑی دلیل جو پیش کرتے تھے وہ یہ تھی کہ یہ دین ان کو اپنے جد اعلیٰ حضرت ابراہیمؑ سے وراثت میں ملا ہے۔ آگے اسی دعوے کی تردید آ رہی ہے اور یہ حقیقت واضح کی گئی ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے ایک زرخیز و شاداب علاقہ سے ہجرت کر کے اس وادی غیر ذی زرع میں اپنی ذریت کو اس لیے بسایا تھا کہ وہ اس میں خدائے واحد کی عبادت کا ایک مرکز قائم کر سکیں تاکہ ان کی اولاد شرک کی تمام آلودگیوں سے پاک رہ کر خدائے وحدہ لا شریک لہٗ کی عبادت کر سکے۔ اس وادی غیر ذی زرع میں امن و رزق کی تمام برکتیں حضرت ابراہیمؑ کی دعاؤں کا نتیجہ ہیں لیکن قریش نے ان تمام نعمتوں کو اپنے دیوتاؤں کے کھاتے میں ڈال دیا ہے اور خدائے واحد کو چھوڑ کر اپنے بتوں کی عبادت میں لگ گئے ہیں اور اسی کو حضرت ابراہیمؑ کا دین بتاتے ہیں ـــ اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۳۵-۴۱

وَإِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ رَبِّ اجْعَلْ هَٰذَا الْبَلَدَ آمِنًا وَاجْنُبْنِي وَ
بَنِيَّ أَنْ نَعْبُدَ الْأَصْنَامَ ﴿۳۵﴾ رَبِّ إِنَّهُنَّ أَضْلَلْنَ كَثِيرًا مِنَ

النَّاسِ ۚ فَمَنْ تَبِعَنِي فَإِنَّهُ مِنِّي ۖ وَمَنْ عَصَانِي فَإِنَّكَ غَفُورٌ
رَّحِيمٌ ﴿٣٦﴾ رَبَّنَا إِنِّي أَسْكَنتُ مِن ذُرِّيَّتِي بِوَادٍ غَيْرِ ذِي زَرْعٍ
عِندَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ رَبَّنَا لِيُقِيمُوا الصَّلَاةَ فَاجْعَلْ أَفْئِدَةً مِّنَ
النَّاسِ تَهْوِي إِلَيْهِمْ وَارْزُقْهُم مِّنَ الثَّمَرَاتِ لَعَلَّهُمْ يَشْكُرُونَ ﴿٣٧﴾
رَبَّنَا إِنَّكَ تَعْلَمُ مَا نُخْفِي وَمَا نُعْلِنُ ۗ وَمَا يَخْفَىٰ عَلَى اللَّهِ مِن
شَيْءٍ فِي الْأَرْضِ وَلَا فِي السَّمَاءِ ﴿٣٨﴾ الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي وَهَبَ
لِي عَلَى الْكِبَرِ إِسْمَاعِيلَ وَإِسْحَاقَ ۚ إِنَّ رَبِّي لَسَمِيعُ الدُّعَاءِ ﴿٣٩﴾
رَبِّ اجْعَلْنِي مُقِيمَ الصَّلَاةِ وَمِن ذُرِّيَّتِي ۚ رَبَّنَا وَتَقَبَّلْ دُعَاءِ ﴿٤٠﴾
رَبَّنَا اغْفِرْ لِي وَلِوَالِدَيَّ وَلِلْمُؤْمِنِينَ يَوْمَ يَقُومُ الْحِسَابُ ﴿٤١﴾ ع ٦ / ١٨

ترجمۂ آیات ۳۵-۴۱

اور یاد کرو جب ابراہیم نے دعا کی کہ اے میرے رب اس سرزمین کو پرامن بنا اور مجھ کو اور میری اولاد کو اس بات سے محفوظ رکھ کہ ہم بتوں کو پوجیں۔ اے میرے رب! ان بتوں نے لوگوں میں سے ایک خلق کثیر کو گمراہ کر رکھا ہے تو جو میری پیروی کرے وہ تو مجھ سے ہے اور جو میری نافرمانی کرے تو تو بخشنے والا مہربان ہے۔ اے ہمارے رب! میں نے اپنی اولاد میں سے ایک بن کھیتی کی وادی میں تیرے محترم گھر کے پاس بسایا ہے، اے ہمارے رب، تاکہ وہ نماز کا اہتمام کریں تو تو لوگوں کے دل ان کی طرف مائل کر دے اور ان کو پھلوں کی روزی عطا فرما تاکہ وہ تیرا شکر ادا کریں۔ اے ہمارے رب تو جانتا ہے جو ہم پوشیدہ رکھتے ہیں اور جو ظاہر کرتے ہیں اور اللہ سے کوئی چیز بھی مخفی نہیں، نہ زمین میں اور نہ آسمان میں۔ شکر ہے اس اللہ کے لیے جس نے مجھے بڑھاپے میں اسمٰعیل اور اسحاق عطا فرمائے۔ بیشک

میرا رب دعا کا سننے والا ہے۔ اے میرے رب مجھے نماز کا اہتمام کرنے والا بنا اور میری اولاد میں سے بھی اے ہمارے رب اور میری دعا قبول فرما۔ اے ہمارے رب مجھے اور میرے والدین کو اور مومنین کو اس دن بخش جس دن حساب قائم ہوگا۔ ۳۵-۴۱

۱۳- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا الْبَلَدَ اٰمِنًا وَّاجْنُبْنِيْ وَبَنِيَّ اَنْ نَّعْبُدَ الْاَصْنَامَ ؕ رَبِّ اِنَّهُنَّ اَضْلَلْنَ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ ۚ فَمَنْ تَبِعَنِيْ فَاِنَّهٗ مِنِّيْ ۚ وَمَنْ عَصَانِيْ فَاِنَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (۳۵-۳۶)

حضرت ابراہیمؑ کی دعا

حضرت ابراہیمؑ نے جس وقت حضرت اسمٰعیلؑ اور ان کی والدہ کو سرزمین مکہ میں بسایا ہے یہ دعا اس وقت کی ہے۔ سب سے پہلے تو اس سرزمین کے لیے انھوں نے امن کی دعا کی اس لیے کہ اس وقت تک یہ پورا علاقہ امن سے محروم تھا۔ حضرت ابراہیمؑ کی یہ دعا اللہ تعالیٰ نے اس طرح قبول فرمائی کہ انسان تو انسان اس سرزمین پر کسی جاندار کو ستانا بھی گناہ ٹھہرا۔ پھر خانہ کعبہ کی بدولت چار مہینے حج و عمرہ کے لیے محترم قرار دے دیے گئے جن میں قافلے ملک کے ایک حصہ سے دوسرے حصہ تک بے تکلف سفر کرتے، مجال نہیں تھی کہ کسی کا بال بیکا ہو۔ مزید برآں قریش کو خانہ کعبہ کی پاسبانی کی بدولت سارے ملک میں امامت و سیادت کا درجہ حاصل ہوگیا، ان کے قافلے ہر حصۂ ملک کا سفر کرتے اور قبائل ان سے تعرض کرنا تو درکنار ان کے لیے بدرقہ فراہم کرتے۔

دوسری دعا یہ فرمائی کہ مجھ کو اور میری اولاد کو بت پرستی کی نجاست سے محفوظ رکھ۔ یہ وہ اصل مقصود تھا جس کے لیے حضرت ابراہیمؑ نے ہجرت فرمائی تھی۔ اس دعا میں انھوں نے خود اپنے آپ کو بھی شامل کیا ہے جس سے شرک کی تعدی اور خطرناکی کا اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ جیسے جلیل القدر پیغمبر بھی اس کی چھوت سے بچائے جانے کی دعا کرتے تھے۔ اس حقیقت کا اظہار رَبِّ اِنَّهُنَّ اَضْلَلْنَ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ کے الفاظ سے بھی ہو رہا ہے کہ ان بتوں کا فتنہ ایسا ہے کہ ایک خلق کثیر اس کا شکار ہو کر رہ گئی۔ بلاغت زبان کا یہ ایک اسلوب ہے کہ کسی چیز کی شدت تاثیر و تسخیر کا اظہار مقصود ہو تو بعض اوقات اس کے لیے ضمیر اور فعل وہ استعمال کر دیتے ہیں جو عام طور پر ذوی العقول کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔

دعا میں 'بَنِیَّ' کا لفظ ہے جس کے ظاہر معنی یہ ہیں کہ میرے بیٹوں کو شرک کی نجاست سے محفوظ رکھ لیکن یہ لفظ علی سبیل التغلیب استعمال ہوا ہے۔ مقصود یہی ہے کہ میری اولاد کو محفوظ رکھ۔ چنانچہ آگے اسی دعا میں 'ذریۃ' کا لفظ استعمال ہوا ہے جو عام ہے۔

فَمَنْ تَبِعَنِیْ فَاِنَّهٗ مِنِّیْ وَمَنْ عَصَانِیْ فَاِنَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ یہ اپنی اولاد میں سے ان لوگوں سے اعلان برأت ہے جو ان کے طریقہ سے ہٹ کر شرک و بت پرستی میں مبتلا ہوں۔ فرمایا کہ جو اس معاملہ میں میری پیروی کریں وہ تو بے شک مجھ سے اور میرے زمرے میں سے ہیں اور جو میری راہ سے ہٹ کر شرک میں مبتلا ہوں ان کا معاملہ تیرے حوالہ ہے، تو ان کے ساتھ وہ معاملہ کرے گا جس کا تو ان کو مستحق پائے گا۔ تو غفور رحیم ہے، تجھ سے کسی ناانصافی کا اندیشہ نہیں۔ جو رحمت کے سزاوار ہوں گے وہ اس سے محروم نہیں ہوں گے۔

یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ یہ شرک کرنے والوں کے لیے حضرت ابراہیمؑ کی طرف سے مغفرت کی دعا نہیں ہے بلکہ صرف ان کے معاملے کو، جیسا کہ ہم نے عرض کیا، خدائے غفور رحیم کے حوالہ کرنا ہے۔

رَبَّنَآ اِنِّیْٓ اَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّیَّتِیْ بِوَادٍ غَیْرِ ذِیْ زَرْعٍ عِنْدَ بَیْتِكَ الْمُحَرَّمِ رَبَّنَا لِیُقِیْمُوا الصَّلٰوةَ فَاجْعَلْ اَفْىِٕدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهْوِیْٓ اِلَیْهِمْ وَارْزُقْهُمْ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّهُمْ یَشْكُرُوْنَ (۳۷)

ہجرت کا اصل مقصود

یعنی میں نے اپنی اولاد کو ایک بن کھیتی کی چٹیل زمین میں، تیرے محترم گھر کے پاس، اس لیے لا بسایا ہے تاکہ وہ نماز کا اہتمام کریں۔ تو لوگوں کے دل ان کی طرف مائل کر دے اور ان کو پھلوں کی روزی عطا فرما تاکہ وہ تیرے شکرگزار رہیں۔

اس سے ایک بات تو یہ معلوم ہوئی کہ خدا کی توحید اور خالص اسی کی بندگی وہ چیز ہے جس کی خاطر انسان سب کچھ چھوڑ سکتا ہے اور اسے سب کچھ چھوڑ دینا چاہیے یہاں تک کہ اگر اسے ایک چٹیل زمین میں تنہا زندگی بسر کرنی پڑے تو اس کو بھی اسے اختیار کر لینا چاہیے لیکن خدا اور اس کی عبادت کو کسی حال میں بھی نہیں چھوڑنا چاہیے۔

اقامت صلوٰۃ تعمیر کعبہ کا مقصد

دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ خانہ کعبہ اصل میں نماز کا مرکز ہے اس وجہ سے اس کی تولیت کے اصل حق دار وہ ہیں جو نماز کا اہتمام کریں نہ کہ وہ جو توحید اور نماز سب کچھ ضائع کر بیٹھے لیکن اس کی تولیت کے مدعی ہیں۔ یہاں حضرت ابراہیمؑ نے نماز کا ذکر خانہ کعبہ کے ابتدائی مقصد تعمیر کی حیثیت سے کیا ہے۔ بعد میں جب اس کے لیے ان کو حج کی منادی کا حکم ہوا تو یہ حج کا بھی مرکز بن گیا اور حضرت اسمٰعیلؑ کی قربانی کی یادگار میں قربانی کا بھی۔ یہ امر بھی ملحوظ رہے کہ 'اقامت صلوٰۃ' کا مفہوم صرف نماز پڑھنا ہی نہیں ہے بلکہ یہ چیز بھی اس میں شامل ہے کہ لوگوں کو اس کی دعوت دی جائے اور اس امر کا اہتمام و انتظام کیا جائے کہ لوگ نماز پڑھیں۔

دعائے ابراہیمی کے اصل اجزاء

یہاں حضرت ابراہیمؑ نے نماز اور اس سرزمین کی خاص نوعیت کے سبب سے اپنی اولاد کے لیے دو چیزوں کی دعا کی۔

ایک اس چیز کی کہ تو لوگوں کے دل ان کی طرف مائل کر دے۔ حضرت ابراہیمؑ کی اس دعا کی مقبولیت کا یہ اثر ہوا کہ خانہ کعبہ بہت جلد سارے عرب کا مرجع بن گیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد تو کعبہ کہ سارے عالم کا مرکز بن گیا۔

دوسری دعا ملک کے بے آب و گیاہ ہونے کے سبب سے رزق و فضل کی کشائش کی کی۔ جس کا اثر بہت جلد اس شکل میں ظاہر ہوا کہ مکہ تمام عرب کی تجارت کا مرکز بن گیا۔ 'وَارْزُقْهُمْ مِنَ الثَّمَرٰتِ' پر تفصیل بحث ہم سورۂ بقرہ کی تفسیر میں کر آئے ہیں۔

رَبَّنَآ اِنَّكَ تَعْلَمُ مَا نُخْفِيْ وَمَا نُعْلِنُ ۭ وَمَا يَخْفٰى عَلَي اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِي السَّمَاۗءِ (۳۸)

'رَبَّنَآ اِنَّكَ تَعْلَمُ مَا نُخْفِيْ وَمَا نُعْلِنُ'۔ اس فقرے کی بلاغت احاطۂ بیان میں نہیں آسکتی۔ بندہ جب اپنے رب سے کسی اہم معاملے میں دعا کرتا ہے تو اس کو ایک بڑی مشکل یہ پیش آتی ہے کہ بعض باتیں وہ کہنا تو چاہتا ہے لیکن وہ بیان میں نہیں آتیں، اسی طرح بعض باتیں ایسی ہوتی ہیں جو دل میں تو ہوتی ہیں لیکن وہ ان کے کہنے میں کسی مبہم سبب سے کچھ حجاب سا محسوس کرتا ہے۔ اس فقرے نے اس طرح کی ساری باتوں کو سمیٹ لیا اس لیے کہ خدا کا علم ظاہر و مخفی سب کو محیط ہے۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ وَهَبَ لِيْ عَلَي الْكِبَرِ اِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ ۭ اِنَّ رَبِّيْ لَسَمِيْعُ الدُّعَاۗءِ (۳۹)

یہ اپنی دعا کے حق میں اللہ تعالیٰ کے پچھلے عظیم احسانات کا حوالہ دے کر گویا سفارش بہم پہنچائی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جس پروردگار نے مجھے بڑھاپے میں اسمٰعیلؑ و اسحاقؑ عطا فرمائے، میں اس سے یہی امید رکھتا ہوں کہ جس طرح اس نے ان کے باب میں میری دعا کو قبولیت سے نوازا اسی طرح میری اس دعا کو بھی شرف قبول بخشے گا۔ میں اس سے مانگ کر کبھی محروم نہیں ہوا ہوں۔

رَبِّ اجْعَلْنِيْ مُقِيْمَ الصَّلٰوةِ وَمِنْ ذُرِّيَّتِيْ ڰ رَبَّنَا وَتَقَبَّلْ دُعَاۗءِ ؀ رَبَّنَا اغْفِرْ لِيْ وَلِوَالِدَيَّ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ يَوْمَ يَقُوْمُ الْحِسَابُ (۴۰-۴۱)

یہ آخر میں اپنے اور اپنی اولاد کے لیے اس مقصد میں سرگرم رہنے کی دعا کی جس کے لیے انھوں نے خانۂ کعبہ کی تعمیر کی تھی اور جس کا ذکر اوپر 'رَبَّنَا لِيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ' کے الفاظ میں ہو چکا ہے 'وَمِنْ ذُرِّيَّتِيْ' میں مِنْ تبعیض کا ہے اس لیے کہ مکہ میں انھوں نے اپنی ذریت میں سے صرف حضرت اسمٰعیل کو بسایا تھا۔

سب سے آخر میں اپنے لیے، اپنے والدین کے لیے اور تمام اہل ایمان کے لیے مغفرت کی دعا فرمائی۔

حضرت ابراہیمؑ کے والد — آزر — کے متعلق قرآن کے متعدد مقامات میں تصریح ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے چونکہ ہجرت کے وقت ان سے کہہ دیا تھا کہ میں آپ کے لیے استغفار کرتا رہوں گا۔ اس وجہ سے ان کے شرک و کفر پر شدید اصرار کے باوجود وہ ان کے لیے استغفار کرتے رہے۔ بعد میں اللہ تعالیٰ نے جب آپ کو اس سے روک دیا تو آپ رک گئے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ دعا جو اوپر مذکور ہوئی ہے اس ممانعت کے وارد ہونے سے قبل کی ہے۔

دعا کی خصوصیات

اس دعا میں دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ سات مرتبہ 'رَبِّ' یا 'رَبَّنَا' کا لفظ آیا ہے۔ یوں بظاہر تو یہ ایک تکرار سی محسوس ہوتی ہے لیکن درحقیقت یہ چیز دعا کی خصوصیات بلکہ اس کے لوازم میں سے ہے۔ دعا کا اصل مزاج

تضرع، استمالت، استغاثہ اور التجا و فریاد ہے۔ یہ چیز مقتضی ہوتی ہے کہ جس سے دعا کی جارہی ہے اس کو بار بار متوجہ کیا جائے۔ جب بندہ خدا کو 'رَبِّ' سے خطاب کرتا ہے تو وہ گویا اس لطف خاص کو اپنی دعا کے حق میں سفارشی بناتا ہے جس کا تجربہ اسے خود ہے اور جب اس کو 'رَبَّنَا' سے خطاب کرتا ہے تو وہ اس کے اس کرم عام کو اپنی دعا کے حق میں سفارشی بناتا ہے جس کا مشاہدہ تمام خلق میں ہو رہا ہے۔

یہاں وہ بات پھر ذہن میں تازہ کر لیجیے جو اوپر گزر چکی ہے کہ یہ دعا قریش کو اس لیے سنائی گئی کہ وہ سوچیں کہ وہ کس مقصد سے اس وادی غیر ذی زرع میں بسائے گئے تھے اور اب کیا بن کے رہ گئے ہیں، نیز وہ اس امر پر بھی غور کریں کہ وہ تمام نعمتیں جو اس سرزمین پر ان کو حاصل ہوئیں، وہ حاصل تو ہوئیں حضرت ابراہیم کی دعا کی برکت اور خاص اللہ تعالیٰ کے فضل سے لیکن انھوں نے ان تمام نعمتوں کا منبع اپنے خیالی معبودوں کو قرار دے رکھا ہے۔

۱۴۔ آگے کا مضمون ـــــ آیات ۴۲-۵۲

خاتمۂ سورہ

آگے خاتمۂ سورہ کی آیات ہیں جن میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی ہے اور کفار کے لیے سخت دھمکی ہے۔ ربط کلام بالکل واضح ہے۔ آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۴۲-۵۲

وَلَا تَحْسَبَنَّ اللّٰهَ غَافِلًا عَمَّا يَعْمَلُ الظّٰلِمُوْنَ ؕ اِنَّمَا يُؤَخِّرُهُمْ لِيَوْمٍ
تَشْخَصُ فِيْهِ الْاَبْصَارُ ۙ﴿۴۲﴾ مُهْطِعِيْنَ مُقْنِعِيْ رُءُوْسِهِمْ لَا يَرْتَدُّ
اِلَيْهِمْ طَرْفُهُمْ ۚ وَاَفْـِٕدَتُهُمْ هَوَآءٌ ؕ﴿۴۳﴾ وَاَنْذِرِ النَّاسَ يَوْمَ
يَاْتِيْهِمُ الْعَذَابُ فَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا رَبَّنَاۤ اَخِّرْنَاۤ اِلٰۤى اَجَلٍ
قَرِيْبٍ ۙ نُّجِبْ دَعْوَتَكَ وَنَتَّبِعِ الرُّسُلَ ؕ اَوَلَمْ تَكُوْنُوْۤا اَقْسَمْتُمْ
مِّنْ قَبْلُ مَا لَكُمْ مِّنْ زَوَالٍ ۙ﴿۴۴﴾ وَّسَكَنْتُمْ فِيْ مَسٰكِنِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْۤا
اَنْفُسَهُمْ وَتَبَيَّنَ لَكُمْ كَيْفَ فَعَلْنَا بِهِمْ وَضَرَبْنَا لَكُمُ الْاَمْثَالَ ﴿۴۵﴾
وَقَدْ مَكَرُوْا مَكْرَهُمْ وَعِنْدَ اللّٰهِ مَكْرُهُمْ ؕ وَاِنْ كَانَ مَكْرُهُمْ
لِتَزُوْلَ مِنْهُ الْجِبَالُ ﴿۴۶﴾ فَلَا تَحْسَبَنَّ اللّٰهَ مُخْلِفَ وَعْدِهٖ رُسُلَهٗ ؕ اِنَّ

اللّٰهَ عَزِيْزٌ ذُو انْتِقَامٍ ﴿٤٧﴾ يَوْمَ تُبَدَّلُ الْاَرْضُ غَيْرَ الْاَرْضِ وَالسَّمٰوٰتُ
وَبَرَزُوْا لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ ﴿٤٨﴾ وَتَرَى الْمُجْرِمِيْنَ يَوْمَئِذٍ مُّقَرَّنِيْنَ
فِي الْاَصْفَادِ ﴿٤٩﴾ سَرَابِيْلُهُمْ مِّنْ قَطِرَانٍ وَّتَغْشٰى وُجُوْهَهُمُ
النَّارُ ﴿٥٠﴾ لِيَجْزِيَ اللّٰهُ كُلَّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ﴿٥١﴾
هٰذَا بَلٰغٌ لِّلنَّاسِ وَلِيُنْذَرُوْا بِهٖ وَلِيَعْلَمُوْٓا اَنَّمَا هُوَ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ وَّ
لِيَذَّكَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ ﴿٥٢﴾ ع ۱۱/۱۹

ترجمۂ آیات ۴۲-۵۲

اور اللہ کو، جو کچھ یہ ظالم کر رہے ہیں اس سے بے خبر نہ سمجھو۔ وہ ان کو بس ایک ایسے دن کے لیے ٹال رہا ہے جس میں نگاہیں پھٹی کی پھٹی رہ جائیں گی۔ وہ سر اٹھائے ہوئے بھاگ رہے ہوں گے، ٹکٹکی بندھی ہوگی اور ان کے دل اڑے ہوئے ہوں گے۔ ۴۲-۴۳

اور تم لوگوں کو اس دن سے خبردار کر دو جس دن ان پر عذاب آ دھمکے گا تو یہ اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے کہیں گے کہ اے ہمارے رب ہمیں تھوڑی سی مہلت اور دے دے، ہم تیری دعوت قبول کر لیں گے اور رسولوں کی پیروی کریں گے ــــ کیا تم اس سے پہلے قسمیں نہیں کھاتے رہے تھے کہ تم ٹلنے والے نہیں ہو۔ اور تم ان لوگوں کی بستیوں میں رہے بسے جنھوں نے اپنی جانوں پر ظلم ڈھائے اور تم پر واضح تھا کہ ہم نے ان کے ساتھ کیا معاملہ کیا اور تمھارے لیے ہم نے مثالیں بھی بیان کر دی تھیں۔ اور انھوں نے اپنی ساری چالیں چلیں اور یہ چالیں ان کی خدا کے پاس ہیں اگرچہ ان کی یہ چالیں ایسی تھیں کہ ان سے پہاڑ بھی اپنی جگہ سے ٹل جاتے۔ ۴۴-۴۶

تو اللہ کو اپنے رسولوں سے وعدہ خلافی کرنے والا نہ سمجھو، اللہ غالب اور انتقام لینے والا ہے۔ اس دن کو یاد رکھو جس دن یہ زمین دوسری زمین سے بدل دی جائے گی اور آسمان بھی

اور سب اللہ واحد و قہار کے حضور پیش ہوں گے۔ اور تم مجرموں کو اس دن زنجیروں میں جکڑا ہوا دیکھو گے۔ ان کے لباس تارکول کے ہوں گے اور ان کے چہروں پر آگ چھائی ہوئی ہوگی۔ تاکہ اللہ ہر جان کو اس کی کمائی کا بدلہ دے۔ بے شک اللہ بڑی جلدی حساب چکا دینے والا ہے۔ یہ لوگوں کے لیے ایک اعلان ہے اور تاکہ اس کے ذریعہ سے وہ آگاہ کر دیے جائیں اور تاکہ وہ جان لیں کہ وہی ایک معبود ہے اور تاکہ اہل عقل یاد دہانی حاصل کر لیں۔ ۴۷-۵۲

۱۵۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَلَا تَحْسَبَنَّ اللّٰهَ غَافِلًا عَمَّا يَعْمَلُ الظّٰلِمُوْنَ ۥ اِنَّمَا يُؤَخِّرُهُمْ لِيَوْمٍ تَشْخَصُ فِيْهِ الْاَبْصَارُ ۙ مُهْطِعِيْنَ مُقْنِعِيْ رُءُوْسِهِمْ لَا يَرْتَدُّ اِلَيْهِمْ طَرْفُهُمْ ۚ وَاَفْئِدَتُهُمْ هَوَآءٌ (۴۲-۴۳)

شخوص کا مفہوم
تَشْخَصُ فِيْهِ الْاَبْصَارُ ' شَخَصَ شُخُوْصًا' کے معنی تو ارتفاع کے ہیں لیکن جب یہ آنکھوں کے لیے آئے تو اس کے معنی آنکھوں کی ٹنگی ہوئی یا پھٹی ہوئی رہ جانے کے ہوں گے۔

اِھطاع کا مفہوم
'مُهْطِعِيْنَ' 'اِهْطَاع' کسی طرف تیزی سے بڑھنے اور لپکنے کے معنی میں آتا ہے بالخصوص جب کہ یہ بڑھنا اور لپکنا خوف و دہشت کی بنا پر ہو۔

'اقناع' کا مفہوم
'اقناع' سر اٹھانے یا آواز بلند کرنے کے معنی میں آتا ہے۔ یہاں سر اٹھا کر چلنے کے معنی میں آیا ہے۔

خطاب پیغمبر صلعم سے عتاب قریش پر
آیت میں خطاب ظاہر الفاظ کے اعتبار سے تو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے لیکن اس میں جو شدید عتاب ہے وہ تمام تر قریش پر ہے۔ پیغمبر صلعم کو اطمینان دلایا جا رہا ہے کہ تم یہ نہ گمان کرو کہ جو کچھ یہ تمہارے مخالفین کر رہے ہیں ہم اس سے بے خبر ہیں۔ ہم بے خبر نہیں ہیں۔ ہم سب کچھ دیکھ رہے ہیں لیکن ہم ان کے معاملے کو اس دن پر ٹال رہے ہیں جس کے ہول کا یہ حال ہوگا کہ نگاہیں اٹھیں گی تو ٹنگی ہی رہ جائیں گی، پلک جھپکنے کی نوبت نہیں آئے گی۔ سر اٹھائے ہوئے تیزی سے یہ موقف حشر کی طرف بھاگ رہے ہوں گے اور ان کے دل خوف و دہشت سے اڑے جا رہے ہوں گے۔

وَاَنْذِرِ النَّاسَ يَوْمَ يَاْتِيْهِمُ الْعَذَابُ فَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا رَبَّنَآ اَخِّرْنَآ اِلٰٓى اَجَلٍ قَرِيْبٍ ۙ نُّجِبْ دَعْوَتَكَ وَنَتَّبِعِ الرُّسُلَ ۭ اَوَلَمْ تَكُوْنُوْٓا اَقْسَمْتُمْ مِّنْ قَبْلُ مَا لَكُمْ مِّنْ زَوَالٍ (۴۴)

یعنی آج یہ تمہاری بات نہیں سنتے تو نہ سنیں انھیں اس دن سے آگاہ کر دو جس دن ان پر عذاب آ دھمکے گا اور یہ اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے لوگ اس وقت فریاد کریں گے کہ اے ہمارے رب ہمیں تھوڑی سی مہلت اور دے دے۔ ہم تیری دعوت بھی قبول کر لیں گے اور تیرے رسولوں کی پیروی بھی کریں گے لیکن اس وقت توبہ اور اصلاح کا وقت گزر چکا ہو گا۔ ان کو جواب دے دیا جائے گا کہ کیوں اب کیا ہوا، کیا تم ہی وہ لوگ نہیں ہو جو قسمیں کھا کھا کر کہتے تھے کہ تم اپنی ضد سے ٹلنے والے نہیں ہو۔

وَّسَكَنْتُمْ فِيْ مَسٰكِنِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ وَتَبَيَّنَ لَكُمْ كَيْفَ فَعَلْنَا بِهِمْ وَضَرَبْنَا لَكُمُ الْاَمْثَالَ (۴۵)

تاریخ کی یاددہانی

یعنی یہ بات نہیں ہے کہ رسولوں کی تکذیب کرنے والوں کا جو حشر ہوا اور خدا نے ان کے ساتھ جو معاملہ کیا اس سے تم بے خبر رہے ہو، انہی اقوام بائدہ و معذبہ کی بستیوں میں تم رہے بسے اور خدا نے تم کو اپنے رسولوں کے ذریعہ سے ان کے سبق آموز اور عبرت انگیز حالات بھی سنا دیے۔ یہ حالات محض قصے کے طور پر تمھیں نہیں سنائے گئے تھے بلکہ ان کے سنانے سے مقصود تم کو یہ بتانا تھا کہ یہی حشر تمھارا بھی ہونا ہے اگر تم نے رسول کی تکذیب کر دی۔ جب یہ سب کچھ ہو چکا اور تم نہیں مانتے تو اب کس بات کے لیے مزید مہلت مانگ رہے ہو۔

وَقَدْ مَكَرُوْا مَكْرَهُمْ وَعِنْدَ اللّٰهِ مَكْرُهُمْ ۭ وَاِنْ كَانَ مَكْرُهُمْ لِتَزُوْلَ مِنْهُ الْجِبَالُ (۴۶)

یعنی ان قوموں نے بھی جہاں تک چالیں چلنے کا تعلق ہے کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی تھی لیکن آج ان کی ساری چالیں خدا کے پاس دھری ہیں۔ اگرچہ یہ چالیں ان کی ایسی زبردست تھیں کہ ان سے پہاڑ بھی اپنی جگہ سے کھسکائے جا سکتے تھے لیکن خدا نے ان کی یہ ساری چالیں بیکار کر دیں۔

فَلَا تَحْسَبَنَّ اللّٰهَ مُخْلِفَ وَعْدِهٖ رُسُلَهٗ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ ذُو انْتِقَامٍ (۴۷)

یہ خطاب بھی پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے اور اس میں بھی جو تسکین اور طمانیت کا پہلو ہے وہ تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ہے اور جو عتاب اور غضب کا پہلو ہے اس کا رخ کفار و مشرکین کی طرف ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ نہ گمان کرو کہ خدا نے اپنے رسولوں کے لیے فتح و نصرت کا جو وعدہ فرمایا ہے کسی حال میں اس کی خلاف ورزی کرے گا۔ وہ عزیز و غالب ہے کوئی اس کا ہاتھ نہیں پکڑ سکتا اور انتقام لینے والا ہے اس وجہ سے شریروں اور حق و عدل کے دشمنوں کو ضرور کیفر کردار کو پہنچائے گا۔

يَوْمَ تُبَدَّلُ الْاَرْضُ غَيْرَ الْاَرْضِ وَالسَّمٰوٰتُ وَبَرَزُوْا لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ (۴۸)

یوم آخرت کی یاددہانی

'يَوْمَ تُبَدَّلُ الْاَرْضُ غَيْرَ الْاَرْضِ وَالسَّمٰوٰتُ' و السَّمٰوٰتُ یعنی تُبَدَّلُ السَّمٰوٰتُ غَيْرَ السَّمٰوٰتِ۔

مطلب یہ ہے کہ انھیں وہ دن یاد دلاؤ جس دن یہ زمین اور یہ آسمان دونوں دوسری زمین اور دوسرے آسمانوں سے بدل دیے جائیں گے اور یہ سارے لوگ ایک ہی خدائے قہار کے حضور پیش ہوں گے۔ لفظ 'بَرَزُوْا' کے مفہوم کی وضاحت ہم دوسرے مقام میں کر چکے ہیں کہ اس کے اندر یہ مضمون بھی ہے کہ اس دن نہ کسی کے ساتھ

اس کا کوئی حامی و مددگار ہوگا اور نہ کوئی شفیع و سفارشی۔ بس ہر ایک کی ذات ہوگی اور اس کے اعمال۔ آسمان و زمین بھی دوسرے ہوں گے، وہاں نہ کسی کے قلعے اور گڑھیاں ہوں گی نہ کسی کے ایوان و محل۔

'قہّار' کا مفہوم

لفظ 'قہّار' کا مفہوم ہم دوسرے مقام میں واضح کر چکے ہیں کہ اس کا اصل مفہوم ہے تنہا سب پر اپنا کنٹرول رکھنے والا، دوسروں کی مدد و اعانت سے بالکل مستغنی، کسی کی مجال نہیں کہ اس کے قابو سے باہر نکل سکے۔

وَتَرَى الْمُجْرِمِينَ يَوْمَئِذٍ مُّقَرَّنِينَ فِي الْأَصْفَادِ ۝ سَرَابِيلُهُم مِّن قَطِرَانٍ وَتَغْشَىٰ وُجُوهَهُمُ النَّارُ ۝ لِيَجْزِيَ اللَّهُ كُلَّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ ۚ إِنَّ اللَّهَ سَرِيعُ الْحِسَابِ (۴۹-۵۱)

'سرابیل' کا مفہوم

'سَرَابِيل'، سربال کی جمع ہے جس کے معنی قمیص کے بھی آتے ہیں اور لباس کے مفہوم میں بھی یہ آتا ہے۔ یہاں موقع کلام دلیل ہے کہ یہ دوسرے عام مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔

'قطران' کا مفہوم

'قَطِرَان' کے اہل لغت نے مختلف معنی لکھے ہیں لیکن تارکول کے لیے یہ لفظ معروف ہے۔ ہمارے نزدیک یہاں اسی معنی میں ہے۔ مستحقین دوزخ کے جسموں اور چہروں کی سیاہی کا ذکر قرآن میں دوسرے مقامات میں بھی ہے۔ پھر تارکول پر آگ جس طرح بھڑکتی ہے وہ ایک معلوم و معروف حقیقت ہے۔

یوم آخرت کے ہول کی مزید تفصیل

یہ اس دن کی ہولناکی کی مزید تفصیل ہے کہ اس دن تمام مجرمین زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہوں گے۔ ان کے لباس تارکول کے ہوں گے اور ان کے چہروں پر آگ کے شعلوں کی لپٹ ہوگی اور یہ سب کچھ اس لیے ہوگا تاکہ ہر جان اپنے اعمال کا بدلہ پائے اور کوئی یہ نہ سمجھے کہ یہ ساری مخلوق کا حساب کرنے میں کوئی بڑا عرصہ لگ جائے گا۔ خدا پلک جھپکتے سب کا حساب چکا دے گا۔

هَٰذَا بَلَاغٌ لِّلنَّاسِ وَلِيُنذَرُوا بِهِ وَلِيَعْلَمُوا أَنَّمَا هُوَ إِلَٰهٌ وَاحِدٌ وَلِيَذَّكَّرَ أُولُو الْأَلْبَابِ (۵۲)

آخری تنبیہ

یہ آخری تنبیہ ہے کہ یہ ساری باتیں اس لیے لوگوں کو پہنچا دی گئی ہیں کہ لوگوں پر خدا کی حجت پوری ہو جائے، لوگ عذاب اور قیامت سے خبردار ہو جائیں اور اس بات کو اچھی طرح جان لیں کہ ایک ہی خدا سے سابقہ پڑنے والا ہے، کوئی اور کام آنے والا نہیں ہے اور جو اہل عقل ہیں ان کو یاد دہانی ہو جائے۔

ان سطروں پر اس سورہ کی تفسیر تمام ہوئی۔ وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ۔

لاہور

۱۲ ستمبر ۱۹۷۰ء

تدبرِ قرآن

۱۵

الحجر

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ا۔ سورہ کا عمود

پچھلی سورہ کے آخر میں کفار کے لیے جو تہدید و وعید اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے جو تسکین و تسلی مجمل الفاظ میں وارد ہوئی ہے وہ اس سورہ میں بالکل سامنے آگئی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے یہ اطمینان دلایا گیا ہے کہ یہ قرآن بجائے خود ایک واضح حجت ہے۔ اگر یہ لوگ اس کو نہیں مان رہے ہیں، تمھیں خبطی اور دیوانہ کہتے ہیں، مطالبہ کر رہے ہیں کہ ان پر فرشتے اتارے جائیں تب یہ مانیں گے تو یہ کوئی انوکھی بات نہیں ہے، ہمیشہ سے رسولوں کے جھٹلانے والوں کی یہی روش رہی ہے، اگر ان کے مطالبہ کے مطابق ان کو معجزے دکھا بھی دیے گئے جب بھی یہ ہٹ سے باز آنے والے نہیں ہیں تو ان کو ان کے حال پر چھوڑ دو، وہ وقت آئے گا جب یہ آرزوئیں کریں گے کہ کاش پیغمبرؐ اور قرآن کی دعوت قبول کر کے مومن و مسلم بنے ہوتے۔

ب۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

(۱-۱۵) پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو تسکین و تسلی کہ یہ قرآن بجائے خود ایک واضح حجت ہے، یہ کسی خارجی نشانی یا کسی معجزے کا محتاج نہیں ہے۔ جو لوگ اس کو آج جھٹلا رہے ہیں وقت آئے گا جب وہ اپنی بدبختی پر ماتم کریں گے۔ ان کو ان کے حال پر چھوڑ دو، یہ چند دن اپنی خود فراموشیوں میں مگن رہ لیں۔ اس قوم کی ہلاکت کے لیے خدا کی طرف سے ایک وقت مقرر ہے، جب وہ وقت پورا ہو جائے گا خدا کا عذاب آجائے گا۔ یہ خدا کے فرشتوں کے ظہور کا مطالبہ کر رہے ہیں تو ان سے کہہ دو کہ فرشتے تو جب آتے ہیں خدا کا فیصلہ لے کر ہی آتے ہیں اس کے بعد کسی قوم کو مہلت نہیں ملا کرتی۔ اگر یہ لوگ اس قرآن کی تکذیب کر رہے ہیں تو اس کی پروا نہ کرو، خدا اس کی حفاظت کا خود سامان کرے گا۔ یہی روش ان سے پہلے کی قوموں نے اختیار کی تو وہ اپنے کیفر کردار کو پہنچیں۔ وہی حشر ان کا بھی ہونا ہے۔ یہ اطمینان رکھو کہ ان کو کوئی بڑے سے بڑا معجزہ بھی قائل کرنے والا نہیں بن سکتا۔ وہ اس کو دیکھ کر بھی کوئی نہ کوئی بات بنا ہی لیں گے۔

(۱۶-۲۵) قرآن کی دعوت کی صداقت کی جو نشانیاں آفاق میں موجود ہیں ان کی یاددہانی۔ آسمان اور اس کے چمکتے ہوئے تارے، زمین اور اس کی نوع بنوع پیداوار، ہوائیں اور ان کی ابرخیزیاں۔ ان عجائب قدرت

کے مشاہدے سے وہ سبق کیوں نہیں حاصل کرتے؟ ان نشانیوں کے ہوتے کسی معجزے کے ظاہر ہونے کی کیا ضرورت باقی رہی؟

(۲۶-۴۸) آدمؑ اور ابلیس کے ابتدائی ماجرے کی یاددہانی جس سے مقصود یہ واضح کرنا ہے کہ کفار کی گمراہی کا اصل مصدر کیا ہے اور ابلیس کی ذریات نے ان کو جس ضلالت میں پھنسایا ہے بالآخر اس کا انجام کیا ہونا ہے۔ نیز شیطان کے فتنوں سے محفوظ رہنے والے متقین کی فوز و فلاح کی طرف ایک اجمالی اشارہ۔

(۴۹-۷۷) حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس آنے والے فرشتوں کے واقعہ کی یاددہانی جو اس بات کا ثبوت ہے کہ خدا اپنے بندوں پر بڑا مہربان بھی ہے اور ان پر دردناک عذاب لانے والا بھی۔ وہی فرشتے حضرت ابراہیمؑ کے لیے بیٹے کی بشارت لے کر آئے اور وہی فرشتے قوم لوط کے لیے صاعقۂ عذاب بن کر نمودار ہوئے۔ آخر میں کفار کو توجہ دلائی گئی ہے کہ تم لوط کی بستیوں پر سے آئے دن گزرتے ہو، اگر دیدۂ بینا رکھتے ہو تو ان کے انجام سے کیوں عبرت حاصل نہیں کرتے؟ تم پیغمبرؐ سے فرشتوں کے ظہور کے لیے مطالبہ کر رہے ہو۔ فرشتے تو جب مکذبین کے پاس آئے ہیں تو اسی طرح آتے ہیں جس طرح قوم لوط کے پاس آئے کہ ان کے آنے کے بعد ان پر عذاب الٰہی آدھمکا۔

(۷۸-۸۴) قوم شعیبؑ اور قوم ثمود کے انجام کی طرف اجمالی اشارہ۔ قوم لوطؑ کی طرح قوم شعیبؑ اور قوم ثمود کے آثار پر سے بھی قریش کو اپنے تجارتی سفروں میں گزرنے کا موقع ملتا تھا۔ مطلب یہ ہے کہ اگر دیدۂ بینا ہو تو قدم قدم پر مفسدین کے انجام کے آثار موجود ہیں۔ یہ کیا ضروری ہے کہ جب اپنے ہی اوپر سب کچھ نازل ہو جائے تب ہی آنکھیں کھلیں۔

(۸۵-۹۹) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تسکین و تسلی کہ ابھی خوبصورتی کے ساتھ ان لوگوں سے درگزر کرو۔ ان کے کیے کا سارا انجام ان کے سامنے آجائے گا۔ خدا نے قرآن عظیم کی شکل میں جو دولت گرانمایہ تمھیں بخشی ہے وہ تمھارے لیے کافی ہے۔ اس کے ہوتے تمھیں کسی چیز کی احتیاج نہیں۔ ان کے طعنوں کی تم کچھ پروا نہ کرو، خدا کی تسبیح اور نماز میں مشغول رہو۔ صبح یقین طلوع ہوا ہی چاہتی ہے۔

سُوْرَةُ الْحِجْرِ (۱۵)

مَكِّيَّةٌ ———— اٰيَاتُهَا ۹۹

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

الٓرٰ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ وَقُرْاٰنٍ مُّبِيْنٍ ۝۱ رُبَمَا يَوَدُّ الَّذِيْنَ آیات ۱ - ۱۵
كَفَرُوْا لَوْ كَانُوْا مُسْلِمِيْنَ ۝۲ ذَرْهُمْ يَاْكُلُوْا وَيَتَمَتَّعُوْا وَيُلْهِهِمُ
الْاَمَلُ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ ۝۳ وَمَآ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ اِلَّا وَلَهَا
كِتَابٌ مَّعْلُوْمٌ ۝۴ مَا تَسْبِقُ مِنْ اُمَّةٍ اَجَلَهَا وَلَا يَسْتَاْخِرُوْنَ ۝۵
وَقَالُوْا يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْ نُزِّلَ عَلَيْهِ الذِّكْرُ اِنَّكَ لَمَجْنُوْنٌ ۝۶ لَوْ
مَا تَاْتِيْنَا بِالْمَلٰٓئِكَةِ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۝۷ مَا نُنَزِّلُ
الْمَلٰٓئِكَةَ اِلَّا بِالْحَقِّ وَمَا كَانُوْٓا اِذًا مُّنْظَرِيْنَ ۝۸ اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا
الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ۝۹ وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ فِيْ شِيَعِ
الْاَوَّلِيْنَ ۝۱۰ وَمَا يَاْتِيْهِمْ مِّنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ۝۱۱
كَذٰلِكَ نَسْلُكُهٗ فِيْ قُلُوْبِ الْمُجْرِمِيْنَ ۝۱۲ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَقَدْ
خَلَتْ سُنَّةُ الْاَوَّلِيْنَ ۝۱۳ وَلَوْ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَابًا مِّنَ السَّمَآءِ
فَظَلُّوْا فِيْهِ يَعْرُجُوْنَ ۝۱۴ لَقَالُوْٓا اِنَّمَا سُكِّرَتْ اَبْصَارُنَا بَلْ نَحْنُ
قَوْمٌ مَّسْحُوْرُوْنَ ۝۱۵ ع

ترجمۂ آیات ۱ - ۱۵

یہ الف، لام، را ہے۔ یہ کتاب الٰہی اور ایک واضح قرآن کی آیات ہیں۔ وہ وقت آئیں گے جب یہ لوگ، جنھوں نے کفر کیا ہے، تمنا کریں گے کہ کاش ہم مسلم بنے ہوتے۔ ان کو چھوڑ دو، کھا پی لیں، عیش کر لیں اور آرزوؤں میں مگن رہ لیں۔ عنقریب یہ جان لیں گے۔ ہم نے جس قوم کو بھی ہلاک کیا ہے اس کے لیے ایک معین نوشتہ رہا ہے۔ کوئی قوم نہ اپنی مدت مقررہ سے آگے بڑھتی نہ پیچھے ہٹتی۔ اور یہ کہتے ہیں کہ اے وہ شخص جس پر یاددہانی اتاری گئی ہے تم تو ایک خبطی ہو، اگر تم سچے ہو تو ہمارے پاس فرشتوں کو کیوں نہیں لاتے؟ ہم فرشتوں کو نہیں اتارتے مگر فیصلہ کے ساتھ اور اس وقت ان کو مہلت نہیں ملے گی۔ یہ یاددہانی ہم ہی نے اتاری ہے اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں۔ اور ہم نے تم سے پہلے بھی اگلے گروہوں میں اپنے رسول بھیجے تو جو رسول بھی ان کے پاس آتا وہ اس کا مذاق ہی اڑاتے۔ ہم مجرموں کے دلوں میں اس کو اسی طرح اتارتے ہیں۔ یہ اس پر ایمان نہیں لائیں گے اور اگلوں کی سنت گزر چکی ہے۔ اور اگر ہم ان پر آسمان کا کوئی دروازہ بھی کھول دیتے جس میں وہ چڑھنے لگتے تب بھی یہی کہتے کہ ہماری آنکھیں مدہوش کر دی گئی ہیں بلکہ ہم سب پر جادو کر دیا گیا ہے۔ ۱ - ۱۵

۱۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

الٓرٰ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ وَقُرْاٰنٍ مُّبِيْنٍ (۱)

قرآن اپنی صداقت کی خود دلیل ہے

حروف مقطعات پر ایک جامع بحث ہم سورۂ بقرہ کی تفسیر کے آغاز میں کر چکے ہیں۔ ہمارے نزدیک 'الٓرٰ'، اس سورہ کا قرآنی نام ہے اور 'تلک' کا اشارہ اسی کی طرف ہے۔ لفظ 'الکتاب' پر بھی ہم بقرہ کی تفسیر کے شروع میں بحث کر چکے ہیں۔ اس سے مراد وہ خدائی کتاب ہے جس کے آتارنے کا اللہ تعالیٰ نے وعدہ فرمایا تھا اور جس کی پچھلے نبیوں نے خبر دی تھی۔ قرآن کی تنکیر تفخیم شان کے لیے ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ کلام جو ان کو سنایا جا رہا ہے یہ کتاب الٰہی اور ایک واضح قرآن کی آیات پر مشتمل ہے۔ یہ اپنی صداقت کی دلیل خود

اپنے اندر رکھتا ہے، کسی خارجی دلیل کا محتاج نہیں ہے۔ اس کے باوجود جو لوگ اس کو نہیں مان رہے ہیں، اس کی صداقت کو جانچنے کے لیے معجزوں کی فرمائش کر رہے ہیں، وہ درحقیقت اپنی شامت کو دعوت دے رہے ہیں۔

رُبَمَا يَوَدُّ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْ كَانُوا مُسْلِمِينَ (۲)

یعنی آج تو یہ لوگ غرور و رعونت کے ساتھ اس کتاب کا انکار کر رہے ہیں لیکن آگے ایسے وقت آئیں گے اور بار بار آئیں گے جب یہ تمنائیں کریں گے کہ کاش اس کتاب کو قبول کر کے مسلمان بنے ہوتے کہ ان ہولناک نتائج سے محفوظ رہتے۔ یہ مضمون سورۂ ابراہیم آیت ۴۴ میں بھی گزر چکا ہے۔

ذَرْهُمْ يَأْكُلُوا وَيَتَمَتَّعُوا وَيُلْهِهِمُ الْأَمَلُ فَسَوْفَ يَعْلَمُونَ (۳)

یعنی اگر یہ اپنی سرمستیوں میں گم ہیں، تم کو اور تمہاری دعوت کو (خطاب پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے) خاطر میں نہیں لا رہے ہیں تو ان کو ان کے حال پر چھوڑو، چند دن یہ کھا پی لیں، مزے کر لیں اور لذیذ آرزوؤں کے خواب دیکھ لیں، عنقریب وہ وقت آیا چاہتا ہے جب یہ اپنی سرمستی کا انجام خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے۔

وَمَا أَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ إِلَّا وَلَهَا كِتَابٌ مَعْلُومٌ ۝ مَا تَسْبِقُ مِنْ أُمَّةٍ أَجَلَهَا وَمَا يَسْتَأْخِرُونَ (۴-۵)

عذاب الٰہی کے مؤخر ہونے کی وجہ

یہ وجہ بیان ہوئی ہے عذاب کے مؤخر ہونے کی۔ مطلب یہ ہے کہ ان کے مطالبہ کے باوجود ان پر عذاب جو نہیں آ رہا ہے تو یہ تاخیر اللہ تعالیٰ کی ایک سنت پر مبنی ہے۔ سنت الٰہی یہ ہے کہ وہ کسی قوم پر عذاب بھیجنے سے پہلے اس پر اپنی حجت تمام کرتا ہے۔ اس اتمام حجت کے بعد بھی اگر وہ قوم اپنی سرکشی سے باز نہیں آتی تو لازماً وہ اپنے انجام کو پہنچ جاتی ہے۔ اتمام حجت اور اخلاقی زوال کی وہ حد جس پر پہنچ کر کوئی قوم مستحق عذاب ہو جاتی ہے ایک خدائی نوشتہ میں مرقوم ہے۔ جب اس نوشتہ کی مدت پوری ہو جاتی ہے، قوم ہلاک کر دی جاتی ہے۔ سر مو اس میں فرق واقع نہیں ہوتا۔ نہ اس میں تقدیم ہوتی نہ تاخیر۔

وَقَالُوا يَا أَيُّهَا الَّذِي نُزِّلَ عَلَيْهِ الذِّكْرُ إِنَّكَ لَمَجْنُونٌ ۝ لَوْ مَا تَأْتِينَا بِالْمَلَائِكَةِ إِنْ كُنْتَ مِنَ الصَّادِقِينَ (۶-۷)

آنحضرت پر کفار کا طعن اور اس کا جواب

کفار آنحضرت صلعم کو طنزیہ انداز میں خطاب کر کے کہتے کہ اے وہ شخص جو مدعی ہے کہ اس پر خدا کی طرف سے ہمارے لیے یاد دہانی اتری ہے تم تو ہمیں ایک خبطی معلوم ہوتے ہو کہ ہمیں تو عذاب کی دھمکی سنا رہے ہو اور اپنے لیے فوز و فلاح کے مدعی ہو درآنحالیکہ ہمارے حالات تمہارے اور تمہارے ساتھیوں کے حالات سے ہزار درجہ بہتر ہیں۔ اگر ہم خدا کے مبغوض و مقہور ہیں اور تم خدا کے محبوب و منظور نظر ہو تو ہم کو یہ نعمتیں کیوں ملی ہوئی ہیں اور تم ان سے کیوں محروم ہو؟ یہ صورت حال تو صاف ظاہر کرتی ہے کہ تم ایک خبطی آدمی ہو اور

خبطیوں کی سی باتیں کر رہے ہو اور یہ بھی تمہارا ایک خبط ہی ہے کہ تم مدعی ہو کہ تمہارے پاس فرشتہ آتا ہے۔ اگر فرشتے آتے ہیں اور تم اس دعوے میں سچے ہو تو ان فرشتوں کو تم ہمارے پاس کیوں نہیں لاتے کہ ہم بھی ذرا دیکھیں اور سنیں کہ وہ کیسے ہیں اور کیا کہتے ہیں۔ آخر تمھیں ایسے کیا سرخاب کے پر لگے ہیں کہ وہ تمہارے پاس تو آتے ہیں اور ہمارے پاس نہیں آتے۔

'لَوْمَا تَأْتِيْنَا' میں 'لَوْمَا' ابھارنے، اکسانے یا مطالبہ کرنے کے مفہوم میں ہے یعنی 'کیوں نہیں ایسا کرتے'۔ کلامِ عرب اور قرآن مجید میں اس کی نظیریں موجود ہیں۔

مَا نُنَزِّلُ الْمَلٰٓئِكَةَ اِلَّا بِالْحَقِّ وَمَا كَانُوْٓا اِذًا مُّنْظَرِيْنَ (۸)

یہ مذکورہ بالا مطالبہ کا جواب ہے۔ 'حق' کے معنی یہاں فیصلہ کے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ یہ چاہتا ہے کہ لوگ اپنی عقل اور سمجھ سے کام لیں اور آفاق و انفس میں جو نشانیاں موجود ہیں اور جن کی طرف قرآن توجہ دلا رہا ہے ان پر غور کریں اور ان کی روشنی میں ایمان لائیں۔ ایمان لانے کے لیے فرشتوں کے اتارے جانے کا مطالبہ نہ کریں۔ فرشتے تو ہم لوگوں پر صرف اس وقت بھیجتے ہیں جب لوگ اندھے بہرے بن جاتے اور عذاب کے سوا ان کے لیے کوئی اور چیز باقی رہ ہی نہیں جاتی۔ اس وقت فرشتے خدا کا فیصلہ لے کر آتے ہیں اور وہ قوم نیست و نابود کر دی جاتی ہے اس کے بعد کسی کو مہلت نہیں ملتی۔

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ (۹)

قرآن کی حفاظت کا ذمہ دار خود خدا ہے

یہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو نہایت پر زور الفاظ میں تسکین و تسلی دی گئی ہے کہ اگر یہ لوگ (قریش) اس قرآن عظیم کی قدر نہیں کر رہے ہیں تو تم اس کا غم نہ کرو۔ یہ کتاب تمہاری طرف سے کسی طلب و تمنا کے بغیر ہم ہی نے تم پر اتاری ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔ اگر یہ لوگ اس کو رد کر رہے ہیں تو رد کر دیں، خدا اس کے لیے دوسروں کو کھڑا کر دے گا جو اس کو قبول کریں گے اور اس کی دعوت و حفاظت کی راہ میں کسی قربانی سے بھی دریغ نہیں کریں گے۔ یہی مضمون سورۂ انعام میں یوں بیان ہوا ہے۔ فَاِنْ يَّكْفُرْ بِهَا هٰٓؤُلَآءِ فَقَدْ وَكَّلْنَا بِهَا قَوْمًا لَّيْسُوْا بِهَا بِكٰفِرِيْنَ۔ ۸۹۔ انعام (اگر یہ لوگ اس کا انکار کر دیں تو تم اس کا غم نہ کرو ہم نے اس پر ایسے لوگوں کو مامور کر رکھا ہے جو اس کا انکار کرنے والے نہیں ہیں) مطلب یہ ہے کہ اگر یہ لوگ اس کو قبول کرتے ہیں تو اس میں ان کی اپنی ہی دنیا و آخرت کی سعادت ہے، اور اگر یہ اپنی بد قسمتی اور شامتِ اعمال سے اس کو رد کر دیتے ہیں تو دوسرے اس کے قبول کرنے کے لیے آگے بڑھیں گے۔ چنانچہ جب قریش نے اس کو قبول کرنے سے انکار کیا تو اللہ تعالیٰ نے انصار کے سینے اس کے لیے کھول دیے، انھوں نے اس کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور اس کی حفاظت کی راہ میں کسی قربانی سے بھی دریغ نہیں کیا۔

'اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا' میں حصر و حصر کا جو مضمون پایا جاتا ہے اس سے اس حقیقت کا اظہار مقصود ہے کہ یہ کتاب تم نے ہم سے مانگ کے تو لی نہیں ہے کہ تم پر لوگوں سے اس کو قبول کروانے کی ذمہ داری ہو۔ تم

پر ذمہ داری صرف تبلیغ و دعوت کی ہے، تم اس کو ادا کر دو۔ رہا اس کتاب کی حفاظت اور اس کے قیام و بقا کا مسئلہ تو یہ ہم سے متعلق ہے، اس کی حفاظت اور اس کے قیام و بقا کا انتظام ہم کریں گے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ وعدہ کن کن شکلوں میں پورا فرمایا، تاریخ میں اس سوال کا پورا جواب موجود ہے۔ اس تفصیل میں جانے کا یہاں موقع نہیں ہے۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ فِيْ شِيَعِ الْاَوَّلِيْنَ ٥ وَمَا يَاْتِيْهِمْ مِّنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ٥ كَذٰلِكَ نَسْلُكُهٗ فِيْ قُلُوْبِ الْمُجْرِمِيْنَ ٥ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَقَدْ خَلَتْ سُنَّةُ الْاَوَّلِيْنَ (۱۰-۱۳)

انبیاء کی سرگزشتوں کا حوالہ

تسکین و تسلی کے مضمون کو مزید مؤکد و مبرہن کرنے کے لیے یہ حضرات انبیاء علیہم السلام کی سرگزشتوں کا حوالہ ہے کہ آج اپنی قوم کی طرف سے جو تجربہ تمھیں ہو رہا ہے یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ ہم نے تم سے پہلے بھی جو رسول پچھلی قوموں میں بھیجے انھیں بھی اپنی اپنی قوموں کی طرف سے انہی حالات سے دوچار ہونا پڑا۔ جس طرح آج تمھارا مذاق اڑایا جا رہا ہے اسی طرح تم سے پہلے آنے والے رسولوں کا بھی مذاق اڑایا گیا۔ اللہ کے رسولوں کی دعوت چیز ہی ایسی ہے کہ نافرمانیوں میں ڈوبے ہوئے مجرمین اس کو ٹھنڈے پیٹوں نہیں برداشت کرتے۔ یہ چیز ان کو تیر و نشتر کی طرح چبھتی ہے اور وہ اس کو اگلنے کے لیے زور لگاتے ہیں چنانچہ یہ تمھاری قوم کے لوگ بھی اس پر ایمان نہیں لائیں گے بلکہ وہی روش انھوں نے اختیار کی ہے جو ان کے پیشرووں نے اختیار کی اور لازماً اسی انجام سے بھی دوچار ہوں گے جس سے ان کے پیش رو دوچار ہوئے۔

وَلَوْ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَابًا مِّنَ السَّمَآءِ فَظَلُّوْا فِيْهِ يَعْرُجُوْنَ ٥ لَقَالُوْٓا اِنَّمَا سُكِّرَتْ اَبْصَارُنَا بَلْ نَحْنُ قَوْمٌ مَّسْحُوْرُوْنَ (۱۴-۱۵)

منکرین کے انکار کا اصل سبب

یعنی فرشتوں کا اتارا جانا تو الگ رہا اگر ہم ان کے لیے آسمان میں کوئی دروازہ بھی کھول دیں اور وہ اس میں چڑھنے لگ جائیں جب بھی وہ ایمان نہ لانے کے لیے کوئی نہ کوئی بہانہ پیدا کر ہی لیں گے۔ کہیں گے ہماری نگاہیں خیرہ کر دی گئی ہیں اور ہماری پوری قوم، مردوں اور عورتوں سب پر جادو کر دیا گیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ان کے ایمان نہ لانے کا اصل سبب یہ نہیں ہے کہ ان کی طلب کے مطابق ان کو کوئی معجزہ نہیں دکھایا جا رہا ہے بلکہ اس کا اصل سبب یہ ہے کہ وہ اپنی خواہشات اور اپنے مزعومات میں کوئی تبدیلی قبول کرنے اور استکبار کے سبب سے پیغمبر کی بات سننے کے لیے تیار نہیں ہیں۔

۲- آگے کا مضمون ـــــ آیات ۱۶-۲۵

آفاق و انفس کی نشانیوں کی طرف اشارہ

آگے ان نشانیوں کی طرف توجہ دلائی گئی ہے جو آفاق و انفس اور آسمان و زمین کے گوشہ گوشہ میں پھیلی ہوئی ہیں اور ان باتوں کی تصدیق کرتی ہیں جن کی پیغمبر دعوت دے رہے ہیں۔ مقصد ان نشانیوں کے ذکر سے یہ ہے کہ قدرت کے معجزات کے ہوتے ہوئے کسی نئے معجزے کی ضرورت کہاں باقی رہی، دیکھنے والی آنکھیں اور

سوچنے والے دماغ ہوں تو ایک ایک پتہ معرفت کردگار کا دفتر ہے۔

آیات ۱۶-۲۵

وَلَقَدْ جَعَلْنَا فِي السَّمَاءِ بُرُوجًا وَزَيَّنَّاهَا لِلنَّاظِرِينَ ﴿۱۶﴾ وَحَفِظْنَاهَا
مِنْ كُلِّ شَيْطَانٍ رَّجِيمٍ ﴿۱۷﴾ إِلَّا مَنِ اسْتَرَقَ السَّمْعَ فَأَتْبَعَهُ شِهَابٌ
مُّبِينٌ ﴿۱۸﴾ وَالْأَرْضَ مَدَدْنَاهَا وَأَلْقَيْنَا فِيهَا رَوَاسِيَ وَأَنْبَتْنَا فِيهَا
مِنْ كُلِّ شَيْءٍ مَّوْزُونٍ ﴿۱۹﴾ وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيهَا مَعَايِشَ وَمَنْ لَّسْتُمْ
لَهُ بِرَازِقِينَ ﴿۲۰﴾ وَإِنْ مِّنْ شَيْءٍ إِلَّا عِنْدَنَا خَزَائِنُهُ وَمَا
نُنَزِّلُهُ إِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُومٍ ﴿۲۱﴾ وَأَرْسَلْنَا الرِّيَاحَ لَوَاقِحَ فَأَنْزَلْنَا
مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَأَسْقَيْنَاكُمُوهُ وَمَا أَنْتُمْ لَهُ بِخَازِنِينَ ﴿۲۲﴾ وَإِنَّا
لَنَحْنُ نُحْيِي وَنُمِيتُ وَنَحْنُ الْوَارِثُونَ ﴿۲۳﴾ وَلَقَدْ عَلِمْنَا الْمُسْتَقْدِمِينَ
مِنْكُمْ وَلَقَدْ عَلِمْنَا الْمُسْتَأْخِرِينَ ﴿۲۴﴾ وَإِنَّ رَبَّكَ هُوَ يَحْشُرُهُمْ إِنَّهُ
ع ۲ حَكِيمٌ عَلِيمٌ ﴿۲۵﴾

ترجمۂ آیات ۱۶-۲۵

اور ہم نے آسمان میں برج بنائے اور دیدۂ بینا رکھنے والوں کے لیے اس کو مزین کیا اور ہر شیطانِ مردود کی دراندازی سے اس کو محفوظ کیا۔ اگر کوئی سن گن لینے کے لیے چوری چھپے کان لگاتا ہے تو ایک دمکتا شہاب اس کا تعاقب کرتا ہے۔ ۱۶-۱۸

اور زمین کو ہم نے بچھایا اور ہم نے اس میں پہاڑوں کے لنگر ڈال دیے اور اس میں ہر قسم کی چیزیں تناسب کے ساتھ اگائیں اور ہم نے اس میں تمہاری معیشت کے سامان بھی رکھے اور ان کی معیشت کے بھی جن کو تم روزی نہیں دیتے۔ اور کوئی شے ایسی نہیں ہے جس کے خزانے ہمارے پاس نہ ہوں لیکن ہم اس کو ایک معین اندازے کے ساتھ ہی اتارتے ہیں۔ ۱۹-۲۱

اور ہم ہی ہواؤں کو بار آور بنا کر چلاتے ہیں پھر آسمان سے پانی برساتے اور تم کو اس سے سیراب کرتے ہیں اور یہ تمھارے بس میں نہ تھا کہ تم اس کے ذخیرے جمع کر کے رکھتے۔ ۲۲

اور بے شک یہ ہم ہی ہیں کہ زندہ کرتے اور مارتے ہیں اور ہم ہی سب کے وارث ہیں اور ہم ان کو بھی جانتے ہیں جو تم سے پہلے گزر چکے ہیں اور ان کو بھی جانتے ہیں جو بعد میں آنے والے ہیں اور بے شک تمھارا خداوند ہی ہے جو ان سب کو اکٹھا کرے گا۔ بے شک وہ علیم اور حکیم ہے۔ ۲۳-۲۵

۲۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَلَقَدْ جَعَلْنَا فِي السَّمَآءِ بُرُوْجًا وَّزَيَّنّٰهَا لِلنّٰظِرِيْنَ ۙ وَحَفِظْنٰهَا مِنْ كُلِّ شَيْطٰنٍ رَّجِيْمٍ ۙ اِلَّا مَنِ اسْتَرَقَ السَّمْعَ فَاَتْبَعَهٗ شِهَابٌ مُّبِيْنٌ (۱۶-۱۸)

آسمانی نشانیوں کی طرف اشارہ — **شہاب ثاقب کا کام**

'بروج' کے معنی قلعہ اور محل کے ہیں۔ یہاں اس سے مراد وہ آسمانی قلعے ہیں جو خدا نے آسمانوں میں بنائے ہیں، جن میں اس کے ملائکہ اور کروبیوں کی فوجیں برابر مامور رہتی اور ان حدود اور دائروں کی نگرانی کرتی ہیں جن سے آگے بڑھنے کی اجازت نہ شیاطین انس کو ہے اور نہ شیاطین جن کو اور اگر کوئی شیطان ملاء اعلیٰ کی باتوں کی کچھ سن گن لینے کی کوشش کرتا ہے تو ایک دمکتا شہاب اس کا تعاقب کرتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جس طرح ایک قلعہ کی برجیوں پر مامور سپاہی دشمن کے آدمیوں پر کڑی نگاہ رکھتے ہیں، کسی اجنبی کو اپنے حدود کے اندر لانگنے کا موقع نہیں دیتے، اسی طرح خدا کے مامور ملائکہ ان شیاطین جن کو شہاب ثاقب کا نشانہ بناتے ہیں جو ان کے حدود میں ٹوہ لگانے کے لیے دراندازی کی کوشش کرتے ہیں۔ اس سے ضمناً اس کہانت کی بالکل بنیاد ہی ڈھے جاتی ہے جس کا عہد جاہلیت میں بڑا رواج تھا اور جس کی آڑ میں کاہن لوگ غیب دانی کے دعوے کر کے سادہ لوح عوام کو بے وقوف بناتے تھے۔ قرآن نے یہ واضح کر دیا کہ ملاء اعلیٰ کے دائروں تک شیاطین کو رسائی حاصل نہیں ہے اور اگر وہ چوری چھپے کان لگانے کی کوشش کرتے ہیں تو وہ شہاب کی سنگباری کا ہدف بنتے ہیں۔ اسی پہلو سے یہاں شیطان کی صفت 'رجیم' آئی ہے اس لیے کہ 'رجیم' کے معنی سنگسار کردہ کے ہیں اور لفظ 'کل' اس حقیقت کو ظاہر کر رہا ہے کہ بڑے سے بڑا شیطان بھی بہرحال خدا کے محفوظ کیے ہوئے حدود میں داخل نہیں ہو سکتا۔

جس چیز کو عرفِ عام میں ستاروں کا ٹوٹنا کہتے ہیں موجودہ سائنس اس کی جو توجیہ بھی کرے اس سے قرآن کی بیان کردہ اس حقیقت کی تردید نہیں ہوتی اس لیے کہ سائنس کی رسائی کسی چیز کے صرف ظاہری اسباب و علل ہی تک ہے۔ قدرتِ الٰہی ان شہابوں سے کیا کیا کام لیتی ہے یہ بتانا سائنس کے بس سے باہر ہے۔ اس کو صرف اللہ تعالیٰ ہی بتا سکتا ہے اور اس کی باتوں کو جاننے کا واحد ذریعہ وحی الٰہی اور قرآن ہے۔

یہ مضمون بیان ضمناً آگیا ہے۔ آیت کا اصل مقصود، جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا، آسمان و زمین کی ان نشانیوں کی طرف توجہ دلانا ہے جو اس کائنات کے گوشے گوشے میں پھیلی ہوئی ہیں اور ان میں سے ہر نشانی ان باتوں کی تصدیق کر رہی ہے جن کی قرآن اور پیغمبر خبر دے رہے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جن کے اندر سوچنے سمجھنے کی صلاحیت موجود ہے ان کے لیے تو آسمان بھی نشانیوں سے معمور ہے اور زمین بھی لیکن جن کی آنکھیں بند ہیں وہ ان نشانیوں سے رہنمائی حاصل کرنے کے بجائے معجزوں کے مطالبے کرتے ہیں اور اگر کوئی بڑے سے بڑا معجزہ بھی ان کو دکھا دیا جائے جب بھی، جیسا کہ اوپر اشارہ فرمایا، یہ اندھے ہی بنے رہیں گے۔

نظم کلام کے پہلو سے یہاں خاص توجہ 'وَزَيَّنّٰهَا لِلنّٰظِرِيْنَ' کے ٹکڑے پر ہونی چاہیے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر کسی کی آنکھیں کھلی ہوئی ہوں تو اس کے لیے اس دنیا میں معجزات کی کمی نہیں ہے۔ وہ آسمان کو دیکھے۔ قدرت نے اس کو ستاروں اور سیاروں، چاند اور سورج، شفق اور قوس قزح اور دوسرے بے شمار گوناگوں و بوقلموں عجائب سے کس طرح سنوارا ہے کہ جس طرف بھی نگاہ اٹھتی ہے انسان حیران و ششدر ہو کے رہ جاتا ہے اور پکار اٹھتا ہے کہ 'رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا' کہ یہ کسی کھلنڈرے کا کھیل اور کسی اتفاقی حادثہ کے طور پر ظہور میں آجانے والی چیز نہیں ہے بلکہ یہ ایک حکیم و علیم اور ایک بے پناہ قدرت و حکمت کے مالک کی بنائی ہوئی دنیا ہے۔ اس کی قدرت و حکمت کا یہ لازمی تقاضا ہے کہ وہ اس کو پیدا کر کے یوں ہی چھوڑ نہ دے بلکہ یہ لازم ہے کہ وہ ایک ایسا دن بھی لائے جس میں وہ سب کو اکٹھا کر کے ان کے اعمال نیک و بد کا حساب کرے اور ان کے اعمال کے مطابق ان کو جزا یا سزا دے۔

وَالْاَرْضَ مَدَدْنٰهَا وَاَلْقَيْنَا فِيْهَا رَوَاسِيَ وَاَنْۢبَتْنَا فِيْهَا مِنْ كُلِّ شَيْءٍ مَّوْزُوْنٍ (۱۹)

زمین کی نشانیوں کی طرف اشارہ

آسمان کی نشانیوں کی طرف توجہ دلانے کے بعد یہ زمین کی نشانیوں کی طرف توجہ دلائی کہ جس طرح آسمان خدا کی نشانیوں سے معمور ہے اسی طرح زمین بھی اس کی نشانیوں سے معمور ہے۔ آسمان اوپر شامیانے کی طرح، چمکتے ہوئے قمقموں کے ساتھ، تنا ہوا ہے اور زمین نیچے، اپنی گوناگوں و بوقلموں نباتات کے ساتھ، فرش کی طرح بچھی ہوئی ہے اور یہ خدائے قادر و قیوم ہی کی قدرت و حکمت ہے کہ اس کے اندر اس نے پہاڑوں کے لنگر ڈال دیے ہیں جو اس کے توازن کو برقرار رکھے ہوئے ہیں ورنہ، جیسا کہ دوسرے مقام میں فرمایا ہے، یہ ساری مخلوق سمیت کسی ایک جانب کو لڑھک پڑتی۔

'وَاَنْۢبَتْنَا فِيْهَا مِنْ كُلِّ شَيْءٍ مَّوْزُوْنٍ' سے اس حقیقت کی طرف اشارہ مقصود ہے کہ خدا نے اس

میں جو چیز بھی پیدا کی ہے ایک خاص توازن وتناسب کے ساتھ پیدا کی ہے اور اسی توازن وتناسب کی برکت سے یہ انسان کی رہائش اور تمدن و معیشت کے لیے سازگار ہوئی ہے۔ ورنہ جیسا کہ آگے ارشاد ہوا ہے، خدا کے خزانوں میں کسی چیز کی بھی کمی نہیں تھی، وہ اگر کسی چیز کو بھی اس کی حدِ مطلوب و معین سے متجاوز ہو جانے کے لیے چھوڑ دیتا تو اس زمین کا سارا نظام درہم برہم ہو کے رہ جاتا اور انسانوں کے بجائے اس میں کوئی اور ہی مخلوق آباد ہوتی یا یہ بالکل غیر آباد ہو کے رہ جاتی۔

وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيهَا مَعَايِشَ وَمَنْ لَّسْتُمْ لَهٗ بِرٰزِقِيْنَ (۲۰)

نظامِ ربوبیت کی طرف اشارہ

اس میں زبان کے معروف قاعدے کے مطابق ایک جگہ حرفِ جر کو محذوف کر دیا گیا ہے 'وَمَنْ لَّسْتُمْ' دراصل 'وَلِمَنْ لَّسْتُمْ' ہے۔ آسمان و زمین کی نشانیوں کی طرف توجہ دلانے کے بعد یہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نظامِ ربوبیت کی طرف اشارہ فرمایا ہے کہ اس زمین میں اس نے انسان کے لیے بھی ضرورت کی وہ ساری چیزیں پیدا کی ہیں جن کا وہ اپنی زندگی کے بقا اور اس کی رفاہیت کے لیے محتاج ہے اور ان چیزوں کے لیے بھی زندگی کا سامان کیا ہے جن کے رزق کی کوئی ذمہ داری انسان پر نہیں ہے اگرچہ وہ انسان کے کام آنے والی ہیں اور انسان مختلف پہلوؤں سے ان سے فائدے اٹھاتا ہے۔

وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا عِنْدَنَا خَزَآئِنُهٗ وَمَا نُنَزِّلُهٗٓ اِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ (۲۱)

توازن وتناسب کی طرف اشارہ

یہ جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا، اس توازن وتناسب کی طرف اشارہ ہے جو خالق کائنات کے تمام کاموں میں موجود ہے اور جس کے اوپر ہی اس دنیا کے قیام و بقا کا انحصار ہے۔ خدا کے پاس کسی چیز کی کمی نہیں ہے۔ اس کے پاس ہر چیز کے خزانے موجود ہیں لیکن اس دنیا کا بقا مقتضی ہے کہ ہر چیز ایک تناسب کے ساتھ ظہور میں آئے اس وجہ سے وہ ہر چیز اتنی ہی مقدار میں بھیجتا ہے جتنی مقدار میں اس کا بھیجنا ضروری ہوتا ہے۔ اگر کوئی چیز ذرا اپنی حدِ مطلوب سے زیادہ ہو جاتی ہے، اور یہ زیادتی بھی جب ہوتی ہے خدا ہی کے حکم سے ہوتی ہے، تو اس کے نتیجہ میں اس دنیا میں بڑی بڑی آفتیں برپا ہو جاتی ہیں۔ یہ ساری باتیں اس بات کی دلیل ہیں کہ یہ دنیا نہ تو کسی اتفاقی حادثہ کے طور پر ظہور میں آگئی ہے جیسا کہ ملاحدہ و منکرین سمجھتے ہیں اور نہ یہ مختلف دیویوں اور دیوتاؤں کی بازیگاہ ہے جیسا کہ مشرکین نے سمجھا ہے۔ چنانچہ سورۂ فرقان کی آیت ۲ میں اجزائے کائنات کے اسی تناسب کو 'تقدیر' کے لفظ سے تعبیر فرمایا ہے اور اس تقدیر کو شرک کی نفی اور توحید کی ایک واضح دلیل کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ اس کی تفصیل انشاء اللہ اپنے مقام پر آئے گی۔

وَاَرْسَلْنَا الرِّيٰحَ لَوَاقِحَ فَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَسْقَيْنٰكُمُوْهُ ۚ وَمَآ اَنْتُمْ لَهٗ بِخٰزِنِيْنَ (۲۲)

'لَقَحَ' کے معنی باردار اور حاملہ کرنے کے ہیں۔ اسی سے 'لَاقِحَۃٌ' اور اس کی جمع 'لَوَاقِحُ' ہے 'لَوَاقِح' ان موسمی ہواؤں کو کہتے ہیں جو بادلوں کو باردار کرتی اور بارش کا سبب بنتی ہیں۔

نظامِ ربوبیت کی مزید وضاحت

اوپر اللہ تعالیٰ نے اپنی جس ربوبیت کی طرف اشارہ فرمایا ہے یہ اسی کی مزید وضاحت ہے کہ پانی جو تمہاری

اور تمام جانداروں کی زندگی کا ذریعہ اور تمام اسباب معیشت کو وجود میں لانے کا واسطہ ہے یہ خدا ہی کے حکم اور اسی کی مہربانی سے تمہیں حاصل ہوتا ہے۔ وہی ہے جو موسمی ہوائیں چلاتا ہے جو بادلوں کو جمع اور ان کو بار دار کرتی ہیں جن سے تم سیراب ہوتے ہو۔ یہ تمہارے بس میں نہ تھا کہ تم اس پانی کے ذخیرے جمع کر کے رکھ چھوڑتے اور جب ضرورت پڑتی پانی برسا لیتے۔ یہ خدا ہی کا انتظام اور اسی کی رحمت ہے کہ اس نے تمہارے لیے یہ انتظام کر رکھا ہے۔

وَإِنَّا لَنَحْنُ نُحْيِي وَنُمِيتُ وَنَحْنُ الْوَارِثُونَ (۲۳)

مذکورہ حقائق کا لازمی تقاضا

اوپر جو باتیں ارشاد ہوئی ہیں یہ ان کا لازمی تقاضا واضح فرمایا گیا ہے کہ ہم ہی زندگی بھی بخشتے ہیں اور ہم ہی موت بھی دیتے ہیں اور ہم ہی ہر چیز کے وارث بھی ہیں۔ جس طرح زندگی اور موت میں کسی کو دخل نہیں ہے اسی طرح زمین اور اہل زمین کی وراثت میں بھی کسی کا کوئی حصہ نہیں۔ سب کا مرجع و مولیٰ اللہ ہی ہے۔ اگر کسی نے کسی اور سے کوئی امید باندھ رکھی ہے تو یہ محض وہم ہے جس کی کوئی حقیقت نہیں۔

وَلَقَدْ عَلِمْنَا الْمُسْتَقْدِمِينَ مِنكُمْ وَلَقَدْ عَلِمْنَا الْمُسْتَأْخِرِينَ ۝ وَإِنَّ رَبَّكَ هُوَ يَحْشُرُهُمْ إِنَّهُ حَكِيمٌ عَلِيمٌ (۲۴-۲۵)

یعنی کوئی اس غلط فہمی میں نہ رہے کہ اتنی بے شمار مخلوقات کا حساب کتاب کس کے بس کی بات ہے! فرمایا کہ ہم ہی نے سب کو پیدا کیا اور سب کو روزی دی ہے ہم ان کو بھی جانتے ہیں جو گزر چکے اور ان سے بھی واقف ہیں جو بعد میں آئے یا آئیں گے۔ اللہ ان سب کو اکٹھا کرے گا اور سب کا حساب کرے گا۔ وہ حکیم و علیم ہے۔ اس کے حکیم ہونے کا تقاضا ہے کہ وہ ایک روز جزا و سزا لائے اور اس کے علیم ہونے کے معنی یہ ہیں کہ نہ کوئی اس سے اوجھل ہو سکتا اور نہ وہ کسی کے کسی عمل سے بے خبر ہے۔

۴- آگے کا مضمون ـــــ آیات ۲۶-۴۸

آدم و ابلیس کے ماجرے کا حوالہ

آگے کی آیات میں آدم اور ابلیس کے ابتدائی ماجرے کا حوالہ دیا ہے۔ مقصود اس حوالہ سے اس حقیقت کو واضح کرنا ہے کہ آج جو لوگ ایمان نہیں لا رہے ہیں اور نہایت غرور و تکبر کے ساتھ خدا کے رسول کی تکذیب کر رہے ہیں ان کے کفر اور تکبر کا اصل سبب یہ نہیں ہے کہ رسولوں کی باتوں کی صداقت ثابت کرنے کے لیے دلیلیں موجود نہیں ہیں یا ان کی طلب کے مطابق ان کو معجزے نہیں دکھائے جا رہے ہیں بلکہ یہ ذریات ابلیس کے اس فریب میں آئے ہوئے لوگ ہیں جس کی دھمکی ابلیس نے اس وقت دی تھی جب اس کو آدم کے سجدہ کا حکم ہوا تھا۔ اس وقت اس نے سجدہ سے انکار کرتے ہوئے کہا تھا کہ اگر مجھے مہلت دی جائے تو میں آدم کی ساری ذریت کو گمراہ کر کے چھوڑوں گا، صرف وہی لوگ میرے دام فریب سے بچ سکیں گے جو خدا کے مخلص بندے ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ نے شیطان کو اس کی مہلت دی اور فرمایا کہ جا ان میں سے جو تیرے فریب میں آئیں ان کو تو اپنے

دام فریب میں پھنسا، لیکن میرے مخلص بندوں پر تیرا کوئی زور نہیں چلے گا۔ اس روشنی میں آگے کی آیات تلاوت فرمائیے۔

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَإٍ مَّسْنُوْنٍ (۲۶) وَالْجَآنَّ آیات ۲۶-۴۸
خَلَقْنٰهُ مِنْ قَبْلُ مِنْ نَّارِ السَّمُوْمِ (۲۷) وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ إِنِّيْ
خَالِقٌ بَشَرًا مِّنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَإٍ مَّسْنُوْنٍ (۲۸) فَإِذَا سَوَّيْتُهٗ وَ
نَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِيْنَ (۲۹) فَسَجَدَ الْمَلٰٓئِكَةُ
كُلُّهُمْ أَجْمَعُوْنَ (۳۰) إِلَّآ إِبْلِيْسَ أَبٰٓى أَنْ يَّكُوْنَ مَعَ السّٰجِدِيْنَ (۳۱) قَالَ
يٰٓإِبْلِيْسُ مَا لَكَ أَلَّا تَكُوْنَ مَعَ السّٰجِدِيْنَ (۳۲) قَالَ لَمْ أَكُنْ لِّأَسْجُدَ لِبَشَرٍ
خَلَقْتَهٗ مِنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَإٍ مَّسْنُوْنٍ (۳۳) قَالَ فَاخْرُجْ مِنْهَا
فَإِنَّكَ رَجِيْمٌ (۳۴) وَّإِنَّ عَلَيْكَ اللَّعْنَةَ إِلٰى يَوْمِ الدِّيْنِ (۳۵) قَالَ رَبِّ
فَأَنْظِرْنِيْٓ إِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ (۳۶) قَالَ فَإِنَّكَ مِنَ الْمُنْظَرِيْنَ (۳۷) إِلٰى
يَوْمِ الْوَقْتِ الْمَعْلُوْمِ (۳۸) قَالَ رَبِّ بِمَآ أَغْوَيْتَنِيْ لَأُزَيِّنَنَّ لَهُمْ
فِي الْأَرْضِ وَلَأُغْوِيَنَّهُمْ أَجْمَعِيْنَ (۳۹) إِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِيْنَ (۴۰)
قَالَ هٰذَا صِرَاطٌ عَلَيَّ مُسْتَقِيْمٌ (۴۱) إِنَّ عِبَادِيْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ
سُلْطٰنٌ إِلَّا مَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْغٰوِيْنَ (۴۲) وَإِنَّ جَهَنَّمَ لَمَوْعِدُهُمْ
أَجْمَعِيْنَ (۴۳) لَهَا سَبْعَةُ أَبْوَابٍ لِكُلِّ بَابٍ مِّنْهُمْ جُزْءٌ مَّقْسُوْمٌ (۴۴) ۳ ع ۱۹ ۳
إِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ جَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ (۴۵) أُدْخُلُوْهَا بِسَلٰمٍ اٰمِنِيْنَ (۴۶) وَ
نَزَعْنَا مَا فِيْ صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غِلٍّ إِخْوَانًا عَلٰى سُرُرٍ مُّتَقٰبِلِيْنَ (۴۷)
لَا يَمَسُّهُمْ فِيْهَا نَصَبٌ وَّمَا هُمْ مِّنْهَا بِمُخْرَجِيْنَ (۴۸)

ترجمۂ آیات ۲۶-۴۸

اور بے شک ہم ہی نے انسان کو سڑے ہوئے گارے کی کھنکھناتی ہوئی مٹی سے پیدا کیا اور اس سے پہلے جنوں کو آتش سموم سے پیدا کیا۔ اور یاد کرو جب تیرے رب نے فرشتوں سے کہا کہ میں سڑے ہوئے گارے کی کھنکھناتی ہوئی مٹی سے ایک بشر پیدا کرنے والا ہوں تو جب میں اس کو مکمل کر لوں اور اس میں اپنی روح میں سے پھونک لوں تو تم اس کے لیے سجدے میں گر پڑنا۔ تو تمام فرشتوں نے اس کو سجدہ کیا بجز ابلیس کے۔ اس نے سجدہ کرنے والوں کا ساتھ دینے سے انکار کیا۔ پوچھا، اے ابلیس، تیرا کیا معاملہ ہے کہ تو سجدہ کرنے والوں کا ساتھ نہ دے؟ وہ بولا میں ایک ایسے بشر کو سجدہ کرنے کو تیار نہیں جس کو تو نے سڑے ہوئے گارے کی کھنکھناتی ہوئی مٹی سے پیدا کیا۔ فرمایا، یہ بات ہے تو تو یہاں سے نکل کہ تو راندۂ درگاہ ہوا اور روزِ جزا تک تجھ پر لعنت ہے۔ اس نے کہا اے میرے رب تو مجھے اس دن تک کے لیے مہلت دے دے جس دن لوگ اٹھائے جائیں گے۔ فرمایا، اچھا، روز معین تک مہلت پانے والوں میں سے تو بھی ہے۔ بولا، اے رب، چونکہ تو نے مجھے گمراہ کیا میں زمین میں دنیا کو ان کی نگاہوں میں کھباؤں گا اور ان میں سے تیرے خاص بندوں کے سوا سب کو گمراہ کر کے چھوڑوں گا۔ فرمایا، یہ ایک سیدھی راہ ہے جو مجھ تک پہنچانے والی ہے۔ میرے بندوں پر تیرا کوئی زور نہیں چلے گا۔ بجز ان کے جو گمراہوں میں سے تیرے پیرو بن جائیں اور ان سب کے لیے جہنم ہی موعود ہے۔ اس کے سات دروازے ہیں اور ہر دروازے کے لیے ان کا ایک مخصوص حصہ ہوگا۔ خدا ترس بندے باغوں اور چشموں میں ہوں گے۔ رہو ان میں سلامتی کے ساتھ نچنت ہو کر۔ ان کے سینوں کی کدورتیں ہم نکال دیں گے۔ وہ آمنے سامنے بھائی بھائی کی طرح تختوں پر براجمان ہوں گے۔ اس میں نہ تو ان کو کوئی تکان لاحق ہوگی اور نہ وہ اس سے نکالے ہی جائیں گے۔ ۲۶-۴۸

۵۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ (۲۶)

صلصال کا مفہوم — 'صَلْصَال' خشک مٹی کو کہتے ہیں جو خشک ہو کر کھنکھنانے لگ جائے۔

حماٍ مسنون کا مفہوم — 'حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ' سیاہ اور بودار مٹی کو کہتے ہیں۔

انسان کی خلقت کا آغاز — زمین کے تمام جانداروں کی زندگی کا آغاز پانی اور کیچڑ ہی سے ہوا ہے پھر اللہ تعالیٰ نے ان میں سے جن کے لیے یہ چاہا کہ وہ خشکی میں رہیں بسیں ان کے لیے خشک زمین مہیا فرمائی اور اس خشک زمین میں ان کے اندر کی وہ قوتیں اور صلاحیتیں ابھریں جو اللہ تعالیٰ نے ان کے اندر ودیعت فرمائی تھیں اور جو اپنے نشوونما کے لیے زمین کے مخصوص ماحول کی محتاج تھیں۔ انسان بھی اس کلیہ سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ وہ بھی پانی، کیچڑ اور خشک زمین ہی کی ایک مخلوق ہے۔ البتہ اس کو دوسرے جانداروں کے مقابل میں، جیسا کہ آگے ذکر آ رہا ہے، یہ امتیاز حاصل ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کا تسویہ فرمایا یعنی ان تمام قوتوں اور صلاحیتوں سے اس کو آراستہ کیا جو اس کے مقصد تخلیق کی تکمیل کے لیے ضروری تھیں۔ یہاں یہ امر ملحوظ رہے کہ صرف یہی نہیں فرمایا کہ انسان کو مٹی سے پیدا کیا، جیسا کہ دوسرے مقامات میں ہے، بلکہ اس کے ساتھ 'حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ' کا اضافہ بھی ہے۔ اس سے مقصود زندگی کے نقطۂ آغاز کی طرف اشارہ بھی کرنا ہے اور اس حقیقت کی طرف توجہ دلانا بھی کہ جس کی زندگی کا آغاز ایسے حقیر عنصر سے ہوا ہے اس کے لیے یہ کسی طرح زیبا نہیں کہ وہ اس قادر و قیوم سے اکڑے جس نے اس کو اتنے حقیر عنصر سے پیدا کیا اور پھر اس کو نہایت اعلیٰ صلاحیتوں سے آراستہ کیا۔

وَالْجَآنَّ خَلَقْنٰهُ مِنْ قَبْلُ مِنْ نَّارِ السَّمُوْمِ (۲۷)

'سَمُوْم' لو کی لپٹ اور ہوائے گرم کو کہتے ہیں۔

جنات کی خلقت کا آغاز — انسانوں کی خلقت کے بعد یہ جنوں کی خلقت کا پتہ دیا کہ انسانوں سے پہلے اللہ نے جنوں کو پیدا کیا اور ان کی خلقت آگ کے عنصر لطیف یعنی ہوائے گرم سے ہوئی۔

یہ امر یہاں پیش نظر رہے کہ انسان اور جنات کی خلقت کے بیان کرنے سے قرآن کا مقصود اصلی یہاں ان کے عناصر خلقت کا سراغ دینا نہیں ہے بلکہ اصل مقصود انسان اور ابلیس کی اس بنائے مخاصمت کو واضح کرنا ہے جس کا ذکر آگے کی آیات میں آ رہا ہے۔ ابلیس نے، جو جنوں میں سے تھا، اسی خلقت کو اپنی برتری کی دلیل ٹھہرا کر آدمؑ کو سجدہ کرنے سے انکار کیا جس کے سبب سے وہ ملعون ہوا اور اس کی یہ ملعونیت اس کی اور آدمؑ کی ذریات میں ایک مستقل وجہ عناد و حسد بنی اس وجہ سے قرآن نے اس کا حوالہ دیا ہے۔

وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّيْ خَالِقٌ بَشَرًا مِّنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ ۝ فَاِذَا سَوَّيْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِيْنَ (۲۸ - ۲۹)

اب یہ وہ اصل مضمون بیان ہو رہا ہے جس کی تمہید کے طور پر اوپر والی بات بیان ہوئی ہے۔ ہم آدمؑ و ابلیس کے اس ماجرے پر بقرہ آیات ۳۴-۳۸ اور اعراف آیات ۱۱-۲۵ کے تحت پوری وضاحت کے ساتھ بحث کر چکے ہیں۔ یہاں اس کے اعادے میں طوالت ہوگی۔ البتہ ان امور کی طرف ہم یہاں بھی اشارہ کریں گے جو سلسلۂ کلام کو سمجھنے کے لیے ضروری ہیں۔

انسانی شرف کی بنیاد

ان آیات سے ایک بات تو یہ معلوم ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو آدمؑ کو سجدہ کرنے کا حکم آدمؑ کی تخلیق سے پہلے ہی دے دیا تھا۔ دوسری بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ سجدہ کے اس حکم کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ وضاحت بھی تھی کہ یہ سجدہ اس وقت کیا جائے جب میں آدمؑ کا تسویہ یعنی اس کو تمام قوتوں اور صلاحیتوں سے آراستہ کر لوں اور اس کے اندر اپنی روح پھونک لوں۔ اس سے یہ بات ازخود واضح ہو جاتی ہے کہ انسان کو جو کچھ شرف و فضیلت حاصل ہے وہ تمام تر ان قوتوں اور صلاحیتوں اور اس روح یزدانی کی بدولت ہے جو اس کو ودیعت ہوئی ہیں۔ اگر انسان ان کی حفاظت کرے اور ان کو ترقی دے تو وہ مسجود ملائک ہے اور اگر ان کو برباد کر دے تو پھر وہ نہ صرف ایک حیوان بلکہ حیوانات سے بھی فروتر ہے۔

وَنَفَخْتُ فِيهِ مِن رُّوحِي سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ انسان کے اندر ایک نور یزدانی (DIVINE SPARK) بھی ودیعت ہوا ہے جو اس کے تمام روحانی کمالات کا سرچشمہ ہے اور اسی کے واسطہ سے وہ خدا سے جڑتا ہے بشرطیکہ وہ اس کی پوری پوری حفاظت کرے۔ اگر وہ اس کو ضائع کر دے تو وہ ایک بے چراغ گھر ہے جس کے اندر صرف تاریکی ہی تاریکی ہے۔

فَسَجَدَ الْمَلٰٓئِكَةُ كُلُّهُمْ اَجْمَعُوْنَ ۝ اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ اَبٰٓى اَنْ يَّكُوْنَ مَعَ السّٰجِدِيْنَ (۳۰-۳۱)

آدمؑ و ابلیس کی سرگزشت

تمام فرشتوں اور ان کے حکم میں داخل تمام مخلوقات نے اللہ تعالیٰ کے اس حکم کی تعمیل میں آدمؑ کو سجدہ کیا لیکن ابلیس نے، جو جنات میں سے تھا، اس حکم کی تعمیل سے انکار کیا اور اس انکار کی وجہ، جیسا کہ آگے تفصیل آ رہی ہے، اس نے صرف یہ بتائی کہ وہ آگ سے پیدا ہونے کے سبب سے ایک برتر مخلوق ہے تو ایک بشر کو کس طرح سجدہ کر سکتا ہے جو مٹی سے پیدا ہوا اور اس سے فروتر ہے۔

قَالَ يٰٓاِبْلِيْسُ مَا لَكَ اَلَّا تَكُوْنَ مَعَ السّٰجِدِيْنَ ۝ قَالَ لَمْ اَكُنْ لِّاَسْجُدَ لِبَشَرٍ خَلَقْتَهٗ مِنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ ۝ قَالَ فَاخْرُجْ مِنْهَا فَاِنَّكَ رَجِيْمٌ ۝ وَّاِنَّ عَلَيْكَ اللَّعْنَةَ اِلٰى يَوْمِ الدِّيْنِ (۳۲-۳۵)

یہ حکم ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے فرشتوں اور جنوں کے لیے ایک امتحان تھا جس میں فرشتے کامیاب رہے لیکن ابلیس جو جنوں میں سے تھا، اپنے غرور و تکبر کے سبب سے اس میں ناکام رہا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی اس سرکشی کے جرم میں اس کو ملعون و مردود قرار دے کر وہاں سے نکلنے کا حکم دیا اور فرمایا کہ تیرے اوپر یہ لعنت جزا کے دن تک مسلط رہے گی اور اس کے بعد تو اپنے اس جرم کی سزا بھگتے گا۔

قَالَ رَبِّ فَاَنْظِرْنِىْٓ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ ۝ قَالَ فَاِنَّكَ مِنَ الْمُنْظَرِيْنَ ۝ اِلٰى يَوْمِ الْوَقْتِ الْمَعْلُوْمِ (۳۶-۳۸)

شیطان کی فتنہ سامانیاں

ابلیس اس حکم اخراج اور اس لعنت سے متاثر یا مرعوب ہونے کے بجائے اور زیادہ اکڑ گیا۔ اس نے روزِ قیامت تک کے لیے مہلت مانگی کہ اس کو موقع دیا جائے کہ وہ آدمؑ اور ان کی ذریات کو اپنے فتنوں میں مبتلا کر کے یہ ثابت کر دے کہ یہ اس شرف کے اہل نہیں ہیں جو ان کو بخشا گیا ہے اور ان کو سجدہ نہ کرنے کے معاملے میں وہ بالکل بجانب حق ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی یہ درخواست قبول فرمالی اور قیامت کے روزِ موعود تک کے لیے اس کو یہ مہلت دے دی گئی۔

قَالَ رَبِّ بِمَآ اَغْوَيْتَنِيْ لَاُزَيِّنَنَّ لَهُمْ فِي الْاَرْضِ وَلَاُغْوِيَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ ۝ اِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِيْنَ (۳۹-۴۰)

'اغوا' کے معنی گمراہ کرنے کے ہیں۔ چونکہ ابلیس آدمؑ کو سجدہ نہ کرنے کے معاملے میں اپنے آپ کو بجانب حق خیال کرتا تھا اس وجہ سے اس نے نہایت گستاخانہ انداز میں فعل 'اغوا' کو اللہ تعالیٰ ہی کی طرف منسوب کیا۔ مطلب یہ کہ اگر میں اس حکم کی عدم تعمیل کے باعث گمراہ ٹھہرا تو اس میں میرا قصور نہیں ہے بلکہ یہ حکم ہی ایسا تھا کہ میں اس کی تعمیل نہیں کر سکتا تھا اس وجہ سے اگر میں اس کے سبب سے گمراہ ہوا تو اس پر تو ہی نے مجھے مجبور کیا۔

شیطان کی کوشش کا خاص ہدف

'لَاُزَيِّنَنَّ لَهُمْ فِي الْاَرْضِ' یعنی میں دنیا اور اس کی مرغوبات کو انسان کی نگاہوں میں کھبا دوں گا اور وہ ان کی طمع اور محبت میں اس طرح پھنس جائے گا کہ نہ اسے یہ یاد رہے گا کہ وہ مسجودِ ملائک ہے، نہ اس کو کچھ آخرت کا ہوش رہے گا اور نہ وہ تیری توحید پر قائم رہے گا۔

'وَلَاُغْوِيَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ' یعنی ان کو توحید کی سیدھی راہ سے ہٹا کر شرک کی وادیوں میں بھٹکا دوں گا۔ ابلیس کا یہ قول سورہ اعراف آیت ۱۶-۱۷ میں یوں نقل ہوا ہے۔ قَالَ فَبِمَآ اَغْوَيْتَنِيْ لَاَقْعُدَنَّ لَهُمْ صِرَاطَكَ الْمُسْتَقِيْمَ ۝ ثُمَّ لَاٰتِيَنَّهُمْ مِّنْۢ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ وَمِنْ خَلْفِهِمْ وَعَنْ اَيْمَانِهِمْ وَعَنْ شَمَآئِلِهِمْ ۭ وَلَا تَجِدُ اَكْثَرَهُمْ شٰكِرِيْنَ ۝ (وہ بولا کہ چونکہ تو نے مجھے گمراہ کر دیا اس وجہ سے میں تیری سیدھی راہ پر ان کی گھات میں بیٹھوں گا، پھر ان کے آگے سے، ان کے پیچھے سے اور ان کے دہنے اور ان کے بائیں سے ان پر حملہ کروں گا اور تو ان میں سے اکثر کو اپنا شکرگزار نہ پائے گا) اس سے معلوم ہوا کہ شیطان کے اغوا کا خاص ہدف توحید ہے۔ اس کی ساری فتنہ آرائیاں اس واحد غرض کے لیے ہیں کہ وہ کسی نہ کسی شکل میں آدمؑ کی اولاد کو خدا تک پہنچانے والی سیدھی راہ سے بھٹکا کر شرک کی گمراہی میں پھنسا دے۔

'اِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِيْنَ' یعنی میری ان فتنہ سامانیوں سے تیرے بندوں میں سے اگر کچھ خوش قسمت بچ رہیں گے تو وہی بچ رہ پائیں گے جن کو تو نے اپنی توحید اور یادِ آخرت پر قائم رہنے کے لیے خاص کر لیا ہو۔ باقی سب میرے فتراک ضلالت کے نخچیر ہو کے رہیں گے

قَالَ هٰذَا صِرَاطٌ عَلَيَّ مُسْتَقِيْمٌ (۴۱)

اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ توحید کا راستہ، جس سے بنی آدم کو گمراہ کرنے کی تو دھمکی دے رہا ہے، کوئی کج پیچ والا راستہ نہیں ہے بلکہ یہ مجھ تک پہنچا دینے والی نہایت سیدھی

اور ہموار راہ ہے۔ میرے جو بندے مجھ تک پہنچنا چاہیں گے اگر وہ اس راہ کو اختیار کریں گے تو یہ راہ خود بخود ان کو میرے آستانے پر لا ڈالے گی، اس میں کج روی اور گمراہی کا کوئی اندیشہ نہیں ہے۔ صرف شامت زدہ ہی ہوں گے جو اس سیدھی راہ کو چھوڑ کر کوئی کج پیچ والی راہ اختیار کریں گے۔

یہاں 'صراط' کے بعد 'علیٰ' جو آیا ہے یہ عربی زبان کے مخصوص اسلوب کے مطابق ہے۔ عربی زبان میں کسی سیدھے راستہ کی تعریف کے لیے یہ اسلوب بیان موجود ہے کہ یہ راستہ ایسا سیدھا ہے کہ راہرو کو خود منزل پر لا ڈالتا ہے۔ کلام عرب کے شواہد نقل کرنے میں غیر ضروری طوالت ہوگی اس وجہ سے ہم صرف قرآن کے بعض نظائر پیش کرنے پر اکتفا کرتے ہیں۔ سورۂ ہود میں ہے۔

اِنِّیْ تَوَکَّلْتُ عَلَی اللّٰہِ رَبِّیْ وَرَبِّکُمْ ؕ مَا مِنْ دَآبَّۃٍ اِلَّا ھُوَ اٰخِذٌۢ بِنَاصِیَتِہَا ؕ اِنَّ رَبِّیْ عَلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ (۵۶ - ہود)	میں نے اللہ پر، جو میرا بھی خداوند ہے اور تمہارا بھی ، بھروسہ کیا۔ ہر جاندار کی پیشانی اس کی گرفت میں ہے۔ بے شک میرا رب سیدھی راہ پر ہے۔

'بے شک میرا رب سیدھی راہ پر ہے' یعنی اس کو پانے اور اس تک پہنچنے کے لیے مجھے بہت سی کج پیچ والی وادیاں قطع نہیں کرنی ہیں، اس کے پانے اور اس تک پہنچنے کے لیے یہ کافی ہے کہ میں توحید کی شاہراہ پر قائم و استوار اور اس کی بندگی میں سرگرم رہوں اور اس پر بھروسہ رکھوں کہ وہ ہر مشکل میں میری مدد فرمائے۔

اسی طرح سورہ نحل آیت ۹ میں ہے۔

وَعَلَی اللّٰہِ قَصْدُ السَّبِیْلِ وَمِنْہَا جَآئِرٌ ؕ وَلَوْ شَآءَ لَہَدٰىکُمْ اَجْمَعِیْنَ ؕ	اور اللہ تک پہنچانے والی سیدھی راہ ہے اور بعض راہیں بالکل کج ہیں اور اگر اللہ چاہتا تو تم سب کو ہدایت پر کر دیتا۔

اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَکَ عَلَیْہِمْ سُلْطٰنٌ اِلَّا مَنِ اتَّبَعَکَ مِنَ الْغٰوِیْنَ (۴۲)

ابلیس کی مہلت کی مد

'سُلْطٰنٌ' کے معنی اختیار و اقتدار کے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ابلیس پر یہ بھی واضح فرما دیا کہ تجھے مہلت جو کچھ مل رہی ہے وہ صرف اس بات کی مل رہی ہے کہ تو لوگوں کو اپنی راہ پر چلنے کی ترغیب دے سکے اور ان کو بہکانے اور ورغلانے کی کوشش کرے۔ اس مہلت کے یہ معنی نہیں ہیں کہ تجھے یہ اختیار مل گیا ہے کہ تو جس کو چاہے گمراہی کے راستہ پر ڈال ہی دے۔ تیرا زور بس انہی پر چلے گا جو تیری پیروی کرنا چاہیں گے اور گمراہی کو پسند کریں گے۔ میرے ان بندوں پر تیرا کوئی زور نہیں چلے گا جو تیرے فتنوں سے محفوظ اور تیری تمام ترغیبات کے علی الرغم میری بتائی ہوئی سیدھی راہ پر گامزن رہیں گے۔

وَاِنَّ جَہَنَّمَ لَمَوْعِدُہُمْ اَجْمَعِیْنَ ۙ لَہَا سَبْعَۃُ اَبْوَابٍ ؕ لِکُلِّ بَابٍ مِّنْہُمْ جُزْءٌ مَّقْسُوْمٌ (۴۳-۴۴)

یہ ان لوگوں کا انجام بتایا گیا ہے جو شیطان کی پیروی کریں گے۔ فرمایا کہ ایسے سارے لوگ جو میری صراط مستقیم کو چھوڑ کر ابلیس کی راہ اختیار کریں گے، خواہ وہ جنات میں سے ہوں یا انسانوں میں سے اور خواہ ان کی تعداد کتنی ہی زیادہ کیوں نہ ہو، ان سب کا ٹھکانا جہنم ہوگی۔ ان کو جس عذاب کی آج خبر دی جا رہی ہے اس سے

وہ دوچار ہوں گے۔ لفظ 'اَجْمَعِيْنَ' کے زور کو سمجھنے کے لیے ابلیس کے قول 'لَاُغْوِيَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ' پر نظر رہے۔ ابلیس نے بڑے طنطنہ کے ساتھ دعویٰ کیا کہ 'میں سب کو گمراہ کر کے چھوڑوں گا'۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کو جواب بھی بھرپور ملا کہ اگر تو سب کو گمراہ کر کے چھوڑے گا تو میں بھی ان سب کو جہنم کے حوالے کرنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھوں گا۔

جہنم کی راہ پر ڈالنے والے مہلکات

'لَهَا سَبْعَةُ اَبْوَابٍ' یہ جہنم کی وسعت کی تعبیر ہے اور اگر غور کیجیے تو اس میں ایک لطیف اشارہ اس بات کی طرف بھی ہے کہ وہ مہلکات جو انسان کو تباہ کرنے والے اور اس کو جہنم کی راہ پر ڈالنے والے ہیں اپنی اصل کے اعتبار سے سات ہیں۔ شیطان انہی میں سے کسی ایک میں یا بالآخر ان سب ہی میں مبتلا کر کے انسان کو جہنم کی راہ پر ڈال دیتا ہے۔

نظم کلام کے پہلو سے آیت کا ظاہر مفہوم یہ ہے کہ کوئی اس غلط فہمی میں نہ رہے کہ اتنی بے شمار و بے نہایت مخلوق کو سزا دینے کے لیے ایسی وسیع جہنم کہاں سے مہیا کی جائے گی جو سب کو اپنے اندر سمیٹ لے۔ خدا نے ایسے مجرموں کو سزا دینے کے لیے بڑی وسیع جہنم تیار کر رکھی ہے جس میں سات پھاٹک ہوں گے اور اس کے ہر پھاٹک سے جہنمیوں کے گروہ الگ الگ داخل ہوں گے۔

'جُزْءٌ مَّقْسُوْمٌ' کے الفاظ سے یہ اشارہ نکلتا ہے کہ جہنم کے مختلف دروازوں سے داخل ہونے والوں کے درمیان ایک خاص نوعیت کی درجہ بندی ہوگی۔ اس درجہ بندی کی بنیاد کس چیز پر ہوگی، اس باب میں کوئی قطعی بات کہنا، جب کہ خود قرآن میں اس کی کوئی تصریح نہیں ہے، مشکل ہے۔ لیکن ہمارا ذہن بار بار اس طرف جاتا ہے کہ قرآن نے جن چیزوں کا اصولی مہلکات کی حیثیت سے ذکر کیا ہے وہ اگر شمار کی جائیں تو وہ سات عنوانات کے تحت آتی ہیں اور وہ یہ ہیں۔

۱- شرک
۲- قطع رحم
۳- قتل
۴- زنا
۵- جھوٹی شہادت
۶- کمزوروں پر ظلم
۷- بغی

ان میں سے ہر ایک کے تحت طویل تفصیلات ہیں جن کے ذکر کا یہ محل نہیں ہے۔ ان پر تفصیلی بحث انشاء اللہ سورۂ بنی اسرائیل میں آیات ۲۲-۳۸ کے تحت آئے گی۔

اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ جَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ ۝ اُدْخُلُوْهَا بِسَلٰمٍ اٰمِنِيْنَ ۝ وَنَزَعْنَا مَا فِيْ صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غِلٍّ
اِخْوَانًا عَلٰى سُرُرٍ مُّتَقٰبِلِيْنَ ۝ لَا يَمَسُّهُمْ فِيْهَا نَصَبٌ وَّمَا هُمْ مِّنْهَا بِمُخْرَجِيْنَ (۴۵-۴۸)

خدا ترسوں کا انجامِ نیک

اہل دوزخ کا انجام بیان کرنے کے بعد اب یہ ان لوگوں کا انجام بیان ہو رہا ہے جو خدا سے ڈرنے والے اور اس کے احکام پر عمل کرنے والے ہیں۔ فرمایا کہ وہ باغوں اور چشموں کے درمیان ابدی زندگی کے عیش و آرام میں ہوں گے۔ ان کے لیے خدا کی طرف سے یہ بشارت ہوگی کہ اُدْخُلُوْهَا بِسَلٰمٍ اٰمِنِيْنَ اب ہر قسم کے فکر و اندیشہ سے بالکل بے خوف اور بےخطر ہو کر اس میں رہو اور اپنے رب کی ابدی نعمتوں سے متمتع ہو۔ ان کے دل ایک دوسرے سے بالکل صاف ہوں گے اس وجہ سے وہ بھائیوں کی طرح ایک دوسرے کی طرف رخ کیے ہوئے آمنے سامنے جنت کے تختوں پر فروکش ہوں گے۔ جن لوگوں کے اندر نفسانی کدورتیں ہوتی ہیں اگر وہ کسی مجلس میں مجتمع ہوتے بھی ہیں تو ایک دوسرے سے منہ پھیر کر بیٹھتے ہیں لیکن اللہ سے ڈرنے والوں میں اول تو نفسانی کدورتیں ہوتی ہی نہیں اور اگر تاویل و اجتہاد، رائے و قیاس اور رجحان و ذوق کے کسی اختلاف کے باعث ان کے اندر کوئی شکر رنجی ہوتی بھی ہے تو کشفِ حقیقت کے بعد وہ بھی دور ہو جائے گی اور اللہ تعالیٰ اس کے اثرات سے بھی ان کے دلوں کو پاک کر دے گا اور وہ باہم بالکل شیر و شکر ہو کر ایک دوسرے کے ساتھ گھل مل جائیں گے۔

'لَا يَمَسُّهُمْ فِيْهَا نَصَبٌ' بہتر سے بہتر عیش و آرام کی زندگی بھی کسی کو حاصل ہو لیکن اس میں تجدد و تنوع نہ ہو تو آدمی بجھ کے رہ جاتا ہے۔ جنت میں اہل جنت کو اس صورتِ حال سے سابقہ پیش نہیں آئے گا۔ اس میں ابدی عیش و آرام کی زندگی بھی ہوگی اور ہر لحظہ خدا کی نعمتوں میں ایسی گوناگونی و بوقلمونی ہوگی کہ اہل جنت کی طبیعت کبھی اس سے اچاٹ نہیں ہوگی۔

خلود کی بشارت

'وَمَا هُمْ مِّنْهَا بِمُخْرَجِيْنَ' یہ خلود کی بشارت ہے اور یہ سب سے بڑی بشارت ہے۔ بہتر سے بہتر عیش و آرام کی زندگی بھی حاصل ہو لیکن اس کے ساتھ یہ کھٹکا لگا ہوا ہو کہ یہ عارضی یا فانی ہے تو سارا عیش کرکرا ہو کے رہ جاتا ہے۔ اہل جنت اس کھٹکے سے بالکل محفوظ ہوں گے۔ انھیں عیش و آرام کی جو زندگی حاصل ہوگی اس سے وہ کبھی محروم نہیں کیے جائیں گے۔

۱۰۶- آگے کا مضمون ـــــ آیات ۴۹-۷۹

قریش کے مغروروں کو تنبیہ

آگے پہلے تو ایک مختصر تمہید ہے جس میں یہ حقیقت واضح کی گئی ہے کہ خدا کی ڈھیل سے کسی کو دھوکے میں نہیں پڑنا چاہیے۔ وہ بڑا غفور و رحیم بھی ہے اور بڑا منتقم و قہار بھی۔ پھر قریش کے ان مغروروں کو جو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے فرشتوں کو دکھانے کا مطالبہ کر رہے تھے، متنبہ کیا گیا ہے کہ فرشتوں کا آنا کوئی آسان بازی نہیں ہے۔ وہ جب آتے ہیں تو کسی مہم ہی پر آتے ہیں۔ اس حقیقت کو تاریخ کی روشنی میں واضح کرنے کے لیے قوم لوط کی سرگزشت سنائی گئی ہے جن کی بستیوں پر سے قریش کو اپنے تجارتی سفروں میں آئے دن گزرنے کے مواقع ملتے تھے۔ اس سرگزشت کو سنانے سے مقصود قریش کو آگاہ کرنا ہے کہ اگر فرشتوں کو دیکھنے کا ارمان رکھتے ہو تو اس انجام سے دوچار ہونے کے لیے بھی تیار رہو جو قوم لوط کا ہوا ـــــ اسی روشنی میں آگے کی آیات کی تلاوت کیجیے۔

نبئ عبادي أني أنا الغفور الرحيم ﴿٤٩﴾ وأن عذابي هو العذاب آیات ۴۹-۷۷
الأليم ﴿٥٠﴾ ونبئهم عن ضيف إبراهيم ﴿٥١﴾ إذ دخلوا عليه وقف لازم
فقالوا سلما قال إنا منكم وجلون ﴿٥٢﴾ قالوا لا توجل إنا
نبشرك بغلم عليم ﴿٥٣﴾ قال أبشرتموني على أن مسني الكبر
فبم تبشرون ﴿٥٤﴾ قالوا بشرنك بالحق فلا تكن من القنطين ﴿٥٥﴾
قال ومن يقنط من رحمة ربه إلا الضالون ﴿٥٦﴾ قال فما
خطبكم أيها المرسلون ﴿٥٧﴾ قالوا إنا أرسلنا إلى قوم مجرمين ﴿٥٨﴾
إلا آل لوط إنا لمنجوهم أجمعين ﴿٥٩﴾ إلا امرأته قدرنا
إنها لمن الغبرين ﴿٦٠﴾ فلما جاء آل لوط المرسلون ﴿٦١﴾ قال ع ۴
إنكم قوم منكرون ﴿٦٢﴾ قالوا بل جئنك بما كانوا فيه
يمترون ﴿٦٣﴾ وأتينك بالحق وإنا لصدقون ﴿٦٤﴾ فأسر بأهلك
بقطع من الليل واتبع أدبارهم ولا يلتفت منكم أحد وامضوا
حيث تؤمرون ﴿٦٥﴾ وقضينا إليه ذلك الأمر أن دابر هؤلاء
مقطوع مصبحين ﴿٦٦﴾ وجاء أهل المدينة يستبشرون ﴿٦٧﴾ قال
إن هؤلاء ضيفي فلا تفضحون ﴿٦٨﴾ واتقوا الله ولا تخزون ﴿٦٩﴾
قالوا أولم ننهك عن العلمين ﴿٧٠﴾ قال هؤلاء بناتي إن
كنتم فعلين ﴿٧١﴾ لعمرك إنهم لفي سكرتهم يعمهون ﴿٧٢﴾
فأخذتهم الصيحة مشرقين ﴿٧٣﴾ فجعلنا عاليها سافلها و

أَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ حِجَارَةً مِّن سِجِّيلٍ ﴿٧٤﴾ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ
لِّلْمُتَوَسِّمِينَ ﴿٧٥﴾ وَإِنَّهَا لَبِسَبِيلٍ مُّقِيمٍ ﴿٧٦﴾ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَةً
لِّلْمُؤْمِنِينَ ﴿٧٧﴾

ترجمۂ آیات ۴۹-۷۷

میرے بندوں کو آگاہ کر دو کہ بے شک میں بڑا ہی بخشنے والا مہربان ہوں اور بے شک میرا عذاب بھی بڑا ہی دردناک ہے۔ اور ان کو ابراہیم کے مہمانوں سے متعلق بھی آگاہ کر دو۔ جب وہ اس کے پاس آئے تو انھوں نے سلام کہا۔ اس نے کہا ہم تو آپ لوگوں سے اندیشہ ناک ہیں۔ وہ بولے کہ آپ کوئی اندیشہ نہ کریں، ہم آپ کو ایک ذی علم فرزند کی بشارت دیتے ہیں۔ وہ بولا کہ کیا جب کہ مجھ پر بڑھاپا آ چکا آپ لوگوں نے یہ بشارت دی تو یہ کس بل پر بشارت دے رہے ہیں۔ انھوں نے کہا ہم نے آپ کو ایک امر واقعی کی بشارت دی ہے تو آپ ناامید ہونے والوں میں سے نہ ہوں۔ اس نے کہا کہ اپنے رب کی رحمت سے گمراہوں کے سوا اور کون ناامید ہو سکتا ہے۔ ۴۹-۵۶

اس نے پوچھا اے فرستادو! آپ لوگوں کے سامنے مہم کیا ہے؟ انھوں نے جواب دیا کہ ہم ایک مجرم قوم کی طرف بھیجے گئے ہیں۔ بس آل لوط اس سے مستثنیٰ ہیں، ہم ان سب کو بچا لیں گے بجز اس کی بیوی کے۔ اس کو ہم نے تاک رکھا ہے وہ بے شک پیچھے رہ جانے والوں میں سے ہوگی۔ ۵۷-۶۰

تو فرستادے جب آلِ لوط کے پاس پہنچے اس نے کہا آپ لوگ تو اجنبی معلوم ہوتے ہیں۔ انھوں نے کہا ہم تمھارے پاس وہی چیز لے کر آئے ہیں جس کے باب میں یہ لوگ شک میں پڑے ہوئے تھے۔ اور ہم تمھارے پاس ایک شدنی لے کر آئے ہیں اور ہم بالکل ٹھیک بات کہہ رہے ہیں تو تم راتوں رات اپنے اہل و عیال کے ساتھ یہاں سے نکل جاؤ اور تم ان کے پیچھے پیچھے چلیو

اور تم میں سے کوئی پیچھے مڑ کے بھی نہ دیکھے اور وہیں جاؤ جہاں کے لیے تمہیں حکم ہے اور ہم نے اپنے اس فیصلہ سے اس کو آگاہ کر دیا کہ صبح ہوتے ہی ان لوگوں کی جڑ کٹ کے رہے گی۔ ۶۱-۶۶

اور شہر والے خوش خوش آ پہنچے۔ اس نے کہا کہ یہ لوگ میرے مہمان ہیں تو تم لوگ مجھے رسوا نہ کرو، اللہ سے ڈرو اور مجھے ذلیل نہ کرو۔ وہ بولے کہ کیا ہم نے تم کو دوسروں کی آمد و شد سے روکا نہیں تھا۔ اس نے کہا اگر تم کچھ کرنے ہی پر تلے ہوئے ہو تو یہ میری بیٹیاں موجود ہیں۔ تیری جان کی قسم یہ لوگ اپنی سرمستی میں اندھے ہو رہے ہیں۔ تو دن نکلتے ہی ان کو ہماری ڈانٹ نے آ پکڑا اور ہم نے اس سرزمین کا اوپر کا تختہ نیچے کر دیا اور ان پر سنگِ گل کی بارش کر دی۔ بے شک اس سرگزشت میں بصیرت حاصل کرنے والوں کے لیے بڑی نشانیاں ہیں اور یہ بستی ایک شاہراہ عام پر ہے۔ بے شک اس سرگزشت کے اندر اہلِ ایمان کے لیے بڑی نشانی ہے۔ ۶۷-۷۷

۷۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

نَبِّئْ عِبَادِیْٓ اَنِّیْٓ اَنَا الْغَفُوْرُ الرَّحِیْمُ ۝ وَاَنَّ عَذَابِیْ هُوَ الْعَذَابُ الْاَلِیْمُ (۴۹-۵۰)

اللہ تعالیٰ سے متعلق صحیح تصور

یہ آیات اللہ تعالیٰ سے متعلق صحیح تصور کی وضاحت کرتی ہیں کہ اس کی ڈھیل سے کسی کو اس مغالطے میں نہیں پڑنا چاہیے کہ نیک اور بد دونوں اس کی نظر میں یکساں ہیں۔ وہ بڑا مہربان بھی ہے اور بڑا ہی منتقم اور قہار بھی۔ جو لوگ اس کی سیدھی راہ پر چلتے ہیں ان کے صبر کی آزمائش کے لیے ان کو امتحانات سے گزرنا پڑتا ہے لیکن بالآخر وہی لوگ کامیاب و بامراد ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس جو لوگ اس کی راہ سے انحراف اختیار کرتے ہیں اگرچہ کچھ عرصہ کے لیے ان کو ڈھیل ملتی ہے تاکہ ان پر حجت تمام ہو جائے لیکن بالآخر ان کو ان کے اس انحراف کی سزا مل کے رہتی ہے۔

وَنَبِّئْهُمْ عَنْ ضَیْفِ اِبْرٰهِیْمَ ۝ اِذْ دَخَلُوْا عَلَیْهِ فَقَالُوْا سَلٰمًا ؕ قَالَ اِنَّا مِنْكُمْ وَجِلُوْنَ ۝ قَالُوْا لَا تَوْجَلْ اِنَّا نُبَشِّرُكَ بِغُلٰمٍ عَلِیْمٍ (۵۱-۵۳)

تاریخ کی ایک شہادت

مذکورہ بالا حقیقت کی تائید میں یہ تاریخ کی ایک شہادت پیش کی گئی ہے کہ جو فرشتے حضرت ابراہیمؑ کے پاس ایک ذی علم فرزند کی بشارت لے کر آئے وہی فرشتے قوم لوط کے لیے صاعقۂ عذاب لے کر آئے۔

'قَالَ اِنَّا مِنْكُمْ وَجِلُوْنَ' فرشتوں سے حضرت ابراہیم کا یہ ارشاد اس امر کی دلیل ہے کہ وہ اس حقیقت سے باخبر تھے کہ فرشتوں کا یوں علانیہ آنا کسی مہم ہی کے لیے ہو سکتا ہے اس وجہ سے ان کی اس آمد سے ان کو اندیشہ ہوا اور انھوں نے اپنے اندیشے کا ان کے سامنے اظہار بھی کر دیا۔ قریب ہی قوم لوط موجود تھی اور اس کا اخلاقی فساد اپنی آخری حد کو پہنچ چکا تھا اس وجہ سے فرشتوں کو دیکھ کر حضرت ابراہیم نے یہ محسوس فرما لیا ہو گا کہ معلوم ہوتا ہے کہ قوم لوط کی شامت اب آگئی ہے اور یہ فرشتے ان کی اسی شامت کا پیش خیمہ ہیں۔ فرشتوں نے حضرت ابراہیم کو اطمینان دلایا کہ آپ اپنے باب میں کسی بات کا اندیشہ نہ کریں، جہاں تک آپ کا تعلق ہے ہم آپ کے لیے تو ایک ذی علم فرزند کی بشارت لے کر آئے ہیں۔ فرزند کے لیے 'عَلِيْم' کی صفت کا حوالہ دے کر فرشتوں نے گویا ایک لطیف اشارہ اس بات کی طرف بھی کر دیا کہ وہ فرزند صرف فرزند ہی نہیں ہو گا بلکہ علم نبوت سے بھی سرفراز ہو گا۔ ظاہر ہے کہ اس چیز نے اس بشارت کی قدر و قیمت بہت بڑھا دی۔ بیٹے کے لیے بڑی سے بڑی چیز جس کی حضرت ابراہیم تمنا کر سکتے تھے وہ یہی ہو سکتی تھی کہ وہ نبی ہو۔

قَالَ اَبَشَّرْتُمُوْنِيْ عَلٰٓى اَنْ مَّسَّنِيَ الْكِبَرُ فَبِمَ تُبَشِّرُوْنَ (۵۴)

حضرت ابراہیم کا حسنِ طلب

حضرت ابراہیم ایک ذی علم فرزند کی بشارت سن کر جس قدر خوش ہوئے ہوں گے وہ ظاہر ہے لیکن ظاہری حالات کے اعتبار سے اس بشارت کا ظہور میں آنا چونکہ نہایت مستبعد تھا اس وجہ سے آپ نے چاہا کہ اس کی مزید تصدیق کرا لیں چنانچہ انھوں نے نہایت خوب صورت پیرایہ میں فرمایا کہ کیا یہ بشارت آپ لوگ مجھے اس وقت دے رہے ہیں جب کہ مجھ پر بڑھاپا آچکا ہے تو کس بل پر یہ بشارت دے رہے ہیں؟ مطلب یہ کہ اگر یہ بشارت من جانب اللہ ہے تو اس کی تصریح ہو جائے۔

قَالُوْا بَشَّرْنٰكَ بِالْحَقِّ فَلَا تَكُنْ مِّنَ الْقٰنِطِيْنَ (۵۵)

'حق' کے معنی امر واقعی اور ہو کے رہنے والی بات کے ہیں۔

فرشتوں کی اطمینان دہانی

فرشتوں نے حضرت ابراہیم کو اطمینان دلایا کہ آپ ظاہری حالات کی ناساعدت سے بددل اور مایوس نہ ہوں، ہم نے آپ کو جو بشارت دی ہے ایک امر واقعی کی بشارت دی ہے اور حالات ظاہری خواہ کتنے ہی ناموافق و ناساعد ہوں لیکن یہ بات ہو کے رہے گی۔ فرشتوں کے اس جواب میں یہ بات مضمر ہے کہ یہ بشارت من جانب اللہ ہے اور جو بات من جانب اللہ ہے اس میں حالات کی ساعدت و ناساعدت کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ اللہ تو ہر چیز پر قادر ہے۔

قَالَ وَمَنْ يَّقْنَطُ مِنْ رَّحْمَةِ رَبِّهٖٓ اِلَّا الضَّآلُّوْنَ (۵۶)

حضرت ابراہیم کا شکر گزاری

حضرت ابراہیم کو جب یہ اطمینان ہو گیا کہ یہ بشارت من جانب اللہ ہی ہے تو بے ساختہ ان کی زبان مبارک سے یہ کلمہ نکلا جس سے ان کا وہ جذبۂ شکر و سپاس بھی ظاہر ہو رہا ہے جو اس بشارت کے باب میں اطمینان حاصل ہو جانے کے بعد ان کے اندر پیدا ہوا اور یہ بات بھی ظاہر ہو رہی ہے کہ فرشتوں سے جو سوال انھوں نے کیا

وہ خدا کے فضل و رحمت سے مایوسی کی بنا پر نہیں تھا بلکہ محض ظاہری اسباب کی ناسازگاری کی بنا پر تھا۔ ساتھ ہی یہ حقیقت بھی انھوں نے ظاہر فرما دی کہ مشکل سے مشکل حالات میں بھی جو لوگ خدا کی رحمت سے مایوس ہو جاتے ہیں وہ ایمان سے محروم اور گمراہ ہوتے ہیں۔

قَالَ فَمَا خَطْبُكُمْ اَيُّهَا الْمُرْسَلُوْنَ (۵۷)

لفظ 'خطب' کا غالب استعمال کسی اہم معاملہ اور کسی امر عظیم کے لیے ہوتا ہے۔

نزول ملائکہ کے سبب سے قوم لوط کے بارے میں حضرت ابراہیمؑ کا اندیشہ

حضرت ابراہیمؑ یہ بشارت سن کر اپنے معاملے میں تو مطمئن ہو گئے لیکن ان کے دل میں یہ کھٹک پیدا ہوئی کہ محض ایک فرزند کی ولادت کی خوش خبری پہنچانے کے لیے تو اس طرح فرشتوں کی ایک پوری جماعت کے آنے کی ضرورت نہیں تھی۔ ان کا اس صورت میں آنا تو ضرور کسی اہم مقصد ہی کے لیے ہو سکتا ہے۔ پھر قریب ہی قوم لوط کا اخلاقی فساد اپنی آخری حد کو پہنچ چکا تھا اور ان کے حالات سے حضرت ابراہیمؑ بے خبر نہیں تھے اس وجہ سے ہو سکتا ہے کہ ان کے دل میں یہ خیال بھی گزرا ہو کہ ہو نہ ہو یہ بجلی اسی خرمن فساد پر گرنے والی ہے۔ چنانچہ انھوں نے فرشتوں سے یہ سوال کر ہی دیا کہ فرزند کی ولادت کی خوش خبری تو میں نے سن لی، اب یہ بتائیے کہ اس وقت آپ لوگ کس مہم پر مامور کر کے بھیجے گئے ہیں۔

قَالُوْۤا اِنَّاۤ اُرْسِلْنَاۤ اِلٰى قَوْمٍ مُّجْرِمِيْنَ ۙ اِلَّاۤ اٰلَ لُوْطٍ ؕ اِنَّا لَمُنَجُّوْهُمْ اَجْمَعِيْنَ ۙ اِلَّا امْرَاَتَهٗ قَدَّرْنَاۤ ۙ اِنَّهَا لَمِنَ الْغٰبِرِيْنَ (۵۸ - ۶۰)

فرشتوں کا جواب

فرشتوں نے جواب دیا کہ ہم مجرموں کی ایک قوم کی طرف بھیجے گئے ہیں، اس اسلوب بیان سے دو باتیں ظاہر ہوتی ہیں۔

ایک تو اس سے فرشتوں کے اس غصہ و غضب کا اظہار ہو رہا ہے جو ان کو قوم لوط پر تھا۔ چنانچہ انھوں نے بجائے یہ کہنے کے کہ ہم قوم لوط کی طرف بھیجے گئے یہ کہا کہ ہم مجرموں کی ایک قوم کی طرف بھیجے گئے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے اندر اس قوم کے خلاف اتنی شدید نفرت تھی کہ ان کو اس کا نام لینا بھی گوارا نہیں ہوا۔

دوسری اس سے یہ حقیقت ظاہر ہوتی ہے کہ کسی قوم پر اللہ کا فیصلہ کن عذاب اس وقت آیا کرتا ہے جب آوے کا آوا ہی بگڑ جاتا ہے اور اس پر اخلاقی فساد اس طرح مسلط ہو جاتا ہے کہ ان کے اندر بھلے آدمی یا تو سرے سے رہ ہی نہیں جاتے یا کچھ افراد ہوتے بھی ہیں تو اس فاسد ماحول کے اندر ان کی زندگی اجیرن ہو کے رہ جاتی ہے۔

'اِلَّاۤ اٰلَ لُوْطٍ اِنَّا لَمُنَجُّوْهُمْ اَجْمَعِيْنَ' لفظ 'آل' کے اندر چونکہ اتباع بھی شامل ہوتے ہیں اس وجہ سے بعید نہیں کہ کچھ لوگ حضرت لوطؑ پر ایمان بھی لائے ہوں، فرشتوں نے حضرت ابراہیمؑ کے سامنے حضرت لوطؑ اور ان کے اتباع کے باب میں یہ تصریح اس لیے ضروری سمجھی کہ قوم لوط کے لیے عذاب کا فیصلہ سن کر قدرتی طور پر ان کے دل میں یہ تشویش پیدا ہوئی ہو گی کہ لوطؑ اور ان کے اہل و اتباع کے ساتھ کیا معاملہ ہو گا؟ فرشتوں نے ان کی یہ تشویش دور کرنے کے لیے بتا دیا کہ ہم ان سب کو اس عذاب سے بچا لیں گے۔

قانونِ الٰہی بے لاگ ہوتا ہے

إِلَّا امْرَأَتَهُ قَدَّرْنَا إِنَّهَا لَمِنَ الْغَابِرِينَ - فرشتوں نے اس نجات سے صرف حضرت لوطؑ کی بیوی کو مستثنیٰ رکھا۔ اس کی بابت فرمایا کہ اس کو ہم نے تاک رکھا ہے کہ وہ مبتلائے عذاب ہونے والوں کے ساتھ ہی رہے گی اور اسی عذاب میں مبتلا ہوگی۔ اس تصریح سے یہ حقیقت واضح ہوئی کہ خدا کا قانون بالکل بے لاگ ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ اس کی زد سے پیغمبر کی بیوی بھی محفوظ نہیں رہتی۔ بلکہ لفظ قَدَّرْنَا کے صحیح مفہوم کو پیش نظر رکھیے تو اس سے یہ اشارہ بھی نکلتا ہے کہ پیغمبروں اور نیکوں سے قرابت رکھنے کے باوجود اگر کوئی شخص، خواہ مرد ہو یا عورت، بدی کی راہ اختیار کرے تو وہ خدا کے غضب کا دوسروں کے مقابل میں زیادہ سزاوار ٹھہرتا ہے۔

فَلَمَّا جَاءَ آلَ لُوطٍ الْمُرْسَلُونَ ۝ قَالَ إِنَّكُمْ قَوْمٌ مُنْكَرُونَ (۶۱-۶۲)

حضرت لوطؑ اور فرشتے

حضرت ابراہیم کو بشارت دے کر یہ فرشتے حضرت لوطؑ کے پاس پہنچے۔ حضرت لوطؑ نے ان کو دیکھا تو محسوس کیا کہ یہ لوگ اس علاقے کے تو ہیں نہیں تو آخر یہ کون لوگ ہیں، کہاں سے آئے ہیں اور کس غرض سے آئے ہیں؟ بالآخر انھوں نے فرمایا کہ آپ لوگ تو اجنبی معلوم ہوتے ہیں۔ مطلب یہ کہ آپ لوگوں کو پہچان نہیں رہا ہوں براہ کرم آپ لوگ اپنا تعارف کرائیے۔

قَالُوا بَلْ جِئْنَاكَ بِمَا كَانُوا فِيهِ يَمْتَرُونَ ۝ وَأَتَيْنَاكَ بِالْحَقِّ وَإِنَّا لَصَادِقُونَ (۶۳-۶۴)

فرشتوں نے کہا ہم آدمی نہیں ہیں، جیسا کہ تم نے گمان کیا ہے بلکہ ہم وہ عذاب لے کر آئے ہیں جس سے تم اپنی قوم کے لوگوں کو ڈراتے رہے ہو لیکن وہ برابر شک ہی میں پڑے رہے۔ 'حق' کے معنی یہاں، جیسا کہ آیت ۸ میں گزر چکا ہے، عذاب اور شدنی کے ہیں۔ یہ ظاہر کر دینے کے بعد کہ ہم عذاب لے کر آئے ہیں یہ ظاہر کرنے کی ضرورت باقی نہیں رہی کہ ہم فرشتے ہیں۔ 'وَإِنَّا لَصَادِقُونَ' بطور تنبیہ و توثیق ہے کہ ہمیں بشر سمجھ کر کسی غلط فہمی میں نہ پڑنا۔ ہم جو کچھ کہہ رہے ہیں یہ شدنی ہے تو اب جو ہدایت ہم کر رہے ہیں اس پر بلا تاخیر و تامل عمل کرو۔

فَأَسْرِ بِأَهْلِكَ بِقِطْعٍ مِنَ اللَّيْلِ وَاتَّبِعْ أَدْبَارَهُمْ وَلَا يَلْتَفِتْ مِنْكُمْ أَحَدٌ وَامْضُوا حَيْثُ تُؤْمَرُونَ (۶۵)

یہ وہ ہدایات ہیں جو فرشتوں نے حضرت لوطؑ کو اس موقع پر دیں۔

حضرت لوطؑ کو فرشتوں کی ہدایات

پہلی ہدایت یہ تھی کہ راتوں رات یہاں سے اپنے اہل و عیال سمیت نکل کر وہاں چلے جائیے جہاں کے لیے آپ کو حکم دیا جا رہا ہے۔ اس ہدایت کی وجہ، جیسا کہ آگے تصریح آ رہی ہے، یہ تھی کہ صبح کو اس بستی پر عذابِ الٰہی آ دھمکنے والا تھا۔

دوسری ہدایت یہ تھی کہ آپ ان سب کے پیچھے پیچھے چلیے جس طرح راعی اپنے گلے کے پیچھے چلتا ہے کہ کوئی بھیڑ ریوڑ سے الگ رہ کر بھیڑیے کا شکار نہ ہو جائے۔

تیسری ہدایت یہ تھی کہ بستی سے نکلنے کے بعد تم میں سے کوئی پیچھے مڑ کے بھی نہ دیکھے۔ کسی جگہ سے نکلتے ہوئے اس کی طرف مڑ مڑ کے دیکھنا اس بات کی علامت ہے کہ اس کے ساتھ انس اور لگاؤ ہے۔ یہ انس اور

لگاؤ عام حالات میں تو ایک فطری چیز ہے اور ایک فطری تقاضے کو روکا یا دبایا نہیں جا سکتا لیکن جس بستی کے لیے اتمام حجت کے بعد عذابِ الٰہی کا فیصلہ ہو چکا ہو اس سے نکلتے وقت اہل ایمان کو اس طرح دامن جھاڑ کے اٹھنا چاہیے کہ اس کے ساتھ دل کے لگاؤ کا کوئی شائبہ بھی باقی نہ رہ جائے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق روایات میں آتا ہے کہ جب کبھی آپ کو معذب قوموں کی بستیوں پر سے گزرنے کا اتفاق پیش آتا تو آپ وہاں سے تیزی سے گزر جاتے اور دوسروں کو بھی اسی کی ہدایت فرماتے۔

وَقَضَيْنَآ إِلَيْهِ ذَٰلِكَ ٱلْأَمْرَ أَنَّ دَابِرَ هَٰٓؤُلَآءِ مَقْطُوعٌ مُّصْبِحِينَ (۶۶)

'قَضَيْنَا' کے بعد 'الیٰ' کا صلہ اس بات پر دلیل ہے کہ یہاں 'اَبْلَغْنَا' یا اس کے ہم معنی کوئی لفظ محذوف ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہم نے اس بات کا فیصلہ کر کے اس کو آگاہ کر دیا کہ صبح ہوتے ہی ان لوگوں کی جڑ کاٹ کر رکھ دی جائے گی۔

وَجَآءَ أَهْلُ ٱلْمَدِينَةِ يَسْتَبْشِرُونَ (۶۷)

'مَدِیْنَة' سے مراد یہاں قوم لوط کی بستی سدوم ہے۔ سدوم کے گنڈوں اور بدمعاشوں کو جب پتہ چلا کہ حضرت لوط کے پاس کچھ خوب رو مہمان آئے ہوئے ہیں تو وہ خوش خوش ان کے گھر پہنچے کہ آج خوب شکار ہاتھ آیا ہے، آج جی بھر کے اپنے ارمان نکالیں گے۔

قَالَ إِنَّ هَٰٓؤُلَآءِ ضَيْفِى فَلَا تَفْضَحُونِ ۝ وَٱتَّقُوا۟ ٱللَّهَ وَلَا تُخْزُونِ (۶۸-۶۹)

حضرت لوط کے گھر پر گنڈوں کا حملہ

حضرت لوط نے جب دیکھا کہ گنڈوں نے ان کے گھر پر ہلا بول دیا ہے، ان کی اور ان کے مہمانوں کی عزت و آبرو خطرے میں ہے تو نہایت مؤثر انداز میں ان کو اپنی عزت و آبرو کا بھی واسطہ دیا اور خوفِ خدا کا بھی حوالہ دیا کہ یہ لوگ میرے مہمان ہیں، ان کی عزت و آبرو کی حفاظت مجھ پر اخلاقاً فرض ہے، اگر ان پر تم نے کوئی دست درازی کی تو میں ان کی نگاہوں میں بالکل ذلیل ہو کر رہ جاؤں گا، یہ کہیں گے کہ اچھے کے گھر مہمان اترے کہ اس نے ہمیں گنڈوں اور بدمعاشوں کے حوالہ کر دیا۔ پھر ان کو خوف خدا بھی یاد دلایا کہ اللہ سے ڈرو اور میرے مہمانوں کی بے عزتی کر کے مجھے رسوا نہ کرو کہ میں کہیں منہ دکھانے کے قابل بھی نہ رہ جاؤں ـــــ یہ اپیل، اگر مخاطبوں کے اندر اخلاقی حس کی کوئی رمق باقی ہوتی، نہایت مؤثر ہوتی اس لیے کہ مہمانوں کی عزت برے سے برے لوگوں کے اندر بھی ایک اعلیٰ صفت سمجھی گئی ہے لیکن جن کی اخلاقی حس بالکل مردہ ہو چکی ہو ان پر اس کا کیا اثر ہو سکتا ہے۔

قَالُوٓا۟ أَوَلَمْ نَنْهَكَ عَنِ ٱلْعَٰلَمِينَ (۷۰)

بدمعاشوں کی بہانہ سازی

بدمعاش سے بدمعاش لوگ بھی اپنی بدمعاشی کے لیے کوئی نہ کوئی عذر تلاش کر ہی لیتے ہیں۔ چنانچہ ان گنڈوں نے بھی اپنے اس اقدام کے لیے یہ سیاسی جواز پیدا کیا کہ تم باہر کے لوگوں سے ساز باز رکھتے ہو۔ باہر کے لوگ تمہارے پاس آتے ہیں اور تم ان سے ملتے جلتے ہو۔ تمہاری یہ سازش کسی نہ کسی دن ہمارے لیے خطرہ بن سکتی ہے اس وجہ سے ہم یہ دھوکا کھانے کے لیے تیار نہیں کہ تم مہمانوں کے پردے میں ہمارے لیے ایک دن کوئی مصیبت

لا کھڑی کرو۔

قَالَ هٰٓؤُلَآءِ بَنٰتِیْٓ اِنْ كُنْتُمْ فٰعِلِیْنَ (۷۱)

قوم کی اخلاقی حس بیدار کرنے کی آخری تدبیر

ان بدمعاشوں کی اخلاقی حس کو بیدار کرنے کے لیے یہ حضرت لوطؑ کا آخری حربہ تھا جو انھوں نے استعمال کیا۔ انھوں نے جب دیکھا کہ یہ پاجی لوگ کسی طرح اپنی خباثت سے باز آنے والے نہیں ہیں تو فرمایا کہ یہ میری بیٹیاں ہیں جو کچھ تم کرنا چاہتے ہو ان کے ساتھ کرو لیکن خدارا میرے مہمانوں کے معاملے میں مجھے رسوا نہ کرو۔ سورۂ ہود آیت ۷۸ کے تحت ہم یہ حقیقت واضح کر چکے ہیں کہ یہ حضرت لوطؑ کی طرف سے کوئی پیشکش نہیں تھی بلکہ یہ اپنی قوم کے ضمیر کو جھنجھوڑنے کے لیے ان کی آخری تدبیر تھی۔ اگر ان لوگوں کے اندر اخلاقی حس کی کوئی رمق بھی ہوتی تو وہ سوچ سکتے تھے کہ ایک یہ شخص ہے جو اپنے مہمانوں کی عزت بچانے کے لیے اپنی عزت تک خطرے میں ڈالنے کے لیے تیار ہے اور ایک ہم ہیں کہ اس کی اور اس کے مہمانوں کی عزت کے درپے ہیں۔ یہ بالکل اسی طرح کی بات ہے جس طرح ایک اعلیٰ کردار کا آدمی دوسرے کی جان یا آبرو بچانے کے لیے اپنی جان اور اپنے وقار کو خطرے میں ڈال دینے کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔

لَعَمْرُكَ اِنَّهُمْ لَفِیْ سَكْرَتِهِمْ یَعْمَهُوْنَ (۷۲)

اتمام حجت اور عذاب

جب معاملہ اس حد کو پہنچ گیا کہ حضرت لوطؑ کا یہ آخری حربہ بھی ان بدمستوں پر کارگر نہ ہوا تو اللہ تعالیٰ نے ان کو نہایت پیار کے انداز میں تسلی دی کہ تمھاری جان کی قسم[1] یہ لوگ اپنی بدمستی میں اندھے ہو رہے ہیں۔ مطلب یہ کہ اب یہ راہ پر آنے والے لوگ نہیں ہیں تو تم ان کے پیچھے ہلکان نہ ہو۔ اب خدا کا عذاب ہی ان کا فیصلہ کرے گا۔

فَاَخَذَتْهُمُ الصَّیْحَةُ مُشْرِقِیْنَ (۷۳)

'صَیْحَةٌ' کے معنی ڈانٹ کے ہیں اور یہاں اس سے مراد وہ عذاب الٰہی ہے جو دن نکلتے ہی ان پر آ دھمکا۔ چونکہ یہ عذاب، جیسا کہ آگے تفصیل آ رہی ہے، باد تند کے ساتھ رعد و برق کی صورت میں آیا تھا اس وجہ سے اس کے لیے 'صَیْحَةٌ' کا لفظ نہایت موزوں ہے۔

فَجَعَلْنَا عَالِیَهَا سَافِلَهَا وَاَمْطَرْنَا عَلَیْهِمْ حِجَارَةً مِّنْ سِجِّیْلٍ (۷۴)

عذاب کی نوعیت

یہ اس عذاب کی طرف اجمالی اشارہ ہے جو قوم لوط پر آیا۔ اس عذاب کی نوعیت پر ہمارے استاذ مولانا فراہیؒ نے اپنی تفسیر سورۂ ذاریات میں مفصل بحث فرمائی ہے۔ ہم اس کا ضروری حصہ یہاں نقل کرتے ہیں۔ مولاناؒ کی تفسیر عربی میں ہے ہم اس کا اردو ترجمہ دے رہے ہیں۔

"قوم لوط پر اللہ تعالیٰ نے غبار انگیز ہوا بھیجی جو سخت ہو کر بالآخر حاصب (کنکر پتھر برسانے والی تند ہوا) بن گئی اس سے اول تو ان کے اوپر کنکروں اور پتھروں کی بارش ہوئی پھر اس نے اس قدر شدت اختیار کر لی کہ اس کے زور سے

---

[1] قرآنی قسموں پر استاذ امام مولانا فراہیؒ کا رسالہ اقسام القرآن ملاحظہ فرمائیے۔

ان کے مکانات بھی الٹ گئے، چنانچہ انھیں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا۔ فَمِنْهُمْ مَّنْ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِ حَاصِبًا (ان ہی سے بعض قوموں پر ہم نے کنکر پتھر برسانے والی آندھی بھیجی) نیز فرمایا۔ فَجَعَلْنَا عَالِيَهَا سَافِلَهَا وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ حِجَارَةً مِّنْ سِجِّيْلٍ مَّنْضُوْدٍ ۔ پس ہم نے ان کی بستی کو تلپٹ کر دیا اور ان کے اوپر تہ بہ تہ سنگ گل کے پتھروں کی بارش کی) یعنی ایسی تند ہوا چلی کہ ان کے مکانات اور ان کی چھتیں سب زمین کے برابر ہو گئیں اور اوپر سے کنکریوں اور ریت نے ان کو ڈھانک لیا جیسا کہ فرمایا وَالْمُؤْتَفِكَةَ اَهْوٰى فَغَشّٰهَا مَا غَشّٰى (اور الٹی ہوئی بستیاں جن کو الٹ دیا اور پھر ان کو ڈھانک دیا جس چیز نے ڈھانک دیا)"

تفسیر سورۂ ذاریات فراہیؒ

'سجیل' کی تحقیق

لفظ سِجِّيْل کی تحقیق مولانا فراہیؒ نے سورۂ فیل کی تفسیر میں یہ بیان فرمائی ہے۔

"'سجیل' دو فارسی لفظوں، سنگ (پتھر) اور گل (مٹی) سے معرب ہے۔ قرآن مجید نے دو طریقوں سے اس کی شرح کی ہے۔ ایک جگہ ہے وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ حِجَارَةً مِّنْ سِجِّيْلٍ' یعنی جبیل کے قسم کا کنکر۔ دوسری جگہ ہے حِجَارَةً مِّنْ طِيْنٍ۔ یہ لفظ چونکہ عربی زبان میں شامل ہو چکا تھا اس وجہ سے قرآن نے اس کو استعمال کیا۔"

اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّلْمُتَوَسِّمِيْنَ ۝ وَاِنَّهَا لَبِسَبِيْلٍ مُّقِيْمٍ ۝ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّلْمُؤْمِنِيْنَ (۷۵-۷۷)

'تَوَسُّم' کے معنی بھانپنے تاڑنے اور کسی عبرت انگیز چیز سے درس عبرت حاصل کرنے کے ہیں۔

'سَبِيْلٍ مُّقِيْمٍ' چلتا راستہ، عام گزرگاہ۔

قریش کے لیے درس عبرت

قوم لوط کی سرگزشت سنانے کے بعد اب یہ پہلے کفار قریش کو توجہ دلائی کہ اگر وہ آنکھیں رکھتے ہیں تو ان معذَّب بستیوں سے درس عبرت حاصل کریں جو ان کی نگاہوں سے اوجھل نہیں ہیں بلکہ وہ ایسے چلتے راستہ پر واقع ہیں جن سے آئے دن ان کو گزرنا پڑتا ہے۔ یہ واضح رہے کہ سدوم اور عمورہ کی بستیاں حجاز اور شام کے تجارتی راستہ پر واقع تھیں اور یہ راستہ دونوں ملکوں کے تجارتی قافلوں کی عام گزرگاہ تھا۔

پھر خاص طور پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے والوں کو توجہ دلائی کہ اس سرگزشت میں ان کے لیے بھی بہت بڑی نشانی ہے کہ اہل حق کو اگرچہ امتحانات پیش آتے ہیں لیکن بالآخر وہی خدا کی رحمت کے سزاوار ٹھہرتے ہیں اور ان کے دشمن پامال ہو کے رہتے ہیں۔

۸۔ آگے کا مضمون ____ آیات ۷۸-۹۹

آگے رسولوں کی تکذیب کرنے والی بعض دوسری قوموں کا اجمالی تذکرہ اور ان کی اس تکذیب کے انجام کا بیان ہے پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی ہے کہ تم اپنی دعوت حق پر جمے رہو۔ اگر تمھاری قوم کے لوگوں نے بھی اپنی پیش رو قوموں ہی کی تقلید کی تو ان کا بھی وہی انجام ہونا ہے جو ان کا ہوا اور تم ان کے رویہ سے

بدول نہ ہو بلکہ خوبصورتی سے درگزر کرو۔ انجام کار کی کامیابی تمہارا اور تمہارے ساتھیوں ہی کا حصہ ہے ——
آیات کی تلاوت کیجیے۔

وَإِنْ كَانَ أَصْحٰبُ الْأَيْكَةِ لَظٰلِمِينَ ﴿٧٨﴾ فَانْتَقَمْنَا مِنْهُمْ وَإِنَّهُمَا آیات ۷۸-۹۹ وقف لازم
لَبِإِمَامٍ مُّبِينٍ ﴿٧٩﴾ وَلَقَدْ كَذَّبَ أَصْحٰبُ الْحِجْرِ الْمُرْسَلِينَ ﴿٨٠﴾ ع ۵
وَاٰتَيْنٰهُمْ اٰيٰتِنَا فَكَانُوا عَنْهَا مُعْرِضِينَ ﴿٨١﴾ وَكَانُوا يَنْحِتُونَ
مِنَ الْجِبَالِ بُيُوتًا اٰمِنِينَ ﴿٨٢﴾ فَأَخَذَتْهُمُ الصَّيْحَةُ مُصْبِحِينَ ﴿٨٣﴾
فَمَا أَغْنٰى عَنْهُمْ مَّا كَانُوا يَكْسِبُونَ ﴿٨٤﴾ وَمَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَ
الْأَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا إِلَّا بِالْحَقِّ ۗ وَإِنَّ السَّاعَةَ لَاٰتِيَةٌ فَاصْفَحِ
الصَّفْحَ الْجَمِيلَ ﴿٨٥﴾ إِنَّ رَبَّكَ هُوَ الْخَلّٰقُ الْعَلِيمُ ﴿٨٦﴾ وَلَقَدْ اٰتَيْنٰكَ
سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِي وَالْقُرْاٰنَ الْعَظِيمَ ﴿٨٧﴾ لَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ إِلٰى مَا
مَتَّعْنَا بِهٖ أَزْوَاجًا مِّنْهُمْ وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ
لِلْمُؤْمِنِينَ ﴿٨٨﴾ وَقُلْ إِنِّي أَنَا النَّذِيرُ الْمُبِينُ ﴿٨٩﴾ كَمَا أَنْزَلْنَا عَلَى
الْمُقْتَسِمِينَ ﴿٩٠﴾ الَّذِينَ جَعَلُوا الْقُرْاٰنَ عِضِينَ ﴿٩١﴾ فَوَرَبِّكَ
لَنَسْأَلَنَّهُمْ أَجْمَعِينَ ﴿٩٢﴾ عَمَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿٩٣﴾ فَاصْدَعْ بِمَا الربع
تُؤْمَرُ وَأَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِينَ ﴿٩٤﴾ إِنَّا كَفَيْنٰكَ الْمُسْتَهْزِءِينَ ﴿٩٥﴾
الَّذِينَ يَجْعَلُونَ مَعَ اللّٰهِ إِلٰهًا اٰخَرَ ۚ فَسَوْفَ يَعْلَمُونَ ﴿٩٦﴾ وَلَقَدْ
نَعْلَمُ أَنَّكَ يَضِيقُ صَدْرُكَ بِمَا يَقُولُونَ ﴿٩٧﴾ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ
رَبِّكَ وَكُنْ مِّنَ السّٰجِدِينَ ﴿٩٨﴾ وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَأْتِيَكَ
الْيَقِينُ ﴿٩٩﴾ ع ۶

ترجمۂ آیات ۷۸ - ۹۹

اور بے شک بن والے بھی اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے تھے تو ہم نے ان سے بھی انتقام لیا اور یہ دونوں ہی کھلی شاہراہ پر واقع ہیں؟ اور حجر والوں نے بھی رسولوں کی تکذیب کی اور ہم نے ان کو اپنی نشانیاں دیں تو وہ ان سے روگرداں ہی رہے اور وہ پہاڑوں کو تراش کر چین سے گھر بناتے تھے تو ان کو صبح تڑکے ہماری ڈانٹ نے آ پکڑا تو جو کچھ وہ کرتے رہے تھے ان کے کچھ کام نہ آیا۔ ۷۸ - ۸۴

اور ہم نے آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے غایت کے ساتھ ہی پیدا کیا ہے اور بلاشبہ قیامت شدنی ہے تو ان سے خوبصورتی کے ساتھ درگزر کرو تمھارا رب بڑا ہی پیدا کرنے والا اور علم والا ہے۔ اور ہم نے تم کو سات مثانی اور قرآن عظیم عطا کیے۔ ہم نے ان کے مختلف گروہوں کو جن چیزوں سے بہرہ مند کر رکھا ہے ان کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھو اور نہ ان کی حالت پر غم کرو اور اپنی شفقت کے بازو اہل ایمان پر جھکائے رکھو اور کہہ دو کہ میں تو بس ایک کھلا ہوا ڈرانے والا ہوں۔ اسی طرح ہم نے ان تقسیم کر لینے والوں پر بھی اتارا تھا جنھوں نے قرآن کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے رکھ دیے تو تیرے رب کی قسم ہم ان سب سے ان کے ان اعمال کی بازپرس کریں گے جو یہ کرتے رہے ہیں۔ تو جو کچھ تمھیں حکم ملا ہے اس کو آشکارا طور پر سنا دو اور مشرکوں سے اعراض کرو۔ ہم ان مذاق اڑانے والوں سے، جو اللہ کے ساتھ دوسرے معبود شریک کرتے ہیں، تمھاری طرف سے نمٹنے کے لیے کافی ہیں سو وہ عنقریب جان لیں گے۔ اور ہم کو معلوم ہے کہ جو کچھ وہ کہتے ہیں اس سے تمھارا دل تنگ ہوتا ہے تو تم اپنے رب کی اس کی حمد کے ساتھ تسبیح کرو اور سجدہ کرنے والوں میں سے بنو اور اپنے رب کی عبادت میں لگے رہو یہاں تک کہ امر یقینی تم پر آشکارا ہو جائے۔ ۸۵ - ۹۹

۹- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَاِنْ كَانَ اَصْحٰبُ الْاَيْكَةِ لَظٰلِمِيْنَ (۷۸)

'اَصْحٰبُ الْاَيْكَةِ' سے مراد

'اَصْحٰبُ الایکۃ' سے مراد اصحاب مدین ہیں جن کی طرف حضرت شعیب علیہ السلام رسول بنا کر بھیجے گئے تھے۔ 'ایکہ' کے معنی جھاڑی اور بن کے ہیں۔ مدین کے پاس ایک بہت بڑا بن بھی تھا اس وجہ سے یہ لوگ اس نام سے بھی معروف تھے۔ اس سورہ میں چونکہ قریش کو عذاب الٰہی کے ان زمینی نشانات کی طرف توجہ دلائی جا رہی ہے جن پر سے ان کو اپنے تجارتی سفروں میں برابر گزرنے کے مواقع ملتے تھے اس وجہ سے معذب قوموں کا ذکر مقامات اور ارضی نشانات کی نسبت کے ساتھ ہی آیا ہے۔

'ظٰلِمِیْنَ' سے یہاں ان کے شرک و کفر اور صراط مستقیم سے انحراف کی طرف اشارہ ہے۔ قرآن کی اصطلاح میں سب سے بڑا ظلم شرک ہے۔ جو لوگ اس ظلم میں مبتلا ہوتے ہیں وہ خدا کے سب سے بڑے حق (توحید) سے بھی انکار کرتے ہیں اور خود اپنی جانوں پر بھی ظلم ڈھاتے ہیں اور بالآخر اس انجام سے دوچار ہوتے ہیں جو اس ظلم کی پاداش میں قدرت کی طرف سے ان کے لیے ظاہر ہوتا ہے۔

فَانْتَقَمْنَا مِنْهُمْ وَاِنَّهُمَا لَبِاِمَامٍ مُّبِيْنٍ (۷۹)

'اِنْتِقَام' سے مراد یہاں وہ پاداش عمل ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اتمام حجت کے بعد ان کے لیے ظاہر ہوئی۔ 'وَاِنَّهُمَا' میں مثنیٰ کی ضمیر سے اصحاب الایکہ کے ساتھ قوم لوط کی بستی کی طرف بھی اشارہ کر دیا جس کا ذکر اوپر گزر چکا ہے کہ ان دونوں ہی بستیوں کے آثار و نشانات ڈھکے چھپے نہیں ہیں بلکہ ایک کھلی شاہراہ پر واقع ہیں جس سے اہل عرب کے قافلوں کو آئے دن گزرنے کے مواقع ملتے رہتے ہیں 'اِمَامٍ مُّبِیْنٍ' کا مفہوم بالکل وہی ہے جو اوپر 'سَبِیْلٍ مُّقِیْمٍ' کا بیان ہو چکا ہے۔ کھلی شاہراہ، عام گزرگاہ، چلتا راستہ۔ راستہ چونکہ رہنما ہوتا ہے اس وجہ سے اس کے لیے 'امام' کا لفظ بھی استعمال ہوتا ہے۔

وَلَقَدْ كَذَّبَ اَصْحٰبُ الْحِجْرِ الْمُرْسَلِيْنَ (۸۰)

'اَصْحٰبُ الْحِجْرِ' سے مراد

'حِجْر' شمالی عرب اور شام کے درمیانی علاقہ کو کہتے ہیں۔ یہ علاقہ قوم ثمود کا مسکن تھا جن کے اندر حضرت صالح علیہ السلام کی بعثت ہوئی۔ اوپر ہم یہ اشارہ کر چکے ہیں کہ اس سورہ میں قریش کو معذب اقوام کے ان آثار و نشانات کی طرف توجہ دلائی جا رہی ہے جن پر سے ان کو برابر گزرنے کے مواقع ملتے رہتے تھے۔ اسی وجہ سے قوم ثمود کا ذکر بھی ان کے مسکن کی نسبت کے ساتھ ہوا۔ سرزمین لوط، سرزمین شعیبؑ اور علاقہ حجر یہ تینوں خطے باہم متصل ہیں اور عرب قافلوں کی یہ عام گزرگاہ تھے۔

ایک سوال اور اس کا جواب

ممکن ہے یہاں کسی کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہو کہ قوم ثمود نے تکذیب تو صرف حضرت صالح علیہ السلام کی کی تھی تو لفظ 'مُرْسَلِیْنَ' جمع کیوں استعمال ہوا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس سے ان کے جرم کی شدت اور

سنگینی ظاہر ہو رہی ہے۔ خدا نے جتنے رسول بھیجے سب کی دعوت ایک اور سب کا پیغام واحد رہا ہے۔ اس وجہ سے جس نے ان رسولوں میں سے کسی ایک کی بھی تکذیب کر دی اس نے گویا سب کی تکذیب کر دی۔

وَاٰتَیْنٰهُمْ اٰیٰتِنَا فَكَانُوْا عَنْهَا مُعْرِضِیْنَ (۸۱)

'آیات' سے مراد

'آیات' سے مراد عقلی و فطری دلائل بھی ہیں اور حسی معجزات بھی۔ حسی معجزات میں سے ناقۂ ثمود کا ذکر تو خود قرآن میں آیا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس کے علاوہ بھی ان کو معجزے دکھائے گئے ہوں لیکن قرآن نے ان کی تفصیل بیان کرنے کے بجائے صرف ان کی طرف اشارہ کر دیا ہے، اس لیے کہ یہاں مقصود صرف یہ ظاہر کرنا ہے کہ یہ سارے دلائل و معجزات ان پر بے اثر ہی رہے۔

وَكَانُوْا یَنْحِتُوْنَ مِنَ الْجِبَالِ بُیُوْتًا اٰمِنِیْنَ (۸۲)

قوم ثمود کی تعمیری سرگرمیاں

یعنی پیغمبر کے انذار سے کان بند کیے ہوئے بے خوف اور بے فکر ہو کر اپنی تعمیری سرگرمیوں میں منہمک رہے۔ ان کو سنگ تراشی کے فن میں کمال حاصل تھا۔ پہاڑوں کو تراش کر ان کے اندر نہایت مستحکم اور شاندار مکانات بناتے تھے اور اپنے اس فن پر ان کو بڑا ناز اور فخر تھا۔ بھلا ان لوگوں کے دل پر پیغمبر کے اس ڈراوے کا کیا اثر پڑ سکتا تھا کہ یہی مستحکم اور شاندار مکانات اگر عذاب الٰہی آگیا تو ان کے لیے قبروں کی صورت میں تبدیل ہو سکتے ہیں۔

فَاَخَذَتْهُمُ الصَّیْحَةُ مُصْبِحِیْنَ ۝ فَمَاۤ اَغْنٰی عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا یَكْسِبُوْنَ (۸۳-۸۴)

قوم ثمود کے عذاب کی نوعیت

یعنی بالآخر وہی ہوا جس سے پیغمبر نے ان کو ڈرایا تھا یعنی ایک دن عذاب الٰہی ان پر آ دھمکا اور اس نے اس طرح ان کی بستی کو تہ و بالا کر دیا کہ ان کے سارے کیے کرائے پر پانی پھر گیا، ان کی صناعی اور کاریگری اور ان کے سارے اسباب و وسائل میں سے کوئی چیز بھی ان کے کام نہ آسکی۔ ان پر نازل ہونے والے عذاب کو یہاں 'صَیْحَةٌ' سے تعبیر فرمایا ہے جس کے معنی ڈانٹ اور چیخ کے ہیں۔ اس کی وجہ، جیسا کہ ہم اوپر بھی اشارہ کر آئے ہیں، یہ ہے کہ ثمود پر اللہ تعالیٰ نے دھاریوں والے بادل بھیجے جن کے اندر ان کے لیے ہولناک کڑک اور بہرا کر دینے والی چیخ بھی تھی۔

وَمَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَیْنَهُمَاۤ اِلَّا بِالْحَقِّ ؕ وَاِنَّ السَّاعَةَ لَاٰتِیَةٌ فَاصْفَحِ الصَّفْحَ الْجَمِیْلَ (۸۵)

خاتمۂ سورہ اور پیغمبرؐ کو تسلی

اب یہاں سے براہ راست پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف خطاب التفات ہے اور اس کی حیثیت خاتمۂ سورہ کی ہے جس نے سورہ کے تمام مطالب اپنے اندر سمیٹ لیے ہیں۔ آپؐ کو مخاطب کر کے صبر و استقامت اور مخالفوں کی مخالفت سے خوب صورتی کے ساتھ درگزر کرنے کی تلقین فرمائی جا رہی ہے۔ تمہید کلام یوں ہے کہ ہم نے آسمانوں اور زمین اور ان کے درمیان کی چیزوں کو جو پیدا کیا تو یوں ہی بے مقصد، عبث اور بے غایت نہیں پیدا کیا ہے بلکہ غایت و مقصد کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ یہ دنیا کوئی بازیچۂ اطفال نہیں ہے کہ لوگ اس میں جو چاہیں کرتے پھریں اور ان سے کوئی بازپرس نہ ہو۔ اس کے باغایت اور بامقصد ہونے کا یہ لازمی تقاضا ہے

کہ ایک ایسا دن آئے جس میں لوگوں سے باز پرس ہو۔ جنھوں نے اس میں نیک کام کیے ہوں وہ اپنی نیکیوں کا صلہ پائیں اور جنھوں نے اس کو ایک بازیچۂ اطفال سمجھ کر اس میں صرف اپنے ہوائے نفس کی پیروی کی ہو وہ اس کی سزا بھگتیں۔ چنانچہ قیامت شدنی ہے وہ آکے رہے گی اور اس دن یہ لوگ جو تمھاری مخالفت میں آج ایڑی چوٹی کا زور صرف کر رہے ہیں اپنا انجام دیکھ لیں گے تو ان کی مخالفتوں اور شرارتوں سے خوبصورتی کے ساتھ درگزر کرو۔ خوبصورتی کے ساتھ درگزر کا مطلب یہ ہے کہ نہ ان کی شرارتوں سے بددل اور مایوس ہو، نہ ان کی بیہودہ باتوں کا جواب دو اور نہ اپنے فرض دعوت و تبلیغ سے دست کش ہو بلکہ اپنے کام میں لگے رہو اور ان کے معاملے کو اللہ پر چھوڑ دو۔ اگر یہ اپنی روش سے باز نہ آئے تو یہ بھی اسی انجام سے دوچار ہوں گے جس سے رسولوں کی تکذیب کرنے والی ان کی پیشرو قومیں ہو چکی ہیں۔

اِنَّ رَبَّكَ هُوَ الْخَلّٰقُ الْعَلِيْمُ (۸۶)

یہ دلیل ہے اس بات کی جو اوپر والی آیت میں ارشاد ہوئی ہے کہ قیامت آکے رہے گی۔ فرمایا کہ تمھارا خداوند خلاق بھی ہے اور علیم بھی۔ جس نے یہ ساری دنیا پیدا کی ہے اور برابر پیدا کر رہا ہے اس کے لیے لوگوں کو ان کے مرنے کے بعد از سر نو پیدا کر دینا کچھ مشکل نہیں۔ اور وہ علیم بھی ہے، ہر ایک کے ایک ایک قول و فعل سے اچھی طرح باخبر، تو اس کے لیے لوگوں کے اقوال و اعمال کا مواخذہ و محاسبہ بھی کچھ دشوار نہیں۔ یہ امر بھی یہاں ملحوظ رہے کہ جو خالق ہے لازم ہے کہ وہ اپنی خلق سے پوری طرح باخبر بھی ہو اَلَا يَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ یعنی کیا وہ جس نے سب کو پیدا کیا ان سے بے خبر ہو سکتا ہے۔

وَلَقَدْ اٰتَيْنٰكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِيْ وَالْقُرْاٰنَ الْعَظِيْمَ (۸۷)

پیغمبرؐ کے لیے سرمایۂ تسکین و تسلی

صبر و استقامت اور درگزر کی تلقین کے بعد یہ اس دولت گراں مایہ اور اس نعمت عظمیٰ کا حوالہ دیا گیا ہے جو تمام مشکلات و مصائب میں پیغمبر کے لیے سرمایۂ تسکین و تسلی اور آخر کار اس کی کامیابی و فتحمندی کی ضامن ہے۔ فرمایا کہ ہم نے تمھیں سات مثانی اور قرآن عظیم عطا کیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس روحانی و ملکوتی لشکر کے رکھتے ہوئے تم اپنے دشمنوں اور مخالفوں کے مقابلے کے لیے اب کسی اور چیز کے محتاج نہیں رہے جس خدا نے اس قرآن عظیم کی ذمہ داری تم پر ڈالی ہے اس کی طرف سے یہ عہد ہے کہ وہ تم کو ضرور فتحمند کرے گا۔ اِنَّ الَّذِيْ فَرَضَ عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ لَرَآدُّكَ اِلٰى مَعَادٍ۔

'سبع مثانی' سے کیا مراد ہے؟

یہاں ایک اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ 'سبع مثانی' سے کیا مراد ہے؟ اس سوال کے جواب میں سلف سے مختلف اقوال منقول ہیں۔

ایک قول یہ ہے کہ اس سے قرآن کی ابتدائی سات بڑی سورتیں مراد ہیں۔

دوسرا قول یہ ہے کہ اس سے مراد سورۂ فاتحہ ہے جس کے اندر بسم اللہ سمیت سات آیتیں ہیں اور یہ نمازوں میں بار بار دہرائی جاتی ہیں۔

تیسرا قول یہ ہے کہ اس سے پورا قرآن مراد ہے۔

اقوال تو بعض اور بھی ہیں لیکن قابل ذکر یہی تین قول ہیں اور ان میں سے بھی زیادہ شہرت دوسرے قول کو حاصل ہوئی۔ پہلے قول کی تائید میں اس کے قائلوں کی طرف سے کوئی دلیل میری نظر سے نہیں گزری۔ دوسرے قول کی تائید میں اس کے قائلوں کی طرف سے واحد دلیل جو دی گئی ہے وہ یہ ہے کہ یہ سورہ نمازوں میں بار بار دہرائی جاتی ہے۔ اگرچہ اس امر واقعی سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ یہ سورہ نمازوں میں بار بار دہرائی جاتی ہے لیکن دو باتوں کے سبب سے اس قول پر دل نہیں جمتا۔

اول یہ کہ سورہ فاتحہ کی آیتیں سات اسی صورت میں بنتی ہیں جب بسم اللہ کو بھی اس کا ایک جزو تسلیم کیا جائے۔ بسم اللہ کا جزو فاتحہ ہونا ایک امر نزاعی ہے اور قوی بات یہی معلوم ہوتی ہے کہ بسم اللہ اس سورہ کے آغاز میں بھی اسی طرح ہے جس طرح دوسری سورتوں کے آغاز میں ہے۔ اس کے فاتحہ کے ایک جزو ہونے کی کوئی خاص وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔

دوسری یہ کہ بار بار دہرائے جانے کی دلیل اسی صورت میں دلیل بنتی ہے جب 'مثانی' کے معنی بار بار دہرائی جانے والی چیز کے ہوں۔ ظاہر ہے کہ 'مثانی' 'مثنیٰ' کی جمع ہے۔ 'مثنیٰ' بار بار دہرائی جانے والی چیز کو نہیں کہتے بلکہ اس چیز کو کہتے ہیں جو دو دو کرکے ہو۔ قرآن میں یہ لفظ کئی جگہ استعمال ہوا ہے اور ہر جگہ اس کے معنی یہی ہیں۔ مثلاً

فَانْكِحُوا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ (نساء - ۳)	تو نکاح کرو اپنی پسندیدہ عورتوں میں سے دو دو، تین تین اور چار چار کرکے۔
اَنْ تَقُوْمُوْا لِلّٰهِ مَثْنٰى وَفُرَادٰى ثُمَّ تَتَفَكَّرُوْا (سبا - ۴۶)	یہ کہ اٹھو اللہ کے لیے دو دو کرکے اور ایک ایک کرکے پھر غور کرو۔

تیسرے قول کو اگرچہ کچھ زیادہ شہرت حاصل نہیں ہوئی لیکن دلائل کی روشنی میں یہ قول ہم کو زیادہ وزن دار معلوم ہوتا ہے۔

سب سے بڑی دلیل تو اس کے حق میں یہ ہے کہ قرآن میں خود یہ تصریح موجود ہے کہ پورا قرآن 'مثانی' ہے۔

اَللّٰهُ نَزَّلَ اَحْسَنَ الْحَدِيْثِ كِتٰبًا مُّتَشَابِهًا مَّثَانِيَ (زمر - ۲۳)	اللہ نے بہترین کلام اتارا ہے ایک متشابہ مثانی کتاب کی صورت میں۔

'متشابہ' سے مراد ظاہر ہے کہ اس کے تمام اجزا کا باہم ہم آہنگ اور ہم رنگ ہونا ہے۔ یعنی اس میں کہیں کوئی تضاد و تناقض نہیں پایا جاتا۔

رہا یہ سوال کہ اس کے 'مثانی' ہونے کا کیا مفہوم ہے تو اس کا صحیح جواب ہمارے نزدیک وہی ہے جس کی طرف ہم اس کتاب کے مقدمہ میں اشارہ کر آئے ہیں کہ قرآن کی تمام سورتیں جوڑا جوڑا ہیں۔ ہر سورہ اپنے ساتھ

اپنا ایک شئی بھی رکھتی ہے۔ ہم نے بڑی سورتوں میں سے بقرہ اور آلِ عمران کو اور چھوٹی سورتوں میں معوذتین کو اس کی مثال میں پیش کیا ہے اور اپنی اس کتاب میں سورتوں کی تفسیر کرتے ہوئے ہم اس حقیقت کو برابر واضح کرتے آ رہے ہیں۔

قرآن میں سورتوں کے سات گروپ

ہم نے مقدمہ میں نہایت تفصیل کے ساتھ یہ بھی واضح کیا ہے کہ قرآن میں سورتوں کی ترتیب اس طرح ہے کہ ان کے الگ الگ سات گروپ یا سات مجموعے بن گئے ہیں۔ ہر گروپ ایک یا ایک سے زیادہ مکی سورتوں سے شروع ہوتا ہے اور ایک یا ایک سے زیادہ مدنی سورتوں پر تمام ہوتا ہے۔ اس طرح قرآن گویا سات ابواب پر مشتمل ہے جن کے اندر سورتوں کی حیثیت فصلوں کی ہے۔ ان ابواب اور ان فصلوں میں مضامین مشترک بھی ہیں اور ہر باب اور ہر فصل کا ایک خاص امتیازی پہلو بھی ہے جو ان کو ایک دوسرے سے ممیز کرتا ہے۔ سورۂ فاتحہ کی حیثیت پورے قرآن کے دیباچہ کی ہے جس میں اجمال کے ساتھ وہ تمام مطالب آ گئے ہیں جو پورے قرآن میں تفصیل کے ساتھ بیان ہوئے ہیں۔

اس روشنی میں زیر بحث آیت کی تاویل ہمارے نزدیک یہ ہے کہ ہم نے تمھیں سات مثانی کا مجموعہ یعنی قرآن عظیم دیا۔ گویا حرف 'من' اضافت کو ظاہر کر رہا ہے اور حرف 'و' تفسیر کے لیے ہے۔ یہ ساتوں مجموعے احقاق حق اور ابطال باطل کے ساتھ خدائی لشکر ہیں جو تمام باطل نظریات کے پرخچے اڑا دینے کے لیے کافی ہیں۔

بعض احادیث میں یہ جو آیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سورۂ فاتحہ کو سبع مثانی اور قرآن عظیم قرار دیا تو اس کا بھی ایک خاص محل ہے۔ ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے کہ سورۂ فاتحہ کی حیثیت پورے قرآن کے دیباچہ کی ہے اور اس میں وہ تمام مطالب بالاجمال سمٹ آئے ہیں جو پورے قرآن میں تفصیل سے بیان ہوئے ہیں۔ گویا اس نگینہ کے اندر قرآن عظیم کا پورا شہرستانِ معانی بند ہے۔ اس پہلو سے یہ سبع مثانی بھی ہے اور قرآن عظیم بھی۔

لَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ إِلَىٰ مَا مَتَّعْنَا بِهِ أَزْوَاجًا مِّنْهُمْ وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِلْمُؤْمِنِينَ (۸۸)

لفظ 'ازواج' کا مفہوم

لفظ 'ازواج' طبقات کے معنی میں بھی آتا ہے۔ مثلاً سورۂ واقعہ میں ہے 'وَكُنتُمْ أَزْوَاجًا ثَلَاثَةً' (اور اس وقت تم تین طبقات میں تقسیم ہو گے)۔

قوم کے اغنیاء کو چھوڑ کر مومنین پر شفقت کا حکم

آیت کا مطلب یہ ہے کہ جب خدا نے تمھیں قرآن کی یہ نعمت عظمیٰ دے رکھی ہے جو تمھاری کامیابی و فتح مندی کی ضامن ہے تو تمھیں ان لوگوں کی طرف نگاہ اٹھانے کی ضرورت نہیں ہے جو اپنے مال و اسباب کے غرور میں مست ہیں اور تمھاری بات سننے اور سمجھنے کے لیے تیار نہیں۔

یہ حقیقت یہاں پیش نظر ہے کہ حضرات انبیاء علیہم السلام کو اپنی قوم کے اغنیاء اور ارباب ثروت و جاہ کی طرف خاص طور پر دعوت کے ابتدائی دور میں، جو توجہ ہوتی ہے تو اس کا سبب نعوذ باللہ یہ نہیں تھا کہ ان کی نگاہوں میں ان کے مال و متاع کی کوئی طمع یا وقعت تھی بلکہ اس کا سبب محض یہ تھا کہ اگر یہ زور و زر رکھنے والے

لوگ ایمان لائیں گے تو اپنی دنیا اور عاقبت بھی سنواریں گے اور ان کا مال اور ان کا اثر دین کی تقویت اور اس کے زیردستوں کے لیے دین کی راہ کھولنے کا بھی ذریعہ ہوگا۔ اسی جذبۂ خیر سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی دعوت کے ابتدائی دور میں قریش کے اکابر و اعیان کی طرف خاص توجہ رہی لیکن جب انھوں نے آنکھیں نہیں کھولیں تو اللہ تعالیٰ نے ان کو ہدایت فرمائی کہ آپ ان سے صرف نظر کرکے اپنی ساری توجہ اور شفقت ان لوگوں پر مبذول فرمائیں جو اگرچہ دولت دنیا نہیں رکھتے لیکن قرآن عظیم پر ایمان کی نعمت ان کو حاصل ہے۔

'وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ' سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ان اغنیاء کی ایمان سے محرومی پر بڑا غم تھا۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس سے بھی روک دیا کہ ان لوگوں کی اس محرومی پر غم نہ کھاؤ۔ یہ شامت زدہ لوگ اسی کے سزاوار تھے کہ یہ قرآن پر ایمان کی نعمت سے محروم ہی رہیں۔

'وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِلْمُؤْمِنِيْنَ' میں ایک لطیف اشارہ اس بات کی طرف بھی ہے کہ اب ان شامت زدہ لوگوں پر قہر الٰہی نازل ہونے میں دیر نہیں ہے تو جس طرح پرندہ کوئی خطرہ محسوس کرتے ہی اپنے بچوں کو اپنے پروں کے نیچے چھپا لیتا ہے اسی طرح تم ان مومنین کو برابر اپنے دامن شفقت کے نیچے چھپائے رکھو۔

وَقُلْ اِنِّیْٓ اَنَا النَّذِيْرُ الْمُبِيْنُ (۸۹)

یعنی تم ان مغروروں اور سرمستوں کو سنا دو کہ میں تو بس آنے والے عذاب اور خطرے سے ایک کھلا ہوا آگاہ کرنے والا ہوں سو میں نے اپنا فرض انجام دیا اور دے رہا ہوں۔ رہی یہ بات کہ تم نے میری بات سنی یا نہیں سنی تو اس کی ذمہ داری مجھ پر نہیں بلکہ خود تم پر ہے۔

كَمَآ اَنْزَلْنَا عَلَى الْمُقْتَسِمِيْنَ o الَّذِيْنَ جَعَلُوا الْقُرْاٰنَ عِضِيْنَ (۹۰-۹۱)

یہود کے ہاتھوں تورات کے حصے بخرے

اس آیت کا تعلق اوپر کی آیت ۸۷ سے ہے یعنی پوری بات یوں ہے کہ ہم نے تمہیں سبع مثانی اور قرآن عظیم اسی طرح عطا کیا ہے جس طرح ان لوگوں پر اپنا کلام اتارا تھا جنھوں نے اس کے حصے بخرے کرکے اپنے قرآن کے ٹکڑے ٹکڑے کرکے رکھ دیے۔ یہ اشارہ یہود کی طرف ہے جنھوں نے حق کو چھپانے کے لیے اپنے قرآن یعنی تورات کی ترتیب بھی بدل ڈالی اور اس کو مختلف اجزا میں تقسیم کرکے اس کے بعض کو چھپاتے اور بعض کو ظاہر کرتے تھے۔ سورہ انعام آیت ۹۱ میں ان کی اس شرارت کا ذکر گزر چکا ہے۔ دوسرے آسمانی صحیفوں کے لیے لفظ قرآن کے استعمال کی نظیر خود قرآن میں موجود ہے ملاحظہ ہو سورہ رعد کی آیت ۳۱۔

اس آیت میں ضمناً یہود کے اس اعتراض کا جواب بھی آگیا کہ تورات کے بعد اب کسی نئے قرآن کی ضرورت کیا باقی رہی؟ جواب یہ ہے کہ اول تو وہ قرآن اپنی اصلی صورت میں باقی کہاں رہا جس پر ان کو ناز ہے' اس کے تو انھوں نے حصے بخرے کر ڈالے اور اگر وہ اپنی صحیح صورت میں باقی ہوتا تو خود اسی سے اس نئے قرآن کی ضرورت کا ثبوت بھی مل جاتا۔

'عضون' کا مفہوم

'عضون'، 'عضۃ' کی جمع ہے جس کے معنی فرقے، ٹکڑے اور اجزاء کے ہیں۔

فَوَرَبِّكَ لَنَسْـَٔلَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ ۝ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (۹۲-۹۳)

یہ دونوں آیتیں یہود ہی سے متعلق ہیں۔ نہایت زور دار الفاظ میں قسم کے ساتھ ارشاد ہوا ہے کہ جنھوں نے کتمان حق اور اپنے اغراض و اہوا کے لیے کتاب الٰہی کے ساتھ یہ ظلم کیے ہیں ہم ان سے ان کی ان کارستانیوں کی بابت ایک دن ضرور باز پرس کریں گے۔

فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ وَاَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ (۹۴)

اب کلام پھر اپنے اصل سلسلہ سے مربوط ہو گیا ہے۔ حضورؐ کو تاکید کے ساتھ ہدایت کی جا رہی ہے کہ جو کچھ تمھیں حکم دیا جا رہا ہے بے کم و کاست اور بے خوف و خطر اس کو اس کے مخاطبوں تک پہنچا دو اور تمھارے خلاف مشرکین جو بکواس کر رہے ہیں اس کا نوٹس نہ لو۔

اِنَّا كَفَيْنٰكَ الْمُسْتَهْزِءِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ يَجْعَلُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰـهًا اٰخَرَ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ (۹۵-۹۶)

یعنی یہ مشرکین جو تمھارا مذاق اڑا رہے اور تم ان کو جو ڈراوے سناتے ہو ان پر ہنستے ہیں تو ان سے نمٹنے کے لیے تمھاری طرف سے ہم کافی ہیں۔ وہ عنقریب جان لیں گے کہ جو کچھ تم انھیں سنا رہے ہو اس کا ایک ایک حرف سچ ثابت ہوا۔

وَلَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّكَ يَضِيْقُ صَدْرُكَ بِمَا يَقُوْلُوْنَ ۝ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَكُنْ مِّنَ السّٰجِدِيْنَ ۝ وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَاْتِيَكَ الْيَقِيْنُ (۹۷-۹۹)

کفار کے طنز پر صبر و استقامت کی تلقین
حصولِ صبر کی تدبیر، نماز

یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو کفار کے طنز و استہزا پر صبر کی تلقین اور اس صبر کے حاصل کرنے کی تدبیر بتائی گئی ہے کہ حصول صبر و استقامت کے لیے اپنے رب کی تسبیح کرو، اپنے اہل ایمان ساتھیوں کے ساتھ نماز کا اہتمام کرو اور اپنے رب کی عبادت میں لگے رہو تا آنکہ صبح یقین طلوع ہو جائے یعنی ہر وہ بات واقعہ ثابت ہو کے رہے جس کی تم لوگوں کو خبر دے رہے ہو۔

ان سطروں پر اس سورہ کی تفسیر تمام ہوئی۔ اللہ لغزشوں کو معاف فرمائے اور اس کی صحیح باتوں سے پڑھنے والوں کو نفع پہنچے۔ وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ۔

تدبرِ قرآن

۱۶

النحل

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ا۔ سورہ کا عمود اور سابق سورہ سے تعلق

اس گروپ کی تمام سورتوں کے عمود پر ایک جامع بحث ہم سورۂ یونس کی تفسیر کے شروع میں کر آئے ہیں۔ رسول کی بعثت سے حق و باطل کے درمیان جو کشمکش شروع ہوتی ہے وہ لازماً رسول اور اس پر ایمان لانے والوں کی فتح اور اس کے جھٹلانے والوں کی ہزیمت پر ختم ہوتی ہے۔ یہی حقیقت ایک نئے اسلوب سے اس سورہ میں بھی واضح کی گئی ہے۔ اس پہلو سے دیکھیے تو اس کی آیت ۳۰ لِلَّذِیْنَ اَحْسَنُوْا فِیْ ھٰذِہِ الدُّنْیَا حَسَنَۃٌ وَلَدَارُ الْاٰخِرَۃِ خَیْرٌ وَلَنِعْمَ دَارُ الْمُتَّقِیْنَ، کو عمود کی حیثیت حاصل ہے۔ یعنی جو لوگ نیکی اور تقویٰ کی راہ اختیار کرتے ہیں ان کے لیے اس دنیا میں بھی فیروزمندی ہے اور آخرت کا گھر تو اس سے کہیں بڑھ کر ہے ہی اور کیا ہی خوب ہے تقویٰ اختیار کرنے والوں کا گھر۔ یہی بات اس سورہ کی آیات ۴۱-۴۲ میں بھی فرمائی گئی ہے کہ جو لوگ حق کی راہ میں مخالفین حق کے مظالم سہہ کر اللہ تعالیٰ کی راہ میں ہجرت اختیار کرتے ہیں ہم ان کو دنیا میں بھی اقتدار و تمکن عطا کرتے ہیں اور آخرت کا صلہ تو اس سے کہیں بڑھ چڑھ کر ہے ہی۔

سابق سورہ (سورہ حجر) پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے اس تسلی کے مضمون پر ختم ہوئی تھی کہ آج جو لوگ تمھارے انذار اور تمھاری تنبیہ و تذکیر کا مذاق اڑا رہے ہیں اور تمھاری باتوں کو محض ہوائی باتیں خیال کر رہے ہیں تم ان کے اس استہزاء سے دل شکستہ نہ ہو، تمھاری طرف سے ان متکبروں اور مغروروں سے نپٹنے کے لیے ہم کافی ہیں۔ اس مضمون کے بعد یہ سورہ بغیر کسی تمہید کے ان متکبرین ہی کو خطاب کر کے یوں شروع ہو گئی ہے کہ اَتٰٓی اَمْرُ اللّٰہِ فَلَا تَسْتَعْجِلُوْہُ سُبْحٰنَہٗ وَتَعٰلٰی عَمَّا یُشْرِکُوْنَ۔ یعنی عذاب کے لیے امر الٰہی صادر ہو چکا ہے تو اس کے لیے جلدی نہ مچاؤ، اور یہ لوگ اس گھمنڈ میں نہ رہیں کہ جن کو خدا کا شریک بنائے بیٹھے ہیں وہ ان کو خدا کی پکڑ سے بچا لیں گے۔ اللہ اس سے پاک اور برتر ہے کہ اس کا کوئی شریک و سہیم ہو۔

ب۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

(۱-۹) کفارِ قریش کو تنبیہ کہ عذابِ الٰہی کو آیا ہی ہوا سمجھو۔ اس کو مذاق سمجھ کر اس کے لیے جلدی نہ مچاؤ۔ اس گھمنڈ میں نہ رہو کہ جن کو تم نے خدا کا شریک بنا رکھا ہے وہ تم کو اس سے بچا لیں گے۔ خدا کا کوئی شریک نہیں ہے۔ یہ دنیا کوئی بازیچۂ اطفال نہیں ہے کہ لوگ اس میں دھاندلی مچاتے پھریں اور اس کا خالق و مالک ان سے

کوئی باز پرس نہ کرے۔ پانی کی ایک بوند سے پیدا ہوئے انسان کے لیے یہ زیبا نہیں ہے کہ وہ خدا سے جھگڑا کرنے کہ مرنے کے بعد اس کو کون دوبارہ پیدا کر سکتا ہے۔ اس دنیا میں خدا کی ربوبیت اور اس کی پروردگاری کی جو نشانیاں ہر قدم پر موجود ہیں وہ اس بات کی شاہد ہیں کہ اس کا خالق نہایت ہی مہربان و رحیم ہے۔ وہ ایک ایسا دن ضرور لائے گا جس میں تمام معاملات کا فیصلہ کرے گا اور نیکوں اور بدوں دونوں کو ان کے اعمال کے مطابق جزا یا سزا دے گا۔ پس لوگوں کے لیے صحیح رویہ یہی ہے کہ وہ اس کی بتائی ہوئی اور اس تک پہنچانے والی سیدھی راہ اختیار کریں اور کج و پیچ کی راہوں میں بھٹکنے سے بچیں۔ اگر خدا چاہتا تو سب کو راہ ہدایت ہی پر کر دیتا لیکن اس معاملے میں اس نے جبر کو نہیں پسند فرمایا بلکہ یہی چاہا کہ لوگ اپنے اختیار و انتخاب سے ہدایت کی راہ اختیار کریں۔

(۱۰-۲۳) توحید کے دلائل اس کائنات کے مختلف اجزا میں توافق کے پہلو سے۔ یعنی اس کائنات کے مختلف اجزا میں جو باہمی سازگاری ہے وہ اس حقیقت کی نہایت واضح دلیل ہے کہ ایک ہی حکیم و قدیر کا ارادہ اس پوری کائنات میں کارفرما ہے۔ اس میں کسی اور کی شرکت نہیں ہے تو جو لوگ دوسرے معبودوں پر تکیہ کیے بیٹھے اور آخرت سے بے نیاز ہیں وہ اپنے اس گھمنڈ کی سزا ایک دن ضرور بھگتیں گے۔

(۲۴-۳۲) قرآن اور اس کی تعلیمات سے متعلق متکبرین کی رائے اور ان کے رویے کی طرف اشارہ اور اس حقیقت کی تصریح کہ آج جو لوگ اپنی لیڈری کے زعم میں قرآن سے لوگوں کو برگشتہ کر رہے ہیں، وہ قیامت کے دن اپنی گمراہی کا بوجھ بھی اٹھائیں گے اور ان لوگوں کے بوجھ میں سے بھی کچھ حصہ ان کو اٹھانا پڑے گا جن کی گمراہی کا وہ ذریعہ بنیں گے۔ ان کے مقابل میں خدا ترسوں کا جو رویہ ہے اس کا حوالہ اور ان کے اچھے انجام کی طرف اشارہ۔

(۳۳-۴۰) مشرکین، قرآن کی مخالفت اور اپنے باطل نظریات کی حمایت میں جو باتیں کہتے تھے ان میں سے بعض کا حوالہ اور ان کی تردید۔

(۴۱-۴۷) جو لوگ کلمۂ حق کی خاطر مشرکین کے ہاتھوں مصائب جھیل رہے تھے ان کی ہمت افزائی اور شرک کے علم برداروں کو ان کی سرکشی پر تہدید و وعید۔

(۴۸-۶۰) توحید کے دلائل اور مشرکین کو تنبیہ کہ سب کچھ اللہ واحد ہی کے اختیار میں ہے۔ اگر اس کی پکڑ میں آ گئے تو کوئی دوسرا اس کی پکڑ سے نجات دینے والا نہیں بن سکتا اور وہ جب چاہے اور جس حال میں چاہے لوگوں کو پکڑ سکتا ہے۔

(۶۱-۶۴) مشرکین کو تنبیہ کہ خدا نے اگر تم کو مہلت دے رکھی ہے تو اس لیے دے رکھی ہے کہ اس کے ہاں ہر چیز کے لیے ایک وقت مقرر ہے، جب وہ وقت مقرر آ جائے گا تو پھر نہ اس سے پیچھے ہٹ سکو گے نہ آگے بڑھ سکو گے۔ ساتھ ہی پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی کہ جو کچھ تمہیں پیش آ رہا ہے یہی کچھ تم سے پہلے

رسولوں کو بھی پیش آچکا ہے۔ تمھارا کام لوگوں کو مومن و موحد بنا دینا نہیں ہے بلکہ صرف لوگوں پر اللہ کی حجت تمام کر دینا ہے۔

(۶۵-۸۳) اللہ تعالیٰ نے جو نعمتیں بخش رکھی ہیں ان میں سے کچھ کو گنا کر مشرکین کو ملامت کہ ان میں سے کس نعمت کو وہ اللہ کے سوا کسی اور کی طرف منسوب کر سکتے ہیں۔ اس کے بعد پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی کہ جو لوگ جان بوجھ کر انجان بن رہے ہیں ان کو راستہ پر لا کھڑا کرنا تمھاری ذمہ داری نہیں ہے۔ تمھاری ذمہ داری صرف حق کو پہنچا دینے کی ہے۔

(۸۴-۹۰) اللہ تعالیٰ نے ہر امت میں حق کی تبلیغ کے لیے اپنے رسول بھیجے ہیں۔ وہ ان سے قیامت کے دن گواہی دلوا دے گا کہ انھوں نے اللہ کا پیغام ان کو پہنچا دیا۔ یہی حیثیت اس امت کے لوگوں کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ہے۔ اسی مقصد کے لیے اللہ نے آپ پر یہ کتاب اتاری اور اس کتاب کا جو بنیادی پیغام ہے اس کا اجمالی حوالہ۔

(۹۱-۹۵) یہود سے خطاب اور ان کو ملامت کہ تم اللہ سے عہد باندھ کر محض بربنائے حسد مخالفین حق کی صف میں جا کھڑے ہوئے اور اس بڑھیا کے مانند جو اپنا کاتا ہوا خود اپنے ہی ہاتھوں ادھیڑ کر رکھ دے تم اللہ سے باندھے ہوئے عہد کے بخیے ادھیڑ رہے ہو۔ اللہ کے عہد کو متاع دنیا کے عوض نہ بیچو اور اپنی قسموں کو لوگوں کو حق سے برگشتہ کرنے کا ذریعہ نہ بناؤ۔

(۹۶-۱۰۵) جو لوگ مخالفوں کی مخالفت کے علی الرغم حق پر ثابت قدم رہیں گے ان کے لیے دنیا اور آخرت دونوں میں بہترین صلہ کا وعدہ۔ قرآن اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے لوگوں کو بدظن کرنے کے لیے مخالفین جو سخن سازیاں کرتے تھے ان میں سے بعض کا جواب۔

(۱۰۶-۱۱۱) اعدائے حق کی ستم رانیوں کے ہدف بنے ہوئے مسلمانوں کو صبر و استقامت کی تلقین اور ان لوگوں کو تہدید و وعید جو مخالفین سے مرعوب ہو کر اسلام سے برگشتہ ہو جائیں گے۔ حق کی خاطر ہجرت کی طرف ایک اشارہ اور اس کا اجر و ثواب۔

(۱۱۲-۱۱۷) قریش کی تنبیہ کے لیے ایک بستی کی تمثیل کہ اگر انھوں نے اپنی روش نہ بدلی تو ان کا بھی وہی انجام ہو سکتا ہے جو اس بستی والوں کا ہوا۔ نیز ان کو یہ ہدایت کہ اپنے جی سے حرام و حلال نہ ٹھہراؤ۔ اللہ نے جن چیزوں کو حلال ٹھہرایا ہے ان کو کھاؤ، اپنے مشرکانہ توہمات کے تحت ان کو حرام نہ ٹھہراؤ۔

(۱۱۸-۱۲۴) اس امر کی طرف اشارہ کہ یہود پر بھی وہی چیزیں حرام ٹھہرائی گئی تھیں جو اس ملت میں حرام ہیں لیکن انھوں نے اپنی سرکشی کے سبب سے خود اپنے اوپر بعض چیزیں حرام کر لیں اور اب ان کو ملت ابراہیم کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ ابراہیم کو نہ یہودیت و نصرانیت سے کوئی علاقہ تھا، نہ وہ مشرکین میں سے تھے۔ ان کی ملت ان سب سے الگ تھی اور وہی ملت ہے جس کی پیروی کی ہدایت تمھیں کی گئی ہے۔ سبت کے احترام کا تعلق

بھی یہود سے تھا، ملت ابراہیم سے اس کو کوئی تعلق نہیں۔

(۱۲۵-۱۲۸) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کو حکمت و موعظت کے ساتھ دعوت کی ہدایت اور اس راہ میں صبر و استقامت کی تلقین۔ صبر و استقامت کے حصول کا ذریعہ تعلق باللہ ہے۔ مخالفین کی سازشوں سے دل شکستہ نہیں ہونا چاہیے۔ اللہ اپنے متقی اور خوب کار بندوں کا ساتھی ہے۔

سورہ کے مطالب کا اجمالی تجزیہ کرنے کے بعد اب ہم اس کی تفصیلی تفسیر شروع کرتے ہیں۔

وَمَا تَوْفِیْقِیْٓ اِلَّا بِاللّٰهِ۔

سُورَةُ النَّحْلِ (۱۶)

مَكِّيَّةٌ ــــــــــــــ اٰيَاتُهَا ۱۲۸

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اٰیات ۱-۹ أَتَىٰٓ أَمْرُ اللّٰهِ فَلَا تَسْتَعْجِلُوْهُ ۚ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿۱﴾
يُنَزِّلُ الْمَلٰٓئِكَةَ بِالرُّوْحِ مِنْ أَمْرِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖٓ أَنْ
أَنْذِرُوْٓا أَنَّهٗ لَآ إِلٰهَ إِلَّآ أَنَا فَاتَّقُوْنِ ﴿۲﴾ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ
بِالْحَقِّ ۚ تَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿۳﴾ خَلَقَ الْإِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ فَإِذَا
هُوَ خَصِيْمٌ مُّبِيْنٌ ﴿۴﴾ وَالْأَنْعَامَ خَلَقَهَا ۗ لَكُمْ فِيْهَا دِفْءٌ وَّمَنَافِعُ
وَمِنْهَا تَأْكُلُوْنَ ﴿۵﴾ وَلَكُمْ فِيْهَا جَمَالٌ حِيْنَ تُرِيْحُوْنَ وَحِيْنَ
تَسْرَحُوْنَ ﴿۶﴾ وَتَحْمِلُ أَثْقَالَكُمْ إِلٰى بَلَدٍ لَّمْ تَكُوْنُوْا بٰلِغِيْهِ إِلَّا
بِشِقِّ الْأَنْفُسِ ۚ إِنَّ رَبَّكُمْ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ﴿۷﴾ وَّالْخَيْلَ وَالْبِغَالَ وَ
الْحَمِيْرَ لِتَرْكَبُوْهَا وَزِيْنَةً ۚ وَيَخْلُقُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۸﴾ وَعَلَى اللّٰهِ
قَصْدُ السَّبِيْلِ وَمِنْهَا جَآئِرٌ ۚ وَلَوْ شَآءَ لَهَدٰىكُمْ أَجْمَعِيْنَ ﴿۹﴾ ع ۱/۹

ترجمۂ آیات ۱-۹ امرِ الٰہی صادر ہو چکا ہے تو اس کے لیے جلدی نہ مچاؤ، وہ پاک اور برتر ہے ان چیزوں سے جن کو یہ اس کا شریک ٹھہراتے ہیں۔ وہ فرشتوں کو اپنے امر کی روح کے ساتھ اتارتا ہے اپنے بندوں میں سے جن پر چاہتا ہے کہ لوگوں کو آگاہ کر دو کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں تو مجھی سے

ڈرد۔ اس نے آسمانوں اور زمین کو غایت کے ساتھ پیدا کیا، وہ برتر ہے ان چیزوں سے جن کو یہ اس کا شریک گردانتے ہیں۔ اس نے انسان کو پانی کی ایک بوند سے پیدا کیا تو وہ ایک کھلا ہوا حریف بن کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اور چوپائے بھی اس نے تمہارے لیے پیدا کیے جن کے اندر تمہارے لیے جڑاول بھی ہے اور دوسری منفعتیں بھی اور ان سے تم غذا بھی حاصل کرتے ہو۔ اور ان کے اندر تمہارے لیے ایک شان بھی ہے جب کہ تم ان کو شام کو گھر واپس لاتے ہو اور جس وقت کہ ان کو چرنے کو چھوڑتے ہو۔ اور وہ تمہارے بوجھ ایسی جگہوں تک پہنچاتے ہیں جہاں تم شدید مشقت کے بغیر پہنچنے والے نہیں بن سکتے تھے، بے شک تمہارا رب بڑا ہی شفیق و مہربان ہے اور اسی نے پیدا کیے گھوڑے اور خچر اور گدھے کہ تم ان پر سوار ہو اور وہ زینت بھی ہیں اور وہ ایسی چیزیں بھی پیدا کرتا ہے جن کو تم نہیں جانتے اور اللہ تک سیدھی راہ پہنچاتی ہے اور بعض راہیں کج ہیں اور اگر وہ چاہتا تو تم سب کو ہدایت پر کر دیتا۔ ۱-۹

۱- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

اَتٰۤی اَمۡرُ اللّٰہِ فَلَا تَسۡتَعۡجِلُوۡہُ ؕ سُبۡحٰنَہٗ وَ تَعٰلٰی عَمَّا یُشۡرِکُوۡنَ (۱)

جلدبازوں سے خطاب اور ان کی وعید: نبی صلی اللہ علیہ وسلم جب اپنی قوم کے لوگوں کو اس حقیقت سے آگاہ فرماتے کہ میں جس امر حق کی دعوت دے رہا ہوں اگر تم نے اس کو اختیار نہ کیا تو مہلت کی مدت گزر جانے کے بعد تم پر اللہ کا عذاب آجائے گا تو سرکش لوگوں کی طرف سے آپ کو یہ جواب ملتا کہ جس عذاب کی دھمکی سنا رہے ہو وہ لاتے کیوں نہیں، ہم تو تمہاری بات جب مانیں گے جب اس عذاب کو دیکھ لیں گے جس کے روز روز ڈراوے سنا رہے ہو۔ آگے آیت ۳۲ میں اس کی تفصیل آئے گی۔ انہی جلد بازوں کو خطاب کر کے ارشاد ہوا کہ عذاب کے لیے امر الٰہی صادر ہو چکا ہے تو اس کے لیے جلدی نہ مچاؤ۔

'اَتٰۤی اَمۡرُ اللّٰہِ' (عذاب کے لیے امر الٰہی صادر ہو چکا ہے) محض دھمکی نہیں ہے بلکہ ایک امر واقعی کا بیان ہے۔ ہم اس کتاب میں متعدد آیات کے تحت اس سنت الٰہی کی وضاحت کر چکے ہیں کہ کسی قوم کے اندر رسول کی بعثت ہی کے اندر یہ بات مضمر ہوتی ہے کہ جو لوگ اس رسول پر ایمان لائیں گے وہ نجات پائیں گے اور جو لوگ

اس کی تکذیب کریں گے وہ ہلاک کر دیے جائیں گے۔ رسول، حق و باطل کے امتیاز کے لیے کسوٹی اور اتمام حجت کا آخری ذریعہ ہوتا ہے۔ اس وجہ سے رسول کی بعثت کے بعد اس کی قوم کے لیے دو ہی راہیں باقی رہ جاتی ہیں یا تو لوگ اس پر ایمان لائیں اور نجات حاصل کریں ورنہ خدا کی پکڑ میں آئیں اور اپنی سرکشی کا انجام بد دیکھیں۔

سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰی عَمَّا یُشْرِکُوْنَ یعنی یہ لوگ اس خبط میں مبتلا نہ رہیں کہ جن کو یہ خدا کا شریک و شفیع بنائے بیٹھے ہیں وہ ان کو خدا کے عذاب سے بچا لیں گے۔ خدا ان کے مزعومہ شریکوں سے پاک اور برتر ہے۔ اس کا کوئی شریک نہیں ہے۔ وہ جن اعلیٰ صفات سے متصف ہے ان صفات کے ساتھ ان مشرکانہ توہمات کا کوئی جوڑ نہیں ہے۔ وہ اپنی تمام صفات میں یکتا اور وحدہٗ لا شریک ہے۔

بلاغت کا ایک اسلوب

اس آیت میں اسلوب بیان کا یہ فرق بھی ملحوظ رہے کہ فَلَا تَسْتَعْجِلُوْهُ میں براہ راست ان کو خطاب کیا ہے لیکن عَمَّا یُشْرِکُوْنَ میں خطاب کے بجائے غائب کا صیغہ آگیا ہے۔ اس میں بلاغت یہ ہے کہ پہلے ٹکڑے میں تہدید و وعید ہے جس کے لیے خطاب ہی کا اسلوب زیادہ موزوں ہے اور اس دوسرے ٹکڑے میں کراہت و نفرت کا اظہار ہے جس کے لیے غائب کا صیغہ زیادہ مناسب تھا گویا بات ان سے منہ پھیر کر فرمائی گئی۔

یُنَزِّلُ الْمَلٰٓئِکَةَ بِالرُّوْحِ مِنْ اَمْرِهٖ عَلٰی مَنْ یَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖٓ اَنْ اَنْذِرُوْٓا اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاتَّقُوْنِ (۲)

کفار کے بعض مطالبات کا جواب

کفار کا مطالبہ دو چیزوں کے لیے تھا۔ ایک تو اس چیز کے لیے کہ ان پر بھی اسی طرح فرشتے اتریں جس طرح پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) کو دعویٰ ہے کہ ان پر فرشتے اترتے ہیں، دوسرا اس عذاب کے لیے جس سے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم ان کو ڈراتے تھے۔ چنانچہ اسی سورہ میں ان کے ان دونوں مطالبات کا حوالہ ہے۔ هَلْ یَنْظُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ تَاْتِیَهُمُ الْمَلٰٓئِکَةُ اَوْ یَاْتِیَ اَمْرُ رَبِّکَ ۳۳ (وہ نہیں منتظر ہیں مگر اس بات کے کہ ان کے پاس فرشتے آئیں یا تمھارے رب کا حکم ہی آجائے) ان میں سے دوسرے مطالبہ کا جواب تو اوپر والی آیت میں دے دیا گیا کہ عذاب کے لیے امر الٰہی صادر ہو چکا ہے تو اس کے لیے جلدی نہ مچاؤ۔ اب یہ ان کے پہلے مطالبہ کا جواب دیا جا رہا ہے کہ ہر شخص اس بات کا اہل نہیں ہوتا کہ اس پر فرشتے اتریں۔ اللہ اپنے فرشتے اپنے بندوں میں سے ان پر اتارتا ہے جن پر چاہتا ہے۔ یعنی جن کو وہ اس کا اہل پاتا ہے اور جن کو وہ اس مقصد کے لیے انتخاب فرماتا ہے۔

روح سے مراد وحی الٰہی ہے

بِالرُّوْحِ مِنْ اَمْرِهٖ۔ یعنی یہ فرشتے امر الٰہی کی 'روح' کے ساتھ اترتے ہیں۔ 'روح' سے مراد وحی الٰہی ہے۔ وحی الٰہی کو روح سے اس لیے تعبیر فرمایا گیا ہے کہ جس طرح جسم کی زندگی روح سے ہے اسی طرح روح و دل کی زندگی وحی الٰہی سے ہے۔ سیدنا مسیح علیہ السلام کا ارشاد ہے کہ انسان روٹی سے نہیں جیتا بلکہ اس کلمہ سے جیتا ہے جو خداوند کی طرف سے آتا ہے۔

رسولوں کو اللہ کی مشترک ہدایت

اَنْ اَنْذِرُوْٓا اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاتَّقُوْنِ۔ یعنی ہر رسول کو اللہ کی طرف سے یہ ہدایت ہوئی کہ لوگوں کو آگاہ کر دو کہ میرے سوا کوئی اور معبود نہیں ہے تو صرف مجھی سے ڈرو اور میری ہی عبادت کرو، کسی اور کو میرا ساجھی

اور شریک نہ ٹھہراؤ۔

خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ تَعٰلٰی عَمَّا یُشْرِکُوْنَ (۳)

کارخانۂ کائنات کے بالحق ہونے کا لازمی تقاضا

لفظ 'حق' کی تشریح سورۂ حجر کی آیت ۸۵ کے تحت گزر چکی ہے۔ اس کے معنی غایت اور مقصد کے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ خدا نے یہ دنیا بے غایت و بے مقصد نہیں بنائی ہے۔ یہ کسی کھلنڈرے کا کھیل اور بازیچۂ اطفال نہیں ہے بلکہ اس کی ایک ایک چیز کے اندر قدرت و حکمت نمایاں ہے وہ شاہد ہے کہ اس کا خالق حکیم و قدیر ہے۔ ایک حکیم و قدیر خالق کی شان سے یہ بات بعید ہے کہ وہ کوئی عبث، باطل اور بے مقصد کام کرے۔ اس کے بامقصد اور باغایت ہونے کا یہ لازمی تقاضا ہے کہ وہ ایک ایسا دن ضرور لائے جس دن سب اس کی طرف لوٹیں اور اپنے اعمال کی جزا یا سزا پائیں۔ اگر ایسا نہ ہو تو یہ تمام کارخانہ بالکل عبث اور بے غایت ایک کھیل بن کے رہ جاتا ہے۔ اسی حقیقت کو سورۂ مومنون کی آیت ۱۱۵ میں یوں واضح فرمایا ہے۔ اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰکُمْ عَبَثًا وَّاَنَّکُمْ اِلَیْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ (کیا تم نے یہ گمان کر رکھا ہے کہ ہم نے تم کو عبث پیدا کیا ہے اور تم ہماری طرف لوٹائے نہیں جاؤ گے)۔

'تَعٰلٰی عَمَّا یُشْرِکُوْنَ' یہ اسی اوپر والے مضمون کی ایک دوسرے پہلو سے تاکید ہے۔ کفار و مشرکین اول تو قیامت کے قائل نہ تھے، پھر ان کا اصل تعلق ان کے ان فرضی معبودوں اور شرکاء و شفعاء سے رہ گیا تھا جن کی وہ پوجا کرتے تھے۔ ان کا گمان یہ تھا کہ وہ ان کی طرف سے خدا سے نبٹنے کے لیے کافی ہیں۔ ظاہر ہے یہ عقیدہ اس کارخانۂ کائنات کے 'بالحق' ہونے کی صریح نفی ہے۔ اس وجہ سے یہ حقیقت بھی واضح کر دی گئی کہ یہ لوگ اپنے جن معبودوں سے لو لگائے بیٹھے ہیں ان میں سے کوئی ان کے کام آنے والا نہیں ہے۔ خدا کا کوئی شریک اور ساجھی نہیں ہے۔ وہ ان تمام شریکوں سے پاک اور منزہ ہے۔ وہ جن اعلیٰ صفات سے متصف ہے ان کے ساتھ ان شریکوں کا کوئی جوڑ نہیں ہے۔

خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ فَاِذَا هُوَ خَصِیْمٌ مُّبِیْنٌ (۴)

انسان سے یہاں مراد وہی کفار و مشرکین ہیں جو اوپر کی آیات میں مخاطب ہیں۔ ان سے بیزاری کے لیے بات عام صیغے سے کہہ دی گئی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ پیدا تو ہم نے انسان کو نجس پانی کی ایک بوند سے کیا لیکن اب وہ کھلم کھلا ہمارا ایک حریف بن کر اٹھ کھڑا ہوا ہے اب وہ اپنے دوبارہ اٹھائے جانے کو بھی بعید از امکان سمجھتا ہے اور کہتا ہے ءَاِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا ذٰلِكَ رَجْعٌۢ بَعِیْدٌ۔ ق (کیا جب ہم مر جائیں گے اور گل سڑ کر مٹی ہو جائیں گے تو ہم از سر نو اٹھائے جائیں گے، یہ واپسی تو بہت ہی مستبعد ہے) اور جن کو اپنے زعم کے مطابق اس نے ہمارا شریک بنا رکھا ہے ان کی حمایت میں بھی ہم سے لڑتا ہے۔ آگے آیت ۲۷ میں ان کے اسی لڑنے کا حوالہ ہے وَیَقُوْلُ اَیْنَ شُرَكَآءِیَ الَّذِیْنَ كُنْتُمْ تُشَآقُّوْنَ فِیْهِمْ (اور وہ فرمائے گا کہ اب میرے وہ شریک کہاں ہیں جن کی حمایت میں تم لڑتے تھے)۔

وَالْاَنْعَامَ خَلَقَهَا لَكُمْ فِیْهَا دِفْءٌ وَّمَنَافِعُ وَمِنْهَا تَاْكُلُوْنَ (۵)

'دِفْءٌ' چوپایوں کے بال اور اون وغیرہ کو کہتے ہیں جن سے بنے ہوئے لباس سردیوں میں گرمی حاصل کرنے کا ذریعہ بنتے ہیں۔

آیاتِ الٰہی کی طرف اشارہ

اب اس آیت، اور آگے کی آیات میں مخاطب گروہ کے گرد و پیش کی چیزوں اور ان کے گوناگوں فوائد و منافع کا حوالہ دے کر اس کو توجہ دلائی ہے کہ ان میں سے ایک ایک چیز شہادت دے رہی ہے کہ اس کائنات کا خالق نہایت ہی کریم و حکیم اور نہایت ہی مہربان و رحیم ہے۔ مطلب یہ ہے کہ نعمتیں تو تمہیں ساری خدا سے ملی ہیں لیکن تم عبادت دوسروں کی کرتے ہو اور جس کی یہ فیاضی اور پروردگاری کی یہ شانیں دیکھتے ہو اس کے متعلق یہ گمان کیے بیٹھے ہو کہ اس نے بس تمہیں ان نعمتوں سے فائدہ اٹھانے کے لیے چھوڑ رکھا ہے، نہ ان نعمتوں کے جواب میں اس کا تم پر کوئی حق قائم ہوتا ہے اور نہ تمہیں اس کے آگے کبھی کوئی جواب دہی کرنی ہے۔ نعمتوں کے ذکر میں سب سے پہلے چوپایوں کا حوالہ دیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اہل عرب کی اصل دولت یہ چوپائے ہی تھے۔ وہ بیشتر انہی سے لباس، غذا اور دوسرے گوناگوں فوائد حاصل کرتے تھے۔

وَلَكُمْ فِيْهَا جَمَالٌ حِيْنَ تُرِيْحُوْنَ وَحِيْنَ تَسْرَحُوْنَ (۶)

چوپایوں کی نعمت

'جمال' سے مراد یہاں شان و شوکت اور دولت و عظمت ہے۔ اہل عرب کی اصل پونجی، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، چوپائے ہی تھے اس وجہ سے وہاں کسی شخص کی ثروت و عظمت کا اندازہ اس کے گلے ہی سے کیا جاتا۔ اگر اس کا گلہ بڑا ہوتا تو وہ بڑا آدمی سمجھا جاتا اور اگر چھوٹا ہوتا تو چھوٹا آدمی خیال کیا جاتا۔

'اِرَاحَة' کے معنی شام کو گلے کو چراگاہ سے گھر واپس لانے کے ہیں اور 'تَسْرِيْح' کے معنی اس کو چرنے چگنے کے لیے صبح کو چھوڑنے کے ہیں۔ یہاں 'اِرَاحَة' کو 'تَسْرِيْح' پر مقدم کیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ مرجع کلام اظہار شان کا ہے اور شان کا اظہار گلے کی شام کو واپسی میں زیادہ ہے جب کہ وہ چراگاہ سے چر چگ کے تازگی اور فربہی کی حالت میں گھر کو واپس آتا ہے۔ یہ بات اس درجہ میں اس وقت نہیں ہوتی جب وہ صبح کو چرنے کے لیے چھوڑا جاتا ہے۔

وَتَحْمِلُ اَثْقَالَكُمْ اِلٰى بَلَدٍ لَّمْ تَكُوْنُوْا بٰلِغِيْهِ اِلَّا بِشِقِّ الْاَنْفُسِ اِنَّ رَبَّكُمْ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ (۷)

یہ اشارہ اونٹوں کی طرف ہے جن پر عرب میں بار برداری اور سفر کا تمام تر انحصار تھا۔ یہ جانور طویل سے طویل اور پرمشقت سے پرمشقت سفر کے لیے، خاص طور پر صحرائی اور گرم ملکوں میں، خدائی سفینہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس وصف میں کوئی دوسرا اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔

نعمت سے متمتع ہونے والوں کے لیے سبق

'اِنَّ رَبَّكُمْ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ' یہ وہ اصل سبق ہے جو ان نعمتوں سے متمتع ہونے والے انسان کو حاصل ہونا چاہیے کہ وہ یہ مانے کہ ان کا بخشنے والا نہایت ہی مہربان اور نہایت ہی رحیم و کریم ہے اور پھر اس سے جو بات لازم آتی ہے اس کو اختیار کرے یعنی اس منعم کا حق پہچانے، اس کا شکر گزار بندہ بنے، اس کی بندگی و اطاعت میں سرگرم رہے، اس کے حقوق میں دوسروں کو شریک نہ بنائے اور اس کے مقابل میں حریف بن کر نہ اٹھ کھڑا ہو۔ لیکن انسان کی یہ عجیب شامت ہے کہ وہ خدا کی نعمتیں پا کر اس کا شکر گزار بندہ بننے کی بجائے خود اپنی شان میں مبتلا ہو جاتا ہے اور خدا کا حریف بن کر اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ مزید ستم یہ کہ اگر شکر گزار بھی ہوتا ہے

تو خدا کا نہیں بلکہ خدا کے سوا دوسروں کا ہوتا ہے۔

وَالْخَيْلَ وَالْبِغَالَ وَالْحَمِيْرَ لِتَرْكَبُوْهَا وَزِيْنَةً ۚ وَيَخْلُقُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ (۸)

اونٹ کے بعد یہ دوسرے جانوروں کی طرف اشارہ فرمایا جو سواری کے کام بھی آتے اور سرداری کے لوازم میں سے ہونے کے باعث شان و شوکت کا بھی ذریعہ تھے نیز فرمایا کہ انہی تک محدود نہیں خدا بے شمار ایسی مخلوقات بھی پیدا کرتا رہتا ہے، جن کو تم جانتے بھی نہیں بلکہ بالواسطہ یا بلا واسطہ تم یا تمہارے سوا دوسرے لوگ ان سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ مقصود ان چیزوں کے ذکر سے بھی وہی ہے جس کی طرف اوپر اشارہ گزرا کہ نعمتیں بخشی ہوئی تو سب خدا کی ہیں لیکن تم ان کو پا کر خدا کو تو بھول جاتے ہو اور اپنی شان اور دوسروں کی بندگی میں لگ جاتے ہو۔

وَعَلَى اللّٰهِ قَصْدُ السَّبِيْلِ وَمِنْهَا جَآئِرٌ ۚ وَلَوْ شَآءَ لَهَدٰىكُمْ اَجْمَعِيْنَ (۹)

'قصد' کے معنی سیدھے اور مستقیم کے ہیں۔ طَرِیْقٌ قَصْدٌ سیدھا راستہ۔ 'قَصْدُ السَّبِیْلِ' میں صفت اپنے موصوف کی طرف مضاف ہوگئی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ بندے کو خدا تک توحید کی سیدھی راہ پہنچاتی ہے، اس میں کج پیچ اور پگ ڈنڈیاں نہیں ہیں۔ خدا نے اپنے اور اپنے بندوں کے درمیان وسائط کو حائل نہیں کیا ہے۔ اس نے اپنے تک پہنچنے کے لیے سیدھی راہ کھولی ہے، بندہ اس کو اختیار کرے تو یہ سیدھے خدا تک پہنچا دیتی ہے۔ اسی حقیقت کو سورۂ حجر کی آیت ۴۱ میں یوں واضح فرمایا گیا ہے۔ 'هٰذَا صِرَاطٌ عَلَيَّ مُسْتَقِيْمٌ' (یہ سیدھی راہ (توحید) سیدھے مجھ تک پہنچاتی ہے) یہی مضمون سورۂ ہود آیت ۵۶ میں یوں بیان ہوا ہے۔ 'اِنَّ رَبِّيْ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ' (بے شک، میرا رب ایک سیدھے راستہ پر ہے)

'وَمِنْهَا جَآئِرٌ' یعنی خدا تک تو توحید کی سیدھی راہ پہنچاتی ہے لیکن لوگوں نے اپنی شامت سے اس سیدھی راہ سے شرک کے کج پیچ کے راستے نکال لیے ہیں جن پر پڑ کے وہ اس طرح کھو جاتے ہیں کہ پھر خدا سے وہ دور سے دور تر ہی ہوتے جاتے ہیں۔ ان کے لیے اصل شاہراہ کی طرف لوٹنا نہایت دشوار ہو جاتا ہے۔

'وَلَوْ شَآءَ لَهَدٰىكُمْ اَجْمَعِيْنَ' یعنی اگر خدا چاہتا تو سب کو ہدایت کے راستہ ہی پر ڈال دیتا لیکن اس معاملے میں اس نے جبر کو پسند نہیں فرمایا ہے بلکہ لوگوں کو اختیار دیا ہے کہ وہ اپنی عقل و تمیز سے کام لیں اور جس راہ کو بھی اختیار کریں اپنی ذمہ داری پر اختیار کریں۔ اگر وہ توحید کی راہ اختیار کریں گے تو منزل تک پہنچیں گے اور اگر اس سے انحراف کریں گے تو اس کا انجام خود دیکھیں گے۔ اسی سورہ میں آگے ارشاد ہوا ہے۔ 'اِنْ تَحْرِصْ عَلٰى هُدٰىهُمْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ مَنْ يُّضِلُّ وَمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ'۔ یعنی جن پر خدا کا قانون ضلالت نافذ ہو جاتا ہے، پھر ان کو ہدایت نصیب نہیں ہوا کرتی تو ایسوں کی ہدایت کے درپے ہونے کی ضرورت نہیں۔

۲۔ آگے کا مضمون ——— آیات ۱۰-۲۳

توحید کا مضمون ایک دوسرے پہلو سے

آگے بھی توحید کا مضمون ایک دوسرے پہلو یعنی کائنات میں توافق کے پہلو سے واضح کیا گیا ہے پھر آخر

میں تنبیہ کیا گیا ہے کہ جو لوگ دوسرے معبودوں پر تکیہ کیے بیٹھے ہیں وہ یاد رکھیں کہ قیامت کے دن، جب کہ لوگوں سے ان کے اعمال کی بابت پرسش ہونی ہے، ان کے یہ فرضی دیوی دیوتا کچھ کام آنے والے نہیں ہیں۔ سب کو اللہ واحد ہی سے سابقہ پیش آنا ہے اور وہ ہر ایک کے تمام ظاہر و باطن سے واقف ہے اور ہر ایک کے ساتھ اس کے اعمال کے مطابق ہی معاملہ کرے گا۔

هُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَاۗءِ مَاۗءً لَّكُمْ مِّنْهُ شَرَابٌ وَّمِنْهُ شَجَرٌ آیات ۱۰-۲۳
فِيْهِ تُسِيْمُوْنَ ﴿۱۰﴾ يُنْۢبِتُ لَكُمْ بِهِ الزَّرْعَ وَالزَّيْتُوْنَ وَالنَّخِيْلَ
وَالْاَعْنَابَ وَمِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ﴿۱۱﴾
وَسَخَّرَ لَكُمُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ ۙ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ۭ وَالنُّجُوْمُ مُسَخَّرٰتٌۢ
بِاَمْرِهٖ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ﴿۱۲﴾ وَمَا ذَرَاَ لَكُمْ فِي
الْاَرْضِ مُخْتَلِفًا اَلْوَانُهٗ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّذَّكَّرُوْنَ ﴿۱۳﴾
وَهُوَ الَّذِيْ سَخَّرَ الْبَحْرَ لِتَاْكُلُوْا مِنْهُ لَحْمًا طَرِيًّا وَّتَسْتَخْرِجُوْا
مِنْهُ حِلْيَةً تَلْبَسُوْنَهَا ۚ وَتَرَى الْفُلْكَ مَوَاخِرَ فِيْهِ وَلِتَبْتَغُوْا
مِنْ فَضْلِهٖ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۱۴﴾ وَاَلْقٰى فِي الْاَرْضِ رَوَاسِيَ اَنْ
تَمِيْدَ بِكُمْ وَاَنْهٰرًا وَّسُبُلًا لَّعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ﴿۱۵﴾ وَعَلٰمٰتٍ ۭ وَ
بِالنَّجْمِ هُمْ يَهْتَدُوْنَ ﴿۱۶﴾ اَفَمَنْ يَّخْلُقُ كَمَنْ لَّا يَخْلُقُ ۭ اَفَلَا
تَذَكَّرُوْنَ ﴿۱۷﴾ وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا ۭ اِنَّ اللّٰهَ
لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۸﴾ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تُسِرُّوْنَ وَمَا تُعْلِنُوْنَ ﴿۱۹﴾
وَالَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَا يَخْلُقُوْنَ شَيْـــًٔا وَّهُمْ
يُخْلَقُوْنَ ﴿۲۰﴾ اَمْوَاتٌ غَيْرُ اَحْيَاۗءٍ ۚ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ۙ اَيَّانَ يُبْعَثُوْنَ ﴿۲۱﴾ ع ۲ ۱۲ ۸

إِلَٰهُكُمْ إِلَٰهٌ وَاحِدٌ ۚ فَالَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ قُلُوبُهُمْ مُنْكِرَةٌ
وَهُمْ مُسْتَكْبِرُونَ ﴿۲۲﴾ لَا جَرَمَ أَنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ مَا يُسِرُّونَ وَمَا يُعْلِنُونَ
إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الْمُسْتَكْبِرِينَ ﴿۲۳﴾

ترجمۂ آیات ۱۰-۲۳

وہی ہے جس نے آسمان سے پانی اتارا جس میں سے تم پیتے بھی ہو اور اسی سے وہ نباتات بھی اگتی ہیں جن میں تم مویشیوں کو چراتے ہو۔ وہ اسی سے تمھارے لیے کھیتی، زیتون، کھجور، انگور اور ہر قسم کے پھل پیدا کرتا ہے۔ بے شک اس کے اندر بہت بڑی نشانی ہے ان لوگوں کے لیے جو سوچیں۔ اور اس نے رات اور دن، سورج اور چاند کو تمھاری نفع رسانی میں لگا رکھا ہے اور تارے بھی اسی کے حکم سے نفع رسانی میں لگے ہوئے ہیں، بے شک اس میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو سمجھیں۔ اور زمین میں جو چیزیں تمھارے لیے گوناگوں قسموں کی پھیلائیں، بے شک اس میں بھی بڑی نشانی ہے ان لوگوں کے لیے جو یاددہانی حاصل کریں۔ ۱۰-۱۳

اور وہی ہے جس نے سمندر کو تمھاری نفع رسانی میں لگا رکھا ہے تاکہ تم اس سے تازہ گوشت کھاؤ اور اس سے وہ زیور نکالو جو تم پہنتے ہو اور تم کشتیوں کو دیکھتے ہو کہ اس میں چیرتی ہوئی چلتی ہیں (تاکہ تم اس میں سفر کرو) اور اس کے فضل کے طالب بنو اور تاکہ تم اس کے شکرگزار بنو۔ ۱۴

اور اس نے زمین میں پہاڑ ڈال دیے ہیں کہ وہ تمھیں لے کر جھک نہ پڑے اور نہریں جاری کر دی ہیں اور راستے نکال دیے ہیں تاکہ تم راہ پاؤ اور دوسری علامتیں بھی ہیں اور تاروں سے بھی وہ راہ معلوم کرتے ہیں۔ ۱۵-۱۶

تو کیا وہ جو پیدا کرتا ہے ان کے مانند ہے جو کچھ بھی پیدا نہیں کرتے؟ تو کیا تم سوچتے نہیں؟

اور اگر تم اللہ کی نعمتوں کو شمار کرنا چاہو تو تم ان کا احاطہ نہ کر سکو گے۔ بے شک اللہ بڑا ہی بخشنے والا

مہربان ہے۔ اور اللہ جانتا ہے جو تم چھپاتے ہو اور جو تم ظاہر کرتے ہو۔ اور جن کو یہ اللہ کے سوا پکارتے ہیں وہ کچھ پیدا نہیں کرتے، وہ تو خود مخلوق ہیں، مردہ غیر زندہ، اور ان کو احساس بھی نہیں کہ وہ کب اٹھائے جائیں گے۔ ۱۷-۲۱

تمہارا معبود ایک ہی معبود ہے۔ پر جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے ان کے دل منکر ہیں اور وہ گھمنڈ میں ہیں۔ لاریب خدا جانتا ہے جو کچھ وہ چھپاتے ہیں اور جو کچھ وہ ظاہر کرتے ہیں، وہ تکبر کرنے والوں کو ہرگز پسند نہیں کرتا۔ ۲۲-۲۳

۳۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

هُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَاۗءِ مَاۗءً لَّكُمْ مِّنْهُ شَرَابٌ وَّمِنْهُ شَجَرٌ فِيْهِ تُسِيْمُوْنَ (۱۰)

'اسامۃ' کے معنی مویشیوں کو چراگاہ کی طرف لے جانے کے ہیں۔

توحید کی دلیل توافق کے پہلو سے

آیت کا مطلب یہ ہے کہ وہی ایک خدا ہے جو آسمان سے پانی اتارتا ہے جس کو تم زمین پر بسنے والے پیتے بھی ہو اور اسی سے وہ جنگل جھاڑیاں اور نباتات بھی اگتی ہیں جن میں تم اپنے مال مویشی چراتے ہو۔ یہ صورت واقعہ اس بات کی شہادت دیتی ہے کہ آسمانوں کے خدا اور ہیں، زمین کے خدا اور، بلکہ اس بات کی شہادت دیتی ہے کہ ایک ہی خدائے قادر و قیوم آسمانوں اور زمین سب پر حکمران ہے۔ ظاہر ہے کہ آسمانوں اور زمین کا یہ توافق اس حقیقت کی کھلی شہادت ہے کہ ایک ہی حکیم و قدیر کا ارادہ آسمانوں اور زمین سب میں کارفرما ہے اور اس کی ربوبیت و پروردگاری کا خوان کرم اتنا وسیع ہے کہ انسان تو انسان، انسان کے کام آنے والے جانور بھی اس سے متمتع ہو رہے ہیں۔

يُنْۢبِتُ لَكُمْ بِهِ الزَّرْعَ وَالزَّيْتُوْنَ وَالنَّخِيْلَ وَالْاَعْنَابَ وَمِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ (۱۱)

آخرت کی دلیل ربوبیت کے پہلو سے

اسی پانی سے وہ کھیتی، زیتون، کھجور، انگور اور گوناگوں قسم کے پھلوں کے باغ پیدا کرتا ہے۔ فرمایا کہ اس میں بہت بڑی نشانی ہے ان لوگوں کے لیے جو تفکر و تدبر کریں۔ توحید کی دلیل، توافق کے پہلو سے، تو اس میں ہے ہی لیکن تفکر کرنے والوں کے لیے اس میں بہت بڑی نشانی آخرت کی بھی ہے اس لیے کہ گوناگون نعمتوں اور حکمتوں سے بھری ہوئی اس دنیا پر جب ایک حساس انسان غور کرتا ہے

تو وہ بے تحاشا پکار اٹھتا ہے کہ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا، اے رب تو نے حکمتوں اور رحمتوں سے یہ معمور عالم عبث اور بے غایت نہیں پیدا کیا ہے۔ اس کے باغایت و بامقصد ہونے کا لازمی تقاضا ہے کہ اس کے بعد ایک ایسا دن لائے جس میں ان لوگوں پر انعام فرمائے جنھوں نے اس میں اپنی ذمہ داریاں پہچانی اور اپنے فرائض ادا کیے ہوں اور ان لوگوں سے بازپرس کرے جنھوں نے ہوش و گوش سے عاری ایک شترِ بے مہار کی زندگی گزاری ہو۔

وَسَخَّرَ لَكُمُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ۖ وَالنُّجُومُ مُسَخَّرٰتٌۢ بِاَمْرِهٖ ۗ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ (١٢)

'سَخَّرَ لَكُمْ' کے معنی جیسا کہ ہم دوسرے مقامات میں واضح کر چکے ہیں، یہ ہیں کہ ان چیزوں کو خدا نے تمھاری خدمت اور نفع رسانی میں لگا رکھا ہے۔ لیکن یہ عجیب ماجرا ہے کہ خدا نے تو ان چیزوں کو تمھاری خدمت میں سرگرم کیا کہ تم اس کے شکرگزار بنو اور اس بات کو یاد رکھو کہ جس نے انسان کی نفع رسانی کے لیے اپنی یہ شانیں اور قدرتیں دکھائی ہیں وہ اس کو غیر مسئول اور مطلق العنان نہیں چھوڑے گا لیکن نادانوں نے یہ صحیح راہ اختیار کرنے کے بجائے، انھی سورج، چاند اور ستاروں کی پرستش شروع کر دی اور ان کے پیچھے اس خدا کو بھلا بیٹھے جو ان سب چیزوں کا خالق و مالک ہے۔

وَمَا ذَرَاَ لَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُخْتَلِفًا اَلْوَانُهٗ ۗ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّذَّكَّرُوْنَ (١٣)

ہر پتہ معرفتِ کردگار کا دفتر ہے

یعنی زمین میں جو بے شمار گوناگوں و بوقلموں انواع و اقسام کی چیزیں تمھارے فائدے کے لیے پھیلا رکھی ہیں ان کو بھی دیکھو اور ان پر غور کرو۔ ان کے اندر بھی یاددہانی حاصل کرنے والوں کے لیے بہت بڑی نشانی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ دنیا بالکل سپاٹ، چٹیل، یک رنگ بلکہ بالکل بے رنگ بھی ہو سکتی تھی لیکن ایسا نہیں ہے بلکہ اس کا گوشہ گوشہ عجائبِ قدرت سے معمور ہے۔ ایسا کیوں ہے؟ یہ اس لیے ہے کہ اس کے خالق نے یہ چاہا کہ انسان اس کے جس گوشہ پر بھی نظر ڈالے وہیں اس کو اس کے خالق کی قدرت و حکمت اور رحمت و ربوبیت کی کوئی نہ کوئی نشانی مل جائے اور وہ مصنوع سے صانع اور اس کی صفات کا درس حاصل کر سکے۔ گویا کہ پتہ پتہ معرفتِ کردگار کا دفتر ہے۔ ہر قدم پر صحیح نشانِ منزل کی طرف رہنمائی کرنے والی کوئی نہ کوئی نشانی موجود ہے۔ ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ یاددہانی کرنے والی چیزوں سے انسان یاددہانی حاصل کرے، آنکھیں بند کر کے نہ چلے بلکہ ایک ایک چیز کو دیکھے اور اس سے جو سبق حاصل ہوتے ہیں ان کو محفوظ رکھے۔

انسان کو دعوتِ تفکر و تذکر

یہاں یہ امر بھی ملحوظ رہے کہ انسان کی جو صلاحیتیں اس دنیا میں اس کی صحیح رہنمائی کرتی ہیں ان کو بالترتیب 'يَتَفَكَّرُوْنَ'، 'يَعْقِلُوْنَ'، اور 'يَذَّكَّرُوْنَ' سے تعبیر فرمایا ہے۔ یہ اعلیٰ سے ادنیٰ کی طرف نزول ہے۔ انسان کی سب سے اعلیٰ صفت تو یہ ہے کہ وہ اس کائنات میں تفکر کرے، اسی تفکر سے اس کو اس کثرت کے اندر وحدت کی طرف رہنمائی اور اس کائنات کی اصل غایت کی معرفت حاصل ہوتی ہے۔ یہ نہ ہو تو کم از کم یہ تو ہو

کہ وہ اپنی عقل سے کام لے اور اس کائنات کی ایک ایک چیز جس نشانِ منزل کی طرف انگلی اٹھا اٹھا کر اشارہ کر رہی ہے اس کی اس یاد دہانی سے فائدہ اٹھائے اور اندھے بھینسے کی طرح نہ چلے۔ انہی صفات کا حوالہ آگے اسی سورہ کی آیات ۶۵، ۶۷، ۶۹ میں بالترتیب 'یَسْمَعُوْنَ'، 'یَعْقِلُوْنَ'، اور 'یَتَفَکَّرُوْنَ' کے الفاظ سے آیا ہے۔ یہ ادنیٰ سے اعلیٰ کی طرف صعود ہے یعنی ایک معقول آدمی کے اندر کم از کم جو بات ہونی چاہیے وہ یہ ہے کہ وہ معقول بات کو سنے اور اس کو سمجھنے کی کوشش کرے اگر یہ نہ ہو تو وہ سرے سے آدمی ہی نہیں ہے بلکہ نرا دو ٹانگوں پر چلنے والا ایک جانور ہے۔ اور اس کا اعلیٰ وصف یہ ہے کہ وہ اس کائنات میں تفکر کرے اس لیے کہ اسی تفکر سے علمِ صحیح اور معرفتِ حقیقی کے دروازے کھلتے ہیں اور قرآن درحقیقت انسان کی اسی صلاحیت کو بیدار کرنا چاہتا ہے۔

وَهُوَ الَّذِیْ سَخَّرَ الْبَحْرَ لِتَاْکُلُوْا مِنْهُ لَحْمًا طَرِیًّا وَّتَسْتَخْرِجُوْا مِنْهُ حِلْیَةً تَلْبَسُوْنَهَا ۚ وَتَرَى الْفُلْکَ مَوَاخِرَ فِیْهِ وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَلَعَلَّکُمْ تَشْکُرُوْنَ (۱۴)

سمندر کی نشانیوں کی طرف اشارہ

تسخیرِ بحر سے مراد وہی ہے جس کا ذکر اوپر گزر چکا ہے۔ یعنی خدا نے سمندر کو تمہاری خدمت اور نفع رسانی میں لگا رکھا ہے کہ تمہیں اس سے تازہ گوشت بھی حاصل ہوتا ہے اور تم اپنی زینت کے لیے اسی سے قیمتی موتی بھی نکالتے ہو۔

'وَتَرَى الْفُلْکَ مَوَاخِرَ فِیْهِ وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ' یہاں قرینہ دلیل ہے کہ 'وَلِتَبْتَغُوْا' سے پہلے 'لِتَرْکَبُوْهَا' یا اس کے ہم معنی کوئی فعل محذوف ہے اور حرفِ عطف 'وَ' اس کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔

یعنی تم کشتیوں کو دیکھتے ہو کہ ایک گہرے اور موجزن سمندر کے اندر اس کے پانی کو چیرتی ہوئی چلتی ہیں تاکہ تم ان پر سوار ہو اور تجارتی سفر کر کے خدا کے فضل کے طالب اور اس کے شکرگزار ہو کہ اس نے اپنی قدرت و رحمت سے تمہارے لیے سمندر کے سینے پر سے نہایت مصفا سڑکیں نکال دی ہیں جن پر سے تمہارے بڑے بڑے جہاز گزرتے ہیں۔ مقصد یہ ہے کہ ہونا تو یہ چاہیے کہ خدا کے اس فضل و نعمت پر لوگ اس کے شکرگزار ہوں لیکن نادانوں نے ان دریاؤں اور سمندروں ہی کو دیوی دیوتا بنا کر ان کی پوجا اور عبادت شروع کر دی۔

وَاَلْقٰى فِی الْاَرْضِ رَوَاسِیَ اَنْ تَمِیْدَ بِکُمْ وَاَنْهٰرًا وَّسُبُلًا لَّعَلَّکُمْ تَهْتَدُوْنَ ۔ وَعَلٰمٰتٍ ؕ وَبِالنَّجْمِ هُمْ یَهْتَدُوْنَ (۱۵-۱۶)

اس میں اعلیٰ عربیت کے اسلوب کے مطابق کلام کے بعض اجزاء جو بغیر اظہار کے ظاہر تھے، وہ حذف ہیں۔ ہم نے ترجمہ میں ان کو کھول دیا ہے۔ 'اَنْهٰرًا وَّسُبُلًا' یعنی فَجَّرَ فِیْهَا اَنْهٰرًا وَمَهَّدَ فِیْهَا سُبُلًا۔ 'عَلٰمٰتٍ' یعنی جَعَلَ لِلسَّبِیْلِ عَلٰمٰتٍ۔

زمین اور آسمان کی نشانیوں کی

خدا نے زمین میں پہاڑوں کے لنگر ڈال دیے ہیں جو اس کے توازن کو قائم رکھے ہوئے ہیں۔ اس میں نہریں جاری کر دی ہیں جن سے طرح طرح کے فوائد حاصل ہوتے ہیں، راستے نکال دیے ہیں کہ ایک جگہ سے دوسری جگہ جا سکو

اور ان راستوں کو پہچاننے کے لیے مختلف قسم کی علامتیں (LAND MARKS) نصب کر دی ہیں کہ ان کا تعین کر سکو، پھر اسی پر بس نہیں، آسمان پر ستارے بھی چمک رہے ہیں جن سے صحراؤں کے سفر میں لوگ راستوں، سمتوں اور اوقات کے تعین میں رہنمائی حاصل کرتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ یہ ساری چیزیں تو خدا کی بنائی اور بخشی ہوئی ہیں تو عبادت و اطاعت خدا کی ہونی چاہیے یا خدا کے سوا ان چیزوں کی جنھوں نے کوئی چیز بھی نہیں بنائی۔

أَفَمَن يَخْلُقُ كَمَن لَّا يَخْلُقُ ۗ أَفَلَا تَذَكَّرُونَ (۱۷)

تذکر حقائق کے لازمی نتائج

اب یہ توحید اور جزا و سزا کے ان نتائج کی طرف توجہ دلائی جا رہی ہے جو اوپر کی بیان کردہ تمام نعمتوں سے نکلتے ہیں۔ فرمایا کہ کیا وہ جو تمام چیزیں پیدا کرتا ہے ان کی مانند ہو جائے گا جو نہ صرف یہ کہ کچھ پیدا نہیں کرتے بلکہ، جیسا کہ آگے آ رہا ہے، وہ مخلوق ہیں۔ 'اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ' یعنی یہ عقل کی کیسی موت ہے کہ اتنی موٹی سی بات بھی تمہاری سمجھ میں نہیں آ رہی ہے!

یہاں اس حقیقت پر نظر رہے کہ مشرکین عرب ان چیزوں کا، جن کی طرف اوپر توجہ دلائی گئی ہے، خالق خدا ہی کو مانتے تھے لیکن اس کے باوجود انہی مخلوقات میں سے بہت سی چیزوں کو وہ خدا کا شریک ٹھہراتے اور جو حقوق خاص خالق کے ہیں ان میں وہ ان کو حصہ دار بناتے اور اس طرح خالق کو اس کی مخلوقات کے برابر کر دیتے۔

وَإِن تَعُدُّوا نِعْمَةَ اللَّهِ لَا تُحْصُوهَا ۗ إِنَّ اللَّهَ لَغَفُورٌ رَّحِيمٌ (۱۸)

توبہ اور اصلاح کی دعوت

یعنی یہ نعمتیں جو گنائی گئی ہیں یہ تو خدا کی بے شمار نعمتوں میں سے چند ہیں۔ اگر تم خدا کی نعمتوں کو شمار کرنا چاہو تو ان کا احاطہ نہیں کر سکتے لیکن اس کے باوجود تم خدا کی ناشکری اور اس کے حقوق میں دوسروں کو شریک کرتے ہو۔ اپنی اس حرکت کے سبب سے تم سزاوار تو اس بات کے تھے کہ خدا تم کو فوراً ہر نعمت سے محروم کر دیتا لیکن اس نے تم کو مہلت دے رکھی ہے اس لیے کہ وہ بڑا ہی بخشنے والا اور مہربان ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ تم اس مہلت سے فائدہ اٹھا کر توبہ اور اصلاح کر لو اور اس کے غضب کے بجائے اس کی رحمت کے سزاوار بنو۔

وَاللَّهُ يَعْلَمُ مَا تُسِرُّونَ وَمَا تُعْلِنُونَ (۱۹)

تنبیہ و وعید

یہ تہدید و وعید ہے یعنی خدا نے اپنی رافت و رحمت کے سبب تمہیں ڈھیل تو دے رکھی ہے لیکن یہ یاد رکھو کہ وہ تمہارے ظاہر و باطن اور پوشیدہ و علانیہ سے اچھی طرح باخبر ہے۔ ایک دن آئے گا جب کوئی چیز ڈھکی چھپی نہیں رہ جائے گی۔ وہ رتی رتی کا حساب اور عدل کے ساتھ تمام معاملات کا فیصلہ کرے گا۔ اس میں ایک لطیف اشارہ اس حقیقت کی طرف بھی ہے کہ تم اچھی طرح جانتے ہو کہ نعمتیں سب اللہ ہی کی بخشی ہوئی ہیں لیکن جان کر انجان بنتے ہو، تمہارے دل مانتے لیکن زبانیں انکار کرتی ہیں۔ آگے اسی سورہ کی آیت ۸۳ میں یہ حقیقت یوں بیان ہوئی ہے۔ 'يَعْرِفُوْنَ نِعْمَتَ اللّٰهِ ثُمَّ يُنْكِرُوْنَهَا وَاَكْثَرُهُمُ الْكٰفِرُوْنَ' (وہ خدا کی نعمت کو پہچانتے ہیں، پھر اس سے ناآشنا بنتے ہیں اور ان میں سے اکثر ناشکرے ہیں)۔

وَالَّذِينَ يَدْعُونَ مِن دُونِ اللَّهِ لَا يَخْلُقُونَ شَيْئًا وَهُمْ يُخْلَقُونَ ۝ أَمْوَاتٌ غَيْرُ أَحْيَاءٍ

وَمَا يَشْعُرُونَ أَيَّانَ يُبْعَثُونَ (۲۰-۲۱)

معبودانِ باطل کی بے حقیقتی

ان دونوں آیتوں میں سے پہلی آیت تو تمام معبودانِ باطل سے متعلق عام ہے اور دوسری آیت خاص انھی آباء و اجداد سے متعلق ہے جن کی وہ پرستش کرتے تھے۔ فرمایا کہ اللہ کے سوا جن کو یہ پکارتے ہیں وہ کسی چیز کو پیدا نہیں کرتے بلکہ وہ خود مخلوق ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ایسوں کو حاجت روائی کے لیے پکارنا محض نادانی ہے۔ پھر ان کے ان آباؤ اجداد کی طرف جن کو انھوں نے معبود بنا رکھا تھا، اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ وہ تو مردہ ہیں، ان کو پتہ بھی نہیں کہ وہ کب اٹھائے جائیں گے۔ مطلب یہ کہ مردوں کو پکارنے سے حاصل! اَمْوَاتٌ کے ساتھ غَيْرُ أَحْيَاءٍ کی صفت تاکیدِ مزید کے طور پر ہے یعنی مردہ بے حس۔

إِلَٰهُكُمْ إِلَٰهٌ وَاحِدٌ فَالَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ قُلُوبُهُمْ مُنْكِرَةٌ وَهُمْ مُسْتَكْبِرُونَ (۲۲)

منکرین کے انکار کی اصل علت غرور ہے

یعنی یہ امر تو ایک حقیقتِ ثابتہ ہے کہ تمھارا معبود ایک ہی معبود ہے لیکن جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے ان کے دل اس کو ناگوار سمجھتے ہیں اور وہ گھمنڈ میں پڑے ہوئے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اصل حقیقت ان لوگوں سے مخفی نہیں ہے لیکن چونکہ آخرت پر ان لوگوں کا ایمان نہیں ہے اس وجہ سے یہ بے خوف ہیں اور یہ اس امر میں ہتک محسوس کر رہے ہیں کہ جن چیزوں کو وہ آباء و اجداد کے زمانے سے پوجتے آ رہے ہیں ان کو ایک شخص کے کہنے پر چھوڑ دیں۔ گویا سوال ایک شے کے حق یا باطل ہونے کا نہیں بلکہ اپنی آن و شان کا ہے۔ ان کے اندر یہ غرور سمایا ہوا ہے کہ ایک چیز کتنی ہی باطل سہی لیکن جب وہ اس کو برابر کرتے آئے ہیں تو اس کو چھوڑ کر خود اپنے قول و عمل سے اپنے باطل پر ہونے کا اقرار کیوں کریں۔

لَا جَرَمَ أَنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ مَا يُسِرُّونَ وَمَا يُعْلِنُونَ ۚ إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الْمُسْتَكْبِرِينَ (۲۳)

متکبرین خدا کے مبغوض ہیں

یعنی یقیناً اللہ ان کے اس باطنی محرک انکار اور ان کے اس ظاہری انکار دونوں کو جانتا ہے وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ ان کے دلوں میں استکبار کا خناس سمایا ہوا ہے اس وجہ سے وہ ایک حق کو حق مانتے ہوئے جھٹلا رہے ہیں اور ایک باطل سے اس کو باطل جانتے ہوئے چمٹے ہوئے ہیں۔ سو اللہ ایسے مغروروں اور متکبروں کو دوست نہیں رکھتا۔ 'دوست نہیں رکھتا' یعنی ان کو مبغوض رکھتا ہے۔

۴۔ آگے کا مضمون ــــــ آیات ۲۴-۳۲

آگے چند آیات میں پہلے انھی متکبرین کی، جن کا ذکر اوپر گزرا، ان سازشوں اور شرارتوں کا ذکر ہے جو وہ اپنے زیرِ اثر لوگوں کو قرآن کی دعوت سے روکنے کے لیے کر رہے تھے۔ ساتھ ہی ان کے اس انجام کا بھی ذکر ہے جو دنیا اور آخرت دونوں میں ان کی ان مفسدانہ کوششوں کے نتیجہ میں ان کے اور ان کی پیروی کرنے والوں کے سامنے آنے والا ہے۔ پھر ان کے مقابل میں ان متقیوں اور خدا ترسوں کا ذکر ہے جو قرآن کی دعوت کے علمبردار تھے اور دنیا و آخرت میں جو صلہ ان کی ان مساعی کا ملنے والا ہے اس کی طرف اشارہ ہے۔

آیات ۲۴-۳۲

وَإِذَا قِيلَ لَهُم مَّاذَآ أَنزَلَ رَبُّكُمْ ۙ قَالُوٓا۟ أَسَٰطِيرُ ٱلْأَوَّلِينَ ﴿٢٤﴾

لِيَحْمِلُوٓا۟ أَوْزَارَهُمْ كَامِلَةً يَوْمَ ٱلْقِيَٰمَةِ ۙ وَمِنْ أَوْزَارِ ٱلَّذِينَ

ع ۴ يُضِلُّونَهُم بِغَيْرِ عِلْمٍ ۗ أَلَا سَآءَ مَا يَزِرُونَ ﴿٢٥﴾ قَدْ مَكَرَ ٱلَّذِينَ مِن

قَبْلِهِمْ فَأَتَى ٱللَّهُ بُنْيَٰنَهُم مِّنَ ٱلْقَوَاعِدِ فَخَرَّ عَلَيْهِمُ ٱلسَّقْفُ مِن

فَوْقِهِمْ وَأَتَىٰهُمُ ٱلْعَذَابُ مِنْ حَيْثُ لَا يَشْعُرُونَ ﴿٢٦﴾ ثُمَّ يَوْمَ ٱلْقِيَٰمَةِ

يُخْزِيهِمْ وَيَقُولُ أَيْنَ شُرَكَآءِىَ ٱلَّذِينَ كُنتُمْ تُشَٰٓقُّونَ فِيهِمْ ۚ قَالَ

ٱلَّذِينَ أُوتُوا۟ ٱلْعِلْمَ إِنَّ ٱلْخِزْىَ ٱلْيَوْمَ وَٱلسُّوٓءَ عَلَى ٱلْكَٰفِرِينَ ﴿٢٧﴾ ٱلَّذِينَ

تَتَوَفَّىٰهُمُ ٱلْمَلَٰٓئِكَةُ ظَالِمِىٓ أَنفُسِهِمْ ۖ فَأَلْقَوُا۟ ٱلسَّلَمَ مَا كُنَّا نَعْمَلُ

مِن سُوٓءٍۭ ۚ بَلَىٰٓ إِنَّ ٱللَّهَ عَلِيمٌۢ بِمَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ ﴿٢٨﴾ فَٱدْخُلُوٓا۟

أَبْوَٰبَ جَهَنَّمَ خَٰلِدِينَ فِيهَا ۖ فَلَبِئْسَ مَثْوَى ٱلْمُتَكَبِّرِينَ ﴿٢٩﴾ وَقِيلَ

لِلَّذِينَ ٱتَّقَوْا۟ مَاذَآ أَنزَلَ رَبُّكُمْ ۚ قَالُوا۟ خَيْرًا ۗ لِّلَّذِينَ أَحْسَنُوا۟ فِى

هَٰذِهِ ٱلدُّنْيَا حَسَنَةٌ ۚ وَلَدَارُ ٱلْءَاخِرَةِ خَيْرٌ ۚ وَلَنِعْمَ دَارُ ٱلْمُتَّقِينَ ﴿٣٠﴾

جَنَّٰتُ عَدْنٍ يَدْخُلُونَهَا تَجْرِى مِن تَحْتِهَا ٱلْأَنْهَٰرُ ۖ لَهُمْ فِيهَا مَا

يَشَآءُونَ ۚ كَذَٰلِكَ يَجْزِى ٱللَّهُ ٱلْمُتَّقِينَ ﴿٣١﴾ ٱلَّذِينَ تَتَوَفَّىٰهُمُ ٱلْمَلَٰٓئِكَةُ

طَيِّبِينَ ۙ يَقُولُونَ سَلَٰمٌ عَلَيْكُمُ ٱدْخُلُوا۟ ٱلْجَنَّةَ بِمَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ ﴿٣٢﴾

ترجمۂ آیات ۲۴-۳۲

اور جب ان سے پوچھا جاتا ہے کہ تمھارے رب نے کیا چیز اتاری ہے تو کہتے ہیں اگلوں کے فسانے، تاکہ وہ قیامت کے دن اپنے بوجھ بھی پورے اٹھائیں اور ان لوگوں کے بوجھ میں سے بھی حصہ بٹائیں جن کو یہ بغیر کسی علم کے گمراہ کر رہے ہیں۔ جان رکھو کہ نہایت ہی برا ہوگا وہ بوجھ

جو یہ اٹھائیں گے۔ ۲۴-۲۵

ان سے پہلے والوں نے بھی چالیں چلیں تو خدا نے ان کی عمارت بنیاد سے اکھیڑ دی پس ان کے اوپر سے ان پر چھت آپڑی اور ان پر عذاب وہاں سے آیا جہاں سے ان کو گمان بھی نہ تھا۔ پھر قیامت کے دن اللہ ان کو رسوا کرے گا اور پوچھے گا کہ میرے وہ شریک کہاں ہیں جن کی حمایت میں تم لڑتے تھے۔ جن کو علم عطا ہوا وہ پکار اٹھیں گے کہ آج رسوائی اور بدبختی کافروں پر ہے۔ ان پر جن کو فرشتے اس حال میں وفات دیں گے کہ وہ اپنی جانوں پر ظلم ڈھا رہے ہوں گے تو اس وقت وہ سپر ڈال دیں گے کہ ہم تو کوئی برائی نہیں کر رہے تھے۔ ہاں، بے شک اللہ اچھی طرح باخبر ہے اس سے جو تم کرتے رہے ہو۔ اب جہنم کے دروازوں میں داخل ہو اسی میں ہمیشہ رہنے والے بن کر۔ پس کیا ہی برا ٹھکانا ہے تکبر کرنے والوں کا۔ ۲۶-۲۹

اور جو تقویٰ والے ہیں ان سے پوچھا جاتا ہے کہ تمہارے رب نے کیا چیز اتاری ہے تو وہ جواب دیتے ہیں کہ خوب چیز اتاری ہے۔ جن لوگوں نے بھلائی کی راہ اختیار کی ان کے لیے اس دنیا میں بھی بھلائی ہے اور دار آخرت تو اس سے کہیں بہتر ہے اور کیا ہی خوب ہے اہل تقویٰ کا گھر! ابد کے باغ جن میں وہ داخل ہوں گے، ان کے نیچے نہریں جاری ہوں گی، ان کے لیے ان میں وہ سب کچھ ہوگا جو چاہیں گے۔ اللہ اہل تقویٰ کو اسی طرح صلہ دے گا۔ ان کو جن کو فرشتے پاکیزہ حالت میں وفات دیتے ہیں، وہ کہتے ہیں آپ لوگوں پر سلامتی ہو جنت میں جا براجیے اپنے اعمال کے صلے میں۔ ۳۰-۳۲

۵- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَاِذَا قِیْلَ لَهُمْ مَّاذَآ اَنْزَلَ رَبُّكُمْ قَالُوْٓا اَسَاطِیْرُ الْاَوَّلِیْنَ (۲۴)

'اَسَاطِیْرُ' 'اُسْطُوْرَۃٌ' کی جمع ہے۔ 'اُسْطُوْرَۃٌ' بے اصل اور بے حقیقت بات کو کہتے ہیں جس کی حیثیت

محض افسانے کی ہو۔

قرآن کی دعوت کا ردِعمل قریش کے لیڈروں پر

قرآن کی دعوت بالخصوص رسولوں اور ان کے جھٹلانے والوں کی تاریخ، جو اس نے نہایت ہی صحیح پہلو سے نہایت ہی موثر انداز میں پیش کی، ایسی چیز نہیں تھی جو بے اثر رہ جائے۔ اس نے مکہ کے عوام و خواص اور بالتدریج سارے عرب میں ایک ہلچل برپا کر دی۔ عوام چونکہ سیادت و قیادت کے پندار سے پاک ہوتے ہیں اس وجہ سے صحیح چیز ان پر اثر انداز ہوتی ہے لیکن وہ اپنے لیڈروں کے تابع ہوتے ہیں اس وجہ سے خود کوئی فیصلہ کرنے سے پہلے ان کی رائے معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ وہ کیا کہتے ہیں۔ یہی صورتِ حال قرآن کی دعوت کے باب میں عرب میں پیش آئی۔ قرآن کی دعوت اور اس کے انذار نے جب لوگوں کو ہلا دیا تو عوام اپنے لیڈروں سے جا جا کر سوال کرنے لگے کہ یہ چیز، جو خدا کے نازل کردہ کلام کی حیثیت سے، آپ لوگوں کے سامنے پیش کی جا رہی ہے کیسی ہے، اس کے بارے میں آپ لوگوں کی کیا رائے ہے، اور اس میں اس کی تکذیب کا جو انجام بتایا گیا ہے اور جس کے حق میں تاریخ کے واقعات بھی پیش کیے گئے ہیں اس کی حقیقت آپ لوگوں کی نظر میں کیا ہے؟ لیڈروں نے یہ محسوس کر کے کہ ان کے پیرو اس سے متاثر ہو رہے ہیں اور یہ چیز ان کی لیڈری کے لیے خطرے کا باعث ہو سکتی ہے، ان کو مطمئن کرنے کے لیے یہ جواب دینا شروع کیا کہ اس میں اگلوں کے فسانوں اور ماضی کے قصوں کے سوا ہے کیا۔ مطلب یہ کہ عاد و ثمود اور ماضی قدیم کی قوموں کے بے اصل قصے اس میں اپنے رنگ میں دہرائے جا رہے ہیں۔ ان قصوں سے ہراساں ہونے کی ضرورت نہیں۔ ہماری روش بالکل ٹھیک ہے۔ ہم اپنے آباؤ اجداد کے صحیح دین پر ہیں۔ ان بے حقیقت افسانوں سے مرعوب ہو کر کہیں تم لوگ اس شخص کے چکمے میں نہ آ جانا جو اپنی من گھڑت باتیں خدا کے نام سے پیش کر رہا ہے۔

لِیَحْمِلُوْٓا اَوْزَارَهُمْ کَامِلَةً یَّوْمَ الْقِیٰمَةِ وَمِنْ اَوْزَارِ الَّذِیْنَ یُضِلُّوْنَهُمْ بِغَیْرِ عِلْمٍ ؕ اَلَا سَآءَ مَا یَزِرُوْنَ (۲۵)

مفسدین کی سعیٔ افساد کا انجام

یہ ان کی اس سعیٔ نامراد کا انجام بیان ہو رہا ہے جو وہ لوگوں کو حق سے روکنے کے لیے کر رہے تھے۔ فرمایا کہ یہ جو کچھ کر رہے ہیں اس کا انجام یہ ہونا ہے کہ قیامت کے روز یہ اپنی گمراہی کا پورا بوجھ تو اٹھائیں گے ہی اس لیے کہ اس دن ان کے وہ شرکاء و شفعاء ان کے کچھ کام آنے والے نہیں ہیں جن کو یہ شریک خدا بنائے بیٹھے ہیں، مزید برآں اپنی سعیٔ افساد کے بقدر ان کو ان لوگوں کے بوجھ میں سے بھی اٹھانا پڑے گا جو ان کی ان مفسدانہ کوششوں سے گمراہ ہوں گے۔

'وَمِنْ اَوْزَارِ الَّذِیْنَ یُضِلُّوْنَهُمْ بِغَیْرِ عِلْمٍ' میں 'مِنْ' تبعیض کے لیے ہے جس سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ کوئی شخص قیامت کے دن اس بنیاد پر کہ دوسرے نے اس کو گمراہ کیا ہے اپنی ذمہ داری سے کلیۃً بری نہیں ہو جائے گا بلکہ اسے بھی اپنی گمراہی کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جو شخص عقل و فہم سے بہرہ مند اور مکلف کے حکم میں داخل ہے اس کے لیے یہ عذر کافی نہیں ہے کہ دوسرے نے اس کو گمراہ کیا

اس وجہ سے وہ گمراہ ہو گیا۔ آخر اللہ تعالیٰ نے خود اس کو جو عقل و بصیرت عطا فرمائی تھی اس نے اس سے کیوں کام نہ لیا۔ اس وجہ سے جس طرح اس کا گمراہ کرنے والا اپنی حد تک اس کی گمراہی کا ذمہ دار ٹھہرے گا اور اس کی سزا بھگتے گا اسی طرح یہ بھی اپنی حد تک اپنی گمراہی کا ذمہ دار قرار پائے گا اور اس کا خمیازہ بھگتے گا۔

'بِغَیْرِ عِلْمٍ' کی قید سے ان کے اس جرم کی سنگینی واضح ہوتی ہے کہ ایک طرف تو رسول کی دعوت ہے جو اس علم حقیقی پر مبنی ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس پر اترا ہے، دوسری طرف یہ مفسدین ہیں جو بغیر کسی علم ہی کے لوگوں کی رہنمائی کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے ہیں اور ان کو ضلالت کے کھڈ میں گرا رہے ہیں۔

قَدْ مَكَرَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَاَتَى اللّٰهُ بُنْيَانَهُمْ مِّنَ الْقَوَاعِدِ فَخَرَّ عَلَيْهِمُ السَّقْفُ مِنْ فَوْقِهِمْ وَاَتٰىهُمُ الْعَذَابُ مِنْ حَيْثُ لَا يَشْعُرُوْنَ (۲۶)

'مکر' کا مفہوم 'مکر' کے معنی سازش اور چال کے ہیں، چونکہ ان مفسدین کی یہ تمام سرگرمیاں محض اپنی لیڈری کے تحفظ کے لیے تھیں، وہ دیدہ دانستہ حق کی مخالفت کر رہے تھے اس وجہ سے قرآن نے اس کو 'مکر' سے تعبیر فرمایا۔

ماضی کی معذب قوموں کی طرف اشارہ یہ اشارہ ہے ماضی کی ان قوموں کی طرف جنھوں نے اپنے رسولوں کی اسی طرح کے اغراض کے تحت مخالفت کی جس طرح کے اغراض کے تحت قریش کے لیڈر آنحضرت صلعم کی مخالفت کر رہے تھے۔ فرمایا کہ اس کی پاداش میں اللہ کے عذاب نے ان کی عمارتیں بنیاد سے اکھیڑ کر پھینک دیں اور ان پر اللہ کا عذاب وہاں سے آ دھمکا جہاں سے ان کو گمان بھی نہ تھا۔ اللہ کے رسول جب ان کو اللہ کے عذاب سے ڈراتے تو وہ اپنے اطمینان بخش حالات کے سبب سے حیران ہوتے کہ بھلا ہم پر عذاب کدھر سے آجائے گا۔ بالآخر جب وہ عذاب آگیا تب ان کو پتہ چلا کہ اس کے آنے کا راستہ یہ تھا۔ یہ امر ملحوظ رہے کہ یہ محض استعارہ نہیں بلکہ بیان واقعہ ہے۔ معذب قومیں زلزلوں اور باد تند و سیلاب کے ایسے طوفانوں سے ہلاک ہوئیں جن سے ان کے مکانوں کی دیواریں اور چھتیں سب ان کے اوپر آ پڑیں۔

ثُمَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُخْزِيْهِمْ وَيَقُوْلُ اَيْنَ شُرَكَآءِيَ الَّذِيْنَ كُنْتُمْ تُشَآقُّوْنَ فِيْهِمْ ۭ قَالَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ اِنَّ الْخِزْيَ الْيَوْمَ وَالسُّوْۗءَ عَلَي الْكٰفِرِيْنَ (۲۷)

قیامت کے دن مشرکین کی رسوائی 'خزی' کے معنی رسوائی کے ہیں۔ چونکہ ان مفسدین کے تمام فساد کا اصل سبب، جیسا کہ اوپر گزرا، تکبر تھا اس وجہ سے قیامت کے دن اللہ تعالیٰ ان کے اس تکبر کی پاداش میں ان کو ذلیل و رسوا کرے گا۔ 'وَيَقُوْلُ اَيْنَ شُرَكَآءِيَ الَّذِيْنَ كُنْتُمْ تُشَآقُّوْنَ فِيْهِمْ' یہ ان کی ذلت و رسوائی کی ایک شکل بیان ہوئی ہے کہ اللہ تعالیٰ ان سے کہے گا کہ اب دکھاؤ میرے وہ شریک کہاں ہیں جن کی حمایت میں تم ہر وقت آستینیں چڑھائے رہتے تھے۔ اس کی تفصیل آگے آیت ۸۶ میں یوں آئی ہے وَاِذَا رَاَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا شُرَكَاۗءَهُمْ قَالُوْا رَبَّنَا هٰٓؤُلَاۗءِ شُرَكَاۗؤُنَا الَّذِيْنَ كُنَّا نَدْعُوْا مِنْ دُوْنِكَ ۚ فَاَلْقَوْا اِلَيْهِمُ الْقَوْلَ اِنَّكُمْ لَكٰذِبُوْنَ (اور جب شرک کرنے والے اپنے شریکوں کو دیکھیں گے تو پکاریں گے کہ اے ہمارے رب یہ ہیں ہمارے وہ شریک جن کو تیرے سوا ہم پکارتے

تھے تو وہ ان کے منہ پر بات پھینک ماریں گے کہ تم لوگ بالکل جھوٹے ہو) ظاہر ہے کہ یہ ان کی رسوائی کی انتہا ہوگی کہ جن کی حمایت میں زندگی بھر اللہ و رسول کے مقابل میں آستینیں چڑھائے رہے وہ عین وقت پر اس طرح ان کو جھوٹا قرار دیں گے۔

قیامت کے روز اہل علم کا مسرت

قَالَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ اِنَّ الْخِزْيَ الْيَوْمَ وَالسُّوْٓءَ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ۔ اوپر ان مفسدین کا ذکر گزر چکا ہے جو بغیر کسی علم ہی کے لوگوں کو گمراہ کرنے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ اب یہ ان کے مقابل میں ان لوگوں کا ذکر ہے جن کو اللہ کے بخشے ہوئے علم میں سے حصہ ملا اور انھوں نے اس علم کی روشنی میں اپنے کو بھی منور کیا اور دوسروں کی بھی اس سے رہنمائی کی۔ فرمایا کہ یہ لوگ جب شرک کے علم برداروں کی یہ رسوائی دیکھیں گے تو خوشی سے پکار اٹھیں گے کہ آج رسوائی اور عذاب کافروں کا حصہ ہے۔ یعنی دنیا میں تو یہ بہت دندناتے رہے، آج اس غرور و بدمستی کا انجام دیکھیں گے

اَلَّذِيْنَ تَتَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ظَالِمِيْٓ اَنْفُسِهِمْ ۖ فَاَلْقَوُا السَّلَمَ مَا كُنَّا نَعْمَلُ مِنْ سُوْٓءٍ ۭ بَلٰٓى اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝ فَادْخُلُوْٓا اَبْوَابَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۭ فَلَبِئْسَ مَثْوَى الْمُتَكَبِّرِيْنَ (۲۸ - ۲۹)

کلام کا انطباق حال پر

یہ دو آیتیں بطور تضمین ہیں۔ اس تضمین سے اہل علم کی بات کی وضاحت کر دی گئی ہے کہ یہ صرف مستقبل کی ایک حکایت نہیں ہے بلکہ ان لوگوں پر بھی ٹھیک ٹھیک منطبق ہو رہی ہے جو آج اپنے غرور میں مست ہیں اور اسی حال میں مرتے ہیں۔

اَلَّذِيْنَ تَتَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ظَالِمِيْٓ اَنْفُسِهِمْ۔ یعنی انھیں کافروں کے حکم میں وہ سب داخل ہیں، جن کی جانیں فرشتے اس حال میں نکالتے ہیں کہ وہ اپنے کفر و شرک کی وجہ سے خود اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے ہوتے ہیں۔

'سلم' کے معنی

فَاَلْقَوُا السَّلَمَ مَا كُنَّا نَعْمَلُ مِنْ سُوْٓءٍ۔ 'سَلَم' 'تسلیم' سے اسم ہے جس کے معنی حوالگی اور سپردگی کے ہیں۔ فَاَلْقَوُا السَّلَمَ یعنی ڈگ ڈال دیں گے، سپر انداز ہو جائیں گے، صلح کی درخواست کریں گے۔

حوالگی اور سپردگی

پہلے مرحلہ ہی میں سارا نشہ ہرن

یعنی ان کا یہ سارا غرور اور گھمنڈ اور سارا طنطنہ صرف اس وقت تک ہے جب تک ان کو موت کے فرشتوں سے سابقہ پیش نہیں آتا جب ان سے سابقہ پیش آ جاتا ہے اور وہ ان کے مونہوں اور پیٹھوں پر مارتے ہوئے، جیسا کہ دوسرے مقام میں ذکر ہے، ان کی جانیں نکالتے ہیں تو پہلے ہی مرحلہ میں سارا نشہ ہرن ہو جاتا ہے اور وہ نہایت لجاجت سے درخواست کرتے اور جھوٹی معذرت پیش کرتے ہیں کہ ہم پر رحم کیا جائے ہم کوئی برائی نہیں کرتے رہے ہیں۔ بَلٰٓى اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ۔ فرشتوں کی طرف سے یہ جواب ملتا ہے کہ ہاں تم برائی کرتے رہے ہو، بے شک اللہ اس سے خوب باخبر ہے جو تم کرتے رہے ہو۔

متکبروں کا ابدی ٹھکانا

فَادْخُلُوْٓا اَبْوَابَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۭ فَلَبِئْسَ مَثْوَى الْمُتَكَبِّرِيْنَ۔ یعنی اسی وقت ان کو یہ خبر بھی دے دی جاتی ہے کہ اب جہنم کے دروازوں میں، اسی میں ہمیشہ رہنے کے لیے، داخل ہو، اب اس سے نکلنا

نصیب نہ ہوگا۔ یہی متکبروں کا ٹھکانا ہے اور نہایت برا ٹھکانا ہے۔ لفظ ابواب، جمع ہے جس سے جہنم کی وسعت کی طرف بھی اشارہ ہو رہا ہے اور اس سے یہ بات بھی نکلتی ہے کہ مجرمین اپنے اپنے جرائم کی حیثیت و نوعیت کے اعتبار سے اس میں الگ الگ دروازوں سے داخل ہوں گے۔

وَقِيلَ لِلَّذِينَ اتَّقَوْا مَاذَا أَنزَلَ رَبُّكُمْ ۚ قَالُوا خَيْرًا ۗ لِّلَّذِينَ أَحْسَنُوا فِي هَٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةٌ ۚ وَلَدَارُ الْآخِرَةِ خَيْرٌ ۚ وَلَنِعْمَ دَارُ الْمُتَّقِينَ (۳۰)

متکبرین کے بالمقابل متقین کا رویہ

اب یہ متکبرین کے مقابل میں، ان لوگوں کا رویہ بیان ہو رہا ہے جو خدا سے ڈرنے والے تھے۔ فرمایا کہ جب پوچھنے والے ان سے پوچھتے ہیں کہ خدا نے کیسی چیز اتاری ہے تو وہ اس کی نہایت تحسین کرتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ نہایت خوب چیز اتاری ہے۔ 'لِلَّذِينَ أَحْسَنُوا الآیہ' یہ ان متقیوں اور خوب کاروں کا وہ صلہ بیان ہوا ہے جو دنیا اور آخرت دونوں میں ان کو ملنے والا ہے۔ فرمایا کہ ان کے لیے دنیا میں بھی بھلائی اور کامیابی ہے اور آخرت کا تو پوچھنا ہی کیا ہے، وہ تو ہے ہی بہتر۔ 'وَلَنِعْمَ دَارُ الْمُتَّقِينَ' بالکل 'فَلَبِئْسَ مَثْوَى الْمُتَكَبِّرِينَ' کے مقابل میں ہے۔ جس طرح متکبرین کے ٹھکانے کے برے ہونے کی کوئی حد نہیں اسی طرح متقیوں کے گھر کے اچھے ہونے کی کوئی حد نہیں۔

رسولوں اور ان کے صحابہ کے لیے اس دنیا میں بھی کامیابی ہے

یہاں ان متقیوں کے لیے صریح الفاظ میں اس دنیا میں بھی کامیابی و نصرت کی بشارت ہے۔ اس کی وجہ جیسا کہ ہم دوسرے مقام میں واضح کر چکے ہیں، یہ ہے کہ رسول اور اس کے ساتھیوں کے لیے اس دنیا میں بھی غلبہ اور اقتدار لازمی ہے۔ آگے آیت ۴۱ کے تحت ہم اس کی مزید وضاحت کریں گے۔

جَنَّاتُ عَدْنٍ يَدْخُلُونَهَا تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ ۖ لَهُمْ فِيهَا مَا يَشَاءُونَ ۚ كَذَٰلِكَ يَجْزِي اللَّهُ الْمُتَّقِينَ (۳۱)

'جنّٰتِ عدن' کا مفہوم

'عدن' کے معنی توطن اور اقامت کے ہیں۔ یہ متقین کے گھر کی تعریف ہے کہ وہ اقامت اور توطن کے باغ ہوں گے۔ خدا کے متقی بندے ان میں محض وقتی سیر و تفریح کے لیے نہیں بلکہ ان میں ہمیشہ رہنے بسنے کے لیے داخل ہوں گے۔ فعل 'يَدْخُلُونَ' یہاں اپنے حقیقی اور کامل معنی میں ہے یعنی متقی ان باغوں میں عزت و اکرام کے ساتھ براجمان ہوں گے، ان میں ان کے لیے وہ سب کچھ حاضر ہوگا جو وہ چاہیں گے۔

'تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ' یہ ان باغوں کی تصویر و تعریف ہے۔ ایک اچھے باغ کا تصور یہ ہے کہ وہ بلندی پر ہو اور اس کے نیچے نہر جاری ہو۔ بلندی اس کے حسن کو دوبالا کرتی ہے اور نیچے بہنے والی نہر اس کی شادابی و زرخیزی کی ضامن ہوتی ہے۔

الَّذِينَ تَتَوَفَّاهُمُ الْمَلَائِكَةُ طَيِّبِينَ ۙ يَقُولُونَ سَلَامٌ عَلَيْكُمُ ادْخُلُوا الْجَنَّةَ بِمَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ (۳۲)

متقین کے ساتھ فرشتوں کا معاملہ

جس طرح اوپر والی آیت ۲۸ بطور تضمین ہے اسی طرح یہ آیت بھی بطور تضمین ہے جس سے کلام بالکل مطابق حال ہوگیا ہے۔ 'طَيِّبِينَ' بالکل 'ظَالِمِي أَنفُسِهِمْ' کے مقابل میں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ان 'مُتَّقِينَ' سے مراد

وہ لوگ ہیں جن کو فرشتے اس حال میں وفات دیتے ہیں کہ وہ شرک و کفر کی ہر آلائش سے بالکل پاک اور منزہ ہوتے ہیں۔ فرشتے ان کو سلام کرتے ہیں اور ان کو ان کے اعمال کے صلہ میں جنت کی بشارت سناتے ہیں

۶- آگے کا مضمون ـــــ آیات ۳۳-۴۷

متکبرین کی کج بحثیوں کا تردید اور اہل ایمان کو کامیابی کی بشارت

آگے انہی متکبرین کی ان کج بحثیوں کا حوالہ اور ان کی تردید ہے جو وہ اپنے رویہ کی حمایت و مدافعت میں کرتے تھے اور ساتھ ہی پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہؓ کو استقامت اور اللہ پر بھروسہ قائم رکھنے کی تلقین کی گئی ہے اور یہ اطمینان دلایا گیا ہے کہ آزمائشوں کے دور سے گزرنے کے بعد بالآخر فتح و کامیابی انہی کا حصہ ہے۔ آیات کی تلاوت کیجیے۔

آیات ۳۳-۴۷

هَلْ يَنْظُرُونَ إِلَّا أَنْ تَأْتِيَهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ أَوْ يَأْتِيَ أَمْرُ رَبِّكَ ۚ
كَذٰلِكَ فَعَلَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۚ وَمَا ظَلَمَهُمُ اللّٰهُ وَلٰكِنْ
كَانُوٓا أَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ ﴿۳۳﴾ فَأَصَابَهُمْ سَيِّاٰتُ مَا عَمِلُوا وَ
ع ۹ ۱۰ حَاقَ بِهِمْ مَا كَانُوا بِهٖ يَسْتَهْزِءُونَ ﴿۳۴﴾ وَقَالَ الَّذِينَ أَشْرَكُوا
لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا عَبَدْنَا مِنْ دُونِهٖ مِنْ شَيْءٍ نَحْنُ وَلَآ اٰبَآؤُنَا
وَلَا حَرَّمْنَا مِنْ دُونِهٖ مِنْ شَيْءٍ ۚ كَذٰلِكَ فَعَلَ الَّذِينَ مِنْ
قَبْلِهِمْ ۚ فَهَلْ عَلَى الرُّسُلِ إِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِينُ ﴿۳۵﴾ وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِي
كُلِّ أُمَّةٍ رَسُولًا أَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوتَ ۚ فَمِنْهُمْ
مَنْ هَدَى اللّٰهُ وَمِنْهُمْ مَنْ حَقَّتْ عَلَيْهِ الضَّلٰلَةُ ۚ فَسِيرُوا فِي
الْأَرْضِ فَانْظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِينَ ﴿۳۶﴾ إِنْ تَحْرِصْ
عَلٰى هُدٰهُمْ فَإِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي مَنْ يُضِلُّ وَمَا لَهُمْ مِنْ
نّٰصِرِينَ ﴿۳۷﴾ وَأَقْسَمُوا بِاللّٰهِ جَهْدَ أَيْمَانِهِمْ ۙ لَا يَبْعَثُ اللّٰهُ مَنْ

يَمُوتُ بَلٰى وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۳۸﴾
لِيُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِيْ يَخْتَلِفُوْنَ فِيْهِ وَلِيَعْلَمَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنَّهُمْ
كَانُوْا كٰذِبِيْنَ ﴿۳۹﴾ اِنَّمَا قَوْلُنَا لِشَيْءٍ اِذَآ اَرَدْنٰهُ اَنْ نَّقُوْلَ
لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ﴿۴۰﴾ وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا فِي اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا ظُلِمُوْا ع ۵ ۶ ۱۱
لَنُبَوِّئَنَّهُمْ فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً ۭ وَلَاَجْرُ الْاٰخِرَةِ اَكْبَرُ ۘ لَوْ كَانُوْا وقف لازم
يَعْلَمُوْنَ ﴿۴۱﴾ الَّذِيْنَ صَبَرُوْا وَعَلٰي رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ﴿۴۲﴾ وَمَآ اَرْسَلْنَا
مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْٓ اِلَيْهِمْ فَسْـَٔـلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ
لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۴۳﴾ بِالْبَيِّنٰتِ وَالزُّبُرِ ۭ وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ
لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ ﴿۴۴﴾ اَفَاَمِنَ الَّذِيْنَ النصف
مَكَرُوا السَّيِّاٰتِ اَنْ يَّخْسِفَ اللّٰهُ بِهِمُ الْاَرْضَ اَوْ يَاْتِيَهُمُ الْعَذَابُ
مِنْ حَيْثُ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۴۵﴾ اَوْ يَاْخُذَهُمْ فِيْ تَقَلُّبِهِمْ فَمَا هُمْ
بِمُعْجِزِيْنَ ﴿۴۶﴾ اَوْ يَاْخُذَهُمْ عَلٰي تَخَوُّفٍ ۭ فَاِنَّ رَبَّكُمْ لَرَءُوْفٌ
رَّحِيْمٌ ﴿۴۷﴾

یہ لوگ تو بس اس بات کے منتظر ہیں کہ ان کے پاس فرشتے آئیں یا تیرے رب کا حکم ہی ترجمۂ آیات
آجائے۔ یہی روش ان سے پہلے والوں نے اختیار کی۔ اور اللہ نے ان پر ظلم نہیں کیا بلکہ وہ خود ۳۳ - ۴۷
اپنی جانوں پر ظلم ڈھاتے رہے۔ تو ان کو ان کے کیے کی سزائیں پہنچیں اور جس چیز کا وہ مذاق اڑا
رہے تھے اسی چیز نے ان کو گھیر لیا۔ ۳۳-۳۴

اور جن لوگوں نے شرک کیا وہ کہتے ہیں، اگر اللہ چاہتا تو ہم اس کے سوا کسی چیز کو نہ پوجتے،

نہ ہم نہ ہمارے آباء و اجداد، اور نہ ہم اس کے بغیر کسی چیز کو حرام ٹھہراتے۔ یہی روِیہ ان سے پہلے والوں نے اختیار کیا تو رسولوں پر واضح طور پر پہنچا دینے کے سوا اور کوئی ذمہ داری نہیں۔ اور ہم نے ہر امت میں ایک رسول اس دعوت کے ساتھ بھیجا کہ اللہ ہی کی بندگی کرو اور طاغوت سے بچو تو ان میں سے کچھ کو اللہ نے ہدایت بخشی اور ان میں ایسے بھی ہوئے جن پر ضلالت مسلط ہو کے رہی۔ تو ملک میں چلو پھرو اور دیکھو کہ کیا ہوا جھٹلانے والوں کا انجام۔ ۳۵-۳۶

اگر تم ان کی ہدایت کے حریص ہو تو اللہ ایسوں کو ہدایت نہیں دیا کرتا جن کو گمراہ کر دیتا ہے اور ان کا کوئی مددگار نہیں بنتا۔ ۳۷

اور یہ پکی پکی قسمیں کھا کر کہتے ہیں کہ جو مر جاتا ہے اللہ اس کو نہیں اٹھائے گا۔ ہاں، یہ اس کے اوپر ایک لازمی وعدہ ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔ یہ اس لیے ہے کہ یہ جس چیز میں اختلاف کر رہے ہیں اس کو وہ اچھی طرح واضح کر دے اور تاکہ جن لوگوں نے کفر کیا ہے وہ جان لیں کہ وہ جھوٹے تھے۔ جب ہم کسی چیز کا ارادہ کرتے ہیں تو اتنا ہی ہمارا کہنا ہوتا ہے کہ ہم اس کو کہتے ہیں ہو جا تو وہ ہو جاتی ہے۔ ۳۸-۴۰

اور جن لوگوں نے اللہ کی راہ میں ہجرت کی بعد اس کے کہ ان پر ظلم ڈھائے گئے ہم ان کو دنیا میں بھی اچھی طرح متمکن کریں گے اور آخرت کا اجر تو اس سے کہیں بڑھ کر ہے، کاش وہ جانتے! یہ ان مہاجرین کے لیے ہے جنھوں نے استقامت دکھائی اور اپنے رب پر بھروسہ رکھتے ہیں۔ ۴۱-۴۲

اور ہم نے تم سے پہلے بھی آدمیوں ہی کو دلائل اور کتابوں کے ساتھ رسول بنا کر بھیجا جن کی طرف ہم وحی کرتے رہے تو اہل علم سے پوچھ لو اگر تم نہیں جانتے اور ہم نے تم پر بھی یاددہانی اتاری تاکہ تم لوگوں پر اس چیز کو اچھی طرح واضح کر دو جو ان کی طرف اتاری گئی ہے اور تاکہ وہ غور کریں۔ ۴۳-۴۴

کیا وہ لوگ جو بری بری چالیں چل رہے ہیں اس بات سے نچنت ہیں کہ اللہ ان کو سمیت زمین کو دھنسا دے یا ان پر عذاب وہاں سے آدھمکے جہاں سے ان کو گمان بھی نہ ہو یا ان کو چلتے پھرتے پکڑ لے تو وہ اس کے قابو سے باہر نہیں نکل سکتے یا ان کو عین اندیشہ کی حالت میں دھر لے پس تمھارا پروردگار بڑا ہی شفیق و رحیم ہے۔ ۴۵-۴۷

۷۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ تَاْتِيَهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَوْ يَاْتِيَ اَمْرُ رَبِّكَ ۭ كَذٰلِكَ فَعَلَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۭ وَمَا ظَلَمَهُمُ اللّٰهُ وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ۝ فَاَصَابَهُمْ سَيِّاٰتُ مَا عَمِلُوْا وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ (۳۳-۳۴)

(تاریخ سے سبق لینے کی دعوت) یعنی یہ منکرین تمھاری باتوں کی تصدیق کے لیے اس وقت تک تیار نہیں ہیں جب تک ان کے پاس فرشتے نہ آئیں یا ان پر وہ عذاب ہی نہ آجائے جس کی ان کو خبر دی جا رہی ہے۔ كَذٰلِكَ فَعَلَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ، یعنی یہی روش ان سے پہلے کی قوموں نے اپنے رسولوں کے ساتھ اختیار کی، نتیجہ یہ ہوا کہ ان پر عذاب الٰہی آدھمکا اور اس نے ان کو تباہ کر کے رکھ دیا۔ یہی حشر ان کا بھی ہونا ہے اگر انھوں نے اپنی روش نہ بدلی۔ وَمَا ظَلَمَهُمُ اللّٰهُ وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ، یعنی یہ پچھلی قومیں ہلاک ہوئیں تو اپنی ضد اور سرکشی کے سبب سے ہلاک ہوئیں۔ خدا نے ان پر کوئی ظلم نہیں کیا اس لیے کہ ان کو پہلے سے تمام نتائج و عواقب سے اس نے آگاہ کر دیا تھا بلکہ انھوں نے خود اپنی جانوں پر ظلم ڈھائے کہ تنبیہ و تذکیر سے فائدہ اٹھانے کے بجائے عذاب کا مطالبہ کیا اور اپنے رسولوں کی تنبیہات کا مذاق اڑاتی رہیں۔

فَاَصَابَهُمْ سَيِّاٰتُ مَا عَمِلُوْا وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ، یعنی ان پر جو عذاب آئے وہ ان کے اپنے اعمال کے نتیجے تھے۔ خدا نے ان کو وہی چیز دکھا دی جو انھوں نے اپنے لیے مہیا کی تھی۔

(مشرکین کی بعض کج بحثیوں کا جواب) وَقَالَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا لَوْ شَاۗءَ اللّٰهُ مَا عَبَدْنَا مِنْ دُوْنِهٖ مِنْ شَيْءٍ نَّحْنُ وَلَآ اٰبَاۗؤُنَا وَلَا حَرَّمْنَا مِنْ دُوْنِهٖ مِنْ شَيْءٍ ۭ كَذٰلِكَ فَعَلَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۚ فَهَلْ عَلَي الرُّسُلِ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ (۳۵)

یہ بھی ان لوگوں کی کج بحثی کی ایک مثال ہے۔ یعنی یہ مشرکین تمھیں زچ کرنے کے لیے کہتے ہیں کہ ہم جن معبودوں کو پوجتے اور ان کے نام پر جن چیزوں کو حرام ٹھہرائے ہیں یہ سب خدا ہی کی مرضی سے کرتے ہیں، ورنہ خدا کے اختیار میں تو سب کچھ ہے، اگر ہمارے یہ کام اس کی مرضی کے خلاف ہوتے تو وہ ہمیں اپنی قدرت سے ان

کاموں سے روک دیتا اور ہم ان میں ایک کام بھی نہ کر پاتے۔ کَذٰلِكَ فَعَلَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ، یعنی یہ بھی کوئی نئی بات نہیں بلکہ ان سے پہلے جو قومیں گزری ہیں انھوں نے بھی اسی طرح کی کج بحثیوں سے اپنے رسولوں کو چپ کرنے کی کوشش کی۔ مطلب یہ ہے کہ جب انھوں نے انہی کی روش اختیار کی ہے تو لازماً انہی کے انجام سے بھی دوچار ہوں گے۔ فَهَلْ عَلَى الرُّسُلِ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِیْنُ یعنی اگر وہ تمھاری سچائی کی دلیل اس بات کو سمجھتے ہیں کہ تم اپنے تصرف سے ان کو اس دین کی راہ پر لگا دو جس کی ان کو دعوت دے رہے ہو تو رسولوں کا کام یہ نہیں ہوتا، ان کا کام صرف واضح طور پر لوگوں تک دین حق پہنچا دینا ہوتا ہے، یہ کام تم کر رہے ہو اور اسی پر تمھاری ذمہ داری ختم ہو جاتی ہے۔ حق کو قبول کرنا یا نہ کرنا ان کی اپنی ذمہ داری ہے اور اس کے لیے عند اللہ وہی مسئول ہوں گے۔ اللہ کا یہ طریقہ نہیں ہے کہ وہ حق یا باطل میں سے کسی چیز پر لوگوں کو مجبور کر دے بلکہ اس نے لوگوں کو اختیار بخشا ہے۔ اگر کوئی شخص حق کی راہ اختیار کرتا ہے تو اس کو اسی راہ کی توفیق ملتی ہے اور اگر کوئی شخص باطل کی راہ پر چل پڑتا ہے تو اللہ اس کو اسی راہ میں ڈھیل دے دیتا ہے۔

وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِیْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ هَدَى اللّٰهُ وَمِنْهُمْ مَّنْ حَقَّتْ عَلَیْهِ الضَّلٰلَةُ ۚ فَسِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَیْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِیْنَ (۳۶)

لفظ طاغوت کی تحقیق بقرہ آیت ۲۵۶ کے تحت گزر چکی ہے۔

اللہ کے ہر رسول نے اللہ ہی کی بندگی کی دعوت دی

آیت کا مطلب یہ ہے کہ اگر ان لوگوں کے اس قول کا منشا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے رسولوں نے اسی کفر و شرک کی تعلیم دی ہے جس پر وہ ہیں تو یہ بات بالکل خلاف واقعہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ہر رسول نے صرف اللہ ہی کی بندگی اور طاغوت سے اجتناب کی تعلیم دی ہے تو جس نے ہدایت کی راہ پسند کی اس کو ہدایت کی توفیق ملی اور جو اپنی ضلالت ہی پر جما رہ گیا اس پر ضلالت پوری طرح مسلط ہو گئی۔ فَسِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ، یعنی جن لوگوں نے ان رسولوں کی تکذیب کی ان کی اس تکذیب کے انجام کے آثار اس سرزمین میں موجود ہیں تو ان آثار کا مشاہدہ کرو اور ان سے سبق لو۔

اِنْ تَحْرِصْ عَلٰی هُدٰىهُمْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا یَهْدِیْ مَنْ یُّضِلُّ وَمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِیْنَ (۳۷)

پیغمبر صلعم کو تسلی

یہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تسلی ہے۔ آپ کو اپنی قوم کی ہدایت کی شدید تمنا تھی اس وجہ سے آپ ان کے پیچھے اپنے رات دن ایک کیے ہوئے تھے اللہ تعالیٰ نے آپ کو تسلی دی کہ جو لوگ خدا کے قانون ضلالت کی زد میں آ چکے ہیں اب ان کو ہدایت نصیب نہیں ہو سکتی۔ ایسوں کا کوئی مددگار نہیں بنتا۔ خدا ہدایت انہی لوگوں کو بخشتا ہے جو اپنی فطری صلاحیتیں اس کے لیے استعمال کرتے اور اس کے طلب گار بنتے ہیں۔

وَاَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَیْمَانِهِمْ ۙ لَا یَبْعَثُ اللّٰهُ مَنْ یَّمُوْتُ ؕ بَلٰی وَعْدًا عَلَیْهِ حَقًّا وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ (۳۸)

منکرین کی قسم کی تردید

وَاَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ، اي بالغوا في اليمين واجتهدوا۔ یعنی انھوں نے قسم کھانے میں مبالغہ کیا اور اپنا پورا زور لگایا۔

منکرین کا انکار آخرت میں غلو

ایمان کے موانع میں سے ایک بڑا مانع قریش کے منکرین کے لیے یہ بھی تھا کہ وہ مرنے کے بعد کی زندگی کے نہ تو قائل تھے اور نہ اس کے قائل ہونا چاہتے تھے۔ وہ بڑے زور و شور سے قسمیں کھا کھا کے اپنے زیر اثر لوگوں کو مطمئن کرنے کی کوشش کرتے کہ مرنے کے بعد دوبارہ اٹھایا جانا ناممکن ہے، اللہ کسی کو نہیں اٹھائے گا۔ یہ محض محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی دھونس ہے۔

بَلٰى وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ، یہ ان کی تردید ہے اور اس تردید میں بھی وہی شدت ہے جو منکرین کے قول میں ہے۔ فرمایا کہ ہاں وہ لوگوں کو ضرور اٹھائے گا۔ یہ اللہ کا حتمی وعدہ ہے جس کا ایفا اس نے اپنے اوپر لازم کر رکھا ہے لیکن اکثر لوگ اس سے واقف نہیں ہیں اس وجہ سے وہ اس کا انکار کرتے یا مذاق اڑا رہے ہیں۔

لِيُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِيْ يَخْتَلِفُوْنَ فِيْهِ وَلِيَعْلَمَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنَّهُمْ كَانُوْا كٰذِبِيْنَ (۳۹)

قیامت کی ضرورت

یہ مرنے کے بعد دوبارہ اٹھائے جانے کی ضرورت واضح فرمائی ہے کہ یہ اس لیے ہوگا کہ جن چیزوں کے بارے میں آج وہ اختلاف کر رہے ہیں ان میں امر حق اچھی طرح واضح ہو جائے اور جن لوگوں نے جانتے بوجھتے دھاندلیاں مچائی ہیں وہ اپنے کیے کا انجام اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں۔ وَلِيَعْلَمَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنَّهُمْ كَانُوْا كٰذِبِيْنَ اور یہ اس لیے بھی ہوگا کہ جو لوگ آج قسمیں کھا کھا کے لوگوں کو مطمئن کرنے کی کوشش کر رہے ہیں کہ قیامت نہیں ہے وہ اچھی طرح جان لیں کہ وہ جھوٹے تھے اور انھوں نے جھوٹی قسمیں کھائیں۔

قیامت کلمۂ کن سے وجود میں آئے گی

اِنَّمَا قَوْلُنَا لِشَيْءٍ اِذَآ اَرَدْنٰهُ اَنْ نَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ (۴۰)

یہ اس استبعاد کو رفع فرمایا ہے جس کی بنا پر کفار قیامت کا انکار کرتے تھے۔ فرمایا کہ ہم جب کوئی کام کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں اس کے لیے کسی اہتمام و انتظام کی ضرورت پیش نہیں آتی، ہم تو بس اتنا کہتے ہیں کہ ہو جا اور وہ کام ہو جاتا ہے تو ہمارے لیے لوگوں کو دوبارہ اٹھا کھڑا کرنا کیا مشکل ہے۔

وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا فِي اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا ظُلِمُوْا لَنُبَوِّئَنَّهُمْ فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً ۭ وَلَاَجْرُ الْاٰخِرَةِ اَكْبَرُ ۘ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ۝ الَّذِيْنَ صَبَرُوْا وَعَلٰي رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ (۴۱-۴۲)

مہاجرین حبشہ کی تحسین

یہ بات بھی یہاں قیامت کی ضرورت اور اس کے مقاصد کے تحت ہی بیان ہوئی ہے مطلب یہ ہے کہ آخر خدا کے بندے وہ بھی تو ہیں جو آج اس کی راہ میں، اس کے دین کی خاطر، طرح طرح کے مصائب و شدائد کا ہدف بنے ہوئے ہیں، یہاں تک کہ وہ مجبور ہو کر محض اپنے دین کو بچانے کی خاطر اپنے وطن اور گھر در کو چھوڑ کر ایک غیر ملک حبشہ کی طرف ہجرت کر گئے ہیں۔ کیا اللہ ان لوگوں کو ان کی ان جانبازیوں کا صلہ نہیں دے گا؟ ضرور دے گا۔ دنیا میں بھی ان کو اچھی طرح متمکن کرے گا اور

آخرت کا اجر تو اس سے کہیں بڑھ چڑھ کر ہے۔ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ' یعنی جو لوگ اللہ کے اس وعدے کی قدر و قیمت اور اس اجر آخرت کی عظمت سے واقف نہیں ہیں وہ جو چاہیں سمجھیں کاش وہ اس سے واقف ہوتے۔ اگر واقف ہوتے تو انہیں اندازہ ہوتا کہ جن لوگوں کو وہ محروم سمجھ رہے ہیں انھوں نے دنیا اور آخرت دونوں کی کتنی بڑی بازی جیتی ہے۔

اَلَّذِيْنَ صَبَرُوْا وَعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ۔ یہ انہی مہاجرین کی تعریف ہے کہ انھوں نے اللہ کی راہ میں ہر قسم کے مصائب جھیلے لیکن متزلزل نہیں ہوئے بلکہ اپنے موقف حق پر ڈٹے رہے اور جب گھر چھوڑنے تک نوبت آگئی تو اللہ کے بھروسہ پر دامن جھاڑ کر اٹھ گئے، ذرا اس بات کی پروا نہیں کی کہ کیا کھائیں گے اور کہاں سر چھپائیں گے۔

ہجرت کی حقیقت

ان آیتوں سے ہجرت کی حقیقت بھی واضح ہوتی ہے کہ ہر نقل مکان کو ہجرت نہیں کہتے۔ ہجرت یہ ہے کہ آدمی اپنے دین کے معاملے میں ستایا جائے یہاں تک کہ وہ اپنا محبوب وطن اور اپنا عزیز آشیانہ چھوڑ کر وہاں سے نکلنے اور دوسری سرزمین کو اپنی پناہ گاہ بنانے پر مجبور ہو جائے۔ اس راہ میں صبر کا مفہوم یہ ہے کہ خواہ اس کے سر پر آرے ہی کیوں نہ چل جائیں لیکن دین حق کی جو نعمت اس کو مل چکی ہے وہ اس سے دستبردار ہونے پر آمادہ نہ ہو اور توکل کا مفہوم یہ ہے کہ خواہ حالات کتنے ہی نامساعد کیوں نہ ہوں لیکن وہ یہ اعتماد رکھے کہ اللہ اس کو تنہا نہیں چھوڑے گا بلکہ اس کی دستگیری فرمائے گا۔ یہی صبر و توکل ہجرت کی راہ میں زاد راہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔

منتظرین عذاب کو جواب

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْٓ اِلَيْهِمْ فَسْـَٔلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ۴۳

یہ ان لوگوں کا جواب ہے جن کا ذکر اوپر آیت ۳۳ میں گزرا ہے کہ وہ منتظر ہیں کہ ان کے پاس فرشتے آئیں یا اللہ کا عذاب ہی آجائے۔ پہلے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے فرمایا کہ تم سے پہلے جتنے بھی رسول آئے ہیں سب بشر ہی تھے، بس یہ امتیاز ان کو حاصل ہوتا تھا کہ ان پر ہم اپنی وحی نازل کرتے تھے۔ پھر معترضین کو خطاب کر کے فرمایا کہ اگر تم اس حقیقت سے بے خبر ہو تو جو پہلے کے حاملین کتاب ہیں ان سے پوچھ دیکھو وہ تمھیں بتائیں گے کہ انسانوں کے اندر منصب رسالت پر بشر ہی فائز ہوتے رہے ہیں، فرشتے نہیں فائز ہوتے رہے ہیں۔

بِالْبَيِّنٰتِ وَالزُّبُرِ ۭ وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ ۴۴

'بِالْبَيِّنٰتِ وَالزُّبُرِ' یعنی یہ رسول جو آتے رہے ہیں دلائل اور صحیفوں کے ساتھ ہی آتے رہے ہیں، عذاب الٰہی لے کر نہیں آتے رہے ہیں جس کا مطالبہ یہ لوگ کر رہے ہیں۔

کتاب الٰہی اللہ کی ایک عظیم نعمت ہے

وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ الاية یعنی جس طرح ہم نے پچھلے رسولوں کو دلائل اور صحیفوں کے ساتھ بھیجا اسی طرح تم پر بھی اپنی یاددہانی (کتاب) اتاری تاکہ تم لوگوں پر اس چیز کو اچھی طرح واضح کر دو جو ان کی طرف اتارا گیا

گئی ہے اور وہ اختلاف رفع ہو جس میں وہ اپنے دین سے متعلق مبتلا ہو گئے تھے۔ اوپر آیت ۳۹ پر ایک نظر پھر ڈال لیجیے۔ 'وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ' یعنی کتاب اتارنے کا یہ مقصد بھی ہے کہ اس پر وہ غور کریں تاکہ ان کی کجرویوں اور گمراہیوں کی اصلاح ہو۔ اگر عذاب آگیا تو اس چیز کا موقع ان کے لیے باقی نہیں رہے گا۔ یہ تو اللہ کا بہت بڑا فضل و احسان ہے کہ اس نے عذاب کے بجائے کتاب اتاری جو رفع اختلاف کے لیے روشنی اور عقل کے لیے رہنمائی ہے تو انھیں چاہیے کہ اس نعمت پر وہ اپنے رب کے شکرگزار ہوں، اس پر ایمان لائیں، اس سے ہدایت حاصل کریں اور عذاب کے لیے جلدی نہ مچائیں۔

أَفَأَمِنَ الَّذِينَ مَكَرُوا السَّيِّئَاتِ أَنْ يَخْسِفَ اللَّهُ بِهِمُ الْأَرْضَ أَوْ يَأْتِيَهُمُ الْعَذَابُ مِنْ حَيْثُ لَا يَشْعُرُونَ ۝ أَوْ يَأْخُذَهُمْ فِي تَقَلُّبِهِمْ فَمَا هُمْ بِمُعْجِزِينَ ۝ أَوْ يَأْخُذَهُمْ عَلَىٰ تَخَوُّفٍ فَإِنَّ رَبَّكُمْ لَرَءُوفٌ رَحِيمٌ (۴۵-۴۷)

مطالبۂ عذاب پر اظہارِ تعجب

یہ ان کے مطالبۂ عذاب پر اظہارِ تعجب اور ان کو ملامت ہے کہ اگر وہ عذاب کا مطالبہ کر رہے ہیں تو کس بوتے پر کر رہے ہیں؟ خدا جہاں سے چاہے ان کو پکڑ لے۔ اس کی پکڑ سے بچنے کا انھوں نے کیا سامان کر رکھا ہے؟ اگر خدا چاہے تو ان کے سمیت زمین کو دھنسا دے یا ان پر عذاب وہاں سے آدھمکے جہاں سے ان کو گمان بھی نہ ہو، یا چاہے تو عین ان کی آمد و شد کے دوران میں ان کو دھر لے، اگر وہ ایسا کرے جب بھی وہ اس کے قابو سے باہر نہیں نکل سکتے۔ اسی طرح اگر وہ چاہے تو عین اس وقت ان کو پکڑ لے جبکہ وہ خطرے کو پوری طرح محسوس کر رہے ہوں اور اس کے لیے بیدار ہوں۔ غرض ہر حالت میں ان کو پکڑ سکتا ہے اگر وہ نہیں پکڑتا تو اس وجہ سے نہیں پکڑتا کہ وہ مہربان اور رحیم ہے۔ وہ اپنے بندوں کو آخری حد تک مہلت دیتا اور ان سے درگزر فرماتا ہے۔

۸۔ آگے کا مضمون ___ آیات ۴۸-۶۰

توحید کے آفاقی و انفسی دلیلیں

آگے کی آیات میں توحید کی بعض آفاقی اور انفسی دلیلیں بیان ہوئی ہیں اور مقصود ان کے بیان کرنے سے تنبیہ کے اس مضمون کو مؤکد کرنا ہے جو اوپر کی آیات ۴۵-۴۷ میں گزرا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ عذاب کے لیے جلدی مت مچاؤ، اگر خدا کا عذاب آگیا تو اس سے نجات دینے والا خدا کے سوا کوئی اور نہیں بن سکتا۔ اگر کسی کو اپنے دیویوں دیوتاؤں پر اعتماد ہے تو یہ واضح رہنا چاہیے کہ خدا کا کوئی شریک نہیں ہے۔ وہ وحدہٗ لاشریک ہے۔ کسی کی مجال نہیں ہے کہ اس کے کسی ارادے میں مزاحم یا مخل ہو سکے۔

آیات ۴۸-۶۰

أَوَلَمْ يَرَوْا إِلَىٰ مَا خَلَقَ اللَّهُ مِنْ شَيْءٍ يَتَفَيَّأُ ظِلَالُهُ عَنِ الْيَمِينِ
وَالشَّمَائِلِ سُجَّدًا لِلَّهِ وَهُمْ دَاخِرُونَ ۝۴۸ وَلِلَّهِ يَسْجُدُ مَا

فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ مِنْ دَآبَّةٍ وَّالْمَلٰٓئِكَةُ وَهُمْ لَا
يَسْتَكْبِرُوْنَ ﴿٤٩﴾ يَخَافُوْنَ رَبَّهُمْ مِّنْ فَوْقِهِمْ وَيَفْعَلُوْنَ مَا ع ٦/١٠/١٢
يُؤْمَرُوْنَ ﴿٥٠﴾ ۩ السجدۃ وَقَالَ اللّٰهُ لَا تَتَّخِذُوْٓا اِلٰهَيْنِ اثْنَيْنِ ۚ اِنَّمَا هُوَ
اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ فَاِيَّايَ فَارْهَبُوْنِ ﴿٥١﴾ وَلَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ آیات
وَلَهُ الدِّيْنُ وَاصِبًا ۭ اَفَغَيْرَ اللّٰهِ تَتَّقُوْنَ ﴿٥٢﴾ وَمَا بِكُمْ مِّنْ نِّعْمَةٍ ۴۸-۶۰
فَمِنَ اللّٰهِ ثُمَّ اِذَا مَسَّكُمُ الضُّرُّ فَاِلَيْهِ تَجْـَٔرُوْنَ ﴿٥٣﴾ ثُمَّ اِذَا كَشَفَ
الضُّرَّ عَنْكُمْ اِذَا فَرِيْقٌ مِّنْكُمْ بِرَبِّهِمْ يُشْرِكُوْنَ ﴿٥٤﴾ لِيَكْفُرُوْا بِمَآ
اٰتَيْنٰهُمْ ۭ فَتَمَتَّعُوْا ۣ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ﴿٥٥﴾ وَيَجْعَلُوْنَ لِمَا لَا يَعْلَمُوْنَ
نَصِيْبًا مِّمَّا رَزَقْنٰهُمْ ۭ تَاللّٰهِ لَتُسْـَٔلُنَّ عَمَّا كُنْتُمْ تَفْتَرُوْنَ ﴿٥٦﴾
وَيَجْعَلُوْنَ لِلّٰهِ الْبَنٰتِ سُبْحٰنَهٗ ۙ وَلَهُمْ مَّا يَشْتَهُوْنَ ﴿٥٧﴾ وَاِذَا بُشِّرَ
اَحَدُهُمْ بِالْاُنْثٰى ظَلَّ وَجْهُهٗ مُسْوَدًّا وَّهُوَ كَظِيْمٌ ﴿٥٨﴾ يَتَوَارٰى
مِنَ الْقَوْمِ مِنْ سُوْۗءِ مَا بُشِّرَ بِهٖ ۭ اَيُمْسِكُهٗ عَلٰي هُوْنٍ اَمْ يَدُسُّهٗ
فِي التُّرَابِ ۭ اَلَا سَاۗءَ مَا يَحْكُمُوْنَ ﴿٥٩﴾ لِلَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ
مَثَلُ السَّوْءِ ۚ وَلِلّٰهِ الْمَثَلُ الْاَعْلٰى ۭ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿٦٠﴾ ع ٧/١٠/١٣

ترجمۂ آیات ۴۸-۶۰

کیا انھوں نے غور نہیں کیا کہ خدا نے جو چیز بھی پیدا کی ہے اس کے سائے دہنے اور بائیں سے منقلب ہوتے ہیں اللہ کو سجدہ کرتے ہوئے اور ان پر فروتنی ہوتی ہے اور اللہ ہی کو سجدہ کرتے ہیں جتنے آسمانوں اور زمین میں جاندار ہیں اور فرشتے بھی، وہ سرتابی نہیں کرتے۔ وہ اپنے اوپر اپنے رب سے ڈرتے ہیں اور وہی کرتے ہیں جس کا ان کو حکم ملتا ہے۔ ۴۸-۵۰

اور اللہ نے فرمایا کہ دو معبود نہ بنانا، وہ ایک ہی معبود ہے تو مجھی سے ڈرو۔ اور اسی کا ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے اور اسی کی اطاعت ہمیشہ لازم ہے تو کیا تم غیر اللہ سے ڈرتے ہو۔ ۵۱-۵۲

اور تمھارے پاس جو نعمت بھی ہے وہ اللہ ہی کی طرف سے ہے، پھر جب تمھیں کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو اسی سے تم فریاد کرتے ہو۔ پھر جب وہ تم سے تکلیف دور کر دیتا ہے تو تم میں سے ایک گروہ اپنے رب کا شریک ٹھہرانے لگتا ہے تاکہ ناشکری کریں اس چیز کی جو ہم نے ان کو بخشی ہے تو چند روزہ عیش کر لو، عنقریب تم جان لوگے۔ اور جن کے بارے میں انھیں کوئی علم نہیں ان کا حصہ لگاتے ہیں ان چیزوں میں سے جو ہم نے ان کو دی ہیں۔ خدا کی قسم! جو افترا تم کر رہے ہو اس کی تم سے پرسش ہونی ہے۔ ۵۳-۵۶

اور وہ اللہ کے لیے بیٹیاں ٹھہراتے ہیں، وہ ان چیزوں سے پاک ہے، اور ان کے لیے ہے جو وہ چاہیں۔ اور جب ان میں سے کسی کو بیٹی کی خوش خبری سنائی جاتی ہے تو اس کا چہرہ سیاہ پڑ جاتا ہے اور وہ گھٹا گھٹا رہتا ہے۔ وہ اس منحوس خبر پر لوگوں سے چھپا چھپا پھرتا ہے۔ سوچتا ہے کہ اس کو ذلت کے ساتھ رکھ چھوڑے یا اس کو مٹی میں دفن کر دے۔ افسوس، کیا ہی برا فیصلہ ہے جو یہ کرتے ہیں۔ بری تمثیل ان لوگوں کے لیے ہے جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے اور اللہ کے لیے اچھی صفتیں ہیں، وہ غالب اور حکیم ہے۔ ۵۷-۶۰

۹- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

أَوَلَمْ يَرَوْا إِلَىٰ مَا خَلَقَ اللَّهُ مِن شَيْءٍ يَتَفَيَّأُ ظِلَالُهُ عَنِ الْيَمِينِ وَالشَّمَائِلِ سُجَّدًا لِّلَّهِ وَهُمْ دَاخِرُونَ (۴۸)

تَفَيُّؤ کے معنی تقلب اور ردوبدل کے ہیں۔

تفیؤ کے معنی تقلب اور ردوبدل

یہ توحید کی تکوینی دلیل بیان ہوئی ہے کہ ہر چیز کا سایہ زمین پر پھیلا رہتا ہے۔ گویا وہ خدا کے آگے سجدہ میں ہے۔ پھر وہ آہستہ آہستہ اٹھنا شروع ہوتا ہے یہاں تک کہ جب سورج سمت راس میں آتا ہے تو سایہ بالکل کھڑا ہو جاتا ہے، پھر جب سورج جھکنا شروع ہوتا ہے تو سایہ دوسری سمت میں زمین پر بچھنا شروع ہوتا ہے۔ ہر چیز کے سایہ کے چوبیس گھنٹے اسی رکوع و سجود میں گزرتے ہیں اور یہ امر بھی قابل توجہ ہے کہ سایہ کا یہ سجدہ سورج کی بالکل مخالف سمت میں ہوتا ہے، سورج اگر پورب کی طرف ہے تو سایہ پچھم کی طرف پھیلے گا اور اگر سورج پچھم کی طرف ہے تو سایہ کا پھیلاؤ پورب کی طرف ہوگا۔ یہ ایک لطیف اشارہ ہے اس حقیقت کی طرف کہ سایہ کی فطرت ابراہیمی ہے۔ آفتاب پرستی سے اس کو عار ہے۔

توحید کی تکوینی دلیل

اس تکوینی شہادت کی روشنی میں غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ کوئی شخص اگر سورج یا کواکب میں سے کسی چیز کی پرستش کرتا ہے تو اس کا اپنا سایہ اس کے اس فعل کی نفی کرتا ہے۔ وہ خود تو سورج کے آگے جھکتا ہے لیکن اس کا سایہ اس کی مخالف سمت میں جھکتا ہے۔ وہ طوعاً جس خدا کو سجدہ کرنے پر راضی نہیں ہے کرہاً اسی کے آگے سربسجود ہے اس لیے کہ اس کا سایہ خدا ہی کے آگے جھکا ہوا ہے۔ اسی حقیقت کی طرف سورۂ رعد کی یہ آیت اشارہ کر رہی ہے۔

وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَ	اور اللہ ہی کو سجدہ کرتے ہیں جو آسمانوں اور زمین میں
الْاَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا وَّظِلٰلُهُمْ	ہیں، راضی خوشی یا مجبورانہ اور ان کے سائے صبح
بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ (رعد-۱۵)	و شام سجدہ کرتے ہیں۔

مطلب یہ ہے کہ جو شخص طوعاً خدا کو سجدہ کرتا ہے اس کے سجدۂ تکوینی اور سجدۂ اختیاری میں تو پوری پوری مطابقت ہوتی ہے، رہا وہ شخص جو غیر اللہ کو سجدہ کرتا ہے تو اس کا اپنا سایہ اس کے اس سجدہ پر نکیر کرتا ہے۔

وَهُمْ دٰخِرُوْنَ یعنی اس تکوینی سجدہ میں ان پر عاجزی و فروتنی طاری ہوتی ہے۔ اب اگر کوئی شخص اس سے باہر کی حالت میں خدا سے اکڑتا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ اپنے دائرہ اختیار میں اپنی اصل جبلت سے منحرف ہے۔

وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ مِنْ دَآبَّةٍ وَّالْمَلٰٓئِكَةُ وَهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ (۴۹)

فرشتوں کی فروتنی اور فرمانبرداری

یعنی آسمانوں اور زمین میں جتنے بھی جاندار ہیں سب خدا ہی کو سجدہ کرتے ہیں اس لیے کہ سب کی جبلت خدا پرستی ہی ہے فرشتے بھی خدا ہی کو سجدہ کرتے ہیں یہ نادان لوگ ان کو جو چاہیں بنا کر رکھ دیں لیکن وہ خود خدا کے فرمانبردار بندے ہیں وہ اس سے اکڑتے نہیں بلکہ بے چون و چرا اس کے ہر حکم کی تعمیل کرتے ہیں۔

يَخَافُوْنَ رَبَّهُمْ مِّنْ فَوْقِهِمْ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ (۵۰)

یعنی بایں ہمہ قرب و اتصال خدا کی بارگاہ عالی سے ان کا مقام بہت پیچھے ہے۔ وہ اپنے اوپر خدا سے برابر ڈرتے رہتے ہیں۔ ناز اور تدلل کے فتنہ میں کبھی مبتلا نہیں ہوتے، جو کچھ حکم ملتا ہے فوراً اس کی تعمیل کرتے ہیں۔

وَقَالَ اللّٰهُ لَا تَتَّخِذُوْٓا اِلٰهَيْنِ اثْنَيْنِ ۚ اِنَّمَا هُوَ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ فَاِيَّايَ فَارْهَبُوْنِ (۵۱)

توحید کے حق میں خدا کی شہادت

یہ توحید کے حق میں خود خدا کی شہادت کا حوالہ ہے جو اس کے انبیاء اور رسولوں، کتابوں اور صحیفوں کے ذریعے سے لوگوں کو پہنچی ہے۔ فرمایا کہ اس نے لوگوں کو اپنے نبیوں اور رسولوں کے ذریعہ سے یہی تعلیم دی ہے کہ دو معبود نہ بناؤ، میں ایک ہی معبود ہوں تو مجھی سے ڈرو۔

وَلَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلَهُ الدِّيْنُ وَاصِبًا ۭ اَفَغَيْرَ اللّٰهِ تَتَّقُوْنَ (۵۲)

'دین' کے معنی

'دِیْن' کے معنی یہاں اطاعت کے اور 'وَاصِب' کے معنی دائم کے ہیں۔

اطاعت 'واصب' کے معنی دائم

مطلب یہ ہے کہ آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے سب خدا ہی کا ہے۔ وہی اطاعت کا حق دار ہے ہمیشہ۔ یعنی اس دنیا میں بھی اسی کی اطاعت ہونی چاہیے اور آخرت میں بھی اسی کی اطاعت ہوگی۔ اگر تم خدا کے سوا کسی اور سے ڈرتے ہو تو یہ سرتاسر تمھاری جہالت ہے۔

وَمَا بِكُمْ مِّنْ نِّعْمَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ ثُمَّ اِذَا مَسَّكُمُ الضُّرُّ فَاِلَيْهِ تَجْـَٔــرُوْنَ (۵۳)

'جَاَرَ جُؤَارًا' کے معنی تضرع اور فریاد کرنے کے ہیں۔

توحید کی انفسی دلیل

یہ توحید کی انفسی دلیل بیان ہوئی ہے کہ جتنی نعمتیں بھی تمھیں حاصل ہیں سب اللہ ہی کی بخشی ہوئی ہیں اور جب کبھی تمھیں کوئی مصیبت پہنچتی ہے تو تم خدا ہی کو پکارتے ہو۔ یہ دلیل ہے اس بات کی کہ اصل فطرت کے اندر صرف ایک ہی خدا کا شعور ہے، یہ دوسرے دیوی دیوتا جو تم نے بنا رکھے ہیں اصل فطرت کے اندر ان کی کوئی جگہ نہیں ہے چنانچہ جب کسی حقیقی پریشانی کا وقت آتا ہے تو یہ سارے بناوٹی دیوی دیوتا غائب ہو جاتے ہیں، صرف ایک ہی خدا باقی رہ جاتا ہے جس کا اعتقاد اصل فطرت کے اندر ودیعت ہے۔

ثُمَّ اِذَا كَشَفَ الضُّرَّ عَنْكُمْ اِذَا فَرِيْقٌ مِّنْكُمْ بِرَبِّهِمْ يُشْرِكُوْنَ (۵۴)

پھر جب خدا مصیبت کو دور کر دیتا ہے تو وہی پچھلی خرمستیاں پھر عود کر آتی ہیں۔ وہی دیوی دیوتا پھر جاگ پڑتے ہیں جو مصیبت کے وقت میں غائب ہو گئے تھے اور اسباب و وسائل کا وہی اعتماد پھر بحال ہو جاتا ہے جو پہلے دل و دماغ پر مسلط تھا۔ آدمی خدا کے بخشے ہوئے امن و اطمینان کو دوسروں کی طرف منسوب کرنا شروع کر دیتا ہے اور خود خدا کو طاقِ نسیاں پر رکھ دیتا ہے۔

لِيَكْفُرُوْا بِمَآ اٰتَيْنٰهُمْ ۭ فَتَمَتَّعُوْا ۣ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ (۵۵)

یہ اس صورت حال کا نتیجہ بیان ہوا ہے کہ اس طرح انسان خدا کی بخشی ہوئی نعمتوں کی ناشکری کرتا اور ان کو دوسروں کی طرف منسوب کرتا ہے۔ 'فَتَمَتَّعُوْا' یہ دھمکی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ خدا کی ناشکری کر کے اس کی نعمتوں سے چند روز فائدہ اٹھا لو۔ عنقریب تمھارے سامنے اس کفرانِ نعمت کا نتیجہ آ جائے گا۔

وَيَجْعَلُوْنَ لِمَا لَا يَعْلَمُوْنَ نَصِيْبًا مِّمَّا رَزَقْنٰهُمْ ۭ تَاللّٰهِ لَتُسْـَٔلُنَّ عَمَّا كُنْتُمْ تَفْتَرُوْنَ (۵۶)

شرک خدا پر افترا ہے

یعنی جن دیویں دیوتاؤں کے بارے میں ان کے پاس کوئی دلیل و ثبوت نہیں، محض وہم و گمان کی بنا پر انھوں نے ان کو خدا کا شریک بنا رکھا ہے، ان کو خدا کی بخشی ہوئی نعمتوں میں حصہ دار بناتے ہیں، ان کے نام کے حصے بھی نکالتے ہیں اور بہت سی چیزوں کو ان کی طرف منسوب بھی کرتے ہیں کہ یہ ان کے فضل و کرم سے ان کو حاصل ہوئی ہیں۔ تَاللّٰهِ لَتُسْـَٔلُنَّ عَمَّا كُنْتُمْ تَفْتَرُوْنَ۔ یہ اپنی ذات کی قسم کھا کر ان کو دھمکی دی کہ یہ افترا جو تم خدا پر کر رہے ہو کہ اس نے فلاں اور فلاں کو اپنا شریک بنایا ہے، ایک دن اس کی تم سے پرسش ہونی ہے، خدا نے کسی کو اپنا شریک نہیں بنایا ہے، یہ محض تہمت ہے جو تم اس پر جوڑ رہے ہو۔

وَيَجْعَلُوْنَ لِلّٰهِ الْبَنٰتِ سُبْحٰنَهٗ ۙ وَلَهُمْ مَّا يَشْتَهُوْنَ (۵۷)

شرک کا دہرا گھنونا پن

یہاں کے شرک کے دہرے گھنونے پن کو واضح فرمایا ہے کہ اول تو یہی بات نہایت بھونڈی ہے کہ خدا کا کسی کو شریک و سہیم ٹھہرایا جائے پھر ستم بالائے ستم یہ ہے کہ جس چیز کو اپنے لیے ناپسند کرتے ہیں اس کو خدا کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ خود اپنے لیے تو بیٹے پسند کرتے ہیں لیکن خدا کے لیے انھوں نے بیٹیاں قرار دے رکھی ہیں۔ یہ امر یہاں واضح رہے کہ مشرکین عرب فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں قرار دیتے تھے اور اس خیال سے ان کی پوجا کرتے تھے کہ اگر یہ راضی رہیں تو اپنے باپ سے سب کچھ منوا لیتی ہیں۔ سُبْحٰنَهٗ یعنی اللہ تعالیٰ اس طرح کی تمام نسبتوں سے پاک و منزہ ہے، کوئی اس کا بیٹا یا بیٹی نہیں، سب اس کی مخلوق ہیں۔

وَاِذَا بُشِّرَ اَحَدُهُمْ بِالْاُنْثٰى ظَلَّ وَجْهُهٗ مُسْوَدًّا وَّهُوَ كَظِيْمٌ ۚ يَتَوَارٰى مِنَ الْقَوْمِ مِنْ سُوْۗءِ مَا بُشِّرَ بِهٖ ۭ اَيُمْسِكُهٗ عَلٰي هُوْنٍ اَمْ يَدُسُّهٗ فِي التُّرَابِ ۭ اَلَا سَاۗءَ مَا يَحْكُمُوْنَ (۵۸-۵۹)

یعنی خدا کی طرف تو انھوں نے بیٹیاں منسوب کر رکھی ہیں درآنحالیکہ بیٹیوں کے معاملے میں خود ان کا اپنا حال یہ ہے کہ اگر ان میں سے کسی کو یہ خبر دی جائے کہ اس کے ہاں بیٹی پیدا ہوئی ہے تو غم سے اس کا چہرہ سیاہ پڑ جاتا ہے اور وہ ہر وقت رنج و الم سے گھٹا گھٹا رہتا ہے، اس کو اپنے لیے باعث ننگ سمجھ کر لوگوں سے چھپتا پھرتا ہے اور اس تردد میں پڑ جاتا ہے کہ ذلت گوارا کر کے اس کو زندہ رکھے یا اس کو زمین میں دفن کر کے اس ذلت سے چھٹکارا حاصل کرے۔

اَلَا سَاۗءَ مَا يَحْكُمُوْنَ، یعنی جس چیز کو اپنے لیے مکروہ سمجھتے ہیں اسی چیز کو خدا کی طرف بڑی بے تکلف منسوب کرتے ہیں، اتنی توفیق بھی نہیں ہوتی کہ خدا کی طرف اس چیز کو منسوب کرنے میں احتیاط کرتے جس چیز کو اپنے لیے اس درجہ مکروہ سمجھتے ہیں۔ افسوس کتنا برا فیصلہ ہے جو انھوں نے کیا۔

لِلَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ مَثَلُ السَّوْءِ ۚ وَلِلّٰهِ الْمَثَلُ الْاَعْلٰى ۭ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ (۶۰)

یعنی اصل حقیقت تو یہ ہے کہ جو لوگ آخرت پر یقین نہیں رکھتے ان کے لیے بری تمثیل ہے اور اللہ کے لیے اعلیٰ صفتیں ہیں لیکن ان لوگوں نے معاملہ اس کے بالکل برعکس کر رکھا ہے۔ اللہ کی طرف تو وہ چیزیں

منسوب کرتے ہیں جن کو خود اپنے لیے بری سمجھتے ہیں اور اپنے لیے اچھے نتائج اور اچھے انجام کے مدعی ہیں، وَيَجْعَلُوْنَ لِلّٰهِ مَا يَكْرَهُوْنَ وَتَصِفُ اَلْسِنَتُهُمُ الْكَذِبَ اَنَّ لَهُمُ الْحُسْنٰى (اور وہ اللہ کے لیے وہ چیزیں قرار دیتے ہیں جن کو اپنے لیے ناپسند کرتے ہیں اور ان کی زبانیں جھوٹ دعویٰ کرتی ہیں کہ ان کے لیے اچھا انجام ہے)۔

۱۰۔ آگے کا مضمون ــــــ آیات ۶۱-۶۴

مشرکین کو تنبیہ، پیغمبر صلعم کو تسلی

آگے مشرکین کو تنبیہ ہے کہ خدا نے اگر تم کو مہلت دے رکھی ہے تو اس لیے دے رکھی ہے کہ اس کے ہاں ہر چیز کے لیے ایک وقت مقرر ہے۔ جب وہ وقت آجائے گا تو پھر نہ اس سے پیچھے ہٹ سکو گے نہ آگے بڑھ سکو گے۔ ساتھ ہی پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی ہے کہ یہ جو کچھ تمھیں پیش آرہا ہے یہی کچھ تم سے پہلے رسولوں کو بھی پیش آچکا ہے۔ تمھارا کام لوگوں کو مومن و موحد بنا دینا نہیں ہے بلکہ لوگوں پر صرف اللہ کی حجت تمام کر دینا ہے۔

آیات ۶۱-۶۴

وَلَوْ يُؤَاخِذُ اللّٰهُ النَّاسَ بِظُلْمِهِمْ مَّا تَرَكَ عَلَيْهَا مِنْ دَآبَّةٍ
وَّلٰكِنْ يُّؤَخِّرُهُمْ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ۚ فَاِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ لَا يَسْتَاْخِرُوْنَ
سَاعَةً وَّلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ ﴿۶۱﴾ وَيَجْعَلُوْنَ لِلّٰهِ مَا يَكْرَهُوْنَ وَتَصِفُ
اَلْسِنَتُهُمُ الْكَذِبَ اَنَّ لَهُمُ الْحُسْنٰى ۭ لَا جَرَمَ اَنَّ لَهُمُ النَّارَ وَ
اَنَّهُمْ مُّفْرَطُوْنَ ﴿۶۲﴾ تَاللّٰهِ لَقَدْ اَرْسَلْنَآ اِلٰٓى اُمَمٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَزَيَّنَ
لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ فَهُوَ وَلِيُّهُمُ الْيَوْمَ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۶۳﴾
وَمَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ اِلَّا لِتُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِي اخْتَلَفُوْا فِيْهِ ۙ وَ
هُدًى وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴿۶۴﴾

ترجمۂ آیات ۶۱-۶۴

اور اگر اللہ لوگوں سے ان کی حق تلفی پر فوراً مؤاخذہ کرتا ہوتا تو زمین پر کسی جاندار کو نہ چھوڑتا لیکن وہ ایک وقت معین تک لوگوں کو مہلت دیتا ہے تو جب ان کا وقت معین آجائے گا

تو اس سے نہ وہ ایک ساعت پیچھے ہٹ سکیں گے اور نہ آگے بڑھ سکیں گے۔ ۶۱

اور یہ اللہ کے لیے وہ چیز قرار دیتے ہیں جو خود اپنے لیے ناپسند کرتے ہیں اور ان کی زبانیں جھوٹ بیان کرتی ہیں کہ ان کے لیے اچھا انجام ہے، لازماً ان کے لیے دوزخ ہے اور وہ اسی میں پڑے چھوڑ دیے جائیں گے۔ ۶۲

خدا کی قسم! ہم نے تم سے پہلے بھی قوموں کی طرف رسول بھیجے تو شیطانوں نے ان کے اعمال ان کی نگاہوں میں کھبا دیے تو اب وہی ان کا رفیق ہے اور ان کے لیے ایک دردناک عذاب ہے۔ ۶۳

اور ہم نے تم پر کتاب صرف اس لیے اتاری ہے کہ تم ان پر اس چیز کو اچھی طرح واضح کر دو جس میں وہ مختلف ہو گئے ہیں اور یہ ہدایت و رحمت ہے ان لوگوں کے لیے جو ایمان لائیں۔ ۶۴

۱۱۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَلَوْ يُؤَاخِذُ اللَّهُ النَّاسَ بِظُلْمِهِم مَّا تَرَكَ عَلَيْهَا مِن دَابَّةٍ وَلَٰكِن يُؤَخِّرُهُمْ إِلَىٰ أَجَلٍ مُّسَمًّى ۖ فَإِذَا جَاءَ أَجَلُهُمْ لَا يَسْتَأْخِرُونَ سَاعَةً ۖ وَلَا يَسْتَقْدِمُونَ (۶۱)

کفر و شرک ظلم ہے

'ظُلم' کے اصل معنی حق تلفی کے ہیں۔ چونکہ شرک و کفر سب سے بڑی حق تلفی ہے، جس کا ارتکاب کر کے بندہ اپنے رب کے سب سے بڑے حق کو بھی تلف کرتا ہے اور خود اپنی جان پر بھی سب سے بڑا ظلم ڈھاتا ہے، اس وجہ سے قرآن نے جگہ جگہ کفر و شرک کو ظلم سے تعبیر کیا ہے۔

مطالبۂ عذاب کا جواب

یہ کفار کے مطالبۂ عذاب کا جواب ہے کہ اللہ کا یہ قاعدہ نہیں ہے کہ وہ لوگوں کے کفر و شرک پر ان کو فوراً پکڑ لے۔ اگر وہ ایسا کرنے والا ہوتا تو زمین پر ایک جاندار کو بھی جینے کی مہلت نہ ملتی۔ بلکہ اس کا قاعدہ یہ ہے کہ وہ لوگوں کو ایک وقت معین تک مہلت دیتا ہے تاکہ جس کو توبہ و اصلاح کرنی ہو وہ اس مہلت سے فائدہ اٹھا کر توبہ و اصلاح کر لے ورنہ اپنا پیمانہ اچھی طرح بھر لے۔ ہاں جب وہ وقت معین آجاتا ہے تو پھر اس سے نہ پیچھے ہٹنے کا موقع ملتا ہے نہ آگے بڑھنے کا۔

وَيَجْعَلُونَ لِلَّهِ مَا يَكْرَهُونَ وَتَصِفُ أَلْسِنَتُهُمُ الْكَذِبَ أَنَّ لَهُمُ الْحُسْنَىٰ ۖ لَا جَرَمَ أَنَّ لَهُمُ النَّارَ وَأَنَّهُم مُّفْرَطُونَ (۶۲)

اَفْرَطَ الشَّیْءَ، 'نسیہ وترکہ' اس چیز کو بھلا دیا، چھوڑ دیا یعنی کفار و مشرکین دوزخ میں ڈال کر اسی میں پڑے چھوڑ دیے جائیں گے، پھر ان کی خبر نہیں لی جائے گی۔

مشرکین کی حماقت حد حماقت

یہ ان کی حماقت در حماقت کی طرف اشارہ ہے کہ اول تو یہی بات عجیب ہے کہ انھوں نے خدا کی طرف بیٹیاں منسوب کر رکھی ہیں جن کی نسبت خود اپنی طرف ان کو گوارا نہیں پھر ان کے اعتماد پر یہ گمان کیے بیٹھے ہیں کہ اگر آخرت وغیرہ کا کوئی مرحلہ بالفرض پیش آیا تو ان کی بدولت ان کے لیے سب خیریت اور ہر مرحلہ میں کامیابی ہے۔ فرمایا کہ ان کے لیے لازماً دوزخ ہے اور وہ اس میں ایک مرتبہ ڈال کر ہمیشہ کے لیے اس طرح چھوڑ دیے جائیں گے کہ پھر ان کی خبر بھی نہیں لی جائے گی۔

تَاللّٰهِ لَقَدْ اَرْسَلْنَآ اِلٰٓى اُمَمٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ فَهُوَ وَلِيُّهُمُ الْيَوْمَ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ (۶۳)

کفار کو دھمکی، پیغمبر صلعم کو تسلی

یہ کفار کو دھمکی اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تسلی ہے کہ آج جو کچھ تمھیں پیش آ رہا ہے یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ یہی کچھ تم سے پہلے آنے والے رسولوں کو، ان کی قوموں کی طرف سے، پیش آ چکا ہے۔ ہم نے اپنے رسول بھیجے کہ لوگ ان کے ذریعے سے ہدایت کی راہ اختیار کریں لیکن لوگوں نے رسولوں کے بجائے شیطان ہی کو اپنا رہنما بنایا۔ اس نے ان کی نگاہوں میں ان کے اعمال کھبا دیے اور وہ اپنی گمراہیوں سے نکلنے پر راضی نہ ہوئے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اب وہی ان کا رفیق اور ساتھی ہے اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔

وَمَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ اِلَّا لِتُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِي اخْتَلَفُوْا فِيْهِ وَهُدًى وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ (۶۴)

پیغمبر صلعم کی ذمہ داری کی آخری حد

یہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی ذمہ داری کی حد بتا دی گئی ہے کہ یہ کتاب ہم نے تم پر اس لیے نہیں اتاری کہ لازماً تم اس کو لوگوں سے قبول ہی کرا دو، اس کو قبول کرنا یا نہ کرنا لوگوں کی اپنی ذمہ داری ہے، تمھاری ذمہ داری صرف اس قدر ہے کہ اس کے ذریعہ سے اس دین حق کو اچھی طرح واضح کر دو جس میں لوگ مختلف ہو گئے ہیں تاکہ لوگوں کے لیے گمراہی پر جمے رہنے کے لیے کوئی عذر باقی نہ رہ جائے۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم احساس فرض کی شدت کے سبب سے بسا اوقات یہ محسوس فرمانے لگتے کہ لوگ جو ہدایت کی راہ اختیار نہیں کر رہے ہیں تو اس میں کہیں آپ کی کسی کوتاہی کو دخل نہ ہو۔ آپ کی اس الجھن کو دور کرنے کے لیے آپ کی ذمہ داری بتا دی گئی کہ آپ پر صرف واضح طور پر دین کو پہنچا دینے کی ذمہ داری ہے اور بس۔ آگے اس مضمون کو مزید واضح فرما دیا ہے۔ وَيَوْمَ نَبْعَثُ فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ شَهِيْدًا عَلَيْهِمْ مِّنْ اَنْفُسِهِمْ وَجِئْنَا بِكَ شَهِيْدًا عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ وَّهُدًى وَّرَحْمَةً وَّبُشْرٰى لِلْمُسْلِمِيْنَ۔ ۸۹ (اور اس دن کو یاد کرو جس دن ہم ہر امت میں اسی کے اندر سے ایک گواہ اٹھائیں گے اور ہم تم کو ان لوگوں پر گواہ بنا کر لائیں گے اور ہم نے تم پر کتاب اتاری ہے ہر چیز کو واضح کر دینے کے لیے اور ہدایت و رحمت اور بشارت بنا کر اسلام اختیار کرنے والوں کے لیے)۔

هُدًى وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ یعنی یہ کتاب ہدایت ہے اپنے آغاز کے لحاظ سے اور رحمت ہے اپنے انجام کے لحاظ سے۔ جو لوگ اس ہدایت کو قبول کریں گے بالآخر وہی خدا کی رحمت کے مستحق ٹھہریں گے۔

۱۲۔ آگے کا مضمون ——— آیات ۶۵-۸۳

مشرکین کو ملامت اور پیغمبر صلعم کو تسلی

اللہ تعالیٰ نے جو نعمتیں بخش رکھی ہیں آگے ان میں سے کچھ کو گنا کر مشرکین کو ملامت کی گئی ہے کہ ان میں سے کس نعمت کو وہ اللہ کے سوا کسی اور کی طرف منسوب کر سکتے ہیں۔ پھر پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی ہے کہ جو لوگ جان بوجھ کر انجان بن رہے ہیں ان کو راستہ پر لا کھڑا کرنا تمھاری ذمہ داری نہیں ہے، تمھاری ذمہ داری صرف حق کو پہنچا دینے کی ہے۔

آیات ۶۵-۸۳ وَاللّٰهُ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ۭ اِنَّ فِيْ
ع ۸ ۱۴ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّسْمَعُوْنَ ۶۵ وَاِنَّ لَكُمْ فِي الْاَنْعَامِ لَعِبْرَةً ۭ نُسْقِيْكُمْ
مِّمَّا فِيْ بُطُوْنِهٖ مِنْۢ بَيْنِ فَرْثٍ وَّدَمٍ لَّبَنًا خَالِصًا سَاۗىِٕغًا
لِّلشّٰرِبِيْنَ ۶۶ وَمِنْ ثَمَرٰتِ النَّخِيْلِ وَالْاَعْنَابِ تَتَّخِذُوْنَ مِنْهُ
سَكَرًا وَّرِزْقًا حَسَنًا ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ۶۷ وَاَوْحٰى
رَبُّكَ اِلَى النَّحْلِ اَنِ اتَّخِذِيْ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوْتًا وَّمِنَ الشَّجَرِ وَمِمَّا
يَعْرِشُوْنَ ۶۸ ثُمَّ كُلِيْ مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ فَاسْلُكِيْ سُبُلَ رَبِّكِ ذُلُلًا ۭ
يَخْرُجُ مِنْۢ بُطُوْنِهَا شَرَابٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهٗ فِيْهِ شِفَاۗءٌ لِّلنَّاسِ ۭ
اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ۶۹ وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ ثُمَّ يَتَوَفّٰىكُمْ
وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرَدُّ اِلٰٓى اَرْذَلِ الْعُمُرِ لِكَيْ لَا يَعْلَمَ بَعْدَ عِلْمٍ شَـيْـــًٔا ۭ اِنَّ اللّٰهَ
ع ۹ ۱۵ عَلِيْمٌ قَدِيْرٌ ۷۰ وَاللّٰهُ فَضَّلَ بَعْضَكُمْ عَلٰي بَعْضٍ فِي الرِّزْقِ ۚ فَمَا
الَّذِيْنَ فُضِّلُوْا بِرَاۗدِّيْ رِزْقِهِمْ عَلٰي مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَهُمْ فِيْهِ

سَوَآءٌ ۭ اَفَبِنِعْمَةِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ ﴿۷۱﴾ وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ
اَزْوَاجًا وَّجَعَلَ لَكُمْ مِّنْ اَزْوَاجِكُمْ بَنِيْنَ وَحَفَدَةً وَّرَزَقَكُمْ مِّنَ
الطَّيِّبٰتِ ۭ اَفَبِالْبَاطِلِ يُؤْمِنُوْنَ وَبِنِعْمَتِ اللّٰهِ هُمْ يَكْفُرُوْنَ ﴿۷۲﴾ وَ
يَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَمْلِكُ لَهُمْ رِزْقًا مِّنَ السَّمٰوٰتِ وَ
الْاَرْضِ شَيْـًٔا وَّلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ﴿۷۳﴾ فَلَا تَضْرِبُوْا لِلّٰهِ الْاَمْثَالَ ۭ
اِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۷۴﴾ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا عَبْدًا
مَّمْلُوْكًا لَّا يَقْدِرُ عَلٰي شَيْءٍ وَّمَنْ رَّزَقْنٰهُ مِنَّا رِزْقًا حَسَنًا فَهُوَ
يُنْفِقُ مِنْهُ سِرًّا وَّجَهْرًا ۭ هَلْ يَسْتَوٗنَ ۭ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ ۭ بَلْ اَكْثَرُهُمْ
لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۷۵﴾ وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا رَّجُلَيْنِ اَحَدُهُمَآ اَبْكَمُ لَا يَقْدِرُ
عَلٰي شَيْءٍ وَّهُوَ كَلٌّ عَلٰي مَوْلٰىهُ ۙ اَيْنَمَا يُوَجِّهْهُّ لَا يَاْتِ بِخَيْرٍ ۭ هَلْ
يَسْتَوِيْ هُوَ ۙ وَمَنْ يَّاْمُرُ بِالْعَدْلِ ۙ وَهُوَ عَلٰي صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۷۶﴾ وَلِلّٰهِ غَيْبُ ع ۱۰ ۱۶
السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ وَمَآ اَمْرُ السَّاعَةِ اِلَّا كَلَمْحِ الْبَصَرِ اَوْ هُوَ اَقْرَبُ ۭ
اِنَّ اللّٰهَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۷۷﴾ وَاللّٰهُ اَخْرَجَكُمْ مِّنْۢ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ
لَا تَعْلَمُوْنَ شَيْـًٔا ۙ وَّجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ ۙ لَعَلَّكُمْ
تَشْكُرُوْنَ ﴿۷۸﴾ اَلَمْ يَرَوْا اِلَى الطَّيْرِ مُسَخَّرٰتٍ فِيْ جَوِّ السَّمَاۗءِ ۭ مَا
يُمْسِكُهُنَّ اِلَّا اللّٰهُ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴿۷۹﴾ وَاللّٰهُ
جَعَلَ لَكُمْ مِّنْۢ بُيُوْتِكُمْ سَكَنًا وَّجَعَلَ لَكُمْ مِّنْ جُلُوْدِ الْاَنْعَامِ
بُيُوْتًا تَسْتَخِفُّوْنَهَا يَوْمَ ظَعْنِكُمْ وَيَوْمَ اِقَامَتِكُمْ ۙ وَمِنْ اَصْوَافِهَا

وَّاَوْبَارِهَا وَاَشْعَارِهَآ اَثَاثًا وَّمَتَاعًا اِلٰى حِيْنٍ ﴿٨٠﴾ وَاللّٰهُ جَعَلَ
لَكُمْ مِّمَّا خَلَقَ ظِلٰلًا وَّجَعَلَ لَكُمْ مِّنَ الْجِبَالِ اَكْنَانًا وَّجَعَلَ
لَكُمْ سَرَابِيْلَ تَقِيْكُمُ الْحَرَّ وَسَرَابِيْلَ تَقِيْكُمْ بَاْسَكُمْ كَذٰلِكَ
يُتِمُّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكُمْ لَعَلَّكُمْ تُسْلِمُوْنَ ﴿٨١﴾ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَيْكَ
الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ﴿٨٢﴾ يَعْرِفُوْنَ نِعْمَتَ اللّٰهِ ثُمَّ يُنْكِرُوْنَهَا وَاَكْثَرُهُمُ
ع ۱۱ ۱۷ الْكٰفِرُوْنَ ﴿٨٣﴾

ترجمۂ آیات ۶۵-۸۳

اور اللہ ہی نے آسمان سے پانی اتارا پس اس سے زمین کو زندہ کر دیا اس کے خشک ہو جانے کے بعد۔ بے شک اس میں ان لوگوں کے لیے بڑی نشانی ہے جو بات کو سنتے ہیں اور بے شک تمہارے لیے چوپایوں میں بھی بڑا سبق ہے۔ ہم ان کے پیٹوں کے اندر کے گوبر اور خون کے درمیان سے تم کو خالص دودھ پلاتے ہیں، پینے والوں کے لیے نہایت خوشگوار، اور کھجوروں اور انگوروں کے پھلوں سے بھی، تم ان سے نشہ کی چیزیں بھی بناتے ہو اور کھانے کی اچھی چیزیں بھی۔ بے شک اس کے اندر بڑی نشانی ہے ان لوگوں کے لیے جو عقل سے کام لیتے ہیں۔ ۶۵-۶۷

اور تمہارے رب نے شہد کی مکھی پر القا کیا کہ تو پہاڑوں اور درختوں اور لوگ جو چھتیں اٹھاتے ہیں، ان میں چھتے بنا، پھر ہر قسم کے پھلوں سے رس چوس پھر اپنے پروردگار کے ہموار راستوں پر چل۔ اس کے پیٹ سے مشروب نکلتا ہے جس کے رنگ مختلف ہوتے ہیں، اس میں لوگوں کے لیے شفا ہے۔ بے شک اس کے اندر بڑی نشانی ہے ان لوگوں کے لیے جو غور کرتے ہیں۔ ۶۸-۶۹

اور اللہ ہی نے تم کو پیدا کیا، پھر وہی تم کو وفات دیتا ہے اور تم میں سے بعض ارذل عمر کی طرف لوٹا دیے جاتے ہیں کہ جاننے کے بعد وہ کچھ نہ جانیں۔ بے شک اللہ ہی علم والا اور

قدرت والا ہے۔ ۰،

اور اللہ نے تم میں سے بعض کو بعض پر رزق کے معاملہ میں برتری دے رکھی ہے تو جن کو برتری دی گئی ہے وہ اپنا رزق اپنے غلاموں کو نہیں دے دیتے کہ وہ اس میں برابر ہو جائیں تو کیا وہ اللہ کے فضل کا انکار کرتے ہیں۔ ۷۱

اور اللہ نے تمہارے لیے تمہاری ہی جنس سے بیویاں بنائیں اور تمہاری بیویوں سے تمہارے لیے بیٹے اور پوتے پیدا کیے اور تمہیں پاکیزہ رزق عطا کیا، تو کیا یہ باطل پر ایمان لاتے ہیں اور اللہ کی نعمت کا انکار کرتے ہیں اور اللہ کے سوا ان چیزوں کو پوجتے ہیں جو نہ ان کے لیے آسمان سے کسی رزق پر اختیار رکھتی ہیں، نہ زمین سے اور نہ وہ اس کی استطاعت ہی رکھتی ہیں۔ تو تم اللہ کے لیے مثالیں نہ بیان کرو۔ بے شک اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔ ۷۲-۷۴

اور اللہ مثال بیان کرتا ہے ایک غلام مملوک کی جو کسی چیز پر اختیار نہیں رکھتا اور اس کی جس کو ہم نے اپنی جانب سے اچھا رزق دے رکھا ہے جس میں سے وہ پوشیدہ اور علانیہ خرچ کرتا ہے، کیا یہ یکساں ہوں گے؟ شکر کا سزاوار اللہ ہے لیکن ان کے اکثر لوگ نہیں جانتے۔ اور اللہ مثال بیان کرتا ہے دو شخصوں کی جن میں سے ایک گونگا ہے جو کسی چیز پر قادر نہیں ہے اور وہ اپنے آقا پر ایک بوجھ ہے، جہاں کہیں بھی وہ اس کو بھیجتا ہے وہ کوئی کام درست کر کے نہیں لاتا۔ کیا وہ اور وہ جو عدل کا حکم دیتا ہے اور وہ ایک سیدھی راہ پر ہے دونوں یکساں ہوں گے؟ ۷۵-۷۶

اور آسمانوں اور زمین کا بھید اللہ ہی کے لیے ہے اور قیامت کا معاملہ بس آنکھ جھپکنے کی طرح یا اس سے بھی جلد تر ہوگا، بے شک اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ ۷۷

اور اللہ نے تم کو تمھاری ماؤں کے پیٹوں سے اس حال میں نکالا کہ تم کچھ نہیں جانتے تھے اور اس نے تمھارے لیے سمع و بصر اور دل بنائے تاکہ تم شکر گزار بنو۔ ۷۸

کیا انھوں نے پرندوں کو آسمان کی فضا میں مسخر نہیں دیکھا؟ ان کو بس اللہ ہی تھامے ہوئے ہوتا ہے۔ بے شک اس کے اندر نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو ایمان لائیں۔ اور اللہ ہی نے تمھارے لیے تمھارے گھروں کا سکون پیدا کیا اور تمھارے لیے چوپایوں کی کھال کے گھر بنائے جنھیں تم اپنے کوچ اور قیام کے دن ہلکا پھلکا پاتے ہو اور ان کے اون، ان کے روئیں اور ان کے بالوں سے تمھارے لیے گھریلو سامان اور ایک وقت تک برتنے کی چیزیں بنائیں۔ ۷۹-۸۰

اور اللہ ہی نے تمھارے لیے اپنی پیدا کردہ چیزوں سے سایے بنائے اور تمھارے لیے پہاڑوں میں پناہ گاہیں بنائیں اور تمھارے لیے ایسے لباس بنائے جو تمھیں گرمی سے بچاتے ہیں اور ایسے لباس بنائے جو تمھاری جنگ میں تم کو محفوظ رکھتے ہیں۔ اسی طرح اللہ تم پر اپنی نعمت تمام کرتا ہے تاکہ فرمانبردار رہو۔ ۸۱

پس اگر وہ اعراض کریں تو تمھارے اوپر صرف واضح طور پر پہنچا دینے کی ذمہ داری ہے۔ یہ اللہ کی نعمتوں کو پہچانتے ہیں پھر ان سے انجان بنتے ہیں اور ان میں اکثر ناشکرے ہیں۔ ۸۲-۸۳

۱۳۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَاللّٰهُ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّسْمَعُوْنَ ۝ (۶۵)

توحید کی دلیل توافق کے پہلو سے

آسمان سے پانی برسانا اور زمین کو اس کے خشک ہو جانے کے بعد اس پانی سے از سر نو زندہ اور شاداب کر دینا اس بات کی نہایت واضح دلیل ہے کہ آسمان اور زمین دونوں میں ایک ہی خدائے حکیم و قدیر کا ارادہ کارفرما ہے۔ اگر ان کے اندر الگ الگ مختلف ارادے کارفرما ہوتے، جیسا کہ مشرکین سمجھتے ہیں، تو یہ توافق

کہاں سے وجود میں آتا جس پر اس دنیا کے بقا کا انحصار ہے۔

بعث و نشر کی دلیل

پھر یہ نہایت واضح نشانی قیامت اور بعث و نشر کی بھی ہے۔ جو خدا زمین کے چٹیل اور خشک مردہ ہو جانے کے بعد بارش کے ایک ہی چھینٹے سے اس کو حیات تازہ بخش دیتا ہے اس کے لیے قیامت کے دن لوگوں کو ان کی قبروں سے اٹھا کھڑا کرنا کیا مشکل ہے۔

فعل اپنے حقیقی معنی میں

فعل 'یَسْمَعُوْنَ' یہاں اپنے حقیقی معنی میں ہے۔ یعنی جو لوگ بات کو کان کھول کر سنتے، اس کو سمجھتے اور اس کو قبول کرتے ہیں ان کے لیے تو اس کے اندر توحید اور قیامت سب کی دلیل موجود ہے۔ رہے وہ لوگ جو سننے اور سمجھنے کے لیے تیار ہی نہیں ہیں تو وہ خدا کے قانون کی زد میں آئے ہوئے ہیں۔ ایسے لوگوں کے کانوں کو کوئی چیز بھی نہیں کھول سکتی۔

وَاِنَّ لَكُمْ فِی الْاَنْعَامِ لَعِبْرَةً ۚ نُسْقِیْكُمْ مِّمَّا فِیْ بُطُوْنِهٖ مِنْۢ بَیْنِ فَرْثٍ وَّدَمٍ لَّبَنًا خَالِصًا سَآئِغًا لِّلشّٰرِبِیْنَ (۶۶)

دودھ کی نعمت کی طرف اشارہ

پانی کی نعمت کے بعد یہ دودھ کی نعمت کی طرف اشارہ فرمایا کہ غور کرنے والوں کے لیے چوپایوں کے اندر بھی خدا کی رحمت و ربوبیت اور اس کی توحید کے بڑے درس موجود ہیں۔ یہ چوپائے اسی زمین کی گھاس اور سبزیاں چرتے ہیں، جو ان کے پیٹوں میں ایک مرحلہ میں گوبر بنتی ہیں اور ایک مرحلہ میں خون، پھر اسی گوبر اور خون کے درمیان کے مرحلہ سے دودھ پیدا ہوتا ہے جس میں نہ گوبر کا کوئی شائبہ ہوتا ہے اور نہ خون کا، وہ ہر آمیزش سے بالکل پاک اور پینے والوں کے لیے نہایت خوش گوار، لذیذ اور غذا بخش ہوتا ہے۔ یہ ساری صورت حال اس بات کی شاہد ہے کہ یہ ساری کائنات ایک ہی صناع و حکیم اور ایک ہی قدیر و رحیم کے ارادے کے تحت چل رہی ہے یا اس بات کی شاہد ہے کہ اس کے اندر مختلف ارادے اپنے اپنے طور پر کام کر رہے ہیں۔

حصول عبرت علم کی کلید ہے

'عِبْرَة' کے معنی ایک حقیقت سے دوسری حقیقت تک پہنچ جانا ہے۔ یہی عبرت علم کی کلید ہے۔ جس کے اندر یہ صلاحیت موجود ہوتی ہے اور وہ اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں ان کے لیے ایک دروازہ کھل جانے تو اس کی روشنی میں دوسرے دروازے خود کھلتے جاتے ہیں۔ جو لوگ اپنی اس صلاحیت کو مردہ کر دیتے ہیں، ان کے عقل و دل کی آنکھیں اندھی ہو جاتی ہیں، وہ دیکھتے سب کچھ ہیں لیکن ان کو سوجھتا کچھ بھی نہیں۔

وَمِنْ ثَمَرٰتِ النَّخِیْلِ وَالْاَعْنَابِ تَتَّخِذُوْنَ مِنْهُ سَكَرًا وَّرِزْقًا حَسَنًا ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ (۶۷)

لطف و ذائقہ کی طرف اشارہ

یعنی جس طرح اس نے چوپایوں سے تمہارے لیے دودھ پیدا کیا ہے اسی طرح کھجور اور انگور سے بھی تمہارے لیے غذا فراہم کی، تم ان سے نشہ کی چیزیں بھی بناتے ہو اور پاکیزہ غذا بھی حاصل کرتے ہو۔

یہاں 'رِزْقًا' کے ساتھ 'حَسَنًا' کی صفت لگا کر ضمناً اس حقیقت کی طرف بھی اشارہ کر دیا کہ کھجور اور انگور اور اس طرح کی چیزوں سے نشہ آور چیزیں تیار کرنا ان کا صحیح استعمال نہیں ہے بلکہ یہ ان چیزوں کا سوءِ استعمال

ہے۔ ان کا صحیح استعمال یہی ہے کہ ان سے پاکیزہ اور صحت بخش غذا حاصل کی جائے جس سے جسم اور عقل دونوں کو توانائی حاصل ہو نہ کہ ان کو ایسی شکل میں تبدیل کر دیا جائے کہ وہ عقل اور دل کو ماؤف کر دینے والی بن جائیں۔

ان تنوعات کی حکمت

'اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ' یعنی اللہ نے اپنی نعمتوں میں یہ گوناگونی و بوقلمونی اس لیے رکھی ہے کہ سوچنے والے سوچیں اور سمجھنے والے سمجھیں۔ ظاہر ہے کہ یہ دنیا اپنی بقا کے لیے ان تنوعات کی محتاج نہیں تھی، یہ بالکل سادہ اور یک رنگ بلکہ بالکل بے رنگ بھی ہو سکتی تھی لیکن اس کے خالق نے اس کو ایسا بنایا کہ یہ اس کی صفات کا ایک پرتو اور مظہر ہو تاکہ غور کرنے والے غور کریں اور اس کی ایک ایک چیز سے اس کے خالق کی اعلیٰ صفات، اس کی بے نہایت قدرت و حکمت، اس کی غیر محدود رافت و رحمت، اس کی بے مثال ربوبیت و پروردگاری اور اس کی کامل وحدت و یکتائی کا کچھ تصور اور اس کی روشنی میں اپنے فرائض اور ذمہ داریوں کا احساس کریں۔

وَاَوْحٰی رَبُّكَ اِلَی النَّحْلِ اَنِ اتَّخِذِیْ مِنَ الْجِبَالِ بُیُوْتًا وَّمِنَ الشَّجَرِ وَمِمَّا یَعْرِشُوْنَ ۝ ثُمَّ كُلِیْ مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ فَاسْلُكِیْ سُبُلَ رَبِّكِ ذُلُلًا ؕ یَخْرُجُ مِنْ بُطُوْنِهَا شَرَابٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهٗ فِیْهِ شِفَآءٌ لِّلنَّاسِ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً لِّقَوْمٍ یَّتَفَكَّرُوْنَ ۝ (۶۸-۶۹)

'وحی' اور 'ذلل' سے مراد

'وحی' سے یہاں مراد وہ جبلی اور فطری وحی ہے جو ہر مخلوق کو اپنے اندر کی ودیعت کردہ صلاحیتیں استعمال کرنے کے لیے فاطر فطرت و جبلت کی طرف سے ہوئی ہے۔ 'ذلل'، 'ذلول' کی جمع ہے جس کے اصل معنی مطیع و منقاد کے ہیں۔ یہاں 'سبل' کی صفت ہے اس وجہ سے اس کے معنی ہموار، سیدھے اور پٹے ہوئے راستوں کے ہوں گے۔

شہد کی نعمت کی طرف اشارہ

پھلوں کی نعمت کے بعد یہ شہد کی نعمت کا ذکر فرمایا جو شہد کی مکھیاں انہی پھلوں سے تیار کرتی ہیں۔ فرمایا کہ تمہارے رب نے شہد کی مکھی کو یہ القا کیا کہ تو پہاڑوں، درختوں اور لوگوں کی بنائی ہوئی چھتوں میں اپنے چھتے بنا، پھر ہر قسم کے رس چوس اور تیرے رب نے تیری صلاحیتوں کے ظہور کے لیے جو راستے ہموار کر دیے ہیں ان پر سرگرمی کے ساتھ مصروف کار رہ۔ چنانچہ وہ اپنی جبلت کی رہنمائی میں پوری سرگرمی کے ساتھ مصروف کار رہتی ہے جس کے نتیجہ میں ان مکھیوں کے پیٹوں سے ایک مشروب برآمد ہوتا ہے جس کے رنگ مختلف ہوتے ہیں اور جن میں لوگوں کے لیے ان کے مختلف امراض کا علاج ہے۔

آیات الٰہی سے فائدہ اٹھانے والوں کی صفتیں

'اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً لِّقَوْمٍ یَّتَفَكَّرُوْنَ' یہ ایک شہد کی مکھی کے اندر سے اللہ نے اپنی جو آتنی قدرت و حکمت اور اتنی رحمت و ربوبیت کا اظہار فرمایا یہ اس لیے فرمایا کہ لوگ تفکر و تدبر کریں، اس کائنات کے خالق کی صفات کو سمجھیں اور ان کے تقاضوں کی روشنی میں اپنی دنیا اور آخرت کو سنواریں۔

'یَسْمَعُوْنَ'، 'یَعْقِلُوْنَ' اور 'یَتَفَكَّرُوْنَ' کا مطلب

اوپر کی آیات میں اللہ تعالیٰ کی نشانیوں سے فائدہ اٹھانے والوں کی بالترتیب تین صفتیں بیان ہوئی ہیں۔ ایک 'یَسْمَعُوْنَ' یعنی وہ کھلے کانوں سے معقول باتوں کو سنتے اور ان کو قبول کرتے ہیں، دوسری

'یَعْقِلُوْنَ' یعنی وہ اپنی عقل سے کام لیتے ہیں اور سوچنے سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں، تیسری 'یَتَفَکَّرُوْنَ' یعنی وہ برابر اسرار کائنات میں تفکر و تدبر کرتے اور حقائق سے حقائق تک پہنچنے کی سعی میں لگے رہتے ہیں۔

یہی صفتیں انسانیت کا اصلی جوہر ہیں اور ان میں ایک حکیمانہ تدریج و ترتیب ہے۔

پہلا مرحلہ: 'یَسْمَعُوْن' اس کائنات کے حقائق میں سے بے شمار حقائق ایسے ہیں جو بدیہیات فطرت کے حکم میں داخل ہیں۔ ان کو سمجھنے کے لیے کسی بڑی کاوش کی ضرورت نہیں ہے۔ ایک معقول انسان اول تو ان کو خود سمجھتا ہے اور اگر خود نہیں سمجھتا ہے تو چونکہ معقول باتوں کے لیے اس کے کان کھلے ہوئے ہوتے ہیں اس وجہ سے دوسرے کسی معقول آدمی کی زبان سے ان کو سنتے ہی 'از دل ریزد بر دل ریزد' کی کیفیت محسوس کرتا ہے۔

دوسرا مرحلہ: 'یَعْقِلُوْنَ' دوسرا مرحلہ 'یَعْقِلُوْنَ' کا ہے جہاں سوچنے سمجھنے اور عقل سے کام لینے کی ضرورت پڑتی ہے جہاں مقدمات کی ایک ترتیب ہوتی ہے اور پھر ان سے نتائج حاصل ہوتے ہیں۔ یہ مرحلہ پہلے مرحلہ سے اونچا ہے اور علم کی راہ میں اس کے ثمرات بھی زیادہ وسیع ہیں لیکن ہے یہ عام عقل کی دسترس کی چیز۔ جو لوگ اپنی عقل کی قدر کرتے اور اس نعمت سے فائدہ اٹھاتے ہیں وہ اس کی برکات سے محروم نہیں رہتے۔

تیسرا مرحلہ: 'یَتَفَکَّرُوْنَ' تیسرا مرحلہ 'یَتَفَکَّرُوْنَ' کا ہے یہ سب سے اونچا مرحلہ ہے۔ یہ ان لوگوں کا مقام ہے جو اسرار کائنات میں برابر غور کرتے اور علم کے مدارج برابر طے کرتے رہتے ہیں۔ یہ حکماء کا درجہ ہے۔ جس طرح شہد کی مکھی اپنی بے مثال کاوش سے طرح طرح کے پھولوں سے رس چوس کر شہد بناتی ہے جس میں لوگوں کے لیے غذا اور شفا ہے۔ اسی طرح یہ لوگ اپنے تدبر و تفکر کی کاوشوں سے حکمت کا شہد جمع کرتے ہیں جس میں عقل و دل کے امراض کا مداوا ہوتا ہے۔ وہ خود بھی اس سے آسودہ رہتے ہیں اور دوسروں کو بھی اس سے فیض پہنچتا ہے۔

وَاللّٰہُ خَلَقَکُمْ ثُمَّ یَتَوَفّٰکُمْ ۙ وَمِنْکُمْ مَّنْ یُّرَدُّ اِلٰۤی اَرْذَلِ الْعُمُرِ لِکَیْ لَا یَعْلَمَ بَعْدَ عِلْمٍ شَیْـًٔا ؕ اِنَّ اللّٰہَ عَلِیْمٌ قَدِیْرٌ (۷۰)

زندگی اور موت خدا کی طرف سے ہے: یعنی زندگی اور موت اور عمر کی چھوٹائی اور بڑائی بھی خدا ہی کی طرف سے ہے۔ چنانچہ تم میں سے کتنے ہیں جو بچپن یا جوانی ہی میں مر جاتے ہیں اور کتنے ایسے ہیں جو ارذل عمر تک پہنچتے ہیں یہاں تک کہ ان کا حال یہ ہو جاتا ہے کہ جاننے کے بعد کچھ نہیں جانتے۔ علیم و قدیر خدا ہی ہے۔ وہی تمام علم کا منبع ہے اور وہی ہر چیز کے لیے اندازے اور پیمانے مقرر کرتا ہے۔

عمر کا طول و قصر خدا کی طرف سے ہے: 'وَمِنْکُمْ مَّنْ یُّرَدُّ' کا اسلوب بیان اس بات کی طرف اشارہ کر رہا ہے کہ اس سے پہلے کلام میں کچھ حذف ہے۔ یعنی تم میں کچھ تو بچپن یا جوانی ہی میں مر جاتے ہیں اور کچھ ارذل عمر کو پہنچتے ہیں۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ عمر کا طول و قصر خدا ہی کی طرف سے ہے، اس میں کسی دوسرے کو کوئی اختیار حاصل نہیں ہے۔

قدرت کا ایک اشارہ: 'لِکَیْ لَا یَعْلَمَ بَعْدَ عِلْمٍ شَیْـًٔا' میں 'لِکَیْ' کا صحیح حق ادا کیجیے تو اس سے یہ بات نکلتی ہے کہ قدرت کچھ لوگوں کو ارذل عمر تک پہنچا کر یہ حقیقت ظاہر کرنا چاہتی ہے کہ علم و عقل اور قدرت و اختیار سب خدا ہی کا عطیہ

ہے۔ وہی انسان جس کو اپنے علم اور اپنی عقل پر بڑا ناز ہوتا ہے ایک وقت اس پر ایسا آتا ہے جب وہ خود بھی دیکھ لیتا ہے اور دوسرے بھی دیکھ لیتے ہیں کہ وہ شیر خوار بچوں کی طرح عقل و علم اور قدرت و اختیار سے بالکل عاری ہو کر رہ گیا ہے۔ اس کو اپنے تن بدن تک کا کچھ ہوش نہیں رہ جاتا۔ وہ تمام تر دوسروں پر انحصار کرتا اور اپنی ضروریات میں ان کا محتاج ہوتا ہے۔ اس کی تمام علمی و عقلی صلاحیتیں اسی خدا کی طرف واپس ہو جاتی ہیں جو ان کا اصل عطا کرنے والا ہے۔ اس لیے کہ علیم و قدیر خدا ہی ہے۔ جس کو جس حد تک بھی علم و قدرت کی نعمت ملتی ہے خدا ہی سے ملتی ہے اس وجہ سے اس پر فخر و غرور جائز نہیں ہے بلکہ اس کا شکر واجب ہے۔

وَاللّٰهُ فَضَّلَ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ فِي الرِّزْقِ ۚ فَمَا الَّذِيْنَ فُضِّلُوْا بِرَآدِّيْ رِزْقِهِمْ عَلٰى مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَهُمْ فِيْهِ سَوَآءٌ ۭ اَفَبِنِعْمَةِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ (۷۱)

رزق بھی خدا ہی کا عطیہ ہے

عمر اور علم و عقل کی طرح رزق بھی خدا ہی کا عطیہ ہے۔ اسی نے کسی کو کم دیا ہے اور کسی کو زیادہ۔ یہ کسی کے اپنے اختیار میں نہیں ہے کہ وہ جتنا چاہے اپنے رزق میں اضافہ کر لے۔ اس وجہ سے ہر شخص کا فرض ہے کہ وہ خدا ہی کا شکرگزار رہے اور اللہ کے بخشے ہوئے رزق و فضل کو دوسروں کی طرف منسوب کر کے اصل رازق کی ناشکری نہ کرے۔

انسانی فطرت کی ایک حقیقت

فَمَا الَّذِيْنَ فُضِّلُوْا بِرَآدِّيْ رِزْقِهِمْ الایۃ' یہ انسانی فطرت کی ایک حقیقت کی طرف توجہ دلا کر اس سے جو سبق حاصل ہوتا ہے اس کو سامنے رکھا ہے کہ تمہارا اپنا حال تو یہ ہے کہ جن کو رزق میں برتری حاصل ہے وہ یہ نہیں کرتے کہ اپنی دولت اپنے غلاموں اور مملوکوں میں بانٹ کر خود ان کے برابر ہو جائیں اور ان کو اپنے برابر کر لیں تو خدا کے متعلق تم نے کیسے یہ فرض کر لیا کہ وہ اپنی بنائی ہوئی دنیا اپنے غلاموں اور مملوکوں میں بانٹ کر خود ان کی سطح پر آ گیا ہے۔ یہ تو خدا کی نعمتوں کا صریح انکار ہے کہ اس کی بخشی ہوئی چیزوں کو ان کی طرف منسوب کیا جائے جن کو ان کے پیدا کرنے میں سرمو دخل نہیں۔

وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا وَّجَعَلَ لَكُمْ مِّنْ اَزْوَاجِكُمْ بَنِيْنَ وَحَفَدَةً وَّرَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ ۭ اَفَبِالْبَاطِلِ يُؤْمِنُوْنَ وَبِنِعْمَتِ اللّٰهِ هُمْ يَكْفُرُوْنَ (۷۲)

بیوی بچوں کی نعمت خدا ہی سے ملی ہے

یعنی رزق و فضل کی طرح بیوی بچوں کی نعمت بھی تمھیں خدا ہی سے ملی ہے۔ اسی نے تمھاری ہی جنس سے تمھارے لیے بیویاں بنائیں اور ان سے بیٹوں اور پوتوں کا سلسلہ جاری کیا اور پاکیزہ چیزیں کھانے اور برتنے کو دیں۔ ان نعمتوں کا حق تو یہ تھا کہ لوگ خدا ہی کا شکر کرتے اور اسی پر ایمان لاتے لیکن لوگوں کا حال یہ ہے کہ وہ باطل معبودوں پر تو ایمان لاتے ہیں اور اصل منعم کی نعمتوں کی ناشکری کرتے ہیں۔

وَيَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَمْلِكُ لَهُمْ رِزْقًا مِّنَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ شَيْـــًٔا وَّلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ (۷۳)

ایمان بالباطل کی تفصیل

یہ اس ایمان بالباطل اور ناشکری کی تفصیل ہے کہ وہ اللہ کے سوا ان چیزوں کی پرستش کرتے ہیں جو نہ آسمان سے ان کے لیے کوئی رزق اتارنے پر اختیار رکھتی ہیں نہ زمین سے کوئی چیز برآمد کرنے پر۔ اور صرف یہی نہیں کہ بالفعل ان کو اختیار حاصل نہیں ہے بلکہ اگر وہ چاہیں بھی اور اس کے لیے اپنا پورا زور بھی صرف کر ڈالیں جب بھی ان کو اس کا اختیار حاصل نہیں ہو سکتا۔

فَلَا تَضۡرِبُوۡا لِلّٰهِ الۡاَمۡثَالَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَعۡلَمُ وَاَنۡتُمۡ لَا تَعۡلَمُوۡنَ ‏(۷۴)

صفات الٰہی کے باب میں تمثیل سے احتراز کی ہدایت

'ضَرۡبُ مَثَل' سے یہاں مراد تمثیل و تشبیہ کو ذریعہ بنا کر خدا کے لیے صفتیں بیان کرنا ہے۔ مثلاً یہ کہ اپنے اوپر قیاس کر کے یہ کہا جائے کہ خدا کے بیٹیاں ہیں یا دنیوی بادشاہوں پر قیاس کر کے خدا کو ان کی جیسی صفات سے متصف کیا جائے۔ شرک کے بیشتر دروازے اسی تمثیل و تشبیہ سے کھلے ہیں اس وجہ سے اوپر کی آیات میں خدا کی صفات کے باب میں صحیح رہنمائی دے کر اس فتنہ کے دروازے کو بند کر دیا۔ فرمایا کہ خدا کی صفات کے معاملے میں تشبیہ و قیاس کو رہنما نہ بناؤ۔ خدا اپنی صفات کو خود ہی جانتا ہے، تم نہیں جانتے اس وجہ سے اپنی صفتیں جو وہ بتاتا ہے ان کو مانو اور ان پر ایمان لاؤ۔ یہی راستہ ہدایت کا ہے۔

ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا عَبۡدًا مَّمۡلُوۡكًا لَّا يَقۡدِرُ عَلٰى شَىۡءٍ وَّمَنۡ رَّزَقۡنٰهُ مِنَّا رِزۡقًا حَسَنًا فَهُوَ يُنۡفِقُ مِنۡهُ سِرًّا وَّجَهۡرًا ؕ هَلۡ يَسۡتَوٗنَ ؕ اَلۡحَمۡدُ لِلّٰهِ ؕ بَلۡ اَكۡثَرُهُمۡ لَا يَعۡلَمُوۡنَ ‏(۷۵)

خدا کی بیان کردہ تمثیل

یعنی اگر مثال ہی سننی ہے تو خدا مثال بیان کرتا ہے اس کو سنو۔ ایک طرف ایک غلام مملوک ہے جس کو کسی چیز پر کوئی اختیار نہیں ہے اور دوسری طرف ایک آزاد ہے جس کو خدا نے خوب رزق و فضل دے رکھا ہے، وہ پوری آزادی سے پوشیدہ اور علانیہ اس میں سے خرچ کرتا ہے کیا یہ دونوں یکساں ہوں گے؟ ظاہر ہے کہ نہیں، تو پھر خدا اور اس کے مملوکوں کو کس طرح یکساں کر دیتے ہو؟

'اَلۡحَمۡدُ لِلّٰهِ' یعنی صحیح طور پر سوچیں تو ان پر یہ حقیقت واضح ہو گی کہ شکر کا سزاوار اللہ ہے لیکن ان میں سے اکثر اس بدیہی حقیقت سے واقف نہیں۔

وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا رَّجُلَيۡنِ اَحَدُهُمَاۤ اَبۡكَمُ لَا يَقۡدِرُ عَلٰى شَىۡءٍ وَّهُوَ كَلٌّ عَلٰى مَوۡلٰٮهُ ۙ اَيۡنَمَا يُوَجِّهْهُّ لَا يَاۡتِ بِخَيۡرٍ ؕ هَلۡ يَسۡتَوِىۡ هُوَ ۙ وَمَنۡ يَّاۡمُرُ بِالۡعَدۡلِ ۙ وَهُوَ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسۡتَقِيۡمٍ ‏(۷۶)

ایک دوسری تمثیل

یعنی ایک دوسری تمثیل سنو۔ دو شخص ہیں جن میں سے ایک گونگا بہرا[1] غلام ہے، کسی چیز پر کوئی قدرت نہیں رکھتا، وہ اپنے آقا پر ایک بوجھ ہے۔ وہ جہاں کہیں بھی اس کو بھیجتا ہے کوئی کام وہ صحیح کر کے نہیں لاتا اور ایک دوسرا شخص ہے جو آزاد ہے، دوسروں کو عدل و انصاف کا حکم دیتا ہے اور خود بھی سیدھے راستہ پر ہے۔ کیا یہ دونوں شخص یکساں ہوں گے؟ اگر نہیں تو پھر تم خدا اور اس کی عاجز و بے بس مخلوقات کو

---

[1] یہ واضح رہے کہ گونگے اکثر حالات میں بہرے بھی ہوتے ہیں۔

یکساں کیسے کیے دیتے ہو۔

وَلِلّٰهِ غَيْبُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ وَمَآ اَمْرُ السَّاعَةِ اِلَّا كَلَمْحِ الْبَصَرِ اَوْ هُوَ اَقْرَبُ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (۷۷)

اثنائے کلام میں ایک تنبیہ

یہ اثنائے کلام میں ضدی مخاطبوں کو ایک تنبیہ ہے کہ قیامت کو بہت بعید نہ سمجھو۔ اگر اس کا وقت معلوم نہیں ہے تو اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ وہ آئے گی ہی نہیں۔ آسمانوں اور زمین کا غیب اللہ ہی کے علم میں ہے۔ جب وہ اس کو لانا چاہے گا تو وہ آنکھ جھپکنے کی طرح آجائے گی بلکہ اس سے بھی جلد تر۔ اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔

وَاللّٰهُ اَخْرَجَكُمْ مِّنْۢ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ شَـيْـــًٔـا ۙ وَّجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـــِٕدَةَ ۙ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ (۷۸)

اللہ کی نعمتوں کا حق

یعنی انسان جب پیدا ہوتا ہے تو صرف ایک مضغۂ گوشت ہوتا ہے، عقل و علم اور قوت و صلاحیت سے بالکل عاری۔ پھر اللہ تعالیٰ اس کو سمع و بصر اور دل و دماغ کی قوتیں عطا فرماتا ہے۔ ان نعمتوں کا حق یہ ہے کہ تم اللہ کے شکر گزار بنو لیکن اکثر لوگوں کا حال یہ ہے کہ ان نعمتوں کو پا کر ان کو خدا ہی کی ناشکری کا ذریعہ بناتے ہیں۔ اسی مضمون کو سورۂ ملک میں یوں بیان فرمایا ہے۔ قُلْ هُوَ الَّذِيْٓ اَنْشَاَكُمْ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـــِٕدَةَ ۭ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ (کہہ دو کہ وہی ہے جس نے تم کو پیدا کیا اور تمہیں سمع و بصر اور دل عطا فرمائے لیکن تم بہت کم شکرگزار ہوتے ہو)۔

اَلَمْ يَرَوْا اِلَى الطَّيْرِ مُسَخَّرٰتٍ فِيْ جَوِّ السَّمَاۗءِ ۭ مَا يُمْسِكُهُنَّ اِلَّا اللّٰهُ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ (۷۹)

آیاتِ الٰہی کی طرف اشارہ

یعنی اگر یہ آنکھیں کھول کر دیکھیں تو انھیں معلوم ہو کہ ہر چیز کو اس کی ضرورت کی چیزیں خدا ہی کی عنایت سے ملی ہیں۔ پرندے فضا میں اڑتے ہیں۔ آخر خدا کے سوا کون ہے جو ان کو فضا میں تھامتا ہے۔ سورۂ ملک میں ہے اَوَلَمْ يَرَوْا اِلَى الطَّيْرِ فَوْقَهُمْ صٰۗفّٰتٍ وَّيَقْبِضْنَ ڼ مَا يُمْسِكُهُنَّ اِلَّا الرَّحْمٰنُ ۭ اِنَّهٗ بِكُلِّ شَيْءٍۢ بَصِيْرٌ (کیا انھوں نے اپنے اوپر پرندوں کو نہیں دیکھا، وہ اپنے پروں کو پھیلائے ہوئے بھی ہوتے ہیں اور ان کو سمیٹ بھی لیتے ہیں، ان کو خدائے رحمان ہی تھامتا ہے، بے شک وہ ہر چیز کی دیکھ بھال کرنے والا ہے)۔

اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ۔ یعنی جو لوگ ایمان لانا چاہیں ان کے لیے اس میں بہت سی نشانیاں ہیں۔ اس میں سب سے بڑی نشانی تو اس بات کی ہے کہ اس کائنات کا خالق رحمان و رحیم ہے، اس نے جو چیز بھی پیدا کی اس کو ضرورت کی تمام چیزیں مہیا کیں اور اس کو ان کے استعمال کا سلیقہ عطا فرمایا۔ اس میں اس بات کی بھی نشانی ہے کہ یہ کائنات ایک ہی خدا وحدہٗ لا شریک لہٗ کے تصرف

میں ہے، وہی اس کے افراد میں توافق و سازگاری پیدا کرتا ہے اور فضا کو پرندوں کی جولانگاہ بنا دیتا ہے۔

اس میں اس بات کی بھی نشانی ہے کہ جو چیز جہاں تھمی ہوئی ہے خدا ہی کے تھامے تھمی ہوئی ہے اگر وہ نہ تھامے تو کوئی چیز بھی اپنی جگہ پڑکی نہیں رہ سکتی۔ سورہ ملک میں ہے۔ هُوَ الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ الْأَرْضَ ذَلُولًا فَامْشُوا فِي مَنَاكِبِهَا وَكُلُوا مِن رِّزْقِهِ وَإِلَيْهِ النُّشُورُ ءَأَمِنتُم مَّن فِي السَّمَاءِ أَن يَخْسِفَ بِكُمُ الْأَرْضَ فَإِذَا هِيَ تَمُورُ أَمْ أَمِنتُم مَّن فِي السَّمَاءِ أَن يُرْسِلَ عَلَيْكُمْ حَاصِبًا فَسَتَعْلَمُونَ كَيْفَ نَذِيرِ (۱۵-۱۷) (وہی ہے جس نے تمھارے لیے زمین کو فرمانبردار بنا دیا تو اس کے مونڈھوں پر چلو پھرو، اور اس کے رزق میں سے کھاؤ اور اسی کی طرف اکٹھے ہونا ہے۔ کیا تم اس سے جو آسمان میں ہے بے خوف ہو گئے کہ وہ تمھارے سمیت زمین کو دھنسا دے، پس وہ دفعۃً چکر کرنے لگے۔ کیا تم اس سے جو آسمان میں ہے بے خوف ہو گئے کہ وہ تم پر سنگریزے برسا دینے والی آندھی بھیج دے تو تم جان لو گے کہ میرا ڈراوا کیسا ہے)

وَاللَّهُ جَعَلَ لَكُم مِّن بُيُوتِكُمْ سَكَنًا وَجَعَلَ لَكُم مِّن جُلُودِ الْأَنْعَامِ بُيُوتًا تَسْتَخِفُّونَهَا يَوْمَ ظَعْنِكُمْ وَيَوْمَ إِقَامَتِكُمْ وَمِنْ أَصْوَافِهَا وَأَوْبَارِهَا وَأَشْعَارِهَا أَثَاثًا وَمَتَاعًا إِلَىٰ حِينٍ (۸۰)

خود اپنے حالات پر غور کرنے کی دعوت

یعنی پرندوں کو تو تم نے دیکھا کہ ان کا خیمہ و خرگاہ سب ان کے ساتھ ہوتا ہے۔ اب ذرا اپنے حالات پر غور کرو کہ اللہ نے کس کس طرح تم کو اپنی نعمتوں سے نوازا ہے۔ اللہ ہی ہے جس نے تمھارے لیے تمھارے گھروں کو وجہ سکون و راحت بنایا، دن بھر کے تھکے ماندے جب تم اپنے گھروں کو واپس لوٹتے ہو تو کیسی راحت پاتے ہو اور رات کی تاریکی میں کیسی حفاظت کا احساس کرتے ہو۔ پھر خدا ہی ہے جس نے جانوروں کی کھالوں کو خیمے بنانے کے لیے موزوں بنا دیا جن سے تم خیمے بنا لیتے ہو جو تمھارے کوچ و قیام کے لیے نہایت ہلکے پھلکے ہوتے ہیں۔ پھر انہی جانوروں کی اون اور ان کے بالوں سے تم اپنے دوسرے سامان اور ضرورت کی چیزیں تیار کر لیتے ہو جو تمھارے کام آتی ہیں۔

وَاللَّهُ جَعَلَ لَكُم مِّمَّا خَلَقَ ظِلَالًا وَجَعَلَ لَكُم مِّنَ الْجِبَالِ أَكْنَانًا وَجَعَلَ لَكُمْ سَرَابِيلَ تَقِيكُمُ الْحَرَّ وَسَرَابِيلَ تَقِيكُم بَأْسَكُمْ كَذَٰلِكَ يُتِمُّ نِعْمَتَهُ عَلَيْكُمْ لَعَلَّكُمْ تُسْلِمُونَ (۸۱)

بعض اور نشانیوں کی طرف اشارہ

پھر اور دیکھو، یہ خدا ہی ہے جس نے اپنی پیدا کی ہوئی چیزوں میں تمھارے لیے سایہ پیدا کر دیا۔ تمھارے لیے پہاڑوں میں پناہ گاہیں بنا دیں، تمھارے لیے ایسے لباس بنا دیے جو گرمی اور سموم کی لپیٹ سے تمھیں بچاتے اور جنگوں میں تمھاری حفاظت کرتے ہیں۔ اللہ نے یہ اتمام نعمت تم پر اس لیے کیا کہ تم خدا کے سوا کسی اور کے محتاج نہ رہو اور اپنے آپ کو کلیتہً اپنے رب ہی کے حوالے کر دو۔

لباس کے ذکر میں گرمی سے حفاظت کا جو حوالہ آیا ہے یہ قرآن کے ابتدائی مخاطب اہل عرب کی رعایت سے ہے بلکہ اس سے اوپر جو چیزیں مذکور ہوئی ہیں ان میں بھی اہل عرب اور ان کی بدویانہ زندگی کی رعایت ملحوظ ہے۔ کلام کے حسن اور اس کی تاثیر کا صحیح اندازہ کرنے کے لیے خطاب کے اس پہلو کا لحاظ رکھنا بھی ضروری

ہوتا ہے۔

روزمرہ کے استعمال کی اشیا کی نعمت

یہ امر بھی ملحوظ رکھیے کہ اوپر جن چیزوں کے حوالے آئے ہیں یہ روزمرہ زندگی کی عام چیزیں ہیں جن سے مخاطب گروہ کے ہر شخص کو سابقہ تھا۔ قرآن نے ان کا ذکر کر کے گویا توجہ دلائی ہے کہ جب ان چیزوں میں سے بھی کوئی چیز ایسی نہیں ہے جس کو تم خدا کے سوا کسی اور کی طرف منسوب کر سکو تو خدا کے سوا تم دوسروں کو کیوں پوجتے ہو آخر وہ کس مرض کی دوا ہیں؟ پھر تو تمہیں بالکلیہ اپنے آپ کو خدا ہی کے حوالے کرنا چاہیے جس نے تمہاری چھوٹی چھوٹی ضروریات تک کا اہتمام کیا۔

فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ (۸۲)

یہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے ارشاد ہے کہ اگر یہ اعراض و انکار پر جم گئے تو تم زیادہ ان کے درپے نہ ہو تمہارے اوپر ان کے ایمان کی ذمہ داری نہیں ہے، صرف واضح طور پر حق کو پہنچا دینے کی ذمہ داری ہے۔ تم اپنا فرض ادا کر کے ان کو ان کے حال پر چھوڑو۔ یہ اپنی اس ضد کا انجام خود دیکھیں گے۔

يَعْرِفُوْنَ نِعْمَتَ اللّٰهِ ثُمَّ يُنْكِرُوْنَهَا وَاَكْثَرُهُمُ الْكٰفِرُوْنَ (۸۳)

یعنی یہ بات نہیں ہے کہ یہ باتیں ان کی سمجھ میں نہ آرہی ہوں، آخر ایسا کون کودن ہو سکتا ہے کہ یہ نہ سمجھ سکے کہ یہ ساری نعمتیں اللہ ہی کی بخشی ہوئی ہیں۔ یہ لوگ جان کر انجان بنتے ہیں اور ان میں سے اکثر ناشکرے ہیں، ان کے اندر سے ایمان لانے والے تھوڑے ہی نکلیں گے۔ تو ان کو ان کے حال پر چھوڑو، یہ خود بھگتیں گے۔

۱۴۔ آگے کا مضمون ___ آیات ۸۴-۹۰

رسول اتمام حجت کا آخری ذریعہ ہے

اوپر رسولوں کی ذمہ داری کی آخری حد واضح کر دی گئی ہے۔ آگے اسی تعلق سے یہ حقیقت واضح فرمائی گئی ہے کہ رسول کے ذریعے سے اتمام حجت کے بعد کسی قوم کے لیے گمراہی پر قائم رہنے کے لیے کوئی عذر باقی نہ رہے گا جس کو وہ خدا کے سامنے پیش کر سکے۔ اللہ تعالیٰ نے ہر امت میں حق کی تبلیغ اور اتمام حجت کے لیے اپنے رسول بھیجے۔ وہ ان سے قیامت کے دن گواہی دلوا دے گا کہ انھوں نے اللہ کا پیغام لوگوں کو پہنچا دیا۔ یہی حیثیت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اس امت کے لوگوں کے لیے ہے۔ اسی مقصد کے لیے اللہ نے آپ پر یہ کتاب اتاری ہے۔ اس کتاب کا جو بنیادی پیغام ہے آخر میں اس کا اجمالی حوالہ ہے۔ آیات کی تلاوت کیجیے۔

آیات ۸۴-۹۰

وَيَوْمَ نَبْعَثُ مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ شَهِيْدًا ثُمَّ لَا يُؤْذَنُ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَلَا
هُمْ يُسْتَعْتَبُوْنَ ﴿۸۴﴾ وَاِذَا رَاَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوا الْعَذَابَ فَلَا يُخَفَّفُ
عَنْهُمْ وَلَا هُمْ يُنْظَرُوْنَ ﴿۸۵﴾ وَاِذَا رَاَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا شُرَكَآءَهُمْ

قَالُوْا رَبَّنَا هٰٓؤُلَآءِ شُرَكَآؤُنَا الَّذِيْنَ كُنَّا نَدْعُوْا مِنْ دُوْنِكَ ۚ
فَاَلْقَوْا اِلَيْهِمُ الْقَوْلَ اِنَّكُمْ لَكٰذِبُوْنَ ﴿۸۶﴾ وَاَلْقَوْا اِلَى اللّٰهِ يَوْمَئِذِ ِۨ الثلثة
السَّلَمَ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ﴿۸۷﴾ اَلَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ
صَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ زِدْنٰهُمْ عَذَابًا فَوْقَ الْعَذَابِ بِمَا كَانُوْا
يُفْسِدُوْنَ ﴿۸۸﴾ وَيَوْمَ نَبْعَثُ فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ شَهِيْدًا عَلَيْهِمْ مِّنْ
اَنْفُسِهِمْ وَجِئْنَا بِكَ شَهِيْدًا عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ ۭ وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ
۱۲ ع ۶ ۱۸ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ وَّهُدًى وَّرَحْمَةً وَّبُشْرٰى لِلْمُسْلِمِيْنَ ﴿۸۹﴾ ع
اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِيْتَآئِ ذِي الْقُرْبٰى وَيَنْهٰى
عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْيِ ۚ يَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ﴿۹۰﴾

ترجمۂ آیات ۸۴-۹۰

اور یاد کرو اس دن کو جس دن ہم ہر امت میں سے ایک گواہ اٹھائیں گے، پھر جن لوگوں نے کفر کیا ہو گا نہ ان کو عذر پیش کرنے کی اجازت دی جائے گی اور نہ ان سے یہ فرمائش ہو گی کہ وہ خدا کو راضی کریں۔ اور جب وہ لوگ، جنھوں نے ظلم کیا ہو گا، عذاب کو دیکھ لیں گے تو پھر نہ وہ ان سے ہلکا ہی کیا جائے گا اور نہ انھیں مہلت ہی دی جائے گی۔ اور جب وہ لوگ جنھوں نے شرک کیا ہے، اپنے شریکوں کو دیکھیں گے، پکاریں گے کہ اے ہمارے رب یہی ہمارے وہ شرکاء ہیں جن کو ہم تجھے چھوڑ کر پکارتے رہے تو وہ ان پر بات پھینک ماریں گے کہ تم بالکل جھوٹے ہو۔ اور وہ اس دن اللہ کے آگے سپر ڈال دیں گے اور جو کچھ وہ افترا کرتے رہے تھے وہ سب ہوا ہو جائے گا۔ جن لوگوں نے کفر کیا اور لوگوں کو اللہ کے راستہ سے روکا ہم ان کے عذاب پر عذاب کا اضافہ کریں گے بوجہ اس کے کہ وہ فساد مچاتے رہے۔ ۸۴-۸۸

اور یاد کرو جس دن ہم ہر امت میں سے ایک گواہ ان پر انھیں میں سے اٹھائیں گے اور تم کو ان لوگوں پر گواہ بنا کر لائیں گے اور ہم نے تم پر کتاب اتاری ہے ہر چیز کو کھول دینے کے لیے اور وہ ہدایت اور رحمت اور بشارت ہے فرماں برداروں کے لیے بے شک اللہ حکم دیتا ہے عدل کا، احسان کا اور ذوی القربیٰ کو دیتے رہنے کا اور روکتا ہے بے حیائی، برائی اور سرکشی سے' وہ تمھیں نصیحت کرتا ہے تاکہ تم یاددہانی حاصل کرو۔ ۸۹-۹۰

۱۵- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَيَوْمَ نَبْعَثُ مِنْ كُلِّ أُمَّةٍ شَهِيدًا ثُمَّ لَا يُؤْذَنُ لِلَّذِينَ كَفَرُوا وَلَا هُمْ يُسْتَعْتَبُونَ (۸۴)

'امۃ' سے امت دعوت مراد ہے

'اُمَّۃ' سے یہاں مراد امت دعوت ہے جس کی طرف کسی رسول کی بعثت ہوتی ہے۔

'شہید' سے مراد رسول ہے

'شَہِیْد' سے مراد رسول ہے اس لیے کہ وہی دنیا میں اپنی قوم کے لوگوں پر حق کی گواہی دیتا ہے اور وہی قیامت کے دن گواہ بنا کر کھڑا کیا جائے گا اور گواہی دے گا کہ اس نے اللہ کا دین لوگوں کو پہنچا دیا تھا۔

'ثُمَّ لَا یُؤْذَنُ لِلَّذِیْنَ کَفَرُوْا' کے بعد کلام میں حذف ہے جس پر قرینہ دلیل ہے۔ یعنی قیامت کے روز رسولوں کی گواہی کے بعد کافروں کو یہ اجازت نہیں دی جائے گی کہ وہ عذر و معذرت کے لیے زبانیں کھولیں۔

'استعتاب' کا مفہوم

'اِسْتِعْتَاب' کے معنی ہیں کسی کا کسی سے یہ مطالبہ کرنا کہ وہ اس کی وجہ شکایت کو رفع کر کے اس کو راضی کرے۔ یہاں اس سے یہ مراد ہے کہ قیامت میں کافروں اور نافرمانوں سے یہ فرمائش نہیں کی جائے گی کہ وہ خدا کو راضی کرنے کی کوشش کریں اس لیے کہ اس وقت سعی و عمل کے دروازے بند ہو چکیں گے اور جزا و سزا کا مرحلہ شروع ہو جائے گا۔ مابعد الموت من مستعتب ولا بعد الدنیا دار الا الجنۃ او النار۔

کفار کو تنبیہ

یہ کفار کو تنبیہ ہے کہ اپنی سرکشی میں بہت آگے نہ بڑھتے جاؤ۔ اس دن کو بھی یاد رکھو جس دن ہر امت میں سے اس کی طرف بھیجے ہوئے رسول کو ہم گواہ بنا کر اٹھائیں گے اور اسی سے گواہی دلوا دیں گے کہ اللہ کا پیغام اس نے پورا پورا لوگوں کو پہنچا دیا تھا۔ پھر نہ کسی کو عذر و معذرت پیش کرنے کے لیے زبان کھولنے کی اجازت دی جائے گی اور نہ کسی سے یہ کہا جائے گا کہ وہ اللہ کے غضب کو دور اور اس کو راضی کرنے کی کوشش کرے اس لیے کہ رسول کے اتمام حجت کے بعد نہ کسی عذر و معذرت کا موقع باقی رہتا اور نہ قیام قیامت کے بعد خدا کو راضی کرنے کے لیے کسی سعی کا۔

وَإِذَا رَأَى الَّذِينَ ظَلَمُوا الْعَذَابَ فَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُمْ وَلَا هُمْ يُنْظَرُونَ (۸۵)

'الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا' سے یہاں مراد وہ لوگ ہیں جنھوں نے شرک کر کے خدا کے حقوق بھی تلف کیے اور اپنی جانوں پر بھی ظلم ڈھائے۔ فرمایا کہ یہ ظالم لوگ جب قیامت کے دن خدا کے عذاب کی پکڑ میں آجائیں گے تو پھر نہ اس عذاب میں کوئی تخفیف ہی ہوگی اور نہ عارضی طور پر ہی ان کو اس سے مہلت نصیب ہوگی، پھر وہ عذاب سخت سے سخت تر ہی ہوتا جائے گا اور اس کے تسلسل میں بھی کوئی انقطاع واقع نہ ہوگا۔

وَاِذَا رَاَ الَّذِیْنَ اَشْرَكُوْا شُرَكَآءَهُمْ قَالُوْا رَبَّنَا هٰٓؤُلَآءِ شُرَكَآؤُنَا الَّذِیْنَ كُنَّا نَدْعُوْا مِنْ دُوْنِكَ ۚ فَاَلْقَوْا اِلَیْهِمُ الْقَوْلَ اِنَّكُمْ لَكٰذِبُوْنَ (۸۶)

مشرکین اور ان کے شریکوں میں ردوبدل

یعنی آج یہ مشرکین اپنے جن شریکوں پر اعتماد کیے بیٹھے ہیں وہ بھی رو در رو ان کو جھوٹا قرار دیں گے۔ یہ جب اپنے ان شریکوں کو دیکھیں گے تو پکاریں گے کہ اے پروردگار! یہی ہیں وہ جن کو ہم تیرے سوا پکارتے رہے ہیں۔ وہ جھٹ ان کے منہ پر بات پھینک ماریں گے کہ تم بالکل جھوٹے ہو۔ یعنی ہمیں کیا خبر کہ تم ہمیں پکارتے رہے ہو۔ اگر تم اس حماقت و جہالت میں مبتلا رہے ہو تو ذمہ داری سرتاسر تمھاری ہے، تم اس کو بھگتو۔ ہمیں اس میں کیوں گھسیٹنے کی کوشش کر رہے ہو۔ ہم نے تم سے کب کہا تھا کہ تم خدا کو چھوڑ کر ہمیں پکارو۔

یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ مشرکین کا یہ کہنا کہ یہی ہیں ہمارے شریک جن کو ہم تیرے سوا پکارتے رہے ہیں، فی الجملہ اپنے آپ کو بری ٹھہرانے کے لیے ہوگا کہ اصلی مجرم یہ ہیں جن کے سبب سے ہم گمراہ ہوئے۔ اس روشنی میں دیکھیے تو شرکاء کے جواب کی تلخی کا اصل رخ واضح ہوگا۔

وَاَلْقَوْا اِلَى اللّٰهِ یَوْمَىٕذِ ِۨ السَّلَمَ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا یَفْتَرُوْنَ (۸۷)

لفظ 'سَلَم' کی تحقیق آیت ۲۸ کے تحت گزر چکی ہے۔

آیت کا مطلب یہ ہے کہ جب نوبت یہاں تک پہنچ جائے گی کہ جن کی زندگی بھر پوجا کرتے رہے وہی رو در رو ان کو جھوٹا قرار دیں گے تو ان کے لیے عذر و معذرت اور اپنی بریت میں کچھ کہنے کی گنجائش ہی باقی نہیں رہ جائے گی۔ پھر تو وہ بالکل بے بس ہو کر سپر ڈال دیں گے اور ان کے وہ دیوی دیوتا، جن کو خدا پر افترا کر کے انھوں نے خدا کا شریک بنایا تھا، سب غائب ہو جائیں گے۔

یہاں شرک کو 'افترا' سے تعبیر فرمایا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مشرکین جن کو پوجتے تھے ان کی نسبت بالکل بے سند وہ یہ دعویٰ بھی کرتے تھے کہ خدا نے ان کو اپنا شریک بنایا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ صریح افترا علی اللہ ہے۔

اَلَّذِیْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ زِدْنٰهُمْ عَذَابًا فَوْقَ الْعَذَابِ بِمَا كَانُوْا یُفْسِدُوْنَ (۸۸)

شرک کے لیڈروں کے لیے مزید عذاب

یہ کفار و مشرکین کے ان لیڈروں کی طرف اشارہ ہے جو صرف خود ہی مبتلائے کفر و شرک نہیں تھے بلکہ دوسروں کو بھی اللہ کی راہ سے روکتے تھے۔ فرمایا کہ ہم ان کے اس افساد کی پاداش میں ان کے عذاب پر عذاب کا اضافہ کریں گے۔ ان کو خود ان کی گمراہی کی بھی سزا بھگتنی ہوگی اور دوسروں کی گمراہی میں ان کا جو حصہ ہوگا اس کے بقدر وہ اس کی سزا بھی بھگتیں گے۔

وَيَوْمَ نَبْعَثُ فِي كُلِّ أُمَّةٍ شَهِيدًا عَلَيْهِمْ مِنْ أَنْفُسِهِمْ وَجِئْنَا بِكَ شَهِيدًا عَلَى هَؤُلَاءِ وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ تِبْيَانًا لِكُلِّ شَيْءٍ وَهُدًى وَرَحْمَةً وَبُشْرَى لِلْمُسْلِمِينَ (۸۹)

نبی صلعم دو بعثتوں کے ساتھ مبعوث ہوئے

یہ مضمون اوپر آیت ۸۴ میں بھی گزر چکا ہے۔ یہاں یہ اضافہ ہے کہ جِئْنَا بِكَ شَهِيدًا عَلَى هَؤُلَاءِ یعنی جس طرح ہم تمام امتوں میں سے ایک گواہ ان پر کھڑا کریں گے اسی طرح تم کو ان لوگوں پر گواہ بنا کر اٹھائیں گے۔ "ان لوگوں پر" یعنی ان اہل عرب پر جن کی طرف تمھاری بعثت براہ راست ہے اور جو تمھاری امت دعوت کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ امر واضح رہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم دو بعثتوں کے ساتھ مبعوث ہوئے اہل عرب کی طرف آپ کی بعثت براہ راست ہوئی اور تمام خلق کی طرف آپ کی امت کے واسطہ سے جس کو شُهَدَاءُ اللَّهِ فِي الْأَرْضِ کی حیثیت حاصل ہے اور جس پر اب قیامت تک خلق کی رہنمائی کی ذمہ داری عاید ہوتی ہے۔

کتاب الٰہی، اتمام حجت کا ذریعہ ہے

وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ تِبْيَانًا لِكُلِّ شَيْءٍ میں اس چیز کا حوالہ ہے جو اس دنیا میں حق کی گواہی اور لوگوں پر اتمام حجت کا ذریعہ ہے۔ فرمایا کہ تمھارے اسی فرض منصبی کے تقاضے سے ہم نے تم پر کتاب اتاری ہے جو شہادت حق کے لیے تمام پہلوؤں سے جامع اور مکمل اور ہر متعلق چیز کو اچھی طرح واضح کر دینے والی ہے تاکہ کسی کے لیے گمراہی پر جمے رہنے کے لیے کوئی عذر باقی نہ رہ جائے۔ اس کتاب کی تعریف میں مزید یہ فرمایا کہ هُدًى وَرَحْمَةً وَبُشْرَى لِلْمُسْلِمِينَ یہ ان لوگوں کے لیے ہدایت اور رحمت اور بشارت ہے جو اپنے آپ کو بالکلیہ اپنے رب کے حوالے کر دیں۔ یہ ان کو صراط مستقیم کی طرف رہنمائی کرے گی پھر جو اس صراط مستقیم کو اختیار کر لیں گے ان پر خدائے رحمان و رحیم کی عظیم رحمت ہوگی اور یہ عظیم رحمت کی پیشگی بشارت ہے۔

إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ وَإِيتَاءِ ذِي الْقُرْبَى وَيَنْهَى عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْيِ يَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ (۹۰)

قرآنی اوامر و منہیات کا خلاصہ

یہ عظیم آیت تمام قرآنی اوامر و منہیات کا خلاصہ ہے۔ قرآن جن باتوں کا حکم دیتا ہے ان کی بنیادیں بھی اس میں واضح کر دی گئی ہیں اور جن چیزوں سے وہ روکتا ہے ان کی اساسات کی طرف بھی اس میں اشارہ ہے۔ تمام قرآنی اوامر کی بنیاد عدل، احسان اور ذوی القربیٰ کے لیے انفاق پر ہے اور اس کی منہیات میں وہ چیزیں داخل ہیں جن کے اندر فحش، منکر اور بغی کی روح فساد پائی جاتی ہے۔ یہاں اس کا حوالہ دینے سے مقصود ان لوگوں کو متنبہ کرنا ہے جو قرآن کی مخالفت میں اپنا ایڑی چوٹی کا زور صرف کر رہے تھے تاکہ وہ سوچیں کہ جس چیز کی وہ مخالفت کر رہے ہیں اس کی تعلیم کیا ہے اور اس کی مخالفت سے کس عدل و خیر کی مخالفت اور کس شر و فساد کی حمایت لازم آتی ہے۔

یہاں نہایت اجمال کے ساتھ صرف اوامر و منہیات کی اساسات کا ذکر فرمایا ہے۔ اس سے یہ واضح نہیں ہوتا کہ کس طرح کے احکام ہیں جو عدل و احسان کے تحت آتے ہیں اور کس نوعیت کی منہیات ہیں جو فحشاء، منکر یا بغی میں داخل ہیں۔ اس اجمال کی تفصیل اس سے آگے کی سورہ — سورہ بنی اسرائیل آیات ۲۲-۳۹ میں آئی

ہے۔ سورۂ بنی اسرائیل سورۂ نحل کے مثنیٰ کی حیثیت رکھتی ہے اس وجہ سے اس میں اس اجمال کی وضاحت کے لیے نہایت موزوں مقام تھا۔ ہم تکرار بحث سے بچنے کے لیے یہ مناسب خیال کرتے ہیں کہ اس اجمال کی وضاحت وہیں کی جائے۔ جب عدل، احسان، انفاق اور فحشا، منکر، بغی کے اہم اجزا بھی سامنے ہوں گے تو خیر و شر کے ان اصولوں کے سمجھنے میں بڑی آسانی ہوگی۔ وہیں ان شاء اللہ ہم یہ بھی واضح کریں گے کہ اس تفصیل میں اور تورات کے احکام عشرہ میں بڑی مطابقت ہے جس سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ خیر و شر کے یہ اصول سابق ادیان میں بھی مسلم رہے ہیں۔

عدل کی توضیح

یہاں بالاجمال صرف یہ ذہن میں رکھیے کہ 'عدل' یہ ہے کہ جس کا جو حق واجب ہم پر عاید ہوتا ہے ہم بے کم و کاست اس کو ادا کریں، خواہ صاحبِ حق کمزور ہو یا طاقت ور اور خواہ وہ ہم کو مبغوض ہو یا محبوب۔

احسان کی توضیح

'احسان' عدل سے ایک زائد شے ہے۔ یہ صرف حق کی ادائیگی ہی کا تقاضا نہیں کرتا بلکہ مزید برآں یہ تقاضا بھی کرتا ہے کہ دوسرے کے ساتھ ہمارا معاملہ کریمانہ اور فیاضانہ ہو۔

'اِیْتَآئِ ذِی الْقُرْبٰی' سے مراد

'اِیْتَآئِ ذِی الْقُرْبٰی' احسان کی ایک نہایت اہم فرع ہے۔ قرابت مند عدل و احسان کے حقدار تو ہیں ہی، مزید برآں وہ بربنائے قرابت مزید انفاق کے مستحق ہیں، ہر صاحبِ مال کو اپنے عزیزوں اور رشتہ داروں پر فیاضی سے خرچ کرنا چاہیے۔

'فحشاء' سے مراد، 'منکر' سے مراد

'فَحْشَاء' کھلی ہوئی بے حیائی اور بدکاری کو کہتے ہیں۔ مثلاً زنا اور لواطت اور اس قبیل کی دوسری برائیاں۔

'مُنْکَر' معروف کا ضد ہے۔ معروف ان اچھی باتوں کو کہتے ہیں جن کا ہر اچھی سوسائٹی میں چلن ہو۔ مثلاً مہمانداری، مسافر نوازی اور اس قبیل کی دوسری نیکیاں۔ منکر اس کا ضد ہے تو اس سے مراد وہ باتیں ہوں گی جو معروف اور عقل و عرف کے پسندیدہ طریقہ اور آداب کے خلاف ہوں۔

'بغی' سے مراد

'بغی' کے معنی سرکشی اور تعدی کے ہیں یعنی آدمی اپنی قوت و طاقت اور اپنے زور و اثر سے ناجائز فائدہ اٹھائے اور اس سے دوسروں کو دبانے کی کوشش کرے۔

یہاں ان اجمالی اشارات پر قناعت کیجیے، آگے والی سورہ میں ان کی پوری تفصیل آئے گی۔

۱۶- آگے کا مضمون ـــــ آیات ۹۱-۹۵

یہود کو ملامت

آگے کی آیات میں خطاب یہود سے ہے اور یہ خطاب بغیر نام لیے اچانک اس طرح سامنے آگیا ہے جس طرح خطیب بسا اوقات محض رخ کی تبدیلی سے روئے سخن کو بدل دیتا ہے۔ اگرچہ وہ نام نہیں لیتا کہ خطاب کس سے ہے لیکن اس کی باتیں خود مخاطب کو معین کر دیتی ہیں۔ یہود اس مرحلہ میں اسلام کے باب میں غیر جانبدار نہیں رہ گئے تھے بلکہ وہ اس سے خطرہ محسوس کر کے اس کی مخالفت کے لیے اندر اندر سازشوں میں مصروف ہو گئے تھے۔ انھوں نے قریش کے ان لیڈروں کی پیٹھ ٹھونکنی شروع کر دی تھی جو اس دعوت سے روکنے کے لیے پورے

جوش وخروش سے میدان میں نکل آئے تھے۔ قرآن نے یہاں یہود کی اسی حرکت پر ان کو ملامت کی ہے کہ تم اللہ سے عہد باندھنے کے بعد محض بربنائے حسد مخالفین کی صف میں جا کھڑے ہوئے ہو اور اس بڑھیا کے مانند ہو جو اپنا کاتا بنا خود اپنے ہی ہاتھوں ادھیڑ کے رکھ دے، تم اللہ سے باندھے ہوئے عہد کے بخیے ادھیڑ رہے ہو۔ اللہ کے عہد کو متاع دنیا کے عوض نہ بیچو اور اپنی قسموں کو لوگوں کو حق سے برگشتہ کرنے کا ذریعہ نہ بناؤ۔ آیات کی تلاوت کیجیے۔

آیات ۹۱-۹۵

وَأَوْفُوا بِعَهْدِ اللَّهِ إِذَا عَاهَدتُّمْ وَلَا تَنقُضُوا الْأَيْمَانَ بَعْدَ
تَوْكِيدِهَا وَقَدْ جَعَلْتُمُ اللَّهَ عَلَيْكُمْ كَفِيلًا ۚ إِنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ مَا
تَفْعَلُونَ ﴿٩١﴾ وَلَا تَكُونُوا كَالَّتِي نَقَضَتْ غَزْلَهَا مِن بَعْدِ قُوَّةٍ
أَنكَاثًا ۖ تَتَّخِذُونَ أَيْمَانَكُمْ دَخَلًا بَيْنَكُمْ أَن تَكُونَ أُمَّةٌ هِيَ
أَرْبَىٰ مِنْ أُمَّةٍ ۚ إِنَّمَا يَبْلُوكُمُ اللَّهُ بِهِ ۚ وَلَيُبَيِّنَنَّ لَكُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ
مَا كُنتُمْ فِيهِ تَخْتَلِفُونَ ﴿٩٢﴾ وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ لَجَعَلَكُمْ أُمَّةً وَاحِدَةً
وَلَٰكِن يُضِلُّ مَن يَشَاءُ وَيَهْدِي مَن يَشَاءُ ۚ وَلَتُسْأَلُنَّ عَمَّا كُنتُمْ
تَعْمَلُونَ ﴿٩٣﴾ وَلَا تَتَّخِذُوا أَيْمَانَكُمْ دَخَلًا بَيْنَكُمْ فَتَزِلَّ قَدَمٌ
بَعْدَ ثُبُوتِهَا وَتَذُوقُوا السُّوءَ بِمَا صَدَدتُّمْ عَن سَبِيلِ اللَّهِ ۖ
وَلَكُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ ﴿٩٤﴾ وَلَا تَشْتَرُوا بِعَهْدِ اللَّهِ ثَمَنًا قَلِيلًا ۚ إِنَّمَا
عِندَ اللَّهِ هُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ إِن كُنتُمْ تَعْلَمُونَ ﴿٩٥﴾

ترجمۂ آیات ۹۱-۹۵

اور اللہ کے ساتھ اپنے عہد کو، جب کہ تم وہ باندھ چکے ہو، پورا کرو اور قسموں کو ان کو مؤکد کرنے کے بعد مت توڑو درآنحالیکہ تم اللہ کو اپنے اوپر گواہ ٹھہرا چکے ہو۔ بے شک اللہ جانتا ہے جو کچھ تم کرتے ہو۔ اور اس عورت کے مانند نہ بن جاؤ جس نے اپنا سوت خوب مضبوط کاتنے کے

بعد تار تار ادھیڑ کے رکھ دیا۔ تم اپنی قسموں کو اس اندیشہ سے آپس کے فساد کا ذریعہ بناتے ہو کہ ایک امت دوسری امت سے کہیں بڑھ نہ جائے اللہ اس کے ذریعہ سے تمھاری آزمائش کر رہا ہے اور وہ قیامت کے دن اس چیز کو اچھی طرح تم پر واضح کر دے گا جس میں تم اختلاف کر رہے ہو۔ ۹۱-۹۲

اور اگر اللہ چاہتا تو تم سب کو ایک ہی امت بنا دیتا لیکن وہ گمراہ کر دیتا ہے جس کو چاہتا ہے اور ہدایت دیتا ہے جس کو چاہتا ہے اور جو کچھ تم کر رہے ہو اس کے باب میں ضرور تم سے پرسش ہونی ہے۔ ۹۳

اور تم اپنی قسموں کو آپس میں فریب کا ذریعہ نہ بناؤ کہ کوئی قدم جمنے کے بعد پھسل جائے اور تم اللہ کی راہ سے روکنے کی پاداش میں عذاب چکھو اور تمھارے واسطے ایک عذاب عظیم ہے اور اللہ کے عہد کو متاع قلیل کے عوض نہ بیچو۔ جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہ تمھارے لیے بہتر ہے اگر تم جانو۔ ۹۴-۹۵

۱۷۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَاَوْفُوْا بِعَهْدِ اللّٰهِ اِذَا عٰهَدْتُّمْ وَلَا تَنْقُضُوا الْاَيْمَانَ بَعْدَ تَوْكِيْدِهَا وَقَدْ جَعَلْتُمُ اللّٰهَ عَلَيْكُمْ كَفِيْلًا ۭ اِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا تَفْعَلُوْنَ (۹۱)

یہود کو ایفائے عہد کا حکم

اوپر آیت ۸۸ میں قریش کے ان اشرار کا ذکر گزر چکا ہے جو اللہ کے دین سے لوگوں کو روکنے کے لیے اپنا ایڑی چوٹی کا زور صرف کر رہے تھے۔ اب اس ضمن میں نام لیے بغیر یہود کو مخاطب کر لیا ہے اس لیے کہ اس مرحلہ میں انھوں نے بھی اپنے تمام مکر و فریب کے ساتھ اللہ کی راہ سے روکنے کی اس مہم کی پشت پناہی شروع کر دی تھی۔ ان کی طرف رخ کر کے فرمایا کہ اللہ سے جو عہد تم نے باندھا ہے اس کو پورا کرو اور اپنی قسموں کو مؤکد و موثق کرنے اور ان پر اللہ کو گواہ اور ضامن ٹھہرانے کے بعد نہ توڑو۔ یاد رکھو کہ جو کچھ تم کر رہے ہو اور جو کچھ کرو گے اللہ اس سے اچھی طرح باخبر ہے۔

یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام شریعت کے ایک ایک حکم کو پوری جماعت کے سامنے پیش کرتے اور اللہ کو گواہ اور ضامن بنا کر لوگوں سے اس کی پابندی کا عہد لیتے اور لوگ قسم کھا کر اس کی پابندی کا عہد کرتے۔ اس طرح ان کی پوری شریعت کی حیثیت اللہ تعالیٰ اور بنی اسرائیل کے درمیان ایک عہد نامہ کی تھی۔ چنانچہ اسی بنا پر تورات کو عہد نامہ کہتے ہیں۔ یہ عہد نامہ جس طرح شریعت کے عام احکام و قوانین پر مشتمل ہے، اسی طرح اس میں وہ عہد بھی شامل ہے جو بنی اسرائیل سے بنی اسمٰعیل میں پیدا ہونے والے نبی امی کی تائید و نصرت کا لیا گیا تھا اور آیت 'اِنَّ اللّٰہَ یَاۡمُرُ بِالۡعَدۡلِ الاٰیۃ' کے تحت ہم یہ اشارہ بھی کر چکے ہیں کہ جن اساسات پر قرآن کے اوامر و نواہی مبنی ہیں بعینہٖ انہی اساسات پر تورات کے احکام عشرہ مبنی ہیں۔ قرآن نے یہاں انہی عہود کو یاد دلایا ہے کہ خدا سے جو عہد تم باندھ چکے ہو اس کو پورا کرو اور پابندی عہد کی پکی قسمیں کھانے اور ان پر اللہ کو ضامن اور گواہ ٹھہرانے کے بعد ان کو نہ توڑو، یاد رکھو کہ آج جو کچھ تم کر رہے ہو اللہ اس سے پوری طرح باخبر ہے اور کل تمہیں اس عہد کی جواب دہی کرنی ہوگی۔

وَلَا تَكُوۡنُوۡا كَالَّتِىۡ نَقَضَتۡ غَزۡلَهَا مِنۡۢ بَعۡدِ قُوَّةٍ اَنۡكَاثًا ؕ تَتَّخِذُوۡنَ اَيۡمَانَكُمۡ دَخَلًاۢ بَيۡنَكُمۡ اَنۡ تَكُوۡنَ اُمَّةٌ هِىَ اَرۡبٰى مِنۡ اُمَّةٍ ؕ اِنَّمَا يَبۡلُوۡكُمُ اللّٰهُ بِهٖ ؕ وَلَيُبَيِّنَنَّ لَكُمۡ يَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ مَا كُنۡتُمۡ فِيۡهِ تَخۡتَلِفُوۡنَ (۹۲)

'انکاث' کا مفہوم — 'انکاث' 'نکث' کی جمع ہے جس کے معنی ادھیڑی ہوئی رسی یا تار تار کیے کپڑے یا سوت کے ہیں۔

'دخل' کا مفہوم — 'دَخَل' کے معنی مکر و فریب اور فساد کے ہیں۔

یہود کی مفسدانہ سرگرمیوں کی طرف اشارہ — ان یہود ہی کو مخاطب کر کے فرمایا کہ اس عورت کے مانند نہ بن جاؤ جو اپنا کاتا ہوا سوت، اس کو اچھی طرح کاتنے اور مضبوط کرنے کے بعد، خود اپنے ہی ہاتھوں تار تار کر کے رکھ دے۔ یعنی پہلے تو تم نے عہد باندھا اور قسمیں کھا کھا کے اس کو خوب مؤکد و محکم کیا لیکن جب اس کو پورا کرنے کا وقت آیا تو اس عہد کے بخیے ادھیڑ کے رکھ دیے۔

'تَتَّخِذُوۡنَ اَيۡمَانَكُمۡ دَخَلًاۢ بَيۡنَكُمۡ' یعنی تم اپنی قسموں کو افساد اور مکر و فریب اور اللہ کے بندوں کو اللہ کی راہ سے روکنے اور ان کے جمے ہوئے قدموں کو اکھاڑنے کا ذریعہ بناتے ہو۔ یہ یہود کی ان مفسدانہ کوششوں کی طرف اشارہ ہے جو وہ اسلام کی طرف مائل لوگوں کو اسلام سے روکنے یا اسلام قبول کر لینے والوں کو متزلزل کرنے کے لیے صرف کر رہے تھے۔ یہ قسمیں کھا کھا کر لوگوں کو یہ یقین دلانے کی کوشش کرتے کہ یہ نیا دین سراسر خدائی دین کے خلاف ہے۔ ہمارے صحیفوں میں نہ اس کی کوئی سند موجود ہے اور نہ ہمارے نبیوں نے اس کی طرف کوئی اشارہ کیا ہے۔ یہود کو چونکہ فی الجملہ مذہبی تقدس کی سند حاصل تھی اس وجہ سے ان کی یہ قسمیں ان لوگوں کے دلوں میں اضطراب پیدا کرتی تھیں جو ان کی چالوں اور ان کے مخفی محرکات سے اچھی طرح واقف نہیں تھے۔

'اَنْ تَكُوْنَ اُمَّةٌ هِيَ اَرْبٰى مِنْ اُمَّةٍ'۔ 'اَنْ' سے پہلے 'مَخَافَةَ' یا اس کے ہم معنی کوئی لفظ اکثر محذوف ہو جایا کرتا ہے۔

یہود کی سرگرمیوں کا اصل محرک

یہ یہود کی ان تمام مفسدانہ سرگرمیوں کے اصل محرک سے پردہ اٹھایا ہے کہ تمھاری یہ ساری تگ و دو اس حاسدانہ اندیشہ کی بنا پر ہے کہ تم ڈرتے ہو کہ کہیں یہ نئی قائم ہونے والی امت تمھاری امت سے عدد اور قوت میں بڑھ نہ جائے۔ اس خوف نے تمھیں حق کا حامی و ناصر ہونے کے بجائے اس کا دشمن بنا کر کھڑا کر دیا ہے اس طرح خدا تمھاری آزمائش کر رہا ہے اور دیکھ رہا ہے کہ تم حق کے حامی بنتے ہو یا اپنے تعصبات ہی کے جال میں پھنس کر رہ جاتے ہو۔ یہ یاد رکھو کہ جن چیزوں کو آج تم بنائے اختلاف بنائے ہوئے ہو قیامت کے دن اللہ ان کو اچھی طرح واضح کر دے گا کہ حق کیا تھا اور تم نے کس طرح دیدہ دانستہ اس پر پردے ڈالنے کی کوشش کی۔

یہود کی مثال بڑھیا سے

'اَلَّتِيْ' اور 'اَلَّذِيْ' اگرچہ معرفہ کے لیے آتے ہیں لیکن تمثیلات میں معرفہ لانے سے مقصود بسا اوقات صرف صورت حال کو نگاہوں کے سامنے مصور کرنا ہوتا ہے اس وجہ سے یہاں کسی متعین بڑھیا کو مراد لینے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ ایک ایسی بڑھیا کو فرض کر لینا کافی ہے جس سے چشم تصور کے سامنے واقعہ کی پوری تصویر آ جائے۔

جس طرح یہاں یہود کی مثال ایک بڑھیا سے دی ہے اسی طرح ان کی مثال اعراف ۱۷۵-۱۷۶ میں ایک ایسے شخص سے دی ہے جس کو اللہ نے اپنی آیات و تعلیمات سے نوازا لیکن وہ ان سے نکل بھاگا، نتیجہ یہ نکلا کہ وہ شیطان کے ہتھے چڑھ گیا اور گمراہ ہو کے رہ گیا۔ اس کے بعد ان کی تمثیل کتے سے دی ہے جو ہر وقت اپنی زبان نکالے رکھتا ہے، نہ ڈانٹا جائے جب بھی زبان نکالے رکھتا ہے اور ڈانٹا جائے جب بھی زبان نکالے رکھتا ہے۔ اس تمثیل میں بھی 'اَلَّذِيْ' استعمال ہوا ہے لیکن ہم نے اس کے محل میں واضح کیا ہے کہ اس سے مقصود محض تصویر حال ہے نہ کہ کسی متعین شخص کی طرف اشارہ۔

وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلٰكِنْ يُّضِلُّ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ۭ وَلَتُسْـَٔــلُنَّ عَمَّا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (۹۳)

یعنی اگر اللہ اپنے جبر و زور سے کام لینا چاہتا تو سب کو ایک ہی امت بنا دیتا لیکن اس نے جبر کے بجائے تمھیں اختیار بخشا ہے اور اس طرح تمھارا امتحان کرنا چاہتا ہے کہ تم اپنی سمجھ بوجھ اور اپنے اختیار و ارادہ سے کام لے کر ہدایت کی راہ اختیار کرتے ہو یا ضلالت کی، تو تم میں سے جو ہدایت کے طالب بنتے ہیں ان کو ہدایت کی توفیق بخشتا ہے اور جو ضلالت ہی پر جمے رہنا چاہتے ہیں ان کو اسی پر چھوڑ دیتا ہے۔ ہم یہ حقیقت جگہ جگہ واضح کر چکے ہیں کہ خدا کی مشیت اس کی حکمت کے تحت ہے۔

'وَلَتُسْـَٔــلُنَّ عَمَّا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ' یعنی اس بات کو یاد رکھو کہ اس نے تمھیں ہدایت و ضلالت میں اختیار کرنے کے لیے عقل بھی عطا فرمائی ہے، پھر اپنے نبیوں اور رسولوں کے ذریعہ سے بھی تم پر حجت تمام کر دی ہے اس وجہ

سے ایک دن آئے گا جب تم میں سے ایک ایک سے جو کچھ تم کرتے رہے اس کی بابت پرسش ہونی ہے اور پھر تم اپنے اعمال ہی کے مطابق جزا و سزا پاؤ گے۔

وَلَا تَتَّخِذُوْٓا اَيْمَانَكُمْ دَخَلًاۢ بَيْنَكُمْ فَتَزِلَّ قَدَمٌۢ بَعْدَ ثُبُوْتِهَا وَتَذُوْقُوا السُّوْٓءَ بِمَا صَدَدْتُّمْ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ وَلَكُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ (۹۴)

یہود کا ذریعۂ افساد قسمیں تھیں

یہود لوگوں کو اسلام سے روکنے کے لیے سب سے زیادہ جس ہتھیار سے کام لیتے تھے وہ ان کی قسمیں تھیں۔ جھوٹے لوگ اول تو اپنی نفسیاتی کمزوری کے سبب سے قسمیں کھاتے ہی زیادہ ہیں، پھر ان کے پاس دلیل کون سی تھی جس کو وہ اسلام اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف پیش کر سکتے سے لے دے کے قسموں ہی کا سہارا تھا۔ وہ انہی کے بل پر کوشش کرتے کہ جن لوگوں کے قدم اسلام میں جم چکے ہیں ان کو متزلزل کر دیں اور جو لوگ اس کی طرف مائل ہو رہے ہیں ان کو اس کی طرف بڑھنے سے روک دیں۔ یہ لوگ چونکہ سابق مذہب اور سابق انبیاء کے وارث ہونے کے بھی مدعی تھے اس وجہ سے اپنی مذہبی تقدس کے پردے میں وہ لوگوں کو قسمیں کھا کھا کے یقین دلانے کی کوشش کرتے کہ اس نئے مذہب اور نئے پیغمبر کو سابق مذاہب اور سابق انبیاء سے کوئی تعلق نہیں ہے اور یہ پیغمبر سابق مذاہب اور انبیاء کا جو حوالہ دیتے ہیں نعوذ باللہ اس میں وہ جھوٹے ہیں۔

وَتَذُوْقُوا السُّوْٓءَ بِمَا صَدَدْتُّمْ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ وَلَكُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ 'سُوْٓء' کے معنی بدی اور برائی کے ہیں۔ یہاں 'سُوْٓء' سے مراد نتیجہ سوء اور انجام سوء یعنی عذاب ہے، چونکہ عذاب الٰہی لوگوں کے اپنے اعمال ہی کا ثمرہ اور نتیجہ ہوگا اس وجہ سے یہاں فعل ہی سے نتیجہ فعل کو ظاہر کر دیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ایسا نہ کرو کہ تمہاری فریب کارانہ قسموں سے کسی کے حق پر جمے ہوئے قدم اکھڑ جائیں اور تمہیں اللہ کی راہ سے روکنے کے اس جرم کی پاداش میں اپنے کیے کی سزا بھگتنی پڑے۔ اگر ایسا ہوا تو تمہارے لیے ایک عذاب عظیم ہے۔ تم حق کے گواہ بنا کر کھڑے کیے گئے ہو۔ اگر تمہی نے حق سے لوگوں کو روکنے کی کوشش کی تو سزا بھی اس کی بہت ہی سخت بھگتو گے۔

وَلَا تَشْتَرُوْا بِعَهْدِ اللّٰهِ ثَمَنًا قَلِيْلًا ۭ اِنَّمَا عِنْدَ اللّٰهِ هُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ (۹۵)

'اشتراء' بمعنی ترجیح و مبادلہ

لفظ 'اشترا' پر سورۂ بقرہ کی تفسیر میں بھی بحث کر چکے ہیں اور آل عمران کی آیت ۷۷ کے تحت بھی۔ جب مبادلہ چیز کا چیز سے ہو، جیسا کہ عموماً زمانۂ قدیم میں رواج رہا ہے تو ہر شے مبیع بھی ہو سکتی ہے اور ثمن بھی۔ اس وجہ سے کسی شے کا اشتراء اس مفہوم میں خریدنا نہیں ہوتا جس مفہوم میں ہم خریدنا بولتے ہیں بلکہ اس کا مفہوم مبادلہ ہوتا تھا۔ اس وجہ سے لفظ 'اشتروا' مبادلہ کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے اور پھر اس مفہوم سے ترقی کر کے ترجیح دینے کے معنی میں بھی۔

'ثمن قلیل' سے مراد دنیا و متاع دنیا

'ثمن قلیل' سے مراد دنیا اور متاع دنیا ہے اور 'مَا عِنْدَ اللّٰهِ' سے مراد اجر آخرت ہے۔ اجر آخرت کے مقابل میں خواہ دنیا اور متاع دنیا کی کتنی ہی بڑی مقدار حاصل ہو جائے وہ بہرحال ناچیز اور حقیر ہی ہے اس لیے

کہ وہ چند روزہ اور فانی ہے اور اجر آخرت ابدی اور لازوال ہے۔ فرمایا کہ عہد الٰہی کو حقیر منفعت دنیوی کے عوض نہ فروخت کرو۔ عہد الٰہی پر قائم رہنے کا اللہ کے ہاں جو صلہ ہے اس دنیا کی منفعتوں سے بدرجہا بڑھ کر ہے اگر تم اس حقیقت کو سمجھو۔

۱۸-۱ آگے کا مضمون ــــ آیات ۹۶-۱۰۵

مخالفین کے بعض اعتراضات کے جواب

آگے پہلے تو مخالفین حق کو دھمکی اور ان مسلمانوں کو جو حق کے مخالفین کے نرغہ میں تھے صبر و استقامت کی نصیحت اور اس کے اچھے انجام کی بشارت ہے۔ پھر قرآن کی دعوت کے سلسلہ میں جو چیز شیاطین کی دراندازیوں سے محفوظ رکھنے والی ہے اس کی ہدایت اور بعض ان اعتراضات کا جواب ہے جو یہود نے لوگوں کو قرآن اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے بدظن کرنے کے لیے پھیلائے تھے اور جن کو قریش نے بھی بے سمجھے بوجھے دہرانا شروع کر دیا تھا۔ آیات کی تلاوت کیجیے۔

مَا عِندَكُمْ يَنفَدُ وَمَا عِندَ اللَّهِ بَاقٍ ۗ وَلَنَجْزِيَنَّ الَّذِينَ صَبَرُوا آیات
أَجْرَهُم بِأَحْسَنِ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿٩٦﴾ مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّن ۹۶-۱۰۵
ذَكَرٍ أَوْ أُنثَىٰ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهُ حَيَاةً طَيِّبَةً ۖ وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ
أَجْرَهُم بِأَحْسَنِ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿٩٧﴾ فَإِذَا قَرَأْتَ الْقُرْآنَ
فَاسْتَعِذْ بِاللَّهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ ﴿٩٨﴾ إِنَّهُ لَيْسَ لَهُ سُلْطَانٌ
عَلَى الَّذِينَ آمَنُوا وَعَلَىٰ رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُونَ ﴿٩٩﴾ إِنَّمَا سُلْطَانُهُ عَلَى الَّذِينَ
يَتَوَلَّوْنَهُ وَالَّذِينَ هُم بِهِ مُشْرِكُونَ ﴿١٠٠﴾ وَإِذَا بَدَّلْنَا آيَةً مَّكَانَ ع ۱۳/۱۱/۱۹
آيَةٍ ۙ وَاللَّهُ أَعْلَمُ بِمَا يُنَزِّلُ قَالُوا إِنَّمَا أَنتَ مُفْتَرٍ ۚ بَلْ أَكْثَرُهُمْ
لَا يَعْلَمُونَ ﴿١٠١﴾ قُلْ نَزَّلَهُ رُوحُ الْقُدُسِ مِن رَّبِّكَ بِالْحَقِّ لِيُثَبِّتَ
الَّذِينَ آمَنُوا وَهُدًى وَبُشْرَىٰ لِلْمُسْلِمِينَ ﴿١٠٢﴾ وَلَقَدْ نَعْلَمُ أَنَّهُمْ
يَقُولُونَ إِنَّمَا يُعَلِّمُهُ بَشَرٌ ۗ لِّسَانُ الَّذِي يُلْحِدُونَ إِلَيْهِ أَعْجَمِيٌّ وَ

هٰذَا لِسَانٌ عَرَبِيٌّ مُّبِيْنٌ ﴿۱۰۳﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ۙ لَا
يَهْدِيْهِمُ اللّٰهُ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۰۴﴾ اِنَّمَا يَفْتَرِي الْكَذِبَ الَّذِيْنَ
لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ۚ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰذِبُوْنَ ﴿۱۰۵﴾

ترجمۂ آیات ۹۶-۱۰۵

جو کچھ تمھارے پاس ہے وہ ختم ہو جائے گا اور جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہ باقی رہنے والا ہے اور جو لوگ ثابت قدم رہیں گے ہم ان کو جو کچھ وہ کرتے رہے اس کا بہترین اجر دیں گے۔ جو کوئی نیک عمل کرے گا، خواہ مرد ہو یا عورت، وہ ایمان پر ہے، تو ہم اس کو ایک پاکیزہ زندگی بسر کرائیں گے اور ہم ان کو جو کچھ وہ کرتے رہے اس کا بہتر صلہ دیں گے۔ ۹۶-۹۷

پس جب تم قرآن پڑھو تو شیطان رجیم سے اللہ کی پناہ مانگ لیا کرو۔ اس کا ان لوگوں پر کچھ بھی زور نہیں چلتا ہے جو ایمان لائے ہوئے ہیں اور اپنے رب پر بھروسہ رکھتے ہیں۔ اس کا زور بس انہی پر چلتا ہے جو اسے دوست رکھتے ہیں اور جو اللہ کے شریک ٹھہرانے والے ہیں۔ ۹۸-۱۰۰

اور جب ہم ایک آیت کی جگہ دوسری آیت بھیجتے ہیں اور اللہ خوب جانتا ہے جو کچھ وہ اتارتا ہے تو یہ کہتے ہیں کہ تم تو اپنے جی سے گھڑ لینے والے ہو۔ بلکہ ان میں کے اکثر علم نہیں رکھتے ہیں۔ کہہ دو اس کو روح القدس نے تمھارے رب کی جانب سے حق کے ساتھ اتارا ہے تاکہ وہ ان لوگوں کو جمائے رکھے جو ایمان لائے ہیں اور یہ ہدایت و بشارت ہو خدا کے فرمانبرداروں کے لیے۔ ۱۰۱-۱۰۲

اور ہمیں اچھی طرح علم ہے کہ یہ لوگ کہتے ہیں کہ اس کو تو ایک انسان سکھاتا ہے۔ اس شخص کی زبان جس کی طرف یہ منسوب کرتے ہیں عجمی ہے اور یہ فصیح عربی زبان ہے۔ بے شک جو لوگ اللہ کی آیات پر ایمان نہیں لاتے ہیں اللہ ان کو راہ یاب نہیں کرے گا اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔ جھوٹ تو بس وہی لوگ گھڑ رہے ہیں جو اللہ کی آیات پر ایمان نہیں لا رہے ہیں اور

یہی لوگ جھوٹے ہیں۔ ۱۰۳-۱۰۵

۱۹- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

مَا عِنْدَكُمْ يَنْفَدُ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ بَاقٍ ۗ وَلَنَجْزِيَنَّ الَّذِيْنَ صَبَرُوْٓا اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (۹۶)

خالفین کے لیے تنبیہ اہل ایمان کے لیے بشارت

اس آیت کا پہلا ٹکڑا مخالفین کے لیے تنبیہ اور دوسرا ٹکڑا اہل ایمان کے لیے بشارت ہے جو اس وقت سامنے کے زغے میں طرح طرح کے روحانی و جسمانی مصائب کے ہدف بنے ہوئے تھے۔ مخالفین کو خطاب کرکے فرمایا کہ جس متاعِ دنیا کی محبت میں تم حق کی یہ مخالفت کر رہے ہو یہ ایک دن ختم ہو جانے والی ہے، باقی رہ جانے والی چیز وہ اجر ہے جو اس دنیا میں کیے ہوئے اعمال کے بدلہ میں ملنے والا ہے۔ تو یہ سن لو کہ یہ اجر ہم ان لوگوں کو دیں گے جو آج ہماری راہ میں مصائب جھیل رہے ہیں اور حق پر ثابت قدم ہیں۔ ان کا یہ اجر ان کے اعمال کی نسبت سے کہیں بہتر ہوگا۔

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً ۚ وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ - (۹۷)

یہ اسی بشارت کی تفصیل ہے، فرمایا کہ جو کوئی نیک عمل کرے گا، عام اس سے کہ وہ مرد ہے یا عورت، اگر وہ ایمان پر قائم ہے تو ہم اس کو اچھی اور پاکیزہ زندگی بسر کرائیں گے اور جو کچھ وہ کرتے رہے اس کا بہترین صلہ دیں گے۔

اچھی اور پاکیزہ زندگی بسر کرانے کا یہ وعدہ دین اور دنیا دونوں اعتبار سے ہے۔ جو لوگ ایمان پر قائم ہوتے اور عمل صالح کی زندگی بسر کرنے کا عزم کر لیتے ہیں ان کو آزمائشیں تو پیش آتی ہیں، شیاطین جن و انس ان کو ستانے اور الجھنوں میں مبتلا کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور ان کو اس کے لیے ڈھیل بھی ملتی ہے لیکن اس ڈھیل کی ایک معین حد ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ اس طرح اپنے بندوں کے صبر اور ان کی استقامت کا امتحان کرتا ہے اور خوب جانتا ہے کہ اس امتحان کی حد کیا ہونی چاہیے، چنانچہ جوں ہی وہ حد پوری ہو جاتی ہے اللہ تعالیٰ شیاطین جن و انس کو اس سے آگے بڑھنے کا موقع نہیں دیتا۔ اہل ایمان ان امتحانات سے گزرنے کے بعد اپنے ایمان میں قوی سے قوی تر ہو جاتے ہیں۔ ان کی زندگی کی پاکیزگی اور ان کی طمانیت و سکینت میں روز افزوں اضافہ ہوتا ہے اور اگر اس راہ میں انھیں موت بھی پیش آتی ہے تو وہ اس کا بھی خندہ جبینی سے خیر مقدم کرتے ہیں۔

اہل ایمان کی اس روحانی بادشاہی کا اندازہ وہ لوگ نہیں کر سکتے جو ایمان کی قوت اور اس کی حلاوت سے

ناآشنا ہیں۔

آیت میں یہ وعدہ تصریح کے ساتھ مردوں اور عورتوں دونوں کے لیے مذکور ہے۔ بظاہر اس تصریح کی ضرورت نہیں تھی لیکن اس کا ایک خاص محل ہے۔ وہ یہ کہ اس دور میں جس طرح مسلمان مرد اپنے ایمان پر ثابت قدم رہنے کے لیے نہایت کڑے امتحانات سے گزر رہے تھے اسی طرح بہت سی خواتین بھی اپنا ایمان بچائے رکھنے کے لیے جان کی بازی لگائے ہوئے تھیں اور ان کا امتحان کمزور عنصر ہونے کے سبب سے مردوں کے امتحان سے بھی زیادہ سخت تھا۔ یہاں قرآن نے مردوں کے ساتھ خاص طور پر عورتوں کی تصریح کر کے ان کی دلداری اور حوصلہ افزائی کر دی کہ اگر انھوں نے ایمان اور عمل صالح کی زندگی بسر کرنے کا عزم کر لیا ہے تو اللہ تعالیٰ ان کو ضرور پاکیزہ زندگی بسر کرائے گا۔ شیاطین اس نعمت سے ان کو محروم نہیں کر سکتے۔ اللہ تعالیٰ اس کا موقع ان کو نہیں دے گا۔

فَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ (۹۸)

شیطانی فتنوں سے پناہ مانگنے کی ہدایت

لفظ قَرَاْتَ یہاں عام ہے۔ یعنی خواہ یہ پڑھنا اپنی تلاوت کے طور پر ہو یا لوگوں کو دعوت دینے اور انھیں قرآن سنانے کے لیے، دونوں ہی حالتوں میں اس کے پڑھنے سے پہلے شیطانِ رجیم سے اللہ کی پناہ مانگ لی جائے۔

یہ آیت تمہید ہے ان اعتراضات کے جواب کی جو یہود نے قرآن کے خلاف اٹھائے تھے اور جن کے اٹھانے سے ان کا مقصد قرآن پر ایمان لانے والوں یا اس کی طرف مائل لوگوں کو اس سے بدظن اور برگشتہ کرنا تھا۔ قرآن نے آگے آیات ۱۰۱-۱۰۲ میں ان اعتراضات کے جواب دیے ہیں اور اس جواب سے پہلے بطور تمہید یہ ہدایت فرمائی ہے کہ جب تم قرآن کو پڑھو یا دعوتِ حق کے لیے اس کو سناؤ تو اس سے پہلے شیطان رجیم کے فتنوں سے اللہ کی پناہ مانگ لیا کرو۔ یہ ہدایت اس لیے ہوئی کہ درحقیقت اصل دشمن قرآن کا شیطان ہی ہے۔ جب قرآن پڑھا یا سنایا جاتا ہے تو وہ اس کے خلاف وسوسہ اندازی کے لیے اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ اس کے پڑھنے والوں اور سننے والوں کے دلوں میں وہ خود بھی وسوسے بھرنے کی کوشش کرتا ہے اور ان لوگوں کو بھی اللہ کی راہ سے روکنے کی اس مہم میں اپنا شریک کار بنا لیتا ہے جو انسانوں میں سے اس کے اولیاء اور دوست کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ تعوذ گویا ایک تعویذ ہے جو اس قسم کے تمام اشرار و شیاطین کے فتنوں اور ان کی وسوسہ اندازیوں سے آدمی کو محفوظ رکھتا ہے۔

اس کی تاثیر آدمی کے دل کی حالت پر منحصر ہے۔ اگر آدمی محض زبان سے تعوذ کے الفاظ دہراتا ہے تو اس کا کوئی خاص اثر نہیں پڑتا لیکن جن کے دل کی گہرائیوں سے یہ دعا نکلتی ہے وہ اس سے ایک ایسی قوت و طاقت حاصل کرتے ہیں جو شیطان اور اس کے اولیاء سے نبرد آزمائی میں بڑا سہارا بنتی ہے۔ یہ نبرد آزمائی اس امتحان کے مقتضیات میں سے ہے جو اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں انسانوں کے لیے مقرر کر رکھا ہے اس وجہ سے اس سے کسی حالت میں مفر نہیں ہے۔ اسی سے آدمی کی اپنی صلاحیتیں اجاگر ہوتی ہیں۔ تعوذ کی یہ برکت

ہے کہ اگر آدمی کو اس کا سہارا حاصل ہو تو وہ شیطان اور اس کے ایجنٹوں سے شکست نہیں کھاتا۔

إِنَّهُ لَيْسَ لَهُ سُلْطَانٌ عَلَى الَّذِينَ آمَنُوا وَعَلَىٰ رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُونَ ۝ إِنَّمَا سُلْطَانُهُ عَلَى الَّذِينَ يَتَوَلَّوْنَهُ وَالَّذِينَ هُم بِهِ مُشْرِكُونَ (۹۹ - ۱۰۰)

سُلْطَان کے معنی قابو، زور اور اختیار کے ہیں۔

اہل ایمان پر شیاطین کا کوئی زور نہیں چلتا

یہ اوپر والے مضمون ہی کی مزید وضاحت ہے کہ شیطان اور اس کے ایجنٹوں کو یہ مہلت تو ضرور ملی ہوئی ہے کہ وہ لوگوں کو بہکائیں اور ورغلائیں لیکن ان کو لوگوں پر زور و اختیار حاصل نہیں ہے کہ وہ لازماً ان کو گمراہ ہی کر دیں۔ شیطان کا زور صرف ان لوگوں پر چلتا ہے جو اس کو اپنا دوست بناتے اور اللہ کے شریک ٹھہراتے ہیں، ان لوگوں پر اس کا کوئی زور نہیں چلتا جو ایمان لائے ہوئے ہیں اور اپنے رب پر بھروسہ رکھتے ہیں۔ اس آیت نے گویا اطمینان دلا دیا کہ شیطان کے فتنے خواہ کتنے ہی خطرناک ہوں لیکن جو شخص ان سے محفوظ رہنا چاہے وہ اپنے آپ کو ان سے محفوظ رکھ سکتا ہے اور اس کی تدبیر یہ ہے کہ خدا پر مضبوط ایمان رکھے اور سخت سے سخت حالات میں بھی اس کے فضل اور اس کی کارسازی پر بھروسہ کرے۔ شیطان سے مار وہی کھاتا ہے جو اس کی طرف دوستی کی پینگیں بڑھاتا ہے اور جس کے اندر شرک کی کچھ آلائش ہوتی ہے۔

وَإِذَا بَدَّلْنَا آيَةً مَّكَانَ آيَةٍ ۙ وَاللَّهُ أَعْلَمُ بِمَا يُنَزِّلُ قَالُوا إِنَّمَا أَنتَ مُفْتَرٍ ۚ بَلْ أَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُونَ (۱۰۱)

'آیت' سے مراد احکام شریعت کی تبدیلی پر یہود کا اعتراض

'آیت' سے مراد کوئی حکم شرعی ہے۔

یہ ایک مثال ہے ان اعتراضات کی جو یہود لوگوں کے دلوں میں وسوسہ اندازی کے لیے قرآن کے خلاف اٹھاتے تھے۔ فرمایا کہ جب ہم ایک حکم کو دوسرے حکم سے بدلتے ہیں تو وہ کہتے ہیں کہ تم تو نرے مفتری ہو۔ اپنے جی سے ایک بات گھڑتے ہو اور لوگوں پر دھونس جمانے کے لیے اس کو خدا کی طرف منسوب کر دیتے ہو، ورنہ اس کے کیا معنی کہ خدا ایک مرتبہ ایک قانون بنائے اور پھر اس قانون کو خود ہی دوسرے قانون سے بدل دے۔

یہ اشارہ ہے تحریم و تحلیل اور یوم السبت کے باب میں ان احکام کی طرف جن کا حوالہ آگے اسی سورہ کی آیات ۱۱۴ - ۱۱۶ اور ۱۲۴ میں آیا ہے۔ قرآن نے جب اس امت کے لیے یوم السبت کی حرمت ختم کر دی اور کھانے پینے کے باب میں وہ احکام دیے جو ملت یہود یا ملت مشرکین کے بجائے ملت ابراہیم پر مبنی تھے تو یہود نے شور مچانا شروع کر دیا کہ یہ دیکھو، یہ شخص ایک طرف تو ہماری شریعت کو خدائی شریعت مانتا ہے دوسری طرف اس کے احکام کو ان سے مختلف احکام سے بدلتا ہے۔ اگر یہ شخص خدا کا رسول ہوتا تو وہ خدا کے دیے ہوئے احکام کو کس طرح بدل سکتا۔ اس وجہ سے ہمارے نزدیک یہ خدا کا رسول نہیں بلکہ (نعوذ باللہ) ایک مفتری ہے۔ یہ بات کہی تو یہود نے لیکن یہ بے سمجھے بوجھے قریش کے ان لیڈروں نے بھی دہرانی شروع کر دی، جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت میں کہی ہوئی ہر بات کو اپنی تائید سمجھتے تھے۔

"وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا يُنَزِّلُ": یہ قرآن نے مذکورہ بالا اعتراض کا جواب دیا ہے کہ اپنی اتاری ہوئی چیزوں کی حکمت و مصلحت کو خدا ہی خوب جانتا ہے۔ "بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ" اکثر لوگ ان حکمتوں اور مصلحتوں کو نہیں جانتے۔

یہاں یہ بات اجمال کے ساتھ ارشاد ہوئی ہے۔ آگے کی آیات میں اس اجمال کی تفصیل آئے گی۔ ہم یہاں چند اشارات صرف اس لیے کیے دیتے ہیں کہ آگے نظم کلام کے سمجھنے میں آسانی ہو۔ قرآن کا یہ جواب مندرجہ ذیل دو مبادی پر مبنی ہے۔

شریعت میں تدریج کی مصلحت

اول یہ کہ خدا نے اپنی شریعت کے نازل کرنے میں ترتیب و تدریج ملحوظ رکھی ہے تاکہ ایمان لانے والوں کے قدم شریعت میں خوب جم سکیں۔ یہ ترتیب و تدریج بعض حالات میں احکام میں تبدیلی کی مقتضی ہوئی ہے جو سرتاسر اہل ایمان کی مصلحت پر مبنی ہے۔

دوسرا یہ کہ اس ملت کی بنیاد ملت ابراہیمؑ پر ہے اور ملت ابراہیمؑ ملت یہود اور ملت مشرکین سے بالکل الگ ملت تھی۔ اس میں حرام وہی چیزیں ہیں جو ملت ابراہیمؑ میں حرام تھیں۔ یہی چیزیں اصلاً ملت یہود میں بھی حرام تھیں لیکن بعد میں انھوں نے اپنی بدعات کے ذریعہ سے ان میں اضافے کر لیے جو اللہ نے ان کی سزا کے طور پر ان پر باقی رکھے لیکن اس ملت کی اساس چونکہ ملت ابراہیم پر ہے اس وجہ سے اس میں وہ اضافے ختم کر دیے گئے۔

قُلْ نَزَّلَهٗ رُوْحُ الْقُدُسِ مِنْ رَّبِّكَ بِالْحَقِّ لِيُثَبِّتَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهُدًى وَّبُشْرٰى لِلْمُسْلِمِيْنَ (۱۰۲)

روح القدس سے مراد

"رُوْحُ الْقُدُسِ" سے مراد جبرائیل امین ہیں اور "حق" سے مراد وہ خالص اور بے آمیز دین ہے جو اللہ کی طرف سے یہود و نصاریٰ اور مشرکین کی تمام ملاوٹوں سے پاک و صاف ہو کر اترا ہے۔

قرآن کو وحی الٰہی ماننے سے یہود کا انکار

یہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت ہوئی کہ جو لوگ تمھیں مفتری کہتے ہیں ان کو جواب دے دو کہ یہ جو کچھ میں پیش کر رہا ہوں اس کو اپنے جی سے گھڑ کر خدا کی طرف منسوب نہیں کر رہا ہوں بلکہ یہ خدا کے مقرب فرشتے جبریل امین نے میرے رب کی جانب سے مجھ پر اتارا ہے اور یہ سراسر حق ہے۔ شیاطین و مفسدین کی ہر ملاوٹ سے بالکل پاک و صاف۔

"لِيُثَبِّتَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا": یعنی اللہ نے دین کو تمام ملاوٹوں سے پاک کر کے اس لیے اتارا ہے تاکہ وہ ایمان لانے والوں کو حق پر جما دے اور وہ لغزشوں اور گمراہیوں سے بالکل محفوظ ہو جائیں۔ یہاں یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے کہ اگر دین کے بعض اجزا میں اللہ تعالیٰ کی جانب سے کوئی تبدیلی واقع ہوئی ہے تو وہ، جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا، تدریج کی مصلحت سے واقع ہوئی ہے اور مقصود اس سے لوگوں کو دین میں راسخ کرنا تھا۔ اگر سارا دین بیک دفعہ نازل کر دیا جاتا تو یہ لوگوں پر بہت شاق ہوتا اور ان کے قدم دین میں خوب مضبوط نہ جم سکتے۔

'وَهُدًى وَبُشْرٰى لِلْمُسْلِمِيْنَ'، یعنی مخالفین اس سے جو فتنے چاہیں اٹھائیں لیکن جو لوگ خدا کی ہر بات پر 'اٰمَنَّا وَصَدَّقْنَا' کہنے کو تیار ہیں ان کے لیے تو یہ آغاز کے لحاظ سے ہدایت اور انجام کے اعتبار سے بشارت ہے۔

وَلَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّهُمْ يَقُوْلُوْنَ اِنَّمَا يُعَلِّمُهٗ بَشَرٌ لِسَانُ الَّذِيْ يُلْحِدُوْنَ اِلَيْهِ اَعْجَمِيٌّ وَّهٰذَا لِسَانٌ عَرَبِيٌّ مُّبِيْنٌ (۱۰۳)

مخالفین کا ایک اور فتنہ اور رد

'وَلَقَدْ نَعْلَمُ' دراصل 'وَلَقَدْ كُنَّا نَعْلَمُ' ہے یعنی بعض اوقات مضارع سے پہلے افعال ناقصہ کو حذف کر دیتے ہیں۔ اس اسلوب پر پیچھے سورۂ بقرہ وغیرہ میں تفصیل سے بحث ہو چکی ہے۔

یہ مخالفین کے ایک دوسرے فتنے کا حوالہ دیا ہے جو وہ لوگوں کو قرآن سے بدگمان کرنے کے لیے اٹھائے ہوئے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ اس کلام کو وحی الٰہی اور فرشتہ کا لایا ہوا کہنا تو محض ایک ڈھونس ہے۔ یہ تو فلاں شخص ان کو سکھاتا ہے اور یہ حضرت اس کو سنا کر ہم پر رعب جماتے ہیں کہ اس کو خدا نے جبریلِ امین کے ذریعے سے ان پر اتارا ہے۔ یہاں کسی متعین شخص کا نام مذکور نہیں، صرف اس کے عجمی ہونے کی تصریح ہے۔ مفسرین نے یہاں ایک سے زیادہ ناموں کا ذکر کیا ہے جن میں ایک نام سلمان فارسیؓ کا بھی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ مخالفین انہی کی طرف اشارہ کرتے رہے ہوں۔ قرآن کو ان کے نام سے بحث نہیں، صرف اعتراض سے بحث ہے اور اسی کا اس نے جواب دیا ہے۔ جواب کی تمہید ہی اس طرح اٹھائی گئی ہے جس سے اس اعتراض کی لغویت واضح ہو رہی ہے اس لیے کہ 'وَلَقَدْ نَعْلَمُ' کے اسلوب ہی میں یہ بات مضمر ہے کہ ہم برابر معترضین کی یہ بکواس سنتے رہے ہیں لیکن اس کی لغویت کے سبب سے ہم نے اس کی طرف توجہ نہیں کی۔ اس کے بعد فرمایا کہ اگر ان بوالفضولوں کو قرآن کے معانی و حقائق کی پرکھ نہیں ہے تو کم از کم اس کے بیان کی سطوت و جلالت اور اس کی زبان کی بے مثال فصاحت پر ہی غور کرتے تو ان پر اپنے اس اعتراض کی لغویت واضح ہو جاتی کہ کہاں ایک کج مج بیان عجمی اور کہاں یہ حوضِ کوثر کی دھلی ہوئی عربی مبین۔ آخر ایسا کودن کون ہو سکتا ہے جو منہ کے اڑائے چھینٹوں اور آسمان کی بارش میں امتیاز نہ کر سکے۔

یہ بات علی سبیل التنزل فرمائی گئی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ قرآن کے معانی و حقائق تک تو ان لوگوں سے پہنچنے کی توقع ہی نہیں کی جا سکتی جن کو گہر اور پشیز میں امتیاز نہیں ہے لیکن ان کو اپنی طلاقتِ لسانی پر بڑا ناز ہے تو کم از کم اس کی زبان ہی پر غور کرتے کہ ایک عجمی تو درکنار خود ان کے کسی شاعر یا خطیب کے بس میں بھی یہ نہیں ہے کہ اس طرح کا کلام پیش کر سکے۔ یہاں تک کہ خود پیغمبر کے اپنے کلام اور اس کلام میں آسمان و زمین کا فرق ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ لَا يَهْدِيْهِمُ اللّٰهُ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ (۱۰۴)

یعنی ایمان و ہدایت کا راستہ صرف یہ ہے کہ اللہ کی آیات پر ایمان لایا جائے اس لیے کہ ہدایت وہی ہے جو اللہ کی طرف سے آئے تو جو لوگ اللہ کی آیات پر ایمان لانے کے لیے تیار نہیں ہیں ان کو اللہ کی ہدایت

نصیب نہیں ہو سکتی۔ انھوں نے اپنے اوپر ہدایت کے دروازے بند کر لیے اور ان کے لیے آگے بس ایک دردناک عذاب ہی ہے۔

إِنَّمَا يَفْتَرِي الْكَذِبَ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِآيَاتِ اللَّهِ ۖ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْكَاذِبُونَ (۱۰۵)

۲ پیغمبر کو مفتری سمجھنے والوں کی لغویت

اوپر آیت ۱۰۱ میں یہ بات گزر چکی ہے کہ یہ لوگ پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) کو ایک مفتری قرار دیتے ہیں۔ اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ مفتری ہمارا پیغمبر نہیں ہے بلکہ مفتری وہ لوگ ہیں جو اللہ کی آیات پر تو ایمان نہیں لاتے جو اللہ کی ہدایت معلوم کرنے کا واحد ذریعہ ہیں لیکن ایک دین انھوں نے تصنیف کر رکھا ہے اور اس کو اللہ کا دین بتاتے ہیں۔ فرمایا کہ یہ بالکل جھوٹا افترا ہے اور اس کے تصنیف کرنے والے ہی اصل جھوٹے ہیں۔

۲۰۔ آگے کا مضمون ___ آیات ۱۰۶-۱۱۱

مظلوم مسلمانوں کو صبر و استقامت کی تلقین

آگے ان مسلمانوں کی طرف توجہ فرمائی ہے جو اعدائے حق کے جور و ستم کے ہدف بنے ہوئے تھے۔ ان کو خطاب کر کے صبر و استقامت کی تلقین فرمائی اور ساتھ ہی ان لوگوں کو عذاب الٰہی سے ڈرایا ہے جو مخالفین سے مرعوب ہو کر اللہ کے دین سے برگشتہ ہو جائیں گے۔ اسی سلسلہ میں ان مسلمانوں کی طرف بھی ایک اشارہ ہے جنھیں اعدائے حق کے مظالم سے تنگ آ کر ہجرت کرنی پڑی۔ ان کی تحسین فرمائی گئی ہے اور ان کے لیے مغفرت اور رضوان کی بشارت ہے۔ آیات کی تلاوت کیجیے۔

آیات ۱۰۶-۱۱۱

مَنْ كَفَرَ بِاللَّهِ مِنْ بَعْدِ إِيمَانِهِ إِلَّا مَنْ أُكْرِهَ وَقَلْبُهُ مُطْمَئِنٌّ
بِالْإِيمَانِ وَلَٰكِنْ مَنْ شَرَحَ بِالْكُفْرِ صَدْرًا فَعَلَيْهِمْ غَضَبٌ
مِنَ اللَّهِ ۖ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ ﴿۱۰۶﴾ ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمُ اسْتَحَبُّوا الْحَيَاةَ
الدُّنْيَا عَلَى الْآخِرَةِ وَأَنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكَافِرِينَ ﴿۱۰۷﴾ أُولَٰئِكَ
الَّذِينَ طَبَعَ اللَّهُ عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ وَسَمْعِهِمْ وَأَبْصَارِهِمْ ۖ وَأُولَٰئِكَ
هُمُ الْغَافِلُونَ ﴿۱۰۸﴾ لَا جَرَمَ أَنَّهُمْ فِي الْآخِرَةِ هُمُ الْخَاسِرُونَ ﴿۱۰۹﴾ ثُمَّ
إِنَّ رَبَّكَ لِلَّذِينَ هَاجَرُوا مِنْ بَعْدِ مَا فُتِنُوا ثُمَّ جَاهَدُوا وَ
ع ۱۴/۲۰ صَبَرُوا إِنَّ رَبَّكَ مِنْ بَعْدِهَا لَغَفُورٌ رَحِيمٌ ﴿۱۱۰﴾ يَوْمَ تَأْتِي كُلُّ

نَفْسٍ تُجَادِلُ عَنْ نَّفْسِهَا وَتُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿۱۱۱﴾

ترجمۂ آیات ۱۰۶-۱۱۱

جو اپنے ایمان لانے کے بعد اللہ کا کفر کرے گا بجز اس کے جس پر جبر کیا گیا ہو اور اس کا دل ایمان پر جما ہوا ہو، لیکن جو کفر کے لیے سینہ کھول دے گا تو ان پر اللہ کا غضب اور ان کے لیے عذاب عظیم ہے۔ یہ اس وجہ سے کہ انھوں نے دنیا کی زندگی کو آخرت پر ترجیح دی اور اللہ کفر اختیار کرنے والوں کو ہدایت نہیں دیا کرتا۔ یہی لوگ ہیں جن کے دلوں اور جن کے سمع و بصر پر اللہ نے مہر کر دی اور یہی لوگ ہیں جو آخرت سے غافل ہیں۔ لازماً یہی لوگ ہیں جو آخرت میں خائب و خاسر رہیں گے۔ ۱۰۶-۱۰۹

پھر تیرا رب ان لوگوں کے لیے جنھوں نے آزمائشوں میں ڈالے جانے کے بعد ہجرت کی، پھر جہاد کیا اور ثابت قدمی دکھائی تو ان باتوں کے بعد بے شک تیرا رب بڑا ہی بخشنے والا اور رحمت والا ہے۔ اس دن جس دن ہر جان اپنی ہی مدافعت کرتی ہوئی حاضر ہو گی اور ہر جان کو وہی پورا پورا بدلہ میں ملے گا جو اس نے کیا ہو گا اور ان کے ساتھ ذرا بھی ناانصافی نہیں کی جائے گی۔ ۱۱۰-۱۱۱

۲۱۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

مَنْ كَفَرَ بِاللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ اِيْمَانِهٖٓ اِلَّا مَنْ اُكْرِهَ وَقَلْبُهٗ مُطْمَئِنٌّۢ بِالْاِيْمَانِ وَلٰكِنْ مَّنْ شَرَحَ بِالْكُفْرِ صَدْرًا فَعَلَيْهِمْ غَضَبٌ مِّنَ اللّٰهِ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ (۱۰۶)

زیر ستم مسلمانوں کو آگاہی

یہ ان لوگوں کو آگاہی ہے جو اس دور میں کفار کی ستم رانیوں کے ہدف تھے۔ فرمایا کہ جو لوگ اعدائے حق کے شکنجہ میں ہیں ان کے لیے اس بات کی تو گنجائش ہے کہ وہ قلباً ایمان پر جمے رہتے ہوئے محض زبان سے کوئی کلمہ ایسا نکال دیں جس سے ان کی جان کے اس مصیبت سے چھوٹ جانے کی توقع ہو، لیکن اس بات کی گنجائش نہیں ہے کہ وہ اسی جبر و ظلم کو بہانہ بنا کر اپنا سینہ کفر ہی کے لیے کھول دیں۔ جو لوگ ایسا کریں گے فرمایا کہ ان پر

اللہ کا غضب اور بہت بڑا عذاب ہے۔ ان کا ایک مرتبہ ایمان کی طرف آجانا اس بات کی نہایت واضح دلیل ہے کہ اس چیز کی صحت و صداقت ان پر واضح ہو چکی ہے۔ اس کے بعد اس بات کی تو گنجائش باقی رہتی ہے کہ آدمی اسی کے تحفظ کے پہلو سے کوئی ایسی تدبیر اختیار کرسکے جو بظاہر اس کے خلاف ہو لیکن اس بات کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی کہ آدمی اس سے کلیتہً دستبردار ہو کر کفر ہی کو اوڑھنا بچھونا بنالے۔ فرمایا کہ جو لوگ تن آسانی کی یہ راہ اختیار کریں گے ان پر خدا کا غضب اور ان کے لیے عذاب عظیم ہے۔

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمُ اسْتَحَبُّوا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا عَلَى الْاٰخِرَةِ ۙ وَاَنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۰۷﴾

ہدایت و ضلالت کے باب میں سنتِ الٰہی

یہ وجہ بیان ہوئی ہے اس بات کی کہ کیوں ایسے لوگوں پر اللہ کا غضب ہے، فرمایا کہ یہ اس وجہ سے ہے کہ انھوں نے اپنی دنیا کی زندگی کو آخرت پر ترجیح دی ہے اور خدا کی پکڑ سے بے پروا ہو کر اپنے آپ کو کفر کے حوالے کر دیا۔ اللہ ان لوگوں کے لیے تو اپنی ہدایت کی راہ کھولتا ہے جو ہر حال میں اس کی ہدایت ہی کو اپنا نصب العین بناتے ہیں لیکن ان لوگوں کو راہ یاب نہیں کرتا جو مشکلات سے گھبرا کر کفر ہی کو اپنا ملجا و ماویٰ بنا لیتے ہیں۔

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ طَبَعَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَسَمْعِهِمْ وَاَبْصَارِهِمْ ۚ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ ﴿۱۰۸﴾

فرمایا کہ ایسے لوگ جو ایمان کی روشنی ایک مرتبہ دیکھ لینے کے بعد محض اپنے دنیوی مفادات کی خاطر اس سے آنکھیں بند کر لیتے ہیں، اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کے دلوں، ان کے کانوں اور ان کی آنکھوں پر مہر کر دیا کرتا ہے اور وہ ہدایت کی توفیق سے بالکل ہی محروم ہو جاتے ہیں۔ ایسے لوگ نہ خود اصل حقیقت پر غور کرتے، نہ کسی دوسرے معقول آدمی کی بات سنتے اور نہ بصیرت حاصل کرنے کے لیے اپنی آنکھیں کھولتے۔ یہ ہدایت و ضلالت کے باب میں اس سنتِ الٰہی کی طرف اشارہ ہے جس کی وضاحت بقرہ کی آیت ۷ کے تحت ہو چکی ہے وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ یعنی اصل بے خبر یہی لوگ ہیں اس لیے کہ ان کے دل اور ان کے کان آنکھ سب چاٹ ہو چکے ہیں۔ کسی طرف سے بھی کوئی بصیرت کی کرن ان کے اندر داخل ہونے کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہی۔

لَا جَرَمَ اَنَّهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿۱۰۹﴾

'لَا جَرَمَ' کے معنی لابد اور لا محالہ کے ہیں۔ اصلاً تو یہ کسی بات کی تاکید کے لیے آتا ہے لیکن موقع مقتضی ہو تو اس کے اندر قسم کا زور بھی پیدا ہو جاتا ہے۔

اوپر جو کچھ بیان ہوا ہے یہ اس کا لازمی نتیجہ بتایا گیا ہے کہ جو لوگ اپنی دنیا کی خاطر اس طرح آخرت سے بے پروا ہو جائیں گے آخرت میں سب سے زیادہ محروم و نامراد وہی ہوں گے۔

ثُمَّ اِنَّ رَبَّكَ لِلَّذِيْنَ هَاجَرُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا فُتِنُوْا ثُمَّ جٰهَدُوْا وَصَبَرُوْٓا ۙ اِنَّ رَبَّكَ مِنْۢ بَعْدِهَا لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۱۰﴾

ہجرت حبشہ کے جانبازوں کے لیے بشارت

بزدلوں اور پست ہمتوں کا انجام بیان کرنے کے بعد اب یہ ان جانبازوں اور سر فروشوں کا ذکر ہے جنھوں نے اپنے دین کی خاطر کفار کے ہاتھوں ہر قسم کے مصایب جھیلے لیکن وہ اس سے دست بردار ہونے پر تیار نہ ہوئے۔

ہجرت سے یہاں اشارہ ہجرت حبشہ کی طرف ہے اور جہاد و صبر سے یہاں ان کی وہ جاں بازیاں مراد ہیں جو دین پر استقامت کے معاملے میں انھوں نے دکھائیں۔ فرمایا کہ جن لوگوں نے ان جاں گسل مصائب کا مقابلہ کر کے اپنے ایمان کی حفاظت کی ہے، خدا ان کی لغزشوں اور فروگزاشتوں سے درگزر فرمائے گا اور ان کو اپنی رحمت سے نوازے گا۔

يَوْمَ تَأْتِي كُلُّ نَفْسٍ تُجَادِلُ عَنْ نَّفْسِهَا وَتُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ (۱۱۱)

آخرت کی یاددہانی

یہ اس دن کی یقین دہانی ہے جس دن اللہ تعالیٰ کے حضور سب لوگوں کی پیشی ہوگی اور وہ کامل انصاف کے ساتھ سب کے معاملات کا فیصلہ فرمائے گا۔ فرمایا کہ تَاْتِيْ كُلُّ نَفْسٍ تُجَادِلُ عَنْ نَّفْسِهَا، اس دن ہر جان پر نفسی نفسی کی حالت طاری ہوگی۔ نہ کوئی کسی کی وکالت کر سکے گا اور نہ کوئی کسی کا سفارشی بن کر کھڑا ہو گا۔ جس نے جو کچھ کیا ہو گا اس کا سارا کیا دھرا اس کے سامنے آجائے گا، ہر ایک کے ساتھ کامل عدل کا معاملہ ہو گا، کسی کے ساتھ کوئی ناانصافی نہیں کی جائے گی۔

۲۲- آگے کا مضمون ــــــ آیات ۱۱۲-۱۲۴

قریش کے لیے ایک بستی کی مثال

آگے قریش کی تنبیہ کے لیے ایک بستی کو بطور مثال پیش کیا ہے کہ اگر انھوں نے اپنی روش نہ بدلی تو ان کا بھی وہی انجام ہو سکتا ہے جو اس بستی والوں کا ہوا۔ نیز ان کو یہ ہدایت فرمائی گئی کہ اپنے جی سے حرام و حلال نہ ٹھہراؤ۔ اللہ نے جن چیزوں کو حلال ٹھہرایا ہے ان کو کھاؤ برتو، اپنے مشرکانہ توہمات کے تحت ان کو حرام نہ ٹھہراؤ۔ اسی ذیل میں اس حقیقت کی طرف بھی اشارہ فرما دیا گیا کہ یہود پر بھی وہی چیزیں حرام کی گئی تھیں جو اس ملت میں حرام ہیں لیکن انھوں نے اپنی سرکشی کے سبب سے بعض چیزیں از خود اپنے اوپر حرام کر لیں اور ان کی حرمت کو وہ اب ملت ابراہیم کی طرف منسوب کرتے ہیں حالانکہ ابراہیم کو نہ یہودیت و نصرانیت سے کوئی علاقہ تھا نہ ملت مشرکین سے۔ ان کی ملت ان سب سے الگ تھی اور وہی ملت ہے جس کی پیروی کی ہدایت تمھیں کی گئی ہے۔ سبت کے احترام کا تعلق بھی یہود سے تھا، ملت ابراہیم سے اس کا کوئی تعلق نہیں ــــــ آیات کی تلاوت کیجیے۔

آیات ۱۱۲-۱۲۴

وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا قَرْيَةً كَانَتْ اٰمِنَةً مُّطْمَىِٕنَّةً يَّاْتِيْهَا رِزْقُهَا رَغَدًا مِّنْ كُلِّ مَكَانٍ فَكَفَرَتْ بِاَنْعُمِ اللّٰهِ فَاَذَاقَهَا اللّٰهُ لِبَاسَ الْجُوْعِ وَالْخَوْفِ بِمَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ (۱۱۲) وَلَقَدْ جَآءَهُمْ رَسُوْلٌ مِّنْهُمْ فَكَذَّبُوْهُ فَاَخَذَهُمُ الْعَذَابُ وَهُمْ

ظٰلِمُوْنَ ﴿١١٣﴾ فَكُلُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ حَلٰلًا طَيِّبًا ۖ وَّاشْكُرُوْا
نِعْمَتَ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ ﴿١١٤﴾ اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ
الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنْزِيْرِ وَمَآ اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ ۚ
فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿١١٥﴾ وَلَا
تَقُوْلُوْا لِمَا تَصِفُ اَلْسِنَتُكُمُ الْكَذِبَ هٰذَا حَلٰلٌ وَّهٰذَا حَرَامٌ
لِّتَفْتَرُوْا عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ ۭ اِنَّ الَّذِيْنَ يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ
لَا يُفْلِحُوْنَ ﴿١١٦﴾ مَتَاعٌ قَلِيْلٌ ۠ وَّلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿١١٧﴾ وَعَلَى الَّذِيْنَ
هَادُوْا حَرَّمْنَا مَا قَصَصْنَا عَلَيْكَ مِنْ قَبْلُ ۚ وَمَا ظَلَمْنٰهُمْ
وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ﴿١١٨﴾ ثُمَّ اِنَّ رَبَّكَ لِلَّذِيْنَ عَمِلُوا
السُّوْۗءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ وَاَصْلَحُوْٓا اِنَّ رَبَّكَ
مِنْۢ بَعْدِهَا لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿١١٩﴾ اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ كَانَ اُمَّةً قَانِتًا ع ۱۵ ۲۱
لِّلّٰهِ حَنِيْفًا ۭ وَلَمْ يَكُ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿١٢٠﴾ شَاكِرًا لِّاَنْعُمِهٖ ۭ اِجْتَبٰىهُ
وَهَدٰىهُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿١٢١﴾ وَاٰتَيْنٰهُ فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً ۭ وَاِنَّهٗ
فِي الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿١٢٢﴾ ثُمَّ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ اَنِ اتَّبِعْ مِلَّةَ
اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا ۭ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿١٢٣﴾ اِنَّمَا جُعِلَ السَّبْتُ
عَلَى الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِيْهِ ۭ وَاِنَّ رَبَّكَ لَيَحْكُمُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ
فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ﴿١٢٤﴾

ترجمۂ آیات ۱۱۲-۱۲۴

اور اللہ نے ایک بستی کی مثال بیان کی ہے جو بالکل امن و اطمینان کی حالت میں تھی،

ان کو ان کا رزق فراغت کے ساتھ ہر طرف سے پہنچ رہا تھا۔ لیکن انھوں نے اللہ کی نعمتوں کی ناشکری کی تو اللہ نے ان کی کرتوتوں کی پاداش میں ان کو بھوک کا مزا چکھایا اور خوف کا لباس پہنا دیا۔ اور ان کے پاس ایک رسول انھیں میں سے آیا تو انھوں نے اس کی تکذیب کر دی تو ان کو عذاب نے آدبوچا اور وہ خود اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے تھے۔ ۱۱۲-۱۱۳

تو اللہ نے تمھیں جو چیزیں جائز و پاکیزہ دے رکھی ہیں ان میں سے کھاؤ اور اللہ کی نعمت کا شکر ادا کرو اگر تم اسی کی پرستش کرتے ہو۔ اس نے تو تم پر بس مردار اور خون اور سؤر کا گوشت اور جس پر غیر اللہ کا نام لیا گیا ہو، حرام ٹھہرایا ہے، پس جو کوئی مجبور ہو جائے، نہ طالب ہو اور نہ حد سے بڑھنے والا، تو اللہ بخشنے والا اور مہربان ہے۔ اور اپنی زبانوں کے گھڑے ہوئے جھوٹ کی بنا پر یہ نہ کہو کہ فلاں چیز حلال ہے اور فلاں چیز حرام کہ اللہ پر جھوٹی تہمت لگاؤ۔ جو لوگ اللہ پر جھوٹی تہمت لگائیں گے وہ ہرگز فلاح نہیں پائیں گے۔ ان کے لیے چند روزہ عیش اور دردناک عذاب ہے۔ ۱۱۴-۱۱۷

اور جو یہودی ہوئے ان پر بھی ہم نے وہی چیزیں حرام کیں جو ہم نے پہلے تم کو بتائیں اور ہم نے ان پر کوئی ظلم نہیں کیا بلکہ وہ خود اپنی جانوں پر ظلم ڈھاتے رہے۔ ۱۱۸

پھر تمھارا رب ان لوگوں کے لیے جو جہالت سے برائی کر بیٹھیں پھر اس کے بعد توبہ اور اصلاح کر لیں تو بے شک تمھارا رب اس کے بعد بڑا بخشنے والا اور نہایت مہربان ہے۔ ۱۱۹

بے شک ابراہیم ایک الگ امت تھے، اللہ کے فرماں بردار اور اس کی طرف یکسو اور وہ مشرکین میں سے نہ تھے۔ وہ اس کی نعمتوں کے شکر گزار تھے۔ اللہ نے ان کو برگزیدہ کیا اور ان کی رہنمائی ایک سیدھی راہ کی طرف فرمائی۔ اور ہم نے ان کو دنیا میں بھی بھلائی عطا کی اور آخرت میں بھی وہ صالحین

کے زمرہ میں ہوں گے۔ پھر ہم نے تمھاری طرف وحی کی کہ ملتِ ابراہیمؑ کی پیروی کرو جو بالکل یکسو تھے اور وہ مشرکین میں سے نہ تھے۔ ۱۲۰-۱۲۲

سبت انھی لوگوں پر عاید کیا گیا تھا جنھوں نے اس کے باب میں اختلاف کیا اور بے شک تمھارا رب ان چیزوں کے باب میں جن میں وہ اختلاف کرتے رہے ہیں، قیامت کے روز ان کے درمیان فیصلہ فرمائے گا۔ ۱۲۴

۲۳- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا قَرْيَةً كَانَتْ اٰمِنَةً مُّطْمَئِنَّةً يَّاْتِيْهَا رِزْقُهَا رَغَدًا مِّنْ كُلِّ مَكَانٍ فَكَفَرَتْ بِاَنْعُمِ اللّٰهِ فَاَذَاقَهَا اللّٰهُ لِبَاسَ الْجُوْعِ وَالْخَوْفِ بِمَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ (۱۱۲)

'قریۃ' سے مراد سبا ہے۔

'قریۃ' مرکزی بستی کو کہتے ہیں جس کے ساتھ اس کے توابع اور ملحقات ہوں۔ یہاں قریہ کی تصریح نہیں ہے لیکن قرینہ دلیل ہے کہ اشارہ سبا کی طرف ہے۔ اہل مکہ کے سامنے اس بستی کی مثال کئی جگہ تفصیل کے ساتھ پیش کی گئی ہے مثلاً ملاحظہ ہوں آیات ۱۵-۲۰ سورۂ سبا۔ اس بستی پر اللہ کا بڑا فضل و کرم تھا، دو رویہ سرسبز و شاداب باغوں کی قطاریں تھیں، نہریں تھیں، چشمے تھے لیکن اس کے باشندوں نے اللہ کی ناشکری اور اس کی نعمتوں کی ناقدری کی تو اللہ کا عذاب ایک بے پناہ سیلاب کی شکل میں نمودار ہوا اور اس نے سب کو تباہ کر کے رکھ دیا۔

مشرکینِ مکہ کے لیے قوم سبا کی مثال

'فَاَذَاقَهَا اللّٰهُ لِبَاسَ الْجُوْعِ وَالْخَوْفِ'، اس میں عربیت کے اعلیٰ اسلوب کے مطابق حذف ہے۔ اگر اس حذف کو کھول دیا جائے تو پوری بات یوں ہوگی۔ فَاَذَاقَهَا اللّٰهُ طَعْمَ الْجُوْعِ وَاَلْبَسَهَا لِبَاسَ الْخَوْفِ یعنی اللہ نے ان کے کفرانِ نعمت کی پاداش میں ان کو بھوک کا مزہ چکھایا اور امن و اطمینان کی جگہ ان کو خوف و خطرے کا جامہ پہنا دیا۔

وَلَقَدْ جَآءَهُمْ رَسُوْلٌ مِّنْهُمْ فَكَذَّبُوْهُ فَاَخَذَهُمُ الْعَذَابُ وَهُمْ ظٰلِمُوْنَ (۱۱۳)

یعنی ان میں انھیں میں سے ایک رسول ان کو متنبہ کرنے کے لیے آیا تو انھوں نے اس کو جھٹلا دیا، نتیجہ یہ ہوا کہ اللہ کے عذاب نے ان کو آ دبوچا اور یہ اللہ نے ان پر کوئی ظلم نہیں کیا بلکہ وہ خود اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے بنے اس لیے کہ اپنی ناشکری سے اس کے اسباب انھوں نے خود فراہم کیے۔

فَكُلُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ حَلٰلًا طَيِّبًا وَّاشْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ (۱۱۴)

اہل سبا اور اہل مکہ میں مماثلت

اہل مکہ کو اہل سبا کا انجام یاد دلا کر ان کو یاد دہانی فرمائی کہ تمھیں بھی اللہ نے جو چیزیں حلال و طیب بخشی ہیں ان کو کھاؤ برتو اور اس کی نعمتوں پر اسی کا شکر ادا کرو اگر تم اسی کی پرستش کرنے والے ہو۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ اہل سبا اور اہل مکہ میں بڑی مماثلت تھی۔ اوپر اہل سبا کے باب میں جو الفاظ وارد ہوئے ہیں ان کو پڑھیے پھر حرم مکہ کی شان میں یہ الفاظ اَوَلَمْ نُمَكِّنْ لَّهُمْ حَرَمًا اٰمِنًا يُّجْبٰٓى اِلَيْهِ ثَمَرٰتُ كُلِّ شَيْءٍ رِّزْقًا مِّنْ لَّدُنَّا ، ۵۷ قصص - پڑھیے تو دونوں کی مماثلت واضح ہو جائے گی جس طرح اہل سبا کو امن و چین کی زندگی حاصل تھی اسی طرح اہل مکہ کو بھی امن و اطمینان کی زندگی حاصل تھی۔ خانہ کعبہ کا مرکز ہونے کی وجہ سے یہ شہر امن و امان کا شہر تھا، کسی کی مجال نہیں تھی کہ بلد امین پر حملہ کرنے کی جرأت کر سکے۔ تمام ملک سے تجارتی قافلے یہاں بے خوف و خطر آتے اور اس شہر کے باشندوں کی خوش حالی کا ذریعہ بنتے۔ خود اہل مکہ کے تجارتی قافلے ہر موسم میں بے خوف و خطر دور دور کے سفر کرتے لیکن ان کو نقصان پہنچانا تو الگ رہا راستہ کے بدوی قبائل ان کی حفاظت کے لیے بدرقہ فراہم کرتے کہ یہ بیت اللہ کے خادم اور متولی ہیں۔ ان نعمتوں کا حق یہی تھا کہ یہ ان سے فائدہ اٹھاتے اور اللہ کے شکر گزار رہتے لیکن انھوں نے شرک میں مبتلا ہو کر اللہ کے بخشے ہوئے جانوروں کی قربانی اپنے مزعومہ شریکوں کے تھانوں اور استھانوں پر دی، محض اپنے مشرکانہ اوہام کے تحت اپنے جی سے ان کو حلال و حرام ٹھہرایا اور اس طرح اسی کفران نعمت کے جرم کے مرتکب ہوئے جس کے مرتکب ہو کر اہل سبا کیفر کردار کو پہنچے۔

مشرکین مکہ کا زعم باطل

اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ کے صحیح مفہوم کو سمجھنے کے لیے اس بات کو یاد رکھیے کہ مشرکین مکہ شرک کی تمام خرافات میں مبتلا ہونے کے باوجود دعویٰ یہی کرتے تھے کہ وہ پرستش خدا ہی کی کرتے ہیں۔ بتوں کی پرستش کے حق میں انھوں نے یہ دلیل پیدا کی تھی کہ ہم ان کی پرستش تو محض اس لیے کرتے ہیں کہ یہ ہمیں خدا کے قریب کر دیں مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَآ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى ان کا زعم یہ تھا کہ یہ خدا کے مقرب اور چہیتے ہیں۔ اگر یہ راضی رہیں تو خدا سے سفارش کر کے اپنے پرستاروں کو جو چاہیں دلوا سکتے ہیں۔ اسی زعم کے تحت وہ ان کو نذرانے اور چڑھاوے پیش کرتے اور ان کے نام پر جانور چھوڑتے جن کو تقدس کا یہ درجہ حاصل ہو جاتا کہ نہ ان کا دودھ اور گوشت کھانا جائز ہوتا اور نہ ان پر سواری کی جا سکتی۔ قرآن نے ان کے اسی مغالطہ کو یہاں رفع کیا ہے کہ اگر خدا ہی کی پرستش کا دعویٰ ہے تو اس کی نعمتوں پر اسی کا شکر ادا کرو، اس کی بخشی ہوئی نعمتوں کو نہ دوسروں کی طرف منسوب کرو، نہ ان کے لیے ان کی قربانی پیش کرو، نہ ان کے نام پر ان کو حرام و حلال ٹھہراؤ۔

اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنْزِيْرِ وَمَآ اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ ۚ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (۱۱۵)

خدا کی حرام کردہ چیزیں

ان جانوروں میں سے تمھارے اوپر حرام صرف مردار اور خون، لحم خنزیر اور وہ جانور ہے جس کو غیر اللہ کے نام پر ذبح کیا گیا ہو اور اس میں بھی یہ رعایت ہے کہ اگر کسی شخص کی بھوک سے جان پر آ بنی ہو تو بقدر

سدرمق وہ ان میں سے کسی چیز کو کھا کر اپنی جان بچا سکتا ہے۔ ایسی حالت میں خدا اس کو معاف کر دے گا اور اس پر رحم فرمائے گا۔ 'غَیْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ' بس یہ ایک شرط اس کے ساتھ ہے کہ نہ اس حرام کو دل سے چاہنے والا بنے اور نہ سدرمق کی حد سے متجاوز ہو۔ یعنی یہ نہ کرے کہ اضطرار کو حرام خوری کا بہانہ بنائے اور پھر خوب حرام پر ہاتھ صاف کرنا شروع کر دے۔ مزید تفصیل کے طالب مائدہ آیت ۳ اور انعام ۱۴۵ کے تحت جو کچھ لکھا گیا ہے اس پر ایک نظر ڈال لیں۔

وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَا تَصِفُ اَلْسِنَتُكُمُ الْكَذِبَ هٰذَا حَلٰلٌ وَّهٰذَا حَرَامٌ لِّتَفْتَرُوْا عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ ۭ اِنَّ الَّذِيْنَ يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ لَا يُفْلِحُوْنَ (۱۱۶)

تحلیل و تحریم کا حق صرف خدا کو ہے

یعنی حلال و حرام کرنے کا حق صرف اللہ ہی کو حاصل ہے۔ کسی دوسرے کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ بغیر کسی خدائی سند کے محض اپنے مزعومات کی بنیاد پر کسی چیز کو حلال اور کسی چیز کو حرام قرار دینا شروع کر دے۔ یہ اللہ پر جھوٹا افترا ہے کیونکہ جو بات اس نے نہیں فرمائی وہ تم اس کی طرف منسوب کرتے ہو۔ اور یاد رکھو کہ خدا پر جھوٹا افترا کرنے والے کبھی فلاح یاب نہیں ہوں گے۔

'لِمَا تَصِفُ اَلْسِنَتُكُمُ الْكَذِبَ' یعنی جن کے باب میں محض تمہاری اپنی زبان کے جھوٹے اور بے بنیاد دعوے ہیں، ان کے حق میں تمہارے پاس خدا کی طرف سے کوئی دلیل نہیں ہے۔

'لِتَفْتَرُوْا عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ' یعنی اپنے جی سے حلال و حرام قرار دینا کوئی معمولی بات نہیں ہے، بالآخر یہ بات خدا پر جھوٹے افترا تک منتہی ہوتی ہے جو شدید ترین جرائم میں سے ہے۔

مَتَاعٌ قَلِيْلٌ ۠ وَّلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ (۱۱۷)

یہ 'لَا يُفْلِحُوْنَ' کی وضاحت ہے، یعنی اللہ پر افترا کرنے والوں کے لیے بس اس دنیا کی چند روزہ زندگی اور اس کا عیش و آرام ہے، اس کے بعد ان کے لیے ایک ابدی عذاب الیم ہے۔

وَعَلَى الَّذِيْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا مَا قَصَصْنَا عَلَيْكَ مِنْ قَبْلُ ۚ وَمَا ظَلَمْنٰهُمْ وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ (۱۱۸)

یہود کی من مانی تحریم و تحلیل

یعنی اصلاً یہود پر بھی وہی چیزیں حرام ٹھہرائی گئی تھیں جو اوپر آیات ۱۱۵ میں مذکور ہوئیں لیکن پھر انھوں نے خود اپنے جی سے کچھ چیزیں اپنے اوپر حرام کر لیں جو ان کی سرکشی کی سزا کے طور پر ان پر حرام کر دی گئیں۔ خدا نے ان پر کوئی ظلم نہیں کیا بلکہ وہ خود اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے بنے۔ اس کی وضاحت نساء کی آیت ۱۶۰ کے تحت گزر چکی ہے۔ تفصیل کے طالب اس پر ایک نظر ڈال لیں۔

ثُمَّ اِنَّ رَبَّكَ لِلَّذِيْنَ عَمِلُوا السُّوْۗءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ وَاَصْلَحُوْٓا ۙ اِنَّ رَبَّكَ مِنْۢ بَعْدِهَا لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (۱۱۹)

توبہ کرنے والوں کے لیے بشارت

یہ اوپر کی تنبیہات کے بعد ایک بشارت ہے۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے فرمایا جا رہا ہے کہ جو لوگ خدا کی واضح ہدایات کے باوجود اب تک غلطیوں، جہالتوں اور تعصبات میں گرفتار رہے ہیں ان

کے لیے اب بھی نجات کی راہ کھلی ہوئی ہے۔ تمھارا رب ان لوگوں کو بخش دے گا اور ان پر رحم فرمائے گا جنھوں نے جہالت کے سبب سے برائیاں کیں پھر اس کے بعد توبہ اور اصلاح کر لی۔ مطلب یہ ہے کہ تمھاری بعثت سے قبل جو تاریکی کا دور گزرا ہے اس میں لوگوں نے خدا کی جو نافرمانیاں کی ہیں اگر تمھاری اس دعوت کے بعد انھوں نے توبہ اور اصلاح کر لی تو ان کے لیے خدا کی رحمت میں داخل ہونے اور اس کی مغفرت کے مستحق ہونے کا موقع اب بھی باقی ہے۔ بدقسمت ہی ہوں گے وہ جو اس موقع سے فائدہ نہ اٹھائیں۔

إِنَّ إِبْرَٰهِيمَ كَانَ أُمَّةً قَانِتًا لِّلَّهِ حَنِيفًا وَلَمْ يَكُ مِنَ ٱلْمُشْرِكِينَ (۱۲۰)

حضرت ابراہیم کا اصل مقام

یہود، نصاریٰ اور مشرکین سب اپنی اپنی بدعات کی تائید میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے نام کو بطور سند استعمال کرتے تھے۔ ان میں سے ہر گروہ کا دعویٰ یہ تھا کہ وہ حضرت ابراہیم ہی کے طریقہ پر ہے اور حرام و حلال کے معاملہ میں ملت ابراہیمی ہی کی پیروی کر رہا ہے۔ نصاریٰ بھی جنھوں نے خنزیر تک کو جائز کر لیا، اسی خبط میں مبتلا تھے۔ مشرکین مکہ کا تو پوچھنا ہی کیا وہ تو تھے ہی اپنے زعم میں ملت ابراہیم کے اجارہ دار، یہ سب بجائے اپنے اپنے رویہ کا جائزہ لینے کے خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مطعون کرتے تھے کہ یہ حضرت ابراہیم کے طریقہ سے ہٹے ہوئے ہیں، حرام و حلال کے معاملہ میں ان کے ضابطہ کی پیروی نہیں کر رہے ہیں بلکہ ان سے الگ اپنی راہ انھوں نے نکالی ہے۔ قرآن نے ان سب کا یہ جواب دیا ہے کہ ابراہیم ایک الگ امت تھے، وہ اللہ کے فرمان بردار اور اسی کی طرف یکسو تھے، وہ مشرکین میں سے نہ تھے۔ اسی طرح آل عمران میں فرمایا ہے کہ مَا كَانَ إِبْرَٰهِيمُ يَهُودِيًّا وَلَا نَصْرَانِيًّا وَلَٰكِن كَانَ حَنِيفًا۔ "ابراہیم نہ یہودی تھے نہ نصرانی بلکہ وہ اللہ کی طرف یکسو تھے۔"

'امۃ' کا لفظ ایک طرف تو حضرت ابراہیم کی انفرادیت کا اظہار کر رہا ہے کہ وہ یہود، نصاریٰ اور مشرکین کسی میں سے نہیں تھے بلکہ ان سب سے الگ وہ ایک حنیف و مسلم تھے، دوسرے ان کی اس جامعیت و مرکزیت کی طرف اشارہ کر رہا ہے جو اللہ نے ان کو بخشی تھی۔ اس لیے کہ وہ صرف ایک فرد نہیں بلکہ ایک عظیم امت کے بانی تھے۔

شَاكِرًا لِّأَنْعُمِهِ ۚ ٱجْتَبَىٰهُ وَهَدَىٰهُ إِلَىٰ صِرَٰطٍ مُّسْتَقِيمٍ (۱۲۱)

یہ حضرت ابراہیم کی مزید تعریف ہے کہ وہ اللہ کی نعمتوں پر اللہ ہی کے شکر گزار تھے، تمھاری طرح اللہ کی نعمتوں کو اصنام و انصاب کی طرف منسوب کر کے خدا کی ناشکری کرنے والے نہیں تھے اور ان کی اسی شکر گزاری کی یہ برکت تھی کہ خدا نے ان کو منصب نبوت کے لیے انتخاب فرمایا اور ایک صحیح راہ کی طرف ان کی رہنمائی فرمائی۔

وَءَاتَيْنَٰهُ فِى ٱلدُّنْيَا حَسَنَةً ۖ وَإِنَّهُۥ فِى ٱلْءَاخِرَةِ لَمِنَ ٱلصَّٰلِحِينَ (۱۲۲)

یعنی دنیا میں بھی اللہ نے ان کو مال و جاہ عطا فرمایا یہاں تک کہ ان کی حیثیت ایک حکمران کی ہو گئی اور آخرت میں بھی وہ زمرہ صالحین میں اپنا درجہ اور مقام حاصل کریں گے۔

ثُمَّ أَوْحَيْنَآ إِلَيْكَ أَنِ ٱتَّبِعْ مِلَّةَ إِبْرَٰهِيمَ حَنِيفًا ۖ وَمَا كَانَ مِنَ ٱلْمُشْرِكِينَ (۱۲۳)

یعنی ملت ابراہیمؑ کی پیروی کے یہ سارے مدعی۔ یہود، نصاریٰ اور مشرکین ۔۔۔ تو بالکل جھوٹے ہیں ہاں ہم نے تمہاری طرف البتہ یہ وحی کی کہ تم ملت ابراہیمؑ کی پیروی کرو۔ چنانچہ تمہاری ملت ملت ابراہیمؑ ہے۔

إِنَّمَا جُعِلَ السَّبْتُ عَلَى الَّذِينَ اخْتَلَفُوا فِيهِ ۚ وَإِنَّ رَبَّكَ لَيَحْكُمُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ
فِيمَا كَانُوا فِيهِ يَخْتَلِفُونَ (۱۲۴)

سبت کا حکم ملت ابراہیم کا جزو نہیں تھا

یہ یہود کے ایک اعتراض کا جواب ہے۔ یہود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں پر ایک اعتراض یہ بھی کرتے تھے کہ یہ لوگ سبت کا احترام نہیں کرتے۔ قرآن نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ سبت کا احترام ملت ابراہیمؑ کا کوئی جزو نہیں ہے بلکہ سبت یہود کے لیے مشروع ہوا تھا اور انھوں نے بھی اس کے باب میں اختلافات پیدا کر کے اس کی حرمت برباد کی۔ اب ان اختلافات کا فیصلہ قیامت کے روز ہو گا۔ سبت کے آداب و احکام کے بارے میں ان کے ہاں جو اختلافات ہیں ان کی تفصیل بڑی طولانی ہے۔ ہمارے لیے اس میں پڑنے کی یہاں گنجائش نہیں ہے۔

۴۔ آگے کا مضمون ــــــ آیات ۱۲۵-۱۲۸

خاتمۂ سورہ

آگے کی آیات خاتمۂ سورہ کی حیثیت رکھتی ہیں جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کو اللہ کے دین کی دعوت پر جمے رہنے اور مشکلات راہ کا صبر و استقامت کے ساتھ مقابلہ کرنے کی ہدایت فرمائی گئی ہے ساتھ ہی حصول صبر کا طریقہ بتایا گیا ہے اور یہ بشارت دی گئی ہے کہ اللہ کی معیت اس کے متقی بندوں ہی کو حاصل ہوتی ہے اور انجام کار کی کامیابی انہی کا حصہ ہے ۔۔۔ آیات کی تلاوت کیجیے۔

آیات ۱۲۵-۱۲۸

ادْعُ إِلَىٰ سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ ۖ وَجَادِلْهُم
بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ ۚ إِنَّ رَبَّكَ هُوَ أَعْلَمُ بِمَن ضَلَّ عَن سَبِيلِهِ ۖ وَهُوَ
أَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِينَ (۱۲۵) وَإِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوا بِمِثْلِ مَا عُوقِبْتُم
بِهِ ۖ وَلَئِن صَبَرْتُمْ لَهُوَ خَيْرٌ لِّلصَّابِرِينَ (۱۲۶) وَاصْبِرْ وَمَا صَبْرُكَ
إِلَّا بِاللَّهِ ۚ وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَلَا تَكُ فِي ضَيْقٍ مِّمَّا يَمْكُرُونَ (۱۲۷)
ع ۱۶ إِنَّ اللَّهَ مَعَ الَّذِينَ اتَّقَوا وَّالَّذِينَ هُم مُّحْسِنُونَ (۱۲۸)

ترجمۂ آیات ۱۲۵-۱۲۸

اپنے رب کے راستہ کی طرف حکمت اور اچھی نصیحت کے ساتھ دعوت دو اور ان کے ساتھ اس

طریقہ سے بحث کرو جو پسندیدہ ہے۔ بے شک تمہارا رب خوب جانتا ہے کہ کون اس کی راہ سے بھٹکا ہوا ہے اور وہ ان کو بھی خوب جانتا ہے جو ہدایت پانے والے ہیں۔ اگر تم بدلہ لو تو بس اتنا لو جتنا تمہارے ساتھ کیا گیا ہے اور اگر تم صبر کرو تو یہ چیز صبر کرنے والوں کے لیے بہت ہی بہتر ہے۔ اور صبر کرو اور تمہیں صبر حاصل نہیں ہو سکتا مگر اللہ ہی کے تعلق سے اور تم نہ ان پر غم کرو اور نہ ان کی ان چالوں سے جو یہ چلتے رہتے ہیں پریشانی میں مبتلا ہو۔ بے شک اللہ ان لوگوں کے ساتھ ہے جنھوں نے تقویٰ اختیار کیا اور جو خوب کار ہیں۔ ۱۲۵-۱۲۸

۲۵- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ ۚ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِیْلِهٖ وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِیْنَ (۱۲۵)

حکمت اور موعظتِ حسنہ

'حکمت' سے مراد دلائل و براہین ہیں اور 'موعظتِ حسنہ' سے مشفقانہ انداز میں تذکیر و تنبیہ۔ دعوتِ دین میں یہی دو چیزیں اصولِ کار کی حیثیت رکھتی ہیں۔ آدمی جو بات بھی کہے دلیل و برہان کی روشنی میں کہے اور انداز دھونس جمانے کا نہیں بلکہ اس کے سچے جذبۂ خیر خواہی و ہمدردی کا غماز ہو تاکہ مخاطب بدکنے کے بجائے اس کی باتوں کے سننے اور ان پر غور کرنے کی طرف مائل ہو۔ اگر چہ ہٹ دھرم لوگ اس سے بھی نہیں پسیجتے لیکن خیر و برکت کا طریقہ یہی ہے۔

پیغمبر صلعم اور صحابہ کو ہدایت

یہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے واسطہ سے آپ کے صحابہؓ کو ہدایت کی جا رہی ہے کہ تم اللہ کے راستے کی دعوت حکمت اور موعظتِ حسنہ کے ساتھ دو۔ اس ہدایت کی ضرورت اس وجہ سے پیش آئی کہ اس دور میں، جیسا کہ پیچھے کی آیات سے واضح ہو چکا ہے، مخالفین کے رویے نے بڑی گرما گرمی پیدا کر دی تھی، پھر اب آنحضرت صلعم بھی تنہا نہیں تھے بلکہ آپ کے ساتھ مومنین کی ایک جماعت میدانِ عمل میں آ گئی تھی۔ ایسی حالت میں یہ بات بعید از امکان نہیں تھی کہ مبادا مخالفین کے رویہ سے تنگ آ کر مسلمان بھی کوئی سخت رویہ اختیار کر لیں اور اس کا اثر دعوت کے مزاج پر پڑے۔ اس سے دعوت کو محفوظ رکھنے کے لیے یہ ہدایت فرما دی گئی کہ دعوتِ دین کے معاملے میں قدم حکمت اور موعظت کے جادۂ مستقیم سے منحرف نہ ہونے پائیں۔

حکمتِ تبلیغ

'وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ' دعوت کے کام میں بحث و گفتگو سے تو مفر نہیں لیکن اس میں بھی یہ قید

نگادی گئی کہ اس کے لیے بہتر طریقہ استعمال کیا جائے۔ اگر حریف اشتعال انگیز رویہ اختیار کرے تو اس کے رویے متاثر ہو کر آدمی اینٹ کا جواب پتھر سے دینے کی کوشش نہ کرے بلکہ ہر حالت میں اپنی شائستگی برقرار رکھے۔ سورۂ بنی اسرائیل میں اسی حقیقت کی وضاحت یوں فرمائی گئی ہے۔ قُلْ لِّعِبَادِیْ یَقُوْلُوا الَّتِیْ ھِیَ اَحْسَنُ اِنَّ الشَّیْطٰنَ یَنْزَغُ بَیْنَھُمْ اِنَّ الشَّیْطٰنَ کَانَ لِلْاِنْسَانِ عَدُوًّا مُّبِیْنًا ۵۳ (میرے بندوں کو ہدایت کر دو کہ وہی بات کہیں جو بہتر ہے۔ بے شک، شیطان ان کے مابین وسوسہ اندازی کرتا ہے بے شک شیطان انسان کا کھلا ہوا دشمن ہے)

اِنَّ رَبَّكَ ھُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِیْلِهٖ وَھُوَ اَعْلَمُ بِالْمُھْتَدِیْنَ، یعنی ایسے حالات میں معاملہ اللہ کے حوالہ کرو۔ وہ گمراہوں سے بھی خوب واقف ہے اور جو ہدایت پر ہیں ان سے بھی خوب باخبر ہے۔ وہ ہر ایک کے ساتھ وہی معاملہ کرے گا جس کا وہ مستحق ہوگا۔ داعی کی ذمہ داری صرف دعوت تک محدود ہے اگر اس نے اپنا فرض صحیح طور پر انجام دے دیا تو وہ اپنی ذمہ داری سے سبکدوش ہوا۔ رہا یہ معاملہ کہ کون گمراہی کا راستہ اختیار کرتا ہے اور کون ہدایت کا تو اس کا تمام تر تعلق اللہ سے ہے اور اس کو اسی پر چھوڑنا چاہیے۔

وَاِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ مَا عُوْقِبْتُمْ بِهٖ ۭ وَلَىِٕنْ صَبَرْتُمْ لَهُوَ خَيْرٌ لِّلصّٰبِرِيْنَ (۱۲۶)

صبر اور انتقام کے حدود کی رعایت

فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ مَا عُوْقِبْتُمْ بِهٖ، میں مشاکلت کا وہی اسلوب ملحوظ ہے جس کی مثال دِنَّاھُمْ کَمَا دَانُوْا ہے۔ کَمَا دَانُوْا یعنی کَمَا فَعَلُوْا۔ اسی طرح اس کے معنی یہ ہیں کہ اگر تم بدلہ لینا ہی چاہو تو اتنا ہی بدلہ لو جتنا تمھارے ساتھ کیا گیا ہے۔ جرم اور سزائے جرم میں عدم توازن نہ ہو۔ یہ نہ ہو کہ تم اینٹ کا جواب پتھر سے دینے کے لیے اٹھ کھڑے ہو۔ علاوہ ازیں منہیات سے اجتناب مسلمان کے لیے ہر صورت میں لازم ہے۔ اگر مخالف ہمیں گالیاں دے تو ہم اس کے جواب میں گالیاں نہیں دے سکتے۔ اپنے معروف اخلاقی حدود کے اندر رہتے ہوئے ہی ہم اس کا جواب دے سکتے ہیں۔

وَلَىِٕنْ صَبَرْتُمْ لَهُوَ خَيْرٌ لِّلصّٰبِرِيْنَ۔ چونکہ یہ مرحلہ نازک ہے، ہر شخص حدود کو صحیح طور پر ملحوظ نہیں رکھ سکتا اور ان کے ملحوظ نہ رکھنے کی صورت میں اسلام کے عاید کردہ حدود و قیود بھی مجروح ہوں گے اور دعوت کے کام کو بھی اس سے نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے اس وجہ سے اولیٰ یہی ہے کہ صبر ہی کیا جائے۔ صبر کرنے والوں کے لیے بڑی نعمت ہے اس میں جو خیر و برکت ہے وہ انتقام میں نہیں ہے۔

یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ یہ ہدایات اس دور سے متعلق ہیں جب مسلمان افراد کی صورت میں اپنے مخالفوں کے اندر گھرے ہوئے اور ان کی چیرہ دستیوں کے شکار تھے۔ اس کا تعلق اس دور سے نہیں جب مسلمانوں کی باقاعدہ منظم حکومت قائم ہوگئی۔ ایک باقاعدہ منظم اسلامی حکومت کے حدود کار اور اس کے اختیارات اس سے مختلف ہیں۔ ان کی تفصیل پچھلی سورتوں خاص طور پر سورۂ انفال اور برأت میں، گزر چکی ہے اور آگے مدنی سورتوں میں ان کی مزید تفصیل آئے گی۔

وَاصْبِرْ وَمَا صَبْرُكَ اِلَّا بِاللّٰهِ وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَلَا تَكُ فِيْ ضَيْقٍ مِّمَّا يَمْكُرُوْنَ (۱۲۷)

صبر کی ہدایت اور حصولِ صبر کی تدبیر

خطاب اگرچہ لفظاً پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے لیکن معناً، جیسا کہ اوپر والی آیت میں واضح ہو چکا ہے، تمام مسلمانوں سے ہے، گویا آپؐ کے واسطہ سے یہ تمام مسلمانوں کو ہدایت کی جا رہی ہے۔ یہ صبر کی ہدایت بھی ہے اور حصولِ صبر کی تدبیر بھی۔ فرمایا کہ 'وَمَا صَبْرُكَ اِلَّا بِاللّٰهِ' یعنی صبر نہیں حاصل ہو سکتا مگر اللہ کے تعلق سے۔ جو صبر کا مقام حاصل کرنا چاہے اس کے لیے لازم ہے کہ وہ اللہ کے ساتھ اپنے تعلق کو زیادہ سے زیادہ بڑھائے۔ خدا کے ساتھ تعلق کا واسطہ اس کا ذکر ہے اور ذکر کا سب سے اعلیٰ طریقہ نماز ہے۔ اس وجہ سے قرآن کے دوسرے مقامات میں صبر کے ساتھ نماز خصوصاً تہجد کے اہتمام کی تاکید فرمائی گئی۔

وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَلَا تَكُ فِيْ ضَيْقٍ مِّمَّا يَمْكُرُوْنَ، یعنی نہ ان شامت زدوں کی حالت پر غم کرو اور نہ ان کی ان چالوں سے جو یہ رات دن چل رہے ہیں ہراساں اور پریشان ہو۔

اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا وَّالَّذِيْنَ هُمْ مُّحْسِنُوْنَ (۱۲۸)

نصرت کا وعدہ اور اسلام کے غلبہ کی بشارت

یہ نصرت کا وعدہ اور بالآخر اسلام اور مسلمانوں کے غلبہ کی بشارت ہے۔ فرمایا کہ اللہ اہل تقویٰ اور ان لوگوں کے ساتھ ہے جو خوب کار ہیں، 'مُحْسِنُوْنَ' یعنی جو اپنے رب کی بندگی اور اس کی عبادت و اطاعت اس طرح کر رہے ہیں گویا اس کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ فرمایا کہ انہی لوگوں کو اللہ کی معیت حاصل ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جب اللہ کی معیت انہی کو حاصل ہے تو لازماً انجام کار کی کامیابی بھی انہی کا حصہ ہے۔

ان سطروں پر اس سورہ کی تفسیر تمام ہوئی۔ وَاٰخِرُ دَعْوٰنَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ۔

تدبرِ قرآن

۱۷

بنی اسرائیل

بسم اللہ الرحمن الرحیم

۱۔ سورہ کا عمود اور سابق سورہ سے تعلق

یہ سورہ، سابق سورہ ـــ سورۂ نحل ـــ کی، جیسا کہ ہم پیچھے اشارہ کر آئے ہیں، توام سورہ ہے اس وجہ سے دونوں کے عمود میں کوئی بنیادی فرق نہیں ہے، صرف تفصیل و اجمال کا فرق ہے۔ پچھلی سورہ میں جو باتیں اشارات کی شکل میں ہیں وہ اس سورہ میں نہایت واضح صورت میں آگئی ہیں۔ مثلاً

پچھلی سورہ میں مشرکین مکہ کے ساتھ ساتھ بنی اسرائیل کے لیے دعوت اور انذار دونوں ہے لیکن جہاں تک بنی اسرائیل کا تعلق ہے بات صرف اشارات کی شکل میں ہے۔ اس سورہ میں تفصیل کے ساتھ ان کو مخاطب کر کے، ان کی اپنی تاریخ کی روشنی میں، یہ حقیقت واضح فرمائی ہے کہ اگر تم اس غرے میں مبتلا ہو کہ تم خدا کے محبوب اور چہیتے ہو تو یہ غرہ محض خود فریبی پر مبنی ہے، تمھاری اپنی تاریخ شاہد ہے کہ جب جب تم نے خدا سے بغاوت کی ہے تم پر مار بھی بڑی ہی سخت پڑی ہے۔ خدا کی رحمت کے مستحق تم اسی صورت میں ہوئے ہو جب تم نے توبہ اور اصلاح کی راہ اختیار کی ہے تو اگر اپنی بہبود چاہتے ہو تو اس پیغمبر کی پیروی کرو جو اسی سیدھی راہ کی دعوت دے رہا ہے جو تورات کے ذریعے سے تم پر کھولی گئی تھی۔ ساتھ ہی معراج کے واقعے کی طرف اشارہ کر کے مشرکین مکہ اور بنی اسرائیل دونوں پر یہ حقیقت بھی واضح فرمائی گئی ہے کہ اب مسجد حرام اور مسجد اقصیٰ دونوں کی امانت خائنوں سے چھین کر اس نبیؐ امی کے حوالہ کرنے کا فیصلہ ہو چکا ہے تو جس کو اپنی روش بدلنی ہے وہ بدلے ورنہ اپنی ضد اور سرکشی کے نتائج بھگتنے کے لیے تیار ہو جائے۔

قرآن جس فطری اور سیدھے طریقۂ زندگی کی دعوت دے رہا ہے، پچھلی سورہ میں صرف اس کی اساسات کی طرف اجمالی اشارہ تھا۔ اوامر میں عدل، احسان اور قرابت مندوں کے حقوق کی ادائی کا حوالہ تھا اور منہیات میں فحشاء، منکر اور بغی کا۔ اس سورہ میں اس کی پوری تفصیل آگئی ہے۔ اس تفصیل سے تورات کے احکام عشرہ کے ساتھ اس کی مطابقت واضح ہوتی ہے۔ گویا انسانی فطرت اور قدیم آسمانی تعلیم دونوں ہم آہنگ ہیں اس وجہ سے قریش اگر اس سے بغاوت کرتے ہیں تو ان کی بھی شامت ہے اور اگر بنی اسرائیل اس کے خلاف سازشیں کرتے ہیں تو ان پر بھی خدا کی پھٹکار ہے۔

پچھلی سورہ میں ہجرت کا ذکر بھی ہے لیکن اشارے کی شکل میں ہے۔ اس سورہ میں اس کا ذکر نہایت واضح طور پر ہوا ہے اور اس کے لیے جن تیاریوں کی ضرورت ہے ان کی ہدایت پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے

صحابہؓ کو ایسے انداز میں دی گئی ہے جس سے یہ نمایاں ہو رہا ہے کہ اس کا وقت بہت قریب ہے۔ اس سے یہ بات نکلتی ہے کہ یہ سورۂ ہجرت کے قریب زمانہ میں نازل ہوئی۔

سابق سورہ کے ساتھ اس کے تعلق کی نوعیت واضح کرنے کے بعد اب ہم اس کے مطالب کا تجزیہ پیش کرتے ہیں تاکہ بالاجمال پوری سورہ نظر کے سامنے آجائے۔

ب۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

(۱) واقعہ معراج کی طرف اشارہ جس میں یہ حقیقت مضمر تھی کہ اب مسجد حرام اور مسجد اقصیٰ دونوں گھروں کی امانت خائنوں اور بدعہدوں سے چھین کر نبی امی صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالہ کی گئی۔ اب یہی ان مقدس گھروں اور ان کے انوار و برکات کے وارث اور محافظ و امین ہوں گے اور ان کے قابضین ـــــ مشرکین قریش اور یہود ـــــ عنقریب ان گھروں کی تولیت سے بے دخل کیے جائیں گے۔

(۲-۸) تاریخ بنی اسرائیل کی روشنی میں ان کے اس زعم کی تردید کہ وہ اللہ کے محبوب اور چہیتے ہیں اس وجہ سے اب دنیا کی مذہبی پیشوائی ان کا اجارہ ہے۔ ان آیات میں ان پر واضح کیا گیا ہے کہ تمھیں خود تمھارے نبیوں کے ذریعہ سے آگاہ کر دیا گیا تھا کہ تم دو مرتبہ خدا سے بغاوت اور زمین میں فساد مچاؤ گے اور دونوں مرتبہ خوب خوب پٹو گے۔ چنانچہ تمھاری تاریخ شاہد ہے کہ تم نے دو مرتبہ خدا سے بغاوت کی اور دونوں ہی مرتبہ خوب پٹے، ایک مرتبہ کلدانیوں کے ہاتھوں اور دوسری مرتبہ رومیوں کے ہاتھوں، تمھیں کلدانیوں کے شکنجہ سے نجات اس وقت ملی جب تم نے اپنے حالات کی اصلاح کی۔ اسی طرح اگر آئندہ بھی تم خدا کی رحمت کے مستحق بننا چاہتے ہو تو توبہ اور اپنے حالات کی اصلاح کرو۔ اس نبی امی کی دعوت نے تمھارے لیے توبہ اور اصلاح کی راہ کھول دی ہے۔ اگر سلامتی چاہتے ہو تو اس دعوت کو قبول کرو اور اس کی برکات میں حصہ دار بن جاؤ۔ اگر تم نے حسد میں مبتلا ہو کر اس نبی کی تکذیب کر دی اور نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ کے غرے میں مبتلا رہے تو یاد رکھو ہم کہیں چلے نہیں گئے ہیں، ہم تمھیں پھر اسی طرح پٹوائیں گے جس طرح اس سے پہلے پٹوا چکے ہیں۔

(۹-۲۱) مشرکین قریش اور بنی اسرائیل دونوں کو قرآن پر ایمان لانے کی دعوت کہ یہ قرآن فطرت کی اسی صراط مستقیم کی طرف رہنمائی کر رہا ہے جس کی طرف سابق انبیاء اور پچھلے صحیفوں نے رہنمائی کی ہے۔ ان کے لیے بشارت ہے جو اس کو قبول کر لیں اور ان کی شامت ہے جو اس کو رد کر دیں۔ ان لوگوں کی حالت پر افسوس جو اس دعوتِ حق کو قبول کرنے کے بجائے حسی معجزات اور عذاب کی نشانیاں مانگتے ہیں اور ان نشانیوں کی طرف توجہ نہیں کرتے جو آفاق میں بھی پھیلی ہوئی ہیں اور جن کی تفصیل اس کتاب میں بھی کر دی گئی ہے۔ یہ اپنے مزعومہ معبودوں پر تکیہ کیے بیٹھے ہیں حالانکہ کوئی جان کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گی، ہر ایک کو اپنا بوجھ خود ہی اٹھانا ہے۔ اللہ کا طریقہ یہ ہے کہ وہ انذار و تنبیہ کے بغیر عذاب نہیں بھیجتا۔ اب ان کو تنبیہ ہو چکی ہے، اگر انھوں نے اس تنبیہ

سے فائدہ نہ اٹھایا تو آگے عذاب ہی کا مرحلہ باقی ہے۔ ساتھ ہی عذاب کے بارے میں سنت الٰہی کی وضاحت کر دی گئی ہے۔

(۲۲-۳۹) قرآن جس طریق اقوم کی دعوت دے رہا ہے (جس کی طرف سورۂ نحل کی آیت ۹۰ میں اشارہ گزر چکا ہے) اس کی تفصیل۔ یہ تفصیل واضح کرتی ہے کہ تورات کے احکام عشرہ اور قرآن حکیم کی ان ہدایات میں پوری مطابقت ہے اور یہ عین انسانی فطرت کے موافق ہیں جن کے بغیر کوئی صالح معاشرہ وجود میں نہیں آسکتا اس وجہ سے نہ بنی اسرائیل کے لیے ان سے فرار کا کوئی جواز ہے نہ بنی اسمٰعیل کے لیے۔ حضرت ابراہیمؑ سے لے کر حضرت موسیٰؑ اور حضرت مسیحؑ تک سب نے انہی باتوں کی تعلیم دی ہے۔

(۴۰-۵۲) مشرکین قریش کی قرآن سے بیزاری کے اصل سبب کی طرف اشارہ کہ وہ توحید اور آخرت پر ایمان نہیں لانا چاہتے اس وجہ سے جب ان کو قرآن سنایا جاتا ہے تو وہ اس سے بدکتے اور پیغمبر پر طرح طرح کے فقرے چست کرتے ہیں حالانکہ ان دونوں باتوں کے دلائل اس قدر واضح ہیں کہ کوئی عاقل ان کا انکار نہیں کر سکتا۔

(۵۳-۵۵) یہ تین آیتیں اثنائے کلام میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف التفات کی نوعیت کی ہیں۔ آپ کو یہ ہدایت فرمائی گئی ہے کہ اپنے صحابہؓ کو متنبہ کر دیں کہ دعوت کی اس گرماگرمی کے دور میں، تبلیغ حق کے جوش میں، کوئی ایسی بات زبان سے نہ نکالیں جو مخالفین کے لیے مزید اشتعال کا سبب بن جائے اور شیطان اسے فتنہ کا ذریعہ بنا لے۔ ساتھ ہی پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی ہے کہ تمہارا فرض صرف تبلیغ حق تک محدود ہے، لوگوں کو مومن و مسلم بنا دینا تمہاری ذمہ داری نہیں ہے، اللہ ہی جس کو چاہے گا ایمان کی توفیق دے گا اور جس کو چاہے گا اس سے محروم رکھے گا۔ آیت ۵۵ میں یہ حقیقت واضح فرما دی گئی کہ اللہ نے اپنے تمام نبیوں کو کسی نہ کسی پہلو سے فضیلت بخشی ہے اس وجہ سے کسی کے لیے مطلق ترجیح و تفضیل کی بحث نہ چھیڑی جائے کہ وہ وجۂ فتنہ بن جائے۔

(۵۶-۵۷) التفات کی آیات بطور جملہ معترضہ تھیں۔ ان کے ختم ہونے کے بعد توحید کے اس مضمون کی تکمیل کر دی گئی جو اوپر سے چلا آ رہا تھا۔ مشرکین، فرشتوں کو خدا کا شریک مانتے تھے۔ ان کی بابت فرمایا کہ خدا کا شریک ہونا تو الگ رہا وہ تو خود برابر خدا کے قرب اور اس کی رضا کے حصول کی جدوجہد میں سرگرم اور ہر وقت اس کے عذاب کے اندیشے سے لرزاں و ترساں ہیں۔

(۵۸-۶۰) مخالفین کے مطالبۂ نشانیٔ عذاب کا جواب اور اس باب میں سنت الٰہی کا بیان۔

(۶۱-۶۵) مخالفین کے اعراض و انکار کے اصل سبب کی طرف اشارہ کہ اللہ نے ان کو اپنی نعمتوں سے نوازا تو انھوں نے نعمت کو شکر کے بجائے کفر و استکبار کا سبب بنا لیا۔ اس معاملے میں انھوں نے ٹھیک ٹھیک ابلیس کے نقش قدم کی پیروی کی ہے اور ابلیس نے ان کے باب میں اپنا گمان بالکل سچ کر دکھایا۔

(۶۶-۷۲) نعمت پا کر انسان کے غرور و استکبار کی تمثیل اور آنکھیں کھول کر زندگی بسر کرنے والوں اور آنکھیں بند

کر کے بھٹکنے والوں کے انجام کا بیان۔

(۷۳-۷۷) مخالفین کی مخالفت کے علی الرغم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دعوت حق پر جمے رہنے کی تاکید اور اس امر کا اعلان کہ اگر قریش نے تمہیں اس سرزمین سے نکال دیا تو پھر ان کو بھی یہاں زیادہ دیر تک ٹکنا نصیب نہ ہوگا۔ نبی کی ہجرت کے باب میں سنت الٰہی کی وضاحت۔

(۷۸-۸۱) حصول صبر و ثبات کے لیے نماز کے اہتمام کی تاکید۔ قرب ہجرت کی طرف اشارہ اور اس کے لیے دعا کی تلقین۔ ظاہری حالات کے علی الرغم غلبۂ حق کی بشارت۔

(۸۲-۸۹) مخالفین کی حرماں نصیبی پر اظہار افسوس کہ وہ قرآن جیسی نعمتِ عظمیٰ کی ناقدری کر رہے ہیں حالانکہ یہ ان کے لیے شفا اور رحمت ہے اور تمام جن وانس مل کر بھی اگر ایسی کتاب لانا چاہیں تو نہیں لا سکتے۔ ضمناً وحی اور جبریل سے متعلق مخالفین کا ایک معترضانہ سوال اور اس کا حکیمانہ جواب۔

(۹۰-۱۰۰) کفار کی طرف سے بعض معجزات کا مطالبہ اور ان کا جواب۔ ہدایت و ضلالت کے باب میں سنت الٰہی کی طرف اشارہ۔ قریش کے متکبرین کو یہ تنبیہ کہ تم خدا کے خزائن نعمت کے ٹھیکے دار نہیں ہو کہ سمجھتے ہو کہ اگر نبوت کسی کو ملنے والی ہوتی تو تمہیں میں سے کسی کو ملتی۔ یہ اللہ کا فضل ہے اس نے جس کو چاہا دیا۔

(۱۰۱-۱۰۴) حضرت موسیٰؑ اور ان کے نو معجزات کا حوالہ۔ ان معجزات کے دیکھنے کے باوجود فرعون کی سرکشی اور اس کا انجام۔

(۱۰۵-۱۱۱) خاتمۂ سورہ ــــ قرآن یکسر حق ہے۔ رسول کی ذمہ داری صرف انذار و تبشیر ہے۔ قرآن کا بالتدریج اترنا تعلیم کے پہلو سے ہے۔ جو بدبخت اس پر ایمان نہیں لا رہے ہیں ان کو ان کے حال پر چھوڑ دو۔ جن کے اندر علم کی روشنی ہے وہ اس پر ایمان لا رہے ہیں۔ اللہ اور رحمٰن سب خدا ہی کے نام ہیں۔ جو لوگ ان ناموں میں کوئی فرق کرتے اور ان کو بنائے اعتراض بناتے ہیں، ان کے درپے نہ ہو۔ اس دین کی روح میانہ روی ہے اور اس میانہ روی کو اپنی عبادات میں ملحوظ رکھو اور اللہ کی حمد اور اس کی تکبیر میں سرگرم رہو۔

اس تجزیۂ مطالب پر ایک نظر ڈال لیجیے اور دیکھیے کہ ایک معین عمود کے تحت کس طرح اس سورہ کی ہر کڑی دوسری کڑی سے ملی ہوئی ہے ــــ اب ہم توفیق الٰہی کی دعا کے ساتھ سورہ کی تفسیر شروع کرتے ہیں۔ اَللّٰھُمَّ اَرِنَا الْحَقَّ حَقًّا وَارْزُقْنَا اتِّبَاعَہٗ وَاَرِنَا الْبَاطِلَ بَاطِلًا وَارْزُقْنَا اجْتِنَابَہٗ۔

سُوْرَةُ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ (۱۷)

مَکِّیَّۃٌ ———————— اٰیَاتُھَا ۱۱۱

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

آیت ۱　سُبْحٰنَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ لَیْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَی الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا الَّذِیْ بٰرَکْنَا حَوْلَہٗ لِنُرِیَہٗ مِنْ اٰیٰتِنَا ۭ اِنَّہٗ ھُوَ السَّمِیْعُ الْبَصِیْرُ ①

ترجمۂ آیت ۱　پاک ہے وہ ذات جو اپنے بندے کو لے گئی ایک شب مسجد حرام سے اس دور والی مسجد تک جس کے اردگرد کو ہم نے برکت بخشی تاکہ ہم اس کو اپنی کچھ نشانیاں دکھائیں۔ بیشک سمیع و بصیر وہی ہے۔ ۱

۱۔ الفاظ کی تحقیق اور آیت کی وضاحت

سُبْحٰنَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ لَیْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَی الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا الَّذِیْ بٰرَکْنَا حَوْلَہٗ لِنُرِیَہٗ مِنْ اٰیٰتِنَا ۭ اِنَّہٗ ھُوَ السَّمِیْعُ الْبَصِیْرُ (۱)

سُبْحٰنَ تنزیہ کا کلمہ ہے　'سُبْحٰنَ' جیسا کہ متعدد مواقع میں تصریح ہو چکی ہے، تنزیہ کا کلمہ ہے۔ یعنی اللہ کی ذات ہر نقص و عیب سے پاک و منزہ ہے۔ اس کلمہ سے کلام کا آغاز اس موقع پر کیا جاتا ہے جہاں مقصود خدا کے باب میں کسی سوئے ظن یا غلط فہمی کو رفع کرنا ہو۔ یہاں واقعۂ معراج کی تمہید اس لفظ سے اس لیے اٹھائی ہے کہ یہ واقعہ بھی خدا کے باب میں یہود اور مشرکین کے ایک بہت بڑے سوء ظن کو رفع کرنے والا تھا۔ یہ دونوں ہی گروہ خدا کے دین کے دو سب سے بڑے مرکزوں پر قابض تھے اور ان کو انھوں نے، ان کے بنیادی مقصد کے بالکل خلاف، نہ صرف شرک و بت پرستی کا اڈا بلکہ جیسا کہ سیدنا مسیحؑ نے فرمایا ہے کہ 'تم نے میرے باپ کے گھر کو چوروں کا بھٹ بنا ڈالا ہے'، ان کو انھوں نے چوروں اور خائنوں کا بھٹ ہی بنا ڈالا تھا۔ یہ دونوں ہی مقدس گھر بالکل خائنوں اور

بے ایمانوں کے تصرف میں تھے[1] اور یہ ان میں اسی طرح اپنی من مانی کر رہے تھے گویا ان گھروں کا اصل مالک کانوں میں تیل ڈال کر اور آنکھوں پر پٹی باندھے سو رہا ہے اور اب کبھی وہ اس کی خبر لینے کے لیے بیدار ہی نہیں ہوگا۔ معراج کا واقعہ، جیسا کہ ہم نے پیچھے اشارہ کیا ہے، اس بات کی تمہید تھا، کہ اب ان گھروں کی امانت اس کے سپرد ہونے والی ہے جو ان کے اصل مقصد تعمیر کو پورا کرے گا اس وجہ سے اس کے بیان کا آغاز سُبْحٰنَ کے لفظ سے فرمایا اور آیت کے آخر میں اپنی صفات اِنَّہٗ ھُوَ السَّمِیْعُ الْبَصِیْرُ کا حوالہ دے کر یہ واضح فرما دیا کہ جو نادان خدا کو نعوذ باللہ اندھا اور بہرا سمجھے بیٹھے تھے اب وہ اپنے کان اور اپنی آنکھیں کھولیں۔ اب ان کی عدالت کا وقت آ گیا ہے۔ حقیقی سمیع و بصیر خدا ہی ہے اور اب وہ اپنے کامل علم و خبر کی روشنی میں لوگوں کا انصاف کرے گا۔

عبد سے مراد آنحضرت صلعم

اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ لَیْلًا ’اسرار‘ کے معنی شب میں سفر کرنے کے ہیں اور جب ’ب‘ کے ذریعے سے یہ متعدی ہو جائے تو اس کے معنی شب میں کسی کو کہیں لے جانے کے ہیں۔ اگرچہ اس کے مفہوم میں شب میں نکلنے یا لے جانے کا مفہوم خود داخل ہے لیکن عام استعمال میں یہ لفظ کبھی کبھی اس مفہوم سے مجرد ہو جایا کرتا ہے اس وجہ سے ’لَیْلًا‘ کی قید سے اس بات کو مؤکد کرنا مقصود ہے کہ یہ واقعہ شب ہی میں پیش آیا۔

’بِعَبْدِہٖ‘ میں ’عبد‘ سے مراد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ اس موقع پر حضورؐ کے لیے اس لفظ کا استعمال اللہ تعالیٰ کے ساتھ حضورؐ کے غایت درجہ اختصاص، آپؐ کے ساتھ اللہ کی غایت درجہ محبت اور آپؐ کے کمال درجہ عبدیت کی دلیل ہے۔ گویا آپؐ کی ذات کسی اور تعریف و تعارف کی محتاج نہیں ہے۔ لفظ عبد نے خود انگلی اٹھا کر ساری خدائی میں سے اس کو ممیز کر دیا جو اس لفظ کا حقیقی محمل و مصداق ہے۔

مسجد حرام اور مسجد اقصیٰ سے مراد

مِنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَی الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا الَّذِیْ بٰرَکْنَا حَوْلَہٗ ’مسجد حرام‘ سے تو ظاہر ہے کہ خانہ کعبہ مراد ہے۔ رہی دوسری مسجد تو اس کا تعارف دو صفتوں سے کرایا ہے۔ ایک ’اقصیٰ‘ دوسری ’الَّذِیْ بٰرَکْنَا حَوْلَہٗ‘۔ ’اقصیٰ‘ کے معنی ہیں دور والی۔ یہ مسجد حرم مکہ کے باشندوں سے، جو اس کلام کے مخاطب اول ہیں کم و بیش ۴۰ دن کی مسافت پر یروشلم میں تھی اس وجہ سے اس کو اقصیٰ کی صفت سے موصوف فرمایا تاکہ ذہن آسانی سے اس کی طرف منتقل ہو سکے۔ پھر ’الَّذِیْ بٰرَکْنَا حَوْلَہٗ‘ کی صفت اس کے ساتھ لگا کر اس سرزمین کی طرف بھی اشارہ کر دیا جس میں یہ مسجد واقع ہے۔ یہ اس سرزمین کی روحانی اور مادی دونوں قسم کی زرخیزیوں کی طرف اشارہ ہے۔ قدیم صحیفوں میں اس سرزمین کو دودھ اور شہد کی سرزمین کہا گیا ہے۔ جو اس کی انتہائی زرخیزی کی تعبیر ہے روحانی برکات کے اعتبار سے اس کا جو درجہ تھا اس کا اندازہ کرنے کے لیے یہ بات کافی ہے کہ جتنے انبیاء کا مولد و مدفن ہونے کا شرف اس سرزمین کو حاصل ہوا ہے کسی دوسرے علاقے کو حاصل نہیں ہوا۔

---

[1] مسجد اقصیٰ کی حالت کا اندازہ کرنے کے لیے تو حضرت مسیحؑ کے الفاظ ہی کافی ہیں۔ اگر حرم ابراہیمی کی حالت کا اندازہ کرنا ہو تو فراہیؒ کی تفسیر سورۂ لہب پر ایک نظر ڈال لیجیے کہ ابولہب نے اس میں کیا اودھم مچا رکھی تھی۔

معراج کے سفر کی غایت

لِنُرِیَهٗ مِنْ اٰیٰتِنَا۔ یہ اس سفر کی غایت بیان ہوئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ چاہا کہ اپنے بندے کو اپنی کچھ نشانیاں دکھائے۔ اسلوب بیان کی یہ بلاغت ملحوظ رہے کہ اوپر کی بات غائب کے صیغہ سے بیان ہوئی ہے جو تفخیم شان پر دلیل ہے اور یہاں صیغہ متکلم کا آگیا ہے جو التفات خاص کو ظاہر کر رہا ہے۔ فرمایا کہ ہم نے یہ سفر اس لیے کرایا تاکہ اپنے بندے کو اپنی کچھ نشانیاں دکھائیں۔ یہ نشانیاں کیا تھیں اس کا کوئی ذکر یہاں نہیں ہے لیکن قرینہ دلیل ہے کہ اس سے مراد وہ آثار و مشاہد اور وہ انوار و برکات ہیں جن سے یہ دونوں ہی گھر معمور تھے۔ مقصود ان کے دکھانے سے ظاہر ہے کہ یہی ہو سکتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر اللہ تعالیٰ کی یہ مرضی واضح ہو جائے کہ اب یہ ساری امانت ناقدروں اور بدعہدوں سے چھین کر آپ کے حوالے کی جانے والی ہے۔ گویا دعوت کے اس انتہائی مشکل دور میں آپ کو اللہ کی مدد و نصرت کی جو بشارت دی جا رہی تھی معراج کے اس سفر نے اس پر ایک مزید مہر تصدیق ثبت کر دی اور جو کچھ ہونے والا تھا وہ آپ کو دکھا بھی دیا گیا۔

نبی کو دکھائے

رہا یہ سوال کہ یہ جو کچھ آپ کو دکھایا گیا رویا میں دکھایا گیا یا بیداری میں تو اس سوال کا جواب اسی سورہ میں آگے قرآن نے خود دے دیا ہے۔ فرمایا ہے۔

وَمَا جَعَلْنَا الرُّءْيَا الَّتِیْٓ اَرَيْنٰكَ اِلَّا فِتْنَةً لِّلنَّاسِ ۔ ۶۰　　　اور ہم نے اس رویا کو جو ہم نے تمہیں دکھائی لوگوں کے لیے فتنہ ہی بنا دی۔

ظاہر ہے کہ یہاں جس رویا کی طرف اشارہ ہے اس سے اس رویا کے سوا کوئی اور رویا مراد لینے کی کوئی گنجائش نہیں ہے جس کا ذکر آیت زیر بحث میں لِنُرِیَهٗ مِنْ اٰیٰتِنَا کے الفاظ سے ہوا ہے۔ لفظ اراءت قرآن میں متعدد مقامات میں، رویا میں دکھانے کے لیے آیا بھی ہے اور مفسرین نے اس سے یہی رویا مراد بھی لی ہے۔ اس وجہ سے اس کا رویا ہونا تو اپنی جگہ پر واضح بھی ہے اور مسلم بھی لیکن یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ رویا کو خواب کے معنی میں لینا کسی طرح صحیح نہیں ہے۔ خواب تو خواب پریشان بھی ہوتے ہیں لیکن حضرات انبیاء علیہم السلام کو جو رویا دکھائی جاتی ہے وہ رویائے صادقہ ہوتی ہے۔ اس کے متعدد امتیازی پہلو ہیں جو ذہن میں رکھنے کے ہیں۔

رویائے صادقہ کے امتیازی پہلو

پہلی چیز تو یہ ہے کہ رویائے صادقہ وحی الٰہی کے ذرائع میں سے ایک ذریعہ ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے نبیوں اور رسولوں پر جس طرح فرشتے کے ذریعے سے کلام کی صورت میں اپنی وحی نازل فرماتا ہے اسی طرح کبھی رویا کی صورت میں بھی ان کی رہنمائی فرماتا ہے۔

دوسری چیز یہ ہے کہ یہ رویا نہایت واضح، غیر مبہم اور روشن صورت میں کَفَلَقِ الصُّبْحِ ہوتی ہے جس پر نبی کو پورا شرح صدر اور اطمینان قلب ہوتا ہے۔ اگر اس میں کوئی چیز تمثیلی رنگ میں بھی ہوتی ہے تو اس کی تعبیر بھی اللہ تعالیٰ اپنے نبی پر واضح فرما دیتا ہے۔

تیسری چیز یہ ہے کہ جہاں واقعات و حقائق کا مشاہدہ کرانا مقصود ہو وہاں یہی ذریعہ نبی کے لیے زیادہ اطمینان بخش ہوتا ہے اس لیے کہ اس طرح واقعات کی پوری تفصیل مشاہدہ میں آجاتی ہے اور وہ معانی و حقائق

بھی ممثل ہو کر سامنے آجاتے ہیں جو الفاظ کی گرفت میں مشکل ہی سے آتے ہیں۔

چوتھی چیز یہ ہے کہ رویا کا مشاہدہ چشم سر کے مشاہدہ سے زیادہ قطعی، زیادہ وسیع اور اس سے ہزارہا درجہ عمیق اور دور رس ہوتا ہے۔ آنکھ کو مغالطہ پیش آسکتا ہے لیکن رویائے صادقہ مغالطہ سے پاک ہوتی ہے، آنکھ ایک محدود دائرہ ہی میں دیکھ سکتی ہے لیکن رویا بیک وقت نہایت وسیع دائرہ پر محیط ہو جاتی ہے، آنکھ حقائق و معانی کے مشاہدے سے قاصر ہے، اس کی رسائی مرئیات ہی تک محدود ہے۔ لیکن رویا معانی و حقائق اور انوار و تجلیات کو بھی اپنی گرفت میں لے لیتی ہے۔ حضرت موسیٰؑ نے تجلی الٰہی اپنی آنکھوں سے دیکھنی چاہی لیکن وہ اس کی تاب نہ لاسکے۔ برعکس اس کے ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو شب معراج میں جو مشاہدے کرائے گئے وہ سب آپؐ نے کیے اور کہیں بھی آپ کی نگاہیں خیرہ نہیں ہوئیں۔

اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ کا موقع و محل اوپر واضح کیا جا چکا ہے۔ اس کے اندر حصر کا پہلو ہے۔ وہ اس حقیقت کے اظہار کے لیے ہے کہ حقیقی سمیع و بصیر خدا ہی ہے۔ اس کے سمع و بصر سے کوئی چیز بھی مخفی نہیں ہے۔ اگر دوسروں کو اس میں سے کوئی حصہ ملا ہے تو وہ خدا ہی کا عطا کردہ اور نہایت محدود ہے۔ مقصود ان صفات کا حوالہ دینے سے، جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا، مشرکین قریش اور بنی اسرائیل دونوں کو تنبیہ کرنا ہے کہ خدا کو اپنی کرتوتوں سے بے خبر نہ سمجھو، وہ ہر چیز کو دیکھ اور سن رہا ہے۔

۲۔ آگے کا مضمون ــــــ آیات ۲-۸

یہود کے کبر و غرور پر ضرب

آگے کی آیات میں یہود کے اس غرور پر ضرب لگائی گئی ہے کہ وہ اسرائیل کی اولاد اور خدا کے محبوب اور چہیتے ہیں اس وجہ سے مذہبی پیشوائی ان کا اجارہ ہے۔ یہود اپنے اس غرور کے سبب سے اول تو اپنے خاندان سے باہر کسی کی نبوت و رسالت تسلیم کرنے کے لیے تیار ہی نہیں تھے اس وجہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے شروع ہی سے شدید مخالف تھے، پھر جب آپؐ نے شب معراج کے مشاہدات بیان کیے اور وہ ان کے علم میں آئے تو ان کا پارہ اور چڑھ گیا کہ یہ لو، یہ شخص ہمارے نبیوں کی وراثت اور ہماری امامت کا بھی مدعی بن بیٹھا۔ قرآن نے ان کے دماغ سے یہ ہوا نکالنے کے لیے یہ حقیقت واضح فرمائی کہ اللہ تعالیٰ کے فضل و رحمت کا استحقاق کسی قوم کو بھی نسل و نسب کی بنا پر حاصل نہیں ہوتا بلکہ ایمان و عمل صالح کی بنا پر حاصل ہوتا ہے۔ اور اس پر خود انہی کی تاریخ کی شہادت پیش کی ہے کہ خود تمہارے صحیفوں میں ہے کہ تم دو مرتبہ بڑے پیمانہ پر خدا سے بغاوت کرو گے اور زمین میں فساد مچاؤ گے اور دونوں مرتبہ خدا تم پر اپنے سخت گیر بندے مسلط کردے گا جو تمہارا کچومر نکال دیں گے۔ چنانچہ یہ پیشین گوئیاں حرف بحرف پوری ہوئیں۔ جب تم نے اصلاح کی ہے خدا نے تم پر رحمت کی ہے اور جب تم نے فساد مچایا ہے خدا نے تم پر اپنے عذاب کے کوڑے برسائے ہیں۔ یہی مرحلہ اس وقت بھی تمہارے سامنے ہے۔ ہمارے رسول کی دعوت نے تمہارے لیے صلاح و فلاح کی

راہ کھول دی ہے۔ اگر تم نے یہ دعوت قبول کر لی تو اس کی برکتوں میں برابر کے حصہ دار ہو گے اور اگر تم نے یہ دعوت رد کر دی تو یاد رکھو کہ ہم کہیں چلے نہیں گئے ہیں، ہم پھر تمہاری اسی طرح خبر لیں گے جس طرح اس سے پہلے لے چکے ہیں۔ آیات تلاوت کیجیے۔

آیات ۲-۸

وَاٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَجَعَلْنٰهُ هُدًى لِّبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اَلَّا تَتَّخِذُوْا
مِنْ دُوْنِيْ وَكِيْلًا ۝۲ ذُرِّيَّةَ مَنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوْحٍ ۭ اِنَّهٗ كَانَ
عَبْدًا شَكُوْرًا ۝۳ وَقَضَيْنَآ اِلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ فِي الْكِتٰبِ
لَتُفْسِدُنَّ فِي الْاَرْضِ مَرَّتَيْنِ وَلَتَعْلُنَّ عُلُوًّا كَبِيْرًا ۝۴ فَاِذَا
جَاۗءَ وَعْدُ اُوْلٰىهُمَا بَعَثْنَا عَلَيْكُمْ عِبَادًا لَّنَآ اُولِيْ بَاْسٍ شَدِيْدٍ
فَجَاسُوْا خِلٰلَ الدِّيَارِ ۭ وَكَانَ وَعْدًا مَّفْعُوْلًا ۝۵ ثُمَّ رَدَدْنَا لَكُمُ
الْكَرَّةَ عَلَيْهِمْ وَاَمْدَدْنٰكُمْ بِاَمْوَالٍ وَّبَنِيْنَ وَجَعَلْنٰكُمْ اَكْثَرَ
نَفِيْرًا ۝۶ اِنْ اَحْسَنْتُمْ اَحْسَنْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ ۣ وَاِنْ اَسَاْتُمْ فَلَهَا ۭ
فَاِذَا جَاۗءَ وَعْدُ الْاٰخِرَةِ لِيَسُوْۗءٗا وُجُوْهَكُمْ وَلِيَدْخُلُوا الْمَسْجِدَ
كَمَا دَخَلُوْهُ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّلِيُتَبِّرُوْا مَا عَلَوْا تَتْبِيْرًا ۝۷ عَسٰى رَبُّكُمْ
اَنْ يَّرْحَمَكُمْ ۚ وَاِنْ عُدْتُّمْ عُدْنَا ۘ وَجَعَلْنَا جَهَنَّمَ لِلْكٰفِرِيْنَ وقف لازم
حَصِيْرًا ۝۸

ترجمۂ آیات ۲-۸

اور ہم نے موسیٰ کو کتاب عطا کی اور اس کو بنی اسرائیل کے لیے ہدایت نامہ بنایا کہ میرے سوا کسی کو معتمد نہ بنائیو، اے ان لوگوں کی اولاد جن کو ہم نے نوح کے ساتھ سوار کرایا، بے شک وہ ایک شکر گزار بندہ تھا۔ ۲-۳

اور ہم نے بنی اسرائیل کو اپنے اس فیصلہ سے کتاب میں آگاہ کر دیا تھا کہ تم دو مرتبہ زمین میں

فساد مچاؤ گے اور بہت سر اٹھاؤ گے۔ پس جب ان میں سے پہلی بار کی میعاد آ جاتی ہے تو ہم تم پر اپنے زور آور بندے مسلط کر دیتے ہیں تو وہ گھروں میں گھس پڑے اور شدنی وعدہ پورا ہو کے رہا۔ پھر ہم نے تمھاری باری ان پر لوٹائی اور تمھاری مال اور اولاد سے مدد کی اور تمھیں ایک کثیر التعداد جماعت بنا دیا۔ اگر تم بھلے کام کرو گے تو اپنے لیے کرو گے اور اگر برے کام کرو گے تو بھی اپنے ہی لیے۔ پھر جب پچھلی بار کی میعاد آ جاتی ہے تو ہم تم پر اپنے زور آور بندے مسلط کر دیتے ہیں کہ وہ تمھارے چہرے بگاڑ دیں اور تاکہ وہ مسجد میں گھس پڑیں جس طرح پہلی بار گھس پڑے تھے اور تاکہ جس چیز پر ان کا زور چلے اسے تہس نہس کر ڈالیں۔ کیا عجب کہ تمھارا رب تم پر رحم فرمائے اور اگر تم پھر وہی کرو گے تو ہم بھی وہی کریں گے اور ہم نے جہنم کو تو کافروں کے لیے باڑا بنا ہی رکھا ہے۔ ۴-۸

۳۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَاٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَجَعَلْنٰهُ هُدًى لِّبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اَلَّا تَتَّخِذُوْا مِنْ دُوْنِيْ وَكِيْلًا (۲)

وکیل کے معنی کارساز اور معتمد

'کتاب' سے مراد تورات ہے اور 'وکیل' کے معنی کارساز، معتمد اور اس ذات کے ہیں جس پر کامل بھروسہ کر کے اپنے معاملات اس کے حوالہ کر دیے جائیں۔

یہود کے بگاڑ کی تاریخ

یہ آیت تمہید ہے یہود کے اس بگاڑ اور فساد کے بیان کی جو آگے کی آیات میں آ رہا ہے۔ فرمایا کہ ہم نے موسیٰ کو کتاب عطا کی اور اس کو بنی اسرائیل کے لیے صحیفۂ ہدایت بنایا جس میں صاف یہ ہدایت درج تھی کہ میرے سوا کسی کو کارساز اور معتمد نہ بنائیو۔ مقصود اس کا حوالہ دینے سے یہ واضح کرنا ہے کہ انھوں نے اللہ تعالیٰ کے اس اہتمام ہدایت کی کوئی قدر نہیں کی۔ اس کے صحیفۂ ہدایت کو پیٹھ پیچھے پھینک دیا اور شرک سے بچتے رہنے کی صریح ہدایت کے باوجود شرک کی نجاستوں اور آلودگیوں میں مبتلا ہوئے۔

تورات میں توحید کی تعلیم

کتاب کے ذکر کے بعد توحید کی تعلیم کا حوالہ اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ یہی چیز تمام تعلیماتِ دین کے لیے مرکزِ ثقل کی حیثیت رکھتی ہے۔ اسی پر تمام شریعت کی بنیاد بھی ہے اور اسی کے ساتھ وابستہ رہنے تک کوئی جماعت دین سے وابستہ بھی رہتی ہے۔ جہاں اس مرکزِ ثقل سے وابستگی کمزور ہوئی پھر بالتدریج سارا دین غارت

ہو کے رہ جاتا ہے۔

یہ امر محتاج بیان نہیں ہے کہ تورات توحید کی تعلیم سے بھری پڑی ہے۔ حوالے نقل کرنے میں طوالت ہوگی اس وجہ سے ہم صرف ایک حوالہ پر اکتفا کرتے ہیں۔ خروج ۲۰ : ۲ میں ہے۔

"خداوند تیرا خدا جو تجھے زمین مصر سے غلامی کے گھر سے نکال لایا، میں ہوں۔ میرے حضور تیرے لیے دوسرا خدا نہ ہووے۔ تو اپنے لیے کوئی مورت یا کسی چیز کی صورت جو اوپر آسمان پر یا نیچے زمین پر یا پانی میں زمین کے نیچے سے مت بنا۔ تو ان کے آگے اپنے تئیں مت جھکا اور نہ ان کی عبادت کر کیونکہ میں خداوند تیرا خدا غیور خدا ہوں"

قرآن کے الفاظ اَلَّا تَتَّخِذُوْا مِنْ دُوْنِیْ وَكِيْلًا اور تورات کے الفاظ "میرے حضور تیرے لیے دوسرا خدا نہ ہووے" میں کتنی مطابقت ہے لیکن ان واضح ہدایات کے باوجود یہود بار بار شرک و بت پرستی میں مبتلا ہوئے جس پر ان کے نبیوں نے نہایت درد انگیز الفاظ میں ماتم بھی کیا ہے اور یہود کو ملامت بھی کی ہے۔ سیدنا مسیحؑ نے تو یہود کو مخاطب کر کے یہاں تک فرما دیا کہ "تو تو وہ ہے کہ تو نے پہلی شب میں چھنالا کیا"

ذُرِّيَّةَ مَنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوْحٍ ؕ اِنَّهٗ كَانَ عَبْدًا شَكُوْرًا (۳)

حرف ندا یہاں محذوف ہے۔ یعنی توحید کی اس تعلیم کے ساتھ ساتھ ان کو یہ یاد دہانی بھی کر دی گئی تھی کہ اس بات کو ہمیشہ مستحضر رکھنا کہ تم ان باقیات الصالحات کی نسل سے ہو جن کو اللہ نے نوحؑ کے ساتھ ان کی کشتی میں بچایا۔ نوحؑ اللہ کے ایک شکر گزار بندے تھے تو تم بھی انہی کی طرح خدا کے شکر گزار اور اس کی توحید پر قائم رہنا ورنہ یاد رکھو کہ جس طرح اللہ نے قوم نوحؑ کے وجود سے، اس کے شرک کی پاداش میں، اپنی زمین کو پاک کر دیا اسی طرح تمہارے وجود سے بھی اپنی زمین کو پاک کر دے گا۔

وَقَضَيْنَاۤ اِلٰى بَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ فِى الْكِتٰبِ لَتُفْسِدُنَّ فِى الْاَرْضِ مَرَّتَيْنِ وَلَتَعْلُنَّ عُلُوًّا كَبِيْرًا (۴)

عربیت کا ایک اسلوب

'قَضَيْنَا' کے بعد 'اِلٰی' کا صلہ عربیت کے قاعدے سے اس بات کی دلیل ہے کہ یہاں 'اَبْلَغْنَا' یا اس کے ہم معنی کوئی لفظ محذوف ہے۔ یعنی ہم نے فیصلہ کر کے بنی اسرائیل کو اپنے اس فیصلے سے آگاہ کر دیا تھا۔

یہود کے دو بڑے فسادات

'فِی الْكِتٰبِ' میں 'الکتاب' کا لفظ یہاں تمام اسفار یہود پر مشتمل ہے۔ قرآن میں یہ لفظ تورات کے لیے بھی آیا ہے اور دوسرے انبیاء بنی اسرائیل کے صحیفوں کے لیے بھی۔ آیت میں یہود کے جن دو بڑے فسادات اور ان کے انجام کی خبر دی گئی ہے ان میں سے پہلے فساد اور اس کے عبرت انگیز انجام سے حضرت داؤد، یسعیاہ، یرمیاہ اور حزقی ایل علیہم السلام نے آگاہ فرمایا اور دوسرے فساد اور اس کے عواقب سے سیدنا مسیحؑ نے ڈرایا۔ 'فساد' سے مراد جیسا کہ ہم دوسرے مقامات میں واضح کر چکے ہیں، خدا کی توحید اور اس کی شریعت سے بغاوت ہے۔ اس قسم کے فسادات سے لو تو یہود کی پوری تاریخ بھری پڑی ہے چنانچہ ایک فساد کی تفصیل سورۂ بقرہ میں تابوت کے چھن جانے کے واقعہ سے متعلق بھی گزر چکی ہے لیکن

یہاں جن فسادات کا حوالہ ہے وہ ایسے فسادات ہیں کہ ان کے نتائج نے یہود کی پوری قوم کو ذلیل و پامال کر کے رکھ دیا۔ حضرت داؤدؑ نے پہلے فساد اور اس کے انجام کی جن لفظوں میں پیشین گوئی فرمائی تھی وہ یہ ہیں۔

> انھوں نے (یعنی بنی اسرائیل نے) ان قوموں کو (یعنی مشرک قوموں کو) ہلاک نہ کیا، جیسا کہ خداوند نے ان کو حکم دیا تھا بلکہ ان قوموں کے ساتھ مل گئے اور ان کے سے کام سیکھ گئے اور ان کے بتوں کی پرستش کرنے لگے جو ان کے لیے پھندا بن گئے بلکہ انھوں نے اپنی بیٹیوں کو شیاطین کے لیے قربان کیا اور معصوموں کا یعنی اپنے بیٹوں اور بیٹیوں کا خون بہایا .... اس لیے خدا کا قہر اپنے لوگوں پر بھڑکا اور اسے اپنی میراث سے (یعنی بنی اسرائیل سے) نفرت ہو گئی اور اس نے ان کو قوموں کے قبضے میں کر دیا اور ان سے عداوت رکھنے والے ان پر حکمران بن گئے۔
>
> زبور باب ۱۰۶ آیات ۳۴-۴۱

دوسرے فساد کی پیشین گوئی کے سلسلہ میں سیدنا مسیحؑ کے الفاظ یہ ہیں۔

> "میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ یہاں کسی پتھر پر پتھر باقی نہ رہے گا جو گرایا نہ جائے۔"
>
> متی باب ۲۴ آیت ۲

لوقا میں ہے۔

> "اے یروشلم کی بیٹیو! میرے لیے نہ روؤ بلکہ اپنے لیے اور اپنے بچوں کے لیے روؤ کیونکہ دیکھو وہ دن آتے ہیں جب کہیں گے کہ مبارک ہیں بانجھیں اور وہ پیٹ جو نہ جنے اور وہ چھاتیاں جنھوں نے دودھ نہ پلایا۔ اس وقت وہ پہاڑوں سے کہنا شروع کریں گے کہ ہم پر گر پڑو اور ٹیلوں سے کہیں گے کہ ہمیں چھپا لو۔"
>
> باب ۲۳ آیات ۲۸-۳۰

آیت کے آخر میں 'نُعَذِّبُكُمْ مَرَّتَيْنِ' یا اس کے ہم معنی الفاظ حذف ہیں۔ گویا پوری بات یوں ہے کہ ہم نے بنی اسرائیل کو اپنے اس فیصلہ سے کتاب میں آگاہ کر دیا تھا کہ تم زمین میں دو مرتبہ فساد مچاؤ گے اور بہت سر اٹھاؤ گے اور ہم دونوں مرتبہ تم کو سخت سزا دیں گے۔ چونکہ یہ بات بالکل واضح بھی تھی نیز اس کی پوری تفصیل آگے کی آیات میں آ رہی تھی اس وجہ سے یہاں اس کو حذف فرما دیا۔

فَإِذَا جَاءَ وَعْدُ أُولَاهُمَا بَعَثْنَا عَلَيْكُمْ عِبَادًا لَّنَا أُولِي بَأْسٍ شَدِيدٍ فَجَاسُوا خِلَالَ الدِّيَارِ وَكَانَ وَعْدًا مَّفْعُولًا (۵)

'اِذَا' صرف مستقبل ہی کے لیے نہیں آتا بلکہ بیان عادت و سنت اور بعض اوقات تصویر حال کے لیے بھی آتا ہے۔ یہاں تصویر حال ہی کے لیے ہے۔ ہم نے ترجمے میں اس کو ملحوظ رکھا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ چنانچہ دیکھو جب پہلی بار کی میعاد آ جاتی ہے تو ہم تمھیں اپنے عذاب کا مزا چکھانے کے

لیے اپنے زور آور بندوں کو ابھار کر تم پر مسلط کر دیتے ہیں جو تمہارے گھروں میں گھس پڑتے ہیں اور خدا کا شدنی وعدہ پورا ہو کے رہتا ہے۔

'بعث'، کا صلہ جب 'علیٰ' کے ساتھ آتے تو وہ ابھارنے اور اکسانے کے ساتھ ساتھ مسلط کر دینے کے مفہوم پر بھی متضمن ہو جاتا ہے۔

یہود کی توہین و تذلیل کی تصویر

'فَجَاسُوا خِلٰلَ الدِّیَارِ' یہ یہود کی انتہائی توہین و تذلیل کی تصویر ہے اس لیے کہ جب دشمن اتنا زور آور ہو کہ وہ گھروں کے اندر گھس پڑے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ اس نے عزت و ناموس ہر چیز کو تاراج کر کے رکھ دیا۔ یہاں صرف اتنے ہی کے ذکر پر اکتفا فرمایا ہے اس لیے کہ ذلت کی تصویر کے لیے یہی کافی تھا لیکن آگے اس بات کا حوالہ بھی آتے گا کہ اس دشمن نے صرف گھروں میں گھسنے ہی پر بس نہیں کیا بلکہ مسجد اقصیٰ کی حرمت بھی پوری طرح برباد کی۔

بخت نصر کا حملہ اور یہود کی غلامی

یہ اشارہ بابل و نینوا کے بادشاہ بخت نصر یا نبوکد نضر کے حملہ کی طرف ہے جس نے ۵۸۶ قبل مسیح میں یروشلم کی اینٹ سے اینٹ بجا دی تھی۔

یرمیاہ نبی نے اس کی پیشین گوئی یوں فرمائی تھی۔

"رب الافواج یوں کہتا ہے۔ اس لیے کہ تم نے میری باتیں نہ سنیں دیکھ میں اتر کے سارے گھرانوں کو اپنے خدمت گزار شاہ بابل نبوکد نضر کو بلا بھیجوں گا۔"

یرمیاہ ۲۵ : ۸-۹

ان کے انذار کی مزید تفصیل سنیے۔

"میں ایسا کروں گا کہ ان کے درمیان خوشی کی آواز اور خرمی کی آواز، دولہے کی آواز دلہن کی آواز، چکی کی آواز اور چراغ کی روشنی باقی نہ رہے اور یہ ساری سرزمین ویرانہ اور حیرانی کا باعث ہو جائے گی اور یہ قومیں ستر برس تک بابل کے بادشاہ کی غلامی کریں گی۔"

یرمیاہ ۲۵ : ۹-۱۰

یرمیاہ نبی کا نوحہ سنیے:۔

"خداوند نے صیہون کی بیٹی کو اپنے قہر کے ابر تلے چھپا دیا۔ اس نے اسرائیل کے جمال کو آسمان سے زمین پر پٹک دیا اور اپنے قہر کے دن اپنے پاؤں رکھنے کی کرسی کو یاد نہ کیا۔ خداوند نے یعقوب کے سارے مکانوں کو غارت کیا اور رحم نہ کیا۔ اس نے اپنے قہر میں یہوداہ کی بیٹی کے قلعوں کو ڈھا دیا۔ اس نے انہیں خاک کے برابر کر دیا۔ اس نے بادشاہت اور امیروں کو ناپاک کیا۔ اس نے اپنے قہر شدید میں اسرائیل کا ہر ایک سینگ بالکل کاٹ ڈالا۔"

یرمیاہ کا نوحہ ۲ : ۱-۳

آیت میں بخت نصر (یا نبوکد نضر) اور اس کی فوجوں کے لیے عِبَادًا لَّنَآ اُولِیْ بَاْسٍ شَدِیْدٍ (اپنے زور آور بندے) کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ یہ ان کے دین اور تقویٰ کے اعتبار سے نہیں استعمال ہوئے ہیں بلکہ صرف اس حیثیت سے استعمال ہوئے ہیں کہ انھوں نے خدا کے ارادہ کے اجرا و نفاذ کے لیے آلہ و جارحہ کا کام دیا۔ یہ اگرچہ خود گندے تھے لیکن گندگی کے ایک بہت بڑے ڈھیر کو صاف کرنے میں انھوں نے مشیت الٰہی کی تنفیذ کی اس وجہ سے انھیں بھی فی الجملہ خدا سے نسبت حاصل ہو گئی۔ بنی اسرائیل کو غرہ تھا کہ نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ (ہم خدا کے محبوب اور چہیتے ہیں)۔ خدا نے ان پر واضح کر دیا کہ جن جوتوں سے تم پٹے ہو وہ تو خدا کی نظروں میں کچھ وقعت رکھتے ہیں لیکن تم کوئی وقعت نہیں رکھتے۔

ثُمَّ رَدَدْنَا لَكُمُ الْكَرَّةَ عَلَيْهِمْ وَاَمْدَدْنٰكُمْ بِاَمْوَالٍ وَّبَنِيْنَ وَجَعَلْنٰكُمْ اَكْثَرَ نَفِيْرًا (۶)

ایک عرصہ کی غلامی اور بدحالی کے بعد بنی اسرائیل میں کچھ اصلاح حال کا جذبہ ابھرا تو اللہ تعالیٰ نے بھی ان کی طرف توجہ فرمائی، ان کے مال و اولاد میں برکت دی اور تائید الٰہی ان کے لیے اس شکل میں ظاہر ہوئی کہ خارائے اول سائرس شاہ ایران نے ۵۳۹ ق م میں کلدانیوں کو شکست دے کر ان کے ملک پر قبضہ کر لیا اور یہود کو جلاوطنی سے نجات دے کر وطن جانے اور اسے دوبارہ آباد کرنے کی اجازت دے دی، جس کے بعد بنی اسرائیل کو از سر نو خاصا فروغ حاصل ہوا۔

اِنْ اَحْسَنْتُمْ اَحْسَنْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ وَاِنْ اَسَاْتُمْ فَلَهَا ۭ فَاِذَا جَاۗءَ وَعْدُ الْاٰخِرَةِ لِيَسُوْۗءٗا
وُجُوْهَكُمْ وَلِيَدْخُلُوا الْمَسْجِدَ كَمَا دَخَلُوْهُ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّلِيُتَبِّرُوْا مَا عَلَوْا
تَتْبِيْرًا (۷)

ٹائٹس کے ہاتھوں یہود کی دوسری تباہی

'اِنْ اَحْسَنْتُمْ .... الاٰیۃ' یعنی ایک طویل غلامی کے بعد یہ جو نجات حاصل ہوئی تھی اس کے اندر خود یہ درس مضمر تھا کہ اب اگر تم بھلائی کی روش اختیار کرو گے تو اس کا نفع خود اپنے ہی کو پہنچاؤ گے اور اگر پھر وہی سرکشی کی روش اختیار کرو گے تو اس کا انجام بھی ویسا ہی بھگتو گے۔ یہ نوشتہ دیوار بھی موجود تھا اور اس سے تمھارے نبیوں نے بھی تمھیں اچھی طرح آگاہ کر دیا تھا لیکن ہوا وہی جس کی پیشین گوئی پہلے ہو چکی تھی یعنی تم اسی طرح کے فساد میں پھر مبتلا ہو گئے جس طرح کے فساد میں پہلے مبتلا ہوئے تھے چنانچہ جب تمھاری سرکوبی کی دوسری میعاد آ جاتی ہے تو ہم تم پر اپنے دوسرے زور آور بندے مسلط کر دیتے ہیں تاکہ وہ تمھارے چہرے بگاڑ دیں اور تاکہ یہ بھی مسجد میں اسی طرح گھس جائیں جس طرح پہلے والے گھس گئے تھے اور تاکہ یہ ہر اس چیز کو تہس نہس کر کے رکھ دیں جس پر ان کا زور چلے۔

'لِيَسُوْۗءٗا وُجُوْهَكُمْ' سے پہلے 'بَعَثْنَا عَلَيْكُمْ عِبَادًا لَّنَآ اُولِيْ بَاْسٍ شَدِيْدٍ' کے الفاظ محذوف ہیں۔ چونکہ اس کا قرینہ واضح تھا اس وجہ سے اس کو حذف کر دیا اور 'لِيَسُوْۗءٗا' پر جو لام ہے وہ اس کی طرف انگلی اٹھا کر اشارہ کر رہا ہے۔

بائبل ہسٹری کے مطالعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ اس تباہی کی طرف اشارہ ہے جو سنہ ء میں رومی شاہنشاہ طیطاؤس (ٹائیٹس) کے ہاتھوں یہود پر آئی، جس کی طرف حضرت مسیح نے اشارہ فرمایا تھا۔

عَسٰی رَبُّكُمْ اَنْ یَّرْحَمَكُمْ ۚ وَ اِنْ عُدْتُّمْ عُدْنَا ۘ وَ جَعَلْنَا جَهَنَّمَ لِلْكٰفِرِیْنَ حَصِیْرًا (۸)

'حَصِیْرٌ' کا ٹھیک ترجمہ باڑا ہے جس میں جانوروں کو بند کرتے ہیں۔

یہ ان یہود سے خطاب ہے جو ان آیات کے نزول کے وقت موجود اور قرآن کی مخالفت میں کفار قریش کی ہمنوائی و پشت پناہی کر رہے تھے۔ ان سے خطاب کر کے فرمایا جا رہا ہے کہ ماضی میں جو کچھ ہو چکا ہے وہ تمہیں سنایا جا چکا۔ اب اگر خیریت چاہتے ہو تو اس نبی امی (صلی اللہ علیہ وسلم) کی دعوت نے تمہارے لیے نجات کی جو راہ کھولی ہے، اس کو اختیار کرو، اور اپنے مستقبل کو سنوار لو۔ اگر تم نے توبہ اور اصلاح کی راہ اختیار کر لی تو خدا بھی تم پر رحم فرمائے گا اور اگر تم نے پھر اسی طرح کی حرکتیں کیں جیسی کہ پہلے کرتے آئے ہو تو ہم بھی تمہاری اسی طرح خبر لیں گے جس طرح پہلے لے چکے ہیں اور یہ بھی یاد رکھو کہ اس دنیا میں جو ذلت و رسوائی ہوئی ہے وہ تو ہو گی ہی۔ آگے تمہارے جیسے کافروں کے لیے جہنم کا باڑا ہے جس میں سارے کے سارے بھر دیے جائیں گے۔ | نبی صلعم کی یہود کیلیے نجات

اس آیت کے تیور لحاظ رکھنے کے قابل ہیں۔ پہلے تو بات غائب کے صیغے سے فرمائی۔ پھر 'وَاِنْ عُدْتُّمْ عُدْنَا' میں متکلم کا صیغہ آ گیا۔ پہلے ٹکڑے میں بے پروائی کا انداز ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر تم یہ صحیح راہ اختیار کر لو گے تو اپنے ہی کو نفع پہنچاؤ گے اور اگر نہ اختیار کرو گے تو اپنی ہی شامت کو دعوت دو گے، خدا کا کچھ نہیں بگاڑو گے۔ دوسرے ٹکڑے میں نہایت ہی سخت وعید ہے اس وجہ سے اول تو متکلم کا صیغہ آیا جو تہدید و وعید کے لیے زیادہ موزوں ہے پھر اس میں ابہام و اجمال بھی ہے۔ یہ تو بتایا کہ ہم لوٹیں گے، یہ نہیں بتایا کہ ہم کس شکل میں لوٹیں گے۔ یہ بات سمجھنے والوں کی سمجھ پر چھوڑ دی ہے اور اس جملے کی ساری شدت اس ابہام کے اندر مضمر ہے۔

۴۔ آگے کا مضمون ـــــ آیات ۹-۳۱

آگے کی آیات میں مشرکین قریش اور یہود دونوں کو اس قرآن پر ایمان لانے کی دعوت دی گئی ہے جو فطرت کی اسی صراط مستقیم کی دعوت دے رہا ہے جس کی دعوت تمام انبیاءؑ نے دی ہے۔ اس دعوت پر ایمان لانے والوں اور اس کی تکذیب کرنے والوں، دونوں کا انجام واضح فرما دیا گیا ہے اور ان لوگوں کو ملامت کی گئی ہے جو آفاق میں پھیلی ہوئی نشانیوں اور قرآن کی واضح آیات سے آنکھیں بند کیے ہوئے عذاب کی نشانیوں کا مطالبہ کر رہے

ہیں ۔ اسی ذیل میں بالاجمال اس سنت الٰہی کی وضاحت کر دی گئی ہے جو قوموں کو عذاب دینے کے معاملے میں اللہ تعالیٰ نے اختیار فرمائی ہے ۔۔۔ آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۹-۲۱

إِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَهْدِيْ لِلَّتِيْ هِيَ اَقْوَمُ وَيُبَشِّرُ الْمُؤْمِنِيْنَ الَّذِيْنَ
يَعْمَلُوْنَ الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ اَجْرًا كَبِيْرًا ﴿۹﴾ وَّاَنَّ الَّذِيْنَ لَا
ع ۱۰ ۱ يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ اَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ﴿۱۰﴾ وَيَدْعُ
الْاِنْسَانُ بِالشَّرِّ دُعَآءَهٗ بِالْخَيْرِ ۭ وَكَانَ الْاِنْسَانُ عَجُوْلًا ﴿۱۱﴾
وَجَعَلْنَا الَّيْلَ وَالنَّهَارَ اٰيَتَيْنِ فَمَحَوْنَآ اٰيَةَ الَّيْلِ وَجَعَلْنَآ
اٰيَةَ النَّهَارِ مُبْصِرَةً لِّتَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلِتَعْلَمُوْا عَدَدَ
السِّنِيْنَ وَالْحِسَابَ ۭ وَكُلَّ شَيْءٍ فَصَّلْنٰهُ تَفْصِيْلًا ﴿۱۲﴾ وَكُلَّ
اِنْسَانٍ اَلْزَمْنٰهُ طٰۗىِٕرَهٗ فِيْ عُنُقِهٖ ۭ وَنُخْرِجُ لَهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ
كِتٰبًا يَّلْقٰىهُ مَنْشُوْرًا ﴿۱۳﴾ اِقْرَاْ كِتٰبَكَ ۭ كَفٰى بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ
حَسِيْبًا ﴿۱۴﴾ ۭ مَنِ اهْتَدٰى فَاِنَّمَا يَهْتَدِيْ لِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ ضَلَّ فَاِنَّمَا
يَضِلُّ عَلَيْهَا ۭ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ۭ وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ
حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا ﴿۱۵﴾ وَاِذَآ اَرَدْنَآ اَنْ نُّهْلِكَ قَرْيَةً اَمَرْنَا مُتْرَفِيْهَا
فَفَسَقُوْا فِيْهَا فَحَقَّ عَلَيْهَا الْقَوْلُ فَدَمَّرْنٰهَا تَدْمِيْرًا ﴿۱۶﴾ وَكَمْ
اَهْلَكْنَا مِنَ الْقُرُوْنِ مِنْۢ بَعْدِ نُوْحٍ ۭ وَكَفٰى بِرَبِّكَ بِذُنُوْبِ عِبَادِهٖ
خَبِيْرًۢا بَصِيْرًا ﴿۱۷﴾ مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعَاجِلَةَ عَجَّلْنَا لَهٗ فِيْهَا مَا
نَشَاۗءُ لِمَنْ نُّرِيْدُ ثُمَّ جَعَلْنَا لَهٗ جَهَنَّمَ ۚ يَصْلٰىهَا مَذْمُوْمًا

مَّدْحُوْرًا ﴿١٨﴾ وَمَنْ اَرَادَ الْاٰخِرَةَ وَسَعٰى لَهَا سَعْيَهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ
فَاُولٰٓئِكَ كَانَ سَعْيُهُمْ مَّشْكُوْرًا ﴿١٩﴾ كُلًّا نُّمِدُّ هٰٓؤُلَآءِ وَهٰٓؤُلَآءِ مِنْ
عَطَآءِ رَبِّكَ ۭ وَمَا كَانَ عَطَآءُ رَبِّكَ مَحْظُوْرًا ﴿٢٠﴾ اُنْظُرْ كَيْفَ
فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ۭ وَلَلْاٰخِرَةُ اَكْبَرُ دَرَجٰتٍ وَّاَكْبَرُ
تَفْضِيْلًا ﴿٢١﴾

ترجمۂ آیات ۹-۲۱

بے شک یہ قرآن اس راستے کی رہنمائی کرتا ہے جو بالکل سیدھا ہے اور ان ایمان والوں کو جو نیک عمل کرتے ہیں اس بات کی بشارت دیتا ہے کہ ان کے لیے بہت بڑا اجر ہے اور جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے، ہم نے ان کے لیے ایک دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔ ۹-۱۰

اور انسان برائی کا اس طرح طالب بنتا ہے جس طرح اس کو بھلائی کا طالب بننا چاہیے اور انسان بڑا ہی جلد باز ہے اور ہم نے رات اور دن کو دو نشانیاں بنایا، سو ہم نے رات کی نشانی تو دھندلی کر دی اور ہم نے دن کی نشانی کو روشن بنایا تاکہ تم اپنے رب کے فضل کے لیے کوشش کرو اور تاکہ تم سالوں کی تعداد اور حساب معلوم کر سکو اور ہم نے ہر چیز کی پوری پوری تفصیل کر دی ہے۔ ۱۱-۱۲

اور ہم نے ہر انسان کا نصیبہ اس کے گلے کے ساتھ باندھ دیا ہے اور ہم قیامت کے روز اس کے لیے ایک رجسٹر نکالیں گے جس کو وہ بالکل کھلا ہوا پائے گا۔ لو، پڑھ لو اپنا اعمال نامہ! آج تم خود ہی اپنا حساب کر لینے کے لیے کافی ہو۔ جو ہدایت کی راہ چلتا ہے تو وہ اپنے ہی لیے ہدایت کی راہ چلتا ہے اور جو گمراہی اختیار کرتا ہے تو وہ اپنے ہی اوپر وبال لاتا ہے اور کوئی

جان کسی دوسری جان کا بوجھ اٹھانے والی نہیں بنے گی اور ہم عذاب دینے والے نہیں تھے جب تک کسی رسول کو بھیج نہ لیں۔ ۱۲-۱۵

اور جب ہم کسی بستی کو ہلاک کرنا چاہتے ہیں تو ہم اس کے خوش حالوں کو امر کر دیتے ہیں تو وہ اس میں خوب اودھم مچاتے ہیں۔ پس ان پر بات پوری ہو جاتی ہے پھر ہم اس کو بالکل نیست و نابود کر کے رکھ دیتے ہیں۔ اور نوح کے بعد ہم نے کتنی ہی قومیں ہلاک کر دیں اور تمھارا رب اپنے بندوں کے گناہوں سے باخبر رہنے اور ان کو دیکھنے کے لیے کافی ہے۔ ۱۶-۱۷

جو دنیا ہی کا طالب بنتا ہے ہم اس کے لیے اسی میں جس قدر چاہتے ہیں، جس کے لیے چاہتے ہیں، آگے بڑھا دیتے ہیں۔ پھر ہم نے اس کے لیے جہنم رکھ چھوڑی ہے جس میں وہ خوار اور راندہ ہو کر داخل ہوگا۔ اور جو آخرت کا طالب بنتا ہے اور اس کے شایانِ شان کوشش بھی کرتا ہے اور وہ مومن بھی ہے تو درحقیقت یہی لوگ ہیں جن کی سعی مقبول ہوگی۔ ہم تیرے پروردگار کی بخشش سے ہر ایک کی مدد کرتے ہیں، ان کی بھی اور ان کی بھی۔ اور تیرے رب کی بخشش کسی پر بند نہیں۔ دیکھو ہم نے ان کے ایک کو دوسرے پر کس طرح فضیلت دے رکھی ہے اور آخرت درجات اور فضیلت کے اعتبار سے کہیں بڑھ کر ہے۔ ۱۸-۲۱

۵۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

إِنَّ هَٰذَا الْقُرْآنَ يَهْدِي لِلَّتِي هِيَ أَقْوَمُ وَيُبَشِّرُ الْمُؤْمِنِينَ الَّذِينَ يَعْمَلُونَ الصَّالِحَاتِ أَنَّ لَهُمْ أَجْرًا كَبِيرًا ۝ وَأَنَّ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ أَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابًا أَلِيمًا (۹-۱۰)

اَقْوَمُ کا مفہوم اَقْوَم کے معنی سیدھا اور مستقیم یعنی وہ راستہ جو ٹھیک فطرت اور عقل کے مطابق اور خدا تک پہنچنے اور پہنچانے والا ہے۔

یہود اور مشرکین کو قرآن پر ایمان لانے کی دعوت

یہ بنی اسرائیل اور مشرکین قریش دونوں کو قرآن پر ایمان لانے کی دعوت ہے کہ اگر خدا تک پہنچنا چاہتے ہو تو پیچ پیچ کی وادیوں میں بھٹکنے کے بجائے اس راستہ کو اختیار کرو جس کی طرف قرآن بلا رہا ہے۔ یہ ان لوگوں کو اجر عظیم کی خوش خبری دیتا ہے جو اس پر ایمان لا کر عمل صالح کی زندگی اختیار کریں۔ جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے اور اس کے سبب سے اس قرآن کو بھی ٹھکرا رہے ہیں ان کے لیے ایک دردناک عذاب ہے۔

وَيَدْعُ الْاِنْسَانُ بِالشَّرِّ دُعَآءَهٗ بِالْخَيْرِ ؕ وَكَانَ الْاِنْسَانُ عَجُوْلًا (۱۱)

یہ حالت انہی مخالفین قرآن کی بیان ہوئی ہے جو اس پر ایمان لانے کے بجائے کسی نشانیٔ عذاب کا مطالبہ کر رہے تھے۔ یہ مطالبہ چونکہ نہایت احمقانہ اور خود ان کے حق میں نہایت مہلک تھا اس وجہ سے بات ان سے منہ پھیر کر عام الفاظ میں بانداز تاسف فرما دی گئی کہ انسان کا عجیب حال ہے کہ جس سرگرمی کے ساتھ اس کو خیر کا طالب ہونا چاہیے اس سرگرمی کے ساتھ وہ اپنے لیے آفت اور تباہی کا مطالبہ کرتا ہے۔ یہ مہلت جو ان لوگوں کو ملی ہوئی ہے اس سے فائدہ اٹھانے اور اپنی زندگی کو بنانے سنوارنے کے بجائے یہ چاہتے ہیں کہ جلد سے جلد اس عذاب ہی کو دیکھ لیں جس سے ان کو آگاہ کیا جا رہا ہے۔

وَجَعَلْنَا الَّيْلَ وَالنَّهَارَ اٰيَتَيْنِ فَمَحَوْنَآ اٰيَةَ الَّيْلِ وَجَعَلْنَآ اٰيَةَ النَّهَارِ مُبْصِرَةً لِّتَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِيْنَ وَالْحِسَابَ ؕ وَكُلَّ شَيْءٍ فَصَّلْنٰهُ تَفْصِيْلًا (۱۲)

اس آیت کے پہلے ٹکڑے میں فَمَحَوْنَآ اٰيَةَ الَّيْلِ کے بعد مُظْلِمَةً لِّتَسْتَرِيْحُوْا یا اس کے ہم معنی الفاظ حذف ہیں جن پر بعد کے الفاظ مُبْصِرَةً لِّتَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ روشنی ڈال رہے ہیں۔ یعنی ہم نے شب کو تاریک بنایا تاکہ تم اس میں راحت حاصل کرو اور دن کو روشن بنایا تاکہ تم اس میں خدا کے رزق و فضل کے طالب بنو۔

عذاب کی نشانی کے طالبوں کے لیے آفاقی نشانیاں

یہ عذاب کی نشانی مانگنے والوں کو آفاق کی نشانیوں کی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ اگر نشانی ہی مطلوب ہے تو یہ کیا ضرور ہے کہ کوئی عذاب ہی کی نشانی آئے آخر یہ رات اور رات کے بعد دن کے طلوع کو کیوں نہیں دیکھتے کیا یہ کچھ کم نشانی ہے؟ رات آتی ہے تو تمہارے لیے راحت اور سکون کا بستر بچھا دیتی ہے جس میں تم دن کے تھکے ماندے آرام کر کے از سر نو چاق و چوبند ہو جاتے ہو، اسی لیے خدا نے اس کو تاریک اور پر سکون بنایا ہے۔ پھر دن آتا ہے جس میں تم تازہ دم ہو کر اپنی معاشی سرگرمیوں اور خدا کے رزق و فضل کی طلب میں سرگرم ہوتے ہو چنانچہ اسی لیے تمہارے پروردگار نے اس کو روشن بنایا ہے۔

وَلِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِيْنَ وَالْحِسَابَ۔ روز و شب کی یکے بعد دیگرے، پابندیٔ اوقات کے ساتھ، آمد و شد کا یہ ایک مزید فائدہ بتا دیا کہ اس طرح تم مہینوں اور سالوں کا حساب بھی معلوم کر لیتے ہو اور دوسرے حساب بھی جان لیتے ہو۔ اگر یہ روز و شب کا فرق نہ ہوتا تو آخر کسی چیز کے تعین کے لیے تم نشان اور علامت امتیاز کس چیز کو ٹھہراتے؟

وَكُلَّ شَيْءٍ فَصَّلْنٰهُ تَفْصِيْلًا۔ یعنی آفاق کی ان نشانیوں کے علاوہ ہم نے تم پر یہ احسان بھی کیا ہے کہ

اپنی اس کتاب میں بھی ہر ضروری چیز کی تفصیل کر دی ہے تاکہ غور کرنے والے کے اطمینان کے لیے یہ کتاب ہی کافی ہو جائے۔

یہاں یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ رات اور دن کی آمد و شد سے جس حقیقت کی طرف یہاں توجہ دلائی گئی ہے قرآن نے صرف اسی پر بس نہیں کیا ہے بلکہ دوسرے مقامات پر اس کے مزید پہلو واضح فرمائے ہیں، مثلاً تضاد کے باوجود ان کے درمیان جو توافق ہے اس سے توحید پر استدلال کیا ہے۔ رات کے بعد صبح کی آمد سے حشر و نشر کی طرف توجہ دلائی ہے۔ ان چیزوں کی تفصیل پیچھے بھی اس کتاب میں گزر چکی ہے اور آگے بھی ان کی تفصیلات آئیں گی۔

وَكُلَّ إِنسَانٍ أَلْزَمْنَاهُ طَائِرَهُ فِي عُنُقِهِ ۖ وَنُخْرِجُ لَهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ كِتَابًا يَلْقَاهُ مَنشُورًا ۝ اقْرَأْ كِتَابَكَ كَفَىٰ بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيبًا (۱۳-۱۴)

'طائر' کا مفہوم

'طائر' کے اصل معنی تو پرندے کے ہیں لیکن اہل عرب پرندوں سے چونکہ فال بھی لیتے تھے اور اپنے زعم کے مطابق ان سے قسمت بھی معلوم کرتے تھے اس وجہ سے یہ لفظ قسمت، حظ اور نصیبہ کے معنی میں استعمال ہونے لگا۔

یہ عذاب کے لیے جلدی مچانے والوں کو تنبیہ ہے کہ اگر یہ جلدی یہ اپنے مزعوم شرکاء و شفعاء کے بل پر مچائے ہوئے ہیں تو انہیں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ ہم نے ہر انسان کا نصیبہ اس کی گردن کے ساتھ لٹکا رکھا ہے جس نے جو کچھ کیا ہو گا اس کی پوری تفصیل ایک کھلے ہوئے رجسٹر کی صورت میں اس کے سامنے موجود ہو گی اور ہم اس سے کہیں گے کہ تم اپنا اعمال نامہ خود ہی پڑھ لو، تم اپنے حساب کے لیے خود ہی کافی ہو، اس میں کسی اور کی دخل اندازی کی ضرورت نہیں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ حساب کے دن کوئی بھی کسی دوسرے کا بوجھ اٹھانے والا نہیں بنے گا۔ ہر ایک کے اعمال اس کے سامنے ہوں گے اور ہر ایک کو اپنا بوجھ خود ہی اٹھانا ہو گا۔

مَّنِ اهْتَدَىٰ فَإِنَّمَا يَهْتَدِي لِنَفْسِهِ ۖ وَمَن ضَلَّ فَإِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا ۚ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ أُخْرَىٰ ۗ وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِينَ حَتَّىٰ نَبْعَثَ رَسُولًا (۱۵)

اتمام حجت کے لیے رسول کی بعثت

یہ اوپر کے مضمون ہی کی مزید وضاحت ہے کہ جو ہدایت کی راہ اختیار کرے گا اپنے ہی نفع کے لیے کرے گا اور جو گمراہی کی راہ چلے گا اس کا انجام خود ہی بھگتے گا۔ کوئی دوسری جان کسی دوسرے کا بوجھ اٹھانے والی نہیں بنے گی۔ 'وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِينَ ...... الآیۃ' یہ اس سنت الٰہی کی طرف اشارہ ہے جو قوموں پر عذاب کے معاملے میں اللہ تعالیٰ نے ہمیشہ اختیار فرمائی ہے۔ وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے عذاب بھیجنے سے پہلے اتمام حجت کے لیے اپنے رسول بھیجے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ عذاب کے لیے تم کیا جلدی مچائے ہوئے ہو! اس کا ایک مرحلہ تو طے ہو چکا کہ اتمام حجت کے لیے خدا کا رسول تمہارے پاس آ گیا۔ اب تو عذاب کے آنے میں صرف اتنی کسر باقی ہے کہ تم پر حجت تمام ہو جائے۔ تمہاری شامت ہی ہو گی اگر تم نے اس فرصت سے فائدہ نہ اٹھایا۔

وَإِذَا أَرَدْنَا أَن نُّهْلِكَ قَرْيَةً أَمَرْنَا مُتْرَفِيهَا فَفَسَقُوا فِيهَا فَحَقَّ عَلَيْهَا الْقَوْلُ فَدَمَّرْنَاهَا تَدْمِيرًا (۱۶)

'امر' کا مفہوم

'اَمَر' صرف حکم دینے ہی کے معنی میں نہیں آتا بلکہ بسا اوقات کسی کو ڈھیلا چھوڑ دینے اور مہلت دے دینے کے مفہوم میں بھی آتا ہے۔ آپ کسی شخص یا گروہ سے افہام و تفہیم کی کوشش کرنے کے بعد جب تنگ آ جاتے ہیں تو کہہ دیتے ہیں کہ 'اِفْعَلُوْا مَا بَدَا لَكُمْ' جاؤ، جو تمہارے جی میں آئے کرو۔ بظاہر یہ امر ہی کا صیغہ استعمال ہوتا ہے لیکن اس کا مفہوم اِمہال ہوتا ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ بھی سرکش لوگوں پر اپنی حجت تمام کر چکنے کے بعد ان کو ڈھیلا چھوڑ دیتا ہے کہ وہ اپنا پیمانہ اچھی طرح سے بھر لیں۔

'مُتْرَفِیْن' کسی قوم کے کھاتے پیتے خوش حال طبقہ کو کہتے ہیں۔ چونکہ قوم کی باگ انہی کے ہاتھ میں ہوتی ہے اس وجہ سے سنتِ الٰہی یہ رہی ہے کہ حضرات انبیاء علیہم السلام نے اپنی دعوتِ اصلاح میں سب سے پہلے اسی طبقہ کو خطاب کیا ہے۔ پھر جب اس طبقہ نے اپنی ضد اور ہٹ دھرمی سے نہ صرف ان کو مایوس کر دیا ہے بلکہ ان کے قتل کے درپے ہو گیا ہے تو نبی نے ہجرت فرمائی اور قوم عذابِ الٰہی کی گرفت میں آ گئی ہے۔

یہ عذاب کے معاملے میں سنتِ الٰہی کی مزید وضاحت ہے۔ فرمایا کہ جب ہم کسی بستی کو ہلاک کرنا چاہتے ہیں تو اس کے خوش حالوں کو ڈھیلا چھوڑ دیتے ہیں تو وہ اس میں خوب کھل کر خدا کی نافرمانیاں اور بدمستیاں کرتے تا آنکہ ان پر حجت تمام ہو جاتی ہے اور ان کا پیمانہ لبریز ہو جاتا ہے۔ پھر خدا ان کو پکڑتا ہے اور اس بستی کو تہ و بالا کر کے رکھ دیتا ہے۔

وَكَمْ أَهْلَكْنَا مِنَ الْقُرُونِ مِن بَعْدِ نُوحٍ ۗ وَكَفَىٰ بِرَبِّكَ بِذُنُوبِ عِبَادِهِ خَبِيرًا بَصِيرًا (۱۷)

یہ اسی مذکورہ سنتِ الٰہی کی تائید میں پچھلی تاریخ کا حوالہ ہے کہ نوحؑ کے بعد ہم نے کتنی ہی قوموں کو ہلاک کیا ہے، اگر یہ لوگ دیدۂ عبرت رکھتے ہیں تو ان کے حالات سے سبق لیں۔ پھر پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی ہے کہ وہ تمہاری قوم کے سرکشوں کے جرائم سے بھی اچھی طرح باخبر ہے اور سارے حالات کو دیکھ رہا ہے۔ جب وقت آ جائے گا تو وہ ان کا فیصلہ کرنے میں بھی دیر نہیں لگائے گا۔

مَن كَانَ يُرِيدُ الْعَاجِلَةَ عَجَّلْنَا لَهُ فِيهَا مَا نَشَاءُ لِمَن نُّرِيدُ ثُمَّ جَعَلْنَا لَهُ جَهَنَّمَ يَصْلَاهَا مَذْمُومًا مَّدْحُورًا (۱۸)

'عاجلۃ' کا مفہوم

'عَاجِلَة' آخرت کا مقابل لفظ ہے یعنی یہ دنیا اور اس کا نفع عاجل۔

امہال کے باب میں سنتِ الٰہی

یہ امہال کے باب میں سنتِ الٰہی بیان ہو رہی ہے کہ جو لوگ آخرت کو یک قلم نظر انداز کر کے صرف اسی دنیا اور اس کے نفع عاجل کے طلب گار بنتے ہیں خدا ان کو بھی محروم نہیں کرتا بلکہ ان میں سے بھی جس کے لیے چاہتا ہے اور جتنا چاہتا ہے دے دیتا ہے۔ البتہ آخرت میں ان کا کوئی حصہ نہیں ہو گا۔ ایسے لوگوں کا حصہ آخرت میں صرف جہنم ہے جس میں وہ مذموم و مطرود ہو کر داخل ہوں گے۔

اس آیت میں 'مَا نَشَآءُ لِمَنْ نُّرِيْدُ' کے الفاظ خاص طور پر نگاہ میں رکھنے کے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ یہ بات بھی دنیا طلبوں کے اپنے اختیار میں نہیں ہے کہ جو شخص اس دنیا میں جتنا چاہے حاصل کر لے بلکہ یہ معاملہ کلیۃً خدا ہی کے اختیار میں ہے۔ وہی جس کو چاہتا ہے جتنا چاہتا ہے دیتا ہے۔

وَمَنْ اَرَادَ الْاٰخِرَةَ وَسَعٰى لَهَا سَعْيَهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ كَانَ سَعْيُهُمْ مَّشْكُوْرًا (۱۹)

اصل فائز المرام گروہ

یہ آخرت کے طلبگاروں اور اصل فائز المرام گروہ کا بیان ہے۔ فرمایا کہ جو لوگ آخرت کے طالب بنتے ہیں اور اس کے شایانِ شان کوشش بھی کرتے ہیں اور ان کے سینے ایمان سے بھی منور ہیں، درحقیقت یہی لوگ ہیں جن کی سعی عند اللہ مقبول ہوگی۔ مطلب یہ ہے کہ ایسے لوگ اس دنیا میں سے بھی جو کچھ ان کے لیے مقدر ہے پاتے ہیں اور آخرت تو ان کی کامیابی کا گھر ہے ہی۔

اس آیت میں بھی 'وَسَعٰى لَهَا سَعْيَهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ' کے الفاظ خاص طور پر نگاہ میں رکھنے کے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ آخرت صرف تمنا کرنے سے نہیں مل جائے گی، بلکہ اس کے لیے اس کے شایانِ شان کوشش بھی مطلوب ہے اور ساتھ ہی شرک کی ہر آمیزش سے پاک ایمان بھی۔ جب تک یہ دونوں چیزیں طلبِ آخرت کے ساتھ نہیں ہوں گی اس وقت تک یہ تمنا لاحاصل ہی رہے گی۔

كُلًّا نُّمِدُّ هٰٓؤُلَآءِ وَهٰٓؤُلَآءِ مِنْ عَطَآءِ رَبِّكَ ۭ وَمَا كَانَ عَطَآءُ رَبِّكَ مَحْظُوْرًا (۲۰)

رب کی عطاء و بخشش عام ہے

لفظ 'کل' جب مختلف جماعتوں کے ذکر کے بعد اس طرح آئے جس طرح یہاں آیا ہے تو وہ معرفہ کے حکم میں ہو جاتا ہے۔ یعنی اس سے وہ جماعتیں مراد ہوتی ہیں جن کا ذکر پہلے ہو چکا ہوتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تمہارے رب کی عطاء و بخشش کا دروازہ مذکورہ دونوں گروہوں میں سے کسی پر بھی بند نہیں۔ جو لوگ آخرت سے بالکل بے پروا رات دن دنیا ہی کی طلب میں سرگرم ہیں، ان کو بھی خدا اس دنیا میں سے جو کچھ ان کے لیے مقدر کر رکھا ہے، دیتا ہے۔ یہ نہیں کرتا کہ ان کی خدا فراموشی اور آخرت فراموشی کے جرم میں ان کو دنیا سے محروم کر دے۔ اسی طرح جو لوگ آخرت کے طالب بنتے ہیں خدا اس دنیا میں سے ان کا مقدر حصہ دیتا ہے۔ یہ نہیں کرتا کہ دنیا سے بے پروائی کے سبب سے ان کو دنیا سے محروم کر دے بلکہ ان کو اس دنیا میں سے بھی ان کا حصہ دیتا ہے اور آخرت میں بھی وہ اپنی کوششوں کا بھرپور صلہ پائیں گے۔ مطلب یہ ہے کہ جب اصل حقیقت یہ ہے تو آدمی اس فانی اور حقیر دنیا کے پیچھے اپنے آپ کو آخرت کی ابدی اور لازوال نعمتوں سے کیوں محروم کرے۔ وہ راستہ کیوں نہ اختیار کرے جس پر چل کر آخرت کی ابدی نعمتوں کا بھی حقدار بنے اور اس دنیا میں سے بھی جو کچھ اس کے لیے مقدر ہے اس سے بہرہ مند ہو۔

اُنْظُرْ كَيْفَ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ۭ وَلَلْاٰخِرَةُ اَكْبَرُ دَرَجٰتٍ وَّاَكْبَرُ تَفْضِيْلًا (۲۱)

یعنی دیکھ لو یہ حقیقت اپنی جگہ پر بالکل واضح ہے کہ خدا ہی نے جس کو چاہا ہے زیادہ دیا ہے اور جس کو چاہا ہے کم دیا ہے۔ یہ انسان کے اپنے اختیار میں نہیں ہے کہ وہ جتنا چاہے حاصل کر لے۔ اسی طرح آخرت میں بھی تمام اختیار خدا ہی کے ہاتھ میں ہوگا، وہی جس کو چاہے گا عزت دے گا اور جس کو چاہے گا ذلت دے گا کسی

دوسرے کو وہاں یہ زور و اثر حاصل نہیں ہوگا کہ وہ اس کے فیصلوں پر اثر انداز ہو سکے۔ یہ آخرت اپنے درجات و مراتب کے لحاظ سے اس دنیا کے درجات و مراتب کے لحاظ سے کہیں بڑھ چڑھ کر ہوگی تو جس کو کوشش کرنی ہو وہ اس کے درجات و مراتب کا طالب بنے اور اس کے لیے کوشش کرے، اس دنیا کے پیچھے آخرت کو کیوں برباد کرے۔

۶۔ آگے کا مضمون ____ آیات ۲۲-۳۹

اور آپ نے دیکھا کہ آیت ۹ میں یہ فرما کر کہ اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَهْدِيْ لِلَّتِيْ هِيَ اَقْوَمُ ..... الایۃ (یہ قرآن اس راستے کی طرف رہنمائی کرتا ہے جو سیدھا ہے) کلام کا رخ بعض دوسری متعلق باتوں کی طرف مڑ گیا تھا۔ اب پھر کلام اپنے اصل سلسلہ سے مربوط ہو گیا اور قرآن خدا تک پہنچنے کے جس راستے کی طرف رہنمائی کرتا ہے اس کی وضاحت شروع ہو گئی۔ یہی راستہ فطرت اور عقل کا سیدھا راستہ ہے اور یہی اس عدل و احسان کی زندگی کو وجود میں لاتا ہے جو خدا کو پسند ہے اور جس پر صالح معاشرہ اور صالح تمدن کی بنیاد ہے۔ یہاں سورۂ نحل کی آیت ۹۰ ذہن میں پھر تازہ کر لیجیے جس میں قرآن کے اوامر و نواہی کی اساسات واضح کی گئی ہیں۔ اس لیے کہ آگے کی آیات اسی اجمال کی شرح کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِيْتَآئِ ذِي الْقُرْبٰى وَيَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْيِ ...... الایۃ ___ آگے آیات کی تلاوت کیجیے۔

ع ۲/۱۲ لَا تَجْعَلْ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ فَتَقْعُدَ مَذْمُوْمًا مَّخْذُوْلًا ﴿۲۲﴾ وَ
۲ آیات ۲۲-۳۹ قَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ؕ اِمَّا
يَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ اَحَدُهُمَآ اَوْ كِلٰهُمَا فَلَا تَقُلْ لَّهُمَآ اُفٍّ
وَّلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُلْ لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيْمًا ﴿۲۳﴾ وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ
الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَقُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِيْ صَغِيْرًا ﴿۲۴﴾
رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَا فِيْ نُفُوْسِكُمْ ؕ اِنْ تَكُوْنُوْا صٰلِحِيْنَ فَاِنَّهٗ كَانَ
لِلْاَوَّابِيْنَ غَفُوْرًا ﴿۲۵﴾ وَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ وَالْمِسْكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ
وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِيْرًا ﴿۲۶﴾ اِنَّ الْمُبَذِّرِيْنَ كَانُوْٓا اِخْوَانَ الشَّيٰطِيْنِ ؕ وَكَانَ
الشَّيْطٰنُ لِرَبِّهٖ كَفُوْرًا ﴿۲۷﴾ وَاِمَّا تُعْرِضَنَّ عَنْهُمُ ابْتِغَآءَ رَحْمَةٍ مِّنْ

رَبِّكَ تَرْجُوْهَا فَقُلْ لَّهُمْ قَوْلًا مَّيْسُوْرًا ﴿٢٨﴾ وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُوْلَةً
اِلٰى عُنُقِكَ وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُوْمًا مَّحْسُوْرًا ﴿٢٩﴾
اِنَّ رَبَّكَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَقْدِرُ ۭ اِنَّهٗ كَانَ بِعِبَادِهٖ
خَبِيْرًۢا بَصِيْرًا ﴿٣٠﴾ وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ ۭ نَحْنُ ع
نَرْزُقُهُمْ وَاِيَّاكُمْ ۭ اِنَّ قَتْلَهُمْ كَانَ خِطْاً كَبِيْرًا ﴿٣١﴾ وَلَا تَقْرَبُوا
الزِّنٰٓى اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً ۭ وَسَاۗءَ سَبِيْلًا ﴿٣٢﴾ وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ
الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ ۭ وَمَنْ قُتِلَ مَظْلُوْمًا فَقَدْ جَعَلْنَا
لِوَلِيِّهٖ سُلْطٰنًا فَلَا يُسْرِفْ فِّي الْقَتْلِ ۭ اِنَّهٗ كَانَ مَنْصُوْرًا ﴿٣٣﴾ وَلَا
تَقْرَبُوْا مَالَ الْيَتِيْمِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِىَ اَحْسَنُ حَتّٰى يَبْلُغَ اَشُدَّهٗ ۠ وَاَوْفُوْا
بِالْعَهْدِ ۚ اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْـُٔوْلًا ﴿٣٤﴾ وَاَوْفُوا الْكَيْلَ اِذَا كِلْتُمْ
وَزِنُوْا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيْمِ ۭ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِيْلًا ﴿٣٥﴾ وَلَا
تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ۭ اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ
اُولٰۗىِٕكَ كَانَ عَنْهُ مَسْـُٔوْلًا ﴿٣٦﴾ وَلَا تَمْشِ فِي الْاَرْضِ مَرَحًا ۚ اِنَّكَ
لَنْ تَخْرِقَ الْاَرْضَ وَلَنْ تَبْلُغَ الْجِبَالَ طُوْلًا ﴿٣٧﴾ كُلُّ ذٰلِكَ كَانَ
سَيِّئُهٗ عِنْدَ رَبِّكَ مَكْرُوْهًا ﴿٣٨﴾ ذٰلِكَ مِمَّآ اَوْحٰٓى اِلَيْكَ رَبُّكَ
مِنَ الْحِكْمَةِ ۭ وَلَا تَجْعَلْ مَعَ اللّٰهِ اِلٰـهًا اٰخَرَ فَتُلْقٰى فِيْ جَهَنَّمَ مَلُوْمًا
مَّدْحُوْرًا ﴿٣٩﴾

ترجمۂ آیات ۲۲-۳۹

اللہ کے ساتھ کسی دوسرے معبود کو شریک نہ کر کہ تو سزاوار مذمت اور دھتکارا ہو کر رہ جائے

اور تیرے رب کا فیصلہ یہ ہے کہ اس کے سوا کسی اور کی بندگی نہ کرو اور ماں باپ کے ساتھ نہایت اچھا سلوک کرو۔ اگر وہ تیرے سامنے بڑھاپے کو پہنچ جائیں، ان میں سے ایک یا دونوں، تو نہ ان کو اف کہو اور نہ ان کو جھڑکو اور ان سے شریفانہ بات کہو اور ان کے لیے رحمدلانہ اطاعت کے بازو جھکائے رکھو اور دعا کرتے رہو کہ اے میرے رب اِن پر رحم فرما، جیسا کہ انھوں نے بچپن میں مجھے پالا۔ تمہارا رب جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے اس سے خوب واقف ہے۔ اگر تم سعادت مند رہو گے تو وہ رجوع کرنے والوں کو بڑا بخشنے والا ہے۔ ۲۳-۲۵

اور تم قرابت دار کو اس کا حق دو اور مسکین اور مسافر کو بھی اور مال کو اللے تللے نہ اڑاؤ۔ اللے تللے اڑا دینے والے شیطانوں کے بھائی ہوتے ہیں اور شیطان اپنے رب کا بڑا ہی ناشکرا ہے۔ اور اگر تمھیں اپنے رب کے فضل کے انتظار میں، جس کے تم متوقع ہو، ان سے اعراض کرنا پڑ جائے تو تم ان سے نرمی کی بات کہہ دو۔ اور نہ تو اپنے ہاتھ کو اپنی گردن سے باندھے رکھو اور نہ اس کو بالکل کھلا ہی چھوڑ دو کہ ملامت زدہ اور درماندہ ہو کر بیٹھ رہو۔ بے شک تمہارا رب ہی ہے جو رزق کو جس کے لیے چاہتا ہے کشادہ کرتا ہے اور جس کے لیے چاہتا ہے تنگ کر دیتا ہے، بے شک وہی اپنے بندوں کی خبر رکھنے والا اور ان کو دیکھنے والا ہے۔ ۲۶-۳۰

اور تم اپنی اولاد کو ناداری کے اندیشہ سے قتل نہ کرو، ہم ہی ان کو بھی رزق دیتے ہیں اور تم کو بھی۔ بے شک ان کا قتل بہت بڑا جرم ہے۔ اور زنا کے پاس بھی نہ پھٹکو۔ کیونکہ یہ کھلی ہوئی بے حیائی اور نہایت بری راہ ہے۔ اور جس جان کو خدا نے محترم ٹھہرایا اس کو قتل مت کرو مگر حق پر اور جو ظلماً قتل کیا گیا تو ہم نے اس کے ولی کو اختیار دیا تو وہ قتل میں حدود سے تجاوز نہ کرے کیونکہ اس کی مدد کی گئی ہے۔ اور یتیم کے مال کے پاس بھی نہ پھٹکو مگر اس طریقہ سے جو اس کے حق میں

بہتر ہے، یہاں تک کہ وہ اپنے سن بلوغ کو پہنچ جائے اور عہد کو پورا کرو کیونکہ عہد کی پرسش ہونی ہے۔ اور جب تم ناپو تو ناپ پوری رکھو اور وزن صحیح ترازو سے کرو۔ یہی بہتر اور مآل کار کے اعتبار سے خوب تر ہے اور جس چیز کا تمہیں علم نہیں اس کے درپے نہ ہوا کرو۔ کیونکہ کان، آنکھ اور دل، ان میں سے ہر ایک چیز کی پرسش ہونی ہے اور زمین میں اکڑ کر نہ چلو، نہ تم زمین کو پھاڑ سکتے ہو اور نہ پہاڑوں کے طول کو پہنچ سکتے ہو۔ ان ساری باتوں کی برائی تمہارے رب کے نزدیک نہایت ناپسندیدہ ہے۔ ۳۱-۳۸

یہ ان باتوں میں سے ہیں جو تمہارے رب نے حکمت میں سے تمہاری طرف وحی کی ہیں اور خدا کے ساتھ کسی اور معبود کو شریک نہ کرو کہ تم ملامت زدہ اور راندہ ہو کر جہنم میں جھونک دیے جاؤ۔ ۳۹

تورات کے احکامِ عشرہ

لہ تورات میں کم و بیش یہی باتیں جس انداز میں کہی گئی ہیں ان سے واقف رہنا بھی فائدہ سے خالی نہیں ہوگا اس وجہ سے ہم اس کا ضروری حصہ یہاں نقل کیے دیتے ہیں۔

"پھر خداوند نے موسیٰ سے کہا، بنی اسرائیل کی ساری جماعت سے کہہ کہ تم پاک رہو کیونکہ میں جو خداوند تمہارا خدا ہوں پاک ہوں۔ تم میں سے ہر ایک اپنی ماں اور اپنے باپ سے ڈرتا رہے اور تم میرے سبتوں کو ماننا۔ میں خداوند تمہارا خدا ہوں۔ تم بتوں کی طرف رجوع نہ ہونا اور نہ اپنے لیے ڈھالے ہوئے دیوتا بنانا۔ میں خداوند تمہارا خدا ہوں اور جب تم خداوند کے حضور سلامتی کے ذبیحے گزرانو تو ان کو اس طرح گزراننا کہ تم مقبول ہو۔.........

اور جب تم اپنی زمین کی پیداوار کی فصل کاٹو تو تو اپنے کھیت کے کونے کونے تک پورا پورا نہ کاٹنا اور نہ کٹائی کی گری پڑی بالوں کو چن لینا۔ اور تو اپنے انگورستان کا دانہ دانہ نہ توڑ لینا اور نہ اپنے انگورستان کے گرے ہوئے دانوں کو جمع کرنا، ان کو غریبوں اور مسافروں کے لیے چھوڑ دینا۔ میں خداوند تمہارا خدا ہوں۔ تم چوری نہ کرنا اور نہ دغا دینا اور نہ ایک دوسرے سے جھوٹ بولنا اور تم میرا نام لے کر جھوٹی قسم نہ کھانا جس سے تو اپنے خدا کے نام کو ناپاک ٹھہرائے۔ میں خداوند ہوں۔ تو اپنے پڑوسی پر ظلم نہ کرنا نہ اسے لوٹنا۔ مزدور کی مزدوری تیرے پاس ساری رات صبح تک رہنے نہ پائے۔ تو بہرے کو نہ کوسنا اور نہ اندھے کے آگے ٹھوکر کھلانے کی چیز کو دھرنا بلکہ اپنے خدا سے ڈرنا۔ میں (باقی اگلے صفحہ پر)

۷- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

لَا تَجْعَلْ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ فَتَقْعُدَ مَذْمُوْمًا مَّخْذُوْلًا (۲۲)

واحد کا خطاب جمع کے لیے

ہم متعدد مقامات میں یہ واضح کرچکے ہیں کہ واحد کا خطاب بسا اوقات جمع کے لیے بھی آتا ہے۔ اس صورت میں گویا جماعت کا ایک ایک شخص فرداً فرداً مخاطب ہوتا ہے۔ یہاں بھی یہی صورت ہے۔ چنانچہ بیچ بیچ میں خطاب کے لیے جمع کا صیغہ بھی استعمال ہوگیا ہے جس سے خطاب کی اصل نوعیت پر روشنی پڑتی ہے۔ اس بیچ میں اگر کہیں خطاب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی ہوا ہے تو وہ جماعت کے امام کی حیثیت سے ہوا ہے اس کی حیثیت شخصی خطاب کی نہیں ہے۔

'فَتَقْعُدَ' کا مفہوم

'فَتَقْعُدَ' یہاں اس مفہوم میں آیا ہے جس مفہوم میں افعالِ ناقصہ مثلاً 'فَتَكُوْنَ'، 'فَتُصْبِحَ' وغیرہ استعمال ہوتے ہیں۔ اردو میں بھی 'بیٹھ رہو'، 'بیٹھ رہے' اس مفہوم میں استعمال ہوتے ہیں۔ اس صورت میں بیٹھنے کے معروف مفہوم سے یہ لفظ مجرد ہو جاتا ہے۔

قرآن کے طریق اقوام کی بنیادی دفعہ

قرآن جس عدل یا طریق اقوام کی تعلیم دیتا ہے یہ اس کی بنیادی دفعہ ہے کہ خدا کے ساتھ کسی اور معبود کو شریک نہ ٹھہراؤ۔ خالق، مالک، رازق صرف خدا ہے تو اس کے حقوق اور اس کی خدائی میں کسی اور کو ساجھی بنانا عدل کے منافی اور بہت بڑا ظلم ہے۔ چنانچہ اسی بنیاد پر قرآن میں شرک کو ظلم عظیم کہا گیا ہے۔

خدا کا شریک بنانے کا انجام

'فَتَقْعُدَ مَذْمُوْمًا مَّخْذُوْلًا' یہ خدا کے ساتھ کسی اور کو شریک بنانے کا انجام بیان ہوا ہے اور 'تَقْعُدَ' کا ظرف، 'يَوْمَ الْقِيٰمَةِ' یہاں محذوف ہے۔ یعنی اگر خدا کے ساتھ اس کے حقوق میں کسی اور کو شریک بناؤ گے تو قیامت کے روز سزاوار مذمت اور مخذول ہو کر رہ جاؤ گے۔ تم خود اپنی بدبختی کے ذمہ دار ہوگے اور تمھارے مزعومہ شرکاء و شفعاء میں سے نہ صرف یہ کہ کوئی تمھارا ساتھ نہ دے گا بلکہ وہ بھی تم پر لعنت اور نفرت کریں گے۔

وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ۭ اِمَّا يَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ اَحَدُهُمَآ اَوْ كِلٰـهُمَا فَلَا تَقُلْ لَّهُمَآ اُفٍّ وَّلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُلْ لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيْمًا (۲۳)

خدا کے بعد سب سے بڑا حق والدین کا

یعنی یہ خدا ہی کا کام ہے کہ وہ یہ بتائے کہ اس کے حقوق میں کوئی شریک ہے یا نہیں ہے سو اس کا فیصلہ یہ ہے کہ اس کے سوا تم کسی اور کی بندگی نہ کرو۔ خدا کے بعد سب سے بڑا حق ہو سکتا ہے تو والدین کا اپنی اولاد پر

(حاشیہ صفحہ گزشتہ) خداوند ہوں۔ تم فیصلہ میں ناراستی نہ کرنا۔ نہ تو تو غریب کی رعایت کرنا نہ بڑے آدمی کا لحاظ بلکہ راستی کے ساتھ اپنے ہم سایہ کا انصاف کرنا۔ تو اپنی قوم میں ادھر ادھر لترا پن نہ کرتے پھرنا اور نہ اپنے ہم سایہ کا خون کرنے پر آمادہ ہونا، میں خداوند ہوں۔ تو اپنے بھائی سے بغض نہ رکھنا .... تو انتقام نہ لینا اور نہ اپنی قوم کی نسل سے کینہ رکھنا بلکہ اپنے ہم سایہ سے اپنی مانند محبت کرنا۔ میں خداوند ہوں۔ تم میری شریعتوں کو ماننا۔"

احبار باب ۱۹

ہو سکتا ہے اس لیے کہ ان کی پیدائش اور پرورش و پرداخت کا وہ ذریعہ بنتے ہیں لیکن ان کا حق بھی اللہ نے یہ نہیں قرار دیا کہ وہ اس کی عبادت میں شریک ٹھہرائے جائیں بلکہ ان کا حق یہ ہے کہ ان کے ساتھ احسان کیا جائے۔ 'اِحْسَانًا' یہاں فعل محذوف ہے مفعول مطلق ہے اس وجہ سے اس کے معنی یہ ہوں گے کہ ان کے ساتھ نہایت بہتر سلوک کیا جائے۔ یہاں سیاق کلام سے یہ بات آپ سے آپ نکلی کہ اگر عبادت میں کسی اور کو شریک کرنے کی کوئی ادنیٰ گنجائش بھی ہوتی تو اس کے حق دار والدین ہو سکتے تھے لیکن جب خدا نے ان کو بھی شریک نہیں کیا، ان کو صرف احسان ہی کا حقدار ٹھہرایا تو تا بدیگراں چہ رسد!

'اِمَّا يَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ اَحَدُهُمَآ اَوْ كِلٰهُمَا فَلَا تَقُلْ لَّهُمَآ اُفٍّ وَّلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُلْ لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيْمًا'

'اُفّ' دل کی بیزاری کے اظہار کا کلمہ ہے اور 'نَہر' کے معنی ڈانٹنے اور جھڑکنے کے ہیں۔ اوپر جس احسان کا حکم ہے یہ اس کی وضاحت ہے کہ اگر ماں باپ تمہارے سامنے بڑھاپے کو پہنچ جائیں تو نہ ان کے خلاف دل میں کوئی بیزاری پیدا ہونے پائے اور نہ زبان سے ان کے سامنے کوئی کلمہ سوءادب کا نکلے بلکہ جب بھی ان سے بات کرنے کا موقع آئے شریفانہ اور سعادت مندانہ بات کرو اور ان کی دلداری و تسلی کرتے رہو۔

والدین کا حقِ احسان

آیت میں بڑھاپے تک پہنچ جانے کا حوالہ محض اس لیے دیا گیا ہے کہ یہی زمانہ ہوتا ہے جس میں ان لوگوں کو ماں باپ بوجھ محسوس ہوتے ہیں جو ان کی ان قربانیوں اور جاں فشانیوں کو بھول جاتے ہیں جو انھوں نے ان کے لیے بچپن میں کی ہوتی ہیں۔ سعادت مند اولاد تو اس بات کو یاد رکھتی ہے کہ جس طرح کبھی ایک مضغۂ گوشت کی صورت میں مجھ کو اپنے والدین کی گود میں ڈالا گیا تھا اسی طرح اب میرے والدین ہڈیوں کے ایک ڈھانچے کی صورت میں میرے حوالے کیے گئے ہیں اور میرا فرض ہے کہ میں ان کے احسان کا بدلہ احسان کی صورت میں دوں لیکن ہر شخص اس بات کو یاد نہیں رکھتا۔ یہ اسی بات کی یاد دہانی ہے۔ ورنہ اصل حقیقت یہ ہے کہ والدین ہر دور میں محبت، تعظیم اور احسان کے حق دار ہیں ——— یہاں یہ بات ذہن میں محفوظ رہے کہ اوپر والی آیت میں جس طرح سب سے بڑے عدل کا ذکر آیا ہے اسی طرح اس آیت میں سب سے بڑے احسان کا ذکر ہے جو قرآن کی تعلیمات میں دوسری اساسی تعلیم کا درجہ رکھتا ہے

وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَقُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِيْ صَغِيْرًا (۲۴)

والدین کا حقِ فرمانبرداری و خدمت

'ذُلّ' کے معنی اطاعت و فرمانبرداری کے ہیں۔ اس کے لیے 'جَنَاح' کے استعارے میں یہ تلمیح مضمر ہے کہ تمہارے والدین نے تمہارے بچپن میں تمھیں اسی طرح اپنے بازوؤں کے نیچے چھپائے رکھا جس طرح پرندہ اپنے بچے کو اپنے پروں کے نیچے چھپائے رکھتا ہے۔ اس کا حق یہ ہے کہ ان کے بڑھاپے میں تم بھی انھیں اپنی اطاعت و محبت کے بازوؤں کے نیچے چھپائے رکھو۔ اس اطاعت و فرمانبرداری کے ساتھ 'مِنَ الرَّحْمَةِ' کی قید اس کے منبع اور محرک کا پتہ دیتی ہے کہ یہ اطاعت و فرماں برداری تمام تر مہر و محبت اور شفقت و رحمت پر مبنی ہو۔ اس میں کسی

اور جذبہ کو دخل نہ ہو اس لیے کہ ان کی شفقت و محبت کا حق اگر کچھ ادا ہو سکتا ہے تو مہر و محبت کے جذبہ ہی سے ہو سکتا ہے۔ بغیر اس جذبے کے کوئی شخص والدین کا حق ان کے بڑھاپے میں ادا نہیں کر سکتا۔

والدین کے لیے دعا کا حق

وَقُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا ...... الآیۃ۔ خدمت و محبت کے ساتھ ساتھ ان کے لیے یہ دعا کرتے رہنے کی ہدایت ہوئی کہ اے میرے رب جس طرح شفقت و محبت کے ساتھ انھوں نے بچپن میں مجھے پالا اسی طرح اس بڑھاپے میں تو ان پر اپنی محبت و رحمت نازل فرما۔ یہ دعا والدین کا حق بھی ہے، اس میں اس حق کی یاددہانی بھی ہے جو والدین سے متعلق اولاد پر عائد ہوتا ہے اور یہ اس جذبۂ محبت کی محرک بھی ہے جو والدین کے ساتھ سلوک کے معاملے میں مطلوب ہے۔

رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَا فِيْ نُفُوْسِكُمْ ۚ اِنْ تَكُوْنُوْا صٰلِحِيْنَ فَاِنَّهٗ كَانَ لِلْاَوَّابِيْنَ غَفُوْرًا (۲۵)

والدین کے لیے دلی محبت اور کامل سعادت مندی

بڑھاپے میں والدین کی خدمت و محبت اس طرح کرنا جس طرح قرآن نے ہدایت فرمائی ہے کوئی آسان بازی نہیں ہے۔ اس میں صرف ظاہری اطاعت ہی مطلوب نہیں ہے بلکہ پاکیزہ قلبی جذبۂ محبت اور دلی لگاؤ بھی مطلوب ہے۔ اس کی اس مشکل کی وجہ سے قرآن نے یہ وضاحت بھی فرما دی کہ اصل مطلوب دلی محبت اور کامل سعادت مندی ہے۔ اگر یہ چیز موجود ہے تو خدا دلوں کے حال سے خوب واقف ہے۔ اس کے ہوتے اگر کوئی چھوٹی موٹی اتفاقیہ کوتاہی صادر ہو گئی تو اس کی تلافی توبہ اور رجوع الی اللہ سے ہو سکتی ہے۔ جو لوگ اپنی اس طرح کی کوتاہیوں پر برابر اللہ سے معافی مانگتے رہیں گے تو اللہ ان کو معاف کر دے گا۔

وَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ وَالْمِسْكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِيْرًا ۝ اِنَّ الْمُبَذِّرِيْنَ كَانُوْٓا
اِخْوَانَ الشَّيٰطِيْنِ ۭ وَكَانَ الشَّيْطٰنُ لِرَبِّهٖ كَفُوْرًا (۲۶-۲۷)

قرابت دار، مسکین اور مسافر کا حق

عدل اور احسان کے حکم کے بعد قرآنی اوامر کی تیسری اساسی چیز ایتائے ذی القربی یعنی عزیزوں اور قرابت داروں کی خدمت ہے، اب یہ اس کا بیان ہو رہا ہے۔ فرمایا کہ قرابت دار، مسکین اور مسافر کو اس کا حق دو۔ اس سے معلوم ہوا کہ ہر صاحبِ مال کے مال میں اس کے قرابت داروں، مسکینوں اور مسافروں کا بھی حق ہے۔ یہاں لفظ 'حق' کا استعمال اس حقیقت کو ظاہر کرتا ہے کہ یہ محض اخلاقی ذمہ داری نہیں ہے بلکہ اس کی ذمہ داری حق واجب کی ہے جس کی ادائیگی صاحبِ مال پر لازمی ہے۔ اگر کوئی شخص اس حق کو ادا نہ کرے گا تو وہ عند اللہ غصبِ حقوق کا مجرم ٹھہرے گا۔ قرابت دار کے بعد دوسرا درجہ مسکین کا ہے۔ قرابت دار تو مجرد قرابت کی بنا پر حق دار بن جاتا ہے لیکن مسکین کو اس کی مسکینی حقدار بناتی ہے۔ اگر کوئی قرابت دار مسکین بھی ہو تو اس کا حق دہرا ہو جائے گا۔ قرابت دار کے بعد معاً مسکین کا ذکر اسلامی معاشرے میں مسکین کے درجے اور مرتبے کو ظاہر کرتا ہے۔ مسکین کے بعد ابن السبیل یعنی مسافر کا حق ہے۔ یہ بات ظاہر ہے کہ مسافر صرف مسافر ہونے کی بنا پر حقدار بنتا ہے، اس کا مسکین ہونا ضروری نہیں ہے، ورنہ اس کے علیحدہ ذکر کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اس امر میں شبہ نہیں ہے کہ حالتِ سفر بجائے خود ایسی چیز ہے جو عام حالات میں آدمی کو دوسروں کی مدد

کا محتاج بنا دیتا ہے اگرچہ وہ فقہی مفہوم میں مسکین کے حکم میں نہ آتا ہو۔

اعتدال و کفایت شعاری کی ہدایت

وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِيرًا ظاہر ہے کہ جب ہر صاحبِ مال کے مال میں دوسروں کے بھی حقوق ہوئے تو اس کو اللّے تللّے خرچ کرنے کی اجازت نہیں ہو سکتی۔ پھر تو اس کے لیے صحیح رویہ یہی ہو سکتا ہے کہ احتیاط و اعتدال اور کفایت شعاری کے ساتھ اپنی جائز ضروریات پر خرچ کرے اور بقیہ مال کے معاملے میں وہ اپنے آپ کو دوسرے حق داروں کا امین سمجھے، اور اس امانت کو نہایت احتیاط کے ساتھ ادا کرے۔ جو شخص اپنی ضروریات کے معاملے میں محتاط اور کفایت شعار نہیں ہوگا اس کو اپنے ہی شوق پورے کرنے سے فرصت نہیں ہوگی تو وہ دوسروں کے حقوق کہاں سے ادا کر پائے گا۔

إِنَّ الْمُبَذِّرِينَ كَانُوا إِخْوَانَ الشَّيَاطِينِ ...... الآیۃ فرمایا کہ جو لوگ فضول خرچ ہیں وہ شیطان کے بھائی ہیں اور شیطان اپنے رب کا ناشکرا ہے۔ جن لوگوں کو اللہ اپنی نعمت دیتا ہے اس کا فطری تقاضا یہ ہے کہ وہ اپنے رب کی نعمت کے شکرگزار ہوں اور اس کو انہی کاموں پر صرف کریں جو اللہ کی رضا اور اس کی خوشنودی کے موجب ہوں لیکن شیطان ان کو ورغلا کر اپنی راہ پر لگا لیتا ہے اور خدا کا بخشا ہوا مال ان سے ان کاموں پر خرچ کراتا ہے جو ان کو خدا سے دور سے دور تر اور شیطان سے قریب سے قریب تر کر دیں۔

وَإِمَّا تُعْرِضَنَّ عَنْهُمُ ابْتِغَاءَ رَحْمَةٍ مِنْ رَبِّكَ تَرْجُوهَا فَقُلْ لَهُمْ قَوْلًا مَيْسُورًا (۲۸)

یہ اس حالت کے لیے ہدایت ہے جب کہ بروقت کوئی شخص اس پوزیشن میں نہ ہو کہ وہ اوپر بیان کیے ہوئے حقوق ادا کر سکے۔ فرمایا کہ اگر تمہارے حالات ایسے ہوں کہ مذکورہ حق داروں میں سے کسی کی امداد سے تمہیں مجبوراً اعراض ہی کرنا پڑ جائے اور تمہیں توقع ہو کہ مستقبل قریب میں تمہارے حالات درست ہو جائیں گے اور تم اس کی مدد کر سکو گے تو اس سے دلداری اور ہمدردی کی بات کرو اور آئندہ کے لیے اچھے وعدے کے ساتھ اس کو رخصت کرو۔

وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُولَةً إِلَىٰ عُنُقِكَ وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُومًا مَحْسُورًا (۲۹)

ہاتھ کو گردن سے باندھ لینا، تعبیر ہے انتہائی بخل اور خست کی اور ہاتھ کو بالکل کھلا چھوڑ دینا تعبیر ہے اسراف و تبذیر کی۔

اوپر آیات ۲۶-۲۷ میں اسراف و تبذیر کی جو ممانعت وارد ہوئی ہے اس کے باب میں غلط فہمی سے بچانے کے لیے یہ صحیح نقطۂ اعتدال کی وضاحت فرما دی کہ منشائے الٰہی یہ نہیں ہے کہ آدمی اپنی ضروریات کے معاملے میں بالکل ہی بخیل و خسیس بن کر رہ جائے بلکہ صرف یہ مطلوب ہے کہ وہ اعتدال و کفایت شعاری کا رویہ اختیار کرے، نہ اپنے ہاتھ بالکل باندھ ہی لے، نہ ان کو بالکل کھلا ہی چھوڑ دے، بلکہ اعتدال کے ساتھ اپنی جائز ضروریات پر بھی خرچ کرے اور دوسروں کے حقوق بھی ادا کرے۔ فَتَقْعُدَ مَلُومًا مَحْسُورًا، یہاں تَقْعُدَ اسی مفہوم میں ہے جس مفہوم میں آیت ۲۲ میں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر تم اپنے ہاتھ بالکل ہی کھلے ہوئے چھوڑ دو گے تو بالآخر

اس کا نتیجہ یہ سامنے آئے گا کہ دوسروں کے حقوق کے معاملے میں سزاوارِ ملامت بھی ٹھہرو گے اور ادائے حقوق سے قاصر و درماندہ بھی ہو کر رہ جاؤ گے۔

اِنَّ رَبَّكَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَقْدِرُ ۭ اِنَّهٗ كَانَ بِعِبَادِهٖ خَبِيْرًۢا بَصِيْرًا (۳۰)

یہاں 'یَقْدِرُ' کے بعد بھی 'لِمَنْ یَّشَآءُ' ہے جو وضاحتِ قرینہ کی بنا پر حذف کر دیا گیا ہے۔

رزق کی تنگی و کشادگی خدا کی مشیت پر منحصر ہے

اوپر والی آیت میں یہ جو فرمایا ہے کہ 'اور نہ تم اپنے ہاتھ کو اپنی گردن سے باندھ کے رکھو'، یہ آیت اسی کی وضاحت میں ہے کہ رزق کی تنگی و کشادگی کا انحصار آدمی کی اپنی تدبیروں پر نہیں ہے بلکہ یہ تمام تر خدا کی حکمت و مشیت پر منحصر ہے۔ وہ اپنے بندوں کے حال سے اچھی طرح باخبر اور ان کا نگران و نگہبان ہے۔ وہی اپنی مشیت و حکمت کے تحت جس کے لیے رزق کو چاہتا ہے کشادہ کرتا ہے اور جس کے رزق کو چاہتا ہے تنگ کر دیتا ہے۔ بندے کے لیے صحیح رویہ یہی ہے کہ وہ احتیاط و اعتدال کے ساتھ اپنی ضروریات پر بھی خرچ کرے اور دوسروں کے حقوق بھی ادا کرے۔ کوئی ایسا قدم نہ اٹھائے جو اس نقطۂ اعتدال سے منحرف ہو، خواہ وہ کسی سمت میں ہو۔

وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ ۭ نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَاِيَّاكُمْ ۭ اِنَّ قَتْلَهُمْ كَانَ خِطْاً كَبِيْرًا (۳۱)

'اِمْلَاق' کے معنی مفلسی اور ناداری کے ہیں۔

قتلِ اولاد کی ممانعت

یہ بات اوپر والی بات ہی پر متفرع ہے۔ یعنی جب اصل حقیقت یہ ہے کہ اصل رازق خدا ہی ہے تو کسی دوسرے کو یہ حق کہاں سے پہنچتا ہے کہ وہ کسی دوسری جان کو اس اندیشہ سے ہلاک کر دے کہ وہ کھائے گی کیا۔ عرب جاہلیت میں لڑکیوں کو زندہ درگور کر دینے کی جو سنگ دلانہ رسم جاری تھی اس کی بڑی وجہ یہی تھی کہ وہ سمجھتے تھے کہ عورت کوئی کمانے والا فرد تو ہے نہیں تو لڑکیوں کی پرورش کا بوجھ کیوں اٹھایا جائے۔ قرآن نے اس سنگ دلانہ جرم کے اصل محرک پر ضرب لگائی اور اس بربریت کا خاتمہ کیا۔ موجودہ زمانے میں ضبطِ ولادت کے نام سے جو تحریک چل رہی ہے اور جس کو بروئے کار لانے کے لیے روز نت نئی ترکیبیں ایجاد ہو رہی ہیں، وہ بظاہر تو وحشیانہ نہیں ہیں لیکن فلسفہ اور عقیدہ بنیادی طور پر اس کے اندر بھی وہی کارفرما ہے جو عرب جاہلیت کی بربریت کا محرک تھا۔ جاہل عربوں کی طرح موجودہ زمانے کا متمدن انسان بھی اپنے آپ کو دوسروں کا رزاق سمجھ بیٹھا ہے۔ قرآن نے 'نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَاِيَّاكُمْ' فرما کر اس گمراہی کی اصلاح کی ہے۔ عرب کے وحشی تو اس حقیقت کو سمجھ گئے اور انھوں نے اپنی اصلاح بھی کر لی لیکن اس زمانے کے پڑھے لکھے جاہلوں کو کون سمجھائے۔

وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰٓى اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً ۭ وَسَاۗءَ سَبِيْلًا (۳۲)

منہیات کا بیان

آیت ۳۱ پر قرآنی اوامر — عدل، احسان، ایتائے ذی القربیٰ — سے متعلق بنیادی مسائل ختم ہوئے۔ اب آگے قرآنی منہیات — فحشاء، منکر، بغی — کے تحت جو چیزیں آتی ہیں ان کا بیان شروع ہو رہا ہے۔

زنا اور اس کے محرکات کی ممانعت

منہیات کے باب میں سب سے پہلے زنا کو لیا ہے اس لیے کہ یہ برائی صالح معاشرہ کی جڑ پر کلہاڑا مارنے والی برائی ہے۔ صالح معاشرہ کی بنیاد صالح خاندان پر ہے۔ صالح خاندان صحیح فطری جذبات کے ساتھ صرف

اسی صورت میں وجود پذیر ہو سکتا ہے جب والدین کے ساتھ اولاد کا تعلق صحیح ترین، صحیح نسب اور پاکیزہ مدحمی رشتہ پر استوار ہو۔ اگر یہ چیز مفقود ہو جائے تو خاندان خاندان نہیں بلکہ فطری و روحانی جذبات و عواطف سے بالکل محروم و ناآشنا حیوانات کا ایک گلہ ہے۔ حیوانات کا کوئی گلہ نہ کسی صالح معاشرہ کی بنیاد رکھ سکتا نہ کسی صالح تمدن کا مقدمۃ الجیش بن سکتا۔

قرآن نے زنا کے اس مفسدے کے باعث اس کو اپنی منہیات کے باب میں سب سے پہلے لیا ہے۔ اور ایسے لفظوں میں اس سے روکا ہے جو زنا اور زنا کے تمام دواعی و محرکات کا سدباب کرنے والے ہیں۔ فرمایا لَا تَقْرَبُوا الزِّنٰىٓ جس کے معنی ہیں زنا کے پاس بھی نہ پھٹکو۔ زنا کے پاس بھی نہ پھٹکو، یعنی ان تمام باتوں سے بھی دور دور رہو جو زنا کی محرک، اس پر اکسانے والی اور اس کے قریب لے جانے والی ہیں۔ یہاں بات صرف اصولی حیثیت سے فرمائی گئی ہے۔ اس وجہ سے اس کی کوئی تفصیل نہیں آئی ہے۔ اس کی تفصیل سورۂ نور میں آئے گی جو اس گروپ کی آخری سورہ ہے۔ اس کی تفسیر میں انشاء اللہ ہم واضح کریں گے کہ قرآن نے کن کن باتوں سے محض اس بنیاد پر روکا ہے کہ وہ زنا کے مقدمات و محرکات میں سے ہیں۔

اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً ؕ وَسَآءَ سَبِيْلًا یہ زنا کی ممانعت کی دلیل بیان ہوئی ہے کہ یہ کھلی ہوئی بے حیائی اور نہایت ہی بری راہ ہے۔ 'کھلی ہوئی بے حیائی' یعنی اس کے برائی اور بے حیائی ہونے پر کسی منطقی بحث و حجت کی ضرورت نہیں ہے بلکہ یہ فطرت انسانی کی قدیم ترین جانی پہچانی ہوئی حقیقتوں میں سے ایک واضح ترین حقیقت ہے۔ انسان جب سے دنیا میں موجود ہے اس نے مرد و عورت کے آزادانہ تعلق کو کبھی گوارا نہیں کیا بلکہ اس پر ہمیشہ نہایت سخت پابندیاں رہی ہیں اور وہ لوگ کبھی خوش دلی کے ساتھ معاشرے میں گوارا نہیں کیے گئے ہیں جنھوں نے ان پابندیوں کو توڑا ہے۔ 'وَسَآءَ سَبِيْلًا' یعنی اس طریق اقوم سے یہ بالکل منحرف راہ ہے جس کی دعوت قرآن دے رہا ہے۔ جو لوگ اس راستہ پر چل پڑتے ہیں وہ صالح خاندان، صالح معاشرہ اور بالآخر صالح حکومت سب کی جڑیں اکھاڑ کے رکھ دیتے ہیں۔

وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِىْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ ؕ وَمَنْ قُتِلَ مَظْلُوْمًا فَقَدْ جَعَلْنَا لِوَلِيِّهٖ سُلْطٰنًا فَلَا يُسْرِفْ فِّى الْقَتْلِ ؕ اِنَّهٗ كَانَ مَنْصُوْرًا ﴿۳۳﴾

قتل کی ممانعت اور اسلامی قانون کا مزاج

اَلنَّفْسَ الَّتِىْ حَرَّمَ اللّٰهُ۔ یعنی ہر وہ جان جس کو اللہ نے محفوظ و مصئون قرار دیا ہے، جو مباح الدم نہیں ہے، کسی کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ اس کو قتل کرے مگر حق کی بنا پر۔ یعنی صرف اس صورت میں جس میں شریعت نے اس کے قتل کا حکم دیا ہے۔ اگر کوئی شخص اس قانونی جواز کے بغیر قتل ہوا تو وہ مظلومانہ قتل ہوا۔ ایسی صورت میں فرمایا کہ فَقَدْ جَعَلْنَا لِوَلِيِّهٖ سُلْطٰنًا، ہم نے اس کے اولیاء کو قاتل کے اوپر پورا اختیار دے دیا ہے کہ وہ چاہیں تو اس سے قصاص لیں، چاہیں تو خون بہا لیں اور اگر چاہیں تو معاف بھی کر سکتے ہیں۔ پورا اختیار دینے کے معنی یہ ہیں کہ اسلامی حکومت اولیائے مقتول کی مرضی لازماً نافذ کرائے گی۔ فَلَا يُسْرِفْ فِّى الْقَتْلِ

'اِنَّہٗ کَانَ مَنْصُوْرًا' یہ اولیائے مقتول کے لیے ہدایت ہے کہ چونکہ ان کو قانون اور حکومت کی حمایت حاصل ہے اس وجہ سے ان کے لیے یہ بات جائز نہیں ہے کہ وہ قاتل کو قتل کرنے کے معاملے میں حدود سے تجاوز کریں مثلاً یہ کہ اصل قاتل کے علاوہ دوسروں کو بھی قتل کر دیں یا قتل کے ایسے طریقے اختیار کریں جن سے اللہ نے منع فرمایا ہے۔ مثلاً آگ میں جلانا یا مثلہ کرنا۔

اس آیت سے یہ بات بھی نکلتی ہے کہ اسلامی قانون میں قتل کے معاملے میں اصل مدعی کی حیثیت حکومت کی نہیں بلکہ اولیائے مقتول کی ہے۔ حکومت کا کام صرف یہ ہے کہ وہ اولیائے مقتول کی مرضی ٹھیک ٹھیک نافذ کرا دے۔ حکومت مدعی صرف اس شکل میں ہوگی جب مقتول لاوارث ہو یا وارث ہوں تو سہی لیکن کسی سبب سے ان کو مقتول کے معاملے سے کوئی دلچسپی نہ رہ گئی ہو۔ موجودہ قوانین میں سارا اختیار صرف حکومت ہی کو حاصل ہوتا ہے۔ اولیاء کو سرے سے کوئی تعلق رہ ہی نہیں جاتا۔ ہمارے نزدیک موجودہ قوانین اسلامی قانون کی بہت سی برکتوں سے خالی ہیں۔ ہم نے اس مسئلے پر اپنی ایک دوسری کتاب میں بحث کی ہے۔ یہاں اس کے اعادے کی گنجائش نہیں ہے۔

وَلَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْيَتِيْمِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ حَتّٰى يَبْلُغَ اَشُدَّهٗ ۠ وَاَوْفُوْا بِالْعَهْدِ ۚ اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْـُٔوْلًا (۳۴)

مالِ یتیم کی حفاظت

اور جس شدت کے ساتھ زنا اور اس کے دواعی و محرکات سے روکا ہے اسی شدت کے ساتھ یتیم کے مال میں کسی ناجائز تصرف سے روکا ہے۔ فرمایا کہ بجز بہتری و بہبود کے ارادے کے یتیم کے مال کے قریب بھی نہ پھٹکو۔ یعنی یتیم کے مال میں اولیاء کی صرف وہی مداخلت جائز ہے جو اس کی ترقی، اس کی حفاظت اور اس کے نشوونما کو پیش نظر رکھ کر کی گئی ہو۔ ان سے الگ ہو کر جو تصرف بھی ہوگا وہ خیانت ہے اس لیے کہ یتیم کا مال اولیاء کے ہاتھ میں درحقیقت امانت ہوتا ہے۔ 'حَتّٰى يَبْلُغَ اَشُدَّهٗ' یعنی اولیاء کی یہ نگرانی صرف اس وقت تک کے لیے ہے جب تک یتیم اپنی پختگی اور سن رشد کو نہیں پہنچ جاتا۔ جب وہ بلوغ و رشد کو پہنچ جائے وہ اپنے مال کا مالک و مختار ہے۔ اس کا مال اس کے حوالے کر دیا جائے۔

ایفائے عہد کی ہدایت

'وَاَوْفُوْا بِالْعَهْدِ اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْـُٔوْلًا' یتیم کے مال میں خیانت کی ممانعت کے ساتھ ہی یہ تمام عہود و مواثیق میں خیانت سے منع فرمایا کہ ہر عہد جو کرو اس کو پورا کرو، اس میں کوئی خیانت نہ کرو۔ اس لیے کہ ہر عہد کی بابت عند اللہ پرسش ہونی ہے۔

اس عہد میں ہر قسم کے عہد شامل ہیں۔ خواہ وہ کسی معاہدے کی صورت میں وجود میں آئے ہوں، یا معاہدے کی شکل میں تو وجود میں نہ آئے ہوں لیکن عادۃً اور عرفاً ان کو عہد ہی سمجھا اور مانا جاتا ہو۔ جس نوعیت کا بھی عہد ہو اگر وہ خلاف شریعت نہیں ہے تو اس کو پورا کرنا ضروری ہے۔ سورۂ مائدہ کی تفسیر میں ہم یہ حقیقت بھی واضح کر چکے ہیں کہ شریعت کی حیثیت بھی درحقیقت بندوں اور خدا کے درمیان ایک معاہدہ کی ہے۔ انہی عہود کے ایفاء پر عالم خانداً

صالح معاشرہ اور صالح حکومت کا قیام و بقا منحصر ہے۔

وَاَوْفُوا الْكَيْلَ اِذَا كِلْتُمْ وَزِنُوْا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيْمِ ۚ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِيْلًا (۳۵)

الفائے کیل و وزن کی تاکید

ایفائے عہد کی تاکید کے بعد یہ ایفائے کیل و وزن کی تاکید ہے کہ آپس کے لین دین میں جب کوئی چیز ناپو یا تولو تو ناپ تول میں کوئی خیانت نہ کرو۔ ناپو صحیح پیمانے سے اور تولو ٹھیک ترازو سے۔ یہی طریقہ بہتر اور انجام کے اعتبار سے یہی اچھا ہے۔ یعنی معاشی اور تجارتی نقطۂ نظر سے بھی یہی طریقہ سود مند ہے اور مال کار کے پہلو سے بھی یہی طریقہ بہتر ہے اس لیے کہ خدا کو پسند یہی طریقہ ہے۔ جو قوم ڈنڈی ماری کو شیوہ بنا لیتی ہے۔ بظاہر اس کے کچھ افراد اپنی دانست میں نفع کماتے ہیں لیکن وہ درحقیقت اس عدل و صداقت کی بنیاد ہی کو ڈھا دیتے ہیں جس پر صالح معاشرہ اور صالح تمدن کا قیام و بقا منحصر ہے۔

وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ۭ اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰۗىِٕكَ كَانَ عَنْهُ مَسْـُٔوْلًا (۳۶)

'تَقْفُوْتُهٗ، قَفَوْتُ اَثَرَهٗ' کے معنی ہیں اس کے پیچھے لگا یا ہو لیا۔ 'لَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ' یعنی جس چیز کے بارے میں تمھیں قابل اطمینان علم نہیں ہے اس کے پیچھے نہ ہو لیا کرو اور محض اٹکل اور گمان کی بنا پر کسی کے بارے میں کوئی بات نہ لے اڑو۔

قذف اور تہمت وغیرہ کی ممانعت

یہ قذف اور تہمت وغیرہ کی قسم کی ساری باتوں کی ممانعت ہے۔ قرآن جو معاشرہ قائم کرنا چاہتا ہے اس کی بنیاد حسن ظن اور اعتماد پر ہے اس وجہ سے کسی کے باب میں کوئی ایسی بات زبان سے نہیں نکالنی چاہیے جو محض گمان یا افواہ پر مبنی ہو اور وہ اس کی عزت و شہرت کو نقصان پہنچانے والی ہو۔ فرمایا کہ جو لوگ اس طرح کی غیر ذمہ دارانہ باتیں کرتے ہیں انھیں یاد رکھنا چاہیے کہ کان، آنکھ اور دل ہر ایک سے اس طرح کی باتوں کی بابت ایک روز پرسش ہونی ہے۔

وَلَا تَمْشِ فِى الْاَرْضِ مَرَحًا ۚ اِنَّكَ لَنْ تَخْرِقَ الْاَرْضَ وَلَنْ تَبْلُغَ الْجِبَالَ طُوْلًا (۳۷)

غرور و تکبر کی ممانعت

'مرح' کے معنی اکڑ کر اور اترا کر چلنے کے ہیں۔ جو شخص اکڑ کر اور اترا کر چلتا ہے وہ زمین پر پاؤں مارتا ہوا اور گردن کو اٹھا کر چلتا ہے۔ یہ متکبرین اور مغروروں کی چال ہے۔ فرمایا کہ یہ مغروروں اور متکبروں کی چال نہ چلو۔ یاد رکھو کہ تم کتنا ہی زمین پر پاؤں مارتے ہوئے چلو لیکن تم خدا کی زمین کو پھاڑ نہیں سکتے، اسی طرح تم کتنا ہی سینہ تان کر اور گردن اور سر کو اونچا کر کے چلو لیکن تم پہاڑوں کی بلندی کو نہیں پہنچ سکتے۔ مطلب یہ کہ جس خدا کی قدرت کی یہ شانیں دیکھتے ہو کہ اس نے تمھارے پاؤں کے نیچے یہ طویل و عریض زمین بچھا دی جس کے اوپر تمھاری حیثیت ایک بھنگے اور چیونٹی کی بھی نہیں اور جس نے یہ فلک بوس پہاڑ تمھارے آگے کھڑے کر دیے جن کے سامنے تم ایک گلہری کی بھی حیثیت نہیں رکھتے اس کی زمین پر اکڑنے اور اترانے کے کیا معنی؟ اپنی حیثیت پہچانو اور خدا کی عظمت اور اس کے جلال کے آگے ہمیشہ سرنگندہ رہو۔

یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ آدمی کی یہ حالت اس کے باطن پر عکس ڈالتی ہے۔ یہ دلیل ہے اس بات کی کہ اس شخص کے دل میں خدا کی عظمت و قدرت کا کوئی تصور نہیں ہے۔ جن کے دلوں کے اندر خدا کی عظمت و قدرت کا تصور سمایا ہوا ہوتا ہے ان پر تواضع اور فروتنی کی حالت طاری رہتی ہے۔ وہ اکڑنے اور اترانے کے بجائے سر جھکا کر دبے پاؤں چلتے ہیں۔

كُلُّ ذٰلِكَ كَانَ سَيِّئُهٗ عِنْدَ رَبِّكَ مَكْرُوْهًا (۳۸)

یہ اوپر کی تمام منہیات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ ان میں سے ہر کام کی برائی تیرے رب کے نزدیک نہایت مکروہ ہے۔ لفظ 'مکروہ' یہاں فقہی مفہوم میں نہیں بلکہ اپنے حقیقی مفہوم میں ہے۔ یعنی یہ ساری باتیں خدا کے نزدیک نہایت مبغوض اور قابلِ نفرت ہیں۔ اس سے یہ بات آپ سے آپ نکلی کہ جو ان میں سے کسی چیز کے بھی مرتکب ہوں گے وہ بھی خدا کے نزدیک قابل نفرت ٹھہریں گے۔

ذٰلِكَ مِمَّآ اَوْحٰٓى اِلَيْكَ رَبُّكَ مِنَ الْحِكْمَةِ ۭ وَلَا تَجْعَلْ مَعَ اللّٰهِ اِلٰـهًا اٰخَرَ فَتُلْقٰى فِيْ جَهَنَّمَ مَلُوْمًا مَّدْحُوْرًا (۳۹)

یہ باتیں اجزائے حکمت میں سے ہیں

'ذٰلِكَ' کا اشارہ ان تمام باتوں کی طرف ہے جو اوپر سے لے کر یہاں تک بیان ہوئی ہیں۔ یہ ساری باتیں حکمت کے اجزاء میں سے ہیں۔ یعنی یہ وہ ٹھوس، راسخ اور غیر متزلزل حقیقتیں ہیں جو عقل، فطرت اور شریعت میں نہایت مضبوط بنیادیں رکھتی ہیں۔ تمہارے رب نے اپنے پیغمبر کے واسطہ سے یہ تمہاری طرف وحی کی ہیں کہ تم اپنی زندگیاں ان سے سنوارو۔

توحید کے مضمون کی یاددہانی

وَلَا تَجْعَلْ ...... الایۃ۔ یہ آخر میں توحید کے اس مضمون کی پھر یاددہانی کر دی جس سے آیت ۲۲ میں اس بحث کا آغاز فرمایا تھا۔ گویا توحید ان ساری تعلیمات کے لیے حصار اور شہر پناہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ جب تک یہ شہر پناہ قائم ہے اس وقت تک یہ تعلیمات بھی قائم ہیں اور اگر اس شہر پناہ میں کوئی رخنہ پیدا ہو گیا تو یہ ساری حکمت کی باتیں بھی ایک ایک کر کے ناپید ہو جائیں گی۔ توحید سے آغاز اور توحید ہی پر اختتام کی مثالیں قرآن مجید میں اور بھی ہیں بلکہ تورات میں بھی اس کی مثالیں موجود ہیں، اگر بحث کے دوسرے گوشوں میں نکل جانے کا اندیشہ نہ ہوتا تو ہم یہاں ان کا حوالہ دیتے۔

۸۔ آگے کا مضمون ــــــ آیات ۴۰-۵۷

کفار کی قرآن سے بیزاری کا اصل سبب

آگے کفار قریش کی قرآن سے بیزاری کے اصل سبب پر روشنی ڈالی گئی ہے کہ یہ لوگ چونکہ اپنے مزعومہ معبودوں کو چھوڑنے اور آخرت کو تسلیم کرنے پر تیار نہیں ہیں اس وجہ سے قرآن اور پیغمبر سے چڑتے ہیں۔ اسی ضمن میں بطور جملہ معترضہ مسلمانوں کو یہ ہدایت بھی فرمادی گئی کہ تم دعوت میں حکیمانہ طریقہ اختیار کرو، مخالفین کے رویے سے متاثر ہو کر زبان سے کوئی ایسا کلمہ نہ نکالو جو ان بدکے ہوئے لوگوں کے لیے مزید وحشت کا سبب بن جائے۔

آیات کی تلاوت فرمایئے۔

آیات ۴۰-۵۲ أَفَأَصْفٰكُمْ رَبُّكُمْ بِالْبَنِيْنَ وَاتَّخَذَ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ إِنَاثًا ۭ إِنَّكُمْ
ع ۴ لَتَقُوْلُوْنَ قَوْلًا عَظِيْمًا ﴿۴۰﴾ وَلَقَدْ صَرَّفْنَا فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لِيَذَّكَّرُوْا ۭ
وَمَا يَزِيْدُهُمْ إِلَّا نُفُوْرًا ﴿۴۱﴾ قُلْ لَّوْ كَانَ مَعَهٗٓ اٰلِهَةٌ كَمَا يَقُوْلُوْنَ
إِذًا لَّابْتَغَوْا إِلٰى ذِي الْعَرْشِ سَبِيْلًا ﴿۴۲﴾ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا
يَقُوْلُوْنَ عُلُوًّا كَبِيْرًا ﴿۴۳﴾ تُسَبِّحُ لَهُ السَّمٰوٰتُ السَّبْعُ وَالْأَرْضُ وَ
مَنْ فِيْهِنَّ ۭ وَإِنْ مِّنْ شَيْءٍ إِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ
تَسْبِيْحَهُمْ ۭ إِنَّهٗ كَانَ حَلِيْمًا غَفُوْرًا ﴿۴۴﴾ وَإِذَا قَرَأْتَ الْقُرْاٰنَ
جَعَلْنَا بَيْنَكَ وَبَيْنَ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ حِجَابًا
مَّسْتُوْرًا ﴿۴۵﴾ وَّجَعَلْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ أَكِنَّةً أَنْ يَّفْقَهُوْهُ وَفِيْٓ اٰذَانِهِمْ
وَقْرًا ۭ وَإِذَا ذَكَرْتَ رَبَّكَ فِي الْقُرْاٰنِ وَحْدَهٗ وَلَّوْا عَلٰٓى أَدْبَارِهِمْ
نُفُوْرًا ﴿۴۶﴾ نَحْنُ أَعْلَمُ بِمَا يَسْتَمِعُوْنَ بِهٖٓ إِذْ يَسْتَمِعُوْنَ إِلَيْكَ وَإِذْ
هُمْ نَجْوٰٓى إِذْ يَقُوْلُ الظّٰلِمُوْنَ إِنْ تَتَّبِعُوْنَ إِلَّا رَجُلًا مَّسْحُوْرًا ﴿۴۷﴾
الربع اُنْظُرْ كَيْفَ ضَرَبُوْا لَكَ الْأَمْثَالَ فَضَلُّوْا فَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ سَبِيْلًا ﴿۴۸﴾
وَقَالُوْٓا ءَإِذَا كُنَّا عِظَامًا وَّرُفَاتًا ءَإِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ خَلْقًا
جَدِيْدًا ﴿۴۹﴾ قُلْ كُوْنُوْا حِجَارَةً أَوْ حَدِيْدًا ﴿۵۰﴾ أَوْ خَلْقًا مِّمَّا يَكْبُرُ
فِيْ صُدُوْرِكُمْ ۚ فَسَيَقُوْلُوْنَ مَنْ يُّعِيْدُنَا ۭ قُلِ الَّذِيْ فَطَرَكُمْ أَوَّلَ
مَرَّةٍ ۚ فَسَيُنْغِضُوْنَ إِلَيْكَ رُءُوْسَهُمْ وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰى هُوَ ۭ قُلْ عَسٰٓى أَنْ
يَّكُوْنَ قَرِيْبًا ﴿۵۱﴾ يَوْمَ يَدْعُوْكُمْ فَتَسْتَجِيْبُوْنَ بِحَمْدِهٖ وَتَظُنُّوْنَ

إِن لَّبِثْتُمْ إِلَّا قَلِيلًا ﴿٥٢﴾ وَقُل لِّعِبَادِي يَقُولُوا الَّتِي هِيَ أَحْسَنُ ۚ إِنَّ ۵ ع ۱۲ ۵
الشَّيْطَانَ يَنزَغُ بَيْنَهُمْ ۚ إِنَّ الشَّيْطَانَ كَانَ لِلْإِنسَانِ عَدُوًّا مُّبِينًا ﴿٥٣﴾
رَّبُّكُمْ أَعْلَمُ بِكُمْ ۖ إِن يَشَأْ يَرْحَمْكُمْ أَوْ إِن يَشَأْ يُعَذِّبْكُمْ ۚ وَمَا
أَرْسَلْنَاكَ عَلَيْهِمْ وَكِيلًا ﴿٥٤﴾ وَرَبُّكَ أَعْلَمُ بِمَن فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ ۗ
وَلَقَدْ فَضَّلْنَا بَعْضَ النَّبِيِّينَ عَلَىٰ بَعْضٍ ۖ وَآتَيْنَا دَاوُودَ زَبُورًا ﴿٥٥﴾
قُلِ ادْعُوا الَّذِينَ زَعَمْتُم مِّن دُونِهِ فَلَا يَمْلِكُونَ كَشْفَ
الضُّرِّ عَنكُمْ وَلَا تَحْوِيلًا ﴿٥٦﴾ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ يَدْعُونَ يَبْتَغُونَ إِلَىٰ
رَبِّهِمُ الْوَسِيلَةَ أَيُّهُمْ أَقْرَبُ وَيَرْجُونَ رَحْمَتَهُ وَيَخَافُونَ عَذَابَهُ ۚ
إِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ كَانَ مَحْذُورًا ﴿٥٧﴾

ترجمۂ آیات ۴۰-۵۷

کیا تمھارے رب نے تمھارے لیے تو بیٹے مخصوص کیے اور اپنے لیے فرشتوں میں سے بیٹیاں بنا لیں۔ یہ تو تم بڑی ہی سنگین بات کہتے ہو۔ اور ہم نے اس قرآن میں گوناگون اسلوبوں سے بات واضح کر دی کہ وہ یاد دہانی حاصل کریں لیکن یہ چیز ان کی بیزاری ہی میں اضافہ کیے جا رہی ہے۔ کہہ دو کہ اگر کچھ اور الٰہ بھی اس کے شریک ہوتے جیسے یہ دعویٰ کرتے ہیں تو وہ عرش والے پر ضرور چڑھائی کر دیتے۔ وہ پاک اور بہت برتر ہے ان باتوں سے جو یہ کہتے ہیں۔ ساتوں آسمان اور زمین اور جو ان میں ہیں سب اسی کی تسبیح کرتے ہیں اور کوئی چیز بھی ایسی نہیں ہے جو اس کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح نہ کرتی ہو لیکن تم ان کی تسبیح نہیں سمجھتے۔ بے شک وہ بڑا ہی حلم والا اور بخشنے والا ہے۔ ۴۰-۴۴

اور جب تم قرآن سناتے ہو تو ہم تمھارے اور ان لوگوں کے درمیان جو آخرت پر ایمان نہیں

رکھتے، ایک مخفی پردہ حائل کر دیتے ہیں اور ان کے دلوں پر حجاب اور ان کے کانوں میں ثقل پیدا کر دیتے ہیں کہ نہ اس کو سمجھیں نہ سنیں اور جب تم قرآن میں تنہا اپنے رب ہی کا ذکر کرتے ہو تو وہ نفرت کے ساتھ پیٹھ پھیر لیتے ہیں اور ہم خوب جانتے ہیں کہ جب یہ لوگ تمہاری طرف کان لگاتے ہیں تو کس غرض سے کان لگاتے ہیں اور جب کہ یہ آپس میں سرگوشیاں کرتے ہیں جب کہ یہ ظالم کہتے ہیں کہ تم لوگ تو بس ایک سحر زدہ شخص کے پیچھے چل پڑے ہو۔ دیکھو، تم پر کیسے کیسے فقرے چست کر رہے ہیں۔ یہ لوگ کھوئے گئے ہیں، کوئی راہ نہیں پا رہے ہیں۔ ۴۵-۴۸

اور یہ کہتے ہیں کہ کیا جب ہم ہڈیاں اور ریزہ ریزہ ہو جائیں گے تو ہم از سر نو اٹھائے جائیں گے! کہہ دو کہ تم پتھر یا لوہا بن جاؤ یا کوئی اور شے جو تمہارے خیال میں ان سے بھی سخت ہو۔ پھر وہ کہیں گے کہ ہمیں کون دوبارہ زندہ کرے گا؟ کہہ دو کہ وہی جس نے تم کو پہلی بار پیدا کیا۔ پھر وہ تمہارے آگے سر ہلائیں گے اور کہیں گے کہ یہ کب ہوگا؟ کہہ دو کہ عجب نہیں کہ اس کا وقت قریب ہی آ پہنچا ہو۔ جس دن وہ تم کو پکارے گا تو تم اس کی حمد کرتے ہوئے اس کے حکم کی تعمیل کرو گے اور تم یہ گمان کرو گے کہ تم بس تھوڑی ہی مدت رہے۔ ۴۹-۵۲

اور میرے بندوں سے کہہ دو کہ وہی بات کہیں جو بہتر ہے۔ بے شک شیطان ان کے درمیان وسوسہ اندازی کرتا رہتا ہے، شیطان انسان کا کھلا ہوا دشمن تو ہے ہی۔ تمہارا رب تم کو خوب جانتا ہے، اگر وہ چاہے گا تم پر رحم فرمائے گا یا اگر چاہے گا تم کو عذاب دے گا اور ہم نے تم کو ان پر مسئول بنا کر مامور نہیں کیا ہے اور تمہارا رب ہی خوب جانتا ہے ان کو جو آسمانوں اور زمین میں ہیں اور ہم نے بعض نبیوں کو بعض پر فضیلت بخشی ہے اور ہم نے داؤد کو زبور عطا کی۔ ۵۳-۵۵

کہہ دو کہ ان کو پکار دیکھو جن کو تم نے اس کے سوا معبود گمان کر رکھا ہے، نہ وہ تم سے کسی مصیبت کو دفع ہی کر سکیں گے، نہ اس کو ٹال ہی سکیں گے۔ جن کو یہ پکارتے ہیں وہ تو خود ہی اپنے رب کے قرب کی طلب میں سرگرم ہیں کہ ان میں سے کون سب سے زیادہ قرب حاصل کرتا ہے اور وہ اپنے رب کی رحمت کے امیدوار ہیں اور اس کے عذاب سے ڈرتے ہیں۔ بے شک تمہارے رب کا عذاب چیز ہی ڈرنے کی ہے۔ ۵۶-۵۷

۹- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

أَفَأَصْفَاكُمْ رَبُّكُم بِالْبَنِينَ وَاتَّخَذَ مِنَ الْمَلَائِكَةِ إِنَاثًا ۚ إِنَّكُمْ لَتَقُولُونَ قَوْلًا عَظِيمًا (۴۰)

'اصفاء' کے معنی خاص اور خالص کر دینے کے ہیں۔

تردید شرک نئے اسلوب سے

اوپر کے مجموعۂ آیات کو شرک کی تردید پر ختم فرمایا تھا، اسی مضمون کو ایک نئے اسلوب سے پھر لے لیا۔ فرمایا کہ کیا تمہارے رب نے تمہیں تو بیٹوں کے لیے مخصوص کر لیا اور خود اپنے لیے فرشتوں میں سے بیٹیاں بنا لیں۔ یہ واضح رہے کہ فرشتوں کو مشرکین عرب خدا کی بیٹیاں کہتے تھے اور اس وہم کے ساتھ ان کی پرستش کرتے تھے کہ یہ اپنے باپ سے ان کے لیے سفارش کرتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے یہاں ان کی اس دوہری حماقت پر توجہ دلائی ہے کہ اول تو کسی کو خدا کا شریک ٹھہرانا ہی حماقت ہے۔ پھر ستم بالائے ستم تم نے یہ کیا ہے کہ خدا کے لیے بیٹیاں منتخب کی ہیں جن کو خود اپنے لیے سخت ناپسند کرتے ہو۔

إِنَّكُمْ لَتَقُولُونَ قَوْلًا عَظِيمًا۔ یعنی یہ تو تم بڑی ہی بھونڈی اور نہایت ہی سنگین بات کہتے ہو۔ یہ صرف حماقت ہی نہیں بلکہ حماقت در حماقت ہے کہ اپنے رب کے لیے اس چیز کا انتخاب کرتے ہو جس کو اپنے لیے گوارا کرنے پر آمادہ نہیں۔ گویا خدا کو تم نے خود اپنے سے بھی گرا دیا۔

وَلَقَدْ صَرَّفْنَا فِي هَٰذَا الْقُرْآنِ لِيَذَّكَّرُوا وَمَا يَزِيدُهُمْ إِلَّا نُفُورًا (۴۱)

'تصریف' کے معنی گردش دینے کے ہیں۔ یہاں اس سے مراد کسی حقیقت کو مختلف اسلوبوں اور گوناگون طریقوں سے پیش کرنا ہے۔ مثلاً توحید ہی کا مضمون قرآن میں اتنے مختلف اسلوبوں اور طریقوں سے بیان ہوا ہے کہ غبی سے غبی آدمی بھی، اگر ہٹ دھرم نہ ہو تو اس کو ذہن نشین کر سکتا ہے۔ لیکن جو لوگ ضدی اور جھگڑالو ہوتے ہیں، بات کو ماننا نہیں چاہتے، ان کی بیزاری اور نفرت اتنی ہی بڑھتی جاتی ہے جتنی کہ بات واضح ہوتی جاتی ہے اس لیے کہ اس کی وضاحت کو وہ اپنی شکست اور رسوائی سمجھتے ہیں۔ فرمایا کہ ہم نے اس قرآن میں

توحید کی حقیقت اور شرک کی شناعت گوناگوں پہلوؤں سے واضح کی کہ یہ لوگ یاد دہانی حاصل کریں لیکن جتنی ہی ان کی دوا کی گئی اتنا ہی ان کا مرض بڑھتا گیا۔

'قُلْ لَّوْ كَانَ مَعَهٗٓ اٰلِهَةٌ كَمَا يَقُوْلُوْنَ اِذًا لَّابْتَغَوْا اِلٰى ذِي الْعَرْشِ سَبِيْلًا' (۴۲)

مشرکین عرب دنیوی بادشاہوں اور بادشاہتوں پر قیاس کر کے اللہ تعالیٰ کو تو صاحب تخت و تاج یعنی معبودِ اعظم مانتے تھے اور اس کے تحت بہت سے دوسرے دیوی دیوتاؤں کو بھی مانتے تھے جن کی نسبت ان کا گمان تھا کہ وہ خدائی میں شریک ہیں اور اپنے پجاریوں کے لیے وہ صاحب عرش کے تقرب کا بھی ذریعہ بنتے ہیں اور ان کی خواہشیں اور ضرورتیں بھی اس سے پوری کرا دیتے ہیں۔ یہ ان کے اسی واہمہ کی تردید ہے۔ فرمایا کہ اگر خدا کے ساتھ اس کے کچھ شریک و سہیم بھی ہوتے، جیسا کہ تم گمان کیے بیٹھے ہو، تو وہ ایک نہ ایک دن ضرور صاحب عرش سے منازعت و مخاصمت کی راہ ڈھونڈھ لیتے اور یہ آسمان و زمین کا سارا نظام درہم برہم ہو کے رہ جاتا۔ مطلب یہ ہے کہ جس زمین کے بادشاہوں اور بادشاہتوں پر قیاس کر کے تم نے یہ تخیل آراستہ کیا ہے اس میں تو دیکھتے ہو کہ آئے دن حکومتوں کے نقشے بگڑتے بنتے رہتے ہیں۔ اگر اسی طرح خدا کے بھی کچھ شریک و سہیم اور حریف ہوتے تو آخر وہ کیوں چپکے بیٹھے رہتے، وہ کیوں نہ صاحب عرش بننے کے لیے زور لگاتے لیکن یہاں تو دیکھتے ہو کہ نہ ایک دن کے لیے سورج اپنے محور سے کھسکا اور نہ زمین اپنے مدار سے منحرف ہوئی۔ اسی حقیقت کو دوسرے مقام میں یوں واضح فرمایا ہے۔ 'لَوْ كَانَ فِيْهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا' ۲۲- انبیاء (اگر آسمان و زمین میں اللہ کے سوا دوسرے معبود بھی ہوتے تو یہ درہم برہم ہو کے رہ جاتے)۔

'سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يَقُوْلُوْنَ عُلُوًّا كَبِيْرًا' (۴۳)

یعنی اللہ تعالیٰ اس قسم کے اوہام و خرافات سے بالکل منزہ اور نہایت برتر ہے۔ ان قیاسات و تشبیہات اس کی اعلیٰ صفات کے ساتھ کوئی جوڑ نہیں ہے۔

'تُسَبِّحُ لَهُ السَّمٰوٰتُ السَّبْعُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهِنَّ ۭ وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ ۭ اِنَّهٗ كَانَ حَلِيْمًا غَفُوْرًا' (۴۴)

'بحمدہٖ' کا مفہوم

'تسبیح' کی اصل روح تنزیہ ہے یعنی اللہ تعالیٰ کو ان تمام نسبتوں اور صفتوں سے بری اور بالاتر قرار دینا جو اس کی اعلیٰ صفات اور شان کے منافی ہیں۔ اس کے ساتھ جب 'بِحَمْدِهٖ' کی قید لگ جاتی ہے جس طرح یہاں 'يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ' ہے تو اس کے اندر تنزیہ کے ساتھ اثبات کا مفہوم بھی پیدا ہو جاتا ہے یعنی اس کو تمام اعلیٰ صفات سے متصف قرار دینا۔

مطلب یہ ہے کہ ایک خاص دائرہ کے اندر خدا نے تم کو اختیار بخشا ہے۔ اس سے غلط فائدہ اٹھا کر تم جو تہمتیں چاہو خدا پر جوڑو لیکن ساتوں آسمان اور زمین اور ان کے اندر جتنی مخلوقات ہیں سب خدا کی تسبیح کرتی ہیں لیکن تم ان کی تسبیح سمجھتے نہیں۔

'اِنَّهٗ كَانَ حَلِيْمًا غَفُوْرًا'۔ یعنی تمہاری یہ حرکت تو ایسی ہے کہ تم پر آسمان ٹوٹ پڑتا لیکن اللہ بڑا

ہی حلیم اور غفور ہے، تمہاری ان حرکتوں کے باوجود تمہیں مہلت دیے جا رہا ہے۔

وَإِذَا قَرَأْتَ الْقُرْآنَ جَعَلْنَا بَيْنَكَ وَبَيْنَ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ حِجَابًا مَسْتُورًا (۴۵)

کفار کا قرآن سے بیزاری کا اصل سبب

یہ اس تعجب کو دور فرمایا ہے کہ قرآن جیسی واضح چیز، جس میں ایک ایک بات گوناگوں اسلوبوں سے، جیسا کہ آیت ۴۱ میں فرمایا، بیان ہوئی ہے، ان لوگوں کی سمجھ میں کیوں نہیں آرہی ہے اور یہ اس سے اس درجہ وحشت زدہ کیوں ہیں؟ فرمایا کہ یہ لوگ نہ آخرت کو مانتے ہیں اور نہ آخرت کو ماننا چاہتے ہیں۔ یہ چیز ان کے دلوں پر ایک مخفی حجاب بن کر چھا گئی ہے جس کا اثر یہ ہے کہ قرآن کے انوار ان کے دلوں پر منعکس نہیں ہو پاتے۔

وَجَعَلْنَا عَلَى قُلُوبِهِمْ أَكِنَّةً أَنْ يَفْقَهُوهُ وَفِي آذَانِهِمْ وَقْرًا ۚ وَإِذَا ذَكَرْتَ رَبَّكَ فِي الْقُرْآنِ وَحْدَهُ وَلَّوْا عَلَى أَدْبَارِهِمْ نُفُورًا (۴۶)

'اَكِنَّة'، 'كِنَان' کی جمع ہے جس کے معنی پردہ کے ہیں۔ 'اَنْ يَفْقَهُوهُ'، یعنی كَرَاهَةَ اَنْ يَفْقَهُوهُ 'ان' سے پہلے مضاف حذف ہو گیا ہے۔ 'وَفِي آذَانِهِمْ وَقْرًا' کے بعد 'اَنْ يَسْمَعُوهُ' حذف ہے قرینہ اس پر دلیل ہے۔

یہ اوپر والے مضمون ہی کی مزید وضاحت ہے کہ ہم نے ان کے دلوں پر پردے ڈال دیے ہیں کہ وہ قرآن کو نہ سمجھیں اور ان کے کانوں میں ثقل پیدا کر دیا ہے کہ وہ اس کو نہ سنیں وَإِذَا ذَكَرْتَ رَبَّكَ فِي الْقُرْآنِ وَحْدَهُ وَلَّوْا عَلَى أَدْبَارِهِمْ نُفُورًا۔ یہ ان کی قرآن سے وحشت کا دوسرا بڑا سبب ہے کہ چونکہ تم قرآن میں صرف اللہ واحد ہی کا ذکر سناتے ہو ان کے مزعومہ معبودوں کو کوئی درجہ نہیں دیتے، اور یہ لوگ آخرت کی طرح توحید سے بھی بیزار ہیں اس وجہ سے قرآن کو سنتے ہی وحشت زدہ ہو کر پیٹھ پیچھے بھاگتے ہیں

ختم قلوب کی سنت الٰہی

آیت میں دلوں پر پردہ اور کانوں میں ثقل پیدا کرنے سے اشارہ اس سنت الٰہی کی طرف ہے جس کا ذکر سورۂ بقرہ میں ختم قلوب کے عنوان سے ہوا ہے۔ ہم سورۂ بقرہ کی تفسیر میں پوری تفصیل کے ساتھ اس سنت الٰہی کے ہر پہلو کی وضاحت کر چکے ہیں، تفصیل کے طالب اس کو پڑھیں۔ یہاں اس کے اعادے میں طوالت ہوگی۔

نَحْنُ أَعْلَمُ بِمَا يَسْتَمِعُونَ بِهِ إِذْ يَسْتَمِعُونَ إِلَيْكَ وَإِذْ هُمْ نَجْوَى إِذْ يَقُولُ الظَّالِمُونَ إِنْ تَتَّبِعُونَ إِلَّا رَجُلًا مَسْحُورًا (۴۷)

یعنی یہ قرآن کو سمجھنے اور اس سے فائدہ اٹھانے کے لیے تو کبھی اس کو سنتے نہیں کہ اس سے ان کو نفع پہنچے، یہ اگر سنتے ہیں تو اس غرض سے سنتے ہیں کہ کوئی پہلو اعتراض اور نکتہ چینی کا ہاتھ آئے اور اس کو اس کے خلاف بدگمانیاں پھیلانے کے لیے لے اڑیں۔ فرمایا کہ ہم ان کی اس نیت کو بھی خوب جانتے ہیں اور ان کی ان سرگوشیوں کو بھی خوب جانتے ہیں جب یہ مسلمانوں کو قرآن سے برگشتہ کرنے کے لیے یہ کہتے ہیں کہ تم لوگ تو ایک بالکل خبطی اور سحر زدہ شخص کے پیچھے چل پڑے ہو

اُنْظُرْ كَيْفَ ضَرَبُوا لَكَ الْأَمْثَالَ فَضَلُّوا فَلَا يَسْتَطِيعُونَ سَبِيلًا (۴۸)

ضَرْبِ مَثَل سے مراد یہاں فقرے اور پھبتیاں چست کرنا ہے، ملاحظہ ہو آیات ۸-۹ فرقان۔
مطلب یہ ہے کہ تم پر اور قرآن پر اعتراض کرنے کی کوئی راہ تو انھیں مل نہیں رہی ہے اس وجہ سے یہ بالکل کھوئے گئے ہیں۔ نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن۔ ماننا چاہتے نہیں اور تردید کا کوئی پہلو ہاتھ نہیں آرہا ہے اس وجہ سے جس کے منہ میں جو کچھ آجاتا ہے، دل کی بھڑاس نکالنے کے لیے وہی بک دیتا ہے۔ کوئی کاہن بتاتا ہے، کوئی مجنون، کوئی ساحر کہتا ہے کوئی مسحور۔ مطلب یہ ہے کہ ایسے حواس باختوں کی باتوں پر صبر کرو اور ان کو ان کے حال پر چھوڑ دو۔ اصل حقیقت بہت جلد ان کے سامنے آجائے گی۔

وَقَالُوْٓا ءَاِذَا كُنَّا عِظَامًا وَّرُفَاتًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ خَلْقًا جَدِيْدًا (۴۹)

کفار کے آخرت سے بیزاری

یہ آخرت کے بارے میں ان کے استبعاد کو نقل فرمایا ہے کہ وہ بر سبیل استہزاء و طنز پوچھتے ہیں کہ کیا ہم جب سڑگل کر ہڈیاں اور ریزہ ریزہ ہو جائیں گے تو ہم از سر نو اٹھائے جائیں گے!!

قُلْ كُوْنُوْا حِجَارَةً اَوْ حَدِيْدًا ۙ اَوْ خَلْقًا مِّمَّا يَكْبُرُ فِيْ صُدُوْرِكُمْ ۚ فَسَيَقُوْلُوْنَ مَنْ يُّعِيْدُنَا ۭ قُلِ الَّذِيْ فَطَرَكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ ۚ فَسَيُنْغِضُوْنَ اِلَيْكَ رُءُوْسَهُمْ وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰى هُوَ ۭ قُلْ عَسٰٓى اَنْ يَّكُوْنَ قَرِيْبًا (۵۰-۵۱)

'قُلْ كُوْنُوْا حِجَارَةً اَوْ حَدِيْدًا اَوْ خَلْقًا مِّمَّا يَكْبُرُ فِيْ صُدُوْرِكُمْ' فرمایا کہ ان کو جواب دے دو کہ ہڈیاں اور ریزے ریزے ہو جانا تو درکنار اگر تم پتھر یا لوہا بھی بن جاؤ یا ان سے بھی کوئی سخت تر چیز جو تمہارے خیال میں زندگی قبول کرنے کی صلاحیتوں سے بالکل خالی ہو، جب بھی تم از سر نو اٹھائے جاؤ گے۔

'فَسَيَقُوْلُوْنَ مَنْ يُّعِيْدُنَا' فرمایا کہ تمہاری اس بات پر وہ کہیں گے کہ بھلا کون ہمیں اٹھائے گا، یہ استفہام انکاری ہے، یعنی وہ کہیں گے کہ بھلا سڑگل جانے کے بعد کون ہمیں دوبارہ اٹھا سکتا ہے!! اس کا جواب بتایا کہ 'قُلِ الَّذِيْ فَطَرَكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ' ان سے کہہ دینا کہ وہی جس نے تم کو پہلی مرتبہ پیدا کیا، یہ جواب نہایت مختصر لیکن بھرپور ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جس خدا کو تمھیں عدم محض سے پیدا کرنے میں کوئی زحمت پیش نہیں آئی، آخر تمھیں دوبارہ وجود میں لانے سے وہ کیوں عاجز ہو جائے گا۔

'فَسَيُنْغِضُوْنَ اِلَيْكَ رُءُوْسَهُمْ وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰى هُوَ' 'انغاض' کے معنی سر ہلانے کے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ تمہارے اس مسکت جواب کے بعد بھی یہ چپ رہنے والے اسامی نہیں ہیں بلکہ اس کے بعد بانداز استہزاء وہ یہ سوال کریں گے کہ یہ کب ہوگا؟ اس کا جواب یہ بتایا کہ 'قُلْ عَسٰٓى اَنْ يَّكُوْنَ قَرِيْبًا' کہہ دیجیو کہ بہت ممکن ہے کہ اس کا وقت قریب ہی آلگا ہو۔ اس جواب کے اندر یہ حقیقت مضمر ہے کہ جہاں تک قیامت کے وقت کا تعلق ہے اس کا پتہ تو اللہ کے سوا کسی کو بھی نہیں ہے۔ یہاں تک کہ پیغمبر کو بھی اس کا علم نہیں ہے لیکن جو چیز شدنی ہے وہ بہرحال شدنی ہے۔ وہ دیر سویر ہو کے رہے گی، اس کو محض اس بنیاد پر تو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ اس کا ٹھیک ٹھیک وقت ہمارے علم میں نہیں ہے۔ وقت تو اپنی موت کا بھی کسی کو معلوم نہیں ہے لیکن احمق ہی ہوگا جو اس کا اس بنا پر انکار کر بیٹھے کہ اس کو اس کا وقت معلوم نہیں ہے۔

يَوْمَ يَدْعُوكُمْ فَتَسْتَجِيبُونَ بِحَمْدِهِ وَتَظُنُّونَ إِن لَّبِثْتُمْ إِلَّا قَلِيلًا (۵۲)

اب یہ ان کو براہِ راست خطاب کر کے فرمایا کہ آج تو بہت اکڑتے ہو لیکن اس دن کو یاد رکھو جس دن پکار ہوگی اور تم اس پکار پر خدا کی حمد کرتے ہوئے دوڑو گے۔ اس دن سارے حجابات چاک ہو جائیں گے اور ایک ایک حقیقت آنکھوں سے نظر آجائے گی۔ نیز یہ مدت جو تمہارے اور قیامت کے درمیان حائل ہے اور تمہیں بہت طویل نظر آرہی ہے، اس دن ایسا محسوس کرو گے کہ ابھی سوئے تھے ابھی جاگ پڑے ہیں۔ مطلب یہ کہ جو مرا بس سمجھو کہ اس کی قیامت سر پر کھڑی ہے اس لیے کہ برزخ میں جو زندگی گزرے گی اس کا کوئی احساس باقی نہیں رہے گا۔

وَقُل لِّعِبَادِي يَقُولُوا الَّتِي هِيَ أَحْسَنُ ۚ إِنَّ الشَّيْطَانَ يَنزَغُ بَيْنَهُمْ ۚ إِنَّ الشَّيْطَانَ كَانَ لِلْإِنسَانِ عَدُوًّا مُّبِينًا (۵۳)

مسلمانوں کو حکمت تبلیغ کی تعلیم

اوپر کی آیات سے یہ بات بالکل واضح ہے کہ اس دور میں مخالفین نے طنز و تعریض کے تمام ترکش سنبھال لیے تھے۔ جب جب کوئی موقع گفتگو کا نکلتا مسلمانوں کی بھی تحقیر کرتے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بھی گستاخی اور بدتمیزی سے پیش آتے۔ اوپر آیت ۴۷ میں اس کی ایک مثال گزر چکی ہے۔ یہ صورتِ حال مقتضی ہوئی کہ اس باب میں مسلمانوں کو ضروری ہدایات دے دی جائیں تاکہ وہ کفار کے رویہ سے متاثر ہو کر کوئی ایسا قدم نہ اٹھا بیٹھیں جو دعوت کے مزاج کے منافی ہو۔ فرمایا کہ میرے بندوں (مسلمانوں) سے کہہ دو کہ وہی بات کہیں جو بہتر ہو یعنی مخالفین کی بے ہودہ باتوں کا جواب دینے کی کوشش نہ کریں۔ صرف صحیح اور سچی بات پہنچا دینے کی کوشش کریں اور اس حقیقت کو یاد رکھیں کہ شیطان جو انسان کا کھلا ہوا دشمن ہے، ہر وقت اس گھات میں لگا ہوا ہے کہ کب کوئی موقع ہاتھ آئے اور وہ وسوسہ اندازی کر کے سارے کام کو خراب کر دے۔ بعینہٖ یہی ہدایت اسی طرح کے مواقع کے لیے سورہ نحل میں ان الفاظ میں گزر چکی ہے۔ ادْعُ إِلَىٰ سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ ۖ وَجَادِلْهُم بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ ۚ إِنَّ رَبَّكَ هُوَ أَعْلَمُ بِمَن ضَلَّ عَن سَبِيلِهِ ۖ وَهُوَ أَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِينَ۔ ۱۲۵۔ نحل۔ سورۂ اعراف کی آیات ۱۹۸-۲۰۱ میں بھی یہی مضمون بیان ہوا ہے۔ مزید وضاحت مطلوب ہو تو ان پر بھی ایک نظر ڈال لیجیے۔

رَّبُّكُمْ أَعْلَمُ بِكُمْ ۖ إِن يَشَأْ يَرْحَمْكُمْ أَوْ إِن يَشَأْ يُعَذِّبْكُمْ ۚ وَمَا أَرْسَلْنَاكَ عَلَيْهِمْ وَكِيلًا (۵۴)

دعوت کے معاملہ میں مومنین کی ذمہ داری

یہ دعوت کے معاملے میں مومنین اور پیغمبر کی ذمہ داری کی حد واضح فرما دی تاکہ کفار کے معاندانہ رویے سے ان کے دل تنگ نہ ہوں۔ فرمایا کہ یہ خدا ہی کو معلوم ہے کہ کون رحمت کا مستحق ہے اور وہ ہدایت پا کر رحمت کا مستحق ہوگا اور کون عذاب کا مستحق ہے اور وہ گمراہی پر جما رہے گا اور عذاب کا سزاوار ٹھہرے گا۔ پیغمبر اور اس کے ساتھیوں کی ذمہ داری صرف دعوت کو پہنچا دینے کی ہے۔ ان پر یہ ذمہ داری نہیں ہے کہ وہ لازماً سب کو مومن بنا ہی دیں۔ مطلب یہ ہے کہ تم کوئی داروغہ ان پر مقرر نہیں ہوئے ہو کہ ان کے کفر و ایمان کے معاملے میں تمہیں جواب دہی کرنی ہو۔ تمہارے اوپر ذمہ داری صرف حق پہنچا دینے کی ہے وہ پہنچا دو، ماننا نہ ماننا ان کا

کام ہے اور اس کی پرستش خدا کے ہاں انھیں سے ہونی ہے تم سے نہیں ہونی ہے تو تم بلاوجہ زیادہ پریشان کیوں ہو؟

وَرَبُّكَ اَعْلَمُ بِمَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ وَلَقَدْ فَضَّلْنَا بَعْضَ النَّبِيّٖنَ عَلٰي بَعْضٍ وَّاٰتَيْنَا دَاوٗدَ زَبُوْرًا (۵۵)

تفضیلِ انبیاء میں باہم تفاضل

مباحثے کی گرما گرمی میں جو چیز سب سے زیادہ فتنہ کا سبب بنتی ہے وہ اپنے اپنے مقتداؤں کی متعصبانہ ترجیح و تفضیل ہے۔ جو جس کو مانتا ہے ساری فضیلت بس اسی کے ساتھ باندھ کے رکھ دیتا ہے، کسی دوسرے کے لیے کسی فضیلت کے تسلیم کرنے میں وہ اپنی ہتک اور شکست محسوس کرتا ہے۔ اس دور میں معلوم ہوتا ہے کہ یہ فتنہ بھی اٹھ کھڑا ہوا تھا یا اس کے اٹھ کھڑے ہونے کا اندیشہ تھا۔ بالخصوص اس وجہ سے کہ یہود، جیسا کہ پیچھے گزر چکا ہے، اپنی تمام فتنہ سامانیوں کے ساتھ میدانِ مخالفت میں اتر آئے اور وہ مخالفین کی پیٹھ ٹھونک رہے تھے۔ یہود کو، جیسا کہ بقرہ آیت ۲۵۳ کے تحت گزر چکا ہے، اس فتنہ سے خاص دلچسپی تھی۔ قرآن نے اس فتنہ کا سر کچلنے کے لیے مسلمانوں کو یہ تعلیم دی کہ زمین اور آسمان میں جو ہیں سب سے اللہ ہی خوب واقف ہے، وہی جانتا ہے کہ کس کا درجہ کیا ہے اور کون کس مرتبہ پر سرفراز ہے۔ اس چیز کو دوسرے لوگ نہیں جانتے۔ رہا یہ سوال کہ نبیوں میں سے کس کو کس پر فضیلت ہے تو اللہ نے اپنے بعض انبیاء کو بعض پر بعض اعتبارات سے فضیلت بخشی۔ مثلاً حضرت موسیٰ سے اللہ نے کلام کیا، حضرت عیسیٰ ابن مریم کو بینات عطا فرمائیں اور روح القدس سے ان کی تائید کی، حضرت داؤد کو زبور عطا فرمائی۔ نبیوں کے باب میں یہی نقطۂ نظر صحیح ہے اور مسلمانوں کو اسی پر جمے رہنے کی تاکید ہوئی کہ وہ آنحضرت صلعم کے اختصاص و امتیاز کے جو پہلو ہیں ان کا بھی اظہار و اعلان کریں اور دوسرے نبیوں کے جو امتیازی پہلو ہیں ان کو بھی تسلیم کریں۔ اس مسئلے پر بقرہ آیت ۲۵۳ کے تحت ہم جو کچھ لکھ آئے ہیں ایک نظر اس پر بھی ڈال لیجیے۔ حضرت داؤد کو جو زبور عطا ہوئی اس کا خاص امتیازی پہلو یہ ہے کہ آسمانی کتابوں میں یہی ایک کتاب منظوم شکل میں ہے، جو تمام تر حمد و تمجید کے نغمات پر مشتمل ہے۔

قُلِ ادْعُوا الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ فَلَا يَمْلِكُوْنَ كَشْفَ الضُّرِّ عَنْكُمْ وَلَا تَحْوِيْلًا (۵۶)

کلام کا تعلق اوپر کے مضمون سے

اوپر کی تین آیتیں، جیسا کہ ہم عرض کر چکے ہیں، اثنائے کلام میں، بطور جملہ معترضہ، برسر موقع تنبیہ و ہدایت کے لیے آ گئی تھیں، اب پھر کلام اپنے اصلی سلسلہ یعنی آیات ۵۱-۵۲ سے جڑ گیا۔ اوپر ارشاد ہوا تھا کہ جس ساعت کے ظہور کے لیے تم جلدی مچائے ہوئے ہو کیا عجب کہ اس کا وقت قریب آ پہنچا ہو۔ اب یہاں فرمایا کہ جن کو تم خدا کا شریک بنائے بیٹھے ہو اگر تمہارا گمان یہ ہے کہ وہ تمہاری مدد کریں گے تو ان کو بلا دیکھو، نہ وہ کسی مصیبت کو دور کر سکیں گے اور نہ یہی کر سکیں گے کہ کچھ دیر ہی کے لیے اس کا رخ کسی اور طرف موڑ دیں۔

اُولٰۗىِٕكَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ يَبْتَغُوْنَ اِلٰى رَبِّهِمُ الْوَسِيْلَةَ اَيُّهُمْ اَقْرَبُ وَيَرْجُوْنَ رَحْمَتَهٗ وَيَخَافُوْنَ عَذَابَهٗ ۭ اِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ كَانَ مَحْذُوْرًا (۵۷)

یعنی جن فرشتوں کو یہ خدا کا شریک بنائے بیٹھے ہیں وہ تو خود ہر وقت خدا کے قرب کی طلب میں سرگرم ہیں۔ وہ اس کی رحمت کے امیدوار اور اس کے عذاب سے ڈرتے ہیں اور کیوں نہ ڈریں۔ تیرے رب کا عذاب چیز ہی

ایسی ہے کہ اس سے ہر شخص ڈرے اور بچے، خواہ وہ کتنا ہی عالی مقام ہو۔

۱۰- آگے کا مضمون ـــــ آیات ۵۸-۶۰

عذاب کے باب میں سنتِ الٰہی

پیچھے آیت ۱۱ میں یہ بات گزر چکی ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم جب مشرکین کو عذابِ الٰہی سے ڈراتے تو وہ جھٹ عذاب کا مطالبہ شروع کر دیتے کہ جس عذاب کی روز دھمکی سنا رہے ہو اس کو لا کر دکھاتے کیوں نہیں۔ اب یہاں اوپر والی آیات میں اس کا ذکر آیا تو اس باب میں جو سنت الٰہی ہے اس کی وضاحت فرما دی کہ اللہ تعالیٰ لوگوں کی طلب پر عذاب کی نشانیاں اگر نہیں دکھاتا تو کیوں نہیں دکھاتا ـــ آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۵۸-۶۰

وَاِنْ مِّنْ قَرْيَةٍ اِلَّا نَحْنُ مُهْلِكُوْهَا قَبْلَ يَوْمِ الْقِيٰمَةِ اَوْ
مُعَذِّبُوْهَا عَذَابًا شَدِيْدًا ۭ كَانَ ذٰلِكَ فِي الْكِتٰبِ
مَسْطُوْرًا ﴿۵۸﴾ وَمَا مَنَعَنَآ اَنْ نُّرْسِلَ بِالْاٰيٰتِ اِلَّآ اَنْ كَذَّبَ
بِهَا الْاَوَّلُوْنَ ۭ وَاٰتَيْنَا ثَمُوْدَ النَّاقَةَ مُبْصِرَةً فَظَلَمُوْا بِهَا ۭ
وَمَا نُرْسِلُ بِالْاٰيٰتِ اِلَّا تَخْوِيْفًا ﴿۵۹﴾ وَاِذْ قُلْنَا لَكَ اِنَّ رَبَّكَ
اَحَاطَ بِالنَّاسِ ۭ وَمَا جَعَلْنَا الرُّءْيَا الَّتِيْٓ اَرَيْنٰكَ اِلَّا فِتْنَةً
لِّلنَّاسِ وَالشَّجَرَةَ الْمَلْعُوْنَةَ فِي الْقُرْاٰنِ ۭ وَنُخَوِّفُهُمْ ۙ فَمَا
يَزِيْدُهُمْ اِلَّا طُغْيَانًا كَبِيْرًا ﴿۶۰﴾ ع ۶ ۶

ترجمۂ آیات ۵۸-۶۰

اور کوئی بستی ایسی نہیں ہے جس کو قیامت سے پہلے ہم ہلاک نہ کر چھوڑیں یا اس کو کوئی سخت عذاب نہ دیں۔ یہ بات کتاب میں لکھی ہوئی ہے۔ اور ہم کو نشانیاں بھیجنے سے نہیں روکا مگر اس چیز نے کہ اگلوں نے ان کو جھٹلایا۔ اور ہم نے قوم ثمود کو ایک اونٹنی ایک آنکھیں کھول دینے والی نشانی دی تو انھوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا اور اس کی تکذیب کر دی اور ہم نشانیاں بھیجتے ہیں تو ڈرانے ہی کے لیے بھیجتے ہیں۔ ۵۸-۵۹

اور یاد کرو جب ہم نے تم سے کہا کہ تمھارے رب نے لوگوں کو اپنے گھیرے میں لے لیا۔ اور وہ رویا جو ہم نے تم کو دکھائی اس کو ہم نے لوگوں کے لیے بس ایک فتنہ ہی بنا دیا اور اس درخت کو بھی جس پر قرآن میں لعنت وارد ہوئی اور ہم تو ان کو ڈراتے ہیں لیکن یہ چیز ان کی غایت سرکشی میں اضافہ کیے جا رہی ہے۔ ۶۰

۱۱۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَإِنْ مِّنْ قَرْيَةٍ إِلَّا نَحْنُ مُهْلِكُوهَا قَبْلَ يَوْمِ الْقِيَامَةِ أَوْ مُعَذِّبُوهَا عَذَابًا شَدِيدًا ۚ كَانَ ذَٰلِكَ فِي الْكِتَابِ مَسْطُورًا (۵۸)

'قَرْيَةٌ' سے مراد یہاں، جیسا کہ ہم پیچھے اشارہ کر آئے ہیں، وہ مرکزی بستیاں ہیں جو کسی قوم کے اعیان و مترفین کا مرکز ہوتی ہیں۔

مطالبۂ نشانی عذاب کا جواب

یہ کفار قریش کے مطالبۂ نشانی عذاب کا جواب دیا جا رہا ہے کہ یہ عذاب کے لیے جلدی نہ مچائیں، ہر بستی جو کفر و طغیان کی راہ اختیار کرے گی وہ دو حالتوں میں سے کسی ایک سے لازماً دوچار ہو کے رہے گی۔ یا تو ہم اس کو ہلاک کر چھوڑیں گے یا اس کو سخت عذاب دیں گے۔ یہاں بات اجمال کے ساتھ فرمائی گئی ہے لیکن اسی سورہ میں پیچھے وہ سنت الٰہی بھی بیان ہو گئی ہے جس کے تحت یہ بات واقع ہوتی ہے۔ آیت ۱۶ پر ایک نظر پھر ڈال لیجیے۔

وَإِذَا أَرَدْنَا أَنْ نُّهْلِكَ قَرْيَةً أَمَرْنَا مُتْرَفِيهَا فَفَسَقُوا فِيهَا فَحَقَّ عَلَيْهَا الْقَوْلُ فَدَمَّرْنَاهَا تَدْمِيرًا۔ (۱۶۔ بنی اسرائیل)

اور جب ہم کسی بستی کو ہلاک کر دینا چاہتے ہیں تو اس کے خوش حالوں کو ڈھیلا چھوڑ دیتے ہیں تو وہ اس میں نافرمانیاں کرتے ہیں، پھر ان پر بات پوری ہو جاتی ہے پھر ہم اس کو بالکل نیست و نابود کر کے رکھ دیتے ہیں۔

یوں تو یہ سنت الٰہی ہمیشہ سے جاری ہے اور ہمیشہ جاری رہے گی لیکن کفار قریش کے لیے یہ مسئلہ اور بھی زیادہ سنگین اس وجہ سے بن گیا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے ان میں انہی کے اندر سے ایک رسول بھیج دیا تھا۔ رسول اتمام حجت کا آخری ذریعہ ہوتا ہے۔ اگر کوئی قوم رسول کی تکذیب کر دیتی ہے تو ایک خاص مدت تک مہلت پانے کے بعد وہ لازماً تباہ کر دی جاتی ہے۔

'كَانَ ذَٰلِكَ فِي الْكِتَابِ مَسْطُورًا' یعنی یہ بات نوشتۂ الٰہی یا خدا کے دفتر میں مرقوم ہے۔ اس نے یہ لکھ رکھا ہے کہ فلاں قوم ان ان جرائم کی اپنے ارادہ و اختیار سے مرتکب ہو گی اور ان کی پاداش میں وہ یوں اپنے کیفر کردار

کو پہنچے گی۔

وَمَا مَنَعَنَآ اَنْ نُّرْسِلَ بِالْاٰيٰتِ اِلَّآ اَنْ كَذَّبَ بِهَا الْاَوَّلُوْنَ ۭ وَاٰتَيْنَا ثَمُوْدَ النَّاقَةَ مُبْصِرَةً فَظَلَمُوْا بِهَا ۭ وَمَا نُرْسِلُ بِالْاٰيٰتِ اِلَّا تَخْوِيْفًا (۵۹)

نشانی نہ بھیجنے کی حکمت

یہ اللہ تعالیٰ نے اپنی وہ حکمت و رحمت واضح فرمائی ہے جس کے سبب سے وہ لوگوں کے شدید مطالبہ کے باوجود کوئی نشانی عذاب نہیں بھیج رہا ہے۔ فرمایا کہ نشانیوں کا مقصد تو لوگوں کو ڈرانا اور متنبہ کرنا ہوتا ہے کہ وہ ان کو دیکھ کر اس عذاب الٰہی سے ڈریں جس سے ان کو آگاہ کیا جا رہا ہے لیکن پچھلی قوموں نے اپنی شامت اعمال سے ہمیشہ یہ کیا کہ ان نشانیوں سے متنبہ ہونے کے بجائے ان کی تکذیب کر کے اپنے لیے انھوں نے عذاب الٰہی کا دروازہ کھول لیا۔

'وَاٰتَيْنَا ثَمُوْدَ النَّاقَةَ مُبْصِرَةً فَظَلَمُوْا بِهَا' 'ب' کا صلہ چونکہ 'ظَلَمُوْا' کے ساتھ مناسبت نہیں رکھتا اس وجہ سے یہاں حذف مانیں گے یعنی 'ظَلَمُوْا اَنْفُسَهُمْ وَكَذَّبُوْا بِهَا' انھوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا اور ناقہ کے نشانی ہونے کی تکذیب کر دی۔

نشانیوں کی تکذیب کی ایک مثال

یہ مثال بیان ہوئی ہے اوپر والی بات کی کہ عذاب کی نشانیوں کی پچھلی قوموں نے کس طرح تکذیب کی ہے۔ فرمایا کہ ہم نے قوم ثمود کو ناقہ ایک آنکھیں کھول دینے والی نشانی کی حیثیت سے دی۔ اگر وہ ضد سے اندھے نہ ہو چکے ہوتے تو ان کے لیے وہ کافی تھی لیکن انھوں نے اس نشانی سے کوئی فائدہ اٹھانا تو در کنار ناقہ کی کوچیں کاٹ کر اس کو ہلاک کیا اور اس طرح خود اپنی ہلاکت کے لیے عذاب الٰہی کا دروازہ کھول لیا۔

'وَمَا نُرْسِلُ بِالْاٰيٰتِ اِلَّا تَخْوِيْفًا' یعنی عذاب کی کوئی نشانی تو جب بھی ہم بھیجتے ہیں محض اصل عذاب سے متنبہ اور آگاہ کرنے کے لیے بھیجتے ہیں لیکن ہٹ دھرم لوگ اس سے قائل نہیں ہوتے، وہ اس کی کوئی نہ کوئی تاویل کر کے اپنی خوش فہمیوں کے لیے بہانہ پیدا کر ہی لیتے ہیں۔ اگر کنکر برسا دینے والی ہوا (حاصب) کا کسی طرف سے طوفان اٹھے تو یہ کہیں گے کہ یہ تو ابر کرم ہے جو ہم پر برسنے والا ہے۔ اگر کوئی اور آفت ارضی یا سماوی نمودار ہو تو کہیں گے کہ قوموں پر ایسے نرم و سخت دن تو آیا ہی کرتے ہیں۔ غرض کوئی نشانی جس کا مقصود محض تخویف و تنبیہ ہو وہ تو ان کو قائل کرنے والی بن نہیں سکتی، یہ تو اگر قائل ہو سکتے ہیں تو اصل عذاب سے قائل ہو سکتے ہیں لیکن اس کے ظہور کے بعد قائل ہونے اور نہ ہونے کا سوال ہی باقی نہیں رہتا۔

وَاِذْ قُلْنَا لَكَ اِنَّ رَبَّكَ اَحَاطَ بِالنَّاسِ ۭ وَمَا جَعَلْنَا الرُّءْيَا الَّتِيْٓ اَرَيْنٰكَ اِلَّا فِتْنَةً لِّلنَّاسِ وَالشَّجَرَةَ الْمَلْعُوْنَةَ فِي الْقُرْاٰنِ ۭ وَنُخَوِّفُهُمْ ۙ فَمَا يَزِيْدُهُمْ اِلَّا طُغْيَانًا كَبِيْرًا (۶۰)

تنبیہی نشانیوں کے باب میں قریش کا رویہ

تخویفی و تنبیہی نشانیوں کے باب میں پچھلی قوموں کا جو رویہ رہا ہے اوپر کی آیات میں اس کی طرف اشارہ فرمایا۔ اب یہ خاص آنحضرت صلعم کی قوم کی بعض باتوں کا حوالہ دیا ہے جس سے یہ واضح کرنا مقصود ہے کہ اگر ان کی طلب پر ان کو بھی کوئی تخویفی نشانی دکھائی گئی تو ان کا رویہ بھی پچھلی قوموں سے کچھ مختلف نہ ہوگا۔ یہ بھی اس کی

تکذیب کردیں گے اس لیے کہ اب تک جو باتیں ان سے تخویف و تنبیہ کے مقصد سے کہی گئی ہیں انھوں نے ان سب کا مذاق ہی اڑایا ہے۔ مثلاً جب ہم نے تم کو یہ خبر دی کہ تمھارے رب نے لوگوں کو اپنے گھیرے میں لے لیا ہے تو انھوں نے اس سے متنبہ ہونے کے بجائے اس کا مذاق اڑایا کہ تم دو دن کی لے رہے اور ڈینگیں مار رہے ہو۔

یہ اشارہ ان آیات کی طرف ہے جن میں اللہ تعالیٰ نے یہ خبر دی کہ اب ہم کفارِ مکہ کے زور و اثر کو اس کے اطراف سے کم کرتے ہوئے مکہ کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ مثلاً سورۂ رعد میں ہے۔

أَوَلَمْ يَرَوْا أَنَّا نَأْتِي الْأَرْضَ نَنْقُصُهَا مِنْ أَطْرَافِهَا (۴۱ - رعد)

کیا انھوں نے نہیں دیکھا کہ ہم سرزمین (مکہ) کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ اس کے اطراف سے اس کو کم کرتے ہوئے۔

یہ بات اس وقت فرمائی گئی تھی جب اطرافِ مکہ میں اسلام پھیلنے لگا اور مکہ اور اہلِ مکہ گویا آہستہ آہستہ اسلام کے گھیرے میں آرہے تھے۔ یہی مضمون آیت ۴۴ - انبیاء میں بھی ہے۔ پھر جب فتوحات کا دور شروع ہوا تو قرآن نے فتح مکہ کی پیشین گوئی ان الفاظ میں فرمائی۔

وَأُخْرَىٰ لَمْ تَقْدِرُوا عَلَيْهَا قَدْ أَحَاطَ اللَّهُ بِهَا (۲۱ - الفتح)

اور دوسری فتوحات بھی ہیں جن پر تم ابھی قادر نہیں ہو سکے لیکن اللہ نے ان کو اپنے احاطے میں لے لیا ہے۔

یہ باتیں ہوائی نہیں تھیں بلکہ حالات ان کی صاف پیشین گوئی کر رہے تھے لیکن قریش کے ضدی لیڈروں نے ان تمام تخویفات کا آخر وقت تک انکار ہی کیا یہاں تک کہ بالآخر انھیں مسلمانوں کے آگے گھٹنے ٹیک دینے پڑے۔

'وَمَا جَعَلْنَا الرُّؤْيَا الَّتِي أَرَيْنَاكَ إِلَّا فِتْنَةً لِلنَّاسِ' یہ ان کی ضد اور ہٹ دھرمی کی دوسری مثال بیان ہوئی۔ فرمایا کہ جو رویا ہم نے تم کو دکھائی اس میں بھی ان کے لیے تخویف و تنبیہ مضمر تھی لیکن وہ بھی ان کے لیے فتنہ ہی بنی اور انھوں نے اس کا بھی مذاق ہی اڑایا۔

واقعۂ معراج پر ردِ عمل

'رُؤْيَا' سے یہاں اشارہ واقعۂ معراج کی طرف ہے جس کا ذکر سورہ کے شروع میں گزر چکا ہے۔ وہاں ہم یہ واضح کر چکے ہیں کہ اس واقعہ کے اندر قریش اور بنی اسرائیل دونوں ہی کے لیے یہ تنبیہ مضمر تھی کہ اب مسجد حرام اور مسجد اقصیٰ دونوں گھروں کی تولیت و امانت ان کے موجودہ خائن متولیوں سے چھین کر نبی امی (صلی اللہ علیہ وسلم) اور آپ پر ایمان لانے والوں کے حوالہ کی جانے والی ہے۔ لیکن اس تنبیہ سے دونوں میں سے کسی نے فائدہ نہیں اٹھایا۔ ہر ایک نے طرح طرح سے اس کا مذاق اڑایا یہاں تک کہ جو چیز ان کی تنبیہ و تخویف اور ان کو ان کے مستقبل سے آگاہ کرنے کے لیے تھی وہ ان کی شامتِ اعمال سے ان کے لیے ایک فتنہ بن کے رہ گئی[1]۔

تنبیہات سے فائدہ نہ اٹھانے کی ایک اور مثال

'وَالشَّجَرَةَ الْمَلْعُونَةَ فِي الْقُرْآنِ' یہ تیسری مثال بیان ہوئی تنبیہات سے ان کے فائدہ نہ اٹھانے کی۔

---

[1] ہم پیچھے حضرات انبیاء کی رویا اور خواب کا فرق بھی واضح کر چکے ہیں۔ انبیاء علیہم السلام کی رویا رویائے صادقہ ہوتی ہے۔ یہ وحی الٰہی کے ذرائع میں سے ایک ذریعہ ہے۔ آنحضرت صلعم کو متعدد بڑے بڑے واقعات رویا ہی میں دکھائے گئے۔ رویا کے مشاہدات بسا اوقات آنکھوں کے مشاہدات سے زیادہ قابلِ اعتماد ہوتے ہیں۔

'شَجَرَةَ مَلْعُونَة' سے اشارہ شجرۂ زقوم کی طرف ہے جس کے متعلق قرآن میں آیا ہے کہ وہ دوزخ میں ہوگا۔ اس کو دوزخی بھوک سے بیتاب ہو کر کھائیں گے پھر اس پر پیاس سے بے تاب ہو کر کھولتا پانی پیاسے اونٹوں کی طرح پئیں گے۔ شجرہ کے لیے 'ملعونہ' کی صفت 'مبارکہ' کی ضد ہے۔ ایک تو شجرۂ مبارکہ ہوتا ہے جو اپنے سایہ، اپنی طراوت اور اپنے پھل ہر چیز سے خلق کو فیض پہنچاتا ہے۔ اس کے بالکل برعکس شجرۂ ملعونہ ہوتا ہے جس میں نہ سایہ نہ پھل، صرف کانٹوں کا ڈھیر، کڑواہٹ اور زہر سے بھرا ہوا، خلق کے لیے ایک لعنت اور مصیبت ہوتا ہے۔ زقوم کی صفت یہی ہے۔

ظاہر ہے کہ دوزخ کے یہ احوال اس لیے سنائے گئے ہیں کہ غفلت کے ماتے لوگ متنبہ ہوں اور اس سے بچنے کے لیے جو کچھ کر سکتے ہوں آج کر لیں لیکن قریش کے لال بجھکڑوں نے اس تنبیہ و تخویف سے فائدہ اٹھانے کے بجائے، اس عالم کے حالات کو اس عالم کے حالات پر قیاس کر کے یہ نکتہ آرائی شروع کر دی کہ یہ دیکھو، یہ شخص آگ، پانی اور درخت سب کو ایک ہی جگہ جمع کیے دے رہا ہے! بھلا یہ کس طرح ممکن ہے کہ آگ بھی ہو اور اس میں درخت بھی ہو، آگ بھی ہو اور اس میں پانی بھی ہو۔

'وَنُخَوِّفُهُمْ فَمَا يَزِيدُهُمْ إِلَّا طُغْيَانًا كَبِيرًا' یعنی ہم تو ان کو ان باتوں سے مستقبل کے خطرات سے آگاہ کر رہے ہیں کہ یہ ان سے کچھ بچنے کی فکر کریں لیکن یہ چیزیں ان کو فائدہ پہنچانے کے بجائے الٹے ان کے اس طغیان کبیر ہی میں اضافہ کیے جا رہی ہیں جس میں یہ مبتلا ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جن کے دماغ اتنے ٹیڑھے ہو چکے ہیں کہ سیدھی سے سیدھی بات بھی ان میں جا کر ٹیڑھی ہو جاتی ہے ان سے یہ توقع نہ رکھو کہ ان کی طلب پر کوئی نشانی ان کو دکھا دی گئی تو یہ اس کو مان لیں گے۔ اس کو دیکھ کر بھی یہ کوئی نہ کوئی بات بنا ہی لیں گے۔ یہ نشانی عذاب سے فائدہ اٹھانے والے لوگ نہیں ہیں بلکہ اصل عذاب سے قائل ہونے والے لوگ ہیں جس کے ظہور کے بعد قائل ہونے یا نہ ہونے کا سوال ہی باقی نہیں رہ جاتا۔

۱۲- آگے کا مضمون ــــــ آیات ۶۱-۶۵

استکبار کا اصل سبب

آگے ان لوگوں کے طغیان و استکبار کے اصل سبب سے پردہ اٹھایا ہے کہ اس کا اصل سبب وہ نہیں ہے جو یہ ظاہر کر رہے ہیں کہ ان کو عذاب کی کوئی نشانی نہیں دکھائی گئی بلکہ یہ ہے کہ اللہ نے ان کو اپنی نعمتوں سے نوازا تو یہ نعمتوں کو پا کر اس کے شکر گزار بندے بننے کے بجائے غرور اور گھمنڈ میں مبتلا ہو گئے۔ یہ روش اختیار کرنے میں انھوں نے ٹھیک ٹھیک ابلیس کے نقش قدم کی پیروی کی ہے اور ابلیس نے ذریت آدم کے بارے میں اپنا جو گمان ظاہر کیا تھا ان کے اوپر اپنے اس گمان کو حرف حرف سچ کر دکھایا۔

آیات کی تلاوت کیجیے۔

آیات ۶۱-۶۵

وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ
قَالَ ءَاَسْجُدُ لِمَنْ خَلَقْتَ طِيْنًا ﴿۶۱﴾ قَالَ اَرَءَيْتَكَ هٰذَا
الَّذِيْ كَرَّمْتَ عَلَيَّ ۫ لَئِنْ اَخَّرْتَنِ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ لَاَحْتَنِكَنَّ ذُرِّيَّتَهٗٓ
اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۶۲﴾ قَالَ اذْهَبْ فَمَنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ فَاِنَّ جَهَنَّمَ جَزَآؤُكُمْ
جَزَآءً مَّوْفُوْرًا ﴿۶۳﴾ وَاسْتَفْزِزْ مَنِ اسْتَطَعْتَ مِنْهُمْ بِصَوْتِكَ وَ
اَجْلِبْ عَلَيْهِمْ بِخَيْلِكَ وَرَجِلِكَ وَشَارِكْهُمْ فِي الْاَمْوَالِ وَ
الْاَوْلَادِ وَعِدْهُمْ ۭ وَمَا يَعِدُهُمُ الشَّيْطٰنُ اِلَّا غُرُوْرًا ﴿۶۴﴾ اِنَّ عِبَادِيْ
لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنٌ ۭ وَكَفٰى بِرَبِّكَ وَكِيْلًا ﴿۶۵﴾

ترجمۂ آیات ۶۱-۶۵

اور یاد کرو جب ہم نے فرشتوں سے کہا کہ آدم کو سجدہ کرو تو انھوں نے سجدہ کیا لیکن ابلیس نے نہیں کیا وہ بولا کہ کیا میں اس کو سجدہ کروں جس کو تو نے مٹی سے پیدا کیا۔ اس نے کہا ذرا دیکھ تو اس کو جس کو تو نے مجھ پر عزت بخشی ہے اگر تو نے مجھے روز قیامت تک مہلت دے دی تو میں، ایک قدرے قلیل کے سوا، اس کی ساری ذریت کو چٹ کر جاؤں گا۔ فرمایا، جا، جو ان میں سے تیرے پیرو بن جائیں گے تو جہنم تم سب کا پورا پورا بدلہ ہے۔ اور ان میں سے جن پر تیرا بس چلے ان کو اپنے غوغا سے گھبرا لے، ان پر اپنے سوار اور پیدل چڑھا لا، مال اور اولاد میں ان کا ساجھی بن جا اور ان سے وعدہ کر لے اور شیطان ان سے محض دھوکے ہی کے وعدے کرتا ہے۔ بے شک میرے اپنے بندوں پر تیرا کوئی زور نہیں چلے گا اور تیرا رب کارسازی کے لیے کافی ہے۔ ۶۱-۶۵

۱۳۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَإِذْ قُلْنَا لِلْمَلَٰٓئِكَةِ اسْجُدُوا لِآدَمَ فَسَجَدُوٓا إِلَّآ إِبْلِيسَ قَالَ ءَأَسْجُدُ لِمَنْ خَلَقْتَ طِينًا (٦١)

آدمؑ اور ابلیس کے اس ماجرے کے تمام اجزاء پر سورۂ بقرہ اور اعراف کی تفسیر میں بحث ہو چکی ہے اس وجہ سے یہاں ہم گفتگو سیاق و سباق کلام کی وضاحت ہی کی حد تک محدود رکھیں گے۔

کفار کے انکار کی اصل علت یہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی جا رہی ہے کہ ان لوگوں کے انکار کی اصل علت یہ نہیں ہے کہ ان کو عذاب کی کوئی نشانی نہیں دکھائی گئی بلکہ اس کی اصل وجہ ان کا استکبار ہے اور اس معاملے میں انھوں نے بالکل ٹھیک اپنے امام ابلیس کی سنت کی پیروی کی۔ جس طرح اس کو جب حکم ہوا کہ آدمؑ کو سجدہ کرے تو اس نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ میں ایک برتر مخلوق ہو کر ایک خاکی مخلوق کو کس طرح سجدہ کروں اسی طرح یہ لوگ بھی خدا کی نعمتیں پا کر سیادت و امارت کے پندار میں اندھے ہو گئے ہیں اور ان کا یہ پندار ان کو اجازت نہیں دے رہا ہے کہ وہ تمھیں رسول مان کر تمھاری برتری اپنے اوپر تسلیم کر لیں اور اپنی زعامت کے پندار سے دست بردار ہو جائیں۔

قَالَ أَرَءَيْتَكَ هَٰذَا الَّذِي كَرَّمْتَ عَلَيَّ لَئِنْ أَخَّرْتَنِ إِلَىٰ يَوْمِ الْقِيَٰمَةِ لَأَحْتَنِكَنَّ ذُرِّيَّتَهُۥٓ إِلَّا قَلِيلًا (٦٢)

'أَرَءَيْتَكَ' کا اسلوب خطاب طنز و تحقیر کے لیے بھی آتا ہے اور 'احْتَنَكَ الْجَرَادُ الْأَرْضَ' کے معنی ہوں گے کہ ٹڈی دل نے زمین کی ساری روئیدگی چٹ کر لی۔

قصہ آدم و ابلیس کا سبق یعنی آدمؑ و ابلیس کی یہ دشمنی ختم نہیں ہو گئی بلکہ یہ قیامت تک باقی رہنے والی ہے۔ اس نے جوش حسد میں خدا سے یہ مہلت مانگی تھی کہ اگر تو نے مجھے قیامت تک مہلت دے دی تو میں آدمؑ کی ساری ذریت کو چٹ کر جاؤں گا اور یہ ثابت کر دوں گا کہ آدمؑ اور اس کی ذریت میرے اور میری ذریت کے مقابل میں کسی شرف کے حقدار نہیں ہیں۔

اس کا حوالہ دینے سے مقصود یہ ظاہر کرنا ہے کہ یہ جو ایمان نہیں لا رہے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ ابلیس اور اس کی ذریات کے نرغے میں آئے ہوئے لوگ ہیں اور اس نے روز اول جو دعویٰ کیا تھا ان لوگوں کے معاملے میں اس نے وہ سچ کر دکھایا ہے۔

قَالَ اذْهَبْ فَمَن تَبِعَكَ مِنْهُمْ فَإِنَّ جَهَنَّمَ جَزَآؤُكُمْ جَزَآءً مَّوْفُورًا (٦٣)

یعنی ابلیس نے خدا سے قیامت تک کے لیے ذریت آدمؑ کو ورغلانے کی جو مہلت مانگی تھی خدا نے اس کو وہ مہلت دے دی تھی کہ جا جو کچھ تجھے کرنا ہے کر، تیرا اور تیری پیروی کرنے والوں کا پورا پورا بدلہ چکا دینے کے لیے جہنم کافی ہے، یعنی تجھ کو یہ مہلت دینے سے کسی فرصت کے ضائع ہونے کا اندیشہ نہیں ہے کہ تمھاری سزا میں کوئی کسر رہ جائے گی اس لیے کہ جہنم ایسی چیز ہے کہ وہ ایک ہی ساتھ ساری کسر پوری کر دے گی۔

وَاسْتَفْزِزْ مَنِ اسْتَطَعْتَ مِنْهُمْ بِصَوْتِكَ وَأَجْلِبْ عَلَيْهِمْ بِخَيْلِكَ وَرَجِلِكَ وَشَارِكْهُمْ فِي الْأَمْوَالِ وَالْأَوْلَادِ وَعِدْهُمْ ۚ وَمَا يَعِدُهُمُ الشَّيْطَانُ إِلَّا غُرُورًا (۶۴)

'اِسْتِفْزَاز' کے معنی گھبرا دینے اور پریشان کر دینے کے ہیں اور 'صوت' سے مراد یہاں شور و غوغا، ہنگامہ اور پروپیگنڈا ہے۔

ابلیس کی مدت کی حد — ابلیس اور اس کی ذریات کو اضلال کی مہم چلانے کی جس حد تک مہلت ملی ہوئی ہے یہ اس کی طرف اشارہ ہے تاکہ لوگ اس کو کوئی آسان بازی نہ سمجھیں بلکہ جو اس کے فتنوں سے اپنے ایمان کو بچانا چاہتے ہوں وہ ہر وقت اس کا مقابلہ کرنے کے لیے چوکس رہیں۔

ابلیس کے فتنوں کی گوناگونی — وَاسْتَفْزِزْ مَنِ اسْتَطَعْتَ مِنْهُمْ بِصَوْتِكَ۔ یعنی جا، لوگوں کو صراطِ مستقیم سے ہٹانے کی مہم میں اپنے شور و غوغا، اپنے نعرے اور ہنگامے، اپنے ریڈیو اور سنیما، اپنے گانے بجانے، اپنے جلسوں اور جلوسوں، اپنی تقریروں اور اعلانات، اپنے اخبارات و رسائل اور اس قبیل کی ساری ہی چیزوں سے جو فائدہ اٹھا سکتا ہے اٹھا لے اور جن کے قدم اکھاڑ سکتا ہے اکھاڑ دے۔

وَأَجْلِبْ عَلَيْهِمْ بِخَيْلِكَ وَرَجِلِكَ۔ 'خَیل' سواروں کی جماعت اور 'رَجِل' پیادوں کی ٹولی۔ یعنی اپنے لشکرِ ضلالت کے سواروں اور پیادوں کو بھی ان پر چڑھا لا اور اس طرح بھی اگر تیرا بس چلے تو ان کو ایمان سے پھیرنے کی کوشش کر دیکھ۔ یہ ملحوظ رہے کہ سوار اور پیادے چڑھا لانا محض استعارہ ہی نہیں ہے بلکہ امرِ واقعی بھی ہے۔ وہ تمام جنگیں جو دشمنانِ اسلام نے اہلِ ایمان کو دینِ حق سے پھیرنے کے لیے برپا کی ہیں وہ سب اس میں داخل ہیں۔

وَشَارِكْهُمْ فِي الْأَمْوَالِ وَالْأَوْلَادِ۔ یعنی جو مال اور اولاد ہم نے لوگوں کو بخشے ہیں تو اگر کر سکے تو جا کر ان میں ساجھی بن جا۔ تیرے پرستار ان میں تجھ کو شریک کریں گے۔ اپنے مال میں سے تیرا حصہ نکالیں گے، اپنی اولاد کے نام تیرے نام پر رکھیں گے اور بعض تیری رضا جوئی کے لیے ان کو قربان بھی کر دیں گے۔

وَعِدْهُمْ ۚ وَمَا يَعِدُهُمُ الشَّيْطَانُ إِلَّا غُرُورًا۔ یعنی تو ان کو نہایت لذیذ اور سنہرے وعدوں کے سبز باغ بھی دکھا لے جن میں مبتلا ہو کر زندگی کی حقیقی ذمہ داریوں سے وہ بالکل فارغ ہو بیٹھیں۔ اس کے بعد یہ تنبیہ بھی فرما دی کہ 'وَمَا يَعِدُهُمُ الشَّيْطَانُ إِلَّا غُرُورًا' یعنی شیطان جتنے وعدے بھی کرتا ہے سب محض فریب ہوتے ہیں۔ مثلاً مشرکینِ عرب کا یہ وہم کہ ہم جن فرشتوں کو پوجتے ہیں وہ ہمیں خدا کا مقرب بنا دیں گے یا یہود کا یہ وہم کہ ہم خدا کے بیٹے اور چہیتے ہیں اس لیے ہمیں جہنم کی آگ نہیں چھوئے گی۔

إِنَّ عِبَادِي لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطَانٌ ۚ وَكَفَىٰ بِرَبِّكَ وَكِيلًا (۶۵)

ایمان پر جمے رہنے والوں کو تسلی — 'سُلْطَان' کے معنی اختیار اور قدرت کے ہیں۔ یعنی مذکورہ سارے فتنے برپا کرنے کی تو تجھے مہلت دی گئی لیکن تجھے یہ اختیار حاصل نہیں ہوگا کہ میرے جو بندے میری بندگی پر قائم و ثابت قدم رہنا چاہیں ان کو تو زور

ابلیس کو اختیار مطلق حاصل نہیں

برگشتہ کر دے۔ یہ ایمان پر جمے رہنے والوں کے لیے تسلی ہے کہ شیطان جو کچھ بھی کر گزرے لیکن یہ اختیار مطلق اس کو حاصل نہیں ہے کہ وہ جس کو چاہے ایمان سے پھیر دے۔ اختیار مطلق صرف اللہ ہی کو حاصل ہے۔ پھر مزید تسلی کے لیے فرمایا کہ وَكَفٰى بِرَبِّكَ وَكِيلًا یعنی اللہ کے جو بندے شیطان کے فتنوں کے علی الرغم اپنے ایمان پر قائم رہنا چاہیں گے اور اپنے آپ کو پورے اعتماد کے ساتھ اپنے رب کے حوالے کر دیں گے خدا ان کا کارساز ہے اور وہ کارسازی کے لیے کافی ہے۔ وہ سخت سے سخت حالات کے اندر بھی اپنے بندے کی حفاظت فرمائے گا اور اس کے ایمان کو بچائے گا۔

۱۴۔ آگے کا مضمون ——— آیات ۶۶-۷۲

سرکشوں اور غافلوں کی تمثیل

آگے انسان کی اس حالت کی تمثیل ہے کہ جب وہ کسی مصیبت میں پکڑا جاتا ہے تب وہ خدا خدا پکارتا اور اسی کے آگے روتا اور گڑگڑاتا ہے لیکن جوں ہی اس مصیبت سے نجات پا جاتا ہے پھر اکڑنے اور سرکشی کرنے لگتا ہے۔ اسے یہ بات بالکل فراموش ہو جاتی ہے کہ اگر خدا چاہے تو اس کو پھر اسی حالت میں گرفتار کر سکتا ہے اور اس طرح گرفتار کر سکتا ہے کہ پھر اس سے کبھی رہائی نصیب نہ ہو۔ اس کے بعد دو گروہوں کی تمثیل ہے ایک ان لوگوں کی جو دنیا کو کھلی آنکھوں سے دیکھتے ہیں اور اس سے صحیح سبق حاصل کرتے ہیں اور دوسری ان لوگوں کی جو ہمیشہ اندھے بنے رہتے ہیں۔ ان دونوں قسم کے لوگوں کا آخرت میں جو انجام ہو گا وہ بیان فرمایا۔ یہ ساری تصویر و تمثیل قریش کے کفار کی ہے جو قرآن کے مخاطب اول تھے لیکن یہی رویہ دوسرے سرکشوں کا بھی ہوتا ہے اس وجہ سے بات عام الفاظ میں فرمائی گئی ہے ——— آیات کی تلاوت کیجیے۔

آیات ۶۶-۷۲

رَبُّكُمُ الَّذِيْ يُزْجِيْ لَكُمُ الْفُلْكَ فِي الْبَحْرِ لِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ
اِنَّهٗ كَانَ بِكُمْ رَحِيْمًا ﴿۶۶﴾ وَاِذَا مَسَّكُمُ الضُّرُّ فِي الْبَحْرِ ضَلَّ مَنْ
تَدْعُوْنَ اِلَّآ اِيَّاهُ ۚ فَلَمَّا نَجّٰىكُمْ اِلَى الْبَرِّ اَعْرَضْتُمْ ۚ وَكَانَ الْاِنْسَانُ
كَفُوْرًا ﴿۶۷﴾ اَفَاَمِنْتُمْ اَنْ يَّخْسِفَ بِكُمْ جَانِبَ الْبَرِّ اَوْ يُرْسِلَ عَلَيْكُمْ
حَاصِبًا ثُمَّ لَا تَجِدُوْا لَكُمْ وَكِيْلًا ﴿۶۸﴾ اَمْ اَمِنْتُمْ اَنْ يُّعِيْدَكُمْ فِيْهِ
تَارَةً اُخْرٰى فَيُرْسِلَ عَلَيْكُمْ قَاصِفًا مِّنَ الرِّيْحِ فَيُغْرِقَكُمْ
بِمَا كَفَرْتُمْ ۙ ثُمَّ لَا تَجِدُوْا لَكُمْ عَلَيْنَا بِهٖ تَبِيْعًا ﴿۶۹﴾ وَلَقَدْ كَرَّمْنَا

بَنِيْٓ اٰدَمَ وَحَمَلْنٰهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَ
فَضَّلْنٰهُمْ عَلٰى كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا ﴿٧٠﴾ يَوْمَ نَدْعُوْا كُلَّ اُنَاسٍۢ ع ۷
بِاِمَامِهِمْ ۚ فَمَنْ اُوْتِيَ كِتٰبَهٗ بِيَمِيْنِهٖ فَاُولٰٓئِكَ يَقْرَءُوْنَ كِتٰبَهُمْ
وَلَا يُظْلَمُوْنَ فَتِيْلًا ﴿٧١﴾ وَمَنْ كَانَ فِيْ هٰذِهٖٓ اَعْمٰى فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ
اَعْمٰى وَاَضَلُّ سَبِيْلًا ﴿٧٢﴾

ترجمۂ آیات ۶۶-۷۲

تمہارا رب وہی ہے جو تمہارے لیے سمندر میں کشتی چلاتا ہے تاکہ تم اس کے فضل کے طالب بنو۔ بے شک وہ تمہارے حال پر بڑا مہربان ہے۔ اور جب تمہیں سمندر میں مصیبت پہنچتی ہے تو اس کے سوا جن کو تم پکارتے ہو سب غائب ہو جاتے ہیں۔ پھر جب وہ تم کو خشکی کی طرف بچا لاتا ہے تو تم اعراض کر بیٹھتے ہو اور انسان بڑا ہی ناشکرا ہے۔ ۶۶-۶۷

کیا تم اس بات سے نچنت ہو گئے کہ وہ خشکی کی جانب تمہارے سمیت زمین کو دھنسا دے یا تم پر باد تند بھیج دے، پھر تم کسی کو اپنا کارساز نہ پاؤ۔ یا تم اس سے نچنت ہو گئے کہ تم کو دوبارہ اسی میں لوٹائے پھر وہ تم پر باد تند کا جھونکا بھیج دے پس وہ تمہاری ناشکری کی پاداش میں تم کو غرق کر دے اور تم اس پر ہمارا کوئی پیچھا کرنے والا اپنے لیے نہ پاؤ۔ ۶۸-۶۹

اور ہم نے بنی آدم کو عزت بخشی اور خشکی اور تری دونوں میں ان کو سواری عطا کی اور ان کو پاکیزہ چیزوں کا رزق دیا اور ان کو اپنی بہت سی مخلوقات پر نمایاں فضیلت دی۔ اس دن کو یاد رکھو جس دن ہم ہر گروہ کو اس کے رہنما سمیت بلائیں گے۔ سو جن کو ان کا اعمال نامہ دہنے ہاتھ میں ملے گا وہ تو اپنے اعمال نامہ کو پڑھیں گے اور ذرا بھی ان کے ساتھ ناانصافی نہیں کی جائے گی۔

اور جو اس دنیا میں اندھا بنا رہے گا وہ آخرت میں بھی اندھا اور گمراہ تر ہو گا۔ ۷۰-۷۲

۱۵- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

رَبُّكُمُ الَّذِي يُزْجِي لَكُمُ الْفُلْكَ فِي الْبَحْرِ لِتَبْتَغُوا مِنْ فَضْلِهِ ۚ إِنَّهُ كَانَ بِكُمْ رَحِيمًا ۝ وَإِذَا مَسَّكُمُ الضُّرُّ فِي الْبَحْرِ ضَلَّ مَنْ تَدْعُونَ إِلَّا إِيَّاهُ ۖ فَلَمَّا نَجَّاكُمْ إِلَى الْبَرِّ أَعْرَضْتُمْ ۚ وَكَانَ الْإِنْسَانُ كَفُورًا (۶۶-۶۷)

اللہ کی نعمتوں کی ناقدری

یہ تمثیل ہے اس بات کی کہ ہر نعمت جو انسان کو ملتی ہے اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے ملتی ہے۔ اس کا حق یہ ہے کہ انسان اس نعمت سے متمتع اور اپنے رب کا شکر گزار ہو لیکن یہ انسان کی عجیب بدبختی ہے کہ جب اس کو نعمت ملتی ہے تو وہ خدا سے اکڑ تا ہے اور ہر چیز کو اپنی سعی و تدبیر کا کرشمہ اور اپنے مزعومہ دیویوں دیوتاؤں کا فضل و کرم سمجھتا ہے لیکن جب کسی گردش میں آجاتا ہے تو خدا خدا پکارنے لگتا ہے، اس وقت سارے دیوی دیوتا اس کو بھول جاتے ہیں۔ پھر جب اللہ اس گردش سے اس کو نجات دے دیتا ہے تو وہ پچھلی خرمستی اس پر عود کر آتی ہے اور خدا کو وہ پھر طاق نسیاں پر رکھ دیتا ہے۔

کشتی اور دریا کی ایک مثال

اس حقیقت کو واضح کرنے کے لیے کشتی اور دریا کے سفر کی مثال دی ہے کہ یہ خدا ہی کی قدرت ہے کہ ہزاروں ٹن کا وزنی جہاز سمندر کے سینے پر چلتا ہے۔ اللہ نے یہ انتظام اس لیے فرمایا ہے کہ انسان اپنے سفروں میں اس سے فائدہ اٹھائے اور خدا کے اس فضل و رحمت پر اس کا شکر گزار ہو لیکن انسان کا حال یہ ہے کہ جب تک کشتی رواں دواں رہتی ہے اس وقت تک تو خدا کا اس کو کبھی خیال بھی نہیں آتا لیکن جب کشتی کسی طوفان میں گھر کر ہچکولے کھانے لگتی ہے تو اس وقت اس کو اپنی اکڑ بھی بھول جاتی ہے اور دوسرے دیوی دیوتا بھی بھول جاتے ہیں، اس وقت وہ صرف خدا ہی سے فریاد و استغاثہ کرتا ہے لیکن یہ حالت صرف اس وقت تک قائم رہتی ہے جب تک کشتی گردابِ بلا میں رہتی ہے۔ جوں ہی کشتی اس گرداب بلا سے نکلی اور انسان نے خشکی پر قدم رکھا پھر نہ اسے مصیبت کی وہ ساعت یاد رہتی ہے اور نہ اس کو خدا سے اپنا رونا اور گڑگڑانا یاد رہتا۔

اس تمثیل میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے یہ تسلی بھی ہے کہ یہ نہ سمجھو کہ یہ قریش کے سرکش لوگ تم سے عذاب کی جو نشانی مانگ رہے ہیں، اگر نشانی ان کو دکھا دی گئی تو یہ ایمان و ہدایت کی راہ اختیار کر لیں گے بلکہ جب مصیبت میں پھنسیں گے تو خدا خدا پکاریں گے لیکن اس سے چھوٹتے ہی پھر اپنی پچھلی بدمستیوں ہی میں مبتلا ہو جائیں گے ـــــ ایمان و ہدایت کی راہ یہ ہے کہ انسان اپنی فطرت کی صداؤں پر کان دھرے اور اپنی عقل کی رہنمائی کو قبول کرے، یہ لوگ اس کے لیے تیار نہیں ہیں تو عذاب کی کسی نشانی سے ان کو ہدایت کی راہ کس طرح مل جائے گی۔

أَفَأَمِنْتُمْ أَنْ يَخْسِفَ بِكُمْ جَانِبَ الْبَرِّ أَوْ يُرْسِلَ عَلَيْكُمْ حَاصِبًا ثُمَّ لَا تَجِدُوا لَكُمْ وَكِيلًا (۶۸)

سرکشوں سے چند سوالات

اب یہ سوال فرمایا ہے کہ دریا سے خشکی میں آجانے کے بعد خدا سے بے خوف اور بے پروا کیوں ہو جاتے ہو؟ کیا سمجھتے ہو کہ خدا کی خدائی دریا ہی تک محدود ہے، خشکی اس کی خدائی سے باہر ہے؟ اگر وہ خشکی میں

زمین کو تمہارے سمیت دھنسا دے یا تم پر کنکر پتھر برسا دینے والی بادِ تند بھیج دے جو تم کو اور تمہارے مکانوں کو تہس نہس کر کے رکھ دے تو آخر کون ہے جو تم کو خدا سے بچانے والا بن سکے گا۔

اَمْ اَمِنْتُمْ اَنْ يُّعِيْدَكُمْ فِيْهِ تَارَةً اُخْرٰى فَيُرْسِلَ عَلَيْكُمْ قَاصِفًا مِّنَ الرِّيْحِ فَيُغْرِقَكُمْ بِمَا كَفَرْتُمْ ۙ ثُمَّ لَا تَجِدُوْا لَكُمْ عَلَيْنَا بِهٖ تَبِيْعًا (۶۹)

قاصف اور تبیع کا مفہوم

'قَاصِف' کے معنی توڑ دینے والی اور 'تَبِيْع' کے معنی نامراد و مددگار کے ہیں۔

یعنی تم ایک مرتبہ خدا سے چھوٹ جانے کے بعد یہ کیوں سمجھ بیٹھے کہ خدا سے ہمیشہ کے لیے آزاد ہو گئے، آخر یہ بھی تو ممکن ہے کہ خدا تمہیں کفرانِ نعمت کی سزا دینے کے لیے پھر ایسے حالات پیدا کر دے کہ تمہیں دوبارہ پھر اسی سمندر سے سابقہ پیش آئے اور وہ تم پر ایسی بادِ تند بھیجے جو سب کچھ توڑ پھوڑ کر تمہیں غرق کر دے اور تمہارا کوئی حامی تمہاری حمایت میں ہمارا تعاقب کرنے والا نہ بن سکے! آگے آیت ۷۵ میں اسی مضمون کو یوں ادا فرمایا ہے۔ 'ثُمَّ لَا تَجِدُ لَكَ عَلَيْنَا نَصِيْرًا'۔

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ وَحَمَلْنٰهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلٰى كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا (۷۰)

انسان کو اس کی ذمہ داری کی یاد دہانی

اب یہ انسان کو اس کی ذمہ داری یاد دلائی ہے کہ ہم نے انسان کو جو عزت بخشی ہے، خشکی اور تری دونوں میں اس کے لیے سواری کا جو انتظام کیا ہے، اس کو جو پاکیزہ رزق عطا کیا ہے اور اس کو اپنی بہت سی مخلوقات پر جو فضیلت دی ہے تو اس کا فرض ہے کہ وہ ان نعمتوں کا حق پہچانے اور اپنے رب کی ان نعمتوں کو پا کر اس سے اکڑنے اور اس کی نعمتوں کی ناشکری کرنے کے بجائے اس کا شکر گزار اور فرماں بردار بندہ بنے، نعمت پا کر اکڑنا ابلیس کی سنت ہے اور اس کا جو حشر ہوا وہ معلوم ہے۔

'وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلٰى كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا' سے یہ بات بھی واضح ہو گئی کہ انسان کو دوسری مخلوقات پر جو فضیلت حاصل ہے وہ کلی نہیں ہے۔ خدا کی مخلوقات میں ایسی مخلوقات بھی ہیں جن پر انسان کی فضیلت نہیں ہے۔

يَوْمَ نَدْعُوْا كُلَّ اُنَاسٍۭ بِاِمَامِهِمْ ۚ فَمَنْ اُوْتِيَ كِتٰبَهٗ بِيَمِيْنِهٖ فَاُولٰٓئِكَ يَقْرَءُوْنَ كِتٰبَهُمْ وَلَا يُظْلَمُوْنَ فَتِيْلًا (۷۱)

'اُنَاس' کے معنی انسانوں کے گروہ کے ہیں اور 'امام' سے مراد لیڈر اور پیشوا ہیں۔

جزا و سزا کے دن کی یاد دہانی

یہ اس دن کی یاد دہانی فرمائی ہے جس دن جزا اور سزا کی خدائی عدالت قائم ہو گی۔ فرمایا کہ اس دن ہم ہر گروہ کو ان کے لیڈروں اور پیشواؤں سمیت اپنے حضور حاضر ہونے کا حکم دیں گے۔ نیک بھی اپنے صالح پیشواؤں اور مقتداؤں کے ساتھ حاضر ہوں گے اور اشرار و مفسدین بھی اپنے ناہنجار لیڈروں کے ساتھ حاضر کیے جائیں گے۔ پھر نیکوں کو ان کے اعمال نامے ان کے دہنے ہاتھ پکڑائے جائیں گے اور بدوں کو ان کے بائیں ہاتھ میں۔ تو

جن کو ان کے اعمال نامے دہنے ہاتھ میں ملیں گے وہ ان کو پڑھیں گے اور وہ دیکھیں گے کہ ان کے ساتھ ذرہ برابر بھی ناانصافی نہیں کی گئی ہے۔ ان کی ایک ایک نیکی، خواہ چھوٹی ہو یا بڑی، سب درج ہے اور ہر ایک کا ان کو بھرپور صلہ بھی عطا ہوا۔ 'وہ ان کو پڑھیں گے'، میں فعل اپنے حقیقی معنی میں استعمال ہوا ہے۔ یعنی وہ خوش ہو ہو کر ایک ایک چیز کو پڑھیں گے اور اپنے رب کی ذرہ نوازی پر اس کے شکرگزار ہوں گے۔ یہاں اگرچہ اس امر کی کوئی تصریح نہیں ہے کہ ان لوگوں کے تاثرات کیا ہوں گے جن کو ان کے اعمال نامے بائیں ہاتھ میں پکڑائے جائیں گے لیکن سیاق کلام سے خود یہ بات ظاہر ہے کہ یہ لوگ اپنے اعمال نامے پڑھنے کے بجائے اپنے سر اور منہ پیٹیں گے کہ ہائے ہماری بدبختی کہ ہمارے سارے اعمال نامے میں ایک نقطہ بھی روشن نہیں ہے، سب تاریکی ہی تاریکی ہے۔

ہر گروہ کو ان کے لیڈروں اور مقتداؤں کے ساتھ جمع کرنے میں اعزاز و تکریم کا پہلو بھی ہے اور اتمام حجت کا پہلو بھی۔ اتقیا کے لیڈر تو یہ دیکھیں گے کہ الحمدللہ جس اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے انھوں نے بازیاں کھیلیں اس کا انجام اس شاندار صورت میں سامنے آیا اور اشرار کے لیڈر اپنی کارستانیوں کے انجام دیکھیں گے اور ان کی پیروی کرنے والے ان پر لعنت بھیجیں گے اور ان کے لیے، جیسا کہ دوسرے مقام میں تصریح ہے، دونے عذاب کا مطالبہ کریں گے۔

وَمَنْ كَانَ فِىْ هٰذِهٖۤ اَعْمٰى فَهُوَ فِى الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى وَاَضَلُّ سَبِيْلًا (۷۲)

اصحاب الشمال کا انجام

اصحاب الیمین کے بعد یہ اصحاب الشمال کا انجام بیان ہو رہا ہے کہ چونکہ یہ لوگ دنیا میں اندھے بنے رہے اس وجہ سے یہ آخرت میں بھی اندھے ہی اٹھیں گے اور اصل منزل سے جو دوری آج ان کو ہے وہ دوری آج کی نسبت کہیں زیادہ ہو جائے گی اس لیے کہ آخرت کے ظہور کے بعد ان کے لیے صراط مستقیم کی طرف لوٹنے کا کوئی امکان ہی باقی نہیں رہ جائے گا۔

اس آیت سے اس حقیقت پر بھی روشنی پڑتی ہے کہ اصحاب الیمین کو جو مرتبہ و مقام حاصل ہو گا وہ اس بنا پر حاصل ہو گا کہ انھوں نے دنیا میں آنکھیں بند کر کے زندگی نہیں گزاری بلکہ ہمیشہ اپنی آنکھیں کھلی رکھیں اور اللہ کی ایک ایک نشانی سے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔

۱۶- آگے کا مضمون ـــــ آیات ۷۳-۸۴

آنحضرت صلعم کو موقف حق پر جمے رہنے کی تاکید

آگے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ تاکید ہے کہ مخالفین کی تمام مخالفتوں کے علی الرغم اپنے موقف حق پر جمے رہو۔ یہ کتنا ہی زور لگائیں کہ تم قرآن میں ان کے حسب منشا کچھ ترمیم کر دو تو وہ تمہارے دوست اور ساتھی بن جائیں گے لیکن تم کو ایک شوشہ کے برابر بھی اس میں ترمیم و تغیر کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ تمہاری مخالفت میں یہ زیادہ سے زیادہ جو کر سکتے ہیں وہ یہ ہے کہ تم کو یہ اتنا تنگ کریں کہ تم یہ شہر چھوڑنے پر مجبور ہو جاؤ۔ اگر ایسا ہوا تو پھر تمہارے بعد ان کو بھی اس شہر میں زیادہ ٹکنا نصیب نہ ہو گا۔ رسولوں کی ہجرت کے بعد ان کی قوموں کا جو حشر ہوا ہے وہی حشر ان

کا بھی ہوگا۔ اس کے بعد حصول صبر و استقامت کے لیے نماز خصوصاً تہجد کی تاکید ہوئی اور قرب ہجرت کی دعا تعلیم فرمائی گئی اور ہجرت کے ساتھ جو فتح وابستہ ہے اس کی طرف اشارہ فرمایا گیا۔ آخر میں مخالفین کی بدبختی پر اظہار افسوس ہے کہ قرآن جیسی چیز جو سر تا سر شفا اور رحمت ہے، ان لوگوں کی شامتِ اعمال سے ان کے لیے موجب وبال بن گئی ——— آیات کی تلاوت کیجیے۔

آیات ۷۳-۸۴
وَإِنْ كَادُوا لَيَفْتِنُونَكَ عَنِ الَّذِي أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ لِتَفْتَرِيَ عَلَيْنَا
غَيْرَهُ ۖ وَإِذًا لَاتَّخَذُوكَ خَلِيلًا (۷۳) وَلَوْلَا أَنْ ثَبَّتْنَاكَ لَقَدْ كِدْتَ
تَرْكَنُ إِلَيْهِمْ شَيْئًا قَلِيلًا (۷۴) إِذًا لَأَذَقْنَاكَ ضِعْفَ الْحَيَاةِ وَ
ضِعْفَ الْمَمَاتِ ثُمَّ لَا تَجِدُ لَكَ عَلَيْنَا نَصِيرًا (۷۵) وَإِنْ كَادُوا
لَيَسْتَفِزُّونَكَ مِنَ الْأَرْضِ لِيُخْرِجُوكَ مِنْهَا ۖ وَإِذًا لَا يَلْبَثُونَ
خِلَافَكَ إِلَّا قَلِيلًا (۷۶) سُنَّةَ مَنْ قَدْ أَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِنْ رُسُلِنَا
وَلَا تَجِدُ لِسُنَّتِنَا تَحْوِيلًا (۷۷) أَقِمِ الصَّلَاةَ لِدُلُوكِ الشَّمْسِ ع ۸
إِلَىٰ غَسَقِ اللَّيْلِ وَقُرْآنَ الْفَجْرِ ۖ إِنَّ قُرْآنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُودًا (۷۸)
وَمِنَ اللَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهِ نَافِلَةً لَكَ عَسَىٰ أَنْ يَبْعَثَكَ رَبُّكَ
مَقَامًا مَحْمُودًا (۷۹) وَقُلْ رَبِّ أَدْخِلْنِي مُدْخَلَ صِدْقٍ وَأَخْرِجْنِي
مُخْرَجَ صِدْقٍ وَاجْعَلْ لِي مِنْ لَدُنْكَ سُلْطَانًا نَصِيرًا (۸۰) وَقُلْ
جَاءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ ۚ إِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوقًا (۸۱) وَنُنَزِّلُ
مِنَ الْقُرْآنِ مَا هُوَ شِفَاءٌ وَرَحْمَةٌ لِلْمُؤْمِنِينَ ۙ وَلَا يَزِيدُ الظَّالِمِينَ
إِلَّا خَسَارًا (۸۲) وَإِذَا أَنْعَمْنَا عَلَى الْإِنْسَانِ أَعْرَضَ وَنَأَىٰ بِجَانِبِهِ ۖ وَ
إِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ كَانَ يَئُوسًا (۸۳) قُلْ كُلٌّ يَعْمَلُ عَلَىٰ شَاكِلَتِهِ فَرَبُّكُمْ
أَعْلَمُ بِمَنْ هُوَ أَهْدَىٰ سَبِيلًا (۸۴) ع ۹

ترجمۂ آیات ۷۳-۸۴

اور بے شک قریب تھا کہ تم کو فتنوں میں ڈال کر اس چیز سے ہٹا دیں جو ہم نے تم پر وحی کی ہے تاکہ تم اس سے مختلف ہم پر افترا کر کے پیش کرو، اور تب وہ تم کو اپنا گاڑھا دوست بنا لیتے۔ اور اگر ہم نے تم کو جمائے نہ رکھا ہوتا تو قریب تھا کہ تم ان کی طرف کچھ جھک پڑو۔ اگر ایسا ہوتا تو ہم تم کو زندگی اور موت دونوں کا دوگنا عذاب چکھاتے پھر تم ہمارے مقابل میں اپنا کوئی مددگار نہ پاتے۔ ۷۳-۷۵

اور بے شک یہ اس سرزمین سے تمہارے قدم اکھاڑ دینے کے درپے ہیں تاکہ یہ تم کو یہاں سے نکال چھوڑیں۔ اور اگر ایسا ہوا تو تمہارے بعد یہ بھی ٹکنے نہ پائیں گے۔ ہم نے تم سے پہلے اپنے جو رسول بھیجے ان کے باب میں ہماری سنت کو یاد رکھو اور تم ہماری سنت میں کوئی تبدیلی نہیں پاؤ گے۔ نماز کا اہتمام رکھو زوال آفتاب کے اوقات سے لے کر شب کے تاریک ہونے تک اور خاص کر فجر کی قرأت کا۔ بے شک فجر کی قرأت بڑی ہی حضوری کی چیز ہے۔ اور شب میں بھی تہجد پڑھو، یہ تمہارے لیے مزید برآں ہے۔ توقع رکھو کہ تم کو تمہارا رب محمود اٹھانا اٹھائے اور دعا کرو کہ اے میرے رب مجھے داخل کر عزت کا داخل کرنا اور مجھے نکال عزت کا نکالنا اور مجھے خاص اپنے پاس سے مددگار قوت نصیب کر۔ اور اعلان کر دو کہ حق آگیا اور باطل نابود ہو گیا اور باطل نابود ہونے والی چیز ہے۔ ۷۶-۸۱

اور ہم قرآن میں سے جو اتارتے ہیں وہ شفا اور رحمت ہے ایمان والوں کے لیے اور ظالموں کے لیے یہ چیز ان کے خسارے میں ہی اضافہ کر رہی ہے اور انسان پر جب ہم اپنا انعام کرتے ہیں تو وہ اعراض کرتا اور پہلو بدل لیتا ہے اور جب اس کو مصیبت پہنچتی ہے تو مایوس ہو جاتا ہے۔ کہہ دو کہ ہر ایک اپنی روش پر کام کرے گا تو تمہارا رب ان لوگوں کو خوب جانتا ہے جو صحیح تر راستہ پر ہیں۔ ۸۲-۸۴

۱۷۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَاِنْ كَادُوْا لَيَفْتِنُوْنَكَ عَنِ الَّذِیْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ لِتَفْتَرِيَ عَلَيْنَا غَيْرَهٗ ۖ وَاِذًا لَّاتَّخَذُوْكَ خَلِيْلًا ۝ وَلَوْلَآ اَنْ ثَبَّتْنٰكَ لَقَدْ كِدْتَّ تَرْكَنُ اِلَيْهِمْ شَيْــــًٔا قَلِيْلًا ۝ اِذًا لَّاَذَقْنٰكَ ضِعْفَ الْحَيٰوةِ وَضِعْفَ الْمَمَاتِ ثُمَّ لَا تَجِدُ لَكَ عَلَيْنَا نَصِيْرًا (۷۳-۷۵)

'یَفْتِنُوْنَكَ' یہاں 'یَصْرِفُوْنَكَ' یا اس کے ہم معنی کسی لفظ پر متضمن ہے جس کی طرف 'عَنْ' اشارہ کر رہا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ مخالفین نے اتنا زور باندھا تھا کہ قریب تھا کہ تم کو فتنوں اور آزمائشوں میں ڈال کر تم کو موقف حق سے ہٹا دیں لیکن اللہ نے تم کو اس فتنہ سے بچا لیا۔

کفار کی دعوتِ مصالحت کا جواب

رسولوں کی دعوت میں ایک مرحلہ یہ بھی آیا ہے کہ مخالفین نے جب یہ محسوس کر لیا ہے کہ اب یہ دعوت جڑ پکڑ چکی ہے، صرف اندھی بہری مخالفت سے اس کا ہلانا ممکن نہیں رہا تو اس وقت انھوں نے یہ سیاسی چال چلی ہے کہ کوئی تجویز باہمی سمجھوتے کی پیش کی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت میں بھی یہ مرحلہ پیش آیا۔ مخالفین نے جب دیکھ لیا کہ اب یہ دعوت دلوں میں گھر کر رہی ہے تو ان کی بعض جماعتوں نے، روایات میں قبیلہ بنی ثقیف وغیرہ کا نام بھی آیا ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے آگے یہ تجویز پیش کی کہ اگر فلاں فلاں احکام میں ترمیم کر دیں تو ہم یہ دعوت قبول کیے لیتے ہیں، پھر ہم اور آپ گہرے دوست بن کے رہیں گے[۱]۔ یہ مرحلہ آنحضرت صلعم کے لیے بڑا ہی سخت تھا۔ ایک طرف اللہ کے اتارے ہوئے احکام تھے جن میں ایک نقطہ کے برابر بھی آپ ترمیم کرنے کے مجاز نہ تھے، دوسری طرف آپ اپنی قوم کے ایمان کے انتہائی حریص تھے اور کسی ایسے موقع کو ضائع نہیں ہونے دینا چاہتے تھے جس سے قوم کے ایمان کی راہ پر بڑھنے کی کچھ امید بندھتی ہو۔ اس صورت حال نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تذبذب میں مبتلا کر دیا۔ 'لَقَدْ كِدْتَّ تَرْكَنُ اِلَيْهِمْ' کے الفاظ اسی تذبذب کی طرف اشارہ کر رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس نازک مرحلے میں اپنے پیغمبر کی دستگیری فرمائی اور آپ کو تردد و تذبذب سے نکال کر صحیح شاہراہ پر کھڑا کر دیا۔

نبی کی عصمت کا مفہوم

یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ نبی کے معصوم ہونے کے معنی یہ نہیں کہ اس کو کوئی تذبذب کی حالت پیش نہیں آتی یا کوئی غلط میلان اس کے دل میں خطور نہیں کرتا بلکہ اس کے معنی صرف یہ ہیں کہ اول تو اس کا میلان کبھی جانب نفس میں نہیں ہوتا بلکہ ہمیشہ جانب خیر میں ہوتا ہے، دوسرے یہ کہ جانب خیر میں بھی اگر وہ کوئی ایسا قدم اٹھاتا نظر آتا ہے جو صحیح نہیں ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس سے اس کو بچا لیتا ہے اور صحیح سمت میں اس کی رہنمائی فرما دیتا ہے۔

خطاب نبی سے، عتاب کفار پر

'اِذًا لَّاَذَقْنٰكَ ...... الایۃ' ظاہر الفاظ کے اعتبار سے خطاب اگرچہ آنحضرت صلعم سے ہے لیکن اس میں جو زجر و عتاب ہے اس کا رخ سمجھوتے کی تجویزیں لانے والوں کی طرف ہے تاکہ وہ متنبہ ہو جائیں کہ جب اس قسم کے

---

[۱] اسی سے ملتی جلتی بات مائدہ کی آیت ۴۹ میں بھی گزر چکی ہے۔ اس پر ایک نظر ڈال لیجیے۔

کسی اقدام پر خود پیغمبر کو دنیا اور آخرت میں دو گنے عذاب کی دھمکی ہے تو پھر اس کے بروئے کار آنے کا کیا امکان رہا۔

'ضِعْفَ الْحَيٰوةِ وَضِعْفَ الْمَمَاتِ' میں ایک مضاف محذوف ہے یعنی ضِعْفَ عَذَابِ الْحَيٰوةِ وَ ضِعْفَ عَذَابِ الْمَمَاتِ' اور یہ دوگنے عذاب کی دھمکی رسول کے درجے اور مرتبے کے اعتبار سے ہے۔ جن کے مرتبے جتنے ہی اونچے ہوتے ہیں اسی اعتبار سے ان کی ذمہ داریاں ہوتی ہیں اور اسی اعتبار سے ان کی گرفت بھی ہوتی ہے اگر وہ کوئی غلطی کرتے ہیں۔

وَإِن كَادُوا لَيَسْتَفِزُّونَكَ مِنَ الْأَرْضِ لِيُخْرِجُوكَ مِنْهَا وَإِذًا لَّا يَلْبَثُونَ خِلَافَكَ إِلَّا قَلِيلًا ۝ سُنَّةَ مَن قَدْ أَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِن رُّسُلِنَا وَلَا تَجِدُ لِسُنَّتِنَا تَحْوِيلًا (۷۶-۷۷)

'اِسْتِفْزَاز' کے معنی گھبرا دینے، پریشان کر دینے اور اکھاڑ دینے کے ہیں اور 'الْاَرْض' سے مراد یہاں سرزمین مکہ ہے۔

مخالفین جب سمجھوتے کی کسی تجویز کے بروئے کار آنے سے بھی مایوس ہو گئے تو ظاہر ہے کہ ان کی مخالفت جو پہلے بھی کچھ کم نہ تھی اس مایوسی کے بعد دو چند ہو گئی۔ انھوں نے اپنا ایڑی چوٹی کا زور صرف کر دیا کہ آپ کے قدم سرزمین مکہ سے اکھاڑ دیں کہ آپ یہاں سے نکلنے پر مجبور ہو جائیں۔ اس پر ارشاد ہوا کہ اگر تم کو انھوں نے یہاں سے نکلنے پر مجبور کر دیا تو تمھارے بعد یہ بھی زیادہ ٹکنے نہ پائیں گے۔ تم سے پہلے جو ہم نے رسول بھیجے ان کی ہجرت کے بعد جو حشر ان کی قوموں کا ہوا وہی حشر لازماً ان کا بھی ہو گا۔ اس معاملے میں اللہ کی جو سنت پہلے سے چلی آ رہی ہے کوئی وجہ نہیں ہے کہ ان کے معاملے میں وہ بدل جائے۔

رسول کی ہجرت تک قوم امون ہوتی ہے

ہم دوسرے مقام میں یہ وضاحت کر چکے ہیں کہ رسول چونکہ اتمام حجت کا کامل ذریعہ ہوتا ہے، نیز وہ جب تک قوم میں رہتا ہے اس کے لیے استغفار کرتا رہتا ہے اس وجہ سے اس کی موجودگی تک قوم کو اللہ کے عذاب سے امان حاصل رہتی ہے لیکن جب قوم کی روش سے تنگ آ کر وہ ہجرت پر مجبور ہو جاتا ہے تو قوم ایک بالکل جسد بے روح ہو کر رہ جاتی ہے اور اتمام حجت کا مرحلہ ختم ہو چکتا ہے۔ اس کے بعد یا تو اللہ کا کوئی عذاب نمودار ہوتا ہے جو غلاظت کے اس ڈھیر سے زمین کو صاف کر دیتا ہے یا اہل ایمان کی تلوار بے نیام ہوتی ہے اور وہ ان کا خاتمہ کر دیتی ہے۔ اہل مکہ کے اشرار کے معاملے میں یہی دوسری صورت پیش آئی۔

'سُنَّةَ' میرے نزدیک 'يَوْمَ' وغیرہ کی طرح فعل محذوف سے منصوب ہے یعنی 'اُذْكُرْ سُنَّةَ مَنْ' ہم نے جو رسول تم سے پہلے بھیجے ان کے اور ان کی قوموں کے معاملے میں ہماری جو سنت رہی ہے اس کو یاد رکھو۔ اس اسلوب میں فی الجملہ تخصیص ذکر کا پہلو مضمر ہوتا ہے اور یہ براہ راست اصل چیز کو نگاہ کے سامنے کر دیتا ہے۔

أَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوكِ الشَّمْسِ إِلٰى غَسَقِ الَّيْلِ وَقُرْاٰنَ الْفَجْرِ إِنَّ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُودًا (۷۸)

'اِقَامَتِ صَلٰوة' کا مفہوم صرف نماز پڑھنا ہی نہیں بلکہ نماز کا اہتمام کرنا ہے۔

نمازوں کے اوقات

'دُلُوْك' کے معنی زوال کے ہیں۔ سورج کے زوال کے تین درجے ہیں۔ ایک وہ جب وہ سمت راس سے ڈھلتا

ہے، دوسرا جب مرئی العین سے نیچے کی طرف جھکتا ہے، تیسرا جب وہ افق سے غائب ہوتا ہے۔ یہ تینوں اوقات ظہر، عصر اور مغرب کی نمازوں کے ہیں۔ 'دُلُوْکِ' پر 'لِ' وقت کے مفہوم میں ہے۔ اس معنی کے لیے یہ عربی میں معروف ہے۔ جس مفہوم کو ہم لفظ 'پر' سے ادا کرتے ہیں بعض مواقع میں وہی مفہوم 'لِ' ادا کرتا ہے۔ مثلاً 'اَلصَّلٰوۃُ لِاَوْقَاتِھَا' کے معنی ہوں گے نماز اس کے اوقات پر۔ اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِدُلُوْکِ الشَّمْسِ' نماز کا اہتمام کرو زوالِ آفتاب پر۔

'غَسَقِ الَّیْلِ' اول شب کی تاریکی جب کہ وہ گاڑھی ہو جائے۔ یہ نمازِ عشا کا وقت ہے۔

'وَقُرْاٰنَ الْفَجْرِ' اس کو اگرچہ 'اَقِمْ' کے تحت بھی رکھ سکتے ہیں لیکن میرے نزدیک اس کا نصب تخصیصِ ذکر کے پہلو سے ہے یعنی 'اَخُصُّ بِالذِّکْرِ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ' اس تخصیص ذکر سے نمازِ فجر کی خاص اہمیت واضح ہوتی ہے۔

'اِنَّ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ کَانَ مَشْھُوْدًا' 'قرآن' سے مراد یہاں نمازِ فجر میں قرآن کی تلاوت ہے۔ یہ لفظ یہاں فی الجملہ طولِ قرأت کی طرف بھی اشارہ کر رہا ہے اور جہر قرأت کی طرف بھی۔ 'مَشْھُوْدًا' سے اس حضورِ قلب و دماغ کی طرف بھی اشارہ ہو رہا ہے جو خاص طور پر نمازِ فجر میں امام اور مقتدیوں دونوں کو حاصل ہوتا ہے اور ملائکہ کی اس حاضری کی طرف بھی جو اس وقتِ مبارک کی برکات میں سے ہے اور جس کا ذکر احادیث میں آیا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ دن رات میں پانچ نمازوں اور ان کے اوقات کا ذکر خود قرآن میں ہے۔ بلکہ آگے والی آیت سے معلوم ہوگا کہ تہجد اور اس کے وقت کا ذکر بھی قرآن میں ہے۔ اتنی واضح آیات کے بعد بھی اگر کوئی شخص یہ کہے کہ قرآن میں پانچ وقت کی نمازوں کا کوئی ذکر نہیں ہے تو ایسے سرپھرے لوگوں کے بارے میں اس کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو ہدایت دے۔

اشیائے کائنات کا رکوع و سجود

نمازوں کے اوقات کے تعین میں معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کی بڑی نشانیوں کے رکوع و سجود کے اوقات کو ملحوظ رکھا ہے۔ زیرِ بحث آیت سے یہ اشارہ نکلتا ہے کہ سورج شب و روز کے تمام اوقات میں قیام، رکوع اور سجود میں رہتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ان تمام چیزوں کا بھی یہی حال ہوتا ہے جن پر سورج کا عکس پڑتا ہے۔ وہ بھی اس کے ساتھ ساتھ اپنے رب کے آگے برابر قیام، رکوع اور سجود میں رہتی ہیں 'ظِلٰلُھُمْ بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ' اور 'اِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمْدِہٖ' وغیرہ آیات میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہے۔ یہ تمام مخلوقات اپنی صورت و ہیئت سے انسان کو گویا دعوت دیتی ہیں کہ جس طرح وہ خدا کے آگے رکوع و سجود کرتی ہیں اسی طرح وہ بھی ان کا ہم آہنگ ہو کر اپنے رب کی نماز پڑھے لیکن یہ انسان کی عجیب بدقسمتی ہے کہ وہ کائنات کی مخلوق میں سے تو حقیر سے حقیر چیزوں کے آگے گھٹنے اور ماتھے ٹیکتا ہے لیکن اپنے اس رب حقیقی سے اکڑتا ہے جس کے آگے اس کی مسجود چیزیں بھی ہر وقت رکوع و سجود میں ہیں۔ اسی آفتاب کو لیجیے جس کے رکوع و سجود کا یہاں ذکر ہے، کون اندازہ کر سکتا ہے کہ یہ دنیا میں کتنا پجا ہے اور کتنا پج رہا ہے۔

نماز حصولِ صبر و استقامت کے لیے

یہاں نماز کے اس اہتمام کی تاکید، جیسا کہ ہم اوپر اشارہ کر آئے ہیں، اس مشکل مرحلہ میں حصولِ صبر و استقامت کے لیے ہے جو اس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کو درپیش تھا۔ راہِ حق میں جو سخت مراحلِ آزمائش

کے پیش آتے ہیں ان میں حق پر استقامت اللہ کی معیت کے بغیر ممکن نہیں اور اللہ کی معیت کے حصول کا سب سے بڑا ذریعہ نماز بالخصوص تہجد کی نماز ہے جس کا ذکر آگے آ رہا ہے۔

وَمِنَ الَّيۡلِ فَتَهَجَّدۡ بِهٖ نَافِلَةً لَّكَ ۖ عَسٰۤى اَنۡ يَّبۡعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحۡمُوۡدًا (۷۹)

'تہجد' سے مراد — 'تہجد' کے معنی لغت میں تو شب میں کچھ سونے کے بعد اٹھنے کے ہیں لیکن اصطلاح قرآن میں اس سے مراد وہ نماز ہے جو شب میں کچھ سونے کے بعد اٹھ کر پڑھی جائے۔ 'بہٖ' میں 'ب' میرے نزدیک ظرفیہ ہے اور ضمیر مجرور کا مرجع 'لیل' ہے۔

'نافلۃ' کا مفہوم — 'نَافِلَةً' اصل پر جو شے زائد ہو اس کو کہتے ہیں۔ اس کا استعمال کسی نعمت و رحمت پر زیادتی کے لیے ہوتا ہے، کسی بار اور مصیبت پر زیادتی کے لیے نہیں ہوتا یعنی یہ نماز ان پنجوقتہ نمازوں پر تمہارے لیے مزید ہے۔ 'لَكَ' سے یہ اشارہ نکلتا ہے کہ جہاں تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا تعلق ہے یہ نماز آپ کے لیے ضروری تھی۔ چنانچہ آپ نے زندگی بھر اس کا اہتمام رکھا۔ نمازوں کے اس اہتمام کی تاکید، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، شیطانی قوتوں کے مقابلہ کے لیے حصول قوت کے مقصد سے تھی۔ اسی مقصد کے لیے یہ تہجد کے اہتمام کی تاکید ہوئی اور اس کی نسبت فرمایا گیا کہ نَافِلَةً لَّكَ' یعنی یہ تمہارے لیے مزید کمک کے طور پر ہے جو راہ حق کی مشکلات کا مقابلہ کرنے کے لیے تمہارے صبر و ثبات میں مزید اضافہ کرے گی۔ عام امتیوں کے لیے یہ نماز اگرچہ فرض نہیں ہے لیکن جو لوگ شیطانی قوتوں کا مقابلہ کرنے اور حق کو دنیا میں برپا کرنے کے لیے اٹھیں ان کے لیے خدا کی نصرت حاصل کرنے کا سب سے بڑا ذریعہ یہی نماز ہے۔ چنانچہ امت کے صالحین نے جنھوں نے اس دنیا میں دین کی کوئی خدمت کرنے کی توفیق پائی ہے، اس نماز کا ہمیشہ اہتمام رکھا ہے۔

'عَسٰى' کا لفظ اصلاً امید و رجا، توقع اور ظن غالب کے اظہار کے لیے آتا ہے لیکن جب یہ اللہ تعالیٰ کی نسبت کے ساتھ آئے تو اس صورت میں امید و رجا کا تعلق اللہ تعالیٰ کے بجائے مخاطب یا متکلم سے ہو جائے گا۔ مثلاً عَسٰى رَبُّكُمۡ اَنۡ يَّرۡحَمَكُمۡ ۚ (اسراء: ۸) کا ترجمہ ہوگا، تم توقع رکھو کہ اللہ تم پر رحم فرمائے گا۔ عَسَى اللّٰهُ اَنۡ يَّاۡتِيَنِىۡ بِهِمۡ جَمِيۡعًا (یوسف: ۸۳) کا ترجمہ ہوگا، میں امید رکھتا ہوں کہ اللہ ان سب کو میرے پاس لائے گا۔ اسی طرح 'عَسٰۤى اَنۡ يَّبۡعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحۡمُوۡدًا' کا ترجمہ ہوگا، تم امید رکھو کہ خدا تمھیں محمود اٹھانا اٹھائے گا۔ اس توجیہ سے وہ شبہ رفع ہو جاتا ہے جو عربیت سے ناآشنا لوگ اٹھاتے ہیں کہ خدا کے نزدیک تو ہر چیز معلوم و معین ہے تو اس کی طرف توقع اور ظن و گمان کی نسبت کے کیا معنی؟ آگے کسی موزوں مقام پر ہم واضح کریں گے کہ 'لَعَلَّ' اور اس کے ہم معنی الفاظ و حروف بھی جب خدا کی نسبت سے آتے ہیں تو ان میں بھی وہی مفہوم ہوتا ہے جس کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا۔

مقام محمود — 'مَقَامًا مَّحۡمُوۡدًا'۔ 'مَقَام'، ہمارے نزدیک ظرف کے معنی میں نہیں بلکہ مصدر کے معنی میں ہے اور یہ یہاں مفعول مطلق کی حیثیت رکھتا ہے۔ چونکہ لفظ 'بعث' اور 'مقام' میں معنی کا اشتراک موجود ہے اس لیے کہ 'بَعَثَ' کے معنی اٹھانے اور 'مَقَام' کے معنی کھڑے ہونے اور اٹھنے کے ہیں اس وجہ سے اس کے مفعول مطلق واقع ہونے میں

کوئی قباحت نہیں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ آج تو تمہاری مخالفت و مذمت میں یہ شور و غوغا برپا ہے کہ کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی ہے لیکن تم اپنے موقف حق پر ڈٹے ہو، نمازوں بالخصوص تہجد کا خاص اہتمام کرو اور یہ توقع رکھو کہ تمہارا رب تمہیں اس حال میں اٹھائے گا کہ ایک عظیم امت کی زبانوں پر تمہارے لیے ترانۂ حمد ہوگا اور عنداللہ بھی تمہاری ساعی محمود و مشکور ہوں گی۔

وَقُلْ رَّبِّ اَدْخِلْنِیْ مُدْخَلَ صِدْقٍ وَّاَخْرِجْنِیْ مُخْرَجَ صِدْقٍ وَّاجْعَلْ لِّیْ مِنْ لَّدُنْكَ سُلْطٰنًا نَّصِیْرًا (۸۰)

لفظ 'قُلْ' یہاں دعا کرنے کے مفہوم میں ہے۔ اس مفہوم میں یہ لفظ قرآن میں جگہ جگہ آیا ہے۔ ملاحظہ ہو آیت ۲۹۔ مومنون۔

لفظ 'صِدْقٌ' کی اصل روح، جیسا کہ ہم دوسرے مقام میں واضح کر چکے ہیں، عزت، رسوخ اور استحکام ہے۔ 'سُلْطٰن' کے معنی غلبہ اور تمکن کے ہیں۔

قرب ہجرت کا اشارہ اور ایک عظیم بشارت

اوپر کی آیات سے یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ حالات اتنے سخت ہو چکے تھے کہ اب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے مکہ سے ہجرت ناگزیر ہو چکی تھی لیکن اللہ کا رسول اللہ کے اذن کے بغیر ہجرت نہیں کرتا۔ اس وجہ سے آنحضرت صلعم اپنی دعوت اور اپنے مقام پر ڈٹے رہے۔ یہ پہلا موقع ہے کہ آپ کو یہ دعا تلقین کی گئی جس میں نہ صرف یہ کہ قرب ہجرت کی طرف اشارہ ہے بلکہ یہ بشارت بھی مضمر ہے کہ آپ کے نکلنے سے پہلے ہی آپ کے داخل ہونے کا انتظام کر لیا گیا ہے، آپ کا نکلنا اور داخل ہونا دونوں عزت و وقار اور رسوخ و استحکام کے ساتھ ہوگا اور یہ کہ اس سفر میں غلبہ و نصرت الٰہی کا خاص خدائی بدرقہ آپ کے ہم رکاب ہوگا۔ دعا میں 'اَدْخِلْنِیْ مُدْخَلَ صِدْقٍ' کا 'اَخْرِجْنِیْ' پر مقدم ہونا اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ تمہارے داخلہ کا انتظام تمہارے نکلنے سے پہلے ہی ہو چکا ہے اور 'مِنْ لَّدُنْكَ' کے الفاظ اس حقیقت کی طرف اشارہ کر رہے ہیں کہ گو ظاہری حالات کیسے ہی نامساعد و مخالف ہوں لیکن تمہارا رب اپنے پاس سے تمہارے لیے سارے انتظام فرمائے گا۔ غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ ظاہری الفاظ کے اعتبار سے تو یہ ایک دعا ہے جو آپ کو تلقین فرمائی گئی ہے لیکن حقیقت میں یہ ایک عظیم بشارت ہے جو نہایت ہی پرخطر حالات میں آپ کو دی گئی۔ پھر ہجرت کے سفر کی سرگزشت اور مدینہ میں حضورؐ کے داخلہ کے حالات پڑھیے تو معلوم ہوگا کہ خلق نے اس بشارت کے ایک ایک لفظ کو عملاً ظہور میں آتے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔

وَقُلْ جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ ۭ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا (۸۱)

'حق' سے مراد قرآن اور وہ دین حق ہے جس کو لے کر قرآن آیا تھا اور باطل سے مراد وہ دین باطل ہے جس کو مٹانے کے لیے قرآن نازل ہوا تھا۔

حق کی فتح اور باطل کی شکست کا اعلان

اوپر آپ کو ہجرت کی دعا سکھائی گئی تھی اب یہ انھیں نازک حالات کے اندر حق کی فتح اور باطل کی شکست کے اعلان کا آپ کو حکم ہوا۔ اس کی وجہ وہی ہے جس کی طرف ہم اس کے محل میں اشارہ کر چکے ہیں کہ ہجرت درحقیقت رسول کی فتح کا دیباچہ ہوتی ہے۔ اس کے بعد رسول کے مخالفین لازماً مٹ جاتے ہیں اور دین حق کا بول بالا ہو کے رہتا ہے۔

'إِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوقًا' میں اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ انسانی فطرت کے اندر باطل کی کوئی بنیاد نہیں ہے۔ یہ خودرو جھاڑیوں کی طرح اس وقت پھیلتا ہے جب اس کو صاف کرتے رہنے والے موجود نہیں ہوتے ہیں۔ جب اس کو صاف کرنے والے آموجود ہوتے ہیں تو حالات کے اعتبار سے گو انھیں مشقت اٹھانی پڑتی ہے لیکن بالآخر یہ نابود ہو کے رہتا ہے اور اس کی جگہ وہ کشت حق لہلہا اٹھتی ہے جس کا تخم اہل حق ڈالتے ہیں اس لیے کہ انسانی فطرت کی زمین درحقیقت فاطر فطرت نے اسی کشت حق کی پرورش کے لیے بنائی ہے نہ کہ اس خاروخس کی پرورش کے لیے جو محض غفلت کی پیداوار ہے۔

فتح مکہ کے موقع پر یہ پیشین گوئی عملاً پوری ہوگئی۔ اس وقت آنحضرت صلعم نیزے کی انی سے خانہ کعبہ کے بتوں کو توڑتے جاتے اور یہ آیت پڑھتے جاتے گویا اس آیت کا مصداق منصۂ شہود پر آگیا۔

وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْآنِ مَا هُوَ شِفَاءٌ وَرَحْمَةٌ لِلْمُؤْمِنِينَ ۙ وَلَا يَزِيدُ الظَّالِمِينَ إِلَّا خَسَارًا (۸۲)

قرآن کی تکذیب کرنے والوں کی محرومی

یہ قرآن کی تکذیب کرنے والوں کی محرومی اور شامت زدگی پر اظہار افسوس اور ملامت ہے کہ ہم تو قرآن میں سے جو کچھ اتار رہے ہیں اس میں ان کے تمام روحانی وعقلی روگوں کا مداوا اور نتیجہ اور عاقبت کار کے اعتبار سے یہ ان کے لیے سرتا سر رحمت ہے لیکن جو لوگ اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے ہیں یہی چیز ان کے لیے مزید خسارے کا باعث بن رہی ہے کہ وہ اپنے اوپر اللہ کی حجت تمام کر کے اپنے آپ کو دنیا اور آخرت دونوں میں شدید عذاب کا مستحق بنا رہے ہیں۔

وَإِذَا أَنْعَمْنَا عَلَى الْإِنسَانِ أَعْرَضَ وَنَأَىٰ بِجَانِبِهِ ۖ وَإِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ كَانَ يَئُوسًا (۸۳)

'الْإِنسَان' کا لفظ اگرچہ عام ہے لیکن یہاں اس سے مراد قریش کے وہی اشرار و مفسدین ہیں جن کا کردار یہاں زیر بحث ہے۔ انھوں نے اللہ کی کتاب اور اس کے رسول سے متکبرانہ اعراض کی روش اختیار کی، جیسا کہ 'أَعْرَضَ وَنَأَىٰ بِجَانِبِهِ' کے الفاظ سے ظاہر ہو رہا ہے، اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے بھی ان سے منہ پھیر کر عام صیغہ سے بات فرمائی۔

'أَعْرَضَ' کے بعد 'نَأَىٰ بِجَانِبِهِ' کے الفاظ سے ان کے اعراض کی تصویر سامنے آرہی ہے۔ کسی چیز سے اعراض شائستہ انداز میں بھی ہو سکتا ہے لیکن جب انسان نفرت، بیزاری اور غرور کے انداز میں کسی چیز سے اعراض کرتا ہے تو وہ پہلو بدل لیتا اور مونڈھے پھیر لیتا ہے۔

فرمایا کہ انسان کا عجیب حال ہے۔ جب ہم اس پر اپنا فضل و انعام کرتے ہیں تب وہ ہم سے اکڑتا اور سرکشی کرتا ہے لیکن اس کے اعمال کی پاداش میں جب ہم اس کو کسی مصیبت میں گرفتار کر لیتے ہیں تو وہ دل شکستہ اور مایوس ہو جاتا ہے۔ حالانکہ اس کے لیے صحیح روش یہ تھی کہ ہمارے انعام پر ہمارا شکر گزار ہوتا اور کوئی آزمائش پیش آتی تو اس پر صبر کرتا۔ مطلب یہ ہے کہ یہی حال ہے تمھارے ان مخالفین کا۔ ہم نے ان کو اپنے فضل سے نوازا ہے تو ان کے غرور کا یہ حال ہے کہ تمھاری دعوت و تذکیر پر تم سے عذاب کا مطالبہ کر رہے ہیں اور اگر ہم نے ان کو دھر لیا تو پھر سارا نشہ ہرن ہو جائے گا اور یاس و نامرادی کی تصویر بن کر رہ جائیں گے۔

قُلْ كُلٌّ يَّعْمَلُ عَلٰى شَاكِلَتِهٖ ۭ فَرَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَنْ هُوَ اَهْدٰى سَبِيْلًا ﴿۸۴﴾

لفظ 'کل' اگرچہ نکرہ ہے لیکن بعض مواقع میں، جیسا کہ اس کے محل میں ہم واضح کر چکے ہیں، یہ معرفہ کے حکم میں ہو جاتا ہے یعنی اس سے وہی جماعتیں یا اشخاص مراد ہوتے ہیں جن کا ذکر اوپر سے چلا آ رہا ہوتا ہے۔

معاملہ اللہ کے حوالہ کرنے کی ہدایت

'شاکلۃ' کے معنی طریقہ کے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ان سے کہہ دو کہ اگر تم میری بات سننے پر آمادہ نہیں ہو تو تم اپنی روش پر گامزن رہو گے اور میں بہرحال اپنی دعوت پر قائم رہوں گا۔ تمہارا رب خوب جانتا ہے کہ سیدھے راستے پر کون ہے، اپنے زعم کے مطابق تم یا میں اور میرے ساتھی۔ آگے آنے والے حالات بتا دیں گے کہ منزل پر کون پہنچتا ہے۔ یہ آیت گویا تفویض کی آیت ہے۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ہدایت ہوئی کہ تم ان کا معاملہ اللہ کے حوالہ کرو اور خود اپنے موقف حق پر ڈٹے رہو۔

۱۸۔ آگے کا مضمون ____ آیات ۸۵-۱۱۱

مخالفین کے اعتراضوں کے جواب

آگے مخالفین کے ان اعتراضات کا جواب ہے جو وہ قرآن اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کے خلاف اٹھاتے تھے۔ ساتھ ہی ان مطالبات کا حوالہ بھی ہے جو وہ اپنے ایمان لانے کی شرط کے طور پر پیش کرتے تھے۔ ان مطالبات کو نقل کر کے ان کے جواب بھی دیے ہیں اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ تسلی بھی کہ جن کے اندر علم کا نور ہے وہ اس کتاب پر ایمان لا رہے ہیں، رہے وہ لوگ جو طرح طرح کے معجزات کے مطالبے کر رہے ہیں ان کو ان کے حال پر چھوڑو، یہ ایمان لانے والے نہیں ہیں ____ آیات کی تلاوت کیجیے۔

آیات ۸۵-۱۱۱

وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ ۭ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ
الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۸۵﴾ وَلَىِٕنْ شِئْنَا لَنَذْهَبَنَّ بِالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ
اِلَيْكَ ثُمَّ لَا تَجِدُ لَكَ بِهٖ عَلَيْنَا وَكِيْلًا ﴿۸۶﴾ اِلَّا رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ ۭ
اِنَّ فَضْلَهٗ كَانَ عَلَيْكَ كَبِيْرًا ﴿۸۷﴾ قُلْ لَّىِٕنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ
عَلٰٓي اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ
لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا ﴿۸۸﴾ وَلَقَدْ صَرَّفْنَا لِلنَّاسِ فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ ۡ
فَاَبٰٓى اَكْثَرُ النَّاسِ اِلَّا كُفُوْرًا ﴿۸۹﴾ وَقَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى تَفْجُرَ
لَنَا مِنَ الْاَرْضِ يَنْۢبُوْعًا ﴿۹۰﴾ اَوْ تَكُوْنَ لَكَ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّعِنَبٍ

تَفْجُرَ الْاَنْهٰرَ خِلٰلَهَا تَفْجِيْرًا ﴿٩١﴾ اَوْ تُسْقِطَ السَّمَآءَ كَمَا زَعَمْتَ
عَلَيْنَا كِسَفًا اَوْ تَاْتِيَ بِاللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ قَبِيْلًا ﴿٩٢﴾ اَوْ يَكُوْنَ لَكَ بَيْتٌ
مِّنْ زُخْرُفٍ اَوْ تَرْقٰى فِي السَّمَآءِ ۭ وَلَنْ نُّؤْمِنَ لِرُقِيِّكَ حَتّٰى تُنَزِّلَ
عَلَيْنَا كِتٰبًا نَّقْرَؤُهٗ ۭ قُلْ سُبْحَانَ رَبِّيْ هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا ﴿٩٣﴾ ع ١٠ ٩ ١٠
وَمَا مَنَعَ النَّاسَ اَنْ يُّؤْمِنُوْٓا اِذْ جَآءَهُمُ الْهُدٰٓى اِلَّآ اَنْ قَالُوْٓا اَبَعَثَ
اللّٰهُ بَشَرًا رَّسُوْلًا ﴿٩٤﴾ قُلْ لَّوْ كَانَ فِي الْاَرْضِ مَلٰٓئِكَةٌ يَّمْشُوْنَ مُطْمَئِنِّيْنَ
لَنَزَّلْنَا عَلَيْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَلَكًا رَّسُوْلًا ﴿٩٥﴾ قُلْ كَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا بَيْنِيْ
وَبَيْنَكُمْ ۭ اِنَّهٗ كَانَ بِعِبَادِهٖ خَبِيْرًا بَصِيْرًا ﴿٩٦﴾ وَمَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَهُوَ
الْمُهْتَدِ ۚ وَمَنْ يُّضْلِلْ فَلَنْ تَجِدَ لَهُمْ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِهٖ ۭ وَنَحْشُرُهُمْ
يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عَلٰي وُجُوْهِهِمْ عُمْيًا وَّبُكْمًا وَّصُمًّا ۭ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ۭ كُلَّمَا
خَبَتْ زِدْنٰهُمْ سَعِيْرًا ﴿٩٧﴾ ذٰلِكَ جَزَاۗؤُهُمْ بِاَنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِنَا وَقَالُوْٓا النصف
ءَاِذَا كُنَّا عِظَامًا وَّرُفَاتًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ خَلْقًا جَدِيْدًا ﴿٩٨﴾ اَوَلَمْ
يَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ قَادِرٌ عَلٰٓي اَنْ يَّخْلُقَ
مِثْلَهُمْ وَجَعَلَ لَهُمْ اَجَلًا لَّا رَيْبَ فِيْهِ ۭ فَاَبَى الظّٰلِمُوْنَ اِلَّا كُفُوْرًا ﴿٩٩﴾
قُلْ لَّوْ اَنْتُمْ تَمْلِكُوْنَ خَزَاۗىِٕنَ رَحْمَةِ رَبِّيْٓ اِذًا لَّاَمْسَكْتُمْ خَشْيَةَ
الْاِنْفَاقِ ۭ وَكَانَ الْاِنْسَانُ قَتُوْرًا ﴿١٠٠﴾ ع وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسٰى تِسْعَ اٰيٰتٍۢ ع ١١ ١١
بَيِّنٰتٍ فَسْــَٔـلْ بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ اِذْ جَاۗءَهُمْ فَقَالَ لَهٗ فِرْعَوْنُ اِنِّىْ
لَاَظُنُّكَ يٰمُوْسٰي مَسْحُوْرًا ﴿١٠١﴾ قَالَ لَقَدْ عَلِمْتَ مَآ اَنْزَلَ هٰٓؤُلَاۗءِ اِلَّا

رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ بَصَآئِرَ ۚ وَاِنِّیْ لَاَظُنُّكَ يٰفِرْعَوْنُ مَثْبُوْرًا ﴿١٠٢﴾
فَاَرَادَ اَنْ يَّسْتَفِزَّهُمْ مِّنَ الْاَرْضِ فَاَغْرَقْنٰهُ وَمَنْ مَّعَهٗ جَمِيْعًا ﴿١٠٣﴾ۙ
وَّقُلْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ لِبَنِیْٓ اِسْرَآءِيْلَ اسْكُنُوا الْاَرْضَ فَاِذَا جَآءَ
وَعْدُ الْاٰخِرَةِ جِئْنَا بِكُمْ لَفِيْفًا ﴿١٠٤﴾ؕ وَبِالْحَقِّ اَنْزَلْنٰهُ وَبِالْحَقِّ
وقف لازم نَزَلَ ؕ وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا مُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا ﴿١٠٥﴾ وَقُرْاٰنًا فَرَقْنٰهُ
لِتَقْرَاَهٗ عَلَى النَّاسِ عَلٰى مُكْثٍ وَّنَزَّلْنٰهُ تَنْزِيْلًا ﴿١٠٦﴾ قُلْ اٰمِنُوْا بِهٖٓ
اَوْ لَا تُؤْمِنُوْا ؕ اِنَّ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ مِنْ قَبْلِهٖٓ اِذَا يُتْلٰى عَلَيْهِمْ
يَخِرُّوْنَ لِلْاَذْقَانِ سُجَّدًا ﴿١٠٧﴾ۙ وَّيَقُوْلُوْنَ سُبْحٰنَ رَبِّنَآ اِنْ كَانَ وَعْدُ
السجدة رَبِّنَا لَمَفْعُوْلًا ﴿١٠٨﴾ وَيَخِرُّوْنَ لِلْاَذْقَانِ يَبْكُوْنَ وَيَزِيْدُهُمْ خُشُوْعًا ﴿١٠٩﴾
قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ اَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ ؕ اَيًّا مَّا تَدْعُوْا فَلَهُ الْاَسْمَآءُ
الْحُسْنٰى ۚ وَلَا تَجْهَرْ بِصَلَاتِكَ وَلَا تُخَافِتْ بِهَا وَابْتَغِ بَيْنَ
ذٰلِكَ سَبِيْلًا ﴿١١٠﴾ وَقُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ لَمْ يَتَّخِذْ وَلَدًا وَّلَمْ
يَكُنْ لَّهٗ شَرِيْكٌ فِی الْمُلْكِ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ وَلِیٌّ مِّنَ الذُّلِّ وَ
ع ۱۲/۱۱/۱۲ كَبِّرْهُ تَكْبِيْرًا ﴿١١١﴾

ترجمۂ آیات ۸۵-۱۱۱

اور وہ تم سے روح کے متعلق سوال کرتے ہیں، کہہ دو کہ روح میرے رب کے حکم میں سے ہے اور نہیں تو بس تھوڑا ہی سا علم عطا ہوا ہے۔ اور اگر ہم چاہیں تو اس وحی کو سلب کر لیں جو ہم نے تم پر کی ہے، پھر تم اس کے لیے ہمارے مقابلہ میں کوئی مددگار بھی نہ پا سکو گے۔ یہ تو بس تمھارے رب کا فضل ہے۔ بے شک اس کا فضل تم پر بہت بڑا ہے۔ کہہ دو کہ اگر تمام انس و جن

اس بات پر اکٹھے ہو جائیں کہ اس جیسا قرآن لا دیں تو وہ اس جیسا نہ لا سکیں گے اگرچہ وہ ایک دوسرے کے مددگار بھی بن جائیں۔ ۸۵-۸۸

اور ہم نے لوگوں کے لیے اس قرآن میں طرح طرح سے ہر قسم کی حکمت کی باتیں بیان کی ہیں لیکن اکثر لوگ انکار ہی پر اڑے ہوئے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ ہم تو تمھاری بات ماننے کے نہیں جب تک تم ہمارے لیے زمین سے کوئی چشمہ نہ جاری کر دو یا تمھارے پاس کھجوروں اور انگوروں کا کوئی باغ نہ ہو جائے پھر تم اس کے بیچ بیچ میں نہریں نہ دوڑا دو یا تم ہم پر آسمان سے ٹکڑے نہ گرا دو جیسا کہ تم دعویٰ کرتے ہو یا اللہ اور فرشتوں کو سامنے نہ لا کھڑا کرو یا تمھارے پاس سونے کا کوئی گھر نہ ہو جائے یا تم آسمان پر نہ چڑھ جاؤ اور ہم تمھارے چڑھنے کو بھی ماننے کے نہیں جب تک تم وہاں سے ہم پر کوئی کتاب نہ اتارو جسے ہم پڑھیں — کہہ دو کہ میرا رب پاک ہے، میں تو بس ایک بشر ہوں، اللہ کا رسول۔ ۸۹-۹۳

اور ان لوگوں کو ایمان لانے سے، جب کہ ان کے پاس ہدایت آگئی، نہیں مانع ہوئی مگر یہ چیز کہ انھوں نے کہا کہ کیا اللہ نے ایک بشر ہی کو رسول بنا کر بھیجا۔ کہہ دو، اگر زمین میں فرشتے اطمینان سے چلتے پھرتے ہوتے تو ہم ان پر آسمان سے کسی فرشتے ہی کو رسول بنا کر اتارتے۔ کہہ دو کہ اللہ میرے اور تمھارے درمیان گواہی کے لیے کافی ہے، بے شک وہی اپنے بندوں کو خوب جاننے والا ہے، خوب دیکھنے والا ہے۔ اور جس کو اللہ ہدایت دے گا وہی ہدایت پانے والا بنے گا اور جسے وہ گمراہ کر دے گا تو تم ان کے لیے اس کے سوا کسی کو مددگار نہ پاؤ گے اور ہم قیامت کے دن ان کو ان کے مونہوں کے بل، اندھے، گونگے اور بہرے اکٹھا کریں گے۔ ان کا ٹھکانا جہنم ہے، جب جب اس کی آگ دھیمی ہونے لگے گی ہم اس کو مزید بھڑکا دیا کریں گے۔

یہ ان کا بدلہ ہوگا اس بات کا کہ انھوں نے ہماری آیات کا انکار کیا اور کہا کہ کیا جب ہم ہڈیاں اور ریزہ ریزہ ہو جائیں گے تو کیا ہم از سرِ نو پیدا کر کے اٹھائے جائیں گے۔ کیا انھوں نے نہیں سوچا کہ جس اللہ نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا وہ قادر ہے کہ ان کے مانند پھر پیدا کر دے اور اس نے ان کے لیے ایک مدت مقرر کر رکھی ہے جس میں کوئی شک نہیں ہے لیکن یہ ظالم انکار ہی پر اڑے رہے۔ ۹۸-۹۹

کہہ دو کہ اگر میرے رب کے فضل کے خزانوں کے مالک تم ہوتے تو اس وقت تم خرچ ہو جانے کے اندیشے سے ہاتھ روک لیتے اور انسان بڑا ہی تنگ دل ہے۔ ۱۰۰

اور ہم نے موسیٰ کو نو کھلی ہوئی نشانیاں دیں تو بنی اسرائیل سے پوچھ لو جب کہ وہ ان کے پاس آیا تو فرعون نے اس سے کہا کہ اے موسیٰ میں تو تم کو ایک سحر زدہ آدمی سمجھتا ہوں۔ اس نے جواب دیا کہ تجھے خوب معلوم ہے کہ ان کو آسمانوں اور زمین کے رب ہی نے اتارا ہے آنکھیں کھول دینے کے لیے اور میں تو تم کو اے فرعون ہلاکت زدہ سمجھتا ہوں۔ اس کے بعد اس نے ارادہ کیا کہ ان کے قدم اس سرزمین سے اکھاڑ دے تو ہم نے اس کو اور جو اس کے ساتھ تھے سب کو غرق کر دیا۔ اور اس کے بعد ہم نے بنی اسرائیل سے کہا کہ تم ملک میں رہو بسو، پھر جب آخرت کا وعدہ آجائے گا تو ہم تم سب کو اکٹھا کر کے لائیں گے۔ ۱۰۱-۱۰۴

اور ہم نے اس کو حق کے ساتھ اتارا ہے اور یہ حق ہی کے ساتھ اترا ہے اور ہم نے تم کو صرف ایک بشیر و نذیر بنا کر بھیجا ہے۔ اور قرآن کو تو ہم نے تھوڑا تھوڑا کر کے اس لیے اتارا کہ تم اس کو لوگوں کو ٹھہر ٹھہر کر سناؤ اور ہم نے اس کو نہایت اہتمام سے اتارا ہے۔ ان سے کہہ دو کہ تم اس پر ایمان لاؤ یا نہ لاؤ، وہ لوگ جن کو اس کے پہلے سے علم ملا ہوا ہے جب یہ ان کو سنایا

جاتا ہے تو وہ ٹھوڑیوں کے بل سجدہ میں گر پڑتے ہیں اور کہتے ہیں کہ پاک ہے ہمارا پروردگار، بے شک ہمارے پروردگار کا وعدہ شدنی تھا اور وہ ٹھوڑیوں کے بل روتے ہوئے گرتے ہیں اور یہ ان کے خشوع میں اضافہ کرتا ہے۔ ۱۰۵-۱۰۹

کہہ دو کہ اللہ کے نام سے پکارو یا رحمٰن کے نام سے، جس نام سے بھی پکارو سب اچھے نام اسی کے ہیں۔ اور تم اپنی نماز کو نہ زیادہ جہری کرو اور نہ بالکل ہی سرّی، ان دونوں کے بیچ بیچ کا راستہ اختیار کرو۔ اور کہو کہ شکر کا سزاوار ہے وہ اللہ جس کے نہ کوئی اولاد ہے اور نہ اس کی بادشاہی میں اس کا کوئی ساجھی ہے اور نہ اس کو ذلت سے بچانے کے لیے کسی مددگار کی حاجت ہے اور اس کی بڑائی بیان کرو جیسا کہ اس کا حق ہے۔ ۱۱۰-۱۱۱

۱۹- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

یَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ ؕ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّیْ وَمَآ اُوْتِیْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِیْلًا (۸۵)

'رُوْح' سے مراد یہاں وحی الٰہی ہے۔ وحی الٰہی کو روح سے تعبیر کرنے میں یہ اشارہ مضمر ہے کہ جس طرح جسم کی زندگی روح سے ہے اسی طرح روح و عقل اور دل کی زندگی وحی الٰہی سے ہے۔ اس حقیقت کو سیدنا مسیحؑ نے یوں واضح فرمایا ہے کہ انسان صرف روٹی سے نہیں جیتا بلکہ اس کلمے سے جیتا ہے جو خداوند کی طرف سے آتا ہے۔ قرآن کو اسی پہلو سے جگہ جگہ روح سے تعبیر کیا ہے۔ مثلاً 'روح' سے مراد

یُنَزِّلُ الْمَلٰٓئِكَةَ بِالرُّوْحِ مِنْ اَمْرِهٖ عَلٰى مَنْ یَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ (۲- نحل)	وہ اتارتا ہے فرشتوں کو روح کے ساتھ اپنے امر میں سے جن پر چاہتا ہے ان بندوں میں سے۔
یُلْقِی الرُّوْحَ مِنْ اَمْرِهٖ عَلٰى مَنْ یَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ لِیُنْذِرَ یَوْمَ التَّلَاقِ ؕ (۱۵- غافر)	وہ اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے روح القا کرتا ہے اپنے امر میں سے تاکہ وہ لوگوں کو ملاقات کے دن سے ہوشیار کر دے۔
وَكَذٰلِكَ اَوْحَیْنَاۤ اِلَیْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا (۵۲- الشوریٰ)	اور اسی طرح ہم نے تمہاری طرف وحی کی روح اپنے امر میں سے۔

کفار اسی روح سے متعلق سوال کرتے اور ان کا یہ سوال تحقیق کی غرض سے نہیں بلکہ محض اعتراض و استہزاء کے روح کے متعلق سوال کا جواب

ارادہ سے ہوتا۔ یعنی نعوذ باللہ ان کے سوال کا مطلب یہ ہوتا کہ یہ روح کیا بلا ہے جس کے تم اپنے اوپر اترنے کے مدعی ہو، ذرا اس کی حقیقت ہمیں بھی تو سمجھاؤ۔ جواب میں فرمایا کہ ان سے کہہ دو کہ روح میرے رب کے امر میں سے ہے اور تمھیں علم تھوڑا ہی ملا ہے، یعنی یہ ضروری نہیں ہے کہ تم اس کائنات اور اس کے خالق کے سارے ہی بھید سمجھ جاؤ۔ اس روح کو وہی سمجھتے ہیں جن کو اس کا تجربہ ہوا ہے۔ جس کے دردِ جگر نہ ہوا ہو وہ اگر دردِ جگر کو دیکھنے کے لیے مچلے تو اس کو یہ درد کس طرح دکھایا اور سمجھایا جا سکتا ہے۔

ان مخالفین قرآن کے ذہن میں یہ سوال کرتے وقت یہ بات بھی مخفی ہوتی کہ آخر تمھارے ہی اوپر یہ روح کیوں اترتی ہے، ہمارے اوپر کیوں نہیں اترتی؟ ان کے اسی مافی الذہن کو سامنے رکھ کر اوپر کی آیات میں عَلٰی مَنْ یَّشَآءُ کے الفاظ آئے ہیں۔ یعنی اس شرف کا مستحق ہر بوالہوس نہیں ہوتا، اس کے لیے اللہ ہی جس کو چاہتا ہے انتخاب فرماتا ہے۔

'مِنْ اَمْرِهٖ' اور 'مِنْ اَمْرِنَا' کے الفاظ اس حقیقت کے اظہار کے لیے ہیں کہ یہ چیز امورِ الٰہیہ میں سے ہے جس کی اصل حقیقت خدا ہی جانتا ہے۔ ہر شخص اس کی حقیقت کو نہیں پا سکتا۔

وَلَئِنْ شِئْنَا لَنَذْهَبَنَّ بِالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ ثُمَّ لَا تَجِدُ لَكَ بِهٖ عَلَيْنَا وَكِيْلًا ۝ اِلَّا رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ ۭ اِنَّ فَضْلَهٗ كَانَ عَلَيْكَ كَبِيْرًا (۸۶-۸۷)

وحی کی حالت ایک تصرفِ غیبی ہے

اس آیت کا خطاب اگرچہ آنحضرت صلعم کی طرف ہے لیکن بات جو فرمائی گئی ہے اس کو انھی لوگوں کو سنانا مقصود ہے جن کا اوپر سوال نقل ہوا ہے فرمایا کہ یہ وحی کی حالت و کیفیت تو تمھارے لیے بھی ایک بالکل اضطراری کیفیت و حالت ہے جس میں تمھارے اختیار و ارادہ اور تمھاری خواہش و کوشش کو کوئی دخل نہیں ہے۔ نہ تم اس کو اپنے ارادے سے لا سکتے اور نہ اپنے ارادے سے روک سکتے۔ یہاں تک کہ اگر ہم اس وحی کو سلب کر لیں جو ہم نے تم پر کی ہے تو کوئی طاقت ایسی نہیں جو تم کو یہ واپس دلا سکے۔ یہ محض ہمارا تصرفِ غیبی ہے جس سے تمھیں یہ چیز حاصل ہوتی ہے اور صرف ہمارا فضل ہے جس سے ہم نے تم کو سرفراز کیا ہے اور اس میں شبہ نہیں کہ یہ تمھارے رب کا تمھارے اوپر بہت ہی بڑا فضل ہوا ہے۔

قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰٓي اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا (۸۸)

ظاہر ہے کہ جب خود پیغمبر کی خواہش و کوشش کو بھی اس وحی کے لانے میں کوئی دخل نہیں ہے اور وہ بھی اپنے اختیار و ارادے سے اس قسم کی کتاب پیش کرنے پر قادر نہیں درآنحالیکہ انھی کے واسطہ سے یہ ظہور میں آتی ہے تو تا بہ دیگراں چہ رسد۔ دوسروں کی کیا تاب و مجال ہے کہ اس قرآن کے مثل کوئی کتاب لا سکیں۔ انسان تو درکنار اگر انسان اور جنات دونوں آپس میں گٹھ جوڑ کر کے یہ زور لگائیں کہ اس طرح کی کوئی کتاب پیش کریں جب بھی وہ اس پر قادر نہیں ہو سکتے ـــــ قرآن کا یہ چیلنج کم و بیش چودہ سو سال سے موجود ہے اور تاریخ شاہد ہے کہ

عرب و عجم میں سے کوئی اس کو قبول کرنے کی جرأت نہ کر سکا اور اگر کسی نے اس کی نقالی کرنے کی کوشش کی تو وہ اپنے آپ کو مضحکہ بنانے سے محفوظ نہ رکھ سکا۔

وَلَقَدْ صَرَّفْنَا لِلنَّاسِ فِي هَٰذَا الْقُرْآنِ مِن كُلِّ مَثَلٍ فَأَبَىٰ أَكْثَرُ النَّاسِ إِلَّا كُفُورًا (۸۹)

قرآن کے ذریعے اتمام حجت

تصریف کے معنی یہاں ایک ایک حقیقت کو مختلف اسلوبوں اور گوناگون پیرایوں سے بیان کرنا ہے اور 'ضرب مثل' سے مراد حکمت و معرفت کی بات کہنا ہے۔ عربی میں اس مفہوم کے لیے اس محاورہ کا استعمال معروف ہے۔ کسی حماسی کا شعر مشہور ہے۔

یا بدر دی الامثال   یضربها لذی اللب الحکیم

اے بدر، حکمت کی باتیں حکیم عاقل ہی کے لیے بیان کرتا ہے

مطلب یہ ہے کہ اس معجز کتاب کے نازل ہو جانے کے بعد جس میں حکمت کی ایک ایک بات گوناگوں اسلوبوں اور پیرایوں سے ہم نے بیان کی ہے ان لوگوں کے پاس یہ عذر باقی نہیں رہا کہ ان کے پاس خدا کی کوئی ہدایت نہیں آئی۔ اس کتاب نے ان پر حجت تمام کر دی ہے۔ اگر اس کے بعد بھی لوگوں کی اکثریت انکار ہی پر اڑی ہوئی ہے تو یہ ان کی اپنی محرومی و بدبختی ہے۔

وَقَالُوا لَن نُّؤْمِنَ لَكَ حَتَّىٰ تَفْجُرَ لَنَا مِنَ الْأَرْضِ يَنبُوعًا ۝ أَوْ تَكُونَ لَكَ جَنَّةٌ مِّن نَّخِيلٍ وَعِنَبٍ فَتُفَجِّرَ الْأَنْهَارَ خِلَالَهَا تَفْجِيرًا ۝ أَوْ تُسْقِطَ السَّمَاءَ كَمَا زَعَمْتَ عَلَيْنَا كِسَفًا أَوْ تَأْتِيَ بِاللَّهِ وَالْمَلَائِكَةِ قَبِيلًا ۝ أَوْ يَكُونَ لَكَ بَيْتٌ مِّن زُخْرُفٍ أَوْ تَرْقَىٰ فِي السَّمَاءِ ۚ وَلَن نُّؤْمِنَ لِرُقِيِّكَ حَتَّىٰ تُنَزِّلَ عَلَيْنَا كِتَابًا نَّقْرَؤُهُ ۗ قُلْ سُبْحَانَ رَبِّي هَلْ كُنتُ إِلَّا بَشَرًا رَّسُولًا (۹۰-۹۳)

مخالفین کے مطالبات برائے تصدیق رسالت

'ایمان' کا صلہ جب 'ل' کے ساتھ آتا ہے تو اس کے معنی ایمان لانے کے نہیں بلکہ مجرد کسی بات کے ماننے اور باور کرنے کے ہوتے ہیں۔ اب یہ مخالفین کے وہ مطالبات نقل ہو رہے ہیں جن کو وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کی تصدیق کے لیے بطور شرط کے پیش کرتے تھے۔ وہ مطالبات مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ یہ کہ دیکھتے دیکھتے آپ زمین سے ایک چشمہ جاری کر دیں۔

۲۔ یا یہ کہ آپ کے پاس کھجوروں اور انگوروں کا ایک باغ ہو جائے اور آپ اس کے بیچ بیچ میں بہت سی نہریں نکال دیں۔

۳۔ یا یہ کہ آپ ہم پر آسمان کے کچھ ٹکڑے گرا دیں جیسا کہ آپ کا دعویٰ ہے یا یہ کہ اللہ اور فرشتوں کو رو در رو دکھا دیں ('قبیلا' کے معنی ہوں گے رایتہ عیانا و مقابلۃ)۔

۴۔ یا یہ کہ آپ کے پاس ایک سونے کا مکان ہو جائے یا آپ ہماری آنکھوں کے سامنے آسمان پر چڑھ جائیں اور ہم آپ کے اس آسمان پر چڑھنے کو بھی اس وقت تک باور نہیں کریں گے جب تک آپ وہاں سے ہم پر کوئی کتاب نہ اتاریں جس کو ہم پڑھیں۔

مطالبات کا جواب

ان سارے مطالبات کے جواب میں ارشاد ہوا قُلْ سُبْحَانَ رَبِّیْ هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا۔ ان سے کہہ دو کہ میرا رب ہر قسم کی شرکت سے پاک ہے، میں تو بس ایک بشر اور رسول ہوں۔ یعنی میں نے خدائی یا خدائی میں شرکت کا دعویٰ نہیں کیا ہے کہ تم مجھ سے اس قسم کے مطالبے کرتے ہو، میرا رب ہر قسم کی شرکت سے منزہ، ارفع اور بالا تر ہے، میں تو صرف ایک بشر ہوں اور خدا کا ایک رسول۔ رسول کی حیثیت سے میرا فریضہ صرف یہ ہے کہ میں تم کو خدا کا پیغام پہنچا دوں۔ ان کاموں میں سے کوئی ایک کام بھی کر دینے کا مجھے اختیار نہیں ملا ہوا ہے۔

وَمَا مَنَعَ النَّاسَ اَنْ يُّؤْمِنُوْٓا اِذْ جَآءَهُمُ الْهُدٰٓى اِلَّآ اَنْ قَالُوْٓا اَبَعَثَ اللّٰهُ بَشَرًا رَّسُوْلًا (۹۴)

انسانوں کے لیے انسان کے نبی ہونے کی حکمت

'اَلْهُدٰی' یعنی اللہ کی واضح ہدایت اپنے تمام دلائل و براہین کے ساتھ۔ مطلب یہ ہے کہ جہاں تک اللہ کی ہدایت کا تعلق ہے وہ تو نہایت واضح شکل میں، اپنے ناقابل تردید دلائل کے ساتھ، ان کے سامنے آچکی ہے۔ اب تو اگر یہ کسی چیز کو اپنے ایمان نہ لانے کے بہانے کے طور پر پیش کر رہے ہیں تو وہ صرف یہ چیز ہے کہ کیا ایک بشر کو اللہ نے رسول بنا کر بھیجا ہے! یعنی جہاں تک دلائل کا تعلق ہے اس سے انکار کی کوئی گنجائش تو باقی نہیں رہی ہے۔ لیکن ان کا کبر و غرور اس بات سے مانع ہے کہ وہ ایک بشر کو اپنا رسول مان لیں۔

قُلْ لَّوْ كَانَ فِى الْاَرْضِ مَلٰٓئِكَةٌ يَّمْشُوْنَ مُطْمَئِنِّيْنَ لَنَزَّلْنَا عَلَيْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَلَكًا رَّسُوْلًا (۹۵)

یعنی اگر ان کا یہ خیال ہے کہ کسی بشر کے بجائے کسی فرشتے کو ان کی طرف رسول ہو کر آنا تھا تو ان سے کہہ دو کہ اگر زمین میں انسانوں کے بجائے فرشتے رہتے بستے ہوتے تب تو ہم اگر ان کی طرف رسول بھیجتے تو لازماً آسمان سے کوئی فرشتہ ہی اتارتے لیکن جب زمین میں انسان رہتے بستے ہیں تو آخر انسانوں کی طرف کسی فرشتہ کو رسول بنا کر بھیجنے کے کیا معنی؟ رسول اس لیے آتا ہے کہ اس کی زندگی لوگوں کے لیے اسوہ اور نمونہ بنے۔ آخر کسی فرشتہ کی زندگی انسانوں کے لیے اسوہ اور نمونہ کس طرح بن سکتی ہے؟

'مَلٰٓئِكَةٌ' کے ساتھ 'يَّمْشُوْنَ مُطْمَئِنِّيْنَ' کی قید سے اس حقیقت کی طرف اشارہ ہو رہا ہے کہ زمین میں فرشتے آتے جاتے تو ہیں لیکن وہ خدا کے حکم کے تحت اس کی کسی مشیت کی تنفیذ کے لیے آتے جاتے ہیں۔ ان کی حیثیت یہاں کے مستقل باشندوں کی نہیں ہے۔

قُلْ كَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًۢا بَيْنِىْ وَبَيْنَكُمْ ؕ اِنَّهٗ كَانَ بِعِبَادِهٖ خَبِيْرًۢا بَصِيْرًا (۹۶)

معاملہ اللہ کے حوالہ کرنے کی ہدایت

اب یہ اچھی طرح حجت تمام کر دینے کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت ہوئی کہ ان کا معاملہ اللہ کے حوالہ کر دو اور ان سے کہہ دو کہ اللہ میرے اور تمہارے درمیان گواہی دینے کے لیے کافی ہے کہ دلائل کی عدم وضاحت تمہارے لیے ایمان سے مانع ہے یا تمہاری ضد اور انانیت۔ اللہ اپنے بندوں کے ظاہر و باطن سے خوب واقف ہے۔ اب وہی فیصلہ فرمائے گا کہ تم پر میری رسالت کی صداقت واضح نہیں ہوئی تھی یا تم سب کچھ دیکھ، سن اور سمجھ کر اندھے بہرے اور گونگے بنے رہے۔

وَمَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِ ۚ وَمَنْ يُّضْلِلْ فَلَنْ تَجِدَ لَهُمْ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِهٖ ؕ وَنَحْشُرُهُمْ

يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عَلٰى وُجُوْهِهِمْ عُمْيًا وَّبُكْمًا وَّصُمًّا ۭ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ۭ كُلَّمَا خَبَتْ زِدْنٰهُمْ سَعِيْرًا (۹۷)

ہدایت وضلالت کے باب میں سنت الٰہی

یہ ہدایت وضلالت کے باب میں اللہ تعالیٰ نے اپنی سنت واضح فرما دی کہ اللہ ہی جس کو ہدایت دیتا ہے وہ ہدایت پاتا اور وہ جس کو گمراہ کر دے اس کے لیے کوئی بھی ہدایت دینے والا نہیں بن سکتا۔ یہ سنت الٰہی جس اساس پر مبنی ہے اس کی طرف 'وَنَحْشُرُهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عَلٰى وُجُوْهِهِمْ عُمْيًا وَّبُكْمًا وَّصُمًّا' کے الفاظ اشارہ کر رہے ہیں کہ جو لوگ اپنی آنکھیں اللہ کی نشانیاں دیکھنے کے لیے، اپنی زبانیں حق کی گواہی کے لیے اور اپنے کان اللہ اور رسول کی باتیں سننے کے لیے استعمال کرتے ہیں ان کو تو خدا کی طرف سے ہدایت نصیب ہوتی ہے۔ رہے وہ لوگ جو یہ سب کچھ رکھتے ہوئے اندھے، بہرے اور گونگے بنے رہتے ہیں ان کو خدا کی ہدایت نصیب نہیں ہوتی۔ ان لوگوں کا چونکہ یہی حال ہے اس وجہ سے ان کو ہدایت نصیب نہیں ہوگی اور قیامت کے دن ان کو ان نعمتوں کی ناقدری کی سزا ہم یہ دیں گے کہ ان کو ہم ان کے مونہوں کے بل اس حال میں گھسیٹتے ہوئے اکٹھا کریں گے کہ یہ اندھے، گونگے اور بہرے ہوں گے۔ 'نَحْشُرُهُمْ' کے بعد 'عَلٰى' اس بات پر دلیل ہے کہ یہ مونہوں کے بل گھسیٹتے ہوئے اکٹھے کیے جائیں گے۔ دوسری جگہ 'يَوْمَ يُسْحَبُوْنَ فِي النَّارِ عَلٰى وُجُوْهِهِمْ' کے الفاظ وارد ہوئے جن سے اس مضمون کی وضاحت ہو جاتی ہے۔ وہ چہرے جن کو اللہ نے سمع و بصر اور نطق کی صلاحیتوں سے مزین فرمایا لیکن اس کے باوجود وہ اندھے، بہرے اور گونگے ہی بنے رہے بلاشبہ وہ اسی قابل ہیں کہ ایسی بھڑکتی آگ پر گھسیٹے جائیں جس کی لو کبھی دھیمی نہ ہونے پائے۔

ذٰلِكَ جَزَاۗؤُهُمْ بِاَنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِنَا وَقَالُوْٓا ءَاِذَا كُنَّا عِظَامًا وَّرُفَاتًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ خَلْقًا جَدِيْدًا (۹۸)

فرمایا کہ یہ سزا ان کو اس لیے دی جائے گی کہ قدم قدم پر ہماری قدرت اور حیات بعد الممات کی نشانیاں دیکھنے کے باوجود وہ قیامت کے انکار ہی پر اڑے رہے اور بڑے طنطنہ کے ساتھ یہ کہتے رہے کہ کیا جب ہم ہڈیاں ہو جائیں گے اور سڑ گل کر ریزہ ریزہ ہو جائیں گے تو بھلا از سر نو پیدا کر کے اٹھائے جائیں گے؟ یعنی ان کے خیال میں یہ بالکل ناممکن اور محال ہے۔ فرمایا کہ ہم اسی محال کو واقعہ بنا کر ان کو اس کا مزہ چکھائیں گے۔

اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ قَادِرٌ عَلٰٓي اَنْ يَّخْلُقَ مِثْلَهُمْ وَجَعَلَ لَهُمْ اَجَلًا لَّا رَيْبَ فِيْهِ ۭ فَاَبَى الظّٰلِمُوْنَ اِلَّا كُفُوْرًا (۹۹)

قیامت کے لیے وقت مقرر ہے

یعنی ان کو آخر دوبارہ اٹھائے جانے میں اتنا استبعاد کیوں نظر آتا ہے؟ کیا انھوں نے اس بات پر غور نہیں کیا کہ جو خدا آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے پر قادر ہے وہ ان کو دوبارہ پیدا کرنے سے کیوں قاصر رہ جائے گا؟ کیا ان کو دوبارہ پیدا کرنا آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے سے زیادہ مشکل کام ہے؟

'وَجَعَلَ لَهُمْ اَجَلًا لَّا رَيْبَ فِيْهِ' رہا یہ سوال کہ قیامت آنی ہے تو آ کیوں نہیں جاتی تو اس کے لیے جلدی نہ مچائیں۔ خدا نے اس کے لیے ایک وقت مقرر کر رکھا ہے جس کے آنے میں کسی شک کی گنجائش نہیں ہے۔ جب وہ وقت آجائے گا وہ یوم موعود بھی آجائے گا۔ 'فَاَبَى الظّٰلِمُوْنَ اِلَّا كُفُوْرًا' یعنی اتنے واضح دلائل کے باوجود یہ اپنی جانوں

پر ظلم ڈھانے والے لوگ اس کے لیے تیاری کرنے کے بجائے اس کے انکار ہی پر اڑے ہوئے ہیں۔

قُلْ لَّوْ اَنْتُمْ تَمْلِكُوْنَ خَزَآئِنَ رَحْمَةِ رَبِّيْٓ اِذًا لَّاَمْسَكْتُمْ خَشْيَةَ الْاِنْفَاقِ ۭ وَكَانَ الْاِنْسَانُ قَتُوْرًا (۱۰۰)

کفار کی متکبرانہ ذہنیت پر ضرب

ہم اوپر عرض کر چکے ہیں کہ اس تمام ردو انکار میں قریش کے لیڈروں کی اس متکبرانہ ذہنیت کو بھی بڑا دخل تھا کہ جب دنیا کی تمام نعمتیں ہمیں ملی ہیں تو خدا اگر نبوت و رسالت کے منصب پر کسی کو سرفراز کرنے والا ہوتا تو ہم ہی میں سے کسی کو سرفراز کرتا، آخر یہ منصب جلیل ہم سادات کو چھوڑ کر اس غریب آدمی کے حوالہ کیوں کر دیا۔ ان کی اسی متکبرانہ ذہنیت کو سامنے رکھ کر پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت ہوئی کہ ان سے کہہ دیں کہ اگر میرے رب کی رحمت کے خزانوں کے مالک تم ہوتے تب تو بلاشبہ تم اس کے تنہا اجارہ دار بن بیٹھتے اور اپنے سوا اس میں سے کسی کو بھی اس ڈر سے کچھ نہ دیتے کہ مبادا یہ ختم ہو جائے لیکن اپنے فضل و رحمت کے خزانوں کا مالک میرا رب خود ہی ہے اس نے جن خزف ریزوں کا اہل تم کو پایا وہ تمہارے حوالے کیے اور جس فضل عظیم کے لیے میرا انتخاب فرمایا، تمہارے اور بنی اسرائیل کے علی الرغم، اس سے مجھ کو نوازا۔ 'وَكَانَ الْاِنْسَانُ قَتُوْرًا'، میں انسان کا لفظ اگرچہ عام ہے لیکن اشارہ انہی لوگوں کی طرف ہے کہ اگر یہ تنگ دل ہیں، اپنے سوا ان کے دل میں کسی کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے تو آخر خدا کو انھوں نے اپنے جیسا کیوں گمان کر رکھا ہے۔

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسٰى تِسْعَ اٰيٰتٍۢ بَيِّنٰتٍ فَسْــَٔـلْ بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ اِذْ جَاۗءَهُمْ فَقَالَ لَهٗ فِرْعَوْنُ اِنِّىْ لَاَظُنُّكَ يٰمُوْسٰي مَسْحُوْرًا (۱۰۱)

مطالبۂ معجزات کا جواب

اوپر آیت ۹۰ سے ۹۳ تک ان معجزات کا ذکر گزر چکا ہے جن کا قریش مطالبہ کرتے تھے۔ یہ اسی مطالبہ کا جواب ہے کہ ایمان و ہدایت کی راہ معجزات سے نصیب نہیں ہوتی۔ ہم نے موسیٰؑ کو فرعون کی طلب پر نو! نہایت کھلے کھلے معجزے دیے لیکن فرعون نے یہ سارے معجزے دیکھ کر کہا تو یہ کہا کہ اے موسیٰ میں تو تم کو ایک سحر زدہ آدمی سمجھتا ہوں۔ تم پر کسی نے جادو کر دیا ہے جس کے اثر سے تم اس قسم کی بہکی بہکی باتیں میرے سامنے کہنے لگے ہو۔ مطلب یہ ہے کہ اسی طرح تمہیں بھی اگر تمہاری طلب کے مطابق معجزے دکھا دیے گئے تو تم بھی کوئی نہ کوئی بات بنا لو گے۔

حضرت موسیٰؑ کی مثال

'فَسْــَٔـلْ بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ'، میں ایک لطیف تلمیح ہے۔ وہ یہ کہ اس مرحلے میں بنی اسرائیل اسلام کی مخالفت کی مہم میں پوری طرح شریک ہو گئے تھے اور قریش یہ معجزات کے مطالبے زیادہ تر انہی کی شہ پر کرتے تھے۔ وہ قریش کو یہ سکھاتے تھے کہ ہمارے پیغمبر نے تو یہ یہ معجزے دکھائے تو یہ اگر نبوت کے مدعی ہیں تو یہ بھی اسی طرح کے معجزے دکھائیں۔ ان کی اسی حرکت کے سبب سے قرآن نے انہی کو گواہ بنا کر پیش کیا کہ ان کے نبی نے معجزے دکھائے تو بھی لیکن انہی سے پوچھو کہ یہ سارے معجزے دکھانے کا نتیجہ کیا نکلا؟ اگر نتیجہ یہی نکلا کہ فرعون اور اس کی قوم غرق ہو کے رہی تو آخر یہ راستہ وہ قریش کو کیوں دکھاتے ہیں!

قَالَ لَقَدْ عَلِمْتَ مَآ اَنْزَلَ هٰٓؤُلَاۗءِ اِلَّا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ بَصَاۗىِٕرَ ۚ وَاِنِّىْ لَاَظُنُّكَ

لِفِرۡعَوۡنُ مَثۡبُوۡرًا۔ ۱۰۲

حضرت موسیٰؑ کا جواب فرعون کو

'مَثۡبُوۡرًا' کے معنی ہلاکت زدہ کے ہیں۔ حضرت موسیٰؑ نے فرعون کو جواب بالکل ترکی بہ ترکی دیا۔ فرمایا کہ تجھے خوب معلوم ہے کہ یہ معجزے کسی سحر و شعبدہ کے کرشمے نہیں ہو سکتے۔ ان کی نوعیت ہی گواہی دیتی ہے کہ ان کو اتار سکتا ہے تو آسمانوں اور زمین کا رب ہی اتار سکتا ہے اور اسی نے تیری آنکھیں کھول دینے کے لیے ان کو اتارا ہے۔ اگر ان کو دیکھنے کے بعد بھی تیری آنکھیں نہیں کھلیں تو تجھ پر اللہ کی حجت تمام ہو گئی اور میں سمجھتا ہوں کہ اب تیری ہلاکت کا وقت، اے فرعون! سر پر آ پہنچا ہے۔

فَاَرَادَ اَنۡ یَّسۡتَفِزَّهُمۡ مِّنَ الۡاَرۡضِ فَاَغۡرَقۡنٰهُ وَمَنۡ مَّعَهٗ جَمِیۡعًا (۱۰۳)

چنانچہ اس کے بعد اس نے اپنا پورا زور صرف کر دیا کہ حضرت موسیٰؑ اور ان کے ساتھیوں کے قدم سرزمین مصر سے اکھاڑ دے اور اس کی سزا اس کو یہ ملی کہ خدا نے اس کو اور اس کے سارے ساتھیوں کو غرق کر دیا۔

وَّقُلۡنَا مِنۡۢ بَعۡدِهٖ لِبَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ اسۡكُنُوا الۡاَرۡضَ فَاِذَا جَآءَ وَعۡدُ الۡاٰخِرَةِ جِئۡنَا بِكُمۡ لَفِیۡفًا (۱۰۴)

فرعون کو غرق کرنے کے بعد بنی اسرائیل پر انعام

فرعون کو غرق کرنے کے بعد یہ بنی اسرائیل پر انعام ہوا کہ اللہ نے ان کو ارض مقدس میں بسایا۔ 'الۡاَرۡضَ' سے مراد یہاں قرینہ دلیل ہے کہ ارض مقدس ہے جس کا بنی اسرائیل سے وعدہ تھا۔ اس وعدے کو پورا کرتے وقت، اللہ نے ان کو آخرت کا وعدہ بھی یاد دلا دیا تھا کہ اس کامیابی کی خوشیوں میں آخرت کو نہ بھول جانا۔ جس طرح اپنے وعدے کے مطابق ہم تم کو سمیٹ کر یہاں لائے ہیں اسی طرح اپنے وعدے کے بموجب ایک دن سمیٹ کر حساب کتاب کے لیے حشر کے میدان میں جمع کریں گے۔ لیکن بنی اسرائیل اللہ تعالیٰ کی اس یاددہانی کو بالکل بھول گئے۔

وَبِالۡحَقِّ اَنۡزَلۡنٰهُ وَبِالۡحَقِّ نَزَلَ ؕ وَمَاۤ اَرۡسَلۡنٰكَ اِلَّا مُبَشِّرًا وَّنَذِیۡرًا (۱۰۵)

دعوت کے معاملہ میں نبی کی ذمہ داری

یہ بات ذہن میں محفوظ رہے کہ یہ سلسلہ بحث اصلاً وحی و قرآن کے ذکر سے چلا تھا۔ پھر اسی سے متعلق بعض دوسرے مسائل زیر بحث آ گئے۔ اب یہ مسائل ختم ہوئے تو اصل مسئلہ کو پھر لے لیا۔ فرمایا کہ ہم نے اس قرآن کو حق کے ساتھ اتارا ہے اور یہ حق ہی کے ساتھ اترا ہے۔ کسی باطل کی کوئی آمیزش نہ اس میں آگے سے ہوئی ہے نہ پیچھے سے۔ اگر ایسے بے آمیز حق کو بھی یہ لوگ طرح طرح کے شبہات کا ہدف بنا رہے ہیں تو تمہارے اوپر ایسے سرپھرے لوگوں کے ایمان و ہدایت کی کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔ تم صرف ایک مبشر و نذیر ہو۔ اپنا انذار و تبشیر کا فرض ادا کر کے ان کو ان کے حال پر چھوڑ دو۔ اگر یہ تمہاری بات نہیں سنیں گے تو اس کا انجام خود بھگتیں گے۔

وَقُرۡاٰنًا فَرَقۡنٰهُ لِتَقۡرَاَهٗ عَلَی النَّاسِ عَلٰی مُكۡثٍ وَّنَزَّلۡنٰهُ تَنۡزِیۡلًا (۱۰۶)

قرآن کے تدریج کے ساتھ اترنے کی حکمت

یعنی یہ قرآن جو جستہ جستہ اتر رہا ہے تو اس وجہ سے نہیں، جیسا کہ یہ سمجھتے ہیں کہ تم حالات کے مطابق سوچتے ہو اور جتنا تیار کر پاتے ہو اتنا سنا دیتے ہو، بلکہ یہ ہم ہی جستہ جستہ کر کے اس کو تم پر اتار رہے ہیں تاکہ تم اس کو

بالتدریج لوگوں کو سناؤ کہ یہ لوگوں کے فکر و عمل کا جزو بنتا جائے۔ اگر ان کا یہ گمان ہے کہ یہ خدائی کتاب ہوتی تو لازماً پوری کی پوری بیک دفعہ نازل ہو جاتی اس لیے کہ خدا کو کسی تیاری کی ضرورت نہیں تھی تو یہ گمان بھی صحیح نہیں ہے۔ خدا کو تو بلاشبہ کسی اہتمام و تیاری کی حاجت نہیں ہے۔ وہ چاہتا تو پوری کتاب ایک ہی وقت میں نازل کر دیتا لیکن اس نے بندوں کی ضرورت اور ان کے حالات کا لحاظ فرمایا اور اس کو نہایت تدریج و اہتمام کے ساتھ اتارا ہے۔ 'تَنْزِیْل' کا مفہوم، جیسا کہ ہم دوسرے مقامات میں واضح کر چکے ہیں، تدریج و اہتمام کے ساتھ اتارنا ہے۔

قُلْ اٰمِنُوْا بِهٖٓ اَوْ لَا تُؤْمِنُوْا ۭ اِنَّ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ مِنْ قَبْلِهٖٓ اِذَا يُتْلٰى عَلَيْهِمْ يَخِرُّوْنَ لِلْاَذْقَانِ سُجَّدًا ۝ وَّيَقُوْلُوْنَ سُبْحٰنَ رَبِّنَآ اِنْ كَانَ وَعْدُ رَبِّنَا لَمَفْعُوْلًا ۝ وَيَخِرُّوْنَ لِلْاَذْقَانِ يَبْكُوْنَ وَيَزِيْدُهُمْ خُشُوْعًا (۱۰۷-۱۰۹)

صالحین اہل کتاب کا طرز عمل

'اَلَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ مِنْ قَبْلِهٖ' سے یہاں مراد قرینہ دلیل ہے کہ اچھے اہل کتاب ہیں۔ اہل کتاب میں جس طرح اشرار و مفسدین تھے جو اپنا ایڑی چوٹی کا زور قرآن کی مخالفت میں صرف کر رہے تھے اسی طرح ایک گروہ ایسے صالحین کا بھی تھا جو اپنے نبیوں اور صحیفوں کی پیشین گوئیوں کی روشنی میں ایک رسول اور ایک کتاب موعود کا منتظر تھا۔ اس گروہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے لائے ہوئے صحیفہ کے اندر ان پیشین گوئیوں کی جھلک دیکھی جن کے ظہور کے لیے وہ چشم براہ تھا۔ چنانچہ ان کا حال یہ تھا کہ ان کو جب قرآن سنایا جاتا تو بے تحاشا سجدے میں گر پڑتے اور اللہ تعالیٰ کے اس وعدے کے پورے ہونے پر دل و جان سے اس کا شکر بجا لاتے۔ یہ اسی مبارک گروہ کی طرف اشارہ ہے۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ہدایت ہوئی ہے کہ تم قریش اور بنی اسرائیل کے مکذبین کو سنا دو کہ تم ایمان لاؤ یا نہ لاؤ میرے اطمینان کے لیے یہ کافی ہے کہ اہل علم کا ایک ایسا گروہ بھی موجود ہے جو اس قرآن کو سن کر بے تحاشا سجدے میں گر پڑتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے اس ایفائے وعدہ کو دیکھ کر اس پر گریۂ مسرت و شکر اور گریۂ خشوع کی دوگونہ کیفیت و حالت طاری ہو جاتی ہے گریۂ شکر و مسرت کا پہلو تو اس میں ظاہر ہی ہے، زیادت خشوع کا اس میں یہ پہلو ہے کہ اس سے آخرت کے وعدے کی ازسرنو یاد دہانی ہوتی ہے کہ جس رب نے اپنا یہ وعدہ پورا کیا لازماً وہ اپنا آخرت کا وعدہ بھی پورا کر کے رہے گا۔

قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ اَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ ۭ اَيًّا مَّا تَدْعُوْا فَلَهُ الْاَسْمَاۗءُ الْحُسْنٰى ۚ وَلَا تَجْهَرْ بِصَلَاتِكَ وَلَا تُخَافِتْ بِهَا وَابْتَغِ بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيْلًا (۱۱۰)

قرآن پر ایک اعتراض کا جواب

جب کسی چیز کے خلاف شبہ اور بدگمانی جڑ پکڑ لے تو اس سے تعلق رکھنے والی ان چیزوں پر بھی شبہ ہونے لگتا ہے جن کے اندر کسی ادنیٰ شبہ کی بھی گنجائش نہیں ہوتی۔ اہل عرب زمانۂ جاہلیت میں اللہ تعالیٰ کے لیے اللہ اور رحمان دونوں نام استعمال کرتے تھے۔ کلام جاہلیت میں یہ دونوں ہی نام ملتے ہیں۔ البتہ

اتنی بات ضرور تھی کہ اسم رحمان زیادہ معروف اہل کتاب کے ہاں تھا۔ عرب کے ذہینوں نے یہیں سے اس نام کو بھی قرآن پر اعتراض کا بہانہ بنا لیا۔ انھوں نے یہ نکتہ پیدا کیا کہ اس کتاب کی تیاری میں اس شخص کو (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو) اہل کتاب میں سے کچھ لوگ مدد دیتے ہیں۔ قرآن میں ان کا قول وَاَعَانَهٗ عَلَيْهِ قَوْمٌ اٰخَرُوْنَ جو نقل ہوا ہے اس سے ان کا اشارہ اسی گروہ کی طرف ہوتا تھا۔ بعد میں جب اسم رحمان کی طرف ان کی توجہ ہوئی تو اس کو انھوں نے اپنے گمان کی تائید میں پیش کرنا شروع کر دیا کہ دیکھو، یہ شخص اپنے پیش کردہ کلام میں رحمان کا نام بہت لاتا ہے جو اہل کتاب سے اس کے تعلق کی دلیل ہے اور پھر یہیں سے انھوں نے یہ نتیجہ نکال لیا ہو گا کہ یہ ہمارے مذہب اور ہماری روایات پر اہل کتاب کے مذہب اور ان کی روایات مسلط کرنے کی ایک سازش ہے۔

قرآن نے اس کا جواب یہ دیا کہ اللہ کو خواہ اللہ کے نام سے پکارو یا رحمٰن کے، جس نام سے بھی اس کو پکارو تمام اچھے نام اسی کے ہیں۔ یعنی مجرد نام کا تعصب قبول حق میں مانع نہیں ہونا چاہیے۔ خدا کے نام اور بھی ہیں اور اس کو اس کے شایان شان ہر نام سے پکارا جا سکتا ہے۔

نماز میں وقار اور سنجیدگی کی تعلیم

'وَلَا تَجْهَرْ بِصَلَاتِكَ ...... الاٰیۃ' معلوم ہوتا ہے اسی نوعیت کا کوئی اعتراض اسلام کے طریقۂ نماز پر بھی ان ذہینوں کو ہوا۔ مشرکین کے طریقۂ عبادت میں شور و غل اور مکاء و تصدیہ یعنی سیٹی اور تالی وغیرہ کو خاص اہمیت حاصل رہی ہے۔ برعکس اس کے اسلام میں نماز سنجیدگی اور وقار کا مظہر کامل ہے۔ ہو سکتا ہے کہ نماز کے اس وقار کا جوڑ بھی انھوں نے اہل کتاب سے ملا کر اس کو بھی اعتراض کا بہانہ بنا لیا ہو۔ اس باب میں ہدایت ہوئی کہ تمھاری نمازیں اور دعائیں بہت زیادہ جہری ہوں نہ بالکل ہی سری بلکہ ان کے بین بین کی راہ اختیار کرو۔ یہ اشارہ ہوا اس بات کی طرف کہ تم امت وسط ہو اس وجہ سے تمھاری نمازوں اور دعاؤں میں بھی امت وسط کی شان ہونی چاہیے۔

وَقُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ لَمْ يَتَّخِذْ وَلَدًا وَّلَمْ يَكُنْ لَّهٗ شَرِيْكٌ فِي الْمُلْكِ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ وَلِيٌّ مِّنَ الذُّلِّ وَكَبِّرْهُ تَكْبِيْرًا (۱۱۱)

اللہ تعالیٰ کی بلا شرکت غیرے حاکمیت کا اعلان

یہ سورہ کے آخر میں آپ کو خدا ہی کی حمد و تکبیر اور اس کی بلا شرکت غیرے حاکمیت کے اعلان کی ہدایت ہوئی۔ مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ جس وادی میں چاہیں ٹھوکریں کھاتے پھریں لیکن تم یہ اعلان کر دو کہ شکر کا سزاوار حقیقی وہ اللہ ہے جس نے نہ تو اپنے لیے کوئی اولاد بنائی، نہ اس کی بادشاہی میں کوئی اس کا شریک و سہیم ہے اور نہ اس کو کبھی ذلت و مقہوریت لاحق ہوتی ہے کہ اس سے بچانے کے لیے اس کو کسی حمایتی اور مددگار کی ضرورت پیش آئے۔ 'وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ وَلِيٌّ مِّنَ الذُّلِّ' میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ حمایتی اور مددگار کی ضرورت اس کو پیش آتی ہے جس کو ذلت پیش آنے کا خطرہ ہو۔ جب خدا کی شان ذلت کے ہر شائبہ سے ارفع ہے تو اس کو حمایتی اور مددگار کی کیا ضرورت۔ 'وَكَبِّرْهُ تَكْبِيْرًا' یعنی اس کی تمام اعلیٰ صفات کا نہایت اہتمام سے اظہار و اعلان کرو، ان مشرکین کے علی الرغم۔

اس سطروں پر اس سورہ کی تفسیر تمام ہوئی۔ وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ۔

لاہور — ۲۷ر اپریل ۱۹۷۱ء

تدبرِ قرآن

۱۸

الکہف

بسم اللہ الرحمن الرحیم

۱۔ سورہ کا زمانۂ نزول، عمود اور سابق سورہ سے تعلق

سابق سورہ کی طرح یہ سورہ بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مکی زندگی کے اس دور میں نازل ہوئی ہے جب حق و باطل کی کش مکش اپنے آخری مرحلے میں داخل ہو چکی ہے۔ قریش اپنے تمام حربوں کے ساتھ قرآن کی دعوت کو مٹا دینے پر تُل گئے تھے اور یہود و نصاریٰ نے بھی، جیسا کہ ہم پیچھے اشارہ کر آئے ہیں، درپردہ قریش کی پیٹھ ٹھونکنی شروع کر دی تھی کہ انہی کے ہاتھوں یہ دعوت اپنے مرکز ہی میں ختم ہو جائے، اس سے نبرد آزما ہونے کے لیے خود انھیں میدان میں نہ اترنا پڑے۔

ان حالات کے تقاضے سے اس سورہ میں چند باتیں خاص طور پر نمایاں ہوئی ہیں۔

۱۔ قریش کو انذار و تنبیہ کہ وہ اپنی دنیوی کامیابیوں کے غرّے میں ایک بدیہی حقیقت کو جھٹلانے کی کوشش نہ کریں۔ اب عذابِ الٰہی ان کے سروں پر منڈلا رہا ہے، اگر وہ اپنی رعونت سے باز نہ آئے تو وہ وقت دور نہیں ہے جب وہ اس عذاب کی زد میں آ جائیں گے۔

۲۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے مظلوم صحابہؓ کو صبر و عزیمت کی تلقین۔ آنے والے مراحل یعنی ہجرت وغیرہ کی طرف بعض لطیف اشارات، ان مراحل میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے ساتھیوں کو جو غیبی فتوحات حاصل ہونے والی ہیں ان کی بشارت۔

۳۔ جس طرح سابق سورہ ـــــ بنی اسرائیل ـــــ میں یہود کے چہرے سے نقاب الٹ دی گئی ہے اسی طرح اس سورہ اور اس کے بعد کی سورہ ـــــ سورۂ مریم ـــــ میں نصاریٰ کے چہرے سے نقاب الٹ دی گئی ہے اور مقصود اس سے قریش کو متنبہ کرنا ہے کہ جن کی اپنی کوئی بنیاد نہیں ہے اگر ان کی شہ پر خدا کی اس نعمت کی ناقدری کرو گے جس سے اس نے تم کو سرفراز کرنا چاہا ہے تو یاد رکھو کہ پرائے شگون پر اپنی ناک کٹوا بیٹھو گے۔

ب ۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

سورہ کے مطالب کا تجزیہ بالاجمال یہ ہے:۔

(۱-۸) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تلقینِ صبر کہ تمھاری ذمہ داری صرف انذار و تبشیر ہے۔ اگر یہ متمردین، قرآن پر ایمان نہیں لا رہے ہیں تو اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ اس کتاب میں کوئی کج پیچ یا تمھاری دعوت و تبلیغ میں کوئی کسر ہے بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ لوگ زخارفِ دنیا کی محبت میں اندھے ہو رہے ہیں تو تم ان کے پیچھے اپنے تئیں ہلکان نہ کرو۔ ایک وقت آنے والا ہے جب اس دنیا کے چہرے کا یہ مصنوعی غازہ اتر جائے گا اور یہ اپنے اصل روپ میں نمایاں ہو جائے گی، اس وقت یہ بدبخت لوگ اپنے سر پیٹیں گے۔

(۹-۲۶) اصحابِ کہف سے متعلق مخالفین کے اٹھائے ہوئے ایک سوال کا جواب جس سے ان کی اصل زندگی، لاطائل تفصیلات سے بالکل پاک ہو کر، اس طرح سامنے آگئی ہے کہ اس کے آئینہ میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے جاں نثار ساتھیوں کو گویا دکھا دیا گیا ہے کہ تم اس وقت دعوتِ حق کی راہ میں جس مرحلہ سے گزر رہے ہو یہ مرحلہ اصحابِ کہف کو بھی پیش آ چکا ہے۔ اگر تم بھی انہی کی طرح تمام خطرات کے علی الرغم، جادۂ حق پر استوار رہے تو اللہ تمھارے لیے بھی اسی طرح مشکلات کو آسان کرے گا جس طرح ان کے لیے آسان کیں۔ اور اسی طرح تمھارے لیے بھی پردۂ غیب سے اسباب و وسائل مہیا کرے گا جس طرح ان کے لیے مہیا فرمائے۔ اللہ اپنی راہ میں ثابت قدم رہنے والوں کو ضائع نہیں کرتا۔

(۲۷-۳۱) نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دولتِ دنیا کے متوالوں سے بے نیاز ہو کر، اپنے ان غریب و نادار ساتھیوں کی طرف متوجہ ہونے کی ہدایت جو اگرچہ دولتِ دنیا سے محروم تھے لیکن ایمان کی دولت سے مالا مال اور شب و روز اللہ کی یاد اور اس کے دین کی دعوت میں سرگرم تھے۔ اسی ذیل میں آپ کو منکروں کی حالت پر غم کھانے سے روک دیا گیا ہے کہ یہ لوگ اگر ایمان نہیں لا رہے ہیں تو ان کو ان کے حال پر چھوڑو، یہ سنتِ الٰہی کی زد میں آئے ہوئے ہیں اور سنتِ الٰہی کو کوئی بدل نہیں سکتا۔

(۳۲-۴۹) ایک تمثیل جس میں یہ دکھایا گیا ہے کہ جو لوگ اسی دنیا کی کامیابیوں کو اصل کامیابی سمجھے بیٹھے ہیں ان پر خدا اور آخرت کی یقین دہانی بڑی شاق گزرتی ہے۔ وہ اپنی انہی کامیابیوں کو اپنے برحق ہونے کی دلیل تصور کرتے ہیں، اس وجہ سے اگر کوئی اللہ کا بندہ ان کو خدا اور آخرت سے ڈراتا ہے تو وہ یہ جواب دیتے ہیں کہ بتاؤ تمھارا حال اچھا ہے یا ہمارا؟ اگر ہمارا حال اچھا ہے اور بالبداہت اچھا ہے تو ہم یہ کیوں نہ باور کریں کہ ہماری ہی زندگی اور ہمارا ہی عقیدہ و عمل بھی صحیح ہے۔ اس ذہن کے لوگ یہ باور کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتے کہ جو جاہ و اقبال ان کو آج حاصل ہے اس پر کبھی زوال بھی آ سکتا ہے۔ وہ قیامت کو ایک بہت بعید از امکان چیز سمجھتے ہیں اور اگر ایک مفروضہ کے درجہ میں اس کو مانتے بھی ہیں تو اپنی زندگی کی موجودہ کامرانیوں کو دلیل بنا کر یہ گمان کر لیتے

ہیں کہ اگر ہمیں خدا کے پاس جانا ہی پڑا، جیسا کہ یہ سرپھرے مسلمان ڈراتے ہیں تو وہاں بھی ہمیں اس سے بہتر مرتبہ و مقام حاصل ہوگا۔ اس تمثیل کو پیش کرنے سے مقصود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ واضح کرنا ہے کہ آج بعینہٖ اسی طرح کے مغروروں سے تمھیں سابقہ ہے۔ یہ لوگ تمھاری بات سننے والے نہیں ہیں۔ ان کی آنکھیں اس وقت کھلیں گی جب برقِ خرمن سوز ان کے سارے خرمن کو خاکستر کرکے رکھ دے گی۔ سو تم اس دنیا اور اس کی اس زندگی کی جس پر یہ ریجھے ہوئے ہیں، حقیقت ایک تمثیل سے سمجھا دو کہ یہ دنیا اور اس کی ساری رونقیں اور بہاریں چند روزہ ہیں۔ ان میں سے کوئی چیز بھی ساتھ جانے والی نہیں ہے۔ ساتھ صرف نیک اعمال جائیں گے تو جن کو جمع کرنا ہو وہ یہ سرمایہ جمع کرنے کی فکر کریں۔

(۵۰-۵۹) آدم اور ابلیس کی سرگزشت کی یاددہانی جس سے مقصود قریش کے مغروروں کو ان کی بدبختی پر متنبہ کرنا ہے کہ انھوں نے اپنی شامتِ اعمال سے ابلیس اور اس کی ذریات کو اپنا دوست اور کارساز بنا رکھا ہے۔ حالانکہ اولادِ آدم کے ساتھ ان کی دشمنی کوئی ڈھکی چھپی چیز نہیں ہے۔ اسی ضمن میں ان کی اس بدبختی پر بھی ملامت کی گئی ہے کہ اللہ نے تو ان پر عظیم فضل فرمایا کہ ان کی ہدایت کے لیے ایک ایسی کتاب اتاری جو ہر حقیقت کو گوناگوں پہلوؤں سے واضح کردینے والی ہے لیکن یہ اس کو قبول کرنے کے بجائے اس بات پر اڑے ہوئے ہیں کہ ان کو وہ عذاب دکھا دیا جائے جس سے قرآن ان کو ڈرا رہا ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے، وہ رحمت میں سبقت کرتا ہے، عذاب میں جلدی نہیں کرتا لیکن یہ شامت کے مارے لوگ عذاب کے لیے جلدی مچائے ہوئے ہیں۔

(۶۰-۸۲) حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ایک تربیتی سفر کی سرگزشت۔ یہ سفر اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے تحت انھوں نے اس لیے کیا کہ ایک بندۂ خاص کے ذریعے سے وہ اس کائنات کے اس رمز سے اچھی طرح آگاہ ہوجائیں کہ اس دنیا میں جو کچھ ہوتا ہے وہ سب ارادۂ الٰہی کے تحت ہوتا ہے اور ارادۂ الٰہی سرتاسر حکمت و برکت پر مبنی ہوتا ہے۔ اس دنیا میں بظاہر سرکشوں اور نافرمانوں کو ڈھیل ملتی ہے اور اہلِ حق مختلف قسم کی آزمائشوں اور تکلیفوں میں مبتلا کیے جاتے ہیں۔ یہ صورتِ حال بہتوں کے ایمان کو متزلزل کردیتی ہے اور ان کے لیے جادۂ حق پر ثابت قدم رہنا نہایت ابتلا کا کام بن جاتا ہے۔ اس ابتلا میں ثابت قدم صرف وہی لوگ رہتے ہیں جن پر یہ حقیقت اچھی طرح واضح ہو کہ یہاں جو کچھ ہو رہا ہے سب ارادۂ الٰہی کے تحت اور اس کی حکمت کے تقاضوں کے مطابق ہو رہا ہے لیکن انسان کا محدود علم اس کی حکمتوں اور مصلحتوں کا احاطہ نہیں کرسکتا۔ اس وجہ سے صحیح رویہ یہ ہے کہ راہِ حق میں ناموافق و نامساعد جو حالات بھی پیش آئیں آدمی ان سے دل شکستہ و مایوس نہ ہو بلکہ پورے عزم و جزم کے ساتھ موقفِ حق پر ڈٹا رہے، حکمتِ الٰہی کے ظہور کا انتظار کرے اور امید رکھے کہ اگر اس دنیا میں نہیں تو آخرت میں اس کا ظہور ہو کے رہے گا۔

یہی حکمت، صبر کی اساس و بنیاد ہے جس پر سارا دین قائم ہے اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے جب حضرت موسیٰؑ کو ایک عظیم مہم کے لیے انتخاب فرمایا تو اس صبر کی تربیت کے لیے ان کو اپنے ایک خاص بندے

کے پاس بھیجا کہ یہ چیز صرف جاننے کی نہیں بلکہ عملی تربیت کی بھی محتاج تھی۔ یعنی یہاں یہ سرگزشت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے واسطہ سے آپ کے اس دور کے ساتھیوں کو اس مقصد سے سنائی گئی ہے کہ باغیوں اور نافرمانوں کو جو دندناتے دیکھ رہے ہو اور تم حق پر ہوتے ان کے مظالم کے جو ہدف بنے ہوئے ہو اس سے ہراساں اور مرعوب نہ ہونا۔ اس دنیا میں اگر مسکینوں کی کشتی میں چھید کیا جاتا ہے تو اس میں بھی حکمت خیر ہوتی ہے اور اگر ظالموں کی کسی بستی میں، کسی گرتی دیوار کو سہارا دیا جاتا ہے تو اس میں بھی خیر ہی مضمر ہوتا ہے لیکن انسان کا محدود علم خدا کے سارے اسرار کا احاطہ نہیں کر سکتا۔

(۸۳ - ۱۰۱) ایک سوال کی تقریب سے ایک سلطان عادل ــــ ذوالقرنین ــــ کا ذکر جس سے مقصود قریش کے ان متمردین کو عبرت دلانا ہے جو پیغمبر کے انذار کو مذاق اور اپنے اقتدار کو لازوال سمجھتے تھے۔ ان کے سامنے خود انہی کے سوال پر یہ واضح فرمایا کہ ایک بندۂ مومن ذوالقرنین تھے جن کا حال یہ تھا کہ تمام مشرق و مغرب کو فتح کر لینے کے بعد بھی وہ ہر کامیابی کو اللہ کا انعام اور اس کا فضل سمجھتے اور ہر قدم اس کی مرضی کے مطابق اٹھاتے تھے اور ایک تم ہو کہ ذرا سا اقتدار جو مل گیا ہے تو اس کے نشہ میں خدا اور آخرت سب کا مذاق اڑانے لگے ہو۔

(۱۰۲ - ۱۱۰) خاتمۂ سورہ میں اسی تہدید و انذار کے مضمون کا پھر اعادہ ہے جس سے سورہ کا آغاز ہوا ہے گویا آخر میں ایک نئے اسلوب سے اسی حقیقت کی پھر یاد دہانی فرما دی جو سورہ کا عمود ہے۔ ساتھ ہی ان لوگوں کا جواب بھی دے دیا جو قرآن کی پُرحکمت باتوں کا مذاق اڑاتے اور کسی حسی معجزہ کا مطالبہ کر رہے تھے۔ فرمایا اگر دیکھنے والی آنکھیں ہوں تو آفاق و انفس میں خدا کی اتنی نشانیاں ہیں کہ اگر سمندر روشنائی بن جائیں جب بھی ان کو قلم بند نہیں کیا جا سکتا۔ آخر میں پیغمبر صلعم کی زبان سے اعلان کرا دیا کہ معجزے اور نشانیاں دکھانا خدا کا کام ہے، میں تو تمہاری ہی طرح خدا کا ایک بندہ ہوں، تمہیں وہی سناتا ہوں جس کی مجھے وحی کی جاتی ہے۔

سورہ کے مطالب کا یہ اجمالی تجزیہ اس کے نظام اور عمود کو واضح کر دینے کے لیے کافی ہے۔ اب بسم اللہ کا نام لے کر سورہ کی تفسیر شروع کرتے ہیں۔ وما توفیقی الا باللہ۔

سُوْرَةُ الْكَهْفِ (۱۸)

مَكِّيَّةٌ ———— اٰيَاتُهَا ۱۱۰

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ عَلٰى عَبْدِهِ الْكِتٰبَ وَلَمْ يَجْعَلْ آیات
لَّهٗ عِوَجًا ۝۱ قَيِّمًا لِّيُنْذِرَ بَاْسًا شَدِيْدًا مِّنْ لَّدُنْهُ ۱-۸
وَيُبَشِّرَ الْمُؤْمِنِيْنَ الَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ
اَجْرًا حَسَنًا ۝۲ مّٰكِثِيْنَ فِيْهِ اَبَدًا ۝۳ وَّيُنْذِرَ الَّذِيْنَ
قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا ۝۴ مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ وَّلَا
لِاٰبَآئِهِمْ كَبُرَتْ كَلِمَةً تَخْرُجُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ اِنْ يَّقُوْلُوْنَ
اِلَّا كَذِبًا ۝۵ فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ اِنْ لَّمْ
يُؤْمِنُوْا بِهٰذَا الْحَدِيْثِ اَسَفًا ۝۶ اِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَى

الْاَرْضِ زِيْنَةً لَّهَا لِنَبْلُوَهُمْ اَيُّهُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ﴿۷﴾ وَاِنَّا لَجٰعِلُوْنَ مَا عَلَيْهَا صَعِيْدًا جُرُزًا ﴿۸﴾

ترجمۂ آیات ۱-۸

شکر کا سزاوار ہے وہ اللہ جس نے اپنے بندے پر کتاب اتاری اور اس میں اس نے کوئی کج پیچ نہیں رکھا۔ بالکل ہموار اور استوار تاکہ وہ اپنی جانب سے جھٹلانے والوں کو ایک سخت عذاب سے آگاہ کر دے اور ایمان لانے والوں کو، جو نیک اعمال کر رہے ہیں، اس بات کی خوش خبری سنا دے کہ ان کے لیے بہت اچھا اجر ہے جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے اور ان لوگوں کو جو کہتے ہیں کہ خدا نے اولاد بنائی ہوئی ہے آگاہ کر دے۔ ان کو اس باب میں کوئی علم نہیں، نہ ان کو نہ ان کے آباء و اجداد کو۔ نہایت ہی سنگین بات ہے جو ان کے مونہوں سے نکل رہی ہے۔ یہ محض جھوٹ ہے جو وہ بک رہے ہیں۔ ۱-۵

تو شاید تم ان کے پیچھے اپنے تئیں غم سے ہلاک کر کے رہو گے اگر وہ اس بات پر ایمان نہ لائے۔ روئے زمین پر جو کچھ ہے ہم نے اس کو زمین کے لیے سنگار بنایا ہے تاکہ ہم لوگوں کا امتحان کریں کہ ان میں اچھے عمل کرنے والا کون بنتا ہے اور ہم بالآخر اس پر جو کچھ ہے سب کو چٹیل میدان کر کے رہیں گے۔ ۶-۸

۱۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ عَلٰى عَبْدِهِ الْكِتٰبَ وَلَمْ يَجْعَلْ لَّهٗ عِوَجًا (۱)

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ عَلٰى عَبْدِهِ الْكِتٰبَ۔ سابق سورہ بنی اسرائیل جس مضمون پر ختم ہوئی تھی (ملاحظہ ہوں آیات ۱۰۵-۱۱۱) اسی مضمون سے اس سورہ کا آغاز فرمایا۔ قرآن کی صورت میں جو نعمتِ عظمیٰ اہل عرب پر نازل ہوئی تھی یہ اس کے حق کا اظہار ہے کہ یہ نعمت شکر کی موجب ہونی چاہیے نہ کہ کفر کی۔ بدقسمت

ہیں وہ لوگ جو اس کی ناقدری کریں اور اس کی تکذیب کے لیے نت نئے بہانے تلاش کریں۔

قرآن کی صفت

وَلَمْ يَجْعَلْ لَّهُ عِوَجًا، قَيِّمًا: یہ اس کتاب کی صفت ہے کہ اس کتاب میں خدا نے کوئی کج پیچ نہیں رکھا ہے۔ نہ بیان کے اعتبار سے نہ معنی کے اعتبار سے۔ زبان اس کی عربی مبین ہے اور رہنمائی اس کی اس صراط مستقیم کی طرف ہے جس کے مستقیم ہونے کے دلائل عقل و فطرت اور آفاق و انفس کے ہر گوشے میں موجود ہیں اور قرآن نے ان کو اتنے گوناگوں طریقوں سے بیان کر دیا ہے کہ کوئی عقل سے کام لینے والا ان کے سمجھنے سے قاصر نہیں رہ سکتا۔ صرف وہی ان سے محروم رہیں گے جو عقل سے کام نہیں لے رہے ہیں۔

قرآن کی یہی صفت سورہ بنی اسرائیل میں بھی بیان ہوئی ہے۔ اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَهْدِيْ لِلَّتِيْ هِيَ اَقْوَمُ (بے شک یہ قرآن اس راستہ کی طرف رہنمائی کرتا ہے جو سیدھا ہے)۔

قَيِّمًا لِّيُنْذِرَ بَاْسًا شَدِيْدًا مِّنْ لَّدُنْهُ وَيُبَشِّرَ الْمُؤْمِنِيْنَ الَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ اَجْرًا حَسَنًا (۲)

قرآن کا مقصد

لِيُنْذِرَ بَاْسًا شَدِيْدًا مِّنْ لَّدُنْهُ وَيُبَشِّرَ الْمُؤْمِنِيْنَ: یہ اس کتاب کے نازل کرنے کا مقصد بیان ہوا ہے کہ یہ انکار کرنے والوں کے لیے انذار اور ایمان لانے والوں کے لیے بشارت ہے۔ پہلے ٹکڑے میں 'لِلْكٰفِرِيْنَ' یا 'لِلْمُكَذِّبِيْنَ' محذوف ہے۔ اس لیے کہ آگے والے ٹکڑے میں 'مُؤْمِنِيْنَ' موجود ہے جو تقابل کے اصول پر اس محذوف کو خود واضح کر رہا ہے۔

فعل 'يُنْذِرَ' کا فاعل اللہ بھی ہو سکتا ہے اور عبدٗ یعنی رسول بھی۔ پہلی صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ اللہ نے یہ کتاب خاص اپنے پاس سے اس لیے اتاری ہے کہ کافروں کو ایک عذاب شدید سے آگاہ و ہوشیار کر دے۔

دوسری صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ اللہ کا رسول لوگوں کو خدا کی طرف سے نازل ہونے والے عذاب شدید سے متنبہ کر دے۔

پہلی صورت میں 'مِنْ لَّدُنْهُ' کا لفظ اہتمام و عنایت پر دلیل ہوگا کہ اس مقصد کے لیے خدا نے خاص اپنے پاس سے اور اپنی نگرانی میں انتظام فرمایا۔ دوسری صورت میں اس سے عذاب کی شدت کا اظہار ہوگا کہ یہ عذاب کوئی ایسا ویسا عذاب نہیں ہوگا بلکہ قہر الٰہی ہوگا جس سے بچانے والا کوئی نہیں بن سکے گا۔

مَّاكِثِيْنَ فِيْهِ اَبَدًا (۳)

مَاكِثِيْنَ فِيْهِ اَبَدًا: اس 'اجر حسن' میں ہمیشہ رہیں گے یعنی اس بہشت میں ہمیشہ رہیں گے جو اس 'اجر حسن' کے ثمرہ اور نتیجہ کے طور پر حاصل ہوگی۔ شے کو بول کر اس سے اس کے نتیجہ کو مراد لینا عربیت کا ایک معروف اسلوب ہے جس کی مثالیں اس کتاب میں پیچھے گزر چکی ہیں اور آگے بھی آئیں گی۔

وَّيُنْذِرَ الَّذِيْنَ قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا: یہ عام کے بعد خاص کا ذکر ہے، یعنی خاص طور پر ان

لوگوں کو آگاہ کر دے جو خدا کے لیے اولاد فرض کر کے ان کی عبادت میں لگے ہوئے اور ان کی شفاعت کے اعتماد پر خدا سے بالکل مستغنی ہو بیٹھے ہیں۔ اس سے مراد مشرکین عرب بھی ہیں اور نصاریٰ بھی۔ مشرکین عرب فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں کہتے تھے اور نصاریٰ حضرت مسیح کو خدا کا بیٹا بنائے ہوئے تھے۔

مشرکین کی اندھی تقلید

مَا لَهُمْ بِهِ مِنْ عِلْمٍ وَلَا لِآبَائِهِمْ كَبُرَتْ كَلِمَةً تَخْرُجُ مِنْ أَفْوَاهِهِمْ إِنْ يَقُولُونَ إِلَّا كَذِبًا۔ علم سے مراد یہاں دلیل و برہان ہے۔ یعنی جن لوگوں نے خدا کے بیٹے اور بیٹیاں فرض کر کے ان کو خدا کا شریک بنا رکھا ہے انھوں نے یہ افسانہ محض اپنے جی سے گھڑا ہے۔ نہ خدا نے کہیں یہ بات کہی ہے ورنہ ان بوالفضولوں کے پاس اس کی کوئی دلیل ہے۔ یہ اپنے جن آباو اجداد کی تقلید میں یہ حماقت کر رہے ہیں ان کے پاس بھی اس کی کوئی دلیل نہیں تھی محض جہالت سے انھوں نے یہ ضلالت اختیار کی اور یہ بھی جہالت ہی سے ان کی لکیر کو پیٹ رہے ہیں۔ فرمایا کہ یہ بڑی ہی سنگین بات ہے جو ان کے مونہوں سے نکل رہی ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ پر تہمت و بہتان اور اس کی غیرت کو چیلنج ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر یہ اپنی گستاخی سے باز نہ آئے تو عنقریب اپنا حشر دیکھیں گے۔

آنحضرت صلعم کو پرمحبت تسلی

فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَفْسَكَ عَلَىٰ آثَارِهِمْ إِنْ لَمْ يُؤْمِنُوا بِهَٰذَا الْحَدِيثِ أَسَفًا۔

یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی ہے اور تسلی دینے کا انداز بہت پیارا ہے فرمایا کہ تم تو ان کے ایمان کے غم سے اس طرح گھلے جا رہے ہو کہ معلوم ہوتا ہے کہ اگر یہ اس کتاب پر ایمان نہ لائے تو ان کے پیچھے تم اپنے آپ کو ہلاک کر کے رہو گے! اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے فرض رسالت کی ادائیگی کا احساس کتنا شدید تھا۔ آپ دعوت کے کام کے لیے اپنے رات دن ایک کیے ہوئے تھے۔ لیکن پھر بھی آپ کو یہ غم کھائے جا رہا تھا کہ لوگ جو ایمان نہیں لا رہے ہیں تو مبادا اس میں آپ کی کسی کوتاہی کو دخل ہو۔ اس احساس کے باعث آپ کی مشقت اور آپ کے غم دونوں میں برابر اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے آپ کو نہایت پرمحبت انداز میں ٹوکا کہ اپنی ذمہ داری کے احساس میں اس درجہ غلو صحیح نہیں ہے۔ یہ ناشکرے اور ناقدرے لوگ جو اس کتاب پر ایمان نہیں لا رہے ہیں تو یہ نہ سمجھو کہ اس کے سمجھنے میں، ان کو کوئی دشواری پیش آ رہی ہے یا تمہاری طرف سے فرض دعوت کی ادائیگی میں کوئی کوتاہی ہو رہی ہے بلکہ اس کا اصل سبب کچھ اور ہے۔

منکرین کے انکار کا اصل سبب

إِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَى الْأَرْضِ زِينَةً لَهَا لِنَبْلُوَهُمْ أَيُّهُمْ أَحْسَنُ عَمَلًا۔ یہ ان کے اعراض و انکار کے اصل سبب سے پردہ اٹھایا ہے۔ فرمایا کہ یہ دنیا دار الامتحان ہے۔ اس میں ہم یہ دیکھ رہے ہیں کہ کون اپنی عقل و تمیز سے کام لے کر آخرت کا طالب بنتا ہے اور کون اپنی خواہشوں کے پیچھے لگ کر اسی دنیا کا پرستار بن کر رہ جاتا ہے۔ اس امتحان کے تقاضے سے ہم نے اس دنیا کے چہرے پر حسن و زیبائی کا ایک پرفریب غازہ

مل دیا ہے۔ اس کے مال و اولاد، اس کے کھیتوں کھلیانوں، اس کے باغوں اور چمنوں، اس کی کاروں اور کوٹھیوں، اس کے محلوں اور ایوانوں، اس کی صدارتوں اور وزارتوں میں بڑی کشش اور دل فریبی ہے۔ اس کی لذتیں نقد اور عاجل اور اس کی تلخیاں پس پردہ ہیں۔ اس کے مقابل میں آخرت کی تمام کامرانیاں نسیہ ہیں اور اس کے طالبوں کو اس کی خاطر بے شمار جانکاہ مصیبتیں نقد نقد اسی دنیا میں جھیلنی پڑتی ہیں۔ یہ امتحان ایک سخت امتحان ہے۔ اس میں پورا اترنا ہر بوالہوس کا کام نہیں ہے۔ اس میں پورے وہی اتریں گے جن کی بصیرت اتنی گہری ہو کہ خواہ یہ دنیا ان کے سامنے کتنی ہی عشوہ گری کرے لیکن وہ اس عجوزۂ ہزار داماد کو اس کے ہر بھیس میں تاڑ جائیں اور کبھی اس کے عشق میں پھنس کر آخرت کے ابدی انعام کو قربان کرنے پر تیار نہ ہوں۔ رہے وہ لوگ جنھوں نے اپنی عقل و دل کی آنکھیں اندھی کر لی ہیں اور اپنی خواہشوں کے پرستار بن کے رہ گئے ہیں وہ اس نقد کو آخرت کے نسیہ کے لیے قربان کرنے پر تیار نہیں ہو سکتے اگرچہ اس کے حق ہونے پر اس کائنات کا ذرہ ذرہ گواہ ہے۔

اس دنیا کا انجام

وَاِنَّا لَجٰعِلُوْنَ مَا عَلَیْهَا صَعِیْدًا جُرُزًا۔ 'جُرُزٌ' بے آب و گیاہ زمین کو کہتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ یہ بے وقوف لوگ اس زمین کی جن چیزوں پر ریجھے ہوئے ہیں ایک وقت آئے گا کہ ہم ان ساری چیزوں کو مٹا کر اس کو چٹیل اور بے آب و گیاہ میدان کی طرح کر دیں گے۔ یہی مضمون آگے آیات ۴۶-۴۸ میں آ رہا ہے وہاں ان شاء اللہ اس کی مزید تفصیل ہوگی۔

۲- آگے کا مضمون ـــــ آیات ۹-۲۶

اہل کتاب کے القا کیے ہوئے سوالات

قریش جس انداز سے قرآن اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کر رہے تھے اس کا ذکر اوپر کی آیات میں گزرا۔ اسی مخالفت کا ایک پہلو یہ بھی تھا کہ اس دور میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو زچ کرنے کے لیے اہل کتاب جو مختلف قسم کے اینڈے بینڈے سوالات القا کرتے قریش ان کو بھی اٹھا لیتے اور آپ سے ان کے جواب کا مطالبہ کرتے۔ روح کے متعلق، ذوالقرنین کے متعلق اور اس نوع کے بعض دوسرے سوالات جن کا قرآن نے حوالہ دیا ہے، اہل کتاب کے اٹھائے ہوئے سوالات تھے۔ اسی نوع کا ایک سوال اصحاب کہف سے متعلق اہل کتاب نے اٹھایا اور ان کے اشارے سے قریش نے اس کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش کیا۔ یہ غیر متعلق سوالات ظاہر ہے کہ حصولِ علم اور تحقیق حق کے مقصد سے نہیں کیے جاتے تھے بلکہ صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تنگ کرنے کے لیے کیے جاتے۔ مقصد مخالفین کا صرف یہ ہوتا کہ اگر آپ نے کوئی جواب نہ دیا تو اس جواب نہ دینے کو مخالفت کا بہانہ بنائیں گے کہ دیکھو یہ نبوت کا دعویٰ کرتے ہیں لیکن ہمارے اس سوال کا جواب نہ دے سکے اور اگر جواب دیا اور کوئی بات ان کے مزعومات کے خلاف ہوئی تو اس کو مخالفت

کا بہانہ بنائیں گے کہ دیکھو یہ شخص کیا بے پر کی اڑا رہا ہے۔ اصل بات تو یوں ہے اور یہ اس کے برعکس یوں کہہ رہا ہے۔

قصۂ اصحابِ کہف کے زیرِ بحث آنے کی نوعیت

یہ بات کہ اصحابِ کہف کا قصہ یہاں مخالفین کے سوال کے جواب میں زیرِ بحث آیا ہے خود قرآن سے واضح ہے۔ آگے آیات ۲۲-۲۴ میں یہ بات تصریح سے آئے گی کہ قرآن نے اس قصہ سے تعرض سوال کے جواب میں کیا ہے۔ اس قسم کے سوالوں کے باب میں قرآن نے جو رویہ اختیار کرنے کی تلقین کی ہے وہ تو، جیسا کہ آگے واضح ہوگا، یہ ہے کہ ان سے تعرض ہی نہ کیا جائے بلکہ ان کو ٹال دیا جائے۔ لیکن کوئی سوال اگر مفید ہوا ہے یا اس کے جواب کو کسی مفید تعلیم کا ذریعہ بنایا جا سکا ہے تو قرآن نے اس کا بقدرِ ضرورت جواب دے دیا ہے۔ اصحابِ کہف کی زندگی چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے صحابہؓ کے لیے، دعوت کے اس پُر آزمائش دور میں، نہایت سبق آموز ہو سکتی تھی اس لیے کہ آپؐ اور آپؐ کے صحابہؓ انہی مراحل سے گزر رہے تھے جن سے اصحابِ کہف کو گزرنا پڑا تھا اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان کی سرگزشت کا اتنا حصہ سنا دیا جتنا حق تھا۔ اس طرح گویا سوال کرنے والوں کے سوال کا جواب بھی ہوگیا، ماضی کی ایک پاکیزہ سرگزشت سے پیغمبرؐ اور صحابہؓ کو صبر و عزیمت کی تعلیم بھی مل گئی اور اہلِ حق کی تاریخ کا ایک نہایت اہم باب، جو افسانوں کے حجاب میں گم تھا، ہر قسم کے گرد و غبار سے بالکل پاک صاف ہو کر از سرِ نو سامنے آگیا۔

اصحابِ کہف کون تھے؟

اصحابِ کہف کون تھے؟ ان کا تعلق تاریخ کے کس دور سے ہے اور یہ کن کے اسلاف میں سے ہیں؟ ان سوالوں کا کوئی قطعی جواب دینا نہایت مشکل ہے۔ ان کے باب میں قطعیت کے ساتھ اتنی ہی بات کہی جا سکتی ہے جتنی قرآن نے بیان کر دی ہے، باقی جو کچھ ہے اس کی حیثیت محض افسانہ کی ہے۔ قرآن نے ان کی سرگزشت کا صحیح اور سبق آموز حصہ بیان کر کے ان کے باب میں مزید کھوج کرید کرنے سے، جیسا کہ آگے معلوم ہوگا، منع کر دیا ہے۔ اس وجہ سے ہم ایک ایسی چیز کے درپے ہونا پسند نہیں کرتے جس سے قرآن نے روکا ہے۔ البتہ قیاسات و قرائن سے اتنی بات ضرور معلوم ہوتی ہے کہ ان لوگوں کا تعلق قریش یا یہود کی تاریخ سے نہیں ہے بلکہ نصاریٰ کی تاریخ سے ہے۔ ان کے ہاں ایسی روایات ملتی ہیں جو اصحابِ کہف کے واقعہ سے مشابہت رکھتی ہیں۔ ہمارا خیال یہ ہے کہ نصاریٰ اپنی تاریخ کے ابتدائی دور میں، جب دین کی خاطر رومیوں کے ہاتھوں ستائے گئے ہیں، اصحابِ کہف نے دعوتِ حق کی راہ میں وہ بازی کھیلی ہے جس کا قرآن نے ذکر کیا ہے۔ ان لوگوں نے توحید اور آخرت کی دعوت پوری بے خوفی سے دی یہاں تک کہ ان کا پورا ماحول ان کا دشمن بن کر اٹھ کھڑا ہوا اور خطرہ پیدا ہو گیا کہ مخالفین ان کو سنگسار کر دیں گے۔ جب معاملہ اس حد کو پہنچ گیا تو ان لوگوں نے ایک غار میں پناہ لی اور اللہ تعالیٰ نے اس غار میں ان کی حفاظت کے لیے وہ سامان بہم پہنچائے جو صرف اللہ ہی بہم پہنچا سکتا تھا۔ بعد میں جب ان کے حالات لوگوں کے علم میں آئے اور تائیدِ الٰہی کی جو نشانیاں ان کے لیے ظاہر ہوئیں ان کا چرچا ہوا تو ان کی یادگاریں قائم ہوئیں اور

ہر گروہ ان کے ساتھ اپنی نسبت کا دعویٰ کرنے لگا۔ اس طرح نصاریٰ میں ایک مقدس روایت کی حیثیت سے ان کا ذکر باقی رہا لیکن یہ ذکر آہستہ آہستہ بس چند کرامتوں اور چند لاطائل بحثوں تک محدود رہ گیا۔ ان کی زندگی کا اصل کارنامہ نگاہوں سے بالکل اوجھل ہو گیا۔ اس سوال پر تو ان کے ہاں مناظرے ہوتے کہ ان کی تعداد کیا تھی؟ ان کا کتا تین کا چوتھا تھا یا پانچ کا چھٹا؟ لیکن یہ خبر کسی کو نہ تھی کہ ان کی دعوت کیا تھی اور اس دعوت کی راہ میں انھوں نے کیا قربانیاں دیں اور یہ بحثیں بھی غالباً اسی زمانہ تک باقی رہیں جب تک اصل نصرانیت کے کچھ بقایا موجود رہے۔ بعد میں جب پال نے نصرانیت کا حلیہ بالکل بگاڑ ڈالا تو نصاریٰ کے اصل اسلاف کی تمام روایتیں بھی پردۂ خفا میں چھپ گئیں۔ عرب کے نصاریٰ میں معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں سے متعلق کچھ روایات باقی تھیں لیکن بالکل مسخ ہو کر۔ انہی نصاریٰ کی شہ سے یہ سوال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے لایا گیا اور قرآن نے اس لیے اس کا جواب دیا کہ اس سے دعوت کے اس پرآشوب دور میں، جیسا کہ ہم نے عرض کیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہؓ کو بڑی تقویت حاصل ہو سکتی تھی۔ جس طرح اصحاب کہف اپنے ماحول میں ہدف مظالم بنے تھے اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہؓ بھی قریش کے مظالم کے ہدف تھے اور جس طرح اصحابِ کہف کو غار میں پناہ لینی پڑی اسی طرح آپؐ اور آپ کے صحابہؓ کے سامنے بھی ہجرت حبشہ، غارِ ثور اور ہجرت مدینہ کے مراحل آنے والے تھے۔ اب اس روشنی میں آگے کی آیات تلاوت کیجیے۔

آیات ٩-٢٦

أَمْ حَسِبْتَ أَنَّ أَصْحَٰبَ ٱلْكَهْفِ وَٱلرَّقِيمِ كَانُوا۟ مِنْ ءَايَٰتِنَا
عَجَبًا ﴿٩﴾ إِذْ أَوَى ٱلْفِتْيَةُ إِلَى ٱلْكَهْفِ فَقَالُوا۟ رَبَّنَآ ءَاتِنَا مِن
لَّدُنكَ رَحْمَةً وَهَيِّئْ لَنَا مِنْ أَمْرِنَا رَشَدًا ﴿١٠﴾ فَضَرَبْنَا عَلَىٰٓ
ءَاذَانِهِمْ فِى ٱلْكَهْفِ سِنِينَ عَدَدًا ﴿١١﴾ ثُمَّ بَعَثْنَٰهُمْ لِنَعْلَمَ أَىُّ
ٱلْحِزْبَيْنِ أَحْصَىٰ لِمَا لَبِثُوٓا۟ أَمَدًا ﴿١٢﴾ نَّحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ ع ١٢/١٢
نَبَأَهُم بِٱلْحَقِّ ۚ إِنَّهُمْ فِتْيَةٌ ءَامَنُوا۟ بِرَبِّهِمْ وَزِدْنَٰهُمْ هُدًى ﴿١٣﴾
وَرَبَطْنَا عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ إِذْ قَامُوا۟ فَقَالُوا۟ رَبُّنَا رَبُّ ٱلسَّمَٰوَٰتِ
وَٱلْأَرْضِ لَن نَّدْعُوَا۟ مِن دُونِهِۦٓ إِلَٰهًا ۖ لَّقَدْ قُلْنَآ إِذًا شَطَطًا ﴿١٤﴾
هَٰٓؤُلَآءِ قَوْمُنَا ٱتَّخَذُوا۟ مِن دُونِهِۦٓ ءَالِهَةً ۖ لَّوْلَا يَأْتُونَ عَلَيْهِم

بِسُلْطٰنٍ بَيِّنٍ ؕ فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا ﴿۱۵﴾
وَاِذِ اعْتَزَلْتُمُوْهُمْ وَمَا يَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ فَاْوٗۤا اِلَى الْكَهْفِ
يَنْشُرْ لَكُمْ رَبُّكُمْ مِّنْ رَّحْمَتِهٖ وَيُهَيِّئْ لَكُمْ مِّنْ اَمْرِكُمْ
مِّرْفَقًا ﴿۱۶﴾ وَتَرَى الشَّمْسَ اِذَا طَلَعَتْ تَّزٰوَرُ عَنْ كَهْفِهِمْ
ذَاتَ الْيَمِيْنِ وَاِذَا غَرَبَتْ تَّقْرِضُهُمْ ذَاتَ الشِّمَالِ وَهُمْ فِيْ
فَجْوَةٍ مِّنْهُ ؕ ذٰلِكَ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ ؕ مَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِ ۚ
وَمَنْ يُّضْلِلْ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ وَلِيًّا مُّرْشِدًا ﴿۱۷﴾ وَتَحْسَبُهُمْ ع۲ ۵ ۱۴
اَيْقَاظًا وَّهُمْ رُقُوْدٌ ۖ وَّنُقَلِّبُهُمْ ذَاتَ الْيَمِيْنِ وَذَاتَ الشِّمَالِ ۖ
وَكَلْبُهُمْ بَاسِطٌ ذِرَاعَيْهِ بِالْوَصِيْدِ ؕ لَوِ اطَّلَعْتَ عَلَيْهِمْ لَوَلَّيْتَ
مِنْهُمْ فِرَارًا وَّلَمُلِئْتَ مِنْهُمْ رُعْبًا ﴿۱۸﴾ وَكَذٰلِكَ بَعَثْنٰهُمْ
لِيَتَسَآءَلُوْا بَيْنَهُمْ ؕ قَالَ قَآئِلٌ مِّنْهُمْ كَمْ لَبِثْتُمْ ؕ قَالُوْا لَبِثْنَا
يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ ؕ قَالُوْا رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَا لَبِثْتُمْ ؕ فَابْعَثُوْۤا
اَحَدَكُمْ بِوَرِقِكُمْ هٰذِهٖۤ اِلَى الْمَدِيْنَةِ فَلْيَنْظُرْ اَيُّهَاۤ اَزْكٰى طَعَامًا
فَلْيَاْتِكُمْ بِرِزْقٍ مِّنْهُ وَلْيَتَلَطَّفْ وَلَا يُشْعِرَنَّ بِكُمْ اَحَدًا ﴿۱۹﴾
اِنَّهُمْ اِنْ يَّظْهَرُوْا عَلَيْكُمْ يَرْجُمُوْكُمْ اَوْ يُعِيْدُوْكُمْ فِيْ مِلَّتِهِمْ
وَلَنْ تُفْلِحُوْۤا اِذًا اَبَدًا ﴿۲۰﴾ وَكَذٰلِكَ اَعْثَرْنَا عَلَيْهِمْ لِيَعْلَمُوْۤا اَنَّ
وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّاَنَّ السَّاعَةَ لَا رَيْبَ فِيْهَا ۚۛ اِذْ يَتَنَازَعُوْنَ
بَيْنَهُمْ اَمْرَهُمْ فَقَالُوا ابْنُوْا عَلَيْهِمْ بُنْيَانًا ؕ رَبُّهُمْ اَعْلَمُ بِهِمْ ؕ

قَالَ الَّذِينَ غَلَبُوا عَلَىٰ أَمْرِهِمْ لَنَتَّخِذَنَّ عَلَيْهِم مَّسْجِدًا ﴿٢١﴾
سَيَقُولُونَ ثَلَاثَةٌ رَّابِعُهُمْ كَلْبُهُمْ وَيَقُولُونَ خَمْسَةٌ سَادِسُهُمْ
كَلْبُهُمْ رَجْمًا بِالْغَيْبِ ۖ وَيَقُولُونَ سَبْعَةٌ وَثَامِنُهُمْ كَلْبُهُمْ ۚ قُل
رَّبِّي أَعْلَمُ بِعِدَّتِهِم مَّا يَعْلَمُهُمْ إِلَّا قَلِيلٌ ۗ فَلَا تُمَارِ فِيهِمْ إِلَّا
ع ۳ مِرَاءً ظَاهِرًا وَلَا تَسْتَفْتِ فِيهِم مِّنْهُمْ أَحَدًا ﴿٢٢﴾ وَلَا تَقُولَنَّ
۱۵ لِشَيْءٍ إِنِّي فَاعِلٌ ذَٰلِكَ غَدًا ﴿٢٣﴾ إِلَّا أَن يَشَاءَ اللَّهُ ۚ وَاذْكُر رَّبَّكَ
إِذَا نَسِيتَ وَقُلْ عَسَىٰ أَن يَهْدِيَنِ رَبِّي لِأَقْرَبَ مِنْ هَٰذَا رَشَدًا ﴿٢٤﴾
وَلَبِثُوا فِي كَهْفِهِمْ ثَلَاثَ مِائَةٍ سِنِينَ وَازْدَادُوا تِسْعًا ﴿٢٥﴾ قُلِ
اللَّهُ أَعْلَمُ بِمَا لَبِثُوا ۖ لَهُ غَيْبُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ ۖ أَبْصِرْ بِهِ
وَأَسْمِعْ ۚ مَا لَهُم مِّن دُونِهِ مِن وَلِيٍّ وَلَا يُشْرِكُ فِي حُكْمِهِ
أَحَدًا ﴿٢٦﴾

ترجمۂ آیات ۹-۲۶

کیاتم نے کہف و رقیم والوں کو ہماری نشانیوں میں سے کچھ بہت عجیب خیال کیا! جب کہ کچھ نوجوانوں نے غار میں پناہ لی اور دعا کی کہ اے ہمارے رب ہمیں اپنے پاس سے رحمت بخش اور ہمارے اس معاملے میں ہمارے لئے رہنمائی کا سامان فرما، تو ہم نے غار میں ان کے کانوں پر کئی برس کے لیے تھپک دیا۔ پھر ہم نے ان کو بیدار کیا کہ دیکھیں دونوں گروہوں میں سے کون مدتِ قیام کو زیادہ صحیح شمار میں رکھنے والا نکلتا ہے۔ ۹-۱۲

ہم تمھیں ان کی سرگزشت ٹھیک ٹھیک سناتے ہیں۔ یہ کچھ نوجوان تھے جو اپنے رب پر ایمان لائے اور ہم نے ان کی ہدایت میں مزید افزونی عطا فرمائی اور ہم نے ان کے دلوں کو مضبوط

کیا جب کہ وہ اٹھے اور کہا کہ ہمارا رب وہی ہے جو آسمانوں اور زمین کا رب ہے۔ ہم اس کے سوا کسی اور معبود کو ہرگز نہیں پکاریں گے۔ اگر ہم نے ایسا کیا تو ہم یہ حق سے نہایت ہی ہٹی ہوئی بات کہیں گے۔ یہ ہماری قوم کے لوگوں نے اس کے سوا کچھ دوسرے معبود بنا رکھے ہیں۔ یہ ان کے حق میں واضح دلیل کیوں نہیں پیش کرتے! تو ان سے بڑا ظالم کون ہو گا جو خدا پر جھوٹ باندھیں۔ ۱۴ - ۱۵

اور اب کہ تم ان کو اور ان کے معبودوں کو، جن کو وہ خدا کے سوا پوجتے ہیں، چھوڑ کر الگ ہو گئے ہو تو غار میں پناہ لو، تمہارا رب تمہارے لیے اپنا دامنِ رحمت پھیلائے گا اور تمہارے اس مرحلہ میں تمہاری مایحتاج مہیا فرمائے گا۔ ۱۶

اور تم دیکھتے سورج کو کہ جب طلوع ہوتا ہے تو ان کے غار سے دائیں جانب کو بچا رہتا ہے اور جب ڈوبتا ہے تو ان سے بائیں طرف کو کترا جاتا ہے اور وہ اس کے صحن میں ہیں۔ یہ اللہ کی نشانیوں میں سے ہے۔ جس کو اللہ ہدایت دے وہی راہ یاب ہوتا ہے اور جس کو وہ گمراہ کر دے تو تم اس کے لیے کوئی دستگیری کرنے والا اور رہنمائی کرنے والا نہیں پا سکتے۔ ۱

اور تم ان کو جاگتا گمان کرتے حالانکہ وہ سو رہے ہوتے اور ہم ان کو داہنے بائیں کروٹیں بھی بدلواتے اور ان کا کتا دونوں ہاتھ پھیلائے دہلیز پر ہوتا، اگر تمہاری نظر ان پر پڑ جاتی تو تم وہاں سے الٹے پاؤں بھاگ کھڑے ہوتے اور تمہارے اندر ان کی دہشت سما جاتی۔ ۱۸

اور اسی طرح ہم نے ان کو جگایا کہ وہ آپس میں پوچھ گچھ کریں۔ ان میں سے ایک پوچھنے والے نے پوچھا، تم یہاں کتنا ٹھہرے ہو گے؟ وہ بولے ہم ایک دن یا ایک دن سے بھی کم ٹھہرے ہوں گے۔ بولے تمہاری مدتِ قیام کو تمہارا رب ہی بہتر جانتا ہے۔ پس اپنے میں سے کسی

کو اپنی یہ رقم دے کر شہر بھیجو تو وہ اچھی طرح دیکھ لے کہ شہر کے کس حصہ میں پاکیزہ کھانا ملتا ہے اور وہاں سے تمھارے لیے کچھ کھانا لائے اور چاہیے کہ وہ دبے پاؤں جائے اور کسی کو تمھاری خبر نہ ہونے دے۔ اگر وہ تمھاری خبر پا جائیں گے تو تمھیں سنگسار کر دیں گے یا تمھیں اپنی ملت میں لوٹا لیں گے اور پھر تم کبھی فلاح نہ پا سکو گے۔ ۱۹-۲۰۔

اور اسی طرح ہم نے ان پر لوگوں کو مطلع کر دیا تاکہ لوگ جان لیں کہ اللہ کا وعدہ شدنی ہے اور قیامت کے آنے میں کوئی شبہ نہیں ہے۔ وہ وقت بھی خیال کرو جب لوگ آپس میں ان کے معاملے میں جھگڑ رہے تھے تو بولے کہ ان کے غار پر ایک عمارت بنوا دو۔ ان کا رب ان کو خوب جانتا ہے۔ جو لوگ ان کے معاملے میں غالب آئے انھوں نے کہا کہ ہم تو ان کے غار پر ایک مسجد بنائیں گے۔ ۲۱

اب یہ کہیں گے یہ تین تھے، اُن کا چوتھا ان کا کتّا تھا اور کہیں گے یہ پانچ تھے ان کا چھٹا ان کا کتا تھا، بالکل اٹکل پچو! اور کہیں گے یہ سات تھے اور ان کا آٹھواں اُن کا کتّا تھا۔ کہہ دو میرا رب ہی ان کی تعداد کو خوب جانتا ہے۔ ان کو بس تھوڑے ہی لوگ جانتے ہیں اور تم ان کے باب میں نہ بحث کرو مگر ٹالنے کے انداز میں اور ان کے باب میں ان میں سے کسی سے نہ پوچھو۔ اور کسی امر کے لیے یوں نہ کہا کرو کہ میں کل یہ کر دوں گا مگر یہ کہ اللہ چاہے اور جب تم بھول جایا کرو تو اپنے رب کو یاد کر و اور کہو کہ امید ہے کہ میرا رب اس سے بھی کم مدت میں صحیح بات کی طرف میری رہنمائی فرما دے۔ ۲۲-۲۴

اور وہ اپنے غار میں تین سو سال رہے اور نو سال مزید براں۔ کہہ دو اللہ ہی خوب جانتا ہے جتنی مدت وہ رہے۔ آسمانوں اور زمین کا غیب صرف اسی کے علم میں ہے۔ کیا ہی خوب

ہے وہ دیکھنے والا اور سننے والا۔ اس کے سوا ان کا کوئی کارساز نہیں اور وہ اپنے اختیار میں کسی کو ساجھی نہیں بناتا۔ ۲۵-۲۶

۳- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

اَمْ حَسِبْتَ اَنَّ اَصْحٰبَ الْكَهْفِ وَالرَّقِيْمِ كَانُوْا مِنْ اٰيٰتِنَا عَجَبًا (۹)

صیغہ واحد کا خطاب جماعت سے

'حَسِبْتَ' کا خطاب ضروری نہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی سے ہو بلکہ 'اَنْتُمْ' کے خطاب کی طرح یہ عام بھی ہو سکتا ہے۔ اس طرح کے خطاب ہیں، جیسا کہ ہم پیچھے اپنی کتاب میں ایک سے زیادہ مقامات میں ذکر کر چکے ہیں، مخاطب گروہ کا ایک ایک شخص فرداً فرداً مراد ہوتا ہے اور جمع کے خطاب کے بالمقابل اس میں زیادہ زور ہوتا ہے۔ خود اسی سلسلۂ کلام میں آگے متعدد خطابات بصیغۂ واحد ہیں۔ لیکن ان سب میں خطاب آنحضرتؐ سے نہیں بلکہ مخاطب گروہ سے ہے۔ مثلاً 'وَتَرَى الشَّمْسَ'، آیت ۱۷، 'وَتَحْسَبُهُمْ'، 'لَوِ اطَّلَعْتَ'، 'لَوَلَّيْتَ'، 'وَلَمُلِئْتَ' آیت ۱۸۔

یہ خطاب سوال کرنے والوں سے ہے۔

یہاں یہ امر بھی قابلِ غور ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے یہ فرمانے کا کیا محل ہے کہ کیا تم اصحاب کہف و رقیم کو ہماری نشانیوں میں سے کچھ عجیب چیز خیال کرتے ہو؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اول تو اس سرگزشت سے واقف ہی نہیں تھے، اول اول آپ اس وحی کے ذریعہ ہی سے اس سے واقف ہوئے اور بالفرض آپ کچھ واقف رہے بھی ہوں تو اس میں آپؐ کے لیے تعجب اور حیرت کا سوال کہاں پیدا ہوتا ہے! اس سے کہیں زیادہ عجیب سرگزشتیں آپ کو سابق انبیائے کرام کی سنائی جا چکی تھیں۔ پھر آپؐ کے اصحاب کہف کے معاملہ کو عجیب اور نادر سمجھنے کی کیا وجہ ہو سکتی تھی! ہمارے نزدیک یہ سوال خطاب کرنے والوں سے ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ جن لوگوں نے یہ سوال اٹھایا ان کے پیشِ نظر اصل مقصد یہ تھا کہ لوگوں کی نظر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے صحابہؓ کی وقعت گھٹائیں کہ ہمارے ہاں تو اصحاب کہف جیسے اولیاء گزرے ہیں جن کے لیے خدا کی قدرت کی نہایت عظیم نشانیں ظاہر ہوئیں تو ہم کسی اور کی ہدایت و رہنمائی کے محتاج کب ہو سکتے ہیں اور وہ بھی ایک ایسے نبی کی ہدایت کے جس کے اندر ہم اس طرح کی کوئی بات بھی نہیں پا رہے ہیں۔ یہ بات یہاں پیشِ نظر رہے کہ اس دور میں یہود و نصاریٰ دونوں کھلم کھلا یہ بات کہنے لگے تھے کہ جس کو ہدایت کی طلب ہو وہ یہودی بنے یا نصرانی، یہ نیا دین بھلا کیا ہے، اس سے بہتر تو مشرکین ہی کا دین ہے! سوال اٹھانے والوں کی اس پس پردہ ذہنیت کو سامنے رکھ کر قرآن نے جواب کا آغاز ہی اس بات سے کیا کہ اگر تم اصحاب کہف کے ماجرے کو بہت عجیب چیز سمجھتے ہو تو یہ بہت عجیب چیز نہیں ہے۔ یہ خدا کی

بے شمار نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے۔ اس طرح کی نشانیاں پہلے بھی ظاہر ہوئی ہیں اور آئندہ بھی ان لوگوں کے لیے ظاہر ہوں گی جن کے لیے خدا چاہے گا۔ یہ نشانیاں خدا کے اختیار میں ہیں۔ ان پر کسی خاص گروہ کا اجارہ نہیں ہے۔

آیت کے خطاب کے معاملے میں ہماری رائے یہی ہے لیکن کوئی شخص اس کا مخاطب آنحضرتؐ ہی کو قرار دینا چاہے تو اس صورت میں آیت کی تاویل یہ ہوگی کہ اگر تم معروف روایات کی بنا پر اصحابِ کہف کے ماجرے کو عجیب سمجھتے ہو تو یہ کوئی عجیب چیز نہیں۔ خدا کی اس طرح کی نشانیاں پہلے بھی ظاہر ہوئی ہیں اور آئندہ بھی ظاہر ہوں گی۔ اس میں گویا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے صحابہؓ کے لیے بشارت ہے کہ جس طرح خدا نے پہلے اپنے دین کے علمبرداروں کی حفاظت کے لیے اپنی قدرت کی شانیں ظاہر کی ہیں اسی طرح تمھارے لیے بھی ہر مرحلہ میں اس کی شانیں ظاہر ہوں گی۔

اصحابِ کہف و رقیم کی وجہ تسمیہ

رہا یہ سوال کہ ان لوگوں کو اصحابِ کہف و رقیم کیوں کہا گیا تو اس کا جواب یہ ہے کہ عرب کے اہلِ کتاب میں یہ لوگ اسی لقب سے معروف تھے۔ 'کہف' کی طرف تو ان کی نسبت ظاہر ہے کہ غار میں پناہ لینے کی وجہ سے ہوئی۔ رہا 'رقیم' تو اس کے بارے میں ہمارے نزدیک راجح قول وہ ہے جس کی روایت عکرمہ نے حضرت ابن عباسؓ سے کی ہے کہ حضرت کعبؓ کا خیال تھا کہ رقیم اس بستی کا نام تھا، جس سے نکل کر اصحابِ کہف نے غار میں پناہ لی۔ رقیم وادی کو بھی کہتے ہیں۔ ناموں کے بارے میں یہ تحقیق کہ ان کی اصل کیا ہے غیر ضروری بھی ہے اور نہایت مشکل بھی۔ عجمی نام عربی کے قالب میں آکر اس قدر بدل جاتے ہیں کہ ان کی اصل کی تحقیق کوہ کنی کے مترادف بن جاتی ہے اور مقصدِ تعلیم کے پہلو سے اس کی کوئی خاص اہمیت بھی نہیں۔ اگر یہ نام قرآن نے رکھا ہوتا تب تو اس کے معنی اور اس کی اصل کی جستجو کی ایک خاص اہمیت تھی۔ لیکن یہ نام جیسا کہ ہم نے عرض کیا عرب کے اہلِ کتاب بالخصوص نصاریٰ کا اختیار کردہ ہے۔ قرآن نے اسی کو اختیار کر لیا ہے۔ دورِ حاضر کے بعض محققین کی رائے میں رقیم وہی شہر ہے جسے پیٹرا کے نام سے شہرت ملی اور عرب اسے بطرا کے نام سے جانتے ہیں۔

اِذْ اَوَى الْفِتْيَةُ اِلَى الْكَهْفِ فَقَالُوْا رَبَّنَآ اٰتِنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً وَّهَيِّئْ لَنَا مِنْ اَمْرِنَا رَشَدًا (۱۰)

'رَشَد' کا مفہوم

'رَشَدَ' کے معنی ہیں اس نے ہدایت اور استقامت پائی۔ 'رَشِدَ اَمْرَہٗ' کے معنی ہوں گے اس نے اپنے معاملے میں ہدایت پائی۔ 'وَهَيِّئْ لَنَا مِنْ اَمْرِنَا رَشَدًا' کا مفہوم ہوگا کہ اے ہمارے رب ہمارے لیے اس راہ میں، جو ہم نے اختیار کی ہے تو رہنمائی اور استقامت کا بدرقہ مہیا فرما۔

نوجوانوں کی دعا

یہ وہ دعا ہے جو ان نوجوانوں نے اس وقت کی ہے جب انھوں نے غار میں پناہ لینے کا ارادہ کیا ہے آیت کے الفاظ سے یہ بات واضح ہے کہ یہ نوجوان لوگ تھے۔ نوجوانوں میں جب ایک مرتبہ حق کی حمیت

جاگ پڑتی ہے تو پھر نہ وہ مصالح کی پروا کرتی ہے اور نہ خطرات کی۔ لیکن ان لوگوں کے اندر صرف جوانی کا جوش ہی نہیں تھا بلکہ اللہ کی بخشی ہوئی حکمت کا نور بھی تھا۔ اس وجہ سے اس نازک مرحلہ میں انھوں نے اللہ سے رہنمائی اور استقامت کی دعا کی اور یہی بات اہلِ ایمان کے شایانِ شان ہے۔

سرگزشت کا خلاصہ بطور تمہید

یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ یہ آیت اور اس کے بعد کی دو آیتیں اصل سرگزشت کے خلاصہ (SUMMARY) کے طور پر ہیں جن میں پہلے اجمال کے ساتھ سرگزشت قاری کے سامنے رکھ دی گئی ہے۔ اس کے بعد پوری سرگزشت تفصیل کے ساتھ سامنے آئے گی۔ تفصیل سے پہلے اجمال کا یہ طریقہ اختیار کرنے کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ اصل مدعا نگاہ کے سامنے رہتا ہے۔ دوسری ضمنی باتیں اس کو نگاہوں سے اوجھل نہیں ہونے دیتیں۔ سرگزشتوں کے بیان میں یہ طریقہ قرآن نے جگہ جگہ اختیار کیا ہے۔

فَضَرَبْنَا عَلَىٰٓ اٰذَانِهِمْ فِی الْكَهْفِ سِنِیْنَ عَدَدًا۔ (۱۱)

'ضَرَبَ عَلَى الْاٰذَان' کا مفہوم

'ضَرَبَ عَلَى الْاٰذَان' کے لفظی معنی کانوں پر ٹھپہ لگانے یا تھپکنے کے ہیں۔ یہیں سے یہ محاورہ کسی کو سننے سے روک دینے یا پیار و شفقت سے سلا دینے کے مفہوم میں استعمال ہونے لگا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بچے کو جب سلاتے ہیں تو اس کے کانوں پر تھپکتے ہیں۔ غار میں پناہ لینے کے بعد اللہ تعالیٰ نے ان کے ساتھ ان پر کئی سالوں کے لیے نہایت آرام و سکون کی نیند طاری کر دی۔ نیند کے لیے یہ الفاظ بطور استعارہ استعمال ہوئے ہیں اور پیار کے ساتھ سلانے کے لیے یہ نہایت بلیغ استعارہ ہے۔

ثُمَّ بَعَثْنٰهُمْ لِنَعْلَمَ اَیُّ الْحِزْبَیْنِ اَحْصٰى لِمَا لَبِثُوْٓا اَمَدًا۔ (۱۲)

برزخی زندگی کا ایک عکس

'لِنَعْلَمَ' پر 'ل' غایت و نہایت کے مفہوم میں ہے اور 'نَعْلَمَ' کے معنی یہاں دیکھنے اور جانچنے کے ہیں۔ آیت کا مفہوم یہ ہے کہ اس طویل نیند کے بعد پھر ہم نے ان کو جگایا تاکہ یہ بات اس نتیجہ تک منتہی ہو کہ وہ دو گروہ ہو کر آپس میں اس سوال پر بحث کریں کہ اس حالتِ خواب میں وہ کتنی مدت رہے ہیں، کوئی کچھ کہے گا کوئی کچھ۔ اس طرح ہم ان کو جانچ لیں گے کہ اس مدت کا ان میں سے کون گروہ اندازہ کر سکا اور بالآخر یہ بات واضح ہو جائے کہ ان میں سے کوئی بھی اس کا اندازہ نہ کر سکا۔ نیز ان پر یہ حقیقت اچھی طرح واضح ہو جائے کہ یہی حال برزخی زندگی کا ہوگا۔ اس کی مدت کا بھی کسی کو احساس نہیں ہوگا۔ ہر شخص اٹھنے پر یہی گمان کرے گا کہ بس ابھی سوئے تھے ابھی جاگ پڑے ہیں۔ آگے آیت ۱۹ میں یہ مضمون مزید وضاحت سے آ رہا ہے وہاں اس کے تمام مخفی گوشے سامنے آ جائیں گے۔

نَحْنُ نَقُصُّ عَلَیْكَ نَبَاَهُمْ بِالْحَقِّ ؕ اِنَّهُمْ فِتْیَةٌ اٰمَنُوْا بِرَبِّهِمْ وَ زِدْنٰهُمْ هُدًى۔ (۱۳)

اجمال کے بعد تفصیل 'بالحق' کا مفہوم

اب یہ اجمال کے بعد ان کی سرگزشت کی تفصیل سنائی جا رہی ہے۔ اس کے ساتھ 'بالحق' کی قید ایک تو اس حقیقت کو ظاہر کر رہی ہے کہ ان لوگوں کی نسبت جو روایات ان کے نام لیواؤں میں معروف تھیں قرآن نے ان سے غض بصر کر کے واقعہ کی اصل صورت پیش کی ہے۔ دوسری یہ کہ قرآن کے سامنے دوسروں کی طرح محض داستان سرائی

نہیں ہے بلکہ اصل مقصود اس حکمت و موعظت سے لوگوں کو آگاہ کرنا ہے جو اس سرگزشت کے اندر مضمر ہے۔ فرمایا کہ یہ کچھ نوجوان تھے جو اپنے رب پر ایمان لائے اور انھوں نے اپنے ایمان کی نگہداشت کی جس کی برکت سے اللہ تعالیٰ نے ان کی ہدایت میں افزونی عطا فرمائی۔ اس افزونی کا ظہور کس شکل میں ہوا؟ اس کا بیان آگے والی آیت میں آ رہا ہے۔

نوجوانوں کی حوصلہ افزائی

یہاں 'فِتْیَۃٌ' کے لفظ پر نظر رہے۔ قرآن نے ان لوگوں کا جوانوں کے طبقہ سے ہونا ظاہر کر کے وقت کے نوجوانوں بالخصوص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے والے نوجوانوں کو توجہ دلا دی کہ وہ اس سرگزشت سے سبق حاصل کریں اور انہی کی طرح دعوتِ حق کی راہ میں اپنی قوم کی عداوت سے بے پروا ہو کر چل کھڑے ہوں۔ خدا ہر مرحلہ میں ان کا ناصر و مددگار ہوگا۔

وَّرَبَطْنَا عَلٰی قُلُوْبِهِمْ اِذْ قَامُوْا فَقَالُوْا رَبُّنَا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَنْ نَّدْعُوَا۟ مِنْ دُوْنِهٖۤ اِلٰهًا لَّقَدْ قُلْنَاۤ اِذًا شَطَطًا (۱۴)

'ربط اللہ علٰی قلبہ' کے معنی ہوں گے خدا نے اس کے دل کو قوت و عزیمت دے دی۔

'شط' کے معنی دور ہونے اور 'شطط' کے معنی 'تباعد عن الحق' یعنی حق سے انحراف اور دوری کے ہیں۔

حق کی منادی

مطلب یہ ہے کہ ہر چند حالات بہت ہی سخت تھے۔ کلمۂ حق کی دعوت دینا بڑا جان جوکھم کا کام تھا لیکن ان نوجوانوں کے ایمان میں خدا نے برکت دی جس کا اثر یہ ہوا کہ وہ صرف اپنے ہی ایمان پر قانع ہو کر گھروں میں بیٹھ رہنے پر راضی نہیں ہوئے بلکہ ہر قسم کے خطرات سے بے پروا ہو کر دعوتِ توحید کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے، جب اٹھ کھڑے ہوئے تو اللہ نے اپنی سنت کے مطابق ان کے دلوں کو قوت و عزیمت بخشی اور انھوں نے اپنی قوم میں عام منادی کر دی کہ ہمارا رب صرف وہی ہے جو آسمانوں اور زمین کا رب ہے۔ اس کے سوا ہم کسی اور کو رب ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ اگر ہم اس کے سوا کسی اور کو رب مانیں گے تو ہماری یہ حرکت نہایت ہی بے جا اور حق سے بہت دور ہٹی ہوئی ہوگی۔

هٰٓؤُلَآءِ قَوْمُنَا اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖۤ اٰلِهَةً ۭ لَوْلَا يَاْتُوْنَ عَلَيْهِمْ بِسُلْطٰنٍۢ بَيِّنٍ ۭ فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا (۱۵)

قوم کو چیلنج

'قومنا' سے مراد یہاں 'رقیم' کے لوگ ہیں۔ یہ ان حق پرست نوجوانوں کا اپنی پوری قوم کے لیے ایک چیلنج ہے اور عربیت کا ذوق رکھنے والے جانتے ہیں کہ یہاں 'ھٰٓؤُلَآءِ' کا لفظ جس انداز سے استعمال ہوا ہے اس سے ایک قسم کی حقارت کا بھی اظہار ہو رہا ہے۔ پھر غائب کے صیغوں میں بھی حقارت مضمر ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ان لوگوں نے ڈنکے کی چوٹ اعلان کر دیا کہ یہ ہماری قوم کے بدھوؤں نے اللہ کے سوا جو اور معبود بنا رکھے ہیں تو یہ اپنے ان معبودوں کے حق میں کوئی واضح دلیل کیوں نہیں لاتے۔ آخر اس سے بڑا ظالم کون ہو سکتا ہے جو خدا کے اوپر بہتان تراشے!!

وَاِذِ اعْتَزَلْتُمُوْهُمْ وَمَا يَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ فَاْوٗۤا اِلَى الْكَهْفِ يَنْشُرْ لَكُمْ رَبُّكُمْ مِّنْ رَّحْمَتِهٖ وَيُهَيِّئْ لَكُمْ مِّنْ اَمْرِكُمْ مِّرْفَقًا (۱۶)

مرفق کا مفہوم

مُرفق، اس چیز کو کہتے ہیں جو آدمی کی ضرورت اور منفعت کی ہو۔ وَیُهَیِّئْ لَكُم مِّنْ أَمْرِكُم مِّرْفَقًا یعنی اس مرحلہ میں جس چیز کے تم محتاج ہوگے اللہ تعالیٰ وہ تمھارے لیے مہیا فرمائے گا۔

اللہ تعالیٰ کی طرف سے نصرت کی بشارت

یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کے لیے بشارت ہے اور یہ قرینہ دلیل ہے کہ یہاں کلام کا اتنا حصہ حذف ہے جو سیاق کلام سے خود واضح ہے یعنی بالآخر ان کے اور ان کی قوم کے درمیان کش مکش اتنی بڑھ گئی کہ خطرہ پیدا ہو گیا کہ لوگ ان کو، جیسا کہ آیت ۲۰ سے واضح ہوتا ہے سنگسار کر دیں گے۔ اس وقت ان لوگوں نے یہ فیصلہ کیا کہ ایک خاص غار میں جو پہلے سے انھوں نے منتخب کر لیا تھا، پناہ گزیں ہو جائیں گے۔ اس مرحلہ میں اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنی وحی کے ذریعہ سے بشارت دی کہ اب جب کہ تم نے اللہ کی خاطر اپنی قوم اور اس کے معبودوں کو چھوڑ دیا تو اپنے منتخب کردہ غار میں پناہ گیر ہو جاؤ۔ تمھارا رب تمھارے لیے اپنے فضل و رحمت کا دامن پھیلائے گا اور تمھاری تمام ضروریات کا سامان کرے گا۔ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے بس یہ چاہتا ہے کہ وہ ہمت کر کے اس کی راہ پر چلنے کے لیے اٹھ کھڑے ہوں۔ جب وہ اٹھ کھڑے ہوتے ہیں تو آگے کی منزل کے لیے زاد و راحلہ وہ خود فراہم کرتا ہے۔ مَن يَتَّقِ اللَّهَ يَجْعَل لَّهُ مَخْرَجًا وَيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ (الطلاق ۶۵: ۲-۳)

ایک شبہ کا ازالہ

ممکن ہے کسی کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہو کہ کیا یہ لوگ صاحب وحی تھے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو وحی کے ذریعہ سے بشارت دی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ وحی اسی قسم کی وحی تھی جس کے ذریعہ سے حضرت موسیٰ کی والدہ کو یہ ہدایت ہوئی کہ وہ بچہ کو ایک صندوق میں رکھ کے دریا میں ڈال دیں۔

ترکِ دنیا کے حق میں اربابِ تصوف کا غلط استدلال

اس واقعہ سے بعض صوفی حضرات نے گوشہ نشینی اور ترکِ دنیا کی زندگی کی فضیلت ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن یہ بات ہمارے نزدیک صحیح نہیں ہے۔ ان لوگوں نے اس غار میں پناہ اس وقت لی ہے جب وہ اپنے ماحول کی اصلاح کے لیے جان کی بازی کھیل کر اپنی قوم کے ہاتھوں سنگسار کر دیے جانے کے مرحلہ تک پہنچ گئے ہیں۔ یہ مرحلہ بعینہٖ وہی مرحلہ ہے جو ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو پیش آیا اور آپ کو غارِ ثور میں پناہ لینی پڑی۔ ان لوگوں نے یہ غار نشینی رہبانیت کے لیے نہیں اختیار کی تھی بلکہ اعدائے حق کے شر سے اپنی جانیں بچانے کے لیے اختیار کی تھی۔

مفسرین کی ایک غلط فہمی

عام طور پر ہمارے مفسرین نے اس آیت کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے بشارت کے مفہوم میں نہیں لیا ہے بلکہ اس کو خود اصحاب الکہف کا قول سمجھا ہے کہ انھوں نے آپس میں اپنے ساتھیوں سے یہ بات کہی، لیکن یہ بات صحیح نہیں ہے۔ آیت میں جس قطعیت کے ساتھ اللہ کی مدد و نصرت کا وعدہ ہے، کوئی متواضع بندہ اس قطعیت کے ساتھ یہ بات نہیں کہہ سکتا۔ کوئی متواضع بندہ اس طرح کی بات کہے گا تو امید و رجا اور دعا ہی کے الفاظ میں کہے گا۔ چنانچہ آیت ۱۰ میں ان لوگوں کی دعا کا حوالہ بھی ہے۔

وَتَرَى الشَّمْسَ إِذَا طَلَعَت تَّزَاوَرُ عَن كَهْفِهِمْ ذَاتَ الْيَمِينِ وَإِذَا غَرَبَت تَّقْرِضُهُمْ
ذَاتَ الشِّمَالِ وَهُمْ فِي فَجْوَةٍ مِّنْهُ ۚ ذَٰلِكَ مِنْ آيَاتِ اللَّهِ ۗ مَن يَهْدِ اللَّهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِ ۖ وَمَن

يُّضْلِلْ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ وَلِيًّا مُّرْشِدًا ۔ (۱۷)

'تَزٰوَرُ' کا مفہوم

'تَزٰوَرُ' اصل میں 'تَتَزَاوَرُ' ہے ۔ اس کے معنی ہٹ جانے، کترا جانے اور منحرف ہو جانے کے ہیں۔

'تقرض' کا مفہوم

'تَقْرِضُهُمْ' قرض کے معنی کاٹنے اور کترانے کے ہیں۔ اسی سے 'قرض المکان' کا محاورہ پیدا ہوا جس کے معنی ہیں اس جگہ سے ہٹ گیا، کترا گیا، گریز کر گیا۔

'فجوۃ' کا مفہوم

'فَجْوَةٍ' دو چیزوں کے درمیان خلا، شگاف اور گوشہ کو کہتے ہیں۔ یہیں سے اس کا اطلاق مکان کے صحن پر بھی ہوتا ہے۔

غار میں ضروریات زندگی کا غیبی اہتمام

اوپر کی آیت میں اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کے لیے غار میں جن ضروریات و مرافق کے مہیا فرمانے کا وعدہ فرمایا ہے اب یہ ان کا بیان ہو رہا ہے کہ اگر تم دیکھ پاتے تو دیکھتے کہ سورج جب طلوع ہوتا ہے تو ان کے غار سے دائیں کو بچتا ہوا طلوع ہوتا ہے اور جب ڈوبتا ہے تو ان سے بائیں کو کتراتا ہوا ڈوبتا ہے اور وہ اس غار کے صحن میں آرام کر رہے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ غار کا دہانہ اس طرح واقع ہوا تھا کہ اس کے اندر ہوا، روشنی اور حرارت، جو زندگی کی ضروریات میں سے ہیں، بآسانی پہنچتی تھیں۔ لیکن آفتاب کی تمازت اس کے اندر راہ نہیں پاتی تھی۔ ہمارے مفسرین نے غار اور اس کے دہانے کی سمت و جہت متعین کرنے کی کوشش کی ہے لیکن ہمارے نزدیک یہ کاوش غیر ضروری ہے۔ اس کی مختلف شکلیں فرض کی جا سکتی ہیں لیکن ان میں سے کسی کے متعلق جزم کے ساتھ کوئی بات نہیں کہی جا سکتی۔ صحیح بات وہی ہے جو اللہ تعالیٰ نے بتا دی کہ یہ اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے کہ اس نے اپنی تدبیر و کارسازی سے اپنے بندوں کے لیے ایک ایسا غار مہیا فرما دیا جہاں بغیر کسی کاوش کے ان کے لیے ساری ضروریات زندگی فراہم تھیں اور معلوم ہوتا کہ سورج بھی ان کے پاس سے گزرتا ہے تو ادب و احترام سے گزرتا ہے کہ ان کی خدمت کی انجام دہی کا شرف تو حاصل ہو لیکن ان کے آرام و سکون میں کوئی خلل واقع نہ ہو۔

ایک تنبیہ

'ذٰلِكَ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ مَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ الاٰیۃ' اسی آیت الٰہی کے تعلق سے یہ تذکیر فرما دی کہ جہاں تک اللہ کی نشانیوں کا تعلق ہے، ایک سے ایک بڑی نشانی موجود ہے۔ لیکن نشانیوں سے رہنمائی وہی حاصل کرتے ہیں جن کو اللہ تعالیٰ توفیق بخشتا ہے۔ جو اس توفیق سے محروم ہو جاتے ہیں، کوئی دوسرا ان کا کارساز و رہنما نہیں بن سکتا۔

وَتَحْسَبُهُمْ اَيْقَاظًا وَّهُمْ رُقُوْدٌ ۖ وَّنُقَلِّبُهُمْ ذَاتَ الْيَمِيْنِ وَذَاتَ الشِّمَالِ ۖ وَكَلْبُهُمْ بَاسِطٌ ذِرَاعَيْهِ بِالْوَصِيْدِ ۭ لَوِ اطَّلَعْتَ عَلَيْهِمْ لَوَلَّيْتَ مِنْهُمْ فِرَارًا وَّلَمُلِئْتَ مِنْهُمْ رُعْبًا ۔ (۱۸)

حفاظت کے لیے انتظام

یہ وہ انتظام بیان ہوا ہے جو اللہ تعالیٰ نے ان کی حفاظت کے لیے فرمایا کہ باوجودیکہ وہ غار میں محو خواب تھے لیکن صورت حال ایسی تھی کہ اگر اتفاق سے کوئی ان کو دیکھ پاتا تو یہ گمان نہ کرتا کہ وہ سو رہے ہیں بلکہ

وہ یہی سمجھتا کہ جاگ رہے ہیں۔ یعنی ان کو سوتا اور بے خبر سمجھ کر کوئی ان کو نقصان پہنچانے کی جرأت نہ کر سکتا بلکہ ان کو اپنی حفاظت کے لیے بیدار و ہوشیار خیال کرتا۔ ان کے سونے کی ہیئت ایسی تھی کہ معلوم ہوتا کہ کچھ لوگ ذرا دم لینے کے لیے بس لیٹ گئے ہیں، ایسی نہیں کہ دیکھنے والا سمجھے کہ اٹاغفیل پڑ کر سو رہے ہیں۔

وَنُقَلِّبُهُمْ ذَاتَ الْيَمِينِ وَذَاتَ الشِّمَالِ' فرمایا کہ ہم ان کو دہنے بائیں کروٹ بھی بدلواتے رہتے تھے۔ یہ کروٹ صحت جسمانی کو برقرار رکھنے کے لیے ضروری ہے اور اس لیے بھی ضروری ہے کہ ایک ہی ہیئت پر پڑے پڑے جسم اکڑ نہ جائے۔ نیز یہ لوگ زمین پر ایک طویل وقفہ کے لیے سوئے تھے۔ اگر ایک ہی کروٹ پر عرصہ تک پڑے رہتے تو یہ اندیشہ تھا کہ زمین ان کے جسم کو نقصان پہنچا دے۔ اس لیے جس طرح ایک شفیق ماں گہوارے میں لیٹے ہوئے بچے کے پہلو بدلتی رہتی ہے اسی طرح قدرت ان کے پہلو بھی بدلواتی رہتی تھی۔

وَكَلْبُهُمْ بَاسِطٌ ذِرَاعَيْهِ بِالْوَصِيدِ' یہ بھی اسی حفاظتی انتظام کے سلسلہ کی بات ہے کہ ان کا وفادار کتا غار کے دہانے پر اپنے دونوں ہاتھ پھیلائے اس طرح بیٹھا رہا کہ گویا پہرہ دے رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ کتا بھی اس دوران میں برابر سوتا ہی رہا لیکن اس کے سونے کی ہیئت وہ نہیں تھی جو عام طور پر کتوں کے سونے کی ہوتی ہے بلکہ وہ تھی جو ڈیوڑھی پر پہرہ دینے والے کتے کی ہوتی ہے۔ یہ انتظام اللہ تعالیٰ نے اس لیے فرمایا کہ کوئی شخص یا عام قسم کا جنگلی جانور غار میں گھسنے کی جرأت نہ کرے۔

لَوِ اطَّلَعْتَ عَلَيْهِمْ لَوَلَّيْتَ مِنْهُمْ فِرَارًا وَلَمُلِئْتَ مِنْهُمْ رُعْبًا' ظاہر ہے کہ اگر اس طرح کے کسی منظر پر اتفاق سے کسی کی نظر پڑ جائے تو وہ دہشت زدہ ہو کر وہاں سے بھاگ کھڑا ہوگا۔ وہ ششدر رہ جائے گا کہ آخر پہاڑوں کے بیچ میں، ایک غار کے اندر یہ کون لوگ ہیں جو اس طرح لیٹے ہوئے ہیں، وہ انہیں بھلے آدمی سمجھے یا برے، چور اور ڈاکو خیال کرے یا راہب اور سنیاسی، آسمانی مخلوق خیال کرے یا ارضی انسان خیال کرے یا جنات و ملائکہ، بہرحال اس پر اس حالت سے ایک انجانے قسم کا خوف ضرور طاری ہوگا۔ یہ خوف کی فضا وہاں قدرت نے اپنے بندوں کی حفاظت کے لیے پیدا کر دی تھی۔ دنیا کے حکمران غار دار تالوں سے محفوظ محلوں میں سوتے ہیں اور مسلح سپاہی ان کا پہرہ دیتے ہیں لیکن ان کی جان کو امان نہیں۔ اللہ کے بندے غاروں اور جنگلوں میں سوتے ہیں اور مجال نہیں کہ کوئی پرندہ وہاں پر مار سکے۔

وَكَذَٰلِكَ بَعَثْنَاهُمْ لِيَتَسَاءَلُوا بَيْنَهُمْ ۚ قَالَ قَائِلٌ مِّنْهُمْ كَمْ لَبِثْتُمْ ۖ قَالُوا لَبِثْنَا
يَوْمًا أَوْ بَعْضَ يَوْمٍ ۚ قَالُوا رَبُّكُمْ أَعْلَمُ بِمَا لَبِثْتُمْ فَابْعَثُوا أَحَدَكُم بِوَرِقِكُمْ هَٰذِهِ إِلَى
الْمَدِينَةِ فَلْيَنظُرْ أَيُّهَا أَزْكَىٰ طَعَامًا فَلْيَأْتِكُم بِرِزْقٍ مِّنْهُ وَلْيَتَلَطَّفْ وَلَا يُشْعِرَنَّ
بِكُمْ أَحَدًا (١٩)

کارسازی کی ایک نشانی

وَكَذَٰلِكَ' یعنی ان کے معاملہ میں جس طرح اپنی کارسازی کی وہ شان ہم نے دکھائی جو اوپر مذکور ہوئی

اسی طرح اپنی یہ نشانی بھی دکھائی کہ ان کو اس نیند سے بیدار کیا کہ ان کے اندر باہم اس امر میں سوال و جواب ہو کر یہ خواب کی حالت ان پر کتنی مدت طاری رہی اور بالآخر ان پر یہ حقیقت واضح ہو جائے کہ اس مدت کا اندازہ کرنے سے وہ بالکل قاصر ہیں، صرف اللہ ہی اس مدت سے واقف ہے۔ چنانچہ ان میں سے ایک صاحب نے ساتھیوں سے سوال کیا کہ بھلا اس حالت میں تم نے کتنے دن گزارے ہوں گے؟ ساتھیوں نے جواب دیا کہ زیادہ سے زیادہ ایک دن یا اس سے بھی کم۔ بالآخر اتفاق اس بات پر ہوا کہ اس مدت کا علم صرف اللہ ہی کو ہے اس وجہ سے اس سوال پر غور کرنا بے سود ہے۔ البتہ یہ کرو کہ اپنے میں سے کسی کو یہ رقم دے کر شہر بھیجو، وہ پہلے تحقیق کر لے کہ شہر کے کس حصہ میں پاکیزہ کھانا ملتا ہے اور وہاں سے وہ کچھ کھانے کو لائے اور خبردار! وہ دبے پاؤں جائے، کسی کو کانوں کان خبر نہ ہونے دے۔

اصحاب کہف کی مدت قیام کے بارے میں باہمی سوال و جواب

یہی وہ سوال و جواب ہے جس کا اوپر آیت ۱۲ میں اجمالاً حوالہ ہے۔ یہاں اس کی تفصیل ہو گئی جس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ یہ سوال و جواب انہی لوگوں کے درمیان ہوا۔ یہاں بھی 'لِيَتَسَآءَلُوا' پر 'ل' غایت و نہایت کے مفہوم میں ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے یہ چاہا کہ ان کا یہ اٹھایا جانا اس نتیجہ تک منتہی ہو کہ وہ آپس میں سونے کی مدت سے متعلق سوال و جواب کریں اور یہ حقیقت ان پر واضح ہو جائے کہ اس مدت کا اندازہ کرنے سے وہ بالکل قاصر ہیں اور یہیں سے ان پر یہ حقیقت بھی واضح ہو جائے کہ مرنے کے بعد برزخ کی زندگی کا بھی یہی حال ہوگا۔ قیامت کو جب لوگ اٹھیں گے تو ایسا معلوم ہوگا کہ اس حالت میں وہ ایک دن یا اس سے بھی کم رہے۔

'فَلْيَنْظُرْ اَيُّهَآ اَزْكٰى طَعَامًا'۔ 'اَيُّهَا' یعنی ای اطراف المدینۃ' یا 'ای نواحی المدینۃ' اور 'اَزْكٰى' سے پاکیزہ کھانا مراد ہے۔

ان لوگوں نے جس وقت غار میں پناہ لی اس وقت شرک و کفر کے غلبہ کے سبب سے ان کی قوم میں حرام و حلال کی تمیز نہیں تھی اس وجہ سے ان لوگوں نے اس بات کی خاص طور پر تاکید کی کہ کھانا لانے والا اس امر کی اچھی طرح تحقیق کر لے کہ شہر کے کس حصہ میں نسبتاً زیادہ پاکیزہ کھانا ملنے کی توقع ہے۔ رقیم میں آخر کچھ اہل کتاب بھی تو رہتے ہوں گے۔ اس وجہ سے توقع تھی کہ ان کے ہاں حرام و حلال کی تمیز ہو گی لیکن اس تحقیق میں یہ اندیشہ بھی تھا کہ کہیں بات کھل نہ جائے۔ اس وجہ سے انھوں نے یہ تاکید بھی کر دی کہ پوری احتیاط ملحوظ رہے، کسی کو خبر نہ ہونے پائے۔ 'تلطف' کے معنی کسی کام کو زیرکی، ہوشیاری اور احتیاط سے ڈرتے ڈرتے کرنے کے ہیں۔

احتیاط کے ساتھ تحقیق کی تاکید

آیت میں لفظ ورق کا ترجمہ عام طور پر لوگوں نے سکہ یا روپیہ کیا ہے لیکن ہم نے رقم کیا ہے اس لیے کہ ورق کے معنی چاندی کے ہیں اور یہ بجائے خود بھی سکہ کے قائم مقام ہو سکتی ہے۔ اس وجہ سے ہم نے ایسا لفظ اختیار کیا ہے جس کا اطلاق مسکوک اور غیر مسکوک دونوں پر ہو سکتا ہے۔

اِنَّهُمْ اِنْ يَّظْهَرُوْا عَلَيْكُمْ يَرْجُمُوْكُمْ اَوْ يُعِيْدُوْكُمْ فِيْ مِلَّتِهِمْ وَلَنْ تُفْلِحُوْٓا اِذًا اَبَدًا (۲۰)

اس سے اس اندیشہ کا اظہار ہوتا ہے جس کی بنا پر احتیاط اور رازداری کی تاکید کی گئی۔ جس زمانے میں ان لوگوں نے غار میں پناہ لی ہے اہل حق پر ظلم و تشدد اپنی انتہا کو پہنچ چکا تھا اور ان لوگوں نے سنگسار کر دیے جانے کے اندیشے سے یہ پناہ ڈھونڈی تھی۔ اسی اندیشہ کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ فرمایا کہ اگر کہیں لوگوں کو پتہ چل گیا تو پھر ہماری خیر نہیں ہے۔ پہلے تو کسی نہ کسی طرح بچ نکلے لیکن اب اگر پا گئے تو یا تو سنگسار کر دیں گے یا مرتد کر کے چھوڑیں گے۔ پھر کسی طرح بھی ان سے نجات حاصل کرنا ممکن نہ ہوگا۔

وَكَذٰلِكَ اَعْثَرْنَا عَلَيْهِمْ لِيَعْلَمُوْٓا اَنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّاَنَّ السَّاعَةَ لَا رَيْبَ فِيْهَا ۚ اِذْ يَتَنَازَعُوْنَ بَيْنَهُمْ اَمْرَهُمْ فَقَالُوا ابْنُوْا عَلَيْهِمْ بُنْيَانًا ۭ رَبُّهُمْ اَعْلَمُ بِهِمْ ۭ قَالَ الَّذِيْنَ غَلَبُوْا عَلٰٓي اَمْرِهِمْ لَنَتَّخِذَنَّ عَلَيْهِمْ مَّسْجِدًا (۲۱)

اس 'کَذٰلِکَ' کا عطف اوپر والے 'کَذٰلِکَ' پر ہے یعنی جس طرح ہم نے وہ شان دکھائی اسی طرح ہم نے یہ شان بھی دکھائی کہ لوگوں کو ان سے باخبر کر دیا۔ یہاں اس بات کی کوئی تصریح نہیں ہے کہ لوگ ان سے کس طرح آگاہ ہوئے۔ ہو سکتا ہے کہ جو صاحب کھانا لینے کے لیے بازار گئے انھی کو دیکھ کر بعض زیرک لوگوں نے تاڑ لیا ہو اور پھر ان کا سراغ لگانے کے درپے ہو گئے ہوں اور اس طرح آہستہ آہستہ لوگوں کی رسائی غار تک ہو گئی ہو۔ غور کرنے سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ اصحاب کہف کو جب یہ اندازہ ہو گیا کہ ان کی سن گن کچھ باہر پہنچ چکی ہے تو وہ اپنے غار میں معتکف ہو گئے اور اسی حال میں اللہ نے ان کو وفات دے دی۔ لوگوں کو ان کی پوری پوری اطلاع ان کی وفات کے بعد ہی ہوئی۔

واقعہ میں قیامت کے باب میں شہادت

'لِيَعْلَمُوْٓا اَنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّاَنَّ السَّاعَةَ لَا رَيْبَ فِيْهَا' یعنی اللہ نے لوگوں کو ان کے حال سے اس لیے آگاہ کیا کہ یہ اس بات کی نشانی ہو کہ اللہ کا وعدۂ قیامت شدنی ہے اور اس کے ظہور میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں ہے۔ قیامت کے باب میں منکرین کو سب سے بڑا شبہ یہی پیش آتا ہے کہ وہ مرنے کے بعد دوبارہ جی اٹھنے کو بہت ہی مستبعد سمجھتے ہیں۔ اصحاب کہف کے واقعہ نے اس استبعاد کو رفع کرنے کے لیے ایک تازہ شہادت پیش کر دی کہ ایک مدت تک سوتے رہنے کے بعد وہ اپنے رب کے حکم سے پھر اٹھ بیٹھے۔ قرائن اس بات پر دلیل ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے جس طرح لوگوں کو ان کے غار سے آگاہ فرمایا اسی طرح اس بات سے بھی آگاہ فرما دیا کہ ان لوگوں کی زندگی غار میں کس طرح گزری۔ اگرچہ آیت میں اس کی کوئی صراحت نہیں ہے لیکن یہ امر واضح ہے کہ لوگوں کو یہ بات معلوم تھی اور درحقیقت یہی چیز تھی جس کے سبب سے ان کی زندگی لوگوں کی نگاہوں میں ایک اعجوبہ بنی اور مرنے کے بعد یہ خلق کے مرجع عقیدت بن گئے۔ ہو سکتا ہے کہ جس زمانے میں لوگوں نے ان کی ٹوہ لگانے کی کوشش کی ہے اسی زمانے میں یہ راز بھی کھلا ہو اور بعد میں اس کا علم عام ہو گیا ہو اور پھر اس کی روایت نے تواتر کی حیثیت حاصل کر لی ہو۔

'اِذْ يَتَنَازَعُوْنَ بَيْنَهُمْ اَمْرَهُمْ فَقَالُوا ابْنُوْا عَلَيْهِمْ بُنْيَانًا ۭ رَبُّهُمْ اَعْلَمُ بِهِمْ ۭ قَالَ الَّذِيْنَ غَلَبُوْا عَلٰٓي اَمْرِهِمْ لَنَتَّخِذَنَّ عَلَيْهِمْ مَّسْجِدًا'

اصحاب کہف کی وفات کے بعد قوم کا انقلاب حال

اب یہ قرآن نے اس انقلاب حال کی طرف اشارہ فرمایا ہے جو ان کی وفات کے بعد ہوا کہ ایک دن تو وہ تھا کہ یہ بے چارے سنگ سار کر دیے جانے کے ڈر سے ایک غار میں چھپے یا وہ دن آیا کہ لوگ ان کے ساتھ نسبت حاصل کرنے کے لیے آپس میں جھگڑنے لگے۔ ظاہر ہے کہ یہ تنازع مختلف گروہوں، فرقوں اور خاندانوں میں واقع ہوا ہو گا۔ اور اس لیے ہوا ہو گا کہ ہر ایک ان کو اپنے گروہ، اپنے فرقے اور اپنے مسلک و عقیدہ کے ساتھ منسوب کرنے کا خواہش مند رہا ہو گا۔ اہل حق کے ساتھ اس ظالم دنیا نے ہمیشہ یہی معاملہ کیا ہے۔ زندگی میں تو ان کو لوگوں کے پتھر کھانے پڑے لیکن مرنے کے بعد ان کے بت پوجے گئے۔ ان لوگوں کے ساتھ بھی مرنے کے بعد یہی ہوا کہ مختلف گروہ اور فرقے ان کے ساتھ قرب کے مدعی بن کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ ایک گروہ کی رائے یہ ہوئی کہ ان کے مذہب و مسلک کا معاملہ تو اللہ کے حوالے کیا جائے البتہ ان کی یادگار میں ان کے غار پر ایک عمارت بنا دی جائے۔ لیکن دوسرے گروہ نے، جس کو اکثریت حاصل تھی، کہا کہ ہم ان کی یادگار میں ایک مسجد بنائیں گے اور اسی گروہ کی رائے غالب رہی۔ اس سے اس انقلاب حال کا کچھ اندازہ ہوتا ہے جو ان جانبازوں کی قربانیوں کے نتیجہ میں برپا ہوا کہ ملک میں ان لوگوں نے اکثریت حاصل کر لی جو موحد اور خدا پرست تھے۔ دوسرے لوگ جو موحد اور خدا پرست نہیں تھے ان کے اندر بھی اتنی تبدیلی اور رواداری واقع ہو گئی کہ اصحاب کہف کی یادگار قائم کرنے کی سعادت وہ بھی حاصل کرنے کے متمنی ہوئے۔

یادگار میں مسجد کی تعمیر

'رَبُّهُمْ أَعْلَمُ بِهِمْ' میں ہمارے نزدیک عربیت کے معروف قاعدہ کے مطابق ایک مضاف محذوف ہے یعنی 'أَعْلَمُ بِدِينِهِمْ'۔ معلوم ہوتا ہے اس گروہ کی رائے یہ تھی کہ ان کے دین و عقیدہ کی بحث نہ چھیڑی جائے بلکہ قوم کے متفق علیہ بزرگوں اور پیشواؤں کی حیثیت سے ان کی یادگار میں ان کے غار پر ایک ہیکل کی تعمیر کی جائے لیکن دوسرے گروہ نے یہ تجویز قبول نہیں کی بلکہ اس نے ایک مسجد تعمیر کرنے کا فیصلہ کیا اور یہی رائے غالب رہی۔

'عَلَيْهِم مَّسْجِدًا' میں بھی ہمارے نزدیک ایک مضاف محذوف ہے یعنی 'عَلٰى كَهْفِهِمْ'

قرآن مجید نے ان لوگوں کی یادگار کو مسجد سے تعبیر کر کے یہ حقیقت واضح کی ہے کہ یہ موحد اور خدا پرست لوگ تھے۔ اس وجہ سے انھوں نے خدا کی عبادت کا گھر بنایا۔ یہ امر ملحوظ رہے کہ یہود اور نصاریٰ کے عبادت خانے اصلاً مسجد ہی تھے۔ ان میں خرابی تو اس وقت سے پیدا ہوئی ہے جب ان قوموں نے مشرکانہ عقائد اختیار کیے اور اپنے معبدوں کو شرک سے آلودہ کیا۔ یاد ہو گا قرآن نے یہود و نصاریٰ کے 'صوامع' اور 'بیع' کو مساجد ہی کے زمرے میں شمار کیا ہے۔ ملاحظہ ہو سورۂ حج آیت ۴۰۔

سَيَقُولُونَ ثَلَاثَةٌ رَّابِعُهُمْ كَلْبُهُمْ وَيَقُولُونَ خَمْسَةٌ سَادِسُهُمْ كَلْبُهُمْ رَجْمًا بِالْغَيْبِ ۖ وَيَقُولُونَ سَبْعَةٌ وَثَامِنُهُمْ كَلْبُهُمْ ۚ قُل رَّبِّي أَعْلَمُ بِعِدَّتِهِم مَّا يَعْلَمُهُمْ إِلَّا قَلِيلٌ ۗ فَلَا تُمَارِ فِيهِمْ إِلَّا مِرَاءً ظَاهِرًا وَلَا تَسْتَفْتِ فِيهِم مِّنْهُمْ أَحَدًا (۲۲)

غیر ضروری سوالات سے گریز کی

اب یہ ایک جملہ معترضہ کے طور پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے فرمایا کہ اصحاب کہف کی اصل حقیقت

تو یہی ہے جو تمہیں سنا دی گئی لیکن یہ نہ سمجھو کہ یہ سوال کرنے والے اس سے مطمئن ہو جائیں گے اور ان کی زندگیوں سے سبق حاصل کریں گے بلکہ اب کچھ لوگ یہ کہیں گے کہ ان کی تعداد تین تھی اور چوتھا ان کا کتا تھا۔ اور کچھ لوگ یہ کہیں گے کہ یہ پانچ تھے چھٹا ان کا کتا تھا۔ فرمایا کہ یہ ساری باتیں رَجْمًا بِالْغَيْبِ یعنی محض اٹکل پچو ہیں، ان کی کوئی حقیقت نہیں۔ علاوہ ازیں کچھ لوگ یہ کہیں گے کہ وہ سات تھے آٹھواں ان کا کتا تھا، تم ان سے کہہ دو کہ میرا رب ہی ان کی تعداد کو خوب جانتا ہے۔ ان کی تعداد سے صرف تھوڑے ہی لوگ واقف ہیں۔

'فَلَا تُمَارِ فِيهِمْ إِلَّا مِرَآءً ظَاهِرًا' 'ممارات' کے معنی بحث و مناظرہ کرنے کے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اگر لوگ تمہارے سامنے اس طرح کے سوالات لے کر آئیں اور تم سے بحث و جدال کرنا چاہیں تو ان سے نہ الجھنا بلکہ سرسری طور پر بات کر کے ان کو ٹال دینے کی کوشش کرنا۔ اب اصحابِ کہف کے باب میں کسی سے کچھ پوچھنے کی بھی ضرورت نہیں۔ جب ان کی اصل سرگزشت اللہ نے بیان کر دی تو اللہ سے زیادہ کون جاننے والا ہے جس سے رجوع کرنے کی ضرورت پیش آئے۔

اس آیت سے یہ حقیقت واضح ہوئی کہ جن لوگوں کو بحث و مناظرہ کا روگ لگ جاتا ہے ان کو اصل حقیقت سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔ ان کے مناظرہ کی ایک راہ بند کیجیے تو وہ کوئی دوسری راہ نکال لیں گے اس وجہ سے کسی دانش مند کے لیے یہ زیبا نہیں کہ ایسے لوگوں کے قائل کرنے کے درپے ہو۔ ایسے لوگوں سے جان چھڑانے ہی میں خیر ہے۔ ان کے ساتھ سنجیدہ ہو کر بحث کرنے کے بجائے ان کو خوبصورتی سے ٹالنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

بعض اہل تاویل نے اصحابِ کہف کی تعداد سے متعلق آخری قول کو اقرب الی الصواب قرار دیا ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ پہلے دو قولوں کو تو قرآن نے صاف رجماً بالغیب قرار دیا ہے لیکن تیسرے قول سے متعلق کوئی اس طرح کی بات نہیں فرمائی ہے۔ یہ استنباط قرین صواب ہے لیکن ان کی تعداد سے متعلق ہمارا قول وہی ہے جو قرآن نے بتایا ہے۔ قُلْ رَّبِّيْٓ اَعْلَمُ بِعِدَّتِهِمْ مَّا يَعْلَمُهُمْ اِلَّا قَلِيْلٌ۔

وَلَا تَقُوْلَنَّ لِشَايْءٍ اِنِّيْ فَاعِلٌ ذٰلِكَ غَدًا ۝ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ ۡ وَاذْكُرْ رَّبَّكَ اِذَا نَسِيْتَ وَقُلْ عَسٰٓى اَنْ يَّهْدِيَنِ رَبِّيْ لِاَقْرَبَ مِنْ هٰذَا رَشَدًا (۲۳-۲۴)

وعدہ مشروط بمشیتِ الٰہی کیا جائے

اسی ذیل میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ہدایت بھی فرما دی کہ کسی امر میں یوں غیر مشروط وعدہ نہ کر لیا کرو کہ میں یہ کام کل کر دوں گا۔ اس ہدایت کی ضرورت غالباً یوں پیش آئی کہ اصحابِ کہف کے متعلق جب پوچھنے والوں نے پوچھا ہوگا تو آپ نے یہ وعدہ کر لیا ہوگا کہ میں اس کا جواب کل دے دوں گا۔ اس قسم کے سوالات، جیسا کہ ہم نے عرض کیا، آپ سے امتحاناً کیے جاتے تھے اس وجہ سے فطری طور پر آپ کی یہ خواہش ہوتی کہ ان کا جواب جلد دیا جائے اور آپ وحی کی رہنمائی کے بھروسہ پر وعدہ کر بیٹھتے۔ جہاں تک جواب جلد دینے کی خواہش کا تعلق ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دل کے اندر اپنی دعوت کی سربلندی کا

کی جو شدید آرزو تھی اس کی وجہ سے آپ یہ چاہتے تھے کہ معترضین و مخالفین کے ہر سوال و اعتراض کا جواب فوراً دیا جائے تاکہ اپنی طرف سے ان کے لیے قبولِ حق میں کوئی عذر باقی نہ رہے لیکن اس معاملہ کا ایک اور پہلو بھی تھا جو نظر انداز ہو گیا تھا وہ یہ کہ بسا اوقات حکمتِ الٰہی کا تقاضا کسی سوال سے متعلق یہ ہوتا ہے کہ اس کا جواب نہ دیا جائے یا جواب تو دیا جائے لیکن فوراً نہ دیا جائے۔ اس وجہ سے نبی کے لیے یہ بات مناسب نہیں ہے کہ وہ وحی کے بھروسہ پر کوئی غیر مشروط وعدہ کر بیٹھے بلکہ اس کو ہر وعدہ خدا کی مشیت کی شرط کے ساتھ کرنا چاہیے اور اگر کبھی بھول چوک ہو جائے تو یاد آنے پر اپنے رب کو یاد کرنا چاہیے اور جن سے وعدہ ہوا ہے ان سے کہنا چاہیے کہ کیا عجب کہ میرا رب موعودہ مدت سے بھی کم مدت میں صحیح بات کی طرف رہنمائی فرما دے۔

وَلَبِثُوا فِي كَهْفِهِمْ ثَلٰثَ مِائَةٍ سِنِينَ وَازْدَادُوا تِسْعًا (۲۵)

آیت ۲۵ کا تعلق اوپر کے الفاظ سے

آیت ۲۲ سے جو جملہ معترضہ شروع ہوا تھا وہ آیت ۲۴ پر ختم ہوا۔ اب یہ آیت انھی اقوال سے متعلق ہے جو اوپر اصحابِ کہف کی تعداد سے متعلق نقل ہوئے ہیں۔ یعنی جس طرح وہ ان کی تعداد کے بارے میں یہ کہیں گے اسی طرح غار میں ان کی مدتِ قیام سے متعلق دعویٰ کریں گے کہ وہ غار میں تین سو سال اور مزید برآں نو سال رہے۔

عام طور پر لوگوں نے اس کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے خبر کے مفہوم میں لیا ہے لیکن ہمارے نزدیک ان کی مدتِ قیام کے باب میں قرآن نے کوئی قطعی بات نہیں کہی ہے۔ آیت ۱۱ میں 'سِنِينَ عَدَدًا' کے الفاظ ہیں۔ وہ اس بات پر تو ضرور دلیل ہیں کہ یہ لوگ غار میں کئی سال رہے لیکن تین سو نو سال کی مدت کی تعبیر کے لیے، عربیت کا ذوق رکھنے والے جانتے ہیں کہ یہ الفاظ بالکل ناموزوں ہیں۔ پھر اس کے بعد کی آیت 'قُلِ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا لَبِثُوا' اس مفہوم سے بالکل اِبا کرتی ہے۔ اگر یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے خبر ہے کہ وہ تین سو نو سال غار میں رہے تو پھر یہ کہنے کے کیا معنی کہ ان لوگوں سے کہہ دو کہ ان کی مدتِ قیام کو اللہ ہی خوب جانتا ہے۔

کسی کو یہ غلط فہمی نہ ہو کہ میں اس تاویل میں منفرد ہوں۔ متعدد دوسرے ائمہ تفسیر کی رائے بھی یہی ہے۔ وَالْعِلْمُ عِنْدَ اللّٰهِ۔

قُلِ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا لَبِثُوْا ۚ لَهٗ غَيْبُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ اَبْصِرْ بِهٖ وَاَسْمِعْ ۭ مَا لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّلِيٍّ ۡ وَّلَا يُشْرِكُ فِيْ حُكْمِهٖٓ اَحَدًا (۲۶)

یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جواب دلوایا گیا ہے کہ جس طرح اصحابِ کہف کی تعداد سے متعلق ان کے اندازے بالکل اٹکل پچو ہیں اسی طرح غار میں ان کی مدتِ قیام کے بارے میں بھی ان کا اندازہ بالکل غلط ہے۔ ان کو بتا دو کہ اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ یہ لوگ کتنی مدت غار میں رہے۔ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد، جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا، ان لوگوں کے خیال کی نفی کر رہا ہے جو 'وَلَبِثُوا فِي كَهْفِهِمْ ثَلٰثَ مِائَةٍ سِنِينَ ..... الاٰية' کو اس معنی میں

لیتے ہیں کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کی مدتِ قیام کی خبر ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو اس کے معاً بعد یہ کہنے کا کوئی مناسب محل نہیں تھا کہ اللہ ہی ان کی مدتِ قیام کا بہتر علم رکھنے والا ہے۔ یہاں زبان کا یہ نکتہ بھی ذہن میں رکھیے کہ اگر یہ بات اللہ تعالیٰ کی طرف سے خبر کے مفہوم میں ہوتی تو کلام کا آغاز حرفِ عطف سے نہ ہوتا بلکہ حرفِ عطف کے بغیر ہوتا۔ حرفِ عطف اس بات کا واضح قرینہ ہے کہ یہ انہی بے سروپا باتوں کے تحت ہے جو ان لوگوں کی طرف سے اوپر نقل ہوئی ہیں۔

زبان کا ایک نکتہ

'لَهٗ غَيْبُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ' - یعنی آسمانوں اور زمین کے تمام رازوں کا حقیقی علم اللہ ہی کے پاس ہے۔ دوسروں کو صرف اتنا ہی علم ہے جتنا اس نے بتایا ہے باقی سب رطب و یابس کا مجموعہ ہے۔ اس کی حیثیت یہ نہیں ہو سکتی کہ اس کی بنیاد پر انسان اللہ تعالیٰ کے بتائے ہوئے علم کا مذاق اڑائے۔ آج انسان نے زمین کی تہوں کو الٹ پلٹ کر معلومات کا جو ذخیرہ جمع کیا ہے اس کی افادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا، لیکن یہ قرآن کے بیان کردہ حقائق کے مقابل میں کوئی وزن نہیں رکھتا۔

آسمانوں اور زمین کے تمام رازوں کا حقیقی علم اللہ ہی کے پاس ہے

'اَبْصِرْ بِهٖ وَاَسْمِعْ' - یہ مبالغہ اور غایت درجہ تعریف کا اسلوبِ بیان ہے۔ یعنی کیا کہنے ہیں اس کے دیکھنے اور سننے کے! وہ بہت ہی خوب دیکھنے اور سننے والا ہے! آسمانوں اور زمین کی کوئی بات اور کوئی چیز بھی اس کے احاطۂ سمع و بصر سے باہر نہیں ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ جب اس علیم و خبیر نے ایک سوال کا جواب دے دیا تو اب اس سے زیادہ جاننے والا کون ہے کہ اس سے رجوع کرنے کی ضرورت باقی رہے۔

اللہ تعالیٰ کا محیط کل علم

'مَا لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا يُشْرِكُ فِيْ حُكْمِهٖٓ اَحَدًا' : جب بات اللہ تعالیٰ کے احاطۂ علم تک پہنچ گئی تو یہیں سے اس کے تمام شرکاء و شفعاء کی نفی کے لیے راہ صاف ہو گئی کہ جو خود ہر بات سے سب سے زیادہ آگاہ ہے اس کے مقابل اگر لوگوں نے کچھ کارساز و مددگار اپنے لیے فرض کر رکھے ہیں تو وہ ذرہ بھی کام آنے والے نہیں بنیں گے۔ اللہ تعالیٰ اپنی ذات میں کامل اور سب سے مستغنی ہے۔ وہ اپنے اختیار میں کسی کو شریک نہیں بناتا۔

۴- آگے کا مضمون ـــــ آیات ۲۷-۳۱

آگے کا مضمون تمہید سورہ کے مضمون سے متصل ہے۔ یاد ہوگا، سورہ کی تمہید میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ان لوگوں کے پیچھے پریشان ہونے سے روک دیا گیا جو زخارفِ دنیا کے عشق میں خدا اور آخرت کو بھولے بیٹھے ہیں اور قرآن کی بات سننے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ اس کے بعد ایک سوال کے جواب میں اصحابِ کہف کا ذکر آگیا تھا جس سے یہ حقیقت واضح ہوئی کہ اللہ تعالیٰ اپنی راہ میں اٹھنے والے بندوں کو ضائع نہیں کرتا بلکہ ان کی ڈھارس بندھاتا، ان کی حوصلہ افزائی کرتا اور راہِ حق میں ان کو جو مشکلیں پیش آتی ہیں، ان میں غیب سے ان کی مدد فرماتا ہے۔ اب آگے اسی تمہید والے مضمون کو پھر لے لیا اور پیغمبر کو خطاب کر کے فرمایا کہ تم پر جو کتاب وحی کی جا رہی ہے اس کو

لوگوں کو سناؤ اور مخالفین کے نت نئے مطالبات اور ان کے اعراض و استکبار کی پروا نہ کرو۔ ہدایت و ضلالت کے معاملہ میں اللہ کا جو قانون ہے وہ بدل نہیں سکتا۔ تم ان اغنیاء و متکبرین سے بے پروا ہو کر اپنے غریب ساتھیوں پر اپنی ساری توجہ مرکوز کرو اور ان متکبرین کو سنا دو کہ جس کا جی چاہے، ایمان لائے، جس کا جی چاہے کفر کرے۔ جو کفر کرے گا وہ اپنا انجام خود دیکھ لے گا۔ اس روشنی میں آگے کی آیات کی تلاوت کیجیے۔

آیات ۲۷-۳۱

وَاتْلُ مَآ اُوْحِيَ اِلَيْكَ مِنْ كِتَابِ رَبِّكَ ۚ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ ۚ
وَلَنْ تَجِدَ مِنْ دُوْنِهٖ مُلْتَحَدًا ﴿۲۷﴾ وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِيْنَ
يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ وَلَا
تَعْدُ عَيْنٰكَ عَنْهُمْ ۚ تُرِيْدُ زِيْنَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَلَا
تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ وَكَانَ
اَمْرُهٗ فُرُطًا ﴿۲۸﴾ وَقُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ ۣ فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ
وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ ۙ اِنَّآ اَعْتَدْنَا لِلظّٰلِمِيْنَ نَارًا ۙ اَحَاطَ بِهِمْ
سُرَادِقُهَا ۭ وَاِنْ يَّسْتَغِيْثُوْا يُغَاثُوْا بِمَآءٍ كَالْمُهْلِ يَشْوِي الْوُجُوْهَ ۭ
بِئْسَ الشَّرَابُ ۭ وَسَآءَتْ مُرْتَفَقًا ﴿۲۹﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا
الصّٰلِحٰتِ اِنَّا لَا نُضِيْعُ اَجْرَ مَنْ اَحْسَنَ عَمَلًا ﴿۳۰﴾ اُولٰۗىِٕكَ لَهُمْ
جَنّٰتُ عَدْنٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهِمُ الْاَنْهٰرُ يُحَلَّوْنَ فِيْهَا مِنْ اَسَاوِرَ
مِنْ ذَهَبٍ وَّيَلْبَسُوْنَ ثِيَابًا خُضْرًا مِّنْ سُنْدُسٍ وَّاِسْتَبْرَقٍ
مُّتَّكِـِٕيْنَ فِيْهَا عَلَي الْاَرَاۗىِٕكِ ۭ نِعْمَ الثَّوَابُ ۭ وَحَسُنَتْ مُرْتَفَقًا ﴿۳۱﴾ ع ۴ ۹ ۱۶۰

ترجمۂ آیات ۲۷-۳۱

اور تمہارے رب کی جو کتاب تم پر وحی کی جا رہی ہے اس کو سناؤ، خدا کے قوانین کو کوئی بدل نہیں سکتا اور اس کے سوا تم کوئی پناہ نہیں پا سکتے اور اپنے آپ کو ان لوگوں کے ساتھ

جمائے رکھو جو صبح و شام اپنے رب کی رضا جوئی میں اس کو پکارتے ہیں۔ اور تمہاری نگاہیں حیاتِ دنیا کی زینتوں کی خاطر ان سے ہٹنے نہ پائیں اور تم ان لوگوں کی بات پر دھیان نہ کرو جن کے دل ہم نے اپنی یاد سے غافل کر دیے ہیں اور جو اپنی خواہشوں کے پیچھے پڑے ہیں اور جن کا معاملہ حد سے متجاوز ہو چکا ہے۔ اور کہہ دو یہی حق ہے تمہارے رب کی جانب سے، تو جس کا جی چاہے ایمان لائے اور جس کا جی چاہے کفر کرے۔ ہم نے ظالموں کے لیے ایسی آگ تیار کر رکھی ہے جس کی قناتیں ان کو اپنے گھیرے میں لے لیں گی۔ اور اگر وہ پانی کے لیے فریاد کریں گے تو ان کی فریاد رسی ایسے پانی سے کی جائے گی جو پگھلے ہوئے تانبے کی مانند ہو گا، چہروں کو بھون ڈالے گا۔ کیا ہی برا پانی ہو گا! اور کیا ہی برا ٹھکانا! ۲۷-۲۹

بے شک جو ایمان لائے اور جنھوں نے اچھے عمل کیے تو ہم خوب کاروں کے اجر کو ضائع نہیں کریں گے۔ ان کے لیے ہمیشگی کے باغ ہوں گے جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی۔ وہاں وہ سونے کے کنگن پہنائے جائیں گے اور وہ سندس و استبرق کی سبز پوشاک پہنیں گے، تختوں پر ٹیک لگائے ہوئے، کیا ہی خوب صلہ ہے اور کیا ہی خوب ٹھکانا۔ ۳۰-۳۱

۵۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَاتْلُ مَآ اُوْحِیَ اِلَیْکَ مِنْ کِتَابِ رَبِّکَ ۚ لَا مُبَدِّلَ لِکَلِمٰتِہٖ ۚ وَلَنْ تَجِدَ مِنْ دُوْنِہٖ مُلْتَحَدًا (۲۷)

ہدایت و ضلالت کے باب میں سنتِ الٰہی

یہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو تاکید ہے کہ جو کتاب تم پر وحی کی جا رہی ہے، بس اس کو سناؤ۔ نہ مخالفین کے نت نئے مطالبات کی پروا کرو، نہ ان کے سوالات سے پریشان ہو اور نہ ان کی ضد اور ہٹ دھرمی پر غم کرو۔ اللہ نے ہدایت و ضلالت کے لیے جو قانون بنا دیا ہے وہ اٹل ہے، خدا کے قوانین و ضوابط کو کوئی بدل نہیں سکتا۔ ہدایت وہی پائیں گے جن کو ہدایت کی توفیق حاصل ہو گی اور توفیق انہی کو حاصل ہو گی جو اس نعمت کے لیے اپنی صلاحیت کا ثبوت دیں گے۔ یہ معاملہ تمام تر اللہ کے ہاتھ میں ہے اور خدا کے سوا کوئی مرجع و ماویٰ نہیں۔

وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِينَ يَدْعُونَ رَبَّهُم بِالْغَدَاةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيدُونَ وَجْهَهُ وَلَا تَعْدُ عَيْنَاكَ عَنْهُمْ تُرِيدُ زِينَةَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَلَا تُطِعْ مَنْ أَغْفَلْنَا قَلْبَهُ عَن ذِكْرِنَا وَاتَّبَعَ هَوَاهُ وَكَانَ أَمْرُهُ فُرُطًا (۲۸)

'فرط' کا مفہوم

'فُرُطًا' کے معنی اسراف، ظلم اور حدود سے تجاوز کے ہیں۔ 'الامر الفرط' وہ معاملہ جو حدود سے بالکل متجاوز ہو گیا ہو۔

متکبرین کے باب میں پیغمبر کو ہدایت

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی قوم کے سرداروں اور مالداروں کے ایمان کی فکر خدانخواستہ اپنی ذات کے لیے نہیں تھی بلکہ صرف دین کی سربلندی کی خاطر تھی۔ آپ سمجھتے تھے کہ ان لوگوں کا ایمان دوسروں کے ایمان کی راہ کھولے گا۔ اس خیال کے تحت آپ ان لوگوں کی ناز برداری میں بسا اوقات اپنے جاں نثار ساتھیوں کے حقوق سے غافل ہو جاتے۔ اس آیت میں آپ کو اس چیز سے روک دیا گیا۔ ارشاد ہوا کہ جو لوگ صبح و شام خدا کی یاد اور اس کی رضا جوئی میں سرگرم ہیں اپنی توجہ کا مرکز ان کو بناؤ۔ ان سرگشتگانِ دنیا کو جو اپنی خواہشوں کے پیرو ہیں اور جن کا معاملہ اب تمام حدود سے تجاوز کر چکا ہے، خاطر میں نہ لاؤ۔ تمہاری دعوت اپنا زاد و راحلہ اور اپنی عزت و شوکت خود اپنے ساتھ رکھتی ہے، ان لوگوں کے مال و متاع کی محتاج نہیں کہ تم ان کی طرف آنکھ اٹھاؤ۔ اس آیت کے لب و لہجہ میں جو تیزی ہے اہل ذوق جانتے ہیں کہ اس کا رخ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف نہیں بلکہ متکبرین اور اغنیاء کی طرف ہے جو صحابہؓ کو حقیر سمجھتے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مطالبہ کرتے تھے کہ آپ ان کو دور کریں تب ہم بات سننے کے روادار ہوں گے۔

وَقُلِ الْحَقُّ مِن رَّبِّكُمْ فَمَن شَاءَ فَلْيُؤْمِن وَمَن شَاءَ فَلْيَكْفُرْ إِنَّا أَعْتَدْنَا لِلظَّالِمِينَ نَارًا أَحَاطَ بِهِمْ سُرَادِقُهَا وَإِن يَسْتَغِيثُوا يُغَاثُوا بِمَاءٍ كَالْمُهْلِ يَشْوِي الْوُجُوهَ بِئْسَ الشَّرَابُ وَسَاءَتْ مُرْتَفَقًا (۲۹)

متکبرین کو آگاہی

'قُلِ الْحَقُّ' یعنی 'قُلْ هٰذَا هُوَ الْحَقُّ' یعنی ان کی ناز برداری کے بجائے اب ان کو آخری آگاہی دے دو کہ یہی بات حق ہے جو خدا کی طرف سے اتری ہے اور جو میں نے تمہیں پہنچا دی ہے۔ اب کسی کے کفر و ایمان کی ذمہ داری مجھ پر نہیں ہے جس کا جی چاہے ایمان لائے، جس کا جی چاہے کفر کرے۔ جو کفر کریں گے تو ایسے ظالموں کے لیے دوزخ کی آگ تیار ہے جس کی قناتیں ان کو اپنے گھیرے میں لے لیں گی اور جب یہ پانی پانی پکاریں گے تو ان کو پگھلے ہوئے تانبے کی طرح کا پانی دیا جائے گا جو چہروں کو بھون کے رکھ دے گا۔ نہ پانی کی برائی کی کوئی حد ہو گی، نہ ٹھکانے کی، دونوں کی برائی ایک سے ایک بڑھ کر۔

'مرتفق' کا مفہوم

'مُرْتَفَقًا' کے معنی ٹیک لگانے کی جگہ کے ہیں۔ ہم نے اس کے وسیع مفہوم کے اعتبار سے اس کا ترجمہ ٹھکانا کیا ہے۔

'شَوٰی یَشْوِیْ' کے معنی بھوننے کے ہیں۔ 'مُهْل' (پگھلے ہوئے تانبے) کے لیے اس کا استعمال اس کی

شدت و حدت کے اظہار کے لیے ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ إِنَّا لَا نُضِيعُ أَجْرَ مَنْ أَحْسَنَ عَمَلًا ۝ أُولَٰئِكَ
لَهُمْ جَنَّاتُ عَدْنٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهِمُ الْأَنْهَارُ يُحَلَّوْنَ فِيهَا مِنْ أَسَاوِرَ مِنْ ذَهَبٍ وَ
يَلْبَسُونَ ثِيَابًا خُضْرًا مِنْ سُندُسٍ وَإِسْتَبْرَقٍ مُتَّكِئِينَ فِيهَا عَلَى الْأَرَائِكِ ۚ نِعْمَ الثَّوَابُ
وَحَسُنَتْ مُرْتَفَقًا (۳۰-۳۱)

ایمان لانے والوں کو صلہ

کفر کرنے والوں کے انجام کے بیان کے بعد اب یہ ان لوگوں کا انجام بیان ہو رہا ہے جو قرآن کی دعوت پر ایمان لائے۔ امرا و اغنیا چونکہ ان لوگوں کو، ان کی غربت کے سبب سے، بہت حقیر سمجھتے تھے اس وجہ سے ان کے صلہ کے بیان میں ان چیزوں کو خاص طور پر نمایاں کیا گیا ہے جو وقت کے امراء کے لیے سرمایۂ فخر و ناز تھیں۔ فرمایا کہ جو لوگ ایمان لائے اور جنھوں نے عمل صالح کیے ہم ان خوب کاروں کے اجر کو ضائع نہیں کریں گے۔ ان کے لیے ہمیشگی کے باغ ہوں گے، جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی۔ وہ سونے کے کنگن پہنائے جائیں گے اور سندس و استبرق کے سبز لباس پہنیں گے، تختوں پر ٹیک لگائے ہوں گے۔ کیا ہی خوب صلہ اور کیا ہی خوب ٹھکانا ہو گا!!

جنت اور دوزخ کے احوال سے متعلق ہم یہ لکھ چکے ہیں کہ یہ متشابہات میں داخل ہیں جن تمثیلات و تشبیہات سے اس نادیدہ عالم کے احوال کو ہمارے ذہن کے قریب لایا جا سکتا ہے، قرآن ان کے ذریعہ سے ان کو ہمارے ذہن کے قریب کرتا ہے۔ رہی ان کی اصل حقیقت تو اس کا علم صرف اللہ کو ہے۔ دوزخ کے مہل، یا جنت کے کنگن اور سندس اور استبرق کی حقیقت یہاں نہیں معلوم کی جا سکتی۔ یہ امر بھی ملحوظ رہے کہ قرآن ان چیزوں کے بیان میں اہلِ عرب ہی کی معلومات اور انہی کے ذوق کو ملحوظ رکھتا ہے اس لیے کہ تشبیہ و تمثیل میں مؤثر وہی چیزیں ہوتی ہیں جن سے مخاطب واقف ہوں۔

۶۔ آگے کا مضمون ـــــ آیات ۳۲-۴۴

مومن اور کافر کی ذہنیت کی تمثیل

آگے دو شخصوں کی ایک تمثیل کے ذریعے سے مومن اور کافر دونوں کی ذہنیت واضح فرمائی ہے کہ مومن اس دنیا کو کس نگاہ سے دیکھتا ہے اور ایک کافر اس کو کس نگاہ سے دیکھتا ہے۔ اس تمثیل سے یہ حقیقت بالکل واضح ہو کر سامنے آگئی ہے کہ جو لوگ قرآن اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کر رہے تھے ان کا اصل مغالطہ کیا تھا۔ وہ درحقیقت اپنی اس دنیا کی کامیابی کو اپنے فکر و عمل کی صحت و صداقت کی دلیل سمجھ بیٹھے اور جب مسلمان ان کو خدا اور آخرت سے ڈراتے تو وہ کہتے کہ جب دنیوی اعتبار سے ہمارا حال تم سے اچھا ہے تو لازماً ہمارا ہی عقیدہ اور ہمارا ہی طریقہ بھی اچھا ہے۔ پھر وہ یہیں سے یہ نتیجہ بھی نکال لیتے کہ اول تو آخرت و قیامت وغیرہ محض ایک ہوا ہے اور بالفرض ہو بھی تو ہم وہاں بھی تم سے اچھے ہی رہیں گے۔ اس روشنی میں آگے

کی آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۳۲-۴۴

وَاضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلًا رَّجُلَيْنِ جَعَلْنَا لِاَحَدِهِمَا جَنَّتَيْنِ مِنْ
اَعْنَابٍ وَّحَفَفْنٰهُمَا بِنَخْلٍ وَّجَعَلْنَا بَيْنَهُمَا زَرْعًا ﴿۳۲﴾ كِلْتَا الْجَنَّتَيْنِ
اٰتَتْ اُكُلَهَا وَلَمْ تَظْلِمْ مِّنْهُ شَيْئًا ۙ وَّفَجَّرْنَا خِلٰلَهُمَا نَهَرًا ﴿۳۳﴾ وَّ
كَانَ لَهٗ ثَمَرٌ ۚ فَقَالَ لِصَاحِبِهٖ وَهُوَ يُحَاوِرُهٗٓ اَنَا اَكْثَرُ مِنْكَ مَالًا
وَّاَعَزُّ نَفَرًا ﴿۳۴﴾ وَدَخَلَ جَنَّتَهٗ وَهُوَ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ ۚ قَالَ مَآ اَظُنُّ
اَنْ تَبِيْدَ هٰذِهٖٓ اَبَدًا ﴿۳۵﴾ وَّمَآ اَظُنُّ السَّاعَةَ قَآئِمَةً ۙ وَّلَئِنْ رُّدِدْتُّ
اِلٰى رَبِّىْ لَاَجِدَنَّ خَيْرًا مِّنْهَا مُنْقَلَبًا ﴿۳۶﴾ قَالَ لَهٗ صَاحِبُهٗ وَهُوَ
يُحَاوِرُهٗٓ اَكَفَرْتَ بِالَّذِىْ خَلَقَكَ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ سَوّٰىكَ
رَجُلًا ﴿۳۷﴾ لٰكِنَّا۠ هُوَ اللّٰهُ رَبِّىْ وَلَآ اُشْرِكُ بِرَبِّىْٓ اَحَدًا ﴿۳۸﴾ وَلَوْلَآ اِذْ
دَخَلْتَ جَنَّتَكَ قُلْتَ مَا شَآءَ اللّٰهُ ۙ لَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ ۚ اِنْ تَرَنِ اَنَا
اَقَلَّ مِنْكَ مَالًا وَّوَلَدًا ﴿۳۹﴾ فَعَسٰى رَبِّىْٓ اَنْ يُّؤْتِيَنِ خَيْرًا مِّنْ جَنَّتِكَ
وَيُرْسِلَ عَلَيْهَا حُسْبَانًا مِّنَ السَّمَآءِ فَتُصْبِحَ صَعِيْدًا زَلَقًا ﴿۴۰﴾ اَوْ
يُصْبِحَ مَآؤُهَا غَوْرًا فَلَنْ تَسْتَطِيْعَ لَهٗ طَلَبًا ﴿۴۱﴾ وَاُحِيْطَ بِثَمَرِهٖ
فَاَصْبَحَ يُقَلِّبُ كَفَّيْهِ عَلٰى مَآ اَنْفَقَ فِيْهَا وَهِىَ خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا
وَيَقُوْلُ يٰلَيْتَنِىْ لَمْ اُشْرِكْ بِرَبِّىْٓ اَحَدًا ﴿۴۲﴾ وَلَمْ تَكُنْ لَّهٗ فِئَةٌ
يَّنْصُرُوْنَهٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَمَا كَانَ مُنْتَصِرًا ﴿۴۳﴾ هُنَالِكَ الْوَلَايَةُ
لِلّٰهِ الْحَقِّ ۭ هُوَ خَيْرٌ ثَوَابًا وَّخَيْرٌ عُقْبًا ﴿۴۴﴾ ع ۵

ترجمۂ آیات ۳۲-۴۴

اور ان کو دو شخصوں کی تمثیل سناؤ۔ ان میں سے ایک کے لیے ہم نے انگوروں کے دو

باغ بنائے، ان کو کھجوروں کی قطار سے گھیرا اور ان کے درمیان کھیتی کے قطعات بھی رکھے۔ دونوں باغ خوب پھل لائے، ان میں ذرا کمی نہیں کی۔ اور ان کے بیچ بیچ میں ہم نے نہر بھی دوڑا دی۔ اور اس کے پھلوں کا موسم ہوا تو اس نے اپنے ساتھی سے بحث کرتے ہوئے کہا، میں تم سے مال میں بھی زیادہ اور تعداد کے اعتبار سے بھی زیادہ طاقت ور ہوں۔ اور وہ اپنے باغ میں اس حال میں داخل ہوا کہ وہ اپنی جان پر آفت ڈھا رہا تھا۔ اس نے کہا کہ میں یہ گمان نہیں کرتا کہ یہ کبھی برباد ہو جائے گا۔ اور میں قیامت کے آنے کا بھی گمان نہیں رکھتا اور اگر میں اپنے رب کی طرف لوٹایا ہی گیا تو اس سے بھی بہتر مرجع پاؤں گا۔ ۳۲-۳۶

اس کے ساتھی نے بحث کرتے ہوئے کہا، کیا تم نے اس ذات کا انکار کیا جس نے تم کو مٹی سے بنایا، پھر پانی کی ایک بوند سے، پھر تم کو ایک مرد بنا کر کھڑا کیا۔ لیکن میرا رب تو وہی اللہ ہے اور میں اپنے رب کا کسی کو شریک نہیں ٹھہراتا۔ اور جب تم اپنے باغ میں داخل ہوئے تو تم نے یوں کیوں نہ کہا کہ یہ جو کچھ ہے سب اللہ کا فضل ہے۔ اللہ کے بدون کسی کو کوئی قوت حاصل نہیں۔ اگر تم مال و اولاد کے اعتبار سے مجھے اپنے سے کم دیکھتے ہو تو امید ہے کہ میرا رب تمہارے باغ سے بہتر باغ مجھے دے اور تمہارے باغ پر آسمان سے کوئی ایسی گردش بھیجے کہ وہ چٹیل میدان ہو کر رہ جائے۔ یا اس کا پانی نیچے اتر جائے اور تم اس کو کسی طرح نہ پا سکو۔ ۳۷-۴۱

اور اس کے پھلوں پر آفت آئی تو جو کچھ اس نے اس پر خرچ کیا تھا اس پر ہاتھ ملتا رہ گیا اور وہ باغ اپنی ٹٹیوں پر گرا پڑا تھا۔ اور وہ کہہ رہا تھا کہ اے کاش! میں کسی کو اپنے رب کا شریک نہ بناتا۔ اور اس کے پاس نہ تو کوئی جتھا تھا جو خدا کے مقابلے میں اس کی مدد کرتا اور نہ وہ خود ہی انتقام لینے والا بن سکا۔ اس وقت سارا اختیار صرف خدائے برحق ہی کا ہے اور وہ بہترین اجر

اور بہترین انجام والا ہے۔ ۴۱-۴۴

۷- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَاضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلًا رَّجُلَيْنِ جَعَلْنَا لِأَحَدِهِمَا جَنَّتَيْنِ مِنْ أَعْنَابٍ وَّحَفَفْنٰهُمَا بِنَخْلٍ وَّجَعَلْنَا بَيْنَهُمَا زَرْعًا۔ (۳۲)

قریش کے سامنے تمثیل کا آئینہ

یہ قریش کے متمردین کو ایک تمثیل سنائی جا رہی ہے تاکہ وہ اس کے آئینہ میں اپنا ظاہر و باطن بھی دیکھ لیں اور اس کشمکش حق و باطل کا انجام بھی ان کے سامنے آجائے جو ان کے اور مسلمانوں کے درمیان برپا تھی۔ یہ تمثیل دو ایسے شخصوں کی ہے جن میں سے ایک کو خدا نے دو بہترین باغ دیے تھے اور دوسرے کو اگرچہ اس قسم کی کوئی متاع حاصل نہیں تھی لیکن اس کا سینہ ایمان کی دولت سے مالا مال اور دل خدا کی معرفت سے باغ باغ تھا۔

دو باغوں کا ذکر تکمیلِ نعمت کی تعبیر کے لیے

دو باغوں کا ذکر تکمیلِ نعمت کے اظہار کے لیے ہے۔ سورۂ رحمان میں اہلِ جنت کے لیے بھی دو جنتوں کا ذکر آتا ہے۔ اس سے مقصود تکمیلِ نعمت ہے۔ اہلِ عرب کے نزدیک بہترین باغ کا دستور یہ تھا کہ انگوروں کا باغ ہو، کنارے کنارے کھجوروں کے درخت ہوں جو پھل بھی دیں، باغ کی خوب صورتی میں بھی اضافہ کریں اور سموم وغیرہ کی آفتوں سے باغ کی حفاظت بھی کریں۔ علاوہ ازیں باغ میں چھوٹے چھوٹے زراعتی قطعات بھی ہوں جن میں موسم کے لحاظ سے ضروری چیزوں کی کاشت کی جا سکے اور بیچ میں نہر ہو جس کی نالیاں باغ کے ہر گوشے میں دوڑا دی گئی ہوں۔

كِلْتَا الْجَنَّتَيْنِ اٰتَتْ اُكُلَهَا وَلَمْ تَظْلِمْ مِّنْهُ شَيْئًا وَّفَجَّرْنَا خِلٰلَهُمَا نَهَرًا۔ (۳۳)

جس کو اس طرح کا باغ حاصل ہو وہ بھی ایک چھوڑ دو دو، اسے دنیا میں اور کیا چاہیے۔ فرمایا کہ دونوں باغوں نے خوب پھل دیے، ذرا کمی نہیں کی۔ باغ کے بیچ میں نہر جاری تھی جو اس کی شادابی، طراوت اور زرخیزی کی ضامن تھی۔

وَّكَانَ لَهُ ثَمَرٌ فَقَالَ لِصَاحِبِهِ وَهُوَ يُحَاوِرُهُ اَنَا اَكْثَرُ مِنْكَ مَالًا وَّاَعَزُّ نَفَرًا۔ (۳۴)

نعمت پاکر ناشکری

اب یہ بتایا کہ اس نعمت کو پاکر اس نعمت والے نے رویہ کیا اختیار کیا۔ ہونا تو یہ تھا کہ اس کا بال بال اس رب کا شکر گزار ہوتا جس نے اس کو یہ نعمت بخشی لیکن ہوا یہ کہ جب اس کے ساتھی نے اس کو خدا کا شکر گزار اور فرمانبردار بندہ بننے کی نصیحت کی اور ناشکری کے انجام اور خدا کے قہر و غضب سے ڈرایا تو اس نے بحث شروع کر دی کہ بتاؤ تمہارا حال اچھا ہے یا میرا؟ میں مال میں بھی تم سے زیادہ اور میری جمعیت بھی تمہاری جمعیت سے

تری، تو تم مجھے کیا ڈراتے ہو، مجھے جو کچھ حاصل ہے یہ خود اس امر کی ایک ناقابلِ انکار شہادت ہے کہ تمھارے عقیدہ و عمل سے میرا عقیدہ و عمل زیادہ صحیح ہے۔

'وَکَانَ لَہٗ ثَمَرٌ' سے اس بات کی طرف اشارہ ہو رہا ہے کہ یہ بحث فصل کی تیاری کے زمانے میں ہوئی۔ ظاہر ہے کہ دولت کا نشہ باغ والے کے اندر پھلوں کی تیاری کے زمانے میں دوچند ہو جاتا ہے۔

وَدَخَلَ جَنَّتَهُ وَهُوَ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهِ قَالَ مَا أَظُنُّ أَن تَبِيدَ هَٰذِهِ أَبَدًا ۝ وَمَا أَظُنُّ السَّاعَةَ قَائِمَةً وَلَئِن رُّدِدتُّ إِلَىٰ رَبِّي لَأَجِدَنَّ خَيْرًا مِّنْهَا مُنقَلَبًا (۳۵-۳۶)

'ظَالِمٌ لِّنَفْسِہٖ' کا مفہوم

'ظَالِمٌ لِّنَفْسِہٖ' یعنی وہ اپنی دولت و ثروت پر غرور کرتا اور اکڑتا ہوا اپنے باغ میں داخل ہوا اور بولا کہ میں کبھی یہ گمان نہیں کر سکتا کہ میرا یہ باغ تباہ ہو جائے گا۔ قیامت و آخرت اول تو ہے نہیں لیکن اگر ہوئی، جیسا کہ یہ ملا ڈراتا ہے تو میں بہرحال وہاں اس سے بھی زیادہ بہتر زندگی پاؤں گا۔

قَالَ لَهُ صَاحِبُهُ وَهُوَ يُحَاوِرُهُ أَكَفَرْتَ بِالَّذِي خَلَقَكَ مِن تُرَابٍ ثُمَّ مِن نُّطْفَةٍ ثُمَّ سَوَّاكَ رَجُلًا (۳۷)

بندۂ مومن کی سرزنش

بندۂ مومن نے یہ اس متکبر کے استکبار اور انکارِ قیامت پر معارضہ کیا کہ اگر تم قیامت کے منکر ہو تو یہ کفر ہے۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ مرنے کے بعد خدا دوبارہ زندہ نہیں کر سکتا؟ کیا تم نے خود اپنی ہستی پر غور نہیں کیا کہ تم جس آدم کی اولاد ہو خدا نے ان کو مٹی سے بنایا، پھر پانی کی ایک بوند سے اولادِ آدم کی تخلیق کا سلسلہ شروع کیا اور اسی پانی کی بوند سے تمھیں ایک بھلا چنگا مرد بنا کھڑا کیا۔ اگر خدا کی یہ قدرت دیکھتے ہو تو اس بات کو کیوں بعید سمجھتے ہو کہ خدا تمھیں دوبارہ اٹھا کھڑا کرے! یہ تو صریحاً خدا کی قدرت و حکمت کا انکار ہے جو کفر ہے۔

لَّٰكِنَّا هُوَ اللَّهُ رَبِّي وَلَا أُشْرِكُ بِرَبِّي أَحَدًا (۳۸)

شرک کا مخفی خناس

یہ بندۂ مومن نے اپنا عقیدہ بیان کیا ہے جس سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ ایمان کے لیے صرف خدا کو مان لینا ہی کافی نہیں ہے بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ خدا ہی کو اپنا رب، پروردگار اور آقا و مالک بھی مانے۔ اگر کوئی شخص اللہ کا اقرار کرتا ہے لیکن رب دوسروں کو بھی مانتا ہے تو وہ مشرک ہے۔ اور یہ شرک بھی کفر ہے۔ اگر کوئی شخص اپنے مال و جاہ پر مغرور ہے، اس کو اپنی قابلیت کا ثمرہ و نتیجہ اور اپنے استحقاقِ ذاتی کا کرشمہ خیال کرتا ہے اور یہ خناس اس کے دماغ میں سمایا ہوا ہے کہ اس کو اس سے کوئی چھین نہیں سکتا تو یہ بھی شرک ہے اس لیے کہ ایسا شخص اپنے آپ کو خدا کی خدائی میں ساجھی سمجھتا ہے۔ توحید کا مطالبہ یہ ہے کہ بندہ کو جو نعمت بھی ملے اس کو خدا کا فضل و عطیہ سمجھے، اس کے لیے برابر اپنے رب کا شکرگزار رہے، اس کے باب میں اپنے آپ کو خدا کے آگے مسئول سمجھے اور یہ عقیدہ رکھے کہ خدا جب چاہے اس نعمت کو چھین سکتا ہے۔

وَلَوْلَا إِذْ دَخَلْتَ جَنَّتَكَ قُلْتَ مَا شَاءَ اللَّهُ لَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللَّهِ ۚ إِن تَرَنِ أَنَا أَقَلَّ مِنكَ مَالًا وَوَلَدًا (۳۹)

ایمان کا تقاضا

یہ بندۂ مومن نے اس متکبر کو ایمان کا صحیح تقاضا بتایا ہے کہ اگر تم نے مجھے مال و اولاد میں اپنے سے کمتر پایا تھا تو یہ چیز اکڑنے اور مغرور ہونے کی نہیں تھی بلکہ اس پر تمہیں اپنے رب کا شکر گزار ہونا تھا کہ تمہارے رب نے تم کو اپنے فضل سے نوازا۔ اس کا حق یہ تھا کہ جب تم اپنے ہرے بھرے، میووں سے لدے باغ میں داخل ہوتے تو مَا شَآءَ اللّٰهُ لَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ کہتے یعنی یہ اعتراف کرتے کہ یہ سب کچھ رب کریم کا عطیہ ہے، اس کے بغیر کسی کو کوئی قوت و طاقت حاصل نہیں کہ کچھ بنا یا بگاڑ سکے۔

'انا' یہاں دونوں مفعولوں کے درمیان بطور ایک فاصل کے آگیا ہے۔ اس کو جملہ سے براہ راست تعلق نہیں ہے۔ اس قسم کے زائد استعمال کی مثالیں کلام عرب میں بھی موجود ہیں اور ہماری اپنی زبان میں بھی۔

فَعَسٰى رَبِّيْٓ اَنْ يُّؤْتِيَنِ خَيْرًا مِّنْ جَنَّتِكَ وَيُرْسِلَ عَلَيْهَا حُسْبَانًا مِّنَ السَّمَآءِ فَتُصْبِحَ صَعِيْدًا زَلَقًا (۴۰)

'حُسبان' کا مفہوم

'حُسْبَان'، 'حُسْبَانَة' کی جمع ہے۔ 'حسبانہ' کڑک اور اولے کو کہتے ہیں۔

'زلق' کا مفہوم

'زَلَق' اس زمین کو کہتے ہیں جو بالکل چٹیل، سبزہ اور روئیدگی سے یک قلم محروم ہو۔ یعنی اگر تم نے میری غربت پر مغرورانہ طعن کیا ہے تو کچھ بعید نہیں کہ میرا رب مجھے تمہارے باغ سے بہتر باغ دے اور تمہارے باغ پر کڑک اور اولے کا کوئی آسمانی عذاب بھیج دے اور وہ ایک چٹیل میدان ہو کے رہ جائے۔

اَوْ يُصْبِحَ مَآؤُهَا غَوْرًا فَلَنْ تَسْتَطِيْعَ لَهٗ طَلَبًا (۴۱)

'غار الماء غورا' کے معنی ہیں پانی زمین میں نیچے اتر گیا۔

یعنی رعد اور اولے نہ سہی، یہ نہر جاری جس سے باغ سیراب ہوتا ہے اگر زمین میں غائب ہو جائے تو تم یا کوئی دوسرا کیا کر سکتا ہے۔

مغروروں کی آنکھ کا پردہ

اوپر متکبر کا قول گزرا ہے کہ مَآ اَظُنُّ اَنْ تَبِيْدَ هٰذِهٖٓ اَبَدًا۔ اس نے اپنے شاداب اور پھلوں سے لدے ہوئے باغ کو دیکھ کر کہا کہ میں یہ گمان بھی نہیں کر سکتا کہ یہ کبھی تباہ ہو جائے گا۔ یہی ذہن دنیا کے تمام مغروروں اور متکبرین کا ہوتا ہے۔ ان کو جو چین اور عیش حاصل ہوتا ہے وہ اس میں اس طرح کھو جاتے ہیں کہ ان کے اوپر یہ تصور بڑا شاق گزرتا ہے کہ اس میں کہیں سے کوئی رخنہ بھی پیدا ہو سکتا ہے۔ اس وجہ سے اگر کوئی ان کو خواب غفلت سے جگانے کی کوشش کرتا ہے تو وہ حیران ہوتے ہیں کہ آخر ان کے قلعہ میں دراڑ پیدا ہونے کا کیا امکان ہے! لیکن جب وقت آجاتا ہے، قدرت ایک ہی جنبش میں سارے قلعہ کو زمین بوس کر کے رکھ دیتی ہے اور اس وقت سب کو نظر آجاتا ہے کہ جس چیز کو اتنی بعید سمجھے تھے وہ بالکل پاؤں کے نیچے سے برآمد ہو گئی۔ اسی حقیقت کی طرف عبد مومن نے توجہ دلائی۔

وَاُحِيْطَ بِثَمَرِهٖ فَاَصْبَحَ يُقَلِّبُ كَفَّيْهِ عَلٰى مَآ اَنْفَقَ فِيْهَا وَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا وَيَقُوْلُ يٰلَيْتَنِيْ لَمْ اُشْرِكْ بِرَبِّيْٓ اَحَدًا (۴۲)

'احیط بالشیٔ' کے معنی ہیں وہ چیز تباہ کردی گئی۔

ندامت بعد از وقت

بالآخر وہی ہوا جس سے بندۂ مومن نے ڈرایا تھا۔ کوئی آفت ارضی یا سماوی آئی اور اس نے سارے باغ کو آناً فاناً تباہ کر کے رکھ دیا۔ جن ٹٹیوں پر انگور کی بیلیں چڑھائی گئی تھیں وہ فرش زمین ہوگئیں اور سارا باغ ڈھے گیا۔ اب مغرور کی آنکھیں کھلیں، اس کو نظر آیا کہ جس باغ کی تباہی کو وہ بعید از امکان سمجھتا تھا وہ پلک جھپکتے یوں غارت ہو کے رہ گیا۔ تباہ شدہ باغ ایک میت کی طرح سامنے تھا اور وہ اس کی لاش پر کھڑا اپنے دونوں ہاتھ مل رہا تھا کہ اس سے کچھ بازیافت ہونی تو الگ رہی جو کچھ اس کے رکھ رکھاؤ پر خرچ کیا وہ بھی برباد ہوا۔ اس وقت اسے اپنے ناصح کی بات یاد آئی اور نہایت حسرت کے ساتھ بولا کہ کاش میں کسی کو اپنے رب کا شریک نہ بناتا۔

گھمنڈ شرک ہے

'اپنے رب کا شریک نہ بناتا' یعنی غرور اور گھمنڈ میں مبتلا ہو کر اس خبط میں نہ پڑتا کہ یہ سب کچھ میری قابلیت و صلاحیت کا کرشمہ اور میرے استحقاقِ ذاتی کا ثمرہ ہے بلکہ اس کو اپنے رب کا فضل سمجھتا اور اسی کا شکر گزار رہتا۔

وَلَمْ تَكُن لَّهُ فِئَةٌ يَنصُرُونَهُ مِن دُونِ اللَّهِ وَمَا كَانَ مُنتَصِرًا (۴۳)

یعنی جب عذاب آیا تو نہ وہ پارٹی کام آئی جس پر ناز تھا اور جس کے اعتماد پر کہا تھا۔ أَنَا أَكْثَرُ مِنكَ مَالًا وَأَعَزُّ نَفَرًا، اور نہ اپنے ہی اندر اتنا بل بوتا تھا کہ انتقام کے لیے اٹھ سکے۔

هُنَالِكَ الْوَلَايَةُ لِلَّهِ الْحَقِّ هُوَ خَيْرٌ ثَوَابًا وَخَيْرٌ عُقْبًا (۴۴)

بدوں پر عذاب نیکوں کی دادرسی ہے۔

'ھُنَالِکَ' کا اشارہ ساعت عذاب کے ظہور کی طرف ہے۔ یعنی جب وہ وقت آجائے گا تو پھر تمام اختیار خدائے برحق ہی کے ہاتھ میں ہوگا۔ کسی دوسرے کی کچھ پیش نہیں جائے گی، اور وہ اپنے صالح بندوں کو بہترین ثواب اور بہتر انجام سے نوازے گا۔ اوپر بدکاروں کے انجام کا ذکر ہو چکا تھا اس وجہ سے یہاں صرف خوب کاروں کے انجام کا ذکر ہوا۔ نیز یہ حقیقت بھی یاد رکھنی چاہیے کہ عذاب دنیا ہو یا عذاب آخرت اس سے اصل مقصود نیکوں کی دادرسی ہے۔ بدوں کو سزا دینا اس کا اصل مقصد نہیں بلکہ لازمی نتیجہ ہے۔

۸۔ آگے کا مضمون ___ آیات ۴۵-۴۹

آگے اس دنیا کی زندگی کی تمثیل پیش کی ہے جس کی محبت میں اندھے ہو کر یہ سرگشتگان غفلت قرآن اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی باتیں سننے کے لیے تیار نہیں تھے۔ فرمایا کہ اس دنیا کی جتنی زینتیں ہیں ان میں سے کوئی چیز بھی ساتھ جانے والی نہیں ہے، صرف آدمی کے اعمال صالحہ اس کے ساتھ جائیں گے تو جس کو کمائی کرنی ہو وہ اعمال صالحہ کی کمائی کرے۔ آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۴۵-۴۹

وَاضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا كَمَآءٍ اَنْزَلْنٰهُ مِنَ السَّمَآءِ
فَاخْتَلَطَ بِهٖ نَبَاتُ الْاَرْضِ فَاَصْبَحَ هَشِيْمًا تَذْرُوْهُ الرِّيٰحُ ؕ
وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ مُّقْتَدِرًا ﴿۴۵﴾ اَلْمَالُ وَالْبَنُوْنَ زِيْنَةُ
الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَالْبٰقِيٰتُ الصّٰلِحٰتُ خَيْرٌ عِنْدَ رَبِّكَ ثَوَابًا
وَّخَيْرٌ اَمَلًا ﴿۴۶﴾ وَيَوْمَ نُسَيِّرُ الْجِبَالَ وَتَرَى الْاَرْضَ بَارِزَةً ۙ
وَّحَشَرْنٰهُمْ فَلَمْ نُغَادِرْ مِنْهُمْ اَحَدًا ﴿۴۷﴾ وَعُرِضُوْا عَلٰى رَبِّكَ
صَفًّا ؕ لَقَدْ جِئْتُمُوْنَا كَمَا خَلَقْنٰكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ ۢ بَلْ زَعَمْتُمْ اَلَّنْ
نَّجْعَلَ لَكُمْ مَّوْعِدًا ﴿۴۸﴾ وَوُضِعَ الْكِتٰبُ فَتَرَى الْمُجْرِمِيْنَ
مُشْفِقِيْنَ مِمَّا فِيْهِ وَيَقُوْلُوْنَ يٰوَيْلَتَنَا مَالِ هٰذَا الْكِتٰبِ لَا
يُغَادِرُ صَغِيْرَةً وَّلَا كَبِيْرَةً اِلَّآ اَحْصٰىهَا ۚ وَوَجَدُوْا مَا عَمِلُوْا
حَاضِرًا ؕ وَلَا يَظْلِمُ رَبُّكَ اَحَدًا ﴿۴۹﴾ ع ۶ ۵ ۱۸

ترجمہ آیات ۴۵-۴۹

اور ان کو اس دنیوی زندگی کی تمثیل سناؤ کہ اس کو یوں سمجھو کہ بارش ہو جس کو ہم نے آسمان سے اتارا، پس زمین کی نباتات اس سے خوب اپجیں پھر وہ چورا ہو جائیں جس کو ہوائیں اڑائے لیے پھریں اور اللہ ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے۔ مال و اولاد دنیوی زندگی کی زینت ہیں اور باقی رہنے والے اعمال صالحہ باعتبار ثواب اور باعتبار امید تمھارے رب کے نزدیک بہتر ہیں۔ اس دن کا خیال کرو جس دن ہم پہاڑوں کو چلا دیں گے اور تم زمین کو دیکھو گے کہ بالکل عریاں ہو گئی ہے اور ہم ان کو اکٹھا کریں گے تو ان میں سے کسی کو چھوڑیں گے نہیں۔ اور وہ سب کے سب صف بستہ تیرے رب کے حضور پیش کیے جائیں گے۔ ہم کہیں گے تم ہمارے پاس اسی طرح آئے ہو

جس طرح ہم نے تم کو پہلی بار پیدا کیا بلکہ تم نے گمان کیا کہ ہم تمھارے حساب کے لیے کوئی یوم موعود نہیں مقرر کریں گے۔ اور رجسٹر پیش کیا جائے گا تو تم مجرموں کو دیکھو گے کہ جو کچھ اس میں ہے اس سے لرزاں ہیں اور کہیں گے ہائے ہماری شامت! یہ رجسٹر عجب ہے جس نے نہ کوئی چھوٹا گناہ نوٹ کرنے سے چھوڑا ہے نہ کوئی بڑا گناہ۔ اور جو کچھ انھوں نے کیا ہو گا سب موجود پائیں گے اور تیرا رب کسی پر کوئی ظلم نہیں کرے گا۔ ۴۵-۴۹۔

۹- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَاضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا كَمَآءٍ اَنْزَلْنٰهُ مِنَ السَّمَآءِ فَاخْتَلَطَ بِهٖ نَبَاتُ الْاَرْضِ فَاَصْبَحَ هَشِيْمًا تَذْرُوْهُ الرِّيٰحُ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ مُّقْتَدِرًا (۴۵)

اختلط بہ نبات الارض کا مفہوم

'اِخْتَلَطَ بِهٖ نَبَاتُ الْاَرْضِ' سے مطلب یہ ہے کہ زمین کی نباتات بارش کی بدولت خوب اپجیں اور اپنی کثرت اور اپنے زور کے باعث باہم دگر گتھم گتھا ہو جائیں۔

'دنیا کی زندگی' سے مراد

یہاں دنیا کی زندگی سے وہ زندگی مراد ہے جو اوپر والے پیرے میں زیر بحث آئی ہے۔ یعنی اس کی وہ زینتیں اور رونقیں جن پر فریفتہ ہو کر انسان خدا اور آخرت کو بھول بیٹھتا ہے۔ سورۂ حدید میں اس اجمال کی وضاحت فرما دی۔ ملاحظہ ہو۔

اِعْلَمُوْٓا اَنَّمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ وَّزِيْنَةٌ وَّتَفَاخُرٌۢ بَيْنَكُمْ وَتَكَاثُرٌ فِي الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ ۭ كَمَثَلِ غَيْثٍ اَعْجَبَ الْكُفَّارَ نَبَاتُهٗ ثُمَّ يَهِيْجُ فَتَرٰىهُ مُصْفَرًّا ثُمَّ يَكُوْنُ حُطٰمًا ۭ (۲۰- حدید)

یاد رکھو کہ دنیا کی زندگی، یعنی کھیل کود، آرائش و زیبائش، باہمی تفاخر اور مال و اولاد میں ایک دوسرے سے مسابقت کی تمثیل اس طرح ہے کہ بارش ہو جس کی اپجائی ہوئی نباتات کافروں کے دلوں کو موہ لیں۔ پھر وہ خشک ہو جائے اور تم دیکھو کہ وہ زرد پڑ گئی ہے پھر وہ چورا ہو جائے۔

دنیا کی زندگی کی تمثیل

اس آیت میں کئی چیزیں قابلِ بحث ہیں جن پر ہم ان کے محل میں گفتگو کریں گے۔ یہاں صرف اس حقیقت کی طرف توجہ دلانا مقصود ہے کہ دنیا کی جس زندگی کی تمثیل دی گئی ہے آیت میں اس کی وضاحت بھی فرما دی گئی ہے کہ اس سے مراد لہو و لعب اور تفاخر و تکاثر کی زندگی ہے جس میں پھنس کر امراء و اغنیاء تمام حقائق سے آنکھیں بند کر لیتے ہیں۔ عیش و تنعم، سنیما اور تھیٹر، کار اور کوٹھی، مال و جائداد، روپیہ اور بنک بیلنس، عہدے اور مناصب

کے سوا نہ کسی اور چیز کی ان کی نگاہوں میں کوئی قدر باقی رہ جاتی اور نہ کسی اور چیز کی طرف توجہ کرنے کے لیے ان کے پاس فرصت ہی ہوتی۔

اسی طرح آیت زیر بحث میں فرمایا کہ یہ دنیا کی جس زندگی پر ریجھے ہوئے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اس پر کبھی خزاں نہیں آئے گی، ان کو بتا دو کہ اس کی یہ بہار چند روزہ ہے۔ بارش نے وقتی رونق پیدا کر دی ہے۔ لیکن وہ وقت دور نہیں ہے جب اس پر خاک اڑتی نظر آئے گی۔ خدا ہر چیز پر قادر ہے۔ جس طرح اس نے یہ بہار دکھائی اسی طرح وہ اس کی خزاں بھی دکھا دے گا۔

اَلْمَالُ وَالْبَنُوْنَ زِيْنَةُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَالْبٰقِيٰتُ الصّٰلِحٰتُ خَيْرٌ عِنْدَ رَبِّكَ ثَوَابًا وَّخَيْرٌ اَمَلًا (۴۶)

خالی زینتیں

عرب میں چونکہ حمایت و مدافعت کا تمام تر انحصار خاندانی اور قبائلی عصبیت ہی پر تھا اس وجہ سے آدمی کی بڑائی کی علامتوں میں سے مال کے ساتھ اولاد کی کثرت بھی تھی۔ وہ اپنی باہمی مفاخرت کی مجلسوں میں کثرت اولاد کا ذکر خاص طور پر کرتے۔ اوپر جو مفاخرت مذکور ہوئی ہے اس میں بھی اَنَا اَكْثَرُ مِنْكَ مَالًا وَّاَعَزُّ نَفَرًا کے الفاظ اسی ذہن کی غمازی کر رہے ہیں۔

آیت کا مطلب یہ ہے کہ مال و اولاد جن کے عشق میں تم دیوانے ہو رہے ہو۔ یہ تو محض اس دنیا کی زینتیں ہیں اور یہ دنیا اور اس کی تمام زینتیں چند روزہ ہیں۔ ان میں سے کسی چیز کو بھی بقا اور پائداری حاصل نہیں۔ خدا کے ہاں اجر اور امید کے لحاظ سے بہتر وہ اعمالِ صالحہ ہیں جو ہمیشہ باقی رہنے والے ہیں۔ اگر امید باندھنی ہے تو ان سے باندھو۔ ابدی برکات و نتائج انہی سے حاصل ہوں گے۔

وَيَوْمَ نُسَيِّرُ الْجِبَالَ وَتَرَى الْاَرْضَ بَارِزَةً ۙ وَّحَشَرْنٰهُمْ فَلَمْ نُغَادِرْ مِنْهُمْ اَحَدًا (۴۷)

'وَتَرَى الْاَرْضَ بَارِزَةً' یعنی آج تو یہ زمین لدی پھندی نظر آتی ہے۔ اس میں پہاڑ گڑے ہوئے ہیں۔ عالیشان ایوان و محل کھڑے ہیں۔ یہ باغوں اور چمنوں سے آراستہ ہے لیکن ایک دن آئے گا کہ دوسری چیزوں کا تو کیا ذکر اس کے پہاڑ بھی اکھاڑ دیے جائیں گے اور یہ ایک صفاچٹ میدان بن جائے گی۔ اس کی ہر رونق اس سے چھین لی جائے گی۔ فرمایا کہ اس دن ہم سب کو اکٹھا کریں گے، کسی کو بھی نہیں چھوڑیں گے۔ نہ امیر کو، نہ غریب کو، نہ آقا کو، نہ غلام کو، نہ عابد کو نہ معبود کو۔

وَعُرِضُوْا عَلٰى رَبِّكَ صَفًّا ۭ لَقَدْ جِئْتُمُوْنَا كَمَا خَلَقْنٰكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍۢ ۡ بَلْ زَعَمْتُمْ اَلَّنْ نَّجْعَلَ لَكُمْ مَّوْعِدًا (۴۸)

خالی ہاتھ واپسی

اس دن سب کی پیشی تیرے رب کے حضور ہو گی صف بستہ۔ آج یہ اپنی امارت و ریاست کے گھمنڈ میں اکڑتے ہیں لیکن اس دن یہ غلاموں کی طرح اپنے رب کے آگے صف باندھے ہوئے حاضر ہوں گے اور ہم ان سے کہیں گے کہ دیکھ لو، جس طرح تم دنیا میں خالی ہاتھ گئے تھے اسی طرح آج خالی ہاتھ تم ہمارے پاس

حاضر ہو گئے۔ یعنی نہ آج تمہارے ساتھ تمہارے خدم و حشم ہیں اور نہ وہ اموال و اسباب جن پر تم دنیا میں نازاں تھے ' وَتَرَكْتُمْ مَّا خَوَّلْنٰكُمْ وَرَآءَ ظُهُوْرِكُمْ ' جو کچھ ہم نے تمہیں بخشا تھا وہ سب تم نے اپنے پیچھے چھوڑا۔ ' بَلْ زَعَمْتُمْ اَلَّنْ نَّجْعَلَ لَكُمْ مَّوْعِدًا ' یعنی اس بے بسی اور محرومی کا تو تمہیں بھلا کیا گمان ہوتا، تم تو اس زعم میں مبتلا تھے کہ تمہارے حساب کتاب کے لیے سرے سے کوئی دن ہی مقرر نہیں ہے۔

وَوُضِعَ الْكِتٰبُ فَتَرَى الْمُجْرِمِيْنَ مُشْفِقِيْنَ مِمَّا فِيْهِ وَيَقُوْلُوْنَ يٰوَيْلَتَنَا مَالِ هٰذَا الْكِتٰبِ لَا يُغَادِرُ صَغِيْرَةً وَّلَا كَبِيْرَةً اِلَّآ اَحْصٰهَا وَوَجَدُوْا مَا عَمِلُوْا حَاضِرًا وَلَا يَظْلِمُ رَبُّكَ اَحَدًا (۴۹)

دفتر اعمال

' اَلْكِتٰبُ ' سے مراد لوگوں کے اعمال کا دفتر ہے۔ فرمایا کہ یہ دفتر لوگوں کے سامنے لایا جائے گا اس وقت مجرم چونکہ اپنی کرتوتوں سے واقف ہوں گے، اس دفتر کے کھلنے سے لرزاں و ترساں ہوں گے اور جب وہ کھلے گا اور سب کا سارا کچا چٹھا سامنے آجائے گا تو وہ پکار اٹھیں گے کہ ہائے ہماری شامت! عجب ہے یہ کتاب کہ کوئی چھوٹی بڑی بات بھی اس کی گرفت سے باہر نہیں رہ گئی ہے اور وہ اپنا سارا کیا دھرا اپنے سامنے موجود پائیں گے۔ فرمایا کہ یہ اہتمام اس لیے ہوگا کہ تمہارا رب کسی پر ظلم کرنا نہیں چاہتا۔ وہ ہر ایک کو وہی کچھ دے گا جو اس نے کمایا ہوگا۔

۱۰۔ آگے کا مضمون ___ آیات ۵۰-۵۹

آگے آدمؑ و ابلیس کے ماجرے کا حوالہ دے کر قریش کو متنبہ کیا ہے کہ تم اس انکار و تکذیب میں بالکل سنت ابلیس کی پیروی کر رہے ہو۔ تم نے اسی ابلیس اور اس کی ذریت کو اپنا کارساز اور معبود بنا رکھا ہے جس نے قیامت تک کے لیے اولادِ آدم کو دشمنی کا چیلنج دے رکھا ہے۔ یہ تم نے خدا کو چھوڑ کر نہایت ہی برا بدل اپنے لیے تلاش کیا ہے۔ یہ قرآن جو تم کو سنایا جا رہا ہے، تمہارے لیے عظیم رحمت ہے۔ یہ حقیقت کو تمہارے سامنے گوناگوں پہلوؤں سے پیش کر رہا ہے کہ بات تمہارے ذہن نشین ہو جائے لیکن تم رحمت کی جگہ عذاب کے اور روٹی کے بجائے پتھر کے طالب ہو اور مطالبہ کر رہے ہو کہ جب تک وہ عذاب تم کو نہ دکھا دیا جائے جس سے قرآن تمہیں ڈرا تا ہے اس وقت تک تم اس کو ماننے کے لیے تیار نہیں ہو۔ آخر میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی کہ رسول کا کام عذاب لانا نہیں ہوتا بلکہ صرف انذار و تبشیر ہوتا ہے۔ تم اپنا فرض انجام دو اور ان لوگوں کو، جن کے دلوں پر پردے پڑ چکے ہیں ان کے حال پر چھوڑ دو، تمہارا رب غفور رحیم ہے اس وجہ سے ان کو مہلت دے رہا ہے۔ وہ اگر فوراً عذاب دینا چاہے تو ابھی ان کی کمر توڑ کے رکھ دے لیکن اس کے ہر کام میں حکمت ہوتی ہے تو اسی پر بھروسہ کرو اور صبر کے ساتھ اپنے کام میں لگے رہو ___ اس روشنی میں آگے کی آیات کی تلاوت کیجیے۔

وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ كَانَ آيات ٥٠-٥٩
مِنَ الْجِنِّ فَفَسَقَ عَنْ اَمْرِ رَبِّهٖ ؕ اَفَتَتَّخِذُوْنَهٗ وَذُرِّيَّتَهٗٓ اَوْلِيَآءَ
مِنْ دُوْنِيْ وَهُمْ لَكُمْ عَدُوٌّ ؕ بِئْسَ لِلظّٰلِمِيْنَ بَدَلًا ﴿٥٠﴾ مَآ اَشْهَدْتُّهُمْ
خَلْقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلَا خَلْقَ اَنْفُسِهِمْ ۪ وَمَا كُنْتُ مُتَّخِذَ
الْمُضِلِّيْنَ عَضُدًا ﴿٥١﴾ وَيَوْمَ يَقُوْلُ نَادُوْا شُرَكَآءِيَ الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ
فَدَعَوْهُمْ فَلَمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَهُمْ وَجَعَلْنَا بَيْنَهُمْ مَّوْبِقًا ﴿٥٢﴾ وَرَاَ
الْمُجْرِمُوْنَ النَّارَ فَظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ مُّوَاقِعُوْهَا وَلَمْ يَجِدُوْا عَنْهَا
مَصْرِفًا ﴿٥٣﴾ وَلَقَدْ صَرَّفْنَا فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لِلنَّاسِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ ؕ ع ۷ ۱۹
وَكَانَ الْاِنْسَانُ اَكْثَرَ شَيْءٍ جَدَلًا ﴿٥٤﴾ وَمَا مَنَعَ النَّاسَ اَنْ
يُّؤْمِنُوْٓا اِذْ جَآءَهُمُ الْهُدٰى وَيَسْتَغْفِرُوْا رَبَّهُمْ اِلَّآ اَنْ تَاْتِيَهُمْ
سُنَّةُ الْاَوَّلِيْنَ اَوْ يَاْتِيَهُمُ الْعَذَابُ قُبُلًا ﴿٥٥﴾ وَمَا نُرْسِلُ الْمُرْسَلِيْنَ
اِلَّا مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ ۚ وَيُجَادِلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِالْبَاطِلِ
لِيُدْحِضُوْا بِهِ الْحَقَّ وَاتَّخَذُوْٓا اٰيٰتِيْ وَمَآ اُنْذِرُوْا هُزُوًا ﴿٥٦﴾
وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ ذُكِّرَ بِاٰيٰتِ رَبِّهٖ فَاَعْرَضَ عَنْهَا وَنَسِيَ مَا
قَدَّمَتْ يَدٰهُ ؕ اِنَّا جَعَلْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ اَكِنَّةً اَنْ يَّفْقَهُوْهُ وَ
فِيْٓ اٰذَانِهِمْ وَقْرًا ؕ وَاِنْ تَدْعُهُمْ اِلَى الْهُدٰى فَلَنْ يَّهْتَدُوْٓا
اِذًا اَبَدًا ﴿٥٧﴾ وَرَبُّكَ الْغَفُوْرُ ذُو الرَّحْمَةِ ؕ لَوْ يُؤَاخِذُهُمْ بِمَا
كَسَبُوْا لَعَجَّلَ لَهُمُ الْعَذَابَ ؕ بَلْ لَّهُمْ مَّوْعِدٌ لَّنْ يَّجِدُوْا مِنْ

دُوْنِهٖ مَوْىِٕلًا ﴿۵۸﴾ وَتِلْكَ الْقُرٰٓى اَهْلَكْنٰهُمْ لَمَّا ظَلَمُوْا وَجَعَلْنَا
لِمَهْلِكِهِمْ مَّوْعِدًا ﴿۵۹﴾ ع

ترجمۂ آیات ۵۰-۵۹

اور یاد کرو جب ہم نے فرشتوں کو حکم دیا کہ آدمؑ کو سجدہ کرو تو سب نے سجدہ کیا مگر ابلیس نے، وہ جنوں میں سے تھا پس اس نے اپنے رب کے حکم کی نافرمانی کی۔ تو کیا تم اس کو اور اس کی ذرّیت کو میرے سوا اپنا کارساز بناتے ہو، درآنحالیکہ وہ تمہارے دشمن ہیں؛ ظالموں کے لیے کیا ہی بُرا بدل ہے! اور میں نے ان کو نہ تو آسمانوں اور زمین کے پیدا کرتے وقت بلایا اور نہ خود انہی کو پیدا کرتے وقت بلایا اور میں گمراہ کرنے والوں کو دست و بازو بنانے والا نہ تھا۔ ۵۰-۵۱

اور یاد کرو جس دن وہ فرمائے گا کہ بلاؤ تو میرے شریکوں کو جن کو تم نے میرا شریک گمان کیا تو وہ ان کو بلائیں گے لیکن وہ ان کو کوئی جواب نہ دیں گے اور ہم ان کے درمیان ایک مہلکہ حائل کر دیں گے اور مجرم دوزخ کو دیکھیں گے اور گمان کریں گے کہ وہ اسی میں گرنے والے ہیں اور وہ اس سے کوئی مفر نہیں پائیں گے۔ ۵۲-۵۳

اور ہم نے اس قرآن میں لوگوں کی رہنمائی کے لیے ہر قسم کی تنبیہات گوناگوں پہلوؤں سے بیان کر دی ہیں لیکن انسان سب سے زیادہ جھگڑالو واقع ہوا ہے اور لوگوں کو بعد اس کے کہ ان کے پاس خدا کی ہدایت آ چکی ہے، ایمان لانے اور اپنے رب سے مغفرت مانگنے سے نہیں روکا ہے مگر اس چیز نے کہ وہ چاہتے ہیں کہ خدا کا وہی معاملہ ان کے لیے بھی ظاہر ہو جائے جو اگلوں کے لیے ظاہر ہوا یا عذابِ الٰہی ان کے سامنے سے نمودار ہو جائے اور رسولوں کو تو ہم صرف خوش خبری دینے والا اور خبردار کرنے والا بنا کر بھیجتے ہیں۔ اور یہ کافر باطل کی مدد سے کٹ حجتیاں

کرتے ہیں کہ اس کے ذریعہ سے حق کو پسپا کر دیں اور انھوں نے میری آیات کو اور اس چیز کو جس سے ان کو ڈرایا گیا ہے، مذاق بنا رکھا ہے۔ اور ان سے بڑھ کر ظالم کون ہوگا جن کو ان کے رب کی آیات کے ذریعے سے یاددہانی کی جائے تو وہ اس سے اعراض کریں اور اپنے ہاتھوں کی کرتوت کو بھول جائیں اور ہم نے ان کے دلوں پر پردے ڈال دیے ہیں کہ وہ اس کو نہ سمجھیں اور ان کے کانوں میں ڈاٹ دے دی ہے کہ اس کو نہ سنیں سو اس وجہ سے تم ان کو ہدایت کی طرف کتنا ہی بلاؤ وہ کبھی ہدایت پانے والے نہیں ہیں۔ اور تمھارا رب بخشنے والا اور رحمت کرنے والا ہے۔ اگر وہ ان کے اعمال کی پاداش میں فوراً پکڑنا چاہتا تو ان پر فوراً عذاب بھیج دیتا لیکن ان کے لیے ایک مقررہ وقت ہے اور وہ اس کے مقابل میں کوئی پناہ کی جگہ نہیں پائیں گے۔ اور یہ بستیاں ہیں جن کو ہم نے ہلاک کر دیا جب کہ ان کے لوگوں نے اپنی جانوں پر ظلم ڈھائے اور ہم نے ان کی ہلاکت کے لیے ایک وقت مقرر کیا۔ ۵۰-۵۹۔

۱۱- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ۭ كَانَ مِنَ الْجِنِّ فَفَسَقَ عَنْ اَمْرِ رَبِّهٖ ۭ اَفَتَتَّخِذُوْنَهٗ وَذُرِّيَّتَهٗٓ اَوْلِيَاۗءَ مِنْ دُوْنِيْ وَهُمْ لَكُمْ عَدُوٌّ ۭ بِئْسَ لِلظّٰلِمِيْنَ بَدَلًا (۵۰)

ابلیس جنات میں سے تھا

آدم اور ابلیس کے ماجرے پر سورۂ بقرہ و اعراف میں تفصیل سے گفتگو ہو چکی ہے۔ یہاں ابلیس کی اصل و نسل سے متعلق اتنی بات یاد رکھنی چاہیے کہ وہ جنات ہی سے تھا۔ اس نے خدا کے حکم کی نافرمانی کی اور راندہ ہوا۔ ابلیس کوئی مستقل اور غیر فانی مخلوق نہیں ہے جیسا کہ بعض لوگ گمان کرتے ہیں بلکہ یہ اس جن کا لقب ہے جس نے حضرت آدم کو دھوکا دیا۔ حضرت آدم اور ان کی اولاد کے ساتھ اس کی دشمنی معلوم و مشہور ہے۔ اس کی ذریت اپنے جدِ اعلیٰ کے مشن کو پوری جہارت کے ساتھ پورا کر رہی ہے اور اس نے خود انسانوں میں سے انسانوں کو گمراہ کرنے کے لیے ایسے ایسے پرفن دجال جنت لیے ہیں کہ خود ابلیس بھی ان کو دیکھے تو ان کی کارروائی پر عش عش کر اٹھے اور ان کو داد دے کہ شاباش میرے فرزندو، خلقِ خدا کو گمراہ کرنے کے فن میں تم نے میرے بھی کان کتر لیے!

قریش کی ناعاقبت اندیشی پر اظہار افسوس

یہاں قریش کے متکبرین کو ابلیس اور اس کی ذریت کی اسی پشتینی عداوت کو یاد دلا کر ان کے حال پر افسوس کیا گیا ہے کہ تمہاری بدبختی کی انتہا ہے کہ تم نے ابلیس اور اس کی ذریت کو تو اپنا مرجع اور کارساز بنایا اور خدا کو چھوڑ بیٹھے۔ پھر ان سے منہ پھیر کر فرمایا کہ کیا ہی بُرا بدل ہے جس کو خدا کی جگہ ان ظالموں نے اپنے لیے اختیار کیا!

مشرکین عرب میں جنات کی پوجا

یہاں وہ بات یاد رکھنی چاہیے جس کا ذکر ہم سورۃ انعام کی تفسیر میں کر چکے ہیں کہ مشرکین عرب جنات کو مختلف شکلوں میں پوجتے تھے۔ وہ ہر وادی اور ہر پہاڑ کے الگ الگ جن اور بھوت مانتے اور ان کی آفتوں سے اپنے آپ کو محفوظ رکھنے کے لیے ان کی جے پکارتے اور ان کو نذرانے اور چڑھاوے پیش کرتے۔ بعض جن تو اتنے خطرناک سمجھے جاتے کہ ان کو راضی رکھنے کے لیے بدقسمت لوگ اپنی اولاد تک کی قربانی پیش کرتے۔ ان کا وہم یہ تھا کہ اگر اس جن کو اپنی کسی اولاد کی قربانی دے کر راضی نہ رکھا گیا تو وہ ساری اولاد کو چٹ کر جائے گا۔

قرآن نے اس آیت میں یہ یاد دلا کر کہ ابلیس جنوں میں سے تھا مشرکین کو غیرت دلائی کہ بے شرمو! جن کے مورث اعلیٰ نے تمہارے جد اعلیٰ کے ساتھ یہ کچھ دشمنی کی تم ان کے یوں مرید اور نیاز مند بن کے رہ گئے ہو!

شامت زدگی کی آخری حد

'بِئْسَ لِلظّٰلِمِيْنَ بَدَلًا' میں 'ظٰلِمِيْنَ' سے مراد مشرکین ہیں۔ یہ جملہ اظہار تعجب اور اظہار افسوس کا ہے کہ ان ظالموں نے خدا کا بدل بھی ڈھونڈا تو اپنے باپ اور ان کی ذریت کے ابدی دشمن کو! یہ شامت زدگی کی آخری حد ہے!

مَآ اَشْهَدْتُّهُمْ خَلْقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلَا خَلْقَ اَنْفُسِهِمْ وَمَا كُنْتُ مُتَّخِذَ الْمُضِلِّيْنَ عَضُدًا (۵۱)

طنزیہ اسلوب بیان

اس آیت کا اسلوب بیان طنزیہ ہے یعنی ان شیاطین کو اس فیاضی کے ساتھ میری خدائی اور میرے حقوق میں شریک بنا دیا گیا ہے حالانکہ نہ میں نے آسمانوں اور زمین کے پیدا کرتے وقت ان کو بلایا کہ ذرا اس مہم میں میری مدد کریں اور نہ خود انہی کو پیدا کرتے وقت ان کو دعوت دی کہ ذرا اس کام میں میرا ہاتھ بٹائیں اور نہ میں گمراہ کرنے والوں کو اپنا دست و بازو بنانے کا روادار تھا لیکن آج یہ میری خدائی میں اس طرح شریک بنا دیے گئے ہیں کہ گویا سارے کارنامے انہی کے انجام دیے ہوئے ہیں۔

وَيَوْمَ يَقُوْلُ نَادُوْا شُرَكَآءِيَ الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ فَدَعَوْهُمْ فَلَمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَهُمْ وَجَعَلْنَا بَيْنَهُمْ مَّوْبِقًا (۵۲)

'موبق' کا مفہوم

'موبق' کے معنی ہلاکت کا کھڈ، تباہی کا گڑھا۔

نفسی نفسی کا دن

یہ اس دن کی محرومی کو یاد دلایا ہے جس دن وہ ان مشرکین سے فرمائے گا کہ جن کو تم میرا شریک مانتے رہے ہو اب ان کو اپنی مدد کے لیے پکارو چنانچہ وہ ان کو پکاریں گے لیکن وہ کوئی جواب نہ دیں گے اس لیے کہ ان کو خود اپنی پڑی ہوگی، وہ دوسروں کے قضیے کیا نبیڑیں گے۔ فرمایا کہ ان کے درمیان ایک تباہی کا کھڈ حائل ہوگا، نہ یہ ان کے پاس جا سکیں گے اور نہ وہ ان کے پاس پہنچ سکیں گے۔

وَرَاَ الْمُجْرِمُوْنَ النَّارَ فَظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ مُّوَاقِعُوْهَا وَلَمْ يَجِدُوْا عَنْهَا مَصْرِفًا (۵۳)

اور یہ مجرم کھلی آنکھوں سے دیکھیں گے کہ سامنے جہنم تیار ہے اور اب لازماً ان کو اسی میں گرنا ہے لیکن وہ اس سے کوئی مفر نہیں پائیں گے۔ یہ ان کی بے بسی کی تصویر ہے کہ آنکھوں دیکھتے وہ اس جہنم میں گریں گے۔

بے بسی کی تصویر

وَلَقَدْ صَرَّفْنَا فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لِلنَّاسِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ ۭ وَكَانَ الْاِنْسَانُ اَكْثَرَ شَيْءٍ جَدَلًا (۵۴)

'مثل' سے مراد یہاں عالم غیب اور آخرت کے وہ حقائق ہیں جو تمثیل کے رنگ میں اوپر لوگوں کو متنبہ کرنے کے لیے سنائے گئے ہیں اور 'انسان' سے وہی جھگڑالو مخاطب ہیں جن سے یہاں بحث چل رہی ہے لیکن ان سے بیزاری کے اظہار کے لیے بات عام صیغہ سے کہہ دی گئی ہے۔

'مثل' سے مراد

فرمایا کہ ہم نے تو لوگوں کو متنبہ کرنے کے لیے ہر قسم کی تنبیہات اس قرآن میں گوناگوں پہلوؤں سے بیان کر دی ہیں لیکن انسان بڑا ہی جھگڑالو واقع ہوا ہے۔ وہ ان سے فائدہ اٹھانے کے بجائے کوئی نہ کوئی پہلو اعتراض کا ڈھونڈھ ہی لیتا ہے۔

وَمَا مَنَعَ النَّاسَ اَنْ يُّؤْمِنُوْٓا اِذْ جَاۗءَهُمُ الْهُدٰى وَيَسْتَغْفِرُوْا رَبَّهُمْ اِلَّآ اَنْ تَاْتِيَهُمْ سُنَّةُ الْاَوَّلِيْنَ اَوْ يَاْتِيَهُمُ الْعَذَابُ قُبُلًا (۵۵)

'الناس' سے مراد یہاں بھی وہی لوگ ہیں جن سے بحث چل رہی ہے اور 'قبل' کے معنی سامنے اور روبرو کے ہیں۔

مطلب یہ ہے کہ قرآن نے تو ہر قسم کی تنبیہات سنا دی ہیں، کوئی چیز مخفی نہیں رہ گئی ہے، لیکن جو لوگ حقیقت سے گریز کرنا چاہتے ہیں وہ کوئی نہ کوئی بہانہ ڈھونڈھ ہی لیتے ہیں۔ اب ان لوگوں کا یہ مطالبہ ہے کہ یا تو ان پر اسی طرح کی تباہی آ جائے جس طرح کی تباہی پچھلی قوموں پر آئی اور جس سے قرآن ڈرا رہا ہے یا کم از کم یہ کہ عذاب سامنے سے آتا دکھائی دے اور وہ اپنی آنکھوں سے اس کو دیکھ لیں۔ اس کے بغیر وہ اس ہدایت پر ایمان لانے اور توبہ و استغفار کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ قرآن ان کے آگے مائدۂ آسمانی بچھا رہا ہے لیکن یہ قہر آسمانی کے طلب گار ہیں! ایسے شامت زدوں کا بھلا کیا علاج! ان کو معلوم نہیں ہے کہ جب عذاب الٰہی نمودار ہو جائے گا تو وہ دیدار کر کے واپس نہیں چلا جائے گا بلکہ ان کا کچومر نکال کر رکھ دے گا تو اس کے بعد یہ کس چیز پر ایمان لائیں گے!

مائدۂ آسمانی کی جگہ قہر آسمانی کی طلب

وَمَا نُرْسِلُ الْمُرْسَلِيْنَ اِلَّا مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ ۚ وَيُجَادِلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِالْبَاطِلِ لِيُدْحِضُوْا بِهِ الْحَقَّ وَاتَّخَذُوْٓا اٰيٰتِيْ وَمَآ اُنْذِرُوْا هُزُوًا (۵۶)

یہ اوپر والے مطالبۂ عذاب کا جواب ہے۔ فرمایا کہ ہم رسولوں کو عذاب لانے کے لیے نہیں بھیجا کرتے بلکہ صرف انذار و تبشیر کے لیے بھیجا کرتے ہیں کہ وہ کافروں کو عذاب سے خبردار کریں اور ایمان لانے والوں کو جنت کی بشارت دے دیں۔ ان سے عذاب اور قیامت کو دکھا دینے کا مطالبہ کرنا ایک بالکل بے تکی بات اور حق کو

رسولوں کی بعثت کا مقصد

باطل کے ذریعے سے پسپا کرنے کے ہم معنی ہے۔ جو لوگ یہ شرارت کر رہے ہیں انھوں نے عذاب اور قیامت کی حقیقت نہیں سمجھی ہے۔ انھوں نے ہماری تنبیہی آیات اور خدا کی پکڑ کو مذاق بنا لیا ہے۔

وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنْ ذُكِّرَ بِآيَاتِ رَبِّهِ فَأَعْرَضَ عَنْهَا وَنَسِيَ مَا قَدَّمَتْ يَدَاهُ ۚ إِنَّا جَعَلْنَا عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ أَكِنَّةً أَنْ يَفْقَهُوهُ وَفِي آذَانِهِمْ وَقْرًا ۖ وَإِنْ تَدْعُهُمْ إِلَى الْهُدَىٰ فَلَنْ يَهْتَدُوا إِذًا أَبَدًا (۵۷)

بدقسمتوں کے حال پر افسوس

یہاں بدقسمت لوگوں کی حالت پر افسوس کیا ہے کہ اپنی جانوں پر ان سے بڑھ کر ظلم ڈھانے والا کون ہو سکتا ہے جن کو آیاتِ الٰہی کے ذریعے سے یاد دہانی کی جائے لیکن وہ اس سے نفع اٹھانے کے بجائے ان کو ٹھکرائیں اور عذاب کا مطالبہ کریں اور یہ نہ سوچیں کہ جو اعمال انھوں نے کیے ہیں ان کی بنا پر وہ ہر وقت عذابِ الٰہی کے سزاوار ہیں۔ اگر ان کو مہلت مل رہی ہے تو محض خدا کی رحمت کے سبب سے مل رہی ہے۔

ختم قلوب کی سزا

فرمایا کہ یہ اپنی کرتوتوں کے سبب سے ختم قلوب کے سزاوار ہو چکے ہیں اس وجہ سے ہم نے ان کے دلوں پر پردے ڈال دیے ہیں کہ وہ قرآن کو نہ سمجھیں اور ان کے کانوں میں ڈاٹ دے دی ہے کہ وہ اس کو نہ سنیں گویا اصل تالیفِ کلام یوں ہوگی۔ 'أَكِنَّةً أَنْ يَفْقَهُوهُ وَفِي آذَانِهِمْ وَقْرًا مِنْ أَنْ يَسْمَعُوهُ' عربیت کے معروف قاعدے کے مطابق 'أَنْ' سے پہلے 'مِنْ' یا 'كَرَاهَةً' کا لفظ محذوف ہو گیا اور تقابل کے اصول پر 'فِي آذَانِهِمْ وَقْرًا' کے بعد 'أَنْ يَسْمَعُوهُ' کے الفاظ حذف ہو گئے۔

'وَإِنْ تَدْعُهُمْ إِلَى الْهُدَىٰ فَلَنْ يَهْتَدُوا إِذًا أَبَدًا'۔ ظاہر ہے کہ جب خدا کے قانون کے تحت ان کے دلوں پر پردے پڑ چکے ہیں اور ان کے کان بہرے ہو چکے ہیں تو اب تم ان کو لاکھ اللہ کی آیات سناؤ وہ ہدایت قبول کرنے والے نہیں بن سکتے۔ اب ان کا معاملہ اللہ کے حوالے کرو اور صبر کے ساتھ اپنے کام میں لگے رہو تا آنکہ ان پر اچھی طرح حجت تمام ہو جائے۔

وَرَبُّكَ الْغَفُورُ ذُو الرَّحْمَةِ ۖ لَوْ يُؤَاخِذُهُمْ بِمَا كَسَبُوا لَعَجَّلَ لَهُمُ الْعَذَابَ ۚ بَلْ لَهُمْ مَوْعِدٌ لَنْ يَجِدُوا مِنْ دُونِهِ مَوْئِلًا (۵۸)

مجرموں کو مہلت دینے کی حکمت

'مَوْئِل' کے معنی پناہ کی جگہ کے ہیں۔ اب یہ سبب بتایا جا رہا ہے اس بات کا کہ جب یہ ایسے نابکار لوگ ہیں کہ یہ کبھی ہدایت قبول کرنے والے نہیں ہیں تو آخر ان کو بارِ زمین بنائے رکھنے سے فائدہ کیا؛ کیوں نہ ان کے اوپر وہ عذاب بھیج کر جس کا یہ مطالبہ کر رہے ہیں ان کو ختم ہی کر دیا جائے۔ فرمایا کہ اس کا سبب یہ ہے کہ خدا بخشنے والا اور رحمت کرنے والا ہے اس وجہ سے وہ مجرموں کو بھی انتہائی حد تک مہلت دیتا ہے۔ ورنہ اگر وہ ان کو فوراً پکڑنا چاہے تو ان کے اعمال کی پاداش میں فوراً پکڑ لے، کوئی اس کا ہاتھ پکڑنے والا نہیں بن سکتا۔ لیکن اللہ جلدی نہیں کرتا بلکہ اس نے ان کی گرفتاری کے لیے ایک وقت ٹھہرا رکھا ہے۔ جب وہ آ جائے گا تو یہ اس سے کہیں نہیں بھاگ سکیں گے۔

وَتِلْكَ الْقُرٰىٓ اَهْلَكْنٰهُمْ لَمَّا ظَلَمُوْا وَجَعَلْنَا لِمَهْلِكِهِمْ مَّوْعِدًا (۵۹)

تاریخ کی شہادت

یہ اوپر والی بات پر تاریخی شہادت کی طرف اشارہ فرما دیا کہ یہ سامنے ان قوموں کی بستیاں ہیں جن کو ہم نے ان کے ظلم کی پاداش میں ہلاک کر دیا۔ یہ ان کی بستیوں پر سے اپنے سفروں میں گزرتے ہیں ان کے انجام سے عبرت حاصل کریں۔ ہم نے ان کی ہلاکت کے لیے بھی ایک وقت مقرر کیا تھا چنانچہ جب وہ آگیا تو وہ تباہ کر دی گئیں۔

۱۲۔ آگے کا مضمون ــــ آیات ۶۰-۸۲

صبر کی عقائدی بنیادیں

پیچھے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اعدائے حق اور متکبرین کے مقابل میں جس صبر و استقامت کی تلقین کی گئی ہے آگے کی آیات میں اسی مضمون کی تکمیل کر دی گئی ہے۔ گویا سورہ اس مقام پر اپنے نقطۂ عروج پر پہنچ گئی۔ صبر کے متعلق یہ بات یاد رکھیے کہ یہ کوئی منفی چیز نہیں بلکہ ایک مثبت حقیقت ہے۔ اسی پر تمام حق کے قیام و بقا کا انحصار ہے۔ جس کے اندر یہ صفت راسخ نہ ہو وہ نہ تو خدا کا حق ادا کر سکتا ہے نہ بندوں کا۔ اس صفت کو راسخ کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اس کی عقائدی بنیادیں دل کے اندر راسخ ہوں۔ جب تک یہ بنیادیں اچھی طرح راسخ نہ ہوں صبر کو اوپر سے چپکایا نہیں جا سکتا۔ یہ عقائدی بنیادیں تین ہیں۔

ایک یہ کہ اس دنیا میں جو کچھ بھی واقع ہوتا ہے سب خدا کے اذن اور اس کے ارادہ و مشیت کے تحت واقع ہوتا ہے۔ اس کے اذن و ارادہ کے بغیر ایک ذرہ بھی اپنی جگہ سے حرکت نہیں کر سکتا۔

دوسری یہ کہ خدا خیر مطلق اور حکیم ہے اس وجہ سے اس کا کوئی ارادہ بھی خیر اور حکمت سے خالی نہیں ہوتا۔ وہ اگر اہل باطل کو ڈھیل دیتا ہے تو اس لیے نہیں کہ وہ باطل سے محبت کرتا یا اس کے آگے بے بس اور مجبور ہے بلکہ اس کے اندر بھی وہ کسی خیر عظیم کی پرورش کرتا ہے۔ اسی طرح اگر وہ اہلِ حق کو مصائب و آلام میں مبتلا کرتا ہے تو اس لیے نہیں کہ اسے اہلِ حق کے مصائب سے کوئی دلچسپی ہے بلکہ وہ اس طرح ان کے لیے کسی بڑے خیر کی راہیں کھولتا ہے۔

تیسری یہ کہ انسان کے علم کی رسائی محدود ہے اس وجہ سے وہ خدا کے ہر ارادہ کی حکمت کو اس دنیا میں نہیں معلوم کر سکتا۔ اس کے ارادوں کے تمام اسرار صرف آخرت ہی میں بے نقاب ہوں گے۔ اس دنیا میں انسان کے لیے صحیح رویہ یہ ہے کہ وہ خدا کے تمام فیصلوں پر صابر و شاکر رہتے ہوئے اپنا فرض ادا کرے اور مطمئن رہے کہ آج کی تلخیوں کے اندر جو شیرینی چھپی ہوئی ہے اس کے روح افزا جام انشاء اللہ کل سامنے آئیں گے۔

حضرت موسیٰ کا ایک تربیتی سفر

اس کائنات کے اس رمز کو سمجھنے کے لیے یہاں حضرت موسیٰ کے ایک تربیتی سفر کی سرگزشت سنائی گئی ہے۔ حکمت کے اسرار واقعاتِ زندگی میں جس طرح مصور ہو کر سامنے آتے ہیں مجرد اظہار و بیان سے اس طرح سامنے نہیں آتے۔ حضرت موسیٰ کو اصلاح و تربیت کے لیے جو قوم ملی تھی وہ نہایت کمزور اور بودی تھی اور جس دشمن سے ان

کا سابقہ تھا وہ نہایت جبار و قہار تھا اس وجہ سے اللہ تعالیٰ کی حکمت مقتضی ہوئی کہ وہ صبر میں نہایت راسخ و پختہ ہو جائیں تاکہ مخالف حالات کا پورے عزم و جزم کے ساتھ مقابلہ کر سکیں۔ چنانچہ خدا نے ان کو اپنے ایک ایسے بندے کے پاس بھیجا جس کو اس نے کچھ خاص علم عطا فرمایا تھا۔ اس بندے نے حضرت موسیٰؑ پر خدا کے حکم سے اس کے ارادوں کے چند اسرار بے نقاب کیے جو تربیتِ صبر و رضا کے پہلو سے نہایت اہم تھے۔

مفسرین کی ایک غلط فہمی

ہمارے نزدیک حضرت موسیٰؑ کے اس سفر کا مقصد یہی تھا لیکن بعض مفسرین نے معلوم نہیں کہاں سے یہ فضول سی بات لکھ دی ہے کہ نعوذ باللہ حضرت موسیٰؑ ترنگ میں آ کر کسی دن یہ کہہ بیٹھے تھے کہ اس وقت مجھ سے بڑا عالم کوئی نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے بطور تادیب و تنبیہ ان کو اپنے ایک بندے کے پاس بھیجا کہ وہ دیکھ لیں کہ ان سے بھی بڑا ایک عالم موجود ہے۔ اول تو حضرت موسیٰؑ ایسی بے محل بات فرماتے کیوں اور اگر انھوں نے فرمائی تو یہ کوئی غلط بات تو نہیں فرمائی۔ یہ ایک امر واقعہ ہے کہ نبی سب سے بڑا عالم ہوتا ہے اور وہ اپنی پوری قوم کے سامنے اس حقیقت کا آشکارا طور پر اعلان بھی کرتا ہے۔ یہ بات ہر نبی نے اپنی قوم سے کہی ہے 'إِنِّي أَعْلَمُ مِنَ اللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ' (اے میری قوم کے لوگو! میں خدا کی طرف سے وہ کچھ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے) لیکن کسی نبی کی یہ بات نہ تو فخر و تعلّی پر محمول کی گئی اور نہ اس کی بنا پر وہ مستوجب تادیب قرار پایا تو آخر حضرت موسیٰؑ ہی اس کے سبب سے کیوں سزاوار تنبیہ ٹھہرے؟ بہرحال یہ شانِ نزول بالکل لایعنی ہے۔ اصل حقیقت وہی ہے جس کی طرف ہم نے اشارہ کیا۔ اب اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۶۰-۸۲

وَإِذْ قَالَ مُوسَىٰ لِفَتَاهُ لَا أَبْرَحُ حَتَّىٰ أَبْلُغَ مَجْمَعَ الْبَحْرَيْنِ
أَوْ أَمْضِيَ حُقُبًا ﴿٦٠﴾ فَلَمَّا بَلَغَا مَجْمَعَ بَيْنِهِمَا نَسِيَا حُوتَهُمَا
فَاتَّخَذَ سَبِيلَهُ فِي الْبَحْرِ سَرَبًا ﴿٦١﴾ فَلَمَّا جَاوَزَا قَالَ لِفَتَاهُ
آتِنَا غَدَاءَنَا لَقَدْ لَقِينَا مِنْ سَفَرِنَا هَٰذَا نَصَبًا ﴿٦٢﴾ قَالَ أَرَأَيْتَ
إِذْ أَوَيْنَا إِلَى الصَّخْرَةِ فَإِنِّي نَسِيتُ الْحُوتَ وَمَا أَنْسَانِيهُ إِلَّا
الشَّيْطَانُ أَنْ أَذْكُرَهُ ۚ وَاتَّخَذَ سَبِيلَهُ فِي الْبَحْرِ ۖ عَجَبًا ﴿٦٣﴾
قَالَ ذَٰلِكَ مَا كُنَّا نَبْغِ ۚ فَارْتَدَّا عَلَىٰ آثَارِهِمَا قَصَصًا ﴿٦٤﴾ فَوَجَدَا
عَبْدًا مِنْ عِبَادِنَا آتَيْنَاهُ رَحْمَةً مِنْ عِنْدِنَا وَعَلَّمْنَاهُ مِنْ لَدُنَّا

عِلْمًا ﴿٦٥﴾ قَالَ لَهُ مُوسَىٰ هَلْ أَتَّبِعُكَ عَلَىٰ أَن تُعَلِّمَنِ مِمَّا عُلِّمْتَ
رُشْدًا ﴿٦٦﴾ قَالَ إِنَّكَ لَن تَسْتَطِيعَ مَعِيَ صَبْرًا ﴿٦٧﴾ وَكَيْفَ تَصْبِرُ
عَلَىٰ مَا لَمْ تُحِطْ بِهِ خُبْرًا ﴿٦٨﴾ قَالَ سَتَجِدُنِي إِن شَاءَ اللَّهُ
صَابِرًا وَلَا أَعْصِي لَكَ أَمْرًا ﴿٦٩﴾ قَالَ فَإِنِ اتَّبَعْتَنِي فَلَا تَسْأَلْنِي
عَن شَيْءٍ حَتَّىٰ أُحْدِثَ لَكَ مِنْهُ ذِكْرًا ﴿٧٠﴾ فَانطَلَقَا حَتَّىٰ ع
إِذَا رَكِبَا فِي السَّفِينَةِ خَرَقَهَا ۖ قَالَ أَخَرَقْتَهَا لِتُغْرِقَ أَهْلَهَا لَقَدْ
جِئْتَ شَيْئًا إِمْرًا ﴿٧١﴾ قَالَ أَلَمْ أَقُلْ إِنَّكَ لَن تَسْتَطِيعَ مَعِيَ صَبْرًا ﴿٧٢﴾
قَالَ لَا تُؤَاخِذْنِي بِمَا نَسِيتُ وَلَا تُرْهِقْنِي مِنْ أَمْرِي عُسْرًا ﴿٧٣﴾
فَانطَلَقَا حَتَّىٰ إِذَا لَقِيَا غُلَامًا فَقَتَلَهُ قَالَ أَقَتَلْتَ نَفْسًا زَكِيَّةً
بِغَيْرِ نَفْسٍ لَّقَدْ جِئْتَ شَيْئًا نُّكْرًا ﴿٧٤﴾ قَالَ أَلَمْ أَقُل لَّكَ إِنَّكَ
لَن تَسْتَطِيعَ مَعِيَ صَبْرًا ﴿٧٥﴾ قَالَ إِن سَأَلْتُكَ عَن شَيْءٍ بَعْدَهَا فَلَا
تُصَاحِبْنِي ۖ قَدْ بَلَغْتَ مِن لَّدُنِّي عُذْرًا ﴿٧٦﴾ فَانطَلَقَا حَتَّىٰ إِذَا أَتَيَا
أَهْلَ قَرْيَةٍ اسْتَطْعَمَا أَهْلَهَا فَأَبَوْا أَن يُضَيِّفُوهُمَا فَوَجَدَا فِيهَا
جِدَارًا يُرِيدُ أَن يَنقَضَّ فَأَقَامَهُ ۖ قَالَ لَوْ شِئْتَ لَتَّخَذْتَ
عَلَيْهِ أَجْرًا ﴿٧٧﴾ قَالَ هَٰذَا فِرَاقُ بَيْنِي وَبَيْنِكَ ۚ سَأُنَبِّئُكَ
بِتَأْوِيلِ مَا لَمْ تَسْتَطِع عَّلَيْهِ صَبْرًا ﴿٧٨﴾ أَمَّا السَّفِينَةُ فَكَانَتْ
لِمَسَاكِينَ يَعْمَلُونَ فِي الْبَحْرِ فَأَرَدتُّ أَنْ أَعِيبَهَا وَكَانَ وَرَاءَهُم
مَّلِكٌ يَأْخُذُ كُلَّ سَفِينَةٍ غَصْبًا ﴿٧٩﴾ وَأَمَّا الْغُلَامُ فَكَانَ أَبَوَاهُ مُؤْمِنَيْنِ

فَخَشِينَآ أَن يُرْهِقَهُمَا طُغْيَٰنًا وَكُفْرًا ﴿٨٠﴾ فَأَرَدْنَآ أَن يُبْدِلَهُمَا
رَبُّهُمَا خَيْرًا مِّنْهُ زَكَوٰةً وَأَقْرَبَ رُحْمًا ﴿٨١﴾ وَأَمَّا ٱلْجِدَارُ
فَكَانَ لِغُلَٰمَيْنِ يَتِيمَيْنِ فِى ٱلْمَدِينَةِ وَكَانَ تَحْتَهُۥ كَنزٌ لَّهُمَا وَ
كَانَ أَبُوهُمَا صَٰلِحًا فَأَرَادَ رَبُّكَ أَن يَبْلُغَآ أَشُدَّهُمَا وَيَسْتَخْرِجَا
كَنزَهُمَا رَحْمَةً مِّن رَّبِّكَ ۚ وَمَا فَعَلْتُهُۥ عَنْ أَمْرِى ۚ ذَٰلِكَ تَأْوِيلُ
ع مَا لَمْ تَسْطِع عَّلَيْهِ صَبْرًا ﴿٨٢﴾

ترجمۂ آیات ۶۰ - ۸۲

اور یاد کرو، جب کہ موسیٰؑ نے اپنے شاگرد سے کہا کہ میں چلتا رہوں گا یہاں تک کہ یا تو دو دریاؤں کے ملنے کی جگہ پر پہنچ جاؤں یا اسی طرح سال ہا سال چلتا ہی رہوں گا۔ پس جب وہ ان کے ملنے کی جگہ پہنچے تو وہ اپنی مچھلی بھول گئے اور اس نے دریا میں اپنی راہ لی۔ پس جب وہ آگے بڑھ گئے تو موسیٰؑ نے اپنے شاگرد سے کہا کہ اب ہمارا کھانا لاؤ، ہمارے اس سفر سے تو ہم کو بڑی تکان ہو گئی۔ اس نے کہا کیا عرض کروں، جب ہم نے چٹان کے پاس پناہ لی تو میں مچھلی کو بھول گیا، اور یہ شیطان ہی تھا جس نے اس کو یاد رکھنے سے مجھے غافل کر دیا، اور اس نے عجیب طرح اپنی راہ دریا میں نکال لی۔ اس نے کہا، یہی تو ہمیں مطلوب تھا! پس وہ اپنے نقشِ قدم دیکھتے ہوئے واپس لوٹے تو انھوں نے پایا ہمارے بندوں میں سے ایک بندے کو جس کو ہم نے اپنے خاص فضل سے نوازا تھا اور جس کو خاص اپنے پاس سے علم عطا فرمایا تھا۔ ۶۱-۶۵

موسیٰؑ نے اس سے درخواست کی کہ کیا میں آپ کے ساتھ بایں شرط رہ سکتا ہوں کہ جو علم آپ کو عطا ہوا ہے آپ اس میں سے کچھ مجھے بھی سکھائیں؟ اس نے جواب دیا کہ تم میرے ساتھ صبر نہ کر سکو گے اور آخر جو باتیں تمہارے دائرۂ علم سے باہر ہوں گی ان پر تم سے صبر ہو بھی کیسے سکے گا۔

اس نے کہا انشاء اللہ آپ مجھے صابر پائیں گے۔ میں کسی معاملے میں بھی آپ کے حکم کی خلاف ورزی نہیں کروں گا۔ ۶۶-۶۹

اس نے کہا اگر میرے ساتھ رہنا ہے تو یہ شرط ہے کہ کسی چیز کے متعلق مجھ سے اس وقت تک کچھ نہ پوچھیو جب تک میں خود ہی اس کا کچھ ذکر نہ چھیڑوں۔ بالآخر وہ دونوں چلے یہاں تک کہ جب وہ کشتی میں سوار ہوئے تو اس نے اس میں چھید کر دیا۔ موسیٰؑ نے کہا کیا یہ چھید آپ نے اس میں اس لیے کیا ہے کہ اہل کشتی کو غرق کر دیں؟ یہ تو آپ نے بڑی ہی عجیب حرکت کی! اس نے کہا، میں نے نہیں کہا تھا کہ تم میرے ساتھ صبر نہ کر سکو گے! موسیٰؑ نے کہا میری بھول چوک پر مواخذہ نہ کیجیے اور میرے معاملہ میں زیادہ سخت گیری نہ فرمائیے۔ ۷۰-۷۳

پھر چلے، یہاں تک کہ جب ایک لڑکے سے ملاقات ہوئی تو اس نے اس کو قتل کر ڈالا۔ موسیٰؑ نے کہا آپ نے ایک معصوم جان کو بغیر کسی قصاص کے قتل کر ڈالا! یہ تو آپ نے بڑی ہی منکر بات کی! اس نے کہا، میں نے نہیں کہا تھا کہ تم میرے ساتھ صبر نہ کر سکو گے! موسیٰؑ نے کہا، اب اس کے بعد اگر میں آپ سے کسی امر کے متعلق پوچھوں تو مجھے ساتھ نہ رکھیے گا۔ آپ میری جانب سے حد عذر کو پہنچ گئے۔ پھر چلے یہاں تک کہ جب پہنچے ایک بستی والوں کے پاس تو ان سے کھانا کھلانے کی درخواست کی لیکن انھوں نے ان کی میزبانی سے انکار کر دیا۔ تو انھوں نے وہاں ایک دیوار دیکھی جو گرا چاہتی تھی، وہ دیوار اس نے کھڑی کر دی۔ موسیٰؑ نے کہا اگر آپ چاہتے تو اس پر کچھ مزدوری بھی ٹھہرا لیتے۔ اس نے کہا بس اب میرے اور تمھارے درمیان یہ جدائی ہے۔ میں اب تمھیں ان باتوں کی حقیقت بتاؤں گا جن پر تم صبر نہ کر سکے۔ ۷۴-۷۸

کشتی کا معاملہ یہ ہے کہ وہ چند مسکینوں کی تھی جو دریا میں محنت مزدوری کرتے تھے، میں نے

چاہا کہ اس کو عیب دار کر دوں اور ان کے پرے ایک بادشاہ تھا جو تمام کشتیوں کو زبردستی ضبط کر رہا تھا۔ ۷۹

رہا لڑکا تو اس کے ماں باپ باایمان تھے۔ ہمیں اندیشہ ہوا کہ کہیں وہ بڑا ہو کر سرکشی و ناشکری سے ان پر تعدی نہ کرے۔ بس ہم نے چاہا کہ اُن کا رب اُن کو اس کی جگہ ایک ایسا فرزند عطا فرمائے جو پاکیزہ نفسی میں اس سے بہتر اور مروّت و دردمندی میں اس سے بڑھ کر ہو۔ ۸۰-۸۱

اور رہا دیوار کا معاملہ تو وہ شہر کے دو یتیم لڑکوں کی تھی۔ اس کے نیچے ان کا دفینہ تھا اور ان کا باپ ایک صالح آدمی تھا۔ تیرے رب نے یہ چاہا کہ وہ اپنی جوانی کو پہنچیں اور اپنا دفینہ نکالیں۔ یہ تیرے رب کی عنایت سے ہوا۔ اور یہ جو کچھ میں نے کیا اپنی رائے سے نہیں کیا۔ یہ ہے حقیقت ان باتوں کی جن پر تم صبر نہ کر سکے۔ ۸۲

۱۲۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِفَتٰىهُ لَآ اَبْرَحُ حَتّٰٓى اَبْلُغَ مَجْمَعَ الْبَحْرَيْنِ اَوْ اَمْضِيَ حُقُبًا (۶۰)

'فتٰی' کا مفہوم — 'فتٰی' کا ترجمہ میں نے 'خادم' 'نوجوان' یا 'لڑکے' کے بجائے شاگرد کیا ہے۔ اس میں فی الجملہ 'جوان' ہونے کا مفہوم بھی آجاتا ہے اور حضرت موسیٰ کے ساتھ اس جوان کے تعلق کی نوعیت بھی واضح ہو جاتی ہے۔ حضرت موسیٰ نے اس مہم میں رفاقت کے لیے جن الفاظ میں اس جوان سے استمزاج کیا ہے اس سے یہی متبادر ہوتا ہے کہ اس کی حیثیت محض ایک نوکر کی نہیں بلکہ ایک نوجوان صحابی کی تھی جو حضرت موسیٰ کے شاگرد بھی تھے اور ان کی خدمت بھی کرتے تھے۔

'مجمع البحرین' سے مراد — 'مجمع البحرین' سے مراد غالباً خلیج عقبہ اور سویز کا وہ مقام اتصال ہے جہاں سے بعد کے مراحل میں حضرت موسیٰ بنی اسرائیل کے ساتھ گزرے ہیں۔

'حقب' کا مفہوم — 'حقب' کے معنی زمانہ، سال، ۸۰ سال یا اس سے بھی زیادہ مدّت کے ہیں۔
حضرت موسیٰ کو اس سفر کی ہدایت ظاہر ہے کہ وحی کے ذریعہ سے ہوئی ہوگی۔ انھوں نے اس کا اظہار اپنے شاگرد سے کیا اور ان کے لفظ لفظ سے اس سفر کے لیے ان کا عزم و جزم اور ذوق و شوق ٹپک رہا ہے۔

فرماتے ہیں کہ میں یا تو مجمع البحرین میں اس مقام تک پہنچ جاؤں گا جہاں پہنچنے کے لیے مجھے ہدایت ہوئی ہے یا پھر اسی منزلِ مقصود کی تلاش میں سالہا سال گزار دوں گا۔ مطلب یہ ہے کہ اگر ہمت ہے تو اس سفر میں ساتھ دو ورنہ یہ بندہ تو بہر حال اس محبوب سفر پر روانہ ہو رہا ہے اور اس عزم کے ساتھ روانہ ہو رہا ہے کہ ؏

یا تن رسد بجاناں یا جاں زتن بر آید

فَلَمَّا بَلَغَا مَجْمَعَ بَيْنِهِمَا نَسِيَا حُوتَهُمَا فَاتَّخَذَ سَبِيلَهُ فِي الْبَحْرِ سَرَبًا (۶۱)

'سرب' کا مفہوم

'سرب' کے معنی برتن سے پانی کے بہ جانے کے ہیں۔

ایک عجیب واقعہ

یہاں سرگزشت کا بہت سا حصہ حذف ہے جو قرینہ سے واضح ہے۔ یعنی دونوں نے سفر کیا اور مجمع البحرین پہنچ گئے۔ یہاں ذرا دم لینے کے لیے ایک پہاڑی کے دامن میں بیٹھے، پھر وہاں سے چلے تو ناشتہ کے لیے جو مچھلی ساتھ لی تھی وہ ساتھ لینا بھول گئے۔ کچھ دور جانے کے بعد، معلوم ہوتا ہے، شاگرد کو یہ بات یاد آئی اور وہ مچھلی لینے کے لیے واپس لوٹے لیکن یہاں پہنچے تو دیکھا کہ مچھلی نے ان کے سامنے تڑپ کر پانی کی راہ لی۔ یہ واقعہ اتنا عجیب تھا کہ شاگرد نے غالباً اس اندیشہ سے حضرت موسیٰؑ سے ذکر کرنے کی جرأت نہیں کی کہ وہ اتنی عجیب و غریب بات باور نہیں کریں گے اور عجب نہیں کہ ان کے عتاب شدید سے دوچار ہونا پڑے۔ چنانچہ آگے کو چل پڑے، شاگرد اس حیص بیص میں رہا کہ اس واقعہ کا ذکر کروں یا نہ کروں اور حضرت موسیٰؑ نے خیال فرمایا ہوگا کہ شاگرد نے مچھلی اٹھا لی ہوگی۔

فَلَمَّا جَاوَزَا قَالَ لِفَتَاهُ آتِنَا غَدَاءَنَا لَقَدْ لَقِينَا مِنْ سَفَرِنَا هَٰذَا نَصَبًا (۶۲)

'غداء' کا مفہوم

'غداء' کے معنی ناشتہ اور نہاری کے ہیں اور 'نصب' کے معنی تکان کے۔ یہاں 'غداء' کا لفظ اس بات کا واضح قرینہ ہے کہ مچھلی بھنی ہوئی تھی۔ بے بھنی یا زندہ مچھلی کے لیے 'غداء' کا لفظ کسی طرح موزوں نہیں ہے۔

بالآخر جب وہاں سے کچھ دور نکل گئے تو حضرت موسیٰؑ نے شاگرد سے کہا کہ بھئی! اس سفر نے تو تھکا دیا اب ناشتہ لاؤ تو کچھ کھا لیا جائے۔

قَالَ أَرَأَيْتَ إِذْ أَوَيْنَا إِلَى الصَّخْرَةِ فَإِنِّي نَسِيتُ الْحُوتَ وَمَا أَنْسَانِيهُ إِلَّا الشَّيْطَانُ أَنْ أَذْكُرَهُ ۚ وَاتَّخَذَ سَبِيلَهُ فِي الْبَحْرِ ۖ عَجَبًا (۶۳)

شاگرد کی معذرت

مجبوراً شاگرد کو راز سے پردہ اٹھانا پڑا۔ جھجکتے اور ڈرتے ہوئے بولے کہ کیا عرض کروں جب ہم نے پہاڑی کے دامن میں پناہ لی تھی تو میں وہیں مچھلی بھول آیا تھا اور یقیناً یہ شیطان ہی کی حرکت تھی کہ میں اس کو یاد رکھنے سے قاصر رہا۔ پھر جا کے دیکھا تو مچھلی نے نہایت حیرت انگیز طریقہ سے دریا میں اپنی راہ نکال لی۔

'اَرَءَیْتَ' کا لفظ یہاں قائل کی جھجک کو ظاہر کرتا ہے۔ جیسے ہم بولتے ہیں کیا عرض کروں، ذرا دیکھیے تو سہی 'وَمَآ اَنْسٰنِیْهُ اِلَّا الشَّیْطٰنُ' کے الفاظ نہایت شستہ الفاظ میں اپنی کوتاہی کی معذرت کے لیے ہیں۔

قَالَ ذٰلِكَ مَا كُنَّا نَبۡغِ ۖ فَارۡتَدَّا عَلٰٓى اٰثَارِهِمَا قَصَصًا ۙ (۶۴)

منزل کا سراغ

شاگرد نے تو بات ڈرتے ڈرتے بتائی کہ یہ سن کر معلوم نہیں کیا عتاب نازل ہو لیکن حضرت موسیٰؑ یہ مژدہ سن کر پھڑک اٹھے۔ فرمایا اسی کی تو تلاش تھی! معلوم ہوتا ہے کہ وحی یا رویا کے ذریعہ سے حضرت موسیٰؑ کو منزلِ مقصود کا سراغ یہی بتایا گیا تھا کہ جس مقام پر ان کے ناشتہ کی مچھلی زندہ ہو کر پانی کی راہ لے گی وہیں ان کی ملاقات اس بندۂ خاص سے ہوگی جو ان پر زندگی کے کچھ خاص راز فاش کرے گا۔ چنانچہ وہ یہ سراغ پاتے ہی الٹے پاؤں، اپنے نقش قدم کو تلاش کرتے، اس مقام پر واپس آئے جہاں یہ واقعہ پیش آیا تھا۔

فَوَجَدَا عَبۡدًا مِّنۡ عِبَادِنَآ اٰتَيۡنٰهُ رَحۡمَةً مِّنۡ عِنۡدِنَا وَعَلَّمۡنٰهُ مِنۡ لَّدُنَّا عِلۡمًا (۶۵)

حضرت خضرؑ سے ملاقات

یہاں ان کی ملاقات ایک خاص بندے سے ہوئی جس پر اللہ تعالیٰ کا خاص فضل تھا اور جس کو اس نے اپنے کچھ خاص علم سے نوازا تھا۔ یہ کون تھے؟ قرآن نے ان کا نام نہیں بتایا ہے۔ صرف ان کے بعض مخصوص اوصاف کا ذکر کیا ہے۔ بعض حدیثوں میں ان کا نام خضرؑ آیا ہے۔ چونکہ ان حدیثوں کے انکار کی کوئی وجہ ہمارے پاس نہیں ہے اس وجہ سے یہی نام ہم اختیار کر لیتے ہیں۔

حضرت خضرؑ نبی تھے

حضرت خضر علیہ السلام بعض قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی تھے۔ اس کا اول قرینہ تو یہ ہے کہ حضرت موسیٰؑ جیسے جلیل القدر نبی بلکہ رسول کو ان کے پاس حصولِ علم اور حصولِ تربیت کے لیے بھیجا گیا۔ اگر حضرت خضرؑ نبی نہیں تھے تو ایک نبی کا غیر نبی کے پاس حصولِ علم و تربیت کے لیے بھیجا جانا بالکل ناموزوں سی بات ہے۔ اگرچہ اس نام کے کسی نبی کا ذکر قرآن یا تورات میں نہیں ملتا لیکن یہ چیز کچھ اہمیت رکھنے والی نہیں ہے۔ قرآن میں خود اس کی اپنی تصریح کے مطابق بہت سے انبیاء کا ذکر نہیں ہے۔ یہی حال تورات کا بھی ہے۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ اللہ تعالیٰ نے، جیسا کہ قرآن میں تصریح ہے، اپنے ہر نبی کو کسی نہ کسی پہلو سے فضیلت دی ہے۔ حضرت خضرؑ کو بھی ایک خاص پہلو سے فضیلت حاصل تھی اور اسی طرح حضرت موسیٰؑ کو بھی فضیلت حاصل تھی۔ حضرت موسیٰؑ کا ان سے کچھ باتیں سیکھنا اس امر کو مستلزم نہیں ہے کہ حضرت خضرؑ کو حضرت موسیٰؑ پر مطلق فضیلت حاصل تھی۔

دوسرا قرینہ یہ ہے کہ ان کے جو اوصاف اللہ تعالیٰ نے بیان فرمائے ہیں وہ حضرات انبیاء ہی سے مناسبت رکھتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ وہ ہمارے بندوں میں سے ایک خاص بندہ تھا، ہم نے اپنی طرف سے اس پر خاص فضل کیا تھا، 'ہم نے اس کو اپنے پاس سے ایک خاص علم عطا کیا تھا'۔ علیٰ ہذا القیاس انھوں نے خود اپنے کاموں سے متعلق فرمایا کہ 'میں نے کوئی کام بھی خود اپنی رائے سے نہیں کیا بلکہ خدا کے حکم سے کیا ہے'، یہ سب باتیں دلیل ہیں کہ وہ صاحب وحی نبی تھے اور ان کو یہ خاص امتیاز بھی حاصل تھا کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر اپنے بعض ارادوں کے راز کھول دیے تھے۔

قَالَ لَهٗ مُوْسٰی هَلْ اَتَّبِعُكَ عَلٰۤی اَنْ تُعَلِّمَنِ مِمَّا عُلِّمْتَ رُشْدًا ۝ قَالَ اِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِیْعَ مَعِیَ صَبْرًا ۝ وَكَیْفَ تَصْبِرُ عَلٰی مَا لَمْ تُحِطْ بِهٖ خُبْرًا (۶۶-۶۸)

حضرت خضرؑ اور حضرت موسیٰؑ کے مابین معاہدۂ رفاقت

'رُشْدًا' کے معنی علم و حکمت کے ہیں لیکن یہاں اس سے مراد وہ خاص علم ہے جو اسرارِ کائنات سے متعلق اللہ تعالیٰ نے حضرت خضرؑ کو بخشا۔ حضرت موسیٰؑ نے ان سے درخواست کی کہ اگر آپ اس علمِ خاص میں سے' جو اللہ نے آپ کو بخشا ہے، مجھے بھی کچھ سکھائیں تو کچھ عرصہ اپنی خدمت میں مجھے رہنے کی اجازت دیجیے۔ حضرت خضرؑ نے فرمایا کہ مجھے اجازت سے تو انکار نہیں ہے لیکن تم میرے ساتھ صبر نہ کر سکو گے۔ میرے ہاتھوں ایسے کام صادر ہوں گے جن کے بھید اور جن کی حکمت سے تم واقف نہیں ہو گے اور وہ کام تمہاری نگاہوں میں عجیب اور ناگوار ہوں گے تو آخر تم ان پر کس طرح صبر کرو گے۔

قَالَ سَتَجِدُنِیْۤ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ صَابِرًا وَّلَاۤ اَعْصِیْ لَكَ اَمْرًا (۶۹)

حضرت موسیٰؑ نے وعدہ کیا کہ انشاء اللہ آپ مجھے ہر مرحلہ پر صابر پائیں گے اور میں ہرگز آپ کے کسی حکم کی خلاف ورزی نہیں کروں گا۔

قَالَ فَاِنِ اتَّبَعْتَنِیْ فَلَا تَسْـَٔلْنِیْ عَنْ شَیْءٍ حَتّٰۤی اُحْدِثَ لَكَ مِنْهُ ذِكْرًا (۷۰)

حضرت خضرؑ نے اس وعدے کے بعد اس شرط پر ان کو اپنے ساتھ رہنے کی اجازت دے دی کہ جو کچھ وہ کریں اس کو چپ چاپ وہ دیکھتے رہیں، اس کے متعلق اس وقت تک وہ کوئی سوال نہ کریں جب تک حضرت خضرؑ اس کو خود نہ چھیڑیں۔

فَانْطَلَقَا حَتّٰۤی اِذَا رَكِبَا فِی السَّفِیْنَةِ خَرَقَهَا قَالَ اَخَرَقْتَهَا لِتُغْرِقَ اَهْلَهَا لَقَدْ جِئْتَ شَیْـًٔا اِمْرًا (۷۱)

'اِمْر' کے معنی عجیب اور منکر کام کے ہیں۔

کشتی کا واقعہ

اس قول و قرار کے بعد دونوں اپنے تربیتی سفر پہ چلے اور ایک کشتی پر سوار ہوئے۔ کشتی پر سوار ہونے کے بعد حضرت خضرؑ نے کسی جگہ سے کشتی کا کوئی تختہ توڑ کر اس کو عیب دار کر دیا۔ یہ دیکھ کر حضرت موسیٰؑ سے ضبط نہ ہو سکا اور وہ اپنے قول و قرار کو نظر انداز کر کے بول اٹھے کہ یہ حرکت کیا آپ نے اس لیے کی ہے کہ اہلِ کشتی کو غرق کر دیں، یہ تو بڑی ہی ناروا حرکت آپ نے کی!!

قَالَ اَلَمْ اَقُلْ اِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِیْعَ مَعِیَ صَبْرًا ۝ قَالَ لَا تُؤَاخِذْنِیْ بِمَا نَسِیْتُ وَلَا تُرْهِقْنِیْ مِنْ اَمْرِیْ عُسْرًا (۷۲-۷۳)

'اِرْهَاق' کے معنی کسی پر اس کی طاقت سے زیادہ بوجھ ڈالنا، کسی کو مبتلائے آفت کرنا۔ 'اَرْهَقَهٗ عُسْرًا' کے معنی ہوں گے اس کو تنگی میں ڈال دیا۔

حضرت خضرؑ نے حضرت موسیٰؑ کو اپنی بات یاد دلائی کہ میں نے نہیں کہا تھا کہ تم میرے ساتھ صبر نہ کر سکو گے! حضرت

موسیٰؑ نے فوراً معذرت کی کہ بھول ہوئی، معاف کیجیے۔ میرے معاملہ میں زیادہ سخت گیری سے کام نہ لیجیے۔

فَانْطَلَقَا حَتّٰىٓ اِذَا لَقِيَا غُلٰمًا فَقَتَلَهٗ ۙ قَالَ اَقَتَلْتَ نَفْسًا زَكِيَّةًۢ بِغَيْرِ نَفْسٍ ؕ لَقَدْ جِئْتَ شَيْـًٔا نُّكْرًا ۝ قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكَ اِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيْعَ مَعِيَ صَبْرًا ۝ قَالَ اِنْ سَاَلْتُكَ عَنْ شَيْءٍۢ بَعْدَهَا فَلَا تُصٰحِبْنِيْ ۚ قَدْ بَلَغْتَ مِنْ لَّدُنِّيْ عُذْرًا (۷۴-۷۶)

لڑکے کے قتل کا واقعہ

پھر کہیں کو چلے۔ راستہ میں ایک لڑکا ملا۔ خضرؑ نے اس کو قتل کر دیا۔ یہ دیکھ کر حضرت موسیٰؑ پھر بھڑک گئے۔ بولے یہ آپ نے کیا کر ڈالا، ایک معصوم کو بغیر اس کے کہ اس نے کسی کو قتل کیا ہو، آپ نے قتل کر ڈالا۔ یہ تو آپ نے بڑی بھونڈی حرکت کی! حضرت خضرؑ نے پھر ان کو اپنی بات یاد دلائی کہ کیا میں نہیں کہہ چکا ہوں کہ تم میرے ساتھ صبر نہ کر سکو گے۔ حضرت موسیٰؑ نے پھر معافی مانگی اور کہا کہ اگر میں اس کے بعد کوئی سوال کروں تو آپ کو حق ہو گا کہ آپ مجھے اپنے ساتھ نہ رکھیں، پھر آپ میری طرف سے معذور ہوں گے۔

فَانْطَلَقَا حَتّٰىٓ اِذَآ اَتَيَآ اَهْلَ قَرْيَةِ ۨ اسْتَطْعَمَآ اَهْلَهَا فَاَبَوْا اَنْ يُّضَيِّفُوْهُمَا فَوَجَدَا فِيْهَا جِدَارًا يُّرِيْدُ اَنْ يَّنْقَضَّ فَاَقَامَهٗ ؕ قَالَ لَوْ شِئْتَ لَتَّخَذْتَ عَلَيْهِ اَجْرًا (۷۷)

بستی والوں کا واقعہ

پھر آگے کو چلے یہاں تک کہ ایک بستی میں پہنچے۔ بھوکے تھے اس وجہ سے بستی والوں سے کچھ کھلانے کی فرمائش کی۔ شریف لوگ بن کہے بھی مسافروں کی میزبانی ایک سعادت سمجھتے ہیں لیکن اس بستی کے لوگ ایسے لئیم نکلے کہ انھوں نے حضرت موسیٰؑ اور حضرت خضرؑ جیسے دو شریف مسافروں کو، ان کی درخواست پر بھی، روٹی دینے سے انکار کر دیا۔ ان کی اس کمینگی کے باوجود حضرت خضرؑ نے ان کے ساتھ یہ سلوک کیا کہ ان کی بستی کی ایک دیوار، جو گرا چاہتی تھی، محنت کر کے درست کر دی۔ آخر حضرت موسیٰؑ سے اس پر بھی نہ رہا گیا۔ انھوں نے ٹوکا کہ ان نااہلوں اور کمینوں کے لیے آپ نے یہ سخت بے مزدوری برداشت کی، اور کچھ نہیں تو ان سے اس محنت کی کچھ مزدوری ہی ٹھہرا لیتے! حضرت خضرؑ نے فرمایا کہ بس جناب اب بحث ختم ہو چکی۔ اب میرے اور آپ کے درمیان جدائی کا فیصلہ ہے۔ آئیے میں ان باتوں کی حقیقت آپ کو بتاتا ہوں جن پر آپ صبر نہ کر سکے۔ قرینہ دلیل ہے کہ حضرت خضرؑ نے جدائی کا یہ اعلان صرف اس بنا پر نہیں کیا کہ حضرت موسیٰؑ پر، خود ان کے اقرار کے مطابق، حجت تمام ہو چکی تھی بلکہ حکمت کی وہ تعلیم بھی مکمل ہو چکی تھی جو حضرت موسیٰؑ کو وہ دینا چاہتے تھے۔

اَمَّا السَّفِيْنَةُ فَكَانَتْ لِمَسٰكِيْنَ يَعْمَلُوْنَ فِي الْبَحْرِ فَاَرَدْتُّ اَنْ اَعِيْبَهَا وَكَانَ وَرَآءَهُمْ مَّلِكٌ يَّاْخُذُ كُلَّ سَفِيْنَةٍ غَصْبًا (۷۹)

واقعات کی حکمت

اب یہ حضرت خضرؑ نے حضرت موسیٰؑ کو اپنے ایک ایک فعل کی وہ حکمت بتائی جس کے لیے اللہ تعالیٰ نے ان سے یہ فعل کرائے۔

کشتی کے اندر چھید کرنے کی حکمت یہ بتائی کہ یہ کشتی مسکینوں کی تھی جو اسی کے ذریعہ سے دریا میں محنت مزدوری کر کے اپنے پیٹ پالتے تھے۔ پرے ایک بادشاہ تھا جو علاقہ کی تمام کشتیوں کو غالباً اپنی کسی جنگی مہم کے لیے زبردستی قبضہ میں کر رہا تھا۔ حضرت خضر فرماتے ہیں کہ میں نے یہ چاہا کہ مسکینوں کی اس کشتی کو عیب دار کر دوں

تاکہ بادشاہ اپنے مقصد کے لیے اس کو ناکارہ سمجھ کر اس پر قبضہ نہ کرے اور یہ غریب اپنی معاش کے اس واحد ذریعہ سے محروم ہونے سے محفوظ رہیں۔

یہ مثال ہے اس امر کی کہ دنیا میں غریبوں، مسکینوں اور نیکوں کو اگر کوئی مالی و معاشی نقصان پہنچتا ہے تو اس نقصان کے اندر انہی کا کوئی فائدہ مضمر ہوتا ہے اس لیے انھیں چاہیے کہ اس پر صبر کریں، اللہ تعالیٰ کے فیصلے پر راضی رہیں اور اس امر پر یقین رکھیں کہ خدا کا کوئی فیصلہ بھی حکمت و مصلحت سے خالی نہیں ہوتا لیکن کوئی شخص ان حکمتوں کا احاطہ نہیں کر سکتا۔

وَاَمَّا الْغُلٰمُ فَكَانَ اَبَوٰهُ مُؤْمِنَيْنِ فَخَشِيْنَآ اَنْ يُّرْهِقَهُمَا طُغْيَانًا وَّكُفْرًا ۚ فَاَرَدْنَآ اَنْ يُّبْدِلَهُمَا رَبُّهُمَا خَيْرًا مِّنْهُ زَكٰوةً وَّاَقْرَبَ رُحْمًا (۸۰-۸۱)

'اَقْرَبُ رُحْمًا' کا مفہوم

'رُحم' کے معنی رقتِ قلب، ہمدردی اور محبت و شفقت کے ہیں۔ 'خَيْرًا مِّنْهُ زَكٰوةً وَّاَقْرَبَ رُحْمًا' یعنی طبیعت اور اخلاق کی پاکیزگی کے اعتبار سے اس سے بہتر اور دردمندی اور مروت کے اعتبار سے اس سے زیادہ پاس و لحاظ والا۔

لڑکے کے قتل کی حکمت

اب یہ لڑکے کے قتل کی حکمت بتائی کہ اس کے ماں باپ مومن تھے اور یہ کفر پر اٹھنے والا تھا ہمیں اندیشہ ہوا کہ یہ جوان ہو کر ماں باپ کو اپنی سرکشی و ناسپاسی سے مبتلائے اذیت کرے گا۔ ہم نے چاہا کہ اس سرکش و نافرمان کی جگہ اللہ ان کو ایسی اولاد دے جو پاک نفس اور ہمدردی کرنے والی ہو۔

یہ مثال ہے اس بات کی کہ اہلِ ایمان کو اگر کوئی مصیبتِ جانی پہنچتی ہے تو اس میں بھی ان کے لیے کوئی خیرِ عظیم مضمر ہوتا ہے جس کو صرف اللہ ہی جانتا ہے اس وجہ سے اہلِ ایمان کو چاہیے کہ وہ اس پر صبر کریں۔ جس دن اس کی حکمت واضح ہوگی معلوم ہو جائے گا کہ جو کچھ خدا نے کیا اسی میں خیر و فلاح تھی۔

وَاَمَّا الْجِدَارُ فَكَانَ لِغُلٰمَيْنِ يَتِيْمَيْنِ فِي الْمَدِيْنَةِ وَكَانَ تَحْتَهٗ كَنْزٌ لَّهُمَا وَكَانَ اَبُوْهُمَا صَالِحًا ۚ فَاَرَادَ رَبُّكَ اَنْ يَّبْلُغَآ اَشُدَّهُمَا وَيَسْتَخْرِجَا كَنْزَهُمَا ۖ رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ ۚ وَمَا فَعَلْتُهٗ عَنْ اَمْرِيْ ۭ ذٰلِكَ تَاْوِيْلُ مَا لَمْ تَسْطِعْ عَّلَيْهِ صَبْرًا (۸۲)

دیوار کی مرمت کی حکمت

اب یہ ان یتیموں کی بستی کی ایک گرتی ہوئی دیوار کی مرمت کے لیے، بلا کسی معاوضے کے، انھوں نے جو زحمت برداشت کی اس کی حکمت سمجھائی کہ یہ دیوار درحقیقت دو یتیموں کی تھی، ان کے باپ نے، جو ایک نیک آدمی تھا، اس کے نیچے ایک دفینہ محفوظ کیا تھا کہ اس کے بعد یہ اس کے بچوں کے کام آئے گا۔ اگر یہ دیوار گر جاتی تو یہ دفینہ بستی کے لئیموں کے ہاتھ لگ جاتا اور یہ یتیم اس سے محروم ہو جاتے۔ اس وجہ سے تمھارے رب نے یہ چاہا کہ یہ دیوار ان بچوں کے جوان ہونے تک قائم رہے تاکہ وہ جوان ہو کر اپنا دفینہ خود نکال لیں۔ یہ درحقیقت تمھارے رب نے ان یتیموں پر رحم فرمایا ہے نہ کہ اس بستی کے لئیموں پر۔

'مَا فَعَلْتُهٗ عَنْ اَمْرِيْ' آخر میں حضرت خضرؑ نے یہ تصریح بھی فرما دی کہ ان کاموں میں سے کوئی کام

بھی انھوں نے اپنی رائے سے نہیں کیا بلکہ ہر کام خدا کے حکم سے کیا ہے۔

یہ مثال ہے اس بات کی کہ اس دنیا میں نابکاروں اور ناہنجاروں کو جو رعایت ملتی ہے اس سے قدرت کا اصل منشا نابکاروں کی پرورش کرنا نہیں ہوتا ہے بلکہ ان کے پردے میں قدرت اپنی ہی کسی مصلحت، خیر کی پرورش کرتی ہے اگرچہ اس کا علم ہمیں نہیں ہوتا۔ اس قسم کی رعایتوں سے اشرار تو اپنے اوپر صرف خدا کی حجت پوری کراتے ہیں۔ البتہ خدا ان کے ہاتھوں اہل حق کو نکھارتا ہے اور وہی اس دنیا کی خلقت کی اصل غایت ہیں۔

۱۴۔ مجموعۂ آیات ۶۰-۸۲ کے بعض ضمنی فوائد

حضرت موسیٰ کی اس سرگزشت کی اصل حکمت کی طرف تو ہم اوپر اشارہ کر چکے ہیں لیکن اس کے بعض ضمنی فوائد بھی قابلِ توجہ ہیں۔ ہم بالاختصار ان کی طرف بھی توجہ دلا دینا چاہتے ہیں۔

حکمت صرف طالبِ صادق کو ملتی ہے

پہلی بات یہ ہے کہ جس چیز کو حکمت کہتے ہیں ہر مدعی اس کا اہل نہیں ہوتا بلکہ یہ صرف طالب صادق کو حاصل ہوتی ہے۔ یہ حلوائی کی دکان کا حلوا نہیں ہے کہ جس کے جیب میں پیسے ہوں، اس کو خرید لے بلکہ اس کے لیے بڑا ریاض کرنا پڑتا ہے۔ یہ گھر بیٹھے بیٹھے حاصل نہیں ہو جاتی بلکہ بسا اوقات اس کی خاطر کسی خضرِ راہ کی تلاش میں ستو باندھ کر خشکی و تری کا سفر کرنا پڑتا ہے اور امکان اس کا بھی ہے کہ ساری عمر اس سفر ہی میں بیت جائے۔ یہ کوچۂ عشق ہے جس میں درجے اور مرتبے کے رکھ رکھاؤ سے دست بردار ہو کر سر کے بل جانا پڑتا ہے۔ اس کی خاطر اپنی انانیت قربان کرنی پڑتی ہے۔ جب تک کوئی شخص یہ قربانی دینے کے لیے تیار نہ ہو وہ اس راہ میں قدم بھی نہ رکھے۔ یہ خیر کثیر کا خزانہ ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے صرف ان لوگوں کے لیے خاص کیا ہے جو حکمت و معرفت کے سوا ہر خواہش و آرزو سے دست کش ہو جاتے ہیں۔ حضرت موسیٰؑ اور خضرؑ کی اس سرگزشت میں یہ ساری باتیں اتنی واضح ہیں کہ ان کے دلائل نقل کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

دوسری یہ کہ ہمارے لیے اصل رہنما شریعت ہے۔ ہمارا فرض ہے کہ ہر حال میں ہم اسی کی پیروی کریں اور اگر کسی کی کوئی بات اس کے خلاف دیکھیں تو اس پر نکیر کریں اگرچہ اس کا ارتکاب حضرت خضرؑ جیسے مرشد ہی سے کیوں نہ ہوا ہو۔ چنانچہ دیکھ لیجیے حضرت موسیٰؑ باوجودیکہ خضرؑ کے پاس اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے گئے تھے لیکن انھوں نے ان کی کسی ایسی بات پر صبر نہیں کیا جس کو انھوں نے شریعت کے خلاف پایا۔ حضرت موسیٰؑ مطمئن اس وقت ہوئے ہیں جب حضرت خضرؑ نے ان کو یہ اطمینان دلایا ہے کہ جو کچھ انھوں نے کیا ہے حکمِ خداوندی کی تعمیل میں کیا ہے، کوئی بات بھی اپنے جی سے نہیں کی ہے اور حضرت خضرؑ کی اس بات پر بھی ان کو اطمینان مجرد ان کے کہنے پر نہیں ہوا بلکہ وحیِ الٰہی کے ذریعہ سے ان کو پہلے سے یہ معلوم ہو چکا تھا کہ حضرت خضرؑ خدا کے خاص بندے ہیں، وہ جو کچھ بھی کریں گے خدا کے حکم کے مطابق کریں گے۔

اقطاب و ابدال کا تصور بے بنیاد ہے

اس وجہ سے ہم ان لوگوں کی بات بالکل بے سروپا سمجھتے ہیں جو کہتے ہیں کہ ہر دور میں حضرت خضرؑ کی طرح کچھ اقطاب و ابدال ہوتے ہیں جو بجائے خود حق و باطل کی کسوٹی ہوتے ہیں۔ ان کی باتیں شریعت پر نہیں پرکھی جائیں کیونکہ ان کے کام براہِ راست ارادۂ الٰہی کے تحت ہوتے ہیں۔ ہمارے نزدیک اقطاب و ابدال کی یہ اصطلاحات یک قلم باطل ہیں۔ قرآن و حدیث میں ان کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ لیکن فرض کر لیجیے کہ کوئی شخص قطبؒ ابدال ہے تو ہم اس کی خلاف شریعت باتوں کو کس طرح گوارا کر سکتے ہیں؟ حضرت موسیٰ نے حضرت خضرؑ کی باتیں تو، جیسا کہ معلوم ہوا، اس لیے گوارا فرمائیں کہ وحی کے ذریعہ سے معلوم ہو گیا تھا کہ حضرت خضرؑ نے جو کچھ کیا ہے حکم خداوندی کی تعمیل میں کیا ہے لیکن ہمارے پاس کسی کے متعلق یہ معلوم کرنے کا کیا ذریعہ ہے کہ وہ قطبؒ ابدال ہے اور اس کو خدا نے اپنی شریعت کی خلاف ورزی کا اختیار دیا ہے؟ خدا کی مرضیات و احکام معلوم کرنے کا واحد ذریعہ ہمارے پاس کتاب و سنت ہے۔ اس وجہ سے کوئی قطب و ابدال صاحب تو درکنار اگر خواجہ خضرؑ بھی آج آجائیں اور کسی کو قتل کر کے یہ صفائی پیش کریں کہ یہ انھوں نے خدا کے حکم کی تعمیل میں کیا ہے تو ہم ان کے عذر کو رد کر کے ان کے قتل کا فتویٰ دے دیں گے۔ اس لیے کہ ہمارے پاس 'اَلنَّفْسُ بِالنَّفْسِ' کا حکم قرآن میں موجود ہے لیکن خواجہ خضرؑ کے کسی قتل کا خدا کی طرف سے مجاز ہونے کا ثبوت ہمارے پاس موجود نہیں ہے۔

بعض شبہات کا ازالہ

تیسری چیز اس میں اسلوب بیان کا ایک اشکال ہے جو غور کرنے والے کے ذہن میں خلجان پیدا کرتا ہے۔ وہ یہ کہ ایک طرف تو حضرت خضرؑ اپنے ان تمام کاموں کو خدا کی طرف منسوب کرتے ہیں: 'مَا فَعَلْتُهٗ عَنْ اَمْرِیْ' (میں نے ان میں سے کوئی کام بھی اپنی رائے سے نہیں کیا ہے) لیکن دوسری طرف کشتی کے سلسلہ میں فرماتے ہیں 'فَاَرَدْتُّ اَنْ اَعِیْبَهَا' (میں نے یہ چاہا کہ اس کو عیب دار کر دوں) پھر لڑکے کے باب میں ارشاد ہوتا ہے کہ 'فَخَشِیْنَآ' (پس ہم کو اندیشہ ہوا) 'فَاَرَدْنَآ' (پس ہم نے ارادہ کیا) پھر دیوار کے معاملہ میں کہتے ہیں کہ 'فَاَرَادَ رَبُّكَ' (تیرے رب نے ارادہ کیا)۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ ایک ہی بات انھوں نے مختلف اسلوبوں سے کیوں فرمائی؟ جب انھوں نے سب کچھ خدا کے حکم کی تعمیل میں کیا تو اس بات کو ظاہر کرنے کے لیے واضح اسلوب 'اَرَادَ رَبُّكَ' کا تھا، پھر یہ کہنے کے کیا معنی کہ "میں نے چاہا کہ اس کو عیب دار کر دوں"۔ علاوہ ازیں یہ سب کچھ کیا تو تھا تنہا حضرت خضرؑ نے تو آگے جمع کا صیغہ 'اَرَدْنَا' کیوں استعمال کیا؟ اگر یہ فرض کیا جائے کہ اس میں انھوں نے اللہ تعالیٰ کو بھی شامل کر لیا ہے تو اس سلسلہ میں 'خَشِیْنَا' کا لفظ جو استعمال ہوا ہے وہ اللہ تعالیٰ کے لیے بالکل ہی ناموزوں ہے۔ خدا کو کسی چیز کا اندیشہ ہونے کے کیا معنی؟ ان شبہات کے ازالہ کے لیے مندرجہ ذیل امور پیش نظر رکھیے۔

ایک یہ کہ جب بندہ کا ارادہ بعینہٖ وہی ہے جو خدا کا ارادہ ہے تو وہ اس کو خدا کی طرف بھی منسوب کر سکتا ہے اور اپنی طرف بھی۔ اس میں اگر فرق ہوتا ہے تو محض بلاغت کے کسی تقاضے کے تحت ہوتا ہے۔ مثلاً بعض مرتبہ حسن ادب کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ ایک بات کو خدا کی طرف نسبت دینے کے بجائے بندہ خود اپنی طرف

اس کو منسوب کرے۔ مثلاً یہاں کشتی میں چھید کرنے کا معاملہ فی الظاہر چونکہ ذرا بد نما تھا اس وجہ سے اس کو حضرت خضرؑ نے اپنی طرف منسوب کیا۔ اور یتیموں کے دفینہ کو محفوظ کرانے کا معاملہ چونکہ فی الظاہر بھی اچھا تھا اس وجہ سے اس کو براہِ راست اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب فرمایا۔

دوسری یہ کہ اس طرح کے مواقع میں جب متکلم اپنے لیے جمع کا صیغہ استعمال کرتا ہے تو گویا وہ اس پورے زمرہ کے قول یا ارادہ کی ترجمانی کرتا ہے جس کے نمائندے یا جس کے آلہ و جارحہ کی حیثیت سے وہ کسی کام کو انجام دیتا ہے۔ حضرت خضرؑ نے یہ سارے کام چونکہ کارکنان قضا و قدر کے ایک آلہ و جارحہ کی حیثیت سے انجام دیے۔ اس وجہ سے وہ اس کی تعبیر کے لیے جمع کا صیغہ بھی استعمال کر سکتے تھے۔ اس کا فائدہ یہ ہوا کہ اس طرح وہ فعل تنہا ان کا فعل نہیں رہا بلکہ جملہ کارکنان قضا و قدر کا فعل بن گیا۔

تیسری یہ کہ یہاں خَشِیْنَآ کا جو لفظ استعمال ہوا ہے وہ اللہ تعالیٰ کے تعلق سے نہیں استعمال ہوا ہے بلکہ اس کو حضرت خضرؑ نے خاص اپنے اجتہاد کی تعبیر کے لیے استعمال کیا ہے۔ وحی یا فرشتہ کے ذریعہ سے ان کو جو حکم ہوا تھا وہ یہ تھا کہ فلاں لڑکے کو قتل کر دو اس لیے کہ اس کے ماں باپ مومن ہیں اور یہ کافر و نابکار اٹھے گا۔ اس حکم سے خود حضرت خضرؑ نے استنباط فرمایا کہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ لڑکا اپنے ماں باپ پر تعدی کرے گا۔ اس وجہ سے اس کے قتل کا حکم ہوا ہے۔ یہ ان کا اپنا استنباط تھا۔ اس کی تصریح اصل حکم الٰہی میں نہیں تھی۔ اس وجہ سے حضرت خضرؑ نے اس کو اپنے ایک اندیشہ کی حیثیت سے ذکر کیا اور اس کے لیے خَشِیْنَآ کا لفظ استعمال کیا۔

۱۵۔ آگے کا مضمون ——— آیات ۸۳ - ۹۸

یہود کا القا کردہ ایک سوال

آگے ذوالقرنین سے متعلق ایک سوال کا جواب آ رہا ہے۔ یہ سوال اٹھایا تو ہوگا یہود نے اور اس کے اٹھانے سے ان کا مقصد وہی رہا ہوگا جس کا ذکر ہم اصحابِ کہف سے متعلق سوال کے ضمن میں کر چکے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو پریشان کیا جائے اور دعوتِ حق کی راہ میں رکاوٹیں ڈالی جائیں لیکن اس کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش کرنے کا ذریعہ انھوں نے قریش کو بنایا ہوگا۔ یہ بات کہ یہ سوال یہود کا القا کردہ ہے اس وجہ سے قرینِ قیاس ہے کہ ذوالقرنین سے اصل دلچسپی یہود ہی کو تھی۔ وہ ان کو، جیسا کہ آگے تفصیل آ رہی ہے، اپنا محسن بادشاہ سمجھتے تھے اور ان کے انبیاء کے صحیفوں میں ان کا ذکر بھی تھا۔ قرآن نے سوال کرنے والوں کی مفسدانہ ذہنیت کو جانتے ہوئے محض اس وجہ سے اس کا جواب دیا کہ ذوالقرنین کی زندگی ان متمردین اور سرگشتگانِ دنیا کے لیے بہت سبق آموز ہو سکتی ہے جن کی ذہنیت اس سورہ میں شروع سے آخر تک زیرِ بحث چلی آ رہی ہے۔

ذوالقرنین

یہ ذوالقرنین کون تھے؟ اس سوال کے جواب میں ہمارے مفسرین کی رائیں مختلف ہیں۔ عام طور پر لوگوں

نے سکندر رومی کو ذوالقرنین قرار دیا ہے۔ بعض لوگ اس سے ایرانی بادشاہوں کیخسرو جسے خورس یا سائرس بھی کہا جاتا ہے یا دارا کو مراد لیتے ہیں۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ یہ ایک حمیری بادشاہ کا ذکر ہے۔ ان میں سے آخر الذکر قول کے حق میں کوئی قابلِ ذکر دلیل نہیں ہے۔ سکندر پر بھی وہ صفات منطبق نہیں ہوتیں جو قرآن نے ذوالقرنین کی بیان کی ہیں۔ قرآن نے ذوالقرنین کو پکا موحد، سچا مومن بالآخرۃ، نہایت ہی عادل اور رعایا پرور قرار دیا ہے جب کہ سکندر کے اندر ان میں سے کوئی ایک بات بھی نہیں تھی۔ سکندر کی فتوحات کا دائرہ بھی اتنا وسیع نہیں ہے، جتنا وسیع قرآن نے ذوالقرنین کی فتوحات کا بیان کیا ہے۔ اس کے لیے ذوالقرنین کے لقب کے استعمال کی بھی کوئی شہادت موجود نہیں ہے۔ دارا کی بعض مغربی و مشرقی مہمات کا ذکر تاریخوں میں ضرور ملتا ہے لیکن اس راہ میں اس کی حیثیت پیش رو کی نہیں ہے بلکہ وہ درحقیقت کیخسرو ہی کی قائم کردہ ریاست کو مستحکم کرنے والا تھا۔

البتہ کیخسرو کی شخصیت کے متعدد پہلو ایسے ہیں جن کی بنا پر اس کو قرآن میں مذکور ذوالقرنین کا مصداق قرار دیا جا سکتا ہے۔ یہ ایک صاحبِ ایمان اور عادل بادشاہ تھا جس کی عالی ظرفی اور مقبولیت کا اعتراف تمام پرانے اور نئے مؤرخین کو ہے۔ قرآن نے اس کی تین مہمات کا ذکر کیا ہے۔ جن میں سے دو مہمیں۔ مشرقی اور مغربی ـــــ تو تاریخ کی روشنی میں بھی ثابت ہیں۔ تیسری مہم کے بارے میں اگرچہ مورخین کوئی بات وثوق کے ساتھ نہیں کہتے لیکن شواہد اور قرائن اس کے بھی موجود ہیں۔

یہود کے صحیفوں میں ذوالقرنین کا ذکر

یہود پر اس بادشاہ کا عظیم احسان ہے کہ اس نے بابل کی اسیری سے ان کو نجات دلائی اور اس کی مدد سے بیت المقدس اور ہیکل کی از سر نو تعمیر ہوئی۔ یہود کے انبیاء نے ان کی پیشین گوئی بھی کی تھی۔ یسعیاہ میں ہے:

> "خداوند اپنے ممسوح خورس کے حق میں یوں فرماتا ہے کہ میں نے اس کا دہنا ہاتھ پکڑا کہ امتوں کو اس کے سامنے زیر کروں اور بادشاہوں کی کمریں کھلوا ڈالوں" ۴۵: ۱

اس پیشین گوئی میں "خورس" "سائرس" کی ذرا سی بدلی ہوئی شکل ہے جو کیخسرو کے نام کا یونانی تلفظ ہے۔ اسی طرح دانیال نبی کا ایک مکاشفہ یوں منقول ہے۔

> تب میں نے آنکھ اٹھا کر نظر کی اور کیا دیکھتا ہوں کہ دریا کے پاس ایک مینڈھا کھڑا ہے جس کے دو سینگ ہیں۔ دونوں سینگ اونچے تھے لیکن ایک دوسرے سے بڑا تھا اور بڑا دوسرے کے بعد نکلا تھا۔ میں نے اس مینڈھے کو دیکھا کہ مغرب و شمال و جنوب کی طرف سینگ مارتا ہے۔ یہاں تک کہ نہ کوئی جانور اس کے سامنے کھڑا ہو سکا اور نہ کوئی اس سے چھڑا سکا۔" (دانی ایل ۸: ۳-۴)

اس مکاشفہ کی تعبیر حضرت دانیال کو حضرت جبرائیل نے یہ بتائی کہ دو سینگوں سے مراد مادا (MEDIA) اور فارس کی دو بادشاہتیں ہیں جن کو موعود بادشاہ زیرِ نگیں کرے گا ـــــ چنانچہ یہ واقعہ ہے کہ کیخسرو نے یہ دونوں

سلطنتیں زیرِ نگیں کریں اور اسی بنیاد پر اس کا لقب ذوالقرنین (دو سینگوں والا) قرار پایا — اس کا ایک مجسمہ ماضی قریب میں اصطخر کے قریب دریافت ہوا ہے جو اردشیر اول کے زمانہ کا نصب کردہ ہے۔ اس میں اس کے تاج میں دو سینگ بھی ابھرے ہوئے نظر آتے ہیں۔ یہ ہو سکتا ہے کہ یہ مجرد جلال و جبروت کی علامت کے طور پر ابھارے گئے ہوں یا ان کے اندر وہی رمز پوشیدہ ہو جس کا حوالہ اوپر گزرا۔ اس روشنی میں اب آیات کی تلاوت فرمائیے:

آیات ۸۳-۹۸

وَيَسْـَٔلُونَكَ عَن ذِى ٱلْقَرْنَيْنِ ۖ قُلْ سَأَتْلُوا۟ عَلَيْكُم مِّنْهُ ذِكْرًا ﴿٨٣﴾
إِنَّا مَكَّنَّا لَهُۥ فِى ٱلْأَرْضِ وَءَاتَيْنَٰهُ مِن كُلِّ شَىْءٍ سَبَبًا ﴿٨٤﴾ فَأَتْبَعَ
سَبَبًا ﴿٨٥﴾ حَتَّىٰٓ إِذَا بَلَغَ مَغْرِبَ ٱلشَّمْسِ وَجَدَهَا تَغْرُبُ فِى
عَيْنٍ حَمِئَةٍ وَوَجَدَ عِندَهَا قَوْمًا ۗ قُلْنَا يَٰذَا ٱلْقَرْنَيْنِ
إِمَّآ أَن تُعَذِّبَ وَإِمَّآ أَن تَتَّخِذَ فِيهِمْ حُسْنًا ﴿٨٦﴾ قَالَ أَمَّا مَن
ظَلَمَ فَسَوْفَ نُعَذِّبُهُۥ ثُمَّ يُرَدُّ إِلَىٰ رَبِّهِۦ فَيُعَذِّبُهُۥ عَذَابًا
نُّكْرًا ﴿٨٧﴾ وَأَمَّا مَنْ ءَامَنَ وَعَمِلَ صَٰلِحًا فَلَهُۥ جَزَآءً ٱلْحُسْنَىٰ ۖ وَ
سَنَقُولُ لَهُۥ مِنْ أَمْرِنَا يُسْرًا ﴿٨٨﴾ ثُمَّ أَتْبَعَ سَبَبًا ﴿٨٩﴾ حَتَّىٰٓ إِذَا
بَلَغَ مَطْلِعَ ٱلشَّمْسِ وَجَدَهَا تَطْلُعُ عَلَىٰ قَوْمٍ لَّمْ نَجْعَل لَّهُم
مِّن دُونِهَا سِتْرًا ﴿٩٠﴾ كَذَٰلِكَ وَقَدْ أَحَطْنَا بِمَا لَدَيْهِ خُبْرًا ﴿٩١﴾
ثُمَّ أَتْبَعَ سَبَبًا ﴿٩٢﴾ حَتَّىٰٓ إِذَا بَلَغَ بَيْنَ ٱلسَّدَّيْنِ وَجَدَ مِن
دُونِهِمَا قَوْمًا لَّا يَكَادُونَ يَفْقَهُونَ قَوْلًا ﴿٩٣﴾ قَالُوا۟ يَٰذَا ٱلْقَرْنَيْنِ
إِنَّ يَأْجُوجَ وَمَأْجُوجَ مُفْسِدُونَ فِى ٱلْأَرْضِ فَهَلْ نَجْعَلُ لَكَ
خَرْجًا عَلَىٰٓ أَن تَجْعَلَ بَيْنَنَا وَبَيْنَهُمْ سَدًّا ﴿٩٤﴾ قَالَ مَا مَكَّنِّى

فِيْهِ رَبِّيْ خَيْرٌ فَاَعِيْنُوْنِيْ بِقُوَّةٍ اَجْعَلْ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ رَدْمًا ﴿٩٥﴾
اٰتُوْنِيْ زُبَرَ الْحَدِيْدِ ۭ حَتّٰٓي اِذَا سَاوٰى بَيْنَ الصَّدَفَيْنِ قَالَ
انْفُخُوْا ۭ حَتّٰٓي اِذَا جَعَلَهٗ نَارًا ۙ قَالَ اٰتُوْنِيْٓ اُفْرِغْ عَلَيْهِ قِطْرًا ﴿٩٦﴾
فَمَا اسْطَاعُوْٓا اَنْ يَّظْهَرُوْهُ وَمَا اسْتَطَاعُوْا لَهٗ نَقْبًا ﴿٩٧﴾ قَالَ
هٰذَا رَحْمَةٌ مِّنْ رَّبِّيْ ۚ فَاِذَا جَاۗءَ وَعْدُ رَبِّيْ جَعَلَهٗ دَكَّاۗءَ ۚ وَكَانَ
وَعْدُ رَبِّيْ حَقًّا ﴿٩٨﴾

ترجمۂ آیات ۸۳-۹۸

اور وہ تم سے ذوالقرنین کے بابت سوال کرتے ہیں۔ کہہ دو، میں تم کو اس کا کچھ سبق آموز احوال سناؤں گا۔ ہم نے اس کو زمین میں بڑا اقتدار بخشا تھا اور اس کو ہر قسم کے اسباب وسائل سے بہرہ مند کیا تھا۔ پس وہ ایک مرتبہ وسائل کے درپے ہوا یہاں تک کہ وہ سورج کے غروب ہونے کے مقام تک جا پہنچا۔ اس کو دیکھا کہ گویا وہ ایک سیاہ چشمے میں ڈوبتا ہے۔ اور اس کے پاس اس کو ایک قوم ملی۔ ہم نے کہا اے ذوالقرنین چاہو ان کو سزا دو چاہو ان کے ساتھ حسن سلوک کرو۔ اس نے کہا جو ان میں سے ظلم کا مرتکب ہوگا تو اس کو تو ہم بھی سزا دیں گے، پھر وہ اپنے رب کی طرف بھی لوٹایا جائے گا اور وہ اس کو نہایت سخت عذاب دے گا۔ رہا وہ جو ایمان اور عمل صالح اختیار کرے گا تو اس کے لیے اللہ کے پاس بھی اچھا بدلہ ہے اور ہم بھی اس کے ساتھ آسان معاملہ کریں گے۔ ۸۳-۸۸

پھر اس نے ایک اور مہم کی تیاری کی یہاں تک کہ جب وہ طلوعِ آفتاب کے مقام پر پہنچا تو اس نے اس کو ایک ایسی قوم پر طلوع ہوتے دیکھا جس کے لیے آفتاب کے بالمقابل ہم نے کوئی پردہ نہیں رکھا تھا۔ ایسا ہی ہم نے کیا اور ہم اس کے احوال سے خوب باخبر تھے
۸۹-۹۱

اس نے پھر ایک اور مہم کی تیاری کی یہاں تک کہ دو پہاڑوں کے درمیان کے درّے تک جا پہنچا۔ ان دونوں پہاڑوں کے ورے اس کو ایسے لوگ ملے جو کوئی بات سمجھ نہیں پاتے تھے۔ انھوں نے درخواست کی کہ اے ذوالقرنین، یاجوج و ماجوج ہمارے ملک میں فساد مچاتے رہتے ہیں تو کیا یہ ہو سکتا ہے کہ ہم آپ کے لیے خرچ کا بندوبست کر دیں اور آپ ہمارے اور ان کے درمیان ایک دیوار کھڑی کر دیں۔ اس نے جواب دیا کہ میرے رب نے جو کچھ میرے تصرف میں دے رکھا ہے وہ کافی ہے البتہ تم ہاتھ پاؤں سے میری مدد کرو، میں تمہارے اور ان کے درمیان ایک موٹی دیوار کھڑی کیے دیتا ہوں۔ میرے پاس لوہے کے ٹکڑے لاؤ۔ یہاں تک کہ جب بیچ کے خلا کو بھر دیا، حکم دیا کہ اس کو خوب دھونکو۔ یہاں تک کہ جب اس کو آگ کر دیا حکم دیا کہ اب تانبا لاؤ اس پر انڈیل دوں۔ پس نہ تو وہ اس پر چڑھ ہی سکتے تھے اور نہ اس میں نقب ہی لگا سکتے تھے۔ اس نے کہا یہ میرے رب کا ایک فضل ہے۔ پس جب میرے رب کے وعدے کا ظہور ہوگا اس کو ہموار کر دے گا اور میرے رب کا وعدہ شدنی ہے۔ ۹۲-۹۸

۱۶- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنْ ذِي الْقَرْنَيْنِ ۭ قُلْ سَاَتْلُوْا عَلَيْكُمْ مِّنْهُ ذِكْرًا (۸۳)

سائرس (کیخسرو) کے لیے ذوالقرنین کا لقب — سائرس (کیخسرو) کے لیے ذوالقرنین کا لقب، معلوم ہوتا ہے، عرب کے یہود کا اختیار کردہ ہے۔ 'سَاَتْلُوْا' میں ایک قسم کی اپیل مضمر ہے۔ مطلب یہ ہے کہ پوچھتے ہو تو میں ان کی سرگزشت کا کچھ سبق آموز حصہ سناؤں گا۔ امید ہے گوش دل سے سنو گے اور اس سے فائدہ اٹھاؤ گے۔ لفظ 'ذکر' میں یاددہانی، تذکیر اور سبق آموزی کا جو مفہوم مضمر ہے وہ اہل نظر سے مخفی نہیں ہے۔

اِنَّا مَكَّنَّا لَهٗ فِي الْاَرْضِ وَاٰتَيْنٰهُ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ سَبَبًا (۸۴)

'سبب' کا مفہوم — 'سَبَب' کے اصل معنی وسیلہ و ذریعہ کے ہیں۔ یہاں 'مِنْ كُلِّ شَيْءٍ سَبَبًا' کا مطلب یہ ہے کہ اس کی مملکت میں ہر قسم کے وسائل و ذرائع (RESOURCES) موجود تھے۔

کیخسرو کی عظیم سلطنت

کیخسرو، جس کا اصل نام کورش تھا، کے متعلق یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ چھٹی صدی قبل مسیح کے وسط میں اپنے والد کمبوچیہ کی چھوٹی سی ریاست انشان کا والی مقرر ہوا۔ برسرِ اقتدار آتے ہی اس کو ماداکے حکمران کے حملے کا مقابلہ کرنا پڑا جس میں اس کو فتح حاصل ہوئی۔ بعد کے چند سالوں میں اس نے وقت کی تمام بڑی ریاستوں کو زیر کر لیا اور بلخ اور مکران سے لے کر بحیرۂ روم تک اس کا سکہ چلنے لگا۔ اس سے پہلے اس سے زیادہ وسیع اور پرشکوہ سلطنت کوئی اور قائم نہیں ہوئی۔

فَاَتْبَعَ سَبَبًا (۸۵)

'اتباع' کے معنی پیچھے لگنے، درپے ہونے، تعاقب کرنے کے ہیں۔ 'اَتْبَعَ سَبَبًا' کے معنی ہوں گے اس نے وسائل و ذرائع کا جائزہ لیا، اس کا اہتمام کیا۔ پھر یہیں سے ذرا وسیع معنی میں یہ کسی مہم کی تیاری کے لیے استعمال ہوا۔

حَتّٰٓى اِذَا بَلَغَ مَغْرِبَ الشَّمْسِ وَجَدَهَا تَغْرُبُ فِيْ عَيْنٍ حَمِئَةٍ وَّوَجَدَ عِنْدَهَا قَوْمًا ۜ قُلْنَا يٰذَا الْقَرْنَيْنِ اِمَّآ اَنْ تُعَذِّبَ وَاِمَّآ اَنْ تَتَّخِذَ فِيْهِمْ حُسْنًا (۸۶)

'مغرب الشمس' کا مفہوم

'مَغْرِبَ الشَّمْسِ' تک پہنچنا تعبیر ہے اس مفہوم کی کہ وہ مغرب میں ساحلِ سمندر تک پہنچ گیا۔ 'وَجَدَهَا تَغْرُبُ فِيْ عَيْنٍ حَمِئَةٍ' یعنی وہاں غروبِ آفتاب کے وقت ایسا نظر آتا کہ گویا وہ کسی سیاہ چشمہ میں ڈوب رہا ہے۔ یہاں اس ٹکڑے سے مقصود اس حقیقت کا اظہار ہے کہ مغرب کی تمام دنیائے معلوم جہاں تک اس وقت کے انسان کے قدم پہنچ سکتے تھے وہاں تک ذوالقرنین نے زیرِ نگین کر لی۔ اب آگے سمندر تھا جس سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ مغرب میں دنیا کی آخری حد یہی ہے اور سورج یہیں ڈوبتا ہے۔

کیخسرو کی مغربی مہم

یہ کیخسرو کی پہلی مہم کی طرف اشارہ ہے جو اس کے دارالسلطنت ہمتانہ (موجودہ ہمدان) سے مغرب کے لیے ہوئی۔ اس مہم میں اس نے ماد (موجودہ عراق و شام) اور لیڈیا (موجودہ ترکی) کو زیرِ نگین کیا۔ لیڈیا کے دارالحکومت سارڈیس (نزد سمرنا) میں وہاں کے حکمران کروسس کو اس نے شکست دی جس کو بابل، مصر اور اسپارٹا کی حکومتوں کی حمایت بھی حاصل تھی۔ اس مہم میں کیخسرو کے قدم بحیرۂ روم کے ساحل ہی پر جا کے رکے۔

وَّوَجَدَ عِنْدَهَا قَوْمًا ۜ قُلْنَا يٰذَا الْقَرْنَيْنِ اِمَّآ اَنْ تُعَذِّبَ وَاِمَّآ اَنْ تَتَّخِذَ فِيْهِمْ حُسْنًا ۔

لفظ قول رویہ اور اختیار کی تعبیر کے لیے

لفظ 'قول' صورت حال، اختیار، اور رویہ کی تعبیر کے لیے بھی آتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس فتح کے نتیجہ میں جو رعایا اس کے قبضہ میں آئی وہ اس طرح اس کے قدموں میں ہم نے ڈال دی اور ایسا اختیار اس پر اس کو دے دیا کہ چاہے وہ ان کو سزا دے چاہے ان کے ساتھ احسان کرے، کوئی اس کے اختیار و اقتدار میں مداخلت کرنے والا نہیں تھا۔ یہ مطلب نہیں ہے کہ خدا نے قولاً اس کو اجازت دے دی کہ وہ چاہے ظلم کرے چاہے عدل، اس کو دونوں کا یکساں حق ہے۔ حق تو صرف عدل اور احسان کا ہے۔ ہر بادشاہ اور حکمران خدا کی طرف سے عدل و احسان پر مامور ہے لیکن اس کو چھوٹ ظلم و ناانصافی کے لیے بھی ملی ہوتی ہے۔ اگر وہ عدل کرے گا تو خدا سے

اس کا انعام پائے گا اور اگر ظلم کرے گا تو اس کی سزا بھگتے گا۔ حکمرانوں کے لیے اصل ہدایت وہی ہے جو اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤدؑ کو خطاب کر کے دی ہے۔

يٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيْفَةً فِي الْاَرْضِ فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ اِنَّ الَّذِيْنَ يَضِلُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌۢ بِمَا نَسُوْا يَوْمَ الْحِسَابِ (صٓ - ۲۶)

اے داؤدؑ ہم نے تم کو زمین میں خلیفہ بنایا ہے تو لوگوں کے درمیان انصاف کے ساتھ فیصلہ کرو اور خواہش کی پیروی نہ کرو کہ وہ تمہیں اللہ کی راہ سے ہٹا دے۔ جو لوگ اللہ کی راہ سے بھٹک جائیں گے، ان کے لیے سخت عذاب ہے بوجہ اس کے کہ وہ روز حساب کو بھول بیٹھے۔

آیت زیر بحث میں ذوالقرنین سے اسی نوع کا خطاب ہے جس طرح کا خطاب سورۂ صٓ میں حضرت سلیمان علیہ السلام سے ہے۔

هٰذَا عَطَاۗؤُنَا فَامْنُنْ اَوْ اَمْسِكْ بِغَيْرِ حِسَابٍ (صٓ - ۳۹)

یہ ہماری تمہارے اوپر بے حساب بخشش ہے تو چاہے تم لوگوں پر احسان کرو، چاہے روک رکھو۔

ظاہر ہے کہ یہ صرف اس آزادی کا بیان ہے جو انسان کو حاصل ہے کہ وہ چاہے کفر کی راہ اختیار کرے یا ایمان کی۔ اسی طرح اس کو یہ اختیار بھی حاصل ہے کہ اللہ کی نعمتیں پا کر چاہے جود و کرم اور احسان و انفاق کی راہ اختیار کرے چاہے خست و بخالت کی۔ اس کو آزادی دونوں کی ملی ہوتی ہے لیکن خدا کی نگاہوں میں ان میں سے پسندیدہ ایک ہی ہے اور اسی کا اس نے اپنے بندوں سے مطالبہ کیا ہے۔

قَالَ اَمَّا مَنْ ظَلَمَ فَسَوْفَ نُعَذِّبُهٗ ثُمَّ يُرَدُّ اِلٰى رَبِّهٖ فَيُعَذِّبُهٗ عَذَابًا نُّكْرًا ۝ وَاَمَّا مَنْ اٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهٗ جَزَاۗءَ ۨالْحُسْنٰى ۚ وَسَنَقُوْلُ لَهٗ مِنْ اَمْرِنَا يُسْرًا (۸۷-۸۸)

قول بلسان عمل

جس طرح اوپر کا قول بلسانِ حال ہے اسی طرح یہ قول بلسانِ عمل ہے یعنی اس نے اپنے رویہ اور طرزِ عمل سے یہ شہادت دی کہ جو ظلم و فساد کی راہ اختیار کرے گا اس کو تو ہم بھی سزا دیں گے اور اس سے زیادہ سخت سزا وہ خدا کے ہاں پائے گا، البتہ جو ایمان اور عمل صالح کی راہ اختیار کریں گے وہ اپنے ایمان و عمل کے صلہ میں خدا کے ہاں بھی اچھے انجام سے سرفراز ہوں گے اور ہم بھی ان کے معاملہ میں نہایت نرم پالیسی اختیار کریں گے۔

رویہ اور عمل کی تعبیر قول سے عربی زبان کا ایک معروف اسلوب ہے۔ قرآن میں یہود کا یہ قول جو نقل ہوا ہے کہ 'قَالُوْا سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا'، یہ، جیسا کہ بقرہ ۹۳ کے تحت ہم نے اس کی تصریح کی ہے، ان کے عمل اور رویہ کی تعبیر ہے۔ خود اس آیت میں بھی 'وَسَنَقُوْلُ لَهٗ مِنْ اَمْرِنَا يُسْرًا' کے ٹکڑے میں قول سے مراد رویہ ہی ہے۔ اس لیے کہ اس کا ظاہر مفہوم یہی ہے کہ ہم بھی ان کے ساتھ نرم رویہ یا نرم پالیسی اختیار کریں گے۔ بعض لوگوں نے محض اوپر کے 'قُلْنَا' اور اس 'قَالَ' کی بنیاد پر ذوالقرنین کو نبی مان لیا ہے۔ لیکن ہمارے نزدیک مجرد

یہ دلیل اس کو نبی ماننے کے لیے کافی نہیں ہے۔ البتہ اس کے ایک عادل اور خدا ترس بادشاہ ہونے کی شہادت ان آیات سے بھی ملتی ہے اور تاریخ سے بھی۔

ذوالقرنین کے متعلق تاریخ کی شہادت

مورخین لکھتے ہیں کہ سائرس کی فوج جس شہر کو فتح کرتی اس کے شہریوں کو ذرا بھی گزند نہ پہنچاتی۔ بادشاہ مفتوحہ قوموں کے لیے سراپا رحمت و شفقت تھا۔ اس نے تمام بھاری ٹیکس اور خراج بالکل معاف کر دیے۔ اس کے سخت دشمن بھی جب اس کے سامنے گرفتار کر کے لائے گئے تو اس نے ان کی معافی کا اعلان کر دیا۔ اس کے حسن سلوک سے متاثر ہو کر انھوں نے بادشاہ کو اپنی غیر مشروط وفاداری کا یقین دلایا۔ ماد کے حملہ آور بادشاہ کو، اس کے شکست کھانے کے بعد، کیخسرو نے اس کی موت تک اپنے محل میں رکھا۔ اس کو دس ہزار پیادے اور پانچ ہزار سوار عطا کیے۔ اس طرح اس کی شاہانہ حیثیت برقرار رکھی۔

ذوالقرنین مذہب زردشت کے پیرو تھے

ان آیات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ذوالقرنین ایک مومن، موحد اور آخرت پر یقین رکھنے والا بادشاہ تھا۔ تاریخوں سے بھی اس بات کی تائید و تصدیق ہوتی ہے۔ سائرس زردشت کا ہم عصر اور اس کا پیرو تھا۔ زردشت کی اصل تعلیمات میں ایمان باللہ اور ایمان بالآخرۃ کا صحیح تصور ملتا ہے۔ اگرچہ بعد میں دوسرے مذاہب کی طرح یہ مذہب بھی تحریفات کی دست برد سے محفوظ نہیں رہا بلکہ ثنویت کے تصورات اس پر غالب آگئے۔ دارا اپنے کتبوں میں اہورمزدا (اللہ) کا شکر ادا کرتا ہے، اپنی سلطنت کو اس کے فضل و کرم سے منسوب کرتا ہے اور اس سے راہ راست پر قائم رہنے کی توفیق مانگتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ دینداری اس کو ذوالقرنین ہی سے وراثت میں ملی۔ ذوالقرنین کو انبیائے بنی اسرائیل سے بھی بڑی عقیدت تھی۔ یہ چیز بھی اس کے اندر دینی رجحانات کی تقویت کا باعث ہوئی۔

ثُمَّ اَتْبَعَ سَبَبًا ۝ حَتّٰٓى اِذَا بَلَغَ مَطْلِعَ الشَّمْسِ وَجَدَهَا تَطْلُعُ عَلٰى قَوْمٍ لَّمْ نَجْعَلْ لَّهُمْ مِّنْ دُوْنِهَا سِتْرًا ۝ (۸۹-۹۰)

کیخسرو کی مشرقی مہم

یہ کیخسرو کی دوسری مہم کا ذکر ہے۔ بَلَغَ مَطْلِعَ الشَّمْسِ کے الفاظ سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ یہ مہم مشرقی سمت میں تھی اور اس سمت میں بھی وہ آخری حدود تک پہنچ گیا۔ مورخین لکھتے ہیں کہ اس کا سبب مکران، قندھار اور بلخ کے وحشی اور صحراگرد قبائل کی سرکشی ہوئی۔ انھوں نے فارس کی مشرقی سرحد پر بدامنی پھیلا رکھی تھی۔ بالآخر ذوالقرنین کو ان کی سرکوبی کے لیے اٹھنا پڑا اور یہ سارے علاقے اس نے فتح کر لیے۔ قرآن نے ان قبائل کے باب میں یہ جو کہا ہے کہ ان کے اور سورج کے مابین کوئی پردہ حائل نہیں تھا، یہ ان کے انتہائی وحشی اور غیر متمدن ہونے کی تصویر ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ قبائل گھر در اور تعمیر و تمدن سے بالکل ناآشنا اپنی وحشت کے بالکل ابتدائی دور میں تھے، اور خانہ بدوشی کی زندگی بسر کرتے تھے۔

ذوالقرنین اعلیٰ صفات سے متصف تھے۔

كَذٰلِكَ ۭ وَقَدْ اَحَطْنَا بِمَا لَدَيْهِ خُبْرًا ۝ (۹۱)

یہ آیت بالکل اسی موقع و محل میں ہے جس موقع و محل میں سورۂ انبیاء کی آیت وَلَقَدْ اٰتَيْنَآ اِبْرٰهِيْمَ

رُشْدَهٗ مِنْ قَبْلُ وَكُنَّا بِهٖ عٰلِمِيْنَ (۵۱) ہے وہاں حضرت ابراہیمؑ کے منصب امامت و ہدایت پر سرفراز کیے جانے کی حکمت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ ہم اس سے اچھی طرح واقف تھے، یعنی ہم نے اگر اس کو یہ سرفرازی بخشی تو یوں ہی نہیں بخش دی بلکہ اس کی ان صلاحیتوں سے اچھی طرح واقف تھے، جو اس کو اس منصب کا اہل ثابت کرتی تھیں۔ اسی طرح یہاں ذوالقرنین کی ان فتوحات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے، جو اللہ کی عنایات سے ان کو حاصل ہوئیں، فرمایا کہ اس وسیع اقتدار اور عظیم امانت کو سنبھالنے کے لیے جس ظرف اور جن صلاحیتوں کی ضرورت تھی وہ ان کے اندر بدرجہ کمال موجود تھیں اور ہم ان سے اچھی طرح باخبر تھے۔

ثُمَّ اَتْبَعَ سَبَبًا ۝ حَتّٰٓى اِذَا بَلَغَ بَيْنَ السَّدَّيْنِ وَجَدَ مِنْ دُوْنِهِمَا قَوْمًا ۙ لَّا يَكَادُوْنَ يَفْقَهُوْنَ قَوْلًا ۝ قَالُوْا يٰذَا الْقَرْنَيْنِ اِنَّ يَاْجُوْجَ وَمَاْجُوْجَ مُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ فَهَلْ نَجْعَلُ لَكَ خَرْجًا عَلٰٓى اَنْ تَجْعَلَ بَيْنَنَا وَبَيْنَهُمْ سَدًّا ۝ قَالَ مَا مَكَّنِّيْ فِيْهِ رَبِّيْ خَيْرٌ فَاَعِيْنُوْنِيْ بِقُوَّةٍ اَجْعَلْ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ رَدْمًا ۝ اٰتُوْنِيْ زُبَرَ الْحَدِيْدِ ۭ حَتّٰٓى اِذَا سَاوٰى بَيْنَ الصَّدَفَيْنِ قَالَ انْفُخُوْا ۭ حَتّٰٓى اِذَا جَعَلَهٗ نَارًا ۙ قَالَ اٰتُوْنِيْٓ اُفْرِغْ عَلَيْهِ قِطْرًا ۝ فَمَا اسْطَاعُوْٓا اَنْ يَّظْهَرُوْهُ وَمَا اسْتَطَاعُوْا لَهٗ نَقْبًا ۝ قَالَ هٰذَا رَحْمَةٌ مِّنْ رَّبِّيْ ۚ فَاِذَا جَاۗءَ وَعْدُ رَبِّيْ جَعَلَهٗ دَكَّاۗءَ ۚ وَكَانَ وَعْدُ رَبِّيْ حَقًّا ۝ (۹۲-۹۸)

یکخسرو کی تیسری مہم اور سد کی تعمیر

یہ کیخسرو کی تیسری مہم کا ذکر ہے۔ مورخین نے اس مہم کا کوئی ذکر نہیں کیا ہے لیکن وہ اتنا بتاتے ہیں کہ بابل کی فتح کے بعد وہ شمال مشرق کی سمت میں ایک سفر پر روانہ ہوا۔ غالباً اس کی منزل بحر خزر (کیسپین) کے مشرق میں ترکستان کی جانب تھی۔ اسی سفر کے دوران وہ کسی کھڈ میں گر کر ہلاک ہو گیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس مہم کے دوران اس سد کی تعمیر کا وہ واقعہ پیش آیا ہے جس کا قرآن نے یہاں تذکرہ کیا ہے۔

یاجوج و ماجوج

یہ سد، جیسا کہ قرآن سے واضح ہے یاجوج و ماجوج کے حملوں کو روکنے کے لیے تعمیر کی گئی۔ یاجوج ماجوج سے مراد نوحؑ کے بیٹے یافث کی وہ اولاد ہے جو ایشیا کے شمالی علاقوں میں آباد ہوئی۔ حزقی ایل فرماتے ہیں۔

"اور خداوند کا کلام مجھ پر نازل ہوا کہ اے آدم زاد جوج کی طرف جو ماجوج کی سرزمین کا ہے اور روش، مسک اور توبل کا فرماں روا ہے متوجہ ہو اور اس کے خلاف نبوت کر۔" (حزقی ایل ۳۸:۱)

"اور کہہ خداوند یوں فرماتا ہے دیکھ اے جوج! روش، مسک اور توبل کے فرمانروا میں تیرا مخالف ہوں اور میں تجھے پھرا دوں گا اور تجھے لیے پھروں گا اور شمال کے دور اطراف سے چڑھا لاؤں گا۔ (حزقی ایل ۳۹:۱-۲)

روش، مسک اور توبل کے نام اب تک رشیا، ماسکو اور توبالسک کی صورت میں موجود ہیں اور یہ علاقے فلسطین سے شمال کے بعید اطراف میں ہیں۔ یاجوج و ماجوج کے قبائل بحر خزر کے شمال کی جانب اور

وسط ایشیا میں منگولیا کے علاقہ میں آباد تھے۔ ایران پران کی تاخت ترکستان کے رستے سے بھی ہوتی تھی اور کوہ قفقاز کے درّے کی راہ سے بھی۔ کوہ قفقاز (CAUCASUS) کیخسرو کے دارالحکومت سے ٹھیک شمال کو ہے۔ اس لیے عین ممکن ہے کہ بادشاہ نے درّے کو بند کر کے اس خطرے کا سدّباب کر دینا چاہا ہو۔

درۂ داریال کی آہنی دیوار

کوہ قفقاز کے درۂ داریال میں ایک آہنی دیوار موجود ہے۔ سیاحوں نے اپنے سفرناموں میں اس کا تذکرہ بھی کیا ہے۔ روایات میں ہے کہ عباسی خلیفہ واثق نے اس دیوار کی تحقیقات پر پچاس افراد کی ایک ٹیم مقرر کی، جس نے اس کے موقع و محل کا سراغ لگایا۔ اس دیوار کو لوگ دارا یا نوشیرواں کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ لیکن زیادہ شواہد اس بات کے حق میں ہیں کہ یہ کیخسرو نے تعمیر کرائی ہوگی۔ مثلاً یہ بات پایۂ تحقیق کو پہنچ چکی ہے کہ کیخسرو کی سلطنت کی شمالی حد کوہ قفقاز تک تھی۔ اتنا وسیع علاقہ زیرنگین کر لینا صرف اس صورت میں ممکن ہے جب اس نے اس علاقہ کو فتح کرنے کے لیے کوئی اقدام کیا ہو۔ کورش نام کا ایک شہر اور ایک دریا کوہ قفقاز کے علاقے میں اب تک موجود ہے۔ آہنی دیوار کو گورا کا نام دیا جاتا ہے جو کورش ہی کی بگڑی ہوئی شکل معلوم ہوتی ہے۔ یہ دیوار دھات سے دو پہاڑوں کے درمیان بنی ہوئی ہے اور اس کے نچلے حصے میں برسات کے پانی کے نکلنے کے لیے کچھ جگہ چھوڑ دی گئی ہے۔

'لَا یَكَادُوْنَ یَفْقَهُوْنَ قَوْلًا' سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ دوسری قوموں سے بھی ان لوگوں کا کوئی میل جول نہ تھا۔ اپنے علاقہ کے اندر محدود اور دوسروں سے بالکل بے تعلق زندگی رکھنے کی وجہ سے یہ دوسروں کی زبان مشکل ہی سے سمجھ پاتے تھے۔

ذوالقرنین کا جذبۂ خدمتِ خلق

'وَمَا مَكَّنِّیْ فِیْهِ رَبِّیْ خَیْرٌ فَاَعِیْنُوْنِیْ بِقُوَّةٍ'۔ 'قوۃ' سے مراد یہاں (MAN POWER) ہے۔ مطلب یہ ہے کہ رعایا نے دیوار کی تعمیر کے لیے مصارف کی فراہمی کی جو پیشکش کی وہ ازراہِ فیاضی ذوالقرنین نے قبول نہیں کی۔ فرمایا کہ جہاں تک مال کا تعلق ہے وہ جتنا کچھ میرے رب نے میرے تصرف میں دے رکھا وہ بہتر ہے۔ اس 'بہتر' کے لفظ میں یہ بات بھی مضمر ہے کہ وہ کافی ہے اور یہ بات بھی اس میں ہے کہ یہ مال ظلم و تعدی اور لوٹ مار کی ہر آلائش سے بالکل پاک ہے۔ البتہ لیبر تم فراہم کرو، میں تمہارے اور مفسدین یاجوج و ماجوج کے درمیان ایک دیوار کھڑی کیے دیتا ہوں۔

'اٰتُوْنِیْ زُبَرَ الْحَدِیْدِ حَتّٰۤی اِذَا سَاوٰی بَیْنَ الصَّدَفَیْنِ الآیۃ'۔ 'زبر' 'زبرۃ' کی جمع ہے۔ اس کے معنی آہن پارے کے ہیں۔ 'صدف' خول اور خلا کو کہتے ہیں۔ یہاں اس کے مثنیٰ استعمال کرنے میں اس کے دونوں طرفوں کا لحاظ ہے۔ جس طرح 'مشرقین' اور 'مغربین' میں ان کے دونوں اطراف کا لحاظ ہے اسی طرح 'صدفین' میں اس کے دونوں کناروں کا لحاظ ہے۔ مقصود یہی بتانا ہے کہ دونوں پہاڑوں کے درمیان کا خلا پورا بھر دیا گیا۔

'هٰذَا رَحْمَةٌ مِّنْ رَّبِّیْ فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ رَبِّیْ جَعَلَهٗ دَكَّآءَ وَكَانَ وَعْدُ رَبِّیْ حَقًّا'۔ 'دکاء'

اصل میں بے کوہان اونٹنی کو کہتے ہیں۔ یہاں اس سے مراد ہموار اور برابر کر دینا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جب اتنی عظیم الشان آہنی اور سیسہ پلائی ہوئی دیوار کھڑی ہو گئی کہ یاجوج و ماجوج کے لیے نہ اس پر چڑھنا ممکن رہا نہ اس میں نقب لگانا تو اس کو دیکھ کر ذوالقرنین نے تنک ظرفوں کی طرح غرور کے نشہ میں یہ نہیں کہا کہ میں یہ وہ کارنامہ کیے جا رہا ہوں کہ اس کے لیے کبھی زوال نہیں بلکہ پوری تواضع اور فروتنی کے ساتھ یہ کہا کہ یہ خدمت جو انجام پائی ہے محض میرے رب کے فضل و کرم کا کرشمہ ہے۔ آج یہ دیوار ناقابل تسخیر ہے لیکن جب میرے رب کے وعدے کے ظہور کا وقت آئے گا تو وہ اس کو پست و پامال کر دے گا اور میرے رب کا وعدہ شدنی ہے۔

پیچھے دو شخصوں کی تمثیل کے ذیل میں مغرورین دنیا کی یہ ذہنیت آپ پڑھ چکے ہیں کہ جب وہ اپنی کامیابی کے ہرے بھرے باغ میں داخل ہوتے ہیں تو غرور کے نشہ میں کہتے ہیں کہ مَآ اَظُنُّ اَنْ تَبِيْدَ هٰذِهٖٓ اَبَدًا میں گمان بھی نہیں کرتا کہ یہ باغ کبھی تباہ ہو سکے گا۔ اس کے بعد ایک عبد شاکر کی ذہنیت نمایاں فرمائی ہے کہ وہ اپنے بڑے سے بڑے کارنامہ پر بھی اپنے رب کا شکرگزار رہتا ہے اور اللہ کے شدنی وعدۂ آخرت کو یاد رکھتا ہے۔

۱۷- آگے کا مضمون ـــــ آیات ۹۹-۱۱۰

خاتمۂ سورہ

اب آگے خاتمۂ سورہ کی آیات ہیں۔ یہ خاتمہ نہایت بلیغ گریز سے شروع ہوا ہے۔ ذوالقرنین نے اپنے عظیم بند کو دیکھ کر یہ جو فرمایا کہ جب میرے رب کے شدنی وعدۂ قیامت کے ظہور کا وقت آئے گا تو یہ ساری بلندیاں پست اور یہ تمام تعمیرات مسمار ہو جائیں گی، اسی بات کو اللہ تعالیٰ نے وعدۂ قیامت کی یاد دہانی اور سرگشتگان دنیا کی تنبیہ کا ذریعہ بنا لیا اور انذار کا وہ مضمون جس سے سورہ کا آغاز ہوا تھا ایک نئے اسلوب سے پھر سامنے آگیا۔ ہم نظم قرآن کی اس خصوصیت کی طرف متعدد مقامات میں اشارہ کر چکے ہیں کہ سورتیں بالعموم اسی مضمون پر ختم ہوتی ہیں جس مضمون سے ان کا آغاز ہوتا ہے۔ اس سورہ کی تمہید اور خاتمہ پر ایک نظر ڈال کر دیکھ لیجیے یہ خصوصیت یہاں بھی موجود ہے۔ اس روشنی میں آگے کی آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۹۹-۱۱۰

وَتَرَكْنَا بَعْضَهُمْ يَوْمَئِذٍ يَّمُوْجُ فِيْ بَعْضٍ وَّنُفِخَ فِي الصُّوْرِ
فَجَمَعْنٰهُمْ جَمْعًا ﴿٩٩﴾ وَّعَرَضْنَا جَهَنَّمَ يَوْمَئِذٍ لِّلْكٰفِرِيْنَ
عَرْضَا ﴿١٠٠﴾ الَّذِيْنَ كَانَتْ اَعْيُنُهُمْ فِيْ غِطَآءٍ عَنْ ذِكْرِيْ وَكَانُوْا
لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ سَمْعًا ﴿١٠١﴾ اَفَحَسِبَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنْ يَّتَّخِذُوْا ع ۱۱

عِبَادِيْ مِنْ دُوْنِيْٓ اَوْلِيَآءَ ۭ اِنَّآ اَعْتَدْنَا جَهَنَّمَ لِلْكٰفِرِيْنَ نُزُلًا ﴿۱۰۲﴾
قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْاَخْسَرِيْنَ اَعْمَالًا ﴿۱۰۳﴾ اَلَّذِيْنَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ
فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ يُحْسِنُوْنَ صُنْعًا ﴿۱۰۴﴾
اُولٰۗىِٕكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ وَلِقَاۗىِٕهٖ فَحَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ
فَلَا نُقِيْمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَزْنًا ﴿۱۰۵﴾ ذٰلِكَ جَزَاۗؤُهُمْ جَهَنَّمُ
بِمَا كَفَرُوْا وَاتَّخَذُوْٓا اٰيٰتِيْ وَرُسُلِيْ هُزُوًا ﴿۱۰۶﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ
اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ كَانَتْ لَهُمْ جَنّٰتُ الْفِرْدَوْسِ
نُزُلًا ﴿۱۰۷﴾ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا لَا يَبْغُوْنَ عَنْهَا حِوَلًا ﴿۱۰۸﴾ قُلْ لَّوْ كَانَ
الْبَحْرُ مِدَادًا لِّكَلِمٰتِ رَبِّيْ لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ اَنْ تَنْفَدَ كَلِمٰتُ
رَبِّيْ وَلَوْ جِئْنَا بِمِثْلِهٖ مَدَدًا ﴿۱۰۹﴾ قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ
يُوْحٰٓى اِلَيَّ اَنَّمَآ اِلٰـهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ فَمَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَاۗءَ
رَبِّهٖ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَّلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖٓ
اَحَدًا ﴿۱۱۰﴾ ع ۱۲ ۹ ۲

ترجمۂ آیات ۹۹-۱۱۰

اور اس دن ہم چھوڑ دیں گے وہ ایک دوسرے سے موجوں کی طرح ٹکرائیں گے اور صور پھونکا جائے گا پس ہم ان سب کو اکٹھا کریں گے اور اس دن ہم جہنم کو ان کافروں کے روبرو پیش کریں گے جن کی آنکھوں پر ہماری تنبیہ سے پردہ پڑا رہا اور وہ سننے کی تاب نہیں لاتے تھے۔ ۹۹-۱۰۱

کیا ان کافروں نے گمان کیا کہ وہ میرے بندوں کو میرے سوا اپنے لیے کارساز

بنالیں گے؟ ہم نے کافروں کے لیے جہنم بطور ضیافت تیار کر رکھی ہے۔ ۱۰۲

کہو، کیا ہم تمھیں بتائیں کہ اپنے اعمال کے اعتبار سے سب سے زیادہ خسارے میں کون ہیں؟ وہ لوگ جن کی تمام سعی اس دنیا کی زندگی کے پیچھے اکارت گئی اور وہ گمان کرتے رہے کہ وہ بہت اچھا کام کر رہے ہیں۔ یہی لوگ ہیں جنھوں نے اپنے رب کی آیات اور اس کی ملاقات کا انکار کیا۔ پس ان کے اعمال اکارت گئے اور قیامت کے دن ہم ان کو ذرا بھی وزن نہ دیں گے۔ یہی جہنم ان کا بدلہ ہے بوجہ اس کے کہ انھوں نے کفر کیا اور میری آیات اور میرے رسولوں کا مذاق اڑایا۔ ۱۰۳-۱۰۶

بے شک جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے نیک کام کیے ان کے لیے فردوس کے باغوں کی ضیافت ہے جس میں ہمیشہ رہیں گے۔ وہاں سے ہٹنا نہیں چاہیں گے۔ ۱۰۷-۱۰۸

کہہ دو اگر میرے رب کی نشانیوں کو قلم بند کرنے کے لیے سمندر روشنائی بن جائے تو میرے رب کی نشانیوں کے ختم ہونے سے پہلے سمندر ختم ہو جائے گا اگرچہ ہم اس کے ساتھ اسی کے مانند اور سمندر ملا دیں۔ ۱۰۹

کہہ دو کہ میں تو بس تمھاری ہی طرح ایک بشر ہوں۔ مجھ پر وحی آتی ہے کہ تمھارا معبود بس ایک ہی معبود ہے۔ پس جو اپنے رب کی ملاقات کا متوقع ہو اسے چاہیے کہ نیک عمل کرے اور اپنے رب کی عبادت میں کسی کو شریک نہ ٹھہرائے۔ ۱۱۰

۱۸- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

بعض آثارِ قیامت کی طرف اشارہ

وَتَرَكْنَا بَعْضَهُمْ يَوْمَئِذٍ يَّمُوْجُ فِيْ بَعْضٍ وَّنُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَجَمَعْنٰهُمْ جَمْعًا (۹۹)

ذوالقرنین کے مذکورہ بالا فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ رَبِّيْ جَعَلَهٗ دَكَّآءَ، الآیۃ پر عطف کر کے یہ اللہ تعالیٰ نے

ظہور قیامت کے مزید آثار کی وضاحت فرما دی جس سے ذوالقرنین کی بات پوری ہو گئی۔ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ دریاؤں اور پہاڑوں کی جو حد بندیاں ہیں وہ سب ایک دن ختم ہو جائیں گی۔ اور قومیں ایک دوسرے سے اس طرح ٹکرائیں گی جس طرح سمندر میں موجیں ٹکراتی ہیں۔ سائنس کی ترقیوں نے اب دریاؤں اور پہاڑوں کی رکاوٹیں تو یوں بھی ختم کر دی ہیں لیکن معلوم ہوتا ہے کہ ظہور قیامت کے وقت یہ رہی سہی رکاوٹیں بھی بے معنی ہو جائیں گی اس آیت سے اور سورۂ انبیاء کی آیت حَتّٰٓى اِذَا فُتِحَتْ يَاْجُوْجُ وَمَاْجُوْجُ وَهُمْ مِّنْ كُلِّ حَدَبٍ يَّنْسِلُوْنَ ۹۶[1] سے یہ اشارہ بھی نکلتا ہے کہ قرب قیامت میں یافث کی اولاد ایک طوفان کی طرح تمام دنیا پر چھا جائے گی اور پھر اسی طوفان کے اندر سے قیامت نمودار ہو جائے گی۔ یہ باتیں اگرچہ متشابہات کی نوعیت کی ہیں ان کا صحیح علم صرف خدائے عالم الغیب ہی کو ہے لیکن اس کے جو آثار دنیا میں نمودار ہو رہے ہیں ان سے آنکھیں بند نہیں کی جا سکتیں۔

فَجَمَعْنٰهُمْ جَمْعًا میں جَمْعًا کی تاکید اس حقیقت کو ظاہر کر رہی ہے کہ صور قیامت سب کو جمع کرے گا۔ چھوٹے اور بڑے، عابد اور معبود، حاضر اور غائب کوئی بھی نہیں بچے گا۔ سب پکڑ بلائے جائیں گے۔

وَّعَرَضْنَا جَهَنَّمَ يَوْمَىِٕذٍ لِّلْكٰفِرِيْنَ عَرْضَا (۱۰۰)

جہنم کا مشاہدہ

یعنی آج تو عقل و دل کے اندھوں کو جہنم نظر نہیں آ رہی ہے لیکن اس دن ہم یہ جہنم ان کی آنکھوں کے سامنے کھڑی کر دیں گے کہ لو جس چیز کو عقل کی آنکھوں سے نہ دیکھ سکے اب اس کو تجربہ کی آنکھوں سے دیکھ لو۔

الَّذِيْنَ كَانَتْ اَعْيُنُهُمْ فِيْ غِطَاۗءٍ عَنْ ذِكْرِيْ وَكَانُوْا لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ سَمْعًا (۱۰۱)

یہ ان کافروں کی صفت بیان ہوئی ہے کہ ان کی عقل اس طرح ماری گئی تھی کہ پیغمبر کی کوئی یاد دہانی بھی ان کی آنکھیں کھولنے میں کامیاب نہ ہو سکی اور جب ہماری تنبیہات ان کو سنائی جاتی تھیں تو وہ ان کے سننے کی تاب نہیں لاتے تھے۔

اَفَحَسِبَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنْ يَّتَّخِذُوْا عِبَادِيْ مِنْ دُوْنِيْٓ اَوْلِيَاۗءَ ۭ اِنَّآ اَعْتَدْنَا جَهَنَّمَ لِلْكٰفِرِيْنَ نُزُلًا (۱۰۲)

شرکا کی تردید

یہ مخاطبوں کو متنبہ کیا ہے کہ کیا ان بدبختوں نے یہ گمان کر رکھا ہے کہ یہ ہمارے بندوں میں سے کچھ کو اپنا مددگار و کارساز بنا لیں گے جو قیامت کے دن ہم سے ان کی سفارش کر کے ان کو چھڑا لیں گے۔ یہ محض ان کی خوش فہمی ہے۔ ایسے تمام کافروں کے لیے ہمارے پاس جہنم بطور ضیافت تیار ہے جس سے کسی کی سعی و سفارش بھی ان کو چھڑا نہ سکے گی۔

قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْاَخْسَرِيْنَ اَعْمَالًا ۝ اَلَّذِيْنَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ يُحْسِنُوْنَ صُنْعًا ۝ اُولٰۗىِٕكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ وَلِقَاۗىِٕهٖ فَحَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فَلَا نُقِيْمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَزْنًا ۝ ذٰلِكَ جَزَاۗؤُهُمْ جَهَنَّمُ بِمَا كَفَرُوْا وَاتَّخَذُوْٓا اٰيٰتِيْ وَرُسُلِيْ هُزُوًا (۱۰۳-۱۰۶)

---

[1] یہاں تک کہ جب یاجوج و ماجوج کھول دیے جائیں گے اور وہ ہر بلندی سے پل پڑیں گے۔

مغروروں کے پندار پر ضرب یہ ان مغرورین دنیا کے اصل پندار پر ضرب لگائی ہے کہ یہ تو سمجھتے ہیں کہ بڑی کامیاب بازی کھیل رہے ہیں اور بڑے اچھے کام کر رہے ہیں لیکن ان کو بتا دو کہ آخرت میں سب سے زیادہ نامراد اور خسارے میں وہی لوگ ہوں گے جن کی تمام تگ و دو اس دنیا کی طلب کی راہ میں ہے۔ فرمایا کہ اس دنیا کے عشق نے ان کو ہماری آیات اور ہماری ملاقات سے بالکل بے نیاز و بے خوف کر دیا تو ان کے یہ سارے اعمال بالکل بے وزن و بے حقیقت ہو جائیں گے۔ آج تو یہ اپنے آپ کو بڑی چیز سمجھتے ہیں لیکن قیامت کے دن ہم ان کو کوئی وزن نہیں دیں گے۔ انھوں نے اپنے غرور میں ہماری آیات کی تکذیب کی اور ہمارے رسولوں کا مذاق اڑایا۔ اب اس کی پاداش میں جہنم کا مزا چکھیں۔

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ كَانَتْ لَهُمْ جَنَّاتُ الْفِرْدَوْسِ نُزُلًا ۝ خَالِدِينَ فِيهَا لَا يَبْغُونَ عَنْهَا حِوَلًا (۱۰۷-۱۰۸)

اہل ایمان کا صلہ یہ ایمان و عمل صالح کی راہ اختیار کرنے کا صلہ بتایا ہے کہ ان کے لیے فردوس کی ضیافت تیار ہے وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے اور اس میں ہمیشہ رہنے کے باوجود کبھی اس سے اکتائیں گے نہیں۔ اس میں ان کے مدارج بھی ہمیشہ بلند ہوتے رہیں گے اور ان کے لیے نعمتیں بھی برابر ان کی خواہش کے مطابق بدلتی رہیں گی۔ اس وجہ سے وہ اس کو چھوڑ کر کہیں اور جانے کے خواہشمند کبھی نہیں ہوں گے۔

قُل لَّوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِّكَلِمَاتِ رَبِّي لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ أَن تَنفَدَ كَلِمَاتُ رَبِّي وَلَوْ جِئْنَا بِمِثْلِهِ مَدَدًا (۱۰۹)

معجزہ کا مطالبہ کرنے والوں کو جواب کلمات سے مراد اللہ تعالیٰ کی قدرت و حکمت کی وہ نشانیاں ہیں جو آفاق و انفس میں پھیلی ہوئی ہیں۔ یہ ان منکرین کو جواب ہے جو قرآن کی آیات کا مذاق اڑاتے تھے اور پیغمبر سے کسی ظاہری اور حسی معجزے کا مطالبہ کرتے تھے۔ فرمایا کہ ان سے کہہ دو کہ اگر نشانیوں کے طلب گار ہو تو یہ کائنات، اتنی نشانیوں سے بھری ہوئی ہے کہ سمندر اگر روشنائی بن جائے تو اس کی روشنائی بھی ان کو قلم بند کرنے کے لیے ناکافی ہو اگرچہ اسی طرح کا ایک اور سمندر بھی اس کے ساتھ ملا لیا جائے۔ سورۂ لقمان میں یہ مضمون اس سے بھی زیادہ زوردار الفاظ میں بیان ہوا ہے۔ اور یہ سرتاسر بیان حقیقت ہے۔ اس میں ذرہ برابر بھی مبالغہ نہیں ہے۔ سمندر تو اگر اپنی ہی نشانیوں اور عجائب کو قلم بند کرنا چاہے تو اس کی ساری روشنائی ان کے لیے بھی کافی نہ ہو۔ لیکن یہ نشانیاں صرف ان کو نظر آتی ہیں جن کے پاس آنکھیں ہوں۔

قُلْ إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوحَىٰ إِلَيَّ أَنَّمَا إِلَٰهُكُمْ إِلَٰهٌ وَاحِدٌ ۖ فَمَن كَانَ يَرْجُو لِقَاءَ رَبِّهِ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهِ أَحَدًا (۱۱۰)

یعنی ان نشانیاں مانگنے والوں سے کہہ دو کہ میں تمھاری ہی طرح ایک بشر ہوں۔ نشانیاں دکھانا خدا کا کام ہے۔ میں نے رسول ہونے کا اعلان کیا ہے تو جو وحی میرے پاس آتی ہے وہ میں تمھیں سناتا ہوں۔ خدائی کا دعویٰ نہیں کیا ہے کہ تمھاری طلب کے مطابق معجزہ دکھا دوں۔ میرے پاس جو وحی آتی ہے وہ یہ ہے کہ تمھارا معبود ایک ہی معبود ہے تو جو اپنے رب کی ملاقات کا متوقع ہے وہ بلا شرکت غیرے اس کی بندگی کرے۔

یہ آخری سطریں ہیں جو اس سورہ کی تفسیر میں حوالہ قرطاس ہوئیں۔ اللہ تعالیٰ لغزشوں سے درگزر فرمائے اور صحیح باتوں کے لیے دلوں میں جگہ پیدا کرے۔ و آخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

لاہور

۲۷ر اکتوبر ۱۹۷۲ء

تدبرِ قرآن

١٩

مریم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

۱۔ سورہ کا عمود اور سابق سورہ سے تعلق

یہ سورہ، سورۂ کہف کی مثنیٰ یا بالفاظ دیگر اس کی توام سورہ ہے۔ ان دونوں کے عمود میں کوئی خاص فرق نہیں ہے۔ وہی مضمون جو سورہ کہف میں بیان ہوا ہے اس میں بھی بیان ہوا ہے لیکن طریق استدلال اور نہج بیان میں فرق ہے۔ اس میں حضرت آدم، نوح اور ابراہیم علیہم السلام کی نسل میں پیدا ہونے والے انبیائے اولوالعزم کے متعلق یہ بات بتائی گئی ہے کہ ان کی دعوت، توحید کی دعوت تھی۔ انھوں نے نماز و زکوٰۃ کا حکم دیا لیکن ان کے پیرو شرک میں مبتلا ہوئے اور نماز و زکوٰۃ ضائع کر کے بدعات و شہوات میں پڑ گئے۔ اور اب جب کہ ان کو ان کے اصل دین کی دعوت دی جا رہی ہے تو اس کی مخالفت کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے ہیں۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کے مقابل میں صبر و استقامت کی تلقین کی گئی ہے اور انجام کار کی کامیابی کی بشارت دی گئی ہے۔ آخر میں مخالفین کی گمراہی کی اصل علت کی طرف اشارہ فرمایا ہے کہ یہ لوگ اہل ایمان کے مقابل میں اپنی دنیوی کامیابیوں کو اپنے برحق ہونے کی دلیل سمجھتے ہیں حالانکہ یہ ان کے برحق ہونے کی دلیل نہیں بلکہ یہ خدا کی طرف سے ان کے لیے ڈھیل ہے کہ خدا کی حجت ان پر پوری ہو جائے اور جب وہ پکڑے جائیں تو ان کے پاس کوئی عذر باقی نہ رہ جائے۔

اس میں حضرت مسیح علیہ السلام اور حضرت مریم علیہا السلام کا ذکر خاص طور پر نمایاں ہو کر سامنے آتا ہے۔ اس کی وجہ وہی ہے جس کی طرف ہم پچھلی سورہ میں اشارہ کر چکے ہیں کہ اس دور میں یہود کی طرح نصاریٰ نے بھی در پردہ قریش کی پشت پناہی شروع کر دی تھی۔ اہل کتاب کی اس پشت پناہی سے قریش کو بڑی طاقت حاصل ہو گئی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اہل عرب امی ہونے کے سبب سے مذہبی معاملات میں اہل کتاب سے ایک قسم کا حسن ظن رکھتے تھے جب انھوں نے دیکھا کہ اہل کتاب بھی انہی کے ہم خیال ہیں تو اس سے ان کا حوصلہ بہت بڑھ گیا۔ قرآن نے اہل کتاب کے اس اثر کو باطل کرنے کے لیے ان کی حقیقت واضح کی۔ چنانچہ پچھلی سورہ بنی اسرائیل میں یہود کا بالکل بے بنیاد ہونا واضح کیا ہے: اور اس سورہ میں بالکل اسی

انداز میں نصاریٰ کی بے ثباتی دکھائی ہے۔ مقصود یہ ہے کہ قریش پر یہ حقیقت واضح ہو جائے کہ جن کی اپنی کوئی بنیاد نہیں ہے وہ بعلا حق و باطل کے اس معرکے میں ان کے لیے کیا سہارا بن سکیں گے ۔

اس تمہید کے بعد اب ہم سورہ کے مطالب کا تجزیہ بھی کیے دیتے ہیں۔

ب۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

(۱ - ۱۵) سورہ کا آغاز حضرت زکریاؑ کی اس دعا سے ہوتا ہے جو انھوں نے اپنے بڑھاپے اور بیوی کے بانجھ ہونے کے باوجود ایک فرزند کے لیے کی اور اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا قبول فرما کر ان کو حضرت یحییٰؑ کی ولادت کی خوش خبری دی۔ یہ واقعہ تمہید ہے حضرت مریمؑ کے اس واقعہ کی جس کا ذکر آگے آرہا ہے۔ نصاریٰ نے حضرت عیسیٰؑ کی خارق عادت ولادت کو ان کی الوہیت کی دلیل بنایا۔ قرآن نے یہاں حضرت عیسیٰؑ سے پہلے حضرت یحییٰؑ کی ولادت کا ذکر کر کے دکھایا ہے کہ اگر مجرد خارق عادت ولادت ہی کسی کے الٰہ ہونے کی دلیل ہے تو یہ دلیل تو حضرت عیسیٰؑ سے پہلے حضرت یحییٰؑ کے حق میں موجود ہے۔ ان کی ولادت بھی ایک بوڑھے باپ اور ایک بانجھ ماں کے ہاں ہوئی لیکن نہ تو انھوں نے خود الوہیت کا دعویٰ کیا نہ کسی دوسرے نے ان کو الٰہ بنانے کی کوشش کی۔ علاوہ ازیں یہی حضرت زکریاؑ ہیں جنھوں نے حضرت عیسیٰؑ کی والدہ حضرت مریمؑ کی تربیت کی اور یہی حضرت یحییٰؑ ہیں جنھوں نے حسب روایات نصاریٰ، حضرت مسیحؑ کو مسح کیا تو پھر حضرت مسیحؑ ابن اللہ کس طرح بن گئے!

(۱۶ - ۳۶) حضرت مریمؑ کی پاکیزہ زندگی اور ان کے زہد و عبادت کا حوالہ۔ حضرت مسیحؑ کی ان کے ہاں جس طرح ولادت ہوئی اس کی تفصیل ــ حضرت مسیحؑ نے گہوارے ہی میں جس طرح اپنے بندہ ہونے اور خدا کی طرف سے نماز و زکوٰۃ کی ہدایت پانے کی منادی کی ہے، اس کا تذکرہ اور ان بدبختوں کی حالت پر افسوس جنھوں نے یہ ساری باتیں جانتے بوجھتے اللہ کے ایک فرماں بردار بندے کو الٰہ اور اس کی ایک فرماں بردار بندی کو ابن اللہ کی ماں بنا کر رکھ دیا۔

(۳۷ - ۴۰) حضرت مسیحؑ کی واضح تعلیمات کے باوجود ان کے باب میں نصاریٰ کے باہمی اختلاف پر ان کو ملامت اور ایک ایسے دن کی آمد کی دھمکی جس دن اس سارے اختلاف کا فیصلہ ہونے والا ہے۔

(۴۱ - ۵۰) حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ کو توحید کی جو دعوت دی اور اس کے نتیجہ میں جس طرح انھیں ہجرت کرنی پڑی، اس کا حوالہ۔ پھر اس ہجرت کے صلہ میں اللہ تعالیٰ نے ان کو بڑھاپے میں جو اولاد عطا فرمائی اس کا تذکرہ۔

(۵۱ - ۶۳) حضرت موسیٰؑ، حضرت ہارونؑ، حضرت اسماعیلؑ اور حضرت ادریس علیہم السلام کے حالات، خصوصیات کا اجمالی حوالہ کہ یہ آدمؑ و نوحؑ اور ابراہیمؑ و اسرائیلؑ کی ذریت میں اولوالعزم انبیا گزرے ہیں۔ یہ سب خدا کی ہدایت سے سرفراز اور اس کے برگزیدہ بندے تھے۔ ان کا حال یہ تھا کہ جب خدا کی آیات سنتے تو روتے ہوئے سجدے

ہیں گر پڑتے ۔ پھر انہی کی اولاد میں ایسے ناخلف پیدا ہوئے جنھوں نے نماز و زکوٰۃ سب ضائع کر دی اور اپنی خواہشوں کے پیرو بن گئے ۔ یہ لوگ اپنی اس گمراہی کے انجام سے عنقریب دوچار ہوں گے ۔ ان کے اندر سے نجات پانے والے وہی بنیں گے جو توبہ اور اصلاح کریں گے ۔

(۶۴ - ۶۵) حضرت جبریل علیہ السلام کی زبان سے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو صبر و انتظار کی ہدایت اور عجلت سے احتراز کرنے کی تلقین ۔

(۶۶ - ۷۲) قیامت کی تکذیب کرنے والوں کو زجر و تنبیہ اور ان کے انجام کی طرف اشارہ ۔

(۷۳ - ۸۲) مغروروں اور متکبروں کی طرف سے قرآن کے انذار کے جواب کا حوالہ کہ وہ کہتے ہیں کہ جب قرآن کے ماننے والوں کے مقابل میں ہمارا حال بہتر ہے تو لازماً ہمارا ہی عقیدہ و عمل بھی بہتر ہے ۔ قیامت اول تو ہے نہیں اور اگر بالفرض ہوئی تو ہم ان فقیروں سے وہاں بھی بہتر حال میں رہیں گے ۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس باطل ذہنیت کی تردید اور اصل حقیقت سے آگاہی ۔

(۸۳ - ۹۶) پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو صبر و انتظار کی تلقین کہ آپ عذاب کے لیے جلدی مچانے والوں کے مطالبہ سے پریشان نہ ہوں ۔ ان مغروروں کا ایک ایک دن گنا جا رہا ہے ۔ یہ جن معبودوں پر تکیہ کیے ہوئے ہیں یہ ان کے ذرا بھی کام آنے والے نہیں ہیں ۔ قیامت کے دن سرخروئی صرف اہل ایمان کو حاصل ہوگی ۔

(۹۷ - ۹۸) آنحضرت صلعم کو ہدایت کہ قرآن انذار و تبشیر کے لیے بہترین چیز ہے ۔ اسی کے ذریعے انذار و تبشیر کیجیے ۔ جن کے اندر صلاحیت ہوگی وہ اس پر ایمان لائیں گے ۔ جو ایمان نہیں لائیں گے وہ اپنا انجام خود دیکھ لیں گے ۔ ان کے پیچھے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ۔

مطالب کے اس تجزیہ سے سورہ کا مجموعی نظام بالکل واضح ہے ۔ اب ہم اللہ کا نام لے کر سورہ کی تفسیر شروع کرتے ہیں ۔ وبیداللہ التوفیق ۔

سُوْرَةُ مَرْيَمَ (۱۹)

مَكِّيَّةٌ ——— اٰيَاتُهَا ۹۸

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

آیات ۱-۵ كٓهٰيٰعٓصٓ ﴿۱﴾ ذِكْرُ رَحْمَتِ رَبِّكَ عَبْدَهٗ زَكَرِيَّا ﴿۲﴾ اِذْ نَادٰى
رَبَّهٗ نِدَآءً خَفِيًّا ﴿۳﴾ قَالَ رَبِّ اِنِّیْ وَهَنَ الْعَظْمُ مِنِّیْ وَاشْتَعَلَ
الرَّاْسُ شَيْبًا وَّلَمْ اَكُنْۢ بِدُعَآئِكَ رَبِّ شَقِيًّا ﴿۴﴾ وَاِنِّیْ خِفْتُ
الْمَوَالِیَ مِنْ وَّرَآءِیْ وَكَانَتِ امْرَاَتِیْ عَاقِرًا فَهَبْ لِیْ مِنْ لَّدُنْكَ
وَلِيًّا ﴿۵﴾ يَّرِثُنِیْ وَيَرِثُ مِنْ اٰلِ يَعْقُوْبَ ۖ وَاجْعَلْهُ رَبِّ
رَضِيًّا ﴿۶﴾ يٰزَكَرِيَّآ اِنَّا نُبَشِّرُكَ بِغُلٰمِ ۨاسْمُهٗ يَحْيٰى ۙ لَمْ
نَجْعَلْ لَّهٗ مِنْ قَبْلُ سَمِيًّا ﴿۷﴾ قَالَ رَبِّ اَنّٰى يَكُوْنُ لِیْ غُلٰمٌ وَّ
كَانَتِ امْرَاَتِیْ عَاقِرًا وَّقَدْ بَلَغْتُ مِنَ الْكِبَرِ عِتِيًّا ﴿۸﴾ قَالَ كَذٰلِكَ ۚ
قَالَ رَبُّكَ هُوَ عَلَیَّ هَيِّنٌ وَّقَدْ خَلَقْتُكَ مِنْ قَبْلُ وَلَمْ تَكُ
شَيْئًا ﴿۹﴾ قَالَ رَبِّ اجْعَلْ لِّیْٓ اٰيَةً ۭ قَالَ اٰيَتُكَ اَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ
ثَلٰثَ لَيَالٍ سَوِيًّا ﴿۱۰﴾ فَخَرَجَ عَلٰى قَوْمِهٖ مِنَ الْمِحْرَابِ فَاَوْحٰٓى
اِلَيْهِمْ اَنْ سَبِّحُوْا بُكْرَةً وَّعَشِيًّا ﴿۱۱﴾ يٰيَحْيٰى خُذِ الْكِتٰبَ بِقُوَّةٍ ۭ
وَاٰتَيْنٰهُ الْحُكْمَ صَبِيًّا ﴿۱۲﴾ وَّحَنَانًا مِّنْ لَّدُنَّا وَزَكٰوةً ۭ وَكَانَ

تَقِيًّا ﴿١٣﴾ وَبَرًّا بِوَالِدَيْهِ وَلَمْ يَكُنْ جَبَّارًا عَصِيًّا ﴿١٤﴾ وَسَلٰمٌ
عَلَيْهِ يَوْمَ وُلِدَ وَيَوْمَ يَمُوتُ وَيَوْمَ يُبْعَثُ حَيًّا ﴿١٥﴾

ترجمۂ آیات ۱ — ۱۵

کٓھٰیٰعٓصٓ ۔ یہ تیرے رب کے اس فضل کی یاد دہانی ہے جو اس نے اپنے بندے زکریا پر کیا۔ جب اس نے اپنے رب کو چپکے چپکے پکارا۔ اس نے دعا کی اے میرے پروردگار! میرے اندر سے میری ہڈیاں کھوکھلی ہو چکی ہیں اور میرا سر بڑھاپے سے بھڑک اٹھا اور اے میرے رب میں تجھے پکار کے کبھی محروم نہیں رہا۔ میں اپنے بعد اپنے بھائی بندوں کی طرف سے اندیشہ رکھتا ہوں اور میری بیوی بانجھ ہے تو تو اپنے پاس سے مجھے ایک وارث بخش جو میرا بھی وارث ہو اور آلِ یعقوب کی روایات کا بھی۔ اور اے رب! اس کو پسندیدہ اخلاق بنائیو۔ ۱ - ۶

اے زکریا ہم تمھیں ایک فرزند کی بشارت دیتے ہیں جس کا نام یحییٰ ہوگا۔ ہم نے اس سے پہلے اس کا کوئی نظیر نہیں بنایا۔ اس نے کہا اے میرے خداوند! میرے ہاں لڑکا کیسے ہوگا، میری بیوی تو بانجھ ہے اور میں خود بڑھاپے کی بے بسی کو پہنچ چکا ہوں! فرمایا، ایسا ہی ہوگا تیرے رب نے فرمایا ہے کہ یہ میرے لیے آسان ہے۔ میں نے اس سے پہلے تم کو پیدا کیا درآنحالیکہ تم کچھ بھی نہ تھے۔ اس نے کہا، اے میرے خداوند! میرے لیے کوئی نشانی ٹھہرا دیجیے۔ فرمایا، تمھارے لیے نشانی یہ ہے کہ تم تین شب و روز لوگوں سے بات نہ کر سکو گے درآنحالیکہ تم بالکل تندرست ہوگے۔ پس وہ محرابِ عبادت سے نکل کر اپنے لوگوں کے پاس آیا اور ان سے اشارہ سے کہا کہ صبح و شام خدا کی تسبیح کرو۔ ۷ - ۱۱

اے یحییٰ کتاب کو مضبوطی سے پکڑو اور ہم نے اس کو بچپن ہی میں قوتِ فیصلہ عطا فرمائی اور خاص اپنے پاس سے سوز و گداز اور پاکیزگی۔ اور وہ نہایت پرہیزگار تھا۔ اور وہ اپنے

والدین کا فرماں بردار تھا، سرکش و نافرمان نہ تھا۔ اس پر سلامتی ہے جس روز وہ پیدا ہوا جس دن وہ مرے گا اور جس دن زندہ کر کے اٹھایا جائے گا۔ ۱۲-۱۵

۱۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

کٓهٰیٰعٓصٓ (۱)

یہ حروف مقطعات میں سے ہے۔ ان حروف پر مفصل بحث سورۂ بقرہ کے شروع میں دیکھیے۔

ذِكْرُ رَحْمَتِ رَبِّكَ عَبْدَهٗ زَكَرِيَّا (۲)

حضرت زکریا کا مرتبۂ خاص

'ذکر' یہاں اسی مفہوم میں ہے جس مفہوم میں آگے حضرت مریم سے لے کر حضرت ادریس تک تمام انبیاء کا ذکر بعینہٖ 'اذکر' ہوا ہے۔ یہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت ہے کہ نادانوں نے تو یہ تمام سرگزشتیں فراموش کر دیں، یہ تمھیں سنائی جا رہی ہیں تاکہ تم بھی ان سے بہرہ مند ہو اور دوسروں کو بھی یاددہانی کرو کہ وہ بھی ان سے بہرہ مند ہوں۔ آیت میں 'عَبْدَهٗ' کا لفظ حضرت زکریا کے اختصاص پر دلیل ہے۔ جس کو اللہ تعالیٰ خود اپنا 'بندہ' کہہ کر یاد فرمائے اس کے لیے اس سے بڑا اعزاز اور کیا ہو سکتا ہے!

بولائے تو کہ گر بندۂ خویشم خوانی
زسر خواجگی کون و مکاں برخیزم

إِذْ نَادٰى رَبَّهٗ نِدَآءً خَفِيًّا ۝ قَالَ رَبِّ إِنِّيْ وَهَنَ الْعَظْمُ مِنِّيْ وَاشْتَعَلَ الرَّأْسُ شَيْبًا وَّلَمْ أَكُنْ بِدُعَآئِكَ رَبِّ شَقِيًّا (۳-۴)

اولاد کے لیے حضرت زکریا کی دعا اور اندازِ دعا

یہ حضرت زکریاؑ کی دعا ہے جو انھوں نے فرزند کی ولادت کے لیے کی ہے۔ یہ دعا انھوں نے ہیکل میں، جیسا کہ آگے اشارہ آ رہا ہے، غالباً بحالتِ اعتکاف کی ہے۔ فرمایا کہ اس نے چپکے چپکے اپنے رب کو پکارا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دعا کا راز و نیاز کے انداز میں ہونا اس کے اولین آداب میں سے بھی ہے اور اس کی قبولیت کے لیے بہترین سفارش بھی۔ درحقیقت یہی دعائیں ہوتی ہیں جو ریا اور نمائش سے بھی پاک ہوتی ہیں اور انہی کے اندر بندہ اپنے دل کے اصلی راز بھی کھولتا ہے۔ اس وجہ سے دعا کے اس ادب کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔ صرف اجتماعی دعائیں اس سے مستثنیٰ ہیں۔

مؤثر تمہید

'وَهَنَ الْعَظْمُ مِنِّيْ' کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ میرا ظاہری جسم تو درکنار میرے تو اندر کی ہڈیاں تک کھوکھلی ہو چکی ہیں۔ یہ حضرت زکریاؑ نے عرضِ مدعا سے پہلے اس کے لیے تمہید استوار کی ہے اور اس میں شبہ نہیں کہ ایسی مؤثر تمہید استوار کی ہے کہ اگر سوءِ ادب پر محمول نہ کیجیے تو عرض کروں کہ یہ خدا کی رحمت پر کمند ڈال دینے والی تمہید ہے۔ حضرت زکریاؑ نے ایک تو اپنے ضعف و ناتوانی کو سفارش میں پیش کیا، دوسرے اپنے ساتھ زندگی بھر

اپنے رب کے معاملے کو، فرماتے ہیں کہ اے رب میں کبھی تجھے پکار کے محروم نہیں رہا۔ غور کیجیے کہ جو سائل جس در سے کبھی محروم نہیں لوٹا ہے وہ اس پیری و ناتوانی میں، جب کہ اس کی ہڈیوں تک کی گود خشک ہو چکی ہے اس دروازے سے کس طرح محروم لوٹایا جائے گا۔

وَاِنِّیْ خِفْتُ الْمَوَالِیَ مِنْ وَّرَآءِیْ وَكَانَتِ امْرَاَتِیْ عَاقِرًا فَهَبْ لِیْ مِنْ لَّدُنْكَ وَلِیًّا ۙ
يَّرِثُنِیْ وَيَرِثُ مِنْ اٰلِ يَعْقُوْبَ ۖ وَاجْعَلْهُ رَبِّ رَضِيًّا (۵-۶)

دینی وراثت کے حامل کے لیے دعا

'مَوَالِیْ' سے مراد کسی شخص کے بنی اعمام، بھائی بند اور اس کے نسبتی اعزہ و اقرباء ہوتے ہیں۔ حضرت زکریاؑ کے اقرباء، معلوم ہوتا ہے کہ اچھے لوگ نہیں تھے، ان کی طرف سے اندیشہ تھا کہ یہ لوگ، ان کی وفات کے بعد ان کی اور آلِ یعقوبؑ کی ان دینی روایات کو قائم نہ رکھ سکیں گے جو اس پاکیزہ خاندان کا اصل سرمایۂ امتیاز ہیں۔ انھیں فکر تھی کہ خاندان میں کوئی ایسا شخص اٹھے جو اس خاندان کے مشن کو زندہ رکھ سکے اور ان روایات کا حامل ہو جو آلِ یعقوب کا اصل ورثہ ہیں۔ اگرچہ خود پیری و ناتوانی کے آخری مرحلہ میں داخل ہو چکے تھے اور بیوی بانجھ تھیں، جہاں تک ظاہری اسباب و حالات کا تعلق ہے اس آرزو کے بر آنے کی کوئی توقع نہیں تھی، لیکن وہ اس رمز سے آگاہ تھے کہ اسباب و ذرائع خدا کے ہاتھ میں ہیں، خدا اسباب و ذرائع کا غلام نہیں ہے۔ اس وجہ سے انھوں نے دعا فرمائی کہ اے رب اگرچہ اسباب ناپید ہیں لیکن تیرے اختیار میں سب کچھ ہے۔ تو خاص اپنے پاس سے مجھے ایک وارث عنایت فرما جو میری اور آلِ یعقوب کی دینی وراثت کو سنبھال سکے اور اے رب اسے پسندیدہ اخلاق بنائیے، وہ ان کمزوریوں سے پاک ہو جو اب اس خاندان میں در آئی ہیں۔

يٰزَكَرِيَّآ اِنَّا نُبَشِّرُكَ بِغُلٰمِ ِۨاسْمُهٗ يَحْيٰى ۙ لَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ مِنْ قَبْلُ سَمِيًّا (۷)

سچی دعا اور اس کی قبولیت

جب دعا صحیح وقت پر، صحیح مقصد کے لیے، سچے جذبے کے ساتھ اور صحیح الفاظ میں کی جاتی ہے تو اس میں اور اس کی قبولیت میں کوئی فاصلہ نہیں رہ جاتا۔ اس کے لیے اسباب کے تمام پردے اٹھا دیے جاتے ہیں۔ ہر طرف تاریکی اور مایوسی ہوتی ہے، اسباب و حالات بالکل ناسازگار نظر آتے ہیں، کسی طرف سے بھی امید کی کوئی کرن نظر نہیں آتی لیکن بندہ جب اس امید کے ساتھ اپنے آپ کو اپنے رب کے دروازے پر ڈال دیتا ہے کہ بہر حال میرے لیے یہی دروازہ ہے، میں نے جو کچھ پایا ہے یہیں سے پایا ہے اور جو کچھ پاؤں گا یہیں سے پاؤں گا تو بالآخر اس کے لیے خدا کی رحمت اس گوشہ سے نمودار ہوتی ہے جہاں سے اس کو وہم و گمان بھی نہیں ہوتا اور اس شان سے نمودار ہوتی ہے کہ اسباب و ظواہر کے غلام اس کو دیکھ کر انگشت بدنداں رہ جاتے ہیں۔ حضرت زکریاؑ کی یہ دعا بھی ٹھیک مقصد کے لیے، ٹھیک وقت پر اور سچے جذبہ کے ساتھ تھی اس وجہ سے الفاظ زبان سے نکلے نہیں کہ اس کی قبولیت کی بشارت نازل ہو گئی۔ فرمایا کہ اے زکریا ہم تمھیں ایک فرزند کی بشارت دیتے ہیں جس کا نام یحییٰ ہو گا۔

'لَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ مِنْ قَبْلُ سَمِيًّا' 'سمی' کے معنی نظیر و مثال کے ہیں۔ اس سورہ میں آگے آیت ۶۵ میں ہے 'هَلْ تَعْلَمُ لَهٗ سَمِيًّا' کیا تم خدا کی کسی نظیر سے آشنا ہو۔ یہ حضرت زکریا کو اطمینان دلایا گیا ہے کہ ہر چند تم بوڑھے ہو اور تمھاری بیوی بانجھ ہے، بوڑھے مرد اور بانجھ بیوی کے ہاں اولاد کی کوئی نظیر موجود نہیں ہے لیکن ہماری مرضی یہی ہے کہ ہم تمھیں ایسی ہی بے نظیر اولاد دیں۔

قَالَ رَبِّ اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ غُلٰمٌ وَّكَانَتِ امْرَاَتِيْ عَاقِرًا وَّقَدْ بَلَغْتُ مِنَ الْكِبَرِ عِتِيًّا (۸)

'عتی' کے معنی ہیں کسی شے کا حد سے متجاوز ہو جانا، قابو اور اختیار سے باہر نکل جانا۔ 'وَقَدْ بَلَغْتُ مِنَ الْكِبَرِ عِتِيًّا' یعنی اب میں بڑھاپے کی اس حد کو پہنچ چکا ہوں کہ مجھے اپنے اعضاء و جوارح اور اعصاب پر قابو نہیں رہ گیا ہے۔

سوال مزید اطمینان کے لیے

یہ حضرت زکریا نے اس بشارت کے باب میں مزید اطمینان حاصل کرنے کے لیے اپنے اس تردد کا اظہار فرمایا جو ظاہری حالات کو دیکھتے ہوئے اس بشارت کے ظہور سے متعلق ان کو لاحق ہوا۔ فرمایا کہ میری بیوی بانجھ ہے اور میں خود اپنے بڑھاپے کی اس حد کو پہنچ چکا ہوں کہ مجھے اپنے اعصاب پر قابو نہیں رہ گیا ہے، ایسی حالت میں میرے ہاں اولاد کس طرح ہوگی۔

قَالَ كَذٰلِكَ ۚ قَالَ رَبُّكَ هُوَ عَلَيَّ هَيِّنٌ وَّقَدْ خَلَقْتُكَ مِنْ قَبْلُ وَلَمْ تَكُ شَيْـًٔا (۹)

قرینہ دلیل ہے کہ یہ جواب ہاتف غیب کی زبان سے ہے۔ 'كَذٰلِكَ' کی خبر کا حذف زور اور تاکید پر دلیل ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تمھارے رب کا فیصلہ یہی ہے، بس یوں ہی ہوگا۔ جس خدا نے عدم محض سے انسان کو وجود بخشا اس کے لیے بوڑھے باپ اور بانجھ ماں سے اولاد پیدا کر دینا کیا مشکل ہے۔

قَالَ رَبِّ اجْعَلْ لِّيْۤ اٰيَةً ؕ قَالَ اٰيَتُكَ اَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَ لَيَالٍ سَوِيًّا (۱۰)

اطمینانِ قلب کے لیے ایک اور درخواست

یہ حضرت زکریا نے اپنے اطمینانِ قلب کے لیے ایک اور درخواست پیش کر دی۔ یہ بشارت ان کی دلی آرزو کا مظہر اور ان کے لیے بڑی اہمیت رکھنے والی تھی اس وجہ سے انھوں نے چاہا کہ ہر پہلو سے اس پر شرح صدر ہو جائے۔ حضرت زکریا نے یہ بشارت ہاتف غیب سے سنی تھی اس وجہ سے انھیں یہ خیال ہو سکتا تھا کہ ممکن ہے یہ واہمہ کی خلاقی ہو اور اپنے ہی گنبدِ دل کی صدا اس شکل میں سنائی دی ہو۔ انھوں نے اللہ تعالیٰ سے درخواست کی کہ ان کو کوئی ایسی نشانی دکھا دی جائے جس سے انھیں پورا اطمینان ہو جائے کہ یہ بشارت رب ہی کی طرف سے ملی ہے۔ اس میں نفس یا شیطان کا کوئی دخل نہیں ہے۔ اس قسم کی درخواستیں بعض دوسرے انبیاء کی بھی قرآن میں مذکور ہیں۔ یہ اس بات کی دلیل ہیں کہ حضرات انبیاء علیہم السلام رویا اور ہاتف غیب کی باتیں قبول کرنے کے معاملے میں بڑی احتیاط برتتے تھے۔ اس سے خدانخواستہ ان کے ایمان کے بارے میں کوئی شبہ کرنے کی گنجائش نہیں نکلتی۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت زکریا کی یہ دعا بھی قبول فرمائی اور اس بشارت کے خدائی بشارت ہونے کی نشانی یہ مقرر فرما دی کہ تم تین شبانہ روز مسلسل تسبیح و تہلیل تو کر سکو گے لیکن کوئی اور لفظ زبان سے

نہ نکال سکو گے۔ ظاہر ہے کہ ایک آدمی پر ایسی حالت کا طاری ہو جانا کہ وہ ذکر الٰہی تو کر سکے لیکن کوئی اور کلمہ زبان سے نہ نکال سکے، کوئی شیطانی حالت نہیں ہو سکتی، یہ ہو سکتی ہے تو روحانی حالت ہی ہو سکتی ہے۔ چنانچہ یہ حالت حضرت زکریاؑ پر طاری ہو گئی، وہ محرابِ عبادت سے نکل کر لوگوں میں آئے تو وہ کچھ بول نہیں سکتے تھے۔ صرف اشارے سے انھوں نے لوگوں کو تسبیح و تہلیل میں مشغول رہنے کی ہدایت کی۔

بعض لوگوں نے 'اَلَّا تُكَلِّمَ' کو خبر کے بجائے نہی کے معنی میں لیا ہے۔ آیت کا مطلب ان کے نزدیک یہ ہے کہ حضرت زکریاؑ نے نشانی مانگی تو ان کو حکم ہوا کہ تین رات لگاتار تم کسی سے بات نہ کرو۔ جن حضرات نے آیت کا مطلب یہ لیا ہے انھوں نے نہ تو اس بات پر غور کرنے کی زحمت اٹھائی کہ حضرت زکریاؑ نے کس چیز کی نشانی مانگی تھی اور نہ اس مسئلہ پر غور فرمایا کہ حضرت زکریاؑ کو تین شبانہ روز خاموش رہنے کے حکم میں نشانی ہونے کا کیا پہلو نکلا!

'سَوِيًّا' کا مفہوم

'سوی' مرض اور عیب سے بری کو کہتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اگرچہ تم تین شبانہ روز کسی سے بات تو نہ کر سکو گے لیکن یہ حالت کسی مرض یا خرابی کا نتیجہ نہیں ہو گی بلکہ ہر گونہ صحت کے ساتھ محض اللہ کے حکم سے بطور ایک نشانی کے ہو گی جس طرح حضرت موسیٰؑ کے یدِ بیضا کی نشانی سے متعلق فرمایا ہے کہ تَخْرُجْ بَيْضَآءَ مِنْ غَيْرِ سُوْٓءٍ۔ اسی طرح یہاں لفظ 'سَوِيًّا' بطور ایک بدرقہ کے ہے۔ لگاتار یا مسلسل کے معنی میں اس کا استعمال معروف نہیں ہے۔ آگے اسی سورہ میں یہ لفظ آیت ۱۷ میں بھی آیا ہے وہاں یہ صریحاً بھلے چنگے، ہٹے کٹے، تندرست اور مستوی القامت کے معنی میں ہے۔

لیالی، شب و روز دونوں پر حاوی ہے

'لیالی' کا لفظ یہاں شب و روز دونوں پر حاوی ہے۔ سورۂ آل عمران میں یہی مضمون لفظ 'ایام' سے بیان ہوا ہے۔ ایام کا اطلاق بھی شب و روز دونوں پر ہوتا ہے۔ عربی میں یہ استعمالات معروف ہیں۔

فَخَرَجَ عَلٰى قَوْمِهٖ مِنَ الْمِحْرَابِ فَاَوْحٰٓى اِلَيْهِمْ اَنْ سَبِّحُوْا بُكْرَةً وَّعَشِيًّا (۱۱)

تسبیح کی ہدایت کے اندر رمز

'محراب' سے مراد معبد کا کوئی حجرہ یا برآمدہ ہے۔ آیت سے یہ بات نکلتی ہے کہ حضرت زکریاؑ اس دعا کے وقت ہیکل ہی کے کسی گوشہ میں معتکف تھے۔ سورۂ آل عمران سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ وہ نماز میں کھڑے تھے کہ یہ بشارت ان پر نازل ہوئی۔ اس کے بعد وہ اپنے لوگوں میں آئے اور اشارے سے ان کو برابر تسبیح و استغفار میں مشغول رہنے کی ہدایت کی۔ اس اشارے کے اندر یہ بات مضمر تھی کہ وہ قدرت کے کسی بہت بڑے راز کے امین ہیں جس کے اظہار کا وقت ابھی نہیں آیا ہے! لوگ خدا کی حمد و تسبیح میں مشغول رہ کر اس کا انتظار کریں اور دیکھیں کہ پردۂ غیب سے کیا ظہور میں آتا ہے۔

يٰيَحْيٰى خُذِ الْكِتٰبَ بِقُوَّةٍ ۭ وَاٰتَيْنٰهُ الْحُكْمَ صَبِيًّا (۱۲)

'کتاب' اور 'حکم' سے مراد

'کتاب' سے مراد ظاہر ہے کہ تورات ہے۔ حضرت یحییٰ پر کوئی الگ کتاب نازل نہیں ہوئی۔ لفظ 'حکم' پر ہم آل عمران ۷۹ کے تحت مفصل بحث کر چکے ہیں۔ اس سے مراد حق و باطل میں امتیاز کی قوت و صلاحیت ہے۔

یہی قوت و صلاحیت تمام علم و حکمت کی بنیاد ہے۔ یہ صلاحیت عام حالات میں تو سنِ رشد کے بعد ابھرتی ہے اور چالیس سال کی عمر میں پختہ ہوتی ہے لیکن حضرت یحییٰ پر اللہ تعالیٰ کا یہ خاص فضل ہوا کہ ان کو یہ دولت گرانمایہ بچپن ہی میں مل گئی۔

کتاب کو مضبوطی سے پکڑنے کا مفہوم

یہاں غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ اس آیت سے پہلے یہ مضمون محذوف ہے کہ بالآخر اللہ تعالیٰ کی بشارت کے مطابق حضرت یحییٰ کی ولادت ہوئی، وہ سنِ رشد کو پہنچے، اللہ تعالیٰ نے ان کو نبوت سے سرفراز فرمایا اور ان کو اپنی کتاب مضبوطی سے پکڑنے کی ہدایت فرمائی۔ 'کتاب کو مضبوطی کے ساتھ پکڑو'، کا مفہوم یہ ہے کہ شیطان اور اس کے اولیاء اس کتاب کے ابدی دشمن ہیں وہ تم کو اس کتاب سے برگشتہ کرنے کے لیے اپنا پورا زور صرف کردیں گے تو خبردار خوف یا طمع یا کسی چیز سے بھی ڈرا کر یا ورغلا کر تم کو وہ اس سے ہٹنے نہ پائیں۔ چنانچہ حضرت یحییٰ کے متعلق معلوم ہے کہ اس کتاب کی خاطر انھوں نے سر کٹوا دیا۔

وَحَنَانًا مِّن لَّدُنَّا وَزَكَاةً ۖ وَكَانَ تَقِيًّا ۝ وَبَرًّا بِوَالِدَيْهِ وَلَمْ يَكُن جَبَّارًا عَصِيًّا (۱۳-۱۴)

'حنان' کا مفہوم

'حنان' کے معنی محبت، ذوق و شوق اور سوز و گداز کے ہیں۔ یہ لفظ نہایت معروف و متداول الفاظ میں سے ہے اس وجہ سے تعجب ہوتا ہے کہ حضرت ابن عباسؓ کی طرف، بعض لوگوں نے یہ بات، کس طرح منسوب کر دی کہ انھوں نے فرمایا کہ مجھے اس کے معنی معلوم نہیں۔

قلب و روح کی اصل زندگی

یہ سوز و گداز اور یہ محبت ہی انسان کے قلب و روح کی زندگی کی اصل علامت ہے۔ یہ نہ ہو تو انسان انسان نہیں بلکہ پتھر کی ایک مورت ہے۔ اس سوز و گداز میں سے حضرت یحییٰ کو، جیسا کہ 'مِن لَّدُنَّا' کے الفاظ سے واضح ہے، نہایت وافر حصہ ملا تھا۔ ان کے سوز و گداز اور جوش محبت الٰہی کا کچھ اندازہ کرنا ہو تو انجیلوں میں ان کے ارشادات پڑھیے۔ واقعہ یہ ہے کہ ان کے اقوال کی حرارت آج بھی دلوں کو گرماتی اور روحوں کو تڑپاتی ہے۔

'زکوٰۃ' کا مفہوم

'حنان' کے بعد ان کی صفت میں 'زکوٰۃ' کا لفظ آیا ہے۔ 'زکوٰۃ' کے معنی پاکیزگی اور طہارت کے ہیں۔ اس طہارت سے مراد ظاہر اور باطن دونوں کی طہارت ہے۔ یہ درحقیقت 'حنان' ہی کا پرتو ہے۔ گداز باطنی موجود ہو تو نہ باطن میں کسی اخلاقی و عقائدی آلائش کا اثر باقی رہتا ہے نہ ظاہر میں۔

'تقی' کا مفہوم

'زکوٰۃ' کے بعد 'تقی' کا لفظ ہے۔ پچھلی دونوں صفتوں کا تعلق زیادہ تر انسان کے باطن سے ہے۔ اس لفظ میں ان کے ظاہری اعمال و اخلاق اور کردار کی تعریف ہے کہ نہایت ہی پرہیزگار اور متقی تھے۔ ان کی ساری زندگی ترک دنیا کی زندگی تھی۔ انھوں نے توبہ کی منادی اس زور و شور سے کی کہ اس سے دشت و جبل گونج اٹھے۔ ہیکل میں تقریر کرتے تو لوگوں کے دل دہل جاتے لیکن اس دنیا سے ان کا تعلق صرف دینے کے لیے تھا اس سے لیا انھوں نے کچھ بھی نہیں۔ جنگل کے شہد اور اس کی ٹڈیوں پر گزارہ کرتے۔ کمبل کی پوشاک سے تن ڈھانکتے اور جس سر کو چھپانے کے لیے اس دنیا میں کوئی چھت نہیں بنائی اس کو خدا کی کتاب کی خاطر کٹوا کر اس دنیا سے رخصت ہوگئے۔

ماں باپ کے ساتھ وفاداری

وَّبَرًّا بِوَالِدَيْهِ وَلَمْ يَكُنْ جَبَّارًا عَصِيًّا۔ یہ ماں باپ کے ساتھ ان کی وفاداری کا بیان ہے کہ باوجودیکہ وہ یہ سمجھ سکتے تھے کہ ان کی ولادت سے لے کر ان کی تعلیم و تربیت تک ہر چیز براہ راست اللہ تعالیٰ کی نگرانی میں ہوئی ہے، وہ کسی چیز میں بھی اپنے ماں باپ کے محتاج نہیں ہوئے لیکن وہ اس قسم کی کسی غلط فہمی میں مبتلا نہیں ہوئے بلکہ برابر اپنے والدین کے نہایت وفادار اور اطاعت شعار رہے۔ وہ سرکش اور نافرمان نہیں تھے۔

وَسَلٰمٌ عَلَيْهِ يَوْمَ وُلِدَ وَيَوْمَ يَمُوْتُ وَيَوْمَ يُبْعَثُ حَيًّا (۱۵)

ہر مرحلہ میں مبارک سلامت

یہ فرشتوں کی مبارک سلامت کا حوالہ ہے کہ یہ مردِ حق دنیا میں جس دن آیا قدسیوں نے اس دن مبارک سلامت کے ساتھ اس کا خیر مقدم کیا، جس دن مرا اس دن بھی انھوں نے اَهْلًا وَّسَهْلًا کے ساتھ اس کا استقبال کیا اور جس دن اٹھایا جائے گا اس دن بھی اسی نعرۂ تحیت کے ساتھ وہ اس کو خوش آمدید کہیں گے۔ یہ اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ اس دنیا نے اس کے ساتھ جو کچھ کیا کیا، خدا کے ہاں ہر مرحلہ میں اس کے ساتھ جو معاملہ ہوا یا ہوگا وہ مبارک سلامت کا ہے۔

۲- آگے کا مضمون ــــ آیات ۱۶-۳۶

حضرت یحییٰؑ اور حضرت مسیحؑ کی باہدگر مشابہت

آگے حضرت مریمؑ، ان کے بطن سے حضرت عیسیٰؑ کی ولادت اور حضرت عیسیٰؑ کی اصل تعلیم کا تذکرہ ہے۔ اوپر حضرت یحییٰؑ کا ذکر یوں سمجھیے کہ اسی بیان کی تمہید کے طور پر تھا۔ حضرت یحییٰؑ خاندان کے اعتبار سے بھی حضرت عیسیٰؑ کے پیشرو اور شریک ہیں، اور اپنی ولادت کی نوعیت کے پہلو سے بھی بہت بڑی حد تک ان سے مشابہت رکھتے ہیں۔ ان دونوں کا ذکر ایک ساتھ کر کے اللہ تعالیٰ نے نصاریٰ کو اپنی آنکھوں کی پٹی کھولنے کی دعوت دی ہے کہ ایک ہی نسب و حسب کے یکے بعد دیگرے آنے والے دو نبیوں میں آخر یہ عظیم فرق انھوں نے کہاں سے پیدا کر دیا کہ ان میں سے ایک کو خدا بنا کے رکھ دیا درآنحالیکہ دونوں کی ولادت بھی کم و بیش ایک ہی طرح ہوئی اور دونوں کی تعلیم و دعوت بھی مہد سے لے کر لحد تک ایک ہی رہی ــــ اس روشنی میں آگے کی آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۱۶-۳۶

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ مَرْيَمَ ۘ إِذِ انْتَبَذَتْ مِنْ أَهْلِهَا مَكَانًا شَرْقِيًّا (۱۶)
فَاتَّخَذَتْ مِنْ دُوْنِهِمْ حِجَابًا ۚ فَأَرْسَلْنَا إِلَيْهَا رُوْحَنَا فَتَمَثَّلَ
لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا (۱۷) قَالَتْ إِنِّيْ أَعُوْذُ بِالرَّحْمٰنِ مِنْكَ إِنْ كُنْتَ
تَقِيًّا (۱۸) قَالَ إِنَّمَا أَنَا رَسُوْلُ رَبِّكِ ۖ لِأَهَبَ لَكِ غُلٰمًا زَكِيًّا (۱۹)

قَالَتْ اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ غُلٰمٌ وَّلَمْ يَمْسَسْنِيْ بَشَرٌ وَّلَمْ اَكُ بَغِيًّا ﴿۲۰﴾ قَالَ الربع
كَذٰلِكِ ۚ قَالَ رَبُّكِ هُوَ عَلَيَّ هَيِّنٌ ۚ وَلِنَجْعَلَهٗۤ اٰيَةً لِّلنَّاسِ وَ
رَحْمَةً مِّنَّا ۚ وَكَانَ اَمْرًا مَّقْضِيًّا ﴿۲۱﴾ فَحَمَلَتْهُ فَانْتَبَذَتْ بِهٖ
مَكَانًا قَصِيًّا ﴿۲۲﴾ فَاَجَآءَهَا الْمَخَاضُ اِلٰى جِذْعِ النَّخْلَةِ ۚ قَالَتْ
يٰلَيْتَنِيْ مِتُّ قَبْلَ هٰذَا وَكُنْتُ نَسْيًا مَّنْسِيًّا ﴿۲۳﴾ فَنَادٰىهَا مِنْ
تَحْتِهَآ اَلَّا تَحْزَنِيْ قَدْ جَعَلَ رَبُّكِ تَحْتَكِ سَرِيًّا ﴿۲۴﴾ وَهُزِّيْۤ
اِلَيْكِ بِجِذْعِ النَّخْلَةِ تُسٰقِطْ عَلَيْكِ رُطَبًا جَنِيًّا ﴿۲۵﴾ فَكُلِيْ
وَاشْرَبِيْ وَقَرِّيْ عَيْنًا ۚ فَاِمَّا تَرَيِنَّ مِنَ الْبَشَرِ اَحَدًا ۙ فَقُوْلِيْۤ
اِنِّيْ نَذَرْتُ لِلرَّحْمٰنِ صَوْمًا فَلَنْ اُكَلِّمَ الْيَوْمَ اِنْسِيًّا ﴿۲۶﴾ فَاَتَتْ
بِهٖ قَوْمَهَا تَحْمِلُهٗ ؕ قَالُوْا يٰمَرْيَمُ لَقَدْ جِئْتِ شَيْئًا فَرِيًّا ﴿۲۷﴾
يٰۤاُخْتَ هٰرُوْنَ مَا كَانَ اَبُوْكِ امْرَاَ سَوْءٍ وَّمَا كَانَتْ اُمُّكِ
بَغِيًّا ﴿۲۸﴾ فَاَشَارَتْ اِلَيْهِ ؕ قَالُوْا كَيْفَ نُكَلِّمُ مَنْ كَانَ فِي الْمَهْدِ
صَبِيًّا ﴿۲۹﴾ قَالَ اِنِّيْ عَبْدُ اللّٰهِ ؕ اٰتٰنِيَ الْكِتٰبَ وَجَعَلَنِيْ نَبِيًّا ﴿۳۰﴾
وَّجَعَلَنِيْ مُبٰرَكًا اَيْنَ مَا كُنْتُ ۪ وَاَوْصٰنِيْ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ
مَا دُمْتُ حَيًّا ﴿۳۱﴾ وَّبَرًّا بِوَالِدَتِيْ وَلَمْ يَجْعَلْنِيْ جَبَّارًا شَقِيًّا ﴿۳۲﴾
وَالسَّلٰمُ عَلَيَّ يَوْمَ وُلِدْتُّ وَيَوْمَ اَمُوْتُ وَيَوْمَ اُبْعَثُ حَيًّا ﴿۳۳﴾
ذٰلِكَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ ۚ قَوْلَ الْحَقِّ الَّذِيْ فِيْهِ يَمْتَرُوْنَ ﴿۳۴﴾ مَا كَانَ
لِلّٰهِ اَنْ يَّتَّخِذَ مِنْ وَّلَدٍ ۙ سُبْحٰنَهٗ ؕ اِذَا قَضٰۤى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ

لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ﴿۳۵﴾ وَاِنَّ اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ ؕ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ ﴿۳۶﴾

ترجمۂ آیات ۱۶ - ۳۶

اور کتاب میں مریم کی سرگزشت کو یاد کرو جب کہ وہ اپنے لوگوں سے الگ ہو کر پورب کی جگہ میں جا بیٹھی۔ پس اس نے اپنے آپ کو ان سے پردے میں کر لیا تو ہم نے اس کے پاس اپنا فرشتہ بھیجا جو اس کے سامنے ایک کامل بشر کی صورت میں نمودار ہوا۔ وہ بولی کہ اگر تم کوئی خدا ترس آدمی ہو تو میں تم سے خدائے رحمان کی پناہ مانگتی ہوں۔ اس نے کہا میں تو تمھارے رب ہی کا فرستادہ ہوں تاکہ تمھیں ایک پاکیزہ فرزند عطا کروں۔ وہ بولی میرے لڑکا کیسے ہوگا، نہ مجھے کسی مرد نے ہاتھ لگایا اور نہ میں کوئی چھنال ہوں۔ اس نے کہا یوں ہی ہوگا۔ تیرے رب کا ارشاد ہے کہ یہ میرے لیے آسان ہے۔ اور ہم یہ اس لیے کریں گے کہ (وہ ہمارا رسول ہو) اور ہم اس کو لوگوں کے لیے اپنی ایک نشانی اور اپنی جانب سے ایک رحمت بنائیں۔ اور یہ ایک طے شدہ امر ہے۔ ۱۶-۲۱

پس اس نے اس کا حمل اٹھا لیا اور وہ اس کو لے کر ایک دور کے مقام کو چلی گئی۔ بالآخر یہ ہوا کہ دردِ زہ اس کو کھجور کے تنے کے پاس لے گیا۔ اس وقت اس نے کہا، اے کاش! میں اس سے پہلے ہی مر کھپ کے بھولی بسری چیز ہو چکی ہوتی! ۲۲ - ۲۳

پس (کھجور کے) نیچے سے فرشتہ نے اس کو آواز دی کہ مغموم نہ ہو۔ تمھارے پائیں سے تمھارے پروردگار نے ایک چشمہ جاری کر رکھا ہے اور تم کھجور کے تنہ کو اپنی طرف ہلاؤ، تم پر تر و تازہ خرمے جھڑیں گے پس کھاؤ اور پیو اور آنکھیں ٹھنڈی کرو۔ اور اگر کوئی آدمی متعرض ہو تو اس سے اشارے سے کہہ دیجیو کہ میں نے خدائے رحمان کے لیے روزے کی منت مان رکھی ہے تو آج میں کسی انسان سے کوئی بات نہیں کر سکتی۔ ۲۴-۲۶

پس وہ اس کو گود میں اٹھائے ہوئے اپنی قوم کے پاس آئی۔ لوگوں نے کہا، مریم! تم نے تو یہ نہایت عجیب حرکت کر ڈالی۔ اے ہارون کی بہن! نہ تمہارا باپ ہی کوئی برا آدمی تھا اور نہ تمہاری ماں ہی کوئی چھنال تھی۔ ۲۷-۲۸

اس نے اس کی طرف اشارہ کیا۔ لوگوں نے کہا ہم اس سے کس طرح بات کریں جو ابھی گود میں بچہ ہے؟ بچے نے جواب دیا، میں اللہ کا بندہ ہوں اس نے مجھے کتاب عطا فرمائی اور مجھے نبی بنایا ہے اور میں جہاں کہیں بھی ہوں اس نے مجھے سرچشمۂ خیر و برکت ٹھہرایا ہے اور جب تک جیوں اس نے مجھے نماز اور زکوٰۃ کی ہدایت فرمائی ہے اور مجھے ماں کا فرمانبردار بنایا ہے، مجھے سرکش اور بدبخت نہیں بنایا ہے۔ مجھ پر سلامتی ہے جس دن میں پیدا ہوا، جس دن مروں گا اور جس دن زندہ کر کے اٹھایا جاؤں گا۔ ۲۹-۳۳

یہ ہیں عیسیٰ ابن مریم۔ یہ اصل حقیقت بیان ہوئی ہے جس میں یہ لوگ جھگڑ رہے ہیں۔ خدا کے شایان نہیں کہ وہ کوئی اولاد بنائے۔ وہ پاک ہے، جب وہ کسی امر کا فیصلہ کر لیتا ہے تو بس اس کو فرماتا ہے کہ ہو جا تو وہ ہو جاتا ہے۔ ۳۴-۳۵

اور بے شک اللہ ہی میرا بھی رب ہے اور تمہارا بھی تو اسی کی بندگی کرو۔ یہی سیدھی راہ ہے۔ ۳۶۔

۳- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ مَرْيَمَ ۘ اِذِ انْتَبَذَتْ مِنْ اَهْلِهَا مَكَانًا شَرْقِيًّا (۱۶)

'الکتاب' سے مراد اناجیل ہیں جن میں جستہ جستہ حضرت مریمؑ کے حالات بیان ہوئے ہیں۔ ہم نے سورۂ آل عمران کی تفسیر میں تفصیل کے ساتھ ان کا حوالہ دیا ہے۔ اس وجہ سے یہاں ہم صرف آیات کے سیاق و سباق کی وضاحت کی حد تک بحث کو محدود رکھیں گے۔

ہیکل میں عورتوں کی عبادت کی جگہ مشرقی سمت میں تھی

'انتباذ' کے معنی لوگوں سے بالکل منقطع ہو کر ایک طرف ہو جانے کے ہیں۔ یہاں اس سے مراد یہ ہے کہ حضرت مریمؑ ہیکل کے مشرقی جانب میں معتکف ہو گئیں۔ مشرقی جانب میں اس وجہ سے کہ ہیکل کا جو حصہ عورتوں کے اعتکاف عبادت کے لیے خاص تھا وہ مشرقی سمت ہی میں تھا۔ اس عہد کے بیت المقدس کے نقشوں میں عورتوں کی جائے عبادت (WOMEN COURT) کو مشرقی جانب ہی دکھایا گیا ہے۔ نصاریٰ نے اپنا قبلہ جو مشرق کو بنایا اس میں بڑا دخل اسی چیز کو ہے کہ وہ ہیکل کی مشرقی سمت کو اپنی خاص سمت سمجھتے ہیں۔

فَاتَّخَذَتْ مِنْ دُوْنِهِمْ حِجَابًا ۖ فَاَرْسَلْنَآ اِلَيْهَا رُوْحَنَا فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا (۱۷)

حضرت مریمؑ کا امتحان

لوگوں کے اور اپنے درمیان پردہ حائل کر لینا اس بات کا قرینہ ہے کہ وہ اعتکاف میں بیٹھ گئیں۔ اس دوران میں اللہ تعالیٰ نے ان کے پاس اپنا فرشتہ بھیجا جو ایک تندرست و توانا آدمی کی شکل میں ان کے سامنے نمودار ہوا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو حضرت مریمؑ کا امتحان لینا منظور تھا کہ فرشتہ بشری روپ میں نمودار ہوا ورنہ حضرات انبیاءؑ کے لیے بھی فرشتوں کے ظہور کی عام شکل یہ نہیں رہی ہے۔ اس حادثہ کا جو اثر حضرت مریمؑ پر جو ابھی فرشتہ اور ہاتف وغیرہ سے ناآشنا تھیں، پڑا ہوگا اس کا اندازہ کرنا کچھ آسان نہیں ہے لیکن اس نازک موقع پر حضرت مریمؑ نے جس کردار کا مظاہرہ کیا وہ بے مثال ہے۔

قَالَتْ اِنِّيْٓ اَعُوْذُ بِالرَّحْمٰنِ مِنْكَ اِنْ كُنْتَ تَقِيًّا (۱۸)

حضرت مریمؑ کا بے مثال کردار

انھوں نے بڑے وقار کے ساتھ ظاہر ہونے والی ذات کو مخاطب کر کے فرمایا کہ اگر تم میں کچھ خدا ترسی ہے تو میں تم سے اپنے آپ کو خدائے رحمان کی پناہ میں دیتی ہوں۔

قَالَ اِنَّمَآ اَنَا رَسُوْلُ رَبِّكِ ۖ لِاَهَبَ لَكِ غُلٰمًا زَكِيًّا (۱۹)

فرشتہ نے کہا جس خدائے رحمان کے واسطہ سے آپ مجھ سے پناہ مانگ رہی ہیں اسی کا بھیجا ہوا تو میں آپ کے پاس آیا ہوں کہ آپ کو ایک پاکیزہ خصائل فرزند عطا کروں۔

قَالَتْ اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ غُلٰمٌ وَّلَمْ يَمْسَسْنِيْ بَشَرٌ وَّلَمْ اَكُ بَغِيًّا (۲۰)

'بغی' بدکار اور چھنال عورت، کو کہتے ہیں۔

حضرت مریمؑ فرشتہ کی اس بات کو سن کر ہک دھک رہ گئیں۔ انھوں نے فرمایا کہ میرے لڑکا کس طرح پیدا ہوگا، مجھے تو کسی انسان نے ہاتھ تک نہیں لگایا اور میں کوئی بدکار اور چھنال بھی نہیں ہوں!!

لوقا کی بے سروپا روایتِ نکاح

حضرت مریمؑ کے اس ارشاد سے یہ بات بالکل صاف واضح ہے کہ لوقا میں یہ روایت کہ یوسف نامی کسی شخص سے ان کا نکاح ہوا تھا، بالکل بے سروپا روایت ہے۔ اگر ان کا نکاح ہوا ہوتا تو یہ خبر ان کے لیے ایک نہایت مبارک خوش خبری ہوتی اور وہ مذکورہ الفاظ میں اس پر تشویش اور حیرت کا اظہار کرنے کے بجائے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتیں۔ ہمارے نزدیک لوقا کی یہ روایت یہود کی دراندازی کا مولود فساد ہے اس لیے کہ وہ حضرت عیسیٰؑ کی خارق عادت ولادت کے سخت مخالف ہیں۔ ہمارے ہاں جن لوگوں نے اس روایت کو بے سوچے سمجھے نقل کر لیا ہے انھوں نے

نے نادانستہ یہود ہی کی مقصد برآری کی ہے۔ حضرت مریمؑ کے متعلق یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ وہ اپنی منت کے مطابق ہیکل کی خدمت کے لیے وقف تھیں اس وجہ سے ان کے نکاح اور بیاہ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ہیکل کے خدام گھر گرہستی کے تمام علائق سے یک قلم آزاد ہوتے تھے۔ لیکن تھوڑی دیر کے لیے ایک امرِ واقعی کو نظرانداز کر دیجیے اور اس سوال پر غور کیجیے کہ اگر حضرت مریمؑ کسی کے عقدِ نکاح میں تھیں تو ان الفاظ کا کیا موقع و محل تھا جو الفاظ انھوں نے فرمائے؟ یہ الفاظ تو کسی کنواری عفیفہ ہی کی زبان سے موزوں ہو سکتے ہیں، کسی شادی شدہ عورت کی زبان سے تو یہ موزوں نہیں ہو سکتے، علاوہ ازیں حضرت مریمؑ کے خاندان والوں نے جن الفاظ میں ان کو ملامت کی ہے اور جو آگے آرہے ہیں وہ بھی اس صورت میں بالکل بے محل ہو کے رہ جاتے ہیں۔

قَالَ كَذٰلِكِ ۚ قَالَ رَبُّكِ هُوَ عَلَيَّ هَيِّنٌ ۚ وَلِنَجْعَلَهٗٓ اٰيَةً لِّلنَّاسِ وَرَحْمَةً مِّنَّا ۚ وَكَانَ اَمْرًا مَّقْضِيًّا (۲۱)

'وَلِنَجْعَلَهٗ' کا معطوف علیہ یہاں بربنائے قرینہ محذوف ہے۔ اگر اس کو کھول دیجیے تو پوری بات گویا یوں ہو گی کہ تمھارے رب کا ارشاد ہے کہ ہم ایسا اس لیے کریں گے کہ اس کو بنی اسرائیل کے لیے رسول بنائیں اور وہ لوگوں کے لیے ہماری طرف سے ایک نشانی اور رحمت ہو۔

حضرت عیسیٰؑ ایک نشانی ہیں

حضرت عیسیٰؑ کا ایک نشانی ہونا قرآن میں جگہ جگہ مذکور ہے۔ ملاحظہ ہو سورۂ انبیاء آیت ۹۱۔ اور مومنون آیت ۵۰۔ ہمارے نزدیک حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی خارق عادت ولادت قیامت کی بہت بڑی نشانی ہے۔ نادانوں کو قیامت پر سب سے بڑا شبہ یہی تو ہوتا ہے کہ آخر اسباب کے بغیر لوگ کس طرح دوبارہ پیدا ہو جائیں گے۔ حضرت عیسیٰؑ کا وجود اس شبہ کا جواب ہے کہ ہر چیز اللہ کے کلمۂ 'کُن' سے ظہور میں آتی ہے۔ حضرت عیسیٰؑ اسی کلمہ سے وجود میں آئے ہیں، چنانچہ اسی بنیاد پر ان کو انجیل اور قرآن دونوں میں 'کلمۃ اللہ' کہا بھی گیا ہے۔

فَحَمَلَتْهُ فَانْتَبَذَتْ بِهٖ مَكَانًا قَصِيًّا (۲۲)

'دُور کی جگہ' سے مراد

'قَصِیّ' کے معنی دُور کے ہیں۔ یہاں کوئی تصریح نہیں ہے کہ اس 'دُور کی جگہ' سے کون سی جگہ مراد ہے۔ لیکن انجیلوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بعد وہ بیت اللحم چلی گئیں۔ ظاہر ہے کہ حمل کا احساس کرنے کے بعد وہ ایک شدید ذہنی پریشانی اور کرب میں مبتلا ہو گئی ہوں گی۔ اس طرح کے حالات میں آدمی کے لیے اپنا ماحول وحشت انگیز بن جاتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ اس سے الگ ہو کر کوئی اور مامن تلاش کرے، شاید وہاں سکون حاصل کرنے کی کوئی صورت نکل آئے۔ حضرت مریمؑ کی یہ تدبیر اسی طرح کی ایک تدبیر تھی۔

فَاَجَآءَهَا الْمَخَاضُ اِلٰى جِذْعِ النَّخْلَةِ ۚ قَالَتْ يٰلَيْتَنِيْ مِتُّ قَبْلَ هٰذَا وَكُنْتُ نَسْيًا مَّنْسِيًّا (۲۳)

'جِذْع' تنہ کو کہتے ہیں اور 'نَخْلَة' پر الف لام اس بات کا قرینہ ہے کہ کھجور کا یہ درخت پہلے سے ان کے علم میں تھا۔ ممکن ہے اس ذہنی پریشانی کے عالم میں انھیں رؤیا کے ذریعے سے یہ غیبی اشارہ ہوا ہو کہ جب ولادت کا مرحلہ آئے تو وہ فلاں کھجور کے پاس چلی جائیں، وہاں ان کے لیے ضروری لوازم فراہم ہوں گے۔ چنانچہ جب

انھوں نے دردِ زہ کا احساس کیا تو اس تنا ئے ہوئے درخت کے نیچے چلی گئیں۔

حضرت مریمؑ کے دلی احساسات کا ایک عکس

قَالَتْ يٰلَيْتَنِيْ مِتُّ قَبْلَ هٰذَا وَكُنْتُ نَسْيًا مَّنْسِيًّا۔ ذرا تصور کیجیے کیا حال ہوا ہوگا ایک پاکیزہ گھرانے کی ایک کنواری عفیفہ کا جب اس نے اپنے گمان کے مطابق اپنی رسوائی کا یہ سامان اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھا ہوگا! یہ فقرہ ان کے اندرونی احساسات کی بالکل صحیح تعبیر ہے۔ انھوں نے فرمایا اے کاش اس فضیحتے سے پہلے ہی میں مرگئی ہوتی، صرف مر ہی نہیں گئی ہوتی بلکہ لوگوں کے حافظہ سے میری یاد بھی محو ہو چکی ہوتی۔

فَنَادٰىهَا مِنْ تَحْتِهَآ اَلَّا تَحْزَنِيْ قَدْ جَعَلَ رَبُّكِ تَحْتَكِ سَرِيًّا (۲۴)

قرینہ دلیل ہے کہ 'نَادٰی' کا فاعل فرشتہ ہے اور 'مِنْ تَحْتِهَا' میں ضمیر کا مرجع 'نَخْلَة' ہے۔ 'سَرِيّ' چھوٹے چشمہ کو کہتے ہیں۔

امتحان میں کامیاب ہو جانے کے بعد حضرت مریمؑ کو بشارت

حضرت مریمؑ کا غم اس حد کو پہنچ گیا جس کا اظہار اوپر والی آیت سے ہو رہا ہے لیکن اس کے باوجود نہ تو اپنے رب کے سوا کسی اور سے انھوں نے شکوہ کیا اور نہ مایوس ہو کر کوئی غلط قدم اٹھایا۔ اللہ تعالیٰ کو بس یہی امتحان کرنا منظور تھا۔ اس امتحان میں کامیاب ہو جانے کے بعد دفعۃً خدائے رحمان و رحیم کی رحمت مسکراتی ہوئی اس گوشہ سے نمودار ہوئی جس گوشہ سے اس کا وہم و گمان بھی نہیں ہو سکتا تھا اور پھر اللہ تعالیٰ نے اپنی اس مومنہ و قانتہ بندی کے لیے اپنی وہ شانیں دکھائیں جو پوری تاریخِ انسانی میں صرف اسی کے لیے ظاہر ہوئیں۔ کوئی اور اس میں اس کا شریک و سہیم نہیں ہے۔ فرشتے نے درخت کے نیچے سے آواز دی کہ بس اب مغموم و آزردہ نہ ہو۔ غم کے ایام گزر گئے۔ نیچے ایک چشمہ ہے اور یہ کھجور کا درخت ہے جو تمھارے لیے تر و تازہ کھجوریں فراہم کرے گا۔ کھاؤ پیو اور فرزند کے دیدار سے آنکھیں ٹھنڈی کرو۔

وَهُزِّيْٓ اِلَيْكِ بِجِذْعِ النَّخْلَةِ تُسٰقِطْ عَلَيْكِ رُطَبًا جَنِيًّا (۲۵)

'جِذْع' درخت، کے تنہ کو کہتے ہیں۔ کھجور کے تنہ کو حضرت مریمؑ کا ہلانا محض رحمتِ الٰہی کے ظہور کا ایک بہانہ تھا ورنہ ظاہر ہے کہ ان کی قوتِ بازو اتنی کہاں کہ وہ کھجور کے درخت کو ہلا دیں۔

آیت کا اسلوبِ بیان یہ ظاہر کر رہا ہے کہ جس طرح کوئی شخص اپنے خانساماں کو ناشتہ یا کھانا حاضر کرنے کی ہدایت کرتا ہے اسی طرح تم اس کھجور کے تنہ کو ہاتھ لگانا، یہ تمھارے لیے تازہ اور پکے کھجور حاضر کر دے گا۔

فَكُلِيْ وَاشْرَبِيْ وَقَرِّيْ عَيْنًا ۚ فَاِمَّا تَرَيِنَّ مِنَ الْبَشَرِ اَحَدًا ۙ فَقُوْلِيْٓ اِنِّيْ نَذَرْتُ لِلرَّحْمٰنِ صَوْمًا فَلَنْ اُكَلِّمَ الْيَوْمَ اِنْسِيًّا (۲۶)

یعنی کھاؤ پیو اور بچہ کے دیدار سے آنکھیں ٹھنڈی کرو اور روزے کی منت مان لو۔ اگر کوئی شخص آجائے اور کچھ پوچھنا چاہے تو اس سے کہہ دینا کہ میں نے روزے کی منت مان رکھی ہے، میں آج کسی سے بات نہیں کر سکتی۔

خاموشی کا روزہ

یہود کی شریعت میں خاموشی بھی روزے کے شرائط میں تھی۔ اگرچہ آیت میں اس بات کی تصریح نہیں ہے کہ فرشتہ نے حضرت مریمؑ کو روزہ رکھ لینے کی بھی ہدایت کی۔ لیکن فحوائے کلام سے یہ بات واضح ہے۔ جب فرشتہ ان کو

یہ ہدایت کرتا ہے کہ "اگر کوئی شخص کچھ پوچھے تو اس سے یہ کہہ دینا کہ میں روزے سے ہوں، کسی سے بات نہیں کر سکتی" تو اس سے آپ سے آپ یہ بات لازم آتی ہے کہ ان کو روزہ رکھنے کی بھی ہدایت ہوئی۔ ورنہ فرشتہ آخر غلط بیانی کی ہدایت کس طرح کر سکتا ہے ؟

ممکن ہے یہاں کسی کو یہ شبہ ہو کہ حضرت مریمؑ جس حال میں تھیں اس میں تو عورت کو روزہ رکھنے کی اجازت نہیں ہے۔ اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ یہود کے ہاں مجرد خاموشی کا بھی روزہ تھا اور یہ روزہ ہر حال میں رکھا جا سکتا تھا۔ اسفارِ یہود میں "خاموش رہو" کی تعبیر اللہ کو یاد رکھنے اور اس کی عبادت کرنے کے لیے جگہ جگہ استعمال ہوئی ہے ملاحظہ ہو زکریا باب ۲، ۱۳۔

'قول' بمعنی اشارہ

ایک بات اس آیت میں بعض لوگوں کو ادر کھٹکے گی۔ وہ یہ کہ جب یہ روزہ خاموشی کا روزہ تھا تو یہاں لفظ 'قُوْلِیْ' (کہہ دینا) کے استعمال کا کیا محل تھا؟ پھر تو کوئی لفظ ایسا استعمال ہوتا جس کے معنی اشارہ کرنے کے ہوتے اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ عربی میں 'قَالَ' اشارہ کرنے کے معنی میں بھی آتا ہے۔ 'قال بومحہ' (اس نے اپنے نیزے سے اشارہ کیا) 'قال بیدہ ھکذا' (اس نے اپنے ہاتھ سے اس طرح اشارہ کیا) وغیرہ محاورات عربی میں معروف ہیں۔ آخر الذکر محاورہ تو بعض حدیثوں میں بھی استعمال ہوا ہے۔

فَاَتَتْ بِهٖ قَوْمَهَا تَحْمِلُهٗ ؕ قَالُوْا یٰمَرْیَمُ لَقَدْ جِئْتِ شَیْـًٔا فَرِیًّا ۝ یٰۤاُخْتَ هٰرُوْنَ مَا كَانَ اَبُوْكِ امْرَاَ سَوْءٍ وَّمَا كَانَتْ اُمُّكِ بَغِیًّا (۲۷-۲۸)

حضرت مریمؑ کو خاندان والوں کی ملامت

فرشتے سے مذکورہ بالا رہنمائی حاصل کرنے کے بعد حضرت مریمؑ نومولود کو گود میں اٹھائے ہوئے اپنے خاندان والوں میں واپس آئیں۔ ان کو دیکھتے ہی سب ان پر پل پڑے۔ ہر شخص نے ان کو ملامت کی اور غیرت دلائی کہ جس کا باپ شریف، جس کی ماں عفیفہ اور جو ہارون جیسے نیک آدمی کی بہن ہو، حیف ہے اگر وہ ایسی حرکت کی مرتکب ہو!

'ہارون' سے یہاں مراد

'ہارون' سے مراد یہاں حضرت موسیٰؑ کے بھائی ہارونؑ نہیں ہیں بلکہ حضرت مریمؑ کے خاندان ہی کے لوگوں میں سے کسی نیک شہرت رکھنے والے شخص کا نام ہے۔ حدیثوں سے بھی ایسا ہی معلوم ہوتا ہے۔

فَاَشَارَتْ اِلَیْهِ ؕ قَالُوْا كَیْفَ نُكَلِّمُ مَنْ كَانَ فِی الْمَهْدِ صَبِیًّا (۲۹)

حضرت مریمؑ چونکہ خاموشی کا روزہ رکھے ہوئے تھیں، زبان سے کچھ نہیں کہہ سکتی تھیں اسی وجہ سے انھوں نے نومولود کی طرف اشارہ کیا کہ ان تہمتوں کا جواب انہی سے لو، میرے کچھ عرض کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

حضرت مریمؑ [illegible]

ظاہر ہے کہ اس عرصہ میں حضرت مریمؑ پر یہ بات واضح ہو چکی ہوگی کہ نومولود اپنا اور ان کا مقدمہ لڑنے کے لیے خدا ہی کے ہاں سے پوری طرح مسلح ہو کر آیا ہے۔ وہ لوگ حضرت مریمؑ کی اس بات سے بہت جز بز ہوئے، بولے کہ ہم تو تم سے پوچھتے ہیں، اس بچے سے کس طرح بات کریں جو ابھی گہوارے میں ہے!!

جب حضرت مریمؑ کی آزمائش یہاں تک پہنچ گئی اور وہ ہر مرحلہ میں سو فی صدی کامیاب ثابت ہوئیں تو

وقت آگیا کہ اللہ تعالیٰ اب اپنا اعلان کرادے کہ وہ اپنے کسی بندے یا بندی کے لیے، جو اس کے امتحان میں کامیاب ہو جائے، اپنی کیا شانیں دکھاتا ہے۔

قَالَ إِنِّي عَبْدُ اللّٰهِ ۖ اٰتٰنِيَ الْكِتٰبَ وَجَعَلَنِيْ نَبِيًّا ۝ وَّجَعَلَنِيْ مُبٰرَكًا اَيْنَ مَا كُنْتُ ۠ وَاَوْصٰنِيْ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ مَا دُمْتُ حَيًّا ۝ وَّبَرًّا بِوَالِدَتِيْ ۡ وَلَمْ يَجْعَلْنِيْ جَبَّارًا شَقِيًّا ۝ وَالسَّلٰمُ عَلَيَّ يَوْمَ وُلِدْتُّ وَيَوْمَ اَمُوْتُ وَيَوْمَ اُبْعَثُ حَيًّا (۳۰-۳۳)

گہوارے میں حضرت مسیح کے ارشادات

یہ حضرت مسیح کے وہ ارشادات ہیں جو اس موقع پر انھوں نے اپنی اور اپنی والدہ ماجدہ کی براءت میں گہوارے کے اندر سے فرمائے۔ حضرت مریم جس امتحان میں ڈال دی گئی تھیں اس سے پوری عزت اور سرخروئی کے ساتھ عہدہ برآ ہونے کے لیے ضروری تھا کہ گود کا بچہ ہی ان کی پاک دامنی اور اپنی وجاہت کی شہادت دے تاکہ کسی کے لیے بھی اس کے بعد لب کشائی کی گنجائش باقی نہ رہے۔ ہم حضرت مسیح کے ان ارشادات کی وضاحت سورۂ آل عمران کی تفسیر میں کر چکے ہیں یہاں صرف اشارات پر کفایت کریں گے۔

عبرانی میں لفظ 'ابن' کا مفہوم

پہلی بات انھوں نے یہ فرمائی کہ 'اِنِّیْ عَبْدُ اللّٰہِ' میں اللہ کا بندہ ہوں۔ یعنی کوئی میری اس خارق عادت ولادت سے اس غلط فہمی میں نہ مبتلا ہو کہ میں کوئی مافوق بشر ہستی ہوں۔ میں اللہ کا بندہ ہی ہوں۔ یہ قرآن نے ان کے ارشاد 'ابن اللہ' کی صحیح تعبیر بتائی ہے۔ عبرانی میں 'ابن' کا لفظ بندہ اور بیٹے دونوں کے لیے آتا ہے۔ موقع و محل سے اس کا تعین کرتے ہیں۔ حضرت مسیح کی واضح تعلیمات کی موجودگی میں اس لفظ کی تاویل میں کسی التباس کی گنجائش نہیں تھی لیکن پال نے اس کو فتنہ کا ذریعہ بنا لیا اور تثلیث کا ایک پورا گورکھ دھندا تیار کر دیا۔ ہم انجیلوں کی روشنی میں اس سیتاولجی کی تردید سورۂ آل عمران اور مائدہ کی تفسیر میں کر چکے ہیں۔

تورات پر حکمت کا اضافہ

دوسری بات انھوں نے یہ فرمائی کہ خدا نے مجھے کتاب و نبوت سے سرفراز فرمایا ہے اور میں جہاں کہیں بھی ہوں میرا وجود وہاں کے لیے سراپا خیر و برکت ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام جہاں تک شریعت کا تعلق ہے تورات ہی کی شریعت پر عامل اور اسی کے داعی اور مجدد تھے۔ البتہ انھوں نے اس پر حکمت کا اضافہ فرمایا۔ یہی حکمت کے وعظ ہیں جو منتشر اور نا تمام حالت میں ہمیں انجیلوں میں ملتے ہیں۔ یہی لعل و گہر ہیں جو وہ اپنی زبانِ مبارک سے ہر دشت و چمن میں برساتے ہوئے گزرتے تھے اور جس دل میں ذرا بھی زندگی کی رمق ہوتی تھی اس کو زندۂ جاوید کر دیتے تھے۔

تمام دین و شریعت کی بنیاد نماز اور زکوٰۃ پر ہے

تیسری بات انھوں نے یہ فرمائی کہ مجھے زندگی بھر کے لیے نماز اور زکوٰۃ کی ہدایت ہوئی ہے۔ دراصل یہی دو چیزیں ہیں جو تمام دین و شریعت کی بنیاد کی حیثیت رکھتی ہیں اس وجہ سے تمام آسمانی شرائع میں سب سے پہلے انہی کا ذکر آتا ہے۔ ان کی ظاہری شکلیں مختلف ادیان میں مختلف رہی ہیں لیکن بندگیٔ رب اور ہمدردیٔ خلق کی روح ان کی ہر شکل میں محفوظ رہی ہے۔ نماز آدمی کو اس کے رب سے صحیح طور پر جوڑتی ہے اور زکوٰۃ سے اس کا تعلق خلق کے ساتھ صحیح طور پر استوار رہتا ہے۔ انہی دو چیزوں کی استواری پر تمام دین کے قیام کا انحصار

ہے۔ اگر کوئی شخص ان کو ڈھا دے تو وہ تمام دین کو ڈھا دے گا اگرچہ وہ دین کے نام پر کتنی ہی لاف زنی کرے۔

ماں کی فرمانبرداری

چوتھی بات انھوں نے یہ فرمائی کہ خدا نے مجھے اپنی ماں کا فرمانبردار بنایا ہے، مجھے سرکش اور بدبخت نہیں بنایا ہے۔ یعنی ہر چند میری ولادت کی نوعیت خاص ہے، میرے اوپر میرے رب کے انعامات بھی خاص ہیں۔ لیکن ان سب باتوں کے باوجود میں ایک ماں کا بیٹا اور فرمانبردار بیٹا ہوں۔ خدا کے خاص انعامات کے معنی کوئی یہ نہ سمجھے کہ میری حیثیت عرفی و بشری میں کوئی فرق آگیا ہے۔ ساتھ ہی یہ حقیقت بھی واضح فرما دی کہ جو اپنے ماں باپ کا فرمانبردار نہیں وہ جبار و شقی ہے۔ حضرت مسیحؑ کے اس ارشاد سے انجیل کی بعض ان روایات کی تردید ہوتی ہے جن سے یہ گمان گزرتا ہے کہ خدانخواستہ وہ حضرت مریمؑ کا واجبی احترام نہیں کرتے تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ جب حضرت مسیحؑ پر دعوائے الوہیت کی تہمت چپکائی گئی ہے تو اس کی تائید فراہم کرنے کے لیے اس قسم کی روایات بھی انجیلوں میں داخل کر دی گئیں۔

وَالسَّلٰمُ عَلَيَّ يَوْمَ وُلِدْتُّ وَيَوْمَ اَمُوْتُ وَيَوْمَ اُبْعَثُ حَيًّا (۳۳)

ہر مرحلہ میں سلام و تحیت

جس طرح آیت ۱۵ میں اللہ تعالیٰ نے حضرت یحییٰؑ سے متعلق ان کی زندگی اور موت کے ہر مرحلہ میں سلام و تحیت کی بشارت دی ہے اسی طرح یہ حضرت مسیحؑ نے اپنی ولادت، موت اور بعث کے ہر مرحلہ میں اپنے لیے قدوسیوں کے سلام اور ان کی تحیت کی خبر دی ہے۔ اس آیت سے یہ بات واضح طور پر نکلتی ہے کہ ولادت، موت اور موت کے بعد اٹھائے جانے کے مراحل سے جس طرح ہر بشر گزرتا ہے اور گزرے گا اسی طرح سیدنا مسیحؑ بھی گزرے اور گزریں گے۔ اس باب میں ان سے متعلق محض تفسیری روایات کی بنا پر کوئی ایسی بات فرض کر لینا احتیاط کے بالکل خلاف ہے جس کی کوئی سند قرآن میں نہیں ہے۔

ذٰلِكَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ ۚ قَوْلَ الْحَقِّ الَّذِيْ فِيْهِ يَمْتَرُوْنَ ۝ مَا كَانَ لِلّٰهِ اَنْ يَّتَّخِذَ مِنْ وَّلَدٍ ۙ سُبْحٰنَهٗ ۭ اِذَا قَضٰٓى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ (۳۴-۳۵)

ایک برمحل جملہ معترضہ بطور تنبیہ

یہ دو آیتیں، حضرت مسیحؑ کے ارشادات کے بیچ میں، اللہ تعالیٰ کی طرف سے بطور جملہ معترضہ ہیں۔ بالکل برمحل لوگوں کو عام طور پر اور نصاریٰ کو خاص طور پر توجہ دلائی گئی ہے کہ یہ ہے حضرت مسیحؑ کی اصل حقیقت جو انھوں نے خود اپنی زبان سے واضح فرمائی ہے۔

نصاریٰ کی معمہ سازی

قَوْلَ الْحَقِّ الَّذِيْ فِيْهِ يَمْتَرُوْنَ۔ 'امتراء' کے اصل معنی بکری کے تھن کو اچھی طرح نچوڑنے کے ہیں۔ یہیں سے یہ لفظ کٹ حجتی کر کے کسی بات کو بتنگڑ بنانے اور اس میں طرح طرح کے اوہام و شکوک پیدا کرنے کے لیے استعمال ہونے لگا۔ فرمایا کہ حضرت مسیحؑ کی اصل حقیقت تو یہ ہے جو اللہ نے بھی بیان فرما دی اور خود حضرت مسیحؑ نے بھی واضح کر دی لیکن عیسائیوں نے اس کو گھس گھس کر افسانہ بنا دیا جس سے خود بھی اوہام میں مبتلا ہوئے اور دوسروں کو بھی مبتلا کر رہے ہیں۔ ہم نصاریٰ کی الٰہیات پر مائدہ، کے تحت تفصیل سے گفتگو کر چکے ہیں، اس پر ایک نظر ڈال کر دیکھیے تو اندازہ ہو گا کہ پال نے سیدھی سادی بات کو کس طرح ایک

چیستان اور معمہ بنا کے رکھ دیا ہے۔

نصاریٰ کا شرک 'مَا كَانَ لِلّٰهِ اَنْ يَّتَّخِذَ مِنْ وَّلَدٍ سُبْحٰنَهٗ' یہ اس شرک کی تردید ہے جس میں عیسائی حضرت عیسیٰؑ کو خدا کا بیٹا فرض کر کے مبتلا ہوئے۔ فرمایا کہ خدا کی صفات کے یہ بات بالکل منافی ہے کہ وہ کسی کو اپنا بیٹا بنائے۔ سُبْحٰنَهٗ وہ اس قسم کی تمام نسبتوں سے بالکل پاک ہے۔ 'اِذَا قَضٰٓى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ'۔ بیٹے کی ضرورت اس کو ہوتی ہے جو اپنے ارادوں اور منصوبوں کو بروئے کار لانے میں کسی کا محتاج ہو۔ خدا کسی کا محتاج نہیں۔ وہ جب کسی امر کا ارادہ کرتا ہے تو بس اس کے کلمۂ 'کُن' سے اس کا ہر ارادہ پورا ہو جاتا ہے۔

اس ٹکڑے میں یہ بات بھی مضمر ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کی خارقِ عادت ولادت بھی ان کی الوہیت کی کوئی دلیل نہیں ہے ـــــ یہ بھی خدا کے کلمۂ 'کُن' ہی کا ایک کرشمہ ہے۔ خدا نے چاہا کہ وہ یوں ہی پیدا ہوں تو وہ بن باپ کے کلمہ 'کُن' سے پیدا ہو گئے۔

وَاِنَّ اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ ۚ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ (۳۶)

عبرانی میں 'اب' کا صحیح مفہوم جملۂ معترضہ ختم ہونے کے بعد یہ حضرت عیسیٰؑ کے ارشادات کا آخری ٹکڑا نقل ہوا ہے کہ انھوں نے مزید فرمایا کہ اللہ ہی میرا بھی رب ہے اور تمھارا بھی تو اسی کی بندگی کرو، خدا تک پہنچانے والی سیدھی راہ یہی ہے۔ انجیلوں میں حضرت عیسیٰؑ کی زبان سے یہ جو نقل ہوتا ہے کہ "میرا باپ اور تمھارا باپ" یہ قرآن نے اس کی صحیح تعبیر بتائی ہے۔ عبرانی زبان میں 'اب' باپ اور رب دونوں معنوں میں آتا ہے۔ اس کے صحیح مفہوم کا تعین اس کے محلِ استعمال سے ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ "میرا باپ اور تمھارا باپ" کے فقرے میں یہ رب ہی کے معنی میں ہو سکتا ہے۔ اگر اس کو 'باپ' کے معنی میں لیا جائے تو پھر حضرت عیسیٰؑ کی کوئی خصوصیت نہیں رہ جاتی بلکہ ساری خدائی اللہ کی اولاد بن جاتی ہے۔

۴- آگے کا مضمون ـــــ آیات ۳۷-۴۰

آگے چند آیات میں نصاریٰ کے باہمی اختلافات پر ان کو ملامت اور ایک ایسے دن کی دھمکی ہے جس دن ایک علیم و خبیر خدا کی طرف سے ان کا سارا کچا چٹھا ان کے سامنے آ جائے گا۔ آیات کی تلاوت کیجیے۔

آیات ۳۷-۴۰ فَاخْتَلَفَ الْاَحْزَابُ مِنْۢ بَيْنِهِمْ ۚ فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ مَّشْهَدِ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ﴿۳۷﴾ اَسْمِعْ بِهِمْ وَاَبْصِرْ ۙ يَوْمَ يَاْتُوْنَنَا لٰكِنِ الظّٰلِمُوْنَ الْيَوْمَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۳۸﴾ وَاَنْذِرْهُمْ يَوْمَ الْحَسْرَةِ اِذْ قُضِيَ الْاَمْرُ ۘ وَهُمْ فِيْ غَفْلَةٍ وَّهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۳۹﴾ اِنَّا نَحْنُ نَرِثُ

الْأَرْضَ وَمَنْ عَلَيْهَا وَإِلَيْنَا يُرْجَعُونَ ﴿٤٠﴾ ع ۵

ترجمۂ آیات ۳۷ - ۴۰

پس ان کے اندر سے مختلف فرقوں نے باہم اختلاف کیا۔ تو ان لوگوں کے لیے جنھوں نے کفر کیا ایک ہولناک دن کی حاضری کے باعث ہلاکی ہوگی۔ جس دن یہ ہمارے حضور میں حاضر ہوں گے بڑے شنوا اور بڑے بینا ہو جائیں گے لیکن آج یہ ظالم نہایت کھلی ہوئی گمراہی میں پڑے ہوئے ہیں۔ اور ان لوگوں کو اس حسرت کے دن سے آگاہ کر دو جب کہ معاملہ کا فیصلہ کر دیا جائے گا اور یہ غفلت میں پڑے ہوئے ہیں اور ایمان نہیں لا رہے ہیں۔ بے شک زمین اور روئے زمین پر بسنے والوں کے وارث ہم ہوں گے اور سارے لوگ ہماری ہی طرف لوٹائے جائیں گے۔ ۳۷-۴۰

۵- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

فَاخْتَلَفَ الْأَحْزَابُ مِنْ بَيْنِهِمْ ۖ فَوَيْلٌ لِّلَّذِينَ كَفَرُوا مِن مَّشْهَدِ يَوْمٍ عَظِيمٍ (۳۷)

نصاریٰ کی گروہ بندیاں

یعنی حضرت مسیحؑ کی اصل حقیقت تو وہ ہے جو اوپر بیان ہوئی اور یہ اس قدر واضح بات ہے کہ اس میں کسی اختلاف و نزاع کی گنجائش نہیں تھی لیکن عیسائیوں نے اپنی بدبختی سے اس میں اختلاف پیدا کیا۔ اور ان کے اندر بہت سے چھوٹے بڑے فرقے پیدا ہو گئے۔ ان میں سے حق پر صرف وہ تھوڑے سے لوگ قائم رہے جو شمعون کے پیرو تھے۔ یہی لوگ تھے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت پر ایمان لائے اور انہی کی قرآن نے تعریف کی ہے۔ باقی سب جو پال کے پیرو ہوئے وہ مختلف گروہوں میں بٹتے چلے گئے۔ کیتھولک اور پروٹسٹنٹ یہ دو فرقے تو مشہور ہی ہیں ان کے علاوہ اور بھی چھوٹے بڑے بہت سے چرچ ان کے اندر ہیں۔

'مَشْهَدِ يَوْمٍ عَظِيمٍ' سے مراد

'مِن مَّشْهَدِ يَوْمٍ عَظِيمٍ' سے ہمارے نزدیک حضرات انبیاءؑ کی وہ شہادت مراد ہے جو قیامت کے روز وہ اپنی اپنی امتوں کے معاملہ میں اللہ تعالیٰ کے سامنے دیں گے۔ اس شہادت کی پوری تفصیل سورۂ مائدہ میں بیان ہوئی ہے۔ حضرت عیسیٰؑ کی شہادت کا ضروری حصہ ملاحظہ فرمائیے۔

إِذْ قَالَ اللَّهُ يَا عِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ أَأَنتَ	جب کہ اللہ پوچھے گا کہ اے عیسیٰ ابن مریم! کیا
قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُونِي وَأُمِّيَ إِلَٰهَيْنِ	تم نے لوگوں کو یہ تعلیم دی تھی کہ اللہ کے سوا مجھے
مِن دُونِ اللَّهِ ۖ قَالَ سُبْحَانَكَ مَا يَكُونُ	اور میری ماں کو معبود بناؤ؟ وہ کہیں گے تو پاک ہے
لِي أَنْ أَقُولَ مَا لَيْسَ لِي بِحَقٍّ ۚ إِن	میرے لیے یہ کس طرح زیبا تھا کہ میں وہ بات کہوں

كُنْتُ قُلْتُهٗ فَقَدْ عَلِمْتَهٗ ۚ تَعْلَمُ مَا فِيْ نَفْسِيْ وَلَآ اَعْلَمُ مَا فِيْ نَفْسِكَ ۚ اِنَّكَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ ۝ مَا قُلْتُ لَهُمْ اِلَّا مَآ اَمَرْتَنِيْ بِهٖٓ اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبَّكُمْ ۚ وَكُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا مَّا دُمْتُ فِيْهِمْ ۚ فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِيْ كُنْتَ اَنْتَ الرَّقِيْبَ عَلَيْهِمْ ۭ وَاَنْتَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ ۝ اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ ۚ وَاِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَاِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ (المائدۃ: ۱۱۶ - ۱۱۷)

جس کا مجھے کوئی حق نہیں۔ اگر میں نے کہی ہوگی تو تو اسے جانتا ہے۔ جو کچھ میرے جی میں ہے اس کو تو جانتا ہے لیکن جو کچھ تیرے جی میں ہے اس کو میں نہیں جانتا۔ بے شک غیب کا راز دان تو ہی ہے۔ میں نے تو ان سے صرف وہی بات کہی جس کا تو نے مجھے حکم دیا کہ اللہ ہی کی بندگی کرو جو میرا بھی رب ہے اور تمہارا بھی۔ میں جب تک ان کے اندر رہا ان پر گواہ رہا۔ پھر جب تو نے مجھے وفات دے دی تو ان کا نگران حال تو ہے اور تو ہر چیز سے باخبر ہے۔ اگر تو ان کو سزا دے تو وہ تیرے بندے ہیں اور اگر ان کو بخشے تو تو غالب اور حکیم ہے۔

آیت زیر بحث میں اسی مشہد عظیم سے عیسائیوں کو ڈرایا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ جب خود حضرت عیسیٰ سے اللہ تعالیٰ وہ گواہی دلوا دے گا جو مائدہ کی مذکورہ بالا آیات میں بیان ہوئی ہے تو نصاریٰ نہ تو حضرت عیسیٰ کو منہ دکھانے کے قابل رہ جائیں گے نہ اللہ تعالیٰ کو۔ پھر تو ان کے لیے ہلاکی اور ماتم کے سوا کوئی اور چیز باقی نہیں رہ جاتی۔

اَسْمِعْ بِهِمْ وَاَبْصِرْ ۙ يَوْمَ يَاْتُوْنَنَا لٰكِنِ الظّٰلِمُوْنَ الْيَوْمَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ (۳۸)

'اسمع بہٖ' اور 'ابصر بہٖ' عربی میں تعجب کے صیغے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ آج تو انھیں اصل حقیقت جب سنائی اور سمجھائی جاتی ہے تو نہ اس کو سنتے ہیں نہ اس کو دیکھتے اور سمجھتے ہیں لیکن جب اس مشہد عظیم سے ان کو سابقہ پیش آئے گا تو کانوں کے پردے بھی کھل جائیں گے اور آنکھوں کی پٹیاں بھی اتر جائیں گی۔ معلوم ہوگا کہ اس وقت ان سے زیادہ بینا اور شنوا کوئی نہیں ہے، لیکن وہ وقت سننے اور سمجھنے کا نہیں بلکہ سر پیٹنے کا ہوگا۔

'ظالمون' سے یہاں مراد اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے وہ بدقسمت لوگ ہیں جو آنکھ کان رکھتے ہوئے اندھیرے میں ٹھوکریں کھاتے رہے۔

وَاَنْذِرْهُمْ يَوْمَ الْحَسْرَةِ اِذْ قُضِيَ الْاَمْرُ ۘ وَهُمْ فِيْ غَفْلَةٍ وَّهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ (۳۹)

'یوم الحسرۃ' سے مراد

'یوم الحسرۃ' سے مراد وہی شہادت عظیم کا دن ہے۔ اس دن آنکھیں تو سب کی کھل جائیں گی لیکن توبہ، اصلاح اور سعی و عمل کے تمام دروازے بند ہو جائیں گے۔ جو لوگ آج غفلت میں پڑے ہوئے ایمان نہیں لا رہے ہیں وہ حسرت سے کہیں گے کہ کاش ان کو دنیا میں پھر جانا نصیب ہو تا کہ وہ ایمان و عمل صالح کی زندگی گزار سکتے

لیکن ان کی یہ حسرت بس حسرت ہی رہے گی۔ اس دن سارے معاملات کا فیصلہ ہو جائے گا اور ہر ایک اپنے اعمال کے نتائج سے دوچار ہوگا۔

إِنَّا نَحْنُ نَرِثُ الْأَرْضَ وَمَنْ عَلَيْهَا وَإِلَيْنَا يُرْجَعُونَ۔ (۴۰)

یعنی اس دن زمین اور اہل زمین سب کا مالک اور وارث اللہ ہی ہوگا اور سب کی پیشی اسی کے سامنے ہوگی۔ اس دن نہ کوئی کسی کی مدد کر سکے گا اور نہ اللہ کے اذن کے بغیر کوئی کسی کی سفارش کر سکے گا۔

۶- آگے کا مضمون ___ آیات ۴۱-۶۳

آگے حضرت ابراہیم، حضرت موسیٰ، حضرت اسماعیل اور حضرت ادریس علیہم السلام کی سیرت اور ان کی تعلیم و دعوت کا اجمالی حوالہ ہے اور مقصود اس حوالہ سے ایک طرف تو نصاریٰ پر یہ حقیقت واضح کرنا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ سے پہلے جو انبیاء عظام، آدم و نوح اور ابراہیم و اسرائیل علیہم السلام کی نسل سے گزرے ہیں ان سب کی تعلیم و دعوت یہی رہی ہے جو آج اللہ کا رسول تمہارے سامنے پیش کر رہا ہے لیکن تم ایسے ناخلف نکلے کہ تم نے ان نبیوں کی تعلیم ضائع کر دی اور اس کی جگہ بدعتوں اور ضلالتوں میں مبتلا ہو گئے۔ دوسری طرف قریش کو متنبہ کرنا ہے کہ ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام کو جن کے ساتھ نسبت اور جن کے دین کے حامل و وارث ہونے کے تم مدعی ہو، ان خرافات سے کوئی تعلق نہیں تھا جن کو تم آج ملت ابراہیم کے نام سے پوج رہے ہو۔ اصل ملت ابراہیم یہ ہے جس کی دعوت تمہیں قرآن دے رہا ہے لیکن تم اس کی تکذیب کر رہے ہو ___ اس روشنی میں آگے کی آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۴۱ وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ إِبْرٰهِيمَ ۚ إِنَّهُ كَانَ صِدِّيقًا نَّبِيًّا ﴿۴۱﴾ إِذْ
قَالَ لِأَبِيهِ يٰأَبَتِ لِمَ تَعْبُدُ مَا لَا يَسْمَعُ وَلَا يُبْصِرُ وَلَا يُغْنِي
عَنكَ شَيْئًا ﴿۴۲﴾ يٰأَبَتِ إِنِّي قَدْ جَاءَنِي مِنَ الْعِلْمِ مَا لَمْ يَأْتِكَ
فَاتَّبِعْنِي أَهْدِكَ صِرَاطًا سَوِيًّا ﴿۴۳﴾ يٰأَبَتِ لَا تَعْبُدِ الشَّيْطٰنَ ۖ
إِنَّ الشَّيْطٰنَ كَانَ لِلرَّحْمٰنِ عَصِيًّا ﴿۴۴﴾ يٰأَبَتِ إِنِّي أَخَافُ أَن يَمَسَّكَ
عَذَابٌ مِّنَ الرَّحْمٰنِ فَتَكُونَ لِلشَّيْطٰنِ وَلِيًّا ﴿۴۵﴾ قَالَ أَرَاغِبٌ أَنتَ
عَنْ آلِهَتِي يٰإِبْرٰهِيمُ ۖ لَئِن لَّمْ تَنتَهِ لَأَرْجُمَنَّكَ ۖ وَاهْجُرْنِي

مَلِيًّا ﴿٤٦﴾ قَالَ سَلٰمٌ عَلَيْكَ ۚ سَاَسْتَغْفِرُ لَكَ رَبِّيْ ؕ اِنَّهٗ كَانَ بِيْ
حَفِيًّا ﴿٤٧﴾ وَاَعْتَزِلُكُمْ وَمَا تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَاَدْعُوْا رَبِّيْ ۖ
عَسٰۤى اَلَّاۤ اَكُوْنَ بِدُعَآءِ رَبِّيْ شَقِيًّا ﴿٤٨﴾ فَلَمَّا اعْتَزَلَهُمْ وَمَا يَعْبُدُوْنَ
مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۙ وَهَبْنَا لَهٗۤ اِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ ؕ وَكُلًّا جَعَلْنَا
نَبِيًّا ﴿٤٩﴾ وَوَهَبْنَا لَهُمْ مِّنْ رَّحْمَتِنَا وَجَعَلْنَا لَهُمْ لِسَانَ
صِدْقٍ عَلِيًّا ﴿٥٠﴾ وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ مُوْسٰۤى ۫ اِنَّهٗ كَانَ مُخْلَصًا وَّ ع ۳ ۱۰ ۶
كَانَ رَسُوْلًا نَّبِيًّا ﴿٥١﴾ وَنَادَيْنٰهُ مِنْ جَانِبِ الطُّوْرِ الْاَيْمَنِ وَقَرَّبْنٰهُ
نَجِيًّا ﴿٥٢﴾ وَوَهَبْنَا لَهٗ مِنْ رَّحْمَتِنَاۤ اَخَاهُ هٰرُوْنَ نَبِيًّا ﴿٥٣﴾ وَاذْكُرْ
فِي الْكِتٰبِ اِسْمٰعِيْلَ ۫ اِنَّهٗ كَانَ صَادِقَ الْوَعْدِ وَكَانَ رَسُوْلًا نَّبِيًّا ﴿٥٤﴾
وَكَانَ يَاْمُرُ اَهْلَهٗ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ ۪ وَكَانَ عِنْدَ رَبِّهٖ
مَرْضِيًّا ﴿٥٥﴾ وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِدْرِيْسَ ۫ اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيْقًا نَّبِيًّا ﴿٥٦﴾
وَّرَفَعْنٰهُ مَكَانًا عَلِيًّا ﴿٥٧﴾ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ
مِّنَ النَّبِيّٖنَ مِنْ ذُرِّيَّةِ اٰدَمَ ۗ وَمِمَّنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوْحٍ ۫ وَّمِنْ
ذُرِّيَّةِ اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْرَآءِيْلَ ۫ وَمِمَّنْ هَدَيْنَا وَاجْتَبَيْنَا ؕ اِذَا تُتْلٰى
عَلَيْهِمْ اٰيٰتُ الرَّحْمٰنِ خَرُّوْا سُجَّدًا وَّبُكِيًّا ﴿٥٨﴾ السجدة فَخَلَفَ مِنْۢ السجدة ۹
بَعْدِهِمْ خَلْفٌ اَضَاعُوا الصَّلٰوةَ وَاتَّبَعُوا الشَّهَوٰتِ فَسَوْفَ
يَلْقَوْنَ غَيًّا ﴿٥٩﴾ اِلَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَاُولٰٓئِكَ
يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ وَلَا يُظْلَمُوْنَ شَيْـًٔا ﴿٦٠﴾ ۙ جَنّٰتِ عَدْنِ ۣالَّتِيْ

وَعَدَ الرَّحْمٰنُ عِبَادَهٗ بِالْغَيْبِ ۭ اِنَّهٗ كَانَ وَعْدُهٗ مَاْتِيًّا ﴿٦١﴾ لَا
يَسْمَعُوْنَ فِيْهَا لَغْوًا اِلَّا سَلٰمًا ۭ وَلَهُمْ رِزْقُهُمْ فِيْهَا بُكْرَةً وَّعَشِيًّا ﴿٦٢﴾
تِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِيْ نُوْرِثُ مِنْ عِبَادِنَا مَنْ كَانَ تَقِيًّا ﴿٦٣﴾

ترجمۂ آیات ۴۱ — ۶۳

اور کتاب میں ابراہیم کی سرگزشت کو یاد کرو۔ بے شک وہ راست باز اور نبی تھا۔ یاد کرو جب کہ اس نے اپنے باپ سے کہا کہ اے میرے باپ! آپ ایسی چیزوں کی پرستش کیوں کرتے ہیں جو نہ سنتی ہیں، نہ دیکھتی ہیں اور نہ وہ کچھ آپ کے کام آنے والی ہیں! اے میرے باپ! میرے پاس وہ علم آیا ہے جو آپ کے پاس نہیں آیا ہے تو آپ میری پیروی کریں، میں آپ کو سیدھی راہ دکھاؤں گا۔ اے میرے باپ، شیطان کی پرستش نہ کیجیے۔ شیطان خدائے رحمان کا بڑا ہی نافرمان ہے۔ اے میرے باپ! مجھے ڈر ہے کہ آپ کو خدائے رحمان کا کوئی عذاب آ پکڑے اور آپ شیطان کے ساتھی بن کے رہ جائیں۔ ۴۱-۴۵

وہ بولا، اے ابراہیم! کیا تم میرے معبودوں سے برگشتہ ہو رہے ہو! اگر تم باز نہ آئے تو میں تمھیں سنگسار کر دوں گا۔ تم مجھ سے ہمیشہ کے لیے دور اور دفع ہو! ۴۶

ابراہیم نے کہا، اچھا میرا سلام! میں آپ کے لیے اپنے رب سے مغفرت مانگوں گا، وہ میرے حال پر بڑا ہی مہربان ہے۔ میں آپ لوگوں کو اور ان چیزوں کو جن کو آپ لوگ خدا کے ماسوا پوجتے ہیں، چھوڑ کر علیحدہ ہو رہا ہوں اور صرف اپنے رب ہی کی بندگی کروں گا۔ امید ہے کہ اپنے رب کی بندگی کر کے میں محروم نہیں رہوں گا۔ ۴۷-۴۸

پس جب وہ ان کو اور ان چیزوں کو جن کو وہ خدا کے ماسوا پوجتے تھے چھوڑ کر الگ ہو گیا تو ہم نے اس کو اسحاق اور یعقوب عطا کیے اور ان میں سے ہر ایک کو نبی بنایا اور ان کو اپنے فضل میں سے حصہ

دیا اور ان کو نہایت پائیدار شہرت عطا فرمائی۔ ۴۹-۵۰

اور کتاب میں موسیٰؑ کی سرگزشت کو یاد کرو۔ بے شک وہ برگزیدہ اور رسول اور نبی تھا۔ اور ہم نے اس کو طور کے مبارک کنارے سے آواز دی اور راز و سرگوشی کے لیے اس کو قریب کیا اور ہم نے اپنے فضل سے اس کے بھائی ہارونؑ کو نبی بنا کر اس کو دیا۔ ۵۱-۵۳

اور کتاب میں اسماعیلؑ کی سرگزشت کو یاد کرو، بے شک وہ وعدے کا پکا اور رسول اور نبی تھا۔ وہ اپنے لوگوں کو نماز اور زکوٰۃ کا حکم دیتا تھا اور اپنے رب کے نزدیک پسندیدہ تھا۔ ۵۴-۵۵

اور کتاب میں ادریسؑ کو یاد کرو۔ بے شک وہ راست باز اور نبی تھا۔ اور ہم نے اس کو رتبۂ بلند پر پہنچایا۔ ۵۶-۵۷

یہ لوگ ہیں جن پر، اللہ نے نبیوں میں سے، اپنا فضل فرمایا آدمؑ کی اولاد میں سے اور ان لوگوں کی نسل میں سے جن کو ہم نے نوحؑ کے ساتھ سوار کرایا اور ابراہیمؑ و اسرائیلؑ کی اولاد میں سے اور ان لوگوں میں سے جن کو ہم نے ہدایت بخشی اور جن کو برگزیدہ کیا۔ جب ان کو خدائے رحمان کی آیتیں سنائی جاتیں تو سجدہ کرتے اور روتے ہوئے گر پڑتے۔ پھر ان کے بعد ان کے ایسے جانشین اٹھے جنھوں نے نماز ضائع کر دی اور خواہشوں کے پیچھے پڑ گئے تو یہ لوگ عنقریب اپنی گمراہی کے انجام سے دوچار ہوں گے۔ اس سے صرف وہ لوگ مستثنیٰ ہوں گے جو توبہ کریں گے اور ایمان و عمل صالح کی روش اختیار کریں گے۔ یہی لوگ ہوں گے جو جنت میں داخل ہوں گے اور ان کی ذرا بھی حق تلفی نہ ہو گی۔ ہمیشگی کے باغ جن کا خدائے رحمان نے اپنے بندوں سے عالم غیب میں وعدہ کر رکھا ہے۔ بے شک اس کا وعدہ پورا ہو کے رہے گا۔ یہ اس میں کوئی لغویات نہیں سنیں گے، بس تحیت ہی تحیت ہو گی۔ اس میں صبح و شام ان کا رزق مہیا ہو گا۔ یہ وہ جنت ہے جس کا وارث ہم اپنے بندوں میں سے ان کو بنائیں گے جو خدا سے ڈرنے والے ہوں گے۔ ۵۸-۶۳

۷۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِبْرٰهِيْمَ ۥ اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيْقًا نَّبِيًّا (۴۱)

حضرت ابراہیم کے ذکر کی تقدیم کی وجہ

حضرت ابراہیم علیہ السلام چونکہ نبوت و رسالت کے دونوں سلسلوں کے، جو حضرت اسحاقؑ اور حضرت اسماعیلؑ سے قائم ہوئے، مسلّمہ امام ہیں اس وجہ سے سب سے پہلے انہی کی سرگزشت اور دعوت و تعلیم کا حوالہ دیا تاکہ بنی اسرائیل اور بنی اسماعیل دونوں پر حجت قائم ہو سکے۔

'الکتاب' سے مراد

'الکتاب' سے مراد عام طور پر ہمارے مفسرین نے قرآن کو لیا ہے۔ اگرچہ اس کا بھی ایک محل ہے لیکن میں نے اس سے کتب سابقہ کو مراد لیا ہے۔ میرے نزدیک یہ لفظ یہاں بھی اور آگے جہاں جہاں بھی انبیاء کے ذکر کے سلسلہ میں آیا ہے بطریق حوالہ ہے۔ یعنی تورات و انجیل کے حوالہ سے یہ یاد دہانی کی گئی ہے کہ تمام جلیل القدر انبیاء کی دعوت اور تعلیم وہی رہی ہے جو قرآن پیش کر رہا ہے۔ اس قرآن کو جھٹلانے والے درحقیقت اپنے انبیاء اور اپنے صحیفوں کی بھی تکذیب کر رہے ہیں۔

اور اگر اس سے قرآن کو مراد لیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اس کتاب میں اس کے مخالفین کو ان انبیاء کی سرگزشت سناؤ کہ وہ اس سے سبق حاصل کریں۔ یہ ان کے لیے رحمت و برکت ہے۔ اگر اس سے انہوں نے فائدہ نہ اٹھایا تو خود اپنے کو اللہ کی نعمت سے محروم کریں گے، کسی دوسرے کا کچھ نہیں بگاڑیں گے۔

ان دونوں صورتوں میں لفظ کا محل تو ضرور بدل جائے گا لیکن مدعائے کلام میں کچھ ایسا فرق واقع نہیں ہوگا۔

حضرت ابراہیم کی صدیقیت کے ذکر کا ایک خاص پہلو

یہاں حضرت ابراہیمؑ کی صدیقیت کے پہلو کو خاص طور پر نمایاں کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں اہل کتاب اور مشرکین عرب دونوں کو اس بات پر ملامت کی جا رہی ہے کہ تم حضرت ابراہیمؑ کی وراثت اور ان کی ذریت ہونے کے مدعی تو بنے بیٹھے ہو لیکن حال یہ ہے کہ تم نے ابراہیمؑ کی دعوت اور ان کی تعلیم کو بالکل برباد کر کے اس کی جگہ ایک نیا دین کھڑا کر لیا ہے۔ ابراہیمؑ تمہاری طرح خدا سے بدعہدی اور بے وفائی کرنے والے نہیں تھے بلکہ صداقت شعار، راست باز اور کامل وفادار تھے۔ خدا نے ان کو جن آزمائشوں میں ڈالا ان میں وہ پورے اترے اور ان امتحانوں میں پورے اترنے ہی کے صلہ میں اللہ نے ان کو امتوں کی امامت کے منصب پر سرفراز فرمایا۔ تم اگر ان کی وراثت اور ان کے ساتھ نسبت کے حق دار ہو سکتے ہو تو اس صورت میں ہو سکتے ہو جب کہ پوری راستبازی کے ساتھ اس عہد کو پورا کرو جو ابراہیمؑ کے واسطہ سے تم نے خدا سے باندھا ہے۔ اس کے بغیر نہ تم ابراہیمؑ کے ساتھ کسی نسبت کے حق دار ہو اور نہ اس امامت ہی میں تمہارا کوئی حصہ ہے جس کا وعدہ اللہ نے ابراہیمؑ اور ان کی ذریت کے لیے فرمایا۔

سورۂ بقرہ میں حضرت ابراہیمؑ کی اس صدیقیت اور اس کے صلہ و انعام کا یوں ذکر ہوا ہے۔

وَاِذِ ابْتَلٰٓى اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ	اور یاد کرو جب کہ ابراہیمؑ کو اس کے رب نے چند باتوں
فَاَتَمَّهُنَّ ۭ قَالَ اِنِّىْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ	میں جانچا تو وہ اس نے پوری کر دکھائیں۔ اس کے رب

اِمَامًا ۚ قَالَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِيْ ۚ قَالَ لَا يَنَالُ عَهْدِي الظّٰلِمِيْنَ۔ (البقرۃ - ۲ : ۱۲۴)

لے فرمایا کہ اب میں تمہیں قوموں کا امام بنانے والا ہوں۔ اس نے سوال کیا، اور میری ذریت کو بھی؟ فرمایا کہ میرا یہ وعدہ ان سے متعلق نہیں ہے جو اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے ہوں گے۔

یہاں کلمات سے مراد ظاہر ہے کہ وہی امتحانات ہیں جن میں حضرت ابراہیمؑ مبتلا کیے گئے اور وہ ان میں سو فیصدی کامیاب رہے۔ ان امتحانات کا ذکر قرآن میں تفصیل سے ہوا ہے اور ہم بقرہ کی تفسیر میں ان کا حوالہ دے چکے ہیں۔ انہی امتحانوں میں کامیابی کے صلہ میں اللہ تعالیٰ نے ان کو 'صدیق' کے لقب سے نوازا اور قوموں کی امامت کے منصب پر سرفراز فرمایا اور ساتھ ہی حضرت ابراہیمؑ کے سوال کے جواب میں یہ حقیقت بھی واضح فرما دی کہ یہ منصب نام ونسب کے ساتھ وابستہ نہیں ہے بلکہ اعمال و کردار کے ساتھ وابستہ ہے۔ حضرت ابراہیمؑ کی اولاد میں سے بھی وہی لوگ اس کے حقدار ٹھہریں گے جو اپنے باپ کی صدیقیت کی لاج رکھیں گے۔ جو اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے اور شرک و کفر کے علمبردار بن جائیں گے ان کے لیے اس میں کوئی حصہ نہیں ہے، خواہ وہ بنی اسحاق میں سے ہوں یا بنی اسماعیل میں سے۔

سورہ مریم کی زیر بحث آیت کے اصلی زور کو سمجھنے کے لیے لفظ 'صدیق' کے ان تمام مضمرات کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے اس کے بغیر آگے کے کلام کا اصلی رخ معین نہ ہو سکے گا۔

اِذْ قَالَ لِاَبِيْهِ يٰۤاَبَتِ لِمَ تَعْبُدُ مَا لَا يَسْمَعُ وَلَا يُبْصِرُ وَلَا يُغْنِيْ عَنْكَ شَيْـًٔا ۝ يٰۤاَبَتِ اِنِّيْ قَدْ جَآءَنِيْ مِنَ الْعِلْمِ مَا لَمْ يَاْتِكَ فَاتَّبِعْنِيْۤ اَهْدِكَ صِرَاطًا سَوِيًّا ۝ يٰۤاَبَتِ لَا تَعْبُدِ الشَّيْطٰنَ ۭ اِنَّ الشَّيْطٰنَ كَانَ لِلرَّحْمٰنِ عَصِيًّا ۝ يٰۤاَبَتِ اِنِّيْۤ اَخَافُ اَنْ يَّمَسَّكَ عَذَابٌ مِّنَ الرَّحْمٰنِ فَتَكُوْنَ لِلشَّيْطٰنِ وَلِيًّا (۴۲-۴۵)

حضرت ابراہیمؑ کی تقریر اپنے باپ کے سامنے

یہ حضرت ابراہیمؑ کی وہ تقریر ہے جو وحی الٰہی سے سرفراز ہونے کے بعد سب سے پہلے انھوں نے اپنے باپ — آزر — کے سامنے کی ہے۔ اس تقریر میں 'يٰۤاَبَتِ' (اے میرے باپ) کی تکرار حضرت ابراہیمؑ کی دل سوزی، دردمندی اور استمالت کی دلیل ہے۔ ایک سعادت مند بیٹے کے اندر باپ کی گمراہی سے جو تعلق خاطر اور جو اضطراب ہونا چاہیے وہ فقرے فقرے سے نمایاں ہے۔ اس سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ آزر حضرت ابراہیمؑ کے والد کا نام ہے نہ کہ چچا کا، جیسا کہ یہود کا دعویٰ ہے اور جس کو بے سوچے سمجھے ہمارے بعض مفسرین نے بھی قبول کر لیا اور پھر سبائیوں نے اس کو ایک فتنہ کا ذریعہ بنا لیا۔ ہم تورات کی اس روایت کی اس کے محل میں تردید کر چکے ہیں[1]۔

اس تقریر کے چند حقائق

توحید کی اس تقریر میں حضرت ابراہیمؑ نے اپنے باپ کو، ایک فطری ترتیب کے ساتھ چند حقائق کی طرف توجہ دلائی ہے۔

سب سے پہلے اس حقیقت کی طرف توجہ دلائی کہ آخر اپنے ہی ہاتھوں کی گھڑی ہوئی ان پتھر کی مورتوں کو معبود مان کر ان کی پوجا کرنے کا کیا تک ہے؟ کسی کو معبود بنا لینا کوئی شوق اور تفریح کی چیز نہیں ہے۔ اس کا تعلق تو

---

[1] ملاحظہ ہو تدبر قرآن جلد سوم صفحات ۸۸ - ۸۹

انسان کی سب سے بڑی احتیاج سے ہے۔ انسان خدا کو اس لیے مانتا ہے اور اس کی عبادت کرتا ہے کہ وہ اس کی دعا و فریاد کو سنتا، اس کے دکھ درد کو دیکھتا اور اس کی ہر مشکل میں اس کی دستگیری کرتا ہے۔ آخر یہ آپ کس اپنے ہی ہاتھوں کی گھڑی ہوئی مورتیں جو نہ سنتی ہیں، نہ دیکھتی ہیں، نہ آپ کے کچھ کام آسکتی ہیں، کس مرض کی دوا ہیں کہ آپ ان کے آگے ڈنڈوت کرتے ہیں۔ یہ گویا شرک کے بدیہی باطل ہونے کی دلیل ہے کہ اس کے باطن سے قطع نظر اس کا ظاہر ہی شہادت دیتا ہے کہ یہ کھلی ہوئی سفاہت اور عقل و فطرت سے بالکل بے جوڑ چیز ہے۔

دوسری حقیقت یہ واضح فرمائی کہ خدا کے معاملہ میں یہ طے کرنا کہ اس کا کوئی شریک ہے یا نہیں اور ہے تو کون ہے، یہ مجرد ظن و گمان رکھنے والی چیز نہیں ہے۔ آدمی ایک خدا کو تو اس لیے مانتا ہے کہ فطرت اور عقل، آفاق اور انفس کے اندر اس کی شہادت موجود ہے اور ہر انسان، جس کی فطرت سلیم ہو، اس کے ماننے پر مضطر ہے لیکن دوسروں کو ماننے کے لیے کیا مجبوری ہے کہ خواہ مخواہ کو ان کو بھی شریکِ خدا بنا کر اپنے سر پر لاد لے۔ اس معاملہ میں اعتماد کی چیز 'العلم' یعنی وہ علم حقیقی ہے جو خدا کی طرف سے وحی کے ذریعہ سے آتا ہے۔ حضرت ابراہیمؑ نے اپنے باپ کو دعوت دی کہ وہ ایسے اہم معاملہ میں مجرد وہم کی پیروی نہ کریں بلکہ ان کی پیروی کریں۔ وہ ان کے سامنے اس علم حقیقی کو پیش کر رہے ہیں جو خدا کی طرف سے ان کے پاس آیا ہے۔ اسی علم سے اس راہ کی طرف رہنمائی ہوگی جو خدا تک پہنچانے والی سیدھی راہ ہے۔ 'سیدھی راہ' یعنی یہ راہ بندے کو ہر واسطہ اور ہر وسیلہ سے بے نیاز کر کے براہ راست خدا تک پہنچانے والی ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ یہ راہ توحید کی راہ ہے۔

تیسری حقیقت یہ واضح فرمائی کہ شیطان کو سب سے زیادہ کد اور ضد، جیسا کہ قصۂ آدمؑ و ابلیس، سے واضح ہے توحید کی صراط مستقیم ہی سے ہے۔ اس نے یہ قسم کھا رکھی ہے کہ وہ ذریت آدمؑ کو اس صراط مستقیم سے برگشتہ کرنے کے لیے اپنا پورا زور لگا دے گا اور ان کو شرک میں مبتلا کر کے چھوڑے گا۔ خدائے رحمان کے ایسے کھلے ہوئے باغی کی ایسی وفادارانہ اطاعت درحقیقت اس کی عبادت ہے اور بدقسمت ہے وہ انسان جو خدا کو چھوڑ کر شیطان کی عبادت کرے۔

چوتھی حقیقت یہ واضح فرمائی کہ اب تک تو آپ کے لیے ایک عذر تھا کہ خدا کی ہدایت آپ کو نہیں پہنچی تھی لیکن اب جب کہ خدا کی ہدایت آپ کو پہنچ چکی ہے آپ کے لیے کوئی عذر باقی نہیں رہا اس وجہ سے مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں آپ خدا کی پکڑ میں نہ آجائیں اور شیطان کے ساتھی بن کر اسی انجام سے نہ دوچار ہوں جو شیطان اور اس کے اولیاء کے لیے مقدر ہے۔

قَالَ اَرَاغِبٌ اَنْتَ عَنْ اٰلِهَتِیْ یٰٓاِبْرٰهِیْمُ ۚ لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهِ لَاَرْجُمَنَّكَ وَاهْجُرْنِیْ مَلِیًّا (۴۶)

'ملیّ' مدت العمر اور زمانۂ طویل کے معنی میں آتا ہے۔ ہمارے نزدیک تقدیر کلام یوں ہے 'وَاهْجُرْنِیْ هَجْرًا مَلِیًّا' یعنی میرے سامنے سے دفع ہو، کبھی اپنی شکل مجھے نہ دکھائیو۔

آزر کی برہمی　حضرت ابراہیمؑ کی یہ تقریر سن کر آزر کا غصہ بھڑک اٹھا۔ بولا، ابراہیمؑ! تم میرے معبودوں سے برگشتہ ہو

رہے ہو! اگر تم اس حرکت سے باز نہ آئے تو میں تمہیں سنگ سار کر دوں گا اور اب بہتر یہ ہے کہ تم میری نگاہوں سے دور ہو جاؤ اور کبھی مجھے اپنی شکل نہ دکھانا۔

یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ قبائلی زندگی میں جس طرح آقاؤں کو اپنے غلاموں پر غیر محدود اختیارات حاصل ہوتے تھے اسی طرح باپوں کو اپنے بیٹوں اور بیٹیوں پر بالکل غیر محدود اختیارات حاصل تھے۔ وہ ان کو قتل کر دیں، سنگ سار کر دیں یا زندہ درگور کر دیں، کوئی ان کا ہاتھ پکڑنے والا نہیں تھا۔

قَالَ سَلٰمٌ عَلَيْكَ ۚ سَاَسْتَغْفِرُ لَكَ رَبِّيْ ۭ اِنَّهٗ كَانَ بِيْ حَفِيًّا ۔ وَاَعْتَزِلُكُمْ وَمَا تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَاَدْعُوْا رَبِّيْ ڮ عَسٰٓى اَلَّآ اَكُوْنَ بِدُعَاۗءِ رَبِّيْ شَقِيًّا (۴۷-۴۸)

وداعی سلام

'سَلٰمٌ' یہاں وداعی سلام کے مفہوم میں ہے۔ جس طرح ملاقات کے لیے شائستہ اور بابرکت طریقہ یہ ہے کہ وہ سلام کے ساتھ ہو اسی طرح جدائی کے لیے بھی شائستہ طریقہ یہی ہے۔

'حفی' کا مفہوم

'اِنَّهٗ كَانَ بِيْ حَفِيًّا'۔ 'حَفِيّ' اس کو کہتے ہیں جو کسی کی بڑی خبر رکھنے والا، اس کے لیے بڑا اہتمام کرنے والا اور اس پر بے نہایت کرم فرمانے والا ہو۔

حضرت ابراہیمؑ نے جب باپ کو اتنا غضب ناک دیکھا تو فرمایا کہ بہتر ہے، اگر آپ کی رائے یہی ہے کہ میں یہاں سے رخصت ہو جاؤں تو میرا سلام لیجیے، میں یہاں سے چلا۔ اب آپ سے تو کچھ کہنے سننے کی گنجائش رہی نہیں لیکن میں اپنے رب سے آپ کے لیے مغفرت کی دعا کروں گا۔ وہ میری بڑی خبر رکھنے والا ہے۔ مجھے امید ہے وہ میری دعا قبول فرمائے گا۔

باپ کے لیے دردمندی اور حق کے لیے حمیت

باپ کے اس سنگ دلانہ رویہ کے باوجود، حضرت ابراہیمؑ کا اس سے دعائے مغفرت کا وعدہ کرنا ان کی غایت درجہ دردمندی اور رقت قلب کی دلیل ہے۔ قرآن کے دوسرے مقامات سے واضح ہوتا ہے کہ انھوں نے باپ کے لیے اس وقت تک دعا جاری رکھی جب تک اللہ نے آپ کو اس سے روک نہیں دیا۔

لیکن اس دردمندی کے ساتھ ساتھ حق کی غیرت و حمیت کا جو تقاضا تھا وہ بھی انھوں نے پورا پورا ادا کیا۔ مروت یا خوف سے مغلوب ہو کر اپنی دعوتِ توحید کے معاملہ میں کوئی لچک یا مداہنت گوارا نہیں کی بلکہ چلتے چلاتے صاف صاف سنا دیا کہ میں آپ لوگوں سے بھی کنارہ کش ہوتا ہوں اور آپ لوگوں کے ان دیویوں اور دیوتاؤں سے بھی جن کو آپ لوگ خدا کے ماسوا پوجتے ہیں۔ مزید وضاحت یہ بھی فرما دی کہ میں اپنے رب کے سوا نہ کسی اور کو پکارتا ہوں نہ پکاروں گا اور میں امید رکھتا ہوں کہ اپنے رب کو پکار کر محروم نہیں رہوں گا۔

موم کی طرح نرم پتھر کی طرح سخت

حضرت ابراہیمؑ کے اس اعلانِ براءت میں جو زور، جو اعتماد علی اللہ اور خلق سے جو بے نیازی ہے وہ لفظ لفظ سے نمایاں ہے۔ اول تو حضرت ابراہیمؑ نے جمع کا صیغہ 'وَاَعْتَزِلُكُمْ' استعمال کیا ہے جس سے یہ بات نکلتی ہے کہ انھوں نے صرف آزر ہی سے نہیں بلکہ اس کے تمام حواریوں، ہمنواؤں اور خاندان سے بھی اعلانِ براءت کر دیا۔ اس کے ساتھ 'وَمَا تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ' کہہ کر ان کے تمام معبودوں کو بھی ان کے ساتھ

شامل کر دیا، گویا انھیں بھی لات مار دی۔ پھر بات کو صرف منفی پہلو ہی سے کہنے پر بس نہیں کیا بلکہ اس کو مثبت پہلو سے بھی آشکارا کر دیا فرمایا کہ وَاَدْعُوْا رَبِّیْ میں صرف اپنے رب ہی کو پکارتا ہوں اور اس کے سوا میں کسی اور معبود سے آشنا نہیں۔ آخر میں اپنے رب پر اپنے غیر متزلزل اعتماد کا اظہار فرمایا کہ میں اپنے رب کو پکار کے کبھی محروم نہیں رہا ہوں، امید ہے کہ اس آزمائش میں بھی اس کی نصرت اور رہنمائی میرے ساتھ ہوگی۔ ایک طرف تو وہ نرمی، دوسری طرف یہ سختی! درحقیقت نرمی و سختی کا یہی امتزاج اور ان کی یہی ہم آمیزی ہے جو ایک داعی حق کو دوسروں سے ممتاز کرتی ہے۔ جب تک آدمی موم کی طرح نرم اور پتھر کی طرح سخت نہ ہو وہ حق کی کوئی خدمت انجام نہیں دے سکتا۔

فَلَمَّا اعْتَزَلَهُمْ وَمَا يَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۙ وَهَبْنَا لَهٗٓ اِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ ۭ وَكُلًّا جَعَلْنَا نَبِيًّا (۴۹)

ہجرت اور اس کی برکات

حضرت ابراہیمؑ کا مذکورہ بالا اعلانِ براءت ہجرت کے ہم معنی تھا چنانچہ اس کے بعد انھوں نے ہجرت فرمائی۔ اس ہجرت کے بعد اللہ تعالیٰ نے ان کو حضرت اسحاقؑ اور اس کے بعد حضرت یعقوبؑ عطا فرمائے اور ان میں سے ہر ایک کو نبوت سے سرفراز فرمایا۔ حضرت اسحاقؑ اور حضرت یعقوبؑ کا ذکر آیت میں جس انداز سے ہوا ہے اس سے یہ بات مترشح ہوتی ہے کہ یہ حضرت ابراہیمؑ کی ہجرت کے ثمرات و برکات میں سے ہیں۔ جو بندہ اپنے گھر در، اپنے باپ چچا اور اپنے اعزہ و اقربا سب کو اپنے رب کی خاطر چھوڑتا ہے وہ سزاوار ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے لیے اپنے فضل خاص سے ایک دوسری بزم قدس آراستہ کرے تاکہ دنیا دیکھ لے کہ جو لوگ خدا کی خاطر اپنے کو اجاڑتے ہیں وہ کس شان سے آباد ہوتے ہیں۔ چنانچہ حضرت ابراہیمؑ کے لیے خدا کی یہی شان ظاہر ہوئی۔ ہجرت کے بعد اللہ تعالیٰ نے نہ صرف یہ کہ ان کو اولاد عطا فرمائی بلکہ ایسی اولاد عطا فرمائی جن سے اس دنیا میں نبوت و رسالت اور رشد و ہدایت کے دو عظیم سلسلے قائم ہو گئے جن کا فیض ہزاروں برس سے جاری ہے اور قیامت تک جاری رہے گا۔ حضرت اسحاقؑ کے ساتھ حضرت یعقوبؑ کا ذکر، درآنحالیکہ وہ حضرت ابراہیمؑ کے پوتے ہیں، یہ ظاہر کرنے کے لیے ہے کہ باپ، بیٹا، پوتا تینوں نبی۔ ایں خانہ تمام آفتاب است! بلکہ حضرت یوسفؑ کو بھی ملا لیجیے تو انبیاء کا ایک پورا گھرانا آباد ہو جاتا ہے۔ یہ شرف سیدنا ابراہیمؑ کے سوا اور کس کو حاصل ہوا!

ایک شبہ کا ازالہ

یہاں بادی النظر میں ایک بات کھٹکتی ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کی اولاد میں سے حضرت اسحاقؑ کا ذکر تو ہوا جو بنی اسرائیل کے سلسلہ کی پہلی کڑی ہیں لیکن سیدنا اسماعیلؑ کا ذکر نہیں ہوا، جن سے بنی اسماعیل کا سلسلہ چلتا ہے، جن کے اندر خاتم الانبیاء محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی، حالانکہ برکاتِ ہجرت میں سے اولین اور سب سے بڑی برکت، جیسا کہ استاذ امامؒ نے اپنے رسالہ ذبیح میں ثابت کیا ہے، حضرت اسماعیلؑ ہیں۔ ہمارے نزدیک یہاں حضرت اسماعیلؑ کا ذکر نہ کرنے کی وجہ یہ ہے کہ آگے ان کا ذکر مستقلاً آ رہا ہے۔ اس سورہ میں، جیسا کہ ہم پیچھے اشارہ کر آئے ہیں، اصل مخاطب مشرکین عرب ہیں۔ اہل کتاب کا ذکر اس میں تبعاً آیا ہے۔ سورہ کا یہ مزاج مقتضی ہوا کہ حضرت اسماعیلؑ کا ذکر یہاں تبعاً نہ آئے، بلکہ اہتمام کے ساتھ علیحدہ آئے تاکہ اہل عرب کو

پوری طرح متوجہ کر سکے۔

یہ بات بھی نگاہ میں رکھیے کہ حضرت عیسیٰؑ کے ذکر کی تمہید حضرت زکریاؑ کے ذکر سے اٹھائی ہے جن کے ہاں حضرت یحییٰؑ کی ولادت ایسے حالات میں ہوئی کہ حضرت زکریاؑ بڑھاپے کی آخری منزل میں پہنچ چکے تھے اور ان کی بیوی بانجھ تھیں۔ پھر حضرت عیسیٰؑ کی ولادت کا ذکر کرنے کے بعد حضرت ابراہیمؑ کا ذکر فرمایا اور معلوم ہے کہ ان کو بھی اولاد بڑھاپے ہی میں ملی۔ چنانچہ قرآن میں مذکور ہے کہ جب حضرت ابراہیمؑ کو اولاد کی بشارت ملی تو ان کی بیوی نے بالکل اسی طرح اظہار تعجب کیا جس طرح حضرت یحییٰؑ کی ولادت کی بشارت ملنے پر حضرت زکریاؑ نے اظہار تعجب کیا۔ قرآن نے حضرت عیسیٰؑ کے ذکر کے آگے پیچھے ان دونوں نبیوں کا ذکر کر کے ضمناً گویا یہ رہنمائی بھی دے دی کہ خارق عادت ولادت کی مثالیں حضرت عیسیٰؑ سے پہلے بھی موجود رہی ہیں۔ مجرد اسی بنیاد پر کسی کو الوہیت کا درجہ دے دینا محض سفاہت ہے۔

وَوَهَبْنَا لَهُمْ مِّنْ رَّحْمَتِنَا وَجَعَلْنَا لَهُمْ لِسَانَ صِدْقٍ عَلِيًّا (۵۰)

'رحمت' سے مراد وہ تمام افضال و عنایات اور وہ تمام برکتیں اور رحمتیں ہیں جو حضرت ابراہیمؑ اور آل ابراہیمؑ کو از قبیل نبوت و رسالت اور از قسم برکات دنیا حاصل ہوئیں اور جن کی تفصیلات بقرہ کی تفسیر میں گزر چکی ہیں۔

'لسان صدق' کا مفہوم

'لِسَانَ صِدْقٍ' میں 'لِسَان' سے مراد ذکر، چرچا اور شہرت ہے۔ لفظ 'صدق' کے اندر رسوخ، پائداری اور استحکام کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ یہ اسی طرح کی ترکیب ہے جس طرح دوسرے مقام میں 'قَدَمَ صِدْقٍ' کی ترکیب استعمال ہوئی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ نے ان کی دعوت کو خوب فروغ دیا اور ان کو وہ پائیدار عزت و شہرت حاصل ہوئی جو دنیا میں کسی کو حاصل نہیں ہوئی۔ اس کی پائیداری کا یہ عالم ہے کہ ہزاروں برس گزر گئے لیکن اس پر کہنگی نہیں آئی۔ سینکڑوں، ہزاروں جلیل القدر انبیاء و مصلحین اس مبارک خانوادے سے اٹھے اور حضرت ابراہیمؑ کے مشن کو زندہ کرتے رہے۔ آخر میں حضرت اسماعیلؑ کی نسل سے اسی ملت ابراہیمؑ پر حضرت سرور عالم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی جس سے اس عظمت و شہرت کو بقائے دوام حاصل ہو گیا۔ یہ سب کچھ حضرت ابراہیمؑ کی اس دعا کی برکت ہے جس کا حوالہ سورۂ شعراء میں یوں آیا ہے۔ وَاجْعَلْ لِّيْ لِسَانَ صِدْقٍ فِي الْاٰخِرِيْنَ ۔ ۸۴۔

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ مُوْسٰٓى اِنَّهٗ كَانَ مُخْلَصًا وَّكَانَ رَسُوْلًا نَّبِيًّا (۵۱)

حضرت موسیٰؑ کے لیے 'مخلص' کا لقب

حضرت ابراہیمؑ کے بعد ان کی ذریت کے اسرائیلی سلسلہ میں، جلیل القدر نبی حضرت موسیٰؑ ہیں۔ ان کے متعلق فرمایا کہ وہ 'مخلص' اور رسول و نبی تھے۔ ان کا رسول و نبی ہونا تو بالکل واضح ہے اس لیے کہ وہ فرعون اور اس کی قوم کی طرف بھی رسول بنا کر بھیجے گئے تھے اور بنی اسرائیل کی طرف بھی۔ البتہ لفظ 'مُخْلَص' یہاں ان کے ایک خاص وصف امتیازی کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ 'مُخْلَص' اس کو کہتے ہیں جو کسی کار خاص کے

لیے منتخب و مخصوص کیا گیا ہو۔ لفظ کے اس عام مفہوم کے اعتبار سے تمام انبیاء 'مُخلَص' ہیں اس لیے کہ وہ ایک خاص خدائی مشن کے لیے منتخب کیے گئے۔ چنانچہ قرآن میں، ان کی شان میں فرمایا بھی ہے کہ اِنَّآ اَخۡلَصۡنٰهُمۡ بِخَالِصَةٍ ذِكۡرَى الدَّارِ (ص ۴۶) (ہم نے ان کو ایک خاص مشن یعنی آخرت کی یاددہانی کے لیے منتخب کیا) اس وجہ سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰؑ کا وہ خاص وصف امتیازی کیا ہے جس کی وجہ سے وہ اس لقب سے ملقب ہوئے جب کہ پورے قرآن میں یہ لقب ان کے سوا کسی اور کے لیے استعمال نہیں ہوا۔ ہمارے نزدیک اس سوال کا جواب یہ ہے کہ یہ لفظ حضرت موسیٰؑ کے اس امتیاز و اختصاص کی طرف اشارہ کر رہا ہے جو ان کو خدا کے ساتھ ہم کلام ہونے کا حاصل ہوا۔ حضرت موسیٰؑ کے اس امتیازی وصف کا ذکر قرآن میں جگہ جگہ ہوا ہے۔ ہم سورۂ نساء کی آیت 'وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوۡسٰى تَكۡلِيۡمًا' ۔۱۶۴ کے تحت اس پر گفتگو کر چکے ہیں۔ آگے والی آیت بھی اسی مفہوم کی طرف اشارہ کر رہی ہے۔ اس میں فرمایا ہے 'وَقَرَّبۡنٰهُ نَجِيًّا' (ہم نے اس کو اپنی سرگوشی اور راز و نیاز کے لیے اپنے قریب کیا) تقریب و تکلم اور راز و نیاز کے اس مرتبۂ عالی کے لیے صرف حضرت موسیٰؑ ہی خاص کیے گئے اور ان کی اسی خصوصیت کو ظاہر کرنے کے لیے ان کو 'مُخلَص' کے لقب سے مشرف فرمایا گیا۔

وَنَادَيۡنٰهُ مِنۡ جَانِبِ الطُّوۡرِ الۡاَيۡمَنِ وَقَرَّبۡنٰهُ نَجِيًّا (۵۲)

'ایمن'
سے مرا

'اَيۡمَن' کے معنی داہنے کے بھی ہیں اور مقدس و مبارک کے بھی۔ ہمارے نزدیک یہ یہاں مقدس و مبارک کے معنی میں ہے۔ قرآن کے نظائر سے اسی معنی کی تائید ہوتی ہے۔ آگے سورۂ طٰہٰ میں یہی مضمون یوں بیان ہوا ہے۔

فَلَمَّآ اَتٰهَا نُوۡدِىَ يٰمُوۡسٰى ؕ اِنِّىۡۤ اَنَا رَبُّكَ فَاخۡلَعۡ نَعۡلَيۡكَ‌ۚ اِنَّكَ بِالۡوَادِ الۡمُقَدَّسِ طُوًى ؕ وَاَنَا اخۡتَرۡتُكَ فَاسۡتَمِعۡ لِمَا يُوۡحٰى (طٰہٰ ۱۱-۱۳)

پس جب وہ اس کے پاس آیا تو اس کو آواز آئی کہ اے موسیٰ یہ تو میں تمہارا رب ہوں تو تم اپنے جوتے اتار دو، تم وادی مقدس طویٰ میں ہو اور میں نے تمہیں منتخب کیا تو سنو جو تمہیں وحی کی جا رہی ہے۔

اس آیت سے واضح ہے کہ حضرت موسیٰؑ کو جو صدا سنائی دی وہ وادی مقدس طویٰ کی سمت سے سنائی دی۔ اس وادی کو تقدس کا یہ درجہ اس وجہ سے حاصل ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو اپنی جلوہ گاہ ہونے کا شرف بخشا اور یہاں حضرت موسیٰؑ سے اس نے کلام کیا۔ اسی تقدیس کو آیت زیر بحث میں 'اَيۡمَن' سے تعبیر فرمایا ہے۔ اور یہ چیز ایک قابلِ ذکر چیز تھی۔ جہاں تک اس لفظ کے دوسرے معنی کا تعلق ہے طور کی داہنی جانب کی نشان دہی کی کوئی خاص افادیت سمجھ میں نہیں آتی۔

'نجی'
کا مفہوم

وَقَرَّبۡنٰهُ نَجِيًّا 'نجی'، راز اور سرگوشی کو بھی کہتے ہیں اور اس شخص کو بھی کہتے ہیں جس سے سرگوشی کے انداز میں بات کی جائے، اور اس کو محرم راز بنایا جائے۔ یہ حضرت موسیٰؑ کے اسی امتیاز خاص کی وضاحت ہے

جس کا ذکر اوپر والی آیت میں ہوا ہے۔ فرمایا کہ ہم نے طور کی مبارک جانب سے اس کو پکارا اور راز و نیاز کے لیے اس کو قریب کیا۔ حضرت موسیٰؑ کے ساتھ اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے جو کلام کیا اس کو راز و نیاز اور سرگوشی سے تعبیر فرمایا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرات انبیاءؑ سے جب کلام کیا ہے تو ہمیشہ اپنے مقرب و معتمد فرشتے حضرت جبریل امین کے واسطہ ہی سے کیا ہے، کبھی براہِ راست کلام نہیں کیا۔ یہ شرف صرف حضرت موسیٰؑ کو حاصل ہوا کہ ان سے حضرت جبریلؑ کے واسطہ کے بغیر بات کی۔ کوئی تیسرا بیچ میں حائل نہیں ہوا البتہ حضرت موسیٰؑ کو اس موقع پر بھی باوجود اشتیاق کے اللہ تعالیٰ کا دیدار حاصل نہ ہو سکا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس عالمِ ناسوت میں کوئی جن و بشر یہاں تک کہ پہاڑ بھی خدا کی تجلّی کی تاب نہیں لا سکتا۔ یہاں ان باتوں کا کوئی ذکر نہیں ہے جو اللہ تعالیٰ اور حضرت موسیٰؑ کے مابین اس موقع پر ہوئیں۔ اس کی تفصیل سورہ طٰہٰ میں آئے گی۔

وَوَهَبْنَا لَهُ مِنْ رَّحْمَتِنَآ اَخَاهُ هٰرُوْنَ نَبِيًّا (۵۳)

حضرت موسیٰؑ پر ایک اور فضلِ خاص۔ ایک مددگار نبی کی بعثت

حضرت موسیٰؑ پر یہ فضلِ خاص بھی ہوا کہ کارِ نبوت کی انجام دہی میں ان کی مدد کے لیے اللہ تعالیٰ نے ان کے بھائی حضرت ہارونؑ کو ان کا وزیر اور مددگار بنایا اور ان کی یہ مدد محض رضا کارانہ نہیں بلکہ خدا کے ایک مامور و مسئول نبی کی حیثیت سے تھی۔ کسی رسول کی مدد کے لیے کسی نبی کا وزیر اور شریکِ کار کی حیثیت سے مقرر کیا جانا ایک امتیازِ خاص ہے جو حضرات انبیائے کرام کی تاریخ میں حضرت موسیٰؑ کے سوا اور کسی کے لیے معلوم نہیں۔ حضرت موسیٰؑ پر فرعون جیسے جبّار کے سامنے فرضِ رسالت کی ادائیگی اور بنی اسرائیل جیسی نکمی قوم کی اصلاح و تنظیم کی ذمہ داری جب ڈالی گئی تو وہ اس دوہری اور عظیم ذمہ داری سے بہت مضطرب ہوئے اور انھوں نے یہ دعا فرمائی کہ وَاجْعَلْ لِّيْ وَزِيْرًا مِّنْ اَهْلِيْ ۝ هٰرُوْنَ اَخِي ۝ اشْدُدْ بِهٖٓ اَزْرِيْ ۝ وَاَشْرِكْهُ فِيْٓ اَمْرِيْ ۝ كَيْ نُسَبِّحَكَ كَثِيْرًا ۝ وَّنَذْكُرَكَ كَثِيْرًا (طٰہٰ ۲۹-۳۴) (اے رب میرے لیے میرے اہلِ خاندان میں سے میرے بھائی ہارون کو وزیر مقرر کر دے، اس کے ذریعہ سے میری کمر کو مضبوط کر اور اس کو میری ذمہ داری میں شریک کر تاکہ ہم زیادہ سے زیادہ تیری تسبیح کر سکیں اور زیادہ سے زیادہ تیرا ذکر پھیلا سکیں) اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ کی یہ دعا قبول فرمائی اور اس کا ذکر سورۂ طٰہٰ میں ایک عظیم احسان کی حیثیت سے ہوا۔ اسی احسان کی طرف یہاں آیت زیرِ بحث میں اشارہ فرمایا ہے ـــــ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ یہود نے حضرت ہارونؑ کو بدنام کرنے کے لیے اپنے بعض سنگین جرائم کی ذمہ داری ان پر ڈال دی ہے لیکن قرآن نے ان کو ایک معصوم نبی کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِسْمٰعِيْلَ ۡ اِنَّهٗ كَانَ صَادِقَ الْوَعْدِ وَكَانَ رَسُوْلًا نَّبِيًّا (۵۴)

حضرت اسمٰعیلؑ کا ذکر خاص اہتمام کے ساتھ

اب یہ حضرت ابراہیمؑ کی ذریت کے دوسرے سلسلہ کے سربراہ حضرت اسماعیلؑ کا ذکر فرمایا۔ قریش انہی کی نسل سے اور انہی کی ملت کے پیرو ہونے کے مدعی تھے۔ اس سلسلہ میں پہلے رسول اور نبی حضرت اسمٰعیلؑ ہوئے

اور آخری نبی و رسول ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم۔ ان کے ذکر سے مقصود خاص طور پر مشرکین عرب کو متنبہ کرنا ہے کہ وہ غور کریں کہ حضرت اسماعیلؑ کا عمل اور ان کا پیام کیا تھا اور یہ ان سے کتنے بعید ہیں لیکن اس کے باوجود ان کی وراثت کے مدعی ہیں اور اس زعم میں قرآن کی مخالفت کر رہے ہیں در آنحالیکہ وہ سرتاسر ابراہیم و اسمٰعیل علیہما السلام کی ملت کی دعوت ہے۔

حضرت اسماعیلؑ 'صادق الوعد'

ان کی خاص صفت یہ بیان ہوئی ہے کہ اِنَّہٗ کَانَ صَادِقَ الْوَعْدِ، وہ وعدے کا سچا اور پکا تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ اشارہ اس وعدے کی طرف ہے جو انھوں نے حضرت ابراہیمؑ سے اپنے ذبح کیے جانے سے متعلق کیا۔ حضرت ابراہیمؑ نے جب ان سے استمزاج کیا کہ میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ میں تمھیں ذبح کر رہا ہوں تو بتاؤ، تمھاری کیا رائے ہے؟ انھوں نے بے دھڑک جواب دیا کہ آپ کو جو اشارہ ہوا ہے، آپ اس کی تعمیل کیجیے، ان شاء اللہ آپ مجھے ثابت قدم پائیں گے۔ پھر جب اس وعدے کی تکمیل کا وقت آیا تو انھوں نے بے جھجک اپنی گردن باپ کی چھری کے نیچے دے دی اور قریب تھا کہ چھری چل جائے لیکن اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ کا ہاتھ روک دیا کہ بس! مقصود امتحان تھا، وہ پورا ہو گیا اور باپ بیٹے دونوں کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے وفاداری اور راست بازی کی سند عطا ہوئی۔

یہ یاد رکھیے کہ 'صَادِقَ الْوَعْدِ' بظاہر مرکب تو صرف دو لفظوں سے ہے لیکن یہ مومن و مسلم کے کردار کی ایک جامع تعبیر ہے۔ اللہ کا جو بندہ اپنے رب سے کیے ہوئے عہد میں راست باز ہے اور اس کی خاطر اپنی گردن کٹوا سکتا ہے اس نے ایمان و اسلام کی معراج حاصل کر لی۔ رہے وہ لوگ جو ابراہیمؑ و اسمٰعیلؑ کے نام پر محض نسب فروشی اور لاف زنی کر رہے تھے ان کے سامنے قرآن نے یہ آئینہ رکھ دیا ہے کہ وہ اس میں اپنی سیاہ روئی کا مشاہدہ کر لیں!

وَكَانَ يَأْمُرُ أَهْلَهٗ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ ۖ وَكَانَ عِنْدَ رَبِّهٖ مَرْضِيًّا (۵۵)

حضرت اسماعیلؑ کا خاص مشن

ایمان و اسلام میں حضرت اسمٰعیلؑ کا جو مرتبہ تھا وہ تو اوپر کے ایک ہی لفظ 'صَادِقَ الْوَعْدِ' سے واضح ہو گیا۔ اب ان کے نام لیواؤں کو یہ بات یاد دلائی گئی ہے کہ وہ اپنے لوگوں کو نماز اور زکوٰۃ کا حکم دیتے تھے۔ نماز اور زکوٰۃ، جیسا کہ ہم پیچھے اشارہ کر آئے ہیں، تمام حقوق اللہ اور تمام حقوق العباد کی ایک جامع تعبیر ہے۔ انہی دو چیزوں پر تمام شرائع کی بنیاد ہے جس نے ان کا اہتمام کیا اس نے تمام دین و شریعت کو قائم کیا اور جس نے ان کو ہدم کیا اس نے پورے دین کو ہدم کیا۔

خدا کا کامل العیار بندہ

'وَكَانَ عِنْدَ رَبِّهٖ مَرْضِيًّا' ایک ایسی جامع تعریف ہے کہ اس کے بعد اس پر ایک حرف کے اضافے کی بھی گنجائش باقی نہیں رہ گئی ہے۔ اس کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ وہ اپنے رب کی نگاہوں میں بالکل ٹھیک ٹھیک ویسے ہی تھے جیسا وہ اپنے بندے کے لیے چاہتا ہے کہ وہ ہو۔ تو جس کے لیے خود پروردگار یہ شہادت دے کہ وہ اس کی پسند کے معیار پر پورا اترا اس سے بڑھ کر کامل العیار اور کون ہو سکتا ہے۔

یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ اسلام دشمنی کے جوش میں یہود نے حضرت ابراہیم اور اسمٰعیل علیہما السلام کی تاریخ بالکل مسخ کر دی ہے۔ بالخصوص حضرت اسماعیلؑ کی زندگی پر تو انھوں نے اس طرح پردہ ڈال دیا ہے کہ کسی کو ان کا سراغ ہی نہ مل سکے لیکن ہمارے استاذ مولانا فراہی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے رسالۂ ذبیح[1] میں ان تمام تحریفات کا پردہ چاک کر کے ان دونوں بزرگ نبیوں کی تاریخ از سر نو زندہ کر دی ہے۔ جو لوگ حضرت ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام سے متعلق قرآن کے ان بیانات کی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ کرنا چاہتے ہوں ہم ان کو مشورہ دیں گے کہ وہ مولانا کی مذکورہ کتاب کا گہری نظر سے ضرور مطالعہ کر ڈالیں۔

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِدْرِيْسَ اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيْقًا نَّبِيًّا ۙ وَّرَفَعْنٰهُ مَكَانًا عَلِيًّا (۵۶-۵۷)

حضرت ادریسؑ — حضرت ادریسؑ کے متعلق اسفار یہود اور بائیبل سے مجھے کوئی ایسی چیز نہیں مل سکی جس کی بنیاد پر ان کی نسبت میں کوئی بات اعتماد کے ساتھ کہہ سکوں۔ قدیم و جدید مفسرین نے جو کچھ لکھا ہے ان کی بنیاد تمام تر قیاسات و مفروضات پر ہے اس وجہ سے اس کا حوالہ دینا بے فائدہ ہے۔ قرآن نے جس انداز سے ان کا ذکر فرمایا ہے اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اہل کتاب کے صحیفوں میں ان کا ذکر موجود تھا اور ان کی نسبت کچھ غلط صحیح روایات بھی ان کے ہاں مشہور تھیں۔ اب یا تو یہ ہوا کہ جس طرح اکثر انبیاء کے نام عربی لب و لہجہ میں آکر کچھ سے کچھ ہو گئے ہیں اسی طرح حضرت ادریسؑ کا نام بھی بدل گیا ہو یا یہ ہوا کہ تورات کی ابتدائی روایات میں ان کا ذکر موجود رہا ہو لیکن بعد کے نسخوں سے ان کا ذکر غائب ہو گیا ہو۔ یہ یاد رکھنا چاہیے کہ تورات کئی مرتبہ غائب ہوئی ہے اور کئی مرتبہ زبانی روایات کے ذریعہ سے مرتب ہوئی ہے۔ اس وجہ سے اس کے نسخوں میں اختلاف بھی ہوا اور اس کے اندر برابر کمی بیشی بھی ہوتی رہی ہے۔ ہمارا خیال یہ ہے کہ قرآن نے جس طرح تورات کے بہت سے گم شدہ یا گم کردہ حقائق کا سراغ دیا ہے اور جس کی بہت سی مثالیں اس کتاب میں گزر چکی ہیں اسی طرح تاریخ انبیاء کے ایک گم گشتہ ورق کا پتہ حضرت ادریسؑ کا ذکر کر کے دیا۔ ان کا کردار بھی دوسرے انبیاء کی طرح پوری انسانیت کے لیے اسوہ اور نمونہ تھا اس وجہ سے قرآن نے صحیح پہلو سے ان کی یاد دہانی فرما دی اور ان کو از سر نو تاریخ میں زندہ کر دیا۔

حضرت ادریسؑ اور حضرت اسماعیلؑ میں دسفی اشتراک — ان کی تعریف میں بھی بعینہٖ وہی لفظ وارد ہوا ہے جو اوپر حضرت ابراہیمؑ کی تعریف میں وارد ہوا ہے۔ یعنی 'صدیق'۔ اس لفظ کے مضمرات اوپر بیان ہو چکے ہیں۔ ظاہر ہے کہ حضرت ادریسؑ کو یہ مقام بہت سے امتحانات سے گزرنے کے بعد ہی حاصل ہوا ہو گا۔ یہ امر بھی قابل توجہ ہے کہ حضرت ادریسؑ کا ذکر یہاں بھی حضرت اسماعیلؑ کے ساتھ ہوا ہے اور سورۂ انبیاء میں بھی حضرت اسماعیلؑ کے ساتھ ہی ہوا ہے۔ اور حضرت اسماعیلؑ کے ساتھ ان کو بھی صابرین میں شمار کیا گیا ہے اور فرمایا ہے وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِدْرِيْسَ وَذَا الْكِفْلِ ۭ كُلٌّ مِّنَ الصّٰبِرِيْنَ (الانبیاء ۸۵)

---

[1] مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی اصل کتاب عربی میں 'الرأی الصحیح فی من ھو الذبیح' کے نام سے ہے۔ ہم نے اس کا ترجمہ اردو میں بھی 'ذبیح کون ہے' کے نام سے کر دیا ہے۔

(اور اسمٰعیل، ادریس اور ذوالکفل کو یاد کرو، ان میں سے ہر ایک ثابت قدموں میں سے تھا) ان دونوں مقامات پر غور کرنے سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ ان دونوں نبیوں میں بڑی گہری وصفی مماثلت ہے، اس وجہ سے ان کا ذکر ساتھ ساتھ ہوا۔ ان کو صبر اور ثابت قدمی کے بڑے کڑے امتحانات سے گزرنا پڑا اور وہ ان میں پاس ہونے کے صلہ میں ان کو اللہ تعالیٰ کے ہاں اس مرتبۂ بلند کی سرفرازی حاصل ہوئی جس کا ذکر وَّرَفَعْنٰهُ مَكَانًا عَلِيًّا کے الفاظ سے ہوا ہے۔

أُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ أَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ مِنْ ذُرِّيَّةِ اٰدَمَ وَمِمَّنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوْحٍ وَّمِنْ ذُرِّيَّةِ اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْرَآءِيْلَ وَمِمَّنْ هَدَيْنَا وَاجْتَبَيْنَا اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُ الرَّحْمٰنِ خَرُّوْا سُجَّدًا وَّبُكِيًّا ۝ فَخَلَفَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ اَضَاعُوا الصَّلٰوةَ وَاتَّبَعُوا الشَّهَوٰتِ فَسَوْفَ يَلْقَوْنَ غَيًّا (۵۸-۵۹)

تمام انبیاء کا مشترک مشن

اب یہ ان تمام مذکورہ انبیاء کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ آدمؑ کی ذریت، نوحؑ کی ذریت، ابراہیمؑ و اسرائیلؑ کی ذریت کے گل سرسبد یہی انبیائے اولوالعزم ہیں۔ ان پر اللہ کا خاص انعام ہوا اور یہ ان لوگوں میں سے ہیں جن کو اللہ نے اپنے دین کی ہدایت بخشی اور جن کو نبوت و رسالت کے منصب کے لیے انتخاب فرمایا۔ ان تمام کا مشترک وصف یہ تھا کہ جب خدا کی آیتیں ان کو سنائی جاتیں تو روتے ہوئے سجدے میں گر پڑتے۔ پھر فرمایا کہ ان کے بعد ان کی ذریت میں ایسے ناخلف اٹھے جنھوں نے نماز ضائع کر دی اور خواہشوں کے پیچھے لگ گئے تو یہ عنقریب اپنی اس گمراہی کے انجام سے دوچار ہوں گے۔

ناخلف جانشینوں کو تنبیہ

درحقیقت یہی وہ اصل مدعا تھا جس کے لیے مذکورہ بالا انبیاء کی سرگزشتیں سنائی گئی ہیں۔ قرآن کے اس وقت کے مخاطب، خواہ مشرکین عرب ہوں یا یہود و نصاریٰ، سب انہی انبیاء میں سے کسی نہ کسی نبی کے نام لیوا تھے اور وہ اس حقیقت کو بھی تسلیم کرتے تھے کہ آدمؑ، نوحؑ، ابراہیمؑ اور اسرائیلؑ کی ذریت میں خدا کی ہدایت کا سرچشمہ یہی لوگ ہوئے ہیں۔ قرآن نے ان سب کی دعوت اور ان کے کردار و عمل کا حوالہ دے کر ان کے ان ناخلف جانشینوں کے حال پر افسوس کیا ہے جو مدعی تو تھے ابراہیمؑ و یعقوبؑ کی اولاد میں سے ہونے اور موسیٰؑ و مسیحؑ اور اسمٰعیلؑ کی پیروی کے لیکن حال یہ تھا کہ انھوں نے ان بزرگ نبیوں کے سکھائے ہوئے سارے دین کو برباد کر کے رکھ دیا تھا۔

ان انبیاء کے باب میں یہ جو ارشاد ہوا ہے کہ جب ان کو اللہ کی آیات سنائی جاتیں تو وہ روتے ہوئے سجدہ میں گر پڑتے، یہ ان کے ان نام لیواؤں پر تعریض ہے جن کا حال اس کے برعکس یہ تھا کہ ان کو قرآن کی آیتیں سنائی جاتیں تو وہ نہایت استکبار اور رعونت کے ساتھ اس کی تکذیب کرتے اور اس کا مذاق اڑاتے۔

'فَخَلَفَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ' میں لفظ 'خَلْفٌ' ناخلف کے معنی میں ہے۔ ہم دوسری جگہ 'خَلْفٌ' اور 'خَلَفٌ' کے فرق کی وضاحت کر چکے ہیں کہ 'خَلْفٌ' بسکون لام اچھے معنوں میں استعمال نہیں ہوتا بلکہ برے اخلاف

کے لیے آتا ہے۔ ان لوگوں کے ناخلف ہونے کی وجہ یہ ہے کہ انبیاء کے ساتھ نسبت اور ان کی وراثت کسی کو خاندان اور نسب کی بنا پر حاصل نہیں ہوتی بلکہ ان کی لائی ہوئی ہدایت کے حامل ہونے کی بنا پر حاصل ہوتی ہے۔ ان کا حال یہ تھا کہ انھوں نے نماز برباد کر دی اور شہوات کے غلام بن گئے۔ ظاہر ہے کہ نماز ضائع کر دینے کے بعد وہ دین کا اصل سررشتہ ہی کھو بیٹھے۔ نماز ہی وہ چیز ہے جو اگر صحیح طور پر ادا کی جائے تو بندے کو وہ عہد یاد دلاتی رہتی ہے جو اس نے اپنے رب سے باندھا ہے۔ اگر یہ چیز ضائع کر دی جائے تو آدمی کا شیطان کے پیچھے پڑھ جانا قطعی ہے ـــ یہود و نصاریٰ اور مشرکین نے دین کے اس بنیادی حکم کے ساتھ جو معاملہ کیا اس کی تفصیل سورۂ بقرہ، آل عمران اور مائدہ وغیرہ میں گزر چکی ہے۔ یہاں دہرانے میں طوالت ہوگی۔

ایک قابلِ توجہ بات

ایک بات یہاں قابلِ توجہ ہے کہ یہ نہیں فرمایا کہ انھوں نے نماز اور زکوٰۃ ضائع کر دی بلکہ فرمایا کہ نماز ضائع کر دی اور شہوات کے پیچھے پڑ گئے حالانکہ اوپر تمام انبیاء کی تعلیم میں نماز اور زکوٰۃ دونوں چیزوں کا ذکر ہے اس وجہ سے ذوق چاہتا ہے کہ یہاں زکوٰۃ کے ضائع کر دینے کا ذکر بھی ہوتا۔ اسلوب کی یہ تبدیلی ایک خاص حقیقت کی طرف اشارہ کر رہی ہے۔ وہ یہ کہ زکوٰۃ اور انفاق فی سبیل اللہ سے جو چیز انسان کو روکتی ہے وہ درحقیقت یہی اتباعِ شہوات ہے۔ جو شخص اپنی شہوات کی دلداری میں لگ جاتا ہے وہ پھر ان کا اس طرح غلام بن کے رہ جاتا ہے کہ خدا کی راہ میں خرچ کرنے کے لیے اس کے پاس کوئی گنجائش ہی نہیں رہ جاتی۔ یہ گویا ترکِ انفاق و زکوٰۃ کے بجائے ان کے اصل موانع کا ذکر فرما دیا کہ یہ موانع ان پر مسلط ہو گئے۔

عمل سے مراد نتیجۂ عمل

'فَسَوْفَ يَلْقَوْنَ غَيًّا' میں عمل سے نتیجۂ عمل مراد ہے۔ وہ اپنی گمراہی سے دوچار ہوں گے یعنی اپنی گمراہی کے انجام سے دوچار ہوں گے۔ یہ اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ آخرت میں جو چیز ان کے سامنے آئے گی وہ ان کی اپنی بوئی ہوئی فصل کا حاصل ہوگا۔ اس معاملے میں ان کے اوپر کوئی ظلم نہیں ہوگا۔

إِلَّا مَنْ تَابَ وَآمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَأُولَٰئِكَ يَدْخُلُونَ الْجَنَّةَ وَلَا يُظْلَمُونَ شَيْئًا ۝ جَنَّاتِ عَدْنٍ الَّتِي وَعَدَ الرَّحْمَٰنُ عِبَادَهُ بِالْغَيْبِ ۚ إِنَّهُ كَانَ وَعْدُهُ مَأْتِيًّا ۝ لَا يَسْمَعُونَ فِيهَا لَغْوًا إِلَّا سَلَامًا ۖ وَلَهُمْ رِزْقُهُمْ فِيهَا بُكْرَةً وَعَشِيًّا ۝ تِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِي نُورِثُ مِنْ عِبَادِنَا مَنْ كَانَ تَقِيًّا (۶۰ - ۶۳)

آخرت میں کام آنے والی چیز

یعنی نسب و حسب تو کوئی کام آنے والی چیز ثابت نہیں ہوگا البتہ جو لوگ اپنی غلطیوں سے رجوع کر کے اپنے اعمال کی اصلاح کر لیں گے وہ جنت میں داخل ہوں گے اور وہ اطمینان رکھیں کہ ان کی ذرا بھی حق تلفی نہیں کی جائے گی بلکہ وہ اپنی ہر نیکی کا بھرپور صلہ پائیں گے۔ ان کو ان کے اعمال کے صلہ میں عالمِ غیب میں ہمیشگی کے باغ ملیں گے۔ یہ خدائے رحمان کا اپنے نیک بندوں سے وعدہ ہے اور اس کا یہ وعدہ ضرور پورا ہوگا۔ 'مَأْتِيًّا' یعنی خدا کے اس موعود تک خدا کے تمام حق دار بندوں کی لازماً رسائی ہوگی کوئی اس کو وعدۂ فردا سمجھ کر اس کے بارے میں کسی شک میں مبتلا نہ ہو۔

ہر طرف مبارک سلامت

'لَا یَسْمَعُوْنَ فِیْهَا لَغْوًا اِلَّا سَلٰمًا' یعنی آج جو غوغا اور طوفان مخالفتِ حق اور اہلِ حق کے خلاف برپا ہے یہ سب وہاں نابود ہو جائے گا۔ وہاں کوئی لغویات کانوں میں نہیں پڑے گی۔ ہر طرف مبارک سلامت اور تحیت و تہنیت کے تبادلے ہو رہے ہوں گے۔ اہلِ جنت بھی اپنی کامیابی و فتحمندی پر ایک دوسرے کو مبارک باد دیں گے اور ملائکہ بھی ان کی فیروز مندی پر ان کا خیر مقدم سلام کے ساتھ کریں گے۔

اہل جنت کے لیے اصلی رزق

'وَلَهُمْ رِزْقُهُمْ فِیْهَا بُكْرَةً وَّعَشِیًّا' صبح و شام سے ظاہر ہے کہ جنت کے صبح و شام مراد ہیں جن کی حقیقت جنت ہی میں معلوم ہو گی اور اہلِ ایمان کے لیے اصلی رزق خدا کا دیدار، اس کا سلام و پیغام اور اس کا التفات و اکرام ہے۔ یہ چیز بھی ان کو وہاں برابر حاصل ہو گی۔ اگر طوالت کا اندیشہ نہ ہوتا تو ہم یہاں بعض احادیث نقل کرتے جن میں یہ مضمون نہایت خوبی سے واضح ہوا ہے۔ لفظ رزق انوار و برکاتِ الٰہی اور نفحاتِ روح و ریحان کے لیے قرآن میں بعض اور مقامات میں بھی استعمال ہوا ہے مثلاً آلِ عمران آیت ۳۷ میں۔ اور یہ تعبیر دوسرے آسمانی صحیفوں میں بھی موجود ہے۔

جنت کے لیے پشتینی ٹھیکیداروں کو تنبیہ

'تِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِیْ نُوْرِثُ مِنْ عِبَادِنَا مَنْ كَانَ تَقِیًّا' فرمایا کہ اس جنت کا حق دار ہم اپنے بندوں میں سے ان لوگوں کو بنائیں گے جو خدا سے ڈرنے والے اور اس کے حدود و قیود کا احترام کرنے والے ہوں گے۔ ہر مدعی اور ہر بوالہوس اس کا حق دار نہیں بن جائے گا۔ یہ فقرہ ان لوگوں پر تعریض ہے جنھوں نے خدا کا سارا دین تو تاراج کر کے رکھ دیا تھا لیکن اپنے زعم میں جنت کے پشتینی ٹھیکے دار بنے بیٹھے تھے۔

۸۔ آگے کا مضمون ـــــ آیات ۶۴۔ ۹۸

خاتمۂ سورہ

آگے خاتمۂ سورہ کی آیات ہیں۔ پہلے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت جبریل امین کی زبانی مخالفین کے مقابل میں صبر و استقامت کی تلقین ہے۔ پھر مخالفین کو ان کے انکارِ قیامت پر توبیخ ہے۔ خاص طور پر ان کی اس ذہنیت پر شدت کے ساتھ ضرب لگائی گئی ہے کہ آج اہلِ ایمان کے بالمقابل ان کو جو دنیوی برتری حاصل ہے اس کو وہ اپنے برحق ہونے کی دلیل سمجھے بیٹھے ہیں اور کہتے ہیں کہ بالفرض قیامت ہوئی تو وہ اپنے مزعومہ شرکاء و شفعاء کی بدولت وہاں بھی اونچا مقام حاصل کریں گے۔ آخر میں حضورؐ کو لوگوں کے مطالبۂ عذاب سے بے پروا ہو کر قرآن کے ذریعے سے انذار و تبشیر کی ہدایت فرمائی گئی ہے کہ یہ ہر مرحلہ میں اتمامِ حجت کے تمام لوازم سے آراستہ ہے تو تم اسی کے ذریعے سے انذار و تبشیر کرو، جن کے اندر خوفِ خدا ہے وہ اس سے فائدہ اٹھائیں گے۔ رہے وہ لوگ جو ضدی اور جھگڑالو ہیں تو ان کو ان کے انجام سے آگاہ کر دو۔ اگر وہ اپنی ضد پر اڑے رہے تو وہ اس ضد کے انجام سے خود دوچار ہوں گے، تم ان کی ذمہ داری سے بری ہو ـــــ اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمائیے۔

وَمَا نَتَنَزَّلُ اِلَّا بِاَمْرِ رَبِّكَ ۚ لَهٗ مَا بَيْنَ اَيْدِيْنَا وَمَا خَلْفَنَا وَمَا آیات
بَيْنَ ذٰلِكَ ۚ وَمَا كَانَ رَبُّكَ نَسِيًّا ﴿٦٤﴾ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا ٦٤-٩٨
بَيْنَهُمَا فَاعْبُدْهُ وَاصْطَبِرْ لِعِبَادَتِهٖ ۭ هَلْ تَعْلَمُ لَهٗ سَمِيًّا ﴿٦٥﴾ وَ ع ١٥
يَقُوْلُ الْاِنْسَانُ ءَاِذَا مَا مِتُّ لَسَوْفَ اُخْرَجُ حَيًّا ﴿٦٦﴾ اَوَلَا يَذْكُرُ
الْاِنْسَانُ اَنَّا خَلَقْنٰهُ مِنْ قَبْلُ وَلَمْ يَكُ شَيْئًا ﴿٦٧﴾ فَوَرَبِّكَ لَنَحْشُرَنَّهُمْ
وَالشَّيٰطِيْنَ ثُمَّ لَنُحْضِرَنَّهُمْ حَوْلَ جَهَنَّمَ جِثِيًّا ﴿٦٨﴾ ثُمَّ لَنَنْزِعَنَّ
مِنْ كُلِّ شِيْعَةٍ اَيُّهُمْ اَشَدُّ عَلَى الرَّحْمٰنِ عِتِيًّا ﴿٦٩﴾ ثُمَّ لَنَحْنُ اَعْلَمُ
بِالَّذِيْنَ هُمْ اَوْلٰى بِهَا صِلِيًّا ﴿٧٠﴾ وَاِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا ۚ كَانَ عَلٰى
رَبِّكَ حَتْمًا مَّقْضِيًّا ﴿٧١﴾ ثُمَّ نُنَجِّي الَّذِيْنَ اتَّقَوْا وَّنَذَرُ الظّٰلِمِيْنَ فِيْهَا
جِثِيًّا ﴿٧٢﴾ وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا بَيِّنٰتٍ قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِيْنَ
اٰمَنُوْٓا ۙ اَيُّ الْفَرِيْقَيْنِ خَيْرٌ مَّقَامًا وَّاَحْسَنُ نَدِيًّا ﴿٧٣﴾ وَكَمْ اَهْلَكْنَا
قَبْلَهُمْ مِّنْ قَرْنٍ هُمْ اَحْسَنُ اَثَاثًا وَّرِءْيًا ﴿٧٤﴾ قُلْ مَنْ كَانَ فِي الضَّلٰلَةِ
فَلْيَمْدُدْ لَهُ الرَّحْمٰنُ مَدًّا ۚ حَتّٰٓى اِذَا رَاَوْا مَا يُوْعَدُوْنَ اِمَّا
الْعَذَابَ وَاِمَّا السَّاعَةَ ۭ فَسَيَعْلَمُوْنَ مَنْ هُوَ شَرٌّ مَّكَانًا وَّاَضْعَفُ
جُنْدًا ﴿٧٥﴾ وَيَزِيْدُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اهْتَدَوْا هُدًى ۭ وَالْبٰقِيٰتُ الصّٰلِحٰتُ
خَيْرٌ عِنْدَ رَبِّكَ ثَوَابًا وَّخَيْرٌ مَّرَدًّا ﴿٧٦﴾ اَفَرَءَيْتَ الَّذِيْ كَفَرَ
بِاٰيٰتِنَا وَقَالَ لَاُوْتَيَنَّ مَالًا وَّوَلَدًا ﴿٧٧﴾ اَطَّلَعَ الْغَيْبَ اَمِ اتَّخَذَ
عِنْدَ الرَّحْمٰنِ عَهْدًا ﴿٧٨﴾ كَلَّا ۭ سَنَكْتُبُ مَا يَقُوْلُ وَنَمُدُّ لَهٗ مِنَ

الْعَذَابِ مَدًّا ﴿٧٩﴾ وَّنَرِثُهُ مَا يَقُولُ وَيَأْتِينَا فَرْدًا ﴿٨٠﴾ وَاتَّخَذُوا
مِنْ دُونِ اللَّهِ آلِهَةً لِّيَكُونُوا لَهُمْ عِزًّا ﴿٨١﴾ كَلَّا ۚ سَيَكْفُرُونَ بِعِبَادَتِهِمْ
وَيَكُونُونَ عَلَيْهِمْ ضِدًّا ﴿٨٢﴾ أَلَمْ تَرَ أَنَّا أَرْسَلْنَا الشَّيَاطِينَ عَلَى الْكَافِرِينَ ع ۵ ۱۷ ۸
تَؤُزُّهُمْ أَزًّا ﴿٨٣﴾ فَلَا تَعْجَلْ عَلَيْهِمْ ۖ إِنَّمَا نَعُدُّ لَهُمْ عَدًّا ﴿٨٤﴾ يَوْمَ
نَحْشُرُ الْمُتَّقِينَ إِلَى الرَّحْمَٰنِ وَفْدًا ﴿٨٥﴾ وَّنَسُوقُ الْمُجْرِمِينَ إِلَىٰ
جَهَنَّمَ وِرْدًا ﴿٨٦﴾ لَّا يَمْلِكُونَ الشَّفَاعَةَ إِلَّا مَنِ اتَّخَذَ عِنْدَ الرَّحْمَٰنِ وقف لازم
عَهْدًا ﴿٨٧﴾ وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمَٰنُ وَلَدًا ﴿٨٨﴾ لَّقَدْ جِئْتُمْ شَيْئًا وقف لازم
إِدًّا ﴿٨٩﴾ تَكَادُ السَّمَاوَاتُ يَتَفَطَّرْنَ مِنْهُ وَتَنْشَقُّ الْأَرْضُ وَتَخِرُّ
الْجِبَالُ هَدًّا ﴿٩٠﴾ أَنْ دَعَوْا لِلرَّحْمَٰنِ وَلَدًا ﴿٩١﴾ وَمَا يَنْبَغِي لِلرَّحْمَٰنِ
أَنْ يَتَّخِذَ وَلَدًا ﴿٩٢﴾ إِنْ كُلُّ مَنْ فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ إِلَّا آتِي الرَّحْمَٰنِ
عَبْدًا ﴿٩٣﴾ لَّقَدْ أَحْصَاهُمْ وَعَدَّهُمْ عَدًّا ﴿٩٤﴾ وَكُلُّهُمْ آتِيهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ
فَرْدًا ﴿٩٥﴾ إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ سَيَجْعَلُ لَهُمُ
الرَّحْمَٰنُ وُدًّا ﴿٩٦﴾ فَإِنَّمَا يَسَّرْنَاهُ بِلِسَانِكَ لِتُبَشِّرَ بِهِ الْمُتَّقِينَ
وَتُنْذِرَ بِهِ قَوْمًا لُّدًّا ﴿٩٧﴾ وَكَمْ أَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِنْ قَرْنٍ هَلْ
تُحِسُّ مِنْهُمْ مِنْ أَحَدٍ أَوْ تَسْمَعُ لَهُمْ رِكْزًا ﴿٩٨﴾ ع ۶ ۱۴ ۹

ترجمۂ آیات ۶۴ - ۹۸

اور ہم نہیں اترتے مگر آپ کے رب کے حکم سے۔ ہمارے آگے اور پیچھے اور جو کچھ اس کے درمیان ہے سب اسی کے اختیار میں ہے اور آپ کا رب کسی چیز کو بھولنے والا نہیں ہے۔ آسمانوں اور زمین اور جو کچھ ان کے درمیان ہے سب کا مالک وہی ہے تو اسی کی بندگی کرو اور اسی کی بندگی

پر جمے رہو۔ کیا تم اس کی کسی اور نظیر سے آشنا ہو! ۶۴-۶۵

اور انسان کہتا ہے کہ کیا جب میں مر جاؤں گا تو پھر زندہ کر کے نکالا جاؤں گا! کیا یہ انسان اس بات کو نہیں چیتتا کہ ہم نے اس کو اس سے پہلے پیدا کیا درآنحالیکہ وہ کچھ بھی نہ تھا! پس تیرے رب کی قسم! ہم ان کو بھی اور شیطانوں کو بھی ضرور اکٹھا کریں گے پھر ہم ان کو جہنم کے گرد اس طرح حاضر کریں گے کہ وہ دوزانو بیٹھے ہوئے ہوں گے۔ پھر ہم ہر گروہ میں سے ان لوگوں کو چھانٹ کر الگ کریں گے جو خدائے رحمان سے سب سے زیادہ سرکشی کرنے والے رہے ہوں گے۔ پھر ہم ان لوگوں کے سب سے زیادہ جاننے والے ہوں گے جو اس جہنم میں داخل ہونے کے سب سے زیادہ سزاوار ہوں گے (اور ان کو حکم دیں گے) کہ تم میں سے ہر ایک کو بہرحال اس میں داخل ہونا ہے۔ یہ تیرے رب کے اوپر ایک طے شدہ امر واجب ہے۔ ۶۶-۷۱

پھر ہم ان لوگوں کو نجات بخشیں گے جنھوں نے تقویٰ اختیار کیا ہوگا اور اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والوں کو اسی میں گھٹنوں بیٹھے چھوڑ دیں گے۔ ۷۲

اور جب ان کو ہماری واضح آیات پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو جن لوگوں نے کفر کی راہ اختیار کر رکھی ہے وہ ایمان لانے والوں سے سوال کرتے ہیں کہ فریقین میں سے اپنے مرتبہ اور سوسائٹی کے اعتبار سے کون بڑھ کر ہے؟ اور ہم نے ان سے پہلے کتنی ہی قومیں ہلاک کر چھوڑیں جو ان سے ساز و سامان اور شان و شوکت میں کہیں بڑھ چڑھ کر تھیں۔ ان سے کہہ دو کہ جو لوگ گمراہی میں پڑے رہتے ہیں تو خدائے رحمان کی شان یہی ہے کہ ان کی رسی اچھی طرح دراز کرے۔ یہاں تک کہ جب وہ دیکھ لیں گے اس چیز کو جس کا ان سے وعدہ کیا جا رہا ہے خواہ عذاب دنیا یا قیامت ـــــ ان کو پتہ چل جائے گا کہ درجے کے اعتبار سے کون بدتر اور حمائتیوں کے اعتبار سے کون کمزور تر ہے۔ ۷۳-۷۵

اور اللہ تعالیٰ ان لوگوں کی ہدایت میں اضافہ فرماتا ہے جو ہدایت کی راہ اختیار کرتے ہیں اور باقی رہنے والے اعمالِ صالحہ اجر کے اعتبار سے بھی بہتر ہیں اور مآل کار کے اعتبار سے بھی خوش انجام ہیں۔ ۷۶

بھلا دیکھا تم نے اس کو جس نے ہماری آیات کا انکار کیا! اور دعویٰ کیا کہ میں آخرت میں بھی مال اور اولاد سے نوازا جاؤں گا! کیا اس نے غیب میں جھانک کر دیکھ لیا ہے یا خدائے رحمان سے کوئی عہد کرالیا ہے! ہرگز نہیں، جو کچھ وہ بکتا ہے ہم اس کو نوٹ کر رکھیں گے اور اس کے عذاب میں مزید اضافہ کریں گے اور جن چیزوں کا وہ مدعی ہے اس کے وارث ہم بنیں گے اور وہ ہمارے پاس یکہ و تنہا حاضر ہوگا۔ ۷۷-۸۰

اور انھوں نے اللہ کے ماسوا معبود بنا رکھے ہیں تاکہ وہ ان کے لیے پشت پناہ بنیں۔ ہرگز نہیں، وہ ان کی عبادت کا انکار کریں گے اور ان کے عدو بنیں گے۔ ۸۱-۸۲

تم نے دیکھا نہیں کہ ہم نے کافروں پر شیاطین کو چھوڑ دیا ہے، وہ انھیں خوب خوب اکسا رہے ہیں۔ تو تم ان کے فیصلے کے لیے جلدی نہ کرو۔ ہم ان کے لیے اچھی طرح گنتی کر رہے ہیں۔ ۸۳-۸۴

یاد کرو جس دن ہم خدا ترسوں کو خدائے رحمان کی طرف وفد و فد لے جائیں گے اور مجرموں کو جہنم کے گھاٹ کی طرف ہانکیں گے پیاسے۔ اس دن کسی کو شفاعت کا اختیار نہیں ہوگا مگر اس کو جس نے اللہ کے پاس کوئی عہد حاصل کر لیا۔ ۸۵-۸۷

اور کہتے ہیں کہ خدائے رحمان نے اولاد بنا رکھی ہے۔ یہ تم نے ایسی سنگین بات کہی ہے کہ قریب ہے کہ اس سے آسمان پھٹ پڑیں، زمین شق ہو جائے اور پہاڑ دھماکے کے ساتھ گر پڑیں کہ انھوں نے خدا کی طرف اولاد کی نسبت کی۔ اور یہ بات خدا کے شایان نہیں ہے کہ وہ اولاد بنائے۔ آسمانوں

اور زمین میں جو بھی ہیں سب خدائے رحمان کے حضور بندے ہی کی حیثیت سے حاضر ہوں گے۔ سب کا اس نے احاطہ کر رکھا ہے اور اچھی طرح گن رکھا ہے اور ان میں سے ہر ایک اس کے حضور یکہ و تنہا حاضر ہو گا۔ البتہ جو لوگ ایمان لائے اور جنھوں نے نیک عمل کیے ان کے لیے خدائے رحمان مہر و محبت پیدا کر دے گا۔ ۸۸-۹۶

پس ہم نے اس کتاب کو تمھاری زبان میں اس لیے سہل و سازگار بنایا کہ تم خدا ترسوں کو بشارت پہنچا دو اور جھگڑالو قوم کو آگاہی سنا دو۔ اور ان سے پہلے کتنی ہی قوموں کو ہم نے ہلاک کر چھوڑا۔ کیا تم ان میں سے کسی کو محسوس کرتے ہو یا ان کی کوئی آہٹ سنتے ہو! ۹۷-۹۸

۹- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَمَا نَتَنَزَّلُ اِلَّا بِاَمْرِ رَبِّكَ ۚ لَهٗ مَا بَيْنَ اَيْدِيْنَا وَمَا خَلْفَنَا وَمَا بَيْنَ ذٰلِكَ ۚ وَمَا كَانَ رَبُّكَ نَسِيًّا ﴿﴾ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا فَاعْبُدْهُ وَاصْطَبِرْ لِعِبَادَتِهٖ ۚ هَلْ تَعْلَمُ لَهٗ سَمِيًّا ﴿﴾ (۶۴-۶۵)

وسط کلام میں حضرت جبرئیل کی طرف سے ایک تلقین

یہ کلام حضرت جبرئیل امین کی طرف سے ہے جس میں انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو صبر و استقامت کی تلقین بھی فرمائی ہے اور اپنی اور دوسرے ملائکہ کی حیثیت بھی واضح فرما دی کہ ہم اپنے اختیار سے کچھ کرنے کے مجاز نہیں ہیں، ہمارا کام صرف اللہ تعالیٰ کے احکام کی بجا آوری ہے۔ اس تلقین صبر اور اس وضاحت کا ایک خاص موقع و محل ہے۔ وہ یہ کہ حق و باطل کی کشمکش کے اس مرحلہ میں مخالفین کے بالمقابل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے واحد سہارا بس وحی الٰہی کا سہارا تھا۔ اسی آسمانی کمک سے مشکلات میں آپ کو تقویت و رہنمائی بھی حاصل ہوتی تھی اور اسی کے ذریعے سے مخالفین کے نت نئے اعتراضات کا جواب اور ان کے اٹھائے ہوئے فتنوں کا توڑ بھی ہوتا تھا۔ اس وجہ سے قدرتی طور پر آنحضرت کو اس مرحلہ میں نہایت بے چینی کے ساتھ حضرت جبرئیل کا، جو وحی الٰہی لانے کا ذریعہ تھے، انتظار رہتا۔ آنحضرت کی یہ بے چینی حالات کا لازمی تقاضا تھی۔ جو مجاہد دشمنوں کی دل بادل فوج کے مقابل میں محاذ پر ہو اس کو مرکز سے رہنمائی کا انتظار ہر وقت رہتا ہے تاکہ اس کا کوئی قدم غلط نہ اٹھ جائے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کا ہر کام اس کی حکمت و مصلحت کے تحت ہوتا ہے جس کو صرف وہی جانتا ہے۔ اسی وجہ سے آنحضرت کو اس بے چینی پر قرآن میں جگہ جگہ صبر و انتظار کی تلقین کی گئی ہے کہ اپنے موقف پر ڈٹے رہو، جلدی نہ کرو، جس رہنمائی اور مدد کی ضرورت ہو گی وہ اپنے وقت پر اللہ نازل فرمائے گا۔ یہی مضمون سورۂ طٰہٰ میں یوں وارد ہوا ہے۔ وَلَا تَعْجَلْ بِالْقُرْاٰنِ مِنْ قَبْلِ اَنْ

يُّقۡضٰٓى اِلَيۡكَ وَحۡيُهٗ ۡ وَقُلۡ رَّبِّ زِدۡنِىۡ عِلۡمًا (۱۱۴ - طٰہٰ) (اور قرآن کے لیے، اس کی وحی اپنی طرف تمام کیے جانے سے پہلے، جلدی نہ کرو اور دعا کرتے رہو کہ اے میرے رب، میرے علم میں افزونی فرما) یہ مضمون قرآن میں دوسرے مقامات میں بھی آیا ہے لیکن یہاں یہ حضرت جبریلؑ امین کی زبان سے ادا ہوا ہے جس سے اس کی بلاغت میں بڑا اضافہ ہوگیا ہے۔ ہم اس کے بعض پہلوؤں کی طرف اشارہ کرنا چاہتے ہیں۔

حضرت جبریلؑ کی معذرت

اس میں پہلی قابلِ توجہ چیز تو یہ ہے کہ یہ حضرت جبریلؑ امین کی طرف سے آنحضرتؐ کی خدمت میں ایک نوع کی معذرت ہے کہ اگر ہم جلدی جلدی، آپ کے شوق و انتظار کی تسکین کے لیے، وحی لے کر نہیں اترتے تو اس میں ہماری کسی کوتاہی کو دخل نہیں ہے بلکہ ہمارا اترنا تمام تر اللہ تعالیٰ کے حکم کے تحت ہے۔ جب تک اس کا حکم نہ ہو نہ ہم اتر سکتے ہیں اور نہ ہم آپ کے پاس کوئی وحی لا سکتے ہیں۔ اس معاملہ میں ہمیں کوئی دخل نہیں ہے۔ ہم صرف اس کے احکام کی بجا آوری پر مامور ہیں۔

حضرت جبریلؑ اور ملائکہ کی اصل حیثیت

دوسری چیز قابلِ توجہ یہ ہے کہ اس سے حضرت جبریلؑ امین اور پورے زمرۂ ملائکہ کی حیثیت واضح ہوگئی کہ ان کے تمام پیش و عقب اور جو کچھ ان کے مابین ہے سب پر اللہ تعالیٰ کی نگرانی اور اس کا مکمل کنٹرول ہے۔ مجال نہیں کہ کوئی سرِمو اپنے دائرہ سے تجاوز کر سکے یا کوئی اقدام اپنے ارادے سے کر سکے۔ اللہ تعالیٰ کسی چیز کو فراموش کرنے والا بھی نہیں ہے کہ کوئی اس کی بھول چوک سے فائدہ اٹھا کر کسی معاملے میں اپنی آزادیٔ رائے استعمال کر کے اس کی پکڑ سے محفوظ رہ سکے ــــ

مشرکین کی حماقت پر ایک کاری ضرب

فرشتوں کی اس حیثیت کا واضح ہونا ان مشرکین عرب کی حماقت پر ضرب لگانے کے لیے ضروری تھا جو فرشتوں کی پوجا کر کے یہ آس لگائے بیٹھے تھے کہ اگر قیامت ہوئی تو یہ خدا کی بیٹیاں اپنے باپ سے کہہ سن کے ان کو بخشوا ہی لیں گی۔ ان بے وقوف لوگوں کو حضرت جبریلؑ کا یہ بیان سنا کر آگاہ کر دیا گیا کہ جب ربِّ ذوالجلال کی بارگاہ میں جبریلؑ امین کی، جو تمام زمرۂ ملائکہ کے گلِ سرسبد ہیں، بے بسی کا یہ حال ہے تو تا بہ دیگراں چہ رسد!

آنحضرت صلعم کو اطمینان دہانی

'وَمَا كَانَ رَبُّكَ نَسِيًّا' میں ایک اور پہلو کی طرف بھی ذہن جاتا ہے۔ وہ یہ کہ پیغمبرؐ کو اطمینان دہانی ہے کہ اگر وحی الٰہی میں کبھی دیر ہو تو یہ اطمینان رکھیے کہ یہ دیر کسی حکمت و مصلحت پر مبنی ہے اس لیے کہ آپ کا رب کسی چیز کو بھولنے والا نہیں ہے، وہ آپ کے تمام حالات و مسائل سے باخبر اور ایک ایک دعا و مناجات کو یاد رکھے ہوئے ہے۔ اس کا اندیشہ نہیں ہے کہ وہ کسی چیز کو بھول جائے۔

'رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَمَا بَيۡنَهُمَا فَاعۡبُدۡهُ وَاصۡطَبِرۡ لِعِبَادَتِهٖ ؕ هَلۡ تَعۡلَمُ لَهٗ سَمِيًّا'

لفظ 'سمیؔ' آیت ۷ میں گزر چکا ہے۔ اس کے معنی نظیر اور مثیل کے ہیں۔

آنحضرت صلعم کو تلقینِ صبر

یہ آیت حضرت جبریلؑ کے قول کا جزو بھی ہو سکتی ہے اور بطریق تضمین اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضرت جبریلؑ امین کے قول کی تکمیل بھی۔ اس قسم کی تضمین کی مثالیں قرآن مجید میں بہت ہیں۔ ایک مثال سورۂ کہف میں بھی گزر چکی ہے۔ ان دونوں شکلوں میں سے جو شکل بھی اختیار کیجیے فرق صرف متکلم میں ہوگا، کلام کے مدعا میں کوئی فرق نہ ہوگا اور یہ متکلم کا فرق بھی محض ظاہری ہوگا اس لیے کہ حضرت جبریلؑ جو بات بھی فرماتے ہیں وہ اللہ تعالیٰ کے حکم

ہی سے فرماتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو حکم دیا کہ در باب وحی تم اپنا عذر واضح کر دو چنانچہ انھوں نے واضح فرما دیا۔

میرا رجحان پہلے قول کی طرف ہے۔ یعنی حضرت جبرئیل نے آنحضرت کو صبر اور انتظار کی تلقین فرمائی کہ آپ کا معاملہ کسی ایسی ویسی ذات سے نہیں بلکہ تمام آسمانوں اور زمین اور جو کچھ ان کے درمیان ہے سب کے رب کے ساتھ ہے تو اسی کی بندگی کیجیے اور اس کی بندگی پر پورے استقلال و پامردی سے جمے رہیے۔ قرینہ دلیل ہے کہ یہاں لفظ 'عبادت' اپنے وسیع مفہوم یعنی عبادت اور اطاعت دونوں پر مشتمل ہے۔ اس لفظ کی یہ حقیقت ہم تفسیر سورۂ فاتحہ میں واضح کر چکے ہیں۔ آیت ۴۴ میں بھی یہ لفظ اطاعت کے مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔ لفظ

'صبر' اور 'اصطبار' کا مفہوم

'اصطبار' میں 'صبر' کے بالمقابل زیادہ زور ہے۔ عربیت کے اس قاعدے کو یاد رکھیے کہ حروف کی زیادتی معنی کی زیادتی پر دلیل ہوتی ہے۔ اور 'صبر' یا 'اصطبار' کے بعد اگر 'لِ' ہو تو یہ انتظار کے مفہوم پر بھی متضمن ہوتا ہے۔ ہم نے لفظ کے ان مضمرات کو ترجمہ میں کھولنے کی کوشش کی ہے لیکن عربی زبان کے یہ نازک پہلو اردو کی گرفت میں مشکل ہی سے آتے ہیں۔ سورۂ طٰہٰ میں بھی یہ مضمون آئے گا وہاں ان شاء اللہ ہم اس پر مزید روشنی ڈالیں گے۔

هَلْ تَعْلَمُ لَهُ سَمِيًّا، یعنی جب خدا کا کوئی نظیر و مثیل اور ثانی نہیں تو کون ہے جو اس کے ارادوں میں مزاحم ہو سکے یا اس کا ہاتھ پکڑ سکے۔ آپ اپنا کام کیے جائیے وہ ہر مشکل کو آسان کرے گا اور اپنے ہر ارادے کو بروئے کار لائے گا۔

وَيَقُولُ الْإِنْسَانُ ءَإِذَا مَا مِتُّ لَسَوْفَ أُخْرَجُ حَيًّا (۶۶)

منکرین قیامت کے متناقض خیالات کی تردید

حضرت جبرئیل کا کلام تمام ہوا۔ اب یہ براہِ راست اللہ تعالیٰ کی طرف سے ارشاد ہو رہا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو صبر و استقامت کی تلقین کے بعد اب یہ مخالفین کے اصل سبب تکذیب کا خود ان کے الفاظ میں حوالہ دے کر آگے اس کی تردید آ رہی ہے۔ یہاں لفظ 'انسان' اگرچہ عام ہے لیکن قرینہ دلیل ہے کہ اس سے مراد مشرکین عرب ہی ہیں جو قیامت کو ایک مستبعد چیز سمجھ کر اس کی تکذیب کرتے تھے۔ عام لفظ سے بات کہنے میں یہ بلاغت ہے کہ گویا وہ لائق التفات نہیں اس وجہ سے عام صیغہ سے بات کہہ دی گئی۔

قیامت کے باب میں مشرکین عرب کا موقف، جیسا کہ ہم دوسرے مقام میں واضح کر چکے ہیں، صریح انکار کا نہیں تھا بلکہ وہ ایک قسم کے تناقض میں مبتلا تھے۔ وہ اللہ تعالیٰ کو زندہ کرنے والا اور مارنے والا تو مانتے تھے لیکن اس بات کو بہت مستبعد سمجھتے تھے کہ مر کھپ جانے کے بعد سارے لوگ پھر زندہ کر کے اٹھائے جائیں گے اور سب کا حساب کتاب ہوگا۔ ان کے امراء و اغنیاء اس غلط فہمی میں بھی مبتلا تھے کہ بالفرض قیامت ہوئی تو وہ وہاں بھی وہی کچھ پائیں گے جو ان کو یہاں حاصل ہے۔ پھر سب سے زیادہ اعتماد ان کو اپنے دیویوں دیوتاؤں پر تھا، وہ فرشتوں کو خدا کی چہیتی بیٹیاں مان کر ان کی پرستش کرتے تھے اور ان کا زعم یہ تھا کہ اگر قیامت ہوئی اور حساب و کتاب سے سابقہ پیش آیا تو ان کے یہ معبود ان کو خدا سے چھڑا لیں گے۔ مشرکین کے ان متناقض خیالات کو سامنے رکھیے تب قرآن کے آگے کے مباحث سمجھ میں آئیں گے۔

اَوَلَا يَذۡكُرُ الۡاِنۡسَانُ اَنَّا خَلَقۡنٰهُ مِنۡ قَبۡلُ وَلَمۡ يَكُ شَيۡـئًا (۶۷)

ایک بدیہی تناقض ذہنی

یہ اسی تناقض ذہنی کی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ جب یہ انسان اس حقیقت سے انکار نہیں کرسکتا کہ خدا نے اس کو عدم محض سے وجود بخشا تو آخر اس کو یہ بات کیوں مستبعد معلوم ہوتی ہے کہ مرنے کے بعد وہ اس کو دوبارہ اٹھا کھڑا کرے۔ جب وہ 'کچھ نہیں' سے پیدا کرسکتا ہے تو 'کچھ ہے' سے دوبارہ پیدا کردینا اس کے لیے کیوں مشکل ہو جائے گا۔

فَوَرَبِّكَ لَنَحۡشُرَنَّهُمۡ وَالشَّيٰطِيۡنَ ثُمَّ لَنُحۡضِرَنَّهُمۡ حَوۡلَ جَهَنَّمَ جِثِيًّا (۶۸)

'شیاطین' سے شیاطین جن و انس دونوں مراد ہیں

'شیاطین' سے مراد یہاں قرینہ دلیل ہے کہ شیاطین جن بھی ہیں اور شیاطین انس بھی۔ عربوں کے متعلق ہم دوسرے مقام میں ذکر کرچکے ہیں کہ وہ بہت سے جنوں کی بھی پرستش کرتے تھے۔ اسی طرح ان کے گمراہ لیڈروں نے بھی ان کو گمراہ کیا اور انھوں نے آنکھ بند کرکے ان کی پیروی کی اور جب اللہ کے رسول نے ان کو آنکھیں کھولنے کی دعوت دی تو اس کے درپے آزار ہوگئے۔

'جثی' کا مفہوم

'جثی' جاث کی جمع ہے۔ 'جثا جثوا' کے معنی دوزانو اور اکڑوں بیٹھنے کے ہیں۔ یہ نشست مجرموں کی نشست ہے۔ جس طرح مجرم اپنا فیصلہ سننے کے لیے کسی حکمران کے سامنے بیٹھتے ہیں اسی طرح کی غلامانہ اور محکومانہ نشست کے لیے یہ لفظ آتا ہے۔

مجرموں کی نشست جہنم کے اردگرد

اب یہ پوری تاکید کے ساتھ قسم کھا کر فرمایا کہ تیرے رب کی قسم، ہم ان کو اور ان تمام شیاطین کو جن کی انھوں نے عبادت اور اطاعت کی اور ان کے ان تمام گمراہ لیڈروں کو جن کی انھوں نے پیروی کی، سب کو جہنم کے اردگرد اس طرح اکٹھا کریں گے کہ وہ مجرموں کی طرح دوزانو بیٹھے ہوئے اپنے فیصلہ کا انتظار کریں گے کہ کس کے لیے جہنم کے کس وارڈ میں جانے کا حکم ہوتا ہے۔

ثُمَّ لَنَنۡزِعَنَّ مِنۡ كُلِّ شِيۡعَةٍ اَيُّهُمۡ اَشَدُّ عَلَى الرَّحۡمٰنِ عِتِيًّا (۶۹)

دنیا میں ضلالت کے قائد آخرت میں جہنم کے قائد

فرمایا کہ اس کے بعد ہم ہر گروہ اور ہر پارٹی کے ان لیڈروں کو ان کے اندر سے چھانٹ کر الگ کریں گے جو خدا اور اس کے رسول کے سب سے زیادہ مخالف اور اس کے خلاف تحریکیں چلانے والے رہے ہیں۔ ان کو چھانٹ کر اس لیے الگ کیا جائے گا کہ جس طرح انھوں نے دنیا میں لوگوں کو گمراہ کرنے کی مہم میں ان کی قیادت کی اسی طرح اب پیروؤں کو جہنم میں لے جانے کے لیے بھی ان کی پیشوائی کریں۔ وہ آگے آگے ہوں گے اور ان کے پیرو پیچھے پیچھے اور جو جہنم کے جس طبقہ کا سزاوار ہوگا وہ اس میں داخل ہوگا۔

ثُمَّ لَنَحۡنُ اَعۡلَمُ بِالَّذِيۡنَ هُمۡ اَوۡلٰى بِهَا صِلِيًّا (۷۰)

مشرکین کے تصور شفاعت پر تعریض

فرمایا کہ اس وقت اس بات کے جاننے والے کہ کون اس جہنم میں داخل ہونے کا سب سے زیادہ سزاوار ہے، کس کو سب سے پہلے داخل ہونا چاہیے اور کس طبقہ میں داخل ہونا چاہیے، صرف ہم ہوں گے۔ کوئی دوسرا ان باتوں کا ہم سے زیادہ جاننے والا نہیں ہوگا کہ ہمیں کسی کے بارے میں اس سے مشورہ لینے کی ضرورت پیش آئے یا

کوئی کسی کے باب میں یہ کہنے کی پوزیشن میں ہو کہ وہ اس سے زیادہ ہم سے باخبر ہے اس وجہ سے اس کے معاملے میں اس کی سفارش درخور اعتنا ہے ــــ یہ مشرکین کے غلط عقیدۂ شفاعت پر ایک لطیف تعریض ہے کہ خدا کے ہاں کسی کے لیے سفارش تو وہ کر سکے جو کسی کے بارے میں خدا سے زیادہ واقف ہونے کا دعویٰ کر سکے۔ آخر ایسا بر خود غلط کون ہو سکتا ہے جو اللہ تعالیٰ سے یہ کہہ سکے کہ فلاں کو آپ نہیں جانتے، میں جانتا ہوں، وہ بڑا نیک آدمی ہے، اس وجہ سے اس کو کچھ نہ کہیے بلکہ سیدھے جنت میں بھیج دیجیے!

وَاِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا ۚ كَانَ عَلٰى رَبِّكَ حَتْمًا مَّقْضِيًّا (۷۱)

حتمؔ کا مفہوم

’حتم‘ کے معنی واجب اور لازم کے ہیں۔ اور ضمیر خطاب کے مخاطب وہی مجرمین ہیں جن کا ذکر اوپر سے چلا آ رہا ہے۔ اوپر کی بات بصیغۂ غائب کہی گئی ہے اور یہ بات ان کو مخاطب کر کے ارشاد ہوئی۔ ان دونوں اسلوبوں کے الگ الگ فائدے ہیں۔ جس طرح غائب کا اسلوب عدم التفات پر دلیل ہوتا ہے اسی طرح خطاب کا اسلوب شدتِ عتاب پر دلیل ہوتا ہے۔

مجرمین سے خطاب

قرآن مجید اور کلام عرب میں اس کی مثالیں بہت ہیں کہ غائب کا اسلوب کلام دفعتہً خطاب کے اسلوب میں بدل گیا ہے[1]۔ یہاں بھی اسی نوع کی تبدیلی ہوئی ہے۔ چونکہ مقصود شدتِ غضب کا اظہار ہے اس وجہ سے اللہ تعالیٰ ان مجرموں کو خطاب کر کے فرمائے گا کہ اب تمھارے لیے داد فریاد اور عذر و معذرت کا وقت گزر گیا، اب تم میں سے بلا استثناء ہر ایک کو اس جہنم میں اترنا ہے۔ ساتھ ہی پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو اطمینان دلایا کہ یہ امر بالکل قطعی اور فیصل شدہ ہے، اس کو تمھارے رب نے اپنے اوپر لازم ٹھہرا لیا ہے۔ ایک دن تم اپنے دشمنوں کا یہ انجام اپنی آنکھوں سے دیکھ لو گے۔

صرف مجرم جہنم پر وارد ہوں گے

آیت کی یہ تاویل بالکل واضح ہے لیکن ہمارے مفسرین نے اس کا مخاطب تمام بنی نوع انسان کو مان لیا ہے، چنانچہ وہ ہر شخص کے لیے، خواہ نیک ہو یا بد، جہنم سے گزرنا ضروری قرار دیتے ہیں۔ بس اتنی خیریت ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ جہنم پر پل صراط کے نام سے ایک پل ہو گا جس پر سے نیک لوگ تو گزر جائیں گے، البتہ وہ لوگ جہنم میں پڑے چھوڑ دیے جائیں گے جو برے ہوں گے۔ یہ غلط فہمی مفسرین کو صرف اسلوب کلام کے نہ سمجھنے کے سبب سے ہوئی ہے اور ہم نے دیکھا ہے کہ ان کی اکثر لغزشیں اسی چیز کا نتیجہ ہیں۔ تعجب ہے کہ اتنی سخت بات کہتے ہوئے ان حضرات کو قرآن کی وہ آیت یاد نہیں آئی جو سورۂ انبیاء میں نیکوکاروں سے متعلق وارد ہے۔ فرمایا ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ سَبَقَتْ لَهُمْ مِّنَّا الْحُسْنٰٓى ۙ اُولٰٓئِكَ عَنْهَا مُبْعَدُوْنَ ۙ لَا يَسْمَعُوْنَ حَسِيْسَهَا ۚ وَهُمْ فِيْ مَا اشْتَهَتْ اَنْفُسُهُمْ خٰلِدُوْنَ ۚ لَا يَحْزُنُهُمُ الْفَزَعُ الْاَكْبَرُ وَتَتَلَقّٰىهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ۭ هٰذَا يَوْمُكُمُ الَّذِيْ كُنْتُمْ

بے شک جن کے لیے ہمارا اچھا وعدہ ہو چکا ہے وہ اس جہنم سے دور رکھے جائیں گے، وہ اس کا کھٹکا بھی نہیں سنیں گے اور وہ اپنی چاہت کی نعمتوں میں ہمیشہ رہیں گے۔ ان کو سب سے بڑی گھبراہٹ کی ساعت غمگین نہیں کرے گی اور فرشتے اس بشارت کے ساتھ ان کا خیر مقدم کریں گے کہ

---

[1] ملاحظہ ہو اسی سورہ کی آیت ۸۹۔

تُوْعَدُوْنَ ۝ (۱۰۱-۱۰۳ الانبیاء) یہ ہے آپ لوگوں کا وہ دن جس کا وعدہ کیے جا رہے تھے۔

تاویل کی اس قسم کی غلطیوں سے محفوظ رہنے کے لیے قرآن پر تدبر کرنے والوں کو ہمارا مشورہ یہ ہے کہ وہ استاذ امام مولانا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب اسالیب القرآن کا گہری نظر سے مطالعہ کر ڈالیں۔

ثُمَّ نُنَجِّي الَّذِيْنَ اتَّقَوْا وَّنَذَرُ الظّٰلِمِيْنَ فِيْهَا جِثِيًّا (۷۲)

اہل تقویٰ کے ساتھ معاملہ

'ثُمَّ' ترتیب کو ظاہر کرتا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ پہلے ظالموں سے نمٹے گا، ان کو واصل جہنم کرنے کے بعد ان لوگوں کی طرف متوجہ ہوگا جو اس سے ڈرتے رہے ہے۔ فرمایا کہ پھر ہم ان لوگوں کو نجات دیں گے جو ہم سے ڈرتے رہے اور ظالموں کو اسی جہنم میں اکڑوں بیٹھے چھوڑ دیں گے۔ 'نجات دیں گے' سے مراد یہ نہیں ہے کہ جہنم سے نجات دیں گے۔ جہنم کی تو اہل تقویٰ کو، جیسا کہ اوپر گزرا، ہوا بھی نہیں لگنے پائے گی۔ یہاں 'نجات دینے' سے مراد ان تمام ہموم و افکار اور اس تشویش و انتظار سے نجات دینا ہے جن سے بہرحال منزل مقصود پر پہنچنے سے پہلے تک اہل حق کو بھی سابقہ پیش آنا ہے۔

ایک شبہ کا ازالہ

'وَنَذَرُ الظّٰلِمِيْنَ فِيْهَا جِثِيًّا' میں لفظ 'جثی' کی تحقیق اوپر گزر چکی ہے۔ 'جثی' ان کو کہتے ہیں جو مجرموں کی طرح اپنی قسمت کے فیصلے کے انتظار میں دو زانو بیٹھے ہوئے ہوں۔ اوپر والی آیت میں تو اس کا محل استعمال بالکل واضح ہے لیکن یہاں اس کا استعمال کھٹکتا ہے اس لیے کہ 'فیھا' کا قرینہ دلیل ہے کہ یہ ان کی جہنم کے اندر کی حالت بیان ہو رہی ہے لیکن اس کے اندر تو ان کے رونے چلانے کا ذکر ہونا چاہیے، جیسا کہ دوسرے مقامات میں ہے، نہ کہ اکڑوں بیٹھنے کا۔ اس اشکال سے بچنے کے لیے اس کا مفہوم ہمارے مفسرین اور مترجموں نے بدل دیا ہے لیکن یہ تبدیلی لغت سے تجاوز کی نوعیت کی ہے اس وجہ سے ہم کو اس سے اتفاق نہیں ہے۔ ہمارے نزدیک یہ حالت بیان تو ہوئی ہے جہنم کے اندر ہی کی لیکن یہ بالکل ابتدائی مرحلہ کی بات ہے جب کہ وہ فیصلۂ الٰہی کے بعد جہنم کے داروغوں کے حوالہ کیے جائیں گے اور اکڑوں بیٹھے عذاب کے دروازے کے کھلنے کے منتظر ہوں گے اللہ تعالیٰ ان کو دوزخ کے داروغوں کے حوالہ کر کے اسی حالت میں چھوڑ کر ان سے بے التفات ہو جائے گا اور اس کے بعد ان کے لیے عذاب کے دروازے کھول دیے جائیں گے۔

وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا بَيِّنٰتٍ قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا ۙ اَيُّ الْفَرِيْقَيْنِ خَيْرٌ مَّقَامًا وَّاَحْسَنُ نَدِيًّا (۷۳)

مغروروں کی ذہنیت

یہ ان مغروروں کی ذہنیت واضح کی جا رہی ہے کہ جب ان کو جزا و سزا اور عذاب دنیا و آخرت سے آگاہ کرنے والی نہایت واضح، مبنی بر دلائل آیتیں پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو بڑی دیدہ دلیری سے وہ اہل ایمان سے یہ معارضہ کرتے ہیں کہ بتاؤ مرتبہ و مقام، جاہ و منصب، اعوان و انصار، مجلس اور سوسائٹی کے اعتبار سے تمہارا درجہ اونچا ہے یا ہمارا؟ اگر ہمارا درجہ اونچا ہے، اور بالبداہت اونچا ہے، تو ہم کیونکر باور کر لیں کہ ہم خدا کے غضب کے سزاوار ہیں اور ہم پر کوئی عذاب آنے والا ہے! ہم تو دیکھتے ہیں کہ خدا کی نظروں میں ہم تم سے زیادہ عزت

رکھنے والے ہیں کہ اس نے ہم کو یہ کچھ دے رکھا ہے اور تم ان ساری چیزوں سے محروم ہو!

وَكَمْ اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنْ قَرْنٍ هُمْ اَحْسَنُ اَثَاثًا وَّرِءْيًا (۷۴)

'قرون' کے معنی ایک دور کے لوگ، امت اور قوم۔ 'رءی' کے معنی نمود، منظر، شان و شوکت۔

مغروروں کے معارضہ کا جواب

ان معارضہ کرنے والوں کے جواب میں فرمایا کہ اسباب و سامان اور شان و شوکت کی زیادتی نہ تو کسی قوم کے خدا کے چہیتی ہونے کی دلیل ہے اور نہ یہ چیزیں خدا کی پکڑ سے بچانے والی ہیں۔ تاریخ میں کتنی ایسی قوموں کی مثالیں موجود ہیں جو اپنے سرو سامان اور اپنی ظاہری چمک دمک کے اعتبار سے ان سے کہیں بڑھ کر تھیں لیکن جب انھوں نے خدا سے سرکشی کی تو وہ تباہ کر دی گئیں۔ یہاں صرف ان قوموں کی طرف اشارہ ہے۔ دوسری سورتوں میں ان کی تفصیل موجود ہے۔

قُلْ مَنْ كَانَ فِي الضَّلٰلَةِ فَلْيَمْدُدْ لَهُ الرَّحْمٰنُ مَدًّا ۚ حَتّٰىٓ اِذَا رَاَوْا مَا يُوْعَدُوْنَ اِمَّا الْعَذَابَ وَاِمَّا السَّاعَةَ ۭ فَسَيَعْلَمُوْنَ مَنْ هُوَ شَرٌّ مَّكَانًا وَّاَضْعَفُ جُنْدًا (۷۵)

سرکشوں کے معاملہ میں سنتِ الٰہی

یہ اس سنتِ الٰہی کا بیان ہے جو اللہ تعالیٰ اپنے نافرمانوں اور سرکشوں کے معاملہ میں اختیار فرماتا ہے۔ ارشاد ہوا کہ اپنی دنیوی برتری کے زعم میں جو لوگ تمھارے انذار کا مذاق اڑا رہے ہیں ان سے کہہ دو کہ جو لوگ ہدایت کی راہ اختیار کرنے کے بجائے ضلالت ہی میں پڑے رہنا چاہتے ہیں ان کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا معاملہ یہ نہیں ہے کہ ان کے عیش و آرام کو چھین لے یا ان کو فوراً عذاب میں پکڑ لے بلکہ اس کی رحمت کی شان یہ ہے کہ ان کو زیادہ سے زیادہ ڈھیل دے تاکہ وہ اپنا پیمانہ اچھی طرح بھر لیں اور خدا کی حجت ان پر تمام ہو جائے۔ خدا کوئی کمزور ہستی نہیں ہے کہ اس کو اندیشہ ہو کہ فوراً نہ پکڑا تو شکار نکل جائے گا۔ اس کی تدبیر نہایت محکم ہوتی ہے اس وجہ سے وہ برابر رسی دراز کیے جاتا ہے۔ یہاں تک کہ یا تو وہ عذاب ہی ان پر آ دھمکے گا جو رسول کی تکذیب کا لازمی نتیجہ ہے یا وہ قیامت ہی نمودار ہو جائے گی جس سے ان کو آگاہ کیا جا رہا ہے۔ اس وقت انھیں اچھی طرح اندازہ ہو جائے گا کہ کون اپنے موقف و مقام کے لحاظ سے بدتر اور اپنے لاؤ لشکر کے اعتبار سے ضعیف تر ہے۔

اس آیت میں دو تین باتوں پر نگاہ رکھیے۔

چند قابلِ توجہ باتیں

ایک 'فَلْيَمْدُدْ' کے اسلوب پر۔ یہ نہیں فرمایا کہ 'خدا ان کی رسی دراز کرتا ہے'، بلکہ فرمایا کہ خدائے رحمان کے شایانِ شان بات یہی ہے کہ وہ ان کی رسی دراز کرے، یعنی ظالموں کو ڈھیل خدا کی قدرت، حکمت اور اس کی تدبیر کا مقتضیٰ ہے۔ بدقسمت ہیں وہ لوگ جو اس ڈھیل کو اپنی کامیابی سمجھ کر سرکشی میں اور زیادہ دلیر ہو جائیں۔

دوسری چیز یہ نگاہ میں رکھنے کی ہے کہ یہاں 'عذاب' اور 'ساعت' دو چیزوں کا ذکر ہے۔ جب یہ دونوں لفظ ساتھ ساتھ استعمال ہوں تو ایک سے عذابِ دنیا مراد ہوتا ہے اور دوسرے سے عذابِ قیامت۔ اللہ تعالیٰ کے رسولوں نے ان دونوں عذابوں سے اپنی اپنی قوموں کو ڈرایا ہے۔ ہم دوسرے مقام میں ذکر کر چکے ہیں کہ اگر کوئی قوم اپنے رسول کی تکذیب کر دیتی ہے تو اتمامِ حجت کے بعد وہ لازماً تباہ کر دی جاتی ہے۔

تیسری یہ کہ تفضیل کے صیغے بسا اوقات تقابل کے مفہوم سے مجرد ہو کر استعمال ہوتے ہیں۔ یہ بات بھی ہم دوسرے مقام میں واضح کر چکے ہیں۔

یہ بات بھی یہاں یاد رکھنے کی ہے کہ دنیوی کامیابیوں کے نشہ میں جس طرح عرب جاہلیت کے حمقاء خدا اور آخرت کی باتوں کو درخور اعتنا نہیں سمجھتے تھے اسی طرح موجودہ دور میں علم و سائنس کے عقلاء بھی اسی غرّے میں خدا اور آخرت کو ایک واہمہ قرار دیتے ہیں۔ ابھی پچھلے دنوں ایک دوست نے ذکر کیا کہ امریکہ کے لوگوں کے سامنے خدا اور آخرت کا ذکر کیجیے تو وہ جواب دیتے ہیں کہ ہماری عمروں کا اوسط تمھاری عمروں سے زیادہ ہے۔ اگر تمھاری بات صحیح ہے تو چاہیے تھا کہ تمھاری عمروں کا اوسط ہم سے زیادہ ہوتا۔ میں نے کہا ان کے ہاں عمروں کا اوسط بھی سب سے زیادہ ہے اور خودکشی کا اوسط بھی سب سے زیادہ ہے۔ ملک الموت کو اب بھی یہ لوگ اپنے ہاں سے بے دخل نہ کر سکے۔ البتہ یہ ہوا کہ ان کا کام ان لوگوں نے خود سنبھال لیا ہے!!

وَيَزِيدُ اللّٰهُ الَّذِينَ اهْتَدَوْا هُدًى ۗ وَالْبٰقِيٰتُ الصّٰلِحٰتُ خَيْرٌ عِنْدَ رَبِّكَ ثَوَابًا وَّخَيْرٌ مَّرَدًّا (۷۶)

اہل ایمان کو بشارت

یہ آیت اوپر کی آیت ۷۵ کے مقابل میں ہے۔ یعنی جس طرح اللہ تعالیٰ ہدایت پر ضلالت کو ترجیح دینے والوں کی رسی دراز کرتا ہے اسی طرح ہدایت اختیار کرنے والوں کی ہدایت میں بھی، برابر اضافہ پر اضافہ فرماتا ہے۔ اور عاقل کے نزدیک دیکھنے کی چیز یہ نہیں ہوتی کہ کسی کام کا فوری نفع کیا ہے بلکہ وہ یہ دیکھتا ہے کہ اپنے اجر و ثواب اور اپنے انجام و مآل کار کے اعتبار سے کونسا کام بہتر ہے۔ دنیا کے پرستار صرف نفع عاجل کو دیکھتے ہیں انھیں اس سے بحث نہیں کہ مرنے کے بعد کیا ہوگا۔ اس کے برعکس بندۂ مومن کی نگاہ مستقبل یعنی آخرت پر ہوتی ہے اور وہ اپنے ہر کام کا جائزہ مآلِ کار کے پہلو سے لیتا ہے۔ اس آیت میں اہل ایمان کو تسلی دی گئی ہے کہ تم ان اسباب دنیا پر اترانے والوں کے طعنوں کی پروا نہ کرو، تم اگرچہ بے سروسامان ہو، لیکن تمھاری ہدایت میں دم بدم اضافہ ہو رہا ہے اور تمھارا یہ اندوختہ تمھارے لیے ابدی بادشاہی کی ضمانت ہے اور تمھیں طعنہ دینے والوں نے جو سروسامان اکٹھا کر رکھا ہے یا کر رہے ہیں یہ سب ان کے جلانے کے لیے ایندھن کا کام دے گا۔ 'مَرَدّ' کا ترجمہ میں نے مآلِ کار کیا ہے اور یہ ترجمہ میرے نزدیک لفظ کی اصل روح سے قریب تر ہے۔

'باقیات صالحات' کی تعبیر

قرآن میں اعمال صالحہ کو جگہ جگہ 'باقیات الصّٰلِحٰت' سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اس سے یہ اشارہ نکلتا ہے کہ درحقیقت وہی اعمال صالحہ ہیں جو پائیدار اور غیر فانی ہیں۔ جو اعمال چند روزہ اور فانی ہیں وہ غیر صالح ہیں۔ رہا یہ سوال کہ باقی اعمال کون ہیں اور فانی کون ہیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ جو اعمال صرف دنیا کو مطلوب و مقصود بنا کر کیے جاتے ہیں وہ فانی ہیں اس لیے کہ یہ دنیا خود فانی ہے۔ باقی رہنے والے اعمال صرف وہ ہیں جو خدا اور آخرت کو مقصود بنا کر کیے جائیں اس لیے کہ خدا بھی غیر فانی ہے اور آخرت بھی۔

اَفَرَءَيْتَ الَّذِي كَفَرَ بِاٰيٰتِنَا وَقَالَ لَاُوْتَيَنَّ مَالًا وَّوَلَدًا ۝ اَطَّلَعَ الْغَيْبَ اَمِ اتَّخَذَ

عِنۡدَ الرَّحۡمٰنِ عَهۡدًا (۸۰)

برخود غلط لوگوں کے مغالطہ کی تردید

یہ قرآن نے ان جھٹلانے والوں کے ایک اور مغالطہ کا حوالہ دے کر اس کی تردید فرمائی ہے۔ اس مغالطہ کا ذکر 'اَفَرَءَیۡتَ' کے خطاب سے کیا ہے۔ عربی زبان کا ذوق رکھنے والے جانتے ہیں کہ جب اس خطاب سے بات کا آغاز ہو تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس کے بعد کسی بہت ہی برخود غلط شخص یا کسی نہایت بھونڈی بات کا حوالہ آئے گا۔

یہاں عربیت کے اس اسلوب کو بھی یاد رکھیے جس کا ذکر ہم بعض دوسرے مقامات میں بھی کر چکے ہیں کہ 'اَلَّذِیۡ' ضروری نہیں کہ ہر جگہ معرفہ ہی کے لیے آئے۔ بعض اوقات یہ تمثیل کے لیے بھی آتا ہے جس کی نہایت بلیغ مثالیں قرآن مجید میں بھی موجود ہیں[1] اور کلام عرب میں بھی۔ اس صورت میں اس سے کوئی معین شخص مراد نہیں ہوتا بلکہ اس سے مقصود کسی خاص کردار یا کسی خاص ذہنیت کو ممثّل و مصوّر کرنا ہوتا ہے۔ یہاں بھی یہ کسی خاص شخص کے لیے نہیں آیا ہے بلکہ یہ ایک خاص گروہ کی ذہنیت کی تصویر ہے۔

فرمایا کہ ذرا اس برخود غلط کو دیکھو جو اس زعم میں مبتلا ہے کہ اگر قیامت بالفرض ہوئی تو وہ وہاں بھی اسی طرح مال و اولاد کا حق دار ٹھہرے گا جس طرح یہاں ہے۔ اس ذہنیت کے لوگ نعمتوں کو اللہ کا عطیہ نہیں سمجھتے بلکہ اپنے استحقاق ذاتی یا اپنی قابلیت کا کرشمہ سمجھتے ہیں اس وجہ سے اس گھمنڈ میں مبتلا رہتے ہیں کہ ریاست و امارت کے وہ پیدائشی حقدار ہیں اس سے ان کو کون محروم کر سکتا ہے! اگر آخرت نامی کوئی شے ہے تو وہ وہاں بھی کوٹھیوں میں عیش کریں گے اور کاروں میں پھریں گے!

تردید باندازِ تحقیر

'اَطَّلَعَ الۡغَیۡبَ اَمِ اتَّخَذَ عِنۡدَ الرَّحۡمٰنِ عَهۡدًا'۔ چونکہ یہ زعم بالکل احمقانہ اور طفلانہ قسم کا ہے اس وجہ سے اس کا جواب طنز و تحقیر کے انداز میں ہے۔ فرمایا کہ کیا انھوں نے غیب کے پردوں میں جھانک کر ان تمام چیزوں کو دیکھ لیا ہے جو ان کو آخرت میں ملنے والی ہیں یا خدا سے ان کے لیے کوئی گارنٹی لکھوائی ہے! — آخر کس بوتے پر یہ ناز ہے!!

كَلَّا ؕ سَنَكۡتُبُ مَا يَقُوۡلُ وَنَمُدُّ لَهٗ مِنَ الۡعَذَابِ مَدًّا ۙ ﴿۷۹﴾ وَّنَرِثُهٗ مَا يَقُوۡلُ وَيَاۡتِيۡنَا فَرۡدًا ﴿۸۰﴾

تردید غضب کے لہجہ میں

یہ غضب کے لہجے میں اس زعم باطل کی تردید ہے۔ فرمایا کہ ہم اس کی بکواس کو بھی نوٹ کر رکھیں گے اور اس کی پاداش میں بھی اس کے عذاب میں اضافہ کریں گے۔ یعنی کفر و تکذیب کی جو سزا ملنی ہے وہ تو ملے ہی گی اس میں مزید اضافہ اس مغرورانہ ادعا کے سبب سے بھی ہو جائے گا۔

'وَنَرِثُهٗ مَا يَقُوۡلُ وَيَاۡتِيۡنَا فَرۡدًا'۔ یعنی ان تمام چیزوں کے، جن کا یہ مدعی ہے اور جن پر اس کو فخر و ناز ہے، مالک و وارث ہم ہوں گے اور یہ قیامت کے دن ہمارے حضور میں تنہا حاضر ہوگا، نہ اس کے ساتھ اس کا سر و سامان ہوگا، نہ اس کے اعوان و انصار ہوں گے اور نہ اس کے مزعومہ شرکاء و شفعاء ہوں گے۔ اس کو جو

---

[1] ملاحظہ ہو سورۂ نحل کی آیت ۹۲۔

چیزیں بھی ملی تھیں ہماری بخشی ہوئی ملی تھیں وہ سب ہم واپس لے لیں گے اور یہ جس طرح دنیا میں خالی ہاتھ گیا تھا اسی طرح خالی ہاتھ ہمارے پاس واپس آئے گا۔

وَاتَّخَذُوا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اٰلِهَةً لِّيَكُوْنُوْا لَهُمْ عِزًّا ۝ كَلَّا ؕ سَيَكْفُرُوْنَ بِعِبَادَتِهِمْ وَيَكُوْنُوْنَ عَلَيْهِمْ ضِدًّا (۸۱-۸۲)

معبودانِ باطل پر اعتماد

ان مشرکین کا سب سے بڑا سہارا ان کے معبودانِ باطل تھے۔ ان کا گمان یہ تھا کہ اگر خدا کے ہاں حاضری اور حساب کتاب کا کوئی مرحلہ آیا تو ان کے یہ معبود اپنے زور و اثر سے، ان کو بچا ہی لیں گے۔ خصوصاً فرشتوں کی سفارش پر ان کو بڑا اعتماد تھا۔ ان کو وہ خدا کی چہیتی بیٹیاں گمان کرتے تھے اور اس خیال سے ان کی پوجا کرتے تھے کہ خدا ان کی بات نہیں ٹال سکتا۔ یہ دنیا میں بھی ان کو اپنے باپ سے سفارش کر کے ان کو رزق اور اولاد دلواتی ہیں اور اگر مرنے کے بعد بھی کسی مدد کی احتیاج پیش آئی تو یہ وہاں بھی قوت اور سہارا بنیں گی۔ اسی قوت اور سہارے کو یہاں 'عِزّ' سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اس کے اصل معنی قوت کے ہیں۔

مشرکین کے زعم باطل کی تردید

'كَلَّا ؕ سَيَكْفُرُوْنَ بِعِبَادَتِهِمْ وَيَكُوْنُوْنَ عَلَيْهِمْ ضِدًّا' یہ ان کے اس زعم باطل کی تردید ہے۔ فرمایا کہ ان احمقوں کی یہ آرزو ہرگز پوری نہیں ہوگی بلکہ ان کے یہ معبود قیامت کے دن ان کی اس عبادت کا ان کے منہ پر انکار کریں گے۔ قرآن میں اس بات کی تصریح ہے کہ جب یہ مشرکین قیامت کے دن اپنے معبودوں کی دہائی دیں گے کہ ہم دنیا میں آپ کی پرستش کرتے رہے ہیں تو یہاں ہماری کچھ مدد کیجیے تو وہ جھٹ جواب دیں گے کہ ہمیں کیا خبر کہ کچھ احمق لوگ ہماری پرستش کرتے رہے ہیں۔ ہم نے کب کہا تھا کہ ہماری پرستش کرو، اگر تم نے یہ حماقت کی تو اس کا انجام بھگتو!

'وَيَكُوْنُوْنَ عَلَيْهِمْ ضِدًّا' یعنی یہ تو یہ آرزو میں لیے بیٹھے ہیں کہ ان کے یہ معبود ان کے لیے قوت اور سہارا بنیں گے لیکن معاملہ ہوگا اس کے بالکل برعکس، وہ الٹے ان پر لعنت بھیجیں گے اور ان کے دشمن بنیں گے۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّاۤ اَرْسَلْنَا الشَّيٰطِيْنَ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ تَؤُزُّهُمْ اَزًّا ۝ فَلَا تَعْجَلْ عَلَيْهِمْ ؕ اِنَّمَا نَعُدُّ لَهُمْ عَدًّا (۸۳-۸۴)

عربی میں جب کہیں گے 'اَرْسَلَ الْكَلْبَ عَلَى الصَّيْدِ' تو اس کے معنی ہوں گے کتے کو شکار پر چھوڑ دیا۔ اسی اسلوب پر یہاں فرمایا ہے کہ ہم نے ان کافروں پر شیاطین کو چھوڑ دیا ہے کہ وہ ان کو دعوتِ حق کے خلاف جتنا اکسا سکتے ہیں اکسا لیں۔ 'اَزٌّ یَؤُزُّ' کے معنی برانگیختہ کرنے، بھڑکانے اور اکسانے کے ہیں۔

ایک سنتِ الٰہی

ان کافروں کے ساتھ یہ معاملہ اس سنتِ الٰہی کے مطابق ہوا جس کا ذکر سورۂ زخرف میں ہے کہ وَمَنْ يَّعْشُ عَنْ ذِكْرِ الرَّحْمٰنِ نُقَيِّضْ لَهٗ شَيْطٰنًا فَهُوَ لَهٗ قَرِيْنٌ-۳۶ (جو خدائے رحمان کی یاد دہانی سے آنکھیں بند کر لیتے ہیں ہم ان پر کوئی شیطان مسلط کر دیتے ہیں، پس وہ ان کا ساتھی بن جاتا ہے)

پیغمبر کو تسکین و تسلی

یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تسکین و تسلی ہے کہ ان مخالفین کی مخالفت سے

ہراساں اور پریشان نہ ہو اور ان کے بارے میں فیصلۂ الٰہی کے ظہور کے لیے جلدی نہ کرو۔ ان کی مخالفت جتنی ہی شدت اختیار کرتی جا رہی ہے یہ اتنے ہی اپنی تباہی سے قریب ہوتے جا رہے ہیں۔ ان کی حق دشمنی کے سبب سے اب ہم نے ان کے اوپر شیاطین کو چھوڑ دیا ہے کہ وہ ان کو جتنا اکسا سکتے ہیں اکسا لیں تاکہ ان پر ہماری حجت تمام ہو جائے۔ 'اِنَّمَا نَعُدُّ لَهُمْ عَدًّا' یعنی اب ان کے فیصلہ کے ظہور میں دیر نہیں ہے۔ ان کا پیمانہ لبریز ہوا چاہتا ہے اور گھڑی کی سوئی اپنے آخری نقطہ پر پہنچ رہی ہے۔ ہم ایک ایک منٹ کو پورے اہتمام کے ساتھ گن رہے ہیں اور وقت پورا ہو جانے کے بعد ایک پل کے لیے بھی ان کو مہلت دینے والے نہیں ہیں۔

یاد ہوگا، اس مجموعۂ آیات کا آغاز حضرت جبریل امین کی طرف سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تلقین صبر و انتظار سے ہوا تھا۔ وہی مضمون یہ دوسرے انداز سے براہ راست اللہ تعالیٰ کی طرف سے ادا ہوا ہے جس میں مخالفین کے لیے آخری تنبیہ بھی ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے معاملہ کا جلد فیصلہ ہو جانے کی بشارت بھی۔ 'تَؤُزُّهُمْ اَزًّا' اور 'فَلَا تَعْجَلْ عَلَيْهِمْ' کے الفاظ سے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ یہ آیات اس زمانہ میں نازل ہوئی ہیں جب مخالفین کی مخالفت اپنی آخری حد کو پہنچ چکی تھی۔ یہاں تک کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی ہر وقت اس کشمکش کے فیصلہ کے لیے انتظار رہنے لگا تھا۔

يَوْمَ نَحْشُرُ الْمُتَّقِيْنَ اِلَى الرَّحْمٰنِ وَفْدًا ۝ وَّنَسُوْقُ الْمُجْرِمِيْنَ اِلٰى جَهَنَّمَ وِرْدًا ۝ لَا يَمْلِكُوْنَ الشَّفَاعَةَ اِلَّا مَنِ اتَّخَذَ عِنْدَ الرَّحْمٰنِ عَهْدًا ۝ (۸۵-۸۷)

'وفد' کا مفہوم

'وَفَدَ وَفْدًا' کے معنی کہیں عزت و اکرام کے ساتھ جانے کے ہیں جس طرح سفیر اور قاصد بادشاہ اور امیر کے پاس جاتے ہیں۔

'ورد' کا مفہوم

'وِرْد'، 'وَرَدَ يَرِدُ' سے اسم ہے۔ اس کے معنی گھاٹ پر اترنے کے ہیں جس طرح پیاسے اونٹ گھاٹ پر جاتے ہیں۔

مزعومہ شفاعت کی تردید

'اِلَّا مَنِ اتَّخَذَ عِنْدَ الرَّحْمٰنِ عَهْدًا' میں میرے نزدیک استثناء منقطع ہے۔ یہ ان مجرموں کی مزعومہ شفاعت کی نفی ہے۔ فرمایا کہ جس دن ہم متقیوں کو اعزاز کے ساتھ خدائے رحمان کے پاس لے جائیں گے اور ان مجرموں کو پیاسے اونٹوں کی طرح جہنم کے گھاٹ کی طرف ہانکیں گے۔ اس دن ان کے مزعومہ شفعاء کو شفاعت کا کوئی اختیار حاصل نہیں ہوگا۔ یہ حق صرف ان لوگوں کو حاصل ہوگا جنھوں نے اللہ تعالیٰ کے ہاں اس کا حق حاصل کر رکھا ہے۔

شفاعت سے متعلق چند اصولی باتیں

یہ حق کن لوگوں کو حاصل ہوگا؟ اس سوال پر ہم اس کتاب میں مناسب مواقع پر بحث کرتے آئے ہیں۔ چند اصولی باتوں کی یاددہانی یہاں بھی کیے دیتے ہیں۔

شفاعت کا مقام صرف انبیائے کرام اور شہدائے امت کو حاصل ہوگا۔ یہ ایک منصب تکریم و تشریف ہے جس پر اللہ تعالیٰ صرف ان لوگوں کو سرفراز فرمائے گا جو اس اکرام و اعزاز کے سزاوار ہوں گے۔

یہ لوگ بھی خدا کی اجازت سے شفاعت کریں گے اور صرف ان لوگوں کے لیے کریں گے جن کے لیے اللہ تعالیٰ اجازت مرحمت فرمائے۔ یہ نہیں ہوگا کہ یہ کسی کی شفاعت کے لیے خود پیش قدمی کریں یا ان لوگوں کے لیے شفاعت کریں جن کے لیے خدا سے ان کو اجازت حاصل نہ ہو۔

یہ اپنی شفاعت میں وہی بات کہیں گے جو بالکل حق ہوگی۔ باطل کو حق یا بدی کو نیکی بنانا نہ ان کے شایان شان ہے نہ خدائے علام الغیوب کے آگے کوئی اس کی جسارت کر سکتا ہے۔

جن لوگوں نے شرک والحاد کی زندگی گزاری یا ایمان کے تو مدعی رہے لیکن ساری زندگی بطالت اور خدا و رسول کی نافرمانی میں گزاری ان کے لیے کوئی شفاعت نہیں۔

یہ ساری باتیں خود قرآن کے نصوص سے ثابت ہیں۔ ہم نے ان پر جگہ جگہ بحث کی ہے اور آگے بھی انشاء اللہ تفصیل سے ان پر بحث کریں گے۔ ظاہر ہے کہ جب یہ ساری شرطیں شفاعت پر عاید ہیں اور ان سے انکار نہیں کیا جا سکتا تو شفاعت کے بل پر گناہوں کے لیے لیسنس دینے یا حاصل کرنے کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی۔ پھر تو شفاعت کی امید اگر کر سکتے ہیں تو وہ لوگ کر سکتے ہیں جنھوں نے زندگی تو ایمان و عمل صالح اور توبہ و اصلاح کی گزاری لیکن کوتاہی، غفلت یا جذبات سے مغلوب ہو کر نیکیوں کے ساتھ غلطیاں بھی کرتے رہے۔ اس طرح کے لوگ امید ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت کے سزاوار ٹھہریں اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت پر بخش دیے جائیں۔ رہے وہ لوگ جنھوں نے شفاعت کے بل پر گناہوں ہی کو اوڑھنا بچھونا بنا رکھا ہے اور یہود کی طرح امیدوار ہیں کہ 'سَیُغْفَرُ لَنَا'، ہم امت مرحومہ ہیں، ہمارے سارے گناہ بخش دیے جائیں گے تو قرآن کی روشنی میں اس خوش فہمی کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہے۔

وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا (۸۸)

'ولد' کا مفہوم

'وَلَد'، کے معنی اولاد کے ہیں۔ یہ واحد، جمع، مذکر، مؤنث سب کے لیے آتا ہے۔ خدا کے لیے اولاد ماننے کے معاملے میں مشرکین عرب اور یہود و نصاریٰ سب یکساں ہیں۔ مشرکین عرب فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں کہتے تھے۔ یہود حضرت عزیرؑ کو خدا کا بیٹا مانتے ہیں اور نصاریٰ نے حضرت مسیحؑ کو جو کچھ بنایا ہے اس کی تفصیل اسی سورہ میں پیچھے گزر چکی ہے۔ اوپر کی آیت میں شفاعت باطل کی تردید فرمائی ہے۔ اب آگے کی چند آیات میں شرک کی اس گھناؤنی قسم کی تردید فرمائی ہے جو درحقیقت شفاعت باطل کے اسی تصور کے تحت وجود پذیر ہوئی جس کی طرف ہم نے اشارہ کیا۔ ظاہر ہے کہ اگر خدا سے اپنے جرائم کے لیے مفت لیسنس حاصل کرنا ہے تو یہ کام بغیر اس کے نہیں ہو سکتا کہ خدا کے لیے کچھ بیٹے بیٹیاں فرض کیے جائیں اور ان کی پوجا کر کے یہ امید رکھی جائے کہ خواہ ہم کچھ کرتے رہیں خدا کے یہ چہیتے اور لاڈلے ہم پر خدا کو ہاتھ نہیں ڈالنے دیں گے۔ چنانچہ

خدا کی اولاد ٹھہرانے کا جرم

اہل عرب نے اسی خواہش کے تحت فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں بنایا اور نصاریٰ نے یہ عقیدہ ایجاد کیا کہ خدا نے اپنے محبوب بیٹے کو ہماری خاطر قربان کر کے ہمارے سارے گناہوں کا کفارہ بنا دیا۔

لَقَدۡ جِئۡتُمۡ شَیۡـًٔا اِدًّا (۸۹)

'اِدّ' کے معنی ہیں سخت، دہشت اور سنگین بات۔ یہاں اس اسلوبِ کلام پر بھی نظر رہے کہ بات غائب کے صیغہ سے ہو رہی تھی لیکن جب شدتِ عتاب و غضب کا موقع آیا تو دفعۃً صیغہ خطاب کا آ گیا۔ یہ وہی اسلوبِ کلام ہے جس کا ذکر ہم 'وَاِنۡ مِّنۡكُمۡ اِلَّا وَارِدُهَا' کے تحت کر آئے ہیں۔

فرمایا کہ یہ تم بڑی ہی سنگین بات کے مرتکب ہوئے ہو۔ سنگین اس وجہ سے کہ یہ خدا کی خدائی اور اس کی یکتائی میں دوسرے کو شریک و سہیم بنانا ہے اور خدا غیور ہے اس وجہ سے اس بات کو وہ کبھی گوارا نہیں کر سکتا کہ کسی کو اس کا کفو اور ہمسر قرار دے کر اس کی یکتائی کو بٹہ لگایا جائے۔ جب بندے، بندے ہو کر، کسی ایسی بات کو گوارا نہیں کرتے جو ان کی غیرت کو چیلنج کرے تو وہ خدائے غیور جو تمام ارض و سما کا تنہا مالک ہے اس بات کو کس طرح گوارا کر سکتا ہے کہ اس کے بندے اس کے سوا کسی اور کی بندگی کریں۔ خدا کی غیرت کی تعبیر کے لیے قدیم صحیفوں میں یہ تمثیل بھی استعمال ہوئی ہے کہ جب تم یہ گوارا نہیں کر سکتے کہ تمھاری بیوی کسی غیر کی بغل میں سوئے تو خدائے غیور کس طرح گوارا کر سکتا ہے کہ اس کا بندہ کسی اور کو سجدہ کرے۔

تَكَادُ السَّمٰوٰتُ يَتَفَطَّرۡنَ مِنۡهُ وَتَنۡشَقُّ الۡاَرۡضُ وَتَخِرُّ الۡجِبَالُ هَدًّا (۹۰)

'هَدّ' کے معنی کسی دیوار وغیرہ کے دھماکے کے ساتھ گرنے کے ہیں۔

شرک کی سنگینی کی تعبیر

یہ اسی بات کی سنگینی واضح فرمائی ہے کہ قریب ہے کہ اس کے سبب سے آسمان پھٹ پڑیں، زمین شق ہو جائے اور پہاڑ دھماکے کے ساتھ گر پڑیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ اس تہمت سے آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں کو بھی ایسی غیرت و حمیت لاحق ہوتی ہے کہ وہ ایک منٹ کے لیے بھی ان نابکاروں کو برداشت کرنا نہیں چاہتے جو خدا کا شریک بناتے ہیں لیکن وہ خدائے رحمان کے حکم کے تابع ہیں اس وجہ سے جب تک وہ کسی گروہ کو مہلت دیتا ہے اس وقت تک وہ بھی اپنے غضب کو ضبط کرتے ہیں۔

ایک بیانِ حقیقت

یہ امر واضح رہے کہ یہ کوئی مبالغہ کا اسلوبِ بیان نہیں ہے بلکہ ایک حقیقت کا بیان ہے۔ جب ایک غیور بیٹا اس بات کو گوارا نہیں کر سکتا کہ کوئی اس کو اس کے باپ کے سوا کسی اور باپ کی طرف منسوب کر دے یا اس کے باپ کے ساتھ دوسروں کو بھی اس کا باپ بنا دے تو آسمان و زمین اور دریا اور پہاڑ اس بے ناموسی کو کس طرح برداشت کر سکتے ہیں کہ کوئی ان کو خدائے وحدہ لاشریک لہ کے سوا کسی اور کی طرف منسوب کرے یا ان کی خلقت میں خدا کے سوا دوسروں کو بھی ساجھی مان لے۔ ہم دوسرے مقام میں اس حقیقت کی وضاحت کر چکے ہیں کہ آسمان و زمین، سورج اور چاند سب کی فطرت ابراہیمی ہے۔ وہ اپنے مظاہر سے اس فطرتِ تکوینی کا اظہار کرتے ہیں اور ان کی یہ فطرت اس بات سے ابا کرتی ہے کہ وہ ان لوگوں کو برداشت کریں جو خدا کے لیے اولاد ٹھہرائیں لیکن ان کی باگیں خدا کے ہاتھ میں ہیں اس وجہ سے وہ اپنی مرضی سے کوئی اقدام نہیں کر سکتے۔

اَنۡ دَعَوۡا لِلرَّحۡمٰنِ وَلَدًا (۹۱)

یہ آسمان و زمین اور پہاڑوں کے غصہ اور غضب کا سبب بیان ہوا ہے کہ ان کی یہ غضبناکی اس سبب سے ہے کہ لوگوں نے خدائے رحمان پر آل و اولاد کی تہمت لگائی۔

وَمَا يَنۢبَغِي لِلرَّحۡمٰنِ اَنۡ يَّتَّخِذَ وَلَدًا (٩٢)

خدا کے لیے اولاد ماننا اس کی صفاتِ الوہیت کے منافی ہے

یہ خدا کے لیے اولاد ماننے کی ضلالت کی تردید خدا کی صفاتِ الوہیت کے منافی ہونے کے پہلو سے فرمائی کہ آخر اس کو ضرورت کیا پڑی ہے کہ وہ اپنے لیے اولاد بنائے! نہ اس کو اپنے کاموں میں کسی شریک و معاون کی ضرورت ہے نہ اپنی املاک و جائداد کے لیے کسی وارث و والی کی، نہ اپنا نام زندہ رکھنے کے لیے وہ کسی کا محتاج ہے، نہ اسے بڑھاپے کا کوئی سہارا مطلوب ہے۔ وہ اپنی ذات میں غنی اور بے نیاز ہے تو آخر وہ 'ولد' کس مقصد کے لیے بنائے گا۔

اِنۡ كُلُّ مَنۡ فِي السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ اِلَّاۤ اٰتِي الرَّحۡمٰنِ عَبۡدًا (٩٣)

خدا کے حضور مخلوقات کی حیثیت

اب یہ اپنی تمام مخلوقات کی اصل حیثیت واضح فرمادی کہ آسمانوں اور زمین میں جو بھی ہیں۔ خواہ فرشتے ہوں یا جن و انس، اور ان کا جو درجہ و مرتبہ بھی ہو، خواہ وہ چھوٹے ہوں یا بڑے، سب بلا استثنا ایک دن خدائے رحمان کے حضور میں اس کے ایک بندے کی حیثیت سے حاضر ہوں گے۔ جہاں تک بندے ہونے کا تعلق ہے اس اعتبار سے سب برابر ہوں گے۔ وہاں نہ کوئی خدا کا بیٹا ہوگا نہ بیٹی۔

لَقَدۡ اَحۡصٰىهُمۡ وَعَدَّهُمۡ عَدًّا ۝ وَكُلُّهُمۡ اٰتِيۡهِ يَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ فَرۡدًا (٩٤-٩٥)

'احصاء' کا اصل مفہوم ضبط اور کنٹرول میں رکھنا ہے۔

قیامت کی حاضری کی نوعیت

اب یہ قیامت کے دن ہر ایک کی حاضری کی نوعیت واضح فرمادی کہ سب خدا کے کامل کنٹرول میں ہیں اور ہر ایک کو خدا نے اچھی طرح گن رکھا ہے اس وجہ سے اس بات کا کوئی امکان نہیں ہے کہ کوئی اس کے قابو سے باہر ہو جائے یا گنتی میں کوئی سہو ہو جائے۔ پھر ہر ایک یکہ و تنہا حاضر ہوگا، نہ اس کے ساتھ اس کے اولاد و احفاد ہوں گے، نہ اعوان و انصار، نہ شرکاء و شفعاء۔ نفسی نفسی کا عالم ہوگا اور سب کو خدا کے آگے اپنے باب میں خود جواب دہی کرنی ہوگی۔

اِنَّ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَيَجۡعَلُ لَهُمُ الرَّحۡمٰنُ وُدًّا ۝ (٩٦)

فتحمند ٹیم کا حال

اب یہ ان لوگوں کا ذکر فرمایا جو اس کس مپرسی اور نفسی نفسی کی حالت سے محفوظ ہوں گے۔ فرمایا کہ البتہ وہ لوگ جنھوں نے ایمان و عمل صالح کی زندگی گزاری ہوگی ان کے لیے خدائے رحمان ہر طرف مہر و محبت کی فضا پیدا کر دے گا۔ یہاں بات اجمال کے ساتھ ارشاد ہوئی ہے لیکن دوسرے مقامات میں تصریح ہے کہ اس دن اہل ایمان کا خیر مقدم فرشتے بھی سلام و تحیت کے ساتھ کریں گے، رب العزت کی طرف سے بھی ان کو سلام کہلایا جائے گا اور خود اہلِ ایمان بھی ایک فتحمند ٹیم کی طرح ایک دوسرے کو مبارک باد دیں گے۔ غرض ہر طرف فضا احسنت و مرحبا کے کلمات سے گونج رہی ہوگی!

صفتِ رحمان کی تکرار کی حکمت

اس مجموعۂ آیات بلکہ اس پوری سورہ میں آپ نے محسوس کیا ہوگا کہ اسمائے حسنیٰ میں سے اسم (رحمٰن) بار بار آیا ہے۔ قرآن کی کسی سورہ میں بھی یہ نام اتنی بار نہیں آیا ہے جتنی بار اس سورہ میں آیا ہے۔ میرے استاذ مولانا فراہی رحمۃ اللہ علیہ تو اس سورہ کو رحمانی سورہ کہتے بھی تھے۔ ظاہر ہے کہ یہ بات بلا کسی حکمت کے نہیں ہے۔ میرے نزدیک اس کی حکمت یہ ہے کہ خدا کی صفات اور بندوں کے ساتھ اس کے معاملات کے باب میں ملتوں کو بیشتر گمراہی خدا کی صفت رحمانیت کے غلط تصور ہی سے پیش آئی ہے۔ اس سورہ میں دوسرے مطالب کے ساتھ رحمانیت کے غلط تصور کی اصلاح کرکے اس کا صحیح تصور بھی دیا گیا ہے اس وجہ سے اسم رحمان کا حوالہ اس میں بار بار آیا ہے۔

رحمانیت کے غلط تصور سے پیدا شدہ گمراہیاں

رحمانیت کے غلط تصور نے جو گمراہیاں پیدا کی ہیں ان میں سے بعض کی طرف اشارہ کرنا چاہتا ہوں۔

سورہ میں سب سے پہلے نصاریٰ کا ذکر ہے اس وجہ سے پہلے انہی کی گمراہی کو لیجیے۔ ان کی گمراہی میں بڑا دخل ان کے اس واہمہ کو تھا کہ انسان چونکہ ازلی وابدی گنہگار ہے، اس کی نجات کی کوئی شکل ہی نہیں ہے۔ اس وجہ سے خدائے رحمان نے اپنی رحمت سے اپنے بیٹے کو بھیجا جو قربان ہو کر اپنے تمام ماننے والوں کے گناہوں کا کفارہ بن گیا۔

یہود کی گمراہی اس سورہ میں اگرچہ براہ راست زیر بحث نہیں آئی ہے لیکن قرآن سے یہ بات واضح ہے کہ انھوں نے بھی اپنے جرائم کی پردہ پوشی کے لیے خدا کی رحمانیت ہی کی آڑ لی تھی۔ ان کا تصور یہ تھا کہ ہم نبیوں اور ولیوں کی اولاد ہیں اس وجہ سے اول تو ہم دوزخ میں ڈالے ہی نہیں جائیں گے اور اگر ڈالے بھی گئے تو بس چند دن کے بعد کچھ تنبیہ کرکے خدائے رحمان ہم کو بخش دے گا۔

مشرکین عرب فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں بنا کر ان کی پوجا کرتے تھے۔ ان کا تصور یہ تھا کہ اول تو حشر نشر کی باتیں محض خیالی ہیں لیکن اگر ان کے اندر کچھ حقیقت ہے تو خدائے رحمان کی یہ بیٹیاں سفارش کرکے ان کو اپنے باپ سے بخشوا ہی لیں گی۔

رحمانیت کا صحیح تصور

یہ تمام غلط فہمیاں اور گمراہیاں پس منظر میں موجود تھیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی اصلاح کے لیے اپنی رحمانیت کا صحیح تصور واضح فرمایا کہ اس کی رحمت اس کے عدل کو باطل نہیں کرتی بلکہ اس کا عدل بھی اس کی رحمت ہی کا مقتضیٰ ہے۔ وہ متقیوں کو جو بشارت دیتا ہے یہ بھی رحمت ہے اور سرکشوں کو جو انذار کرتا ہے یہ بھی اسی کی رحمت ہے۔ وہ اگر ظالموں اور سرکشوں کو اس لیے معاف کر دے کہ وہ بزرگوں اور نبیوں کی اولاد ہیں یا کسی نے ان کی سفارش کی ہے یا وہ اس کے مزعومہ بیٹے سے محبت کرنے والے ہیں تو یہ رحمت نہیں ہوگی بلکہ صریح ظلم ہوگا۔ اور اگر خدا ایسا کرے تو وہ خدائے رحمان نہیں ہوگا بلکہ نعوذ باللہ نہایت ظالم خدا ہوگا۔ وہ رحمان ہے تو اس کی اس رحمت کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ وہ حق پرستوں کی داد رسی کرے اور ان کی حق پرستی کا بھرپور صلہ دے اور ظالموں نابکاروں کو جہنم میں جھونک دے۔ یہ ظالموں کو جہنم میں جھونک دینا اس کی رحمت و رحمانیت کے منافی نہیں بلکہ یہ عین اس کی رحمت ہی کا ظہور ہے۔ یہ بات بھی یہاں یاد رکھیے کہ جو لوگ خدا کی نافرمانی کرتے ہیں وہ خدا کا کچھ نہیں

بگاڑنے بلکہ اپنا اور خدا کے بندوں کا بگاڑتے ہیں۔ خدا کے حدود و قیود اس کے اپنے تحفظ کے لیے نہیں ہیں، وہ ہر تحفظ سے بالاتر ہے، بلکہ یہ خلق کے تحفظ اور اس کی ترقی کے لیے ہیں اس وجہ سے مجرموں کا معاملہ خدا کا کوئی ذاتی معاملہ نہیں ہے بلکہ یہ اس کی ساری مخلوق کا معاملہ ہے۔ اپنی مخلوق کے ساتھ اس کی رحمت کا تقاضا یہ ہے کہ وہ کسی مجرم کو سزا دیے بغیر نہ چھوڑے گا ـــــــ صفت رحمان کے ان تقاضوں کو سامنے رکھ کر اس سورہ کو غور سے پڑھیے تب یہ حقیقت واضح ہوگی کہ اس میں جو تنبیہات یا بشارتیں وارد ہوئی ہیں سب خدا کی صفت رحمانیت پر مبنی ہیں۔

فَإِنَّمَا يَسَّرْنٰهُ بِلِسَانِكَ لِتُبَشِّرَ بِهِ الْمُتَّقِيْنَ وَتُنْذِرَ بِهٖ قَوْمًا لُّدًّا (۹۷)

ضمیر بلا مرجع

'یَسَّرْنٰہُ' میں ضمیر کا مرجع قرآن ہے۔ اگرچہ مرجع لفظوں میں مذکور نہیں ہے لیکن سورہ میں چونکہ شروع سے یہ بحث چلی آرہی ہے کہ تمام انبیا کی اصل دعوت یہی رہی ہے جو قرآن دے رہا ہے تو گویا زیر بحث یہاں قرآن ہی ہے۔ اس قسم کے سیاق میں ضمیر بلا مرجع لانا نہ صرف یہ کہ کوئی عیب نہیں ہے بلکہ یہی تقاضائے بلاغت ہے یہ اسلوب مرجع کی شان پر دلیل ہوتا ہے کہ ہر چند وہ مذکور نہیں لیکن بغیر ذکر کے بھی ہر شخص اس کو جانتا ہے۔ قرآن میں اس کی مثالیں عام ہیں۔

'تیسیر قرآن' کا مفہوم

'تیسیر' کے معنی عام طور پر لوگوں نے آسان بنانا سمجھا ہے اور آیت کے معنی یہ لیے ہیں کہ قرآن نہایت آسان ہے۔ اگرچہ یہ بات بجائے خود صحیح ہے کہ قرآن کو خدا نے آسان بنایا ہے لیکن یہ بات بالکل غلط ہے کہ قرآن کوئی سپاٹ چیز ہے جس کے لیے کسی فکر و کاوش اور تدبر و تفکر کی ضرورت نہیں ہے۔ جن لوگوں کو یہ غلط فہمی ہوئی ہے انھوں نے لفظ 'تیسیر' کا صحیح مفہوم نہیں سمجھا۔ عربی میں اس کا اصلی مفہوم آسان بنانا نہیں بلکہ کسی شے کو اس کے پیش نظر مقصد کے لیے تمام لوازم سے آراستہ کر کے نہایت موزوں اور سازگار بنانا ہے۔ اگر کہیں کہ 'یَسَّرَ الْفَرَسَ لِلرُّکُوْبِ' تو اس کے معنی ہوں گے کہ گھوڑے کو زین، رکاب، لگام سے آراستہ کر کے سواری کے لیے تیار کر دیا۔ اس طرح 'وَلَقَدْ یَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّکْرِ' کے معنی ہوں گے کہ ہم نے قرآن کو تعلیم و تذکیر کے لیے نہایت موزوں، تمام لوازم سے آراستہ اور نہایت سازگار بنایا ہے۔ قرآن کی تیسیر کے مختلف پہلوؤں پر ادب اور قرآن دونوں کی روشنی میں ہم نے اپنی کتاب 'مبادی تدبر قرآن' میں وضاحت سے بحث کی ہے۔ تفصیل کے طالب اس کی مراجعت کریں۔

'قَوْمًا لُّدًّا' سے مراد

'قَوْمًا لُّدًّا' سے مراد قریش ہیں۔ 'لُدّ' 'اَلَدّ' کی جمع ہے۔ 'اَلَدّ' کے معنی جھگڑالو، ضدی اور ہٹ دھرم کے ہیں۔ اہل عرب اپنی بدویت کے سبب سے اکھڑ بھی تھے اور اپنی امیت کے باعث معاملات دین میں بہت جاہل اور متعصب بھی اسی وجہ سے بات بات پر آنحضرتؐ کے خلاف مورچہ جماتے اور آپ کو زچ کرنے کے لیے نت نئے مطالبات پیش کرتے۔

آنحضرت صلعم کو تسلی اور مخالفین کو انذار

اب یہ آخر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی اور مخالفین کو انذار ہے۔ فرمایا کہ اس قرآن کو ہم نے تعلیم و تذکیر اور اتمام حجت کے لیے ہر پہلو سے نہایت موزوں، مدلل اور قائل کرنے والا بنایا ہے۔ پھر یہ تمہاری اور تمہاری قوم کی زبان میں ہے جس کو تم اچھی طرح سمجھ بھی سکتے ہو اور اپنی قوم کو، اگر وہ سمجھنا چاہیں تو، سمجھا بھی سکتے ہو۔ اس کے

ہوتے ہوئے کسی اور چیز کی ضرورت نہیں ہے۔ اس نسبت سے تمھاری ذمہ داری یہ نہیں ہے کہ تم لوگوں کو اس کا قائل کر دو۔ تمھارا فرض صرف یہ ہے کہ جن کے اندر خوفِ خدا ہے ان کو فوز و فلاح کی خوشخبری سنا دو۔ رہے وہ لوگ جو جھگڑنے کے لیے آستینیں چڑھائے ہوئے ہیں تو ان کو دنیا اور آخرت دونوں کے عذاب سے خبردار کر دو۔ یہی مضمون سورۂ طٰہٰ میں یوں وارد ہوا ہے۔

وَكَذٰلِكَ اَنْزَلْنٰهُ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا وَّصَرَّفْنَا فِيْهِ مِنَ الْوَعِيْدِ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ اَوْ يُحْدِثُ لَهُمْ ذِكْرًا۔ (طٰہٰ - ۱۱۳)

چنانچہ ہم نے اس کو اتارا عربی قرآن کی صورت میں اور اس میں اپنی وعید گوناگوں پہلوؤں سے بیان کر دی تاکہ وہ خدا کے غضب سے بچیں یا یہ ہو کہ وہ از سرِ نو ان کی یاد کو بیدار کر دے۔

وَكَمْ اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنْ قَرْنٍ ۭ هَلْ تُحِسُّ مِنْهُمْ مِّنْ اَحَدٍ اَوْ تَسْمَعُ لَهُمْ رِكْزًا (۹۸)

'رکز' کے معنی آہٹ، سن گن اور کھٹکے کے ہیں۔

مطلب یہ ہے کہ تم اپنا فرض انذار و تبشیر ادا کر دو۔ جو لوگ تمھاری بات نہیں سنیں گے وہ اپنا انجام خود دیکھیں گے۔ تاریخ میں ان کے لیے کافی سامانِ عبرت موجود ہے۔ ان سے پہلے کتنی ہی قومیں ہمارے عذاب کی زد میں آ چکی ہیں تو کیا تم آج ان میں سے کسی کی کہیں بو بھی محسوس کرتے ہو یا ان کی کہیں آہٹ بھی سنتے ہو! اسی طرح یہ بھی تمھاری تکذیب کی پاداش میں بے نام و نشان ہو جائیں گے۔

ان سطروں پر اس سورہ کی تفسیر تمام ہوئی۔ اللھم ارنا الحق حقا وارزقنا اتباعه وارنا الباطل باطلا وارزقنا اجتنابه۔ وصلی اللہ تعالیٰ علی محمد وبارک وسلم۔

لاہور

۲۷ نومبر ۱۹۷۲ء

فہرست مضامین

فہرست مضامین

تفسیر سورۃ ھود - ١١

تفسیر سورۃ یوسف-۱۲

تفسیر سورۃ الرعد ۱۳

تفسیر سورۃ ابراہیم - ۱۴

تفسیر سورۃ الحجر۔ ۱۵

تفسیر سورۃ النحل - ۱۶

تفسیر سورۃ بنی اسرآءیل ۔۱۷

تفسیر سورۃ الکہف ۱۸

تفسیر سورۃ مریم - ۱۹